زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

سالنامہ

ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال
ایم اے (عثمانیہ)

مجلسِ ادارت
منظور احمد * حمایت اللہ * مسیح انجم

مجلسِ مشاورت کرشن چندر	راجندر سنگھ بیدی	بھارت چند کھنّہ
خواجہ عبدالغفور	نریندر لوتھر	مجتبیٰ حسین

جنرل مینجر: محمد ...
کتابت : ادارۂ سلام خوشنویس، ... ، یاقوت پورہ حیدرآباد ۲۳
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ... کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
بائینڈنگ : محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس ... شینی، پرانی حویلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
سالانہ (۲۰) روپے ــــــــ بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ
سالانہ انفرادی (۱۵) روپے ــــــــ فی پرچہ (۳) روپے

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ، ۳۱ ... معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (آے پی)
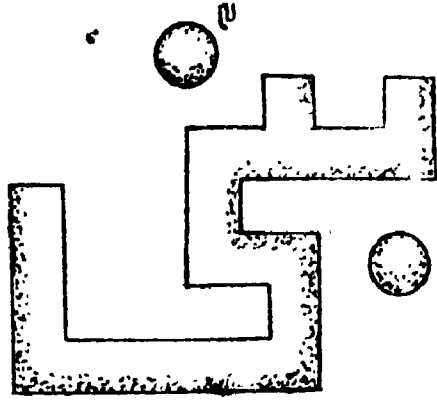
ملز کے تیار کردہ
تمام پارچہ جات
مل کے مقررہ داموں پر
حاصل فرمائیے
آپ کے شہر میں آپ کا اپنا
قابلِ اعتماد شوروم
ایف ڈی خان اینڈ کمپنی
عابد روڈ، حیدرآباد ۱
فون : ۵۳۹۴۲
لاجواب سوٹنگ، بے مثال شرٹنگ،
اسکول یونیفارمس، تولیے، بیڈشیٹس اور ڈور کرٹنز وغیرہ کا
تازہ ترین اسٹاک ملاحظہ فرمائیے

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

شگوفہ کا جدید پتہ

شگوفہ ، ... معظم جاہی مارکٹ ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

- آرٹ کے پرستاروں
- ادب کے متوالوں
- حسن کے پروانوں

کے ذوقِ نظر کی تسکین کے لئے

ایک جاذبِ نظر تحفہ

ایک خوبصورت اردو ماہنامہ

جو، مہکتے پھولوں کی شگفتگی
چمکتے ستاروں کی دلکشی
حسین جلوؤں کی رنگینی لئے
بہت جلد پیش ہو رہا ہے

فلمی تصویر، گرین پیلس، 1/373۔6۔3 حمایت نگر، حیدرآباد 500009

لغاتِ جدید

کنہیا لال کپور

وہ جانور
یا گھر میں اس لئے نہیں
گیا مبادا باقی جانور اس کی صحبت میں
جائیں۔
وہ خوشامدی جو ہر شخص سے کہتا ہے "میں نے
خوبصورت شخص آج تک نہیں دیکھا۔"
وہ چیز جسے سوچ سے اچھی آدمی بالکل نہیں سمجھتے۔
اور باقی ہمیں جو اسے سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں جھوٹ
بولتے ہیں۔
وہ انسان جس کے سر کے بڑھے ہوئے بال اور
لمبی اور بے ترتیب داڑھی دیکھ کر خیال آتا ہے
کہ جس شہر میں وہ رہتا ہے وہاں نائی کی دکان
نہیں۔
وہ کمائی جو آدمی ڈاکٹر اور آدمی محکمۂ انکم ٹیکس
لے جاتا ہے۔
کا منہ دیکھا ہے: جب صبح آئینہ
میں اپنا منہ دیکھنے کے بعد
سارا دن نقصان

ہی ہوتا رہے اس
وقت اس محاورہ کا استعمال کیا
جاتا ہے۔ ایک مرتبہ استاد ذوق کو اسی قسم
کی صورتِ حال سے دو چار ہونا پڑا تھا۔ چنانچہ
انھوں نے فرمایا تھا:

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدۂ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

آوے کا آوا بگڑا ہے: اپنے بعد آنے والی نسل پر ہر
ایک نسل کا تبصرہ!

آپ کے سر کی قسم: دنیا کی سب سے جھوٹی اور بے ضرر
قسم۔ جس کے کھانے سے کھانے والے کا کچھ نقصان نہیں
ہوتا۔ داغ دہلوی اس نکتہ کو جانتے تھے۔ تبھی کہتے ہیں:

آپ گھبرائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ کے سر کی قسم، داغ کا حال اچھا ہے

ادیب: ۱۔ وہ آدمی جو "ہوا" یا "واہ واہ" پر
پلتا۔ پنپتا اور جیتا ہے۔
۲۔ وہ شخص جو اس غلط فہمی میں مبتلا
ہے کہ شیکسپیر۔ کالی داس

غالب کے بعد ادب کو فروغ دینے کی ذمہ داری اس پہ نہ ہوتی ہے۔

ایڈیٹر: ۱۔ وہ بدنصیب شخص جو ہر روز اس امید پر ایڈیٹوریل لکھتا ہے کہ شائد قارئین اسے پڑھیں گے۔ لیکن جس کی یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوتی۔

۲۔ وہ اخبار نویس جس کا ایڈیٹوریل اس کے علاوہ صرف ایک اور شخص پڑھتا ہے۔ یعنی پروف ریڈر۔

اردو: اکبرالہ آبادی اور مہادیوی ورما کے بعد الہ آباد کی ہندوستان کو تیسری دین!

باپ: وہ گنجا اور تھکا ماندہ شخص جو سارے گھر کے لئے کماتا ہے لیکن جسے اس کی بیوی نکھٹو اور بچے چغد سمجھتے ہیں۔

بچے: چلتی پھرتی روتی پیٹتی لعنتیں جو جتنی کم ہوں زیادہ ہیں۔

بیوی: دھوبن، باورچن، نرس اور باندی کا قابلِ رحم مرکب!

بھابی: سالی کے علاوہ واحد ہندوستانی عورت جس کے ساتھ تھوڑی سی بے تکلفی کے ساتھ پیش آیا جاسکتا ہے۔

برسات: وہ واہیات موسم جس میں اگر "فلو" نہ پھیلے تو ملیریا ضرور پھیلتا ہے۔

بھرتی کا شعر: آج کل لکھی جانے والی غزلوں کا قریب قریب ہر ایک شعر۔

بور: وہ شخص جس کی گفتگو سن کر سر پیٹنے کو جی چاہے اپنا نہیں اس کا!

بوسہ: شاذونادر پھول کی پتی لیکن اکثر و بیشتر جوتی کے تلوے چاٹنے کا فعل!

پیسہ: خدا کا سب سے بڑا حریف اور رقیب!

پڑوسی: وہ شخص جو آپ کو کمینہ سمجھتا ہے اور جسے آپ پرلے درجے کا لچا اور بدمعاش سمجھتے ہیں۔

تکرار: وہ بحث جو دو بیوقوفوں میں اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کی جاتی ہے کہ ان میں کون بڑا بیوقوف ہے۔

تشریف لیجانا: وہ عمل جو "تشریف لانے" سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

تقریر: کچھ کہے بغیر متواتر بولتے چلے جانے کا فن۔

تان سین: آپ کے پڑوس میں رہنے والا وہ گویا جو گلا گانا گاتا نہیں اس کی ٹانگ توڑتا ہے۔

تنخواہ: وہ چیز جس کے لئے مہینہ بھر انتظار کرنا پڑتا ہے اور جو ایک دن میں ختم ہو جاتی ہے اور جس پہ وصل کے دن کی طرح یہ شعر صادق آتا ہے:

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کیلئے

تفریح: دن رات اپنے ہمسایوں کے طور طریقوں میں مین میکھ نکالنا۔

جرنلسٹ: وہ شخص جو ایڈیسن اور مارکونی سے بڑا موجد ہے کیوں کہ وہ عجیب و غریب خبریں ایجاد کرتا ہے۔

جوتا: وہ چیز جسے چرانے کے لئے ہم مسجدوں اور مندروں میں جاتے ہیں۔

جوتشی: وہ آدمی جسے مستقبل کے متعلق اتنا ہی معلوم ہے جتنا آپ کو۔ لیکن جو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

جگنو: وہ دانشور جو بے تکی باتیں بنانے میں مہارت رکھتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی غلطی یا اتفاق سے کوئی چونکا دینے والی بات بھی کرسکتا ہے۔

جلوس: بہت سے سرپھروں کا مل کر گلیوں اور بازاروں میں چلنا اور چلّانا!

جمہوریت: وہ طرزِ حکومت جس میں سرکار سمجھتی ہے کہ تمام مسائل حل کرنے کی ذمہ داری جنتا پہ عائد ہوتی ہے اور جنتا سمجھتی ہے گورنمنٹ پہ عائد ہوتی ہے۔

حسد : ایک قسم کا شکوہ کہ جیسے دوسرے ہیں ویسا میں کیوں نہیں یا جیسا میں ہوں ویسے دوسرے کیوں نہیں۔

حاضر جواب : وہ گنہگار جس سے جب خدا پوچھے گا "تمہیں جہنم میں کیوں نہ بھجوایا جائے تاکہ دوسرے گنہگار عبرت پکڑیں۔" تو جواب میں کہے گا "اے خداوندا! گناہ تو میرے علاوہ بھی کئی لوگوں نے کیے ہیں۔ تو ان میں سے کسی ایک کو جہنم میں کیوں نہیں بھیجتا تاکہ میں عبرت پکڑوں۔" اور خدا اس کے جواب سے اتنا خوش ہوگا کہ اسے جنت میں بھجوا دیگا۔

دماغ : وہ بھوسہ جو اسّی فیصد لوگوں کی کھوپڑیوں میں بھرا ہوتا ہے۔

دوست : وہ شخص جسے مخاطب کرکے کہا جا سکتا ہے:

وہ ارماں جو نہ نکلے دشمنی ہے
نکالے جا رہے ہیں دوستی سے

روزی : وہ چیز جو اگر خدا کی بجائے بندا بندوں کو دیتا تو آدھے سے زیادہ لوگوں کو ہر روز روزہ رکھنا پڑتا ہے

راز : وہ بات جو ہم کسی شخص کو بتانے کے بعد اسے تاکید کرتے ہیں کہ کسی اور کو نہ بتائے۔ کیوں کہ جس شخص نے ہمیں یہ بات بتائی تھی۔ اس نے ہمیں یہی تاکید کی تھی۔

رتجگا : وہ شور و شغب جس کا اہتمام دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ ہمسایوں کی نیند حرام کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔

زبان : گوشت کا لوتھڑا جس کی لمبائی گز بھر ہوسکتی ہے اگر وہ عورت کے منہ میں ہو!

شرم : وہ جو تمام حیوانوں میں سے کبھی صرف انسان کو آیا کرتی تھی مگر جو آج کل اسے بھی نہیں آتی۔

شیخ چلی : وہ سادہ لوح جو اس لئے جان باز نہ ہوسکا کہ اسے اصلی پلاؤ پکانے کی توفیق نہیں تھی اور خیالی پلاؤ سے پیٹ نہیں بھرتا۔

شاعر : وہ شخص جس کا تکیہ کلام ہوتا ہے "عرض کیا ہے" اور جب وہ عرض کرنے پر آتا ہے تو عرض کئے چلا جاتا ہے۔

جدید شاعر : وہ شاعر جس کی شاعری نظم ہوتی ہے نہ نثر بلکہ بعض اوقات تو معمہ، پہیلی یا گورکھ دھندا تک نہیں ہوتی۔

صبر : بے بسی یا بے کسی کا دوسرا نام۔

عمل : وہ جس کے بغیر کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ بقول مجید لاہوری:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
اسی سے آدمی بنتا ہے اور آچار شلغم بھی

عشق : ایک قسم کی خود فریبی جس میں مبتلا ہو کر ایک نوجوان کسی خاص لڑکی کو باقی تمام لڑکیوں سے حسین سمجھتا ہے۔

طالب علم : وہ نوجوان جو علم نہیں ڈگری کا طالب ہے اور جس کا مقولہ ہے۔ مفت ہاتھ آئے تو بُری کیا ہے

فاختہ : ایک پرندہ جسے کبھی خلیل خاں اڑایا کرتے تھے لیکن جو اُن کی وفات کے بعد اپنے آپ اُڑ رہی ہے۔

طنز : "جاہل" لفظ استعمال کئے بغیر کسی کو جاہل کہنا۔

ظریف : وہ شخص جو ہمیشہ کھری بات کہتا ہے۔ لیکن لوگ سمجھتے ہیں مذاق کر رہا ہے۔

مجنوں : نجد کا رہنے والا ایک نوجوان جس کی آنکھ میں نقص تھا۔ اور جس کو لیلیٰ جو بالکل کالی تھی گوری نظر آتی تھی۔

نابالغ : ستر برس کا بوڑھا جو اختر شیرانی کی نظموں پر سر دھنتا ہے اور ریاض اور جلیل کے اشعار سُن کر وجد میں آجاتا ہے۔

مشاعرہ : شعر خوانی کی وہ مجلس جس میں شعرا اصرار کرتے ہیں
کہ سامعین بار بار "مکرر مکرر" کی صدائیں بلند کریں
اور سامعین اصرار کرتے ہیں کہ شعرا کوئی کام کا شعر
پڑھیں اور جو اسی کشمکش میں ختم ہو جاتی ہے

گناہِ بے لذت : مسجد یا مندر سے ایسا گھسا پٹا جوتا چرانا
جسے مرمت کرانے کے بعد بھی پہنا نہیں جا سکتا۔

گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ : نئی شاعری جس میں
ایک مصرع کا "وزن"
ایک ماشہ اور دوسرے کا ایک تولہ ہوتا ہے۔

لنگور : وہ جانور جسے دیکھ کر کوئی بھی انسان خدا کا
شکر بجا لاتا ہے کہ وہ اس سے کم بدصورت
ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو کم از کم اس کی دُم
تو نہیں۔

نازک مسئلہ : وہ مسئلہ جو صنفِ نازک سے تعلق رکھتا
ہو۔ جیسے چولی یا انگیا کا سائز!

نازک خیالی : کوئی ایسی بے تکی بات جسے اگر آپ نظم کی بجائے
نثر میں کہیں تو لوگ سمجھیں گے آپ بیٹھے بیٹھے پاگل
ہو گئے ہیں۔

ہچکی : وہ آواز جو کسی کے یاد کرنے پر گلے سے رُک
رُک کر نکلتی ہے اور اس وقت تک نکلتی رہتی ہے
جب تک عاشق کا دم نکل نہیں جاتا۔ سند کے
لئے ملاحظہ فرمائیے داغ دہلوی کا یہ شعر :

مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

ویرانہ : وہ بڑا شہر جس میں کوئی انسان نہ ہو صرف آدمی
ہی آدمی ہوں۔

وفا : وہ وصف جس کی ہم ہمیشہ دوسروں سے توقع
کرتے ہیں۔

یار : وہ شخص جو سینے کی بجائے پیٹھ میں خنجر
گھونپتا ہے۔

▲▲

کام کرواتا ھے دل :

اسماعیل ظریفؔ

خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے جب کہیں آتا ہے دل
کیسے کیسے کار ... پر ...
جب کسی فنکار کے بھیجے کو گرماتا ہے دل
تب نئی تازہ غزل اس سے اگلواتا ہے دل
جب سکندرآباد کے کنڈ پہ لیجاتا ہے دل
کتنے عبرت خیز منظر ہم کو دکھلاتا ہے دل
خود تڑپ کر سونے والے کو بھی تڑپاتا ہے دل
خواب میں جب عقدِ ثانی اس کا کرواتا ہے دل
عشق کو جب حسن کے کوچہ میں لیجاتا ہے دل
تاج پوشی شان سے پھر اس کی کرواتا ہے دل
فاصلے سے دیکھ کر میک اپ مچل جاتا ہے پھر تو نے
دیکھ کر نزدیک سے گھبرا ... [illegible]
پاک بینوں کو بھی بعض اوقات بھٹکاتا ہے دل
چکنے چہرے دیکھ کر اکثر پھسل جاتا ہے دل
لیجئے ہر آج خانہ میں بھی آخر آ گیا
منہ سے بولی دیجئے ہاتھوں سے اب جاتا ہے دل
کیسے کیسے زندہ دل دفنا دیئے ہیں وقت نے
دیکھ کر قبروں کے کتبوں کو دہل جاتا ہے دل
ڈوبتے گُل ہنسنے کے یہ آثار ہوتے ہیں ظریفؔ
ڈوبتی جاتی ہیں نبضیں بیٹھتا جاتا ہے دل"

احمد جمال پاشا

میں اور میری میں

جو ہو رہا ہے [illegible] ساتھیوں نے زندگی میدانِ جنگ بنادی ہے نہ معلوم کدھر سے کب کوئی گولہ لگے اور ہمارے پرخچے اڑجائیں
صبح سے شام تک وہ تمام لوگ جو مجھ سے ٹکراتے رہتے ہیں جنہیں نہ احباب سمجھ کر لباس کی طرح بدلا جاسکتا ہے نہ رشتہ داری کی مجبوری صبر کی سِل ہٹا سکتی ہے۔ یہ سب میرے ملنے والے ہیں۔ کہتے ہیں موت اور ملاقاتی کا کوئی ٹھیک نہیں۔ موت بیچاری صرف ایک بار آتی ہے مگر ملاقاتی خیال کی رفتار سے آتے اور ہر بار ادھ مرا کر جاتے ہیں۔ اس کی تازہ مثال ہمارا حالیہ دورۂ کلکتہ تھا۔ ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے ریل کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں اس نیت سے داخل ہوئے کہ سوتے ہوئے آرام سے پہنچ جائیں گے۔ ابھی قلی ہمارا بستر بھی نہ لگا پایا تھا کہ ایک بڑے میاں ہم پر حملہ آور ہوگئے۔ بولے ___ "ارے موہن ......؟ ایکدم بدل گئے ___؟"

عرض کیا ___ "مجھے موہن نہیں رحمت کہتے ہیں ___"

بے حد خفا ہوتے ہوئے گھُرک کر بولے ___ "خود بدلا، نام بدلا، یہاں تک کہ مذہب تک بدل دیا ___ کمبخت نے ایک [illegible] کی حتی [illegible]"

[illegible] سامنے تھوڑا [illegible] پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میں بتا تو رہا ہوں ......" وہ بات کاٹتے ہوئے چیخ کر بولے "ارے جا! جا! کل کا لونڈا، تو ہمیں کیا بتائے گا؟ جب تانگہ [illegible] ابر کا تھا تب سے جانتا ہوں۔ گودیوں کھلایا ہے۔ میں تیرے باپ کا دوست خان بہادر رضا علی ہوں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو خوش ہوتا، مگر میرا تو دل رو رہا ہے۔ کہ میرے مرحوم دوست سر سوہن لال کی آتما کو تیری اس حرکت سے کتنی بے کلی ہوگی ___؟"

میں نے پھر صفائی دینے کی کوشش کی تو گرج کر بولے:

"خاموش گستاخ، ننگ خاندان..... تو کلنگ ہے کلنگ!" اس کے ساتھ دوسرے مسافر بھی بڑے صاحب کے ساتھ ہو گئے۔ اور میری وہ حالت ہو گئی جو بلی کو دیکھ کر کابک میں بٹیر کی ہوتی ہے۔ دونوں کان سنسنا رہے تھے۔ دماغ پر ہتھوڑے

چل رہے تھے۔ تم لے لیجیے جو ہم نے اس کے آگے گاڑی چلنے کی آواز یا خان بہادر کے ساتھیوں کے اپنی شان میں ناشائستہ کلمات سنے ہوں۔ سفر کاٹے نہ کٹتا تھا۔ بے اختیار دل چاہ رہا تھا کہ چلتی ٹرین سے چھلانگ لگا دیں۔ لیکن کلکتہ تک تو ہمیں اپنے ہم شکل موہن کو بھگتنا ہی پڑا ــــــ

کلکتہ میں جن صاحب کے یہاں ہمارا قیام تھا وہ جوانی میں محمڈن اسپورٹنگ میں فل بیک ہوا کرتے تھے اور بقول ان کے وہ فٹ بال کے ایسے بے مثال کھلاڑی تھے جس کی زمانے نے قدر نہ کی ــــــ

فٹ بال کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ ٹینس کی گیند سے کافی بڑا ہوتا ہے۔ جس کو اچھے خاصے مال دار لوگ تک دوسروں سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی صاحب خانہ کی، کہ جیسے ہی اُن کا سامنا ہوتا اور وہ شروع ہو جاتے ــــــ

"جب میں رنگون میچ کھیلنے گیا تھا تو برما کو تین گول سے ہرا دیا تھا ــــ" ہم نے ان سے نیشنل لائبریری کا جغرافیہ پوچھا ــــ فرمایا۔ "رنگون جانے کی تیاری میں کچھ سامان جہاں سے خریدا تھا اُسی کے سامنے ہی تو نیشنل لائبریری واقع ہے۔

ہر کھانے اور ناشتے پر وہ پابندی سے ہمیں رنگونی میچ کھلا رہے تھے، جس کا ہماری صحت پر اثر کم اور اعصاب پر زیادہ پڑ رہا تھا۔ جس چیز کو اٹھاتے اس میں سے ایک دبی ہوئی برمی آہ نکلتی ــــــ

"میں ٹھیک یہی ناشتہ برما میں کرتا تھا۔ کھانے کے بعد پڈنگ آپ نوش فرما رہے ہیں عام طور پر زرد یا گلابی ہوتی ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ کالی کیسے ہوگئی ــــ؟ تو میں نے برما میں پہلی بار نہ صرف کالی پڈنگ کھائی تھی بلکہ پڈنگ کو سیاہ کرنے کا نسخہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ اس کو کھائیے تو کچھ کچھ محسوس ہوگا کہ آپ اس وقت رنگون میں ہیں۔"

جلے کھانے تو اس سے پہلے بھی کھانے کا اتفاق ہوا تھا مگر اس طرح جل جل کر نہ کھائے تھے۔ وہ ہمیں خاموش دیکھ کر بولے ــــــ

"میں فیلڈ میں اترا تو اک کھلبلی مچ گئی۔ ہر برمی پوچھتا ــــ یہ کون بہادر آگیا ــــ جس کے آگے ہمارے بہترین کھلاڑی ٹک ہی نہیں پا رہے ہیں ــــ؟ میں نے تو اس میچ میں وطنِ عزیز کی لاج رکھ لی تھی پھر کبھی جیتتے تو ہم بھی جانتے ــــ کوئی ایسا ویسا تھوڑی کھیلا تھا۔ ہر گول میں نے صفا پاس کیا بلکہ بائی پاس تک کیا تھا ــــ!"

وہ بکری کی طرح میں میں کرتے رہے ناشتہ، کھانا ٹھنڈا ہوتا رہتا ــــ کھا اس لئے نہ سکتے تھے کہ وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرتے اور گفتگو کے دوران ہمارے ہاتھ کو بطور تکیہ کلام استعمال کرتے۔ متعدد بار اُن کے گھر سے کسی ہوٹل میں منتقل ہو کر روپوش ہو جانے کا خفیہ منصوبہ بنایا۔ ہر بار وہ عین وقت پر نازل ہو گئے۔ سامان کھولتے ہوئے بولے ــــــ

"میں رنگون میں جہاں ٹھہرا تھا آخر تک وہیں رہا تھا ــــ" اور ہوا بھی یہی کہ ہمیں آخر تک جھک مار کر اُسی رنگونی فٹ بال کے میدان میں رہنا پڑا ــــــ

انھیں گھر والی سے شکایت تھی کہ "میں کہتا ہوں! شریف زادیوں کی طرح برمی تہمد اور کرتی پہنو، مگر وہ مانتی ہی نہیں برمی کہانیوں پر جو کتاب لایا تھا اُسی طرح پڑی ہے! انھوں نے آج تک کھول کر بھی نہیں دیکھی"

ہمیں فخریہ انداز سے بالکونی تک لے گئے اور ایک گملے میں جھٹ کٹیا جیسا کوئی جنگلی پودا دکھاتے ہوئے بولے:

"میں اسے رنگون سے پہلی بار ہندوستان لایا تھا۔" آخر ایک رات کامیاب ہو گیا ــــ اُنھیں بے خبر سوتا پا کر سامان چھوڑ

چہار دیواری پھاند اسٹیشن بھاگا —— ٹرین میں اس وقت تک چھپا رہا جب تک کہ کلکتہ نکل نہ گیا —— گھر پہنچ کر ایک بخت نے بہانہ کر دیا کہ "ریل پر سامان چوری ہو گیا۔" اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ "ہم خود چوری نہیں ہوئے ——"

ہماری بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ کلکتہ کے رنگین آسمان سے گرے تو مسٹر مین کی کھجور میں اٹکے ——

ہوا یہ کہ ہمارے دوست مسٹر مین کی جو شامت آئی تو انہوں نے اپنی مین کی دھاک بٹھانے کے لئے ایک عدد رسالہ "جھاڑ جھنکار" چالو کر دیا۔ جس کو انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے آؤٹ پڑدسن لٹریری قسم کے ادب سے ادب و صحافت کا عجوبہ بنا دیا ——

ہمارے فری اسٹائل دوست مسٹر مین کا نزلہ خانۂ انوری پر گرنا شروع ہوا —— ہر نئے شمارے کا جبری مطالعہ کرانے کے لئے آدھمکتے —— مگر رسالہ اور اس کا اڈیٹر دونوں دنیائے ادب کے ایسے اونٹ تھے جن کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ دونوں میں بس ایک شئے مشترک تھی۔ وہ تھی اس کی بڑی موٹی سی "میں" —— ان کی ہر بات۔ اور تحریر اُن کے اسم گرامی سے شروع ہوتی۔ بس وہ اپنا ذکر کرتے یا اپنے اندر کے آدمی کا —— اپنا نام لکھنے کے قلم سے لکھتے —— ہر گھسی پٹی بات کو اپنی دریافت ثابت کرنے پر تُلے رہتے۔ بغل میں رسالہ دبا کر پوسٹ مین کی طرح نکلتے —— رستے گلی میں کھڑے کھڑے ہی سوالیہ نشان بن جاتے ——

"میرا رسالہ دیکھا؟ ...... میں نے کیا خوب لکھ دیا ہے —! اس سے قبل کیا کسی نے لکھی، پھر پر ایسی نظم لکھی ہوگی —؟"

ہم ان کا دل رکھنے کے لئے اُن کی رسمی تعریف شروع کر دیتے ——

"ارے صاحب! کیا کہنا آپ کا ——! آپ تو خلاستے ادب کے آریہ بھٹ ہیں" —— پھر فرمائش کی ——

"مہربان! مکھی اور مچھر کے بعد اب کیچڑ، دلدل، گھاس اور پھوس پر بھی کچھ طبع آزمائی فرمایئے ——!"

وہ فخریہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولے ——

"میں نے دس سال پہلے پیشن گوئی کی تھی کہ میں آریہ بھٹ ہوں مگر بیوی تک نے ماننے سے انکار کر دیا تھا — یہ آپ کی بڑائی ہے کہ آپ نے اسے مانا —— ضرور کیچڑ اور دلدل پہ لکھوں گا۔ رہی گھاس پھوس ....."

ہم نے بات کاٹتے ہوئے کہا ——

"ارے یار اسے چھوڑو وہ تمہاری تنقیدوں میں بھری پڑی ہے ادب کی سب سے بڑی چراگاہ ہے۔ بڑے بڑے جگالی کرتے نظر آتے ہیں ——"

مسٹر مین بولے ——

"بھائی صاحب! تنقید تھوڑی کرتا ہوں کپڑے اُتار لیتا ہوں —— میں بہت بڑا ننگا ہوں ——"

ہم بولے ——

"واقعی آپ ننگِ ادب ہیں۔ زندگی کی سنگینی، اس کے مسائل، دُکھ سُکھ، حسن وغیرہ سے توجہ ہٹانا کوئی آپ سے سیکھے ——"

ہماری تعریف پر وہ گدھے کی طرح پھول کر رینکنے لگے — "میرے آریہ بھٹ ہونے کا راز یہ ہے کہ میں پڑھنے والے کو موٹے موٹے فرضی حوالوں سے مرعوب کر دیتا ہوں —— آج کل اُردو والوں کو مرعوب کرنے کے لئے قدیم آفریقی زبانوں کی گرامر سیکھ رہا ہوں ——!

ہم نے کہا ——

"پھر تو اس کے لئے آپ کو کلدانی، عبرانی، اور فنیقی زبانیں بھی سیکھنا چاہیئے ——!"

کہنے کو تو ہم کہہ گئے —— مگر اب ڈر کے مارے بُرا حال ہے۔ کہ جب وہ قدیم افریقی، ایشیائی زبانوں کا ابو الہول بنے گھراؤ کیا کریں گے تو ہمارا کیا حشر ہوگا ——

مسز میں کے رسالے اور اُن کی میں میں ہم میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرسکی —— کیوں کہ ہمیں بانک، بنوٹ، پٹے بازی یا دنگل میں کبھی کوئی دل چسپی پیدا نہ ہوسکی ——

لیکن یارانِ طریقت کی دن رات کی میں میں نے ہماری سماعت ضرور کچھ زائل کردی ہے۔

▲▲

دلاور فگار صاحب جب پاکستان سے ہندوستان آئے ان کے استقبال میں ـــــــ، شوق بدایونی نے ایک استقبالیہ ترتیب دیا تھا۔ دلاور فگار نے منظوم شکریہ ادا کیا جو "قومی آواز" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ جب یہ منظوم شکریہ ہندوستان کے ممتاز شاعر جناب رضا نقوی واہی کی نظروں سے گزرا تو انھیں جو لطف حاصل ہوا، انھوں نے اسے منظوم شکل دیدی۔ ہم دونوں کے شاہکار ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

استقبالیہ

ـــــــ دلاور فگار ـــــــ

شوق صاحب نے دیا ہے مجھ کو استقبالیہ
اس کا یہ مطلب نہیں وہ ہو گئے دیوالیہ

میں تو استقبالیہ میں کیا سناؤں گا کلام
شوق صاحب سے سنیں ان کا کلامِ عالیہ

کاش مستقبل میں استقبال لئے اس طرح ہوں
آپ مجھ کو پان دیں اور میں کھلاؤں چھالیہ

آج استقبالیہ میں اس طرح آیا ہوں میں
سانس میں عنبر، غزل میں مُشک، سر میں غالیہ

اس میں ماضی کی کسک ہے اور نہ مستقبل کی فکر
شوق صاحب کی غزل ہے وارداتِ حالیہ

ہم کو رہزن ہی کی پروا ہے نہ انکم ٹیکس کی
بس یہی دو چار غزلیں ہیں ہمارا مالیہ

شوق صاحب نے مجھے پہونچا دیا ہے اوج تک
شوق صاحب کو خدا پہونچائے گا صومالیہ

دیکھے استقبالیہ کیوں جائیے صومالیہ

رضا نقوی واہی

کون دے گا اب کسی شاعر کو استقبالیہ
جب اُسے پاداش میں جانا پڑے صومالیہ

کالے پانی سے نہیں ہے کم وہ صحرائی دیار
کس کی شامت ہے کہ ہو جا کر وہاں دیوالیہ

شوق صاحب داد کے خواہاں ہیں پڑھ پڑھ کر غزل
اور دلاور ہیں کہ بیٹھے کھا رہے ہیں چھالیہ

سوئے دسترخوان نظریں اُٹھ رہی ہیں بار بار
کون سُنتا ہے بچارے کا کلامِ عالیہ

خوشبوئے مُرغِ مسلم چھن رہی ہے تا بہ ــــ
سانس میں عنبر تو معدہ میں بسا ہے غالیہ

دیکھے استقبالیہ جیسے کیا ہو کوئی جرم
صورتِ دعوت وصولا جا رہا ہے مالیہ

پڑھ کے اخبارات میں واہی کو لطف آیا بہت!
ارضِ پاکستان کی یہ وارداتِ حالیہ!

راہی + غالبؔ

راہی قریشی

اپنی لکنت کے سبب حال سُنائے نہ بنے
”کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے“

جیب میں وسکی کی بوتل تو رکھی میں نے، مگر
”کوئی پوچھے کہ ”یہ کیا ہے“ تو چھپائے نہ بنے“

اِک مِنسٹر کو خبر کیسے بتاؤں یا رب
”کام وہ آن پڑا ہے، کہ بنائے نہ بنے“

گھر میں اطفال و اعزّا کا ہے کچھ اتنا ہجوم
”ہاتھ آئیں، تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے“

وہ ہے برقعے میں نہاں، کیسے اُسے پہچانوں
”پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے“

راہ ابّا کی نہ دیکھوں، کہ بِن آئے نہ رہیں
”تم کو چاہوں، کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے“

میرے بچوں کو کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
”کاش یوں بھی ہو کہ بِن ”اُن کے“ ستائے نہ بنے“

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے ”جذبۂ زر“
”اُس پہ بَن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے“

زرِ رشوت کی محبت ہے وہ آتش راہیؔ
”کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے“

ناظم انصاری

لگاتا ہوں یہیں بستر، تمہارا کیا اِرادہ ہے
نہیں جاتا میں اپنے گھر، تمہارا کیا اِرادہ ہے

کھڑے ہو آج بھی کل کی طرح آکر اٹاری پر
نہ جاؤں آج بھی دفتر، تمہارا کیا اِرادہ ہے

اجازت ہو تو کرلوں فیصلہ اپنی محبت کا
تمہارے باپ سے مل کر، تمہارا کیا اِرادہ ہے

مرا دیوالا یوں تو پٹ گیا ہے عشق میں پھر بھی
بسانا چاہتا ہوں گھر، تمہارا کیا اِرادہ ہے

یہ کیسی دھاندلی ہے شیخ جی اللہ کے گھر میں
بیانِ بادہ و ساغر، تمہارا کیا اِرادہ ہے

یقیں ہے سنکے پبلک گول ہو جائے گی محفل سے
سناؤں میں غزل گاکر، تمہارا کیا اِرادہ ہے

تخلص میں بھی رکھ لوں سوچئے اِن میں سے کوئی ناظمؔ
لفنگا، چور یا لوفر، تمہارا کیا اِرادہ ہے

"پاس ہو جاؤں جسے کھا کے وہ معجون بنا"

بھارت چند کھنّہ

کالج کے لڑکے لڑکیوں کا پڑھانا کسی زمانے میں ایک نہایت معزز پیشہ، اور کالج کا پروفیسر ایک قابل احترام، ذی شان اور باوقار انسان سمجھا جاتا تھا، کیوں کہ وہ شخص طلبا کو تعلیم کی دولت دیتا اور اس کے اعتراف میں اُن سے تعظیم و تشکر لیتا تھا۔ اب بھی وہ ایسا کرنے کے لئے تیار ہے مگر صد حیف کہ طالب علم کے سر پر کوئی ایسا بھوت سوار ہے کہ وہ علم کی دولت حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں، بقول وِلاور فگارؔ آج کا بال بچکر فرماتا ہے کہ ـــــــ

کیا کروں گا مَیں یہ تعلیم کی دولت پا کر
میرے اللہ بنا دے مجھے جانی واکر

بات دراصل یہ ہے کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ ہمارے ملک میں آبادی کے بے پناہ طور پر بڑھنے سے اوّل تو پڑھنے کے لئے اسکولوں میں داخلہ حاصل کرنا از خود والدین کے لئے کارڈ کے بغیر "بوتل شیر" لانے سے کم نہیں، لیکن داخلہ پانے کے بعد برخوردار جماعت میں جانے کے بجائے کسی سینما ہال میں داخلہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں خود کو مُبتلا رکھتا ہے۔ اور اگر بفرضِ محال کبھی جماعت میں پہنچ جاتا ہے تو جماعت کی کیفیت ایسی بنا دیتا ہے کہ خاموشی کی فضاء قائم کرنے کی کوشش میں سب سے زیادہ شور مچانے والا اِنسان جماعت میں پروفیسر ہی ہوتا ہے اس کی اپنی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ناک میں دَم، کمر میں خم؟ پاؤں میں چھٹی کا دودھ، چشموں پر آہوں کا دُود، آنکھوں میں خون کے آنسو، کانوں میں

گھبراہٹ، بال پریشان، حواس باختہ اور گلا ستقلاً بیٹھا ہوا ـــــ دراصل اس کی ملازمت میں جو چیز سب سے زیادہ مستقل ہے وہ اس کا بیٹھا ہوا گلا ہوتا ہے اور وہ کسی بات کا گلہ بھی نہیں کرسکتا۔

کہتے ہیں کہ حصولِ علم سے جاہل عقلمند بن جاتا ہے مگر جاہل اور عقلمند دونوں کے لئے پیٹ کے دوزخ کو بھرنا ضروری ہے۔ اس لئے علم حاصل کرنے سے زیادہ ضروری امتحان پاس کرنا ہے کیوں کہ امتحان پاس کرنے سے ڈگری ملتی ہے اور ڈگری کے زور پر ملازمت۔ ملازمت سے زر اور زر سے زیست قائم رہ سکتی ہے۔ غرض ثابت ہوا کہ کالج میں داخل ہو کر طالب علم کو جس چیز کی طلب اس چیز کے علاوہ جس کو بیچ کا نشانہ بنایا جاسکے، ہوتی ہے وہ علم نہیں بلکہ امتحان پاس کرنے کی سند ہے۔ آج کے طالب علم جو اس بات پر ایقان رکھتے ہیں کہ "عقل سے نقل بڑی ہے" یہ بھی بخوبی جان گئے ہیں کہ
"نہیں محتاج نمبروں کا جسے لاٹھی خدا نے دی"!

ایک وہ دقیانوسی زمانہ تھا جب طالب علم ڈرتے ہوئے جماعت میں جاتے تھے کہ کہیں کسی سوال کا صحیح جواب نہ دینے پر شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ وہ پروفیسر کو دور سے دیکھ کر احترام سے جھک کر سلام کرتے تھے مگر صورت حال اب یہ ہے کہ پروفیسر طلبا کو دور ہی سے دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سلام بجالاتا ہے اور راہِ فرار تلاش کرتا ہے کہ کہیں ناقابلِ جواب سوال نہ پوچھے جائیں اور ناقابلِ تعمیل فرمائشیں نہ گلے پڑ جائیں ـــــ اور اس کو کفِ افسوس ملتے ملتے اپنی ہتھیلیوں کی حالت پتلی اور منہ سے کفِ افسوس بہانا پڑے!

آج کل پروفیسر جب لڑکے لڑکیوں کو درس دینے کے لئے گھر سے نکلتے ہیں تو بیوی بچوں کو "خدا حافظ" کہتے ہوئے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ بیوی بچوں کی حفاظت سے پہلے اگر پروردگار خود پروفیسر صاحب کی حفاظت کی طرف دھیان دے تو مناسب ہوگا "پھر ملیں گے اگر خدا لایا" کا کلمہ پڑھتے اور "خدا میرا بھلا کرے" کا جاپ جپتے ہوئے کالج کا رُخ کرتے ہیں۔

امتحانوں کے لئے جو نگران کار مقرر کئے جاتے ہیں وہ بیچارے اس کی اطلاع ملتے ہی اپنی اولین فرصت نکال کر اپنی آخری وصیت الفاظ میں ڈھال دیتے ہیں۔ صبح اُٹھ کر جب گھر کی بدبخت گھٹیا ترین چائے کی پتی سے اعلیٰ ترین رنگت نکالنے کے لئے اس کو دَم دے رہی ہوتی ہے تو نگران کار صاحب دوڑ کی مشق کرکے دَم بناتے ہیں اور امتحان ہال میں ٹینس شوز پہن کر جاتے ہیں تاکہ امتحان دینے والے لڑکے اور لڑکیوں اگر سوالوں کا جواب لکھنے کے بجائے اُن کا پیچھا کرنے پر اُتر آئیں تو کم از کم ایسی دوڑ میں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچانے کی کوششوں کو رائگاں ثابت کرنے میں انھیں کم سے کم دشواری پیش آئے اور دوڑ کے اس امتحان میں وہ پاس ہو جائیں۔

میرا خیال ہے کہ لوگ جو محض تکمیلِ ضابطہ کی خاطر تعلیم کے محکمہ سے تعلق رکھتے ہیں، کسی ایک پنج ورشی یوجنا میں نصابِ تعلیم اور معیارِ تعلیم جیسی غیر ضروری چیزوں سے ہٹ کر اگر اساتذہ اور امتحان کے نگران کاروں کے لئے ایسے لباس بنانے والی فیکٹریاں قائم کریں جیسے پرانے زمانے میں انگلستان کے KNIGHTS پہنا کرتے تھے، تو مناسب ہوگا۔ اس اسکیم سے نہ صرف اساتذہ اور امتحان کے نگران کاروں کی جان کی نگرانی ہو سکے گی بلکہ بیکاروں کو روزگار مہیا کرنے کا مسئلہ بھی کسی حد تک حل ہو سکے گا۔ ایسے زرہ بکتر میں ملبوس پروفیسر حملہ آور طلبا کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکیں گے! اسی اسکیم کے تحت پروفیسروں کو پہلوانی، باکسنگ، جوجتسو، لاٹھی چلانے اور سنگباری جیسے فنون میں مہارت حاصل کروانے کا اہتمام بھی ہونا چاہیئے، تاکہ جائے اُستاد جو فی الوقت اُس کی جیب کی طرح بالکل خالی ہو چکی ہے، اپنا کھویا ہوا وقار اور دبدبہ پھر سے حاصل کرسکے۔ اس اسکیم کو پنج ورشی یوجنا کا نام دیا جاسکتا ہے!

اس کے علاوہ ایسے چاق و چوبند اُستاد جو جماعتوں میں اعلیٰ نظم و ضبط برقرار رکھ سکیں اُن کو بطور بونس کم سے کم پانی سے بنایا ہوا آدھا لیٹر دودھ اور ایک کلو یومیہ کے حساب سے دیئے جانے کے متعلق بھی غور کیا جانا چاہیئے !!

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ مسئلہ لڑکے لڑکیوں کو پڑھانے کا تھا۔ آج کل کے سڑکیے البیلے، بال بڑھے اور اسکوٹر چڑھے لڑکے لڑکیوں کو پڑھانا اسی دن ممکن ہو سکتا ہے جس دن وہ اپنے ہر دن کے پروگرام سے ہٹ کر منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر تفریحاً پڑھنا چاہیں۔ اور ایسا دن اس زمانہ میں جب کہ سینماؤں میں صبح کے وقت بھی فلم دکھائے جاتے ہیں اور فلمی ستارے نظر آتے ہیں، شاذ و نادر ہی وقوع ہوتا ہے۔ طلبا کی حاضری لگتی رہتی ہے کیوں کہ یہی ایک کام ہے جس کو استاد، لیکچرر یا پروفیسر بنایت پابندی اور سنجیدگی سے کر پاتے ہیں۔ غیر حاضری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ طلبا کا کوئی نمائندہ خدا کو غیر حاضر جان کر جماعت میں حاضر جوابی کا بے پناہ ثبوت دیتا ہوا حاضر۔ حاضر۔ حاضر فرماتا چلا جاتا ہے، اور ضابطہ کی تکمیل ہوتی رہتی ہے۔

آجکل کی کالج وغیرہ کی تعلیم کے متعلق خاکسار بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ فی زمانہ

استادے نیست کہ ہراساں نہ شود ــــ اور
شاگردے نیست کہ پریشاں نہ شود

▲▲▲

غزل

بوگس حیدرآبادی

خواب میں جب آتے ہو روز جانِ جاں تنہا
دِن میں کیوں نہیں آتے آپ مہرباں تنہا

نوجوان لڑکے بھی نوجوان ہیں آخر
کیوں مٹکتی پھرتی ہیں شوخ لڑکیاں تنہا

تم سے عشق کرنے کا مَیں مزہ چکھا دوں گا
مِل گئے اگر مجھکو تیس مار خاں تنہا

راتوں رات لیلیٰ کو لے کے اُڑ گیا مجنوں
اونٹ لے کے گھر پہنچا صرف ساربان تنہا

خوش نصیب کرتے ہیں ان سے پیار کی باتیں
مَیں غریب سُنتا ہوں اُن کی گالیاں تنہا

اپنے اپنے یاروں سے روز مِلتے رہتے ہیں
بیوی اس طرف تنہا اس طرف میاں تنہا

صبح ہو گئی آخر گھر کو جائیے بوگس
راہ دیکھتی ہو گی سالنے کی ماں تنہا

غزل

ظفر چکدینوی

بَن گئے اعدا جو باہم یار اِن دی لانگ رَن
ہم کو بھی ہونا پڑا ہشیار اِن دی لانگ رَن

دیکھ لینا جلد ہی تم بیس ستری کا کمال
مفلسی مٹ کر رہے گی یار اِن دی لانگ رَن

ختم ہو جانے کو ہے بے روز گاری کا چلن
کام سے لگ جائیں گے بیکار اِن دی لانگ رَن

رنگ لا کر ہی رہے گا جذبۂ صادق مرا
ان کو کرنا ہی پڑے گا پیار اِن دی لانگ رَن

سر پٹک کر رہ گئیں لہریں ہمارے عزم پر
بن گئی ساحل یہی منجدھار اِن دی لانگ رَن

بزدلی کا طعنہ میری بربادی کو نہ دو
ورنہ کر بیٹھوں گا مَیں بھی وار اِن دی لانگ رَن

شادی رحمت ہی نہیں دوستو زحمت بھی ہے
ایک سے دو، دو سے ہو گئے چار اِن دی لانگ رَن

آلۂ موسیقی ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں لوگ
کیوں نہ ہو ہر شخص موسیقار اِن دی لانگ رَن

شیخ جی نے لیٹ میریج پر بھی توڑا ہے ریکارڈ
کر گئے اولاد کی بھرمار اِن دی لانگ رَن

لوگ تانگوں میں پھنسا کر بیل باٹم چل پڑے
کھل گئے پاجامہ اور شلوار اِن دی لانگ رَن

نثر نے بھی شاعری کا نام جب پایا ظفر
ہم بھی کچھ لکھنے لگے اشعار اِن دی لانگ رَن

چوّا

اُنگلیاں مجھ پہ اُٹھائیں نہ مرے یار بہت
مجھ کو معلوم ہیں یاروں کے بھی اَسرار بہت
مختصر یہ کہ مَیں ہی نہیں تنہا بوگس!

گمنامی کی برکتیں

نریندر لوتھر

دُنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔
وی۔آئی۔پی۔ آئی پی اور پی یعنی بہت اہم شخص۔ اہم شخص اور صرف شخص۔
ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اہم اور بہت اہم شخص بنے۔ ہر انسان شہرت کا متلاشی ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ گھر گھر اس کے نام کا چرچا ہو۔ اس کی تقریریں۔ اس کے بیانات۔ اس کی تصویریں اخباروں میں چھپیں۔ لوگ باگ اس کی نظر عنایت حاصل کرنے کے لئے اس کی چاپلوسی کریں۔ اسے ہر جلسے میں مدعو کیا جائے۔ اس کا نام زبان زد عام خاص ہو۔
شہرت کے تعاقب میں انسان کیا کیا حیلے نہیں کرتا۔ سیاسی پارٹیوں میں شامل ہوتا ہے۔ مذہبی اداروں کا ممبر بنتا ہے۔ قسم قسم کی مجلسیں اور انجمنیں بناتا ہے تاکہ ان کے صدر۔ نائب صدر۔ سکریٹری۔ خازن مجلس عاملہ کے رکن۔ یا صرف ممبر کی حیثیت سے اسے کچھ اہمیت مل سکے۔
ہر موضوع پر۔ موقع بے موقع۔ محل بے محل وہ رائے زنی کرتا ہے۔ خود الیکشن کی ٹکٹ ملے یا نہ ملے۔ وہ ہر لیڈر کی کامیابی پر اس کی سالگرہ پر۔ تہنیتی تقریب کے موقع پر اور اس کے ہارنے اور انتقال پر تعزیتی پیغام شائع کرتا ہے۔ عید اور دیوالی جیسے اہم تہواروں پر جنتا کے نام مبارک باد کا پیغام جاری کرکے ان کو مذہبی اور لسانی اتحاد کی تلقین کرتا ہے۔ جشن جمہوریہ پر ہندوستانی جمہوریت زندہ باد اور آزادی کی سالگرہ پر آزادی پائندہ باد کے نعرے لگاتا ہے۔ اگر راشٹرپتی یا وزیراعظم کے استقبال اور وداع کی تقریبوں کے لئے وہ دعوت نامہ حاصل کرنے میں ناکام رہے تو اپنے گھر بیٹھے بیٹھے ہی وہ ان کے لئے خیرمقدمی یا وداعی بیان اخباروں کو بغرض اشاعت بھیج دیتا ہے اور وہ بھی اپنی طرف سے نہیں تمام شہریوں کی طرف سے گویا کہ وہ ان کا چہیتا نمائندہ ہے۔
اگر وہ اپنے گھر کے سامنے والی نالی کی مرمت کی درخواست لے کر بلدیہ پہنچے تو اخبار میں یہ بیان دیتا ہے کہ اس نے بلدیہ کمشنر سے مل کر ان کی توجہ محلے کی صفائی کی ضرورت

کی طرف مبذول کروائی۔ اور کمشنر صاحب نے انھیں جلد ہی اس طرف رجوع ہونے کا تیقن دلایا ہے۔

ایسے شخص کی گھر کی حالت بے شک دگرگون ہو۔ اسے دن میں دو وقت کا کھانا پہلے ہی نصیب نہ ہو۔ اس کے گھر میں چاہے پتلی سی دال جوتیوں میں بٹتی ہو۔ لیکن اسے شہرت کی دھن زندہ رکھے رہتی ہے۔ اس کا یہ عقیدہ رہتا ہے کہ اور نہیں تو کم از کم اس کے دو بیانات۔ ایک پیغام اور ایک تصویر فی ہفتہ جنتا کو ضرور پہنچنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو تو جنتا کا برا حال ہو جائے گا۔

شہرت میں کیا رکھا ہے اور اس کے حصول کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ اس کا شاید ایسے لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ تو گمنامی کی برکات پر غور نہیں کرتے۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شہرت کے لئے انسان کو اپنا دل۔ دماغ۔ اپنا جسم۔ اپنا وقت۔ اپنی مدح اور اپنا ضمیر دوسروں کو بیچنا پڑتا ہے۔

ویسے ضمیر کا بیچنا کوئی آسان کام نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنا ضمیر بیچنے جائیں تو خریدنے والے صاحب کہتے ہیں۔ نہیں صاحب ہم تو خود اپنا ضمیر بیچنے کی فکر میں ہیں۔ آپ کا ضمیر لے کر کیا کریں گے ــــ ہاں اگر خود ہمارا ضمیر کہیں بک گیا تو پھر خرید لیں گے۔ یا آپ کا ضمیر بھی بکوا دیں گے۔ اگر کوئی شخص ضمیر خریدنے کے موقف میں ہو بھی تو آپ کا ضمیر تنول کر۔ تول تال کر ایک لمبی سانس بھر کر کہتا ہے: "معاف کیجیئے۔ آپ کا ضمیر تو کچھ بوجھل سا دکھائی پڑتا ہے۔ ہمیں تو کسی ہلکے پھلکے ضمیر کی تلاش ہے۔" ضمیر کا بیوپاری بے چارہ اپنا سا منہ لے کر واپس ہوتا ہے اور کسی اور خریدار کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔

دماغ کے خریدار تو بہت ہیں لیکن یہ ایک ناپید شے کے مترادف ہے۔ جیسے بوجھل ضمیروں کی بہتات ہے ویسے ہی ہلکے دماغوں کی بھی بھرمار ہے۔ لیکن ہلکے دماغوں کی مانگ نہیں۔

دل کو بیچنا تو غالب نے فیشن ایبل بنا دیا تھا۔ بقول خود وہ اک بازار میں جا کر نئے دل اور جان خرید لایا کرتے تھے آج کل تو جان بہت سستی ہو گئی ہے اور دل مفت ملتے ہیں۔ اس لئے دل اور جان کے بیچنے والوں کو بھی معقول فائدے کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

جسم کا بیوپار تو بہت پرانی بات ہے۔ جسم بکتے بکتے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور پھر جلا یا دفنا دیئے جاتے ہیں۔

ہمیں جسم۔ دل و دماغ۔ مدح اور ضمیر بلکہ کپڑے لتے اور پرانے جوتے بیچنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اگر آج کے زمانے میں کسی شخص کو ان چیزوں کی قیمت مل سکتی ہے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ بیچ کر بھی شہرت نہ ملی تو کیا فائدہ ہوا؟

کبھی آپ نے گمنامی کی برکتوں پر غور کیا ہے۔ کبھی آپ نے یہ سوچا ہے کہ مشہور لوگوں کو اپنے وقت۔ اپنے دل و دماغ اپنی ذات۔ اپنی زندگی پر کتنا کم اختیار ہوتا ہے۔ ادھر سورج طلوع ہوا۔ ادھر ان کے گھر اہل غرض کا تانتا لگ گیا۔ ایک صاحب مصر ہیں کہ آپ ان کے بیٹے کی نوکری کے لئے فلاں صاحب سے سفارش کریں۔ دوسرے صاحب کا تقاضا ہے کہ ان کے داماد کو کنٹریکٹ دلوانے کے لئے آپ فوراً ان کے ساتھ فلاں عہدے دار کے گھر چلیں۔ کوئی صاحب آپ سے فون پر فوری ہدایات جاری کروانا چاہتے ہیں۔ کسی سائل کو مالی امداد کی ضرورت ہے تو کوئی انصاف کے نام پر اپنا حق مانگتا ہے۔ آپ عذر کرتے ہیں کہ میرے پاس گاڑی نہیں تو وہ ٹیکسی پیش کرتے ہیں۔ آپ نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تو وہ آپ کو ایرانی ہوٹل میں ناشتہ کروانے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ اگر ابھی تک نہائے نہیں تو وہ اپنے ہاتھوں سے آپ کو نہلانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ اہم شخص کا گمنام شخص کے سامنے کوئی عذر نہیں چل سکتا اور بالخصوص اگر اس نے آپ کو ووٹ دیا ہوا ہو۔

ہماری زندگی میں بے شمار باتیں یا حرکتیں ہیں جو کبھی نہ کبھی ہم سب کرنا چاہتے ہیں اور جن سے ہماری آزادی کو معانی ملتے ہیں۔ مثلاً آپ ایرانی ہوٹل میں چائے پینا چاہتے ہیں۔ کسی تھرڈ کلاس تھیٹر میں فلم دیکھنا چاہتے ہیں۔ حیدرآباد کے جمعرات بازار

چوری کا مال خریدنا چاہتے ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد مارکٹ سے کباڑے کا مال لینا چاہتے ہیں۔ محبوب کی مہندی جاکر غزلیں اور قوالیاں سُننا چاہتے ہیں۔ چلتی ہوئی بس پر چھلانگ کر چڑھنا چاہتے ہیں۔ گاڑی میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا چاہتے ہیں۔ دل میں آئے تو رکشا کی سواری کرنا چاہتے ہیں۔ برسات کے موسم میں کپڑے اتار کر دل بھر کر مینہ میں نہانا چاہتے ہیں۔ راہ چلتی حسیناؤں پر آوازے کسنا چاہتے ہیں۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے نہایت بے ڈھنگے پن سے فلمی گیت گانا چاہتے ہیں۔ گاتے گاتے گلا سوکھ جائے تو وہیں نل سے چلّو میں پانی پینا چاہتے ہیں پانی پیتے پیتے دل دکھی ہو جائے تو اس چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہتے ہیں۔ خودکشی کا ارادہ ترک کرتے ہی سامنے کوئی کتا نظر آتا ہے تو اسے ایک پتھر اٹھا کر مارنا چاہتے ہیں۔ پاس بیٹھی گائے کی دُم مروڑ کر اسے وہاں سے اٹھانا چاہتے ہیں۔ نکڑ والی پان کی دوکان پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کی پالیٹکس پر رائے زنی کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں سے بور ہو گئے تو مداری کے مجمع میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔!

ایسی بیسیوں بلکہ سیکڑوں اور حرکتیں ہیں جن کا ارتکاب ہم سب کبھی نہ کبھی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ گمنام شخص ہیں تو آپ سب کچھ کر سکتے ہیں اور کوئی پروا نہیں کرے گا۔ لیکن اگر آپ کا نام ہے۔ آپ مشہور شخص ہیں۔ معزز ہستی ہیں۔ لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ آپ کی تصویروں سے آپ کو پہچانتے ہیں تو آپ کے ارمان دل ہی دل میں رہ جائیں گے۔ آپ اپنی بے شمار معصوم حسرتوں میں سے کسی کو بھی پورا نہیں کر پائیں گے۔ اور کر بھی کیسے پائیں گے۔ بس میں چڑھیں گے تو کنڈکٹر پوچھے گا۔ کیوں صاحب۔ آج آپ کی گاڑی خراب ہو گئی کیا جو یہ زحمت کی آپ نے۔ رکشا لیں گے تو رکشا ران پھولا نہیں سمائے گا۔ "واہ صاحب اب تو ہم بھی کہہ سکیں گے کہ اس رکشا میں بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں"۔ محبوب کی مہندی کی طرف سے گزرے بھی تو آپ کی تصویر لے لی جائے گی۔ جس سے آپ کا بلیک میل ہو سکتا ہے۔ بازار کا قصد بھی کیا تو اگلے دن اخبار میں خبر چھپ جائے گی کہ اس شہر میں چوروں کا ایسے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے۔

نام آور شخص ایسی کوئی حرکت اپنے شہر میں نہیں کر سکتا۔ اگر وہ نامی گرامی شخص ہے تو شہر میں تو کیا اپنے ملک میں بھی نہیں کر سکتا اس لئے حکومت ایسے لوگوں کے لئے گاہے بگاہے بیرون ممالک کے دوروں کا انتظام کرتی ہے تاکہ یہ بے چارے لوگ گھٹن سے ہی نہ مر جائیں۔

نام آور شخص آرام سے اپنے بیوی بچوں سے بات بھی نہیں کر سکتا اس کے برعکس گمنام آدمی نہ صرف اپنے بیوی بچوں بلکہ دوسروں کی بیویوں اور بچوں کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ کسی بھی جلسے جلوس میں شریک ہو کر کسی کے خلاف یا کسی کی حمایت میں پُر زور نعرے لگا سکتا ہے کیوں کہ اس کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔ وہ تمام دن راشن کی دوکان کے کیو میں کھڑا رہ سکتا ہے اور کوئی اسے پہچانے گا نہیں۔ وہ اپنے بچوں کے لئے دودھ کی تلاش میں در بدر بھٹک سکتا ہے اور کوئی اسے دودھ نہیں دیگا وہ بسوں کے پیچھے دوڑ دوڑ کے اپنی صحت بنا سکتا ہے اور کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ گمنام انسان کی اہمیت نہیں۔ ہر اسکیم۔ ہر پراجکٹ۔ ہر منصوبہ اس کی ضروریات۔ اس کے نظریئے۔ اس کی امیدیں اور اُمنگیں سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے۔ ہر الیکشن سے پہلے بڑے سے بڑا آدمی گمنام صاحب کے پاس جاکر اس سے ووٹ کی بھیک مانگتا ہے۔ ہر تقریر میں۔ ہر مباحثے میں۔ گمنام کا ذکر آتا ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے لوگ اس کے سر کی قسم کھاتے ہیں۔ وہ کامن مین۔ کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اسے اپنا ضمیر۔ اپنا دل۔ اپنا دماغ۔ اپنا جسم۔ کچھ بھی نہیں بیچنا پڑتا۔ صرف کبھی کبھی گردن دیکھنا پڑتا ہے۔ کامن مین آزاد ہے۔ وہ سراد بچا کر کے کہیں بھی جا سکتا ہے۔ اسے عوام کی قوم کی ملک کی کوئی فکر نہیں۔ اسے صرف اپنی ذات واحد اور ______ اپنے کنبے کی خوشحالی کی فکر ہے۔

ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ گمنامی کی یہ تمام برکتیں نظر انداز کر کے لوگ نہ جانے شہرت کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں۔ ■■

غزل

مظفر حسین جوہر سیوانی

وہ میری ڈیڑھ آنکھوں سے کیا کیا دکھائی دے / سیدھا دکھائی دے کہ جو الٹ
پتلون ہے غرارہ تو جمپر بھی ہے قمیض / فیشن کا رنگ اور بھی چڑھتا
اب سر پر اوڑھنی ہے نہ ہاتھوں میں چوڑیاں / لڑکی بھی آج کل مجھے لڑکا
ہیرو کبھی جو چھیڑ دیے کالج کی گرل کو / کالج کے گیٹ پر ہی وہ پٹتا
جدت کا ہے کمال کہ شاعر کو آجکل / سورج کو چونچ میں لیے مرغا
کوچے سے اُن کے یوں گزرنا بھی ہے محال / مجھ پر ہی اُن کا بھونکتا کتا
گو باپ تھرڈ کلاس ہی میں دیکھتے ہیں فلم / بیٹا تو فرسٹ کلاس میں بیٹھا
اس دور کی ہے دین کہ کرسی پر آجکل / آنکھوں کا اندھا گانٹھ کا پورا
پتلون دس ہی روپئے کا بیگم کو ہے گراں / سایا مگر پچاس کا سستا د
جیسے ادب کی بزم بھی بازارِ شعر ہو / شاعر غریب واہ پہ بکتا د
شاعر غریب کا ہے عجب حال بزم میں / ہوٹنگ کا حملہ ہو تو اکیلا د
اک ہم نے لاٹری کی ٹکٹ کیا خریدلی / ہر رات ایک لاکھ کا سپنا د

جوہر کا ہر کلام تبسم نواز ہے
روتا ہوا جو آئے وہ ہنستا دکھائی دے

غزل

رام لعل نابھوی

میں جا رہا تھا سیر کو پھولوں کے باغ میں / دیکھا تو ایک زن تھی جو زن سے نکل گئی
میں دیکھتا ہی رہ گیا اور دیکھتا رہا / اور دیکھنے نہ پایا تھا دن سے نکل گئی
رنگ اس کا صندلی تھا کہ سرخ و سپید تھا / میں جانچ بھی سکا نہ کہ چھن سے نکل گئی
زلفیں گرائے دوش پہ جاتی تھی شوخ و شنگ / انداز دلبری لیے ٹھن سے نکل گئی
قد اس کا سرو سا تھا قیامت کی چال تھی / وہ چھب کو لیکے آئی چھبن سے نکل گئی
جاذب نظر لباس کی تنگی نہ پوچھیے / وہ مسکرا کے حسنِ بدن سے نکل گئی
محسوس یوں ہوا ابھی نکلا ہو ماہتاب / یا جیسے چاندنی ہو گگن سے نکل گئی
بچنا تو اس کا ہاتھ سے میرے محال تھا / پُر فن تھی وہ حسینہ پہ فن سے نکل گئی
پہلو سے میرے کوند کے بجلی وہ اس طرح / گویا کہ میری جان بھی تن سے نکل گئی
بچ جاتا اضطراب سے بنتا جو دوڑ کر / من میں یہ بات آئی بھی من سے نکل گئی
میں نے چھپانا چاہا بہت پر نہ چھپ سکی / اب کیا کروں جو بات دہن سے نکل گئی
یہ بات مختصر تھی مگر پھیلتی ہوئی / ایران و مصر و روم و ختن سے نکل گئی
جب رام لعل اپنے سلیپر اٹھا لیا / اک تھرتھری سی میرے بدن سے نکل گئی

محفل عقد میں دیر ایک وبا کی طرح پھیل
گئی ہے۔ اسے قاضی فلو کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے
کہ پہلے قاضی صاحبین دیر پیشہ بن گئے۔ پھر دولہے وقت کی پابندی سے لاپروا
ہو گئے۔ نتیجتاً مہمان۔ فرنیچر والے، روشنی والے، پھول والے سب ہی اس لعنتی چکر کی
لپیٹ میں آگئے۔ اب تقریب کا وقت چھ بجے مقرر ہو تو انتظامی کارندے سات بجے حرکت
میں آتے ہیں۔ آٹھ بجے قاضی صاحب کو کسی دوسری محفل عقد سے اغوا کرکے لایا جاتا ہے اور
نو بجے دولھا نمودار ہوتا ہے۔ وقت کے پابند یا ایک سے زائد تقریبوں کے مہمان تو رخصت ہو چکے
ہیں البتہ چند ناقبت اندیش مہمان دس بجے رونق افروز ہو کر محفل عقد میں بر وقت شریک رہتے ہیں۔
دولھا کے دیر سے آنے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ رشتہ اس کے بزرگ طے کرتے ہیں اور بزرگوں
کو دلھن سے زیادہ گھوڑے جوڑے کی رقم سے زیادہ سروکار ہوتا ہے۔ دولھا کی پسند ناپسند
پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور برات اس دروازہ پر رکتی ہے جہاں جھولی بھری جاتی ہے
دولھا ریس کا وہ اڑیل گھوڑا ہوتا ہے جسے آنکھوں پر ڈھکن چڑھا کر میدان میں گھسیٹ
لایا جاتا ہے ایک اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عقد کا انصرام مبارک گھڑی کا
پابند نہیں ہوتا۔ اس لیئے یہ دیر کی اندھیر مچتی ہے۔ میرے نزدیک
ہر گھڑی مبارک گھڑی ہے۔ اگر وقت کی
قدر و قیمت کا احساس ہو۔
اس ضمن میں میرے ایک
دوست کی پریشانی کا حال
سنیئے۔ ان کی لڑکی کی شادی
کے لئے مبارک گھڑی نکلی
رات کے دو بجکر اکیا دن
منٹ گیارہ سکنڈ۔ اب سوال دیر سے آنے کا نہ تھا۔ اندیشہ یہ لاحق تھا کہ
دولھا سویرے سے بیخر غافل نہ ہو جائے۔ اس امکان کی روک تھام کے لئے
دولھا کو کسی رسم کے بہانے سر شام ہی طلب کر لیا گیا۔ اور اسے شادی کی
مبارک گھڑی تک زیر حراست رکھا گیا۔

آنا دولھوں کا دیر سے! ـــــــ رشید قریشی

اس کے برخلاف دولھوں کی بے صبری کا وہ زمانہ بھی میں نے دیکھا ہے کہ وقت پر موجود رہنے کی دُھن میں سویرے ہی دولھن کے گھر جا دھمکتے ___ اور رات دیر گئے دھرنا دیئے بیٹھے رہتے۔ یہاں تک کہ دولھن والے خود بیزار ہو کر دولھن ان کے حوالے کر دیتے۔ ایک شادی میں جب عملدرآمد دولھا دیر سے پہنچا تو دولھن کی نانی نے حسرت ناک لہجے میں تبصرہ کیا۔ ہائے اب وہ دولھے کہاں رہے۔ یہ تو مارے پیٹ کے ٹٹو ہیں۔ آخر ان سے کہا جائے اتنی دیر لگا دی آنے میں اب دولھن کو رہنے بھی دو جہیز لیتے جاؤ۔ تو وہ بخوشی راضی ہو جائیں۔ میں نے ان کو سمجھایا نانی اماں آپ اس زمانہ میں لڑکی ہوتیں تو آپ کی شادی ہی نہ ہو پاتی۔ آپ کے والدین اپنی محنت کی کمائی لڑکے والوں کی نذر نہ کرتے اور آپ کنواری ہی اس دنیا سے اُٹھ جاتیں۔ دیر سے گیا تو کیا دولھا ہے اور پھر اس کے دماغ پر امریکہ کا سورج چمکتا ہے۔ آپ دولھن کو روک کر جہیز لے جانے کو کہتی ہیں وہ ہرگز نہیں مانے گا۔ وہ جہیز بھی لیجائے گا اور دولھن کو بھی۔ البتہ جہیز کو ٹھکانے لگا کر امریکہ جانے سے پہلے وہ آپ کی نواسی کو ضرور آپ کے پاس چھوڑ جائے گا۔

ایسا ہی مشورہ میں اپنے ایک وظیفہ یاب کرنل دوست کو بھی دینا چاہتا تھا۔ وہ بہت چراغ پا ہو رہے تھے کہ اتنی دیر ہو گئی دولھا ندارد۔ میں نے ان کو سمجھایا۔ بھائی میرے دولھا دور دراز کے ایک عرب ملک سے آ رہا ہے۔ دیر سے آئیگا ہی۔ طیش میں آنے کی کیا بات ہے۔ آج اس کے ناز اٹھا لو۔ کل گولی مار دو۔ کہنے لگے میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو میرے سارے مہمان کھسکتے جا رہے ہیں۔ میں آج ہی گولی مار دوں گا..... میں نے صرف آدھے گھنٹے کی مہلت لی۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دولھا نہیں آیا۔ یہ منظر ہو گیا کہ خالی کرسیوں کی اداسی روشنیوں کو دھندلانے لگی اور مسند پر جھولنے والی پھولوں کی لڑیاں آنسوؤں کی دھاریں بن گئیں۔ اتنے میں دور سے بیانڈ کی آواز اُبھری۔ کرنل صاحب گرج اُٹھے۔ پھاٹک بند کر دو۔ کرنل صاحب کو تھامنے کے لئے دولھن کی ماں اور اس کی دو خالائیں باہر نکل آئیں۔ لیکن کرنل صاحب کے آگے کسی کی کچھ پیش نہ گئی۔ ایسا نظر آتا تھا وہ میدانِ جنگ میں ہیں اور فوج کو حملہ کا حکم دے چکے ہیں۔ برات پھاٹک پر رُکی۔ کسی نے پکارا ابھی کرنل صاحب دھینگانہ کی اس واہیات رسم کا اب کونسا موقع ہے۔ پھاٹک کھلوائیے۔ کرنل صاحب مضبوط قدم ڈالتے ہوئے پھاٹک تک گئے۔ "پھاٹک نہیں کھلے گا۔ برات واپس جائے گی" کرنل صاحب کے اس اعلان پر دولھا والوں کی طرف سے کچھ ناشائستہ فقرے کسے گئے تو کرنل صاحب نے جیب سے پستول نکال لیا۔ بیانڈ بند ہو گیا۔ کرنل صاحب پھاٹک کھول کر باہر نکلے "یہی ہے تمہاری وقت کی پابندی۔ شادی کے لئے نکلے ہو یا ڈاکہ ڈالنے۔ دولھا کے والد گڑگڑانے لگے۔" جی وہ کرنل صاحب قبلہ دیکھیے ایسا ہوا کہ آپ کے پاس موٹر کے آنے میں کچھ دیر ہو گئی اور کچھ میرے سالے صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ پھر یہ حادثہ ہوا کہ بیانڈ والوں کو ڈبل سواری کے جرم میں پولیس والوں نے پکڑ لیا ان کو چھڑا لانا پڑا۔ اور آپ دیکھیے اس طرح کچھ ... ذرا ..... دیر ...... کل چوتھی کی دعوت میں مطلق دیر نہیں ہوگی۔ انشاء اللہ۔ کرنل صاحب غصہ کو چباتے ہوئے خاموش کھڑے رہے۔ کرنل صاحب کو خاموش دیکھ کر دولھے کے بے تکلف دوست اندر جانے کے لئے آگے بڑھے۔ کرنل صاحب پھنکار سے "کوئی آگے نہ بڑھے"! انہوں نے پستول کی نالی موٹر کی پچھلی نشست کی طرف جما دی.... "اترو سب اترو۔ دولھے... تم بھی اُترو" اور دولھا اس کے تین بھائی۔ دو بہنوئی۔ ایک خالو۔ ایک نانا... ایک کے بعد ایک سب موٹر سے اُتر گئے۔ کرنل صاحب نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ خالی موٹر اندر لیجائے۔ جب موٹر اندر چلی گئی انھوں نے بیانڈ والوں کو للکارا "بجاؤ"! بیانڈ بجنے لگا..... اس کے بعد کرنل صاحب نے بدحواس براتیوں کی طرف دیکھا۔ "پلٹ جاؤ" سب اس طرح پلٹ گئے جیسے لٹو گھومتا ہے۔ "تیز چلو"! حکم کی دیر تھی۔ رفتار تیز ہو گئی۔ کرنل صاحب چیخ اُٹھے۔ "بھاگو" اور ہوا میں اپنا پستول داغ دیا دھائیں! ایسا

جیسے دو سو براتی صرف دو ٹانگوں سے دوڑتے ہوئے سڑک کی پہلی موڑ کے نیچے میں غائب ہو گئے۔ میں دیر تک کرنل صاحب
ساتھ بیٹھا رہا۔ زنانہ میں سے کسی کے رونے کی صدا بلند ہوئی تو کرنل صاحب اٹھ کھڑے ہوئے "ان ناسمجھوں کو سمجھانا پڑیگا
خریدی نہیں جاتی۔ یہ پھول کی طرح اپنے آپ ٹہنی سے دامن میں آگرتی ہے۔ میری بیٹی کی قسمت کا پھول ابھی نہیں کھلا ہے
اور انتظار کرنا ہوگا۔ رونا نہیں ہوگا۔ کرنل صاحب پستول لیئے ہوئے زنانہ میں گئے۔ تو رونے کی آواز اس طرح بند ہو گئی
فوارہ پر ڈاٹ لگا دیا گیا۔ چند ہی دن بعد ایسا اتفاق ہوا کہ اس شادی خانہ میں مجھے ایک شادی کی ہی تقریب میں شریک
پڑا۔ اس شادی کے لئے عقد کا وقت چھ ساعت شام تھا۔ میں گھر میں بیکار پڑا تھا اس لئے وقت کی پابندی کے لیے
ہو گیا۔ ٹھیک چھ بجے میں شادی خانے کی پھاٹک پر تھا۔ اندر پہنچا تو ایک اداس سکون چاروں طرف تباہی کے طوفان
پہلے کا سکون جیسے پھول والے تازہ فلمی گیت گنگناتے مسند پر پھولوں کا شامیانہ آراستہ کر رہے تھے۔ میں اپنی وقت
بندی کی حماقت پر نفرین بھیج رہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے پہلے یہ اور اکیلے مہمان کی اذیت ناک درگت میں مبتلا ہو گیا۔ اتنے
دروازہ جیسے توڑا گیا اور ایک ضخیم خاتون باہر آئیں۔ یقیناً وہ دلھن کی والدہ تھیں۔ ان کے سیدھے ہاتھ میں ایک سُرخ
نی تھی۔ اور بلاؤز کے جھروکے سے سو سو کے نیلے نیلے نوٹ جھانک رہے تھے۔ میرے ذہن میں نہ جانے کیوں یہ
کوند گیا کہ اگر ان کا سر قلم کیا جائے تو ان کے جسم سے ایک چلتی پھرتی الماری بن سکتی ہے۔ اس خیال نے مسکراہٹ کی
اختیار کی تو ایک پہاڑ مجھ پر لڑھک گیا۔ وہ خاتون حکمران لہجہ میں مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ اجی تم کیا ٹانگ پہ ٹانگ ڈال
صوفہ پہ مسکراتے بیٹھے ہیں۔ چلو اٹھو جاؤ دولھے کی موٹر سجاؤ۔ چلو اٹھو ... میں سہم کر کھڑا ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ مہمان
حیثیت میں اپنا تعارف کراؤں۔ سمجھاؤں کہ پھول والے کا بشرٹ اگر میرے بشرٹ سے ملتا جلتا ہے تو میں لازمی طور پر پھول
ار نہیں پا سکتا۔ میری وجاہت قطعی پھول والے کی نہیں ہے۔ میں ایک مہذب قابلِ اعتماد گھڑی کا مالک" اور وقت کا پابند
ن ہوں۔ لیکن جب موت کے پہیوں کی طرح وہ آنکھیں گھومنے لگیں میں سر جھکائے باہر نکل گیا۔ پھاٹک کے پاس کھڑے
میں اپنے آپ کو لتھاڑنے لگا۔ ہاں۔ ہاں تو اس ذلت کا مستحق تھا کیوں کہ تو وقت کی پابندی کرنے چلا تھا۔ بڑا
ڑیال کا کانٹا۔ بے شک تجھ سے دولھے کی موٹر سجوانا چاہیئے۔ تجھ سے دولھا کے جوتے اٹھوانا چاہیئے۔ تجھے دھکے مار
شادی خانے سے باہر ڈھکیل دینا چاہیئے۔ وقت پر آتا ہے ابن الوقت۔ اور میں نے بہ آواز بلند اعلان کیا" مجھے اپنی
دں میں مدعو کرنے والا ... تم سے میری التجا ہے کہ اگر میں وقت پر شریکِ تقریب ہونے کا مرتکب ہوا تو تم مجھے بلا
دپیش قریب ترین پولیس اسٹیشن میں پہنچا دو ۔ ۔ ۔ !!"

ناچیز کی دعائے نیم شبی

وطن کو شر سے بچائے خدا، دعا ہے یہی — ہر اک ضرر سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
زمین و زن کی ہوس بھی بری بلا ہے، مگر — ہوائے زر سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
شرارِ آتشِ دوزخ بھی ہے قبول مجھے — بشر کے شر سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
جھکے نہ در پہ کسی کے کبھی ہماری جبیں — جبیں کو در سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
گئے تھے غیر کے گھر ایک بار بھر پایا — پرائے گھر سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
بھلے کو ہم سے بگڑ جائیں وہ۔ مگر اُن کی — اگر مگر سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
ادھر ہے غیر کا گھر، خانۂ رقیب اُدھر — اِدھر اُدھر سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
یہ رنگ روپ، یہ قامت، یہ دن جوانی کے — بری نظر سے بچائے خدا، دعا ہے یہی

بڑی خوشی ہے بشر بنے ہو تم ناچیز
تمہاری ٹر سے بچائے خدا دعا ہے یہی

ناچیز کی دعائے سحری

مقدموں سے بچائے خدا، دعا ہے، یہی — عدالتوں سے بچائے خدا، دعا ہے، یہی
بگاڑ دیتی ہیں دم بھر میں بنتے کاموں کو — کمیٹیوں سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
میں ایک بار کو کر لوں گا دشمنوں کو قبول — منافقوں سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
وہ میری جانِ تمنا سہی، مگر اُن کے — مطالبوں سے بچائے خدا، دعا ہے یہی
نہ کھونٹیاں، نہ دریچے، نہ طاق نہ آنگن — نئے گھروں سے بچائے خدا دعا ہے یہی
مذاق بگڑا تو بگڑا تھا شعر بھی بگڑا — مشاعروں سے بچائے خدا دعا ہے یہی

کمر خمیدہ ہوئے اُن کے عشق میں ناچیز
تہی قدوں سے بچائے خدا، دعا ہے یہی

کالج میں پڑھ کے عشق میں بے باک ہو گئے — ٹھنڈے ہوئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے گفٹ کتابیں ہوئیں تمام — تھے دو ہی امتحان سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر ہو گئے گو لیڈری سے ہم — یارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ عاشق کو بے اثر — پردے حریم حسن کے سب چاک ہو گئے
اہلِ ہوس کے پاؤں کہاں عشق میں جمے — سیلاب حسن کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اس سے تغافل پہ ہم ڈیٹ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

پٹوا دیا کچھ اس طرح اس نے رقیب کو

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

مُدیر شگوفہ کا مُراسلہ
ملا کہ مجھے شگوفہ کے سالنامہ کے لئے کچھ نہ
کچھ لکھنا ہوگا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ میں ٹھہرا محض ایک تک بند اور
مدیر شگوفہ کی خواہش غالباً یہ ہے کہ میں کچھ نثر میں لکھوں۔ حیران ہوں لیکن پریشان نہیں
ہوں۔ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ اگر کسی رسالے یا جریدے کو ذرا سی بھی کامیابی حاصل ہو جائے تو اُس
کے مُدیر اپنے آپ کو ہٹلر سے کم نہیں سمجھتے اور یہ کبھی ان کے ذہن میں آہی نہیں سکتا کہ کوئی سر پھرا ان کے حکم کی تعمیل کرنے سے
انکار بھی کر سکتا ہے۔ مجھے تقسیم وطن سے پہلے کا ایک ریاست کا قصہ یاد آ رہا ہے۔ اس ریاست کے رہنے والے چیفس کالج لاہور میں
میرے ایک ہم جماعت تھے اور دوست بھی۔ ایک شریف اور مقتدر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور امیر سلطنت کے عزیزوں میں
سے تھے۔ چیفس کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر مزید تعلیم کے لئے ولایت چلے گئے اور وہاں سے انجینئر بن کر لوٹے۔ آتے ہی انھیں
رجسٹرار کو آپریٹیو سوسائٹیز بنا دیا گیا۔ انھوں نے ہر چند واویلا کیا کہ وہ ایک انجینئر ہیں کو آپریٹیو سوسائٹیز سے انھیں کیا واسطہ لیکن اُن
کی ایک نہ سنی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد انھیں سول سرجن کے عہدہ پر فائز کر کے ریاست کے صدر ہسپتال کا انچارج بنا دیا گیا۔ جب ان کی
حرکت سے قبرستانوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تو انھیں کپتان پولیس مقرر کر دیا گیا۔ امیر ریاست چونکہ دوست تھے اُن سے
عرض کیا گیا کہ قبلہ ہمارے دوست سے ایسا برتاؤ آخر کیوں ہو رہا ہے تو فرمانے لگے کہ لڑکا ذہین ہے اس
لئے میں چاہتا تھا کہ اسے ہر محکمہ کے کام سے واقفیت ہو جائے۔ پھر گزارش کی کہ
اب ہرن پر کافی دیر گھاس لادی جا چکی ہے اسے اپنے اصلی
محکمے میں لے آیئے تو فرمایا کہ ابھی اسے
انسپکٹر، جنرل جیل خانہ جات

بنانا ہے اس کے بعد اس کے اصلی محکمہ یعنی محکمۂ انہار و آب پاشی میں منتقل کر دیا جائے گا۔ اب میں بھی اسی سوچ میں ہوں کہ کس کس کو لکھوں۔ جو کچھ بھی لکھنا ہوگا قلم برداشتہ لکھنا ہوگا۔ لیکن وقت کوتاہ ہے سبھی چونکہ قصہ طولانی نہ ہوگا اس لئے حاضر ہوں۔

تو سنئیے میں اپنی ملازمت کے دوران سے ہی چند واقعے بتاتا ہوں جن میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میری تعیناتی ایک ایسے پہاڑی ضلع میں ہوئی جو بہت خوبصورت اور تاریخی مقام تھا اور جہاں ملک کے کونے کونے سے لوگ سیر و تفریح کے لئے آتے تھے۔ وہاں نزدیک ہی ایک متبرک استھان بھی تھا جس کی یاترا کے لئے دور دراز سے لوگ آتے تھے۔ میں نے سوچا کہ لوگ تو دور دور سے آتے ہیں اور میں نزدیک ہو کر بھی اگر وہاں درشن کرنے نہ گیا تو "چراغ تلے اندھیرا" کی مثال ہوگی۔ چنانچہ میں نے وہاں اطلاع کرا دی کہ میں فلاں فلاں دن فلاں وقت وہاں آرہا ہوں جب میں وہاں پہنچا تو تحصیلدار۔ ذیلدار۔ نمبردار سرپنچ وغیرہ سب موجود تھے اور میرا اچھا خاصا جلوس نکال کر استھان پر لے گئے۔ راستے میں تحصیلدار نے مجھ سے کہا کہ پجاری جی کی یہ خواہش ہے کہ آپ دن کا کھانا اُن کے ساتھ کھائیں اور وہ جس کی دل سے عزت کرتے ہیں اُسے اپنے ہاتھ سے مرغ پکا کر کھلاتے ہیں۔ میں نے تحصیلدار سے پجاری جی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کہا اور کہا کہ اُن سے [illegible] نیکی اور پوچھ پوچھ۔ لنچ یقیناً پجاری جی کے ہاں کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہم سب لوگ اشنان وغیرہ میں مصروف ہو گئے۔ اور ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ پجاری جی کے چوبدار نقرئی چوب لئے اور نرسنگھے لیکر آن کھڑے ہوئے اور کہا کہ پجاری جی لنچ کے لئے انتظار کر رہے ہیں۔ ہمیں پھر ایک جلوس کی شکل میں پجاری جی کے خلوت کدہ تک پہنچایا گیا۔ میرے ہمراہ میرے ایک بزرگ بھی تھے جو رشتے میں میرے پھوپھا ہوتے تھے لیکن بزرگ ہونے کے باوجود دوست بھی تھے اور بے تکلف بھی۔ پجاری جی کا خلوت کدہ ایک اچھا خاصا محل تھا اور عمارت کا آئینہ دار۔ کھانے کے کمرے کی آرائش میں کم خواب۔ زربفت۔ مخمل۔ ریشم کی فراوانی تھی۔ چاندی کی چوکیاں چاندی کے گلاس تھال اور کٹوریاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ باوردی خدام باادب باملاحظہ کھڑے ہوئے تھے غرض کہ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی راجہ مہاراجہ کے دولت کدہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ملازمین نے دسترخوان چننا شروع کیا ہی تھا کہ ہمارے پھوپھا نے اپنے چرمی اسکاچ وہسکی کی بوتل نکالی اور دھڑام سے چوکی پر رکھ دی۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ ہمارے پھوپھا ایسا کریں گے۔ لیکن اب ہو بھی کیا سکتا۔ ایک طرف تو یہ خوف کہ کوئی ٹوک نہ دے دوسری طرف اپنے بزرگ کا پاس۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ قہرِ درویش برجانِ درویش۔ میں منہ پھیر کے خاموش ہو کے بیٹھ گیا جیسے میں نے دیکھا ہی کچھ نہیں۔ ہر آن یہی دھڑکا تھا کہ اگر کسی نے کہہ دیا کہ صاحب اس جگہ شراب کیسے پی جا سکتی ہے تو بے عزتی ہوگی۔ اب پھوپھا جان نے بوتل نمائش کے لئے تو رکھی تھی ہی نہیں۔ انھوں نے اُٹھا کر گلاسوں میں انڈیلنا شروع کیا۔ جب پجاری جی کے گلاس کی باری آئی تو میں نے سمجھا کہ اب ضرور کوئی نہ کوئی گل کھِلے گا۔ پجاری جی کے کئی معتقدین وہاں موجود تھے لیکن سب کے سب خاموش رہے گو گھور گھور کر دیکھ ضرور رہے تھے۔ ایک حقیقت کا ذکر بیان کر دینا ضروری ہوگا کہ بڑے سے بڑا دریانوش بھی گلاس میں تھوڑی سی شراب ڈالنے پر بھی بس بس کہہ دیتا ہے خواہ اس طرح کے درجنوں پیگ پینے کا ظرف رکھتا ہو۔ ایسا کہنا جملۂ آداب بادہ نوشی کا ہے۔ ادھر پجاری جی ہیں کہ ان کا آدھے سے زیادہ گلاس نیٹ وہسکی سے بھر دیا گیا ہے اور وہ خاموش ہیں ٹس سے مس نہیں ہو رہے۔ ہم سب نے سمجھا کہ پجاری جی اُن معصوم لوگوں میں سے ہیں جن کو دولت نے ابھی تک بگاڑا نہیں ہے چنانچہ میں نے پھوپھا جان سے کہا کہ آپ پجاری جی سے پوچھ تو لیجئے کہ اور وہسکی اُنڈیلی جائے۔ پھوپھا جان نے اسے خلاف آداب عمل جانا اور وہسکی انڈیلی۔ جب قریب قریب سارے کا سارا گلاس نیٹ وہسکی ہی سے بھر گیا تو ہم سب کو یقین ہو گیا کہ پجاری جی شراب کی شکل تک سے واقف نہیں ہیں۔ ان کو علم ہی نہیں ہے کہ یہ کیا شئے ہے۔ آخرکار پھوپھا جان سے نہ رہا گیا

اور انھوں نے پجاری جی سے کہا کہ اور وہسکی انڈیلوں۔ پجاری جی نے نہایت انکساری لیکن سنجیدگی سے جواب دیا کہ نہیں پہلا پگ میں ذرا چھوٹا ہی لیا کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب نے اپنی جادو بیانی سے کوزے میں دریا بند کر دیا۔ میں کہتا ہوں لوگ تو پوری تقریر سے کوزے میں دریا بند کرتے ہوں گے پجاری جی نے صرف ایک جملے سے کوزے میں کتنے ہی دریا بند کر دیئے۔ اب ملاحظہ ہو کہ اس جملے سے یہ ثابت ہو گیا کہ ۱۔ انھیں شراب پینے میں کوئی اعتراض نہیں۔ ۲۔ انھیں دن میں پینے میں کوئی اعتراض نہیں۔ ۳۔ انھیں سب کے سامنے پینے میں کوئی اعتراض نہیں یہاں تک اپنے مریدوں اور معتقدین کے سامنے پینے میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔ ۴۔ وہ صرف ایک پگ پر اکتفا کرنے کے نہیں، ۵۔ اور یہ کہ ان کے معیار کے مطابق نیٹ وہسکی کا یہ تقریب قریب پورا گلاس ذرا چھوٹا ہی پگ ہے۔ اور اب اس کے بعد وہ ذرا بڑے پگ پینگے۔ وغیرہ۔ چنانچہ دور جاری رہا اور پجاری جی جب موڈ میں آ گئے تو گھنگھرو باندھ کر اپنی دیوداسیوں کے ساتھ رقص فرمانے لگے۔ اور یہ رنگین محفل رات ڈھلے تک جاری رہی۔ اس زمانے میں اب ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں!

دوسرا واقعہ اُس دور کا ہے جب میں محکمۂ نشر و اشاعت و اطلاعات کا ڈائرکٹر تھا۔ میرے فرائض منصبی میں سے ایک فرض یہ بھی تھا کہ اگر کوئی برگزیدہ و مقتدر ہستی کا مہمان چندی گڑھ آئے تو اس کی دیکھ بھال کی جائے تاکہ اُسے کسی قسم کی کوئی بھی تکلیف نہ ہو۔ ایک مرتبہ نیپال سے ایک وی آئی پی چندی گڑھ تشریف لائے جن کی خاطر خاص طور پر پنجاب گورنمنٹ کو منظور تھی۔ انھیں دنوں میرے محکمے میں ایک جونیئر آفیسر تھے جن کے بارے میں یہ عام شکایت تھی کہ وہ کام چور ہیں اور باتیں بہت بناتے ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں ایک خاص رپورٹ ارسال کرنے کے لئے کہا گیا تھا تاکہ پتہ لگ سکے کہ وہ واقعی کام چور ہیں یا نہیں۔ میں نے اس خیال سے اُنھیں کو مامور کیا کہ وہ ہمارے نیپالی مہمان کی دیکھ بھال کریں۔ چنانچہ جب وہ صاحب تشریف لائے تو میں ہوائی اڈے پر ان کے استقبال کے لئے حاضر تھا۔ رسمی آؤ بھگت کے بعد ان آفیسر صاحب کو ان کے ساتھ کیا کہ جا کر سرکاری مہمان خانے کے خاص کمرے میں ان کو ٹھہرائیں اور دیکھیں کہ انھیں کوئی بھی تکلیف نہ ہو۔ میں یہ کہہ کر چیف منسٹر صاحب کے دفتر گیا تاکہ اُنھیں آگاہ کر سکوں۔ وہ ایک ضروری میٹنگ میں مصروف تھے چنانچہ میں وہیں رُک گیا۔ اتنے میں وہی آفیسر صاحب وہاں تشریف لے آئے۔ میں نے پوچھا کہ ہو گیا سب بندوبست تو فرمانے لگے کہ جو کمرہ اُن کے لئے مخصوص تھا اسے کھلوا کر اُنھیں اندر بٹھا کر اور چائے پیش کر کے وہ اب اس لئے میرے پاس تشریف لائے ہیں کہ وہ مجھ سے یہ دریافت فرما سکیں کہ معزز مہمان کو لنچ چیف منسٹر صاحب کے ساتھ کرنا ہوگا۔ یا کہ وہیں مہمان خانے میں بندوبست کیا جائے۔ ابھی وہ یہ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کا چپراسی ہانپتا ہوا وہاں آیا اور کہنے لگا کہ جس کمرے میں ان کو ٹھہرانا ہے اس کی تالی ہی نہیں ملتی۔ یہ سنتے ہی وہ آفیسر صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ خیر میں بھاگتا ہوا مہمان خانے پہنچا اور بہت معذرت کے بعد مہمان خاص کو اُن کے کمرے تک پہنچایا جب وہاں سے لوٹا تو اس آفیسر سے میں نے پوچھا کہ "بھئی اسقدر سفید جھوٹ تم نے کیوں بولا۔ تو فرمایا کہ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ میں نے کہا فرمایئے تو کہنے لگے کہ حضور میرا کیا قصور ہے۔ یہ نشر و اشاعت و اطلاعات کا محکمہ ہی ایسا ہے جہاں باتیں زیادہ بنائی جاتی ہیں اور کام کم کیا جاتا ہے اس کی اس صاف گوئی پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور میں نے بات وہیں ختم کر دی۔

آخری قصہ ایک شاعر کے بارے میں ہے۔ اس وقت بھی میں ابھی محکمۂ نشر و اشاعت و اطلاعات کا ڈائرکٹر تھا پبلک کی تفریح و حظ کے لئے میرے محکمے کو اکثر ڈرامے۔ کوی سمیلن۔ مشاعرے۔ کشتیوں کے دنگل وغیرہ منعقد کراتے

ہندو پاکستان مشاعرہ کا بندوبست کیا گیا تھا

ے چنانچہ ایک بار پنجاب کے ایک ادب نواز وزیر کے اشارے پر ایک انڈو پاکستان مشاعرہ کا بندوبست کیا گیا تھا
نامور شعرا کو دعوت دی گئی۔ ایک مولانا قسم کے بزرگ شاعر بھی اس مشاعرے میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ انھوں
تھا کہ میں انھیں بھی مدعو کر دوں۔ انھوں نے اس وقت چنڈی گڑھ دیکھا بھی نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ آم کے آم
ا کے دام کے مصداق مشاعرہ میں بھی شریک ہو لیں گے اور اسی بہانے سے چنڈی گڑھ بھی دیکھ لیں گے۔ میں نے
ا دعوت نامہ بھیج دیا اور وہ تشریف لے آئے۔ ان حضرت کی ایک پرانی عادت تھی کہ شعر سنانے سے پہلے ایک تقریر
دیا کرتے۔ اس تقریر کا مقصد خود ستائی ہوا کرتا تھا اور اس میں ہمیشہ جنگِ آزادی کے اپنے کارناموں کا ذکر کیا
تھے۔ میں ہی اس مشاعرہ کو چلا رہا تھا چنانچہ مناسب موقع دیکھ کر انھیں دعوتِ کلام دی۔ مولانا اپنی عبا و قبا کو ایک
انداز سے سنبھالتے ہوئے مائک پر تشریف لائے۔ اور فرمایا "خواتین و حضرات! آپ میں سے جو بزرگ حضرات ہیں وہ
ہے کہ جانتے ہوں لیکن میں نوجوانوں سے خاص طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس پر فضا مقام پر اس وقت یہ پنڈال
ین کر قیام پذیر ہو رہا ہے اور جہاں آپ نے مجھ حقیر کو غزل سرا ہو کر عزت حاصل کرنے کا موقع عطا فرمایا ہے عین اسی
جگہ اپنے کے سامنے میں نے ۱۹۴۶ء میں ماہ جون کی کڑی دھوپ میں سینے پر لاٹھیاں کھائیں۔ انگریزی حکومت کو للکارا اور جیل
ا یہ منظر صاحب نے جو اس وقت صدارت فرما رہے ہیں اور میں نے بیک وقت جیل بھی کاٹی تھی۔ مجھ سے چپ نہ رہا گیا اور میں نے
ہ دونوں جیل ضرور بیک وقت کاٹی تھی لیکن آپ کے جرائم الگ الگ تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شاعر صاحب یہ بات بھول
انھوں نے مجھے خود خط میں لکھا کہ میں نے چنڈی گڑھ اب تک نہیں دیکھا ہے اور انھیں اس بات کا علم بھی نہیں تھا کہ
ڈھ شہر تو بسا ہی تقسیمِ وطن کے بعد ہے۔

بقول پنڈت ہری چند اختر مرحوم:

دہی ہے اپنی رندی اور وہی واعظ کی فہمائش
بُری عادت کوئی بھی ہو یا آسانی نہیں جاتی

مجھے آخر میں مدیر شگوفہ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ میں تو ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہوں جس کا
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری۔ لیکن اگر وہ اسی طرح مجھ کو وقت بے وقت کچھ نہ کچھ سپردِ قلم کرنے کے لئے
تے رہے تو عین ممکن ہے میں اہلِ سیف ہوتے ہوئے اہلِ قلم بھی بن جاؤں۔

۷۸

مقرب حسین مقرب

سنگِ در

(ایک شعر سے بیزار ہوکر)

ایک شاعر نے جب جھوم کر یہ پڑھا — مَیں نے سوچا تو بَس سوچتا رہ گیا
"اُن کے کوچہ میں اے دوست جب جاؤں گا — سنگِ دَر اپنے سَر پر اُٹھا لاؤں گا"

مَیں نے سوچا، یہ شاعر مرا دوست ہے — سنگِ دَر کے اُٹھانے میں ہیں مشکلیں
جانے کن منزلوں سے گزرنا پڑے — پیش آئیں گی اِس کو بڑی دِقتیں

سنگِ دَر کوئی راہوں میں ملتا نہیں
نِکس چوکھٹ میں ہے اور ہلتا نہیں

سنگِ در ہی اٹھانے کا گر شوق ہے — اِس طرح سے شروع کیجئے سلسلہ
صرف باتوں سے کچھ کام ہوگا نہیں — جاکے لے آیئے گینتی اور پھاوڑا

اس طرح طے کرو پیار کے مرحلے
جاؤ دلبر کے گھر رات کے دو بجے

اتنے دھیرے سے گینتی چلانا وہاں — ہو نہ آواز اس طرح کھودو زمیں
تم کو کھانسی نہ آئے خدا کے لئے — جاگ جائیں نہ دلبر کے والد کہیں

ورنہ وہ لے کے لاٹھی نکل آئیں گے
خاک میں سارے ارمان رل جائیں گے

پھر وہ پوچھیں گے کیوں کھودتا تھا زمیں — کیوں اُکھاڑا ہے تو نے مرا سنگِ در
مَیں بلاتا ہوں لڑکوں کو اپنے ابھی — توڑ دیتا ہوں مَیں بھی ابھی تیرا سر

رات کو کیسے آنے کی ہمت ہوئی
کیسے یہ کام کرنے کی جرأت ہوئی

پھینک دے اپنی گینتی کو اے بدنصیب — خون کی ورنہ بہہ جائیں گی ندیاں
لوگ دیکھیں گے اک حشر ہوگا بپا — سرمہ بن جائیں گی ہڈیاں پسلیاں

اب بھی موقع ہے اے ناسمجھ بھاگ جا

شور ہوگا تو ممتاز اُٹھ جائے گی — وہ بھی گھبرا کے باہر نکل آئے گی
تم کھڑے ہوگے سر پہ لئے سنگِ در — دیکھ کر ایسی وحشت وہ گھبرائے گی

وہ کہے گی کہ اے میرے شاہِ جہاں
سنگِ در میرا لیکر چلے ہو کہاں

پھر کہے گی کہ میں نے تو سوچا تھا یہ — تم مرے واسطے تاج بنواؤ گے
مجھ کو تم سے تو امید ایسی نہ تھی — رات کو سنگِ در میرا لے جاؤ گے

تم نہیں میرے عاشق کوئی اور ہو
اب میں سمجھی کہ تم تو کوئی چور ہو

اور بالفرض سب لوگ سوتے رہے — تم نے پوری بھی کر دی جو یہ کوہ کنی
تم ہو شاعر کہ یا کوئی حمال ہو — کیا تمہیں اپنے سر سے بھی ہے دشمنی

کچھ سمجھ میں نہ آیا یہ کیا ذوق ہے
سر پہ پتھر اٹھانے کا کیا شوق ہے

دیکھ ایسا نہ کر شاعرِ خوش نوا — ایسی بے ہودہ باتوں سے اب باز آ
چھوڑ دے اپنی ضد بس خدا کے لئے — کام جو تم کا ہے بھاگ جا بھاگ جا

اے مقرب بہت کام دشوار ہے
یہ محبت نہیں ایک بیگار ہے

ایک شاعر نے جب جھوم کر یہ پڑھا — میں نے سوچا تو بس سوچتا رہ گیا
اُن کے کوچے میں اے دوست جب جاؤنگا — سنگِ در اپنے سر پہ اُٹھا لاؤں گا

قطعات

اثر سلوزی

ہے غریبوں کے دلوں میں جذبۂ حبِّ وطن
اپنے بھارت کی بنی پیتے ہیں سرکاری شراب
ان کی قبروں پہ لکھا جائے شہیدانِ وطن!
پی کے مر جاتے ہیں جتنے لوگ بھی دیسی شراب

○

تیل مہنگا ڈالڈا غائب اگر ہے کیا ہوا
ہر جگہ ہر وقت ملتی ہے بہ آسانی شراب
نام اس کا بھی ہے دنیا میں مگر اتنا نہیں
بڑھ گئی ہے باپ سے انگور کی بیٹی "شراب"

لو آج ہم بھی صاحب جائیداد ہو گئے!

قرض
کی مے تو نہیں
البتہ چائے ضرور
پیتے تھے (غالب سے ازلی
اور ابدی رشتے کی بنا پر ــــــ!)
اور جانتے تھے کہ ایک دن یہ فاقہ مستی کہ جس
میں سے اب مستی بھی غائب ہوتی جارہی تھی ضرور
رنگ لائے گی ـــــ! تو صاحب وہ رنگ لائی۔ اور ایسا چوکھا
کہ ہماری عینک زدہ آنکھیں بھی چکا چوند ہو گئیں ـــــ!
واقعہ کسی سال کے کسی مہینے کے کسی دن کا ہے کہ ہماری
ایک دوست نے شیطانِ اعظم کا رول بڑی
کامیابی سے ادا کیا۔ یعنی ہمیں ورغلا
کے اپنے گھر لے گئیں۔ ویسے
اطلاعاً عرض ہے کہ ہم
گھر بنا پائے
ہی کب

جاتے
تھے وہ تو اس
روز الزام دیوانے
کے سر آتا تھا۔ تو خیر ہم ایک
ڈپلومیٹک بے اعتنائی کے ساتھ
ان کے گھر پہنچے۔ ابھی تصوراتی اطمینان کا
روایتی سانس بھی نہیں لیا تھا کہ خبر ملی کہ ہمارے
خانے کا کہ جسے دولت کے فقدان کے باوجود عرفِ
خاص میں دولت خانہ کہا جاتا ہے' تالا توڑ دیا گیا۔
گھر پہنچتے پہنچتے پوری ایک قوم تعزیت کرنے اور
پس ماندگان کو صبر کی تلقین کرنے جمع ہو چکی
تھی۔ گویا A.V.M کے کسی ٹریجک فلم
کا منظر فلمایا جا رہا ہو ـــــ!
قاعدے کی رو سے
ہمیں فوراً لُٹ اور
تاراج یعنی

شفیقہ فرحت

دروازے کے کنڈے چٹخے دیکھ کے بغیر غش کھا کے گر پڑنا چاہیئے تھا اور جو اتنی بھی مارل کریج نہ ہو تو کم از کم دھاروں دھار رونا تو ضرور چاہیئے تھا۔ مگر ہم نے تڑپتے پھڑکتے حاضرین کی امیدوں پر پانی پھیر دیا (واٹر میکس کا خیال نہ کرتے ہوئے ——!) اور ان سب کو اطمینان دلایا کہ اول تو ہمارا تالا ازل سے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ تو ہماری ہاتھ کی صفائی تھی جس سے کہ اس کا بھرم قائم تھا۔ یعنی ہم اسے اس فنکارانہ خوبی سے چپکا دیتے تھے کہ اچھے اچھے نظر باز دھوکا کھا جائیں، لہٰذا اس واردات کو تالا توڑنے کا نام نہیں دیا جا سکتا ——!

اور دوسرے یہ کہ دن کو یوں لٹنے سے راتوں کی نیند کا چین تو یقینی ہو گیا ——!

اور پھر گھر کی یہ حالت کہ جب جب کوئی آتا ہمیں نہایت انٹلکچوئل اسٹائل میں پوز مار کے کہنا پڑتا کہ

"آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا ——!"

لے دے کہ جوتے کے پرانے ڈبے سے مشابہ ایک ریڈیو تھا جس میں ایک جگہ سوئی لگانے سے بیک وقت آدھے درجن پروگرام سُنے جا سکتے تھے۔ دلی سے مشاعرہ، بمبئی سے ڈرامہ۔ دودھ بھارتی سے کھٹمل مار چوہے مار دوا کا اشتہار جرمنی سے، کلکتے سے رابندر سنگیت۔ مدراس سے ٹامل میں آ۔آ۔آ۔ جالندھر سے ماہیہ اور ناگپور سے آہا ——! اور جب یہ سب نقطۂ عروج پر ہوتے تو لگتا کہ کسی میدانِ جنگ سے آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال سنایا جا رہا ہے ——!!

اور ایک گھڑی تھی جو ممکن ہے کسی زمانے میں گھڑی رہی ہو۔ مگر جس میں اب اس قسم کے کوئی جراثیم نہیں پائے جاتے، تو صاحب جب منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا یہ حال ہو تو چوری کا کیا غم۔ ہمیں تو سینۂ زمین کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے تھا۔ ہمیں غم تھا تو صرف اس بات کا کہ غریب نے اپنے بڑے گھر کی ایک ایک ٹوٹی پھوٹی گرد و غبار میں اٹی چیز اُلٹنے پلٹنے میں کتنی محنت کی اور اسے واپسی کے لئے بس کا کرایہ تک نہ مل سکا ——! بھلا وہ اپنے دل میں کیا سوچتا ہوگا۔ اس سے بڑھ کر بے عزتی کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ کہیں کل کلاں کو وہ اُلٹا ہمیں کوئی آرڈر نہ بھیج دے ——!

یا باضابطہ الحمل بھارتیہ چور سبھا بنا کر ہم جیسے ہیڈ ماسٹر لوگوں کی فلاح و بہبودی کے قانونی ذرائع سوچے جائیں ——!

خیر جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب ایسے آڑے دنوں کے لئے کہ جب گھر کی عزت پر بن جائے ہمیں کوئی نہ کوئی خاطر خواہ انتظام کرنا ہی چاہیئے۔ یعنی کچھ رقم ہر ماہ پس انداز کرنی چاہیئے۔ مجازی آمدنی اور خرچ کا حساب کتاب کچھ ایسا ترقی پسندانہ کہ ہزار چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ رکھے جاتے اور سیکڑوں کمیشن بٹھائے جاتے تب بھی ان کی ایک دوسرے سے دوستی نہ ہو پاتی ——! لہٰذا حساب کتاب کرنا اور بجٹ بنانا بالکل ایسا تھا جیسے کسی عیسیٰ "کو "میسا" کے تحت گرفتار کرنا ——! لہٰذا اس جھنجھٹ میں پڑنے کے بجائے ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آگا دیکھا نہ پیچھا۔ بلکہ اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کام لیتے ہوئے جھٹ سو روپے اٹھا کے ایسی جگہ رکھوا دیا جہاں سے وہ ہمارے لئے بھی اجنبی ہو گئے۔

دو دن بخیر و خوبی گزر گئے اور ہمیں اپنے سو روپیوں کی جدائی کا قطعی احساس نہیں ہوا۔ بلکہ ہم خاصہ فخر سا محسوس کر رہے تھے کہ ہم بھی صاحب جائیداد ہو گئے۔ گردن میں ایک خاص تناؤ اور چال میں رعونت پیدا ہو گئی۔ اور راوی تو یہاں تک کہتا ہے کہ لب و لہجے میں بھی انقلاب آ گیا ——! وہ ہم جو پہلے ہر وقت اپنے ہی جیسے پھکڑ لوگوں کے ساتھ گپیں ہانکا کرتے تھے اور وہ قہقہے لگاتے تھے جو گزوں اور میلوں تک سنے جا سکتے تھے۔ اب صرف زیرِ لب تبسم (کہ جس میں تبسم کم اور متانت زیادہ ہوتی ——!) سے کام چلا لیا کرتے۔ اور اس پھکڑ قوم کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور گپیں ہانکنا تو اب عہد پارینہ کی داستان بن چکی تھی۔ مگر اس تبدیلی بلکہ انقلاب کا ہماری صحت پر شدید اثر پڑا۔ کئی دنوں تک گردن مذبان؛ جبڑے ہونٹ

اور پیٹ میں شدت کا درد ہوتا رہا۔ سر بھاری بھاری اور طبیعت گری گری رہی۔ مگر کرتے کیا۔ مجبور تھے۔ کہ صاحب جائیداد لڑکیوں کا یہی شیوہ ہے ـــــ!

چند روز بعد اتفاقاً بازار سے گزر رہوا۔ خاصی اچھی ساڑی دوکان میں لٹکی تھی۔ ہم نے پہلے اسے اور پھر اپنی ڈھائی جگہ سے سلی اور ڈیڑھ جگہ سے پھٹی ساڑی کو دیکھا۔ اور ایک عاشقانہ تبسم کی آہ ترحم کے ساتھ بھر کے آگے بڑھ گئے۔ کیوں کہ سو روپیہ بچانے کے لئے لازمی تھا کہ ہم ڈھائی نہیں بلکہ سوا تین اور ساڑھے چار جگہ سے پھٹی پرانی ساڑی پہنے گھومیں!

دو قدم چلنے کے بعد پھر پرانی چپل بھی "ٹا ٹا۔ بائی بائی" کہنے لگی۔ پھر دل پہ سو کا نوٹ کر جو پتھر سے بھی بھاری تھا رکھا اور چپل میں ایک پن اٹکا لی ـــــ

رفتہ رفتہ ہم بکھرے سوکھے بال۔ سونی آنکھیں بھینچے ہونٹ اور روکھا اجڑا چہرہ لئے کالج پہنچنے لگے۔ اور سارے کالج میں رنگا رنگ افواہیں پھیلنے لگیں۔ اور قسم قسم کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ قیاس یہ تھا کہ شاید ہمارے کسی عددر جہ قریبی اور اس سے بھی صد درجہ عزیز کا انتقال پر ملال ہو گیا ہے۔ اور یہ سوگواری اسی کا لازمی جزو ہے۔

اور افواہ یہ بھی تھی کہ ہم نے پھر ایک نئے عشق کی افتتاح کی ہے۔ جو شدت کے اعتبار سے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دے گا ـــــ!

لہذا ایک طرف تو تعزیتی جلسے کا انتظام ہونے لگا تو دوسری طرف بڑے راز دارانہ انداز میں آزمودہ مشورے دیئے جانے لگے۔ اور تب ہم نے اعلان کیا کہ اس سوگواری میں نہ کسی کی موت کا ہاتھ ہے نہ عشق کا کمال۔ بلکہ مایا کا جال اور ہماری چال ہے ـــــ! ہم نے مبلغ سو روپے بچائے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ہم اس قابل نہیں رہے کہ لپ اسٹک، پوڈر کاجل، کریم تیل وغیرہ کی LUXURIES کو برداشت کر سکیں۔ اگر آپ لوگوں کو یہ خوف ہے کہ آپ کی طبع نازک ہماری اس ہیبت ناکی کو نہیں برداشت کر سکے گی۔ اور ممکن ہے اس صدمے سے ایک آدھ کا ہارٹ فیل ہو جائے تو بخوشی ہمارے سولہ نہ سہی آٹھ ہی سنگھار کا انتظام کر دیجئے۔ ہمیں قطعی اعتراض نہ ہوگا ـــــ!

خیر صاحب۔ صورت پہ ڈالئے خاک۔ کہ یہ خاک سے بنی ہے اور خاک میں ملے گی۔ اور سیرت پہ نظر ڈالئے۔ کہ سنا ہے یہ نہ کسی سے بنی ہے اور نہ کسی میں ملے گی۔ مگر اے تقدیر۔ کہ یہ سیرت بھی سو روپے یعنی ہزار نئے پیسوں کی چمکیلی دیوار میں زندہ چنی جا رہی ہے اور کسی مائی کے لال میں یہ ہمت نہیں کہ اسے کھینچ کر نکال سکے!

وہ قصہ حاتم طائی جدید یہ کہ حسب معمول چند ایسی لڑکیوں نے جن کے چہرے غربت اور افلاس کی دھوپ سے پیلے تپے رہتے ہیں۔ جن کی آنکھیں حسرت و مایوسی کے بوجھ سے جھکی رہتی ہیں۔ جو اپنے آپ کو اس درجہ مجرم سمجھتی ہیں کہ نہ کبھی ہنستی ہیں نہ مسکراتی۔ نہ کبھی اچھلتی کودتی ہیں بلکہ ہمیشہ جھکی جھکی رہتی ہیں۔ اور ان کا بس چلے تو شاید زمین میں زندہ دفن ہو جائیں! تو ایسی ہی دو لڑکیوں نے داخلے کی فیس کے لئے روپے مانگے۔ کیوں کہ انھوں نے سن رکھا تھا کہ حاتم کی قبر پہ لات مارنے والی (دیر سے ہی سہی ـــــ!) ہستی موجود ہے۔

لیکن حضور ـــــ وہ زمانے تو ہوا ہو گئے۔ سو روپیوں نے تو اس حاتم کی ٹانگیں یوں کس کے پکڑ رکھی تھیں کہ ہلکی سی جنبش بھی ممکن نہ تھی۔ ہاتھ بھی جکڑے ہوئے تھے۔ مگر پتہ نہیں کیسے سو روپیوں کی یہ دیوار ابھی اتنی اونچی نہ ہو پائی تھی کہ آنکھوں کو ڈھک لیتی۔ تو آپ کی یہ حاتم طائی سو روپے کی اس کا غذی دیوار کی آڑ میں کھڑی بے بسی سے ان جھکے ہوئے سروں جھکی ہوئی آنکھوں اور گڑے ہوئے قدموں کو دیکھتی رہی۔ ... ظاہر ہے جائیدادیں لٹائی نہیں جاتی ـــــ!

مہینے کے پندرہ دن گزر گئے۔ پھر ہم نے دیکھی نہیں کینٹین میں چائے پینا (اپنے پیسوں سے!) چھوڑ دی۔ کسی کو اپنے گھر بلانا تو اب خواب پارینہ بلکہ خواب پریشان بن چکا تھا ہم نے دوسروں کے گھر آنا جانا بھی چھوڑ دیا کہ بس اور ٹیکسی پر پیسے نہ اٹھیں مگر پیسے ہیں کہ اتنی تدبیروں کے بعد بھی بہ اٹھتے ہیں تو اٹھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے دونوں غلام علیوں کی تانوں کی طرح ——!

اور اب تو شان اس نقطہ پر پہنچ گئی ہے کہ چائے کی پتی رخصتی کی تیاری کر رہی ہے تو شکر الوداعی گیت گا رہی ہے اور آٹا دال چاول گھی تیل وہ زور شور سے کوچ کے نقارے بجا رہے ہیں کہ ہمارے ہوش و حواس تو خیر گم ہو ہی رہے وہ سو روپے کا نوٹ بھی اس جدید مسٹر مجنوں کی طرح جان بچاتا پھر رہا ہے۔ جس کے پیچھے نئی لیلیٰ بیگم کے ڈیڈی کشیر کی چھڑی لئے بھاگ رہے ہوں ——!

مگر جناب —— یہ جان اور آن کی فری اسٹائل کشتی ہے۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ جیت اسی کی ہوتی ہے جس پر ریفری کی نظر کرم ہو —— ! سو آپ کا یہ ریفری موقع کی نزاکت اور حالات کی نفاست کو دیکھتے ہوئے "آن" کے حق میں ہے (کہ اس حکمت عملی سے جان بھی محفوظ رہ جائے گی —— !)

تو چاہے جان چلی جائے (خارجی اعلان کی خاطر ذرا دیر کے لئے فرض کر لیجئے۔!) مگر سو روپے خرچ نہیں کئے جائیں گے۔ اور چونکہ جان کا بچانا ان سو روپیوں کی حفاظت کے لئے ضروری ہے اس لئے ہم پینڈولاسا چائے ناشتہ کھانا باری باری سے مختلف دوستوں کے یہاں (ان کی سات پشتوں پر احسان کرتے ہوئے)! کھائیں گے۔ اور کپڑے وغیرہ بھی انہیں کے استعمال کئے جائیں گے۔ بلکہ کوشش تو یہ ہوگی کہ مکان کا کرایہ، بجلی کا بل وغیرہ بھی چندہ کر کے ادا کر دیا جائے کہ سو روپے جمع کرنے اور صاحب جائیداد کہلانے کا یہی وحدہٗ لاشریک نسخہ ہے۔

ڈاکٹر محسنؔ عظیم آبادی

رُباعیات

مضمون کی طرح نئی جو ڈالی ہم نے ۔۔۔ تہ اپنے خیالات کی پالی ہم نے
ایجاد کئے نئے علائم کتنے ۔۔۔ تشبیہ نئی نئی نکالی ہم نے

○

بے سود ہے داستاں سنائی اپنی ۔۔۔ کس حال میں گزری ہے جوانی اپنی
ترسیل سے کچھ نہیں ہے مطلب ہم کو ۔۔۔ ہم خود کو سناتے ہیں کہانی اپنی

○

ہر شخص جدا ہر ایک کی بات جدا ۔۔۔ احساس الگ الگ خیالات جدا
کب سمجھے گا کوئی واردات دل غیر ۔۔۔ ہوں کیوں نہ مرے فن کے کمالات جدا

○

منظور نہیں تھی جو بندش ہو عام ۔۔۔ ہوتے ہیں ہمارے استعارے ابہام
سنتے ہیں ہم ان میں اپنے دل کی آواز ۔۔۔ سمجھے کہ نہ سمجھے کوئی اس سے کیا کام

○

غزل

پیپل کی جیسی ذات ہے عزت مآب کی ۔۔۔ ہوتی ہے خشک سایہ میں ٹہنی گلاب کی
پتھر کی چوٹ کھا کے کھُجاتا ہوں سر تو میں ۔۔۔ تھی رازمیں خلش دل خانہ خراب کی
کیوں کر کریں گے جانچ مرے خیر و شر کی آپ ۔۔۔ سادہ ورق رہی ہے جو کاپی حساب کی
بدحواس کس سے شہر میں ملتا نہیں کوئی ۔۔۔ کھلنے لگی ہے جلد ہماری کتاب کی
بدلیں ہر ایک سال کرایہ کا گھر جو آپ ۔۔۔ پیری میں بھی بنتی رہے مستی شباب کی
ہوں اس سڑک پہ جس کے سرے پہ پتہ نہیں ۔۔۔ گھاٹی گناہ کی ہے کہ منزل ثواب کی
آتش پہ تن بھی گر ہوں مثال کباب سیخ ۔۔۔ آنکھوں میں رکھئے تازگی نرگس کباب کی

ایسے شکستہ بکس میں یہ جان ناتواں
رکھے بچا کے کیسے امانت جناب کی

عزیزی مصطفیٰ کمال؛ جشنِ ظرافت کا یہ اعجاز ہے کہ سنجیدہ شاعروں کی رگِ طنز و مزاح بھی پھڑک اٹھی تھی۔ سالنامے میں ڈاکٹر محسن کا یہ کلام شائع کیجیے جو مشاعرہ میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر محسن کے نفسیاتی افسانوں کے مجموعے شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ بڑی اچھی غزلیں بھی لکھتے ہیں۔ نفسیات پر ان کے بعض مضامین یورپ کی بعض یونیورسٹیوں کی نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔

۵۷

گھی کا ــــ بابو!

گھی کا بابو بچے بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ اور بڑے بھی۔ فرق اتنا ہے کہ بچے کھاتے ہوئے نہیں شرماتے اور بڑے ـــ!

بڑے کھاتے ہوئے شرماتے ہیں۔ پہلے تو وہ سب کے سامنے نہیں کھائیں گے۔ اور کھائیں گے بھی تو یہ پتہ ہی نہیں چلنے دیں گے کہ وہ گھی کا بابو کھا رہے ہیں۔ اگر ریڈ ہینڈ پکڑے گئے تو اس طرح شرمندہ ہوں گے جیسے واقعی وہ کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں!

گھی کا بابو اور "حلوہ سوہن" کی پٹی میں فرق یہی ہے کہ ایک میں دانتوں کی آزمائش ہے۔ اور دوسرے میں نہیں۔ اس طرح جوان اپنے مضبوط دانتوں کی قوت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور بوڑھے گھی کا بابو کھاتے ہوئے "حلوہ سوہن" کا تصور کرتے ہیں۔ اور ماضی کے اُن لمحوں کو یاد کر لیتے ہیں جب کہ وہ جوان تھے!

گھی کا بابو اور حلوہ سوہن کے بیچ میں ایک نسل کا فاصلہ ہے۔ اس لئے ان کے ملنے کے پتے بھی مختلف ہیں۔ ایک حلوائی کی دوکان پر ملتا ہے۔ اور دوسرا گلی گلی کوچہ کوچہ!

عاتق شاہ

★

ذائقہ میں کہا جاتا ہے کہ گھی کے بابو کا جواب نہیں ہوتا۔ بس منہ میں ڈال لیجئے۔ آئسکریم کی طرح گھلنے لگا۔ اور حلوہ سوہن تو دانتوں کی ایک مستقل ورزش ہے۔ ویسے بھی بعض کا خیال ہے کہ کبھی اونچ نیچ ہو جائے تو شہر میں ڈنٹسٹ کی کمی نہیں۔ مٹھاس کے بارے میں ہماری دو رائیں نہیں ہیں۔ میٹھا، میٹھا ہوتا ہے۔ اور بس۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بہت سے حضرات طبعیتاً آرام پسند واقع ہوتے ہیں!

گھی کا بابو دوکانوں کے شوکیس یا چھوٹے بڑے شیشوں میں بند پڑا نہیں ملتا۔ بلکہ یہ عام قسم کے انسانوں میں بھی دستیاب ہوتا ہے۔ ہنستا بولتا ہوا، باتیں کرتا ہوا، اور اس کی بھی وہی خصوصیت ہوتی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے!

میٹھا میٹھا نرم نرم
آئسکریم جیسا
لیکن اس کی پہچان ذرا مشکل ہے!

سلام کے بعد مصافحے کے لئے اتنا جھک جائے گا جیسے کوئی اطاعت گزار بندہ نماز میں بہ حالتِ رکوع ہو۔ اس کے بعد کی منزل ظاہر ہے سجدہ کی ہوتی ہے۔ ہر بات کا جواب اثبات میں دے گا۔ اور مسکراتے ہوئے "جی ہاں، جی ہاں" اس طرح کہتا ہوا جائے گا جیسے اس کے علاوہ وہ کوئی اور لفظ سے واقف نہیں۔ گفتگو کے دوران اس طرح ادب سے اور کرسی کی انی پہ بیٹھا رہے گا کہ مخاطب کے دل میں یہ احساس جاگ جائے گا کہ دنیا کی ساری عزت و تکریم صرف اسی کے لئے ہے۔ ورنہ قیام کی حالت میں بات چیت جاری رہے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح باندھ لے گا جیسے کوئی ادنیٰ خادم کسی بادشاہ، شہنشاہ کے حضور میں کھڑا ہے! اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ آپ کسی بھی حیثیت میں گھی کے بابو کے لیے مفید ہوں۔ یا نہیں تو مستقبل قریب یا بعید میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ یا کم از کم اپنے میدان کی ایک با اثر شخصیت ہوں۔ کب جانے آپ سے کب کسی قسم کا بھی کام پڑ جائے۔ ورنہ ان سارے امکانات سے اگر آپ کی شخصیت پرے ہے تو وہ اس طرح آپ کے قریب سے گزر جائے گا جیسے کوئی اجنبی!

اور اپنی جگہ آپ بل کھا کر، تڑپ کر یہ سوچتے رہ جائیں گے کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ کہیں آپ کی آنکھوں نے آپ کو دھوکہ تو نہیں دیا!

ویسے آپ کے ان تمام سوالوں کا جواب جنیٹک اکسپرٹ کے پاس ہے۔ جنیٹک ایک ایسا نیا مضمون ہے جس میں آدمی کا یا کسی جاندار کا تاریخ جغرافیہ پہ ہی غور نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی ترچھا ہے تو پتہ لگایا جاتا ہے کہ اس کے ننھیال یا ددھیال میں کون ترچھا تھا! اگر دونوں شجروں میں کوئی نہ نکلا تو شبہ کا فائدہ دئے بغیر چارہ نہیں۔ ورنہ امن عامہ کا خطرہ بہرحال باقی رہتا ہے۔

گھی کے بابو کی شخصیت بڑی آفاقی ہے۔ یہ ہر قوم اور ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ خاص طور پر ہمارے ملک ہندوستان جنت نشان میں اس کی آبادی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ کیوں کہ یہاں کی آب و ہوا اس کی پیدائش اور صحت کے لیے بے حد مفید ہے۔ آج کل یہ عرب ممالک اور خلیجی ریاستوں کو بھی برآمد کیا جا رہا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ ہر چکنے والا گھی کا بابو نہیں ہوتا!

گھی کے بابو کی شخصیت کا ایک پہلو نہیں بلکہ کئی پہلو ہیں کبھی وہ مسکینی کا لبادہ اوڑھ کر آتا ہے۔ کبھی فرعونیت کا چہرہ لگا کر۔ اور کبھی لمبے لمبے بالوں میں اپنے چہرے کو اس طرح چھپا لیتا ہے کہ دور سے عورت کا دھوکہ ہوتا ہے۔

اور قریب سے طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ یا پھر مرد اور عورت کے بیچ کی کوئی جنس جو ہوتی ہی نہیں۔ لیکن ممی کے بابوؤں میں ایک قدر مشترک ہے۔ اور وہ ہے ان کی زن مریدی!

بات جب یہاں تک پہنچ گئی ہے تو چھپانے سے حاصل ہی کیا۔ اور یوں بھی یہ کوئی ایسی بات تھوڑی ہے جسے راز میں رکھا جائے۔ ممی کے بابو کی یہ خصوصیت بڑی تشویش قسم کی ہے۔ جہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ کوئی اچھا خاصا بھلا آدمی اپنی بیوی کی ساڑی یا بلوز دھو رہا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ جورو کا غلام ہے!

اصل میں ساڑی یا بلوز دھونا غلامی پر دلالت نہیں کرتا۔ ایسے ہی جیسے کوئی اچھی بیوی اپنے شوہر کی قمیض یا پتلون دھو دیتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے شوہر کے حق میں غلامی کا پٹہ لکھ دیا ہے۔ بالکل اسی طرح شوہر کے تعلق سے بھی یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ کیوں کہ میاں اور بیوی زندگی کے وہ رفیق ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے سکھوں میں شریک نہیں ہوتے بلکہ غموں اور مصیبتوں کو بھی بانٹ لیتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شوہر بیوی کی ساڑی دھونا اور اس کی سینڈل کی گرد صاف کرنا ہی اپنی زندگی کا سب سے بڑا آئیڈیل سمجھتا ہے تو اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے!

جورو کا غلام!

آپ ہی نہیں سب یہی کہیں گے!

میرا بھی یہی خیال ہے کہ ممی کا بابو یا ممی کے بابو قسم کے لوگ اپنی بیوی کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ بیوی کی نوکرانی کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ اگر بیوی کہے تو وہ اس کی ساڑی بھی دھونے سے دریغ نہیں کریں گے۔ بیوی کے بھائی اور ماں، باپ اور دیگر افراد خاندان کا تو پوچھئے مت۔ وہ تو اس طرح انھیں اپنے سر پہ اٹھائے پھریں گے جیسے ـــــ جیسے ـــــ

اب ہٹائیے تشبیہ میں کیا رکھا ہے۔ صرف یہی کہنا مقصود تھا کہ زن مریدوں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ وہ جو دنیا کی کسی حسینہ نے کہا تھا ـــــ

مجھے چاہو اور مجھ سے پہلے میرے کتے کو چاہو!

تو اس مشہور فقرے کا کلائمکس یہ ہے کہ محبت کتے سے شروع ہوتی ہے اور کتے پر ہی ختم ہوتی ہے۔ کیوں کہ چاہنے والا کتے کی مالک تک پہنچنے ہی نہیں پاتا۔ پہلا ہی امتحان اتنا سخت ہوتا ہے کہ کتے کے کاٹنے سے بھونک بھونک کر مرجاتا ہے۔ اگر مرتا بھی نہیں تو آخر دم تک بھونکتا رہتا ہے۔ اور اس کی آواز محلے والے سنتے رہتے ہیں!

ایسے لاعلاج عاشق بے چارے شہروں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ سنا ہے کہ دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس اس کا علاج نہیں۔ آپ چاہیں تو انھیں بھی زن مریدوں کی ایک قسم میں شمار کرلیں۔ میں اصرار نہیں کروں گا!

البتہ میں آپ کی توجہ ضرور ان اطاعت گزار شوہروں کی طرف منعطف کراؤں گا جن کی بیویوں کی اجازت کے بغیر گھر کا پتہ بھی نہیں کھڑکتا۔ یہاں تک کہ وہ ـــــ

اب میں کیا عرض کروں۔ میرا اشارہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہیں!

ممی کے بابوؤں کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے جو دیکھنے میں جلے کٹے اور بیویوں کے حق میں جلاد نظر آتے ہیں لیکن کمرے کے اندر یہ سب اپنی بیویوں کے پیر ہی نہیں پڑتے بلکہ گھنٹوں ان کے تلوے سہلاتے بیٹھے رہتے ہیں!

کیوں ـــ؟

تو یہ آپ اُن سے پوچھئے۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ آپ نہ پوچھیں۔ ورنہ ان کی پوزیشن نازک ہو جائے گی۔ اور آپ کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا!

ہر قسم کے گھی کے بابو وہ ہوتے ہیں جو نشہ میں دھت اپنی بیوی دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور دوسرے کی بیوی کو اپنی بیوی سمجھ کر جب اپنا بانہوں کو پھیلاتے ہیں تو انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ کسی نے اُن کے مُنہ پہ ایک زوردار چانٹا رسید کیا ہے۔ تب ان کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ اور وہ معافی چاہ کر اپنے گالوں کو سہلاتے ہوئے پھر گھی بار کے اندر گھس جاتے ہیں!

لیکن وہ گھی کے بابو کی مصروف اور ہمیشہ مسکرانے والے سوشیل ورکر کی طرح بڑے عجیب وغریب ہوتے ہیں جو اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کسی دوسرے دوست کی کار، رکشا یا سواری میں بٹھاتے ہیں۔ اور اُس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بازار جا کر اپنی بھابی کو شاپنگ کرادے۔ کیوں کہ وہ بے حد مصروف ہیں۔ اور انھیں شہر کے آخری کونے میں ایک پبلک میٹنگ کو مخاطب کرنے جانا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سوشیل ورکر صاحب کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کی بیوی کسی دوست کے گھر میں ہے۔ اگر انھوں نے اپنی پارٹی کے سالانہ جلسے کے وقت اپنی بیوی کو زید کے حوالے کیا تھا تو وہ دوسرے سال سالانہ جلسے کے بعد بکر کے گھر سے برآمد ہوتی ہے۔ اور وہ بھی نخرے دکھاتی ہوئی جیسے وہ بھی اپنے لیڈر شوہر سے کسی طرح کم نہیں۔ کیوں کہ اس نے ایک سال دن رات عورتوں کی بھلائی کے لئے کام کیا ہے!

یہ وہ ہوتے ہیں جن کی بیویوں کی تعریف میں صرف پڑوسی ہی نہیں بلکہ اہل محلہ اور اہل شہر بھی اپنی زبان نہیں سکھاتے اور ایسے حضرات اپنے نام سے نہیں بلکہ اپنی بیویوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں!

اور یہ ان کی بیویوں کی مہربانی ہے کہ بچوں کی ولدیت میں ان کا نام ضرور شامل کر لیتی ہیں۔ ورنہ وہ اگر حق گوئی پر اُتر آئیں تو سماجی اور سوشیل زندگی میں ایٹمی دھماکہ ہونے میں باقی کیا رہ جاتا ہے!

آخر میں ایک بات گرہ میں باندھ لینی چاہیئے کہ ہر زن مرید گھی کا بابو نہیں ہوتا۔ لیکن ہر گھی کے بابو کا زن مرید ہونا ضروری نہیں، لازمی ہے!!

گلی محلہ والے ہمارے ہر ہنگامے میں ساتھ دینے کو تیار ہر گڑی آڑی میں گھیون یار اور ہم ہنگامہ شادی سے انھیں بے لنارہ کئے دے رہے ہیں۔ لیکن اس اخلاق، محبت اور مساوات کا ایسا بدلہ ملا کہ ہم اپنے بزرگوں، بزرگانِ دین اور شیخ سعدی کے نام اخلاقی درس حتیٰ کہ حکیم لقمان کے صد پند بھی بھول جانے کی قسم کھا بیٹھے۔

لوگ جو ہمیں وعدہ خلاف کہا کرتے ہیں دراصل اس کی بھی کوئی اصل نہیں اور نہ ہی ہمیں اپنی کوئی غلطی نظر آتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہم نے کھانے پر کسی معزز مہمان کو بلایا اور خود گھر سے غائب۔ دراصل اس میں بھی ہماری وہی محبت اور مروت کار فرما ہوتی ہے۔ گھر سے تو چلے اسی معزز مہمان کے اعزاز میں کچھ اور لوگوں کو بلانے اور بلایا بھی لیکن اس کو کیا کہیے کہ جس کے گھر بھی گئے اس نے یا تو چارپان میں دیر لگا دی یا مجھے باتوں میں لگا دیا۔ اور آخری مہمان کو لے کر جب ہم گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ سارے مہمان بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد بغیر کھائے پیئے ہماری جان کو کوستے اور پھر ہم سے نہ ملنے کا عہد کرتے ہوئے سدھار چکے ہیں۔ کیوں کہ اتفاق تھا سے ہم گھر پر اس گرینڈ دعوت کا ذکر کرنا بھول گئے تھے۔

ہمارے وہ دوست بھی ہم سے بے حد خفا ہیں جن کی بے حد محبت اور اصرار پر ہم اُن کے یہاں جانے کو تیار ہونے اور ہمارے بار بار یہ کہنے پر کہ "جانور اور چھوٹا کر دو" وہ مرغ سے تیتر پر اُتر آئے تھے۔ ان کی وہ شاندار دعوت ہم کوشش کرنے ان کے یہاں کیوں نہ پہنچ سکے اس کی وجہ لوگوں کو کیا بتائی جائے کہ نکلے تو ہم ان کے گھر ہی جانے کے لئے تھے لیکن دوسرے دوستوں نے مل جل کر ایسا گھیراؤ کیا کہ ان کے نرغے سے نہ نکل سکے۔ ان کے یہاں نہ جانے میں بھی ہماری ایک حکمت تھی کہ کہیں یہ پوری بٹالین نہ ہمارے ساتھ ان کے یہاں پہنچ جائے۔ کیوں کہ ہمیں اپنے بھائی کی وہ باوات، پلیٹ فارم پر سیکڑوں کی تعداد میں ہنستے گاتے، چیختے چلاتے باراتی اور خود بھائی صاحب انجن بن کر شنٹنگ کرنا اچھی طرح یاد ہے۔

ہماری ایک چچی صاحبہ ہیں۔ ان کا قول ہے کہ سچائی اور صاف گوئی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوسرا وصف نہیں۔ انھیں صداقت چچی کے یہاں ایکدن ہم جا پہونچے۔ ان کا گھر خلافِ معمول بڑا صاف ستھرا اور سجا بنا دکھائی دیا۔ چچی کا سامنا ہوتے ہی میرے منہ سے انھیں کے الفاظ پھسل پڑے۔

"اہا آپ کا پھٹکار زدہ گھر تو آج ماشاءاللہ بڑا لائٹ مار رہا ہے۔ لگتا ہے آپ کی جھاڑو پھری ہوتے سجایا ہے۔"
ابھی میری اس تعریف کا کوئی جواب ملا بھی نہیں تھا کہ میری نظر آنگن میں گھومتی سجی بنی ایک چھیل چھبیلی نار پہ پڑ گئی۔

میں نے پوچھا: "یہ کون ہیں"

"ارے تم نے پہچانا نہیں۔ یہ منے میاں کی دلہن ہیں۔"

ہم حیرت سے بول پڑے۔

"لیجئے بھلا ہم پہچانتے کیسے ہمارے تصور میں تو ایک کالی کوئلہ سی بھابی تھی۔ سچ بتایئے چچی کیا یہ آپ کی وہی بہو ہے جس کے بارے میں آپ کہا کرتی ہیں صورت چڑیلوں جیسی اور مزاج پریوں والے۔"

یہ سن کر چچی کا کھٹا کھٹ چلتا ہوا سروتا بجائے ڈلی کے ان کی انگلی پہ چل گیا۔ وہ چھیل چھبیلی نار چلتے چلتے یک لخت رک گئی۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ نگاہیں بجلیاں برسانے لگیں۔ چچی اس قدر سٹ پٹائیں کہ مجھے بیٹھانا بھول گئیں۔ وہ نار ایسی تاؤ میں آئی کہ بجائے میرے چچی کی زبانی خاطر تواضع میں لگ گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ صاف گو لوگوں اور تسبیح صداقت کے پڑھنے والوں کے آگے کبھی سچ نہیں بولنا چاہیئے کیوں کہ اسی دن سے بہو کا چچی سے اور چچی کا مجھ سے ان بولا ہے۔ اور خلق کے سامنے اب ہم منہ پھٹ بھی ہیں۔

اب چلتے چلتے ایک پتے کی بات اور ہم آپ کو بتادیں کہ چاہے دنیا کے کسی موضوع پر آپ سچ بولیں تو بولیں لیکن کبھی
ے بھی اپنی یا دوسروں کی عمر کے بارے میں سچائی سے کام نہ لیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو یا تو کسی کی لگی لگائی شادی
تے ہیں یا نوکری۔ اس لیئے کہ ہم ظاہری عمر سے زیادہ حقیقی عمر کو مانتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ اپنی عمر صحیح بتانے میں
طرہ ہے تو سنئیے اس میں آپ کو یا آپ کے چھوٹوں کو تو کوئی خطرہ نہیں لیکن آپ کے بزرگوں کو ضرور ہے۔ اگر آپ
یا تو یقین جانیئے کہ آپ کا حشر بھی وہی ہوگا جو ہمارا ہوا تھا۔

ہوا یوں کہ ایک بار ایک ایسی محفل میں جہاں زیادہ تر ہمارے "بڑے" اور "بزرگ" موجود تھے جن میں زیادہ تر
سفید بالوں کو اسلامی اور غیر اسلامی خضاب سے لال اور کالا بنائے ہوئے تھے۔ کچھ عمروں کا ذکر چھڑ گیا۔ کسی نے کچھ کہا
نے کچھ ہم نے اپنی صحیح عمر جوڑ جاڑ کر ساٹھ نکال لی۔ اب کچھ نہ پوچھیئے ان نابالغ بوڑھے بوڑھیوں پر کیا گزری۔ ایک
ے ہم پر پنجے جھاڑ کر پڑ گئے۔

"سچ کی بھی انتہا ہوتی ہے!"

"تم نے بھی سچ بولنے کی حد کر دی!"

"ایسا بھی کیا سچ جو دوسروں کو بے عزت کر دے۔"

"ارے بے شرم تجھے اپنا نہیں تو دوسروں کا خیال تو ہوتا!" وغیرہ وغیرہ

چند بزرگ تو ایسا غیض میں آئے کہ ان کی نقلی بتیسیاں نکل پڑیں۔ اور ان سب کے جواب میں ہم صرف
وچتے رہے اس میں ہماری کیا غلطی ہے۔ ہم نے تو سچ کہا تھا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہا تھا۔

رشید عبدالسمیع جلیل

غزل

ایک رکشے کا کرایہ بھی چکایا نہ گیا
وہ تھے آنے پہ مُصر ہم سے بُلایا نہ گیا

عقد کے بعد دلھن چل کے مکاں تک پہنچی
بوجھ نازک تھا مگر ہم سے اٹھایا نہ گیا

کھڑکیاں کھول کے بیٹھے رہے پہروں ہم بھی
اک حماقت تھی سراسر کوئی آیا نہ گیا

ایک تھپیڑ کے روادار تھے قسمت کے نثار
نقش چہرے پہ یوں اُبھرا کہ ہٹایا نہ گیا

کتنے پھینکے ہوئے سکّے ہیں سرِراہ ابھی
چلتے چلتے بھی جنھیں تم سے اٹھایا نہ گیا

تو وہ درزی کہ رہا چاک نصیبہ جس کا
میں وہ دامن کہ کبھی جس کو سِلایا نہ گیا

تیرے عاشق تو محبت کی وکالت کرلیں
فیصلہ حق میں کبھی جن کے سُنایا نہ گیا

بختِ شیریں یہ نہ جانے دلِ اوباش صفت
دستِ فرہاد کٹا تھا تو جُڑایا نہ گیا

گل فروشی میں جلیل اپنی بقا ہے مضمر
شعرگوئی سے کوئی سود کمایا نہ گیا

ایمرجنسی کا کرشمہ

اشرف مالوی

میاں جب سے ایمرجنسی لگی ہے
جسے دیکھو شرافت آگئی ہے

انھیں ملتا ہے کھانا پیٹ بھر اب
جو کہتے تھے گرانی کھا رہی ہے

تھی کل ہر شئے کی قیمت آسماں پہ
اچانک اب زمیں پر آ گئی ہے

نہ فقرے ہیں نہ سیٹی عاشقوں کی
نہ ظالم حُسن کی عشوہ گری ہے

وہ جس سے منچلے ہوتے تھے گھائل
حسینوں نے ادا وہ چھوڑ دی ہے

کوئی ہپّی نظر آتا نہیں اب
دوکاں حجاموں کی اب چل رہی ہے

کلرک اور آفیسر موجود ہیں سب
نہ گپ شپ ہے نہ چھٹی لنچ کی ہے

ہے بیکد سر اب رشوت کا بازار
فقط تنخواہ پر اب زندگی ہے

نہیں اسٹرائک کا اب کوئی چسکہ
بدیسیوں سے نہ دولت آرہی ہے

غرارے کا بہت سستا ہے ساٹن
مری بیوی یہ مجھ سے کہہ رہی ہے

تعجب سے کہا سالی نے میری
سبھی چیزوں کی قیمت کیوں گری ہے

کہا میں نے نہیں معلوم تم کو
ایمرجنسی یہ جادو کی چھڑی ہے

روش یہ مستقل اپنانی ہوگی
یہ مت سمجھو ہوا یہ عارضی ہے

ڈاڑھ کی ــــ یاد میں

پیدائش
سے لے کر موت
تک ہر انسان کے ساتھ
کوئی نہ کوئی بیماری لگی رہتی ہے
اور اگر کبھی غائب بھی ہو جائے تو پھر
اچانک یوں نمودار ہو گی جیسے بیوی اپنے میکہ جا کر لوٹ آئی ہو! اس
حقیقت کے باوجود ہمارے ایک سرپھرے دوست واحد کلام کا یہ دعویٰ ہے کہ انھیں کبھی کوئی مرض لاحق
نہیں ہوا۔ مگر وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ایک انسان کو کوئی مرض لاحق ہو یا نہ ہو، وہ "گیسیس کی شکایت" سے کبھی طرح بچ
نہیں سکتا۔ کیوں کہ گیسیس کے تعلق سے ہم نے ایک مستند ڈاکٹر، ایف۔ آر۔ سی۔ ایس، لندن کو یہ کہتے سنا کہ
ملکۂ ایلزبیتھ تک گیسیس کی رسائی ممکن ہے۔ تو پھر آپ ہم کس شمار میں؟ ــــ اور آپ جانتے
ہیں کہ جب گیسیس پیٹ میں پرورش پانے لگتی ہیں تو کیا کیا اندیشے اور غلط فہمیاں
پیدا نہیں ہوتیں؟ دور کیوں جائیں؟ خود ہمارے دوست واحد کلام
کی مسز کی مثال موجود ہے، جن کی شادی ہوئے کوئی پانچ سال
ہو چکے ہیں۔ پچھلے چار سال سے وہ اپنے ہسبنڈ، HUSBAND
کو مسلسل خوش فہمی میں مبتلا رکھتی چلی آ رہی ہیں کہ ان
کی گود بہت جلد ہری ہو گی۔ لیکن
ہر دفعہ طبّی معائنہ

مسیح انجم

کے بعد یہ رپورٹ وصول ہوئی کہ ساری کارستانیاں گیسیس کی تھیں۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہم بھی گیسیس کے مریض ہیں۔ اور پچھلے دس سال سے ہم ان گیسیس کو یوں پالتے پو
چلے آرہے ہیں جیسے کوئی ناعاقبت اندیش باپ اپنی ناخلف اولاد کی پرورش کرتا ہو۔ یہ گیسیس ہی ہماری ننھی سی جان
ہمیشہ موت کو پیش نظر رکھنے اور خدا کو حاضر و ناظر جاننے کے لئے کافی تھیں۔ لیکن جب ہم نے اپنی عمر کا چالیسواں سال عبور
اچانک داڑھ کے درد سے سابقہ پڑا۔ اور پچھلے تمام چھوٹے موٹے درد اس کے آگے ماند پڑ گئے۔ ہم نے اس درد کا
کسی ڈاکٹر سے کروانا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ ڈاکٹر کی دوا سے ایک مرض تو دفع ہو جاتا ہے۔ لیکن دوسرا ایک مہلک مرض
کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور بعض وقت تو پہلا مرض پھر عود کر آجاتا ہے۔ جب کہ دوسرا مرض مستقلاً جان ناتواں سے چمٹ
ہم یہ بات یوں ہی نہیں کہہ رہے ہیں۔ بلکہ ہمارے پاس اس کا ٹھوس ثبوت دستاویز کی شکل میں ہمارے پیٹ پر رقم ہے'
ویدجی کے زود حکمت کا نتیجہ ہے۔ بچپن میں ایک ویدجی نے ہماری بڑھتی ہوئی طحال کو روکنے کے لئے ہمارے پیٹ پر
سے ایک بہت بڑا تعویذ نما نقش بنایا تھا۔ ان کی اس "شوخیٔ تحریر" کی وجہ سے طحال کا بڑھنا رکا تھا یا نہیں' یہ ہمیں یاد نہ
اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک بار ایک ستم ظریف حکیم نے ہمارے پیٹ کا معائنہ کرتے وقت اس نقش کو دیکھ کر ہم سے دریافت
تھا کہ ــــــ

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا؟"

اب تو یہ نقش ہمارے بچوں کے لئے دلچسپی اور وقت گزاری کا ایک ذریعہ بن گیا ہے۔ جب کبھی ہم دن کے وقت
دیر ستانے کے لئے لیٹ جاتے ہیں تو ہمارے چھوٹے صاحبزادے اپنی بہن کے ساتھ مل کر ہمارے پیٹ پر بنے نقش
خانوں میں کنکر اور بیج جما کر "اٹھا چھاں" کھیلنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہم ان سعادت مند بچوں کو اس طرح کھیلتے دیکھ کر
خوش ہوتے ہیں کہ چلو یہی کیا کم غنیمت ہے کہ ہمارے بچے آوارہ بچوں کی طرح گلیوں اور ریلوے پلیٹ فارم پر "اٹھا
اور اگالداں" نہیں کھیلتے۔ پھر دوسرے ہی لمحہ میں ہم یہ بھی سوچنے لگ جاتے ہیں کہ اگر بالفرض ویدجی ہمارے پیٹ پر
یا "لوناپاٹ" کا نقشہ کھینچ دیتے تو آج ہمارے پیٹ پر کیا گزرتی؟

ویدجی کی وہ "شوخیٔ تحریر" ہمارے ذہن پر کچھ اس طرح نقش کر گئی ہے کہ ہم آج بھی علاج و معالجہ کے معاملہ
خائف رہتے ہیں۔ چنانچہ اپنی عمر کے اکتالیسویں سال میں جب ہم کو اچانک اپنے بائیں جبڑے کے اوپری داڑھ میں پہلی
درد سے سابقہ پڑا تو ہم نے اس درد کو برداشت کرنے کی ٹھان لی۔ ویسے ہم نے داڑھ کے درد کے تعلق سے یہ
تھا کہ اس کا واحد علاج "انبور" ہے۔ اور ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس جا کر اس داڑھ کو "انبو
اکھڑوائیں اس بزدلی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی ہمارا بایاں گال پھول گیا۔ جب ہم آئینہ میں اپنی صورت د
لیا تو یوں لگا جیسے ہم اپنے بائیں گال کو پھلا کر بگل بجا رہے ہوں۔ ہمیں اس طرح "بگل ماسٹر" بنے رہنا گوارہ تھا مگر علاج
ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ جب داڑھ نے یہ محسوس کیا ہم اس کے تعلق سے غفلت برتنے لگے ہیں تو اس نے اودھم
شروع کیا۔ لیکن ہم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہماری اس بے حسی کو دیکھ کر اس نے اپنے قریبی دوستوں اور رفیقوں کو ورغلانا
کیا۔ نتیجتاً اس کے دو قریبی دوست اس کے بہکاوے میں آگئے۔ ہمارا گال مزید پھول گیا۔ پھر بھی ہماری بے حسی میں کوئی
نہ آیا۔ تب اس نے اپنی تحریک میں نہ صرف شدت پیدا کی بلکہ وسعت بھی دے دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غدود کی یہ تحریک
کر ایک طرف گلے تک اور دوسری طرف آنکھ تک پہنچ گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے گلے کے غدود متورم ہو گئے۔

اور پھر بائیں آنکھ بند ہونی شروع ہوئی۔ تو جناب کوئی مرد اپنی بائیں آنکھ بند کرکے سیدھی آنکھ کھلی رکھتا ہے تو راستہ چلتے وقت اس کی پوزیشن کتنی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ پھر داڑھی رکھ کر بائیں آنکھ بند کرنا تو اللہ کی پناہ!

جب داڑھ کا درد گلے کے غدود سے آنکھ تک پھیل کر "اظہر من الشمس" قسم کی نوعیت اختیار کر گیا تو ہم نے داڑھ کی اس درپردہ تحریک کو جاننے کے لئے اس سے پوچھا "آخر تو چاہتا کیا ہے؟"

وہ بولا "کچھ نہیں! میں صرف اعتراف خدمات کا صلہ چاہتا ہوں!"

یہ سنتے ہی ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم نے فوراً جھڑک دیا "بڑا آیا فنکار کہیں کا! نکلتا یا نہیں! دور ہو جا یہاں سے"! ہماری جھڑکیاں سننے کے بعد وہ کچھ مایوس سا ہو گیا۔ اسے یہ امید نہ تھی کہ اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جائے گا اس کی انا کو ٹھیس لگی۔ تب اس نے آخری حربے کے طور پر عدم تعاون کی پالیسی اختیار کی۔ پھر تو ہمارے چبانے کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ہم بھی کہاں ہار ماننے والے! ہم نے فوراً یہ ڈپلومیسی اختیار کی کہ چبانے کے سارے نظام کو دائیں جبڑے کی طرف منتقل کر دیا۔ گویا یوں سمجھیے کہ ہمارا جھکاؤ "بائیں" سے "دائیں" جانب ہو گیا۔ یا یوں کہیے کہ پہلے لیفٹسٹ (LEFTIST) تھے تو پھر رائٹسٹ (RIGHTIST) بن گئے۔ ہماری اس ڈپلومیسی کے نتیجہ میں "داڑھ موصوف" بالکل مفلوج ہو گئے۔ داڑھ کی اس حالت کا زبان نے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ زبان جو پہلے اس داڑھ کے آگے دست بستہ کھڑی رہتی تھی، اب۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ دن میں کوئی تین سو بار ہمدردی کا لبادہ اوڑھے داڑھ کی عیادت کو جاتی اور مزاج پرسی کے پردہ میں داڑھ کو ادھر سے ادھر خوب ہلا آتی۔ کچھ ہی عرصہ میں اس نے داڑھ کے درد کو بالکل "بندر کے پھوڑے" میں تبدیل کر دیا۔ (بندر کو جب پھوڑا ہو جاتا ہے تو اس کی موت یقینی ہو جاتی ہے) بالآخر ہماری لاپرواہی اور زبان کی کارستانی رنگ لا کر ہی رہی۔ ایک دن جو بیٹھے بیٹھے ایک زور دار چھینک آئی تو زبان کے دھکے کے ساتھ ہی "حضرت داڑھ" منہ میں سے نکل کر ہماری بیگم صاحبہ کی گود میں بے حس و حرکت جا پڑے۔

اب جب ہم یہ مضمون سپرد قلم کر رہے ہیں تو ہمارے داڑھ کو گزرے ہوئے چالیس دن ہو چکے ہیں۔ گویا اب ہم اس کا چہلم منا رہے ہیں۔ اب ہمیں رہ رہ کر وہ داڑھ یاد آ رہا ہے۔ کتنا پیارا داڑھ تھا وہ ہمارا! اپنے میدان کا کتنا بڑا فنکار تھا وہ! سخت سے سخت چیز کو پیس کر رکھ دیتا تھا۔ کبھی اس نے عدول حکمی نہ کی۔ حلال تو حلال، حرام نوالوں کو تک اس نے پیس کر رکھ دیا۔ بس اُسے صرف اپنے کام سے کام تھا۔ گویا بڑا فرض شناس تھا۔

وہ کیا گیا ہمارے چہرے کی رونق جاتی رہی۔ ہمارے دو گالوں کے درمیان وہ پہلا سا توازن باقی نہ رہا۔ ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی خوبصورت عمارت کا ایک "پلر" گر گیا ہے۔ ہمارے دوست ہمیں دیکھتے ہی از راہ مذاق چھیڑنے لگتے ہیں۔ اس کی اینٹیں گر رہی ہیں، یہ مکان کمزور ہے!" جب ہم بات کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی محفوظ گودام کی روشن دان کھل گئی ہے اور چڑیاں دانہ چگنے کے لیے آ اور جا رہی ہیں۔ جب الفاظ داڑھ کی اس خلا سے پھڑ پھڑا کر نکلتے ہیں تو ہم بڑی بے بسی سے ان کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ دو ایک بار یوں بھی ہوا کہ ہم نے ادھر مضمون پڑھنا شروع کیا، اُدھر سامعین نے ہوٹنگ شروع کی۔ ہم اُن سے کسی طرح اپنی مجبوری و بے بسی کا اظہار کرتے کہ حضرات الفاظ کے الٹ پھیر کی یہ غلطی ہماری نہیں ہے بلکہ ہمارے داڑھ کی محرومی نے ہمیں اس منزل کو پہنچایا ہے۔ جب کبھی ہم تقریر کرتے یا مضمون سناتے ہیں تو شریر بچوں کی عدم موجودگی کے باوجود ہوٹنگ کے طور پر خود بخود سیٹیاں بجتی ہیں۔ اور لوگ تالیاں پیٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بہر حال اب ہم نے داڑھ کی خلا کو پُر کرنے کا ایک ذریعہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یادگار کے طور پر اس کا ایک مجسمہ نصب ہو اور ایک دھوم دھام کا جشن ہو۔ لہٰذا آج ہی ہم نے ایک ڈنٹسٹ کو آرڈر دیا ہے کہ وہ اس داڑھ کا ایک خوبصورت مجسمہ تیار کرے! ✿✿

غزلیں

سرپٹ حیدرآبادی

نظر میں اس کی وقعت ہو گی کیا مُرغی کے سالن کی　　محبت جس کی گھٹی میں لڑکپن سے ہو بیگن کی
خُدا رکھے میرے قبضے میں اب گردن ہے دشمن کی　　مرتب کر رہا ہوں میں کہانی رام د راون کی
اُدھر لندن میں دُلہا مست، چاہت میں فرنگن کی　　اِدھر ہندوستان میں شاد، بن آئی ہے دلہن کی
سکوں ملتا نہیں دونوں کو پل بھر زندگی بھر میں　　نظر آتی ہے صورتِ زہر ہر سوکن کو سوکن کی
وہ شاید دفن کرنے والے ہیں لاش رقیب اسمیں　　تلاشں اُن کو ہے قبرستان میں میرے ہی مدفن کی
بڑے عہدوں پہ اب ستّر سے زائد عمر والے ہیں　　وظیفے کے لئے مختص ہے لیکن عمر بچپن کی
خُدا کہتے ہیں وہ لیکن نکلتا ہے، بھگوان منہ سے　　الٰہی آبرو رکھ لے کسی کے پو پلے پن کی
مسلسل فیر کرتا کوئی آتا ہے تصور میں　　تخیل میں سُنا کرتا ہوں میں آواز دشمن کی

یہاں پاکٹ میں سرپٹ کے ہیں فوٹو اُن کے بچپن کا
وہاں لاکٹ میں ہے تصویر سرپٹ کے لڑکپن کی

کسی کے رُخ پہ تل ہے یا ہے کوئی چاند ہالے میں　　کوئی مکڑی ہے جالے میں، کہ بوٹی ہے پیالے میں
حسینوں پہ نظر پڑتے ہی دل گڑبڑ مچاتا ہے　　نئے انداز کے ہیں چوچلے نازوں کے پالے میں
پسند آتا نہیں کوئی تمہارے ماسوا مجھ کو　　ہمیشہ ایک سُر بجتا ہے میرے راگ مالے میں
کرشمہ ہے یہ معمولی، کریم اسنو لپ اسٹک کا　　نظر آتی ہے سالی کی جوانی مجھ کو سالے میں
سوال وصل پہ میرے بصد انداز وہ بولے　　کہ جاؤ منہ تم اپنا دھو کے آؤ مُرکی نالے میں
نہ رکھا گھر کے لائق اور نہ رکھا گھاٹ کے قابل　　جو تم کہدو تو میں ہو جاؤں داخل پاٹھ شالے میں

بہر صورت رہے، ہر راہ میں رفتار پر قابو
کہ سرپٹ اُڑ کے خود مکھی ہی پھنس جاتی ہے جالے میں

○

دیکھے نا!

ڈھکن رائچوری

بار بار جی کوں مار دیکھے نا!　　کر کو آنکھیاں بی چار دیکھے نا
دِل محبت میں ہار دیکھے نا!　　جان نچھاور پو وار دیکھے نا
نیئں بنی جیون بھر کی ہم جوڑی　　کر کو جوڑی سے پیار دیکھے نا
تھی سو اجرت گنوا ایکو بیٹھے　　لے کو پیسے ادھار دیکھے نا
اب بی آئے سمجھ تو بہتر ہے　　کھا کو جوتیاں کی مار دیکھے نا
بر پو ٹھولہ پزالہ موں میں تھا　　ایسے دن بی گزار دیکھے نا
رچدّر چھٹ کو نکل پڑے باہر　　پاداں اپنے پسار دیکھے نا
کھجلی میں ہات یوں چلے دونوں　　جیسے بجاتے ستار دیکھے نا

سمجے سوب کوڑ پانڈیا ہے ڈھکن
لے کو لمبی ڈکار دیکھے نا

فضل جاوید

ساس بہو!

ساس اور سسر یا خسر رشتوں کے نام ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر "سسری" اور "سرا" بطور گالی بھی مستعمل ہیں۔ ساس دو قسم کی ہوتی ہیں ایک شوہر کی ماں اور دوسری بیوی کی ماں — بیوی کی ماں کے مقابلے میں شوہر کی ماں ہی زیادہ تر ساس کا رول ادا کرتی ہے۔ ساس کا نام سن کر بہو کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ ساس بہو کے جھگڑوں میں ہمیشہ بہو کو مظلوم اور ساس کو ظالم مانا گیا ہے ایسا شاید ہی کبھی سننے میں آتا ہو کہ فلاں سسر اپنی بہو پر ظلم کا پہاڑ توڑ رہا ہے یا فلاں بہو اپنی ساس کا جینا حرام کئے ہوئے ہے۔ اسے تو صرف ساس ہی کا پیدائشی حق سمجھا جاتا ہے۔

اس مسئلہ پر محققین اور صاحبانِ عقل و دانش نے غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ بیٹے کا اپنی نئی نویلی بیوی پر فریفتہ ہونا (جو کہ فطری ہے) ماں کی انا کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کل تک اس کا بیٹا اس کے کہنے میں تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس کا ہر حکم مانتا تھا لیکن اب ماں کو وہ اس طرح نظر انداز کر رہا ہے جیسے کہ وہ اس کی کچھ نہیں۔ اور بہو کل کی چھوکری جسے وہ بیاہ کر لائی ہے اس کی سب کچھ بن گئی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ماں ساس بن جاتی ہے۔ یعنی وہی جذبۂ رقابت جو ازل سے ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی پہلی ساس ہی سے اس روایتی دشمنی کی ابتداء ہوئی ___

علماء کے اس نظریئے سے قطع نظر اگر ساس کو ایک عام عورت کے روپ میں دیکھ کر منصفانہ جائزہ لیا جائے تو اس کے خلاف بنائے گئے محاذ کے ستون ڈھ جائیں گے ___ ساس آخر کب تک یہ تہمتیں برداشت کرےگی سنا ہے ہر بارہ سال بعد نحوست کے سائے انسانی جسم کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں لیکن بے چاری ساس صدیوں سے قابلِ گردن زدنی بنی ہوئی ہے۔

ہم ایک ساس کو جانتے ہیں۔ بے چاری نے اپنی ساری زندگی شوہر کی خدمت اور نصف درجن بچوں کی تربیت میں گزار دی اپنے مرحوم شوہر سے شاہجہاں کی محبت کی لافانی یادگار تاج محل کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اس کے خوابوں کا یہ محل اب بھی ایک بوسیدہ کیلنڈر پر آباد تھا جو اس کے گھر کی ایک دیوار پر آویزاں تھا۔ اسے دیکھ کر ہی وہ خوش ہو جاتی تھی کہ تاج محل اس کے گھر موجود ہے ___ اب جبکہ اس کے بڑے لڑکے کی شادی ہو چکی ہے تو بیٹا اپنی بیوی کو لے کر ہنی مون منانے

تاج محل کا پروگرام بناتا ہے اور اس پروگرام میں غلطی سے بھی وہ ماں کا نام شامل نہیں کرتا ــــ اب آپ ہی سوچئے کہ جو بیٹا ماں کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا اس کے اشاروں پر چلتا تھا اب نئی نویلی دلہن کے بہکاوے میں آکر ماں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر تاج محل دیکھنے جا رہا ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ ہنی مون سے واپسی پر ساس کے سامنے تاج محل کی ہی نہیں بلکہ دلی کے لال قلعہ اور قطب مینار کی سیر سپاٹے کے قصے چٹخارے دار زبان میں بیان ہوں تو کون ایسی ساس ہوگی جس کے منہ میں پانی نہیں بھر آئے گا ــــ ساس کا اب یہ سمجھ لینا کہ بہو اس کو جلانے کے لئے یہ سب قصے بیان کر رہی ہے بالکل فطری ہے۔ اور پھر وہ اپنی بہو کو سمجھاتی ہے کہ جب اس کی شادی ہوئی تھی تو برسوں وہ اپنی اور خسر کے سامنے اپنے شوہر سے بات بھی نہیں کرتی تھی اور آج کل کی چھوکریوں کے دیدے کا پانی مر گیا ہے۔ مہندی بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتی اپنے میاں کو سکھا پڑھا کر سیر سپاٹے پر لے جاتی ہیں ــــ اب بہو صفائی پیش کرنے میں لگ جاتی ہے کہ ہنی مون کے دوران ساس کا ساتھ رہنا کباب میں ہڈی جیسا ہوتا ہے تو بے چاری کیا برا دری میں اتنا بھی نہیں کہہ سکتی کہ دیکھو مجھے بہو نے ہڈی بنا دیا ہے ــــ ظلم تو بہو ساس پر کر رہی ہے۔

ساس کو اپنے غیر شادی شدہ بیٹوں سے بہت پیار ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ شادی کے بعد تو جورو کے غلام ہو کر ماں کو پوچھتے ہی نہیں۔ لیکن لڑکیوں کے معاملے میں شادی شدہ یا کنواری کی قید نہیں۔ لڑکیاں تو اس کی چاہت ہوتی ہیں۔ جب شادی شدہ بیٹیاں اپنے میکے آتی ہیں تو ماں بیٹیوں میں کئی دنوں تک کھسر پھسر چلتی رہتی ہے۔ بیٹیاں اپنی ساس کی شکایت کرتی ہیں اور ماں ساس سے نپٹنے کی ترکیبیں بتاتی ہے ــــ اگر غلطی سے ان سرگوشیوں کا بھنک بہو کے کانوں میں پڑ جائے اور وہ چھوٹی نندوں کو سمجھانے کی کوشش کرے کہ مفاہمت سے بڑھ کر مفید چیز کوئی نہیں ہوتی۔ لڑنے جھگڑنے سے ہمیشہ نقصان ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ ــــ تو ساس کو برا لگنا قدرتی امر ہے۔ یہ بہو تو غیر گھر کی ہے اس کی بیٹیوں کو سبق پڑھانے والی یہ کون ہوتی ہے ــــ ایم اے بی اے پاس کیا کر لیا بڑے چھوٹوں کا لحاظ نہیں۔ بڑی آئیں نصیحت کرنے والی ــــ اب آپ ہی بتائیے کہ پروفیسر لوگ کیا کرتے ہیں۔ یہی نا کہ جو وہ پڑھتے ہیں وہی اپنے طلباء کو پڑھا دیتے ہیں۔ اب اگر ساس سب داؤں پیچ بہو سے سیکھ کر اپنی بیٹیوں کو سکھا دے تو اس میں برائی کیا ہے ــــ یہ ایک عام شکایت ہے کہ ہر ساس خود کو اچھا اور بہو کو برا کہتی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کون اپنے کو افضل و برتر نہیں سمجھتا۔ پھر ساس کیوں نہیں سمجھے؟

ایک ساس کی بہو سے ہم واقف ہیں۔ صحن کے ایک گوشے میں ایک پکی قبر تعمیر کروانے میں مصروف تھیں۔ ہم نے دیورانہ مذاق سے پوچھا "بھابی! یہ کس کا سامان قتل ہے۔ کون زندہ چنوایا جا رہا ہے؟" ادھر سے ایک سنجیدہ جواب ملا کہ ساس کی قبر تعمیر ہو رہی ہے ــــ ہم نے چونک کر ان محترمہ کی ساس صاحبہ کو دیکھا جو تخت پر بیٹھی پاندان کھولے سروتہ سے چھالیہ کتر رہی تھیں اور بھابی سے کہا کہ آہستہ بولئے کہیں وہ سن نہ لیں تب ــــ "سن لینے دو مجھے کسی کی پرواہ نہیں، میں تو دنیا کی پہلی ساس کی یہ قبر تعمیر کروا رہی ہوں۔ ہر سال یہاں عرس ہوا کرے گا ــــ" ہم نے وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا کہ آیا وہ کے سو فیصدی سچ پیشنگوئی کر رہی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو آخر ان کو یہ کس طرح پتہ چلا کہ دنیا کی پہلی ساس یہیں دفن ہو۔ اس پر محترمہ نے جواب دیا کہ "رات میرے خواب میں ایک انتہائی بڑھی عورت آئی تھی۔ سفید بال بکھرے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور منہ سے کئی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ وہ دنیا کی پہلی ساس ہے جس نے غصہ میں آکر اپنی بہو کو بددعا دی تھی۔ اسی لئے دنیا میں ابھی تک ساس بہو کے جھگڑے ہوا کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کی قبر بنا کر اس کا ہر سال عرس کروائے تو وہ اپنی بددعا واپس لے لے گی ــــ اسی لئے میں یہ قبر تعمیر کروا رہی ہوں۔

یہاں دھوم دھام سے وش منایا جائے گا۔ سب سے زیادہ مظلوم بہو اس کی مجاور ہوگی ــــ"
اب آپ ہی غور فرمائیں کہ بہو کی اس منہ زوری پر اگر ساس سر دتہ بجانا بند کرکے منہ پیلانا شروع کردے ــ تو اس
دار کون ہے؟

ساس بہو کے جھگڑوں کی ایک وجہ ساس کی کم علمی بھی بتائی جاتی ہے۔ لیکن یہ سب عذر نامعقول ہے کیوں کہ تعلیم یافتہ
ب ساس بنتی ہے تو پھر وہی ڈرامہ اسٹیج ہوتا ہے۔ ان جھگڑوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کروانے کے لئے کئی ترقی پسند
ے اور مہیلا سماج سدھار سب ہی کوشاں رہتے ہیں لیکن ہمیشہ انھیں منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ ایک مہم چلائی گئی کہ لڑکا اور
کی جنم پتریاں دیکھنے کے بجائے لڑکی اور اس کی ہونے والی ساس کی جنم پتریکائیں دیکھی جائیں اور انہی کے ستارے اور
ملائے جائیں ــــ لیکن یہ مہم کچھ ہی عرصہ میں بُری طرح فلاپ ہوگئی کیوں کہ کسی بھی لڑکی کے ستارے اس کی ہونے والی ساس
ستاروں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے ــــ

بہو بننے کے بعد جو جو بھی عتاب اس پر نازل ہوئے تھے انھیں خون کے گھونٹ پی کر وہ اسی دن کا تو انتظار کرتی ہے
کب ساس بنے اور کب اپنی بہو سے چن چن کر بدلہ لے۔ یہ ایک سائکل ہے جو چلتا رہے گا۔ یہ ایک فطری اور حقیقت پسندا
م ہے۔ "ساس بھی کبھی بہو تھی" اس قسم کے نعرے لگا کر ساس کو شرمندہ کرنے کی ناکام کوششیں کی جاتی ہیں لیکن
آخر کیوں شرمندہ ہو ــــ آج کی بیٹی کل کی بیوی پرسوں کی ساس ــــ عقلمند شوہر ایک اچھے سیاست داں کی طرح
جھگڑوں سے ہمیشہ اپنے کو الگ رکھتے ہیں ــــ

ان جھگڑوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی غرض سے ہمارے معاشی جمہوری نظام میں عورتوں کو مردوں کے برابر
ق سونپے گئے ہیں۔ مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرنے سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوگا کہ ساس دن بھر کی تھکی ہاری شام
مر واپس آئے گی اور بہو آفس کے کام سے تھک کر چور اپنے مکان پہ پہنچے گی۔ تھکے ہارے ساس بہو ایک دوسرے کی
ن دیکھ کر ایک دوسرے سے ہمدردی جتائیں گے ــــ اس طرح ازل سے چلی آتی ہوئی دشمنی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے
لیکن غور فرمایئے گھر کا ماحول گورِ غریباں کی طرح نظر آئے گا ــــ ہر طرف خاموشی سکوت جیسے کہ زندگی ہی نہ ہو۔ گھر کتنا
سونا نظر آئے گا ــــ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایک گھر سے اس کی زندگی چھین کر اسے قبرستان بنادے ــ ساس بہو
دوسرے سے لڑنے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہیں ــــ انھیں خوب لڑنے دیجئے۔

لڑے بھی جاؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔

⁂

غزلیں

بیڈھب کا مشورہ

اب خدا رکھے ہماری لاج ہم گھبرا گئے — مٹھی بھر آٹا نہیں مہمان گھر میں آ گئے
گیہوں چاول کی کمی ہے کھائیے صاحب جوار — اچھے دن کے کا خواب دیکھا تھا بُرے دن آ گئے
آج بیگم کو سنائی ہم نے بھی وہ گرم گرم — بات تلووں سے لگی تالو میں چھالے آ گئے
ہم سے ترچھے ترچھے لوگوں سے ہے شاید اکو بیر — مجھکو دیکھا دور سے تو راستہ کترا گئے
بیگم ان بچوں کو لیجاؤ کہ میں گھبرا گیا — ناک میں دم کر دیا کمبخت بھیجا کھا گئے
اونچی پوری شخصیت اُن کی کہاں وہ تم کہاں
آپ حضرت! حضرت بیڈھب سے کیوں ٹکرا گئے

ریاض مالیگانوی

اتحف آیا شاندار ہے موقع اُٹھائیے — تہذیب نو کا ' مل کے جنازہ اُٹھائیے
کافی تھا ہم کو آنکھ دکھانا جناب من — کس نے کہا تھا آپ سے ڈنڈا اُٹھائیے
ساحل پہ آ کے غرق ہوا حُسن کا جہاز — اے طالبانِ دید جنازہ اٹھائیے
میڑنی کے رُوم میں ہوتا ہے روز و شب — پردہ گرائیے کبھی پردہ اٹھائیے
دیکھا تھا جانے خواب میں کس روسیاہ کو — دھندہ بہت ہے صبح سے مندہ اٹھائیے
کہنے لگے وہ اپنا ہی دیوان دیکھکر — کس بیوقوف کا ہے پلندہ اٹھائیے
محفل میں بار بار ہر اک سے ہے التماس — عمدہ ہو جس کسی کا بھی مصرعہ اٹھائیے
بے حس ہے قوم لے نہیں سکتی کبھی حساب — اپنا سمجھ کے قوم کا چندہ اٹھائیے
ہو نظم یا کہ نثر کسی طور سے ریاض
مُردہ دلانِ شہر کو زندہ اُٹھائیے

غزلیں

منزل کا پتہ ہے نہ کوئی راہنما ہے — منہ جس کا جدھر ہے وہ اسی سمت چلا ہے
بچوں کا اضافہ جو مرے گھر میں ہوا ہے — مولا کا کرم ہے کہ بزرگوں کی دعا ہے
جب دیکھئے اشعار سنانے پہ تلا ہے — شاعر ہے کہ آفت ہے مصیبت ہے بلا ہے
اندھے کہ اندھیرے میں بھی احساس دلا ہے — اپنوں ہی میں بس ریوڑیاں بانٹ رہا ہے
اوڑھوں کہ بچھاؤں مری قسمت کا لبادہ — سو بار پھٹا ہے تو یہ سو بار سلا ہے
سرسوں تو ہتھیلی پہ جمی ہے نہ جمے گی — ہمدرد حسینوں میں ملیگا نہ ملا ہے
ہے عہد گزشتہ کا یہ شوہر کوئی افسوس
جرأت سے مقابل میں جو بیگم کے ڈٹا ہے

فیاض افسوس

غزلیں

گرانی جب سے آئی عشق کا بازار مندا ہے
نہ تو جینے کا بزنس ہے نہ اب مرنے کا دھندا ہے
وہی آنچل کا ٹکڑا کام جو دیتا تھا جھنڈے کا
وہ اب ٹائی کی صورت میں مری گردن کا پھندا ہے
بتاؤں کیا غموں کے گھن لگے ہیں دل کی لکڑی میں
حسیں آنکھوں کی آری ہے نہ تو نظروں کا رندا ہے
برا ہو چند خوردوں کا کہ بد ظن کر دیا سب کو
چھری پٹ سٹو کریں کیسے نہ چندی ہے نہ چندا ہے
پجاری جی کی نظریں ہیں فقط پوری کچوری پہ
یہ سیٹھ وقت بھی اب مرغ و بریانی کا بندا ہے

رام لعل نابھوی

رسمِ اجرا

بچو کل تمہیں ادب اور ادیبوں کے بارے میں
بتایا گیا تھا۔ ایک بات نوٹ کر لو کہ ادب کے بارے میں جو کچھ بتایا
جائے اُسے ذہن نشین کر لو اور جو کچھ ادیبوں کے بارے میں بتایا جائے اسے
ذہن کی اوپر کی سطح تک رکھ چھوڑو۔ ہاں تو تم پوچھو گے کہ ایسا کیوں۔ کیوں کہ ادب تو پیدا
ہی ادیبوں سے ہوتا ہے۔ تو بچو یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے۔ خود ہی سمجھ
جاؤ گے۔ ہو سکتا ہے۔ تب تک تم خود ہی ادیب بن جاؤ ـــــ

تو بچو آج میں تمہیں رسمِ اجراء کے بارے میں بتاؤں گا۔ رسمِ اجراء کے معنی ہیں کسی چیز کے جاری کئے جانے پر اس کی رسم ادا کرنا۔ یہ رسم کسی بھی چیز کے لئے ہو سکتی ہے۔ لیکن ادیبوں نے کمال ہوشیاری سے اسے اپنے لئے ہی محدود کر لیا ہے۔ یہ رسم حال ہی کی پیداوار ہے۔ لیکن اس رسم نے بڑی ترقی کی ہے۔ یہ بات باعث حیرت ہے کہ اس رسم کی پیدائش پر کوئی رسم نہیں ہوئی۔ نہ اس کے اجراء کی رسم ادا کی گئی۔ ہاں تو بچو یہ رسم کسی نئی کتاب کے چھپنے کے بعد اور اس کی فروختگی سے پہلے ادا کی جاتی ہے۔ یہ کتاب کی مشتہری کا ایک ذریعہ ہے۔ مشتہری کے بہت طریقے ہیں۔ ڈھنڈورچی کے ذریعے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے۔ اخباروں، رسالوں کے ذریعے۔ سینما کے ذریعے؛ مشتہری کے اور ذرائع صرف رقم خرچ کرنے سے ہی دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن اس ذریعے پر خرچ بھی بہت ہوتا ہے اور محنت بھی بہت۔ صرف وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو ہتھیلی پر سرسوں جما سکتے ہیں ـــــ

بچو پہلے وقتوں میں ادیب رسمِ اجراء کو اس لئے ایجاد نہیں کر سکے کہ وہ اپنی مشتہری کرنا معیوب سمجھتے تھے۔ کتاب منظرِ عام پر آتی تھی۔ ادب نواز فیصلہ صادر فرماتے تھے۔ نقاد حضرات مصنّف کی تخلیق کا جائزہ لیتے تھے۔ ایماندارانہ تبصرہ دیتے تھے۔ ادیب مستفید ہوتے تھے۔ ناظرین لطف لیتے تھے۔ یہی ادیبوں کی محنت کا صلہ ہوتا تھا۔ کچھ ادیب ایسے بھی تھے جو فرضی نام سے لکھتے تھے۔ گمنام ادیب گمنام پیدا ہوئے۔ گمنام ہی مر گئے۔ ان کے مضامین کا انتظار رہتا تھا۔ لوگ یہ جاننے کے لئے کہ "کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں" بے چین اور بے قرار رہتے تھے۔ اب وہ بات نہیں۔ اب تو بہت، ادیب اتنے گمنام

ادیبوں کی تخلیقات ردّ و بدل کے ساتھ اپنے نام سے چھپواتے ہیں۔ پھر ادب تو نام ہی نئی بات پیدا کرنے کو کہتے ہیں اور یہ نئی بات پیدا کرتے ہیں ادیب۔ ادیب ادب میں نئی بات پیدا کر دیں تو ادب نکھرتا ہے۔ ادیب اپنے لئے نئی بات پیدا کریں تو ادیب نکھرتا ہے۔

اب ادیب کیسے نکھرتا ہے سنو۔ تم اخبار اور رسالے پڑھتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کسی رسالے یا اخبار میں کسی نئے شاعر یا ادیب کا کلام چھپتا ہے۔ تو اس پر چوں میں پھر کچھ خطوط بھی چھپتے ہیں، جن میں اس شاعر یا ادیب کی تعریف ہوتی ہے۔ پھر کچھ ایسے خط بھی چھپتے ہیں کہ فاضل مصنف اپنا کلام کتابی صورت میں لائیں تاکہ لائبریریوں اور کتب خانوں کی زینت بنے۔ عوام و خواص ایک ہی وقت لطف اندوز ہوں۔ بس سمجھئے رسم اجراء کی تیاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب ادیب صاحب سودے بازی کرتے ہیں اور کتاب چھپوا لیتے ہیں۔ ان کتب میں ایک کتاب اعلیٰ قسم کے کاغذ پہ چھپتی ہے اور اس کی جلد بھی خاص ہوتی ہے۔ بس بچو یہی وہ کتاب ہے جسے رسم اجراء کے وقت خاص مقام دیا جاتا ہے۔

بچو رسم اجراء جیسا کہ میں نے ابھی بتایا جان جوکھوں کا کام ہے۔ دماغ حرکت میں آتا ہے۔ جسم حرکت میں آتا ہے۔ جیب حرکت میں آتا ہے۔ سب سے پہلے کتاب کو کسی نقاد کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ کہ وہ رسم اجراء ادا کرے۔ کیوں کہ ادبی دنیا میں اس کا مقام ہوتا ہے۔ وہاں کامیابی نہ ملی تو کسی بڑے آدمی کے ہاں پہنچے جنہیں ادب سے لگاؤ ہے۔ وہاں کسی نے منہ نہ لگایا تو ارباب سیاست کے پاس پہنچے۔ انھیں اور کیا چاہیئے۔ اُن کا نام ہوا انھیں اس سے غرض ان کا کام ہوا انھیں اس سے غرض۔ ایک آدھ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کو خاص نمائندگی دی جاتی ہے۔ اس رسم میں سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ حاضرین کو رسم اجراء شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے اور ختم ہونے کے کچھ دیر بعد تک حاضر رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا علاج بھی سوچ لیا جاتا ہے۔ اعلیٰ قسم کے طعام حاضر رکھے جاتے ہیں۔ فوٹوگرافر تک سے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ کتنی تصاویر مفت پیش کی جاتی ہیں۔ کتنے رسالوں میں چھپنی ہیں۔ غرض کہ ہر پہلو پر غور کیا جاتا ہے

لو بچو اب تم رسم اجراء کو اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ یہ ریل مجھے ایک شاعر نے دی تھی کہ میں تمہیں دکھاؤں۔

تم ایک عالیشان عمارت دیکھتے ہو۔ جو بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔ دونوں طرف لوگ پھولوں کے ہار اور گلدستے لیئے کھڑے ہیں۔ بڑی اشتیاق سے کسی کا انتظار کر رہے ہیں موٹر گاڑیاں، سکوٹر۔ قطار در قطار کھڑے ہیں۔ لو پھولوں سے سجی ہوئی ایک کار آرہی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ اس پھولوں سے لدی ہوئی کار سے کوئی دُلہا اترے گا اس رسم کا دولہا تو ہاتھ باندھے ہوئے بار بار لوگوں کے پاس سے گزرتا ہے۔ اور مارا مارا پھر رہا ہے وہ دیکھو شاعر صاحب گاڑی کی طرف لپکے اور فوٹوگرافروں کو اشارہ کیا۔ کار کا دروازہ شاعر صاحب نے نہایت تپاک سے کھولا اور عجز و انکساری سے جھکے۔ یہ کار سے اترنے والے شہر کے نامی گرامی رئیس بھی ہیں۔ فیتے کاٹنا انھوں نے کسی سے نہیں سیکھا۔ یہ ان کا خاندانی پیشہ ہے۔ شاعر صاحب رئیس صاحب کے ساتھ پیچھے چلے جا رہے ہیں اور فوٹوگرافر چیاں ح اور تڑاخ سے فوٹو اتار رہے ہیں۔

اب یہ جو بڑا کمرہ تم دیکھ رہے ہو اور اس میں جو عالیشان سامان پڑا ہے۔ یہ سب سامان شاعر صاحب کرایہ پر لائے ہیں۔ یہی وہ کمرہ ہے جہاں یہ رسم ادا ہوگی۔ لو مہمانِ خصوصی تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور ان کے پاس صاحبِ کتاب تشریف فرما ہوئے۔ بچو تم دیکھ رہے ہو کہ ایک طرف ایک ہی قسم کی کتابوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے اور اس پر ایک عمدہ قسم کی جلد بند کتاب بھی پڑی ہے اور جس پر ایک عمدہ فیتہ ہے۔ بس یہی وہ کتاب ہے جسے مہمان خصوصی شاعر صاحب کو پیش کریں گے۔ اب تم یہ ضرور پوچھوگے کہ شاعر صاحب کی ہی کتاب کو شاعر صاحب کو پیش کرنا کیا معنی لیکن بچو یہ سوالات چھوڑو۔ سامنے

وہ مہمانِ خصوصی نے کتاب پیش کی۔ اُدھر شاعر صاحب اٹھے اِدھر ٹیلی ویژن حرکت میں آیا۔ کیمروں کے بلب چمکے۔ لوگوں نے تالیاں پیٹنی شروع کیں۔ دیکھو آدھی کتاب مہمانِ خصوصی کے ہاتھ میں ہے اور آدھی شاعر صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ شاعر صاحب کنکھیوں سے فوٹو گرافروں کو اشارہ کر رہے ہیں۔ بچو یہی وہ موقعہ ہے جس کا شاعر صاحب کو انتظار تھا۔ اب شاعر صاحب کو کلام سنانے کی دعوت دی گئی ہے۔ بچو کلام تو تم نے پڑھا ہوگا کیوں کہ وہ مختلف رسائل میں بار بار چھپ چکا ہے۔ اب سن بھی لو۔ لو رسم اجراء ختم ہوئی۔ اب تم ایک کمرے میں پہنچو گے۔ جہاں انواع و اقسام کے کھانے میزوں پر سلیقے سے چنے ہیں۔ یہ کیا مہمان کھانے کی میزوں پر ٹوٹ پڑے۔ بچو یہ نظارہ تمہیں دکھایا جائے گا۔ رسم اجرا کی چھٹی ہوئی تمہیں بھی چھٹی۔

۵۵

آ....

طالب خوندمیری

آتو، میرا گھر بار چلانے کے لئے آ
اتّی کا مری ہاتھ بٹانے کے لئے آ

جلنے کو تو اغیار بھی آتے ہیں مگر، تو
تا عمر میرے گھر میں ٹھکانے کے لئے آ

ق

منظور اگر تجھ کو نہیں ہے مرا رشتہ
دو وقت کا کھانا ہی پکانے کے لئے آ

یہ بات بھی ہمدم جو گوارا نہیں تجھ کو
آ مجھ کو مرید اپنا بنانے کے لئے آ

ہوتے ہی نہیں تجھ سے اگر کام بھی گھر کے
سرکار مری بیٹھ کے کھانے کے لئے آ

بن کر مری بیوی تو، اگر آ نہیں سکتی
رانی کی طرح حکم چلانے کے لئے آ

آتا ہی نہیں تجھ کو اگر پیار جتانا
رنجش ہی سہی، دل ہی دکھانے کے لئے آ

ق

یہ بھی نہیں ممکن تو مری جاں، مری دلبر
ٹنگی کا مجھے ناچ نچانے کے لئے آ

اوروں نے حسیں خواب دکھائے ہیں مگر، تو
جنّت بھی ہتھیلی میں دکھانے کے لئے آ

اتنی سی گزارش ہے مری، جانِ تمنّا!
آنا ہے اگر تجھ کو، نہ جانے کے لئے آ

ایمرجنسی کے بعد

گڑبڑ حیدرآبادی

ایک ایسا انقلاب آیا ایمرجنسی کے بعد
ہو گیا چوروں کا منہ کالا ایمرجنسی کے بعد

پیٹ کر سر کہہ رہے ہیں سارے اسمگلر یہی
مل گیا ہے خاک میں دھندا ایمرجنسی کے بعد

ٹیکس سے اب کالا سرمایہ چھپانے کے لئے
منہ چھپاتے پھرتے ہیں لالا ایمرجنسی کے بعد

راشیوں کے گھر میں ماتم ہے کہ اب ہم کیا کریں
سرد ہے بازار رشوت کا ایمرجنسی کے بعد

غنڈہ گردی چور بازاری کی نبضیں رک گئیں
چاک ان کا ہو گیا پردہ ایمرجنسی کے بعد

اٹھ رہے ہیں دھوکے بازوں کے جنازے رات دن
دے نہیں سکتا کوئی دھوکہ ایمرجنسی کے بعد

رہ گئے خالی کٹورے صرف دسترخوان پر
منہ چھپاتا ہے ہر اک چمچہ ایمرجنسی کے بعد

مٹ گئی فرقہ پرستی سارے ہندوستان سے
بج رہا ہے امن کا ڈنکا ایمرجنسی کے بعد

لے رہے ہیں اہلِ گلشن آج آزادی کی سانس
چل گیا جادو کا وہ ڈنڈا ایمرجنسی کے بعد

حریت کی ہر جگہ ہیں اب تبسّم ریزیاں
ہو گیا ہے ختم سب رونا ایمرجنسی کے بعد

جو سمجھتے تھے حکومت ہاتھ میں آ جائے گی
ان کی حسرت ہو گئی مردہ ایمرجنسی کے بعد

اب کہیں گڑبڑ کی صورت ہی نظر آتی نہیں
اور ہی ہے دیکھئے نقشہ ایمرجنسی کے بعد

سید نصرت آرکیٹکٹ

فارین کا چکر!

عرصہ ہوا ہم نے انگریزی زبان کا ایک لفظ سنا تھا
"فارین" جو ایسے موقعے پر استعمال کیا جاتا تھا جب کوئی شخص سامانِ سفر باندھ کر
ہندوستان سے کہیں کوچ کرتا تھا یا کوئی شخص باہر سے کوچ کر کے ہندوستان آدھمکتا تھا۔
ہماری دانست میں ہم نے یہ قیاس باندھ رکھا تھا کہ "فارین" کسی ایسے ملک کا نام ہے جو ہندوستان
میں یا ہندوستان کے قریب ہی کہیں نیا نیا عالم وجود میں آیا ہے لیکن آہستہ آہستہ جب اس لفظ کا چلن عام ہونے
لگا اور ہر ایرے غیرے نتھو خیرے نے لفظ فارین کا استعمال کرنا شروع کر دیا (جیسے ہمارے دھوبی راملو نے تاڑ
پلی گرزم سے واپسی کے بعد ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ حضور میں اپنی بچّی کی شادی کے سلسلہ میں فارین گیا ہوا تھا وغیرہ) تو ہمارا
جذبۂ تجسس جاگ اٹھا اور ہم نے ارادہ کر لیا کہ اس لفظ کے حقیقی معنیٰ و مطالب تلاش کر کے ہی رہیں گے اور معنیٰ دریافت ہونے
پر اس لفظ کو جملوں میں بھی استعمال کریں گے یعنی ہم بھی فارین ہو آئیں گے۔ چنانچہ کئی دانشوروں سے جب اس لفظ کے معنیٰ معلوم
کئے گئے تو متضاد توضیحات سامنے آئے۔ کسی نے بتایا کہ ہر انگریزی ملک کو فارین کہا جاتا ہے تو کسی نے سمجھایا کہ سعودی عرب فارین
ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ سوائے ہندوستان کے ہر ملک فارین ہے تو کسی کا استدلال تھا کہ فارین اس ملک کا نام ہے جہاں سے اکثر اشیاء
ہمارے دیش کو اسمگلنگ کی جاتی ہیں جیسے فارین کا کپڑا، فارین کا سینٹ، فارین کا کیمرہ، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ فارین کے تعلق سے اتنی
ساری تحقیقی باتوں کو جان لینے کے بعد ہم نے بھی ارادہ کر لیا کہ فارین جہاں کہیں بھی واقع ہو ہم ایک بار ہی سہی اس کے درشن
کر آئیں گے۔ پھر ہمتِ مرداں مددِ خدا کے مصداق ہم نے رختِ سفر باندھنے کی سرسری کارروائی شروع کر دی اس
سلسلے میں کسی نے بتایا کہ فارین جانے کے لئے فوٹو لائسنس (جسے عُرفِ عام میں پاسپورٹ کہا جاتا ہے) کا ہونا
اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کسی کی شادی طے کرنے کے لئے اسم نویسی لازمی ہے۔ پھر مرتا کیا نہ کرتا'
جب فارین کا رختِ سفر باندھ ہی لیا تھا تو ایسی معمولی معمولی چیزوں کو خاطر میں لانے کا سوال
پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ دوست احباب سے تمام راز ہائے بنوائی پاسپورٹ
معلوم کئے گئے اور بہتوں کے پاسپورٹوں کی زیارت

سے مشرف ہوگئے (یہاں ہم پر اس بات کا عقدہ بھی کھلا کہ ہمارے سارے کے سارے قریبی احباب پاسپورٹ زدہ ہیں اور کچھ دوست احباب نے پاسپورٹ کے حصول کے لئے درخواست دے رکھی ہے پھر کچھ ایسے حضرات سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا جن کے پاس پاسپورٹ کے فارم تو موجود تھے لیکن وہ اُن فارموں پر کسی معقول I.A.S. آفیسر کے دستخط کروانے کے سلسلہ میں سرگرداں ہیں) پاسپورٹ کے حصول کی اِن ساری سرگرمیوں اور افراتفری کو دیکھ کر ہمیں بے اختیار وہ زمانہ یاد آگیا جب کہ ملک کے نوجوان پڑھ لکھ کر جواہر لعل نہرو، گاندھی جی یا ابوالکلام بننے کے آرزو مند ہوتے تھے پھر رفتہ رفتہ اُن کی امیدوں اور آرزوؤں کے مراکز دلیپ کمار، راجیش کھنہ اور ششی کپور ہونے لگے۔ لیکن آج ہر نوجوان یہی چاہتا ہے کہ وہ فارین جائے اور خوب روپیہ کما کر دادِ عیش دے (اس جذبے میں کہیں کہیں حبُ الوطنی بھی پائی جاتی ہو گی تو واللہ عالم......)

پاسپورٹ کے فارم داخل کرنے کے بعد ہم نے احتیاطاً دفتر سے ایک ماہ کی رخصت اتفاقی اس لئے حاصل کر لی کہ مبادا کہیں پوسٹ مین ہمیں گھر پر نہ پاکر ہمارا پاسپورٹ کسی اور کے حوالے کر دے۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی آیا اور ہماری پوری ایک ماہ کی رخصت ختم ہونے کے بعد ایک روز جب ہم یونہی دردِ سر کا بہانہ کر کے گھر میں لیٹے ہوئے تھے کہ ڈاکیہ نے پاسپورٹ آنے کا مژدہ سنایا اور اس طرح ہم بھی اہلِ پاسپورٹ ہو گئے۔

پاسپورٹ حاصل ہونے کے بعد ہم نے سب سے پہلے اس شخص سے ملنا مناسب سمجھا جس نے محض پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے ہماری شادی کا پیغام اپنی لڑکی کے لئے نامنظور کر دیا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کے ساتھ اپنی لڑکی بیاہ دی ہے جو امریکہ میں مستقل سکونت پذیر ہے اور موصوف خود بھی لڑکی کے ساتھ آجکل "گھر سسر" بن کر امریکہ ہی میں رہ رہے ہیں۔ حصولِ پاسپورٹ کے بعد سب سے بڑا مسئلہ جو ہمارے سامنے آیا وہ تھا کسی فارین ملک کا ویزا، حاصل کرنا گویا ویزا کا پانا اور جُوئے شیر کا لانا دونوں برابر ہیں۔ ویزے کے تعلق سے پہلے پہل تو ہماری معلومات صفر کے برابر تھیں لیکن جیسے جیسے ہماری تحقیق آگے بڑھتی گئی ہم پر عقدہ کھلنے لگا کہ ویزے بھی کئی انواع و اقسام کے پائے جاتے ہیں جیسے آزاد ویزا، ٹرانزٹ ویزا، جاب ویزا، ویزیٹنگ ویزا، ایجنٹ کا فروخت کیا ہوا ویزا، اقساط پر خریدا گیا ویزا، یا کسی شیخ کا باہر لایا ہوا ویزا، اور ان سارے ویزوں کا انجام ہمیں ایک ہی سا لگا۔ کیوں کہ جو بھی شخص ایک بار ان ویزوں کے ذریعہ فارین جاتا ہے تو پھر اپنے ملک کو واپس نہیں لوٹتا۔ اب اسے ہماری خوش قسمتی ہی سمجھئے کہ ان دنوں کسی عرب ملک سے ایک شیخ صاحب ہمارے شہر آئے ہوئے تھے تاکہ یہاں سے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاسکیں۔ چنانچہ ہم نے بھی درخواست پیش کر دی اور انٹرویو کے لئے بلائے گئے۔ شیخ صاحب نے عربی نما انگریزی اور انگریزی نما عربی میں ہم سے بہت سارے سوالات کئے اور جب انھیں یہ بتایا گیا کہ ہم گرائجویٹ ہیں کسی بھی طرح کے کام کرنے کی اپنے میں پوری صلاحیت رکھتے ہیں تو انہوں نے یہ کہہ کر ہماری درخواست رد کر دی کہ انھیں کسی میٹرک پاس امیدوار کی تلاش ہے گرائجویٹ کی نہیں۔ پھر ہمیں یہ مشورہ دیا گیا کہ ہم میٹرک کا امتحان پاس کریں اور پھر سے نئی درخواست دیں۔ کچھ عرصہ بعد جب یہ معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کسی موزوں امیدوار کے انتخاب کے لئے نہیں بلکہ اپنی بارہویں شادی کے چکر میں شہر تشریف لائے ہیں تو ہمیں اپنی گرائجویشن کی ڈگری پھر سے اہم دکھائی دینے لگی۔ لیکن ویزا حاصل کرنے کا مسئلہ بہر حال اپنی جگہ اب تک برقرار ہے۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ ہم دہلی جا کر اپنا مطلوبہ ویزا انتہائی آسانی اور سہولت سے حاصل کر سکتے ہیں۔ (تعجب ہے کہ اتنا قیمتی اور آسان سا نسخہ ہمارے دماغ میں اب تک کیوں نہیں آیا)۔ چنانچہ ایک مناسب اور معقول ملک ہمارے اور ہماری طرح بہت سارے لوگوں کے خیال میں ایک سونا اگلنے والا ملک ہے) انتخاب کر کے ہم دہلی جا

کافی جد و جہد کے بعد ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر پورے زور و شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے دو عدد سوٹ سلوائے گئے (جو فارین جانے کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں) پھر جوتے خریدے گئے (کیوں کہ صرف یہی ایک واحد شئے ہے جو دوسرے ممالک کی بہ نسبت ہمارے ملک میں نہایت ہی سستے پڑتے ہیں)۔ جوتے کھانا، جوتے اچھالنا، جوتیاں چٹخانا، جوتیوں میں دال بٹنا اور اسی طرح کے کئی اور محاورے صرف اور صرف ہماری دین ہیں۔ جوتوں کی خریداری کے بعد ہر اقسام کے اچار، پاپڑ، بڑیاں، لنگیاں، رومال، موزے، پیجامے، ناڑے مصالحے اور اسی طرح کی دوسری انتہائی ضروری چیزیں خریدی گئیں اور اس طرح باہر جانے کی ابتدائی تیاریوں کا اختتام عمل میں آیا۔

پھر دوسرے مرحلے کی جملہ کارروائی کا آغاز ہوا جس میں دعوتیں اڑانا، پھول پہننا، اپنی سعادت مندی کا دل کھول کر مظاہرہ کرتے ہوئے رشتہ داروں اور دوست احباب سے ملاقات کرنا اور اُن سے اس بات کا وعدہ کرنا کہ ہم فارین پہنچتے ہی دامے درمے قدمے سخنے اُن کی بھی مدد فرمائیں گے اور دو چار تجربہ کار بلکہ ناہنجار قسم کے حضرات کو اپنے ہاں بُلا بھی لیں گے۔ ان غیر رسمی کارروائیوں کے بعد ہمیں اس بات کی فکر لاحق ہوئی کہ شہر بمبئی تک کا سفر کس طرح طے کیا جائے کیوں کہ اس ضمن میں ہم کوئی نئی بات چاہتے تھے۔ چنانچہ اکثر احباب نے یہ مشورہ دیا کہ ریل یا ہوائی جہاز سے جانے کے بجائے بیل گاڑی یا انجن لگا ہوا رکشا مناسب اور بہتر رہے گا۔ پھر ہمارے ذہن مبارک میں ایک اچھوتا اور انوکھا آئیڈیا یہ آیا کہ ہم بذریعہ بس بمبئی جائیں اس طرح سفر کرنے سے اور اخبار میں اپنی تصویر کے ساتھ ساتھ روانگی کی اطلاع شائع کروانے سے ایک انفرادی خصوصیت یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ تمام اخبارات میں تصویر کے ساتھ ساتھ جب یہ خبر چھپے گی کہ موصوف بذریعہ بس لکڑی کے پُل سے فارین روانہ ہو رہے ہیں تو کئی منچلے ہمارے خیر مقدم کے لئے ضرور جمع ہو جائیں گے اور ہمیں اس انوکھے عزم سفر کے اغراض و مقاصد نیک نیتی سے بیان کرنے کا سنہری موقعہ ہاتھ آجائے گا۔

اخبار میں تصویر چھپوانے کا خیال ہمیں یوں پیدا ہوا کہ ہم اکثر و بیشتر اخبارات میں فارین جانے والوں کی تصاویر بڑی حسرت و یاس سے نہ صرف دیکھا کرتے ہیں بلکہ بعض تصویریں تو ہمیں ازبر بھی ہو گئی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب کی تصویر وقفہ وقفہ سے اخبارات میں مختلف عنوانات کے تحت بڑی پابندی سے چھپا کرتی ہے۔ کبھی خبر چھپتی ہے کہ موصوف اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جا رہے ہیں تو کبھی اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ موصوف حج کی سعادت حاصل کرنے کے لئے جدہ روانہ ہو رہے ہیں۔ ایک بار اتفاقاً جب اسی تصویری فارینر سے ہماری ملاقات ہو گئی تو ہم نے اخباروں میں تصویریں چھپوانے کی وجہ دریافت کی تو مسکرا کر بولے "لوگوں نے اپنی اپنی تشہیر کے مختلف ذرائع پیدا کر رکھے ہیں چنانچہ میں نے بھی کافی غور و خوض کے بعد تصویر چھپوانے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ بات صرف پالیسی تک رہے یا ضرورتاً چھپوالی بھی جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن ہمیں آج تک یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ لوگ حج کے لئے جاتے وقت اخبار میں اپنی تشہیر کیوں کرتے ہیں۔ حج بھی دیگر فرائض کی طرح ایک فریضہ ہی تو ہے پھر فریضہ کی ادائیگی کی تشہیر کیوں۔ اگر تشہیر اتنی ہی ضروری سمجھی جائے تو اپنی تصویر کچھ اس طرح کے عنوانات سے بھی شائع کروائی جا سکتی ہے کہ "آج فلاں ابن فلاں اور داماد فلاں ظہر کی نماز پڑھنے مکہ مسجد جا رہے ہیں یا یہ کہ جناب فلاں ابن فلاں نے روزہ رکھا ہے اور وقت مقررہ پر موصوف فلاں مسجد میں افطار فرمائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

کچھ حضرات تو ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ فارین سے واپسی یا حج کی سعادت حاصل ہونے کے بعد واپسی پر اپنی آمد کی اطلاع تصویر کے ساتھ اس صراحت کے ساتھ چھپواتے ہیں کہ موصوف کا قیام کہاں ہے اور وہ کون سی گاڑی سے جلوہ افروز

ہو رہے ہیں ویزہ۔ اس خبر اور تصویر سے اخبار بین حضرات کو فائیدہ پہنچے یا نہ پہنچے یہ الگ بات ہے لیکن ایسے حضرات کو یقیناً فائیدہ پہنچ سکتا ہے جو پیامات شادی کا منفعت بخش کاروبار انجام دیتے ہوں یا باہر جانے کے سلسلے میں کوئی مناسب رہنمائی کے متلاشی ہوں۔ ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مناسب رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے کئی حضرات کا وہی حشر ہوتا ہے جیسا کہ حال ہی میں ایک گروہ کا ہوا تھا۔ جس کو ایک ایجنٹ نے یہ کہہ کر اپنے جال میں پھانس لیا کہ وہ انھیں ایک مناسب معاوضہ کے عوض دوبئی کی بندرگاہ پر غیر قانونی طریقے سے پہنچا دے گا۔ چنانچہ وقت مقررہ پر ایک اچھی خاصی رقم اینٹھ کر اس ایجنٹ نے تمام افراد کو ایک موٹر بوٹ میں سوار کروایا اور بمبئی سے رات کے اندھیرے میں نکل پڑا پھر تقریباً دو تین دنوں تک موٹر بوٹ کو مختلف جگہوں پر گھمانے پھرانے کے بعد ایک سنسان سی رات کو ایک تاریک مقام پر سارے افراد کو یہ کہہ کر اتار دیا کہ یہ دوبئی کی بندرگاہ سے قریب ہی ایک مقام ہے اب وہ تمام لوگ یہاں سے روانہ ہوکر صبح تک دوبئی میں اپنا روزگار تلاش کرلیں۔ جب صبح ہوئی اور سارے افراد چھپتے چھپاتے شہر کی جانب چل پڑے تو انھیں آبادی نظر آئی اور پھر انھیں یہ دیکھ کر بڑا ہی تعجب ہوا کہ وہاں کی پولس بالکل ہندوستانی پولس کی طرح خاکی وردیوں میں ملبوس ہے پھر کچھ لوگوں سے مزید پوچھ تاچھ کرنے پر انھیں اس بات کا پتہ چلا کہ وہ دوبئی نہیں بلکہ گوا کے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے میں گھوم پھر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں ایسے کسی گروہ سے واسطہ نہ پڑا ورنہ مارے غیرت کے ہمیں بھی وہی سب کچھ کرنا پڑتا جو اکثر حضرات بمبئی میں ویزا نہ ملنے کی صورت میں کرتے ہیں۔ وہ بمبئی یا اس کے قرب و جوار کسی شہر میں سخت محنت مزدوری کرکے کچھ رقم پس انداز کرلیتے ہیں اور پھر وہی رقم اپنے اپنے گھروں کو اس صراحت کے ساتھ روانہ کرتے ہیں کہ ہمیں فلاں فارین ملک میں ایک اچھا سا OB مل گیا ہے اور ہماری تنخواہ اتنے ہزار روپے سکہ رائج الوقت ہے اور اس بات کے ثبوت میں وہ اپنی ایک رنگین تصویر روانہ کرنا نہیں بھولتے جو کسی خوبصورت سے بنگلے کے قرب و جوار میں کھنچوائی جاتی ہے۔

بہر حال ہم نے اپنے سفر کا اختتام کس طرح کیا اور فارین ملک میں پہنچ کر ہم نے کیا کیا دیکھا اور کیا کیا پاپڑ بیلے اس کو رقم کرنے بیٹھیں تو ایک الگ باب درکار ہوگا اس لئے اس مضمون کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

قارئین جس طرح کسی جاسوسی ناول کی دوسری سنسنی خیز قسط کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے ہیں اسی طرح ہمیں امید ہے کہ آپ بھی ہماری دوسری قسط کا نہایت بے چینی سے انتظار کریں گے۔ ■■

حیدر خان پٹھان

"تندرستی ہزار نعمت ہے"

اس خیال کو دقیانوسی سمجھئے۔ یہ بات اُس وقت درست تھی جب امراض بہت زیادہ اور علاج بہت کم بلکہ بعض تو لاعلاج تھے لیکن آج تو امراض کم اور دوائیں زیادہ ہیں، حتیٰ کہ کُتے کا گُردہ بھینس کا دل بھی انسانی جسم میں لگایا جارہا ہے۔ جو عضو معطل ہوجائے اُسے کاٹ پھینکو اور نیا لگالو۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تندرستی ہزار نعمت والا فارمولا دقیانوسی ہے

جس چیز کے فاضل پُرزے (SPARE PARTS) ملتے ہوں وہ نعمت نہیں ہوسکتی۔

اب اگر کوئی درد کا درماں ڈھونڈ بھی لیتا ہے تو ہمیں حیرت استعجاب کی وادی میں بھٹکنا نہیں پڑتا۔ یہاں تو ہر شخص درد کے درماں کو ڈھونڈ لینے کا مدعی ہے۔

جس چیز کے اتنے علاج ہوں وہ "ہزار نعمت" کیسے ہوسکتی ہے میرے نزدیک خاموشی ہزار نعمت ہے کہ اس کے اوصاف حمیدہ، نرگن برہمن کی تعریف اور باری تعالیٰ کے اسماء حسنہ سے طوالت میں دو ایک زیادہ ہی ہوں گے۔

خاموشی کی کوکھ سے عزت اور محبت جنم لیتی ہے جو فاتح عالم ہے آج کی دوشیزہ کو سوہنی کی طرح محبت کی خاطر کچا گھڑا لیکر دریا میں کودنے اور جان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے لبوں پر مہر سکوت ثبت کرکے تادم مرگ اپنی قربانی جاری رکھ سکتی ہے سوہنی جب دریا میں کود گئی ہوگی اور تیز و تند لہروں میں جب کچے گھڑے کی مٹی بکھری ہوگی۔ تو ایک ہی

لمحے کے لئے ہی مگر اس کا دھیان اپنے محبوب سے ہٹ کر گھڑے کی بے وفائی اور دنیا کی سفاکی کی طرف گیا ہوگا۔ یہ محبت کی توہین ہے۔
ہم اور ہمارے کالج کی دوست جن سے تاروں کی چھاؤں میں ہم نے زندگی بھر ساتھ رہنے کا عہد و پیماں کیا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ریل کے ڈبہ میں اکٹھا ہو گئے ہم دونوں اپنے اپنے کنبوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ میں ۲۵ سال کے عرصہ میں ۵ بچوں کا باپ بن چکا تھا اور وہ ۶ بچوں کی ماں۔ جب ہم نے ایک دوسرے کا تعارف اپنی بیوی اور شوہر سے کرایا تو دونوں نے بہ یک زبان کہا کہ کبھی آپ لوگوں نے ایک دوسرے کا ذکر نہیں کیا۔

خاموشی کے اس نسخے کو نلی لوگ بہت استعمال کرتے ہیں۔ ہیروئین ڈھائی گھنٹے تک خاموش رہتی ہے نہ زبان ہلتی ہے نہ ہونٹ آخر اس خاموشی کا راز اس کی بے گناہی اور معصومیت کی شکل میں کھل جاتا ہے ویسے بھی ہر خاموش طبع شخص بے گناہ تو ہوتا ہی ہے۔

خاموشی بہت سی کہانیوں کے تانے بانے بنتی ہے خاموشی انسان کو گریٹ بھی بناتی ہے۔
میں اپنے ایک مرحوم دوست کے تعزیتی جلسہ میں گیا جس کا کاروبار میں نے ہڑپ کر لیا تھا لہٰذا میں نے ایک ہی جملہ کہا "کہ میرا دوست بہت عظیم تھا۔ اس نے میرے تعلق سے مکمل خاموشی اختیار کی اور آج سے میں اس کے خاموشی کا گن اختیار کرتا ہوں"۔ اس جملہ نے جادو کا اثر کیا کسی مقرر نے اس کی زندگی کے اس دردناک پہلو کی طرف اشارہ نہیں کیا اور میری عزت بچی رہی آج تک خاموشی ہی کے ذریعہ عزت بچی ہوئی ہے۔ اگر کسی دن زبان ہل گئی ساری عزت کے بخیے ادھڑ جائیں گے۔

خاموشی کے فائدے میں گُن بہت اور چپ سادھنا عبادت ہے کم خوری اور کم گوئی میں عافیت ہے۔ جو لوگ میل جول تبادلۂ خیالات اور انسانی اشتراک کی وکالت کرتے ہیں وہ غلط فہمی پھیلانے اور انسانیت سوز حرکت کے ارتکاب کے مجرم ہیں۔
سچائی کی کئی قسمیں اور کئی شکلیں ہیں ہم نے سچائی کو جس شکل میں دیکھا ہے ممکن ہے اسے اوروں نے اور روپ میں دیکھا ہو۔ اس لئے ہمیں اپنے رکھ رکھاؤ کے لئے اوروں کے عیوب کو نہیں گننا چاہیئے ورنہ کفِ افسوس ملتے ہوئے کہنا پڑے گا۔

ہیں تو آپ کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا !

لفظوں کی بازیگری خیالات و نظریات کی پیچ پیچ راہیں خاموشی کے سپاٹ میدان کا کب مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس لئے تہذیب یافتہ سماج میں خاموشی کو روح کی غذا کہا گیا ہے۔

ایک قتل کی واردات کا میں تنہا گواہ تھا لیکن میں خاموش رہا کیوں کہ خاموشی روح کی غذا ہے۔

جب ہم بچے تھے ہمارے والد صاحب ہمیں چھڑی سے مارتے جاتے اور ہم روتے جاتے وہ جس قدر مارتے ہم اسی قدر تیز چلاتے اور جب وہ غصہ میں کہتے چپ رہ نادان چپ رہ تو ہم خاموش ہو جاتے اور خاموش ہوتے ہی ہماری پٹائی رک جاتی تب سے ہم نے خاموشی کی قدر و منزلت کو پالیا۔
آج تک ہم سچائی کے لئے کبھی نہیں بپٹے زندگی میں بہت سے کٹھن موڑ آئے مگر ہمیشہ ہمیں "خاموش رہ نادان خاموش رہ" کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی اور ہم پٹائی سے بچتے رہے۔
ہماری خاموشی سے بھلے دوسروں کی حق تلفی ہوئی ہو مگر حق و ناحق سے ہمیں کیا سروکار۔ سچ و جھوٹ کوئی گیہوں اور کنکر تو نہیں جو اُس کے الگ کرنے میں دیدہ پھوڑا جائے۔

ایک دفعہ ہمارا سر پھر گیا ہم نے حق و ناحق کو بہت جتن کے بعد الگ کر دیا اور سوچا کہ دنیا کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی آجائے گا۔ جب میری یہ جسارت ایک درویش صفت بزرگ نے دیکھی تو فرمایا ، بھائی دنیا پر یہ ظلم نہ کرو اگر لوگوں کو معلوم ہوگا تو گھر سے نکلنا چھوڑ دیں گے اور دنیا کے کام ہو جائیں گے۔

میں نے اس فرمان کو آنکھوں پر جگہ دی اور پھر کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ کس کے دودھ میں کتنا پانی ہے۔ اور دنیا کے کاروبار میں کوئی دخل نہیں دیا۔ اگر کسی پر جرم عائد کیا گیا ہو کہ اس نے دودھ میں پانی ملایا ہے تو وہ کہتا ہے کہ جرم ثابت کرو میں نے پانی میں دودھ ملایا ہے اور پانی میں ملاوٹ جرم نہیں ہے۔ سب خاموش ہو جاتے ہیں۔

ہم ایک مرتبہ گواہ کی حیثیت سے عدالت میں بلائے گئے ایک کٹہرے میں ملزم کھڑا تھا دوسرے میں میں حلف لینے کے لئے جیسے ہی نظر اٹھائی ایک بورڈ نظر آیا۔ SILENCE PLEASE.

اس SILENCE PLEASE پر یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک جلسہ میں ایک مقرر گاجر کو مولی کا باپ ثابت کر رہا تھا میرے ذہن میں سوال اٹھا کہ گاجر مولی کا باپ کیسے ہو سکتا یہ دونوں بہنیں ہو سکتی ہیں یا میاں بیوی لہٰذا ان کا رشتہ تلاش کرنا چاہیئے میں نے یہ سوال ہوا میں چھوڑ دیا تا کہ مقرر کے کانوں سے ٹکرائے تمام لوگوں نے یوں مجھے گھور کر دیکھا کہ جیسے میں چڑیا گھر سے بھاگا ہوا جانور ہوں اسٹیج سے آواز آئی کون صاحب گڑبڑ کر رہے ہیں SILENCE PLEASE میں نے سوچا کہ اگر گاجر اور مولی کا رشتہ تلاش بھی کر لیا جائے تو اس سے انسانیت کا کیا فائدہ ہوگا۔ کیا اس کی غذائیت اور ڈیمانڈ بڑھ جائیں گے اور میں خاموش ہو گیا۔

حضرت آدمؑ و حوّاؑ اگر سانپ سے بات چیت نہ کرتے اور اس کے ورغلانے میں نہ آتے تو پھر جنت سے کیوں نکالے جاتے۔ اب ہمیں کوئی سانپ بلاتا ہے تو ہم اس سے بات نہیں کرتے اور اگر وہ ڈستا بھی ہے تو ہم اُف نہیں کرتے کہ بابا آدم کے ہاتھ سے جنت گئی تھی۔ میرے ہاتھ سے دنیا نہ نکل جائے مرزا غالب نے آدم و حوّا کے واقعہ سے خاموشی کی عظمت کو یوں اُجاگر کیا ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

عزت اور خاموشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے حالانکہ اس دور میں لباس کا فیشن بدلتا ہے اور چولی تحلیل ہوتی جا رہی ہے دامن مجنوں کے زمانے میں یا یوسف و زلیخا کے قصہ میں تھا ان کی چاک دامانی مشہور ہے۔ وہ چاک دامانی پر رسوا ہوئے اور اسی لئے کسی شاعر نے کہا ہے۔

دامن کو چاک کر کے رسوا ہوئی ہے کیا کیا
تھی عصمت زلیخا یوسف کے پیرہن میں

کسی دانشمند نے ان کو بھی دامن نہ چاک کرنے کی صلاح دی تھی اور اس دور میں جب چولی ہے نہ دامن۔

خاموشی نہ صرف باعث عافیت ہے بلکہ ذریعہ اختفا بھی ہے۔ ہم نے ایک مرتبہ ایک بڑی شخصیت کا قصیدہ لکھا تھا اس کا صلہ بھی ملا ہمارے مخالف شاعر نے اسے بزدلی کی عبادت سے تعبیر کیا اور تلقین بھی کی کہ اگر ہم خاموش رہتے تو اس شخصیت کے مخالف بھی ہمارے مفاد کے دشمن نہ ہوتے۔ بات معقول تھی، ہم ہر معاملہ میں خاموش رہے اور فقیر کا پایہ تخت میں ٹھکانہ ہوا۔

کئی بار پٹنا اور بگڑا لٹا اور بسا مگر فقیر یہاں اپنی ہمہ تن خاموشی کے الاپ میں دارا نیارا ہے اور میرے اردگرد عقیدت مندوں کا حلقہ بندھا ہوا ہے۔ ہندو مجھے "خاموش مہاراج" کہتا اور مسلمان مجھے "خاموش بابا" اور سردار مجھے "چپ سادھ گرو" کہتے ہیں۔ شائد میری اسی خاموشی کے لئے جو مذہب قوم و نسل کے حدود کو پار کرچکی ہے۔ اقبال نے کہا ہوگا۔

میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

خاموشی کرشمہ ساز بھی ہے ایک مرتبہ کچھ ایسا مسئلہ درپیش ہوا کہ لوگ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ انصاف اور ظلم کے بارے میں سوچ رہے تھے کچھ عقیدت مند ہماری طرف بھی رجوع ہوئے۔ ہم تو "مون برت" رکھے ہوئے تھے وہ اکتا کر ہماری چوکھٹ سے چل دیئے۔ انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بابا نہ کچھ کرنے کو کہتے ہیں نہ کرنے والے کا ہاتھ روکنے کو آخر اس مسئلہ میں ٹکراؤ اگر دپ کامیاب ہوا ہمارے پاؤں میں انہوں نے پھول دھر دیئے اور اس گروہ کا سربراہ کہنے لگا کہ ہماری جدوجہد کے تاریک اور کٹھن مراحل میں آپ کی خاموشی نے یقین و عمل کے چراغ جلائے۔

ہم ایک روز مر گئے قبرستان میں گورکن مردوں کے انتظار میں پہلے ہی سے مختلف سائز کی قبریں کھود کر تیار رکھتا ہے تاکہ دفن کرنے والے کا وقت ضائع نہ ہو۔ مجھے میرے سائز کی ایک قبر میں فٹ کردیا گیا وہ لوگ جو زندگی بھر میرے کاندھوں پر سوار تھے۔ اور مجھے اپنے کاندھوں پر قبرستان تک لائے تھے میرے بازوں میں قل کی مٹی رکھنے لگے۔ مگر ایک ہاتھ جو متذبذب تھا وہ بار بار مٹی رکھنے کو بڑھتا اور پھر پلٹ آتا مجھے کہنے لگا موت نے تیری زندگی میں کیا فرق ڈالا تیری خاموشی جو مسلسل تھی دائمی ہوگئی، قل کی مٹی اسی وقت دینا چاہیئے جس وقت تو لے ہونٹ سی لیئے تھے۔ اور نطق زبان کے گلشن کو جھلسا دیا تھا، بات معقول تھی میری گردن جو قبلہ رُخ کی جارہی تھی۔ وہ اس تشنہ طلب کی طرف جھک گئی جو میرا ضمیر تھا!

تمنّا مظفّر پوری

پ ط
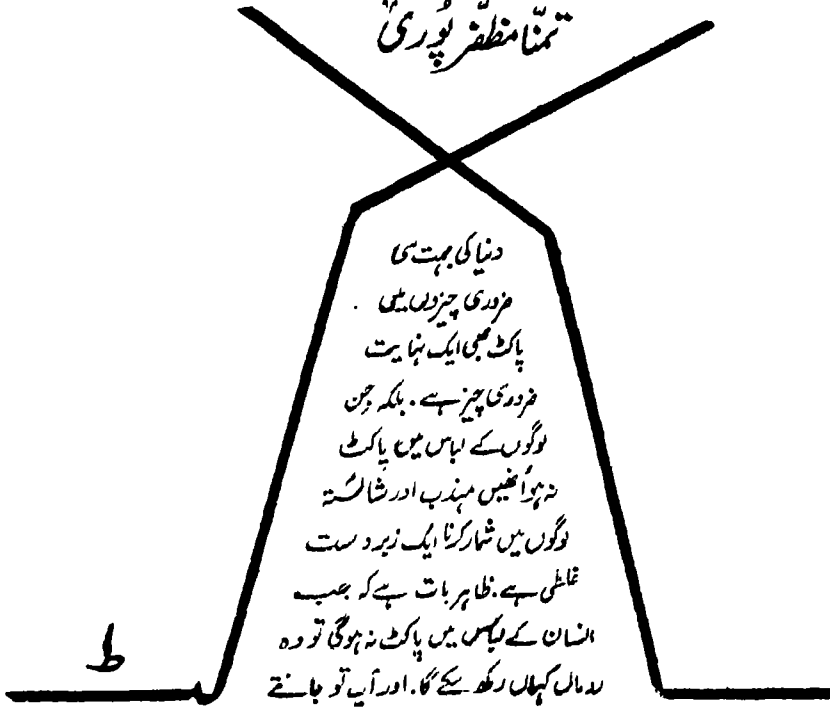
دنیا کی بہت سی
ضروری چیزوں میں
پاکٹ بھی ایک نہایت
ضروری چیز ہے۔ بلکہ جن
لوگوں کے لباس میں پاکٹ
نہ ہو انھیں مہذب اور شائستہ
لوگوں میں شمار کرنا ایک زبردست
غلطی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب
انسان کے لباس میں پاکٹ نہ ہوگی تو وہ
رومال کہاں رکھ سکے گا۔ اور آپ تو جانتے
ہیں کہ شرفا بغیر رومال کے نہیں رہ سکتے ہیں لہٰذا
پاکٹ اور رومال کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب
پاکٹ نہ ہوگی تو سرِراہ چلتے ہوئے چوروں اور اچکوں کو آپ کی حیثیت کا کیسے علم ہوگا۔ اور آپ
سرِ بازار اپنی پاکٹ کٹنے اور موٹی رقم کھونے کا اعلان کیسے کر سکتے ہیں۔

پاکٹ ایک قسم کی تھیلی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تھیلی ہم ہاتھ میں لے کر چلتے ہیں اور
پاکٹ اپنے لباس میں ٹانکے ہوئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سامان رکھنے کی ضرورت
ہوئی تو پاکٹ حاضر ہے۔ جتنی بڑی اور جس قدر پاکیٹس ہوں گی ظاہر ہے اُسی
قدر انسان اس میں سامان رکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل لوگ
قمیض اور پتلون میں دو کی جگہ چار چار پاکٹ لگواتے ہیں بلکہ چور پاکٹ
اور ٹکٹ پاکٹ بھی لگواتے ہیں کہ وقت ضرورت کام آئے یعنی چور سے
بھی محفوظ رہے اور خود بھی چرا کر محفوظ رکھ سکے۔ جاڑے میں
انسان پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر انھیں ٹھنڈک سے بچاتا ہے
اور پاکٹ میں ہاتھ رکھ کر اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے
میں ایک شان بھی ٹپکتی ہے۔ ہاں پاکٹ میں

ہاتھ ڈال کر زندگی گزارنے سے متعلق ایک بار کسی شخص نے جی. کے. چسٹرٹن سے پوچھا:

"اگر کوئی شخص پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر گھومتا رہے تو کیا وہ اپنی زندگی ہنسی خوشی گزار سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں!" چسٹرٹن نے جواب دیا۔ "لیکن اپنی پاکٹ میں نہیں دوسروں کی پاکٹوں میں ہاتھ ڈال کر۔"

حالانکہ چسٹرٹن نے بہت مناسب بات کہی تھی لیکن اپنی پاکٹ میں بھی ہاتھ ڈال کر گھومنے سے انسان کو اکثر فائدہ پہنچتا ہے۔ مثلاً ایک بار ایک فیکٹری کا مالک اچانک فیکٹری میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان پاکٹ میں ہاتھ ڈالے اِدھر اُدھر گھوم رہا ہے۔ اسے اس طرح گھومتے دیکھ کر مالک کو سخت غصّہ آیا، اس نے نوجوان کو ساتھ لیا اور اپنے دفتر میں آیا اور پوچھا:

تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟

"ڈھائی سو روپے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"یہ لو ایک ماہ کی تنخواہ" مالک نے دراز سے روپے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "آج سے تم اس فیکٹری میں نہ آنا۔"

نوجوان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی فیکٹری کا مینیجر فوراً مالک کے دفتر میں داخل ہوا تو مالک نے پوچھا:

"وہ نوجوان جو ابھی ابھی کمرے سے باہر نکلا ہے کتنے دنوں سے ہمارے ہاں کام کر رہا تھا؟"

"جی! وہ ہمارے یہاں کام نہیں کرتا۔" مینیجر نے تقریباً گھبراتے ہوئے کہا: "وہ تو یہاں پارسل دینے آیا تھا۔"

دیکھا آپ نے پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر گھومنے کا انعام ڈھائی سو روپئے۔

ایک بار میں نے ایک بچے کی پاکٹ میں جھنجھناتے ہوئے پیسے کو دیکھ کر پوچھا:

"میاں یہ کیا ہے؟"

ننھا بولا۔ "یہ پاکٹ ہے۔"

میں نے پھر پوچھا۔ "میاں پاکٹ میں کیا ہے؟"

ننھے نے جواب دیا۔ "پاکٹ خرچ"

مجھے یاد آیا ہم لوگوں کو بھی پڑھنے کے زمانے میں گھر سے پاکٹ خرچ ملا کرتا تھا۔ آج بھی بہتوں کو جن کا اکاؤنٹ بیوی کے ہاتھ میں ہوتا ہے دفتر جاتے وقت بیوی سے پاکٹ خرچ ملا کرتا ہے۔ اب بھلا بتایئے ایسی حالت میں اگر پاکٹ ہی نہ ہو تو پاکٹ خرچ کیوں کر ملے گا اور اگر ملا تو انسان کہاں رکھے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے نوجوان اپنے گارجین سے زیادہ پیسے طلب کرتے ہیں کیوں کہ ان کے لباس میں پاکٹ زیادہ ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر پاکٹ نہ ہو تو دنیا میں پاکٹ مار لوگ کیا کریں گے۔ آخر ان کا ذریعہ معاش تو یہی پاکٹ ہے۔ آپ دفتر میں ضرورت مند اسامیوں سے پیسے مار کر لاتے ہیں، آپ کی پاکٹ سے پاکٹ مار کی پاکٹ میں جاتا ہے۔ اس میں سے کچھ حصّہ سپاہی کی پاکٹ میں پہنچ جاتا ہے۔ سپاہی کی پاکٹ بھر جاتی ہے تو وہ کچھ حوالدار کی پاکٹ میں ڈال دیتا ہے تاکہ اسے اس بھیڑ بھاڑ والے علاقے میں ڈیوٹی ملتی رہے اور حوالدار رات میں گھر آکر اپنی بیوی کے آنچل میں اپنی پاکٹ الٹ دیتا ہے۔ اگر پاکٹ نہ ہوتی تو کتنی دقت ہو جاتی یہ سب تو پاکٹ ہی کی کرامات ہیں کہ پیسہ چلتا پھرتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سکّے کی سواری یہ پاکٹ ہی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلتے رہتے ہیں۔

پاکٹ بڑی پیاری چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ننھے میاں کی قمیض اور پتلون سے لے کر دادا ابّا کی صدری اور شیروانی

میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن دراصل پاکٹ وہی پاکٹ ہے جس میں کچھ رقم ہو اور رقم والی پاکٹ ان کی ہوتی ہے جو لوگ کری پیشہ ہوتے ہیں یا تجارت پیشہ۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ رقم والی پاکٹ ہی کی دنیا میں وقعت ہے۔ محبوبہ اور پاکٹ مار کی نظر بھی ان ہی پاکٹوں پر گہری پڑتی ہے جن میں موٹی رقم ہوتی ہے۔

آپ کی پاکٹ میں کچھ ہے اس کی خبر پاکٹ ماروں کو آپ کی چال اور آپ کے چہرے سے ہو جاتی ہے۔ اگر آپ زیادہ چالاکی برتتے ہیں یعنی پاکٹ خالی رکھتے ہیں اور غلطی سے کسی پاکٹ مار کا دست شفقت آپ کی پاکٹ پر پھر گیا تو ہزار قسم کی صلواتیں آپ کے لئے اور آپ کی سات پشتوں کے لئے مخصوص ہو گئیں اور آپ خود بھی پشیمان ہوں گے کہ میاں پاکٹ مار کیا خیال کرتا ہوگا کہ دیکھنے میں تو بابو ہیں مگر پورے کنگوش نکلے۔ اور ہاں اگر آپ سے موٹی رقم اس کے ہاتھ لگ گئی تو خوب دعائیں لیجئے۔ "جیو بیٹا اور اسی طرح کما کر لاؤ"۔

یہ تو باہر کی بات ہوئی اگر آپ کی طرح بچ بچا کر صحیح سلامت گھر پہنچ جاتے ہیں تو آپ کے گھر میں دوسرا پاکٹ مار موجود رہتا ہے، یعنی آپ کی بیگم صاحبہ۔ آپ پاکٹ ماروں سے اپنی رقم محفوظ رکھ سکتے ہیں مگر اپنی بیگم سے اسے بچانا ممکن نہیں کیوں کہ وہ اچھی طرح آپ کی جامہ تلاشی لیتی ہے۔ اُسے صرف آپ کی رقم کی تلاش نہیں ہوتی بلکہ وہ "کچھ اور" بھی تلاش کرتی ہے یعنی کوئی خط وغیرہ کسی محبوبہ کا پرزہ ہی سہی۔ لہذا محبوبہ کے خطوط کبھی پاکٹ میں نہ رکھیں ورنہ نتیجے کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔

سبھی پاکٹوں کا تعلق چار شخصیتوں سے ہوتا ہے۔ پہلی شخصیت، آپ خود (جو پاکٹ کی مالک ہے) دوسری شخصیت درزی کی ہے جو آپ کی پاکٹ اور گلا کاٹتا ہے مگر سزا کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ آپ اُسے مزدوری بھی عنایت کرتے ہیں۔ تیسری شخصیت آپ کی بیوی ہے جو پاکٹ کی صفائی کرنے کے باوجود مجرم نہیں ہوتی۔ اور چوتھی شخصیت جو ہوتی ہے اسے پاکٹ مار کہتے ہیں۔ پاکٹ مار کا راست تعلق آپ کی پاکٹ سے ہوتا ہے اور ان کی زندگی کا سارا انحصار آپ کی پاکٹ ہے۔

پاکٹ ایک ایسی واحد چیز ہے جس میں آپ سوئی سے لے کر خنجر تک اور پیسے سے لے کر سرکاری خزانہ تک رکھ سکتے ہیں۔ بلکہ کچھ شوقین لوگ تو بلی اور کتے کا بچہ بھی پاکٹ میں لیکر چہل قدمی کو نکل جاتے ہیں۔ خواجہ عمرو کی زنبیل کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز وہ اس میں رکھ لیا کرتے تھے۔ درحقیقت یہ پاکٹ آج کے انسان کی زنبیل ہے۔ آپ کو یقین نہ ہو تو آپ دو چار آدمیوں کی پاکٹ کی تلاشی لے کر دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی پاکٹ میں بلیڈ اور پان کا ڈبہ ملے گا تو کسی کی پاکٹ سے خنجر اور دیا سلائی اور سگریٹ کی ڈبیا کسی کے ہاں منی بیگ میں ہزار پانچ سو کے نوٹ اور چیک ہوں گے تو کسی کی پاکٹ میں دو عدد پیاز، چار عدد آلو، دو ہری مرچ ملے گی کنجوسوں کی پاکٹ سے دوا کی شیشی، ڈاکٹر کا نسخہ، منے میاں کے لئے پنسل، بیوی کے کان کا بندہ نئے پرانے انٹرویو لیٹرز، لو لیٹرز یا محبوبہ کی تصویر مل سکتی ہے۔

اُمید ہے اب آپ پاکٹ کی اہمیت مان گئے ہوں گے۔

"تری ایسی کی تیسی"

فیض الرحمٰن فیض

ہر بات نرالی ہے تری ایسی کی تیسی
ہر چال مثالی ہے تری ایسی کی تیسی

اوروں کو ملے داد مرے شعر پہ ہونگ
درپردہ یہ گالی ہے تری ایسی کی تیسی

اولاد کی خاطر تو بہت بیلے ہیں پاپڑ
کلدار نہ حالی ہے تری ایسی کی تیسی

جس گھر میں مشاطہ نے پھنسایا مجھے یارو
سالا ہے نہ سالی ہے تری ایسی کی تیسی

شرفوں جی مشاطہ نے مجھے دیدیا جھانسا
لڑکی جو ہے کالی ہے تری ایسی کی تیسی

کیوں ہار گلے کا ہوئی چھ بچوں کی اماں
لٹو کی وہ جالی ہے تری ایسی کی تیسی

اک ہاتھ سے تالی نہ بجی ہے نہ بجے گی
منطق یہ نرالی ہے تری ایسی کی تیسی

دنیا کی ہر اک چیز بتا کس کے لیئے ہے
دامن ترا خالی ہے تری ایسی کی تیسی

دھوتی کے لپیٹے کو کسوٹا نہ سمجھ تو
سالن نہیں مالی ہے تری ایسی کی تیسی

ممکن نہیں مریخ کی دنیا میں بسائی
یہ خام خیالی ہے تری ایسی کی تیسی

کہتا تھا بھکاری کہ میں نادار ہوں داتا
اک ہاتھ میں تھالی ہے تری ایسی کی تیسی

معلوم نہیں کتنے شکار اس نے کئے ہیں
بندوق کی نالی ہے تری ایسی کی تیسی

کیا فیض تجھے اور بھی کچھ کام نہیں ہیں
اک طرح نکالی ہے تری . . . . . ؟

بلّی حج کو چلی

لئیق صلاح

یہ مقولہ بہت ہی قدیم ہوگیا ہے۔ جیسے قدیم روائتیں اور
رسومات فرسودہ ہوگئیں ویسے ہی یہ مقولے۔ زمانہ تیز رفتاری
کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ع
نے ہاتھ باگ پہ ہے نہ پا ہے رکاب میں
اگلے زمانے کے لوگ خوش خوراک تھے۔ اس لیئے ہر چیز وافر ہوا کرتی تھی۔ اب دور
تنگی کا آگیا ہے۔ ہر چیز میں کفایت شعاری پیشِ نظر رہنی ضروری ہے۔ پہلے کے لوگ محتاط
ہوتے تو روپیہ خرچنے میں اور ضروریاتِ زندگی کی دوسری چیزوں میں اعتدال کو پیشِ نظر رکھا کرتے
تھے۔ لیکن اب تو خاندان بھی محدود ہوگئے ہیں۔ ایک بیوی سے زیادہ کی اجازت نہیں، خیر بیوی کی بات چھوڑیئے
اس قانون سے عورتیں بہت خوش ہوگئی ہیں۔ ورنہ ہمیشہ یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہ کب کس بات پر ناراض ہوکر شوہر صاحب
حریفِ مقابل کو لاکر کھڑا کردیں۔ اور یہ مقابلا معمولی نہیں ہوتا۔ دو متضاد نظریئے رکھنے والے ممالک کسی نہ کسی کو ثالث بنا
سمجھوتہ کرلیتے ہیں۔ خواہ وہ سرد جنگ ہوکر اٹھی۔ لیکن یہ حریف تو تا قیامت ایک نہ ہونے والے۔ بالآخر سمجھوتہ کرانے والے
اور جس کو TARGET بناکر جنگ کرنے کی ٹھانی تھی۔ وہ رخصت ہو جاتے ہیں۔ لیکن "تریا ہٹ" کی یہ تیسری
ہٹ کبھی ہارنے والی نہیں۔ ایک وہ دور تھا کہ ایک گھر سے چار گھر کے بچے نکالا کرتے تھے۔ ہائے!
اب چار گھر کے بھی بچے جمع ہوں تو اس ایک گھر کے مساوی نہ ہوں گے۔ بڑی بوڑھیوں کی دعاؤں
میں بھی کیا تاثیر تھی۔ وہ جب بھی کسی لڑکی یا لڑکے پر مہربان ہوتیں تو بس یہی کہتیں کہ ایک
کے اکیس ہوں۔ اب نہ وہ بوڑھیاں رہیں اور نہ ان کی دعائیں۔ جانے بھی
دیجیے، اب گھر بھی تو مختصر ہیں۔ اتنی ساری پلٹن کے لئے یہ فلیٹس
کیا کافی ہوتے۔ بلکہ کالونی کے چار مکان بھی ہوں تو ان کے

دغا سے بچنا محال۔
آمدم برسرِ مطلب۔ قدیم دور کے لوگ گناہ کم کرتے تھے لیکن بے چاروں کو احساسِ گناہ زیادہ تھا۔ اس لیے نادانستگی
کچھ ہو بھی جاتا تو اس کی تشہیر زیادہ ہوتی تھی۔ پھر وہ توبہ و استغفار سچے دل سے کر کے روانہ ہوتے۔ کیوں کہ سفر بڑا
ل تھا۔ پردے کے جہاز میں ہوں تو ع چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی' کے مصداق چل نکلتے۔ پھر دخانی جہاز کا دور آیا
وہاں تو دہی ناتبدیلی ہی تھا۔ چھ چھ ماہ کا سفر۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے میں اتنا ہی عرصہ لگتا جتنا کہ
م ارکان ادا کر کے واپس آنے تک۔ اس لئے بولا چالا معاف کرانا بے حد ضروری تھا۔ پتہ نہیں لوٹ کر آئیں گے بھی یا نہیں
حالات بھی اب کے بالکل برعکس تھے۔ وہاں سے سوائے تبرکات کے کچھ اور ساتھ نہ آیا تھا۔ لیکن اب تبرکات میں بہت
ہوگیا ہے۔ نقلی اور اصلی سونے کی طرح پہچان مشکل ہوگئی ہے کہ اصل تبرکات کتنی ہیں اور نقلی کتنی۔ پہلے پہل تو سمجھنے والے کم
مگر اب کسوٹی بھی زوردار ہوگئی ہے۔ جو دن کا اجالا ہو کر راتوں کی سیاہی کھوٹے کھرے کا فرق فوری بتا دیتی ہے۔ ورنہ
ہز دوں کو دن کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پھر اس کے لئے ایک خاص "اصطلاح" وضع کی گئی۔ اب ہر جانے والے کو اسی نظر
پرکھا جاتا ہے۔ خواہ وہ معصوم ہوں کہ کچھ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب بھی چند ہستیاں ہیں، جو بھولے بھالے موسیٰ کی طرح ہیں۔
ساری باتوں سے ناواقف، خیر گزری جو اللہ میاں نے ان کی رہبری کے لئے خضر کو ساتھ کر دیا۔ جتنی باتیں وہ پوچھتے
ان کی تشفی کر دیتے۔ اس پر بھی موسیٰ خاموش نہ رہے اور اللہ سے پوچھ بیٹھے کہ کیا تو سوتا نہیں ؟ جواباً اللہ میاں
انھیں دو شیشے ہاتھ میں پکڑنے کے واسطے دیئے اور ساتھ ہی نیند بھی۔ جیسے ہی وہ اونگھے یہ شیشے ٹوٹ کر پاش
پاش ہو گئے۔ بغیر کسی تیشے کے واہ کیا قدرت ہے خدا کی — اور پھر وہی بات ہوئی۔ ع

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اللہ میاں کو موسیٰ کی یہ حرکت بھی پسند آئی۔ گستاخی میں اس کا شمار نہیں ہوا۔ چلئے بھول پن میں اچھی گزر گئی حکیم اللہ
نب بھی عطا ہوا۔ تجلی کی جھلکیوں سے بھی مشرف ہوئے واقعی کسی نے سچ کہا ع

اگر گناہ سلیقہ سے ہو گناہ نہیں

مگر اب کے بھولے معصوموں کو نہ تو خضر ہی ملتے ہیں اور نہ خدا تعالیٰ سے مُنہ درمنہ بات ہوتی ہے خضر تو شاید
ب حیات" کے پاس ہی ٹھہر گئے۔ لیکن اللہ میاں بندوں سے کچھ ناراض ہیں۔
"فریضۂ حج" کی ادائیگی کے سلسلہ میں بہت سارے مضامین ہمارے علماء کے آپ کی نظروں سے گزرے ہوں گے
اس قابل نہیں کہ مزید کچھ آپ کے گوش گزار کروں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اپنے تجربات و مشاہدات سے آپ کو آگاہ کیے
نہیں رہ سکتی۔ چند سال قبل ہمیں بھی اس کے عفوِ بندہ نواز میں پناہ ملی تھی۔ جس کا آنکھوں دیکھا حال قارئین کی خدمت میں
ل کیا جاتا ہے۔ پتہ نہیں روح نے ہی لبیک کہا، یا ہم نے ہی اس سے لبیک کہلوایا۔ بہرحال ! ارادہ کیا اور چل نکلے۔
حیدرآباد سے بمبئی تک کا سفر تو بس عام سفروں کی طرح گزرا۔ حالانکہ اس میں بھی ہمارے مخصوص ہمسفر تھے لیکن
ں پہنچنے کے بعد قدم قدم پہ میدانِ تیز گام سے سابقہ رہا۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے آئے ہوئے لوگ مغل
ن کے دفتر میں اپنا پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ یہیں سے نت نئی بولیوں کا آغاز ہوا۔ کیرالا وغیرہ کے لوگ بہت ہی خوش اخلاقی
مظاہرہ کرتے۔ لیکن ایک دوسرے کا جواب سوائے مسکراہٹ اور اشاروں کے اور کیا دے سکتے بقول شاعر ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
وَہاں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

تمام ضروری امور سے گزر کر جہاز میں سوار ہوئے۔ بازو کے ABIN ۷ میں ایک نیم سودا وی المزاج خاتون تھیں۔ جن سے کبھی خوف لگتا تھا اور کبھی دل بستگی رہا کرتی تھی۔ روزانہ جہاز میں تقاریر ہوتیں۔ حج کے مسائل سے واقف کرایا جاتا۔ اس کے علاوہ بھی بحث مباحثہ الگ چلتے۔ لوگ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے صاحبین صرف اپنی تشنگی ذوق کا سامان کرتے یا جو اُن کے ہم خیال نہ ہوتے انھیں قائل کرنے کی خاطر بحث بین کرتے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ ان مسائل میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ اور اُن بے چاروں کے تعلق سے بالکل بے خبر رہتے۔ جنہیں واقعی ان تمام معلومات کی اشد ضرورت ہوا کرتی ہے۔

خدا خدا کرکے ہم اُس "حریم قدس" میں باریاب ہوئے۔ حسب دستور اپنے معلم کی قیام گاہ میں سکون پذیر ہوئے۔ تیسری منزل پر جگہ ملی۔ "مدینہ منورہ" کی روانگی دو ہفتے بعد عمل میں آئی۔ موٹر آنے میں کچھ تاخیر ہوئی اس لئے ہم نیچے ہی ٹھیرے رہے۔ یہاں ایک بہترین ہستی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ایک بڑی بی فرش پر اپنی مسند بچھائے رونق افروز تھیں۔ یوں تو ہمیں خود ایسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔ لیکن یہاں سمندر خود پیاسے کے قریب آگیا۔ ورنہ سمندر میں رہ کر بھی پیاسے رہنا پڑتا ہے۔ الغرض وہ صاحبہ مجھ سے مخاطب ہوئیں "بیٹیا یاں آؤ"۔ تم کاں سے آئے۔ میں نے کہا حیدرآباد ——— "ارے تم بی واں سے آئیں۔ مَیں بی حیدرآباد ہیچ ہوں"۔ خالص دکھنی لب و لہجہ میں گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ میں نے دریافت کیا "آپ تنہا آئی ہیں۔ یا کوئی اور ساتھ ہے"۔ جواب دیا "ہمارے محلے والے ساتیچ آئے تھے۔ بگریاں آکو کاں گیئں کی پتاچ نہیں ہے"——— پھر انھوں نے نہایت رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا ——— "اچھا ایک بات پوچھتیوں سچی سچی بولنا۔ ارے کعبہ بولے تو کیا۔ مکا (مکہ) بولے تو کیا۔ میں نے جواباً دریافت کیا "آپ نے طواف کیا ہے کہ نہیں ——— "وہ بولیں ارے وہ پلنگ کے ویسا رہتا نین اس میں بٹھا کو دو آدمیاں سروں پر اٹھا کو گول گول پھرے۔ وہ پتھر (حجر اسود) ہے کتے وہ بی دور سے نین دیکھا"۔ ارے واں اتار کو پھر کرسیوں پو بٹھا کو ڈھکلے۔ اسکو ہیچ بولتیں کتے نا سفر مروا (صفا مروہ)"

میں نے کہا ہاں! وہی کعبہ ہے۔ اور آپ جہاں بیٹھی ہیں وہ مکہ ہے۔ ہم سمجھے کہ چلیئے تشفی ہوگئی مگر وہ کہاں خاموش رہنے کی۔ جب کہ انھیں "خوب تر کی جستجو" تھی۔

ایک اور سوال کر بیٹھیں ——— "ارے باوا نہ کوئی درگاں (درگاہ) نہ کوئی مزار۔ ہے، مزار ہے بولے تھے۔ پھر وہ کاں ہے۔ نا او دھر نہ پھوں۔" اسطرح ہماری دوستی بڑھتی گئی۔ کبھی کبھی تو دو منزلوں کا طول طویل سفر طے کرکے اوپر آجاتیں۔ سنا کہ ہماری ساتھی ایک ساتھی سے بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ ان کے ساتھ وہ دو وقت طواف کریں گی لیکن کرانے والی صاحبہ سب سے کہیں کہ سات طواف کی ہیں۔

یہ تو معمولی باتیں تھیں۔ اب ذرا ام اسود کی طرف آیئے۔ ایک دن ہانپتے ہوئے اوپر آئیں حج کے لئے شاید دو دن رہ گئے تھے۔ سب نے اس غیر متوقع آمد پہ پوچھ گچھ شروع کی۔ کہنے لگیں۔ "جیسے جیسے حج قریب آ رہے۔ مجھے ایک فکر (فکر) ہوگئی ہے۔ مولم ساب (معلم صاحب) اور اُن کے بھائیوں کو کہتے وقت بولی کہ میرے لئے ایک ڈنڈا اور عینک لا دیو۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے وہ ماٹھی بلے شیطان کے آنکھ میں پتھر ماروں گی۔ اُس کے دیدے پھوڑوں گی۔ تو کوئی لا کو نیں دیا۔ پھر میں بولی ہمت کر کو اپنیچ کیوں نیں جانا۔ ایک دن ہلو ہلو سیڑیاں اُتر کر دوکانوں کی طرف گئی۔ پوچھ لیتے پوچھ لیتے (آپ ہی غور کیجئے کہ پوچھی کیا ہو گی، کیوں کہ عربی زبان سے بالکل ناواقف) چلی۔ ایک جگہ مڑ کو دیکھی تو کیا ہے۔ میرے پیچھے دو تین لمبے لمبے کالے لوگاں ہیں۔ (NEGROES) لٹ لوں کو خیال آیا۔ ہونہ ہو بشیطانیچ ہے۔ ماٹھی ملا ماروں گی بولی تو سب سن لیا شاید۔ اس لئے

ینے پیچھے ہے۔ پھر میں ڈر کو زلدی زلدی (جلدی جلدی) موللم کے گھر کو آگئی. پلٹ کو دیکھنے بی بی ڈر را تھا. کاں دیکھ لیتا کیا نیں کی؟"

"منیٰ" (جہاں حج کے دوران ٹھیرا کرتے ہیں) میں بھی ساتھ تھیں "عرفات" سے لوٹنے کے بعد دریافت کر رہی ہیں۔ ے حج ہو گیا" ہم نے کہا، ہاں! کل ہی خدا کے فضل سے ہو گیا. آپ ہم سب جو وہ میدان میں جمع ہوئے تھے نا، وہی حج نا. یہیں سے کچھ سکھلایا بتلایا جاتا تو شاید کچھ پلے پڑتا. آخری وقت کا سا حال تھا. اُکنے وہی ہیں اپنے معلومات سے رہ ور کرتیں. فرمایا "ارے عرس کے ویسا بی نیں. قوالی ہوئی نہ کچھ. اسی میں ہی حج"۔

جب بھی ہم ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے تو وہ ارشاد فرماتیں "دیکھو تم لوگاں پڑے لکھے ہیں. کیں کتابوں میں ہیں چھپا پنا۔ وہ باتیں دوسری تھیں جس کو بیان کر کے وعدہ خلافی کا الزام سر لینا ہمیں پسند نہیں باقی رہا یہ معاملہ تو اس کے جملہ حقوق ہمارے پاس (محفوظ) نے محفوظ کر دیئے تھے. اس لئے اس کی اشاعت سے ہمیں کچھ ڈر نہیں۔

یہ تو جیتم جیتم لی ساحتی تھی. ایک اور صاحبہ سے طواف کرتے ہوئے مڈ بھیڑ ہوئی. دراصل اُن کی آواز نے چونکا دیا "یا عبد الستار" یا عبد الغفار" یا غریب نواز" یا خواجہ بندہ نواز" بے چارے معصوم اس بات سے لاعلم رہتے ہیں کہ طواف کے وقت کون سی مسنون دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ جو کچھ استطاعت رکھتے، وہ وہاں کے معلموں کو مقرر کر لیتے ہیں. پھر بھی ہر طواف میں معلم رکھنا ناممکن ہوتا ہے. اس لیئے کہ ان کی بھی فیس مقرر رہتی ہے۔

یہ تھی ہند سے "دیار مدینہ" تک کی سرگزشت. واللہ عالم بالصواب!

جنوری ۱۹۶۵ء کی ایک شام کو حیدرآباد کی صنعتی نمائش میں ایک دوست نے مجھ سے پوچھا۔ آپ مخمور سعیدی کو جانتے ہیں؟"
میں نے کہا۔" وہ جو ٹونک کے رہنے والے ہیں؟"
دوست بولا۔ "جی ہاں"۔
پھر میں نے کہا۔" وہ جو 'تحریک' سے وابستہ ہیں؟"
دوست بولا۔ "جی ہاں"۔
میں نے کہا۔" وہ جن کی تصویر ابھی ایک رسالہ میں چھپی تھی، جس میں انھوں نے اپنے گلے کے اطراف ایک خوبصورت مفلر یوں لپیٹ رکھا تھا جیسے مفلر کی مدد سے خودکشی کرنے جارہے ہوں؟"
دوست بولا۔ "جی ہاں! بالکل وہی! مگر یہ تمھیں مفلر کیسے یاد رہ گیا؟"
میں نے کہا۔" دیکھتے نہیں کیسی غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔ مفلر یاد نہیں آئے گا تو اور کیا یاد آئے گا۔ میں تو ہمیشہ مطلب کی چیز یاد رکھتا ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے عصمت چغتائی کا "لحاف" اور منٹو کی "کالی شلوار" پڑھتے ہیں"۔
دوست بولا۔" تم بات کو کہاں سے کہاں لے گئے، حالانکہ بات مخمور سعیدی کی ہورہی تھی"۔
میں نے کہا۔" اور میں نے بات کا رُخ مخمور سعیدی کے مفلر کی طرف موڑ دیا تھا۔ تم سے مشکل یہ ہے کہ جب بھی کسی شاعر کے بارے میں بات کرتے ہو تو اس کی شاعری کو ہی بات کا موضوع بناتے ہو۔ حالانکہ شاعر کے پاس، اور وہ بھی اردو شاعر کے پاس کبھی کبھی مفلر بھی ہوتا ہے۔ اب یہی دیکھو کہ مخمور کے پاس ایک "قابلِ اشاعت مفلر" بھی ہے جو اُن کی غزل کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ تم غزل کی تعریف تو کروگے لیکن مفلر کو یکسر بھول جاؤ گے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم شاعر کو اس کی شاعری سے ہی ناپیں۔ کبھی کبھار مفلر کو بھی شاعر کی جانچ کا پیمانہ بننا چاہیئے۔ جبھی تو ہم کسی شاعر کی "ٹوٹل پرسنالٹی" کے بارے میں کوئی رائے قائم کرسکتے ہیں"۔

میرے دوست نے جھنجھلا کر کہا "یار یہ مذاق بند کرو۔ مجھے بتاؤ کیا تم محمود سعیدی سے ملنا چاہو گے ؟"
میں نے کہا "ضرور ملوں گا بشرطیکہ وہ اپنے گلے کے اطراف وہی تصویر والا مفلر لپیٹ کر آئیں ۔"
اور میرے دوست نے نمائش میں لگے ہوئے کتابوں کے ایک اسٹال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ دیکھو وہ محمود سعیدی کھڑے ہیں ۔"

اور میں نے دیکھا کہ مجھ سے چالیس قدم کے فاصلے پر ایک نوجوان وہی مفلر لپیٹے کھڑا تھا ۔ جی میں آئی کہ محمود سعیدی سے ملا جائے مگر نہ جانے کیوں چالیس قدم کا یہ فاصلہ مجھ سے طے نہ ہو سکا ۔ مجھے یوں لگا جیسے محمود میں اور مجھ میں اتنا ہی فاصلہ حائل ہے جتنا کہ امریکہ اور روس کے درمیان ۔

میرے دوست نے اسٹال کی طرف مجھے کھینچ کر لے جاتے ہوئے کہا "حسنِ اتفاق دیکھو کہ محمود نے وہی مفلر لپیٹ رکھا ہے ۔ چلو تمہیں محمود سے ملائیں ۔"

میں نے ایک لمحہ میں اپنے دوست کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا "یار ! اب رہنے بھی دو ۔ میں تو صرف مذاق کر رہا تھا پھر تم تو جانتے ہو کہ میں شاعروں سے نہیں ملتا کیوں کہ اس میں نقصان میرا ہی ہوتا ہے ۔ اوّل تو ان کے شعر سنو ۔ پھر انھیں سمجھنے کی کوشش کرو ۔ اور اگر خوش قسمتی سے اس کوشش میں ناکامی ہوئی تو گلا پھاڑ پھاڑ کر داد بھی دو ۔ میں گھاٹے کے سودے کا قائل نہیں ہوں ۔"

یہ کہہ کر میں دوسری جانب چلا گیا ۔ میرا دوست میرے پیچھے پیچھے پکارتا ہوا چلتا رہا ۔ اس وقت ہم دونوں کے درمیان کچھ اس قسم کی بات چیت ہوئی ۔

"یار تم محمود سے مل تو لو ۔ تم اس سے مل کر خوش ہو گے ۔"
"میرے پاس خوش ہونے کے اور بھی بہت سے ذریعے ہیں ۔ میری زندگی میں ابھی خوشی کا اتنا کال نہیں پڑا ہے کہ محض خوش ہونے کے لئے محمود سے ملوں ۔"
"مگر یار ! وہ بڑا نفیس آدمی ہے ۔"
"نفیس آدمی ہوا تو کیا ! شاعر بھی تو ہے ۔"
"مگر شاعر بھی بہت بڑا ہے ۔"
"یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ اردو میں آج تک کوئی چھوٹا شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ۔"
"میری بات تو سنو ۔ بحیثیتِ مجموعی وہ بہت اچھا شخص ہے ۔"
"میری بات بھی تو سنو کہ میں بحیثیتِ مجموعی قسم کے اشخاص سے ملنا پسند نہیں کرتا ۔"

اس کے بعد میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے دوست اور محمود کی خوبیوں کے دائرے سے بہت آگے نکل گیا ورنہ نہ جانے اس دن محمود کی اور کتنی خوبیاں مجھے سننی پڑتیں ۔ میں آگے نکلنے کو نکل تو گیا مگر بڑی دیر تک میرے کانوں میں یہ جملے گونجتے رہے "وہ بڑا نفیس آدمی ہے ، بڑا اچھا شاعر ہے ۔ بحیثیت مجموعی ایک اچھا انسان ہے ۔"

O

حیدرآباد کی نمائش میں وہ چالیس دن تک کتابوں کا اسٹال لگائے بیٹھے رہے لیکن تب بھی مجھ سے چالیس قدم کا یہ فاصلہ

ملے نہ ہو سکا۔ وہ غالباً اس بک اسٹال میں نیشنل اکاڈمی کی کتابیں فروخت کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ میں تو کبھی اس بک اسٹال میں نہیں گیا۔ میں نمائش کلب کا ممبر تھا اور ہر شام کو "سیاست" اخبار کے دفتر سے نکل کر میں اسی کلب میں جایا کرتا تھا اور کلب کے دروازے کے عین سامنے مخمور نے اپنی کتابوں کا اسٹال کچھ اس طرح لگا رکھا تھا جیسے ؎

بستر لگا دیا ہے ترے در کے سامنے

چالیس دن تک میں آتے جاتے مخمور کا دیدار کرتا رہا۔ مخمور اُن دنوں صرف مخمور تھے۔ مطلب یہ کہ وہ ابھی اتنے "سعیدی" نہیں بنے تھے جتنے کہ وہ آج دکھائی پڑتے ہیں۔ آدمی کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اس کی "سعیدی" میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو بسمل سعیدی اور مخمور سعیدی دونوں کی موجودہ "سعیدیوں" کا تقابل کر کے دیکھ لیجئے ـــــ خیر تو مخمور حیدرآباد کی نمائش میں کتابیں بیچنے کے لئے آئے تھے مگر میں نے انھیں کبھی کتاب بیچتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کے اسٹال پر ہمیشہ نوعمر شاعروں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ قیاسِ اغلب ہے کہ مخمور ان نوعمر شاعروں کو اپنا کلام سناتے ہوں گے اور ازراہِ احتیاط کبھی کبھار اُن شاعروں کا کلام بھی سن لیتے ہوں گے۔ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ کتابوں کی فروخت کے کاروبار کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کتب فروش جتنا جاہل ہوگا اتنی ہی زیادہ علمی کتابیں فروخت کر سکے گا۔ پڑھا لکھا آدمی جب کتابیں بیچنے لگتا ہے تو کتابیں نہیں بیچتا، بلکہ کتابوں کی آڑ میں اپنے تحفظات، اپنے تصورات یا پھر اپنے تعصبات بیچتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں نے مخمور کے بک اسٹال پر کبھی کسی گاہک کو نہیں دیکھا۔ یا تو چند بے نکھرے اور بیروزگار قسم کے نوجوان شاعر اُن کے اطراف جمع رہتے یا پھر وہ اکیلے میں بیٹھے اپنے ہی اسٹال کی کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتے۔ حیدرآباد میں ان کے اعزاز میں بعض مخدوش قسم کے غیر مقدمی جلسے بھی ہوئے مگر میں کسی بھی خیر مقدمی جلسے میں نہیں گیا۔

نمائش کے آخری دنوں میں مجھے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ کسی نے مخمور کو بھی میرے بارے میں بتلا دیا ہے۔ اس گمان کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ جب بھی ان کے اسٹال کے سامنے سے گزرتا تو مخمور کسی کتاب کی اوٹ میں سے مجھے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے لیکن کبھی مجھ سے ملنے کی جسارت نہیں کی۔ پھر جب نمائش ختم ہوئی تو مخمور اپنی کتابوں کے بنڈل باندھ کر دہلی واپس چلے گئے۔

○

۱۹۷۲ء میں جب میں دہلی آیا تو میں نے دہلی کے جن چند شاعروں اور ادیبوں سے ملنے کا پروگرام بنایا تھا اُن میں ایک شخص کمار پاشی بھی تھا۔ انہی دنوں کمار پاشی کے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا اور مجھے اس کے بعض افسانے بہت پسند آئے تھے۔ اب جناب ایک آدمی جب دوسرے آدمی سے ملنا چاہتا ہے تو یہ نہیں دیکھتا کہ دوسرا آدمی کس کس سے ملتا ہے اور کیا کیا کرتا ہے۔ کمار پاشی سے ملا تو کمار نے مجھے دوسرے ہی دن اپنے گھر پر آنے کی دعوت دے دی۔ دوسرے دن میں کمار کے ہاں گیا تو دیکھا کہ میرے وہاں پہنچنے کے بعد بھی کسی کا انتظار ہو رہا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "کس کا انتظار ہو رہا ہے؟"

کمار نے کہا۔ "مخمور سعیدی آنے والے ہیں!"

میں نے کہا۔ "مخمور سعیدی؟ وہی جو ٹونک کے رہنے والے ہیں، جو تحریک سے وابستہ ہیں اور جن کی ایک تصویر کچھ سال پہلے ایک رسالہ میں مظفر کے ساتھ چھپی تھی؟"

کمار نے کہا۔ "جی ہاں! بالکل وہی! کیا آپ کی مخمور سے ملاقات نہیں ہے؟"
میں نے کہا۔ "کبھی ملاقات کی ضرورت محسوس نہیں کی"۔
اس پر کمار نے کہا۔ "آپ مخمور سے مل کر خوش ہوں گے۔ وہ بڑا نفیس آدمی ہے۔ بہت اچھا شاعر ہے؟"
اور میں نے بات کو کاٹ کر کہا۔ "اور بحیثیتِ مجموعی ایک اچھا آدمی ہے"؟
سات سال گزرنے کے بعد ایک بالکل ہی دوسرے شہر میں ایک بالکل ہی دوسرا شخص، مخمور کے بارے میں بالکل وہی رائے دے رہا تھا جو میرے حیدرآباد کے دوست نے دی تھی۔
میں دل ہی دل میں سوچ رہا چلو آج ان چالیس قدموں کا فاصلہ طے کر ہی لیا جائے۔ اگرچہ تب بھی میری زندگی میں خوشیوں کا اتنا کال نہیں پڑا تھا کہ محض خوش ہونے کے لئے مخمور سے ملتا۔ اتنے میں مخمور وہاں آگئے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اُسی محفل میں مخمور کتاب کی اوٹ میں سے باہر نکل آئے۔ اُسی محفل میں مخمور نے اپنا تیسرا مجموعۂ کلام "آواز کا جسم" کا ایک نسخہ مجھے دیا جس پر لکھا تھا۔
"ڈیر مجتبیٰ حسین تمہارے لئے ـــــ
" خود سے مل کر بہت اداس تھا آج
وہ جو ہنس ہنس کے سب سے ملتا ہے"
اسی رات میں نے مخمور کا سارا مجموعۂ کلام پڑھ لیا اور بہت عرصہ بعد میں نے اپنی رائے بدلی کہ ایک شاعر کو اس کی شاعری سے ہی جانچنا چاہیئے۔ ہمیں اس سفلر سے کیا سروکار جو شاعر نے اپنے گلے کے اطراف باندھ رکھا ہے۔
پھر تو صاحب جب جب کمار سے ملاقات ہوئی ہے مخمور سے بھی ضرور ملاقات ہوئی ہے۔ کمار اور مخمور کی دوستی بڑی پرانی ہے۔ حالانکہ بحیثیت مجموعی دونوں الگ مزاجوں کے حامل ہیں۔ مزاجوں کی بات چھوڑیئے، رنگ ہی کو لیجیئے۔ کمار سیاہ ہیں تو مخمور سُرخ و سپید۔ سچ پوچھیئے تو ان دونوں کی دوستی سیہ بر سفید ملیشہ قسم کی دوستی ہے!
میں مخمور کے ماضی سے واقف نہیں ہوں۔ سُنا ہے کہ ٹونک میں ان کے گھر پہ ہاتھی جھولا کرتے تھے۔ اب ان کے اشعار پر سامعین جھولا کرتے ہیں۔ مگر مخمور کو ہاتھی اور سامعین کے فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے کیوں کہ ہاتھی سوچ سمجھ کر جھولتا ہے اور سامعین سوچے سمجھے بغیر ہی جھومتے ہیں۔ یہ بھی سُنا ہے کہ وہ کسی زمانے میں ایک ہوٹل کے مینجر بھی تھے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہوٹل کا کاروبار بھی کتابوں کے اسٹال کی طرح ہی چلاتے رہے ہوں گے۔ یعنی اکیلے اکیلے ہی بیٹھے اپنے ہی ہوٹل میں رکھی ہوئی چیزیں کھا کھا کر۔
مخمور تکلیف دہ حد تک ملنسار اور خوش اخلاق آدمی ہیں۔ دن بھر چائے کی دس بارہ پیالیاں پینے کے بعد جی اوب گیا ہے اور اگر ایسے میں مخمور سے ملاقات ہوئی ہے تو مخمور ضرور یہ کوشش کریں گے کہ آپ اُن سے کچھ کھائیں، کچھ پیئیں۔ انکار کی صورت میں ان کے اصرار کے تیور یہ بتائیں گے کہ اگر مزید انکار جاری رہا تو وہ مہمان کو پچھاڑ کر نیچے لٹا دیں گے اور ایسے یوں چائے پلائیں گے جیسے چھوٹے بچے کو دوا پلائی جاتی ہے۔ مخمور اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ اپنی خوش اخلاقی کو دوسروں کے حلقوں میں ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ "تحریک" کے دفتر پر جب بھی فون کرتا ہوں تو فون پر یا تو پریم گوپال متل کی "یس پلیز" سے ملاقات ہوتی ہے یا پھر مخمور کے بھاری بھرکم "حضور" سے۔ اگر کبھی "یس پلیز" سے پہلے سامنا ہو تو پوچھتا ہوں "حضور" کہاں ہیں اور اگر "حضور" سے مڈبھیڑ ہو تو پوچھتا ہوں "یس پلیز" کہاں ہیں؟ مجھے مخمور کا "حضور" بہت اچھا لگتا ہے۔ یوں لگتا

۱؎ مخمور سعیدی کے دوسرے مجموعۂ کلام کا نام!

ہے جیسے ٹونک کی ساری تہذیب اس مخمور کے پیچھے سے جھانک رہی ہو۔

پچھلے چار برسوں میں مخمور سے میری بے شمار ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ جلسوں میں، دوستوں کی محفلوں میں، تحریک کے دفتر پر، میرے دفتر پر۔ میں نے مخمور کو بحیثیت مجموعی ایک نیک نفس اور شریف آدمی کے روپ میں پایا۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ مخمور شام گزارنے کے لئے دن گزارتے ہیں۔ میں نے مخمور کو شاموں سے بھی گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کسی بھی لمحہ میں وہ اپنی شرافت اور خوش اخلاقی کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔

مجھے اس وقت ایک بڑی خوشگوار رات کی یاد آرہی ہے جس کا انجام بڑا ناخوشگوار ہوا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ آسمان گرد آلود تھا مگر تب بھی اس گرد میں سے چاندنی دھندلی دھندلی روشنی پھینک رہا تھا۔ وقت کوئی گیارہ بجے تھے۔ میں مخمور، اور کمار پاشی اور دہلی کے دو چار دیگر شعرا حضرات گھومتے گھامتے جامع مسجد کے سامنے والے وسیع میدان میں پہنچے۔ اس میدان میں جابجا لوگ اس طرح سوئے ہوئے تھے جیسے ایک دوسرے کو ضرب دے رہے ہوں۔ سوئے ہوئے انسانوں کو پھلانگتے ہوئے ہم لوگ ایک چبوترے پر پہنچ گئے۔ طے یہ ہوا کہ ہر شاعر اپنا اپنا کلام سنائے۔ ایک شاعر نے ترنم سے کلام سنانے کی کوشش کی تو سوئے ہوئے لوگ جاگ کر اٹھ بیٹھے اور آہستہ آہستہ ہم لوگوں کے اطراف جمع ہونا شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پچاس ساٹھ افراد وہاں اکٹھا ہو گئے اور داد کا باضابطہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعض کاہل افراد ایسے بھی تھے جو سوئے تو نہیں تھے لیکن وہ لیٹے لیٹے ہی اشعار پر داد دینے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ایک صاحب مجمع میں سب سے سامنے بیٹھے ہیں اور بڑے خشوع خضوع کے ساتھ نہ صرف شعروں پر داد دے رہے ہیں بلکہ شعرا سے شعروں کو مکرر بھی پڑھوا رہے ہیں، چاندنی اتنی دھندلی تھی کہ اس میں اُن کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن اُن کا حُلیہ مجھے اس وقت کچھ ایسا لگا کہ بے ساختہ ان کے ساتھ عملی مذاق کرنے کو میرا جی چاہا۔ اس اثناء میں اور بھی بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ ہماری مخصوص محفلِ شعر جنس تبدیل کر کے باضابطہ مشاعرہ میں بدل رہی ہے تو میں بڑی سنجیدگی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک مختصر سی تقریر شروع کی۔"

حضرات! دہلی کا یہ آخری یادگار مشاعرہ ہے، جو اب تک "صدرِ مشاعرہ" کے بغیر چل رہا تھا۔ لیکن مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ اس مشاعرے کے صدر تشریف لا چکے ہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو کر مشاعرہ کو رونق بخشیں"۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک پتھر پر اپنا رومال بچھا کر "مسندِ صدارت" تیار کر لی اور آگے بڑھ کر ان صاحب کو جو شعروں پر بہت سنجیدگی سے داد دے رہے تھے، ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور "مسندِ صدارت" پر لا بٹھایا۔ اس کے ساتھ ہی مجمع نے تالیاں بجائیں اور میں نے دیکھا کہ "صدرِ مشاعرہ" واقعی بڑی سنجیدگی کے ساتھ یوں بیٹھے ہیں جیسے عام طور پر مشاعروں کے صدر بیٹھتے ہیں۔ کسی نے پکار کر پوچھا "ہمارے صدرِ مشاعرہ کا نام کیا ہے؟" اس پر میں نے کہا۔ "صدرِ مشاعرہ کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ مشاعروں کے سارے صدر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان پر ناموں کی تہمت نہیں آنی چاہیئے۔"

اس کے بعد باضابطہ مشاعرہ شروع ہو گیا۔ چونکہ میں اکیلا ہی غیر شاعر رہ گیا تھا اس لئے میں بزعم خود اس مشاعرہ کا کنوینر بن گیا اور مشاعرہ کی کارروائی چلانے لگا۔ مشاعرہ کی کارروائی چلانے کا مقصد کم از کم میرے نزدیک یہی تھا کہ میں "صدرِ مشاعرہ" کے ساتھ عملی مذاق کروں۔ میں نے سب سے پہلے مخمور کا نام پکارتے ہوئے کہا۔ "اب میں ملک کے ایک طرحدار شاعر کو زحمت دینا چاہتا ہوں جن کا تعلق ٹونک کی مردم خیز سرزمین سے ہے۔ مخمور سعیدی ہم سب کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ وہ غزل کہنے کا بڑا سجیلا ڈھنگ رکھتے ہیں۔ تو آیئے، سنیئے مخمور سعیدی سے اُن کی ایک غزل۔"

مخمور زیرِ لب مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ازراہِ مذاق "صدرِ مشاعرہ" کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "اجازت ہے؟"

اس پر صدرِ مشاعرہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا "مخمور صاحب! اجازت تو ہے لیکن میری خواہش یہ ہے کہ آپ اپنی وہ غزل سنائیے جو "شب خون" کے تازہ شمارے میں شائع ہوئی ہے۔"

صدرِ مشاعرہ کا یہ جملہ سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے اور مخمور کی آواز بیٹھ گئی۔

"یہ تو کوئی جغادری صدرِ مشاعرہ معلوم ہوتا ہے" میں نے کمار سے کہا۔ "یار! ہم نے غلطی سے "صحیح" صدرِ مشاعرہ کا انتخاب کر لیا ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

مخمور نے صدرِ مشاعرہ کی فرمائش پوری کر دی اور مجمع تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد صدرِ مشاعرہ نے داد دینے کے انداز میں مخمور سے کہا "مخمور صاحب! کیا کہنے، کیا ڈکشن ہے! کیا آہنگ ہے! آپ کی اس غزل میں جو اساطیری فضا ہے وہ اس غزل کی جان ہے۔ بھئی سبحان اللہ!"

اب کی بار کسی بھی لمبی چوڑی تمہید میں گئے بغیر میں نے کمار پاشی کو کلام سنانے کی دعوت دی۔ کمار کلام سنانے لگے تو میں سرک کر مخمور کے قریب پہنچا اور کہنے لگا۔ "بھئی! ذرا غور سے تو دیکھو کہ اس "پردۂ زنگاری" میں کون معشوق ہے؟"

مخمور نے کہا۔ "مجھے تو یہ شمس الرحمٰن فاروقی لگتے ہیں کیوں کہ صدرِ مشاعرہ کی بات چیت کا ڈکشن یہی بتا رہا ہے۔"

میں نے اور مخمور نے چاندنی کی دھندلی دھندلی روشنی میں "صدرِ مشاعرہ" کے چہرے پر شمس الرحمٰن فاروقی کے چہرے کے خطوط کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر فضا اتنی گرد آلود تھی کہ کبھی کبھی صدرِ مشاعرہ پر ڈاکٹر وزیر آغا تک کا گمان ہونے لگا۔

اس کے بعد مشاعرہ بڑی آن بان کے ساتھ جاری رہا۔ اس یادگار مشاعرہ کے دو تین دور چلے۔ آخر میں میں نے سوچا کہ جب مذاق کرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ صدرِ مشاعرہ کو "صدارتی تقریر" کرنے کی زحمت دی جائے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اعلان کیا۔ "حضرات! ہمارا مشاعرہ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ میں سب سے آخر میں آج کی محفلِ مشاعرہ کے صدر سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے زرّیں خیالات سے ہمیں مستفیض فرمائیں۔"

یہ سنتے ہی صدرِ مشاعرہ بڑی سنجیدگی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جدید نظم کی تاریخ بیان کرنی شروع کر دی۔ عصری حسیت، تنہائی کا کرب، ترسیل کا المیہ، کافکا، ٹی ایس ایلیٹ، ژاں پال سارتر اور اساطیری علائم۔ نہ جانے وہ کیا کیا کہتے رہے اور ہم بھونچکے ہو کر ایک دوسرے کے چہرے دیکھتے رہے۔ ابھی صدرِ مشاعرہ کی تقریر جاری ہی تھی اور وہ مخمور کی شاعری پر اظہارِ خیال کرنے ہی والے تھے کہ اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے۔ ایک شخص نے بھاگتے بھاگتے کہا۔ "آپ لوگوں کو یہاں شاعری کی سوجھی ہے اور وہاں باڑہ ہندو راؤ میں فساد ہو گیا ہے۔ بھاگو یہاں سے!"

پھر ہم بھی جدھر کو منہ اٹھ گیا ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر بھاگتے بھاگتے رہ رہ کر میرے ذہن میں یہ خیال آتا رہا کہ دلی بھی بڑا عجیب شہر ہے۔ جب بھی یہاں آرٹ اور ادب ترقی کرتا ہے تو ایک نادر شاہ کہیں سے ضرور آ جاتا ہے اور سب کچھ لوٹ کر پلٹ جاتا ہے۔ یہ نادر شاہ کبھی انگریز بن کر آتا ہے اور کبھی فساد بن کر نازل ہوتا ہے۔ ہم لوگ بڑی مشکلوں سے اپنے اپنے گھروں کو پہنچے۔ بعد میں کئی دنوں تک ہم لوگ دلی کے اس یادگار مشاعرے کے صدر کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہے لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ زندگی کی کئی حسین راتیں یونہی اپنا سراغ بتائے بغیر چھپ جاتی ہیں۔

مخمور کے ساتھ ایسی ہی کئی شاموں کی یادیں وابستہ ہیں۔ مخمور کو میں نہ صرف بحیثیت شخص بلکہ بحیثیت شاعر بھی پسند کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مخمور جدید شاعر ہیں حالانکہ وہ نہ تو زبان کی غلطی کرتے ہیں اور نہ ہی مصرعے کو وزن سے گراتے ہیں۔ پھر وہ کاہے کے جدید شاعر ہیں؟ میں ناقد تو ہوں نہیں کہ مخمور کی شاعری کی چیر پھاڑ کر کے اس کی خوبیاں اور خامیاں

گناؤں۔ یہ نیک کام میں نے کبھی نہیں کیا ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ جو بات دل کو چھو لے، چاہے وہ گالی میں کیوں نہ ہو اور وزن میں دی گئی ہو بڑی عظیم ہوتی ہے۔ مخمور کی شاعری کو پڑھتے وقت اکثر مقامات پر میرے ذہن میں قوس قزح سی تن جاتی ہے۔ اب تنقید کی زبان میں ایسی قوس قزح کو کیا کہتے ہیں یہ میں نہیں جانتا۔ میں تو صرف اپنی زبان میں بات کرنا جانتا ہوں۔

مخمور کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ کسی کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر دو چار برسوں میں جتنے شعری مجموعے چھپے ہیں ان میں سے ایک چوتھائی مجموعوں کے مقدمے مخمور نے لکھے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اب وہ از راہِ احتیاط دو چار فاضل مقدمے اپنے ہاں تیار کر کے رکھتے ہیں کہ کون جانے کب کونسی بلا نازل ہو جائے۔

مخمور کئی بیماریوں کا ایک علاج ہیں۔ شاعرے وہ پڑھیں گے، مقدمے وہ لکھیں گے، تحریک کا کام وہ کریں گے، شاموں کا اہتمام وہ کریں گے۔ اور تو اور پچھلے دنوں یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ مخمور، مسز مخمور کے امتحان کی تیاری میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میں بہت سے ایسے شاعروں اور ادیبوں سے واقف ہوں جو شادی شدہ تو ہوتے ہیں لیکن "شوہر" ہرگز نہیں ہوتے۔ مخمور تو خیر سے نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ "شوہر" بھی ہیں۔

مخمور کے بارے میں میرے پاس کہنے کو بہت سی باتیں ہیں لیکن بار بار میرے کانوں میں میرے حیدرآبادی دوست کے یہ جملے گونجتے رہتے ہیں کہ "مخمور سے مل کر تم خوش ہو گے، مخمور بڑا النفیس آدمی ہے، مخمور بحیثیتِ مجموعی اچھا آدمی ہے" چالیس قدم کے فاصلے کو چھلانگنے کے بعد اب اگر کوئی مجھ سے مخمور کے بارے میں رائے پوچھے تو شاید میں بھی انورٹیڈ کاماز (INVERTED COMAS) والی رائے ہی دے دوں۔

جو کچھ نہیں، کسی دشمن کا ذکر ہو مخمور
سکوت ہے یہ سرِ بزمِ دوستاں کیسا

اور آج میں دشمن کا نہیں، ایک دوست کا ذکر کر کے سکوتِ بزمِ دوستاں کو توڑنے چلا ہوں۔
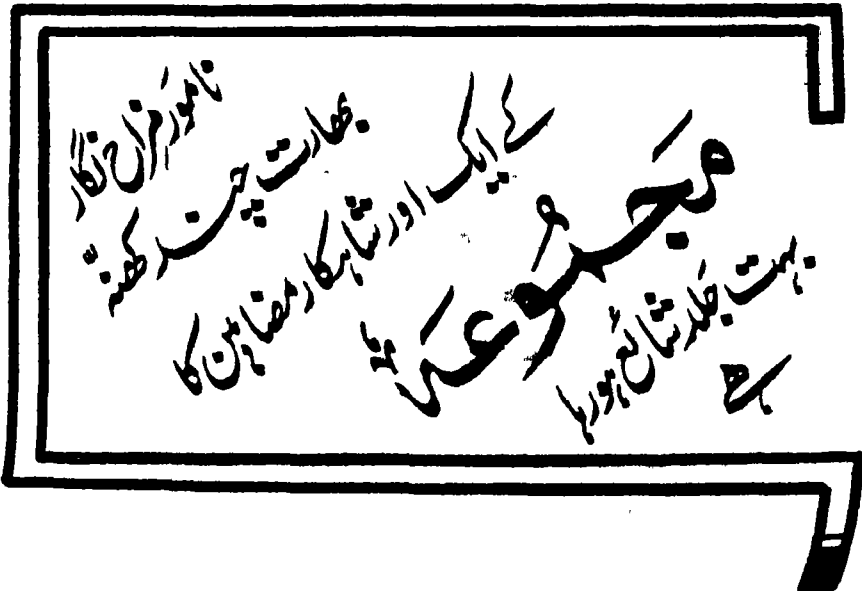
★★

ہے سو ہے

شریف درنگلی

ہاتھ میں اُن کے بیاٹ ہے سو ہے　　چوتے چھکے کی شاٹ ہے سو ہے
بھانسے مگڑے بدل دیئے گھر کے　　پہلے کی ٹھیٹی ناٹ ہے سو ہے
اُن کے ایمان کی ترازو میں　　اب بھی پاسنگ کا باٹ ہے سو ہے
بیٹھنے صوفہ سیٹ مبارک اُنھیں　　اپنی تو پھٹی ٹاٹ ہے سو ہے
اُن کے چوہے بھی موٹے تازے ہیں　　اپنی تو دُبلی کیاٹ (cat) ہے سو ہے
لاکھ تبدیلیاں ہوئیں لیکن
اپنے گھر کا پلاٹ ہے سو ہے

غزل

یوسفی مختار احمد

بَرف کی طرح ترے پیار میں گل جائیں گے　　تب تو ارمان ترے دل کے نکل جائیں گے
اُن کے ابا نے کہا اب نہ اِدھر آنا کبھی　　ورنہ بتیسیوں کے بتیس نکل جائیں گے
قیس و فرہاد سے سیکھی ہے محبت ہم نے　　ہم وہ سائل ہی نہیں در سے جو ٹل جائیں گے
کشتِ دل پر تو نگاہوں کے ٹریکٹر نہ چلا　　پیڑ پودے مرے ارماں کے کچل جائیں گے
اپنے دیوانوں سے یہ غرت مناسب تو نہیں
تیری بلڈنگ میں جب آئیں گے سنبھل جائیں گے

... لوگ

محمد عبدالقادر ادیب

کعبے کو ڈھا کے گھر کو بساتے ہیں یار لوگ　　کیا کیا کمال کرتے ہیں یہ "وضع دار لوگ"
جب بات ہم سے بن نہ سکی ہوگئے خفا　　اس ظرف کے ملیں گے کہاں ہم کو یار لوگ
ایسے ہی شاعروں کو ہمارا سلام ہے　　اُکتا گئے ہیں سُن کے جنھیں بار بار لوگ
تعریف میں بھی بخل کا انداز الاماں　　حرفوں کو تولتے ہیں کفایت شعار لوگ
ہنسنا بھی اپنے آپ پہ آساں نہیں ادیب
کرتے ہیں ایسے کام جگر دار لوگ

از: [illegible]

آج صبح جب میں چائے پی رہا تھا' ایک صاحب کمرے میں بغیر اجازت کے آدھمکے۔ کھچڑی بال' گندا پائجامہ، بڑھی ہوئی داڑھی' ٹوٹی چپلیں اور اندر دھنسی ہوئی آنکھیں ــــ صاف لگ رہا تھا کہ کسی ہتھیار بند فوج سے منہ کی کھاکر اور میدان چھوڑ کر بدحواسی میں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ میں نے ان کی طرف سوالیہ نگاہ ڈالی۔ بولے "جی' مجھے ملّا نابالغ کہتے ہیں۔ میں جناتی ادیب ہوں"۔

میرے لئے 'جناتی ادیب' کا لفظ نیا تھا۔ قواعد میں ویسے بھی میں کمزور رہا ہوں اور اس میں بھی 'مرکب الفاظ' میری سمجھ سے ہمیشہ باہر رہے ہیں۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ ان کا مقصد یا مفہوم کیا ہے۔

مجھے شک ہوا کہ عناصر خمسہ سے عاری ہونے اور قبر میں رہائش اختیار کرنے کے بعد کوئی ادیب بھوت بن کر تو یہاں نہیں آگیا ہے۔ یا کسی جنات کو لکھنے کا شوق چرایا ہو اور وہ مجھ سے مشورہ لینے آپہنچا ہو۔ حالانکہ میں آثار قدیمہ کا طالب علم کبھی نہیں رہا۔ اس لئے یہ نہیں جان سکا کہ ان کے کپڑے کتنے دنوں تک قبر میں مٹی کے نیچے دفن رہے ہونگے

میں ذرا اکبکا کر بولا "کیا آپ جنات ہیں"؟

وہ یکایک سنجیدہ ہوگئے۔ آنکھیں اندر کو سکڑ گئیں پیشانی کی رگیں ابھر آئیں اور ان کی آواز ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی "آپ جنرل نالج میں کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ میں ایسا ادیب ہوں جسے انگریزی میں "گھوسٹ رائٹر" کہتے ہیں۔ اسی کا آزاد ترجمہ میں نے "جناتی ادیب کیا ہے"۔

"لیکن یہ ترجمہ مجھے ہضم نہیں ہو رہا ہے"۔ میں نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا "GHOST" کے معنی بھوت ہوتے ہیں اور جنات کو انگریزی میں GENII کہتے ہیں۔ اس طرح آپ 'بھوت ادیب' ہوئے نہ کہ 'جناتی ادیب'"

"ارے جناب! آپ لفظی ترجمہ کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ اپنی نظر کو وسعت دیجئے میں جو کہہ رہا ہوں اس پر یقین کرتے ہوئے مجھے "گھوسٹ رائٹر" مان لیجیے"۔

"چلئے ماننے میں مجھے کوئی قباحت نہیں کیوں کہ

ہمارے یہاں طرح طرح کے ادیب روز پیدا ہوتے رہتے ہیں. اور ہمارا پورا ادب اِزموں سے بھرا ہوا ہے. ہمارے ادب کی زمین اتنی زرخیز ہے کہ روز نئے نئے اِزم بنتے بگڑتے رہتے ہیں. گھوسٹ رائٹر، کی بات میں نے مذاق میں کہی سے تیں بھی سُنی تھی. مگر آپ کی طرح سیریس ہو کر کسی نے ذکر نہیں کیا تھا. براہ کرم اس سلسلے میں تفصیل بتا کر میری نالج میں اضافہ کریں"

میری بات سے خوش ہو کر اُنھوں نے اپنے نحیف و نزار جسم کو پھُلانے اور پھیلانے کی ناکام کوشش کی. پھر بغیر مجھ سے پوچھے ایک سگریٹ سلگائی اور کہنا شروع کیا" گھوسٹ رائٹر کی کئی اقسام ہیں. کچھ ادیب یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں. اور خالی وقت میں بی اے، ایم اے کے طالب علموں کے نوٹس اور گیس پیپرز تیار کرتے ہیں. چونکہ وہی سوالات چھپتے ہیں، اس لئے اپنے نام سے ممکن اور متوقع سوالات نہیں چھاپ سکتے. یہی وجہ ہے کہ وہ اے بی سی ڈی جیسے فرضی ناموں یا ایک تجربہ کار پروفیسر وغیرہ کے ناموں سے یہ سارے دھندے کرتے ہیں. ویسے یہ دھندا کرنے والے بلیشرز پروفیسر خود اِل اِل پی پی رہتے ہیں. (نوٹ: یہاں مجھے نہ سمجھتا ہوا پا کر انھوں نے اس لقب کے اختصار پر روشنی ڈالی ______ ان کے یہاں کئی جناتی ادیب پروف ریڈر کے بطور بحال رہتے ہیں، جو ان کے لئے آرٹیکل لکھتے ہیں، پیش لفظ اور دیباچہ لکھتے ہیں اور مختلف ناموں سے رسائل میں تعریفی خطوط بھیجتے ہیں"

وہ سانس لینے کے لئے رکے، پھر کہنے لگے " آج کل کے منسٹروں کا خاص کام افتتاح کرنا ہوتا ہے. ہر منسٹر یا ڈپٹی منسٹر مشاعرے سے لے کر فیملی پلاننگ تک کا افتتاح کرتے ہیں. ظاہر ہے. ایسا کرنے کے لئے انھیں تقریر بھی کرنی پڑتی ہے وہ اپنے پرائیویٹ سکریٹری کی شکل میں یا دوست کی حیثیت سے ہمیشہ ایک آدھ گھوسٹ رائٹر رکھتے ہیں. جب جیسی ضرورت پڑتی ہے، لکچر تیار ہو جاتا ہے. کبھی کبھی یہ منسٹر فیتہ کاٹ کر بیمار ڈکلیر کر دیئے جاتے ہیں اور دوسرا کوئی (فلاں چلاں یا خود گھوسٹ رائٹر) ان کی وہ نام نہاد تقریر پڑھ دیتا ہے.

جس طرح بڑے بڑے کنٹریکٹر چھوٹے چھوٹے (پیٹی) کنٹریکٹر رکھتے ہیں اسی طرح بڑے بڑے ادیب (یونیورسٹی کے صدر شعبہ یا پروفیسر یا نامی گرامی مصنف وغیرہ) کئی چھوٹے بڑے گھوسٹ رائٹر رکھتے ہیں. کہاوت ہے کہ' نامی بنئے کا نام بکتا ہے: اسی طرح ان ادیبوں کے یہاں ناشر ایڈوانس لے کر دوڑتے رہتے ہیں. یہ مجاہد اعظم کافی خوشامد کے بعد بچوں کا ادب، نفسیات، شاعری، کہانی، تنقید ڈرامہ اور ترجمہ وغیرہ سب طرح کے کام اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں. جس طرح مشہور فلم اسٹار ایک ساتھ کئی معاہدہ قبول کرتے ہیں، اسی طرح یہ ادبی مجاہد اعظم بھی ہوس کے پتلے بنے پھرتے ہیں. فرق یہ ہوتا ہے کہ فلم اسٹاروں کو شوٹنگ میں خود جانا پڑتا ہے. مگر یہ مجاہد اپنے گھوسٹ رائٹروں کو محنتانہ کے نام پر چند ٹکڑے دیکر اپنے نام سے آرڈر کی کتاب بازاروں میں لا پٹکتے ہیں. پھر پشت در پشت رائلٹی کے نام پر روپیہ کھا کر عذاب شکم میں مبتلا رہتے ہیں کبھی کبھی کچھ سرکاری کرمچاری بھی ڈپارٹمنٹل دشواریوں کی بنا پر گھوسٹ نام سے لکھتے ہیں. حقیقت کے پیش نظر یہ بات سامنے کی ہے کہ مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس پریم چند پہلے سرکاری کرمچاری تھے، جنھیں گھوسٹ ازم، کی گرفت میں آنا پڑا تھا"

اتنا کہتے کہتے جناتی ادیب صاحب ہانپ اٹھے. انھوں نے ایک گلاس پانی حلق سے نیچے اتارا پھر بولے" ان گھوسٹ رائٹروں کی حالت بہت خراب رہتی ہے. چونکہ ان کے پاس سرٹیفکیٹ اور سفارش کا فقدان رہتا ہے. اس لئے یہ جیسے تیسے اپنا پیٹ پالتے ہیں. کبھی کبھی انھیں یوں بھی ٹرخا دیا جاتا ہے"

میں نے پوچھا" ایسی حالت میں کیا یہ گھوسٹ رائٹر انتقام نہیں لیتے ہیں؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" وہ مسکرائے بغیر ہنس پڑے "کبھی کبھی بدلہ لے ہی لیتے ہیں۔ میں آپ بیتی سناتا ہوں۔ ایک ڈپٹی منسٹر کا میں گھوسٹ رائٹر بنا تھا۔ دس بارہ افتتاحی تقریر لکھنے کے بعد بھی وہ مجھے ٹرخاتے رہے۔ گھر پر جاتا تو چائے تک نہیں پلاتے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا —— اچھا بچو، تمہیں کبھی نہ کبھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم کرواں گا۔

ابھی پچھلے دنوں امیر خسرو کی برسی کا انھیں افتتاح کرنا تھا۔ مجھے تقریر لکھنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے حامی بھر لی۔ اور جب ٹھیک ایک گھنٹہ وقت باقی رہ گیا تو تقریر لکھ کر دے آیا۔ ایسا اس لئے کیا تاکہ کوئی دوسرا نہ پڑھ سکے۔ وہ خود پڑھنے کے لئے اس ایک گھنٹہ میں وقت نہیں نکال سکتے تھے۔ اس کا مجھے پتہ تھا۔ پھر وہ میرا حرف بہچانتے تھے اور انھیں مجھ پر بھروسہ تھا۔ بہرحال —— تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ —— حضرت امیر خسرو اس لئے مشہور ہیں کہ ہندوستان کے غالب اور پاکستان کے اقبال کے ہمعصر تھے۔ اور دونوں ملکوں کے وزیر اعظم سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ وزیر اعظم کی ہی اپیل پر 'نیشنل انٹگریشن' کے لئے غذائی اجناس پر نظمیں لکھتے رہے۔ ویسے انھوں نے مزاحیہ شاعری بھی کی ہے۔ اکبر الہ آبادی انھیں کے شاگرد تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ؛

اس تقریر کی بخیہ گری جس طرح اخبار والوں نے کی، اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ تو کہئے کہ اپنی قسمت ہیٹی ہے اس لئے ان کے عتاب سے بچا ہوا ہوں۔ ورنہ ان کا بس چلے تو مجھے کچا چبا کر تھوک دیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ چند لمحے سوچتا رہا کہ انھیں کس طرح ٹالوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ڈرتے ڈرتے براہ راست کہہ دیا "اب مجھے اجازت دیجیے۔ آفس جانا ہے۔ پھر کبھی آئیے تاکہ میں اپنے علم میں اضافہ کر سکوں۔"

"یقیناً یقیناً۔ ضرور آؤں گا۔ گھوسٹ رائٹر جو ٹھہرا۔ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ آپ کے یہاں چائے تک باقی ہے اچھا اچھا خدا حافظ۔" اور وہ اُٹھ گئے!

ذات کا کرب

ظہیر ابنِ قدسی

کل رات اِک عجیب قیامت گزر گئی
عالم تھا نیند کا اِدھر آئی اُدھر گئی !

آنکھوں میں چاند اور ستارے اُتر گئے
چلّاتے چیختے کئی سورج گزر گئے

نیلے گلابی رنگ کبھی ہر طرف اڑے
قوسِ قزح کے رنگ کبھی ٹوٹ کر گرے

صحرا میں جا کے مَیں کبھی تنہا کھڑا رہا
بجلی کا کھمبا راہ میں بن کر گڑا رہا

منظر یہ پلٹا جب تو سیہ رات ہو گئی
پتھر کی چاروں سمت سے برسات ہو گئی

ان پتھروں نے کر دیا مجھ کو لہولہان
اور مَیں سمجھنے لگ گیا خود کو بہت مہان

پھر دیکھا مَیں نے سامنے شیشوں کا اک نگر
شیشے کے لوگ باگ تھے شیشے کے جانور

دل کھیت بن کے بکھرے تھے اسمیں قدم قدم
اُگتی تھی دل کے کھیتوں میں بس ایک فصلِ غم

پھر یوں ہوا کوئی مجھے آ کر کتر گیا
مَیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کے خلا میں بکھر گیا

پھر کرب ناک وادی میں سورج کئی اُگے
کچھ مرغ آس پاس تھے ان کے کٹے ہوئے

سورج لیے ہوئے تھے کئی مرغ چونچ میں
بقیہ کھڑے ہوئے تھے کسی گہری سوچ میں

کُتے جو بھونکے چونچ سے، سورج گرے اِدھر
مَیں بھی خلا سے گر پڑا فوراً زمین پر

بے نام زندگی کا سفر ختم ہو گیا
کھایا پیا تمام وہیں ہضم ہو گیا

سوچا یہ حال کیوں ہوا تب راز یہ کھلا
مَیں نے جدیدیوں کا سنا تھا مشاعرہ

سُنتا ہے اب ظہیر جو غزلیں "علامتی"
فوراً ہی مانگتا ہے دعائے سلامتی

ماڈرن چمچے

اَن پڑھ بھونگیری

مختار کو مجبور بنا دیتے ہیں چمچے
پیغام تباہی کا سُنا دیتے ہیں چمچے

شور ایسا زمانے میں مچا دیتے ہیں چمچے
مُردوں کو بھی قبروں میں جگا دیتے ہیں چمچے

چمچہ گری جب اپنی دکھا دیتے ہیں چمچے
جلتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں چمچے

اغیار تو اغیار ہیں اغیار کی چھوڑو
اپنوں کو بھی اپنوں سے لڑا دیتے ہیں چمچے

ہر روز نیا کرتے ہیں بحران یہ پیدا
ہڑ بونگ نئی روز مچا دیتے ہیں چمچے

کھڈے میں گرا دیتے ہیں کنگال کو لیکن
زر دار کو جھنڈے پہ چڑھا دیتے ہیں چمچے

اک بات میں اک بات نئی کرتے ہیں پیدا
ذرّے کو بھی مہتاب بنا دیتے ہیں چمچے

گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں یہ اَن پڑھ
ہر رنگ میں رنگ اپنا ملا دیتے ہیں چمچے !

شریف اسلم

لطیفہ در لطیفہ

ہم لوگ ہمیشہ لطیفے سُننے، سُنانے اور لطف اندوز ہونے ہی میں مگن رہتے ہیں اور ہمیں اس بات پر غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی کہ کس نے کس لطیفے کا کیا اثر قبول کیا یا یہ کہ ایک ہی لطیفے کے مختلف اشخاص پر کیا اثرات مرتب ہوئے کبھی ایسا بھی ہوا کہ جس لطیفے کو ہم نے اپنا شاہکار سمجھ کر اور اپنے مخاطب کو باذوق جان کر سُنایا اس کی داد ہی نہیں ملی اور بعض موقعوں پر تو سُبکی بھی اٹھانی پڑی لیکن وہی لطیفہ جب کسی دوسری محفل میں سنایا تو مزاح کی تیز حس رکھنے والے سامعین کا ذہن رسا لطیفہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کے انجام پر پہنچ گیا اور قہقہوں کے طوفان جاگ اُٹھے۔

اس بات کا جائزہ لینے کے لئے کہ کس پر کس لطیفے کا کیا اثر ہوگا، ہم لطیفے سُننے والوں کو تین زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں اسی طرح لطیفے سنانے والے بھی مساوی طور پر تین گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

لطیفے سُننے والوں کا ایک طبقہ ان افراد پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں اگر آپ ۱۵ اگست کو کوئی لطیفہ سنائیں تو ان کے سمجھنے اور لطف اندوز ہو کر ہنسنے تک ۲۶ جنوری کا آجانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو لطیفے کے آغاز پر ہی قہقہے مار کر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں اور لطیفہ ختم ہونے تک اپنی ہنسی روک نہیں پاتے اور جب لطیفہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا ترجمہ کرنے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ تیسرے زمرہ میں وہ لوگ آتے ہیں جو لطیفے کے اصل

عا سے ہٹ کر کوئی اور ہی مطلب نکال لیتے ہیں۔ اس زمرہ سے تعلق رکھنے والوں میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کی کوئی قید نہیں!۔

اب اُن اصحاب کا حال سُنئے، جو شعر گوئی کی طرح لطیفہ گوئی کے مرض میں مُبتلا رہتے ہیں اور بہ زعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس فن میں یکتائے روزگار ہیں۔ ایسے ہی ایک کرم فرما سے جب مڈبھیڑ ہوئی تو انھوں نے بہ اصرار شدید کچھ دیر رک جانے اور بقول ان کے ایک تازہ لطیفہ سن لینے کی خواہش کی۔ اخلاقاً جب ہم نے ان کی اس خواہش کی تکمیل کی تو پتہ چلا کہ صرف ۲۴ گھنٹے پہلے خود ہمارا سنایا ہوا لطیفہ وہ ہمیں سنا کر داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

لطیفے سنانے والوں کا دوسرا طبقہ ان افراد کا ہوتا ہے جو بات کو ربر کی طرح کھینچ کر بیان کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ نامپلی سے وقارآباد جانے والی ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں سوار ہو کر ابھی ہم اپنا سوٹ کیس رکھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک ہمسفر کرم فرما اپنی نشست سے اُٹھے اور بڑے تپاک کے ساتھ آداب بجالانے کے بعد ہم سے درخواست کی کہ ان کے قریب کی نشست پہ بیٹھ جائیں اور دورانِ سفر لطیفہ سنا کر لطف اندوز کریں۔ لطیفے کی بات سُنتے ہی آس پاس بیٹھے ہوئے مسافروں کے کان کھڑے ہوگئے اور وہ بھی ہماری نشست کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ اس مرحلے پہ ہم نے تکلفاً اپنے شناسا سے عرض کی کہ جناب آپ تو ہم سے کئی لطیفے سن چکے ہوں گے اس لئے بہتر ہوگا کہ اس دفعہ اس کی خدمات آپ سے ہو۔ یہ سنتے ہی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر انھوں نے ہماری درخواست قبول کر لی اور بقول ان کے اپنا شاہکار لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔ ٹرین کے ساتھ ساتھ اُن کا لطیفہ بھی چلتا رہا حتیٰ کہ وقارآباد آنے میں صرف پانچ میل باقی رہ گئے، اس منزل پہ ہم نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا جناب والا! ہماری برداشت کی حد ہو چکی، خدارا لطیفہ کا '[illegible]' کیجیے ورنہ ہم اپنے سوٹ کیس کے ساتھ چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

لطیفے سنانے والوں کا تیسرا زمرہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب ایک محفل میں دوست احباب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہم کافی دیر تک لطیفے سُنا چکے تو ایک بزرگوار نے اپنی نشست سے اُٹھ کر ہمیں گلے لگایا اور ارشاد فرمایا کہ پچھلے ہفتے جب وہ بمبئی گئے تھے تو وہاں بھی ایک صاحب نے انھیں ایک ایسا پھڑکتا ہوا لطیفہ سنایا تھا کہ ہنستے ہنستے اُن کے پیٹ میں بل پڑ گئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اُن کے کہنے کے مطابق ایسا زوردار اور قہقہہ بردار لطیفہ انھوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار سنا تھا۔ صاحب موصوف کی اس تمہید نے سامعین کی آتش اشتیاق اور بھڑکا دی اور سب لوگ ان سے مصر ہو گئے کہ خدارا ہمیں بھی وہ لطیفہ سُنا کر لطف اندوز کریں۔ اس پر موصوف نے بڑی متانت کے ساتھ فرمایا کہ حضرات مجھ میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ کوئی لطیفہ مجھے یاد نہیں رہتا لہٰذا میں آپ کے حکم کی تعمیل سے قاصر ہوں۔

وہ لطیفے جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں دن رات گھستے پٹتے رہنے کے باعث بے جان بن جاتے ہیں بالخصوص اس وقت جب کسی اناڑی سے ان کے پالا پڑا ہو۔ اکثر یہ روندے ہوئے لطیفے بھی ان اصحاب کے ہاتھوں قتل ہوتے رہتے ہیں جنھیں لطیفے سنانے کی تحریک "دیکھا دیکھی" ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی بزم میں ممتاز، ذہین اور نامور لطیفہ گو حضرات اپنی لطیفہ گوئی سے محفل کو زعفران زار بنا رہے ہوں تو اسی محفل کے کسی گوشے سے صدا آئے گی کہ حضرات اتنی دیر سے آپ کئی جاندار لطیفے سُنا چکے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بھی ایک لطیفہ سناؤں۔ یہ سُن کر تکلفاً سب لوگ اُن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ کرم فرما آدھا لطیفہ سنا کر چُپ سادھ لیتے ہیں۔ اِدھر سامعین یہ جاننے کے لئے مضطرب رہتے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ جب اُن سے دریافت کیا جاتا ہے کہ ہاں جناب! پھر کیا ہوا تو وہ بڑے عجز و انکسار کے ساتھ کہنے لگتے ہیں کہ معاف کرنا اس کے بعد کیا ہوا میں بھول گیا۔

لطیفہ گوئی کے دوران ایسے مرحلے بھی آتے ہیں کہ کسی محفل میں جب کوئی معزز ہستی لطیفہ سناتی ہے تو اس حقیقت کے باوجود کہ یہ لطیفہ آپ کئی بار سُن چکے ہوتے ہیں، آپ کو نہ صرف پوری توجہ سے سُننا پڑتا ہے بلکہ زوردار قہقہے بھی لگانے پڑتے ہیں۔

لطیفے سننے اور سنانے والوں کی محولہ بالا درجہ بندی کے بعد چند منتخبہ لطیفے سامعین کی خدمت میں پیش ہیں۔

ایک صاحب بس میں سفر کر رہے تھے اور جب بھی انھیں چھینک آتی دل پر جبر کر کے روک لیتے۔ اس طرح کئی دفعہ جب انھوں نے اپنی چھینک روک لی تو بازو کی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے ان سے کہا قبلہ یہ جو بار بار آپ چھینک کو روک رہے ہیں تو اس کا سبب کیا ہے؟ اس پر موصوف نے کہا کہ بھائی بات یہ ہے کہ میری بیوی نے مجھ سے کہہ رکھا ہے کہ جب بھی تمہیں چھینک آئے تو یہ سمجھنا کہ میں نے تمہیں یاد کیا اور تم فوراً چلے آنا۔ یہ سن کر ہمسفر نے کہا کہ جب ایسی بات ہے تو آپ بلا تکلف چھینک دیجئے اور اپنی بیوی کے پاس چلے جائیے۔ اس پر انھوں نے کہا بھائی کیا عرض کروں میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔

ایک اور لطیفہ سنئے۔ ایک صاحب نے اپنے لڑکے کے استاد سے پوچھا مولوی صاحب آپ پچھلے ایک سال سے میرے لڑکے کو تاریخ پڑھا رہے ہیں یہ بتائیے کہ اس مضمون میں اس کی کیا حالت ہے کیوں کہ میں خود تاریخ کا طالب علم رہ چکا ہوں لیکن اس مضمون میں بے حد کمزور تھا۔ یہ سن کر مولوی صاحب نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا قبلہ بس یوں سمجھئے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

ایک شخص ریلوے انکوائری کاونٹر پر گیا اور کلرک سے مختلف ٹرینوں کی آمد اور روانگی کے اوقات لگاتار دریافت کرتا رہا۔ دس بارہ ٹرینوں کے اوقات تبلانے کے بعد جب انکوائری کلرک نے جھنجھلا کر کہا کہ اتنی ساری ٹرینوں کے اوقات جو آپ دریافت کر رہے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے۔ پہلے یہ بتائیے آپ کو کس ٹرین سے جانا ہے اس پر شخص مذکور نے کہا مجھے کسی ٹرین سے نہیں جانا ہے۔ بلکہ صرف پٹری پار کرنا ہے۔

ایک صاحب اپنے دوست کی عیادت کے لئے ہاسپٹل گئے اور ہاسپٹل اسٹاف کی ایک خاتون کو مسلسل گھورنے لگے۔ یہ دیکھ کر اس خاتون نے پوچھا کیا بات ہے جو آپ مجھے اس طرح بار بار گھور رہے ہیں۔ اس پر موصوف نے کہا کہ بات یہ ہے کہ آپ کا حُسن و شباب دیکھ کر میرے دل میں یہ امنگ پیدا ہو رہی ہے کہ کسی روز میں بھی ہاسپٹل میں شریک ہو جاؤں اور میری تیمار داری آپ کریں۔ خاتون نے کہا کہ آپ کی آرزو کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب کہ اللہ میاں کوئی معجزہ دکھلائیں کیوں کہ میں نرس نہیں بلکہ دایا ہوں۔

کسی محفل میں لوگ اپنے آبا و اجداد کے کارنامے بڑے فخریہ انداز میں بیان کر رہے تھے۔ ان سب سے ایک شخص نے کہا ایک دفعہ دادا صاحب قبلہ مچھلی کے شکار کے لئے تالاب پر گئے اور جونہی انہوں نے تالاب میں گل ڈالی، ایک پانچ مَن وزنی مچھلی گل کو لگ کر باہر آ گئی۔ یہ سُن کر دوسرے شخص نے کہا، جناب آپ میرے دادا کا بھی ایک کارنامہ سُن لیجئے۔ ایک دفعہ وہ بھی شکار کے ارادے سے تالاب پر گئے اور جونہی تالاب میں گل پھینکی ایک روشن قندیل گل کو لگ کر باہر آ گئی۔ اس پر پہلے شخص نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ جلتی ہوئی قندیل تالاب سے باہر آئے دوسرے شخص نے کہا کہ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر آپ مچھلی کا وزن کم کیجئے میں قندیل بجھائے دیتا ہوں۔

مائیں تندرست ہوں تو بچے بھی توانا ہونگے

ماں اور بچے کی تندرستی کیلئے
ہیلتھ سینٹر میں آئیے

پرویز یداللہ مہدی

چہ خوب!

قسط ——————— (۱۰)

○ "آپ کا کوئی "بی۔ ایف" ہے ——؟"

کلب کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے یہ "جوابی سوال" ہمارے ذہن میں
کلبلایا، لیکن زبان کی چکنی سڑک سے پھسل کر ہونٹوں کے 'گیٹ' سے باہر نکلنے بھی نہ
پایا تھا کہ ایک کرخت آواز کان کے بالکل پاس سے بندوق کی گولی کی طرح سنسناتی ہوئی گزری۔
"ہیلو، شبنم ——!" لہجے میں شبو کے لئے اس قدر لگاوٹ کی ملاوٹ تھی کہ ہم کسی مشین کی طرح گھوم گئے۔
ہم سے چار پیر ملکی کے فاصلے پر ابھی کچھ دیر پہلے ذہن میں کلبلانے والے سوال کا بھرپور جواب کھڑا تھا۔ گٹھیلے بدن
کے اس نوجوان کا چہرا طوطا پری آم جیسا تھا، البتہ تلخ خدوخال اور جبڑے کی ابھری ہوئی ہڈیاں اس بات کی غمازی
کررہی تھیں کہ آدمی نڈر اور لڑاکا قسم کا ہے۔ اس کی آنکھوں کی بناوٹ یوں تو عام سی تھی لیکن ان میں ایک عجیب
سی چمک بھی تھی جو اس کی آنکھوں کو دوسروں سے الگ اور منفرد ثابت کررہی تھی، البتہ اس وقت اس کی
نظروں میں شبو کے لئے لگاوٹ کی جو "چیچپاہٹ" لہرا رہی تھی اس نے ہمیں شبو کا گہری نظر دل
سے جائزہ لینے پر مجبور کردیا۔ آج شبو کی پھبن واقعی نرالی تھی۔ حالانکہ پچھلے دو تین روز کے
عرصے میں ہم نے شبو کے ساتھ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گزارا تھا لیکن اس دوران میں
خدا گواہ ہے ہم نے شبو کو ایسی لگاوٹی بلکہ چھپاتی نظروں سے نہیں دیکھا ——
اس وقت شبو گلابی "غرارہ سوٹ" میں واقعی گلابوں کی ملکہ نظر آرہی تھیں ——
نظر کا زاویہ بدلتے ہی دل کے پیمانے نے نئے انداز سے رقص
کرنا شروع کردیا —— اب ہمیں اس طوطا پری کی نظروں میں
لگاوٹ کھلنے لگی۔ بلکہ ہمیں اس پہ غصہ آنے لگا۔ جی
چاہتا تھا کہ اس کے ایک چپت رسید کردیں
ایک دھول جمادیں —— اس سے
پہلے کہ ہم سے ایسی کوئی تجارت ہو"

حرکت سرزد ہوتی، ہمیں بروقت خیال آگیا کہ سامنے والی پارٹی کے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں ہیں، اور پھر ایسی حرکت ہم آخر کس بُنیاد پر کرتے ـــــ شبُّو نہ تو ہماری منگیتر تھیں نہ محبوبہ، اور نہ ہی مستقبل قریب میں ان سے ہماری سگائی ہونے کے امکانات تھے ـــــ تو پھر رقابت کا یہ جذبہ؟ یہ دل ضرور ہم سے بھاڑ جھونکوائے گا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ جب کسی کی پیاری پیاری صورت واقعی پیاری معلوم ہونے لگتی ہے تو پھر انسان کو اپنی جان پیاری نہیں رہتی اور وہ کپڑے پھاڑ کر (دوسروں کے نہیں اپنے) یا تو جنگلوں اور صحراؤں کی طرف نکل جاتا ہے یا پھر "چور بازار" سے "کند تیشہ" خرید کر کسی پہاڑی کی طرف چل دیتا ہے تاکہ پہاڑ کھود کر عشق کے چوہے کو زندہ یا مُردہ گرفتار کرے اور خود تمام دنیاوی جھنجھٹوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے۔ ناکام عاشقوں کے عبرتناک انجام کے بارے میں جتنی فرضی کہانیاں یاد آسکیں، یاد کیں لیکن اس کے باوجود، طوطا پری کے تئیں ہمارے دل میں جو نفرت کی لہر ابھری تھی کم نہ ہوئی بلکہ اور بڑھ گئی۔ ویسے بھی بعض چہروں کی ساخت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ انھیں دیکھ کر خواہ مخواہ خون کھولتا ہے اور ان سے زبردستی اللہ واسطے کا بیر ہو جاتا ہے ـــــ طوطا پری سے یہ بیر اس وقت کچھ اور بڑھ گیا جب اس کے ہیلو کے جواب میں شبُّو نے بجائے اس پر بگڑنے کے مسکرا کر ہیلو کہا ـــــ اس گھٹیلے طوطا پری نے پہلے تو ہمیں عجیب تمسخرانہ نظروں سے دیکھا پھر شبو کی طرف سوالیہ انداز میں نظریں گھمائیں جیسے یہ جاننا چاہتا ہو کہ ہم کس کھیت کی مولی ہیں یا کوئی مولی کا کھیت۔ پھر خود ہی آگے بڑھ کر اپنا ہتھوڑا چھاپ زبردست، دست نامبارک ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولا ـــــ "ناچیز کو خان فولادی کہتے ہیں" اس کے آہنی پنجے میں جیسے ہی ہمارا ہاتھ پہنچا، اس کی آہنی گرفت کا ہمیں بھی اندازہ ہو گیا آدمی واقعی فولادی تھا بلکہ "فولاد کی کان" تھا "فولادی صاحب صوبے کے "مڈل ویٹ باکسنگ" چمپئن بھی ہیں"۔ شبو کی اس اطلاع پر ہم نے بجلی کی سی تڑپ اور سرعت کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کی آہنی گرفت سے چھڑالیا اس نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے یہ مت سمجھیے کہ میں کوئی پیشہ ور باکسر ہوں، یہ تو بس شوق ہے، کاروبار دراصل امپورٹ ایکسپورٹ کا ہے خصوصاً سانپوں کا زہر ایکسپورٹ کرتی ہے ہماری فرم ـــــ"

طوطا پری کی اس اطلاع پر تو ہمیں سانپ سونگھ گیا بلکہ "ڈس" گیا پہلی نظر میں طوطا پری کی آنکھوں میں جو عجیب سی چمک نظر آئی تھی اور جسے ہم اس وقت کوئی نام نہیں دے سکے تھے، وہ دراصل "کنگ کوبرا" کی چمکدار آنکھوں کی چمک سے مشابہ تھی ـــــ یہ احساس کچھ دیر کے لئے ہماری سٹی گم کر گیا ـــــ نتیجتاً ہم اپنا تعارف کروانا ہی بھول گئے حالانکہ "خان فولادی" کے نام پر جو ہم پلّہ نام ہمارے ذہن میں ابھرا وہ تھا "سید اسٹین لیس اسٹیل" ـــــ لیکن ہمارے ہونٹوں پر تو جیسے چپ سی لگ گئی تھی اس سے پہلے کہ یہ چپ ہمارے لئے سبکی بن جاتی، شبو نے بڑے دھڑلے سے ہمارا تعارف کروا دیا اور پتہ نہیں کھیل کے کتنے میدانوں کو سر کرنے کی تہمت ہمارے سر مڑھ دی، ہم تو چونکے اس وقت جب خان فولادی عرف طوطا پری نے یہ بھاری بھرکم بلکہ فری اسٹائیل جملہ ہماری طرف پھینکا ـــــ "پھر تو باکسنگ سے بھی آپ کو یقیناً دلچسپی ہو گی ـــــ؟"

"جی ہاں آپ کی دعا سے" ـــــ پتہ نہیں اتنا بڑا جھوٹ ہماری زبان سے کیسے نکل گیا۔ شاید وہی احساس ہو گا کہ کسی خوبصورت حسینہ کے سامنے ایک نوجوان یوں بھی کسی معاملے میں اپنا پلّہ کم زور ہونے نہیں دیتا اور پھر ایسے میں جب کہ محبت کے "ایمپلائمنٹ ایکسچینج" میں امیدواروں کی فہرست میں اس نے اپنا نام بھی درج کروالیا ہو ـــــ البتہ خان طوطا پری کی فولادی گرفت کے یاد آتے ہی ہم نے بڑے ہی داؤ پیچ والے انداز میں بات پلٹنے کی کوشش کی ـــــ "یہ سچ ہے کہ باکسنگ سے زیادہ مردانہ کوئی اور گیم نہیں، لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے "مڈل ویٹ" یعنی درمیانہ باکسنگ سے کوئی خاص دلچسپی کبھی نہیں رہی، اس

کی وجہ شاید یہی رہی ہو کہ میں شروع سے ہر درمیانہ چیز سے دور بھاگتا رہا ہوں"۔ ہماری اس چوٹ کو یا تو وہ سمجھ نہیں پایا یا اس کا کوئی نوٹس لینا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر شبو سے مخاطب ہوا "آپ لوگ غالباً بوٹنگ کے لئے جھیل کی طرف تھے، اتنا جلدی واپس کیسے آ گئے ـــــ!"

"کیا کرتے ـــــ" شبو نے مایوسانہ لہجے میں جواب دیا "ساری کشتیاں پہلے ہی بک ہو چکی تھیں ـــــ"

"تو کیا ہوا ـــــ میری بوٹ آخر کس دن کام آئے گی ـــــ" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس طرح جھک گئے جیسے زمین پہ لیٹ کر خود بوٹ بن جانا چاہتا ہو ـــــ ہم نے دل ہی دل میں کہا "برخوردار طوطا پری مانا کہ تم فولادی لیکن ہم بھی کوئی کاغذی پیکر نہیں ہیں ـــــ" لیکن وہ کم بخت ہم سے مخاطب ہی کہاں تھا وہ تو شبو کی طرف یوں ہمہ تن تھا جیسے سر آنکھوں پہ بٹھا لینا چاہتا ہو ہمارے تعلق سے اس کی آنکھوں میں ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ لاکھ باکسنگ چمپئن سہی، ہمیں سر آنکھوں پہ بٹھانا اسے بہر حال بھاری پڑتا ـــــ شبو نے غالباً اسے مزید جھکانے کے لئے منہ بنا کر کہا ـــــ "اب تو بوٹنگ کا موڈ ہی آف ہو گیا پھر کسی دن ـــــ" "لعنت ہے ہم پر ـــــ ہمارے ہوتے اگر آپ کا موڈ اس طرح خراب رہے ـــــ" اس نے اس طرح منہ بنا کر کہا جیسے واقعی اپنی نظر میں خود حقیر ہو گیا ہو، ہم نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر دل ہی دل میں اس پہ ہزار بار لعنت بھیجی کیوں کہ اتنی دیر میں ہمارا گمان یقین میں تبدیل ہو گیا تھا کہ یہ طوطا پری وہ شخص ہے جو ہمارا رقیب رُوسیاہ بن سکتا ہے۔ جب سر سے پاؤں تک ایک بار پھر اپنے رقیب رُوسیاہ کو دیکھا تو روح فنا ہونے لگی، خدا دشمن کو بھی ایسے چمپئن باکسر رقیب رُوسیاہ سے محفوظ رکھے ـــــ ادھر وہ بدستور شبو کی راہ میں بچھا جا رہا تھا ـــــ بلکہ بڑی حد تک "بچھ" چکا تھا کیوں کہ شبو بھی کسی قدر پسیجتی نظر آ رہی تھیں، وہ پتہ نہیں کس قسم کی لچھے دار لفاظی کر رہا تھا ہماری سماعت کو چونکہ اس کی صفتِ مکہ بازی نے بڑی حد تک مفلوج کر دیا تھا اسی لئے الفاظ پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہے تھے البتہ اس کے فولادی لہجے میں اب سختی اور اکھڑ پن کی جگہ نرمی اور حلاوت تھی۔ لگتا تھا جیسے اس کا آبائی پیشہ زہر کی درآمد برآمد نہیں بلکہ حسینوں کے قدموں تلے نرم نرم اور دبیز قالین کی طرح بچھے رہنا۔ شبو اب پوری طرح پسیج چکی تھیں، بلکہ ہم بھی کم بخت کے اس انداز پہ حبا تے اگر اُسے اپنے رقیب رُوسیاہ کے روپ میں نہ دیکھا ہوتا۔ چنانچہ جب شبو نے ہماری طرف اجازت طلب نظر دل سے دیکھا تو ہم انکار نہ کر سکے۔ اور پھر انکار کرتے بھی تو کیسے کسی طالب کو مایوس لوٹانا تو جیسے ہمارے مذہب میں کفر ہے، اور اگر طالب، طالبہ ہو تو ہم بیچ بازار اپنے سر کو "طبلہ" سمجھ کر خود اپنے ہاتھ چلا سکتے ہیں ـــــ!!

○ بوٹنگ کا صحیح لطف ہمیں بھی آتا اگر رہ رہ کر یہ احساس کچوکے نہ لگاتا کہ ہم دو چاہنے والوں کے بیچ کباب میں ہڈی بنے ہوئے ہیں ـــــ شریف آدمی کو محبت کے کباب میں 'ہڈی' بننے کے بعد اپنی ہڈی ہڈی سے نفرت ہو جاتی ہے اور ہماری خاندانی شرافت میں تو خیر کوئی کلام ہی نہیں ـــــ اس سے پہلے کہ یہ احساس ہمیں جھیل میں چھلانگ لگانے پر پوری طرح مجبور کر دیتا، خان طوطا پری نے اچانک لائین بدل دی ـــــ اس نے شبو سے پوچھا ـــــ "آپ کی ممی بہت دنوں سے نہ تو کلب میں نظر آ رہی ہیں اور نہ ہی یہاں جھیل پہ دکھائی دے رہی ہیں ـــــ کہیں باہر گئی ہوئی ہیں شاید؟"

"وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہیں ـــــ" شبو نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ہم پہلے بھی یہ بات محسوس کر چکے تھے کہ شبو کو اپنی ممی کا ذکر بڑا ہی ناگوار گزرتا ہے اس مرتبہ بھی لہجے میں وہی جھلاہٹ تھی۔ لفظ 'میکے' پر جس طرح منہ بنایا تھا اس سے تو یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ شبو کی ممی کا میکہ، شبو کا کچھ بھی نہیں ہے!

حالانکہ ماں کا میکہ ننھیال ہوتا ہے اور ننھیال سے ہر ان کو کچھ نہ کچھ محبت تو ہوتی ہی ہے ـــــ تو پھر یہ کیسا ننھیال ہے جس سے شبو کا ذہنی قلبی کسی قسم کا تعلق نہیں ـــــ کہیں ایسا تو نہیں کہ شبو کی ممی شبو کی سگی ماں نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہوں ـــــ قبلہ چہ خوب کی دوسری غلطی ـــــ ہمارے اس خیال کو طوطا پری کے طرزِ تخاطب سے اور بھی تقویت ملی۔ جس انداز سے اس نے شبو سے ان کی ممی کی بابت پوچھا تھا وہ صاف صاف اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ شبو کی ممی یقیناً قبلہ چہ خوب کی دوسری غلطی ہیں ـــــ ورنہ طوطا پری کم از کم اس معاملے میں اتنا بے وقوف تو نظر نہیں آتا تھا کہ کسی بے آب تلوار کے آگے اپنی جوان گردن جھکاتا ـــــ بڑھاپے میں جو لوگ دوسری شادی کی حماقت کرتے ہیں وہ بذاتِ خود احمق ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کی حماقت عموماً خوبصورت ہوتی ہے، یقیناً قبلہ چہ خوب کی دوسری غلطی میں کوئی بات ایسی ضرور ہوگی جس پر طوطا پری جیسے فولادی نوجوان بھی ایک ہی آنچ میں پگھل جاتے ہیں ـــــ تصویر کے اس رُخ کو دیکھ کر اصلی تصویر کو دیکھنے کی خواہش کا جاگنا یقینی تھا۔ اپنی ممی کے تعلق سے شبو کا عجیب و غریب رویہ، دوسروں کا پُراسرار انداز اس عورت کو ہماری نظر میں ایک پہیلی ایک معمہ بنا چکا تھا، اس پہ رہی سہی کسر آج طوطا پری نے پوری کر دی ـــــ جس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ طوطا پری کو شبو سے دل چسپی ضرور ہے لیکن امیدواروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے کا اسے شوق نہیں۔ وہ تو دراصل شبو کی ممی کے دعویداروں میں سے تھا ـــــ!!!

◉ "تاریخ سے کچھ چہ خوب ہے برخوردار ـــــ؟"

قبلہ چہ خوب نے پائپ میں تازہ تمباکو بھرتے ہوئے اپنے لایعنی انٹرویو کے ایک اور راؤنڈ کا آغاز کر دیا ـــــ موصوف کے پائپ کا حجم دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں تمباکو کی کاشت بہ آسانی کی جا سکتی ہے۔ پچھلے تین روز کے عرصے میں انٹرویو کا یہ غالباً تیسرا راؤنڈ تھا، ہم بھی اس دوران میں موصوف کی عام بلکہ خاص معلومات کی پہنچ سے کسی حد تک واقف ہو چکے تھے اس لئے پُراعتماد لہجے میں عرض کیا ـــــ "آپ کی دُعا سے خاصی دل چسپی ہے، بلکہ میرا تو دعویٰ ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہوگا جسے اس کم بخت سے دل چسپی نہ ہو، یہی تو وہ ظالم ہے جس کے کئی روپ، کئی بہروپ ہوتے ہیں مثلاً مہینے کی آخری تاریخیں، ملازم پیشہ افراد کے لئے بڑی صبر آزما بلکہ جان لیوا ہوتی ہیں جب کہ برخلاف اس کے ابتدائی تاریخیں خصوصاً پہلی تاریخ کو ہر گھر میں یہ گیت ضرور سنائی دیتا ہے ؎

"خوش ہے زمانہ آج پہلی تاریخ ہے"

"پہلی تاریخ ـــــ؟ مہینے کی آخری چہ خوب۔؟ یہ کیا اُلٹی سیدھی ہانک رہے ہو چہ خوب ـــــ!!!" موصوف نے جھنجھلا کر ٹوک دیا ـــــ میں پوچھ رہا ہوں اس چہ خوب کے بارے میں جسے "ہسٹری" کہتے ہیں اور تم اس چہ خوب کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑ رہے ہو جسے ڈیٹ DATE کہتے ہیں ـــــ" اس مرتبہ موصوف کا لہجہ کسی قدر نرم تھا لیکن یہ نرم لہجہ بھی کسی کٹکھنے ولایتی کُتے کی غراہٹ سے کم نہیں تھا ـــــ ہم نے دراصل جان بوجھ کر اس تاریخ یعنی 'ڈیٹ' کا قصہ چھیڑ دیا تھا جو اکثر ماڈرن لڑکیاں اپنے چاہنے والوں کو دیتی ہیں بلکہ ترقی یافتہ ملکوں کے بارے میں تو سنا ہے کہ وہاں لڑکیاں جوان ہونے سے پہلے ہی اپنے چاہنے والوں کو 'ڈیٹ' دیدیتی ہیں، ہمارے یہاں صرف فلم اسٹار ہی ڈیٹ لیتے دیتے ہیں، اسی لئے صرف ان کے متعلق ہی طرح طرح کی افواہیں گشت کرتی رہتی ہیں ـــــ ہماری معلومات عامہ چونکہ اس قسم کی تاریخ یعنی ڈیٹ کے تعلق سے خاصی وسیع بلکہ وقیع تھیں، اس لئے ہم نے جان بوجھ کر اسی کا ذکر چھیڑا تھا۔ لیکن اس سرزمین پر قدم رنجہ فرماتے ہی چونکہ اپنی تمام تر خیر و عافیت کسٹم والوں کے ہاں چھوڑ آئے تھے اسی لئے بھگت رہے تھے،

اصلی تاریخ یعنی ہسٹری کے معاملے میں ہماری معلومات اس قدر حیرت انگیز تھیں کہ ڈر لگتا تھا ان کے انکشاف پر کہیں موصوف پر "ہسٹریا" کے دورے نہ پڑنے لگیں۔ لیکن اب جب کہ موصوف نے خود ہی آ بیل مجھے مار کہا تھا اس لئے ہم نے بھی نا تھو رام کے بیل کی طرح زبانی ٹکریں مارنی شروع کر دیں یعنی نتائج سے بے پرواہ ہو کر ہذیان بکنے لگے ـــــ جہاں تک تاریخ عرف ہسٹری یعنی جغرافیہ کی پارٹنر کا تعلق ہے یہ میرے پسندیدہ بلکہ مرغوب ترین مضامین میں سے ایک ہے۔"

ہمارے اس انکشاف پر شبو کے شریر ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی جو اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح انٹرویو کے روپ میں ہم پر نازل ہونے والی آفت کے دوران ایسے خاموش تماشائی کی حیثیت سے موجود تھیں جس نے بلیک مارکٹ میں ٹکٹ خریدا ہو' اور تفریح کے روپ میں اپنے ایک ایک پیسے کو واپس "وصولنا" چاہتا ہو' ہم نے بات کو خواہ مخواہ ایک اور پلٹا دینے کی کوشش کی ـــــ

"ویسے جناب والا کی وسیع بلکہ دریائی معلومات میں معمولی یعنی "تالابی' اضافے کی غرض سے عرض ہے کہ شاعری کی ایک صنف بھی تاریخ میں کچھ دخل رکھتی ہے جس کی مدد سے کہنہ مشق شاعر اپنے لیے چہیتے پیاروں کی جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں' قطعۂ تاریخ نکالتے ہیں ـــــ کہتے ہیں قطعۂ تاریخ نکالنا بڑا مشکل فن ہے' دانتوں تلے پسینہ آ جاتا ہے بلکہ بڑے بڑے استادانِ سخن تو یہاں تک فرما گئے ہیں کہ تلوں سے تیل نکالنا اور زندہ شیر کے خونخوار جبڑوں میں سے چربی نکالنا آسان ہوتا ہے بہ نسبت قطعۂ تاریخ نکالنے کے ـــــ اس میدان میں وہی شاعر کامیاب ہوتے ہیں جن کی ادبی حیثیت مشکوک ہو تو ہو لیکن تاریخی حیثیت مضبوط ہونی چاہیئے اب رہا جغرافیہ تو کسی شاعر کا جغرافیہ درست نہیں ہوتا' اگر یہ درست ہو جائے تو پھر بے چارا شاعر' پھر سے آدمی کہلانے لگتا ہے۔ ـــــ"

"چہ خوب ـــــ چہ خوب ـــــ" موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں 'داد' دی جسے ہم دونوں ہاتھوں سے بٹور بھی نہ پائے تھے کہ حسبِ معمول "بیداد" شروع کر دی یعنی پہلا تاریخی سوال داغ دیا ـــــ!!!

(باقی)

[نئے تاریخی جوابوں کے لئے ملاحظہ فرمائیے
اگلا شمارہ]

آندھرا پردیش

لگاتار

ترقی کی

منزلیں طے کر رہا ہے

اور

صنعت کاروں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ یہاں صنعتوں میں سرمایہ مصروف کریں۔ پسماندہ علاقوں میں صنعتوں کے قیام کے لئے حسب ذیل ترغیبات اور مراعات میسر ہیں۔

۱۵ نیصد مرکزی امداد، (۸۹) پنچایت سمیتیوں میں۔

۱۰ نیصد ریاستی مالی امداد تمام تعلقوں میں ۶ نکاتی فارمولے کے تحت۔

۲۰ نیصد ریاستی مالی امداد تمام قبائلی اور ایجنسی علاقوں میں۔

علاوہ ازیں متذکرہ بالا تمام علاقوں میں املاک اور قائم سرمائے پر ۱۰ نیصد بلا سودی سیلس ٹیکس قرض۔ مختصر یہ کہ حیدرآباد وسکندرآباد کے دونوں شہروں اور وساکھاپٹنم و وجے واڑہ کے سوائے ریاست کے پورے علاقے میں یا تو ریاستی امداد یا مرکزی امداد یا پھر سیلس ٹیکس قرض کی صورت میں سہولتیں موجود ہیں۔

غرض کہ ہماری ریاست میں صنعت کاروں کو صنعتی ارتقاء کے لئے عظیم اور افراط مواقع ہمدست ہیں۔

جاری کردہ
ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

No: 29/76.77

سائیکل کی سواری

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب میں کسی کو سائیکل کی سواری کرتے یا ہارمونیم بجاتے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر کیسے ترس آتا ہے ــــــ سوچتا ہوں، انسان نے یہ دونوں کام بھی خوب نکالے ہیں۔ ایک سے وقت بچتا ہے دوسرے سے وقت کٹتا ہے مگر تماشہ دیکھئے ہماری تقدیر میں کلجگ کے یہ دونوں علم نہیں لکھے گئے ہیں۔ نہ ہم سائیکل چلا سکتے ہیں اور نہ باجا ہی بجا سکتے ہیں۔ پتہ نہیں کب سے یہ خیال دماغ میں بیٹھ گیا کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں مگر یہ دونوں کام نہیں کر سکتے شائد ۱۹۳۲ء کی بات ہے کہ بیٹھے بیٹھے خیال آیا چلو سائیکل چلانا سیکھ لیں۔ اس کی شروعات یوں ہوئی کہ ہمارے لڑکے نے چوری چھپے یہ علم سیکھ لیا اور ہمارے سامنے ہی سے سوار ہو کر نکلنے لگا۔ اب آپ سے کیا کہیں کہ شرمندگی اور نفرت کے کیسے کیسے خیال میرے دل میں اٹھے۔ سوچا کیا ہم ہی زمانے بھر میں پھسڈی رہ گئے ہیں۔ ساری دنیا چلاتی ہے، ذرا ذرا سے لڑکے چلاتے ہیں، بے وقوف اور گنوار چلاتے ہیں۔ ہم تو بفضلِ تعالیٰ پڑھے لکھے ہیں۔ کیا ہم نہیں چلا سکیں گے؟ آخر اس میں مشکل کیا ہے؟ کود کر چڑھ گئے اور تابڑ توڑ پاؤں مارنے لگے اور جب دیکھا کہ کوئی راہ میں کھڑا ہے تب ٹن ٹن کر کے گھنٹی بجا دی۔ نہ ہٹا تو غصیلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نکل گئے بس یہی تو سارا گر ہے اس لوہے کی سواری کا! اب ایسا معلوم ہوا کہ ہم "بے فضول" ہی مرے جاتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں سیکھ لیں گے۔ بس جناب، ہم نے تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے، پیدا ہونے کو

مہاشہ سدرشن

ترجمہ :- کالیکا پرشاد

دوسرے دن ہم نے اپنے پھٹے پُرانے کپڑے تلاش کیئے اور انھیں لے جا کر بیگم صاحبہ کے سامنے پٹک دیا کہ ان کی ذرا مرمت تو کردو۔

شریمتی جی نے ہماری طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا ـــــ "اِن کپڑوں میں اب جان ہی کہاں ہے جو مرمت کروں۔ یہ تو پھینک دیئے تھے۔ آپ کہاں سے اٹھا لائے؟ وہیں جاکر ڈال آیئے"

ہم نے مسکرا کر شریمتی جی کی طرف دیکھا اور کہا ـــــ "تم ہر وقت بحث نہ کیا کرو۔ آخر میں انھیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر لایا ہوں ایسے ہی تو نہیں اٹھا لایا۔ بلا کرم ان کی مرمت کر ڈالو"

مگر شریمتی جی بولیں ـــــ "پہلے بتاؤ ان کا کیا بنے گا؟"

ہم چاہتے تھے گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور ہم سائیکل سوار بن جائیں اور اس کے بعد جب ہم سائیکل سواری کے ماہر ہو جائیں تو ایک دن جہانگیر کے مقبرہ کو جانے کا ارادہ کریں۔ گھر والوں کو تانگے میں بٹھا دیں اور کہیں تم چلو ہم دوسرے تانگہ میں آتے ہیں۔ جب وہ چلے جائیں تب سائیکل پر سوار ہو کر ان سے راستہ میں جا لیں۔ ہمیں سائیکل پر سوار دیکھ کر ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی! حیران ہو جائیں گے، آنکھیں مَل مَل کر دیکھیں گے کہ کہیں کوئی اور تو نہیں ہے لیکن ہم گردن ٹیڑھی کر کے دوسری جانب دیکھنے لگے جیسے ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے جیسے یہ سواری ہمارے لئے معمولی بات ہے۔

مگر شریمتی جی نے کہا۔ "پہلے بتاؤ ان کا کیا بنے گا؟" جھک مار کر بتانا پڑا کہ روز روز تانگہ کا خرچ مارے ڈالتا ہے۔ سائیکل چلانا سیکھیں گے۔

شریمتی جی نے بچے کو سُلاتے ہوئے ہماری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولیں ـــــ "مجھے تو توقع نہیں کہ آپ سے یہ بیل منڈھے چڑھ سکے۔ خیر کوشش کر دیکھئے۔ مگر ان کپڑوں کا کیا بنے گا؟"

ہم نے ذرا رعب سے کہا ـــــ "آخر سیکل سے ایک دو بار گریں گے یا نہیں اور گرنے سے کپڑے پھٹیں گے یا نہیں؟ جو احمق ہیں وہ نئے کپڑوں کا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ جو صاحب عقل وہ پُرانے کپڑوں سے ہی کام چلاتے ہیں"

ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ ہماری اس دلیل کا جواب ہماری دیوی جی کے پاس کوئی نہ تھا کیوں کہ انھوں نے اسی وقت مشین منگا کر کپڑوں کی مرمت شروع کر دی۔

اِدھر ہم نے بازار جا کر زنبک کے دو ڈبے خرید لیے کہ چوٹ لگنے پر اس کا ہر وقت علاج کیا جا سکے۔ اس کے بعد جا کر ایک کھلا میدان تلاش کیا تاکہ دوسرے دن سے سیکل کی سواری کا کام شروع کیا جا سکے۔

اب یہ سوال ہمارے سامنے تھے کہ اپنا اُستاد کسے بنائیں۔ اسی اُدھیڑ بُن میں بیٹھے تھے کہ تیواری لکشمی نارائن آگئے اور لگے "نیوں بھائی، ہو جائے ایک بازی شطرنج کی۔ ذرا آواز دو لڑکے کو، شطرنج اور مہرے اٹھا لائے"

ہم نے سر ہلا کر جواب دیا ـــــ "نہیں صاحب آج تو جی نہیں چاہتا"

تیواری جی نے اپنے گھٹنے ہوئے سر سے ٹوپی اتار کر ہاتھ میں لے لی اور سر پر ہاتھ پھیر کر بولے ـــــ "ہم اتنی دور سے چل کر آئے ہیں کہ دو ایک بازیاں کھیلیں گے، تم نے کہہ دیا جی نہیں چاہتا"

"اگر جی نہ چاہے تو کیا کرے؟"

یہ کہتے کہتے ہمارا گلا بھر آیا۔ تیواری کا دل پسیج گیا۔ ہمارے پاس بیٹھ کر بولے۔ "ارے بھائی، معاملہ کیا ہے؟ بیوی سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟"

ہم نے کہا — "تیواری بھیا، کیا کہیں؟ سوچا تھا لاؤ سیکل کی سواری سیکھ لیں۔ مگر اب کوئی ایسا آدمی دِکھائی نہیں دیتا جو ہماری مدد کرے۔ بتاؤ نا ہے کوئی ایسا آدمی تمہارے خیال میں؟"

تیواری نے ہماری جانب بے بسی کی آنکھوں سے ایسے دیکھا گویا ہم کو کوئی خزانہ مل رہا ہے اور وہ خالی ہاتھ رہے جاتے ہیں بولے — "میری مانو تو یہ روگ نہ پالو۔ اب اس عمر میں سیکل پر چڑھو گے؟ اور پھر یہ بھی کوئی سواریوں میں سواری ہے کہ بیٹھے پاؤں چلا رہے ہیں! اجی لعنت بھیجو اس خیال پر اور آؤ ایک بازی کھیلیں۔ سیکل چلانا سیکھنے چلے ہیں۔ کیا ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں؟"

مگر ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ صاف سمجھ گئے کہ تیواری حسد کی آگ میں جلا جاتا ہے۔ منہ پھُلا کر ہم نے کہا: "بھائی تیواری، ہم تو ضرور سیکھیں گے۔ کوئی آدمی بتاؤ۔"

"آدمی تو ایک ہے ایک، مگر وہ مفت نہیں سکھائے گا۔ فیس لے گا۔ دے سکو گے؟"

"کتنے دن میں سکھا دے گا؟"

"یہی دس بارہ دن میں!"

"اور فیس کیا لے گا ہم سے؟"

"اوروں سے پچیس لیتا ہے۔ تم سے بیس لے گا ہماری خاطر!"

ہم نے سوچا — دس دن میں سکھائے گا اور بیس روپے فیس لے گا۔ دس دن — بیس روپے — بیس روپے دس دن یعنی دو روپے روزآنہ۔ یعنی ساٹھ روپے ماہانہ اور وہ بھی ایک دو گھنٹوں کے لئے۔ ایسی تین چار ٹیوشن مل جائیں تو ڈھائی تین سو روپے مہینہ ہو گیا۔ ہم نے تیواری جی سے تو اتنا ہی کہا کہ جاکر معاملہ طے کراؤ مگر دل میں خوش ہو رہے تھے کہ سیکل چلانا آجائے تو ایک ٹریننگ اسکول کھول دیں اور تین چار سو روپے ماہانہ کمانے لگیں۔

اِدھر تیواری جی معاملہ طے کرنے لگے اُدھر ہم نے یہ خوشخبری شریمتی جی کو سُنائی کہ کچھ دنوں کے بعد ہم ایک ایسا اسکول کھولنے والے ہیں جس میں تین چار سو روپے ماہانہ کی آمدنی ہوگی۔

شریمتی جی بولیں — "تمہاری اتنی عمر ہو گئی مگر اوچھاپن نہ گیا۔ پہلے خود تو سیکھ لو پھر اسکول کھول لینا۔ مَیں تو سمجھتی ہوں کہ تم سیکھ ہی نہ سکو گے۔ دوسروں کو سکھانا تو دوسری بات ہے۔"

ہم نے بگڑ کر کہا — "یہ تم میں بڑی بُری عادت ہے کہ ہر کام میں ٹوک دیتی ہو۔ ہم سے بڑے بڑے سیکھ رہے ہیں تو ہم کیا نہ سیکھ سکیں گے۔ پہلے تو شاید سیکھتے، شائد نہ سیکھتے مگر اب جب تم نے ٹوک دیا ہے تو ضرور سیکھیں گے۔ تم بھی کیا کہو گی!"

شریمتی جی بولیں — "مَیں تو چاہتی ہوں تم ہوائی جہاز چلاؤ۔ یہ بائیسکل کیا چیز ہے؟ مگر تمہاری فطرت سے ڈر لگتا ہے۔ ایک بار گر و گے تو دیکھ لینا بائیسکل وہیں پھینک پھانک کر چلے آؤ گے!"

اِتنے میں تیواری جی نے باہر سے آواز دی۔ ہم نے جاکر دیکھا تو اُستاد صاحب کھڑے تھے۔ ہم نے شریف طالب علم کی طرح سعادت مندی کے ساتھ سلام کیا اور خاموش کھڑے ہو گئے۔

تیواری جی — "یہ تو بیس پر مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکل سے منایا ہے۔ پیشگی لیں گے۔ کہتے ہیں پیچھے کوئی نہیں دیتا۔"

"ارے بھئی ہم دیں گے۔ دنیا لاکھ بُری ہو مگر پھر بھی بھلے آدمیوں سے خالی تو نہیں ہے! یہ بیس روپے تو چیز ہی کیا ہے؟ ہم اپنا ایمان لاکھوں کے لئے بھی نہ گنوائیں گے۔ بس ایک مرتبہ ہمیں سائیکل چلانا سِکھا دیں پھر دیکھیں ہم اُن کی کیا کیا خدمت کرتے ہیں۔"

مگر استاد صاحب نہیں مانے، بولے۔ "فیس پہلے لیں گے۔" ہم ـــ "اور اگر آپ نے نہیں سکھایا تو ـــ"
اُستاد ـــ "نہیں سکھایا تو فیس لوٹا دیں گے"۔
ہم ـــ "اگر فیس نہیں لوٹائی تو ـــ"
اُستاد ـــ "اس 'تو' کا جواب تو میرے پاس ہے نہیں مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ایسی بے ایمانیاں مجھے بدنام کر دیں گی"۔

اِس پر تیواری جی نے کہا ـــ "ارے صاحب! کیا یہ تیواری مرگیا ہے؟ شہر میں رہنا حرام کر دوں۔ بازار میں نکلنا بند
ں۔ فیس لے کر بھاگ جانا کوئی ہنسی کھیل ہے؟"

جب ہمیں یقین ہوگیا کہ اس میں کوئی دھوکہ نہیں ہے تو ہم نے فیس کے روپے لاکر اُستاد کی نذر کر دیئے اور کہا: اُستاد
الصبح ہی آجانا۔ ہم تیار رہیں گے۔ ہم نے اس کام کے لئے کپڑے بھی بنوا لئے ہیں اور اگر گر پڑے تو زخم پر لگانے کے لئے
ے بھی خرید لیا ہے اور ہاں ہمارے پڑوس میں جو مستری رہتا ہے اس سے سیکل بھی مانگ لی ہے۔ آپ سویرے ہی چلے آئیں
ںد کا نام لے کر شروع کر دیں۔

تیواری جی اور اُستاد نے ہمیں ہر طرح سے تسلّی دی اور چلے گئے۔ اتنے میں ہمیں یاد آیا کہ ایک بات کہنی بھول ہی گئے۔
پاؤں بھاگے اور انھیں بازار میں جا لیا۔ وہ حیران تھے۔ ہم نے ہانپتے ہانپتے کہا: "اُستاد ہم شہر کے پاس نہیں سیکھیں گے
ں باغ میں جو میدان ہے وہاں سیکھیں گے۔ وہاں ایک تو زمین نرم ہے، چوٹ کم لگتی ہے۔ دوسرے وہاں کوئی دیکھتا نہیں ہے"
اب رات کو آرام کی نیند کہاں؟ بار بار چونکتے تھے اور دیکھتے تھے کہ کہیں سورج تو نہیں نکل گیا۔ سوتے تھے تو سیکل کے
ب آتے۔ ایک بار دیکھا کہ ہم سیکل سے گر کر زخمی ہو گئے ہیں۔ دوسری بار دیکھا کہ ہم سیکل پر سوار ہیں، سیکل آپ سے آپ ہوا
، چل رہی ہے۔ اور لوگ ہماری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔

جب آنکھیں کھلیں تو دن نکل آیا تھا۔ جلدی سے جاکر وہ پرانے کپڑے پہن لئے۔ زمبک کا ڈبہ ہاتھ میں لے لیا اور نوکر
یج کر مستری سے سیکل منگوالی اُسی وقت اُستاد صاحب بھی آگئے اور ہم خدا کا نام لے کر لارنس باغ کی جانب چلے۔ لیکن ابھی گھر سے
لے ہی تھے کہ بلّی راستہ کاٹ گئی۔ اور ایک لڑکے نے چھینک دیا۔ کیا کہیں ہمیں کس قدر غصّہ آیا اُس نامُراد بلّی پر اور اُس
لمان لڑکے پر! مگر کیا کرتے؟ دانت پیس کر رہ گئے۔ ایک بار پھر خدا کا نام لیا اور آگے بڑھے لیکن بازار میں پہنچ کر دیکھا
ہر آدمی جو ہماری طرف دیکھتا ہے، مُسکراتا ہے۔ اب ہم حیران تھے کہ بات کیا ہے؟ اچانک ہم نے دیکھا کہ ہم نے جلدی
ر گھبراہٹ میں پاجامہ اور اچکن دونوں اُلٹے پہن لئے ہیں اور لوگ اِسی پر ہنس رہے ہیں۔ شرمندہ ہوتے ہی اُلٹے پڑے!

ہم نے استاد سے معافی مانگی اور گھر لوٹ آئے یعنی ہمارا پہلا دن مفت میں گیا۔

دوسرے دن نکلے۔ ہمارے گھر کے پاس جو لالہ صاحب رہتے ہیں وہ سامنے آگئے اور مسکرا کر بولے ـــ "کہیئے کہاں جا رہے ہیں؟"
یہ لالہ صاحب یوں تو بہت بھلے آدمی ہیں مگر ان کی ایک عادت بہت بُری ہے جس سے ملتے ہیں اس سے پوچھ بیٹھتے ہیں
ہاں چلے؟" کئی بار سمجھایا کہ جب کوئی کام پر نکلے اور اس سے 'کہاں' پوچھا جائے تو وہ کام کبھی نہیں ہوتا اور جس کا کام بگڑ جاتا
ہے وہ 'کہاں' پوچھنے والے کو گالیاں دیتا ہے مگر لالہ صاحب کو ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ اُس وقت ہم نے ان سے بچنے کی کتنی
شش کی کس کس طرف منہ موڑا مگر ان کی 'کہاں' کی توپ سے کون بچ سکتا تھا؟ مہاتما جی نے سامنے آکر گولا داغ ہی تو دیا۔

ہم نے جل بھُن کر جواب دیا۔ "دوزخ کو جا رہے ہیں، آپ بھی چلیں گے کیا؟"

لالہ ـــ "خدا جانتا ہے مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کسی کام کے لئے جا رہے ہیں"۔

ہم ـــــ "مانو ہم بے کار گھوما کرتے ہیں!"

لالہ ـــــ "اجی جناب! آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں؟ میں آپ کی شان میں ایسی گستاخی کرسکتا ہوں؟ میرا مطلب یہ تھا۔"

ہم ـــــ "کہ ان سے 'کہاں' نہ پوچھا جائے تو قیامت ٹوٹے گی۔ ذرا سوچئے آپ سے کتنی بار ہم نے استدعا کی تھی کہ ہمیں اس 'کہاں' سے ڈر لگتا ہے۔ مگر آپ کو یہ ایسا روگ لگا ہے کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ آج ہی سیکل چلانا سیکھنے جا رہے تھے۔ یہ دیکھئے پرانے کپڑے اور یہ زمبک کا ڈبہ اور یہ استاد صاحب اور یہ سیکل۔ لیکن اس 'کہاں' نے آج کا دن بھی خراب کردیا۔ آپ نے تو مسکرا کر پوچھ لیا ـــــ 'کہاں' ہمارا دو روپے کا نقصان ہوگیا!"

اُدھر استاد صاحب نے سیکل کی گھنٹی بجا کر ہمیں اپنے پاس بلایا اور بولے ـــــ "میں ایک گلاس لسی پی لوں۔ آپ ذرا سیکل کو تھامئے؟"

لالہ صاحب نے جب یہ موقع دیکھا تو جان بچا کر بھاگ نکلے ورنہ ہم ان سے اس دن کا غذ لکھا لیتے کہ اب پھر کسی سے 'کہاں' نہ پوچھیں گے۔

اُستاد صاحب لسی پینے لگے تب ہمیں سیکل کے پرزوں کی اوپر نیچے سے جانچ شروع کردی اور لالہ جی سے جو بدمزگی ہوگئی تھی اُسے مٹانے کے لئے گنگنانے لگے۔

پھر کچھ جی میں آیا تب اس کا ہینڈل پکڑ کر ذرا چلنے لگے مگر دو ہی قدم گئے ہوں گے کہ ایسا معلوم ہوا جیسے سیکل ہمارے سینے پر چڑھی جاتی ہے۔ اب تو ہمیں پورا یقین ہوگیا کہ یہ سب لالہ جی کی کہاں کا اثر ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے گمبھیر سوال تھا کہ کیا کرنا چاہیئے؟ میدانِ جنگ میں ڈٹے رہیں یا ہٹ جائیں۔ سوچ بچار کے بعد یہ تصفیہ کیا کہ یہ لوہے کا گھوڑا اور پھر لالہ جی کی کہاں اس کے ساتھ۔ ان کے سامنے ہم کیا چیز ہیں۔ بڑے بڑے سورما بھی نہیں ٹھہر سکیں۔ اسی لیئے ہم نے سیکل چھوڑ دی اور بھگوڑے سپاہی بن کر مُڑ گئے مگر دوسرے ہی لمحے سیکل اپنے زور سے ہمارے پاؤں پر گر گئی اور ہماری رام دُھائی بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونجنے لگی۔ اُستاد جی لسی چھوڑ کر دوڑے اور دوا خانے کے لوگ بھی جمع ہوگئے۔ سب نے مل جل کر ہمارا پاؤں سیکل میں سے نکالا اور خدا کے ایک بندے نے زمبک کا ڈبہ بھی اُٹھا کر ہمارے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسرے نے ہماری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر ہمیں سنبھالا اور ہمدردی سے پوچھا "چوٹ تو نہیں آئی ذرا دو چار قدم چلیئے۔ نہیں تو لہو جم جائے گا!"

اس طرح دوسرے دن ہم اور ہماری سیکل اپنے گھر سے تھوڑی دور پر زخمی ہو گئے۔ ہم لنگڑاتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔ سیکل ٹھوک پیٹ کر ٹھیک کرنے کے لئے دوکان پر بھیج دی۔

مگر ہمارے دلیروں کی جرأت دیکھئے۔ اب بھی میدان میں ڈٹے رہے۔ کئی بار گرے کئی بار شہید ہوئے۔ گھٹنے تڑوائے کپڑے پھڑوائے مگر کیا مجال جو جی چھوٹ جائے۔ آٹھ نو دن میں سیکل چلانا سیکھ گئے تھے مگر ابھی تک اس پہ چڑھنا نہیں آتا تھا۔ کوئی بھلا مانس سہارا دے کر چڑھا دیتا ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ بس جیتے تھے مارلیا میدان ہم نے دو چار دن میں پورے ماسٹر بن جائیں گے۔ اس کے بعد پیون وغیرہ اور پھر اس کے بعد پرنسپل پھر ٹریننگ کالج اور تین چار سو روپے ماہانہ۔ تیواری جی دیکھیں گے اور حسد سے جلیں گے۔

اس دن اُستاد نے ہمیں سیکل پر چڑھا دیا اور سڑک پر چھوڑ دیا کہ لے جاؤ اب تم سیکھ گئے۔

اب ہم سیکل چلا رہے تھے اور دل ہی دل میں پھولے نہ سماتے تھے مگر خیال یہ تھا کہ کوئی آدمی دو سو گز کے فاصلہ

ذ ہم گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتے —"صاحب، ذرا بائیں طرف ہٹ جائیے"۔ دور فاصلہ پر کوئی گاڑی دکھائی
ہماری جان سوکھ جاتی۔ اس وقت ہمارے دل کی جو حالت ہوتی اسے ہمارا خدا ہی جانتا ہے۔ جب گاڑی نکل جاتی
جاکر ہماری جان میں جان آتی۔

دفعتاً سامنے سے تیواری جی آتے دکھائی دیئے۔ ہم نے انھیں بھی دور سے ہی الٹی میٹم دے دیا —"تیواری جی،
ب ہو جاؤ ورنہ سیکل تمہارے اوپر چڑھا دیں گے۔ تم سے بڑا موزی اور کون ملے گا؟"

تیواری جی نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا —"ذرا ایک بات تو سنتے جاؤ۔"

ہم نے ایکبار ہینڈل کی طرف دوسری بار تیواری جی کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ "اس وقت کیسے بات سن سکتے ہیں؟ دیکھتے نہیں
پر سوار ہیں۔"

تیواری جی —"تو کیا، جو سیکل چلاتے ہیں وہ کسی کی بات سنتے نہیں؟ بڑی ضروری بات ہے۔ ذرا اتر جاؤ۔"

ہم نے لڑکھڑاتے ہوئے سیکل کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ "اتر جائیں تو پھر چڑھائے گا کون؟ ابھی چلانا سیکھا ہے، چڑھنا
یکھا۔" تیواری جی چلاتے ہی رہ گئے اور ہم آگے نکل گئے۔

اتنے میں سامنے سے ایک تانگہ آتا نظر آیا۔ ہم نے اسے بھی دور سے ڈانٹ دیا —"بائیں طرف بھائی۔ ابھی سیکھنے
نے والے ہیں۔"

تانگہ بائیں طرف ہو گیا۔ ہم اپنے راستے چلے جا رہے تھے۔ یکایک پتہ نہیں گھوڑا بھڑک اٹھا یا تانگے والے کو شرارت سوجھی،
ہو، تانگہ ہمارے سامنے آ گیا۔ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ذرا سا ہینڈل گھما دیتے تو ہم دوسری طرف نکل جاتے مگر بُرا
آتا ہے تو عقل پہلے ہی ماری جاتی ہے۔ اس وقت ہمیں خیال ہی نہ آیا کہ ہینڈل گھمایا بھی جا سکتا ہے۔ پھر کیا تھا ہم اور ہماری
دونوں ہی تانگے کے نیچے آ گئے۔ اور ہم بے ہوش ہو گئے۔ جب ہم ہوش میں آئے تب ہم اپنے گھر میں تھے اور جسم پر
ہی پٹیاں بندھی تھیں۔ ہمیں ہوش میں دیکھ کر بیگم صاحبہ نے کہا —"کیوں؟ اب کیا حال ہے؟ میں کہتی نہ تھی سیکل چلانا نہ
کھو اس وقت تو کسی کی سنتے ہی نہ تھے۔"

ہم نے سوچا لاؤ سارا الزام تیواری جی پر لگا دیں اور خود صاف بچ جائیں۔ ہم نے کہا: "یہ سب تیواری جی کی شرارت ہے۔"
شریمتی جی نے مسکرا کر جواب دیا —"یہ تو تم اس کو چکمہ دو جو کچھ جانتا نہ ہو۔ اس تانگے پر میں ہی تو بچوں کو لے کر
منے نکلی تھی کہ چلو سیر بھی کر آئیں گے اور تمہیں سیکل چلاتے ہوئے دیکھ آئیں گے۔ میں نے لاجواب ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

○ ماہنامہ شگوفہ کا دفتر ۲-۲۷ مجرد گاہ سے

○ ۱۳-۳ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱ پر تبدیل ہو گیا ہے۔

قارئین نوٹ فرمالیں۔

کل ہند جشنِ ظرافت، پٹنہ

سمینار: ۱۱ و ۱۲ دسمبر ۷۶ء ۱۰½ بجے صبح مقام: خدابخش لائبریری پٹنہ

افتتاح : ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ شرما، وائس چانسلر، پٹنہ یونیورسٹی

صدارت : جناب نریندر لوتھر آئی اے ایس، اسپیشل آفیسر بلدیہ، حیدرآباد

ڈاکٹر قمر رئیس (دہلی) جناب شفیع مشہدی (پٹنہ) جناب مصطفےٰ کمال (حیدرآباد) ڈاکٹر وہاب اشرفی (رانچی) پروفیسر احمد جمال پاشا (سیوان)

: ڈاکٹر لطف الرحمٰن (بھاگلپور) پروفیسر محمد حسین آزاد (مظفرپور) جناب یوسف ناظم (بمبئی) جناب وجاہت علی سندیلوی

،: ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدابخش لائبریری

مقام: بھارتیہ ناٹیہ

مزاحیہ نثری نشست ۱۱ دسمبر ۷۶ء ۶ بجے شام کلامندر، پٹنہ

افتتاح : جناب محمد علی مہتاب علی، وزیر حمل و نقل، حکومت کرناٹک

صدارت : جناب محمد حسین آزاد، وزیر زراعت، امداد باہمی، حکومت بہار

جناب نریندر لوتھر، جناب یوسف ناظم، جناب مجتبیٰ حسین، جناب وجاہت علی سندیلوی، پروفیسر احمد جمال پاشا، بیگم سرور جمال

جناب ماہ فیرخاں، جناب نعمان ہاشمی،   نظامت : جناب مصطفےٰ کمال

مزاحیہ مشاعرہ ۱۲ دسمبر ۶ بجے شام مقام: بھارتیہ ناٹیہ کلامندر، پٹنہ

افتتاح : ستیارام کیسری، ــــــ صدر بہار کانگرس

صدارت : جناب محمد علی مہتاب علی، وزیر حمل و نقل، ــــــ حکومت کرناٹک

علامہ فضل امام واقف * رضا نقوی واہی * ہلال رضوی رامپوری * سلیمان خطیب * طالب خوندمیری * بوگس حیدرآ

: صبغتہ اللہ بمباٹ * عادل لکھنوی * فیاض عالم رتیب * مہدی علی * جوہر سیوانی * ابرار ساغر * مقرب حسُ

لہ آبادی * خالد رحیم * اسمٰعیل آذر * قادر لکھم پوری * تماشا گیاوی * محبوب جہانگیر

،: جناب شفیع مشہدی

جشنِ ظرافت کمیٹی

سرپرست اعلیٰ : جناب محمد حسین آزاد، وزیر زراعت، بہار

بالسیہ کمیٹی : محترمہ عزیزہ امام (ایم۔ پی)، جناب ہدایت اللہ خان ایم۔ ایل۔ اے، جناب عزیز نورالدین، جناب ایس اے عباس

جناب رضا نقوی واہی، جناب عابد رضا بیدار، جناب فخرالدین وانک، ڈاکٹر کلیم عاجز، حاتم بھائی رشید، جناب طیب علی،

جناب ایس اے رزاق، ڈاکٹر کاظم ہاشمی، جناب شمیم فاروقی

معتمدین : جناب بشیر حسین وانک

جناب شفیع مشہدی

خازن : جناب اے۔ آر نقوی

کُل ہند جشنِ ظرافت

معتمد

جناب شفیع مشہدی کا ایک خط

سب سے
پہلے تو جشنِ ظرافت
کی کامیابی پر آپ اور آپ کے
توسط سے ارضِ دکن کے اُن دوستوں
کی خدمت میں شکریہ پیش کر دوں جن کی شرکت
نے ہماری کوششوں کو کامیابی کا خلعت عطا کیا۔ ہماری
توقعات سے زیادہ کامیابی کا واحد سبب آپ حضرات کا وہ بے پناہ خلوص
ہے جس نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ ہم سراپا اظہارِ تشکر ہیں۔
واہی صاحب کے توسط سے تصویریں بھجوا چکا ہوں۔ ..... واہی صاحب نے ایک روداد بھی
بھیجی ہے شگوفہ کا سالنامہ یقیناً آب و تاب کے ساتھ شائع ہوگا۔ ہم اس کے منتظر ہیں۔ مجھ سے بھی خواہش
کی گئی ہے کہ جشنِ ظرافت کے انعقاد کے سلسلے میں کچھ لکھوں۔ مگر اس کی کامیابی نے ہمیں جذبات سے اس قدر مغلوب
کر دیا ہے کہ واقعتاً کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے۔ حالانکہ بہ حیثیت سکریٹری مجھے کچھ لکھنا ہی چاہیئے۔
یہ واقعہ ۷۴ ۱۹ء کا ہے جب بھوپال میں منعقدہ کل ہند طنز و ظرافت کانفرنس میں مجھے سیمینار میں مضمون پڑھنے
کا موقع ملا تھا۔ وہاں مجھے ذاتی طور پر جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ یہ تھا کہ اس اہم صنف
ادب کے اہم قلمکاروں سے نہ صرف ملاقات ہی ہوئی بلکہ ان سے قریب
آنے کا بھی موقع ملا۔ وہیں مجھے یوسف ناظم جیسا دوست
اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے مخلص
احباب ملے۔ مجتبیٰ کی

صلاحیتوں سے میں واقف تھا مگر بھوپال کے بعد میں ان کا مداح بن گیا۔ وہیں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ بہار میں بھی جشن ہونا چاہیئے مگر میں ان دنوں دہلی میں ریاستی حکومت کی جانب سے متعین تھا۔ اس لئے معاملہ التواء میں رہا۔

۷۵ء میں جب میں تبادلے کے بعد پٹنہ آیا تو مجتبیٰ کا اصرار بڑھا۔ واہی صاحب نے وعدے یاد دلائے۔ یوسف ناظم نے اپنے تیز جملوں سے مجھے چھلنی کیا۔ اور میری دیوانگی بھی مجھے اکساتی رہی۔ مگر کہاں ڈپٹی کلکٹری اور کہاں یہ ادبی مجالس کا انعقاد۔ اس پر طرہ یہ کہ ڈپٹی کلکٹری کو "وزیر" سے منسلک کر دیا گیا۔ گویا نیم پر کریلا چڑھایا گیا۔ فرصت عنقا اور یکسوئی ناپید، اپنی کمزوری سے واقف ہوں کہ کسی معاملے میں ہاتھ ڈالوں تو سرتاپا ڈوب جاتا ہوں اور نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ اسی لئے مجتبیٰ کے طنز اور واہی کی ملامتوں سے بچتا رہا۔ اور خاموشی میں عافیت نظر آئی مگر دیوانے کو دیوانہ بنا ہی دیا لوگوں نے فیصلہ ہو گیا کہ جشنِ ظرافت منایا جائے گا۔ جناب محمد حسین آزاد صاحب وزیر بہار نے سرپرستی قبول کی، بلکہ یہ کہ ہم لوگوں کے رہبر بن گئے۔ ایسی حوصلہ افزائی (ادب کے لئے) سیاستدانوں سے ممکن نہیں تھی۔ ادھر محمد علی صاحب نے شرکت کا وعدہ کر لیا۔ تیاری فروع ہو گئی۔ شبیر حسین، فخرالدین، رزاق، علی نقوی، شفیع جاوید اور حاتم بھائی رشید جیسے جانباز ساتھ ہوئے۔ واہی صاحب کی "بیماری" نے "صحت مندی" کا نعرہ لگایا، مجتبیٰ اور یوسف ناظم نے لبیک کہا، ارضِ دکن سے احباب نے اظہار خلوص و تعاون کیا۔ اہلِ عظیم آباد نے اظہارِ دلچسپی کی —— جشنِ ظرافت کا انعقاد ہوا اور ایسا ہوا کہ کامیابی کا لفظ شاید مفہوم کی مکمل ادائیگی سے معذور ہے۔ شعری اور نثری نشست تو خیر بے مثال رہی ہی مگر سیمینار نے تو ایک نئی روائت کا آغاز کیا دو دنوں تک سیمینار چلتا رہا، مباحثے ہوتے رہے اور ہال کھچا کھچ بھرا رہا۔ اس سے پہلے ایسی مثال سننے میں نہیں آئی تھی۔

ہماری کوششوں کو کامیابی کا سہرا عطا کیا ڈاکٹر قمر رئیس، نریندر لوتھر، مصطفیٰ کمال، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، وجاہت علی سندیلوی، سلیمان خطیب، احمد جمال پاشا، ڈاکٹر وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن اور ان تمام اہلِ قلم حضرات نے جو ہماری درخواست پر شریکِ بزم ہوئے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد نے جو روائت بنائی ہے ہم نے اس کے فیض سے بہار یعنی جنوب کے بعد شمال میں ایک روائت کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ آغاز اس قدر شاندار ہے کہ اگر صرف اس روائت کو ہی برقرار رکھا گیا، تو ہم کامیاب کہے جائیں گے۔

اردو میں طنز و مزاح کے ادب کے ساتھ جو بے نیازی برتی جاتی رہی ہے اس کے پیشِ نظر یہ تاریخ ساز قدم ہے وہ حضرات جو اس صنف کے اہلِ قلم ہیں وہی اس روائت کے نگہبان بھی بن سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں "افسانے اور شعر" کی دنیا سے تعلق رکھتا ہوں پھر بھی اپنی تمام بے بضاعتی کے باوجود پورے خلوص سے میں نے اس اہم صنفِ ادب کو ابھارنے اور لوگوں کو اس کی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ اہلِ قلم کا تعاون اور احباب کا خلوص شامل رہا تو ہر سال جشنِ ظرافت کا انعقاد ہوگا، ہر سال کرشنا اور کاوری کی لہریں، ساحلِ گنگا سے ہمکنار ہوں گی۔ اور ہر سال میکدۂ ظرافت میں رندانِ بلانوش یکجا ہوں گے اور کسی کی زبان پر صدائے العطش نہ ہوگی۔

○○

شفیع مشہدی

بہار سیول سروس، پٹنہ

رضا نقوی واہی

وسط اگست ۱۹۷۵ء کی ایک شام ہے۔ جناب عزیز قریشی
پٹنہ ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر، میری قیام گاہ پر تشریف فرما ہیں
عزیز قریشی حیدرآباد کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں
جب زندہ دلان حیدرآباد نے میری نظموں کا ایک مجموعہ
نشتر و مرہم شائع کیا تھا تو تقریب اجراء کے موقع پر وہاں
مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ عزیز قریشی اس وقت حیدرآباد ریڈیو
اسٹیشن سے وابستہ تھے اور تبھی سے مجھے جانتے ہیں۔
پٹنہ آئے تو کچھ دنوں کے بعد مجھ سے ملنے چلے آئے۔ اتفاقاً
برادرِ محترم جناب علی عباس ریٹائرڈ ڈی۔ آئی۔ جی پولس، جناب
شبیر حسین وناک اور جناب فخرالدین وناک بھی آجاتے ہیں۔
شبیر اور فخرالدین صاحبان گجرات کے رہنے والے ہیں اور بوہرہ
جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں حقیقی بھائی پٹنہ کے
ایک بڑے صنعتی ادارے کے مالک ہیں۔ شہر کے ادبی اور
ثقافتی حلقوں میں بہت مقبول و معروف ہیں۔ عباس صاحب
بھی شہر کی بعض ادبی انجمنوں کی روح رواں ہیں۔ ان حضرات
کے آجانے سے گفتگو دلچسپی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

عزیز قریشی مجھ سے فرماتے ہیں، کیوں نہیں پٹنہ میں ایک
مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ میں جواب دیتا ہوں۔ اب
درجنوں مزاحیہ مشاعرے منعقد ہو سکتے ہیں، بہ شرطیکہ
کے لئے رقم فراہم ہو جائے۔ شبیر صاحب دریافت کر
کتنے پیسوں کی ضرورت ہوگی؟ عرض کرتا ہوں، اگر کل
پیمانے پر مشاعرہ منعقد کیا جائے تو کم از کم دس ہزار
صرف ہوں گے۔ شبیر صاحب کہتے ہیں۔ اتنی رقم تو اکٹھی ہو
ہمارے انڈسٹریل اسٹیٹ میں دس یونٹیں ایسے ہیں جو
ایک ایک ہزار روپے لئے جاسکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں
کا انتظام ہو جائے تو مشاعرہ ایک ماہ کے اندر منعقد
کی ذمہ داری میرے سر ہے۔ متفقہ طور پر طے پاتا
اکتوبر کے اواخر میں یہ کار خیر انجام دے ہی دیا جا
شبیر صاحب کو اگلے ہفتہ ایک ماہ کے لئے امریکہ جانا
اس لئے اکتوبر سے پہلے موقع نہیں۔ دوسرے دن
کو دہلی اور مصطفیٰ کمال کو حیدرآباد خط لکھ کر اس مجوز
سے باخبر کرتا ہوں۔ دونوں حضرات جب سے مجھے

شکایت رہا کرتی ہے کہ خطوط کا جواب دینے میں تکلیف وہ حد تک تساہل پسند ہیں، فوراً جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نیک کام میں ہر طرح سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن اگست کے آخری ہفتے میں پٹنہ، دفعتاً زبردست سیلاب کی زد میں آجاتا ہے۔ شہر تین دریاؤں، گنگا، سون اور پن پن سے گھرا ہوا ہے۔ تاریخ میں پہلی بار تینوں دریا عذاب خداوندی کر شہر پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ نشیبی بستیوں میں دس پندرہ فٹ اونچی پانی کی دیوار پھیل گئی ہے، ریڈیو اسٹیشن غرقاب ہوگیا، پروگرام بند ہوگئے، سکریٹریٹ، ہائی کورٹ، گورنمنٹ ہاؤس، وزیروں کے گھروں اور شاہراہوں پر کشتیاں چلنے لگتی ہیں۔ لوگ عمارات کی چھتوں پر بھوکے پیاسے پناہ گزیں ہیں۔ شہری زندگی، ہیجان، پریشانی اور کس مپرسی کا شکار ہے۔ لیکن جلد ہی حکومت حرکت میں آجاتی ہے، فوجی ہیلی کوپٹروں کے ذریعہ پناہ گزینوں کو آب و غذا پہنچانے کا کام جنگی سطح پر کیا جانے لگا۔ خود میں اپنی قیام گاہ میں پانی پانی ہو رہا ہوں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بال بچے اور گھر کا اثاثہ محفوظ ہے۔ شبیر حسین اور فخر الدین وناک کی فیکٹری زیر آب ہے۔ شبیر صاحب، دوش ہوا پر، دوران سفر جب بذریعہ ریڈیو اس عذاب الٰہی کی خبر سنتے ہیں تو امریکہ پہنچنے سے قبل راستے سے ہی واپس ہو جاتے ہیں۔ چار ماہ تک ان کا کارخانہ بند رہتا ہے اور وہ تو وہ خود میں بھی مزاحیہ مشاعرہ کے انعقاد کی بات بھول جاتا ہوں۔

ایک سال گزر جاتا ہے۔ ۱۹۷۶ء کا غالباً جولائی یا اگست کا کوئی دن ہے۔ میری قیام گاہ پر نئے شاعروں کی ایک شعری نشست ہے۔ عزیز قریشی عرصہ ہوا پٹنہ سے کہیں اور جا چکے ہیں شمیم فاروقی ریڈیو اسٹیشن پر اردو پروگرام ایگزیکٹو ہیں۔ وہی شعری نشست کی روداد ریکارڈ کر رہے ہیں۔ مشہور نوجوان شاعر و افسانہ نگار اور شاعر ہونے کے ناتے شفیع مشہدی جو جناب محمد حسین آزاد وزیر زراعت کو آپریٹیو، اور وقف کے پرائیوٹ سکریٹری ہیں، جب اپنا کلام سنا چکے تو مجھ سے کہنے لگے — کیوں نہیں پٹنہ میں طنز و مزاح نگاروں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔

میں انھیں بھی وہی جواب دیتا ہوں۔ جو ایک سال قبل عزیز قریشی کو دے چکا تھا۔ وہ کہتے ہیں پیسے اکٹھے ہو جائیں گے میں کہتا ہوں کانفرنس بھی ہو جائے گی۔ دوسرے دن میں پھر مجتبیٰ حسین اور مصطفیٰ کمال کو خط لکھتا ہوں۔ وہ لوگ پھر کانفرنس کے خوش آئند تصور سے خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک عرصہ تک شفیع مشہدی خاموش رہتے ہیں۔ میں انھیں پیہم خطوط لکھتا ہوں ہر خط میں تقاضے کرتا ہوں کہ کانفرنس کے پروگرام کو بروئے کار لایا جائے، لیکن ان کی بے پناہ دفتری مصروفیت انھیں جواب دینے کا موقع نہیں دیتی، یہاں تک کہ میں انھیں ایک سخت اور آخری خط لکھتا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ مجتبیٰ حسین کو بھی خط لکھ کر مشہدی کے تغافل پر احتجاج کرتا ہوں۔ مجتبیٰ اور مشہدی ایک مدت تک دہلی میں ساتھ رہ چکے ہیں اور دونوں گہرے دوست ہیں۔ میرے احتجاج کے بعد مجتبیٰ اور مشہدی کے درمیان کیا باتیں ہوئیں یہ مجھے نہیں معلوم —— لیکن ستمبر کے اوائل میں پٹنہ پھر سیلاب کی زد میں آجاتا ہے۔ اس کے تین دریاؤں میں ایک دریا پھر بپھر پڑا ہے۔ شہری زندگی پھر عذاب میں مبتلا ہوتی نظر آتی ہے لیکن اب کے حکومت بھی چاق چوبند ہے، انجینیروں نے سیلاب کا رُخ دیہاتوں کی جانب موڑ دیا ہے، اور شہر بال بال بچ گیا۔ آفت ٹل گئی۔

اکتوبر کے وسط میں مشہدی اچانک میرے یہاں آجاتے ہیں۔ اور ہم دونوں بالکل کاروباری انداز میں مزاح نگاروں کی کانفرنس کے انعقاد کے مسئلے پر باتیں کرتے ہیں، اخراجات کا تخمینہ تیار کیا جاتا ہے، شرکاء کانفرنس کا انتخاب ہوتا ہے اور اب ہم یہ ارادہ کر کے اٹھتے ہیں کہ ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر کانفرنس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر ہی چھوڑیں گے، طے پاتا ہے کہ مشہدی، جناب محمد حسین آزاد کو کانفرنس کا سرپرست بننے پر آمادہ کریں گے اور میں شبیر و فخر الدین وناک صاحبان کو اس

کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے رضامند کرلوں گا۔ اس ملاقات کے تیسرے دن میرے یہاں ایک شعری نشست رکھی جاتی ہے شفیع مشہدی جناب محمد حسین آزاد کے ہمراہ آجاتے ہیں۔ میری درخواست پر شبیر حسین اور فخر الدین بھی تشریف لاتے ہیں۔ اس موقع پر مشہور مزاح نگار احمد جمال پاشاہ بھی موجود ہیں چائے اور کھانے کے وقفوں کے درمیان شعر و سخن کا دور چلتا ہے اور پھر عرض مدعا کرتا ہوں۔ پٹنہ دو سال سے سیلاب کی زد میں آتا رہا ہے، جس سے شہری زندگی مایوسی کا شکار ہے، اس مایوسی کو دور کرنے کے لئے جشنِ ظرافت منعقد کیا جانا چاہیئے تاکہ دلوں کا بوجھل پن دور ہو۔ آزاد صاحب فوراً اس تجویز کی حمایت کرتے ہیں۔ شبیر صاحب بھی ہم دونوں کی ہمنوائی کرتے ہیں۔ اور اس طرح یہ شعری نشست، جشنِ ظرافت کی رہبر کمیٹی کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔

اگلے دن آزاد صاحب، ہم تین چار افراد کو اپنے یہاں چائے پہ مدعو کرتے ہیں۔ وہاں کچھ اور حضرات بھی ہیں۔ استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں کی فہرست بنتی ہے، آزاد صاحب کمیٹی کی سرپرستی قبول فرماتے ہیں، شبیر حسین اور شفیع مشہدی کمیٹی کے سکریٹریز اور میرے بڑے لڑکے علی نقوی ٹریژرر بنائے جاتے ہیں، اور ان کے ذمہ یہ کام بھی دیا جاتا ہے کہ روزانہ وہ کمیٹی کے ممبروں سے ملتے رہیں اور کام کی رفتار سے سبھوں کو واقف کراتے رہیں۔ آزاد صاحب نے سوونیر کے لئے حکومت کے شعبوں سے اور شبیر صاحب نے تجارتی حلقوں سے اشتہارات حاصل کرنے کی ذمہ داری لے لی ہے۔ میں اپنے ذمہ سب سے آسان کام یعنی شرکاء جشنِ ظرافت کو خطوط لکھ کر انھیں مدعو کرنے کا کام لیتا ہوں۔ گاڑی چل پڑتی ہے۔ ہر تیسرے روز کسی نہ کسی رکن کمیٹی کے گھر پر میٹنگ ہونے لگتی ہے، کاموں کا جائزہ لیا جانے لگا ہے، چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں مختلف کاموں کے لئے بنادی گئی ہیں۔ سیمینار کے انعقاد اور سوونیر کی ترتیب کا کام ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری کے سپرد کرکے ہم لوگ مطمئن ہوچکے ہیں۔ فخر الدین صاحب نے کانفرنس کے لئے مناسب مقام کے حصول اور اسٹیج کی آرائش و زیبائش کی، حاتم بھائی رشید اور طیب علی غلام علی نے فائنَنس کی دیکھ ریکھ اور رزاق صاحب نے مہمانوں کے قیام اور ان کے استقبال کے امور کی کل ذمہداری قبول کرلی ہے۔ شبیر صاحب، سوونیر کے لئے اشتہارات فراہم کرنے میں منہمک ہوگئے ہیں۔ کانفرنس کے انعقاد کی تاریخیں مقرر کی جاچکی ہیں۔ ۱۱، ۱۲، دسمبر ۷۶ء کو دو روزہ کل ہند جشنِ ظرافت منعقد کیا جائے گا۔ وقت تیزی سے سرک رہا ہے۔ نومبر کے اواخر میں کانگرس کا اجلاس گوہاٹی میں ہورہا ہے۔ آزاد صاحب، شفیع مشہدی کے ساتھ گوہاٹی کے لئے روانہ ہوگئے ہیں۔ دس دن پٹنہ سے باہر رہیں گے۔ سرکاری محکموں کے اشتہارات ان حضرات کی غیر موجودگی میں نہیں مل رہے ہیں۔

گوہاٹی سے واپس آنے کے بعد آزاد صاحب، اسمبلی کے سرمائی اجلاس کے کاموں میں غرق ہوگئے ہیں اتنے میں بقرعید کی تعطیل ہوجاتی ہے اور وہ دوبارہ پٹنہ سے باہر چلے جاتے ہیں۔ مشہدی کی چچی کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ بھی پٹنہ سے باہر ہیں۔ جشنِ ظرافت ۱۱ دسمبر سے ہونے والا ہے۔ کُل ایک ہفتہ باقی رہ گیا ہے۔ اشتہارات اخراجات کے تخمینہ سے بہت کم آتے ہیں۔ ۴ دسمبر کی دوپہر ہے، میرے صاحبزادے علی نقوی گھبرائے ہوئے میرے پاس آتے ہیں۔ کہتے ہیں، سرکاری اشتہارات اب تک نہیں ملے۔ تجارتی حلقوں سے جو اشتہارات ملے ہیں، ان سے حاصل ہونے والی رقم، ہمارے اخراجات کی کفالت نہیں کرسکے گی۔ اب کیا ہوگا؟ میں انھیں اپنے قریب بٹھاتا ہوں، اور دریافت کرتا ہوں کہ کتنی رقم کی کمی ہورہی ہے وہ کہتے ہیں، کم از کم چھ سات ہزار روپیوں کی ضرورت ہوگی۔ جب وہ ذرا پُرسکون ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں، تمہاری بہن کی شادی کے لئے روپے جمع ہیں، حسبِ ضرورت بینک سے نکلوالئے جائیں گے، گھبرانے کی کیا بات ہے۔ وہ مطمئن ہوکر اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ دوسرے دن مشہدی اور آزاد صاحب بھی پٹنہ واپس آجاتے ہیں۔ میرے صاحبزادے

سے مشہدی بھی یہی کہتے ہیں کہ جو لوگ جشن ظرافت منعقد کر رہے ہیں، وہ اخراجات پورے کریں گے۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ اور پھر تو مشہدی برق رفتاری سے فنڈ کی فراہمی کے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اشتہارات دھڑا دھڑ ملنے لگتے ہیں دو تین دنوں کے اندر جشن ظرافت کمیٹی کی تحویل میں اتنی رقم کے اشتہارات آجاتے ہیں جس سے جشن کے سارے اخراجات بہ آسانی پورے ہو جائیں گے۔ حاتم بھائی رشید نے کمیٹی کو یہ خوش خبری دے دی ہے کہ اشتہارات سے جتنی رقم سوونیر چھپنے کے بعد وصول ہوگی اتنی رقم وہ پیشگی دے دیں گے تاکہ کوئی کام رکنے نہ پائے۔ اب بڑے اعتماد و حوصلے کے ساتھ کمیٹی کا ہر فرد اپنے بچے کھچے کاموں کی تکمیل میں مصروف ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے سوونیر کے ادبی حصّے کی ترتیب دیدی ہے اور ایک کاتب کو اپنے یہاں بٹھا کر رات دن کتابت کرا رہے ہیں۔ انھیں دو دو بجے شب تک تصحیح کتابت اور پھر پریس سے آتے ہوئے پروف کی تصحیح کرنا پڑ رہی ہے۔ ان کی بیگم نالاں ہیں کہ صحت کی خرابی کے باوجود بیدار صاحب کیوں اتنی سخت محنت کر رہے ہیں۔ نہ ناشتہ کھانے کا ہوش ہے اور نہ آرام کا خیال۔ کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔ لیکن عابد رضا بیدار دھن کے پکے ہیں، ان کا احساس فرض دعمل بیدار ہے۔ انھیں اگر کوئی فکر ہے تو بس یہی کہ سوونیر ۱۰ ڈسمبر تک چھپ جائے۔ اور واقعی تقریباً سو صفحات پر مشتمل یہ صحیفہ ۱۰ ڈسمبر کی رات کے آخری حصّوں میں چھپ کر تیار ہو جاتا ہے، میرے دو لڑکے علی نقوی اور احسن نقوی مستقل طور سے اپنے چھوٹے سے پریس میں بیٹھے ہوئے سوونیر کو طباعت کے مراحل سے گزارتے رہے ہیں۔

کانفرنس کا پروگرام مرتب ہو کر چھپ چکا ہے۔ شہر کے با ذوق حضرات کے نام دعوت نامے روانہ کئے جا چکے ہیں۔ جشن ظرافت کے تین اجلاس ہوں گے۔ ۱۱ ڈسمبر کو دن کے ساڑھے دس بجے خدا بخش لائبریری میں پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر دیویندر ناتھ شرما کے زیر صدارت سیمینار کا انعقاد ہوگا۔ ڈاکٹر قمر رئیس، صدر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی اور شفیع مشہدی اپنا اپنا مقالہ پڑھیں گے۔ پروفیسر مصطفیٰ کمال ایڈیٹر شگوفہ اور بہار کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذۂ اُردو مباحثہ میں حصّہ لیں گے۔ اسی دن شام کے چھ بجے بھارتیہ نرت کلا مندر کے وسیع ہال میں نثری نشست ہوگی، جس میں ملک کے ممتاز طنز و مزاح نگار اپنے اپنے مزاحیہ مضامین پڑھیں گے۔ اس اجلاس کا افتتاح جناب محمد علی مہتاب علی وزیر ٹرانسپورٹ کرناٹک اور صدارت جناب محمد حسین آزاد کریں گے۔ دوسرے دن ۱۲ ڈسمبر کی شام چھ بجے سے اسی ہال میں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ ہوگا، جس کا افتتاح جناب محمد حسین آزاد اور صدارت جناب محمد علی مہتاب علی کریں گے۔ جناب سیتارام کیسری، صدر بہار کانگریس کمیٹی، مہمانِ خصوصی ہوں گے۔ شفیع مشہدی اور شبیر حسین نے ہر اجلاس کا تفصیلی پروگرام پہلے ہی سے مرتب کر لیا ہے۔

۹ ڈسمبر کی شام آگئی ہے۔ آج ہوٹل پریسس میں جشن ظرافت کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک پریس کانفرنس بلائی گئی ہے۔ پٹنہ کے سبھی انگریزی، ہندی اور اردو اخبارات کے نمائندے شرکت کر رہے ہیں۔ آزاد صاحب، دو روزہ کل ہند جشن ظرافت کا پروگرام تمام نمائندوں کو بتا رہے ہیں۔

اُدھر شرکاء جشن ظرافت، میرے دعوت نامے کے جواب میں اپنی اپنی منظوری کا خط بھیجتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس سمینار میں شرکت کر رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اور وہ ایک ساتھ دہلی سے چل پڑیں گے۔ یوسف ناظم، بمبئی سے، مصطفیٰ کمال حیدرآباد کے مزاح نگار شاعروں کے ساتھ حیدرآباد سے، سلیمان خطیب گلبرگہ سے پاگل عادل آبادی سے مقرب حسین، مدھیہ پردیش سے وجاہت علی سندیلوی یو پی سے، مظہر سیوانی، احمد جمال پاشاہ اور بیگم سرور جمال سیوان سے ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی بہار کی مختلف یونیورسٹیوں کے نمائندے کی حیثیت سے ۱۰ ڈسمبر کی شام تک پٹنہ پہنچ جائینگے

لکھنؤ، یوپی کے اضلاع اور بہار کے مختلف حصوں کے مزاح نگار ۱۱ر ڈسمبر کی صبح تک آ جائیں گے۔ ۱۱ر ڈسمبر کو مسٹر نر
آئی۔ اے۔ ایس بھی حیدرآباد سے، اور جناب محمد علی مہتاب علی وزیر کرناٹک بھی بنگلور سے تشریف لا رہے ہیں۔ کمک
آذر اور خالد عسیم بھی آ رہے ہیں۔

جناب ایم۔ اے۔ رزاق جو ایک حیدرآبادی نوجوان اور ہماری مجلس استقبالیہ کے اہم رکن، نیز پٹنہ میں حیدر
ایک صنعتی ادارے کے نمائندے ہیں، مہمانوں کے قیام کے لئے شہر کے ایک بڑے ہوٹل نٹ راج کی دو منز
پر لے چکے ہیں، جہاں ۱۰ر ڈسمبر کی صبح سے ہی ہمارے مہمان پہنچنے لگیں گے۔

۱۰ر ڈسمبر کی صبح آ ہی گئی۔ علی الصبح یوسف ناظم بمبئی سے پہنچ گئے ہیں۔ رزاق صاحب اور شفیع مشہدی
پر خوش آمدید کہتے ہیں اور ہوٹل پہنچا دیتے ہیں۔ ہوٹل میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد یوسف ناظم مجھ سے ٹیلی فو
کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، "واہی صاحب! آپ حضرات نے تو گھر جیسا آرام پہنچایا ہے۔" میں مطمئن ہو جاتا ہوں کہ ہمارے
رزاق صاحب کے انتظامات سے خوش ہیں۔ تیسرے پہر کے اسٹیمر سے احمد جمال پاشاہ اور بیگم سردہ جمال سیدا
تقریباً اسی وقت ڈاکٹر قمر رئیس اور مجتبیٰ حسین بھی دہلی کی گاڑی سے اترتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مصطفےٰ کمال ا
کے ہمراہ، جن میں سلیمان خطیب اور پاگل عادل آبادی بھی شامل ہیں، پہنچ جاتے ہیں، مقرب حسین بھی آ گئے ہیں
حضرات سے فرداً فرداً ملتا ہوں لیکن مجتبیٰ حسین اور مصطفےٰ کمال کو آٹھ سال کے بعد دیکھ کر انھیں اس طرح گلے
ہوں، جیسے مدت کے بعد افرادِ خاندان مل رہے ہوں۔ ہوٹل والے بھی مہمان نوازی میں عظیم آباد کی پرانی روا
ہر مہمان کو جو بھی ممکن سہولت ہے بہم پہنچا رہے ہیں۔ ۹ بجے شب میں ہوٹل میں موجود تمام مہمان اور میزبان ہو
ہال میں ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ اتنے میں وجاہت علی سندیلوی بھی تشریف لاتے ہیں۔ میں تھکا ماندہ
خوشی سے نیند نہیں آتی۔ اگلے دن کا پروگرام بھی ذہن پر مسلط ہے۔

۱۱ر ڈسمبر کی صبح۔ مجھے ہلکا ہلکا بخار ہے۔ شاید شب بیداری کے باعث ہو، شاید یہم بھاگ
شاید جسم میں مسرت کی حرارت ہو کہ ایک دیرینہ تمنا پوری ہو رہی ہے۔ میں ہوٹل نٹ راج پہنچتا
یہ ہے کہ طنز نگاران دکن مہمان بنے رہنے کے بجائے اب خود میزبان بن چکے ہیں۔ آٹھ بجے صبح
مسٹر نریندر لوتھر آ رہے ہیں، کچھ حضرات ان کا استقبال کرنے کے لئے اسٹیشن جا چکے ہیں
کو ریسیو کرنے کی غرض سے ایرپورٹ پر ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ گنگا کے پانی کو سادیر
ایک عظیم نہر بنانے کا جو منصوبہ حکومت کے زیرِ غور ہے، اس منصوبے کو جشنِ ظرافت میں آئے
ہم اہل پٹنہ کے ساتھ بھرپور تعاون کر کے ادبی سطح پر عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ موسیٰ ندی کا سیلِ ظرافت
ہے۔ ملا وجہی، قلی قطب شاہ کی روحیں، بیدل، راسخ اور شاد عظیم آبادی کے وطن میں اربابِ ظرافت کی
ہوں گی۔

دن کے ساڑھے دس بجتے ہیں۔ خدا بخش لائبریری کا وسیع ہال، مہمان ادیبوں اور بہار کے
کھچ بھرا ہوا ہے۔ جشنِ ظرافت کا پہلا پروگرام سیمینار شروع ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر دیویندر ناتھ شر
کرسیٔ صدارت اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار کارروائی چلانے کے لئے مائک سنبھال چکے ہیں۔ ڈاکٹر
"عہد حاضر میں طنز و مزاح" اور جناب شفیع مشہدی "اردو میں طنز و مزاح ایک جائزہ" پڑھ

ان مقالات میں اٹھائے گئے نکتوں پر مباحثہ شروع ہوتا ہے (سیمینار کی مکمل رپورٹ علیحدہ ایک مضمون میں آپ پڑھیں گے) دو بجے یہ جلسہ کل کے لئے ملتوی ہوتا ہے۔ ہم سب کے سب نٹ راج ہوٹل واپس آتے ہیں۔ رزاق اور شبیر صاحبان اپنے مہمانوں کو ڈائننگ ہال میں لے جاتے ہیں اور ہم تمام موجود لوگ گرما گرم مباحثہ سننے کے بعد گرما گرم لذیذ کھانوں کی لذت میں گم ہو جاتے ہیں۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ میں بھارتیہ نرت کلا مندر کے بڑے ہال میں جشنِ ظرافت کمیٹی کے دوسرے ارکان کے ساتھ پہنچتا ہوں۔ یہاں جناب فخرالدین وناک کی خوش ذوقی قدم قدم پر نمایاں ہے۔ ہال دلہن کی طرح سجا ہوا اور اسٹیج کے پردہ پر کارٹونی تصویر کی انفرادیت ہمارے لبوں پر تبسم بکھیر دیتی ہے۔ پٹنہ کی قدیم عمارت گول گھر کی [illegible] عالم بالا میں بسنے والے اردو کے طنز و مزاح نگار اپنے اپنے شہروں کے سہارے نیچے اتر رہے ہیں۔ ان میں غالب بھی ہیں اکبر بھی، اودھ پنچ اور اودھ اخبار کے لکھنے والے بھی ہیں۔ شوکت تھانوی، پطرس بخاری، سید محمد جعفری، مجید لاہوری اور دوسرے بھی فنکار ہیں۔ نیچے جشنِ ظرافت کے شرکاء انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ساڑھے پانچ بجے شام سے نثری نشست کے فنکاروں کو سننے کے لئے سامعین ہال میں داخل ہونے لگے ہیں۔ پونے چھ بجے ہال سامعین سے پُر ہو جاتا ہے اور ٹھیک چھ بجے اسٹیج کا پردہ ہٹتا ہے۔ تو سامعین کی نگاہیں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ادبا و شعراء اور ان کے پیچھے کارٹونی تصویر پر پڑتی ہیں۔ اور سارے چہرے مسکرا اٹھتے ہیں۔ جلسہ کی ابتداء اقبال کے قومی ترانہ، 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' سے ہوتی ہے' جسے پٹنہ ریڈیو کے آرٹسٹ سناتے ہیں۔ جشن ظرافت کمیٹی کے معتمد شبیر حسین وناک کے خطبۂ استقبالیہ اور جناب محمد علی مہتاب علی کی افتتاحی تقریر کے بعد جناب محمد حسین آزاد خطبۂ صدارت پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر مصطفےٰ کمال نظامت کے فرائض سنبھالتے ہوئے مشہور و مقتدر مزاح نگاروں کو باری باری مضمون سنانے کے لئے بلاتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل جشنِ ظرافت کمیٹی کی جانب سے شائع شدہ سووینیر کا اجراء جناب محمد علی مہتاب علی کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ اور شرکاء جشن کو کمیٹی کی جانب سے ایک خوبصورت فولڈر بطور یادگار پیش کیا جاتا ہے' جس میں سووینیر کی ایک کاپی ایک رائٹنگ پیڈ اور ایک ڈاٹ پین بھی رکھے ہوئے ہیں۔

بیگم سرور جمال، ماہ منیر خاں، نعمان ہاشمی، یوسف ناظم، وجاہت علی سندیلوی، نریندر لوتھر اور مجتبیٰ حسین اپنے اپنے فن کا کمال دکھاتے ہیں اور بھارتیہ نرت کلا مندر کا وسیع ہال قہقہہ زار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سامعین کے اصرار پر مجتبیٰ حسین دوبارہ مائک پر آتے ہیں اور سامعین کو ہنسا ہنسا کر جب بے حال کر دیتے ہیں' تو بڑی معصومیت سے واپس چلے جاتے ہیں۔ ساڑھے نو بجے شب میں یہ محفل نیشنل انتھم کے بعد اختتام کو پہنچتی ہے۔ بوہرہ جماعت کی انجمن کی جانب سے عشائیہ کا انتظام شہر کے سب سے بڑے ہوٹل ری پبلک میں ہے۔ سبھی مہمان اور میزبان وہاں جاتے ہیں۔ پُر تکلف ڈنر کے بعد لطیفے سنانے کا دور چلتا ہے۔ نریندر لوتھر احمد جمال پاشاہ اور دوسرے حضرات لطائف و ظرائف سنا سنا کر ہوٹل ری پبلک کے ڈرائنگ روم کو بھارتیہ نرت کلا مندر کے ہال جیسی فضاء میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ آخر محفل برخواست ہوتی ہے۔ چلتے چلتے نریندر لوتھر صاحب مجھ سے کہتے ہیں۔ "واہی صاحب' آپ حضرات نے پٹنہ میں اتنے بڑے پیمانہ پر اور اس خوش سلیقگی سے جشنِ ظرافت منعقد کر کے ہم اہلِ حیدرآباد کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم لوگ اپنے یہاں آئندہ جب طنز و مزاح نگاروں کی کانفرنس کریں تو معیاری ہو۔" میں کہتا ہوں: "ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے نقشِ قدم پر چل کر ہی کیا ہے۔" مہمان حضرات ہوٹل نٹ راج اور میں تھکا ماندہ اپنے گھر واپس آتا ہوں۔ رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ آج پھر نیند نہیں آتی ہے۔ کروٹیں لیتے لیتے صبح ہو گئی ہے اور جشن ظرافت کا دوسرا اور آخری دن آ پہنچا ہے۔ آج میرے ضعیف جسم کی تھکن شباب پر ہے۔

تاہم گھر سے جلد ہی نکل پڑتا ہوں۔ ہوٹل نٹ راج میں مہمانوں سے ملاقات ہوتی ہے اور ہم سب دس بجتے بجتے خدا بخش لائبریری کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ یہاں شفیع مشہدی کے افسانوں کے مجموعے 'شاخِ لہو' کی تقریبِ اجراء جناب محمد علی مہتاب علی کے ہاتھوں انجام پانے والی ہے اور اس کے بعد کل کے سیمینار کے نامکمل مباحثہ کو اختتام تک پہنچانا ہے۔ جناب محمد علی اور آزاد صاحب جلسہ گاہ میں تشریف لاتے ہیں، ہال کل ہی کی طرح بلکہ کل سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ شاخ لہو کی رسمِ اجراء کے بعد مجتبیٰ حسین ایک چھوٹا سا لیکن اچھوتا مضمون مجموعہ اور صاحبِ مجموعہ پر سناتے ہیں، دوسرے ناقدین بھی اس حسین کتاب پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ محمد علی صاحب کو کچھ اور کام ہے۔ وہ چلے جاتے ہیں۔ اب جناب وجاہت علی سندیلوی کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہیں۔ چائے کے وقفے کے بعد سیمینار کی کارروائی شروع ہو کر، دو بجے دن میں ختم ہوتی ہے۔ اس دو روزہ سیمینار کو خوش ترتیبی اور ہم آہنگی سے چلانے کا سہرا ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے سر ہے۔

آج جناب محمد حسین آزاد کی جانب سے ہوٹل پرنسس میں لنچ کا انتظام ہے۔ شرکاء جشن کے علاوہ شہر کی معزز ہستیاں بھی مدعو ہیں۔ آزاد صاحب ہمہ تن میزبان بنے ہوئے، مدعوئین کو شکم سیر ہونے میں بھرپور مدد پہنچا رہے ہیں۔ دن کے تین بج جاتے ہیں۔ سہ پہر چار بجے بانکی پور کلب کے سبزہ زار پر بہار اردو اکیڈمی کی جانب سے عصرانہ دیا جا رہا ہے۔ یہ کلب گنگا کے ساحل پر واقع ہے۔ بڑا پر لطف اور سکون بخش منظر ہے۔ شہر کے بہت سارے عمائدین موجود ہیں۔ کام و دہن کی آزمائش کے ساتھ ساتھ خوش گپی بھی جاری ہے۔

پانچ بج رہے ہیں۔ میں چند اراکین جشن کے ہمراہ بھارتیہ نرت کلا مندر پہنچ کر ایک آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہوں۔ تھکن نے چور کر دیا ہے۔ کہاں تو صحت کی خرابی کے باعث یہ حال تھا کہ دو سال سے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اور کہاں یہ عالم ہے کہ تین راتوں سے سویا نہیں ہوں، سارا سارا دن چلتا ہی پھرتا رہا ہوں۔ آج مزاحیہ مشاعرہ ہے۔ بھارتیہ نرت کلا مندر کے دروازے پر خلقت کا ہجوم ہے، جس ہال میں بہ مشکل ایک ہزار افراد سما سکتے ہیں وہاں ہم نے سولہ سو سامعین کے لئے کارڈ جاری کئے ہیں۔ پھر بھی ہزاروں شائقین باہر کھڑے ہیں۔ ہم مجبور ہیں۔ پٹنہ میں اس سے بڑا ہال موجود نہیں۔ ہم شائقین کو بٹھائیں تو کہاں بٹھائیں بہتیرے لوگ مایوس ہو کر ہمارے خلاف شکایات کے دفتر لئے واپس جا رہے ہیں۔ اگرچہ ہم نے گیٹ پاس جاری کر کے مزید سیکڑوں افراد کو ہال تک پہنچا دیا ہے، پھر بھی بہت زیادہ لوگ جلسہ گاہ تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں اور ہم نے بھی ان سے چشم پوشی کر لی ہے۔

آج کا جلسہ بھی اقبال کے ترانہ سے شروع ہوتا ہے۔ جناب محمد علی مہتاب علی مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ جناب سیتارام کیسری جلسے کا افتتاح کرتے ہیں، افتتاح وزیر اعلیٰ بہار جناب جگن ناتھ مصرا کرنے والے تھے لیکن اچانک آج صبح وہ بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ ان کے ایک عزیز وہاں جسلوک ہوسپٹل میں داخل مرگ و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے جلسے میں نہ آنے پر ایک معذرت نامہ اور پیغام بھیجا ہے۔ جسے رزاق صاحب پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ جناب محمد حسین آزاد اور دوسرے وزراء بہار کے علاوہ محترمہ عزیزہ امام، ممبر راجیہ سبھا بھی ڈائس پر موجود ہیں۔ محمد علی صاحب کی دلچسپ اور پُر اثر صدارتی تقریر کے بعد مشاعرہ کی کارروائی شروع ہو جاتی ہے۔ آج نظامت کے فرائض مشہدی انجام دے رہے ہیں۔ شفیع مشہدی بہ یک وقت شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی، ڈپٹی کلکٹر بھی ہیں، جناب محمد حسین آزاد کے پرائیوٹ سکریٹری بھی، ہماری جشنِ ظرافت کمیٹی کے مدار المہام بھی اور ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ مزاحیہ مشاعرہ میں ان کی نظامت سونے پر سہاگہ کا لطف دے رہی ہے۔ مشاعرہ کی ابتدا پٹنہ کے قادر الکلام شاعر علامہ واقف آسدی سے ہوتی ہے اور اختتام جناب

ہلال رضوی رامپوری کے کلام پر ہوتا ہے۔ درمیان میں خالد رحیم اور اسمٰعیل آذر (کٹک) مسٹر لکھنوی، قادر لکھیم پوری، عادل لکھنوی (یوپی) تماشہ گیاوی، محبوب جہانگیر، پروفیسر مہدی علی، ابرار ساغر، پروفیسر سید حسن چرخ، فیاض عالم رقیب، جوہر سیوانی، ہدی حسن (بہار) مقرب حسین (مدھیہ پردیش) پاگل عادل آبادی، طالب خوندمیری، لوگس، گرٹبڑ، بھاٹ حیدرآبادی (آندھرا پردیش) اور سلیمان خطیب (کرناٹک) پڑھتے ہیں۔ راقم الحروف نے بھی ایک نظم پڑھی ہے۔ یوں تو سبھی شاعروں نے سامعین کو اپنے اپنے کلام سے محظوظ کیا لیکن اہلِ دکن خصوصاً سلیمان خطیب اور طالب خوندمیری کا چرچہ ہر زبان پہ ہے۔ بھارتیہ نرت کلا مندر کی فضا تبسم، ہنسی، اور قہقہوں کے پیہم عمل سے شرابور ہے۔ سامعین کے اعصاب پر جشنِ ظرافت کا یہ آخری دور، اس حد تک سوار ہو چکا ہے کہ ہر شخص ہنستے ہنستے بے حال ہے کبھی ہنسی آنکھوں کے ذریعہ چھلک رہی ہے تو کبھی چھلکتی ہوئی آنکھیں قہقہوں میں ڈوب ڈوب جاتی ہیں۔ ساڑھے چار گھنٹوں کے مسلسل قہقہوں کے سیلاب کے بعد، مشاعرہ کے ختم ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور نیشنل اینتھم کے بعد سامعین اس دلچسپ اور انوکھی تقریب کی یادیں دلوں میں لئے اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ میں بھی اپنے افراد خاندان کے ساتھ گھر واپس آتا ہوں۔ اور آج جی بھر کے سوتا ہوں۔ جشن ظرافت اپنی تمام تاریخ ساز دلچسپیوں کے ساتھ اختتام پذیر ہو چکا ہے۔

۲۳ر ڈسمبر کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ ہوٹل نٹ راج سے ہمارے مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ کل رات ہی چلے گئے۔ صبح کی گاڑی سے مجتبیٰ حسین اور ڈاکٹر قمر رئیس بھی دہلی کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ بمبئی اور دکن کے طنز نگاروں کی ٹرین شب میں روانہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد، لکچرر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی، بچے کھچے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے شعبہ میں لے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلباء طنازوں کے کلام اور مضامین سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہاں سے ریڈیو والے مہمانوں کو پٹنہ ریڈیو اسٹیشن ان کے کلام کی ریکارڈنگ کے لئے لے جاتے ہیں۔ میں ابھی گھر پر ہی ہوں۔ خالد رحیم اور اسماعیل آذر آجاتے ہیں، ان دونوں کی واپسی تیسرے پہر کی گاڑی سے ہوگی۔ دیر تک بیٹھتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد، یوسف ناظم اور سلیمان خطیب ملنے کے لئے آجاتے ہیں۔ یہ لوگ گئے تو مصطفےٰ کمال اور طالب خوندمیری پہنچتے ہیں۔ موخر الذکر حضرات کے ہمراہ میں نٹ راج ہوٹل جاتا ہوں۔ وہاں سے دکن کا قافلہ، جناب شبیر حسین وناک کے گھر پہنچتا ہے جہاں الوداعی عشائیہ کا انتظام ہے۔ جناب محمد حسین آزاد اور دوسرے اراکین جشن ظرافت کمیٹی بھی آجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر شاعری کا دور چلتا ہے۔ ڈاکٹر کلیم عاجز دو غزلیں سناتے ہیں، ان کے بعد مشہدی سلیمان خطیب، یوسف ناظم، طالب خوندمیری، لوگس، بھاٹ، گڑبڑ، پاگل، مقرب، جوہر سیوانی اور راقم الحروف سبھی کچھ نہ کچھ سناتے ہیں۔ پھر قافلہ سوئے اسٹیشن روانہ ہو جاتا ہے۔ اسٹیشن پر احباب سے رخصت ہو کر میں گھر چلا آتا ہوں، لیکن دوسرے رفقاء کار، مہمانوں کو برتھ پر آرام سے بٹھا کر رخصت ہوتے ہیں۔ جشنِ ظرافت کا یہ آخری کام بھی خوش اسلوبی سے انجام پا جاتا ہے۔

اس پروگرام کو عظیم الشان کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں جناب محمد حسین آزاد کی رہنمائی جناب شبیر حسین اور جناب شفیع مشہدی کی محنت اور انتظامی صلاحیت، جناب فخرالدین وناک جناب علی عباس، جناب شفیع جاوید، جناب حاتم بھائی، جناب طیب علی، جناب رزاق کی مستعدی و خوش سلیقگی اور میرے دو لڑکوں علی نقوی اور احسن نقوی کی لگن، اور بے لوث جذبۂ خدمت نے اہم رول ادا کیا ہے۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

OO

آجر صاحبان آجر صاحبان آجر صاحبان

خود کو قانونی کارروائی سے بچائیے

جو قانون ایمپلائمنٹ اکسچینج (مخلوعہ جائیدادوں کی لازمی طور پر اطلاع) بابت ۱۹۵۹ء کے تحت آپ کے خلاف کی جاسکتی ہے۔

۱. روزگار سے متعلق سہ ماہی تخمینہ جات ایمپلائمنٹ کے دفتر کو بر وقت روانہ کیجئے۔

۲. مخلوعہ جائدادوں کی اطلاع متعلقہ ایمپلائمنٹ اکسچینج کو دیجئے۔

۳. جب بھی طلب کی جائے مطلوبہ مواد فراہم کیجئے۔

تفصیلات کے لیئے

قریب ترین ایمپلائمنٹ اکسچینج سے ربط پیدا کیجئے۔

جاری کردہ

ڈائرکٹر آف ایمپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ
آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

DIPR. 30/76.77

کُل ہند جشنِ ظرافت

منظوم رپورتاژ

خالد رحیم

دسمبر کی وہ آٹھویں شام تھی
کڑی آکے سردی لبِ بام تھی
اچانک ملا، مجھ کو ٹیلی گرام
تھا پٹنہ سے واہیؔ کا جس میں پیام
کہ گیارہ دسمبر کو اُن سے ملوں
مَیں جشنِ ظرافت میں شرکت کروں
ہوا دل میں سرور، بس لا کلام
سفر کا کیا مَیں نے پھر انتظام
کٹک سے سفر پر روانہ ہوا
خیالِ ارضِ پٹنہ کا دل میں رہا
میرے ساتھ تھے آذرؔ نامدار
عزیزوں میں کرتا ہوں جن کو شمار
غزل پڑھتے پڑھتے لگاتے ہیں تان
یہ شاعر ہیں ہر وقت لکھتے ہیں پان
کی ساتھ ان کے ملاقت بھی ہے
طبیعت میں تھوڑی ظرافت بھی ہے
سفر کی صعوبت اٹھاتے ہوئے
چلے پٹنہ ہم مسکراتے ہوئے

جو پٹنے میں گاڑی لگی نو بجے
تو احبابِ جشنِ ظرافت سے ملے
کیا خیر مقدم بصد عز و شان
کہ مہمان تھے ہم اور وہ میزبان
ہمیں کار میں لے کے وہ چل دیئے
معاً جا کے نٹ راج ہوٹل رُکے
یہ ہوٹل ہے پٹنہ میں اپنی مثال
عمارت ہے اس کی بڑی خوش جمال
جو جشنِ ظرافت کا مہمان ہے
یہیں اُس کی راحت کا سامان ہے
بالآخر یہیں پر ٹھہرنا پڑا
ہمیں نمبر اکیس ۲۱ کا کمرہ ملا
مقیم اس میں جوہرؔ سیوانی بھی تھے
جو تشریف لائے تھے سیوان سے
خلوص و محبت کے پیکر ہیں وہ
مروّت، شرافت کے گوہر ہیں وہ
بہت دیر تک بات ہوتی رہی
بسر اس طرح رات ہوتی رہی
صبح کے چھ بجتے ہی ہم لپنے بستر سے اُٹھے
چائے پی پھر حضرتِ جوہر کے شامل بیٹھے
دفعتاً آذر بھی آئے حضرتِ عادلؔ کے ساتھ
پھر تو چل نکلی معاً یادوں کی، باتوں کی برات

بے سروپا گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا
پیٹ ہم بھرتے رہے اور ناشتہ چلتا رہا
دس بجے پھر کار میں ہم سب ہوئے مل کر سوار
حضرتِ بیدارؔ کو تھا ہم سبھوں کا انتظار
صف بہ صف بیٹھے ہوئے تھے ہال میں شاعر علم
تھے وہیں پر کچھ ادیب و نا قدِ عالی مقام
ہو رہا تھا ہال میں سمپوزیم اک شاندار
جس میں شرکت کر رہے تھے عالمانِ نامدار
حضرتِ نوہترؔ نے کی اُس کی صدارت بے خطر
اور مقالے کے لیے حاضر ہوئے حضرت قمرؔ
بعد ازاں جب مشہدیؔ صاحب مقالہ پڑھ چکے
تب برائے بحث لوگوں کے لبِ دنداں کھلے
لطفؔ صاحب بھاگتے آئے تھے بھاگلپور سے
دے رہے تھے فیصلے فن پہ وہ بیٹھے دور سے

حضرت رضا نقوی واہی۔
جناب اسماعیل سعیدی آذر۔

---

۱ حضرت عادل لکھنوی
۲ ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائریکٹر خدا بخش
۳ جناب نہیندر لوہتر۔ حیدرآباد
۴ جناب ڈاکٹر قمر رئیس دہلی
۵ جناب شفیع مشہدی پٹنہ
۶ حضرت لطف

شرفی[۱] صاحب کہ جو ہیں ایک نقادِ کہن
ی میزانِ ادب میں تولتے تھے نقدِ فن
ربار اٹھتے تھے کچھ کہتے کو یوں احمد جمال[۲]
پنے آگے گلنے دیتے ہی نہ تھے اوروں کی دال
عزت ناظم[۳] نے بھی فن پر کیا کچھ تبصرہ
ور وجاہت[۴] جی بھی وضاحت کو اٹھے باقاعدہ
تھے مظفر پورسے آئے جو اعظم ہاشمی[۵]
پ نے بھی فکر و فن پر اپنی دو ٹک رائے دی
یوں کئی حضرات نے تشریح کی، تفسیر کی
حضرتِ توقیر نے اٹھ کر آخری تقریر کی
ہو گیا پھر ملتوی سمپوزیم کا سلسلہ
کل پہ چھوڑا حضرتِ بیدآستے یہ فیصلہ
لنچ کا وقت آگیا ہوٹل میں ہم حاضر ہوئے
اہلِ دل، اہلِ زباں، اہلِ قلم حاضر ہوئے
کھا کے کھانا سب کے سب خوش گپیاں کرتے رہے
اہلِ پٹنہ کی چمن سازی کا دم بھرتے رہے
شام کو پہنچے کلا منڈپ کے ہم جب ہال میں
قبل سے فنکار کچھ موجود تھے پنڈال میں
حضرتِ آزاد[۶] ڈائس پر ہوئے جلوہ فگن
ساتھ ان کے تھے علی صاحب منسٹر از دکن
صدرِ جلسہ حضرتِ آزاد تھے عالی مقام
اور مہمانِ خصوصی تھے علی نیک نام
بعدِ گل پوشی، نظامت کیلئے آئے کمال[۸]
اور فرمایا کہ اب مضمون پڑھیں سرور جمال[۹]
انکے سرور نے سنایا "لوگ کہتے ہیں" جناب
اہلِ اردو آج کل پڑھتے نہیں اردو کتاب
مجتبیٰ[۱۰] صاحب اٹھے تو درد کا قصہ اٹھا
درد! ہائے درد وہ بھی درد اپنے ڈاڑھ کا
حضرتِ ناظم سنانے آ گئے اک ماجرا
(ایک دھوبن نے چرا کر کھا لیا تھا باجرا)

آئے ہیں ڈائس پہ انکے بعد ہی احمد جمال
"میں مری اور میں" کے جملوں سے دکھاتے ہیں کمال
کیا بتائیں ہے وجاہت جی کو اب کس کی تلاش
لامکاں کی یا مکاں کی، یا کہ خود اپنی تلاش
قہقہوں پر قہقہے ہیں قہقہوں کی ہے برات
قہقہوں کے شور میں ڈوبی ہوئی ہے کائنات
قہقہوں کے ساتھ نثری دور کا ہے اختتام
جانے والے قہقہوں کے ساتھ کرتے ہیں کلام
بعد ازاں مہمانوں کو کھانا ری پبلک[۱۱] میں ملا
بزمِ نجمی[۱۲] کی طرف سے طے یہ پہلے ہی سے تھا
ہم ڈنر کھاتے رہے کرتے رہے خوش گپیاں
اور لطیفوں پر لطیفے چھیڑتے تھے درمیاں
دور کافی کا چلا، گرمی بدن میں آ گئی
تھرتھراتے، کانپتے ماحول کو گرما گئی
رات کے گیارہ بجے تھے نیند سے بوجھل تھی آنکھ
کار میں بیٹھے تھے لیکن جانبِ ہوٹل تھی آنکھ
صبح ہوتے ہی چلے ہم حضرتِ واہی کے گھر
جا کے دیکھا دھوپ میں بیٹھے ہیں چادر اوڑھ کر
دیکھتے ہی ہم کو حضرت پیار سے کہنے لگے
منتظر بیٹھا تھا میں اچھا ہوا تم آ گئے
وعدہ کر کے تم کٹک میں کیوں تھے یوں اٹکے ہوئے
زلف میں بیگم کی تھے کس واسطے لٹکے ہوئے
لے کے بیگم سے اجازت آئے ہو یا بھاگ کر
کیا تمہارے پٹنہ آنے کی انھیں ہے بھی خبر؟"
دیر تک چلتا رہا یوں گفتگو کا سلسلہ
پاس ہی آذر بھی بیٹھے سن رہے تھے ماجرا
ناشتہ پھر ساتھ تینوں نے کیا دل کھول کر
بعد ازاں ہم لائبریری تک گئے اک کار پر
تھے وہاں موجود آزاد[۱۳] و علی خوش خصال
کرنے اجراء آئے تھے "شاخِ لہو" کی دیکھ بھال

خوشۂ گندم نہ کوئی شجرِ ممنوعہ تھا وہ
مشہدی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ تھا وہ
تبصرہ، تنقید کا پھر سلسلہ جاری ہوا
مشہدی جی کو ملا تحفۂ مبارکباد کا
چائے پینے ہال سے باہر ذرا آئے جو ہم
مصطفےٰ صاحب کی ہم پر پڑ گئی چشمِ کرم
دیکھ کر وہ خوش ہوئے میرے گلے سے لگ گئے
فرطِ حسرت سے شگوفے باغِ دل کے کھل اٹھے
ہو گیا سمپوزیم جب ختم تو ہم سب اٹھے
لنچ کھانے کے لئے ہوٹل پریس میں گئے
حضرتِ آزاد کی جانب سے ظہرانہ تھا یہ
پُرتکلف، کیا بتائیں کس قدر کھانا تھا یہ

۱۔ جناب وہاب اشرفی ۔ رانچی
۲۔ جناب احمد جمال پاشا ۔ سیوان
۳۔ جناب یوسف ناظم ۔ بمبئی
۴۔ جناب وجاہت علی سندیلوی ۔
۵۔ جناب قمر اعظم ہاشمی ۔ رانچی
۶۔ عزت مآب عالیجناب محمد حسین آزاد؛
وزیر زراعت، امدادِ باہمی و اوقاف بہار
۷۔ عزت مآب عالیجناب محمد علی مہتاب علی
وزیر ٹرانسپورٹ (کرناٹک)
۸۔ جناب مصطفےٰ کمال، مدیر شگوفہ (حیدرآباد)
۹۔ محترمہ سرور جمال ۔ سیوان
۱۰۔ جناب مجتبیٰ حسین ۔ دہلی
۱۱۔ HOTEL REPUBLIC
۱۲۔ انجمنِ نجمی ۔ پٹنہ میں بوہرہ جماعت کی ایک انجمن ہے۔
۱۳۔ جناب مدیر "شگوفہ"
۱۴۔ عزت مآب محمد حسین آزاد ۔ بہار
۱۵۔ عزت مآب محمد علی مہتاب علی (کرناٹک)

کھا کے کھانا اپنے کمرے میں چلے آرام کو
کیوں کہ بزمِ شعر خوانی میں تھا جانا شام کو
شام آئی، ہم ہوئے تیار جانے کے لئے
اپنی بیگم کا گُھنا! خاک سُنانے کے لئے
جائیے کا اردو اکڈمی سلے کیا تھا اہتمام
دعوتوں کا سلسلہ ہی سلسلہ تھا صبح و شام
ساحلِ گنگا پہ بانکی پور کا ہے جو کلب
چل پڑے نٹ راج ہوٹل سے وہاں ہم سب کے سب
ناشتہ اور چائے سے جب ہم فراغت پا چکے
تب کالا مندر میں پہنچے شعر خوانی کے لئے
کیا بتائیں دید کے قابل تھا منظر واں کا
یعنی اہلِ ذوق کا سیلاب تھا اُمڈا ہوا
سامنے بیٹھی ہوئی تھیں مہ لقائیں بے شمار
ڈالتی تھیں شاعروں پر جو نگاہیں شعلہ بار
رفتہ رفتہ ہال میں جب آ گئے شاعر تمام
تب ہوئیں مسند نشیں محفل میں محترمہ امام[1]
آج کی شب صدر کی مسند پہ بیٹھے ہیں علی[2]
اور مہمانِ خصوصی کی جگہ آزاد[3] جی
ہار پھولوں نے اٹھا کر جب اُنھیں پہنا دیا
تالیوں کی گونج سے تب ہال سارا بھر گیا
سامنے مائک کے آکر مشتبدی جی نے کہا
سامعیں ہوتی ہے شعری دور کی اب ابتدا
بزم میں ترتیب کا کچھ بھی نہیں ہے التزام
آگے پیچھے آئیں گے پڑھنے سبھی اپنا کلام
حضرتِ واقف[4] نے کھولا پار ساؤں کا بھرم
تھی ردیف اُن کے مُسلّم شوخی گرما گرم
حضرتِ بوگس[1] پہ غالب کا تھا کچھ ایسا اثر
رکھدیا ہر شعر کا ظالم نے بخیہ کھول کر
حضرتِ ابرار آئے ابر بن کر چھا گئے
قہقہوں کے پھول ساری بزم پہ برسا گئے

حضرتِ بھباٹ[3] نے بم برسٹ اپنا کر دیا
بال جو چاندی کا تھا ہر اک کے سر پہ دھر دیا
مورخوں کو مشورہ دینے مقرب[4] آ گئے
شاعروں کا بے تکا حلیہ وہ خود دکھلا گئے
حضرتِ گڑ بڑ[5] کے آتے گڑ بڑی دونی ہوئی
قہقہوں کا شور اُٹھا ہڑ بڑی دونی ہوئی
حضرتِ مہدی[6] نے اہلِ بزم کو گرما دیا
اُن کا ہر اک شعر تھا قوس و قزح کا آئینہ
حضرتِ جوہر[7] نے لی، بیگم کے جمپر کی خبر
چھٹ کے جمپر ہو گیا آدھا اِدھر آدھا اُدھر
حضرتِ عادل[8] کو ہے آیا ہوا جنسی بخار
مرد ہو کر عورتوں میں خود کو کرتے ہیں شمار
آپ مسٹر[9] لکھنوی ہیں منفرد انداز سے
قہقہوں کی بھیڑ میں ڈوبی ہوئی آواز سے
حضرتِ طالب[10] کو اک معمار اچھا چاہیئے
شعر گر غالب کی صورت گھر کا ہونا چاہیئے
حضرت آذر[11] سے سُنئے خان کے لہجے میں بات
بیٹھتے اُٹھتے ہیں اکثر کابلی والوں کے سات
حضرتِ پاگل[12] کا کہنا ہے کہ میں بیمار تھا۔
آپریشن سے مرا دردِ جگر اچھا ہوا
حضرتِ واہی[13] سے ملئے عورتوں کے سال میں
ہے پھنسی فکرِ رسا زلفِ دوتا کے جال میں
حال سے بے حال ہیں سب سُننے والے ہال میں
بج رہی ہیں تالیوں پہ تالیاں پنڈال میں
منفرد شاعر ہیں دکنی کے سلیمانِ خطیب[14]
دکنی لہجے میں "یہ کہہ کو لائے ہیں غزلیں عجیب"
حال اب اک ریل کے ڈبے کا کہتے ہیں ہلال[15]
کھینچ کر جو ٹی دیہاتن کی دیہاتی ہے ملال
خاکہ بیگم کا لئے خاک[16] ہیں حاضر بزم میں
کر رہے ہیں پیش یہ سارے مناظر بزم میں
(مُشاعرے کا اختتام)

اپنا اپنا ماجرا کہتے ہوئے شاعر گئے
قہقہوں کا پھول برساتے ہوئے شاعر گئے
قہقہوں کے پھول جو چُنتے تھے ہر اک شعر پہ
سامعین حضرات سر دھنتے تھے ہر اک شعر پہ
قہقہوں کے شہر میں سب شاد تھے آباد تھے
توڑ کر زنجیرِ رنج و غم سبھی آزاد تھے
ختم آخر ہو گیا شعر و سخن کا سلسلہ
اپنے اپنے گھر کو لوٹا ہر کوئی ہنستا ہوا

۱۔ محترمہ عزیزہ امام صاحبہ
۲۔ عزت مآب جناب محمد علی مہتاب علی
۳۔ عزت مآب جناب محمد حسین آزاد
۴۔ علامہ فضل امام واقف (پٹنہ)
۱۔ جناب بوگس حیدرآبادی
۲۔ جناب ابرار ساغر (پٹنہ)
۳۔ جناب صبغتہ اللہ بھباٹ (حیدرآبادی)
۴۔ جناب مقرب حسین مقرب (ایم پی)
۵۔ جناب گڑ بڑ حیدرآبادی
۶۔ جناب پروفیسر مہدی علی
۷۔ جناب جوہر سیوانی
۸۔ جناب عادل لکھنوی
۹۔ جناب مسٹر لکھنوی
۱۰۔ جناب طالب خوندمیری (حیدرآبادی)
۱۱۔ جناب اسماعیل سیدی آذر۔ (کٹک)
۱۲۔ جناب پاگل عادل آبادی۔ (حیدرآبادی)
۱۳۔ جناب رضا نقوی واہی۔ (پٹنہ)
۱۴۔ جناب سلیمان خطیب۔
۱۵۔ جناب ہلال رضوی (رامپور)
۱۶۔ راقم الحروف

(سلسلہ جاری)

سوئے ہوٹل چل پڑے ہم بھی ڈنر کے واسطے
اب ہے مہمانی فقط اک رات بھر کے واسطے
شاد ہیں جشنِ ظرافت کے اراکینِ کرام
بار آور ہوگئی ہے ان کی سعیٔ صبح و شام
حضرتِ شبیر[۱] کی کوشش ہوئی ہے کامیاب
مشہدی جی[۲] کی تمناؤں کے مہکے ہیں گلاب
حضرتِ نقوی[۳] کی محنت نے دکھایا ہے کمال
حضرتِ رزاق[۴] کی جد و جہد ہے بے مثال
حضرتِ واہی[۵] بھی اک موسس ہیں اس تعمیر کے
جایئے قربان اُن کے خواب کی تعمیر کے
سرپرستی حضرتِ آزاد[۶] کی تھی بے مثال
لائقِ صد آفریں ہر فرد تھا بے قیل و قال
ہیں اراکین اور بھی جشنِ ظرافت کے ضرور
غیر ممکن ہے کہ سب کے نام گنواؤں حضور
صبح ہوتے ہی ملے پھر چائے پر اہلِ قلم
چل رہا تھا دورِ سگریٹ پان کا بھی دم بدم
اپنے اپنے گھر پہنچنے کی سبھی کو فکر تھی
واپسی کا وقت تھا، ملنے ہلانے کی گھڑی
اشک تھمے ہنستی ہوئی آنکھوں سے چھٹنے کیلئے
مل رہے تھے لوگ آپس میں بچھڑنے کیلئے
ایک اک کرکے ہوئے رخصت سبھی اربابِ فن
ہوگئی سنسان یوں شعر و سخن کی انجمن
ہم بھی مل جُل کر ہوئے رخصت بگئے واہی[۱] کے گھر
دیکھتے کیا ہیں کہ حضرت سو رہے ہیں بے خبر
اُن کی پوتی نے جگایا کہہ کے "دادا جاگئے
گھر میں دو مہمان آپہونچے خدارا جاگئے"
اُٹھ کے فوراً آگئے حضرت ہمارے روبرو
اپنے کمرے میں بٹھایا اور چھیڑی گفتگو
دیر تک چلتا رہا یوں گفتگو کا سلسلہ
آپ نے چھیڑا معاً اہلِ کٹک کا تذکرہ
خیریت پوچھی کرامت[۲] اور حفیظ اللہ[۳] کی
یہ بھی پوچھا کون ہیں یہ حضرتِ ادیج اعظمی[۴]
بات نکلی احمد[۵] و راہی[۶] کی بھی کچھ درمیاں
کی بیاں میں نے مسیح اللہ[۷] کی بھی داستاں
جب سنا اردو کتب خانہ یہاں قائم ہوا
محترم نے ہم کٹک والوں کو دی دل سے دعا
گفتگو کا سلسلہ گھٹتا رہا بڑھتا رہا
لا کے کھانا دوپہر کا سامنے رکھا گیا
ساتھ کھانا حضرتِ راہی کے ہم کھاتے رہے
لطف کھانے کا یہاں کچھ اور ہی پاتے رہے
پھر چھڑی شعر و سخن کی داستاں بعد از طعام
تذکرے کا رُخ تھا سوئے حضرتِ مظہر امام[۱]
تین بجتے ہی گلے حضرت سے ملکر ہم اٹھے
اور اجازت لے کے اسٹیشن کی جانب چل پڑے
رخصتی کے وقت آنکھیں نم تھیں دل غمگین تھا
ساتھ اُن کی یاد کا سایہ مگر رنگین تھا
حضرتِ واہی کی یادوں کا سہارا تھا بہم
ریل کے ڈبے میں رکھے ہم نے بوجھل سے قدم
بیٹھ کر گاڑی میں دیکھا سوئے پٹنہ ایک بار
اہلِ پٹنہ کی بسائی دل میں یادِ زر نگار
رفتہ رفتہ ریل کی رفتار بڑھتی ہی گئی
دمبدم یہ بیل منڈھے بڑھکے چڑھتی ہی گئی
شہر پٹنہ دور ہم سے، دور تر ہوتا گیا
پل بہ پل گھٹتا گیا اپنے سفر کا فاصلہ
جانب ہوڑہ سے ہوکر ہم چلے سوئے کٹک
بیس گھنٹے بعد دیکھا آکے تب روئے کٹک

---

۱ جناب شبیر حسن وناک۔ پٹنہ
۲ " شفیع مشہدی "
۳ " اے آر نقوی؛ "
۴ جناب ایس۔ اے۔ رزاق۔ پٹنہ
۵ " رضا نقوی واہی۔ "
۶ " عزت مآب جناب محمد حسین آزاد بہار

۱ جناب رضا نقوی واہی۔ پٹنہ
۲ " کرامت علی کرامت کٹک
۳ " حفیظ اللہ نیولپوری "
۴ " محمد عثمان ادیج اعظمی
۵ " معین الدین احمد صدر اُردو لائبریری؛ کٹک
۶ جناب وشمی کانت راہی۔ کٹک
۷ " مسیح اللہ مسیح صدر بزم سخن۔ کٹک
۱ میرے محسن قبلہ مظہر امام صاحب۔ (سری نگر)

فلمی تصویر

اردو میں بڑے پیمانہ پر رسالوں کے اجراء کی خاصی گنجائش موجود ہے مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ۔ اسی لئے کوئی بھی ایسا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں۔ ملک میں معدودے چند رسالے ہیں جو کمرشیل بنیادوں پر اچھے گٹ اپ اور اچھے معیار کے ساتھ نکلتے ہیں۔ لیکن جنوبی ہند سے ایک بھی ایسا فلمی رسالہ شائع نہیں ہوتا جو کل ہند نوعیت کا حامل ہو، اور ہر بک اسٹال پر دستیاب ہو سکے۔ حالانکہ جنوب کی ریاستوں خاص طور سے مہاراشٹرا کرناٹک اور آندھرا پردیش میں اچھے اردو رسالوں کی کافی کھپت ہے۔ حیدرآباد کے ایک ادب شناس جناب غوث احمد خاں نے اب ارادہ کیا ہے کہ "فلمی تصویر" کے نام سے ایک فلمی ماہنامہ آفسٹ پر اور کل ہند پیمانہ پر شائع کریں۔ غوث احمد خاں صاحب سے میں کئی برس سے واقف ہوں۔ جب کبھی کسی کام میں انھوں نے ہاتھ ڈالا اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا کر رہے۔ وہ ہر کام پوری لگن اور توجہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے منصوبوں میں کبھی ناکام نہیں رہے۔ بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ بنجر زمین میں بیج بونا کوئی ان حضرت سے سیکھے۔ ایسے عزم و ارادہ کی شخصیت "فلمی تصویر" کے اجراء میں کار فرما ہو تو نتیجہ معلوم۔ یقین ہے کہ یہ پرچہ نکلے گا اور دھوم سے نکلے گا۔ غوث احمد خاں صاحب کام میں معیار کے قائل ہیں۔ رسالہ کے اجراء سے پہلے وہ کوئی چھ مہینوں سے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ مدیر، خصوصی نمائندوں اور دوسرے کام کرنے والوں کا ملک کے تمام اہم اخباروں میں اعلان کے ذریعہ انتخاب عمل میں آیا۔ اور اب جا کر گٹ اپ کے مسائل طے ہو رہے ہیں۔ آرٹ ڈائرکٹر کا انتخاب ہوا ہے۔ سائیز اور خط کا تعین ہو رہا ہے۔ ڈمی تیار ہو رہی ہے۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ایک نئی تاریخ بنائے گا۔ رسالہ کے مدیر سردار الہام فلمی دنیا کے لئے نئے نہیں۔ اس طرح ان کا ساتھ دینے والوں میں تجربہ کار و مشاق فلمی صحافی موجود ہیں۔ فلمی نشیب و فراز پر ان سب کی گہری نظر ہے۔ حیدرآباد میں آفسٹ چھپائی کی سہولتوں میں بھی کچھ اضافہ ہو چلا ہے۔ حیدرآباد کے پریسوں میں خوب سے خوب تر گٹ اپ لایا جا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ تمام تر توجہات پرچہ پر مرکوز کی جائیں اور پرچہ بڑے سرمایہ سے نکلے۔ "فلمی تصویر" جنوبی ہند میں پہلی بار بڑے سرمایہ سے نکلنے والا جریدہ بھی ہوگا۔ اس طرح انتظامیہ کی خوبی اور بہتر سرمایہ کے علاوہ کسی پرچہ کی کامیاب اجرائی کے لئے کیا چاہیئے؟ یقین ہے کہ "فلمی تصویر" ہندوستان کی اردو صحافت میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہوگا۔

مدیر شگوفہ!

نیک
تمنّاؤں
کے
ساتھ
دی وزیر سلطان ٹوباکو کمپنی لمیٹڈ
اعظم آباد، حیدرآباد 500020

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

طنز و مزاح کی گلکاریوں سے معمور یہ سالنامہ قارئین شگوفہ کو یقیناً پسند آئے گا۔

ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ ملک کے تمام نمائندہ طنز و مزاح نگاروں کو اس خصوصی اشاعت میں یکجا کریں۔ ۱۱، اور ۱۲، دسمبر کو پٹنہ میں منعقدہ "کل ہند جشنِ ظرافت" میں سنائی گئی بیشتر تخلیقات اس شمارے میں شریک ہیں۔ پٹنہ کی یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی منفرد اور مفید کانفرنس تھی۔ اس قدر بڑے پیمانے پر کامیاب کانفرنس کے انعقاد پر ہم اہل پٹنہ اور خصوصاً جناب محمد حسین آزاد (سرپرست اعلیٰ) جناب رضا نقوی واہی اور جناب شفیع مشہدی کو مبارکباد دیتے ہیں۔ یوں تو اردو دالوں کے مختلف النوع اجتماعات کا آئے دن اہتمام ہوتا رہتا ہے، لیکن جس خلوص، لگن اور دلچسپی کے ساتھ بلند معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے پٹنہ میں جشن برپا کیا گیا، اس سے طنز و مزاح کے لئے فضا ساز گار کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ سالنامہ میں شریک جناب شفیع مشہدی اور حضرت واہی کے مضامین کے مطالعہ سے قارئین شگوفہ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ مذکورہ جشن کے انعقاد میں کس قدر جوش و خروش سے کام لیا گیا۔ جناب یوسف ناظم بھی اس کانفرنس پر ایک رپورتاژ لکھ رہے ہیں۔ طے تو یہ تھا کہ یہ رپورتاژ سالنامہ میں شریک ہو۔ جناب یوسف ناظم نے رپورتاژ کی پہلی قسط ہمیں ارسال بھی کر دی تھی۔ لیکن دوسری قسط کے انتظار میں یہ شمارہ ایک ہفتہ تک پریس نہ جا سکا۔ اب یہ رپورتاژ فروری کے شمارہ میں شائع ہو سکے گا۔

قارئین شگوفہ کو ہم بڑے فخر و مسرت کے ساتھ یہ اطلاع دیتے ہیں کہ شگوفہ کا ایک حسین و خوبصورت "مزاحیہ ڈرامہ نمبر" بہت جلد شائع ہوگا۔ اس خصوصی اشاعت کے مہمان مُدیر ممتاز ڈرامہ نگار جناب ساگر سرحدی (فلم اسکرین پلے رائٹر و مکالمہ نگار مشہور فلم "کبھی کبھی") ہوں گے۔ اس خصوص میں ابتدائی تیاریوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہماری کوشش ہو گی کہ یہ خصوصی نمبر اپنے موضوع پر ایک مکمل دستاویز ثابت ہو۔ یقین ہے کہ مزاحیہ ڈرامہ نمبر جناب ساگر سرحدی کے تعاون سے شگوفہ کا سب سے دلچسپ، ضخیم اور معیاری نمبر ثابت ہوگا۔ تھیٹر سے دلچسپی رکھنے والی ایک اور شخصیت حیدر پٹھان (بمبئی) بھی اس نمبر کے سلسلے میں خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس تعلق سے تفصیلات کا متعاقب اعلان ہوگا۔

نئے سال کے آتے آتے اردو کے دو اہم ادیب عبدالماجد دریا بادی اور رشید احمد صدیقی ہم سے جُدا ہو گئے۔ عبدالماجد دریا بادی نے نصف صدی سے زائد عرصہ تک علم و ادب کی شمع کو جلائے رکھا۔ اور بے تکان لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنے رسالہ "صدق" کے کالموں میں تنقید و تبصرہ کا ایک مخصوص رنگ اپنایا۔ اور اپنے اس خاص انداز میں سیاسی معاشرتی اور مذہبی معاملات میں طنز کے تیر چلایا کرتے تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی سلجھے ہوئے نقاد، صاحب طرز ادیب اور منفرد انشا پرداز تھے۔ انھوں نے ساری زندگی علی گڑھ کے عاشق کی حیثیت سے گزار دی۔ وہیں تعلیم حاصل کی، اُستاد بنے اور وظیفہ پر علیحدہ ہوئے بھی تو یہ سرزمین ان سے نہ چھوٹی۔ ان کی شخصیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خاص ماحول کی پروردہ تھی۔ جس پر انھیں ہمیشہ ناز رہا۔ اسی ماحول نے بقول ان کے، ان میں طنز و مزاح کے جراثیم پیدا کئے۔ شوخی، طراری، شرارت، ہنسی، دل لگی، کھیل اور دوسری زندگی کی دلچسپیوں سے وہ مادر جامعہ کے توسط سے آشنا ہوئے۔ حد تو یہ ہے کہ لکھنے کا ڈھنگ اور اسالیب بھی اس ماحول کی دین ہیں۔ رشید احمد صدیقی بلاشبہ اس صدی کے سب سے اہم مزاح نگار ہیں۔

انھوں نے طنز و مزاح کو ادب سے قریب تر کیا۔ طنز و مزاح پر اردو میں پہلی کتاب (طنزیات و مضحکات) بھی لکھی۔ اور طنز و مزاح کے خوب صورت نمونے بھی دنیائے ادب کو پیش کئے۔ اس عظیم ادیب کے سانحہ ارتحال پر ہم دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین)

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

جلد (۱۰)
شمارہ (۲)

فروری ۱۹۷۷ء

ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال ایم اے (عثمانیہ)

مجلسِ ادارت

منظور احمد ✤ حمایت اللہ ✤ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت

کرشن چندر — راجندر سنگھ بیدی — بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور — نریندر لوتھر — مجتبیٰ حسین

جنرل منیجر

ممتاز احمد

کتابت: ادارہ سلام خوشنویس نزد مسجد کمیلہ، یاقوت پورہ، حیدرآباد ۲۳

طباعت

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

بائنڈنگ

محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو دربارِ حسینی، پرانی حویلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

زرِ سالانہ لائبریریوں سے (۲۰) روپے
بیرونِ ہند سے (۲۰) شلنگ
سالانہ انفرادی (۱۵) روپے
فی پرچہ: ۱/۵۰ روپیہ

ٹائٹل طالب

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ } ماہنامہ شگوفہ۔ ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

اس
تھیلی
کے
چٹے بٹے

ماہنامہ
شگوفہ
کی
ایک اور یادگار خصوصی اشاعت
مزاحیہ
ڈرامہ نمبر

چند خصوصیات

مزاحیہ ڈراموں کا جائزہ

اُردو کے مزاحیہ نمائندہ ڈرامے

ہندوستانی زبانوں کے شاہکار

مزاحیہ ڈرامے (تراجم)

اور کئی دوسری دلچسپیاں

اِس مزاحیہ ڈرامہ کے مہمان مُدیر :

ساگر سرحدی
مشہور ڈرامہ نگار و فلم اسکرین پلے رائٹر و مکالمہ نویس

★ مزاحیہ ڈرامہ نمبر کے مضامین روانہ کرنے کا پتہ :

ساگر سرحدی
30/363
3 سائن ، بمبئی 400022

مزید تفصیلات کا متعاقب اعلان کیا جائے گا

احمد جمال پاشا

خدا بخش تھیٹر میں
جراحتِ ظرافت!

کُل ہند جشنِ ظرافت، پٹنہ کا آغاز خدا بخش لائبریری کے مطالعاتی ہال میں ایک سمینار سے ـــــ ہُوا تھا، جس کی صدارت پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر شرما نے کی۔ نظامت کے فرائض، خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر اور ممتاز عالم ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے انجام دیئے۔ وائس چانسلر کے بعد، بقیہ صدارت جناب نریندر لوتھر (حیدرآباد) نے فرمائی۔

کانفرنس کے اِس اہم اجلاس میں ہندوستان کے نظم و نثر کے چوٹی کے مزاح نگار، ملک کے ممتاز ناقد اور عظیم آباد کے ممتاز دانشوروں نے شرکت کی۔

یہ گرما گرم اجلاس، سب سے پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر شرما کی زعفران زار تقریر سے رنگِ محفل پر آیا۔ انھوں نے زندگی اور سماج میں طنز و مزاح کی اہمیت پر زور دیا اور اسے کسی سماج کی تہذیبی بلندی کے جانچنے کا بیرومیٹر قرار دیا۔ وہ شروع تو ایسے ہی سنجیدگی سے ہوئے تھے جیسے کہ ایک وائس چانسلر شروع ہوتا ہے۔ مگر بہت جلد عام فضا سے ہم آہنگ ہو گئے۔ اور اپنے لطائف کی پھلجھڑیوں سے سب کو لوٹ پوٹ کر دیا۔ وہ جگ بیتی سے آپ بیتی تک پہونچے اور اپنے کچھ دلچسپ تجربات کی آڑ میں انھوں نے اس فن اور اس کے آداب و رکھ رکھاؤ کے بارے میں بڑے معنی خیز اشارے کیئے۔ غرض وہ سنجیدہ آئے اور ہنستے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اِس ہنسی کو جناب نریندر لوتھر نے دوبالا کر دیا۔ وہ ایک کرکٹ کے اسٹار پلیر کی طرح صدارتی فیلڈنگ میں معروف تھے اور نہایت کامیابی سے ہر فاضل مقالہ نگار یا مقرر کو آؤٹ کر رہے تھے، اور وہ بھی بس ایک تبسم کے ساتھ۔

سب سے پہلے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر قمر رئیس نے "دورِ حاضر میں طنز و مزاح" کے عنوان سے ایک انتہائی پُر مغز مقالہ پیش کیا، جس میں انھوں نے طنز و مزاح پر مقالہ لکھنے کے مقبولِ عام فارمولے کے تحت پہلے تو طنز و مزاح کی تعریف کی تھی، پھر اس کے تاریخی ارتقا پر ایک ترچھی نظر ڈالی تھی۔ اُس کے بعد دَورِ حاضر کو کھنگال کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ دَورِ حاضر کے ڈانڈے جا بجا دورِ رفتہ سے مِل گئے تھے۔ راقم الحروف، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، وجاہت علی سندیلوی، سرور جمال، رضا نقوی واہی، سلیمان خطیب، برق آشیانوی، جوہر سیوانی اسرار جامعی، طالب خوندمیری اور دوسرے نظم و نثر کے ممتاز طنز و مزاح نگاروں کا ڈاکٹر موصوف نے بھرپور جائزہ

جا بجا لیا۔ اور ان فن کاروں کے شہ پاروں کے اقتباسات کی انھوں نے بطور دلیل و مثال پیش کر کے سامنے بیٹھے ہوئے مزاح نگاروں کے چہرے خوشی سے سرخ و سیاہ کر دیئے۔

بحث کا آغاز ڈاکٹر وہاب اشرفی سے ہوا، جنھوں نے فاضل مقالہ نگار پر پہلا پنجہ مارا کہ "انھوں نے بڑی مُرتّبیت کام لیا ہے۔" طنز و ظرافت پر بحث جدیدیت اور ترقی پسندی کے درمیان بار بار کباب میں ہڈی ہوئی جا رہی تھی۔ طنز و مزاح کے بارے میں اُن فرسودہ نظریوں کو پیش کیا جا رہا تھا اور ہر طرف سے انگریزی ادب کے حوالوں کی جنگ میں اُردو ظرافت کا نظر آنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن بحث میں گرمی نے محفل کی رونق دوبالا کر دی تھی۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی، صدر شعبۂ اُردو رانچی یونیورسٹی کا خیال تھا کہ "کرشن چندر نے "گولڈن ایس" کو "گدھے کی سرگزشت" کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔" ان کے اس الزام پر راقم الحروف نے لفظی آستینیں چڑھا لیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ہائیں ہائیں کر کے بہ دقت تمام اِس میچ کو ڈرا کروایا اور ایک کامیاب ایمپائر کی طرح انھوں نے روک تھام کر لی۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے، رشید احمد صدیقی، پطرس اور فرحت اللہ بیگ کے لئے "انشائیوں" کا لفظ استعمال کیا۔ راقم الحروف نے اُن سے تین یا شاید چار بار دریافت کیا کہ "جن لوگوں کے انھوں نے نام لئے ہیں، انھوں نے اپنے لئے خود 'مضامین' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آیا رشید صاحب کے "مضامین رشید"، مجتبیٰ حسین کی 'بہرحال'، راقم الحروف کے 'مضامینِ پاشا' اور وزیر آغا کے 'خیال پارے' یا ڈاکٹر سید محمد حسنین کی 'نشاطِ خاطر' میں آپ کوئی فرق کریں گے؟ انشائیہ اور مضمون میں کیا فرق ہے؛ ہم کسے مضمون کہیں گے؛ اور کسے انشائیہ؛ مگر ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے مصلحتاً یا مجبوراً اس بنیادی سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ یوسف ناظم، ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، جناب مصطفےٰ کمال مدیر 'شگوفہ' جناب وجاہت علی سندیلوی نے بہ حیثیتِ مجموعی ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کے پُر مغز مقالے کو بے حد سراہا، اور عام طور پر بحث کا یہ رُخ تھا کہ اس مقالہ پر جو بھی اعتراض کسی کونے سے ہوتا تو اُس پر چاروں طرف سے لے دے شروع ہو جاتی، چنانچہ کئی مقررین کو تو بھرے مجمع میں اپنے اعتراض واپس لینے پڑے۔ ایک آدھ تو الفاظ تک واپس لیتے دیکھے گئے۔

چند حضرات نے ڈاکٹر قمر رئیس کے مقالہ پر یہ اعتراض فرمایا کہ آپ نے رضا نقوی واہی کے اُن اشعار کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے، جنھیں وہ خود عاق کر چکے ہیں۔ اگر آپ 'واہیات'، 'طنز و تبسم'، 'نشتر و مرہم'، 'کلامِ نرم و نازک' یا 'نام بنام' سے مثالیں پیش کرتے تو آپ کی مثال اور رائے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا۔ چنانچہ جب وہ واہی صاحب کے کلام پر اپنے اظہار کر رہے تھے تو پورا ہال اُنھیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن شریف النفس و معصوم مقالہ نگار نے فوراً اعتراض کے آگے جبینِ نیاز ختم کر دی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اِس سمینار کا دوسرا مقالہ ڈاکٹر وہاب اشرفی صدر شعبۂ اُردو رانچی یونیورسٹی کا تھا۔ مقالہ بے حد محنت سے لکھا گیا تھا۔ مغربی ادب جا بجا چھلکا پڑتا تھا۔ مگر بیشتر حصّہ طنز و مزاح کی تعریف اور اس کو ادب کا ارفع حصّہ نہ ماننے کے اُن دلائل سے لبالب تھا جو عرصہ ہوا رَد کی جا چکی ہیں۔ مزاح اور مزاح نگاری پر ان کے حملے بالکل سامنے سے اور خاصے کاری تھے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی بحث کم ہوئی اور گرماگرمی زیادہ، جس کی وجہ سے دلچسپی اپنے عروج پر تھی۔ اکثر کئی مقررین ایک ساتھ بولنے کی کوشش کرتے۔ حالانکہ ڈاکٹر بیدار صاحب، ہر ایک کو بولنے کا برابر موقع دینے کی لالچ دے کر خاصی روک تھام کر رہے تھے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی، صاحبِ نظر اور وسیع المطالعہ ہیں۔ اگر وہ جدیدیت اور ترقی پسندی کی غیر دلچسپ بحث میں اپنا دامن نہ اُلجھا لیتے تو زیادہ "ہٹ" رہتے۔ گر وہ اس اعتبار سے بہت کامیاب تھے اداُن

کا مقالہ بھی کہ انھوں نے محفل میں بڑی جان ڈال دی تھی اور جب تک بحث میں حصّہ لینے والے گرمائے نہ ، مزا نہیں آتا۔ جناب مصطفےٰ کمال ایڈیٹر شگوفہ ، ایڈیٹر سے زیادہ عالم ہیں، اسی لئے ان کی تقریر لوگوں نے بڑے غور سے سُنی۔

چونکہ کھانے کا وقت ہو چکا تھا اور آنتیں قُل ھُواللہ پڑھ رہی تھیں، اس لئے تقریباً ڈیڑھ بجے دن کو کانفرنس کے پہلے اجلاس کے خاتمہ کا اعلان اس خوشخبری کے ساتھ ڈاکٹر بیدار نے کیا کہ" دوسرے دن دس بجے سمینار کا دوسرا اجلاس ہوگا ' جس میں بقیہ مقالات پیش کیئے جائیں گے اور تقاریر ہوں گی "۔

نریندر لوتھر جو مزاح نگار سے زیادہ کھلاڑی یا ہیرو معلوم ہوتے ہیں اور پہلی کیا ابتدائی تمام نظروں میں بڑے باقاعدہ اور محنتی آدمی معلوم ہوئے ۔ چنانچہ انھوں نے صدارت بھی بڑی محنت سے کی، اور صدارتی تقریر بھی۔ صدارت کے دَوران وہ جو کچھ نوٹ کرتے رہے تھے، اُس کے گرم مصالحہ سے بڑی مزے دار تقریر اُنھوں نے کردی ۔ سچ تو یہ ہے کہ سُننے والوں کو مزا آگیا ۔ باتوں میں لطیفے ٹانکنے کا اُنھیں بڑا سلیقہ ہے ۔ طنز و مزاح پر جو حملے ہوئے تھے ، باتوں ہی باتوں میں انھوں نے اس کا حساب بھی صاف کر دیا ۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے بارے میں اگر کہا جائے کہ وہ مادرزاد اناؤنسر ہیں تو بیجا نہ ہوگا ۔ نظامت کا انھیں ایسا سلیقہ ہے اور اس میں وہ اتنے منجھے ہوئے ہیں کہ مجمع کو جب جدھر چاہیں موڑ دیں ۔

ایک بات جس کا شاید کسی سنجیدہ نگار نے تک نے نوٹس نہیں لیا' وہ یہ کہ جب بھی بیدار صاحب کچھ کہتے تو ان کے مُنہ کھولتے ہی اِن کی بیگم صاحبہ کی باچھیں کھِل جاتیں ۔ چنانچہ ایک دفعہ انھوں نے مُنہ تو کھولا مگر کہا نسنے کیسے اور ان کی باچھیں کھِل اُٹھیں۔ ہم تو یہ دیکھ کر دل مسوس کر رہ گئے کہ ایک ہماری بیگم ہیں کہ ہم مُنہ کھولتے ہیں تو اُن کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں ۔ خیر صاحب اپنی اپنی قسمت !۔

اس سمینار کا دوسرا دَور، دوسرے دن ساڑھے دس بجے پھر خدا بخش ہال میں مجتبیٰ حسین کی صدارت میں ہُوا۔

ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی (بہار یونیورسٹی) نے طنز و مزاح کی تعریف پر ایک نہایت محنت سے لکھا ہوا مقالہ پیش کیا۔

ڈاکٹر لُطف الرحمٰن (بھاگل پور یونیورسٹی) نے "مصنوعی اور حقیقی ظرافت" کے عُنوان سے ایک اچھا مقالہ پیش کیا ۔ راقم الحروف ، وجاہت علی سندیلوی ، پروفیسر سید محمّد محسن صدر شعبۂ نفسیات' پٹنہ یونیورسٹی اور سُہیل عظیم آبادی نے تقریریں کیں اور مباحثہ میں حصّہ لیا ۔

ڈاکٹر لطف الرحمٰن کے اس اُردو مقالے میں اُردو کے چند جملے بھی تھے ، ورنہ صفحے کے صفحے انگریزی حوالوں سے چمک رہے تھے ۔ بڑی تلاش کے ساتھ انھوں نے اپنے موضوع پر مواد پیش کیا تھا ۔ اُن کی علمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ لیکن اگر حوالے اور مثالیں کم ہوتیں تو یہ ایک شاندار مقالہ ہوجاتا ۔ غرض کثرتِ جلوہ میں وہ گُم ہوگئے۔

اِس مقالہ پر سب سے گرما گرم بحث ہوئی ۔ جس کے بعد ڈاکٹر قمر رئیس صاحب' جن کے مقالے سے ، کل اس یادگار سمینار کا آغاز ہوا تھا ، انھوں نے اپنی جوابی تقریر کے ذریعہ اسے SUM-UP کر دیا ۔

دوسرے دن کی کارروائی میں قمر رئیس صاحب کی جوابی تقریر سے پہلے راقم الحروف نے فاضل مقررین پر گولہ باری کرتے ہوئے یہ اصولی نکتہ اُٹھایا تھا کہ "آخر ہر مقالہ طنز و مزاح پر طنز و مزاح کی تعریف سے

کیوں شروع کیا جاتا ہے؟ ہر بار تعریف آخر بدل کیسے جاتی ہے؟ جب ہم غزل یا افسانے پر قلم اُٹھاتے ہیں تو یہ نہیں بتاتے کہ غزل یا افسانہ کیا ہے؟ پھر طنز و مزاح پر یہ نظرِ مسلسل کیوں؟ ہمارے تمام ناقد غزل، افسانے، نظم یا ناول کے ہیں، طنز و مزاح کا کوئی ناقد نہیں۔ اسی لئے طنز و مزاح پر تنقید میں انصاف نہیں ہو پاتا۔" اِس کمی اور ضرورت کا عام طور پر اعتراف کیا گیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی جوابی تقریر میں طنز و مزاح کے مستقبل کے روشن امکانات پر بھرپور روشنی ڈالی۔

اس اجلاس کے صدر جناب مجتبیٰ حسین، بہت ہی شرماتے ہوئے صدارتی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور چُٹکیں اُڑا دیں — انھوں نے لوگوں کو خُوب ہنسایا، مگر ہنسی ہنسی ہی میں بڑی کام کی باتیں بھی کہہ گئے۔ خدا انھیں نظرِ بد سے بچائے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے اِس تاریخی سمینار کے آخر میں تمام شرکاء کا محض رسمی شکریہ اَدا نہیں کیا بلکہ طنز و مزاح کے فن اور مزاح نگاروں کے سلسلہ میں بڑی گہری باتیں کیں، پتے کی باتیں — ڈاکٹر بیدار یُوں بھی بات بے حد ناپ، اور تول کر کرتے ہیں اور قیمتی سے قیمتی معلومات فراہم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس موقع پر ایک طنز و مزاح کی نمائش کا بھی اہتمام کیا تھا جو دیکھنے کی چیز تھی۔ طنز و مزاح پر نادر و نایاب کُتب و رسائل کی نمائش۔ جس کے بعد ہم سب پھر کھانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ پیٹ بُرا بدکار بابا۔۔۔

اس تاریخی پٹنہ سمینار میں جہاں ہم ممتاز مزاح نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا اور اس فن کی رفتارد سمت کے اندازے لگائے گئے، وہاں اس فن پر تنقید کے تقاضوں پر بھی زیادہ کُھل کر بحث کی گئی۔

کُل ہند جشنِ ظرافت پٹنہ اجلاس، جس کے کرتا دھرتا، رُوحِ رَواں، بانی مُبانی بلکہ سب ہی کچھ، اُردو کے صاحبِ طرز بزرگ اور ممتاز ترین طنزیہ و مزاحیہ شاعر، شاعرگر، ظرافت پیما، استادِ فن، استادِ کامل، حضرت رضا نقوی واہی تھے، جن کی حیثیت 'بی جمالو' کی سی تھی، جو بھُس میں چنگاری ڈال کر الگ ہو جاتی تھیں' یعنی سارا دنگل، اکھاڑا تو انہی حضرت کا جمایا ہوا تھا۔ اور یہ تھے کہ ڈگن ڈالے چُپکے سے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ کئی دفعہ تو شُبہ بھی ہوا کہ بیٹھے بھی ہیں یا نہیں۔ ایک آدھ دفعہ کسی اور پر ان کا شُبہ ہو گیا۔ مگر آخر میں کوئی اور نکلا۔ چنانچہ آخر میں اِن سے بھی "کچھ" کی فرمائش کی گئی۔

پہلے دِن تو غیر طرحی معاملہ تھا، یہ اپنے کلام اور اس پر رائے' پر صرف بطور احتجاج چُپکے تھے۔ لیکن دوسرے دن، جب ان کا مکرّر گھیراؤ کیا گیا کہ "اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی"! تو جھٹ یہ مع اپنے گُل و ثمر کے سامنے آگئے۔ اس قدر خوش تھے کہ اصلی دندانِ مبارک تک نظر آرہے تھے!۔

شاید ہی پھر اِن کے شکریہ سے کوئی بچا ہو۔ معزز مہمان، مقرر، صدر، صاحبِ نظامت، جناب شفیع مشہدی' راہ چلتے بلکہ بہت سوں کا تو غائبانہ تک شکریہ ادا کر گئے۔ ایکدم سے کچھ نقاہت طاری ہوئی، یاد آگیا اور بولے: "چلئے آپ لوگ" ہم لوگوں" کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"۔ اور سب بڑی سعادت مندی سے چل دیئے۔

ہر ایک کی زبان پر اِس شاندار سمینار کی تعریفیں تھیں۔

لوگ چونکہ بحث زدہ تھے، اس لئے ٹکڑیوں میں نکل رہے تھے۔

اتنے میں ایک اور موٹر شفیع جاوید کی رُکی۔ سرور جمال بیٹھیں، پھر میں اور — چل دیئے کھانا کھانے! ▲

یوسف ناظم

کُل ہند جَشنِ ظرافتؔ

دسمبر
صبح صبح جب
پٹنہ پہنچا تو ابھی اندھیرا
تھا۔ (اس کا یہ مطلب نہیں کہ
ں پہنچتے ہی آنکھوں تلے اندھیرا
گیا) شفیع مشہدی مع ایک عدد نوجوان
اس سردی اور دھندلکے میں اسٹیشن پر موجود
تھے۔ (خود کردہ را علاج نیست) ہم دونوں نے یک لخت
اپنی باہیں اور باچھیں کھول دیں۔ شفیع مشہدی سے منسلک نوجوان
نام عبدالرزاق بتایا گیا۔ ان کے چہرے پر جوانمردی اور مستعدی کی
علامتیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ یقیناً عبدالرزاق لاری کے وطن کے اطراف
و اکناف کے رہنے والے ہوں گے۔ معلوم ہوا دکن کے رہنے والے ہیں۔ (کافی مایوسی
ہوئی) انھیں یہ ہدایت دی گئی تھی کہ اگر وہ اسٹیشن پر تنہا پہنچیں تو جو شخص بھی سب سے زیادہ
وحشت زدہ نظر آئے اسے پکڑ لائیں لیکن معاملہ برعکس تھا۔ خود اُن کے چہرے پر وحشت برس رہی
تھی۔ وہی وحشت جو میزبانوں کے چہروں پر اور ان کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے۔ معلوم ہوا یہ دونوں کئی اور
لوگوں کے ساتھ مل کر کئی دن سے "جشن ظرافت" کی تمہید اور اس کے دیباچے میں شب و روز مشغول تھے۔ جشن ظرافت
منعقد کرنے کا مضمون شفیع مشہدی کے دماغ میں غیب سے نہیں بلکہ اس عیب کی بدولت آیا تھا جو مزاح نگاروں
سے دوستی رکھنے کی وجہ سے' لاحق ہو جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے (جو مزاحیہ ادبی فسادات کی جڑ ہیں) شفیع مشہدی کے

ں اس وقت بھر دیئے تھے۔ جب شفیع مشہدی دہلی سے پٹنہ منتقل ہو رہے تھے۔ اچھے حافظے کی خرابی یہ ہے کہ ناقص سے ناقص
لطیفے بھی اس میں اس وقت موجود رہتے ہیں جب تک کہ ایفادہ نہ ہو جائیں۔ پٹنہ میں ہر سال طغیانی آتی ہے اس سال طغیانی
ں آئی تو جشنِ ظرافت برپا ہو گیا۔

پٹنہ میں یوں تو شرفاء کی کمی نہیں لیکن مشہرفاء کی اس فہرست میں، محمد حسین آزاد کا نام ذرا اوپر آتا ہے۔ محمد حسین آزاد حکومت
ر کے وزیر زراعت ہیں۔ زراعت کا پورٹ فولیو تو سرکاری طور پر اُن کے پاس ہے لیکن ظرافت کا قلمدان انھوں نے اپنی مرضی
سے سنبھال لیا۔ رضا نقوی واہی اور شفیع مشہدی کے ورغلانے پر جب انھوں نے 'جشنِ ظرافت' کی سرپرستی قبول کر لی تو لوگ آتے
گئے اور کارواں بنتا گیا۔ ویسے بھی محمد حسین آزاد جس کا بھی نام ہوگا، وہ قدرتی طور پر ادب کی طرف توجہ کرے گا۔ (یہ نام ہی کچھ ایسا
ہے)۔

معلوم ہوا میزبانوں نے مہمانوں کے قیام کے لئے ہوٹل سراج کا انتخاب کیا ہے۔ ہوٹل کا کاہد یا کرنے والے، دن میں کچھ
یں یا نہ کریں، رات جگا ضرور کرتے ہیں۔ رات بھر جگے رہنے کے بعد اتنے سویرے اٹھ جانا ان لوگوں میں منع ہے۔ ہم لوگ
ٹل پہنچے تو وہاں سناٹا پڑا تھا۔ شری عبدالرزاق نے کدوکاوش کی تو کسی طرف سے نیند میں ڈوبی ہوئی دو مونچھیں نمودار ہوئیں۔
نگران کار کی مونچھیں تھیں جن کے ہلنے میں آہستہ ہی ہوٹل کے در و دیوار چونک پڑے لیکن ہوٹل نے جنبش نہ کی۔ انتظامات
نے شدید تھے کہ ہر کمرے کے مہمان مقرر ہو چکے تھے، مہمانوں کے نام، پتے ان کے آنے کے اوقات (غالباً ان کی اوقات بھی)
کے سفر کا طریق کار اور ان کا حلیہ بھی کچھ فہرست میں درج تھا۔ (اس فہرست کا نمونہ یقیناً کسی پولس تھانے سے لیا گیا ہوگا) ہوٹل
دو منزلوں یعنی ۱۴، ۱۵ کمروں کا انتساب اہلِ ظرافت کے نام کیا جا چکا تھا۔ میں نے پانچویں منزل پر اس کمرے میں پناہ لی جس کا رخ
نگا کی طرف تھا۔ کھڑکی کھولتے ہی گنگا دکھائی دی۔ پہلے پہل تو مجھے شبہ ہوا کہ الٹی بہہ رہی ہے لیکن غور کیا تو معلوم ہوا میں ہی الٹی
ف کھڑا ہوا تھا ـــــ میزبان منتظمین نے بتایا کہ مجھے مکمل آزادی ہے کہ میں جو اور جتنا چاہوں کھاؤں۔ (اس اعلان کے بعد
مجھے یقین ہو گیا کہ میں اپنے گھر میں نہیں ہوں) ـــــ اس وقت تک اخبار نہیں پہنچا تھا۔ میں مہمانوں کی فہرست مع تفصیلات سے
ں بہلاتا رہا (کافی دلچسپ فہرست تھی)۔

۹ بجے کے قریب میں آوارہ گردی میں مصروف ہو گیا۔ ۱۰ بجے تو کچھ تھا ہی نہیں۔ مجھے چونکہ بے چینی تھی اس لئے میں بہت
پہلے پہنچ گیا تھا۔ سامنے ہی مہندرو گھاٹ تھا (اس گھاٹ پر اطراف و اکناف سے کشتیاں آتی ہیں (ظاہر ہے جاتی بھی یہیں سے
ں گی) گنگا کو بہت قریب سے دیکھا۔ پاٹ اتنا منتشر تھا کہ مختصر بحر میں کہا ہوا مصرعہ دکھائی دیا۔ معلوم ہوا گنگا کو دیکھنا ہو تو بارش
ں دیکھنا چاہیے (منتظمینِ جلسہ کو پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا) مجھے اطلاع ملی تھی کہ احمد جمال پاشا، سیوان کی طرف سے اسی گھاٹ
پہنچیں گے (پتہ نہیں احمد جمال پاشا، ابھی اور کتنے گھاٹ دیکھیں گے) اُن کے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میں کھسک آیا۔ سوچا
ن روڈ سے سفر کروں لیکن گلیوں کی بے تکلفی کا نظارہ رہ جاتا۔ گلیوں سے ہوتا ہوا، یونیورسٹی روڈ (وہاں بھی ہے ایک سڑک
ے چاہے نام دے دیجئے) پر جس کہ بازار کی سیر کی، اور پوچھتا پچھاتا، خدا بخش لائبریری پہنچا (پٹنہ میں اگر آپ کسی سے راستہ پوچھیں
راستہ بتانے والا شخص اس وقت راستہ بتاتا رہے گا جب تک کہ اسے یقین نہ ہو جائے کہ آپ راستے پر آ گئے ہیں)

سڑک پر عمارتوں کی اونچائی کے برابر کی ایک چیز چلتی پھرتی دیکھی پوچھا تو معلوم ہوا، رکشا ہے۔ رکشا حیدرآباد میں بھی چلتی ہے
یہ بھوپال میں۔ ان دونوں جگہوں کی رکشا میں بیٹھیے تو احساس کمتری نہیں بلکہ احساس پستی ہوتا ہے۔ پٹنہ کی رکشا میں بیٹھا ہوا آدمی
اتنی بلندی پر بیٹھا نظر آتا ہے جیسے کوئی نقار ہو مجھے یہ رکشا بہت پسند آئی۔ جس شخص نے بھی اس کا ڈیزائن بنایا بہت بلند نظر شخص تھا

مجنس لائبریری بند تھی (ڈاکٹر رضا بیدار نے پہلے ہی خطرہ محسوس کرلیا تھا) ان سے ملاقات ہوئی۔ چھٹی تھی لیکن وہ گھر میں آفس ٹیبل پر بیٹھے کام کررہے (میں یہ تو نہیں سوچ سکتا کہ وہ مجھے دکھانے کے لئے آفس ٹیبل پر بیٹھے کام کررہے تھے' ایسی گھٹیا بات سوچ بھی نہیں سکتا) ڈاکٹر رضا بیدار اس لائبریری کے ڈائرکٹر ہیں اور بڑے بڑے سمینار کرنے کے ماہر۔ ظرافت کے سمینار کے کنوینر بھی وہی تھے۔ ایک آدھ گھنٹہ لطف سے گزرا۔

پٹنہ یونیورسٹی کا نام میں نے اس وقت سنا تھا جب میں اورنگ آباد کالج میں ایف۔ اے کا طالب علم تھا۔ غلام طیب صاحب دو کے لکچرار تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ ان کے ایم۔ اے کے جوابی پرچے پٹنہ یونیورسٹی میں (دوسروں کی عبرت کے لئے) محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ یہ وہی غلام طیب صاحب تھے جن کی نظم 'یادِ نشاط' سارے ہندوستان میں مشہور ہوئی تھی۔ مجھے مبالغے کی عادت ہے لیکن طیب صاحب کے بارے میں میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ غالب کا کلام پڑھانے میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ انہیں کی یاد نے پٹنہ یونیورسٹی دیکھنے پر آمادہ کیا۔ پسند آئی۔ دربھنگہ ہاؤز گنگا سے بالکل لگا ہوا ہے' یونیورسٹی کے کیمپس دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ غالباً انجینئرنگ کالج میں کرکٹ میدان ہے، پٹنہ یونیورسٹی اور رانچی یونیورسٹی کا میچ ہو رہا تھا۔ وہیں لیسبد مینجمنٹ کورسس کے پرنسپال سنگھ صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ (میں نے اپنے لیبر ڈپارٹمنٹ میں ہونے کا رُعب گانٹھا)۔ کچھ نمک پھلی کھائی۔ مونگ پھلی بستی میں بھی کھائی جاتی ہے بلکہ بمبئی میں روزانہ مونگ پھلی کی دو پُڑیاں کھانا ضروری ہیں لیکن پٹنہ میں بڑے سلیقے سے کھائی جاتی ہے۔ ہر پُڑیا کے ساتھ ایک چھوٹی سی پُڑیا میں نمک (جس پر لیمو چھڑک دیا جاتا ہے) بھی مفت اہم کیا جاتا ہے۔ غالب کبھی عظیم آباد نہیں گئے تھے پھر نمک والی ردیف کی غزل معلوم نہیں انھوں نے کیسے کہہ دی۔

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

(یہ مقطع تو مجھے پاس ہے یاد رہ گیا کہ اردو کے اُستاد فرماتے تھے کہ یہ شعر ذوق کا ہے لیکن میں نے یہ کہہ کر کہ شعر وجد کا ہے، ادم کی تصحیح کردی)۔

بمبئی اور پٹنہ کے لوگوں کے غذائی ذوق کا ذہن میں تقابلی مطالعہ کیا تو ناگاہ اس نتیجے پر پہنچا کہ دونوں مقامات پر مخلوق خداوندی فرکے کھانے کے علاوہ' زیر سما' فواکہات نوش کرنے کی کافی شوقین ہے۔ لیکن اس آؤٹ ڈور خورد و نوش کے معاملے میں پٹنہ کے لوگ' ان بلا کھانے کی بجائے' وٹامن کھانے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ بمبئی میں بھیل پوری' بٹاٹا وڑا، پانی پوری اور اس قسم کی دوسری مرغوب اور مفرح شکم اشیاء مقبول ہیں بلکہ سماجی طور پر آدمی مجبور ہے کہ یہ چیزیں روزانہ بکثرت کھایا کرے لیکن پٹنہ میں سنگھاڑے مرد، مرمرے، پوچے، رتالو، گیک اور گنڈیریاں مستعمل ہیں۔ بیمیٹے کی مٹھائی اور آملے کا مربہ بھی جگہ جگہ باموفورانہ ہوا سنگھاڑوں کی کیفیت البتہ یہ دکھائی دی کہ عورتیں انھیں چھیل کر بیچتی ہیں۔ بغیر چھیلے ہوئے سنگھاڑے بھی بکتے ہیں یا کیونکہ یہ اتنے پاک۔۔ و صاف نہیں ہوتے جتنے چھیلے ہوئے سنگھاڑے ہوتے ہیں۔ (وہاں بندوبست ہی کچھ ایسا ہے، لوگ علی الاعلان گڑ کھاتے ہوئے بھی پائے گئے۔ جو زبان گڑ کا ذائقہ چکھ لے وہ گڑ ہی کی ہو کر رہ جاتی ہے ــــ اتنی دیر میں میں وہاں کے مقامی لہجے اور زبان سے واقف ہو گیا۔ گفتگو میں جب 'نا' نہیں آوتا تو سمجھنا چاہیئے کہ جملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ 'نا' دوسرے کے لئے بات شروع کرنے کا سگنل ہے!

ہوٹل واپس پہنچا تو خبر ملی کہ رضا نقوی واہی آئے تھے اور میں نہیں ملا تو خوش ہو کر واپس چلے گئے۔ ڈاکٹر لطف الرحمن البتہ موجود تھے جو پی ایچ ڈی ہیں اور بھاگل پور کے ٹی این بی کالج میں اردو کے لکچرر ہیں۔ ٹی این بی کالج کا نام مجھے پسند نہیں آیا۔ واش این ڈیری کی ترکیب معلوم ہوئی، ڈاکٹر لطف الرحمن بکثرت سنس مکھ آدمی ہیں اور اس میں ان کا کوئی قصور نہیں،

قدرت کو یہی منظور تھا) رضا نقوی واہی کے بڑے صاحبزادے بھی ملے۔ خیال ہوا فزیکل انسٹرکٹر ہوں گے لیکن محکمہ صنعت و حرفت کے حلقہ بگوش نکلے۔ بہرحال ان سے مل کر جشن ظرافت کے انتظامات کے استحکام اور مضبوطی کے بارے میں اطمینان ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد خود رضا نقوی واہی آ گئے۔ ان سے مل کر بے حد افسوس ہوا۔ ان سے تو کوئی ۲۵ سال پہلے ملاقات ہو جانی چاہیئے تھی۔ یہ تو بڑے نیک اور پارسا آدمی نکلے (ممکن ہے عمر کا تقاضا ہو) میں جہاں بھی ان میں ظرافت ڈھونڈتا، شرافت نمودار ہو جاتی۔ بہرحال ان میں جگہ جگہ شرافت دیکھ کر اپنی کوتاہیوں کی گنتی کرتا رہا۔ باتیں ہوئیں۔ اور بکثرت باتیں ہوئیں۔ کہنے لگے صحت بہت خراب رہتی تھی اور وہ گھر سے باہر نکل نہیں سکتے تھے لیکن جشنِ ظرافت نے انھیں چاق و چوبند کر دیا (اچھا ہوا) کہ ظرافت ادب میں دوسرے درجے کی چیز ہے لیکن اِسے پہلے درجے کا رتبہ دے دیا گیا ہوتا تو رضا نقوی صحت مند ہی نہیں بے جوان بے کسان ہو جاتے)۔

سہ پہر میں دلی سے مجتبیٰ اور ڈاکٹر قمر رئیس آئے۔ مجتبیٰ کے پہنچ جانے پر منتظمین جلسہ اطمینان کی سانس لینے پر آمادہ نظر آئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کو دوسرے دن سمینار میں ظرافت پر مقالہ پڑھنا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کیوں ان کے چہرے پر بادلِ ناخواستہ کے بادل نظر آئے۔ (بدگمانی میں مجھے لطف آتا ہے) یا ممکن ہے بینائی کا قصور ہوا۔ مجتبیٰ کے پہنچ جانے کے بعد خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی اور ہر طرف سے مہمانوں کی یلغار شروع ہو گئی۔

شام میں ہم لوگ ایرپورٹ پہنچے۔ (ایرپورٹ کی عمارت دیکھ کر اپنا ہائی اسکول یاد آگیا) وجہ وہاں جانے کی یہ تھی کہ دہلی سے محمد علی صاحب آرہے تھے۔ محمد علی کرناٹک کے وزیر ٹرانسپورٹ ہیں۔ جشن ظرافت کا افتتاح اور مزاحیہ مشاعرے کی صدارت انھیں کے ذمہ تھی۔ محمد علی جامعہ عثمانیہ کے ایل ایل بی ہیں۔ آج سے ۲۵ سال پہلے یہ ہاکی کھیلتے اور قانون پڑھتے تھے۔ (ہاکی میں قدرے بہتر تھے) اے ہاسٹل میں میرے ساتھ تھے۔ اے ہاسٹل سے کالج کا فاصلہ "تدمے" تھا اور ان کا یہی قدم مشکل سے اٹھتا تھا۔ جب یہ قانون کا امتحان دے کر گلبرگہ واپس ہوئے تو مجھ سے کہہ گئے تھے کہ اخبار میں نتیجہ دیکھنا تو فہرست اوپر سے پڑھنے کی بجائے نیچے کی طرف سے پڑھنا شروع کرنا اور اگر وہاں دو چار ناموں میں نام نظر نہ آئے تو اخبار رکھ دینا۔ میں نے یہی کیا اور نیچے سے پہلا ہی نام ان کا نظر آیا۔ جشنِ ظرافت کے افتتاح کے لئے اس سے بہتر انتخاب مشکل تھا ـــــ کچھ دن پہلے پلین بھی ٹرینوں کی طرح لیٹ چلنے لگے تھے کیوں کہ اتنے کم کرایہ میں وقت کی پابندی ضروری نہیں ہوتی لیکن اب معلوم نہیں کیوں یہ پھر وقت پر آنے جانے لگے ہیں۔ اسی پلین سے میوزک ڈائرکٹر نوشاد بھی اترے معلوم ہوا کسی فنکشن میں گیا جا رہے ہیں۔ تعارف مصافحے معانقے، مسکراہٹیں، قہقہے، کانفرنس کی کامیابی کا شبہ یقین میں بدلنے لگا۔ نریندر لوتھر پہلے ہی آ گئے تھے۔ صرف احمد جمال پاشا دیر کر رہے تھے۔ یہ تنہا تھے جنھیں پانی کے راستے آنا تھا۔ شام ہوتے ہوتے یہ بھی پہنچ گئے۔ سرور جمال اور احمد جمال سے جب بھی ملتا ہوں احمد جمال زیادہ بنے سنورے دکھائی پڑتے ہیں۔ مغرب کے قریب قریب مصطفےٰ کمال بھی آ گئے۔ حیدرآباد کا پورا گروپ ساتھ تھا۔ فضا ہی بدل گئی۔ شبہ ہوا کہ میں غلطی سے حیدرآباد تو نہیں پہنچ گیا ہوں۔ سلیمان خطیب، حسب معمول خستہ اور شکستہ حالت میں پائے گئے۔ فرمایا تین دن سے سفر کر رہا ہوں۔ میں نے کہا، ٹرین سے آجاتے تو بہتر تھا۔ خفا ہو گئے، بولے کیا میں پیدل چلا آ رہا ہوں۔ یہ کہہ کر سر اور گلے کے اطراف مفلر لپیٹ لیا اور برف باری کا انتظار کرنے لگے۔ طالب خوندمیری نے کچھ دلاسا دیا اور کہا کہ پٹنہ میں برف باری نہیں ہوا کرتی تو بولے کھانا کھاؤں گا۔

تزاج ہوٹل کا ڈائننگ ہال کافی کشادہ ہے البتہ روشنی صرف کمروں میں ہوتی ہے۔ (گرینڈ ان ہوٹلوں میں کھانا البتہ دیکھ کر کھانا پڑتا ہے موم شمع البتہ جلائی جا سکتی ہے تاکہ روٹی اور چاول کا فرق معلوم ہو سکے) جشن ظرافت کی وجہ سے بلب کچھ

اور مدھم کر دیئے تھے۔ فرمائش کی گئی تو پانچ واٹ کے بلب جلائے گئے۔ سب نے جلدی جلدی ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ لیا اور خوش ہوئے کہ اس وقت کسی کو پہچاننا مشکل ہے۔ (کھانا کھاتے وقت اتنی سہولت تو ہونی ہی چاہیئے)

ڈاکٹر قمر رئیس اور مجتبیٰ حسین کو ایک کمرے میں ٹھیرنا تھا لیکن مجھے چونکہ ڈاکٹر قمر رئیس کی غیبت کرنی تھی اور اس کے لئے مجتبیٰ سے بہتر اور کوئی رفیق کار نہ ہو سکتا تھا اس لئے مجتبیٰ میرے کمرے میں آ گئے۔ ہم دونوں رات کے دو بجے تک ڈاکٹر قمر رئیس کو تکتا دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ بلکہ قیاس کہتا ہے کہ ہمارے سو جانے کے بعد بھی ان کے کمرے کی روشنی جلتی رہی۔ (سیمنار میں مقالہ پڑھنے کا وعدہ کرنے کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے)۔

۱۱ر دسمبر ۷۶ء کو صبح ساڑھے دس بجے، جشن ظرافت کا آغاز ہو گیا۔ خدا بخش لائبریری میں سیمنار کا انتظام تھا لیکن غالباً منتظمین جلسہ نے اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کے آ جانے کی توقع نہیں کی تھی۔ مجھے تو ہال میں میز بھی بڑے نظر آئے۔ یہ میز نہ ہوتے تو شاید سیمنار کا لطف زیادہ آتا۔ مائکروفون بھی کچھ بغاوت پہ آمادہ تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی این شرما نے صدارت کی لیکن مختصر۔ انھیں کسی اور جگہ بھی جانا تھا۔ تقریر انھوں نے بڑی عمدہ کی اور اپنی آگاہی کا ثبوت دیا۔ تقریر کے بعد انھوں نے معذرت چاہی اور سیمنار کے کنوینر، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے نریندر لوتھر سے بقیہ صدارت کی فرمائش کی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر قمر رئیس چہرے مہرے سے نقاد نظر نہیں آتے۔ ان کے چہرے پر کرختگی کا نام و نشان نہیں۔ نقاد کو صوری طور پر بھی نقاد ہی دکھائی دینا چاہیئے۔ ان کا مقالہ لوگوں نے بڑی توجہ سے سُنا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے آنکھیں اور کان کھول کر سُنا۔ سامعین میں مہمانوں کے علاوہ عظیم آباد کے سبھی بزرگ، متوسط اور نئے ادیب، شاعر، علم دوست اور ادب نواز لوگ موجود تھے۔ بہار میں چھ یونیورسیٹیاں ہیں متھلا یونیورسٹی نئی ہے۔ وہاں سے تو کوئی نہیں آیا لیکن دوسری یونیورسیٹیوں اور کالجوں کے اردو کے پروفیسر بھی موجود تھے۔ صحافت کی بھی پوری پوری نمائندگی تھی (ان میں سے میں صرف غبار بھٹی کو جانتا تھا) بہار یونیورسٹی کے تو کئی ریٹائرڈ اساتذہ بھی شریک محفل تھے۔ اچھا خاصہ مجمع تھا۔ مقالے کے لئے نہایت موزوں محفل۔ میرا خیال تھا ڈاکٹر قمر رئیس بڑا ہنگامہ خیز مقالہ پڑھیں گے لیکن وہ رعایت کر گئے۔ اصل میں مقالے کا کینوس بہت بڑا تھا۔ اور وقت کم۔ بحث بھی اس لئے کم ہوئی۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی کی گفتگو البتہ گرم گرم تھی (ڈاکٹر وہاب اشرفی ایک مرتبہ بمبئی بھی آئے تھے اور مرحوم تصدیق بھائی نے ملاقات کا انتظام بھی کیا تھا لیکن ملاقات ہو نہیں سکی تھی۔ اب تلافی ہو گئی) مصطفیٰ کمال، احمد جمال پاشا، شجاعت سندیلوی، سرور جمال اور شاید میں نے بھی بحث میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے مقالے سے پہلے شفیع مشہدی نے اپنا مقالہ "اردو میں طنز و مزاح" پڑھا۔ یہ مقالہ غالباً انہوں نے بھوپال کی طنز و مزاح کانفرنس کے موقع پر لکھا تھا۔ (نظر ثانی کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے، انھوں نے میرے بارے میں مبالغے کو اور گاڑھا کر دیا ہے) مجموعی طور پر دونوں مقالے پسند کئے گئے۔ لوگوں میں جوش و خروش زیادہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ طنز و مزاح کے بارے میں مزید بلکہ شدید بحث ہو۔ ڈاکٹر رضا بیدار نے اس لئے اعلان کیا کہ بحث کل بھی جاری رہے گی۔ صدر محفل، نریندر لوتھر نے بڑی جامع اور دلچسپ تقریر کی۔ ان کی تقریر کے بعد کافی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ سیمنار کے بیچ میں چائے اور فواکہات مائیکروفون کی خرابی کے لطف کو دوبالا کر دیا۔ جلسے کے بعد مہمانوں کو ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے اور عید ملنے کا زرین موقعہ ملا جس سے سب نے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا۔ (کہیں کہیں تہذیب مانع رہی)

شام میں ۶ بجے، جشن ظرافت، یعنی اصلی جشن ظرافت شہر کے سب سے خوبصورت ہال بھارتیہ نرتیا کلا مندر میں برپا ہوا۔ اس ہال میں کئی خوبیاں ہیں۔ سنا گیا کہ یہاں جلسہ کرنے کے نہایت سخت قاعدے ہیں مثلاً یہ کہ ہال کے باہر لاؤڈ اسپیکر نہیں لگائے جا سکتے۔ کلا مندر کے کمپاؤنڈ میں نشستوں کا انتظام نہیں کیا جا سکتا۔ ہال کے اندر کیا ہو رہا ہے اس کی اطلاع

ہال کے باہر نہیں جا سکتی۔ رات میں جلسہ ہوا تو پرندے پر نہیں مار سکتے۔ دن میں ہو تو ہوا زور سے چل نہیں سکتی یا سورج زیادہ چمک نہیں سکتا وغیرہ وغیرہ۔ ہال کی تنگی کی شکایت، سارے شہر میں سُنی گئی لیکن منتظمین جلسہ بے بس تھے۔ سرما میں ہال میں جلسہ کیا جائے تو سردی سے لوگ بے حال ہو جائیں۔

کلا مندر کے اسٹیج کو بہت زیادہ خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ پس منظر میں ظریفانِ اُردو کے حلیوں (کارٹونوں) پر مشتمل ایک طویل و عریض پینٹنگ تھی۔ محمد علی نے اسی تصویر کی نقاب کشائی سے جشنِ ظرافت کا افتتاح کیا۔ تقریر بھی کی۔ تقریر میں دلچسپ باتوں کے علاوہ کچھ کام کی باتیں بھی کہیں۔ (جن کی ضرورت نہیں تھی)۔ لوگ اس سنجیدہ اور نیم مزاحیہ تقریر کی سے اتنے متاثر ہوئے کہ نثری اجلاس میں حصہ لینے والوں کو اپنے مضامین پر داد ملنے کا یقین ہو گیا۔ جناب محمد حسین آزاد نے صدارتی خطبہ پڑھا۔ ان تقریروں سے پہلے معتمد جشنِ ظرافت؛ شبیر حسین وناک نے استقبالیہ تقریر کی۔

نثری اجلاس میں مہمان ادیبوں میں نریندر لوتھر، وجاہت سندیلوی، سرور جمال، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم نے مضامین پڑھے۔ میزبان ادیبوں میں سے ایک بزرگ ادیب ماہ نیر خاں کا مضمون احمد جمال پاشا نے پڑھ کر سنایا۔ (اصل ادیب شانہ بہ شانہ کھڑے رہے)۔ ان کے علاوہ نعمان ہاشمی نے بھی مضمون پڑھا۔

سامعین نے دل کھول کر داد دی (یہ محاورہ غلط ہے انھوں نے اصل میں ہاتھ کھول کر داد دی) مجتبیٰ حسین کے مضمون پر تو بے تحاشہ تالیاں بجائی گئیں ان سے دو مضمون سُنے گئے۔ نریندر لوتھر کا "کوڈاں" بھی بہت پسند کیا گیا۔

پٹنہ میں نثری مضامین پڑھنے اور سُننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ کارپردازانِ جشنِ ظرافت سہمے سہمے سے تھے کہ پتہ نہیں تجربہ کیسا رہے۔ لیکن سامعین نے جس خوش دلی، خوش مزاجی اور خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا اس سے کارپردازانِ جشنِ ظرافت کو اپنی بدگمانی پر افسوس ہوا ہوگا۔ نثری اجلاس کے اناؤنسر تھے مصطفےٰ کمال۔ انھیں جلسے منعقد کرنے، مشاعرے برپا کرنے اور ادیبوں و شاعروں کو معقول بنانے کا گُر آتا ہے۔ (ان کے کنڈکٹ کے بارے میں اظہارِ خیال کا یہ موقع نہیں) نثری اجلاس کافی طویل اجلاس تھا لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ لوگ ایک جام اور' کے موڈ میں ہیں ــــــ مہمان تو خیر خوش تھے ہی لیکن رضا نقوی واہی اور شفیع مشہدی کے تو چہرے اُن گلابوں کی طرح کِھلے ہوئے تھے جو چنڈی گڑھ کے ذاکر باغ میں نظر آتے ہیں۔ جشنِ ظرافت کے سرپرست۔ محمد حسین آزاد بھی بے حد خوش پائے گئے۔ انھوں نے سب سے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ میں تو پانچ منٹ تک اپنا ہاتھ سہلاتا رہا۔

رات میں ہوٹل ری پبلک میں انجمن نجمی کی طرف سے ڈنر تھا۔ یہ ری پبلک ہوٹل پبلک کے لئے نہیں ہے لیکن ہم تو معزز مہمان تھے۔ ہوٹل کے بینکوئٹ ہال میں رونق ہی رونق تھی۔ داؤدی بوہرہ جماعت کے سر برآوردہ حضرات موجود تھے جو پتہ نہیں کیوں اتنے خوش تھے۔ ہم لوگوں میں تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔ کھانا نہ صرف لذیذ تھا بلکہ بکثرت تھا۔

محمد علی کلے بھی وہاں موجود ہوتے تو ہمارے ساتھ شریکِ طعام ہو سکتے تھے۔ میٹھا تو اتنا عمدہ تھا کہ کھانا کھانے کا افسوس ہوا کیا اچھا ہوتا کہ ایسی دعوتوں میں بھی اناؤنسر ہوا کریں جو پہلے ہی سے کھانوں کی نوعیت کے بارے میں مطلع کر دیا کریں۔ اس دعوت نے جشنِ ظرافت کو جشنِ ضیافت میں بدل دیا۔ اول طعام بعد کلام کے دیرینہ اصول کا بھی پاس رکھا گیا۔ ایک پر پہلے تو انجمن نجمی کے سربراہ ــــ نے محمد علی اور محمد حسین آزاد صاحبان کا خیر مقدم کیا بلکہ صرف ایک ہی جملہ کہا جس پر مجھے عرض کرنا پڑا کہ اس سے مختصر تقریر ممکن نہیں ہو سکتی۔ مائیکروفون کافی دیر خاموش رہا اور کہیں سے اچانک شفیع مشہدی اس پر نمودار ہوئے انھوں نے تو کھانے سے بھی زیادہ پُرتکلف تقریر کی۔ اور مہمانوں کو کافی شرمندہ کیا۔

مہمان ادیبوں اور شاعروں کی آمد کا انھوں نے کچھ اس طرح ذکر کیا جیسے یہ لوگ اس سے پہلے کہیں گئے ہی نہیں تھے اور پہلی مرتبہ گھر سے پٹنہ کے لئے نکلے تھے اس تقریر کا کچھ نہ کچھ جواب کسی نہ کسی کو دینا ہی تھا۔ میں نے خود ساختہ نمایندے کی حیثیت اختیار کر لی۔ (جب بھی مائیکروفون خالی ہو ایسا ہی کرنا چاہیئے)۔ اس کے بعد لطیفہ گوئی کی محفل جمی۔ نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین، شفیع مشہدی، پرگس حیدرآبادی، طالب خوندمیری اور شاید میں نے بھی ایک دو لطیفے سنائے۔ جب اندازہ ہو گیا کہ اس سے زیادہ ہنسی مضر ثابت ہوگی۔ محفل برخاست ہو گئی۔ کچھ تقریریں بھی ہوئیں اور ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ لوگ صرف مسکراتے رہے۔ کیمرہ فیل ہو گیا۔

۱۴ر کی صبح کو سیمینار کا حصہ دوم درپیش تھا لیکن اس سے پہلے شفیع مشہدی کے افسانوں کے مجموعہ "شاخ لہو" کے اجراء کی رسم انجام دی گئی۔ آج تو لوگ کل سے بھی زیادہ آئے تھے۔ انھیں شاید یہ اطلاع مل گئی کہ خدابخش لائبریری میں جگہ کم ہے جو لوگ کل اندر کھڑے تھے آج انھیں باہر کھڑے ہونا تھا۔ مائیکروفون کی صحت میں بھی کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔ رسم اجرا محمد مسلم صاحب نے انجام دی۔ تقریریں ہوئیں۔ سہیل عظیم آبادی کی بھی تقریر سننے کو ملی۔ مجتبیٰ حسین نے ایک مزاحیہ خاکہ پڑھا۔ شفیع مشہدی نے رقت بھری آواز میں شکریہ ادا کیا۔ اس کے فوراً بعد ہی سیمینار شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے مقالہ پڑھا تو ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی نے بھی مقالہ پڑھا۔ صدارت مجتبیٰ حسین نے کی۔ ڈاکٹر رضا عابد بیدار اناؤنسر تھے۔ دونوں مقالوں پر خوب بحث ہوئی۔ خاص طور پر ڈاکٹر لطف الرحمٰن کے مقالے پر سخت بحث ہوئی۔ احمد جمال پاشا، شاید ہوٹل ہی سے غصے میں آئے تھے۔ بہت بولے اور غالباً تین مرتبہ مائیکروفون ان کے حوالے کیا گیا بہت صحیح بولے مزاح نگاروں کی تائید میں لیکن جوش ذرا زیادہ ہی تھا ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی اظہارِ خیال کیا اور ثابت کر دیا کہ ظرافت دوسرے درجے کی چیز ہے۔ ان کی بحث خود ان کے اپنے مقالے سے مختلف تھی۔ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لطف الرحمٰن کا مقالہ میں نے پڑھنے کے لئے مانگا تو معلوم ہوا پٹنہ سے کسی ادبی پرچے کی اشاعت عمل میں آنے والی ہے اس کے ایڈیٹر صاحب لے کر چلے گئے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا مقالہ تو غالباً شاعر کے معاصر نمبر میں چھپ رہا ہے۔ بہر حال دونوں مقالے چھپ جائیں تو اہلِ ظرافت کو اپنی حیثیت کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ آج کی بحث خوش گوار حد تک نزاعی تھی اور اگر لوگ لنچ پہ مدعو نہ ہوتے تو یہ اور طول پکڑتی۔ سیمینار کو اتنی ہی حد تک کامیاب ہونا چاہیئے۔ مزید کامیابی، قواعد اردو کے منافی ہے۔

کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے اس لئے لوگ بہ عجلت ممکنہ ہوٹل پرنسس کی طرف بھاگے۔ محمد حسین آزاد کی طرف سے دعوت تھی۔ ہوٹل پرنسس بھی معقول جگہ ہے۔ اچھا ہوا کہ کھانا بند کمرے میں نہیں بلکہ ٹھنڈی دھوپ میں تھا۔ کھلی جگہ میں ٹہل ٹہل کر کھانا زیادہ ٹھیک ہوتا ہے۔

سہ پہر میں، بہار اردو اکاڈمی کی طرف سے بانکی پور کلب میں چائے کی دعوت تھی۔ بانکی پور کلب بھی پٹنہ یونیورسٹی کی طرح گنگا کے کنارے واقع ہے۔ پرانی عمارت ہے اسی لئے کافی وسیع ہے۔ گنگا میں اترنے کے لئے سیڑھیاں بھی بنی ہوئی ہیں جن کی موجودہ حالت یہ ہے کہ ان پہ پاؤں رکھو تو سیدھے گنگا میں جا پڑو۔ سرور جمال کو میں نے بڑی مشکل سے قسمیں دے کر واپس بلایا۔ وہ اگر ایک قدم اور آگے بڑھتیں تو خطرے کی بات تھی۔ معلوم ہوا یہ مکان سر محمد علی امام یا انکے صاحبزادے کا تھا۔ بیگم عزیزہ امام ایم پی دعوت میں موجود تھیں۔ لیکن یہ مکان کی ملکیت کوئی ایسی اہم بات نہ تھی کہ ان سے پوچھی جاتی۔ دعوت میں بہت لوگ تھے اور اپنی اپنی پسند کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سب اچھی پارٹیاں اسی طرح بنتی ہیں۔

بہار اردو اکاڈمی ہماری بعض اکاڈمیوں میں سے ایک ہے۔ سہیل عظیم آبادی اس کے کرتا دھرتا ہیں۔ (سہیل عظیم آبادی) افسانہ نگار تو ہیں ہی لیکن یہ پرانے کانگریسی بھی ہیں۔ اور پرانے کانگریسی، پرانے چاولوں اور پرانی شراب کی طرح "دبنگ" ہوتے ہیں۔ سہیل صاحب جتنا زیادہ کام کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ پان بھی کھاتے ہیں۔ مگھی پان، ہمیں کھانے کو ملے۔ وقت واحد میں چار پان، ایک پلیٹ میں پرو کر پیش کئے

جاتے ہیں۔ دو چار منٹ تک تو فقط دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ 'عمرانہ' میں مٹھائی بمقدار کثیر تھی۔ (پٹنہ سے ہی کچھ میٹھا سا کا شہر) عمرانہ میں لطف آیا۔ تقریریں نہیں ہوئیں۔

شام میں ۶ بجے جشن ظرافت کا کلائمکس تھا۔ یعنی مشاعرہ۔ وہی بھارتیہ کلا نرتیہ مندر کا ہال اور وہی ہنگامہ۔ مشاعرہ ٹھیک وقت پر شروع ہوا۔ شاعر تو نثری اجلاس میں بھی شریک تھے لیکن آج ان کی سج دھج کچھ اور ہی تھی۔ کل کے براتی آج کے نوشاہ۔ دن بدلتے دیر نہیں لگتی۔

مشاعرے کی صدارت محمد علی صاحب نے کی اور تقریر میں کہا کہ وہ تو کل تقریر کر چکے ہیں آپ کل کیوں نہیں آئے۔ پٹنہ کانگریس کمیٹی کے صدر جناب سیتا رام کیسری نے مشاعرہ کا افتتاح کیا۔ سامعین بے حد خوش ہوئے۔ مشاعرے کو کنڈکٹ کر رہے تھے شفیع مشہدی اناونسر کی حیثیت اسمبلی کے اسپیکر کی تو نہیں ہوتی لیکن اس سے ملتی جلتی ضرور ہوتی ہے۔ خود انھوں نے بھی کافی ہنسایا اپنی اناونسنگ میں وہ بار بار ہندوستان میں بہنے والی دریاؤں کا ذکر کرتے رہے کہ انھوں نے اس جشن ظرافت کے ذریعہ سب پانیوں کو ملا دیا ہے مشاعرہ شروع ہو گیا لیکن سامعین تھے کہ چلے آ رہے تھے خود ڈائس پر اتنے سامعین آ گئے تھے کہ شاعروں کی شکل مشکل ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔ مشاعرہ جب عنفوان شباب سے شباب پہ آیا تو لوگ ہمہ تن چشم و گوش ہو گئے۔ (شباب دیکھنے کی چیز ہے)۔ ان کے قہقہوں نے شاعروں کو اور زیادہ ورغلایا۔ ان میں سے کچھ نے ڈوب کر کلام پڑھا۔ اور کچھ نے ابھر کر۔ کوئی پچیس شاعروں نے کلام سنایا۔ مہمان شاعروں میں سلیمان خطیب، طالب خوندمیری، بوگس حیدر آبادی، پاگل عادل آبادی۔ گڑبڑ حیدر آبادی، بھارٹ حیدر آبادی، مقرب حسین (بھوپال) بلال رضوی رامپوری، پروفیسر سید حسن، پروفیسر مہدی علی، جوہر سیوانی، اسرار جامعی، عادل لکھنوی فیاض عالم رقیب، خالد رحیم، اسمٰعیل آذر، قادر لکھیم پوری، تماشا گیاوی، اور مسٹر لکھنوی جیسے شاعر موجود تھے جو مشاعرے کی کامیابی کے لیے کافی ہی نہیں بلکہ کافی سے زیادہ تھے۔ میزبان شاعروں میں علامہ فضل امام واقف، رضا نقوی واہی، ابرار ساغر، محبوب جہانگیر نے کلام سنایا اور محفل کو گرمایا۔

سلیمان خطیب کو لوگوں نے بہت سنا۔ سلیمان خطیب کو شبہ تھا کہ سامعین ان کی دکھنی نہیں سمجھیں گے۔ غلط فہمیوں کا کوئی علاج نہیں۔ لیکن جب انہوں نے دکھنی شاعری سنائی تو انھیں معلوم ہوا کہ اُن سے بہتر دکھنی سمجھنے والے بھی موجود ہیں۔

مشاعرہ جب برخاست ہوا تو لوگوں کو افسوس ہوا کہ اتنی جلدی کیوں برخاست ہو گیا۔

۱۳، ڈسمبر ہماری وداع کا دن تھا۔ مہمانوں نے سامان سمیٹنا شروع کیا۔ منتظمین جلسہ نے واپسی کا بندوبست بھی اتنا ہی اچھا کیا تھا جتنا ٹھہرنے کا بلکہ واپسی کے بندوبست میں زیادہ احتیاط کی تھی۔ صبح ہی صبح ہر کسی کے ہاتھ میں اس کی واپسی کا ٹکٹ اور ریزرویشن کارڈ تھا۔ دن بھر رخصتیاں ہوتی رہیں۔ میں چونکہ سب سے پہلے آیا تھا اس لیے سب کے آخر میں جانے والا تھا (فرسٹ کم لاسٹ گو لیبر کا اصول رہا ہے) لیکن حیدر آباد گروپ بھی اسی ٹرین سے سفر کرنے والا تھا جو رات میں گیارہ بجے پٹنہ سے چلتی ہے۔ ہم لوگوں کو رات میں گیارہ بجے تک مصروف رکھنے کا یہ بندوبست کیا گیا کہ جشن ظرافت کے سکریٹری شبیر حسین وناک نے اپنے گھر پہ ایک محفل شعر بعد ڈنر ترتیب دی۔ نہایت بے تکلف اور گھریلو محفل تھی۔ طے یہ ہوا کہ سلیمان خطیب کو بالتفصیل سنا جائے گا۔ اور ان کی آواز ٹیپ کر لی جائے گی۔ جب ہم "دل افزا" (کیوں کہ یہی اس مکان کا نام تھا) پہنچے تو کمرے میں ہر طرف ٹیپ ریکارڈ لگے ہوئے تھے ہماری سانسیں تک "قلمبند" ہو گئیں۔ محمد حسین آزاد بھی آئے تو ٹیپ ریکارڈ لے کر ہی آئے۔ نہایت بے تکلف محفل تھی۔ شفیع مشہدی نے پھر دریاؤں کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے عرض کیا وہ آندھرا آ جائیں تو بہتر ہوگا۔ پانی کے جھگڑے چُک جائیں گے۔ نہیں مانے۔ بولے میں یہیں رہوں گا اور ایک جشن ظرافت اور کروں گا۔ رضا نقوی واہی نے فوراً تائید کی۔ محمد حسین آزاد وزیر زراعت نے فرمایا

ٹھیک ہے ظرافت کی کھیتی بھی ہری رہے تو اُن کا کیا بگڑتا ہے۔ بات بکی ہوگئی۔ مشاعرہ ہوا۔ ہر کسی نے کلام سُنایا۔ کلیم عاجز بھی شریکِ محفل تھے۔ ان سے اتنا اصرار ہوا کہ عاجز آکر انہوں نے دو غزلیں سنا ہی دیں۔ میں نے کتنے ہی لوگوں کو ترنم میں پڑھتے سُنا ہے لیکن کلیم عاجز کے ترنم میں عجیب دغریب کیفیت ہے اور پھر استادانہ کلام۔
شفیع مشہدی نے ودائی تقریر کی۔ شکر کہ رٹے نہیں۔ جواب میں میں بھی بسورا۔ معلوم نہیں کس نے جادو کر دیا تھا کہ میں کہہ بیٹھا کہ اگر آئندہ پیدل آنے کے لئے بھی کہا گیا تو ہم پیدل بھی آجائیں گے۔ — اب ڈرتا ہوں کہیں سچ مچ پیدل نہ بلوا لیا جائے۔ لیکن کوئی حرج نہیں۔ کہا ہے تو کرکے بھی دکھاؤں گا۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے۔ حالی نے تو سبھی باتیں اچھی کہی ہیں۔ کون سا شعر لکھوں؟!

کیا کریں؟

ناچیز ؎

شکر کے دام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں
شکر حرام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

تنخواہ صرف تین سو اور خرچ پانچ سو!
قرضے تمام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

یاروں کی محفلیں، نہ حسینوں کی صحبتیں!
بیکار کام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

تعریف اُن کی فون پہ کر دی تھی ایک دن
اُن کے پیام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

زورِ جنونِ عشق ہے کہ اور شہر میں
آہو خرام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

بے ساختہ ہمارے قدم سوئے میکدہ
ہوتے ہی شام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

فہرست شاعروں کی بنائیں تو کس طرح
ہر لحظہ نام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

کہتے ہوئے سُنے گئے کل ایک منتری
"سالے عوام" بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

شہروں میں اب کہاں سے ملے گی کھُلی ہوا
دیوار و بام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

دارائیِ عوام تو ناپید ہے مگر
دار العوام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

آبِ رواں سمجھ کے نمودِ سراب کو
کچھ تشنہ کام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

عالم ہیں اپنی خلوتِ دانش میں گوشہ گیر
جاہل تمام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

جو کوچہ گرد تھے یہاں بے ننگ و نام تھے
اُن کے مقام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

یارب نمازیوں سے تو خالی ہیں مسجدیں
لیکن امام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

ناچیز! اب نوالوں پہ بھی راشن لگائیے
چیزوں کے دام بڑھتے ہی جاتے ہیں کیا کریں

ایک طویل کہانی

دن کے سوا بجے سے سرِ شام تک تو ہم
چپ چاپ اُن کے طعنوں کو سہتے چلے گئے

اُن کی زباں رُکی تو ہماری زباں کھُلی
کچھ دیر ہم بھی اپنی سی کہتے چلے گئے

پھر یہ ہُوا، ملاپ کی کشتی پہ بیٹھ کر
دونوں پریم جھیل میں بہتے چلے گئے

؎ مشہور ادیب شاعر جناب اظہر حسن (ناچیز)

قمر اعظم ہاشمی

شعر و ادب میں طنز و ظرافت کے عناصر

کُل ہند جشنِ ظرافت منعقدہ پٹنہ ۱۲ ردسمبر ۷۶ء کے دوسرے سمینار کے اجلاس میں یہ مقالہ پڑھا گیا۔

۱۲ ردسمبر ۱۹۷۶ء کی ادبی صحبت میں ڈاکٹر قمر رئیس صاحب اور جناب شفیع مشہدی کے دو اہم مقالے زیرِ بحث آئے تھے۔ موضوعِ گفتگو پر کچھ باتیں سنجیدگی سے بھی ہوئیں اور کچھ جذباتی انداز میں بھی۔ چونکہ تمام بحث و تمحیص کا معاملہ طنز اور ظرافت سے متعلق تھا اس لئے، اس سلسلہ میں کئی اہم سوالات سامنے آئے۔ ذیل میں ان ہی سوالات کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کی جا رہی ہے۔

سب سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ طنز و ظرافت ادب کی کسی منظوم یا منثور صنف کا نام نہیں ہے۔ یہ دراصل انسانی مزاج کی دو کیفیتیں ہیں جن کا مظاہرہ نثر و نظم کی ہمیشہ تمام صنفوں میں ہوتا رہا ہے۔ چونکہ یہ دونوں عناصر بشری مزاج کے دو مختلف انداز کی ترجمانی کرتے ہیں اس لئے فطری طور پر انکے تقاضے جداگانہ ہیں۔ ظرافت ہی کی ایک سطح مزاح سے عبارت ہے۔ مزاح نگاری کی تہوں میں خوش طبعی، خوش مزاجی اور خوش دلی ہوتی ہے، طنز نگاری کی تہوں میں اصلاح پسندی طنز میں تلخی ہوتی ہے، مزاح میں مٹھاس، طنز میں جذبے کی تیزی و تندی ہوتی ہے، مزاح میں شگفتگی و شادابی، طنز میں فکر کا عنصر ہوتا ہے، مزاح میں بے فکری طنزیہ میلان نقطۂ نظر کے تصادم اور تہذیبی و معاشرتی اصولوں کی کشمکش میں فروغ پاتا ہے۔ مزاحیہ میلان کو ایسی صورتِ حال کی حاجت نہیں ہے بلکہ بقول نریندر لوتھر اطمینان و آسودگی کی فضاء اسے زیادہ راس آتی ہے۔ انسان مطمئن اور آسودہ ہو تو اسے ہر کاہری سوجھتی ہے اور تفریح کی طرف مائل ہوتا ہے، بے اطمینانیوں نے محاصرہ کر رکھا ہو تو اپنے جذباتی ردِ عمل کی نوعیت کے مطابق معاشرتی معاملات و مسائل کو نشانۂ طنز بنا کر تسکین کی راہ ڈھونڈتا ہے۔ طنز نگاری ایک ذاتی ردِ عمل ہے۔ طنز نگار کسی مصلحت کی پرواہ کئے بغیر، تحسین ناشناس اور سکوتِ سخن شناس کی فکر سے بے نیاز ہو کر اپنے احساس و خیال کو قلمبند کر دیتا ہے، مزاح نگار یہ ملحوظ رکھتا ہے کہ دوسروں کو ہنسنے اور ہنسانے کے مواقع فراہم ہوسکیں یعنی مزاح نگار اپنے مخاطب کا خیال رکھے بغیر مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ طنز نگار اپنے مخاطب کو خوش کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان کمزوریوں سے آگاہ کرنا چاہتا ہے جن کو شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ نظر انداز کرتا ہوتا ہے۔ مزاحیہ اسلوب میں شوخی و شیرینی ہوتی ہے اور اکہرا پن، طنزیہ اسلوب میں تجریاتی بیرحمی ہوتی ہے، معنوی تہہ داری اور

مخاطب سے پرخلوص ہمدردی ۔

طنزیہ شعر و ادب کے پس منظر میں اصلاح کا جذبہ سرگرم عمل ہوتا ہے ۔ طنز نگار ادیب یا شاعر معاشرے کی کمزوریوں اور گمراہیوں کو دیکھ کر کڑھتا ہے ۔ تصورات و اعمال کے تضادات اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں تو وہ معاشرتی زندگی کے بے ڈھنگے پن کا مذاق اڑاتا ہے ۔ یہ طنزیہ انداز بیان اناڑی اور غیر تربیت یافتہ ہاتھوں میں چلا جائے تو ذوق سلیم کے لئے بارگراں بن جاتا ہے ۔ طنز نگار ادیب یا شاعر کا احساس برتری اپنے مظاہروں کے لئے سطحی طریقہ استعمال کرنے لگتا ہے اور کمزوریوں کی اصلاح کا نشہ خود اسے پستیوں کی طرف لے جاتا ہے ۔

طنزیہ شعر و ادب میں حکیمانہ بصیرت ، ہمدردانہ سنجیدگی اور خلوص فکر موجود ہو تو اسلوب میں روشن نفاست اور اثر انگیز لطافت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اعلیٰ درجہ کی طنزیہ شاعری یا نثر نگاری میں صرف تنقید کی سختی نہیں ہوتی محبت کی نرم رو آنچ بھی ہوتی ہے ، بیزاری اور برہمی نہیں ہوتی ، غم و غصہ نہیں ہوتا ، انسانیت دوستی کی خوب صورت لہریں اس کی ہتوں میں موجزن ہوتی ہیں طنز نگار شاعر یا ادیب نفرتوں کی تاریکی نہیں پھیلاتا بلکہ تاریکیوں میں دبی ہوئی زندگی کی صالح قدروں کی روشنی کو اوپر کی سطح پر لانا چاہتا ہے ۔

مزاحیہ ادب زندہ دلی ، خوش مذاقی اور تفریح طبع کا سبب بنتا ہے ۔ مزاح پیدا کرنا ہی اس کا مقصد ہے ظاہر ہے کہ دوسروں کو ہنسانا ایک مشکل کام ہے ۔ مزاح نگار اس کی کوشش کرتا ہے کہ تہذیب و شائستگی کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور لبوں پر مسکراہٹیں بھی بکھر جائیں ، شخصی طور پر کوئی کارٹون بھی نہ بنے اور دلچسپی و خوش طبعی کا پہلو نکل آئے ۔ مزاح نگار معاشرے کی مختلف سطحوں پر بکھرے ہوئے ہزاروں تجربات میں سے ایسی جہتوں کی دریافت کرتا ہے جو دوسروں کے لئے نایافت ہوں کہ لطف و تفریح کا ذریعہ بن سکیں ۔ یہاں اخلاقیات کے کسی نکتے کی پیشکش غیر ضروری ہے ، پس منظر میں کوئی اصلاحی مقصد بھی نہیں ہوتا ۔ اسلوب میں غیر سنجیدگی اور شگفتگی کے عناصر کا نمایاں رہنا ضروری ہے لیکن نہ اس حد تک کہ ابتذال کی کیفیت پیدا ہو جائے ۔

میں بھی ڈاکٹر محسن صاحب کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے طنز و مزاح کی ملی جلی شکل کو ظرافت تسلیم کرتا ہوں ۔ ظریفانہ نثر و نظم ، مزاحیہ نثر و نظم سے اسلئے بلند ہے کہ یہاں زیادہ تخلیقی انہماک چاہیئے ، اپنے تجربہ سے پرخلوص وابستگی یہاں ضروری ہے ۔ ظریفانہ شعر و ادب کے خیال و بیان میں شوخی و شگفتگی بھی ہوتی ہے اور طنز و طعن میں بھی کبھی مزاح کا عنصر سطح زیریں میں ہوتا ہے اور کبھی طنز کا عنصر سطح زیریں میں بھی ۔ مزاحیہ انداز میں طنز کرنا یا طنزیہ انداز میں مزاح پیدا کرنا ہی اس کا مقصد ہے ۔ کہیں انداز بیان میں مسکراہٹوں کی لطافت ہوتی ہے اور فنکارانہ تجربہ کی تہہ میں طنز کی گرم موج ۔ کہیں پیرایۂ بیان میں طنز کا تیکھا پن ہوتا ہے اور خیال میں مزاح کی چاشنی ۔ اس کا انحصار تخلیقی مزاج کے رد عمل کی نوعیت پر ہے ۔ بہر حال ظریفانہ شعر و ادب کی تخلیقی کاوشوں کے دوران ادیب یا شاعر کو صبر و ضبط اور احتیاط کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے کیونکہ انفرادی یا اجتماعی کمزوریوں کو نشانۂ طنز بنانے کے سلسلے میں تنقیدی بصیرت سرگرم عمل ہوتی ہے جسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو مزاح کا عنصر ہی پھیل جاتا ہے ۔ اور ادیب یا شاعر خود اخلاقی اور معاشرتی مسئلوں کے دھندلکوں میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ طنز کا ، حربہ ہے تو بہت مفید مگر بے احتیاطی سے استعمال ہو تو اس کا وار اُلٹا بھی پڑ سکتا ہے ۔ چونکہ مزاح آمیز طنز اور طنز آمیز مزاح دونوں میں مقصدیت موجود ہوتی ہے اسلئے ہلکی سے بے توجہی مقصدیت پسندی کو دفتر نصیحت بنا سکتی ہے اور دیارِ خطابت میں بھی پہونچا سکتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نثری یا شعری حسن ؛

ماند پڑ جائے گا اور فنکاری رخصت ہو جائے گی ۔ مصلح ہونا، ناصح، خطیب اور واعظ ہونا اور بات ہے تجربہ و مشاہدہ کو مزاح و طنز کے ساتھ فنکارانہ رنگ میں پیش کرنا اور بات۔ دنیائے ادب میں جس طرح خطیب و مصلح کے منظوم یا منثور ارشادات کا کوئی منصب نہیں اسی طرح ہنسنے ہنسانے اور طنز کرنے کی اہمیت بھی نہیں ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ فنکارانہ حسن بیاں ہے یا نہیں، ادیبانہ طرز کلام ہے کہ نہیں شعری محاسن ہیں کہ نہیں. مزاح نگاری اور طنز نگاری میں کمال دکھلانا ایک الگ بات ہے اور ان عناصر کو ادب و شعر میں اس طرح استعمال کرنا کہ فنی خوبیاں نکھر کر سامنے آجائیں ایک مستقل فن ۔ تخلیقی کمال کے جائزے اور تعین کے وقت فنی لطافتوں، اور شعری خوبیوں پہ نظر رکھنی ہی ہوگی ۔ ادب و شعر میں الفاظ کی بازیگرانہ بندگی ممنوع ہے ۔ اس میں طنز کا عنصر ہو یا ظرافت کا، حکمت و بصیرت ہو یا متانت و سنجیدگی تخلیقی ریاضتوں سے پیدا ہونے والی پر خلوص کشش ہونی ہی چاہئے ۔ ظرافت کا میدان وسعت مطالعہ زیادہ ہشیاری، زیادہ شعوری جاگ اور زیادہ فنکارانہ چابکدستی کا طالب ہے ۔

خیال کی سطح ہو یا بیان کا مرحلہ یہاں شاعرانہ شعور بے حد چوکنا ہو کر آگے بڑھتا نظر آتا ہے کیونکہ ہر لمحہ یہ اندیشہ دامنگیر ہوتا ہے کہ کہیں خیال سرد پھلجھڑی کی طرح پھسپھسا کر نہ رہ جائے اور الفاظ پھکڑ پن کی کھائی میں نہ گر جائیں ۔

آپ کی سمع خراشیوں کے لئے معذرت طلب کرتے ہوئے میں ایک بار پھر یہ عرض کرنے کی جسارت کرونگا کہ شعر و ادب میں طنز و مزاح اور ظرافت کے عناصر کی جستجو اور مطالعہ اسی انداز میں ہو تو بہتر ہے ۔ جس انداز میں انسانی نفسیات اور احساسات کے دوسرے رنگ کا مطالعہ کیا جاتا رہا ہے ۔ رجائیت و قنوطیت اور نشاط و حسرت ہی کی طرح ظرافت بھی احساس کی ایک خاص لو، جذبے کا ایک خاص رنگ اور اظہار شخصیت کا ایک خاص، انداز ہے جس میں دردناک شادمانی اور مسرت انگیز تشنگی ہوتی ہے ۔ جس طرح کسی ادیب یا شاعر کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ شروع سے آخر تک قنوطی یا رجائی میلان رکھتا ہو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب شروع سے آخر تک ظرافت نگار ہو ۔

(برق آشیانوی)

میک اَپ میں ہے کمال اثر ہے خضاب میں
چالیس سال میں بھی ہیں عہدِ شباب میں

لکھا ہے میں نے قرض دو سو روپے مگر
"میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں"

کوشش سے ہو سکے نہ سیہ گیسوئے سفید
"تاجر نے کچھ ملا نہ دیا ہو خضاب میں"

دیکھا جو اُن کا چہرہ تو میں ڈر کے جاگ اُٹھا
"آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں"

سروس ریکارڈ میں تو ہے پچیس سال عمر!
چالیس سال سے ہیں جہانِ خراب میں

صد حیف میں نے دے دیا بھولے سے سو کا نوٹ
"جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں"

افسوس اُن کے ساتھ ہی آیا رقیب بھی
آجائے جس طرح سے کہ ہڈی کباب میں

ریشم کا ہے تلا، تری سینڈل کا اے صنم
"کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں"

لیلیٰ نہیں تھی ساتھ، وہ لیلیٰ کا بھائی تھا
بیگم ہو تم بلا وجہ کیوں پیچ و تاب میں

گلتی نہیں ہے بزم میں رستم کی دال بھی !
حیران ہوں کہ برق ہے پھر کس حساب میں

شوہر لکھنوی (مرحوم)

دُہائی اے مرے معبود کیا زمانہ ہے
ملائی دُودھ سے نابود کیا زمانہ ہے

مزے سے کھاتے ہیں اب رُوس اور امریکہ
الٰہ آباد کے امرُود کیا زمانہ ہے

وہاں سے لگتے ہیں امن و امان کے نعرے
جہاں پہ بنتی ہے بارُود کیا زمانہ ہے

جو کر رہے تھے حلال و حرام کی باتیں
وہ لوگ کھاتے ہیں اب سُود کیا زمانہ ہے

تمام کُنبے میں بچوں کی ماں پہ شوہر کے
اب اختیار ہیں محدُود کیا زمانہ ہے

ادریس بانکے

کی نہیں شادی مُصیبت جان کر پالی نہیں
اس لئے اپنا کوئی سالا نہیں، سالی نہیں

آنکھ میں کاجل نہیں اس ہونٹ پر لالی نہیں
اب مرے ارمان کے کھیتوں میں ہریالی نہیں

سیدھی سادی بھولی بھالی، چونچلے والی نہیں
میں ہوں کالا، میری محبوبہ مگر کالی نہیں

پان کی ہے چاہ مجھ کو چائے سے ہی اجتناب
چاہنے والا ہے اپنا، چاہنے والی نہیں

دیکھ ہی لوں گا تمہارا چاند سا مکھڑا کبھی
جھانکنے کو کیا کوئی کھڑکی نہیں جالی نہیں

میں ہوں بانکے، بانکپن اپنا دکھاؤں گا ضرور
ذوق و غالب میں نہیں، مومن نہیں، حالی نہیں

سید نصرت، (آرکیٹکٹ)

سے بچے

کرکٹ بھاشا!

ھندوستان میں کبھی تین موسم ہُوا کرتے تھے، گرمی، سردی اور برسات ـــ لیکن جب سے کرکٹ کا کھیل
یجاد ہُوا ہے موسموں کی تعداد تین سے بڑھ کر چار ہوگئی ہے۔ کرکٹ کا موسم ہر سال بڑی پابندی سے ہندوستان کے علاوہ دُنیا
ے اور مُلکوں میں بھی آمار ہتا ہے اور جس طرح برسات کے موسم میں کئی ایک متعدی بیماریاں پھُوٹ پڑتی ہیں، اسی طرح کرکٹ کے
وسم میں بھی "کرکٹیا" جیسی خطرناک اور مُہلک بیماری عام ہو جاتی ہے اور اس بیماری کے لاحق ہوتے ہی اچھا خاصا آدمی تماشا
ن کر رہ جاتا ہے۔ گھر میں کامنٹری، دفتر میں کامنٹری، فیکٹری میں کامنٹری، سڑکوں پہ کامنٹری، چُولھے چکّی کے پاس کامنٹری ـــ
س اسٹانڈس پہ کامنٹری اور تو اور جھونپڑ پٹّی میں بھی کامنٹری سُنائی دینے لگتی ہے۔ آدمی کو بھُوک لگے کامنٹری حاضر، پیاس
گسوس ہو کامنٹری موجود، غمِ دوراں یا غمِ جاناں کے جھگڑے درپیش ہوں کامنٹری غمگساری کے لئے تیار۔ غرض کامنٹری اور
رکٹ عوام کے ذہنوں پر اس بُری طرح چھا جاتے ہیں کہ وہ اپنے روزمرّہ کے کاروبار بلکہ معمولات میں بھی کرکٹ کی اصطلاحیں
ستعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی پرسُوں ہمارے ایک پُرانے شناسا سے برسوں بعد ہماری ملاقات ہوئی تو ہم نے خیر خیریت دریافت
رنے کے بعد پوچھا کہ : "کتنے بچے ہیں؟" تو جواب ملا "ٹوولی فار ٹو"۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی اور ہم نے استفسار کیا کہ
"ٹوولی فار ٹو" کیا بات ہوئی؟ تو کہنے لگے : "میری دو بیویاں ہیں جن کے بچوں کی مجموعی تعداد بارہ ہے"۔ اسی طرح ایک
دوسرے صاحب سے جب پوچھا گیا کہ "آپ کے کتنے بچے ہیں؟" تو جواب ملا : "سکسٹین فار تھری"۔ ہم نے سمجھا کہ ان حضرت کی تین
بیگمات ہوں گی، لیکن انھوں نے اس بات کی وضاحت اس طرح کی کہ اُن کے سولہ بچوں میں سے تین بچے مختلف حادثات میں مر چکے
یں۔ ہم نے افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ کسی طرح کے حادثات پیش آئے تو غمگین آواز میں بولے : "ایک بچہ اسٹمپڈ ہوگیا" یعنی
ں کے پیٹ ہی میں چل بسا اور دوسرا رَن آؤٹ ہوگیا۔ یعنی سڑک پر بس کے نیچے آگیا اور تیسرا کاٹ آؤٹ ہوگیا اور اس
رح ہُوا کہ پتنگ بازی کے شوق میں گھر کی چھت سے اُس کا پَیر پھسلا اور نیچے ملک الموت نے اُس کا ایک ایزی کیچ لے لیا۔

———

اِسی طرح ایک اور صاحب دُکھ بھرے لہجے میں بتاتے ہیں کہ اُن کی شادی ہوئے پورے چھ سال گزر
لیکن اُن کا یہ چھ سالہ اوور (over) میڈن (Maiden) ہی رہا۔ ایک اور صاحب جب اپنے عشق کی داستان
ہیں تو اپنی محبوبہ کے باپ کو وکٹ کیپر سے تعبیر اتنی سخت فیلڈنگ کرتا ہے کہ وہ ایک بائی رن کے لئے
کر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے انہیں مشورہ دیا ایسی اسپورٹس مین ٹیکٹیس آزمائیں کہ اُن کی محبوبہ ایک آ
نوبال پھینکے یعنی وہ کسی بہانے گھر سے باہر نکل آئے۔ تاکہ یہ اپنی محبت کے بہترین اسٹروکس لگاکر رنوں میں تیز
اضافہ کریں۔

کچھ عرصہ بعد انہی حضرت سے ہماری ملاقات ہوئی تو ہم نے پوچھا کہ بھئی آپ کے میچ کا کیا بنا تو ایک سر
بھر کر بولے " میں یہ میچ ٹی ٹائم کے وقفہ سے کچھ دیر پہلے ہی ہار گیا کیونکہ میری محبوبہ دل نواز نے لنچ کا وقفہ یعنی ہمار
کے عروج کے زمانے کے بعد ہی راونڈ دی وکٹ بولنگ شروع کر دی تھی وہ تیزی سے میری جانب مائل ہو
آئی لیکن میرے ایک رقیب کی لگائی ہوئی دولت کی وکٹ سے گھوم کر وہ دوسری طرف چلی گئی ہم نے کہا شکر کیجئے
میچ آپ یوں ہی ہار گئے۔ اگر درمیان میں موسم خراب ہو جاتا اور آپ کی محبت کی گیلی پچ پر آپ کی محبوبہ کے ناز وا
بال اسپن ہوکر آپ کو پریشان کرنے کی کوشش کرتے اور آپ تیزی سے رن بناتے جاتے اور نتیجۃً میچ جیت بھ
تو زندگی بھر آپ کو اس کی قیمت چکانی پڑتی۔

گزشتہ کرکٹ کے موسم میں اتفاق سے شادیوں کا موسم بھی عروج پر تھا اور ہمارے اکثر دوست احباب کی
اِسی موسم میں انجام پائیں۔ اکثر حضرات نے شادی کے بعد بہتر فارمس کا مظاہرہ کیا لیکن ایک دوست شادی کے ا
روز ہی اُداس اُداس اور فکرمند نظر آئے اور جب اُن سے اُداسی کی وجہ دریافت کی گئی تو ایک سرد آہ بھر کر بولے
شادی کی رات ہی فالو آن ہو گیا۔ ہم فالو آن کی تشریح یہاں اس لئے مناسب نہیں سمجھتے کہ خواہ مخواہ اس طرح سے انہیں
آف کنٹرول یعنی اُن کی سسرال کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ایک دوسرے دوست کے ہاں جب دسترخوان
گیا تو اتفاق سے ہمارے بازو ایک پیٹو قسم کے حضرت براجمان ہو گئے۔ لیکن خلافِ معمول اُن کے کھانے کی رفتار بہ
سست تھی۔ ہم نے ازراہِ ہمدردی پوچھا "بھائی صاحب کیا بات ہے جو آپ اتنی سلو بٹنگ کر رہے ہیں تو قدرے
کے انداز سے بولے۔ دیکھتے نہیں کہ فیلڈنگ کتنی ٹائیٹ ہو رہی۔ ہم سے اُن کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور کھانا س
کرنے والے کو قریب بلاکر کہا کہ بھئی کچھ اِدھر کا بھی خیال کر تو اُس نے مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا ہم کیا کر
"دیگ کے پاس بیٹھنے والے ایمپائر نے ہمیں آرڈر دے رکھا ہے کہ بارہویں کھلاڑی یعنی بن بلائے مہمان کی طرف
توجہ نہ دیں۔ ہم نے کہا "کیا بات کرتے ہیں جناب" ہمیں تو باقاعدہ رقعہ دیا گیا تھا اور ہم قانونی طور پر اس ٹیم میں شر
جس پر اُس نے جواب دیا آپ تو ٹسٹ پلیر ہیں ہی لیکن میں آپ کے بازو والے حضرت کے بارے میں کہہ رہا
اگر آپ کو ان سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو آپ ڈراپ ہو جائیں تاکہ آپ کی جگہ اُن کو دی جاسکے۔ ہم نے بح
کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور کہا " آپ سے بحث کرنی فضول ہے آپ ایک کام یہ کیجئے کہ آج کی اس تقریب
کپتان صاحب کو ہی بلوا یئے تاکہ اس سلسلے میں اُن سے ہی بات کی جاسکے تو بولے ' لڑکی کی جدائی کے غ
اُن کا دل انجرڈ ہوگیا ہے اور وہ اپنا غم غلط کرنے فیلڈ سے باہر گئے ہوئے ہیں۔

گپیں ہانکنے والوں کو اکثر کہا جاتا ہے کہ چوکے یا چھکے نہ لگائیں اور اس سلسلے میں ہم ایک صاحب سے وا
ہیں جو گپیں ہانکنے بیٹھ جائیں تو سنچری یا ڈبل سنچری مکمل کر کے چھوڑتے ہیں چنانچہ ایک مرتبہ مسلسل گپیں ہانکنے

بعد انہوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ "میں قطعی جھوٹ نہیں بولتا" تو سب لوگوں نے نعرہ لگایا ایک ہزار سکھ اسی طرح کسی جائیداد کے تعلق سے فریقین میں عرصہ سے تنازعہ چلا آرہا تھا۔ اور مسلسل مقدمے بازی نے دونوں کے انجر پنجر ڈھیلے کر رکھے تھے تنگ آکر فریق اول نے فریق دوم کے پاس اس قسم کی تجویز رکھی کہ مقدمہ ڈرا کر لیا جائے اور پیش کش کے طور پر اُس نے یہ بھی اعلان کر لیا کہ وہ سب سے پہلے اننگز ڈکلیر کر دے گا۔ کسی صاحب نے انتہائی رومینٹک موڈ میں اپنی محبوبہ سے کہا کہ "ڈارلنگ کچھ ہی دنوں بعد ہم دونوں کی شادی ہو جائے گی اور ہماری زندگی کا انتہائی سنسنی خیز میچ شروع ہو جائے گا" تو کیوں نہ ہم اس میچ سے پہلے کچھ نیٹ پریکٹس کر لیں تو اُن کی محبوبہ نے بجھے بجھے دل سے جواب دیا۔ ڈیئر جس میچ کا تم تذکرہ کر رہے ہو اس کے شروع ہونے کے اب کوئی آثار نظر نہیں آتے کیونکہ لیگ امپائر یعنی میرے ڈیڈی کو اس بات کا پتہ چل چکا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان عرصہ سے کاؤنٹی میاچس ہو رہے ہیں اور اب بہت جلد ٹسٹ میچ شروع ہونے والا ہے۔ چنانچہ ڈیڈی نے کل ہی اُس ٹیم کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ جس کے مقابلہ کے لئے میرا اسلکشن عمل میں آیا ہے۔

ہمارے دوستوں میں ایک صاحب اپنے گنجے سر کو چھپانے کے لئے وگ کا استعمال کرتے ہیں۔ ایک دن اتفاق سے اُن کا سر وگ کی قید و بندشوں سے آزاد نظر آیا تو ہم نے پوچھا کیا بات ہے جو آج آپ کی پچ پر میٹنگ نظر نہیں آرہی ہے۔ تو بولے "موسم خراب ہونے کی وجہ سے میٹنگ اُٹھا دی گئی ہے۔ پھر ہم نے کہا وہ ٹھیک ہے لیکن آپ اپنی پچ کسی اور چیز سے ڈھانکئے ورنہ اگر پچ گیلی ہو جائے اور یکایک اولے برسنے لگیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے سر سے اسپن ہو کر دوسروں کو مجروح کرنے لگیں گے۔

مختلف لڑائی جھگڑوں اور ہڑتالوں میں بھی کرکٹ کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حالیہ ریلوے ہڑتال کی ناکامی کے بعد ایک ریلوے ملازم نے ہمیں بتایا کہ جن لوگوں نے اس میں بڑھ چڑھ حصہ لیا تھا انہیں حکومت نے الگ ڈیفیٹ دیدی اور وفادار ملازمین کی ایک ایک وکٹ سے وِن ہوئی ہے یعنی وفادار ملازمین کو ایک ایک پرموشن دیا گیا ہے اور غیر وفادار ملازمین کو ڈی بار یا معطل کر دیا گیا ہے اسی طرح ایک مرتبہ ہمارے پڑوسی کا لڑکا ہمارے پاس آیا اور بتانے لگا کہ اُس کی امی پر آج اسپن بولنگ کا بھوت سوار ہے اور وہ ابا سے لڑ جھگڑ کر ہاتھ کو آئی ہوئی ہر چیز سے اُن کا نشانہ لے رہی ہیں۔ اور جس چیز سے بھی وہ ابا کو نشانہ بناتی ہیں وہ چیز ابا کو زخمی کرتی ہوئی گھر کی اور چیزوں کا بھی ستیاناس کر دیتی ہے۔ یہ سُن کر ہم نے کہا میاں شکر کرو کہ تمہاری امی صرف اسپن بولر ہیں اگر خدانخواستہ انہیں فاسٹ بولنگ کا تجربہ ہوتا تو تمہارے ابا میاں کا وہی حشر ہوتا جو گرفتھ کی گیند سے ناری کنٹراکٹر کا ہوا تھا اسی طرح ایک دادا قسم کے حضرت لڑائی کے دوران اپنے حریف کو زیر کرنے کے لئے ہوا میں اچھلے اور کہا "اب میری ہیٹ ٹرک سے بچو" لیکن تھوڑی دیر بعد وہ چاروں شانے چت زمین پر آرہے کیونکہ وہ زمین سے ہوا میں اچھلے تو تھے کک مارنے لیکن عین وقت پر وہ کک بھول گئے اور کلین بولڈ ہو کر زمین پر آرہے۔

یہ تو تھیں مرد حضرات کی کرکٹ سے دلچسپی کی کچھ مثالیں اب چلتے چلتے خواتین کی بھی دلچسپی کا کچھ حال سُن لیجئے۔ ایک خاتون سے جب اُن کی خوب صورتی کا راز پوچھا گیا تو اِٹھلا کر بولیں۔ میں اپنے چہرے کے بیلس کو اُڑنے نہیں دیتی۔ اور ہمیشہ میک اپ میں رہتی ہوں۔ اسی طرح ایک کالج کی لڑکی کے سر پر بندھی پٹی دیکھ کر جب اُس کی ایک سہیلی نے پوچھا کہ یہ کیونکر ہوا تو اُس نے بتایا کہ "ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہو گیا ہے یعنی وہ اپنی سہیلی کانتا کے ساتھ جب گھر واپس ہو رہی تھی تو کانتا کا محبوب تیزی سے بھاگتا ہوا اُس سے آٹکرایا تھا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی تھی،

ایک محترمہ کی جیسے جیسے عمر بڑھتی جا رہی ہے اُن کے محبوب بھی اُسی تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں چنانچہ اُ
کی عمر کو رن اور محبوبوں کو وکٹیں ثابت کرتے ہوئے اُن کی ایک سہیلی نے فال آف وکٹس کی انالیس [illegible]
کچھ اس طرح کی ہے۔ ون؍ فارسکیٹین (۱۶) ٹو فارسکیٹین اینڈ ہاف (2) 16½۔ تھری فارسیونٹین (3) 17۔ فو
فارسیونٹین 4، 17۔ اور نائین فارائیٹین (9) 18۔

بہرحال ایسی طرح کی کئی اصطلاحیں اور ہیں جن کا ذکر میں کرتا چلا جاؤں تو ڈر ہے کہ شائقین کرکٹ میرا دہی حـ
نہ کریں جو خراب فیلڈنگ کے وقت باونڈری لائن پر کھڑے ہونے والے کسی پلیئر کا کیا جاتا ہے اس لئے مضمو
کو ختم کرتا ہوں لیکن مضمون کے تعلق سے اتنا تو ضرور پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ (ہاؤ انڈ ایٹ [illegible])

معدے کی ضرورت

شاہ فیاض عالم چشتی نظامی رقیب

جی ہاں آپ عنوان پڑھ کر ہنسیں گے کہ بھئی یہ عجیب اشتہار ہے۔ شادی کی ضرورت، ضرورت رشتہ، ملازم کی ضرورت، کلرک کی ضرورت، پروفیسر کی ضرورت، ایڈیٹر کی ضرورت قسم کے اشتہارات تو رات دن نظر سے گزرتے رہتے ہیں لیکن یہ کیا "معدے کی ضرورت"! جناب آپ کو ایسے حالات سے دوچار ہونا نہیں پڑا ہوگا جن سے میں دوچار ہوا ہوں اور جب کوئی چارۂ کار نہ رہا تو یہ اشتہار دینے پر مجبور ہوا ہوں کہ شاید اس طرح مشکل کشائی کی کوئی سبیل نکل آئے ــــ جب تک آپ میری رام کہانی نہ سُن لیں ہماری مصیبت کا اندازہ نہیں کر سکتے تو لیجئے سنیئے۔

اس راز کا انکشاف کہ میں بہت کم کھاتا ہوں سب سے پہلی دفعہ اس وقت ہوا جب کہ میں نے شادی کی اور دو تین دن بعد اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ان کے میکے یعنی اپنی سسرال پہنچا حالانکہ میں نے اپنے سالوں یعنی بیگم کے بھائیوں کے ساتھ کھانا شروع کیا تھا اور ان ہی کے ساتھ ختم کیا لیکن مجھ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ بہت کم کھاتے ہیں۔ میرا تو حیرت کے مارے منہ رہ گیا کھلا کا کھلا سانس رک گیا کہ ــــ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

خیر صاحب میں نے سوچا کہ شاید میرے کھانے کی رفتار کم ہے اور کئی دن سے ولیمہ کے انتظامات میں پریشان رہا۔ اس لئے ممکن ہے کم کھایا گیا ہو۔ دوسرے دن کم خوری کی سزا مجھے قید تنہائی قسم کی ملی۔ یعنی طعام تنہائی کا حکم سنایا گیا اب ہوتا یہ کہ میرے چھوٹے سالے کبھی کھانا لاتے کبھی بیگم لاتیں اور مجھے تنہا کھانے کو کہا جاتا۔ میں ان میں سے ایک ایک کی منت سماجت کرتا کہ میرے ساتھ کھانا کھائیں مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی اور میری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ دراصل بات یہ تھی کہ کم خوری کے جرم میں ان لوگوں نے میرا سوشل بائیکاٹ کر رکھا تھا اور طعام تنہائی کی سزا

اُستاد کی موت پر شاگرد کا نوحہ

انور حسینؔ (ورنگل)

تازہ تازہ غزلیں کہہ کر کون اب دے گا مجھے
آہ رخصت ہو گیا تو چھوڑ کر تنہا مجھے

اُلٹے سیدھے شعر جا کر کس کو سنواؤں گا مَیں
کس سے کرواؤں گا تصحیح کس کو دِکھلاؤں گا مَیں

تیرے دَم سے تھا میں زندہ ورنہ میرا کیا شمار
تیرے دَم سے شاعری میں میری آتی تھی بہار

کیوں نہیں ہوتی ہے مجھ سے اب وہ پہلی سی غزل
فکر کے مرجھا گئے ہوں جیسے سب کے سب کنول

تیرے مضموں میرے شعروں میں جو اب آتے نہیں
اس لئے لوگوں کو میرے شعر بھی بھاتے نہیں

عرف ہوٹنگ کا نشانہ بَن رہا ہُوں مَیں مُدام
شاعری میں مِل سکا نہ آج تک کوئی مقام

یُوں تو بچپن ہی سے مَیں بھی شعر کہتا ہوں مگر
مَردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

سوچتا ہوں بزم تیرے نام سے قائم کروں
صدر بھی میں ہی رہوں اور معتمد بھی مَیں بنوں

کاروبارِ زندگی سے بھی کبھی فرصت مِلے
ڈھونڈتا ہوں کوئی عہدہ تاکہ کچھ شہرت مِلے

لَوٹ کر تو اِس جہاں میں پھر سے آ سکتا نہیں
شاعری میں، مَیں بھی کوئی نام پا سکتا نہیں

بیگم کی جُوتیاں

یٰسین آفتابیؔ

جس کی سمجھ میں آتی ہیں بیگم کی جُوتیاں
ہر روز اُس نے کھائی ہیں بیگم کی جُوتیاں

معراجِ عشق سب کو میسّر نہیں یہاں
مَیں نے کہاں اُٹھائی ہیں بیگم کی جُوتیاں

تکمیلِ عشق کے لیئے لازم ہے دوستو
بے وجہ کس نے کھائی ہیں بیگم کی جُوتیاں

اللہ اُس کو اَجر دے جس کا کمال ہے
مضبوط کیا بنائی ہیں بیگم کی جُوتیاں

ہوگا نہ کوئی ہم سا معزز جہان میں
ہاں! ہم نے روز کھائی ہیں بیگم کی جُوتیاں

ان کے طفیل مجھ کو شہادت نصیب ہو
یہ سوچ کر بنائی ہیں بیگم کی جُوتیاں

تحسینِ ناشناس نے سمجھا نہ آج تک
کیوں میرے دِل کو بھائی ہیں بیگم کی جُوتیاں

نظام الدین نظام

بہت پچھتائے اَدبی شخصیّت سے مل کر!

پتھر کے زمانے سے بتدریج ترقی کرتے ہوئے آج ہم جس دَور پر پتھر برسا رہے ہیں۔ اُسے "فیشن کا زمانہ" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ فیشن کے اس زمانے کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کوئی شخص اس وقت تک "ترقی یافتہ، مہذب اور تعلیم یافتہ" تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ فیشن کے تقاضوں کو پورا نہ کرے اسی لئے ہم آج اپنے اطراف کپڑوں، جوتوں، بالوں اور موٹر کاروں کے جتنے نمونے دیکھتے ہیں۔ شاید ہوا ہیں جراثیم کی تعداد اتنی نہ ہو۔

بہرحال اس "تمہید طوفانی" کے بعد مدعائے بیان بے حد مختصر ہے کہ فیشن کے اس زمانے میں فیشن کے تقاضوں کو پورا کرنا اور اُس کے وضع کردہ قوانین (جن کے مستند ہونے کی کوئی سند نہیں) پر عمل کرنا ہر کس و ناکس کے لیئے لازم ہے بشرطیکہ وہ خود کو سوسائٹی کا ایک فرد سمجھتا ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی سوسائٹی کے ایک فرد ہیں۔ اور فرد ہونے کے ناطے ہم نے چند مشاغل "اختیاری مضمون" کے طور پر اختیار کر رکھے ہیں۔ ہمارا پہلا مشغلہ ہے، ادبی شخصیتوں سے ملاقات کرنا۔ مگر آپ یہ نہ سمجھئے کہ ہم سچ مچ ادبی شخصیتوں سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کرتے ہیں، ایسا ہرگز نہیں کیوں کہ ادبی شخصیتوں سے ملتے ہوئے ہمیں بڑا ڈر لگتا ہے کیونکہ ہم انتہائی بے ادب واقع ہوئے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہم اپنے دوستوں کے درمیان اپنی اسی "ہابی" کا تذکرہ بار بار اس لئے بھی کرتے رہتے ہیں کہ ہم اس جھوٹ کو آسانی سے نبھا سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ دس بارہ اشعار ہمیں ازبر ہیں، دو چار افسانوں کو توڑ موڑ کر اپنے مخصوص انداز میں سُنا سکتے ہیں۔ (یہ الگ بات ہے کہ افسانہ سُنتے وقت لوگ ہمارے افسانے کو سُننے کے بجائے ہمارے چہرے کو بڑے غور سے پڑھتے ہیں)۔

ہم بہت پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ "ادبی شخصیتوں سے ملاقات" ہمارا بے حد پسندیدہ مشغلہ ہے اور ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے بظاہر کوئی نقصان نظر نہ آتا تھا۔ لیکن اُس دن کے واقعہ کے بعد ہمیں اپنا یہ خیال بدل دینا پڑا اور تردید کرنی پڑی کہ اس میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ ہوا یُوں کہ ہمارے ایک دوست ہیں غازؔ بدایونی، نام تو خدا جانے اُن کا کیا ہے مگر غازؔ تخلص فرماتے ہیں اور غلطی سے بدایون کی سرزمین پر جلوہ افروز ہوئے تھے اس لیئے بدایونی ہو گئے تھے ایک شام وہ ہمارے گھر آ پہنچے، بڑے خوش نظر آ رہے تھے اور آتے ہی انہوں نے ہمیں خوشخبری سُنائی کہ آئندہ اتوار کی شام وہ ہمیں ایک "اَدب گیر" شخصیت سے ملائیں گے ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر وہ عظیم ہستی کون ہے ہمارے بے حد اصرار پر انھوں نے بتایا کہ وہ عظیم شخصیت ایک شاعر ہے اور نور اللہ خاں طالب اُس کا نام گرامی ہے۔ نام سُن کر ہمارا جی بہت چاہا کہ غازؔ صاحب سے دریافت کریں کہ "نور اللہ خاں طالب کا شجرہ کیا اسد اللہ خاں غالب سے ملتا ہے؟" مگر ہمیں فوراً یاد آ گیا کہ فیشن کے اس دَور میں امیٹیشن (Imitation) اصل سے زیادہ قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے اس لئے

ہم خاموش رہے اور ہماری خاموشی کو اقرار جان کر خاؔر بدایونی انوار کی شام واقعی اپنے ساتھ نوراللہ خاں طاؔلب کو لئے "ویران کدے" پر آدھمکے ہم اُن سے واقف تو نہ تھے مگر جب خاؔر صاحب نے باقاعدہ تعارف کرایا تو ہمیں اپنے اندازے پر کوئی تعجب نہ ہوا کیونکہ وضع قطع سے وہ شاعر سے کہیں زیادہ پٹھان لگتے تھے۔ ہم نے پچھلے چھبیس برسوں میں اِن گلی کوچوں میں اس قدر تندرست شاعر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہمیں تو وہ کسی زاویہ سے شاعر نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ مگر کس میں اتنی ہمت تھی کہ اُن کے جثہ کو دیکھتے ہوئے شاعر نہ ہونے کا اعلان کریں۔ اُن کے بھاری بھرکم جسم کو دیکھنے کے بعد اپنے اندر اتنی جسارت نہ پائی کہ انھیں شاعر تسلیم کرنے سے انکار کر دیں اس لئے بلا تامل اُن سے مصافحہ کیا گویا تسلیم کر لیا کہ بلاشبہ آپ شاعر ہیں۔ رسمی گفتگو کے بعد خاؔر بدایونی نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں نوراللہ خاں طاؔلب کو جب یہ بتایا کہ ہم شعر سمجھنے کا شعور رکھتے ہیں تو یکایک نوراللہ خاں طاؔلب کو اپنے سارے اشعار لاشعور سے شعور میں آنے لگے۔ اور پھر انھوں نے ہمیں جو اشعار سنانے شروع کئے تو خدا کی پناہ! اور جب چار گھنٹے کی اس مختصر نشست میں (بقول ان کے) اپنے سارے غیر مطبوعہ اشعار ہمیں سنا چکے تو پھر دوسرے شاعروں پر تبصرہ شروع کر دیا۔ ہم اُن کے ہر ہر جملے پر پہلو بدل رہے ہیں۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج بھی چکے تھے لیکن طاؔلب کی طلب گفتار کی تسکین نہیں ہوئی تھی بالآخر ہم نے سوچا کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ زہر کو زہر مارتا ہے اس لئے کیوں نہ ہم بھی بے تکی بکواس شروع کر دیں اور جب کچھ دیر بعد طاؔلب صاحب نے ہمیں ایک ایسا عامیانہ شعر جس میں محبوب کی چال کی تعریف کی گئی تھی، ہمیں سنایا تو ہم موقع کو غنیمت جان کر یوں لب کشا ہوئے کہ "بھئی چال تو ہیما مالنی کی ہے، خدا کی قسم! ظالم۔ جب چلتی ہے تو محسوس ہوتا ہے ناگن پگ پگ دھرتی چوم رہی ہے" اور پھر جو ہم نے سلسلہ شروع کیا تو راکھی، ریکھا، نیتو سنگھ جیہ بہادری، شبانہ، غرض کہ ہر کافر ادا کی کافر چال پر اظہارِ خیال کر گئے۔ طاؔلب صاحب بہت حواس باختہ ہوئے کہ بیٹھے بٹھائے یہ اچانک ہم بہک کیسے گئے پہلے تو بڑی شد و مد سے نوراللہ خاں طاؔلب گفتگو کا رُخ موڑنے کی کوشش کرتے رہے اور جب دیکھا کہ ہم کسی طرح فلمی اداکاروں کے ٹاپک سے ہٹنے کو تیار ہی نہیں تو اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا "بھئی مجھے ایک خصوصی نشست میں شرکت کرنا ہے آپ خیال نہ فرمائیں تو میں اجازت چاہوں گا" اندھے کو کیا چاہئیے۔؟ ایک آنکھ بھی مل جائے تو چل جائے مگر ہم چاہتے تھے طاؔلب اور خاؔر دونوں چلے جائیں اور خدا خدا کرکے وہ چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد ہم چارپائی پر سے اُٹھے تو سر چکراتا محسوس ہو رہا تھا۔ "اسپرو" کی دو گولیاں کھائیں اور خدا جانے کب سو گئے، صبح نمودار ہوئی اور آنکھ کھلی تو بستر پر ہی عہد کیا کہ اب کسی "ادبی شخصیت" سے ملنے کی بے ادبی نہ کریں گے۔ ●●

خالد رحیم

خاکہ نمبر (۲)

چاہتے ہیں آپ شادی پر جہیز

آپ کی تعلیم انٹر تک ہے بس۔!
اِس پہ حضرت بن رہے ہیں بوالہوس
دفترِ سرکار میں ہیں پیش کار!
اس لئے ہے آپ کو رشوت سے پیار!
اپنا گھر بھرنے کو دولت چاہیئے
آپ کو شادی پہ رشوت چاہیئے
سیکڑوں ڈیمانڈ کی کرتے ہیں بات
لیکے فہرستوں کی چلتے ہیں برات
خُسر کی غربت نہیں پیشِ نظر،
مانگتے ہیں آپ رہنے کو بھی گھر،
ایک اسکوٹر بھی لیں گے ساتھ میں
اک گھڑی اچھی سی کوئی ہاتھ میں
سُوٹ ٹیری کاٹ کا اِک چاہیئے
اور پنکھا رُوم میں لگوا دیجیئے

دو پلنگیں اور الماری بھی تین
چاہیئے سلوائی کو اُوشا مشین
صوفہ سیٹ بھی چاہیئے حضرت اُنھیں
ریڈیو، سائیکل کی بھی حاجت اُنھیں
دیجئے اِسٹیل کا برتن ضرور
اور بریانی فقط 'دس مَن' ضرور
ڈنکا شہرت کا وہ یُوں بجوائیں گے
شہر بھر کے لوگ ہمراہ لائیں گے
دس بھری سونے کی سکڑی چاہیئے
نقد میں نوٹوں کی گڈی چاہیئے
ڈھونڈتے ہیں کب شریکِ ہم سفر!
خُسر کی دولت پہ رکھتے ہیں نظر!
کیجئے ڈیمانڈ پُورا کیجئے
جو طلب ہو اِن کی، فوراً دیجئے

ورنہ شادی سے یہ کرلیں گے گریز
چاہتے ہیں آپ شادی پر جہیز

خاکہ نمبر (۳)

آپ ہیں اِک شاعرِ رنگیں نوا

قد کے چھوٹے ہیں مگر گڑ ے ہیں آپ
آپ کی ڈاڑھی بہت ہے شاندار
دُھن میں قوالی کی گاتے ہیں غزل
آپ کی رنگیں بیانی خوب ہے
بزم ہو جاتی ہے ساری ڈانواں ڈول
محفلوں میں جب کبھی آتے ہیں آپ
پڑھ رہے ہیں کس روانی سے کلام

پھوپھی بیگم سے بہت ڈرتے ہیں آپ
ہے بڑھاپے پر جوانی کی بہار
گٹکری لے کر سُناتے ہیں غزل
شعر میں جوشِ جوانی خوب ہے
ہے ترنم آپ کا' ہاتھی کا بول
چند لونڈوں کو بھی لے جاتے ہیں آپ
لے رہے ہیں کچھ حسینوں کا بھی نام

پڑھتے پڑھتے آنکھ بھی سینکا کیئے
مہ جبینوں کی طرف دیکھا کیئے
اِک اشارہ چل رہا ہے بات میں
اپنی ڈاڑھی کو پکڑ کر ہاتھ میں
ہنس پڑے کچھ چلبلے بچے اُدھر
کچھ بزرگوں نے بھی ٹوکا دیکھ کر
ایک انڈا آپ کے سر پر گرا
ہائے چہرہ کتنا گندہ ہوگیا
بہہ چلی داڑھی پہ زردی تار تار
واہ کیا چہرے پہ آئی ہے بہار
ہوگئی ہے آپ کی اچکن خراب
لگ گیا دھبّہ ہُوا دامن خراب
ایک کونے میں کھڑے ہیں محترم
کوستے ہیں شاعری کو دم بہ دم
کھا کے قسمیں کر رہے ہیں دل میں عزم
اب نہ جائیں گے کسی کی بھی ہو بزم
شاعری سے تو بھلا بیڑا پار ہے
یہ مُوئی تو اب خُدا کی مار ہے
منقطع ہے شاعری کا سلسلہ
آپ ہیں اِک شاعرِ رنگیں نوا

دو چوّے

مہنگا اناج اِن دنوں سستا دکھائی دے
سیٹھوں کو جیل خانہ کا رستا دکھائی دے
کیا لکھ پتی، کروڑ پتی اور ارب پتی
اِن سب کا حال دوستو پتلا دکھائی دے!

اَن پڑھ (بھونگیری)

سالن کے لئے تیل ضروری ہے دوستو
ہنڈی کے لئے بیل ضروری ہے دوستو
رجعت پسند، فرقہ پرستوں کو آج کل!
بھجوانا سیدھا جیل ضروری ہے دوستو

انجم مان پوری

تعارف

انجم مانپوری بہار کے وہ منفرد انشاء پرداز اور مزاح نگار ہیں جنھوں نے اُردو طنز و مزاح کو سرشار کے خوجی، سجاد حسین کے حاجی بغلول اور امتیاز علی تاج کے چچا چھکن کی طرح "میر کلو" کا یادگار اور بے مثال کیرکٹر عطا کیا ہے۔ "میر کلو" کا کیرکٹر اُردو طنز و مزاح کے ادب میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ مانپوری کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے میر کلو کا کیرکٹر ہی کافی ہے۔ مانپوری کے میر کلو کا کیرکٹر ایک تخلیقی کیرکٹر ہے، یہ کسی کا چربہ نہیں۔

مانپوری نے سماج، سیاست اور معاشرہ کی گندگیوں اور غلاظتوں پر خوب خوب طنز کیا ہے۔ انھوں نے سماجی، سیاسی اور تعلیمی مسائل کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ دوسروں پر ہنسنے سے قبل خود پر ہنستے ہیں اور ہنسی ہنسی میں ایسی بات وہ کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی چبھن کو محسوس کیئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے طنزیہ مضامین میں "کرایہ کی ٹم ٹم"۔ "سکنڈ ہینڈ موٹر"۔ "میرا روزہ"۔ "اینٹی فادر کانفرنس"۔ "مرنے کے بعد"۔ "میری عید" — "میر کلو کی گواہی" کافی پسند کیئے گئے ہیں۔ ان کی تصانیف "طنزیات مانپوری" (حصہ اول و دوم) "مطائبات مانپوری" اور "مرنے کے بعد" شہرتِ دوام حاصل کر چکی ہیں۔

مانپوری کا قلم، جس طرح نثر میں طنز و مزاح کے گُل بُوٹے کھلاتا ہے، اسی طرح نظم و غزل میں ان کا اپنا ایک الگ رنگ اور اسٹائیل ہے۔ افسوس ہے کہ مانپوری کو اُردو طنز و ظرافت میں جو مقام ملنا چاہیئے تھا، نہ مل سکا علامہ جمیل مظہری نے ان کی ناقدری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

> "مانپوری ابھی تک اپنے ہم وطنوں کی چشمِ اعتبار میں اپنی جگہ نہیں بنا سکا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ مانپوری اس کا مستحق نہ تھا بلکہ سچ پوچھئے تو اعتبار کی آنکھوں میں کمال کے لئے جگہ نہ تھی اور مانپوری کے پاس صرف کمال تھا۔"

مانپوری، مانپور (گیا) میں ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے اور ۲۷ر اگست ۱۹۵۸ء میں ۷۷ برس کی عُمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی ایک نظم اور ایک طنزیہ و مزاحیہ مضمون "شگوفہ" کے قارئین کی نذر ہیں۔

معین شاہد، (ایڈیٹر: آدرش۔ گیا (بہار)

انجم مانپوری

مرنے کے بعد!

دوستوں عزیزوں کے یہاں کی تقریب شادی اور برات کی معیت کی شرکت تو خیر ایک بات ہوئی۔ تقریب کی چہل پہل، برات کی دھوم دھام کے علاوہ پر تکلف دعوتوں کے باعث ہم خرما و ہم ثواب بلکہ ہم قورمہ و ہم کباب سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن یہ جنازہ اور تجہیز و تکفین میں شریک ہو کر خواہ مخواہ بلا وجہ مغموم صورت بنائے بار بار لاش برداری کی بیگار کا کام انجام دینا بلکہ تا اختتام تجہیز و تکفین مصنوعی رونی صورت بنا کر خود کو اور دوسروں کی طبیعت کو مکدر کئے رہنا، آپ ہی کہئے کس قدر غیر شاعرانہ اور تکلیف دہ حرکت ہے۔ اور خاص کر مجھ جیسے زندہ دل اور شگفتہ مزاج کے لئے کئی کئی گھنٹے مردنی کیفیت اپنے اوپر طاری کئے رہنا کیسی روح فرسا مصیبت ہے۔ آپ کہیں گے جنازہ کے ماتمی جلوس میں خواہ مخواہ کی شرکت کے لئے آپ کو مجبور کون کرتا ہے۔ اور یہ شکایت کس سے ہے؟ کہنے کو تو آپ کہہ گئے۔ اور بظاہر ایک طرح سے آپ کی یہ بات معقول بھی معلوم ہوتی ہے۔ اور حتی الامکان تجہیز و تکفین وغیرہ جیسے پژمردہ کن مواقع سے بچنے کی کوشش بھی کرتا رہتا ہوں۔ لیکن اس اتفاقی حادثہ کو کیا کہیے کہ کل مارکٹ جاتے ہوئے راستہ میں ایک دوست کے نانا جان کے جنازہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس جگہ کوئی چوراہا یا اغل بغل کوئی گلی بھی نہیں تھی کہ نظر بچا کر کترا جاتا اور پھر بھائی شمو کا آگے بڑھ کر یہ کہنا کہ تم نے دیر کیوں کی۔ مرتا دلے بر ندش قبرستان تک ساتھ دینا پڑا۔ گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں شرکاء جنازہ کے ساتھ تا اختتام تجہیز مرگ اجزہ جشنے دارد سمجھ کر قبرستان میں ٹھہرنا پڑا۔ اس درمیان میں بہت سے اعزہ و احباب کی شکستہ حال قبروں کا عبرتناک منظر غمناک اثر لئے ہوئے۔ جو گھر واپس لوٹا تو شام کو سینما یا دوستوں کی دلچسپ صحبت میں جانے کے لئے طبیعت مائل نہ ہوئی۔ قبرستان کا سماں، کچھ اس طرح آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ پریشان کن خیالات کو دماغ سے نکالنے کے لئے سویرے ہی سے کھانا کھا کر سو رہنے کی کوشش کے باوجود ایک بجے شب تک نیند نہ آئی۔ بار بار حضرت غالب کا یہ شعر دہراتا رہا ؎

موت کا ایک دن معین ہے ⁂ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آخر خدا خدا کر کے دو بجے آخری شب کو اس متوحش تخیل سے دماغ پر کچھ غنودگی طاری ہوئی اور پھر نیند آ گئی — غالباً شب کے تین بجے ہوں گے کہ یکایک سینہ میں کچھ درد محسوس ہوا اور معلوم ہوا جیسے کسی نے کلیجہ کو چٹکی سے رگڑ کر مسل دیا ہو۔ منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ یہ دردناک چیخ سن کر گھر کے کل لوگ دوڑ پڑے۔ اور گرد جمع ہو کر گھبرائی آوازوں میں زور زور سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا۔ کیسی حالت ہے! اب لاکھ کوشش کرتا ہوں مگر حلق سے آواز ہی نہیں نکلتی۔ فوراً آدھ گھنٹے کے اندر کئی ڈاکٹر مع سول سرجن یکے بعد دیگرے بلا لئے گئے ان سب کے پہونچتے پہونچتے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون ہو گیا اور میری روح جسم سے علیحدہ کر دی گئی سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ کوئی تو یہ کہہ کر آہ و بکا کر رہا ہے مرحوم کون اب

ے گا ۔ کوئی یہ کہہ کر پچھاڑیں کھا رہا ہے کہ اب کس کا سہارا ڈھونڈوں کسی کو اپنے ر ۔۔ پرست کے پہل
نے سا غم کسی کو اپنے بے یار و مدد گار رہنے کا ماتم ۔ موت کے بعد مرنے والے پہ کیا گزرے گی اس کا غم نہیں
، اُن کے بعد ہماری کیسے گزرے گی اس پہ واویلا ہے ۔ میری روح لاش کے سرہانے " ایک ہنگامہ پہ موقوف
ے گھر کی رونق " کا تماشہ دیکھ کر متحیر تھی ۔ اور ماتم کرنے والوں سے کہہ رہی تھی کہ مرنے والے کی
، بےبسی اور بےکسی پر آنسو بہانے کے بدلے اپنے بے یار و مدد گار ہونے کا کیا دکھڑا رو رہے ہو مگر
ں آہ واویلا کے ہنگامہ میں یہ صدا نقارخانہ میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی ۔ اور طوطی بھی وہ جس کا گلا گھونٹ
اسے پنجرے سے باہر پھینک دیا ہو ۔ صبح ہوتے ہوتے میرے چل بسنے کی خبر بجلی کی طرح پھیل گئی میں سمجھے
ئے تھا یہ غمناک خبر سُن کر پورا محلہ اور دوسرے محلے کے احباب و اعزہ بھی دوڑ پڑیں گے اور سارے شہر
، جا بجا میرے مرنے کی المناک خبر کا چرچا ہر زبان پر ہوگا ۔ زندگی میں اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی دیکھ
اکثر شب کو تنہائی میں اس تصور سے ایک طرح کی لذت محسوس کرتا تھا کہ میرے مرنے کی خبر پا کر احباب و اعزہ
س قدر رنج و افسوس ہوگا ۔ ہر جلسہ ہر صحبت میں میری کمی محسوس کر کے کیسے کیسے حسرتناک الفاظ سے میری دلچسپ
شگو اور میری دوست پرستی کا روزانہ تذکرہ رہے گا ۔ لیکن جب سچ مچ میری موت کا یہ سانحہ عظیم پیش آ ہی گیا
یکھا کہ کسی کے کان پہ جوں تک نہ رینگی ۔ نہ کسی کی پیٹھ میں کھٹمل نے کاٹا ، نہ ناک میں مچھر گھسا ۔ یعنی دنیا میں جیسے
ئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہی نہیں ۔ صرف ہمسایہ کے چند لوگ آ آ کر یکے بعد دیگرے پوچھ گئے کہ جنازہ کتنے بجے روانہ ہوگا
نہ قبرستان کے مجاور شاہ نے خبر پاتے ہی ازراہ ہمدردی فقراء میں تقسیم کے لئے غلہ اور نانبائی کے یہاں روٹی وغیرہ
نتظام کا سارا بوجھ اپنے سر لے لیا ۔ عزیزوں میں سے ایک نوجوان شہر کے اعزہ و احباب و ملاقاتیوں کو میری موت
افسوسناک خبر دینے کے لئے سائیکل پر سوار ہو کر چلا تو یہ سوچ کر کہ میری رحلت کی اندوہناک خبر سن کر رات دن کے
اٹھنے بیٹھنے والوں پہ کیا گزرتی ہے ۔ اس غمناک منظر کو دیکھنے کے لئے میں ، یعنی میری روح بھی اس خبر رساں کے ساتھ
نہ ہو گئی ۔ پہلے بھائی غوث کے یہاں پہونچ کر اس نے یہ کہا کہ آپ کے دلی دوست ما نپوری صاحب رات دار فانی
ے دارالبقا کو سدھار گئے ۔ بھائی غوث چائے پی رہے تھے اور اس چائے نوشی کے ساتھ چند لوگوں کے ساتھ
ش گپیوں میں مصروف تھے ۔ میں نے سمجھا تھا کہ اس حادثۂ عظیم کی خبر سنتے ہی گرم گرم چائے کی پیالی ہاتھ سے
ٹ کر گر جائے گی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں گے ۔ مگر نہایت ہی سرد مہری کے ساتھ سن کر اپنے ملازم
ے کہا کہ دو چار کیک اور انڈے ناڈ سپلائی آفس سے ہو کر اسی طرف وہاں جاؤں گا ۔ پھر خدا جانے قبرستان سے
، نجات ملتی ہے ۔ یہ سن کر پاؤں کے نیچے سے زمین ہی نہیں ، آسمان ، زمین بلکہ ساری دنیا نکل گئی ۔

وہاں سے چل کر بچپن کے ساتھی ایک جان دو قالب بھائی شفیق کے یہاں پہونچ کر خبر دہندہ نے جو اس المناک
نو کی اطلاع دی تو اس محب صادق نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کی وجہ جنازہ کی نماز تو جامع مسجد ہی میں ہوگی ، میں
ریک ہو جاؤں گا ۔ خبر رساں صاحب وہاں سے میرے خاص دوست مسٹر کمال ، وکیل کے یہاں جو خبر دینے پہونچے تو
یکھا کہ کسی خون کے مقدمہ کی مثل دیکھنے میں ایسے منہمک ہیں کہ میری غیر محسوس روح کو تو کیا دیکھتے ، سامنے کھڑے
ہوئے اس مخبر تک کے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی ۔ جب انہوں نے کہا کہ رات آپ کے دوست کی موت کا سانحہ عظیم
واقعہ ہو گیا ، عالم استغراق میں دوست وغیرہ کا لفظ تو انہوں نے خیال نہ کیا ۔ موت اور سانحہ کا لفظ سن کر اسی
مشغولیت کے عالم میں سر نیچے کئے ہوئے کہا کہ ان میں مدعی کون ہے اور موت کا سانحہ یعنی اطلاع اول لینے آنا

ـس کے بعد فیس وغیرہ کی بات طے ہوگی۔ ان فنا فی المقدمہ وکیل صاحب کی یہ بے نیازی اور بے پروائی
یکھ کر میرا پیغامبر موت غصہ میں جب یہ بڑبڑاتا ہوا زینے سے نیچے اترا کہ مانپوری صاحب زندہ ہوتے تو اسں
ـت ان کی زبان سے یہ مصرع ضرور نکلتا ع

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

مانپوری صاحب زندہ ہونے کا جملہ جو سُنا تو چونک کر واپس بلایا اور بہ دُرستگی ہوش وحواس جو میری
گہاں رحلت کی خبر سُنی تو مقدمہ کی تاریخ کی عُذرداری پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تاریخ بڑھ گئی یا اگر مقدمہ
ویسے ختم ہوا یا اگر فریق نے مہلت کی درخواست دے دی' غرض کہ اگر موقع ملا تو ضرور آنے کی کوشش کروں
ا۔ میری زبان روح بے چاری کیا بولتی۔ خبر دہندہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے واپس ہوئی کہ جب قیامت کی عدالت
ں دوستی کے خون کرنے والوں سے باز پرس ہوگی تو یہ ساری کج بحثی رہ جائے گی۔

انہیں دو تین احباب کی بے رُخی اور سرد مہری کو دیکھ کر جی چاہا کہ خبر رساں کو اور دوسرے لوگوں کے یہاں
جانے سے یہ کہہ کر روک دوں کہ تجہیز وتکفین میں لوگوں کی شرکت کی ایسی کی تیسی جنازہ کے ساتھ جاکر یہ سیدھے
جنت میں تھوڑے ہی پہونچا دیں گے۔ کیوں یار دوست بن کر ان نمائشی دوستوں کا اپنے کندھے پر احسان
لوں۔ مگر میری روح کی آواز کون سُنتا۔ خبر دہندہ صاحب نے اس خیال سے قصاب ٹولہ' کچہری روڈ'
معروف گنج' گیوال بیگھہ وغیرہ شہر کے قریب قریب تمام محلوں میں جاکر انتقال پر ملال کی خبر دے دی کہ کسی عزیز
کسی دوست' کسی ملاقاتی کو آئندہ کہنے کا موقع نہ مل جائے کہ۔ ع

"ہم بھی شریک ہوتے ملتی خبر جو پہلے"

لیکن یہ خبر سُن کر جن جن لفظوں میں اظہار افسوس کیا گیا اگر آپ سُنیں گے تو میرے دفن ہونے سے پہلے آپ
خود مارے شرم کے زمین میں گڑ جائیں گے۔ اِن لوگوں کا اظہار افسوس میری رحلت پر نہیں بلکہ جنازہ میں عدم
شرکت پر تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اِن کے اس زرّین سبق آموز جملے کندہ کر کے لوحِ تربت بنا لوں۔ ایک صاحب
نے نہایت مغموم صورت بنا کر فرمایا۔ "افسوس آج ہی ایسے بے موقع وقت میں ان کا انتقال ہوا جب آج میرے
مقدمہ کی تاریخ ہے" اب' ان سے کون کہتا کہ کاش! مرنے والے کو آپ کے مقدمہ کی تاریخ ایک روز بھی پہلے
معلوم ہو جاتی تو جنتری دیکھ کر ملک الموت سے مہلت لے کر اپنے مرنے کی تاریخ بڑھوا دیتے۔

دوسرے ایک جان دو قالب صاحب نے جان چھڑانے کے لئے جب یہ فرمایا کہ "اس سے بڑھ کر اور میری
بدقسمتی کیا ہوگی......" میں سمجھے ہوئے تھا کہ اس جملہ کے بعد یقینی دوسرا جملہ کہ "ایک رنج وغم کا شریک دوست
ہم سے علحدہ ہو گیا" ہوگا مگر نہیں یہ جملہ نہیں بلکہ بدقسمتی کی وجہ "اپنے ایک ضروری کام کے باعث اس نے
جن جن لفظوں میں اپنی عدم شرکت پر افسوس کا اظہار کیا بہتر ہے آپ نہ سنیں ورنہ کہیں آپ اپنے دوستوں
کا باٹکاٹ نہ کر دیں۔

مختصر یہ ہے کہ پورے شہر کی گشت سے فرصت پا کر جب میری روح اپنے خبر رساں کے ساتھ واپس
پہونچی تو دیکھا جنازہ تیار ہے۔ نماز جمعہ کے وقت اور شریک ہونے والوں کا مزید انتظار کے بعد تقریباً
نماز جمعہ کے پندرہ منٹ قبل اپنے خاص عزیزوں اور محلے کے لوگوں نے جنازہ اٹھائے ہوئے جامع مسجد
کے بیچ پھاٹک کے زینے کے سامنے رکھ دیا۔ اور بعد نماز جمعہ جلد جلد سنت و نفل پڑھ کر یکے بعد دیگرے

زی مسجد سے نکل کر جو صف بندی شروع کی تو شمالی پھاٹک سے لے کر چھوٹی مسجد تک پوری سڑک
ں سے بھر گئی۔ اپنے جنازہ میں اس بھیڑ اور عظیم الشان جماعت دیکھ کر جو انتہائی مسرت ہوئی اس کا
ہ لوگ کر ہی نہیں سکتے۔ لوگوں کے اس خلوص و محبت اور اپنی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا پر ایک روحانی ــــ
ا محسوس کر رہا تھا۔ اور اس پر ناز کر رہا تھا کہ شاید ہی اس شہر میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کے
کے ساتھ اتنا بڑا مجمع قبرستان تک گیا ہو۔ لیکن تھوڑے ہی دیر کے بعد جب دیکھا کہ ادھر جنازہ کی نماز
ری اور ابھی جنازہ اٹھایا بھی نہیں گیا، پوری بھیڑ ادھر ادھر چھٹنی شروع ہو گئی۔ پانچ منٹ کے اندر ۸۰ فی
آدمی چلتے بنے۔

اور بقیہ بیس (۲۰) فی صد آدمیوں میں سے جنازہ کے ساتھ تھوڑی دور چل کر ہر چوراہے پر دو دو چار
ر کے چھٹنا شروع ہوئے۔ چوتھے چوراہے تک لے دے کے صرف پندرہ بیس (۲۰) آدمی مروتاً
تاً یا بے موقع پھنس جانے کی وجہ سے ساتھ رہ گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ ہوا کیا۔ کسی شاعر کا یہ مصرع۔

نکلے تھے میکدہ سے کہ دنیا بدل گئی

میکدہ کی جگہ اگر غمکدہ بنا دیا جائے تو اس وقت کے لئے بالکل مناسب حال تھا۔ ان باقیات الصالحات
ی حال سن لیجئے۔ سوائے ان چھ سات عزیزوں کے جو یکے بعد دیگرے کاندھا بدلتے جا رہے تھے بقیہ
جنازہ سے دور پیچھے پیچھے اس طرح آپس میں ہنسی مذاق کرتے جا رہے تھے جیسے جنازہ میں نہیں بلکہ کسی
ن کے جلوس میں شرکت فرما رہے ہیں میں کر ہی کیا سکتا تھا، مردہ بدست زندہ آنسو بہاتے یا ہنستے کھیلتے
بال ودش کو قبرستان تک پہونچا کر جس طرح چاہیں اس بیگاری سے سبکدوشی حاصل کریں۔

مختصر یہ کر رواں دواں قبرستان میں پہنچ کر لوگوں نے جب میری قبر کے قریب جنازہ کو رکھا تو بعض صاحبوں نے
یکھ کر کہ قبر کی تیاری میں ابھی آدھ گھنٹہ کی دیر ہے تو خفگی آمیز لہجے میں میرے عزیزوں سے کہا کہ کیا انتظام ہے
ی تک قبر تیار نہیں۔ کب تک آدمی اس گرمی کی دھوپ میں کھڑا رہے۔ چنانچہ چند حضرات بغیر دفن کئے واپس
نہ ہو گئے۔ بقیہ جو لوگ رہ گئے قریب ہی مختلف درختوں کے سایہ میں جا بیٹھے اور وقت کاٹنے کے لئے
ی گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ یہ خیال کر کے کہ سامنے رکھی ہوئی میری لاش کو دیکھ کر میری افسوسناک موت
رنج و غم کا اظہار کر رہے ہوں گے۔ میری روح نے ہر ایک ٹولی کے پاس جا جا کر جو ان کی باہمی گفتگو سنی
جائے میرے تذکرے کے ــــــ دوسری خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ سامنے قبر کی یعنی بلیک ہول کا عبرتناک
ر رہتے ہوئے بلیک مارکٹنگ کا تذکرہ تھا۔ دوسری ٹولی میں لوگ اپنی تجارت میں گھاٹے پر اظہار افسوس
رہے تھے۔ خسرت دنیا کے ساتھ خسرت الآخرۃ کا بھی سامان کر رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر عبرتناک بلکہ
ناک بعض نوجوانوں کی گفتگو شہر میں آئی ہوئی فلمی ایکٹریسوں سے متعلق تھی۔ سامنے میری لاش اور قبر کی
دی کا المناک سبق رہتے ہوئے فلم کی کامیڈی پر ہنس ہنس کر مذاق ہو رہا تھا۔ آدھ گھنٹہ کے اندر جب
ں رکھ کر اوپر سے تختہ پاٹا گیا۔ اور ابھی بلداروں نے مٹی کو بھرنا شروع ہی کیا تھا کہ فوراً اپنی اپنی جگہ سے
اٹھ کر تدفین کی مصیبت سے جلد نجات پانے کی غرض سے یاروں نے دو دو چار چار مٹھی مٹی لے کر ادھر
پھینکا اور بغیر اس کا انتظار کئے کہ کم از کم مٹی سے قبر کی گہرائی سطح زمین کے برابر ہو، جو گھر کی طرف رخ
یا تو پھر مڑ کر شاید اس خیال سے دیکھا تک نہیں کہ کہیں لاش قبر کا تختہ توڑ کر ان لوگوں کو رگید کر دبوچ نہ لے اور

قبریں اپنے ساتھ دھنسا رہے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر میری روح غصہ میں چلّا چلّا کر ان بھگوڑوں سے مخاطب ہوکر کہنے لگی۔ "بے مروتو! منافقو! خود غرضو! کب تک قبرستان سے بھاگو گے؟" میں انتہائی غیض و غضب کے عالم میں چلّا رہا تھا، یکایک محسوس ہوا کہ کوئی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا ہے۔ "سرکار نیند میں کیا بڑبڑا رہے ہیں اتنی دھوپ نکل گئی۔" گھبرا کر آنکھ کھلی تو دیکھا۔ رمضانی ایک طرف جھنجھوڑ رہا ہے۔ دوسری طرف میرے عزیزوں کو پکار کر کہہ رہا ہے۔ کہ نجانے کیوں منافقو' خود غرضو' قبرستان سے کب تک بھاگو گے۔ نیند میں زور زور سے بول رہے ہیں۔ میں ہنسا۔ سے فوراً اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف نگاہ کر کے دیکھا کہ خدا کے فضل سے صحیح و سالم زندہ ہوں اس وقت کی خوشی کا اندازہ وہی صاحب کر سکتے ہیں جنہیں دوبارہ زندگی ملی ہو۔

یہ خواب گرچہ ان پریشان کن خیالات کا نتیجہ تھا جو کل قبرستان کے عبرتناک منظر کا گہرا اثر لے کر آیا تھا۔ اور جس نے نصف شب تک موت کے تصور میں مبتلا رکھا۔ اور اسی تخیل میں نیند آگئی تھی۔ مگر شہر کے خوش گپیوں سے خدا سمجھے کہ اس خواب کے واقعہ کو توڑ مروڑ کر یہ مبالغہ آمیز خبر شہر میں پھیلا دی کہ واقعی میری روح پرواز کر گئی تھی اور عالم بالا سے پھر لوٹ آئی اور میں دوبارہ زندہ ہوگیا۔ اب جو شخص آتا ہے مجھ زندہ مردہ سے موت کے بعد کیا کیفیت ہوتی ہے دریافت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بعض سادہ لوح اسے سچ سچ سمجھ کر دوزخ جنت کی حالت پوچھنا شروع کر دیتے ہیں اور بعض زندہ دل ظریفانہ انداز میں محض دل بستگی کے لئے سوالات شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ میاں سمیع' احقر' رضی' ولایت' محمود وغیرہ گویا یہ ارادہ کر کے پہونچے کہ اسی تذکرہ سے دل بہلائیں۔ چنانچہ سمیع نے آتے ہی ہنس کر کہا کہ ہم لوگ اس وقت آپ کے انتقال پر ملال کے پرسے اور دوبارہ زندگی پر مبارک باد دینے کو حاضر ہوتے ہیں۔ محمود نے اپنے تمسخرانہ انداز کو متانت میں بدل کر کہا کہ آخر — جنتستان سے پھر لوٹ کر اس دنیا جہنمستان واپس آنے کی کیا وجہ ہوئی۔ میں نے بھی اس کی اس شرارت آمیز گفتگو کا نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا کہ بھائی صاحب اس جہنمستان سے روحستان کیلئے یکایک روانہ ہونے کو تو ہوگیا لیکن ان دونوں ممالک یعنی جنتستان اور ہندوستان کے درمیان بیچ سرحد گورستان سے اب محض آپ' لوگوں کی محبت کی کشش لوٹا لائی۔ حالانکہ سرحد تک پہونچانے اور سی آف کرنے کے لئے جو لوگ ساتھ گئے تھے ان لوگوں نے زبردستی ٹال ٹال کر اس پار بھیجنے کی بہت کوشش کی بلکہ عین بونڈری کے ایک گڑھے میں ڈھکیل کر بھاگ بھی آئے لیکن میں گرد جھاڑ کر ان کے پیچھے پیچھے واپس چلا آیا۔ اس پر احقر نے مسکرا کر کہا گلزار جنت کی بہار چھوڑ کر دنیا کے میکدہ میں واپس چلے آنا سوائے حماقت کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ بے شک کوئی عقلمند اور سمجھدار آدمی حماقت نہیں کر سکتا۔ مگر کرتا کیا' بے پرمٹ کے چلا گیا تھا اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت میں جتنے بڑے بڑے شاندار عالی شان محل ہیں' صاحب رسوخ بڑے بڑے عمامہ باندھنے والوں نے پگڑی دے دے کر پہلے ہی اپنے لئے الاٹ کر کے گویا جنت کے معمولی مکانات پر لوٹے مارے تباہ شدہ رفیوجیوں کی بھیڑ جو پہونچی تو انہوں نے زبردستی دھنس کر قبضہ کر لیا۔ اب وہاں کوئی مکان کیا' پڑتی زمین بھی میرے لائق ایسی نہیں تھی کہ جھونپڑی ہی دے کر گزارہ کرتا۔ البتہ ایک سب سے کنارہ جگہ کے بارے میں پتہ چلا جس کو نہ جنت کہہ سکتے ہیں نہ دوزخ۔ عام طور سے اسے بیچ یا دھسان روڈ اور کچھ لوگ اعراف بھی کہتے ہیں۔ جس میں جنت کے نالوں کا پانی وہیں جا کر مرتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اس کو غنیمت سمجھ کر وہیں پڑنا چاہا' لیکن وہاں پرمٹ کے بغیر کی ہمت نہیں پڑی۔ اس پر لطف تمسخر میں میاں رضی حپ کیسے رہتے۔ انہوں نے بھی آخر ہمدردانہ لہجے

کہ بھائی ماہنو ابھی یہاں ڈاکٹروں کے ذریعہ نہایت آسانی کے ساتھ جنت جانے کا پرمٹ مل سکتا ہے پھر کوئی دقت اور رکاوٹ نہیں تھی۔ میں نے کہا بھئی ڈاکٹروں کی مدد سے "رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت" کو کو طبیعت نے قبول نہیں کیا۔ اختر بیچ میں بول اُٹھے تو پھر آپ نے مستقل ارادہ یہیں رہنے کا کرلیا ہے۔ میں نے کہا کہ قبل اس کے دھکے دے کر نکالا جاؤں میں پہلے ہی سے پابہ رکاب ہوں۔ آج نہیں تو کل جانا ہی ہے صرف موقع یعنی پرمٹ کا انتظار ہے۔ مگر یارو ذرا اس کو اپنے ہی تک رکھنا ورنہ کہیں میرے جانے کا ارادہ لوگوں کو معلوم ہوگیا تو "کرے مونچھ والا دھرا جائے داڑھی والا" کے مثل "ادے کیو" قانون کے تحت "اسٹینڈنگ ادے کیو" میں قبل از مرگ داویلا نہ کرنا پڑے۔ اور خاص کر ایسی حالت میں کہ کل رات ہی کو چپکے سرحد تک جاکر واپس ہو آیا ہوں۔

مختصر یہ کہ اس خواب کے تذکرے کے سلسلہ میں اکثر احباب آآ کر چھیڑ کرتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن لوگوں کی دل بستگی کا سامان بھی ہو جاتا اور کچھ دیر کے لئے میرا بھی دل بہل جاتا۔ لیکن ایک روز شب کی تنہائی میں جو اس خواب کا خیال آیا تو میں سوچنے لگا کہ گو یہ خواب' قبرستان میں جاکر جوتا قر دماغ لیکر آیا' اسی کا نتیجہ ہے لیکن مرنے کے بعد جو اعزہ و احباب کی نفرت انگیز اور شرمناک روش ہو جاتی ہے اس کا منظر دماغی فلم نے جو پیش کیا وہ آئے دن کے واقعات کی تصویر ہے۔ میں سوچنے لگا جن دوستوں کے بہترے کام محض دوستی کی بناء پر کرتا رہا ' جن احباب کی خاطر جھوٹی گواہی تک دی۔ جن عزیزوں کے واسطے مال کو مال' جان کو جان سمجھا' مرنے کے بعد قبر پر فاتحہ پڑھنا تو کجا' آنکھ بند ہوتے ہی آنکھ بدلنا اور جنازہ تک میں شریک نہ ہونا اور شرکت بھی کی تو جیسے قبرستان کاٹے کھاتی ہو' اور دوست کی لاش بھوت ہو کر گلا دبانے کو تیار ہو' اسطرح بغیر فاتحہ پڑھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا' آخر کیوں یہ حالت ہے۔ لیکن اس کے بعد جب یہ سوچا کہ نہیں ہر شخص کے ساتھ یہ طریقہ نہیں برتا جاتا ہے لاکھ دس لاکھ میں ایک دو ایسی مثالیں بھی ہیں کہ مرنے کے بعد اس کے رشتہ دار اور دوست ہی نہیں بلکہ دنیا آہ وادیلا کرنے لگتی ہے۔ اور اس کے جنازہ میں ساری خلقت قبرستان تک ساتھ ماتم کرتی جاتی ہے۔ اور آخری منزل پر پہونچانے والوں کا مجمع شاہی جلوس سے بھی بڑھ کر شاندار ہو جاتا ہے۔ اور پھر ایک مدت تک دہیں نہیں بلکہ ملک بھر میں اظہار غم کیلئے جلسے کئے جاتے ہیں آخر یہ خوش قسمت لوگ بھی میری ہی طرح تو آدمی ہیں۔ میری ہی طرح دو ہاتھ دو پاؤں دو آنکھ دو کان رکھتے ہیں لیکن نجانے روح کی پرواز کے بعد کونسا ان میں سرخاب کا پر لگ جاتا ہے کہ دُنیا کی فضاء پر شہرت و عزت چھا جاتی ہے۔ اور ایک مجھ جیسے لوگ ہیں جن کے مرنے کے بعد نہ دنیا میں' نہ اپنے شہر میں بلکہ اپنے محلہ پڑوس تک زبانی پُرسے سے بھی اغماض کرتے ہیں۔ اور اس کی صرف ایک نہیں کئی مثالیں موجود ہیں۔ دور کیوں جائیے۔ دلی میں ایک معمولی شکل و صورت اور معمولی وضع کا آدمی ' نہ سر پر ٹوپی اور نہ پاؤں میں جوتا' پورے بدن پر کپڑا تک نہیں' ایک خبطی کی گولی نے بیچارہ کو ختم کر دیا یہ خبر پورے ملک میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور سارا ملک ماتم کدہ بن گیا۔ خیر اس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ فقیر مزاج سادھو کی عزت عموماً لوگ کرتے ہیں لیکن کراچی والے اس جنٹلمین کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو نہ سادھو کی وضع نہ بزرگانہ عبا قبا' نہ کسی خانقاہ کا پیر میاں نہ کسی مسجد کا پیش امام مگر اس خوش نصیب کی موت پر گھر گھر ماتم اور اسکے جنازہ کے ساتھ انسانوں کا عظیم الشان سیلاب امڈ آنا سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی مقناطیسیت اس میں تھی۔

انجمؔ مانپوری

میونسپل کمشنری کا ماتم!

پُر درد دوستو ہے عجب اپنی داستاں ۔ کل تک تھا اپنے شہر کا گویا میں حکمراں
کیا اپنے رعب و داب کا قصہ کروں بیاں ۔ ڈرتا تھا میرے نام سے ہر صاحبِ مکاں
جس گھر کو تاکا ٹیکس دوگونہ بڑھا دیا
نیلام جس مکان کو چاہا کرا دیا

کیا کہیے کیا تھی میونسپلٹی کی ممبری ۔ وہ شانِ حاکمانہ وہ اندازِ افسری
کہنے کو گرچہ وارڈ کی تھی یہ کمشنری ۔ کرتا تھا پورے شہر پہ لیکن گورنری
جس وقت شہر میں کسی جانب نکل گیا
ہر اِک کا دل رپورٹ کے ڈر سے دہل گیا

ہر وقت در پہ اہلِ غرض کا وہ اژدہام ۔ جھک کر ملازمانِ کمیٹی کا وہ سلام
سکرٹری کی حاضری روزانہ صبح و شام ۔ اُٹھنا کلرکوں کا پئے تعظیم و احترام
وہ کنٹریکٹروں کی خوشامد کی گفتگو
کچھ ذکر خرچ کا تو کچھ آمد کی گفتگو

ہر صبح بھنگنوں کی وہ خود لینی حاضری ۔ ان میں ہر ایک شوخ و شریر اور چلبلی
جھاڑو وہ ایک ہاتھ میں سر پہ بالٹی ۔ وہ حسن جس پہ صدقے ہو چرکیں کی شاعری
بے وجہ اُن کو ڈانٹ ڈپٹ کر وہ جھاڑنا
چپراسیوں کا عندیہ میرا وہ تاڑنا

میٹنگ میں وہ پارٹیوں کی باہم لڑائیاں ۔ توہین دوسروں کی وہ اپنی بڑائیاں
اِک دوسرے کی شان میں ہرزہ سرائیاں ۔ آپس میں ممبروں کی وہ ہاتھا پائیاں
ہنگامہ اور وہ شور و شغب ہر سوال میں
فش مارکٹ کا لطف کمیٹی کے ہال میں

ہر شے کی ممبری میں، وہ ارزانی کیا کہوں   ہر سمت سے وہ مجھ پہ زرافشانی کیا کہوں
انگشتری تھی گویا سلیمانی، کیا کہوں   بے آس کے، اپنی بے سروسامانی کیا کہوں

تھا یہ جو اک ذریعہ معراج چھن گیا
افسوس اپنے شہر کا سوراج چھن گیا

کیسا یہ ظلم مجھ پہ کیا چرخ پیر نے   برباد سلطنت کی مری اک وزیر نے
کی دوڑ دھوپ گرچہ بہت اس حقیر نے   امداد کی مگر نہ کسی دستگیر نے

سازش مخالفوں کی جو سکسیڈ ہو گئی!
میونسپلٹی اپنی سپرسیڈ ہو گئی!

اب جبکہ ممبری کی حکومت نہیں رہی   پہلی سی اب وہ شان وہ شوکت نہیں رہی
پبلک کی بھی نظر میں وہ عزت نہیں رہی   جو بھی تھی اک معاش کی صورت نہیں رہی

ہوتا ہے اب کوئی مخاطب ذرا نہیں
پھرتا ہوں مارا مارا کوئی پوچھتا نہیں

رہتے تھے گھیرے صبح سے لے کر جو شام تک   کرتے نہیں ہیں مجھ سے وہ اب کچھ کلام تک
حد ہو گئی کہ یاد نہیں میرا نام تک   مہتر کا بھی نصیب نہیں اب سلام تک

قیمت جو مارکٹ میں مری تھی وہ گر گئی
یعنی اب آبرو پہ مری جھاڑو پھر گئی

ہوتا ہے جب کمیٹی کی جانب مرا گزر   حسرت سے گھنٹوں دیکھتا رہتا ہوں میں اُدھر
کیا کہیئے کیا گزرتی ہے اِس خاکسار پر   جی چاہتا ہے روؤں وہیں دھاڑیں مار کر

کرتا ہوں یاد ممبری کی اپنی شان کو
آفس کو دیکھتا ہوں کبھی آسمان کو

دیدہ زیب خدوخال کا جادو

دُور غلاؤں میں گھُورتی ہوئی حسین و پُر وقار نظر، مست بادامی آنکھیں، زیورات سے آراستہ، صُراحی دار گردن، دل نشیں چہرہ اور متناسب اعضاء، یہ ہیں دیدہ زیب اور بے عیب خدوخال، اُن شکلوں کے جو بیدری فن پاروں پہ پائی جاتی ہیں اور بیدری فنِ دستکاری آندھرا پردیش کا ایک قدیم اور مقبولِ عام فن ہے۔

آج ریاستی معیشت کے خدوخال اور نقوش ہُو بہُو بیدری فنِ دستکاری کے مانند بے عیب اور کسی بھی قسم کی خامی سے پاک ہیں۔ چھ نکاتی فارمولہ جو ریاست کی یک جہتی کو تقویت دینے کے لئے مُدوّن کیا گیا تھا، کامیابی کے ساتھ رُوبہ عمل لایا گیا ہے۔ ریاست کے پسماندہ علاقوں کی تیز رفتار ترقی کے لئے زائد از دو سال کے عرصے سے ایک پُر زور پروگرام پر عمل ہو رہا ہے۔ پانچویں منصوبہ کی مُدّت میں خرچ کرنے کے لئے آندھرا پردیش کو ۹۰ کروڑ روپے کی جو انتہائی فراخ دِلانہ امداد حاصل ہوئی ہے، اس کی بدولت اِس پروگرام کی عمل آوری ممکن ہوگئی ہے۔

۲۰۔ نکاتی پروگرام نے اگر ہم کو نئے چیلنجوں سے دوچار کیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ ہمارے لئے نئے مواقع بھی فراہم کیئے ہیں۔ آندھرا پردیش نے اِس سلسلہ میں مجاہدانہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے۔ اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کو قابو میں کرلیا گیا ہے۔ قانون تحدید اراضی کی عمل آوری زور و شور کے ساتھ جاری ہے اور اس طرح دھرتی کے لالوں نے جو خواب دیکھے تھے، وہ پورے ہو رہے ہیں۔ فاضل قرار پانے والی اراضیات کی کُل مقدار ۳ء۵۰ لاکھ ایکڑ سے زائد ہوگئی ہے۔ کمزور طبقات کے لئے رہائشی جگہوں کی گنجائش وسیع پیمانے پر فراہم کی گئی ہے۔ اپریل ۱۹۷۵ء کے بعد سے کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۵ لاکھ خاندانوں میں رہائشی اراضیات کی تقسیم کا کارنامہ اس زبردست اور شاندار پروگرام کے عین شایانِ شان ہے۔ اس کے علاوہ رہائشی حقوق کا استقرار، جبری محنت کا خاتمہ، دیہی قرضوں کی ادائی پر التوا اور کھیت مزدوروں کی اقل ترین اُجرتوں میں اضافہ وغیرہ جیسے دوسرے اقدامات سماج کے استحصال کردہ طبقات کے لئے ایک "نئی بشارت" کا حکم رکھتے ہیں۔

ریاست میں صنعتی ماحول کا پیدا ہونا، نئے صنعت کاروں کے لئے ایک خوش آئند امر ہے۔ ترمیمات کی نظرشدہ اسکیم کے مطابق چھ نکاتی فارمولے کے تحت پسماندہ قرار دیئے ہوئے علاقوں میں نئی صنعتی یونٹوں کے قیام کے لئے رقمی امداد کی مقدار لاگت کے سرمائے کی ۱۰ فیصد یا زیادہ سے زیادہ ۱۰ لاکھ روپے مقرر کی گئی ہے۔ قبائلی علاقوں میں قائم کی جانے والی یُونٹوں کے لئے اضافہ رقمی اِمداد مقرر کی گئی ہے، یعنی سرمایۂ لاگت کا ۲۰ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ لاکھ روپے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش، حیدرآباد

DIPR/19/76-77

۔۔۔نیتا بَن۔۔۔!

اُردو کے پہلے عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی سے
معذرت کے ساتھ

نظر برنی

ٹک نوکری اپنی چھوڑ میاں، مت دیس بدیس پھرے مارا
کیا اس میں رکھا ہے لیڈر بن، دن رات بجے گا نقارا
کیا ڈی اے ہے کیا 'پروموشن' یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں
تو پہن لے کھادی کے کپڑے، کر بھاشن اور لگا نعرہ
یہ موقع ہاتھ نہ آئے گا، جب لاد چلے گا بنجارا

بَن جائے اگر تو نیتا جی، پھر جیب یقیناً بھاری ہے
تو سب سے بڑا خود افسر ہے اور سب سے بڑا بیوپاری ہے
کیا کوٹھی، موٹر، فون، فریج، کیا ٹیلی وژن اور وہسکی
پل بھر میں ملیں گی یہ چیزیں گر تجھ میں کچھ ہشیاری ہے
یہ موقع ہاتھ نہ آئے گا، جب لاد چلے گا بنجارا

تو 'چمچوں' کو جو ساتھ میں لے کر پورب پچھم جاوے گا
ہر شہر میں ہووے تیرا سواگت، نامہ بھی کچھ پاوے گا
ہر بات میں ہوگی عیاری، ہر کام میں ہوگی مکاری
تو خود بھی پیئے گا چھپ چھپ کر، اوروں کو پاٹھ پڑھائے گا
یہ موقع ہاتھ نہ آئے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن تو 'ڈی اے' 'ٹی اے' میں کیوں مرتا پھرتا ہے بَن بَن
ٹک غافل دل میں سوچ ذرا، ہیں ساتھ لگے تیرے دشمن
کیا آڈٹ ہے کیا 'چیکنگ' ہے، ہر وقت ہے دھڑکا تجھکو میاں
کچھ ہوش میں آ، کچھ جوش میں آ، تو نیتا بَن کیا ہے اڑچن
یہ موقع ہاتھ نہ آئے گا، جب لاد چلے گا بنجارا

افسوس نہ کر تو قسمت پر، اب وقت بدلنے والا ہے
چل کود سیاست میں فوراً یہ فن تو دیکھا بھالا ہے
جنتا کو رجھا لے باتوں میں یہ تیرے لئے کیا مشکل ہے
تو سب سے جھوٹے کر وعدے، کیا ادنیٰ اور کیا اعلیٰ ہے
یہ موقع ہاتھ نہ آئے گا، جب لاد چلے گا بنجارا

21 سال کی
عمر سے پہلے
شادی نہ کیجئے
قانون اِس کی ممانعت کرتا ہے۔

پرویز یداللہ مہدی

قسط (۱۱)

چہ خُوب

پرتھوی راج کا سب سے چہ خُوب کارنامہ بیان کرو؟

قبلہ چہ خوب کے اس تاریخی سوال نے ہمارے شخصی جغرافیہ میں گھڑی بھر کے لیئے ویسی ہی کھلبلی مچا دی جیسی کہ تاریخ کے چند صفحوں پر ایک دن کے سلطان کے رائج کردہ چمڑے کے سکے نے مچائی ہے۔ کچھ دیر کے لیئے دھوم مچا کر جب یہ کھلبلی ٹلی تو ہم پھر اپنی مخصوص ترنگ میں آگیئے چنانچہ ذہن رسا میں کھلبلی شروع ہوگئی پرتھوی راج نے یوں تو چھوٹی بڑی سینکڑوں فلموں اور ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا چہ خوب یعنی کارنامہ ہے فلم "مغل آعظم" جس میں اس نے "اکبر اعظم" کا رول اس خوبی سے ادا کیا کہ اگر اکبر اعظم عرف مہابلی بھی ایک بار یہ فلم دیکھ لیتے تو اپنا راج پاٹ پرتھوی راج کو سونپ کر خود فلموں میں ایکٹر کی حیثیت سے بھرتی ہو جاتے ۔ ۔ ۔ ۔

یہ تھا وہ جواب جو فوراً ہمارے ذہن کے کمپیوٹر نے تیار کیا لیکن فی الحال ہم نے اسے ذہن میں ہی محفوظ رہنے دیا تاکہ سند رہے اور آئندہ وقت بے وقت کام آدے اور اس کی جگہ جواباً عرض کیا ۔ "میری نظر میں پرتھوی راج کا سب

[illegible]

بیوی کو بھگالے جانا"۔ "بیوی کو بھگا لیجانا؟" موصوف بھی گھڑی بھر کو ہمارے چکر میں آگیئے "سنجوگتا کو بھگانے سے پہلے اس نے چہ خوب کی تھی یا شادی کے بعد اسے چہ خوب کیا تھا ۔؟"۔

"شادی سے پہلے چہ خوب کیا تھا میرا مطلب ہے بھگالے گیا تھا یا بھگانے سے پہلے شادی کی تھی، اس کا تو مجھے علم نہیں"۔ ہم نے بغلیں بجا کر کہا ۔ "البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ اپنی بیوی کو سوئمبر کے وقت لے کر بھاگا ضرور تھا ۔"

خیر جو بھی ہو، فرض کرو پرتھوی راج اگر اس چہ خوب میں ہوتا تو؟" "سنجوگتا اسے بھگالے جاتی! ہمارے اس بے ساختہ جواب پر شبو کی شگفتہ مسکراہٹ ہنسی میں ڈھل گئی ۔ اور موصوف نے ہمیں ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمایا: "چہ خوب چہ خوب"۔ جواب میں ہم نے "آداب عرض" آداب عرض" کہہ کر حساب برابر کر دیا۔

"حسن گفتگو ہمنی کیسا چہ خوب تھا ۔؟ موصوف

[illegible]

لے کر دھواں اگلنے لگے گویا یہ تاریخی بم اگلنے سے پہلے ہی ان کے پیٹ میں پھٹ چکا تھا۔ ادھر ہم نے دل ہی دل میں تمام مورخین کو بلکہ ان کی آل اولاد تک کو الف سے لے کر والسلام تک صلواتیں سنا ڈالیں، پتہ نہیں ان بختوں کو سر میں یہ سودا کیوں سما جاتا ہے کہ آنے والی نسلوں کو تاریخ سے روشناس کرائیں۔ بھلا بتلائیے تاریخ پڑھنے سے کبھی کسی کا بھلا ہوا ہے۔ اُلٹا ہماری تو جان ہی جلتی ہے۔ ہماری آپ کی طرح کا ایک شخص اور ہزاروں لاکھوں انسانوں پر بلا کی طرح مسلط۔ لوگوں کو ایک عدد بیوی بھی بڑی مشکل سے نصیب ہوتی تھی اور حضور شہنشاہ سلامت کی حرم سرائیں بھانت بھانت کی رنگ برنگی بلکہ انواع و اقسام کی خواتین سے یوں بھری رہتی تھیں۔ جیسے آج کے بیش تر " کالے بازاری تاجروں " کے گودام "بلیک اناج" کے بوروں سے بھرے رہتے ہیں۔ خیر ہماری یہ سوچیں تو موصوف کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتی تھیں۔ انہیں تو بہرحال حسن گنگو بہمنی کے بارے میں کچھ نہ کچھ اوٹ پٹانگ بتانا ضروری تھا، کیونکہ بے چارے خود کچھ نہیں جانتے تھے، اس احساس سے ہم میں خود اعتمادی کا فی صد کچھ اور بڑھ گیا۔ چنانچہ ہم اور دھڑلے سے بے پر کی ہانکنے لگے۔

"حسن گنگو بہمنی کے نام سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نسلاً ایک برہمن تھا ۔۔ !"

"حسن گنگو اور برہمن چہ خوب ۔۔ !" موصوف نے منھ بنا کر کہا۔

"جی ہاں، اصل نسل کا برہمن ۔۔ اور اس مشہور گنگو تیلی کی اولاد سے تھا جس نے "راجہ بھوج" سے تن تنہا ٹکر لی تھی، چنانچہ آج بھی یہ مثل زبان زد خاص و عام ہے۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی ۔۔ " راجہ بھوج کہتے وقت بے خیالی میں ہم نے اپنی طرف اور گنگو تیلی کہتے وقت موصوف کی طرف اشارہ کر دیا پھر کیا تھا موصوف کی تیوریاں ایکساتھ کئی زینے چڑھ کر کے قہر و غضب کے قطب مینار کی بلندی تک پہنچ گئیں اور قبل اس کے کہ ان کے قہر کا تیر ہمارے دا خستہ چھلنی جگر کے پار ہوتا ہم نے بات الٹ کر کمال ہشیاری سے الٹتی ہوئی بساط سیدھی کر لی۔ یعنی، دوبارہ ان کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ " کہاں راجہ بھوج " اور پھر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے مردہ سی آواز میں کہا ۔۔ "کہاں گنگو تیلی ۔۔ !"

جواب میں چہ خوب ... چہ خوب ۔۔ " کہہ کر موصوف نے گویا اس بات پر مہر ثبت کر دی کہ وہ یقیناً "راجہ بھوج" اور ہم واقعی گنگو تیلی ہیں ۔۔ ہماری اس بے بسی اور لاچاری کا تبلہ چو خوب سے زیادہ شبو نے لطف لیا ۔۔ نتیجۂ شبو کے ملیح چہرے پر لطافت کی چاندنی کھل اٹھی لیکن ہم اس نرم نرم چاندنی سے جی بھر کر لطف اندوز نہیں ہو سکے، کیونکہ موصوف نے تاریخ کا ایک اور ورق الٹ دیا جو پچھلے تمام اوراق کی طرح ان کے ذہن کی کتاب میں یقیناً کورا ہی تھا۔ پوچھا۔ " دکن کی تاریخ میں، روپ متی اور تارامتی کا چہ خوب خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے کون تھیں یہ چہ خوب ۔۔ ؟"

" ناچیز کی سالیاں تھیں پچھلے جنم میں ۔۔ !" یہ وہ جواب تھا جو فوراً ہی ہمارے ذہن میں کلبلایا لیکن جو جواب ہم نے موصوف کی خدمت اقدس میں پیش کیا وہ یہ تھا ۔۔ " یہ دونوں دکن کی تاریخ کا وہ قہر تھیں جس نے ابوالحسن تاناشاہ کا جغرافیہ بدل کے رکھ دیا، حال ہی میں تحقیق کے ذریعہ کچھ ایسے عقد ثانی ہوئے ہیں۔

" عقد ثانی، چہ خوب ۔۔ !!!"

موصوف کے ماتھے پر تین عدد گہری شکنیں اُبھر آئیں، عقد کے ذکر پر صرف تین عدد شکنوں کا ابھرنا بڑا با موقع اور برمحل معلوم ہوا غالباً ایک شکن بہ حیثیت وکیل اور دو بہ حیثیت گواہ کے ابھری تھیں ۔ ہمیں چونکہ بات میں خواہ مخواہ کاسترپیچ پیدا کر کے بعد ازاں پہاڑ کھود کر مرا ہوا چوہا نکالنے میں ملکہ حاصل ہو چکا تھا

ں لئے زبان سے پھسل کر ہاتھوں سے نکلنے والی
کو کان سے پکڑ کر دوبارہ اصل موضوع کی طرف
ئے "میرا مطلب یہ تھا کہ ابھی حال ہی میں تحقیق
ریعے کچھ ایسے عقدے کھلے ہیں جن سے یہ پتہ
ہے کہ اِن دونوں نامی گرامی طوائفوں یعنی روپ
ور تارا متی کی ایک بڑی بہن بھی تھی جس کا نام تھا
نا متی" — !"
"بھانا متی — !!!" شبو نے پہلی مرتبہ حیرت
لہجے میں مداخلت کی۔ حیرت بھی بناوٹی نہیں معلوم
تھی مزید کہا — "بھانا متی تو ایک خطرناک قسم
جادو کا نام ہے — "
"جی ہاں" — "ہم نے فوراً شبو سے اتفاق
یا' ویسے کئی اور باتوں میں شبو سے اتفاق کرنے
ی چاہتا تھا' لیکن فی الحال اسی ایک بات پر اکتفا
تے ہوئے مزید ڈینگ ہانکی — "یہ جادو دراصل
کی ایجاد ہے ——— اسی لئے موسوم
اسی کے نام سے ہے۔ یعنی بھانا متی — اور
چھوٹے موٹے جادو بعد میں یار لوگوں نے ایجاد کئے' اُن
نڈے چونکہ بھانا متی سے جاکر ملتے ہیں اس لئے
جادو" بھان متی کا کنبہ" کہلاتے ہیں ———!!!"
یہ من گھڑت اور فی البدیہہ تاریخی اضافہ قبلہ'
ذب کے ساتھ شبو کو بھی خاص متاثر کرگیا —
ی بھر کو یہ خیال بھی آیا کہ ہم نے خواہ مخواہ بے چاری
ریخ کو مسخ کر دیا' لیکن اگلے ہی پل ان ذمہ دار'
الروں اور ماڈرن مورخوں کے متعصبانہ بیانات
تحریریں یاد کر کے ہمارے ضمیر کی ملامت کسی
ر کم ہو گئی جو منظم طریقے سے تاریخ کے ساتھ
کے ملے جلے گنگا جمنی کلچر کو بھی مسخ کرنے کی۔
ازشیں پھیلاتے رہتے ہیں — ہمارا ضمیر کسی حد تک
ئن ہوا ہی تھا کہ موصوف نے ایک اور تاریخی پتھر پھینکا
"تاج محل کہاں واقع ہے پر خوب — ؟
"جہاں اُسے ہونا چاہیئے —"

ہمارے حساب سے یہ موزوں ترین جواب تھا'
لیکن موصوف مطمئن نہیں ہو سکے چنانچہ فرمایا —
"مقام کا نام بتاؤ —" !
"آگرہ — لیکن ماڈرن مورخوں کی تحقیق عمیق کے
مطابق ' شہر آگرہ' تاج محل کی وجہ سے نہیں بلکہ
گل خانے کی وجہ سے مشہور ہے"۔ ہم نے اپنے
مخصوص زبانی گھماؤ پھراؤ کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزید
کہا — " اگر آپ کی سمع خراشی نہ ہو تو اس سلسلے
میں ایک تازہ ترین حقیقی لطیفہ پیش خدمت ہے۔
سُنا ہے تین ایسے خودساختہ مقامی مورخ
جنہوں نے اتفاق سے آزادی کے بعد ہوش سنبھالا
تھا تاج محل میں "مین میخ" نکالنے کی غرض سے وہاں
پہنچے ' پہلے مورخ نے تاج کو کافی دیر تک گھورنے
کے بعد غصّے سے نتھنے پھلا کر کہا۔ عوام کی دولت
کی ایسی بربادی دنیا کی تاریخ میں جس کی مثال شاید
ہی مل سکتی ہے ' میں برداشت نہیں کرسکتا ' میرا بس
چلے تو میں اسے ماڈرن میوزیم میں تبدیل کر دوں
پہلے مورخ کی اس جھلاہٹ پر دوسرے مورخ نے
کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا — دوست میں تمہاری
اس بے وقوفی سے اتفاق نہیں کرسکتا اگر میرا بس
چلے تو "تاج" کو فائیو اسٹار ہوٹل میں تبدیل کر دوں
اس سے غیر ملکی سیاحوں کو بڑی سہولت ہوگی اور
دوسرے ملکوں میں ہمارے ملک کا خاص نام بھی
ہوگا۔ اس بات پر تیسرے مورخ نے جواب تک
خاموش تھا بولا۔ بھئی تم دونوں تو آپس میں ہی فیصلے
کر رہے ہو' لیکن یہ بات مت بھولو کہ میرے مرضی کے
بغیر نہ تو تم اسے میوزیم میں تبدیل کر سکتے ہو اور
نہ ہی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں۔ تیسرے مورخ کے
اندازِ گفتگو پر پہلے اور دوسرے مورخ نے ہم آواز ہوکر
پُر احتجاج لہجے میں کہا — "بہت خوب تمہاری مرضی کے
بغیر ہم کچھ نہیں کرسکتے —" تیسرے نے کہا۔
"جی ہاں' تاج محل کو خریدے بغیر تم دونوں اپنی

اپنی خواہش پوری نہیں کرسکتے اور میرا ارادہ فی الحال
اسے فروخت کرنے کا نہیں ہے۔
چہ خوب۔ چہ خوب۔ موصوف نے اس لطیفے پر
جی کھول کر داد دی، البتہ سشبو کی معنی خیز مسکراہٹ
اس بات کی غمازی کررہی تھی کہ اس لطیفے کے پس
پردہ کارفرما طنز کی چبھن کو اچھی طرح محسوس کیا ہے
البتہ طنز کی یہ چبھن موصوف کے سر پر سے گزر گئی تھی
اس لئے وہ بدستور تاج محل کے پیچھے ہی لٹھ لیئے ہوئے
تھے چنانچہ پوچھا۔" اب یہ بھی بتا دو کہ تاج محل کس
چہ خوب نے تعمیر کیا۔؟ جواب میں ہم نے ایک
نثری نظم فی البدیہہ موزوں کردی۔

تاج محل
خواب تھا
ممتاز محل کا
جس کی تعبیر کا سہرا
شاہ جہاں
اور
تعمیر کا سہرا
جن کے سر بندھتا ہے
وہ
مزدور ہیں
مزدور زندہ باد
بچھڑے ہوئے
بھوک اور افلاس کے پنجے میں
تڑپتے ہوئے
مزدور پائندہ باد

نظم چونکہ فی البدیہہ کہی تھی اس لئے اس میں
وزن، بحر، آہنگ اور پتہ نہیں کیا کیا شعری خامیاں
رہ گئی ہوں۔ لیکن کم بخت موصوف کو مطمئن کرنے
میں بھی ناکام رہی فرمایا ۔۔ برخوردار، نظم گرچہ کہ خالص
روایتی ہے پھر بھی اس کا چہ خوب واضح کردو۔"
"کچھ لوگوں کا خصوصاً خواتین کا خیال ہے کہ
تاج محل کی تعمیر کا کریڈٹ ممتاز محل کو ملنا چاہیئے جبکہ
مردوں کا خیال ہے کہ اس کریڈٹ کا اصلی حق دار
شاہ جہاں ہے۔ ہم نے جواباً دوسروں کے خیالات
تو پیش ہی کردیئے ساتھ ہیں اپنا بھی خیال پیش
کیا ۔۔ لیکن اس سلسلے میں ناچیز کا خیال ہے کہ
اس کریڈٹ کے صحیح حق دار وہ مزدور ہیں۔
جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اسے ایک ایک اینٹ تعمیر کیا
سجایا سنوارا، اور خود پھوس کے جھونپڑوں میں اپنی
زندگی تمام کردی ۔۔" ہمارا انداز اور لب ولہجہ
اس قدر گمبھیر اور محققانہ تھا جیسے اس موضوع پر
ہمیں پہلے ہی ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل چکی ہو، مزید
معلومات کے خزانے لٹائے۔
"ویسے اس بچے از عجائبات کرۂ ارض کا سہرا
شہنشاہ شاہ جہاں کے سر باندھتے ہوئے جی اس
واسطے بھی ڈرتا ہے کہ اس طرح اس پر ایکدم سے
الزام آجاتا ہے کہ ۔۔ اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر
کتنے کڑکوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق ۔۔
"چہ خوب ... معقول چہ خوب ہے۔۔" موصوف
نے اتنا کہہ کر بھاڑ سا منہ پھاڑ کر جماہی لی۔ جو اس قدر
طویل و عریض تھی کہ لگتا تھا اس نے قطب شمالی،
سے قطب جنوبی تک احاطہ کرلیا ہو۔ غیر شعوری طور پہ
ہمارا منہ بھی اسی رفتار سے کھل گیا شاید ہمارے
شعور اور لاشعور کے درمیان موصوف کی جماہی کی نقل
کرنے کا جذبہ جھول رہا تھا۔ لیکن موصوف نے غالباً
یہ سمجھ کر ہمیں نیند آرہی ہے یعنی وہی بات ہوئی
الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے فرمایا ۔۔" نیند آرہی ہے
برخوردار ویسے بھی لنچ کے بعد کچھ دیر چہ خوب کرلینا
صحت کیلئے مفید بھی ہے اور سنت بھی مگر لمبی تانتے
سے بجائے آرام کے الٹا تکلیف ہوتی ہے، سارا
بدن دکھتا ہے" طبیعت چہ خوب رہتی ہے اور
آ.... آ.... آ..." موصوف نے پھر ایک وسیع و
عریض جماہی لی اور جس آرام کرسی پہ بیٹھے ہی سے

... دراز تھے مکمل دراز ہو گئے اور ہم نے پہلی مرتبہ
...موف کی طرف اپنائیت کی نظروں سے دیکھا شبو
...علاوہ یہ غالباً موصوف کی پہلی اور آخری ادا
... جس پر ہمیں واقعی پیار آیا تھا ۔۔ !!!!

"ایک لڑکی سے پہلی مرتبہ گفتگو کرتے وقت
... باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔۔۔ ؟"

شبو نے اچانک تیور بدلے اور یہ نیا شوشہ
...وڑ کر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگیں لیکن ہمیں
...ں لگا جیسے گرم گرم چائے پیالیوں میں نہیں بلکہ ہم
... انڈیلی جا رہی ہے ۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے تک نہ یہ
...غاک انداز تھے نہ یہ غضبناک تیور' بلکہ بڑی ہی ۔
...وستانہ فضا تھی ۔ شام کے بڑھتے ہوئے سائے
...لکے سے ناشتے اور گرم چائے کے ساتھ اور بھی بھلے
...لگتے ہیں ۔ غالباً یہی وجہ ہو سکتی ہے جو قبلہ چچ خوب
...ور شبو شام کے وقت "مخملی لان" میں "ہوا خوری"
...ے ساتھ چائے اور میوہ خوری کا بلا ناغہ لطف اُٹھاتے
...یں ۔ ویسے اس وقت قبلہ چچ خوب موجود نہیں تھے
...ھر کے اندر بھی ان کے آثار دور دور تک نہیں پائے
...ا تے تھے ہمارے "قیلولہ" سے بیدار ہو کر باہر نکلنے
...ل موصوف شاید کہیں باہر جا چکے تھے ان کی غیر
...وجودگی کو ہم کچھ دیر تک تو محسوس کرتے رہے کیونکہ
...چھلے تین دن کے عرصے میں ہم نے انہیں گھر کا ۔
...ختلف فرنیچر توڑتے ہوئے ہی دیکھا تھا سچ پوچھئے
...تو اس وقت ان کی غیر موجودگی ہمارے لئے اطمینان
...کا باعث ہی ثابت ہو رہی تھی بلکہ یہ سوچ کر تو ہمارے
...ر لگ گئے کہ پچھلے تین دن کے عرصے میں آج پہلی
...مرتبہ ہم بھی ہوا خوری اور میوہ خوری کا بلا شرکت
...چ خوب پورا پورا لطف اُٹھائیں گے ۔

آج ہوا میں بھی ہلکی سی خنکی تھی اور ڈھلتی
ہوئی دھوپ میں بھی ہلکی سی تمازت جسکی وجہ سے
...ہ گویا "دو آتشہ" ہو گئی تھی اس پہ طرفہ لطف
...یہ کہ ناشتے کی ٹرے میں مختلف موسمی دفیر موسمی میوؤں

کے علاوہ گرم گرم سموسے اور املی کی کھٹی کھٹی چٹنی
جو نظر آئی تو ہماری نظروں میں "سہ آتشہ" ہو گئیں
اور پھر نشہ یہیں پہ ختم نہیں ہوا بلکہ بات پہنچی تری
جوانی تک کے مصداق جب شبو کے نکھرے نکھرے
حسن اور بنے سنورے پیکر پہ نظر پڑی تو سارا ماحول
جیسے "سو ۔۔۔ آتشہ" ہو گیا ۔

ناشتے کے دوران ہمارے تکلف سے کام لینے
پر شبو بڑی اپنائیت سے بولیں "اُوہ ! آپ تو
غیروں کی طرح تکلف کر رہے ہیں یہ سموسہ لیجئے آپ
تو ہمارے چچا جان کے سموسے ہیں !"

"جی ۔ ی ۔ ی" ہم گڑبڑا گئے ۔ پتہ نہیں یہ چوٹ
دانستہ تھی یا غیر دانستہ ۔

"میرا مطلب ہے آپ تو ہمارے چچا جان
کے صاحبزادے ہیں ۔ شبو نے ایک ایک لفظ کو اس
طرح منہ میں گھول گھول کر کہا جیسے لفظ نہ ہو مصری
کی ڈلی ۔ پھر مزید مصری گھولی "چچا جان بھی کون سے
جن کی رفاقت میں ابو کے بچپن اور جوانی کا دور
گزرا ہے ۔ ارے آپ نے پھر ہاتھ روک لیا ۔۔۔

"جی نہیں ۔۔ میں تو کھا رہا ہوں" ۔ ہم نے گڑ
بڑا کر کہا ۔ پچھلے تین دن کے دوران کم از کم دس
بارہ مرتبہ ناشتے اور کھانے پر شبو کا اور ہمارا ساتھ
رہا ہے لیکن ایسی خاطر کبھی توفیق نہیں ہوئی تھی آج
یقیناً اس خاطر کے پیچھے کوئی خطرہ ضرور ہے ہم
نے ناک پھیلا پھیلا کر لاکھ خطرے کی بو سونگھنے
کی کوشش کی لیکن جب انسان کی قسمت ہی کوڑ کام
ہو جائے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے ' چنانچہ ہم نے
اس طرف سے مایوس ہو کر شبو کا وار آپ ہی پہ
مُر لٹنے کی کوشش کی آپ نے اپنے ہاتھ کس خوشی
میں روکے ہوئے ہیں"۔

"ارے صاحب" میں اگر ہاتھ دکھانے پر آؤں
تو سب کی چھٹی ہو جائے ۔ جی ۔ ی ۔ ی !!!"

شبو کے اس فری اسٹائل قسم کے حملے پر

سموسہ ہمارے ہاتھ سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ غالباً ہماری اسی کیفیت کو بھانپ کر شبو نے اپنے علامتی جملے کی اس طرح شرح کی۔ میرا مطلب ہے پلک جھپکتے میں ساری پلیٹ صاف ہوجائے۔ لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے ہمارے فیملی ڈاکٹر نے مجھے ہر وقت منھ چلانے سے منع کر رکھا ہے۔

"یہ فیملی ڈاکٹر بھی خوب ہوتے ہیں بلکہ چرغوب ہوتے ہیں، جو بھی فیملی انہیں اپنا ڈاکٹر بناتی ہے یہ خود کو اس فیملی کا صدر خاندان تصور کر کے دوسروں کے نجی معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔" ہم نے فیملی ڈاکٹر کے موضوع پر مختصر مگر سیر حاصل تقریر کرتے ہوئے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی 'اب یہی دیکھئے آپ کے سموسے کھانے سے آپ کے فیملی ڈاکٹر کے ہاضمے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔؟

"انہیں دراصل یہ خدشہ ہے کہ اگر دن رات میرا منھ چلتا رہا تو کسی دن "مکھن کے پہاڑ" میں تبدیل ہوجاؤں گی"۔ شبو نے اس طرح منھ بنا کر کہا جیسے منھ میں واقعی مکھن بھرا ہو۔ پھر بڑی ہی ادا سے پوچھا "آپ ہی بتائیے کیا میں واقعی ضرورت سے زیادہ صحت مند ہوں!" شبو کے تیور کچھ ایسے تھے کہ ہم اگر سخت جان نہ ہوتے تو یقیناً تیورا جاتے سوال ہی کچھ ایسا تھا کہ بغیر سوچے سمجھے اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا تھا بلکہ دانشمندی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ کسی وکیل سے صلاح مشورے کے بغیر جواب نہ دیا جائے لیکن فی الحال یہ ناممکن تھا اس لئے سوچنے سمجھنے کی مہلت کی غرض سے گلہ صاف کرنے کی کوشش میں کھنکارنے کی غلطی سرزد ہوگئی پھر کیا تھا کھانسی کا دورہ بلکہ دوزدورہ شروع ہوگیا جسے ہم نے غیبی امداد سمجھا کہ شاید اسی بہانے یہ خطرناک بات آئی گئی ہوجائے لیکن جو بلا ایک بار ہمارے سر پہ منڈلانے لگتی ہے وہ آسانی سے نہیں ٹلتی شبو نے فوراً پانی کا گلاس ہماری طرف بڑھا دیا اور بدستور جواب طلب نظروں سے

دیکھتی رہیں۔ چنانچہ گلاس خالی کرنے کے بعد ہم حسب عادت شروع ہوگئے۔ "جہاں تک آپ کی صحت کا تعلق ہے۔

ماشاءاللہ نظر بد دور بلکہ چشم بد سو ۱۰۰ ڈیڑھ سو میل دور، ایسی صحت تو ہونی ہی چاہیئے 'ورنہ جی ہاں ..."

پھر ہم پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ بلکہ اس بار یہ دورہ ہمیں بچا بھی لے گیا ورنہ متذکرہ بالا جملے کا ادا نہ ہونے والا اگلا فقرہ یقیناً سنسر کی زد میں آجاتا بلکہ ہم خود، زد میں آجاتے ہمیں یوں بہک سے بال بال بچتا دیکھ کر یعنی صرف ہمارے بالوں کو بہکنے سے بچتا دیکھ کر شبو نے ہمیں 'نو بال' (NO - Ball) سمجھ کر زبان کے بلے سے زبردست ہٹ لگائی یعنی ایسا خطرناک شوشہ چھوڑا جو ہواخوری، میوہ خوری، سموسہ خوری غرض تمام خوریوں" پر پانی پھیر گیا۔ بڑی بڑی کٹورا جیسی نشیلی۔ کیٹیلی، شوخ و چنچل نظریں دیکھ کر ہمارے فرشتوں کو ویسے بھی کفر و ایمان میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس پر اگر نظریں بولنے کا فن بھی جانتی ہوں تو پھر ہمارے فرشتے لمبی چھٹی لے کر ہماری چھٹی کر دیتے ہیں۔ اور شبو کے ساتھ غضب یہ تھا کہ ان کی نظریں نہ صرف بولنا بلکہ تقریر کرنا بھی بخوبی جانتی تھیں، ہم نے اپنی مختصر سی زندگی میں ایسی "مقرر" نظریں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں اس سے پہلے کہ شبو کی مقرر نظریں بھاشن دے کر ہمارے حصے کا سارا "راشن" صاف کر دیتیں ہم نے چائے کا ایک جرعہ لے کر پیالی تپائی پر رکھی اور شروع ہوگئے۔

(باقی - باقی)

غزل

محمد عبدالرزاق اناڑی

کونسا ڈھنگ ہے جو چھوڑتے جارہیں لوگاں
بہروپ یاں ہیں جو ہر اک رنگ دکھارہیں لوگاں

خون کے ناد ہی کپڑوں پو لگالے رہیں رنگ
نام بھی صاف شہیداں میں لکھارہیں لوگاں

رونا سچ آتا نیں، صورت تو بنارہیں روتی
تھوک انکھیاں سے لگالے کو ٹھکارہیں لوگاں

بول نئیں سکتے ہم اپنوں کو بھی اپنے تیرے
دیکھ کو منہ کو بھی منہ صاف پھرارہیں لوگاں

گرنے والوں کو اٹھا سکتے نیں پن کی کوئی
خوب اچھلتے ہوئے بجلاں تو بجارہیں لوگاں

دوستانے میں اگر جان بھی دے کو بیٹھے
لہو کے بدلے میں پسینہ بھی نیں بہارہیں لوگاں

گھستے ہیں پیٹ میں اک پتلی سی سوئی بن کر
پیٹ میں مار تو سبّل کے لگارہیں لوگاں

چھوری والوں کو ہو یا مولنا چھورا مشکل
دن پو دن چھوروں کے بھاؤ کو بڑھارہیں لوگاں

ق

جن کو چھوروں کو جمکا لئے قسمت اپنی
چھوری والوں کو فقط لوٹ کو کھارہیں لوگاں

بات کرتے نیں سمجھ کی نہ سمجھتے ہیں بات
بھینس کے ناد عقل موٹی بنارہیں لوگاں

آن پو جان گنوانا جو سمجھتے تھے شان
آج جانوں کے لئے آن گنوارہیں لوگاں

بدنصیبی سے ہو یا جینا اگر ڈانواں ڈول
دیکھتے دیکھتے نظروں سے گرارہیں لوگاں

حق سے منہ موڑلیں ناحق سے جڑتے جارہیں
سر کٹانے کے عوض سر کو جھکارہیں لوگاں

بیگن تھالی کے ہیں کیسا بھی ڈھلاو ڈھلتیں
زندگی ڈونگے ڈھکیلتے چلارہیں لوگاں

کون اچھا ہے برا کون ہے دستا نیں ہے
دودھ میں قطرہ زہر دے کو پلارہیں لوگاں

کام نکلے تلک سرکار ہی سرکار کی رٹ
کام نکلیا تو کرم بھولتے جارہیں لوگاں

صورتاں دیکھے تو دستے ہیں اناڑی معصوم
گن مگر اپنا خطرناک بتارہیں لوگاں

غزل

سوتے سوتے میں روبرو دیکھے
مرمریں جسم چاند سے چہرے

جان جاتی ہے بھوک سے تو کیا
چہرے اسنو سے کر لیئے چکنے

مچھلیاں تیرتی ہیں سڑکوں پر
بیل باٹم لباس ہیں پہنے

مرمریں فرش پر کرن پھسلی
جام کس نے یہ نور کے پھینکے

ہونٹ جلتے ہیں دل دھڑکتے ہیں
سج گئے جب خیال کے شیشے

موڑ پر چل کے کہہ غزل انور
دیکھ لینا وہاں نئے چہرے

انور پانی پتی

ظرافت

مراسلات

○ شگوفہ کا سالنامہ ملا۔ ہر لحاظ سے دلکش اور دلکش ہے ں کے بہت سے مضامین، پٹنہ کے جشنِ ظرافت میں سُن کا ہوں۔ دوسرے نئے مضامین بھی جو آپ نے بڑی محنت ے جمع کیے ہیں، دلچسپ اور معیاری ہیں۔ کنھیا لال کپور ں لغاتِ جدید اور رام لعل نابھوی کا "رسمِ اجراء" خاص طور پسند آئے۔ دوسرے مضامین بخیل کی طرح آہستہ آہستہ زہ لے کر پڑھوں گا۔ خالد رحیم صاحب کا منظوم رپورتاژ ھی خاصہ کی چیز ہے۔ اس میں حیرت ناک روانی اور حقیقت یانی ہے۔ اگر یوسف ناظم صاحب کا رپورتاژ بھی شامل ہوجاتا و اچھا ہوتا۔

اس نہایت کامیاب سالنامہ کے اجراء پر آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر) قمر رئیس۔ دہلی

○ شگوفہ کا سالنامہ مل گیا تھا۔ اِس باوقار خاص نمبر، نکالنے پر مبارکباد قبول کیجئے۔ میں اسے اچھی طرح پڑھ بھی نہیں سکا تھا کہ ...... اُٹھا لے گئے۔ بُک امپوریم سے بھی ساری کاپیاں لُٹ گئیں۔ بہرحال وہ بہت مقبول ہُوا۔

رضا نقوی واہی۔ پٹنہ

○ ... زندہ دلانِ حیدرآباد کی محفل سے اُٹھ کر بالآخر بندہ ہیچمدان، نازک اندام و خوش بیان، ساکنانِ ایران میں پہنچ چکا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ باشندگانِ تہران میں کتنے چہرے گلفام ہیں اور کون نازک اندام ہے، کیونکہ بے تحاشہ اور بے حساب سردی نے اہلِ تہران کو چار چار سویٹرس، مفلروں اور سمور میں اتنا لپیٹ رکھا ہے کہ کنٹوپ سے صرف آنکھیں ہی نظر آتی ہیں اور یہ پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے کہ اِس "پردۂ زنگاری" میں کوئی مونچھ ہے یا پنکھڑی اِک گلاب کی سی۔ آپ کے حکم کے "انوسار" قیامِ کراچی میں دو چار اہلِ قلم حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اور بہتوں کو شگوفے کے تحائف بھی پیش کیے گئے۔ دورانِ گفتگو معلوم ہوا کہ حضرت سید محمد جعفری صاحب انتقال فرما گئے ہیں اور مشتاق احمد یوسفی بغرضِ علاج امریکہ میں مقیم ہیں۔ ابنِ انشاء لاہور میں ہیں۔ ان تینوں مشہور و معروف طنز و مزاح نگاروں کی عدم موجودگی کے بعد صرف میری ذاتِ بابرکات ہی باقی رہ جاتی ہے، جو بطور مہمان آپ کے (یا ہمارے) سالانہ جلسہ میں شرکت فرماسکے اگر میری شرکت ناممکن ہو تو "سفید شہر" کے مشہور و معروف کُل ہند مزاح نگار کی خدمات مستعار لی جاسکتی ہیں حیدرآباد کی بہ نسبت کراچی میں ایک اچھا ادبی ماحول پایا جاتا ہے۔ وجہ، حیدرآباد کے ہر چار اشخاص میں سے ایک شخص شاعر ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف کراچی میں ہر چوتھا شخص ادیب یا مزاح نگار ہوتا ہے ...... شگوفہ کا سالنامہ یقیناً پریس کی قید و بند سے آزاد ہوچکا ہوگا، اور اس کے ساتھ گمان غالب ہے کہ آپ نے ترقی کا ایک اور زینہ طے کر کے مجردگاہ میں ایک اونچا مقام پیدا کر لیا ہوگا۔

سالنامہ دیکھا، جس سے پتہ چلا کہ 'شگوفہ' نے واقعی
ل اور طے کرلی ہے۔ سالنامہ کی ضخامت دیکھ کر وہ
دئی جو بھوک کے وقت مرغ مسلّم کی پلیٹ دیکھ کر
ہے ... سمیع صاحب کی غزل کے دو شعر بے حد پسند
۔

پرویز یداللہ مہدی۔ بمبئی

... ترکی کے مصطفےٰ کمال نے تو صرف ایک بار کمال
ترکی میں انقلاب لایا تھا۔ لیکن آپ تو اکثر کچھ نہ کچھ
تے رہتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ آپ نے 'شگوفہ'
ا شاندار سالنامہ نکال دیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ
ن ندار "ڈرامہ نمبر" کا اعلان بھی کردیا ہے۔

رشیدالدین۔ حیدرآباد

"شگوفہ" کا خوبصورت و خوب سیرت سالنامہ ملا۔
، بڑے عمدہ ہیں۔ بار بار پڑھنے کے باوجود طبیعت
ں ہوتی۔ چند سال پہلے زندہ دلانِ حیدرآباد نے ظرافت
ع جلائی تھی، اب اس کی شعاعیں پورے ملک میں
ہی ہیں۔ تازہ شگوفہ سے، پٹنہ کے "جشنِ ظرافت"
لات ملیں۔ جناب خالد رحیم کا منظوم رپورتاژ ——
ید ہے۔ خدا آپ کو ایسے 'شگوفے' بار بار چھوڑنے
غ عطا کرے!۔

فیض الرحمٰن۔ کرناٹک

... ایک حسین و جمیل شاہکار یعنی سالنامہ ملا۔
کا ہر شمارہ یوں تو روایتی حسن کا حامل ہوتا ہے ....
ے رضا نقوی واہی کی کُل ہند دو روزہ جشنِ ظرافت،
ٹ، جناب شفیع مشہدی کا خط اور جناب خالد رحیم
وم رپورتاژ، سالنامہ کی گل کاری میں اضافہ ہے مزاحیہ
نمبر کی خصوصی اشاعت کا اعلان انتظار کی گھڑیاں
نے میں مصروف ہوچکا۔ "فلمی تصویر" کا تعارف جنوبی ہند
ے بے مثال تحفہ ثابت ہونے کا پتہ دیتا ہے۔

اسمٰعیل سعیدی آذر، کٹک

○ شگوفہ ملا، دل شگفتہ ہوگیا۔ میں نے ابھی کچھ
غزلوں پر نظر ڈالی ہے۔ "ایمرجنسی کے بعد" فیاض افسوس
اور مین بانکے کی غزلیں پسند آئیں۔

اثر سلوزی۔ رائے بریلی

○ شگوفہ کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ دلکش ہی دلکش ہے
بلاشبہ آہوں اور آنسوؤں کے اس دور میں شگوفہ کا
سالنامہ پڑھ کر کتنے ہی پژمردہ چہرے کھل کر گلاب بن گئے
بہرحال، اس شمارے میں یوں تو سبھی فن کار خوب ہیں ——
لیکن مجتبیٰ حسین، پرویز مہدی، مسیح انجم، مناظر عاشق اور
شفیقہ فرحت خوب تر بلکہ تر بہ تر ہیں۔

ایم منظرالزماں خاں، حیدرآباد

○ آپ نے شگوفہ کا سالنامہ بھیجا ہے کہ ادبی تاریخ کا آئینہ
ادب کا یہ ایسا گلدستہ ہے، جس کا ہر مضمون گلاب اور ہر نظم
نسترن ہے۔ واقعی یہ سالنامہ آپ کی ذہانت، علمی صلاحیت
اور بلند نظری کا پتہ دیتا ہے۔ میں خواب میں بھی تصور نہیں
کرسکتا تھا کہ یہ سالنامہ سنگِ مرمر کا تراشا ہوا ایک ایسا حسین
ادبی پیکر ہوگا، جس پر ہر مزاحیہ ذہن پروانہ وار نثار ہونے
کا فخر حاصل کرے گا۔ جناب رضا نقوی واہی کا قابلِ فخر مضمون
"کل ہند دو روزہ جشنِ ظرافت" ، جناب شفیع مشہدی کا "ایک خط"
اور جناب خالد رحیم صاحب کا منظوم رپورتاژ، پٹنہ میں منعقدہ،
کل ہند جشنِ ظرافت کا شفاف آئینہ ہے۔ ایسے عدیم المثال شاہکار
پر دلی مبارکباد۔

جوہر سیوانی۔ سیوان

○ سالنامہ ملا۔ بہت ہی شاندار نمبر نکلا ہے، مبارکباد
قبول کیجئے۔

اسمٰعیل ظریف۔ حیدرآباد

○ سالنامہ بدست ہوا۔ تقریباً تمام تخلیقات، ڈھکن کو چھوڑ کر
عمدہ ہیں۔

ڈھکن رائچوری۔ رائچور

ایک نئے دَور کی دہلیز پر!

نصف صدی کے موڑ پر نمودار ہونے والا منصوبہ بندی کا دَور آندھراپردیش کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دَور شاندار کارناموں اور بے مثال کامیابیوں سے معمور ہے۔ زراعت، آبپاشی، برقی اور ملحقہ خدمات کے کلیدی شعبوں پر اس دَور میں زبردست اور مفید اثرات مرتب ہوئے ہیں، جن کی بدولت ہماری معیشت کی بنیادوں کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی ہے اور ریاست کی ترقیاتی سرگرمیاں نئی اور برتر بلندیوں تک پہنچ گئی ہیں۔

آندھراپردیش میں منصوبوں کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ کافی نمایاں اور روشن ہیں۔ منصوبہ جاتی اخراجات کے بڑھتے ہوئے رُجحان پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ہم کو اس کے اثرات کا اندازہ ہوجائے گا کہ یہ اخراجات جو پہلے منصوبے کی مدت میں ۹۷ کروڑ روپے سے بتدریج بڑھ کر چھٹے منصوبے کے دوران میں ۴۲۷ کروڑ روپے ہوگئے۔ تمام منصوبوں میں زراعت، آبپاشی اور برقی کے شعبوں کو اوّلین فوقیت حاصل رہی۔

پہلے منصوبے کے پہلے سال یعنی ۵۲-۱۹۵۱ء سے چوتھے منصوبے کے تیسرے سال یعنی ۷۲-۱۹۷۱ء تک آندھراپردیش میں کی جانے والی کوششوں کی یہ خصوصیت رہی کہ زراعت کو ترقی دینے اور سماجی و معاشی حالات کو بہتر بنانے کی حکمت عملی کو رُوبہ عمل لایا جائے اور بحیثیت مجموعی اقتصادی حالات کو سدھارنے کی خاطر آبپاشی اور برقی کے فروغ کے لئے بھاری مقدار میں سرمایہ مصروف کیا جائے۔

آج، آندھراپردیش میں منصوبہ بندی ایک نئے اور حوصلہ افزا مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ ۷۶-۷۵ء کے سالانہ منصوبہ کے لئے مقررہ رقم ۱۵۴ کروڑ روپے کو نظرثانی کے بعد بڑھاکر ۱۹۰ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے۔ یہ رقم ۷۴-۱۹۷۳ء کے اخراجات سے دوگنی اور ۷۵-۱۹۷۴ء کے اخراجات سے ۲۸ فیصد زیادہ ہے۔

گزشتہ دو برسوں میں منصوبہ جاتی خرچ میں جو اضافہ ہوا ہے، وہ ریاست کی تاریخ میں شاید کثیر ترین ہے۔ اضافہ شدہ اخراجات کی پابجائی ریاستی وسائل ہی سے کرنا تجویز پایا ہے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء کے سالانہ منصوبے کے خرچ کو بڑھاکر ۲۰۰ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے۔

ریاستی منصوبے کے اخراجات میں اضافہ ریاست کی آمدنی بڑھ جانے کے باعث ممکن ہوسکا اور، یہ نتیجہ ہے گزشتہ چند برسوں میں بڑھی چڑھی پیداوار اور ان کوششوں کا جو حکومت نے ریاستی منصوبہ کے لئے مالیہ کی فراہمی کی خاطر زائد وسائل مہیا کرنے کے سلسلہ میں کی ہیں۔ جزوی طور پر اس کی ایک وجہ نظم و نسق کا سدھار بھی ہے، جس کے نتیجہ میں معمولات اچھی مقدار میں وصول ہوئے۔ غیر پیداواری خرچ میں کفایت برتی گئی اور فضول خرچی سے احتراز کیا گیا۔

بلاشبہ آج ہماری ریاست ایک نئے دَور کی دہلیز پر کھڑی ہے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت آندھراپردیش

DIPR/20/76-77.

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر

سیّد مصطفیٰ کمال
(ایم اے (عثمانیہ))

جلد (۱۰) ـــــــــ مارچ ۱۹۷۷ء ـــــــــ شمارہ (۳)

کتابت: ادارۂ سلام خوشنویس، نزد مسجد کمیلہ، یاقوت پورہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۳
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو دربار حسینی، پرانی حویلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

زرِ سالانہ لائبریریوں سے ـــــ (۲۰) روپے
بیرونِ ہند سے ـــــ (۳۰) شلنگ
سالانہ انفرادی ـــــ (۱۵) روپے
فی پرچہ ـــــ ۱/۵۰ روپیہ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ شگوفہ، ۳۱ر مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

کشمیری قوام

نقلی اور ملتے جلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لئے اس کے ڈبے اور پیاکنگ کو بغور دیکھ لیجئے۔

تیار کنندگان:

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس

گلزار حوض، حیدرآباد ۲.... ۵ (اے پی)

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

ماہنامہ

شگوفہ

کی

ایک اور یادگار خصوصی اشاعت

مزاحیہ

ڈرامہ نمبر

چند خصوصیات

مزاحیہ ڈراموں کا جائزہ
اُردو کے مزاحیہ نمائندہ ڈرامے
ہندوستانی زبانوں کے شاہکار
مزاحیہ ڈرامے (تراجم)
اور
کئی
دوسری دلچسپیاں

مزاحیہ ڈرامہ نمبر کے
مہمان مُدیر

ساگر سرحدی
مشہور ڈرامہ نگار و فلم اسکرین پلے رائٹر و مکالمہ نویس

مزاحیہ ڈرامہ نمبر کے مضامین روانہ کرنے کا پتہ:
ساگر سرحدی
30/1368 سردار نگر
3 سائن، بمبئی 400022

مزید تفصیلات کا متعاقب اعلان کیا جائے گا۔

کرشن جی، نہیں رہے!

۸ر مارچ ۱۹۷۷ء کی دوپہر پتہ چلا کہ نامور ادیب کرشن چندر انتقال کر گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے دُنیا ٹھہرسی گئی، سکتہ سا طاری ہوگیا۔ ان کی صحت کچھ ایسی اُونچ نیچ سے دوچار تھی کہ ایسی بُری خبر کسی بھی وقت سُنی جاسکتی تھی۔ کوئی آٹھ ماہ قبل ان کے دِل پر سخت حملہ ہُوا ـــــ تشویشناک خبروں کے درمیان میں اطلاع مِلی کہ انھیں "پیس میکر" لگایا گیا ہے اور اب قدرے ٹھیک ہیں۔ دسمبر کے وسط میں ممتاز مزاح نگار جناب یُوسف ناظم کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ کوئی ایک گھنٹہ تک بڑی پُرلُطف باتیں رہیں، حیدرآباد کے ادیبوں اور دانشوروں کے تذکرے رہے۔ نئے طنز و مزاح نگاروں اور 'شگوفہ' کی کاوشوں پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ جناب یوسف ناظم کی نقرہ بازی سے وہ محظوظ ہوتے رہے۔ البتہ اِس بات سے دِل گرفتہ تھے کہ ان کی بے اعتدالیوں میں فرق آگیا ہے۔ کبھی پڑھ تو لیتے ہیں، لیکن لکھنے سے یکسر منع کر دیا گیا ہے۔ مَیں نے اپنی عادت کے برخلاف سالنامہ کے لئے لکھنے پر کوئی اصرار نہیں کیا، صرف سلمیٰ آپا سے مضمون کی فرمائش کی۔ کرشن جی نے ان کی طرف سے وعدہ کیا۔ لیکن سلمیٰ آپا مزاح لکھنے کی طرف مائِل نہ تھیں۔ بہرحال بڑی خوشگوار یادیں لیئے بمبئی سے لَوٹا۔ سالنامہ پریس سے آیا ہی تھا کہ کرشن جی کا خط آیا کہ اگر پرچہ چھپا نہیں ہے تو وہ مضمون عنایت کریں گے سالنامہ تو چھپ چکا تھا، لیکن اس بات پر جی خوش ہوگیا کہ کرشن جی لکھنے لگے ہیں۔ لیکن مکمل ایک ماہ بعد انتقال کی خبر مِلی تو احساس ہوا کہ فرشتۂ اَجل کرشن جی کو جُل دے گیا۔

کرشن چندر ـــــ جو اِس صدی کے عظیم ادیب تھے، اب ہم میں نہیں۔ سلمیٰ آپا نے اپنی زندگی کا ساتھی، ملک کی کئی ایک انجمنوں نے اپنا سربراہ، بے شمار اصحاب نے اپنا مربی دوست ماہنامہ 'شگوفہ' نے مجلسِ مشاورت کا ایک اہم رُکن کھودیا ـــــ لیکن ادیب کرشن چندر زندہ ہے اور رہتی دُنیا تک زندہ رہے گا۔ یُوں بھی کرشن چندر صرف فرد کا نام نہیں، تحریک کا نام ہے۔ وہ فرد اب ہمارے درمیان نہیں لیکن اس کی تحریک ہمیشہ زندہ رہے گی۔

کرشن چندر نے اپنے قلم کو زندگی کی قابلِ قدر اقدار کے تحفظ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ہر دَور میں رَوا رکھی جانے والی نا انصافیوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ہر قِسم کے جَبر و استبداد و

استبداد و استحصال کے خلاف انھوں نے لکھا اور خوب لکھا۔ اپنی تخلیقات کے ذریعہ اُردو زبان و ادب کو وزن و وقار عطا کیا۔ عالمی ادب میں خود بھی مقام پایا اور اُردو ناول و افسانہ کو روشناس بھی کروایا۔ اُردو زبان کے تحفظ کے لئے بھی انھوں نے قابلِ قدر اور ٹھوس کارنامے انجام دیئے۔ رسم الخط کی تبدیلی کی مُہم چلی تو بڑے بیباکانہ انداز میں اِس سازش کا پردہ چاک کیا۔

کرشن جی زندہ دل انسان تھے۔ وہ اپنی تحریر کو طنز کے نشتر اور مزاح کے گلدستوں سے آراستہ کرتے تھے۔ خالص طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی انھوں نے لکھے۔ ۱۹۶۶ء میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام مزاح نگاروں کی کُل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ خطبۂ صدارت پڑھا اور زندہ دلان کی مساعی کو سراہا۔ ۱۹۶۸ء میں شگوفہ کے اجراء کی تجویز آئی تو مجلسِ مشاورت میں شمولیت کے لئے بہ خوشی اپنی رضامندی سے نوازا۔ ۱۹۷۵ء میں "کرشن چندر کے ساتھ ایک شام" کے زیرِ عنوان شاندار تقاریب منعقد ہوئیں۔ اس طرح زندہ دلانِ حیدرآباد اور ماہنامہ شگوفہ کی ہمیشہ سرپرستی کرتے رہے۔

ہم اپنے بے مثال سرپرست، مشیر اور عظیم ادیب کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ دُعا ہے کہ خدا ان کی رُوح کو سکون نصیب کرے اور محترمہ سلمیٰ صدیقی و دیگر ورثا کو صبرِ جمیل۔

مصطفےٰ کمال

کرشن جی کا آخری خط!

The Niche
St. Francis Avenue
Santacuz (West)
Bombay 54.
23-1-77

پیارے مصطفےٰ کمال۔

خط مل گیا۔ سلمیٰ علیگڑھ میں ہیں۔ رشید صاحب کا انتقال ہوگیا۔ کراچی سے رشید صاحب کے فرزند آنے والے ہیں، اس لئے سلمیٰ ان سے ملنے رُک گئی ہیں۔

سات ماہ کے بعد مجھے اپنے ہاتھ سے خط لکھنے کی اجازت ملی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے موضوعات پر طبع آزمائی کی اجازت بھی ملی ہے۔ ایک مزاحیہ مضامین آج شروع کیا ہے، کل یا پرسوں تک مکمل ہو جائے گا۔ اگر شگوفہ کے سالنامہ میں جگہ ہو تو بھیجدوں۔ فوراً بذریعہ خط یا ٹیلی گرام مطلع فرمائیے۔

جملہ احباب کو آداب۔

مخلص

کرشن چندر

کرشن چندر

پرہیز

میں نے دیکھا ہے کہ قدرت ہر حال میں اپنا توازن برقرار رکھتی ہے۔ ہم نے زکام، نزلہ، بخار، نمونیا
ئے پنسلین ایجاد کی تو قدرت نے پنسلین ہی کو مہلک بنا دیا۔ اب اتنے لوگ نمونیا سے نہیں مرتے جتنے پنسلین
رتے ہیں۔

ہم نے اربوں روپے خرچ کر کے عالمگیر پیمانے پر ملیریا کو ختم کر دیا تو کینسر کا مرض وبائی صورت اختیار
۔ ہم نے ٹی بی دق کا شافی علاج دریافت کر لیا تو دل کا عارضہ عام ہو گیا۔ جسے دیکھئے اپنے سینے کے بائیں طرف
رکھے متوحش نگاہوں سے ڈرا سہما دکھائی دیتا ہے۔ میرے دوستوں میں ہر چوتھا دوست دل کا مریض ہے۔
دل کی بیماری میں آہ و بکاہ کی جاتی تھی۔ اب جان بھی جاتی ہے۔

دل کا عارضہ رنج و غم کرنے سے بڑھتا ہے۔ اسی لئے ساری دنیا کے ہارٹ اسپیشلسٹ یہی کہتے ہیں کہ
ل کے عارضے سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور لمبی عمر پانا چاہتے ہو تو رنج و محن کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے نہ دو۔
خوش رہا کرو۔ اس لئے اب میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔ گزشتہ سال میرے والد کا انتقال ہو گیا تو میں برابر
اتا رہا۔ احباب تعزیت کو آتے رہے۔ مگر میں مسکراتا رہا۔ نہ جانے انہوں نے کیا سمجھا مگر میں تو ڈاکٹر کے کہنے
کر رہا تھا۔ پھر جب چھ ماہ بعد میری خالہ محترمہ کا انتقال ہوا تو میں خوش رہنے کے لئے ایک پکچر ہاؤس میں ایک
فلم دیکھنے چلا گیا۔ پرسوں میرے گھر میں آگ لگ گئی تو میں خوشی سے قہقہے لگانے لگا۔ میری بیوی نے سمجھا شاید
ل ہو چکا ہوں۔ مگر جب میں نے اسے سمجھایا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ محض خوش ہوں اور خوش بھی اس لئے ہوں کہ
سے عمر بڑھتی ہے تو اس نے پاگل خانے لے جانے والی ایمبولنس واپس کر دی۔ مگر میں دیکھ رہا تھا وہ
ن واپس کر دینے پر کچھ خوش نظر نہیں آتی۔

فکر کو دور رکھنے اور دل کو ہمیشہ خوش رکھنے کے علاوہ آجکل ڈاکٹر لوگ اور خصوصاً ہارٹ اسپیشلسٹ
بیماری کے مریضوں یا ہونے والے مریضوں کو وزن گھٹانے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے میں
عمر پانے کا ایک ہی نسخہ ہے۔ اپنا وزن گھٹا دو۔ مجھے اس دلیل میں وزن نظر آتا ہے۔ کیونکہ میں نے سنا ہے
لیلیٰ کے مر جانے کے بعد بھی پچھتر برس زندہ رہا! میں نے سنا ہے اور فلموں میں بھی دیکھا ہے کہ اس کا وزن
تھا کہ جب اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تو اس کے دوست اور احباب محض ایک پھونک مار کر
ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتے تھے۔ ایک بار زور کی پھونک لگ جانے سے وہ اپنی منزل سے کچھ

وہ دریا میں کود پڑا۔ مگر ڈوب نہ سکا۔ کیونکہ اس کا وزن پانی سے کم تھا۔ پھر ایک مچھلی نے پھونک ماری۔ اور وہ واپس اپنے احباب کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کا گریبان ہمیشہ چاک رہتا تھا۔ کیونکہ اس کا تنِ ناتواں کپڑوں کا بوجھ نہ سہار سکتا تھا۔ لیلیٰ کے مرنے کے بعد مجنوں نے کئی بار مرنے کی کوشش کی۔ مگر ہمیشہ ناکام رہا۔ ڈوب وہ نہ سکا۔ زہر کھایا تو زہر سیّال بن کر اُس کے جسم سے نکل گیا۔ اس لئے کہ زہر کا وزن مجنوں کے وزن سے زیادہ تھا۔ ایک بار مجنوں نے ایک کانٹے سے ایک پتلا دھاگا لٹکا کر پھانسی گلے میں لگا کر مرجانے کی سوچی۔ دس سال تک وہ اُس دھاگے سے بندھا کانٹے سے لٹکا لٹکتا رہا۔ مگر اُس کی جان نہ نکلی۔ کیونکہ اُس کا وزن دھاگے اور کانٹے دونوں سے کم تھا۔ پھر ایک دن ایک لڑکے نے اُس دھاگے کو مچھلی پکڑنے کا دھاگا سمجھ کر پانی میں لٹکا دیا۔ جہاں مجنوں کو ایک مچھلی نے نگل لیا۔ لیکن وہ اُسے ہضم نہ کرسکی۔ کیونکہ ہضم کرنے کے لئے بھی وزن چاہیئے۔ اس لئے مجنوں پھر پانی کی سطح پر اُگل دیا گیا۔ لوگ یہ کہتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا۔ خدا جانے کہاں تک سچ ہے مگر سب ہی دیوانے فرزانے بھی کہتے ہیں کہ مجنوں آج بھی زندہ ہے۔ کچھ لوگوں کو دیکھ کر تو یہی گمان ہوتا ہے۔ اس کہانی میں اور کوئی صداقت ہو نہ ہو، اتنا ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ آدمی وزن گھٹانے سے دل کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے عوارض اُس پر اس لئے حملہ نہیں کرتے کہ اُنہیں حملہ کرکے ملے گا کیا؟ اس لئے درازیٔ عمر کی دعا کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اپنا وزن گھٹایا جائے۔

وزن گھٹانے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وزن بڑھتا کیسے ہے؟ پہلے یہ خیال عام تھا۔ کہ وزن آپ ہی آپ بڑھتا ہے۔ اور بچپن سے بڑھاپے تک ایک خاص مقدار اور رفتار سے بڑھتا رہتا ہے۔ پہلے یہ خیال عام تھا۔ اب یہ خیالِ خام ہے۔ اب ڈاکٹروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وزن خود بخود نہیں بڑھتا۔ زیادہ اور عمدہ کھانوں سے بڑھتا ہے۔ جس گھر میں اچھا باورچی یا اچھا کھانا پکانے والی بیوی ہوگی اُس گھر کے مالک کو دل کا عارضہ کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ لازم ہے کہ اگر آپ دل کے عارضے میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے تو ایسا باورچی یا ایسی بیوی لایئے جو کھانا پکانا نہ جانتی ہو۔ اس لئے آج کل طلاق عام ہو رہے ہیں۔ اور پھوہڑ بیویوں کو ترجیح دی جانے لگی ہے۔ اور اچھا کھانا پکانا اور اصلی گھی استعمال کرکے اپنے شوہر کو کھلانا بیویوں کی خامی اور نقائص میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ پرسوں میں نے اخبار میں ایک مقدمہ کی روداد پڑھی۔ جس میں شوہر نے اپنی بیوی پر زہر دینے کا الزام لگایا تھا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ بیوی اپنے شوہر کو اصلی گھی میں کھڑے مسالے کا قورمہ تیار کرکے کھلاتی تھی۔ عدالت نے مجرمہ کو چھ سال قید بامشقّت کی سزا دی ہے۔ کیونکہ ملزمہ اپنے شوہر کو اصلی گھی ہی نہیں کھلاتی تھی۔ صبح ناشتہ میں ایک گلاس اصلی دودھ بھی زبردستی پلاتی تھی۔ تاکہ اُس کے شوہر کا وزن بڑھ جائے۔ اور وہ وزن بڑھ جانے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر جلدی مرجائے۔ لیکن آج کل کے جج عاقل اور دانشمند ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے پوسٹ مارٹم پر ڈاکٹروں کی رائے طلب کی جاتی تھی۔ اب سُنا ہے عدالت فیصلہ سُنانے سے پہلے اس قسم کے وزن بڑھانے والے کیس پر ڈاکٹر کی رائے بھی لیتی ہے اور اُسے اٹل سمجھا جاتا ہے۔ سُنا ہے کہ آل انڈیا میڈیکل اسوسی ایشن نے ایک ایسی تجویز حکومت کے سامنے رکھی ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کو اصلی گھی کھلائے، اصلی دودھ پلائے اور مرغن کھانے کھلائے اُسے پھانسی دے دی جائے۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ وزن صرف اصلی گھی کھانے اور اصلی دودھ پینے، اور گوشت کے مرغن کھانوں ہی سے نہیں بڑھتا۔ وزن دراصل غذا میں نشاستہ کی زیادتی سے بڑھتا ہے۔ اور نشاستہ آلو میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ جوں جوں لوگ آلو زیادہ کھاتے جاتے ہیں وزن میں بھالو بنتے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر وزن کم کرنا ہے تو آلو مت کھایئے۔ نشاستہ روٹی میں بھی ہوتا ہے اور ڈبل روٹی میں تو اصلی

ے بھی ڈبل ہوتا ہے۔ اسی لئے تو اُسے ڈبل روٹی کہا جاتا ہے۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے روٹی
اجتناب کیجئے۔ پہلے زمانے میں لوگ روزی روٹی کے لئے تگ و دو کرتے تھے اور دونوں کو حاصل
کے موٹے ہو ہو کر مر جاتے تھے۔ اب صرف روزی کے لئے تگ و دو کیجئے اور روٹی کو بالکل ہی بھول
جئے۔ نشاستہ اس لئے بھی بُرا ہے کہ یہ انسان کے جسم میں پہنچ کر ایک خاص کیمیاوی عمل سے شکر میں تبدیل
جاتا ہے اور شکر کی زیادتی سے ذیابطیس ہوتی ہے۔ جس سے اکثر قلب کا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔
ستہ انسان کے جسم میں پہنچ کر اس قدر ناشائستہ ہو گا۔ اس کا مجھے علم نہ تھا۔ آج سے چاء میں شکر
مٹھائی بند اور آئسکریم بھی ختم۔ ؟

پروٹین بھی انسان کو موٹا کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں وہ اجزاء ہوتے ہیں جو گوشت بناتے ہیں۔ اس لئے
زندہ رہنے کے لئے پروٹین کو بھی کم کرنا ہو گا۔ گندم میں پروٹین ہوتی ہے۔ سُرخ گوشت میں زیادہ
تی ہے۔ سفید گوشت میں البتہ پروٹین کم ہوتی ہے۔ جیسے مرغی کا گوشت یا مچھلی۔ آج کل اچھی مرغی اٹھارہ روپے
سے کم میں نہیں آتی۔ اس لئے اگر آپ کی تنخواہ دو سو پچاس روپے ہے تو اُس میں سے دو سو چالیس روپے
پر صرف کیجئے اور دس روپے ہر ماہ بچا لیجئے اور جناب مہینے میں دس روپے کی بچت کچھ کم نہیں۔ اندازہ
ن کیجئے کہ آپ اس طرح سو سال زندہ رہیں اور ہر ماہ دس روپے بچاتے رہیں تو ذرا سوچئے کہ آپ کے
نے کے بعد آپ کے کتنے رشتہ داروں کا بھلا ہو گا۔

گھٹیا بھی دل کا دشمن ہے۔ گھٹیا کا عارضہ جس میں جوڑوں میں درد ہوتا ہے اور وہ سوج جاتے ہیں۔ یہ
ابتداء ہے۔ دل کے دورے کی اور گھٹیا یورک ایسڈ کی زیادتی سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنے جسم کا اندرونی نظام
جسے انگریزی میں میٹابولزم کہتے ہیں آپ ہی آپ یورک ایسڈ زیادہ پیدا کرتا ہے۔ اور جو چیزیں یورک ایسڈ
پیدا کرتی ہیں وہ ہیں دالیں، مٹر، پھلیاں، سُرخ گوشت وغیرہ۔ یہ یاد رکھئے کہ آپ شکر بند کر چکے ہیں۔ دودھ مکھن
آپ پر حرام ہے۔ اب سب طرح کی دالیں مع مٹر بند ہو چکی تو آپ کیا کھائیں گے؟ غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔
آرام اور اطمینان سے سوچئے کہ غم کھانے سے بھی عمر کم ہوتی ہے اور آپ لمبی عمر پانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ آپ دن کو لوکی کھائیے اور رات کو پالک کا ساگ اور اصلی گھی کی جگہ سورج مکھی
کے بیجوں کا تیل استعمال کیجئے۔ بہتر یہ ہو گا کہ سورج کو بھی چھوڑ دیجئے۔ صرف مکھی کا تیل استعمال کیجئے۔ دن کو لوکی، رات
کو ساگ، اے میری موت دُور بھاگ! اور اگر آپ کو لوکی اور پالک کے ساگ اور سورج مکھی کے بیج کے تیل
سے نفرت ہے تو صرف پانی پیجئے۔ اس میں تھوڑا سا سنگترے کا رس ملا لیجئے۔ دن کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے
اس لئے نمک بھی مت کھائیے۔ اس کی جگہ صرف سنگترے کا رس پانی میں ڈال کر پیجئے۔ ہر اکیس دن کے فاقے کے
بعد گاندھی جی یہی کرتے تھے۔ پانی اور سنگترے کا رس بس!

لمبی عمر پانے کا مجھے بھی بچپن سے شوق رہا ہے۔ اور اچھے کھانے کا بھی بچپن سے شوق رہا ہے۔
لیکن دونوں شوق ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس لئے میں نے وزن گھٹانے کے لئے نشاستہ بند کر دیا۔ اور
وہ تمام روٹیاں اور سبزیاں بھی، جن میں نشاستہ ہوتا ہے۔ پھر میں نے مٹھائی کھانا بند کر دیا۔ آئسکریم کو چھونے
سے انکار کر دیا۔ سُرخ گوشت سے پرہیز کیا۔ آلو، مٹر، پھل والی بھاجی آہستہ آہستہ خوراک کم کرتے کرتے میں صرف
پانی اور رو پیچھے آرینج جوس پر آ گیا۔

دو ہفتے اس خوراک پر کسی نہ کسی طرح زندہ رہ کر جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو اُس نے مجھے وزن تولنے والی مشین

پر لا کھڑا کیا۔ معلوم ہوا اس پرہیز کے بعد بھی میرا وزن دس پونڈ بڑھ چکا ہے۔ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک خطرناک سنجیدگی کی لہر آئی۔ اسٹیتھسکوپ کو میرے دل پر رکھتے ہوئے بولا: "کیا کھاتے رہتے ہو؟" میں نے کہا: "پانی میں تھوڑا سا آرینج جوس ڈال کر پیتا رہا ہوں۔" "یہی تو خرابی ہے تم میں۔" ڈاکٹر میرے سینے کو اپنے انگوٹھے سے ٹھونکتے ہوئے بولا۔ وزن بڑھ گیا ہے۔ سنگترے کے رس میں بڑے قوی اجزاء ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں تم صرف پانی پیو۔ ایک ہفتے میں تمہارا وزن کم ہو جائے گا۔ موجودہ حالت اور صحت بے حد خطرناک ہے تمہیں کسی وقت بھی دل کا دورہ پڑ سکتا ہے! اگلے ہفتے آنا۔

گھر آ کر میں نے بیوی سے کہا کہ آئندہ سے میں صرف پانی پیا کروں گا۔ اور محض پانی پی کر جیا کروں گا۔ صبح ناشتے میں ایک کپ پانی، لنچ پر ایک گلاس پانی، رات کو دو گلاس پانی۔ ایک ہفتہ میں وزن آپ ہی آپ کم ہو جائے گا۔ بیوی نے بھی خوش ہو کر اس پر صاد کیا۔ کیونکہ اس طریقہ پر عمل کرنے سے کچن کا خرچ بہت کم ہو گیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد جب میں پھر ڈاکٹر کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ محض پانی پینے سے میرا وزن دو پونڈ اور بڑھ چکا ہے! ڈاکٹر حیرت میں پڑ گیا۔ بولا: "تم نے کچھ اور تو نہیں کھایا پیا۔ سچ سچ بتاؤ؟"

"مطلق نہیں ڈاکٹر صاحب! آپ فون کر کے میری بیوی سے پوچھ سکتے ہیں۔"

"پانی پینے کا گلاس صاف ستھرا تھا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "جی ہاں! سوڈے سے دھلوا دیا تھا۔" میں نے کہا ——— "ہمیشہ دھلواتا ہوں اور اپنے سامنے نل کا پانی نکلوا کر پیتا ہوں۔" ——— "پھر وزن کیوں بڑھ گیا؟" ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ——— میں نے کہا: "جب آپ جانتے ہیں بمبئی کے پانی میں پانی کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔ نل کھولئے تو کبھی پانی کی پتلی دھار کے ساتھ مچھلی چلی آ رہی ہے کبھی گھونگھے، کبھی چوہے، کبھی کیڑے ایسی ایسی مقویات پائی جاتی ہیں کہ آدمی اگر پانی کو پیئے تو ناممکن ہے کہ موٹا نہ ہو۔"

"تو آئندہ سے پانی چھان کر پیجئے۔" ڈاکٹر نے بڑی سختی سے کہا ——— "سولہ روپے نکالو میری فیس کے!"

میں نے سولہ روپے جیب سے نکال کے ڈاکٹر کی ہتھیلی پر رکھ دئے۔ گھر چلا آیا اور گھر آ کر بیوی سے کہا کہ وہ میرے لئے کھڑے مصالحے کا گوشت تیار کرے چکن، ریشمی کباب، تیتر کے تکے، قیمے بھرے پراٹھے اور آخر میں ایک پاؤ آئسکریم، رات کو سونے سے پہلے بالائی والے دودھ کا ایک گلاس بھرا ہوا جس میں بادام، کشمش اور چھوارے بھی پڑے ہوں اور پستہ بھی! بیوی نے گھبرا کر کہا: "تمہارا کیا ارادہ ہے؟" اپنی جان دینے کا۔ بارہ پونڈ وزن تمہارا پہلے سے بڑھ چکا ہے اب صرف چھنا ہوا پانی پیو۔ بلکہ اُبال کر پیو!"

میں نے کہا: "مرنا تو ہر حال میں ہے، میں جیسے کہتا ہوں تم ویسے کرو۔"

دوسرے دن میں نے اُس سے کہا: "آج کے مینو میں تندوری مرغ، تلی ہوئی پام فریٹ، چکن بریانی اور لہسن سے بگھارا ہوا دہی کا رائیتہ اور آلو کے پراٹھے اور بعد میں بنارسی حلوائی کے ہاں سے موہن بھوگ کی ایک پلیٹ ادھر کھانے میں اصلی گھی استعمال ہو ورنہ تازہ مکھن۔" سات دن میں نے اسی طرح کا پرہیز رکھا اور خوب ڈٹ کر کھایا۔ بیوی مسلسل احتجاج کرتی رہی۔ اُس نے اپنے میکے والوں کو خط لکھ دیا کہ وہ جلد کوئی بُری خبر سُننے کے لئے تیار رہیں! اور میرے تمام دوستوں کو خبردار کر دیا کہ انہوں نے مجھے جو قرضے دے رکھے ہیں وہ جلد سے جلد اُس کا چکتا کر لیں ورنہ بعد میں وہ اُس کی ذمہ دار نہ ہوگی! ——— سات دن مرغن غذائیں کھانے کے بعد جب میں نے ڈاکٹر کے کہنے پر وزن تولنے والی مشین پر پاؤں رکھا تو میرا وزن بارہ پونڈ کم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر ایک مطمئن تبسم نظر آیا میں کہتا نہ تھا۔ موٹا کرنے والی وزن بڑھانے والی تمام اشیاء چھوڑ دو، تمہارا وزن خود بخود کم ہو جائیگا۔ دیکھا آج وزن بارہ پونڈ کم ہے اور چہرے پر بھی رونق ہے جو احتیاط پرہیز اور ڈاکٹر

کرشن چندر

بلّی اور وزیرؔ

شری آپادھیائے کا ارادہ قطعی طور پر وزیر بننے کا نہیں تھا۔ وہ گل شاہ تارا میں ایک معمولی سے وید تھے۔ گل قند، مدھو مکر دھوج اور جوارش کمونی مروارید والی بیچتے تھے۔ مگر قصہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ چیف منسٹر کے بھانجے کو جس کا اسی گلی میں کوئلوں کا ڈپو تھا پیچش ہوگئی۔ اور وہ شری آپادھیائے کے علاج سے ٹھیک ہوگیا۔ اس نے برسبیل تذکرہ چیف منسٹر سے شری آپادھیائے کا اس کا ذکر کر دیا۔ چیف منسٹر کو عرصے سے بواسیر کی بیماری تھی اور کسی طرح ٹھیک نہ ہوئی تھی چیف منسٹر نے اپنے بھانجے کے اصرار پر شری آپادھیائے کو بلا بھیجا۔ اور ان کا علاج شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے چیف منسٹر صاحب کی پرانی بواسیر چھ مہینوں میں ہی آپادھیائے جی کے علاج سے ٹھیک ہوگئی۔ اب کیا تھا۔ شری آپادھیائے چیف منسٹر کے خاندانی حکیم ہو گئے۔ ان کا شمار چیف منسٹر کے اپنے آدمیوں میں ہونے لگا۔ شری آپادھیائے جی کی حکمت وہ چلی کہ انھیں ایک سال کے عرصے میں ہی اپنے مریضوں کو دیکھنے کے لئے ایک گاڑی خریدنی پڑی۔ گھر سے بنگلے میں رہنا پڑا۔ بنگلے میں ٹیلی فون لگانا پڑا۔ بنک میں اکاونٹ کھولنا پڑا۔ غرض یہ کہ چیف منسٹر صاحب کی دوستی ان کے لئے اچھی خاصی مصیبت بن گئی۔

لیکن یہ سیاسی آدمی آپ تو جانتے ہیں ایک دفعہ جس کے پیچھے پڑ جایئں زندگی بھر اسے چین نہیں لینے دیتے ایک دن آپادھیائے جی کو چیف منسٹر نے بلایا اور کہا۔

"آپادھیائے جی: آپ تو ہمارے اپنے ہی آدمی ہیں۔ آپ جنتا منڈل کے سکریٹری کیوں نہیں بن جاتے"

آپادھیائے جی نے بہت انکار کیا بولے۔

"سرکار میں آج کل ماء اللحم اور در اکش سو ملا کر ایک نئی دوا بنانے میں مصروف ہوں۔ یوں سمجھئے گویا حکمت میں بدک کا پیوند لگا رہا ہوں۔ دیکھئے اب اس قلم سازی سے کون سی نئی چیز نکلتی ہے؟"

"کون سی نکلے گی؟" چیف منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تو مجھے معلوم نہیں"۔

اس پر چیف منسٹر نے اور حیران ہو کر پوچھا۔ "مگر یہ دوا جو ابھی آپ کو معلوم نہیں کہ کیا ہوگی، کس غرض کے لئے ہوگی؟"

"یہ بھی معلوم نہیں!" شری آپادھیائے جی نے بڑی صاف گوئی سے کہا "دراصل بات یہ ہے کہ انگریزی طریقۂ علاج میں پہلے بیماری ڈھونڈی جاتی ہے، بعد میں اس کا علاج دستیاب ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلے دوا بنا لیتے ہیں۔

بعد میں اس کے لئے بیماری ڈھونڈتے ہیں"۔

"تو بالکل ٹھیک ہے!" چیف منسٹر نے سر ہلا کے کہا۔ "آپ پہلے جنتا منڈل کے سکریٹری ہو جائیے بعد میں آپ کے لئے کام ڈھونڈ لیا جائے گا"۔

چنانچہ شری اُپادھیائے جنتا منڈل کے سکریٹری چُنے گئے۔ کیونکہ وہ چیف منسٹر کے اپنے آدمی تھے۔ پھر جب اسمبلی کا الیکشن سر پر آگیا۔ تو چیف منسٹر نے انھیں پھر بُلا بھیجا۔ اور کہا۔ "اُپادھیائے جی! منڈل کے لوگ آپ کے کام کی بہت تعریف کرتے ہیں"۔

اُپادھیائے جی نے حیران ہو کر کہا۔ "مگر سرکار میں تو منڈل میں ایک بار بھی نہیں بولا"۔

"یہی تو قابلِ تعریف بات ہے"۔ چیف منسٹر نے سر ہلا کے کہا۔ "دیکھئے آج کل الیکشن سر پر آرہے ہیں۔ میرے خیال میں آپ اسمبلی کے لئے اپنے حلقے سے ممبری کی درخواست دیدیجئے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور ———"

"مگر جناب" شری اُپادھیائے نے بالکل پریشان ہو کر کہا۔ "میں ان دنوں بہت مصروف ہوں۔ آپ کے کامرس ڈپارٹمنٹ کے جوائنٹ سکریٹری شری گرما بر مانند کا علاج کر رہا ہوں"۔

"انھیں کیا بیماری ہے؟" چیف منسٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "بیماری تو انھیں وہ ہے جو میں ان کی بیوی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ اب آپ خود ہی سمجھ جائیے"۔

چیف منسٹر کی آنکھوں میں ایک شریر چمک نمودار ہوئی۔ رازدارانہ لہجے میں بولے۔ "تو آپ اُن کا علاج تو ٹھیک طرح سے کر رہے ہیں نا؟"

"علاج تو کر رہا ہوں"۔ اُپادھیائے جی رُک رُک کر بولے "لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا علاج کروں؟ دراصل بیماری کا صحیح علاج سنکھیا ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کتنا سنکھیا کھلاؤں، جس سے اُن کی بیماری تو مر جائے لیکن وہ خود تو نہ مریں۔ اگر سنکھیا کم دیتا ہوں تو ان کی بیماری نہیں جاتی۔ زیادہ دیتا ہوں تو وہ خود مر جاتے ہیں"۔

"مرنا جینا تو بھگوان کے ہاتھ میں ہے" چیف منسٹر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "مگر الیکشن تو اپنے ہاتھ میں ہے نا اس لئے آپ بس دیر نہ کیجئے۔ آپ اسی الیکشن میں کھڑے ہو جائیے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور"۔

چنانچہ شری اُپادھیائے جی اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ پھر وزارت سازی کے موقع پر جب چیف منسٹر صاحب اپنی وزارت مرتب کرنے لگے تو انھیں اپنے آدمیوں کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ انہوں نے شری اُپادھیائے جی کو محکمۂ صحت کا وزیر بنا دیا اور جنگل کا محکمہ بھی انھیں کے سپرد کر دیا۔ کہ ہر طرح کی جڑی بوٹی کی دریافت جنگل ہی سے ہوتی ہے۔

شری اُپادھیائے جی نے وزیر بننے سے بہت انکار کیا۔ ایک تو ان کی دھرم پتنی گیارہ بچوں کے بعد پھر سے حاملہ تھیں۔ پھر ان دنوں ہی وہ ایک مقامی رئیس اور کارخانے دار کی فرمائش پر سچے موتی اور جواہرات والا مسدھ مکردھوج، بنانے میں مصروف تھے۔ مگر چیف منسٹر صاحب نے اُن کی ایک نہ مانی۔ بولے "آپ یہ بھی تو سوچئے کہ اب تک جتنے وزیر میں لے چکا ہوں۔ کسی کی عمر ساٹھ برس سے کم نہیں ہے اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں جسے کوئی نہ کوئی بیماری لاحق نہ ہو کسی کا سر ہلتا ہے تو کوئی دمہ میں مبتلا ہے، کسی کو ذیابیطس ہے تو کوئی ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہے اس لئے بھی وزارت میں کسی نہ کسی حکیم یا وید کا ہونا ضروری ہے۔ آپ اپنے آدمی ہیں اور ———"

"بے شک، بے شک" چیف منسٹر کے پرائیویٹ سکریٹری نے سر ہلا کر کہا اور شری اُپادھیائے جی وزیر بن گئے۔

شری اُپادھیائے جی وزیر تو بن گئے لیکن وہ اس وزارت بازی سے خوش نہ تھے۔ ایک تو انھیں انگریزی بھی اپنے دیس کی اعلیٰ راشٹر بھاشا آتی تھی۔ کچھ ہندی اور اردو کو بھی وہ واجبی سی جانتے تھے [illegible]

محکمے کے پرسنل سکریٹری کو سونپ رکھا تھا اور خود دوسرے وزیروں کے علاج میں لگے رہتے تھے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا تھا کہ انھیں اپنی وزارت کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں تھی۔!

ایک روز سہ پہر میں جب آسمان کا رنگ عرق گاؤزبان کی طرح شفاف تھا اور زمین پر پھلا کی طرح زردی مائل اور بھورے رنگ کی ہو رہی تھی۔ اور اُپادھیائے اپنی کھرل میں اصل کشت عنبری مرجان والا گھونٹ رہے تھے۔ چیف منسٹر کا پرائیویٹ سکریٹری ان کے پاس آیا اور ان کے کان میں کہنے لگا۔

"ابھی چلئے! چیف منسٹر صاحب نے بلایا ہے بے حد ضروری کام ہے"۔ "کیا انھیں دل کا دورہ پھر پڑ گیا؟" ——— اپادھیائے جی ایک دم متفکر ہو کر بول پڑے"

"نہیں دورہ نہیں ہے" پرائیویٹ سکریٹری جلدی سے بولا تو پھر میں کون سی دوا اپنے ساتھ لے چلوں' جلدی سے بتائیے' انھیں کیا بیماری ہے؟"

"کوئی بیماری نہیں ہے" پرائیوٹ سکریٹری نے ذرا پریشان ہو کر کہا "یک سرکاری کام ہے"

"سرکاری کام ہے تو میرے محکمہ کے پرسنل سکریٹری شری جتندر ناتھ کنڈا کو بلا لیجئے میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں اس کھرل میں کیسی قیمتی دوا گھونٹ رہا ہوں۔؟"

چیف منسٹر کے پرائیوٹ سکریٹری نے بڑی خوشامد کی۔ آخر بڑی مشکل سے اُپادھیائے جی جانے کے لئے تیار ہوئے۔

جب اُپادھیائے جی چیف منسٹر کی کوٹھی پر پہنچے تو وہاں خوشامدیوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ بڑی مشکل سے چیف منسٹر صاحب نے ان سے چھٹکارا پایا اور پھر شری اُپادھیائے جی کی طرف متوجہ ہوئے۔ بولے "وزارت خطرے میں ہے"۔

"کس کی؟" اُپادھیائے جی نے پوچھا۔ "میری یا آپ کی؟"

"سب کی" ——— اور اگر اس وقت آپ نے میری مدد نہ کی تو میں مارا جاؤں گا"۔

"اُپادھیائے جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا" میں آپ کا اپنا آدمی ہوں۔ کس دن کام آؤں گا۔ اس کمبخت کا نام آپ بتا دیجئے۔ جس نے آپ کو اس قدر پریشان کر رکھا ہے۔ میں شہر کے دو چار غنڈوں کو جانتا ہوں ——— چاقو کے ایک ہی وار میں ———"

نہیں نہیں اُپادھیائے جی! آپ بات کو سمجھتے نہیں! یہ غنڈوں کے کئے سے کام نہ ہوگا۔ یہ کام تو آپ کو کرنا ہوگا!"

اُپادھیائے جی کانپ گئے۔ بولے "یہ کام تو میں نے آج تک کبھی نہیں کیا آپ کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ لیکن کسی کی جان لینا ——— !!!"

چیف منسٹر صاحب ہنس کر بولے "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ میں کہاں کسی کی جان لینے کو کہہ رہا ہوں۔ میں تو ایک سرکاری کام کے بارے میں بات کر رہا ہوں"۔

"وہ کیسا کام ہے؟"

"قومی بچت!"

"قومی بچت؟"

"ہاں قومی بچت۔ آج کل قومی بچت کا خیال مرکزی سرکار کے سر پر بھوت بن کر سوار ہے۔ گزشتہ ایک مہینے سے برابر چٹھیاں آ رہی ہیں۔ سرکاری' نیم سرکاری' ٹرنک کال' ہر لمحہ مجھے دھمکی دی جا رہی ہے کہ اگر میں قومی بچت کے کام کو سنجیدگی سے پورا نہ کیا تو میری وزارت بدل دی جائے گی"۔

"قومی بچت کیا ہوتی ہے؟" اُپادھیائے جی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔ وہ جب چار سے سرکاری کاموں

ہمیشہ کتراتے تھے۔

"مطلب یہ ہے آپادھیائے جی کہ سرکاری کام میں بچت کرنا سرکاری خرچ میں کمی کرنا۔ اگر دس روپے کا کام ہو تو اسے پانچ روپے میں پورا کر لینا اگر کام میں دس آدمیوں کی ضرورت ہو تو اسے دو آدمیوں سے چلا لینا۔ اس طرح کی تکڑم کو قومی بچت کہتے ہیں"

آپادھیائے جی سوچ سوچ کر بولے۔" تو آپ وزیروں کی تنخواہیں کم کر دیجئے"

"وزیروں کی تنخواہ پہلے ہی کم ہو چکی ہے۔ اور اب کیا کم ہو گی؟" چیف منسٹر چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔

"تو آپ ایک وزیر ہی کم کر دیجئے۔ میرا استعفا حاضر ہے"

"آپادھیائے جی خوش ہو کر بولے۔

"مگر ایک وزیر کم کرنے سے کیا ہوگا۔ آپادھیائے جی؟"

"تو........ تو......... دیکھئے میرے محکمے میں پندرہ کے قریب سکریٹری صاحبان ہوں گے۔ گھٹا کے سات کر دیجئے"

"سات آدمیوں کی بچت سے بھلا کیا ہوگا!" چیف منسٹر صاحب اداس ہو کر بولے" اور نیچے جائیے!" چیف منسٹر صاحب نے مشورہ دیا۔

آپادھیائے جی سکریٹری کی سطح سے نیچے اتر کر سوچنے لگے۔ بولے" تو محکمہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ آدھے کر دیجئے ساٹھ کے تیس رکھئے"

"تیس کی بچت سے بھی کیا ہوگا۔ اور نیچے جائیے اور نیچے......" آپادھیائے جی اور نیچے گئے۔ کلرکوں تک پہونچے تو چیف منسٹر کا دل ذرا خوش ہوا۔ اور جب چپراسیوں پر پہنچے تو چیف منسٹر کی باچھیں کھل گیئں۔ انہوں نے فوراً آپادھیائے جی کو گلے لگا لیا۔ بولے۔

" اب آپ کچھ کچھ وزیر ہوتے جا رہے ہیں۔ دراصل ہم لوگوں ــــــــ ہم وزیر لوگوں کو بہت نیچے اتر کر عوام کی سطح پر سوچنا چاہیئے۔ آپ ایک کام کیجئے۔ میرے خیال میں آپ کا ایک دورہ بھی ہو جائے"

"دورہ؟" مجھے تو دل کا دورہ نہیں پڑتا میں تو بالکل ٹھیک ہوں!"

"میرا مطلب علاقے کے دورے سے ہے۔ آپ تین تال کا ایک چکر لگا لیجئے۔ تین تال پُر فضا پہاڑی مقام ہے اور آپ نے اب تک اپنے علاقے کا ایک دورہ تک نہیں کیا۔ اس سے دوسرے وزیروں کو آپ سے شکایت پیدا ہو چلی ہے۔ لہٰذا آپ تین تال کا دورہ کر آیئے۔ اور وہاں بیٹھ کر قومی بچت کے سلسلے میں اپنی تجاویز ٹھیک طرح سے سوچ لیجئے اور اگر ہو سکے تو وہاں مقامی اداروں کو دیکھ کر ان میں بھی بچت کر دیجئے میں آپ کو پورا پورا اختیار دیتا ہوں اس سلسلے میں"۔ باتیں کرتے کرتے سہ پہر سے شام ہو گئی جب آپادھیائے جی چیف منسٹر کی کوٹھی سے نکلے تو انہوں نے تین تال جانے کا اور وہاں جا کر قومی بچت کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ بے حد مسرور ہو کر، چیف منسٹر کے بنگلے سے باہر نکلے۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ مغربی آسمان میں شفق کا رنگ شربت عناب کی طرح تھا۔ اور کہیں کہیں آسمان پر تارے تخم خربزہ کی طرح نکلے ہوئے تھے۔

محکمہ جنگلات کے کنزرویٹر ٹھاکر منوہت سنگھ بڑے عمدہ شکاری تھے۔ پُرانے تجربہ کار حکمران تھے ـــــ انگریزوں کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے شری آپادھیائے جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تین تال کے بوٹ کلب میں انھیں شاندار دعوت دی اور ان کا مقابلہ ہندوستان کے پُرانے ویدوں چرک اور دھنونت سے کیا۔

ہاراٹی آف باندی پور نے ان کے اعزاز میں ایک محفل رقص منعقد کی اور مہاراجہ گوال پور انھیں بلیک بک پر مچھلی شکار کرانے لے گئے۔ جب یہ راونڈ پورا ہو چکا اور شری اُپادھیائے جی تین تال کے جنگلات دیکھنے چاہے تو ٹھاکر منونت سنگھ نے راجہ آن بانشی پور سے کہہ کر ایک ہاتھی کا بندوبست کیا اور ٹھاکر منونت سنگھ شری اُپادھیائے ایک ہفتے تک تین تال کی ترائی کے جنگلوں میں لئے پھرے۔

ٹھاکر منونت سنگھ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ انگریزوں کے وقت میں چیف کنزرویٹر کو جنگل کی سواری کیلئے ایک ہاتھی ملتا تھا لیکن قومی حکومت کے آنے سے ہاتھی بچت میں آگیا۔ اس کا بھی منونت سنگھ کو بہت غم تھا۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ دو چار بار انہوں نے کوشش کی ایک مرتبہ خود چیف منسٹر سے کہا۔ لیکن ہاتھی برابر تخفیف میں رہا۔

شری اُپادھیائے جی کو البتہ شکار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے جنگل میں گھومتے گھومتے جب ٹھاکر، منونت سنگھ "ہائے وہ چیتا نکل گیا"۔

کہہ کر ہاتھ ملتے تو شری اُپادھیائے جی زور سے چلّا پڑتے۔ "ارے وہ جھاڑی آپ نے دیکھی"؟

"کون سی؟" ٹھاکر منونت سنگھ اپنی بے دلی پر قابو پاتے ہوئے پوچھتے۔

"وہ جس پر چھوٹے چھوٹے سنہرے رنگ کے پھول لگے ہیں"۔

اس کے بعد شری اُپادھیائے جی ہاتھی رکوا کر نیچے اُترتے اور جنگل سے بوٹی توڑ کر ٹھاکر منونت سنگھ کو دکھاتے اور کہتے۔

"دیکھئے عام لوگ اسے 'کٹ پکڑی' کہتے ہیں۔ مگر پراکرت میں اسے پڑی کٹ کہتے ہیں۔ سنسکرت میں یہ ریڑکرک ہے۔ یونانی میں۔ یہ ہازکلیڈ ہے!

"عجیب جھمیلا ہے" ٹھاکر حیرت سے بولے "کیونکہ میرے خیال میں تو یہ آملے کا پیڑ ہے"۔

"جی ہاں! وہی تو ہے مگر بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کے فائدے۔ اس کے بعد شری اُپادھیائے جی نے پھر ہاتھی پر چڑھ کر جو آملے کے فائدے گنانے شروع کئے تو جی' جی کہہ کر ٹھاکر منونت سنگھ پر کچھ غنودگی طاری ہونے لگی اتنے میں ٹھاکر صاحب نے جھاڑی کے نیچے ایک ریچھ دیکھا۔ اور مارے خوشی کے پھر اپنی رائفل سیدھی کی لیکایک۔۔۔

اُپادھیائے جی نے زور سے چلّا کے کہا۔ ہاتھی روکئے' ہاتھی روکئے!"۔

ٹھاکر منونت سنگھ نے دانت پیس کر اپنی رائفل نیچی کرلی اور بولے "نیچے تو ریچھ ہے"۔ اُپادھیائے جی ہنس کر بولے "نہیں ٹھاکر جی نیچے ایک بوٹی ہے۔ نہایت نایاب بوٹی مجھے نظر آگئی ہے۔ دیکھئے وہ ہاتھی روکئے، نیچے اُتر کر آپ کو دکھاتا ہوں"۔

جب تک ریچھ بھاگ گیا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے دل ہی دل میں تو جانے کیا کچھ کہا ہوگا۔ مگر بظاہر بڑے تحمل سے ہاتھی رکوایا۔ اُپادھیائے جی نیچے اترے اور ایک سوکھی سڑی جھاڑی کے پاس جاکر رک گئے اور بولے "دیکھئے یہ وہ نایاب بوٹی! یہ سنگھارلو بوٹی ہے جسے پراکرت میں لکھارل کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ڈک مارل یونانی میں چکن فلوطہ لاجواب بوٹی ہے۔ اس کی جڑ کو اگر تین سال آملے کے رس میں بھگو کر تپ دق کے مریض کو کھلایا جائے، تو وہ دو دن میں اچھا ہو جائے"۔

ٹھاکر منونت سنگھ کے دل میں خیال آیا کہ تین سال تک یعنی جب تک یہ بوٹی آملے کے رس میں بھیگتی رہے گی اس وقت تک تپ دق کا مریض کیا کرے گا؟ مگر وزیروں سے اس طرح کے سوال کرنا قومی تہذیب کے خلاف ہے۔ بلکہ سوال نہ کرنا ایک طرح کی قوم پرستی ہی ہے"۔

سات دن کے دورے کے بعد شری اُپادھیائے جی ترائی کے جنگلوں سے واپس آکر پھر تین تال میں ٹک گئے۔ ان کی صحت بہتر ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہلدی، زیرہ، آملہ، بنفشہ اور اسی قسم کی سو ڈیڑھ سو نایاب بوٹیاں اکٹھی کرلی تھیں۔ ٹھاکر منونت سنگھ کا ٹرپ بھی بُرا نہ رہا۔ وزیر صحت کی مداخلت بیجا کے باوجود، انہوں نے دو چلتے شکار کرلئے تھے۔

شری اُپادھیائے جی ٹھاکر منونت سنگھ کے کام سے بے حد خوش ہوکر بولے "ٹھاکر جی آپ کو یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟"

ٹھاکر جی بولے "حضور سب ٹھیک ہے، سب اچھا ہے، سب بہت ہی اچھا چل رہا ہے۔ بس ایک تکلیف ہے اور وہ یہ کہ ترائی کے جنگل تو خود آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ ان جنگلوں میں جب گھوڑے پر سوار ہوکر دورے کو جاتا ہوں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔"

"مگر مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی!" اُپادھیائے جی حیرت سے بولے۔

"آپ تو ہاتھی پر تھے نا!" منونت سنگھ نے سمجھایا۔

"تو آپ بھی ہاتھی پر جائیے! کس نے آپ کو منع کیا ہے؟" اُپادھیائے جی فوراً بولے۔

"کبھی کبھار اپنے رسوخ سے کسی راجہ مہاراجہ کا ہاتھی مانگ لیتا ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں وہ لوگ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ کبھی دیتے ہیں۔ کبھی نہیں دیتے۔ ہاتھی تو دراصل سرکاری ہونا چاہئے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔" اُپادھیائے جی سر ہلاکر بولے "اتنے گھنے جنگلوں میں ہاتھی کے بغیر جانا سرکاری ملازم کو موت کے منھ میں دھکیلنا ہے۔!"

"بے شک، بے شک" ٹھاکر منونت سنگھ بے حد سنجیدہ ہوکر بولے۔

"ہاتھی کتنے کا آئے گا؟" آخر اُپادھیائے جی نے سوچ سوچ کے پوچھا۔ ٹھاکر منونت سنگھ بولے "اچھا ہاتھی دس ہزار میں آئے گا۔ مگر ان دنوں، اتفاق سے راجہ آف بانسی پور کا ایک ہاتھی پانچ ہزار میں مل رہا ہے۔!"

"آپ لے لیجئے میں منظوری دیتا ہوں"

ٹھاکر جی نے کاغذات تو پہلے ہی سے تیار کرکے جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ فوراً آگے بڑھا دئے۔ خود اپنا قلم پیش کیا اور ایک لمحہ میں پانچ ہزار کا ہاتھی منظور ہوگیا۔

پھر ایسی عورتوں، ٹی پارٹیوں کا سلسلہ چل نکلا اور کچھ اس طرح کی مصروفیت رہی کہ اگلے دس روز تک اُپادھیائے جی کو یاد ہی نہ رہا کہ وہ یہاں کس سلسلے میں آئے تھے۔ سوچتے ہی ان کے ماتھے پر پسینے کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔ کیونکہ آدمی سیدھے تھے۔ اور نیک دل تھے۔ اور نہیں جانتے تھے کہ سرکاری کام کیسا مشکل کام ہوتا ہے۔ ناچار انہوں نے ٹیلی فون پر ٹھاکر صاحب کو بلایا۔ اور ان سے کہا کہ وہ اپنے مقامی محکمے کے ملازموں کی تفصیل لے کر آئیں۔ تو یہ بحث کی جائے گی۔

رات کو ٹھاکر صاحب اپنے محکمے کی تفصیل لے کر پہنچ گئے۔ شری اُپادھیائے جی نے تفصیل دیکھ کر کہا "آپ مجھے زبانی سمجھا دیجئے۔"

"دیکھئے ایک تو میں ہوں" ٹھاکر منونت سنگھ بولے "آپ مجھے نکال سکتے ہیں؟"

اُپادھیائے جی مسکراکر بولے۔ چلئے چلئے ایک آدمی کو نکال کر کیا ہوگا؟"

"میرے دو ڈپٹی کنسرویٹر ہیں۔ جو چھ جنگلوں کو سنبھالتے ہیں۔" "باپ رے۔ پھر تو ان کے پاس بہت کام ہوگا۔ آگے چلئے۔ میرا مطلب ہے۔ نیچے چلئے۔"

"نیچے چار اسسٹنٹ ڈپٹی کنسرویٹر"

"اور نیچے؟"

"بارہ رینج آفیسر"

"اور نیچے"

"اٹھائیس فارسٹ آفیسر"

"اور نیچے"

"ساٹھ فارسٹ گارڈ"

"اور نیچے"

"سات ریکارڈ کلرک"

"اور نیچے"

"بلی کا دودھ۔ نو روپے۔"

اُپادھیائے جی یکایک رُکے۔ بولے۔ "ہائیں! یہ بلی کا دودھ کس لئے؟" ٹھاکر منونت سنگھ نے بڑی سنجیدگی سے تشریح کی۔ "دیکھئے حضور!

ہمارے ریکارڈ آفس میں چوہے بہت ہیں۔ جو قریب کے جنگل سے آتے جاتے ہیں۔ اور ریکارڈ تلف کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے سرکاری طور پر ہم نے ایک بلی پال رکھی ہے جو ان چوہوں سے ہمارے ریکارڈ کو بچاتی رہتی ہے۔ اس کے دودھ پر نو روپیہ ماہانہ خرچ ہوتے ہیں اور بس!"

اُپادھیائے جی نے ایک دم غصّے سے بھڑک کر کہا" مگر جب سات ریکارڈ کلرک ہی ریکارڈ کو محفوظ کرنے کے لئے مامور ہیں۔ تو پھر اس بلی کی کیا ضرورت ہے؟ نو روپے!۔ نو روپے!!...... حیرت ہے ٹھاکر صاحب! آپ، اتنے جہاندیدہ اور تجربہ کار آفیسر ہوکر یہ نہیں دیکھ سکتے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے قوم کی گاڑھی کمائی کا قیمتی سرمایہ ایک جنگلی بلی کو دودھ پلانے میں صرف ہو رہا ہے۔!"

ٹھاکر صاحب نے شرم سے سر جھکا لیا۔

اُپادھیائے جی فیصلہ کن لہجے میں بولے۔" میں حکم دیتا ہوں کہ اس بلی کو آج ہی سے ڈسمس کر دیا جائے۔"

"بہت بہتر" ٹھاکر منونت سنگھ فائل بند کرتے ہوئے بولے۔ یکایک دروازے کے قریب سے ایک باریک سی آواز آئی اور اُپادھیائے جی اپنی کرسی سے اُچھل پڑے۔

"میاؤں"

دروازے پر ایک بلی کھڑی تھی اور حیرت سے وزیر کو دیکھ رہی تھی۔ ★

مضامین صاف، خوشخط اور صفحہ کی ایک جانب لکھے ہوئے موصول ہونے چاہئیں۔ "ادارہ"

پہاڑی بچے ایک تابناک مستقبل کے منتظر ہیں!

"جہاں دُنیا چھوٹے ٹکڑوں اور محدود گھریلو چار دیواریوں میں بٹی ہوئی نہ ہو۔ میرے خدا آزادی کی ایسی جنت میں میرے مُلک کو بیدار کرنا" یہ تھا آزاد ہندوستان کا اعلیٰ و ارفع خاکہ جو ایک شاعر کے تخیّل میں اُبھرا تھا لیکن ایک طویل عرصہ تک ہندوستان میں گھریلو چار دیواریوں نے آدمی کو آدمی سے جُدا رکھا۔ اس لئے صبحِ آزادی کے طلوع کے بعد کمزور طبقات اور قبائیلی باشندوں کے ساتھ نئے انداز سے پیش آنے پر زور دیا جانے لگا۔

گذشتہ ۲۰ برس کے عرصہ میں پہاڑی بچوں یعنی قبائیلیوں کی فلاح و بہبود پر پانچ سالہ منصوبوں میں غیر منقسم توجہ دی گئی ہے۔ پہلے پانچ سالہ منصوبے میں ۱۸۸۰۷ لاکھ روپے کے اخراجات کی گنجائش فراہم کر کے آندھرا پردیش میں قبائلی علاقوں اور قبائلی باشندوں کی فلاح و بہبود کا کام باقاعدہ طور پر شروع کیا گیا۔ دوسرا منصوبہ اِس سلسلہ میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس منصوبہ کی مدّت میں قبائلی بہبود سے متعلق گوناگوں سرگرمیوں پر مشتمل اتنور، اراکو، نرسم پیٹ اور پاڈیرو میں چار کثیر المقصدی پراجکٹس قائم کیے گئے۔

تیسرے منصوبے کے دَوران میں ۲۴ قبائلی ترقیاتی بلاکس کے قیام کی بدولت قبائلی بہبود کے پروگراموں کو مزید بڑھاوا مِلا۔ چوتھے منصوبے میں اخراجات کی سطح ۷۳۴.۰۴ لاکھ روپے تک بڑھا دینے سے ترقی کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی گئی اور اب پانچویں منصوبے کے پیشِ نظر رفتارِ ترقی کو تیز تر کر دینا ہے۔

گریجن کوآپریٹیو کارپوریشن جو اپنی قِسم کا پہلا ادارہ ہے، ان تمام برسوں کے دَوران قبائلیوں کو قرض اور مارکٹنگ کی سہولتیں فراہم کرنے میں نمایاں اور فائدہ مند کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اس کارپوریشن کی سرگرمیاں (۱۷) اضلاع پر محیط ہیں اور یہ اس سے ملحقہ (۲۸) ابتدائی انجمنوں اور ۴۰۲ گھریلو ضروریات کے ڈپوز کے ایک جال کے توسط سے اپنے کاروبار انجام دیتا ہے۔

منتخبہ قبائلی علاقوں کی تیز رفتار ترقی کے لئے ۱۵۰ لاکھ روپیوں کے مصارف سے زراعت پر مبنی ایک ہمہ مقصدی پراجکٹ بنایا گیا ہے جو گریجن ڈیولپمنٹ ایجنسی کے نام سے معروف ہے۔ اس پراجکٹ میں مرکزی حکومت کا سرمایہ لگا ہے اور یہ ضلع سریکاکلم کے تعلقہ جات پالاکنڈہ، پاروتی پورم، سالور، ٹیکالی، سوم پیٹ اور پاتھاپٹنم کے شیڈولڈ اور نان شیڈولڈ، دونوں علاقوں پر محیط ہے۔ اس پائلٹ پراجکٹ کی عمل آوری کے لئے تخمیناً ۱۱۷۰ مربع میل علاقہ جس میں ۴۲۳۰۰ قبائلی گھرانے ہیں منتخب کیا گیا ہے۔

پہاڑی بچے، قبائلی، ایک ایسے تابناک مستقبل کی چمک دیکھ رہے ہیں، جو ان کی توقعات اور اُمیدوں کے عین مطابق ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

DIPR.27/76-77.

کرشن چندر

غسلیات

بہت سے بچوں کا نفسی تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانے بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانے کی یادگار ہے۔ جب کہ اس کرۂ ارض پر صرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک، گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہوئے اور تخلیقِ حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف انواع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے، چنانچہ آج بھی بیسویں صدی کا بچہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلا اُٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈا ہونے کی شکایت نہیں کرتا بلکہ اُس آبی زمانے کی وحشی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ جس کے نام سے ڈارون کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے۔

اس زمانے میں بہت سی پرانی وحشیانہ رسمیں متروک ہو چکیں، مگر نہانے کے متعلق ابھی کچھ عرصہ اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، میرے بہت سے احباب جو اس قابلِ نفرین رسم کے خلاف جہاد کرتے کرتے تنگ آ چکے ہیں اور کچھ بہت پُر امید نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے۔ انسان بدستور ان میں نہاتے اور گھڑیال، مگرمچھ اور خوفناک بھنوروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر کرنا نہیں چاہتا جو غسلخانوں میں نہاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں جہاں متوسط طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں ہیں۔ ہر دہ ہزار افراد کیلئے صرف ایک غسلخانہ دستیاب ہو سکتا ہے اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا یہ فرق بہت بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ محکمہ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیارپور میں ایک بھی غسل خانہ نہیں۔

لیکن میں اپنے احباب کے نکتۂ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا، میں مستقبل کے متعلق اس قدر ناامید نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض ایک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفہ پر مبنی ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پڑے ہوئے دلوں نے آج تک کچھ نہیں کیا اور میرے پاس تو پُر امید ہونے کے لئے بہت سی وجہیں ہیں۔ انھیں بہ تفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاسی خلفشار کے زمانے میں لوگوں کو غسل سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی، نہانا ایک انفرادی فعل ہے اور فسطائیت یا اشتراکیت ہر دو مقبولِ عوام فلسفے انفرادیت کو مٹا دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں "تہذیب" بڑھتی چلی جا رہی ہے، انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ اور نہانا تو محض اب نچلے درجوں کی پسماندہ جماعتوں کے لئے رہ گیا ہے ورنہ شائستہ و مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کنوئیں پر نہاتے نہاتے ایک پوربئے کا دوسرے پوربئے سے کہنا۔ " ارے یار، تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی"! ذرا خیال کیجئے۔ کتنا یتیم، غریب [illegible] سے قطعاً عاری، میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی مجھے بتا دے

کہ وہ دن کے کتنے بجے نہاتا ہے تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لئے ابھی اسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۲) مثال کے طور پر

صبح چار بجے کون نہاتا ہے؟ ——— پوربیا' بنیا' میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر!

صبح چھ بجے ——— ڈاکیہ' دفتر کا بابو' پولیس کا سپاہی۔

آٹھ بجے ——— پروفیسر' کالج کا لڑکا۔

دس بجے ——— صاحب بہادر' لیڈر۔

بارہ بجے ——— منسٹر' مجسٹریٹ' رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے' آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے۔ اگر آپ پہلے غسل کرنے وقت آدھ پون' گھنٹہ صرف کرتے تھے' تو اب صرف دو منٹ پر آجائیں گے اگر پہلے سارے جسم کو پانی میں بار بار ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ' ہاتھ اور پاؤں کو تر کرکے "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اور میں تو اس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے۔ اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ لو بھئی آج ہم "نہائے" اور یقیناً جس طرح ایک روز ہندوستان کو سوراج حاصل ہوگا۔ اسی طرح وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے۔ جب کہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً مٹ جائے گی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو' سنیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منہ دیکھ لیتے ہیں۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے ہفتہ کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور نہایت غرور سے کہا کریں گے۔ "آج ہم نے تو غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو' آج کل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتہ میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے۔ مگر ہمارے داداجان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک دن زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھرجھری لے کر) واہ' واہ اس نہانے میں کیا مزہ ہوگا!

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں۔ بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے۔ کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا۔ میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ راوی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے تو سائنٹفک نکتۂ نگاہ سے اسے غلط سمجھنا چاہیے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑ تا ہے۔ باقی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" ہو چکے ہوتے۔ اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید۔ مگر اس کے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے۔ وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ ان کے جسم ایسا تو کمزور تھے۔ کہ وہ اکثر ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انھیں اٹھا کر لے جا

وہ ہر صبح اُٹھ کر اپنے پھونس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاریگری پر حیران ہوتے۔ جس نے اُن کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی پکڑے ہوئے نبض ٹٹولتا رہتا۔ کوئی اپنے پتلے، کاغذی جسم پر بار بار ہاتھ پھیرتا اور سوچتا یا الٰہی اس جسدِ خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے؟

ان کی سات بیویاں تھیں، موٹی۔ بانجھ اور بدصورت بیویاں، وہ سب کی سب اس قدر کریہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچ کر دل دل میں کڑھتا رہتا "ہو نہ ہو میرے اس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے، اگر وہ مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا!"

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ چونکہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں۔ اور، بیویوں کو اس خیال سے نہانے نہیں دیتے تھے کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال اکھایا کہ اُسے ضرور نہانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے۔ دریا پہ گئی اور نہا کر لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اُس کے لمبے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے، اُس کے چہرے پر ایک عجیب چمک تھی، اور اُس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

جب بھائیوں نے اُسے دیکھا تو بے تاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے یہ میری بیوی ہے، نہیں یہ میری بیوی بنے گی۔ اسے میں لونگا، اسے میں لونگا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپا تک پہنچی طمانچوں کا لگنا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جان بحق ہو گئے اور بیویاں بیوائیں بن گئیں، اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھونس کا بڑا سا جھونپڑا پڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ، ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں "اسے میں نہ دوں گا اسے میں نہ دوں گا یہ میری ہے، یہ میری ہے"؟ نتیجہ: نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کریں گے، تو یہ سولہ آنہ درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے، اسے ملیامیٹ کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس کے خلاف پُر زور پروپیگنڈہ کیا جانا چاہیئے۔ مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں۔ آخر آپ کا "پروگرام" کیا ہے بغیر پروگرام کے آج کل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔ لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجئے۔

(۱) جو امیر شخص نہائے اُسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

(۲) دفعہ ۱۴۴ الف میں یہ الفاظ ایزاد کئے جائیں۔

"ہرگاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ .... جو غریب بلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا اُسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا ___________

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا، کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔" بابوجی، غسلخانے میں پانی دیر سے دھرا ہے، آپ جلدی نہالیں، ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا"۔ میں قلم چھوڑ میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسلخانے کی طرف بھاگ گیا۔ ؎

نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو

[illegible]

غزلیں

ظفر چکدینوی

پانی میں دودھ، دودھ میں پانی ملائیے
پبلک کو جیسے چاہیے اُلّو بنائیے

ووٹرس کو دکھائیے وعدوں کے سبز باغ
اور جیت جانے پر انھیں ٹھینگا دکھائیے

مطلب نہ ہو تو باپ کو گردانیے گدھا
مطلب اگر ہو، باپ گدھے کو بنائیے

اب ٹیڑھی اُنگلیوں سے نکلتا نہیں ہے گھی
ہاں گھی نکالنا ہو تو مکھن لگائیے

چمچوں کے دم قدم سے کٹوروں کی شان ہے
منہ تکتے ہیں کٹورے کہ چمچے منگائیے

حاجت روائی کے لئے ہر در پہ ہم گئے
ہر ایک گھر سے آئی صدا "آگے جائیے"

ہے اُلّوؤں کا سارے گلستاں پہ اقتدار
بلبل اگر ہیں آپ، کہیں اور جائیے

اب رہنما بنایا ہے اوروں کو وقت نے
رہبر کبھی تھے آپ اسے بھول جائیے

پھر آگئی ہے باڑھ مقدر سے آپ کے
کچھ بانٹیے ریلیف تو کچھ آپ کھائیے

پھولوں کے ہار کو تو لگاتے ہیں سب گلے
کانٹوں کو بھی کبھی تو گلے سے لگائیے

جھگڑا یہ ہے کہ کھانا پکایا کرے گا کون
شوہر مڈل ہی پاس ہے، بیوی ہے آئی اے

دونوں ہی رسیاں ماننا کی ہو گئی ہیں ٹیک
مت اور لوڈ کیجئے، گاڑی بڑھائیے

کر لو مشاعروں ہی سے توبہ ظفر کہ لوگ
مطلع ہی سن کے کہتے ہیں مقطع سنائیے

○

رشید عبدالسمیع جلیل

جب شعر کہے ہم نے جا جا کے سنا آئے
انمول جواہر تھے، افسوس لٹا آئے

کیا داد کی قیمت ہے کیا سودِ ہنر اے دل
بہروں کی تھی محفل، ہم وقت گنوا آئے

الفاظ کے صحرا میں معنی تھے سراب آسا
آواز کے پیاسوں کو آواز پلا آئے

نغمات کا شیرازہ ظلمت میں بکھر جاتا
اک شمع سرِ محفل ہم تھے کہ جلا آئے

تیزاب تھا لہجوں کا احباب کی باتوں میں
پینے کا سلیقہ تھا، ہم پی کے دکھا آئے

میزانِ ادب کس کے ہاتھوں میں جلیل آئی
افکار سے بے بہرہ الفاظ تلا آئے

OOO

رشید الدین

کہتے ہیں جسے موڈ...

غالب نے عشق کو خلل دماغ کہا تھا لیکن خللِ دماغ کا ایک اور مہذب نام ہے اور وہ ہے موڈ. سرسید نے ضمیر کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ یہ انسان کی ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے. لیکن ضمیر سے زیادہ یہ تعریف موڈ پر صادق آتی ہے جناب! یہ انسان کا موڈ بھی عجیب ہوتا ہے. جب اس پر موڈ سوار ہوجاتا ہے تو وہ اتنا ہی بے قابو ہوجاتا ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے ؎

نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں

جب انسان پر موڈ کا دورہ پڑتا ہے تو اکیلے ہی میں چلانا شروع کردیتا ہے جسے عرف عام میں گانا کہا جاتا ہے یا پلنگ پر سے اُٹھ کر خواہ مخواہ ہی سر کے بل کھڑا ہوجاتا ہے جسے یوگ آسن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے.

مومن نے ایک بار کہا تھا ؎

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

اب تک اسے محض ایک شاعرانہ خیال سمجھا گیا تھا لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں یہ ثابت ہوگیا ہے کہ انسان نہ صرف کوچۂ رقیب بلکہ کوچۂ دودھ فروش اور کوچۂ ترکاری فروش میں بھی سر کے بل جاسکتا ہے بشرطیکہ اس پر موڈ کا دورہ ہو.

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اکیلے ہی اکیلے سڑک پر زور زور سے ہنسنا شروع کردیتا ہے یا پھر جب وہ بہت زیادہ خوشی میں یعنی "فل موڈ" میں ہوتا ہے تو دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوکر گانا شروع کردیتا ہے. اب یہ گانا سننے کو کمہار کے گدھے اس کے گرد جمع ہوجائیں یا گلبدن حسینائیں یا پولس کانسٹیبل یہ الگ بحث ہے اور کسی بھی شریف آدمی کو اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیئے. بہرحال وہ گانے لگتا ہے اور اپنے پھیپھڑوں کی قوت سے گاتا ہے،

بمبئی سے آیا میرا دوست، دوست کو سلام کرو
رات کو کھاؤ پیو دن کو آرام کرو!

ایسے لوگوں کو عام طور پر موڈی یا لہریے کہا جاتا ہے.

آپ پوچھیں گے آخر یہ موڈ ہے کیا بلا؟ تو صاحب اس کا جواب تو آپ کو کوئی فلسفی یا نفسیات داں ہی دے سکے

۔ (واضح رہے کہ فلسفی اور نفسیات داں سب سے زیادہ موڈی ہوتے ہیں، [illegible]

لفظ ہے جو ہندوستان کی ہر زبان میں ایسا ہی بے تکلف چلا آیا ہے جیسے انسان کی زندگی میں موڈ آتا ہے۔

اس پر بھی آپ کو کچھ سمجھ میں نہ آئے تو ہم یہاں زیادہ سے زیادہ ایک مثال دے سکتے ہیں۔ ایک طالب علم جب خاصی آرام دہ جماعت میں سے میر کے حسین اشعار سنتے سنتے کالج کی تنگ اور اندھیری کینٹین میں جا بیٹھتا ہے اور چائے کے کسیلے گھونٹ لیتے لیتے دور خلا میں گھورنا شروع کر دیتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ بے چارہ موڈ کا مارا ہے۔

جس طرح انسانوں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں اسی طرح موڈ کی بھی بہت سی قسمیں ہیں لیکن ان میں دو بہت عام ہیں۔ ایک اچھا موڈ دوسرا بُرا موڈ۔ اچھا موڈ اسے کہتے ہیں جب انسان غیر معمولی طور پر خوش ہو۔ عام طور پر اسے صرف موڈ بھی کہا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی صاحب بہت زیادہ خوش ہوں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ "آج تو بہت موڈ میں ہو" بُرا موڈ وہ ہوتا ہے جس میں انسان چڑچڑا کرنے لگے۔ اور بات بے بات اس کا پارہ چڑھنے لگے۔ ایسی صورت میں ہم کہتے ہیں کہ "آج ان کا موڈ خراب ہے"۔

عام طور پر معمولی آدمی کے موڈ خراب ہونے سے اس کا کسی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی وجہ سے یہ مثل مشہور ہو گئی کہ حقیر کا غصہ فقیر کی جھولی میں۔ لیکن بڑے آدمیوں کے تعلق سے یہ بات نہیں ہے بلکہ ان کی تیوری پر ایک بل بھی بعض اوقات سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے کا باعث بن گیا۔ اسی ایک بل کی وجہ سے بعض لوگوں کو اپنی جان سے تک ہاتھ دھونا پڑا۔ جب مغل بادشاہ فرخ سیر کی پیشانی پر بل پڑا تو اس نے اُردو کے مشہور مزاحیہ شاعر جعفر زٹلی کو قتل کرا دیا۔ اورنگ زیب نے اپنی بیٹی زیب النساء کے عاشق کو پانی گرم کرنے کی ایک دیگ میں زندہ جلا دیا۔ اور شیر شاہ کے تیور جب بدلے تو ہمایوں کو برسوں صحرا کی خاک چھاننی پڑی۔ غرض یہ فہرست بہت طویل ہے۔

لیکن بعض زندہ دل اس دنیا میں ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے نہ صرف بادشاہوں کی تیوریوں کے بل دور کیے اور اپنی موت کی سزائیں منسوخ کرائیں بلکہ الٹا انعام بھی پایا۔ ایک بار جہانگیر کسی بھانڈ کی یاوہ گوئی پر آپے سے باہر ہو گیا اور اسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندنے کا حکم دے دیا۔ بھانڈ کے سامنے جب موت اور وہ بھی ایسی دردناک موت ناچنے لگی تو وہ فوراً بکواس چھوڑ کر آپے میں آ گیا اور دست بستہ عرض کیا:

"سرکار مجھ جیسے غریب آدمی کے لئے آپ نے
ناحق ہاتھی جیسے بڑے اور شاہی جانور کا انتخاب
کیا۔ میرے لئے تو کسی چوہے یا مینڈک کا پیر ہی
کافی تھا"۔

جہانگیر اس آرٹسٹک جواب پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور نہ صرف اس کی سزائے موت معاف کر دی بلکہ اسے انعام سے بھی نوازا۔

اسی بھانڈ کا ہم عصر خوش قسمت ایک اور غریب آدمی تھا۔ جب دلی کی ایک سڑک سے مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی سواری گزر رہی تھی تو اس نے اسے ڈھیلا مار دیا۔ سپاہی اس کی جانب دوڑے تو خانخاناں نے سب کو روک دیا اور اس غریب آدمی کی جانب ایک اشرفی اچھال دی جسے لے کر وہ خوشی خوشی بھاگ کھڑا ہوا۔ پیشی میں موجود اس کے ایک مصاحب نے کہا کہ "حضور اس شخص نے تو آپ کو ڈھیلا مارا اور آپ نے اسے اشرفی مرحمت فرما دی۔" خانخاناں نے جواب دیا کہ "بھائی جس کے پاس جو ہوتا ہے وہ دیتا ہے"۔

عام طور پر جو ہمیشہ ہی موڈ میں رہتے ہیں۔ یعنی جن کا موڈ سدا اچھا ہوتا ہے ان میں بیمہ ایجنٹ، حجام، فقیر، اُدھار لینے والے، ڈاکٹر، ماتحتین اور شوہر وغیرہ شامل ہیں جن لوگوں کا موڈ اکثر خراب رہتا ہے ان میں فلسفی، سیاست داں،

دار، قرض وصول کرنے والے، وکیل، شاعر، بیویاں اور حسین لڑکیاں وغیرہ شامل ہیں۔ ان دونوں کے بین بین پروفیسر اور طالب علم حضرات وغیرہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی کسی کے موڈ کی ہمیشہ اچھے رہنے کی گیارنٹی نہیں دی جا سکتی
بس میں ایک پادری ایک شخص پر برس پڑا۔ سب لوگوں کو بے حد تعجب ہوا۔ ایک شخص نے پوچھا خیر تو ہے پادری صاحب؟
"خیر کہاں اس نے میرے پاؤں پر اپنا جوتا رکھ دیا ہے۔" پادری بولا۔ جہاں تک حسین لڑکیوں کے موڈ کا معاملہ
شاعروں نے اسے نزاکت کا نازک نام دیا ہے۔ ؎

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

ایک لڑکی ایک سیلز مین پر برس رہی تھی "تم نے میرے ساتھ مذاق کرنے کی جرات کیسے کی"؟ سیلز مین نے جواب دیا۔
"مس، جی بھلا میں آپ کے ساتھ کیوں مذاق کرنے چلا کیا میرے گھر میں اس کام کے لیئے میری بیوی موجود نہیں ہے"؟
لیکن بعض اوقات بیویوں سے بھی مذاق مہنگا پڑتا ہے۔ ایک شوہر نے اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیئے یہ کہا:
"ڈارلنگ! آج تو تم بالکل ہیما مالنی لگ رہی ہو۔ بیوی نے سن کر تیوری چڑھائی سینہ پر دوہتڑ مارے اور
"کیا کہا ــ؟ ذرا پھر سے کہو۔ تم نے مجھے بازاری عورت سمجھ لیا کیا جو اس ناچنے گانے والی سے تشبیہ دے ڈالی"۔
بے چارے شوہر کے لینے کے دینے پڑ گئے۔

عموماً ایک پروفیسر کا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب وہ اپنے پھیپھڑوں کی قوت سے چیخ چیخ کر لکچر دے اور
بلیک بورڈ پر کچھ لکھتا بھی جائے اور اس کا کوئی طالب علم پیچھے کی بنچ پر بیٹھ کر شفیق الرحمٰن کا کوئی افسانہ پڑھتا رہے۔ ایک
پادری کا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب وہ اپنے لکچر کے بعد چندہ کے لیئے اپنا ہیٹ لوگوں میں پھرائے اور جیسے
کا وہ ہیٹ بھی واپس نہ آئے۔ ایک شاعر کا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب کہ وہ مشاعرہ میں ایک طویل غزل ختم
کرنے کے بعد دوسری سنانے پر مصر ہو اور حاضرین اس کیلئے تیار نہ ہوں۔

ایک وکیل کا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب اس کا موکل اس سے یہ سوال کر بیٹھے کہ "اگر ہم اس مقدمہ میں ہار
گئے تو ــ"؟ ایک حجام کا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب اس کا کوئی گاہک بال بنانے کے دوران نہ خود بات کرے اور
نہ اسے بات کرنے کی اجازت دے۔ ایک درزی کا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب آپ کپڑے سلوانے کے لئے
دینے کے تیسرے ہی دن کپڑے لے جانے کے لیئے آموجود ہوں۔ ایک ادیب کا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے۔ جب
کوئی ایڈیٹر اس کی کوئی طویل کہانی بغیر ٹکٹ لگائے واپس بھیج دے۔ ایک ڈاکٹر کا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے
جب وہ کسی مریض کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرے اور وہ مرنے پر تل جائے۔

غرض یہ فہرست بہت طویل ہے۔ اس لیئے میں اپنے قلم کو کوتاہ کرتا ہوں اور آپ سے رخصت چاہتا
ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے یہ ضرور بتا دیجئے کہ یہ مضمون پڑھ کر آپ کا موڈ کیسا رہا۔ ایک قاری کا موڈ کب خراب
ہوتا ہے۔ وہ بھی مجھے معلوم ہے لیکن یہاں اس کا اظہار قرین مصلحت نہیں۔ ویسے ایک آخری اور راز کی بات سنتے
جائیے۔ وہ یہ کہ ایک مزاح نگار کا موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب اسے اس کے مضمون کی خاطر خواہ داد نہ ملے ٭

جوہر سیوانی

"جیتے کہ کوئی ہارے"

پُروائی الیکشن کی جب زور سے چلتی ہے
نیتا کی بھی قسمت ووٹوں سے پگھلتی ہے

یُوں حلق کے سوتوں سے تقریر اُبلتی ہے
برساتی ندی جیسے تیزی سے اُچھلتی ہے

چوراہوں پہ کھلتی ہیں وعدوں کی دُکانیں بھی
جنتا کے لئے راحت الفاظ میں ڈھلتی ہے

جو پانچ برس پہلے فہرست تھی وعدوں کی
جھولی سے مداری کی وہ پھر سے نکلتی ہے

ڈمرو کے اشارے پر کٹھ پتلی سی یہ جنتا
راحت کے تصوّر میں خوش ہو کے اُچھلتی ہے

اُمید کے دَرپن سے نیتا جی بہلتے ہیں
اور اُس کے چمکنے سے جنتا بھی بہلتی ہے

آتا ہے الیکشن تو عید آتی ہے چمچوں کی
نیتاؤں کی دیگوں میں دال اُنکی ہی گلتی ہے

حق چاہنے والوں کو پُوچھا بھی نہیں جاتا
چلتی تو الیکشن میں چمچوں ہی کی چلتی ہے

اُمید کا آئینہ نیتا لیئے پھرتے ہیں
حسرت کی حسیں دیوی رہ رہ کے مچلتی ہے

خاموش ہیں نیتا جی، سَر خم ہے ندامت سے
تردامنیٔ حضرت خود راز اُگلتی ہے

سمجھو نہ مرے یارو جنتا کو کبھی ادنیٰ
جنتا ہی کے ووٹوں سے کُرسی بھی بدلتی ہے

آواز کبھی دل کی گم ہوتی ہے لالچ میں
نیت کبھی لوگوں کی نوٹوں پہ پھسلتی ہے

ماحول بدلتا ہے شب بھر میں الیکشن کا
نیتا کی تجوری جب کچھ نوٹ اُگلتی ہے

جو جیت گیا نیتا اُس کے تو ہیں پو بارے
ہارے ہوئے نیتا کی تقدیر مچلتی ہے

مِل جاتا ہے نیتا کو اِک کار بھی بنگلہ بھی!
جنتا تو اُمیدوں کے گھوڑے ہی بدلتی ہے

دِن رات ہے ہنگامہ، جب تک کہ الیکشن ہے
یہ ایسی مصیبت ہے ٹالے نہیں ٹلتی ہے

پھر بعد الیکشن کے آتا ہے نیا منظر
جب ظلم کے پردے پہ تصویر بدلتی ہے

پھر اگلے الیکشن کا جب تک کہ نہ وقت آئے
جنتا کی لنگوٹی بھی نیتاؤں کو کھلتی ہے

کیا مجھ کو غرض اِس سے "جیتے کہ کوئی ہارے"
جوہرؔ میں بتاؤں کیا میری کوئی چلتی ہے

باقر مرزا

ایک لَو لیٹر

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی گہری سوچ میں کہیں چلے جا رہے تھے کہ یکایک ہماری نظر ایک مڑے تڑے کاغذ پر پڑی۔ اس بے خبری کے باوجود بھی کسی انجانی قوت کے زیر اثر سارے پاؤں وہیں جم گئے۔ ہم نے فوراً ہی اُس پُرزے کو اُٹھایا اور پڑھنے لگے۔ وہ ایک لولیٹر تھا۔ جسے مریخ میں رہنے والے عاشق نے چاند پر رہنے والی معشوقہ کو لکھا تھا۔ اس پر C/O یعنی آفس کاپی لکھا ہوا تھا۔ اس خط کو لے کر ہم اپنے گھر پہنچے۔ محبت کے اس عبرتناک، شرمناک، ہیبت ناک اور خطرناک قسم کے انجام کو دیکھ کر ہمارے اندر موجود محبت کا جذبہ ہماری مدافعتی قوت کو ناک آؤٹ کر کے ناک کے ذریعہ سے واک آؤٹ ہو گیا۔ ہماری آنکھ سے آنسو اور منھ سے کف بھی بہنے لگا۔ گھر والوں نے جب ہماری یہ حالت دیکھی تو انھیں یقین ہو گیا کہ بس ہماری آخری گھڑی آن پہنچی ہے اور ہم کچھ دیر کے مہمان ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ دودھ اور پانی کے گلاس لے کر ہمارے اطراف واکناف لوگ کھڑے ہو گئے اور خوشی کی اُس گھڑی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ ہم نے اُنہیں یہ کہہ کر چلتا کیا کہ مرنے ورنے کا فی الحال ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جب ارادہ ہوگا تو ضرور آپ لوگوں کو زحمت دی جائیگی۔ آپ لوگ دودھ اور پانی کے گلاس لے کر حاضر ہو جائیے۔ اپنی امیدوں پر پانی پھرتا دیکھ کر سب منھ لٹکائے کمرے سے نکل گئے۔ اسی لمحہ ہم نے تہیہ کر لیا کہ اس لیٹر کو محفوظ کر لیں۔ لیٹر کچھ اس طرح کا تھا:

مائی ڈیر عنبیلی بنت حویلی۔

" وہ دن میں آج تک نہیں بھول سکا۔ جب تم اڑن طشتری پر سوار ہو کر خلاء میں ہچکولے کھاتے پھر رہی تھیں۔ اور میں بھی اتفاق سے اپنے اُڑن کھٹولہ پر بیٹھ کر نکل کھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں کی آنکھ لڑنے سے پیشتر ہماری اڑن طشتری اور اڑن کھٹولہ لڑ پڑے تھے۔ تمہاری گھبرائے بھرتی ہوئی اڑن طشتری کا بریک ٹوٹ گیا تھا یا نہ معلوم میری دوڑتی ہوئی قسمت کو بریک لگ گیا تھا جو ہماری گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ اس ٹکر سے تمہاری اڑن طشتری کا ٹائر پنکچر ہو چکا تھا۔ میں نے تم سے معذرت چاہی جس کے جواب میں تم نے مجھے گھور کر

طرح سے یاد ہے کہ اُس وقت تم مجھے چور نگاہوں سے دیکھے جا رہی تھیں۔ تمہارا چور نگاہوں سے دیکھنا مجھے بہت بھایا تھا۔ میں نے اُسی لمحہ اپنا دل جسم سے نکال کر تمہارے پرس میں ڈال دیا تھا۔ سخت محنت کے باوجود بھی تمہاری اڑن طشتری ٹھیک نہیں ہو سکی۔ میں نے تمہیں لفٹ، کی پیش کش کی۔ تو تم نے پہلے تو کہا: "نو تھینک یو، میرے ڈیڈی نے مجھے دیکھ لیا تو میرا قیمہ بنا دیں گے!" تھوڑی سی تکرار پر تم نے لفٹ قبول کر لی تھی اور اچک کر میرے اڑن کھٹولہ پر سوار ہو گئیں۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ: کیا کوئی ضروری کام سے جانا تو نہیں ہے؟" تم نے جواب دیا تھا: "نہیں کوئی خاص کام نہیں۔ گھر میں بیٹھی بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ سوچا کہ خلاؤں میں دور بہت دور کچھ تلاش کر کے وقت گزار لوں!" پھر تم نے بھی مجھ سے وہی سوال کیا تو میں نے کہا تھا: " میں بھی یونہی ذرا ستارے گننے کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔" پھر میں نے تم سے تمہارا نام پوچھا تو تم نے اپنا نام "چنبیلی" بتلایا تھا۔ تم نے بھی مجھ سے میرا نام دریافت کیا تو میں نے کہا تھا: "مجھے 'دھتورا' کہتے ہیں!" میں نے تمہارے نام کی تعریف کی تھی۔ 'چنبیلی' کتنا خوبصورت نام ہے۔ سنتے ہی ناک میں چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو آنے لگتی ہے۔ تم نے بھی میرے نام کی تعریف کی تھی۔ 'دھتورا' واہ کتنا پیارا نام ہے۔ سنتے ہی دھتورے کی بھینی بھینی خوشبو آنے لگتی ہے۔ اس کے بعد میں تمہیں گھر سے کچھ فاصلہ پر چھوڑ آٹو رکشا میں سوار کر اکر اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے ایڈرس بھی دے دیئے تھے۔ دونوں میں خط وکتابت بھی ہوا کرتی تھی۔ دو ایک دفعہ میں نے تمہیں ٹرنک کال بھی کیا تھا۔ لیکن تم سے بات چیت نہیں ہو سکی۔ تمہارے خطوط پڑھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ تم ڈگری یافتہ تو ضرور ہو لیکن تعلیم یافتہ نہیں۔ ایک خط میں، میں نے تم سے پوچھا تھا: " ڈارلنگ! کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟" تو اس کے جواب میں تم نے مجھے لکھا تھا: "ہاں ڈارلنگ! میں اگر اپنے کتے 'ٹامی' کے بعد اگر کسی کو چاہتی ہوں تو وہ تم ہی ہو؟" تمہارے اس دوسرے ترجیحی ووٹ کو بھی میں نے غنیمت جانا تھا۔ کیا عجیب اتفاق تھا کہ میں تمہیں چاہتا تھا اور تم ٹامی کو چاہتی تھیں۔ اکثر و بیشتر شاپنگ کرنے کے لئے تم مریخ آیا جایا کرتی تھیں۔ لیکن اکیلے نہیں۔ کوئی نہ کوئی تمہارے ساتھ لگا رہتا تھا۔ اور اگر تم کبھی اکیلی جاتیں بھی تو مجھ سے نظریں بچا کر فراٹے بھرتی ہوئی میرے گھر کے آگے سے نکل جاتیں۔ ایک دفعہ تم اکیلی میرے گھر آئی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو چلا تھا۔ تم نے بھی بہت ہی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ لیکن مجھے دیکھ کر نہیں بلکہ میرے گھر میں، گوبھی، آلو، شلجم وغیرہ کے گودام کو دیکھ کر تم میری خیریت دریافت کرنے کی بجائے، آلو بیگن وغیرہ کی خیر خیریت دریافت کرتی رہیں۔ اُس وقت میں نے بہت ہی رومانٹک انداز میں تم سے کہا تھا: " میری سویٹ ہارٹ! میں بہت بکھر گیا ہوں، تم مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ لو!" تو یاد ہے تم نے کیا جواب دیا تھا۔ "میرے نام نہاد سویٹ ہارٹ! پہلے مجھے ان گوبھی کے پھولوں کو تو سمیٹ لینے دو۔ یہ بھی کافی بکھر گئے ہیں۔ اب کی چکر میں ضرور تمہیں سمیٹ کر لے جاؤں گی۔ ویسے میں آتے وقت اپنی باہوں کو بھول کر آئی ہوں۔ غالباً کھونٹی پر ٹنگے ہوئے ہونگے۔" آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ خدا نے مجھے آدمی بنا کر کیوں پیدا کیا۔ آلو، بینگن، شلجم، گوبھی کے پھول بنا کر کیوں نہ پیدا کیا کہ، درحقیقت قدر انہی چیزوں کی ہوا کرتی ہے۔ مجھ جیسے لوگوں کی نہیں؟ اس

درمیان میں مجھے اخبارات وغیرہ سے اس بات کی اطلاع ملی کہ آدمی نے چاند کی سرزمین پر قدم جمائے ہیں۔ میں نے تم سے تفصیل جاننی چاہی تو تم نے لکھا تھا "قدم جمانے کی بات تو حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ ہاں البتہ آدمی نے ہمارے ہاں کی مٹی پلید کرنے کے لئے جب ہماری سرزمین پر قدم رکھا تو ہم لوگوں نے تھوڑی بہت مٹی حوالہ کردی اور اُسے چلتا کیا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ، تم اسٹرانائس سے کافی متاثر ہوگئیں۔ اُن کا "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" والا لباس بہت بھایا تھا۔ تم اکثر ٹامی سے یہ کہتے بھی سُنی گئیں: "ٹامی اب میری زندگی میں تیرے علاوہ بھی کوئی اور آچکا ہے۔" خیر چھوڑو، ان قصوں کو۔ بہت اچھا کیا تم لوگوں نے مٹی اور کیچڑ آدمی کو دی۔ یاد رکھو انہیں منہ نہیں لگانا چاہیئے۔ وہ اُس کے اہل ہی نہیں ہیں۔ اس درمیان آدمی نے ہمارے ہاں بھی ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ (قدم رکھنے کی انہیں ابھی تک ہمّت نہیں ہوئی ہے۔) تمہارا ایک اور خط میرے نام آیا۔ جس میں تم نے مجھے لکھا تھا: "میرے زبردستی کے ڈارلنگ۔ اگر حقیقت میں تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو کوئی اچھوتا اور انوکھا کام میرے لئے کر دکھاؤ!" میں نے اس پر لکھا تھا: "اگر تم کہو تو میں آسمان سے تارے توڑ کر تمہارے قدموں پر نچھاور کر دوں۔" تو تم نے جواب دیا تھا کہ "آسمان سے تارے تو میرے نوکر کا بچّہ روز ہی توڑ توڑ کر لایا کرتا ہے۔ جسے میں اُٹھا اُٹھا کر پھینک دیا کرتی ہوں۔ اگر تمہیں کوئی کام کرنا ہی مقصود ہو تو زمین سے تاج محل، یا ایلورہ، اجنتا کے غار اُٹھا کر لے آؤ۔ یا نہیں تو مریخ پر دودھ کی ایک نہر کھود دو، اجنتا ایلورہ کے غار یا تاج محل کی اسمگلنگ کرنے کے لئے میں نے ہندوستان کے اسمگلروں سے ربط قائم کیا تو معلوم ہوا کہ وہاں پر ایمرجنسی لگی ہوئی ہے۔ اور تمام اسمگلرس جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی قسمتوں کو اسمگل ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ اب میرے لئے دودھ کی نہر کھودنے کے سوائے اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہ گیا تھا۔ لیکن دقّت یہ تھی کہ ہمارے ہاں ہتھوڑا، پھاوڑا، یا ہل وغیرہ کی فیکٹری نہیں ہے۔ چنانچہ میں ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے زمین سے رابطہ قائم کیا۔ اور تمہیں اس کی تفصیل لکھی: "میری پیاری، زمین سے رابطہ قائم کرنے کے بعد مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہتھوڑا، پھاوڑا، ہل وغیرہ وہاں پر آوٹ آف اسٹاک ہیں۔ سُنا ہے کہ ان کا استعمال مزدوروں اور کسانوں سے زیادہ اشتراکی شاعر اور ادیب کیا کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑے بہت فرق کے ساتھ مزدور اور کسان چلچلاتی دھوپ اور موسلا دھار بارش میں ان چیزوں کو استعمال کر کے مٹھی بھر پیسہ اور جھولی بھر گالیاں حاصل کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے شاعر، ساغر و مینا کو ہاتھوں ہاتھ لئے قافیہ اور ردیف کے طور پر ان کا استعمال کر کے داد و تحسین حاصل کرتے ہیں۔ اگر انہیں یہ چیزیں ... ہاتھوں میں تھما دی جائیں تو یہ ہتھوڑے سے زمین کھودنا اور پھاوڑے سے کیل ٹھوکنا شروع کر دیں گے۔ ہاں سُنا ہے کہ شاعروں کی ایک انوکھی اور اچھوتی قسم نے حال ہی میں جنم لیا ہے۔ جنہیں عرفِ عام میں جدید شاعر کہا جاتا ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ سورج کو آگ لگا سکتے ہیں۔ اگر موڈ میں آجائیں تو آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جیب میں ڈال لے سکتے ہیں۔ اور اگر زیادہ موڈ میں آجائیں تو زمین کو لات مار کر ٹکوں سے تکون بنا سکتے ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ ہمارا حلیہ بگاڑنے ہماری طرف رُخ کریں۔ .... میں چاہتا ہوں کہ ہمیں ایک ڈوری، ایک دھاگے یا ایک رسی میں فوراً ہی بندھ جانا چاہیئے۔ شادی کا نام سنتے ہی مجھے یکایک جہیز کا

خیال آگیا۔ یہ دونوں ٹھیک اسی طرح سے لازم و ملزوم ہیں جس طرح کہ بنگلہ دیش اور انقلاب تم نے اس کے جواب میں لکھا تھا: "تمہارے منھ سے جہیز کا لفظ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے تو سُن رکھا تھا کہ تم ہندوستان کی طرز پر بنائے جانے والی مخالف جہیز کمیٹی کے سکریٹری ہو"! اس کے جواب میں میں نے لکھا تھا۔ "میں تو خالص ہندوستانی روایات پر عمل کرتا ہوں۔ ہندوستان میں مخالف جہیز کمیٹی کا سکریٹری بھی۔ جہیز کے بغیر شادی نہیں کرتا —! اس پر تم بہت ناراض ہوگئیں تھیں۔ میں نے آخر میں لکھا تھا: "ڈرالنگ! ناراضگی دور ہو تو خط لکھ دینا — فقط —!

تمہارا اور صرف تمہارا دھتورا۔

شکیل اختر

الیکشن

الیکشن انگریزی زبان کا لفظ ہے اور ہماری اردو زبان میں اس کے معنی انتخاب، چناؤ وغیرہ ہوتے ہیں۔ تو اب آپ پوچھیں گے کہ یہ الیکشن کیا ہے؟

تو جناب الیکشن سے ہم لوگ جو مراد لیتے ہیں وہ یہ ہے کہ چند لوگوں کے درمیان کسی ایک کو Elect اس بناء پر کیا جاتا ہے کہ اس کے حامیوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ لیکن الیکشن میں ایک خاص بات یہ ہے کہ، حمایت کا (ووٹ دینے کا) حق صرف مخصوص لوگوں کو ہوتا ہے۔ کیونکہ چھتّوں میں مکھیاں تو شامل نہیں ہوسکتیں۔

ایک بات اس سلسلہ میں اور جان لیجئے کہ آجکل Elected کی اہمیت Selected سے زیادہ ہے۔ کیونکہ Selected کو چند لوگ اس کی کچھ خاص خصوصیات کی بناء پر منتخب کرتے ہیں۔ ہذا وہ بعد میں ہٹایا بھی جاسکتا ہے۔ لیکن Elected تب تک اپنی جگہ برقرار رہتا ہے جب تک اس کے حامی کسی دوسرے کے حامی نہ بن جائیں۔ لہٰذا آجکل لوگ Election کو Selection پر ترجیح دے رہے ہیں۔

الیکشن جب بھی ہوتا ہے تو کسی سیاسی، غیرسیاسی، سماجی، ادبی انجمن میں کوئی عہدہ حاصل کرنے کے لئے کیونکہ Elected نے جھاڑو تو نہیں دلوانی ہے۔ بلکہ اس سے ادارے کا کام کرانا ہے۔ علاوہ اس کے اس کا کام الیکشن سے پہلے کھلانا اور الیکشن کے بعد کرسی سے چمٹ جانا۔

الیکشن کے سلسلے میں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ مختلف اداروں کے ضوابط و قوانین الگ الگ ہوتے ہیں۔ ہذا سب کے یہاں الیکشن کا طریقہ ایک دوسرے سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے آیئے ہم کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے مختلف اداروں کے الیکشن کو الگ الگ دیکھتے چلیں۔

ادبی انجمن کا الیکشن : جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ادیبوں کی جماعت اپنے آپ کو سماج کی سب سے باعزت جماعت سمجھتی ہے۔ اس لئے ان کے یہاں الیکشن کا ڈھنگ بھی کچھ نرالا ہے۔ اوّل تو ان کے یہاں ادارے بہت ہوتے ہیں۔ لہٰذا عہدے بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ (لیکن غلط فہمی میں نہ پڑیئے، زیادہ تر ادارے غیر رجسٹرڈ اور عہدے اعزازی ہوتے ہیں) الیکشن میں کامیاب اکثر وہ شخص ہوتا ہے جو کسی ادیب سے جاکر کہے کہ فلاں صاحب (ادیب) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جو حضرات اس لائین کے نہیں ہوتے وہ اکثر کسی ادارے کے سرپرست ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ادیبوں کے الیکشن میں بھی غیرادبی ماحول پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا اس سے گریز کرنے کے لئے ان سے کہ

سرپرستوں نے نامزدگی کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ لیکن مہر سے یہاں بھی ہیں ٹیڈر رہتے ہیں ادبی ادارے کے نامزد یا منتخب " کے کام اور معیار کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ویسے ادبی ادار کے الیکشن کا اختتام اکثر ادارے کی تقسیم پر ہوتا ہے۔

اساتذہ کی یونین کا الیکشن : اساتذہ کی جماعت اپنے کو سماج کی سب سے شریف، ذہین اور معمارِ قوم جماعت سمجھتی ہے۔ لہذا ان کی یونین بھی معماری کا کام کرتی ہے۔ مثلاً تنخواہ بڑھانے کے لئے حکومت سے مطالبہ کرنا، اپنے معطل ساتھی کو بحال کرانا وغیرہ وغیرہ۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ یونین کبھی کبھی بڑ وغیرہ بھی کرادیتی ہے۔

تو ان کے قول اور کام کے متعلق آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ الیکشن کس قسم کا ہوتا ہوگا۔ جی ہاں! بہت راز دارانہ انداز میں ووٹ دیئے جاتے ہیں۔ امیدوار مختلف اقسام کے بانس استعمال کرتے ہیں۔ اکثر الیک کا آغاز شریفانہ ماحول میں ہوکر اختتام غیر شریفانہ ماحول میں ہوتا ہے۔

اساتذہ کے سلسلے میں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اساتذہ بھی دو قسم کے ہو ہیں۔ پہلے یونیورسٹی یا کالجوں کے اور دوسرے اسکولوں کے، پھر اسکولوں کے اساتذہ میں بھی کئی درجے ہو ہیں۔ اور پھر جتنی قسمیں ہیں اسی کے لحاظ سے اُتنی ہی یونین بھی اور الیکشن بھی۔

طلباء کی یونین کا الیکشن : یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ تعلیم حاصل کرنے والوں کو طلباء کہتے ہیں۔ ا اسکول کے، دوسرے کالج کے۔ اب چونکہ اسکول کے طلباء کو ذہنی طور بالغ سمجھا نہیں جاتا۔ لہذا ان کی یونین نہیں ہوتی۔ کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو بھی ازرو قواعد جنس کے اعتبار سے دو گروپ میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک طلباء دوسری طالبات ویسے ان کی مشترکہ یونین بھی ہوسکتی ہے اور الگ الگ بھی۔

طلباء کی یونین کا خاص کام امتحان کی تاریخ بڑھوانا ہوتا ہے۔ اور یہ اس قول سے مطابقت رکھتا ہے کہ پر آنے والے کل کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لہذا طلباء اپنی ذمہ داریوں کو آج ہی سمجھنے کے لئے الیکشن دوران پبلک کے، ہوٹلوں وغیرہ کا نظم ونسق ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ طلباء کا الیکشن تو بڑا شدید ہوتا ہے۔ وو دینے کا حق طلباء اور طالبات دونوں کو ہوتا ہے۔ اور مشترکہ الیکشن میں طلباء اور طالبات امیدوار کی جیب کا بج کی مساوی کرتے ہیں۔

میونسپلٹی کا الیکشن : چونکہ اس الیکشن کو ادبی اور غیر ادبی کے بیچ پُل کی حیثیت حاصل ہے۔ لہذا اس کا بھی ضروری ہے۔ میونسپلٹی کے کام تو ویسے بہت ہوتے ہیں۔ لیکن خاص کام صفائی اور ٹیکس لگانا ہے۔ الیکشن ووٹنگ کے ذریعہ ہوتا ہے اور مختلف وارڈوں سے نمائندے منتخب کئے جاتے لیکن اس الیکشن کی کچھ خاص خصوصیات ہوتی ہیں۔ مثلاً امیدوار اپنے نام کے ساتھ ساتھ علامت بھی استعما ہیں جیسے 'گدھا'، کوڑے کا ڈھیر وغیرہ وغیرہ'، اس الیکشن کی یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ ہر امیدوار دوسرے امیدوار کی علامت کا شہر سے خاتمہ کرانا شروع کر دیتا ہے، جیسے گدھا والا' کوڑے کا اور کوڑے والا' گد کا۔ لیکن الیکشن کے بعد اکثر دونوں آپ کے سامنے گلے ملتے نظر آئیں گے۔

ورکرس کی یونین کا الیکشن : ویسے تو کام کرنے والوں کو ورکرس کہتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ خصوصی طور پر مل کام کرنے والوں کو کہتے ہیں۔ لیکن اب اس میں کلرکوں سے لے کر

چلانے والوں تک کو شامل کر لیا گیا ہے۔ سب ہی کی یونین الگ الگ ہوتی ہے۔ لیکن الیکشن کا طریقۂ کار ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ الیکشن ووٹنگ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور یونین کا خاص کام زیادہ مزدوری کا مطالبہ کرنا۔ ہڑتال کرنا وغیرہ ہوتا ہے۔

سماجی اداروں کا الیکشن: سماجی ادارے، سماجی کاموں کے لئے ہوتے ہیں مثلاً، تفریحی محفلیں اور پروگرام، منعقد کرا کر چندہ جمع کرنا، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ باڑھ، قحط، اور زلزلہ وغیرہ تو کبھی کبھی آتے ہیں۔ لیکن یہ ادارے ہمیشہ رہتے ہیں۔ ووٹنگ کا سلسلہ تو ابھی تک اس کے یہاں جاری نہیں ہوا ہے۔ بلکہ "نامزدگی جاری ہے۔ نامزدگی بھی سرپرست کرتے ہیں۔ اور اکثر سماج کے باعزت اور لکڑی والے اشخاص ہوتے ہیں اور ان کے آگے کسی کی لکڑی چل نہیں سکتی۔ ویسے اس ادارے کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں کہ، "نامزد" حضرت جو کارکن کہلاتے ہیں آنریری ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی بہت سے لوگ اس کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ ان اداروں میں ممبر یا کارکن عموماً ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر چندہ دے سکیں۔ اور چندہ لا سکیں۔

اور اب جب کہ آپ کو الیکشن کے بارے میں کچھ نہ کچھ واقفیت ہو گئی ہے تو یہ فیصلہ کر لیجئے کہ کون سا الیکشن لڑنا آسان ہے۔ ویسے میرے خیال میں کوئی بھی نہیں۔ لہذا میں آپ کو ایک آسان نسخہ بتا دیتا ہوں۔

چند اچھے خوش نما ملاقاتی کارڈ چھپوا لیجئے اور جہاں جائیے بلا تکلف پیش کیجئے اور کہئے: میں فلاں ادارے کا جنرل سکریٹری ہوں گھبرائیے نہیں۔ لوگ پیٹھ پیچھے چہ میگوئیاں کریں گے لیکن آپ کو کوئی چیلنج نہیں کرے گا۔ اگر کوئی چیلنج کرے تو بحث کیجئے:

"اخاہ! آپ کو ابھی تک نہیں معلوم ...... یہ لیجئے ممبر شپ کا فارم اور پہلے ممبر بن جائیے، اور ساتھ ساتھ ممبر شپ کے پانچ روپے دے دیجئے۔!"

بھارتی معیشت میں
وسیع پیمانے پر مزید ترقی کے روشن امکانات

بھارتی معیشت میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔ بھارت نے نہ صرف سکّے کے پھیلاؤ پر قابو پالیا ہے۔ بلکہ اس کا رخ ہی موڑ دیا ہے اور قیمتوں میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔

- اناج کی ۱۱ کروڑ 80 لاکھ ٹن کی پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور اس وقت ملک میں ایک کروڑ 80 لاکھ ٹن سے زیادہ اناج کا اسٹاک ہے۔
- مالی سال کے پہلے چھ مہینوں میں صنعتی شعبے میں بارہ فیصد کی شرح سے ترقی ہوئی۔ جبکہ پچھلے سال کی اس مدت میں یہ صرف تین فیصد تھی۔ 1976-77 میں پچھلے سال کے مقابلے میں دس فیصد زیادہ صنعتی پیداوار متوقع ہے۔
- اپریل سے ستمبر 1976 تک کے عرصے میں 1975 کی اس مدت کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار 16.4 فیصد بڑھی ہے۔
- اپریل سے اکتوبر 1976 کے عرصے میں بھارتی برآمدات میں 33.9 فیصد کا قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور اس مدت میں درآمدات میں 9 فیصد تک کمی ہوئی ہے۔
- بیرونی ادائیگیوں کی پوزیشن میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ غیر ملکی سکّے کا ریزرو حصول آزادی کے بعد پہلی بار 500 د 2 کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔
- پبلک سیکٹر میں ترقی کی شرح تقریباً بارہ فیصد ہے۔
- روپے کی قوت خرید میں ۱۷ سے ۱۲ فیصد تک کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ کامیابیاں اس بات کی مظہر ہیں کہ بھارت کی حکومت اور جنتا نے ترقی کے لئے اس وسیع اور سرگرم عمل ملک کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔

DAVP. 75/886.

اقبال شیدائی

"قلتِ جہاں بیگم"

اوہ ـــــ اور اس سے ملاقات ہو ہی گئی۔ میں دلشاد کیفے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ وہ خود مجھ سے ٹکرا گئی۔ "اوہ معاف کیجئے جناب بڑی مہربانی ہوگی ـــــ" اس نے بڑے شرمیلے انداز میں کہا۔ اس کی آواز بڑی مہین تھی۔

مہربانی یہاں کہاں میڈم ـــــ میں نے کہا ـــــ" ابّا جان مرحوم کے ساتھ ہی مہربانی بھی ختم ہو گئی۔ ابّا جان مہربانی کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔ گھر میں دن رات مہربانیوں کی ریل پیل رہتی تھی۔ قسم قسم کی مہربانیوں کا اسٹاک رہتا تھا۔ گاہک آتے تھے اور اپنی پسند کی مہربانیاں خرید کر لے جاتے تھے۔ لیکن جب سے مہربانیوں کے چاہنے والے بڑھ گئے ہیں۔ مہربانیوں کی ایکدم قلت ہو گئی ہے۔ اب ڈھونڈھنے سے بھی کہیں مہربانی نہیں ملتی۔ خیر آپ کو معاف کیا۔

آپ تو افسانہ نگار معلوم ہوتے ہیں

درایں چہ شک ـــــ میں دیپک بھارتی ہوں ـــــ میں نے کہا ـــــ

اوہ! آئی سی۔ آپ ہی مسٹر دیپک بھارتی ہیں۔ میں خود آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ کتنے دنوں سے تھا ارمان مجھے آپ سے ملنے کا۔ آیئے نا سامنے والے کیفے میں کچھ دیر بیٹھیں گے۔ باتیں کریں گے۔ لڑکی کا لہجہ شگفتہ تھا۔

"ان دنوں اتنی فرصت کہاں میڈم کہ ......"

آپ تو کہیں گے کہ فرصت کی بھی قلت ہے۔ لڑکی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ آیئے کچھ دیر بیٹھیں گے۔ صنفِ مخالف کی پیشکش کو اچھے لوگ ٹھکرایا نہیں کرتے۔

میں اب کی بار لڑکی کے سراپے کا سرسری جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ چھوٹا سا قد۔ چھوٹی چھوٹی انگلیاں۔ چھوٹی چھوٹی ہتھیلیاں چھوٹے چھوٹے بازو۔ چھوٹے چھوٹے پیر۔ چھوٹا سا دھڑ۔ چھوٹی سی گردن چھوٹے کان۔ چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں۔ چھوٹا سا چہرہ۔ چھوٹی سی ناک۔ چھوٹے چھوٹے ہونٹ۔ چھوٹے چھوٹے بال۔ جیسے کسی لمبی چوڑی کو جمع 'تفریق' ضرب و تقسیم کے عمل سے مختصر کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے بنانے والے کو بہت ہی کم کم مصالحہ ملا ہو۔ یا پھر بنانے والے نے اقل ترین مصالحہ کو استعمال کر کے اپنی صناعی کا ثبوت دیا ہو۔

"کیا دیکھ رہے ہیں ـــــ" لڑکی لجاتی ہوئی بولی۔

دیکھ رہا ہوں قدرت کے کیسے کیسے شاہکار دنیا میں موجود ہیں۔

آپ مجھے بنا رہے ہیں۔ آیئے نا اس طرف چلتے ہیں۔

"آیئے ـــــــ" میں اس کا پیش کش رد نہ کر سکا۔
جیسے ہی ہم دٹ دیکھنے کی سمت بڑھے ایک صاحب لڑکی سے ٹکرا گئے۔
اوہ! معاف کیجئے محترمہ ـــــــ انہوں نے کہا اور تیزی سے کھسک گئے۔
کون صاحب ہیں یہ ـــــــ؟" لڑکی نے دریافت کیا۔
یہ ہیں مسٹر قربان علی۔ میرے نئے افسانے انعام کے مرکزی کردار۔ ایک زمانہ تھا ایک تھان لٹھے کا شلوار اور کرتا پہنا کرتے تھے۔ لیکن اب صرف ڈیڑھ گز کی لنگی پر آگئے ہیں۔ آپ یقین نہیں کریں گی حال ہی میں بازار سے پانچ میٹر کپڑا لاکر بیوی کو دیتے ہوئے کہنے لگے ـــــــ بیگم! تم اس میں اپنی چولی کے علاوہ میرے لیئے ... پا کا کپڑا بچالینا۔ اپنی لڑکیوں کے لیئے عید کے موقع پر کپڑا لاکر انہیں دیتے ہوئے کہنے لگے کہ لڑکیو! تم میں سے جو بھی مختصر سے مختصر ترین لباس بناکر زیادہ سے زیادہ کپڑا بچائے گی اسے انعام دیا جائے گا۔ کچھ دیر بعد ان کی بڑی لڑکی ان کے پاس آئی اور کپڑا واپس کرتے ہوئے بولی۔ ابا حضور! لائیے میرا انعام۔ میں نے سب سے زیادہ کپڑا بچا لیا ہے۔ یعنی سارے کا سارا کپڑا۔ میں آئندہ سے لباس قطعی نہیں پہنوں گی۔
واہ ـــــــ غالباً آپ نے یہ افسانہ کپڑوں کی قلّت پر لکھا ہے۔
"جی ہاں" ـــــــ میں نے کہا ـــــــ
ہم دونوں دٹ دیکھنے میں داخل ہوئے۔
"اماں یار دیپک کہاں ہو ـــــــ" ایک صاحب بڑی گرم جوشی سے ملے۔
"معاف کرنا جناب میں نے آپ کو نہیں پہچانا ـــــــ" میں نے کہا ـــــــ
ارے ـــــــ اپنے یارِ غار کو اتنی جلدی بھول گئے۔ میں تو ہوں توکل عرفانی۔
ارے توکل ـــــــ! یہ تم ہو ـــــــ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔ پہچانے تک نہیں جاتے"۔ ہم نے حیرت زدہ لہجہ میں کہا
"اماں یار بھوکا ہوں کئی دنوں سے"
بھوکے ہو ـــــــ تمہیں کیا پڑی کہ تم بھوکے رہو۔ خدا کے فضل سے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ لڑکے بھی سب سے بڑے ہو چکے ہیں۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے ہیں۔
اماں یار ـــــــ اتنا بھی نہیں جانتے۔ جب سے کاغذ کی قلّت ہوگئی ہے دفتر سے کاغذ اڑا لانے کے سارے ذرایع مسدود ہو چکے ہیں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ مجھے بس پلاٹ ملنے کی دیر ہوتی ہے۔ ادھر کوئی کہانی ذہن میں در آئی۔ اُدھر اشہب قلم نے رفتار پکڑ لی۔ اوراق ہیں کہ سیاہ ہوتے ہی چلے جا رہے ہیں اور قلم ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ لیکن کاغذ کی قلّت نے پریشان کر رکھا ہے۔ ذہن میں جیسے پلاٹوں کی یلغار ہو رہی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہی حالت اگر کچھ دن برقرار رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔
اگر یہ بات ہے تو تم شاعری کیوں شروع نہیں کر دیتے توکل ـــــــ سُنا ہے اس میں پیپر بچانے کے بہت زیادہ چانسس ہیں۔ مثلاً جو بات ایک افسانے میں بیس تیس صفحات میں پیش کی جاتی ہے۔ وہی بات صرف ایک شعر میں کہی جاتی ہے۔
یار شاعری بھی کر دیکھا۔ لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ایک پلاٹ کو نظم کرنے کی کوشش کی تو صرف ایک مصرعہ پندرہ اوراق پر مکمل ہو سکا۔ اچھا یار اجازت دو۔ ان دنوں تو ہم بات چیت کی قلّت سے بھی دوچار ہیں۔ ڈاکٹر نے زیادہ بات کرنے سے بھی منع کر دیا ہے۔ اور وہ چلے گئے۔
"یہ غالباً کاغذ کی قلّت کا چکر ہے۔ ـــــــ" لڑکی نے خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
ہاں ـــــــ لیکن ابھی آپ نے کچھ بھی نہیں دیکھا میڈم میں اس سے متعلق ایک واقعہ سناؤں گا۔ جسے آپ سن کر حیران رہ جائیں

گی۔ پرسوں ہی کی بات ہے کہ ایک شاعر صاحب کے انتقال پُر ملال پر ان کے گھر ان کے لواحقین کو پُرسہ دینے گیا۔ تو میں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ مرحوم کاغذ کے ایک ایک پرزہ کے لئے آخری وقت تک ترستے رہے۔ مجھے شک ہوا۔ میں نے ڈائری کا ایک فالتو ورق پھاڑ کر مرحوم کی ناک پر ذرا جو لہرایا تو اچانک مرحوم نے آنکھیں کھول دیں۔ اور بجلی کے کوندے کے مانند کاغذ پر جھپٹ پڑے کہنے لگے۔ اماں یار تم میرے مسیحا ہو۔ تم نے مجھے جلا بخشی لیکن میں تمہیں یہ کاغذ نہیں بخشوں گا۔ اس پر اپنی تمام تازہ ترین غزلیں فیر کر لوں گا۔

میں نے ان کے لواحقین سے کہا کہ وہ تجہیز و تکفین کا سارا سامان واپس کر کے ان تمام پیسوں کا جتنا بھی کاغذ مل سکے خرید لائیں۔ اچھا میڈم! تعارف تو ایک طرف رہا۔ آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔

جی میرا تعارف کیا ـــــ لڑکی نے کہا ـــــ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ مسٹر افسانہ نگار صاحب یہ اور بات ہے کہ آپ تجاہل عارفانہ برت رہے ہیں۔

یہ غلط ہے۔ میں نے احتجاج کیا ـــ میں آپ سے قطعی متعارف نہیں ہوں۔

خیر وقت آنے پر بتا دوں گی ـــــ لڑکی بولی کل ہی میں نے ایک میگزین میں آپ کا ایک افسانہ پڑھا ہے۔ وہی جس میں ایک ذہین طالب علم ایک ادبی رسالہ خریدنے کے لئے بڑی مصیبتوں سے ڈیڑھ روپیہ جمع کر کے ایک اسٹال پر پہنچتا ہے لیکن وہاں جانے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ میگزین کی قیمت کاغذ کی قلت کے پیش نظر ڈھائی روپے ہو گئی ہے طالب علم کو میگزین سے والہانہ محبت ہے۔ وہ ہر حال میں میگزین خریدنے پر مصر ہے۔ چنانچہ وہ ایک روپیہ حاصل کرنے کے لئے ایک پاکٹ اُڑانے کی علت میں دھر لیا جاتا ہے۔

ہاں ـــــ اس کا عنوان "چور" تھا۔ میں نے اس افسانے میں اخبارات و رسائل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر احتجاج کیا تھا آپ بھی محسوس کر رہی ہوں گی کہ جیسے جیسے کاغذ کی قلت کا بحران بڑھتا جا رہا ہے۔ ویسے ویسے رسائل میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ان کی قیمتوں میں بھی۔ اگر کوئی خریدے بھی تو رسائل خریدے اور کیسے خریدے۔ اس کا اپنا مالیہ بھی تو ساتھ دے۔ ایک دو اشیاء کی قلت ہو جائے تو پھر بھی برداشت کر لیا جائے لیکن جب ہر چیز کی قلت ہو جائے تو آخر انسان کب تک صبر کرے۔

مٹی کے تیل کی قلت کے پیش نظر چولہا جلانے کے لئے لکڑی استعمال کرنے لگے تو لکڑی کی قلت ہو گئی۔ گھر میں دو سے تین بچے کیا ہو گئے، دودھ کی قلت ہو گئی۔ پہلے بغیر دودھ کی چائے پی کر دفتر جایا کرتے تھے۔ لیکن پانی کی قلت کی وجہ سے وہ بھی چھوٹ گئی۔ بجلی کی قلت کے نتیجے میں کارخانے بند ہو گئے۔ اس سے بے روزگاری میں اضافہ ہو گیا اور روزگار کی قلت ہو گئی۔ پٹرول کی قلت کیا ہوئی کہ امیروں نے اپنی کاریں گیریجوں میں بند کر کے دھڑا دھڑ سیکلیں خریدنا شروع کر دیں۔ نتیجے میں سیکلیوں کی قلت ہو گئی۔ جن کے پاس سیکلیں تھیں انہوں نے اپنی سیکلیں فروخت کر کے بسوں پر سفر کرنا شروع کر دیا تو بسوں کی قلت ہو گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ بسوں کے کرائے بڑھ گئے۔ غریب عوام جو بسوں کا بڑھتا ہوا کرایہ برداشت نہ کر سکے تو پیدل چلنا شروع کر دیا۔ نتیجہ میں سڑکوں پر پیدل چلنے والوں کا رش بڑھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے سڑکوں پر انسانی سروں کا سمندر لہریں لے رہا ہے۔ اور یہ تک پتہ نہیں چلتا کہ کس سڑک سے گزرا جا رہا ہے۔

"اقبال نے کہا تھا کہ آج کل افسانہ نگاروں کے اعصاب پر صرف عورت سوار ہے۔ لیکن آپ سے مل کر ان کا یہ قول غلط ثابت ہوا۔ کیونکہ آپ کے اعصاب پر تو قلت سوار ہے۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہاں میڈم ـــــ قلت ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ میں ہی کیا۔ ہر کوئی قلت کا مارا ہوا ہے۔

لڑکی مسکرا دی ـــــ اور اس کے چھوٹے چھوٹے دانت چمک اٹھے۔

بغیر شکر ہی کی چائے لاؤ ـــــ ذیابطیس کے مریضوں کو تو شکر سے پرہیز ضروری ہے ـــــ"

"چائے کی پتی بھی نہیں ہے مالک ـــــ"

"تو خیر دو پیالی دودھ ہی لے آؤ ـــــ"

"دودھ کی قلت کے پیش نظر ہی تو اس طرف تختی پر لکھ دیا گیا ہے کہ براہ کرم چار بجے کے بعد ہم سے چائے طلب نہ فرمائیں اور اب پانچ بج رہے ہیں ـ"

تو پھر کیا ہے تمہارے پاس ـــــ میں نے چڑ کر دریافت کیا ـ

"پانی" ـــــ

"دو گلاس پانی ہی لے آؤ ـــــ"

"میٹھا کہ کھارا ـــــ"

"ٹھنڈا کہ گرم ـــــ"

"کیا مطلب ـــــ"

"گرم پانی تیس پیسے گلاس اور ٹھنڈا پانی پچاس پیسے گلاس ـــــ"

خیر دو گلاس ٹھنڈا پانی ہی لے آؤ ـــــ" میں نے کہا ـــــ دیکھا محترمہ ـــــ قلت ـ ـ قلت ـــــ قلت چینی کی قلت ، دودھ کی قلت ـ پانی کی قلت ، گوشت کی قلت ـ ترکاری کی قلت ـ اناج کی قلت ـ انسان دن بھر محنت مزدوری کرے مل کی بھاری مشینوں سے سر کھپاتا رہے ـ رکشہ چلائے ـ پتھر ڈھوئے ـ اور جب شام تھکا ہارا گھر پہنچے تو اسے پیٹ بھر روکھی سوکھی روٹی بھی نہ ملے ـ کیا یہ ظلم نہیں ـ یہی سوال تو میرے افسانے "بھوک" کے مرکزی کردار ھسر نام نے کیا ہے ـ

آپ یہ کیوں نہیں سوچتے مسٹر افسانہ نگار کہ لوگوں کے شوق ذوق بھی تو بڑھ رہے ہیں ـ فضول خرچی ، فیشن پرستی ضروریات زندگی میں شامل ہو چکی ہیں ـ ایک رکشہ والا دن میں پانچ روپے کماتا ہے ـ لیکن شام میں وہ تین روپے کی شراب پی کر گھر آتا ہے ـ اب بتائیے وہ دو روپوں میں گھر کا خرچ کیسے چلا سکتا ہے ـــــ" لڑکی نے کہا ـ

آپ نے تصویر کا صرف ایک ہی رُخ دیکھا ہے میڈم ـــــ" میں نے کہا ـــــ شاید آپ کی نظروں سے وہ المناک خبریں نہیں گزریں جو آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں ـ کہ فلاں عورت نے مسلسل فاقہ کشی سے تنگ آکر اپنے بچوں سمیت خودکشی کر لی ـ فلاں نوجوان نے بے روزگاری سے عاجز آکر اپنے آپ کو چلتی ٹرین سے گرا کر ہلاک کر لیا فلاں شخص نے مسلسل پریشانیوں سے مجبور ہو کر اپنی بیوی بچوں اور خود کو ہلاک کر دیا ـ انسان جب اپنی بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہو جائے اور ان کی قلت ہو جائے تو اور وہ اُس کی قوتِ خرید سے باہر ہو جائیں تو پھر وہ کیا کرے ـ سوائے اس کے کہ خودکشی کرے ـ یا پھر سفاک ڈاکو بن جائے ـ بُرا نہ مانو میڈم ! آپ کا یہ غازہ اور کریم سے عاری چہرہ ـ لپاسٹک سے بے نیاز ہونٹ اور کاجل سے محروم آنکھیں اس بات کی غمازی کر رہی ہیں کہ آپ خود کاسمیٹکس کی قلت سے ، دوچار ہیں ـ

ہاں یہ سچ ہے کہ لڑکی نے کہا ـــــ" آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں بھی قلت سے پریشان ہوں حالانکہ میں خود قلت جہاں بیگم ہوں ـ" کیا کہا ـــــ قلت جہاں بیگم ـــــ مجھے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ـــــ تم قلت جہاں ہو" ـــــ ؟

"ہاں ـــــ قلت جہاں بیگم ـــــ [illegible] اولاد کہتے ہو ـــــ

میں کسی کے خوش ہونے یا نا خوش ہونے کی پرواہ نہیں کرتی۔ اور تمہارے ایک کے خوش ہونے یا نہ ہونے سے بھی کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ ان دنوں تو خلوص و محبت کے ساتھ ساتھ خوشی و مسرت کی بھی قلت ہے۔

اسی لیئے تو مجھے تم سے نفرت ہے۔ میں نے جل کر کہا۔

"میں بھی تو تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے نفرت کیوں ہے۔ یہ بجا ہے کہ میں کسی کی ناجائز اولاد ضرور ہوں لیکن دستوری اعتبار سے مجھے بھی جینے کا حق ہے"

مجھے اس لیئے تم سے نفرت ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ مجھے اپنے آپ سے محبت ہے۔ اپنے بچوں سے محبت ہے۔ مجھے اپنی ماں سے محبت ہے۔ مجھے انسانوں سے محبت ہے۔ لیکن انہیں جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان سب کی قلت ہے میرے بچے میوہ نہیں کھا سکتے۔ میری بیوی ایک پرس نہیں رکھ سکتی اس ایک اچھی سی ساڑی خرید نہیں سکتی۔ اور مجھے ایک خوب صورت سا پن خریدنے کا حوصلہ نہیں۔ اور ملک کے ۷۵ فیصد سے زائد لوگ اپنی بنیادی ضروریات سے محروم ہیں۔ انہیں اپنی بنیادی ضروریات سے محروم کر کے جو چیز گھڑی گئی ہے۔ وہ تمہارا منحوس سا موجود ہے۔ تم قہرآسمان ہو۔ بلائے ناگہانی ہو تم نے ہم سے ہماری مسرتیں چھین لیں ہیں۔ تم نے ہمارا سکون چھین لیا ہے۔ اور بدلے میں ہمیں بے تحاشہ مصائب دیئے۔ اے مکروہ وجود ـــــ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا ـــــــ

جواب میں قلت جہاں بیگم نے قہقہہ لگایا۔

تم مجھے شوٹ کر دوگے ـــــ بے وقوف افسانہ نگار۔ تمہارے پاس پستول بھی تو نہیں۔ تم ایک کارتوس بھی تو نہیں خرید سکتے۔ ایک چھرہ بھی نہیں۔

قلت جہاں بیگم کے اس طنز پر میں تلملا گیا۔ میرا خون کھول گیا۔

میں ـــــ میں تمہیں زہر دے دوں گا۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا ـــــ

زہر ـــــ ہا ـــــ ہا ـــــ زہر۔ ان دنوں اصلی زہر کی بھی تو قلت ہے۔

میں تمہیں زندہ دفن کر دوں گا ـــــ" میں نے تڑپ کر کہا۔

قلت جہاں بیگم نے ایک زبردست اور ڈراونے قسم کا قہقہہ لگایا۔ اور مجھے میرے پیر کانپتے ہوئے محسوس ہوئے تم ـــــ تم ـــــ افسانہ نگار۔ تم مجھے زندہ دفن کر دوگے مجھے دفن کرنے کے لیئے تمہارے گھر میں کوئی جگہ بھی تو نہیں۔ تمہارا گھر اتنا چھوٹا ہے کہ اس آئے ہوئے مہمان کو دس منٹ کے لیئے بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

قلت جہاں بیگم کے اس بھیانک طنز پر میں زخمی شیر کی مانند بپھر گیا۔

میں ـــــ میں تمہارا گلا دبوچ لوں گا۔

اور ـــــ اور میں نے بڑی سرعت سے اس کی گردن دبوچ لی۔ لیکن مجھے ایک دھکا سا لگا۔ جیسے میرا ہاتھ بجلی سے برقی کے تار سے جا لگا ہوا۔ اور وہ پلک جھپکتے میں فضاء میں تحلیل ہو چکی تھی۔ اور اس کے قہقہے گونج رہے تھے۔ طنزیہ اور زہریلے قہقہے۔ جیسے وہ بڑی حقارت سے کہہ رہی ہو ـــــ بے وقوف افسانہ نگار ـــــ بھلا میں تمہارے قابو میں آسکتی ہوں ـــــ نہیں جانتے تم مجھے ـــــ میں قلت جہاں بیگم ہوں ـــــ

قلت جہاں ـــــ قلت ـــــ جو سارے جہاں پر چھائی ہوئی ہے ....

اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میں میز پر رکھے ہوئے برفیلے پانی سے کہیں زیادہ سرد ہو گیا ہوں ـــــــ

★▼

شفیقہ فرحت

ہم گُفر جاتے ہیں...!

بھٹکنے والے تو اپنے شہر اور اپنی گلی میں بھی بھٹک جاتے ہیں ـــــ یہ تو حیدرآباد تھا ـــ اجنبی شہر اور اجنبی راہیں ـــ بھٹکتی بھٹکاتی جب میں چودہ مئی کی شام کے سات بجے "اردو ہال" پہنچی تو تالیاں کچھ اس گھن گرج سے بج رہی تھیں کہ اگر چھت مضبوط نہ ہوتی تو یقیناً اُڑ جاتی ـــ! ایک آدھ بال تو اب بھی پڑ گیا ہوگا ـــــ (ملاحظہ ذرا، خوردبین سے معائنہ کریں ـــ!!) بوکھلائی ہوئی سی میں ہال میں داخل ہوئی۔ مائک پر کوئی صاحب فرما رہے تھے

" زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی پہلی کُل ہند طنز و مزاح کانفرنس کی صدارت کے لئے بمبئی سے جناب کرشن چندر صاحب تشریف لائے ہیں"

اچھا! ـــــ تو ان بے پناہ تالیوں کا روئے سخن آپ کی طرف تھا ـــ!

اب مجھے بیٹھنے کے لئے مناسب جگہ مل چکی تھی۔ لہٰذا اس اعلان پر میں نے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے اُس شخص کی طرف بے اعتباری سے دیکھا جسے کانفرنس کے کنوینر صاحب "کرشن چندر" کہہ رہے تھے ـــــ سر جس میں بال کم اور چٹیل میدان زیادہ (بالکل ہندوستان کے کسی قحط زدہ علاقے کی کھیتی کی طرح ـــ!)

نسبتاً گول چہرہ (غالباً گوشت کی زیادتی کی وجہ سے!) چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی گول گول آنکھیں اور سارے چہرے پر پھیلی ہوئی وہ مسکراہٹ جس میں پچاس فیصدی حماقت کی آمیزش ـــــ!!

وہ تو خیر ہوئی کہ آپ کے متعلق کچھ بہت حسین تصوّرات ذہن میں نہیں تھے ـــ ورنہ بیچارہ نازک سا دل کب اس صدمے کی تاب لا سکتا تھا ـــ!!

گلے میں شب بھر کا سا طول طویل ہار ابھی تک پڑا تھا۔ اور آپ یوں مُسکرا مسکرا اور داد طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے کوئی بچہ کسی تماشے کو دیکھتا ہے ـــــ اس تقریب کا تماشہ جس کا ہیرو وہ خود ہو ـــ

شکل کی طرف سے مایوس ہوکر لباس پر نظر ڈالی ـــ ٹریلین کی نیوی کلر کی پتلون ـــ اور ہلکے نیلے رنگ کی ٹریلین کی قمیص، کپڑے یقیناً قیمتی ہوں گے، اور پہلے بھی اچھے ہی ہوں گے مگر اُس جسم پر اور اُس شخصیت پہ وہ کچھ اجنبیت محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جسم نے کپڑے نہیں پہنے، کپڑوں نے جسم کو پہن لیا ہے۔

موٹاپے کی طرف سفر کرتا ہوا جسم ـــ رہا قد۔ تو ـــ اُس کے متعلق آج تک میں فیصلہ نہیں کر پائی وہ کیسا ہے کبھی وہ مجھے بہت لمبا دکھائی دیتا ہے۔ آسمان سے باتیں کرتا ہوا ـــ اور کبھی چھوٹا سا، موٹا سا، بالکل [illegible]

[illegible] ـــ پر [illegible] ایک لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری اور سر کو جھٹک لیا۔ [illegible]

۷۰

ئا کوئی ایسا شدید نہ تھا ـــــ اور نہ ہی ہم پر دل کا دورہ پڑا۔ لیکن ذرا سی دیر کے لئے ہم اندھے، بہرے ضرور ہو گئے
نب ہمارے نام کی تسبیح مائک پر با آواز بلند پڑھ رہے تھے۔ اور بار بار دُزدیدہ نہیں بلکہ غصیلی بھری نگاہ سے ہماری
رہے تھے ـــــ احمد جمال پاشا پڑوس میں تھے۔ انہوں نے جھٹ حق ہمسائیگی ادا کیا اور ہمیں آگاہ کیا کہ یہ چیخ
ے لئے ہے۔ اور اس سے پہلے کہ شور سن کر پولیس آ جائے اور یہاں دفعہ ۱۴۴ لگا دے ہمیں ڈائس پر پہنچ
، سو ہم دو تین چھلانگوں میں پہنچ گئے۔ کرشن چندر اپنی چندھیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ذرا سا مڑے ـــــ
ہلکی سی ناگواری تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا ـــــ حماقت کے بادل تو چھٹے ـــــ ارے وہ تو دوسرے ہی لمحہ
گئے۔ میں سمجھ گئی کہ مرض لاعلاج ہے ـــــ!
ی کرسی اُن سے خاصی قریب تھی۔ انہیں غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ہر وقت گردش کرتی ہوئی آنکھوں میں کوئی،
ہے ـــــ کیا ـــــ؟ یہ اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا۔
تہ صاحب کانفرنس کا افتتاح فرما رہے تھے۔ کرشن چندر اُن کی تقریر غور سے سن رہے تھے۔ تقریر سنتے سنتے
سے گردن موڑ کے وہ کبھی دائیں دیکھتے کبھی بائیں ـــــ کبھی ہال کی آخری سرحدوں تک پھیلے ہوئے ہجوم کو۔
جھٹکے سے ـــــ رائٹنگ پیڈ کے نیلے کاغذوں کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لیتے ـــــ
ر یہ کیسی وحشت ہے! ـــــ بظاہر بے تعلق۔ خاموش چہرے کے نیچے یہ کیسی بے چین فطرت چھپی ہے ـــــ
ڑپ انہیں کشمیر کی وادیوں اور بمبئی کی گلیوں اور فٹ پاتھوں میں لئے پھرتی ہے ـــــ یہی تڑپ فرسودہ بدرنگ
ں کو جو سنہری منقش زمینوں میں جڑی ہیں، رد کرتی ہے اور زندگی کے نئے خاکے بناتی ہے ـــــ!
ں ہی خطبۂ صدارت کے لئے آپ کا نام لیا گیا، آپ بغیر کسی تکلف کے اُسی مخصوص جھٹکے سے اُٹھے اور مائک
نے پہنچ گئے۔ اور ابھی پوری طرح تالیوں کا شور دبا بھی نہیں تھا کہ آپ نے پڑھنا شروع کر دیا۔
ن ـــــ پڑھنے کی یہ بے تابی، جیسے آج پہلی بار یہ سعادت نصیب ہوئی ہو۔ ذرا دیر کی اور موقع گیا ہاتھ
ے تو واقعی جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی تھی۔ ذرا تو تکلف سے کام لیا ہوتا ـــــ نہ ذرا رُکے ـــــ نہ سامعین
ا موقع دیا۔ نہ پانی پیا۔ نہ کھانسے نہ کھنکارے ـــــ نہ مائک درست کیا ـــــ بس لگے پڑھنے ـــــ اتنا
، اور ادیبانہ نخرے قطعی نہیں غزل کی نگری کے باشندے، جن کی تہذیب بھی غزل ہی کی طرح مرقع
رت ہے، بھلا کیا سوچتے ہوں گے ـــــ!
ں یہ آپ پڑھ رہے ہیں ـــــ خالص پنجابی لہجہ ـــــ! کیا یہی سب دیکھنے اور سننے کے لئے اتنی دور
ں جھلستی گرمی!! کیا تھا ـــــ! دل تھا کہ صدمے پہ صدمے اُٹھائے جا رہا تھا ـــــ کاش اُس وقت
ے کو رامن مل جاتی ـــــ یا خیرہ کا گاؤزبان عنبریں ـــــ یا پھر گلوکوز ہی سہی۔ لیکن ان سب کے بدلے ملا کیا؟
لہجہ ـــــ! ـــــ اُس پنجابی لہجہ میں ابھی دو تین جملے ادا کئے گئے تھے کہ ہنسی کا ایک فوارہ چھوٹا ـــــ میں
نام غم غصہ بھول کر ہنسنے لگی ـــــ میں نے ہال پر نظر ڈالی ـــــ بے حد لمبا چوڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا کرسیاں
میں۔ لہٰذا دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف لوگ کھڑے تھے۔ جن کی قسمت عروج پر تھی وہ ہال کے
ر جن کی نہیں تھی وہ ہال کے باہر ـــــ مجمع کی تعداد ہزاروں نہیں سیکڑوں ہوگی خود پر بے حد غصہ آیا
لتو وقت میں گئیں۔ ہانکنے اور کتابیں پڑھنے کے تارے ہی گنتے ہوتے تو آج مجمع کی [illegible]
سکتی ـــــ! خیر اب تو منتظمین پر ہی تکیہ ہے ـــــ اور وہ اسے [illegible]

پہنچا تے ہیں۔ گرمی کی وہ شدت کہ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے ایک ساتھ یاد آئیں' اور ہال میں پنکھے مذارد — لیکن ہر چہرہ
زعفران زار بنا ہوا ہے۔ پسینہ پونچھے جاتے ہیں' اور کرشن چندر کے ایک ایک جملے پر ہنسے جاتے ہیں — !
لعنت ہے ایسے عشق پر ——— !!

پروگرام ختم ہوا تو طلبا نے اسٹیج پر یلغار کر دی ظاہر ہے 'ٹارگٹ کرشن چندر کے سوا کون ہوسکتا تھا' باقی
پندرہ اور بھی لوگ اسٹیج پر موجود تھے۔ مگر کسی کو لفٹ ہی نہیں ملی۔ جو ہے سو کرشن چندر کی طرف لپکا چلا جا رہا
ہے۔ جی تو چاہا کہ ایک دو چار آٹو گراف بکس چھین کر خود ہی لکھنا شروع کردیں۔ مگر پھر پیچ وتاب کھا کر رہ گئے (کہ
وقت بھی کھانے کا ہو ہی چکا تھا !) اور کرشن چندر اس عبرت ناک حشر پر دل ہی دل میں خوش ہونے لگے۔
جی ہاں — کرشن چندر کو تو ایک ٹڈی دل نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور کرشن تھے کہ بجائے انہیں ڈانٹ
پھٹکار کے بھگانے کے مسکرا مسکرا کر سب کو آٹو گراف دیئے چلے جا رہے تھے۔ اس وقت آپ کی سرخ ناک پر
نظم ہو چکی تھی — اور چہرے پر وہ اطمینان' وہ سکون تھا گویا وہ اپنے دستخط دوسروں کو نہیں بانٹ رہے
خود کونین کی دولت سمیٹ رہے ہوں ! — وہ اپنی بلندیوں سے چھلانگ لگا کر طلباء کی سطح تک آپہنچے تھے
اور میں نے دیکھا جو بھی آگے بڑھتا ہے مسرت اور فخر لیئے پلٹتا ہے — زمانے کے دور سمیٹنے والا یہ انسان
بھر بھر جھولی خوشیاں لٹا رہا تھا — !

ڈنر روزنامہ "سیاست" کے پروپرائٹر کی کوٹھی میں تھا۔ بعض ہندوستانی روایتوں کی پابندی لاشعوری طور پر
"سرزد" ہو جاتی ہے ——— کھانے کے وقت ہم نے دیکھا کہ نہ جانے کب اور کیسے تمام خواتین غیرآباد اور غیر معروف
گوشے کی میز پر اکٹھی ہو گئیں لہٰذا میں نہیں جانتی کہ کھانے میں کرشن چندر نے لکھنوی تکلف کا مظاہرہ کیا یا انگریزی
کٹ کا۔ — بہرحال کھانے کے بعد جب گانے کا پروگرام ہوا تو آپ نہایت بے تکلفی سے فرش پر آلتی پالتی مارے
تھے اور انتہائی بھونڈے پن سے پان چبا رہے تھے — !

حیدرآباد کی فائن آرٹس اکاڈمی کے اراکین گیت اور غزلیں اور قوالیاں سنا رہے تھے۔ مخدوم محی الدین
اور نظم پر جس نے سب سے پرجوش داد دی وہ تھے کرشن چندر — ہر اچھے شعر پر کرشن چندر —" بھئی واہ
کمال کر دیا۔ اردو شاعری تمہیں سے زندہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ' کہہ کر مارے خوشی کے ایک دھپ مخدوم کے رسید
مجھے یقین ہے مخدوم کو اس رات اپنے ہاتھ پیروں کی سکائی ضرور کرانی پڑی ہوگی —

کچھ نقلیں پیش کی گئیں —— لطیفے سنائے گئے ——— ہم سب ہی ہنس رہے تھے۔ مگر کرشن چندر کا تو برا
پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنس رہے تھے — اپنے ماحول میں ڈوبے ہوئے ——— کھوئے ہوئے۔ کہ جیسے ہنسنے کے علاوہ
کوئی کام نہ ہو' ان کا کوئی مقصد نہ ہو — اس وقت وہ ہندوستان کے وہ عظیم مصنف نہیں تھے' جن کی پچاس سے
کتابیں شائع ہو چکی ہیں — جن کی کہانیوں اور ناولوں کے ترجمے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی کئی اہم زبانوں میں —
جس کا نام سورج کی کرن کی طرح ملک کے اس سرے سے اس سرے تک پھیلا ہوا ہے — جنھوں نے اردو افسانے
کو وہ سرمایہ دیا ہے کہ اگر ان کی کتابوں کے علاوہ اردو ادب میں کچھ بھی نہ بچے' تب بھی ادب زندہ رہے گا —
اس وقت وہ الفاظ کے جادوگر اور خیال کے سوداگر کچھ بھی نہ تھے — !

اس وقت وہ صرف ایک سیدھے سادے معصوم انسان تھے جو لطیفوں پر ہنس رہے تھے اور نقلوں پر خوش ہو رہے
تھے ——— رات کے بارہ بج رہے تھے۔ سلمیٰ صاحبہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی — ایک نظر وہ گھڑی پر ڈالتیں
دوسری کرشن چندر پر — اور میں دیکھ رہی تھی کہ کرشن چندر' سلمیٰ صاحبہ کی نگاہوں کو دیکھنے کی اداکاری کر رہے

سنتے تھے کہ کرشن جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ۔ اور خود وہ بھی بہت تھک چکے ہیں ـــــ اور اب انھیں اٹھ جانا چاہئیے
ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ۔ فائن آرٹس اکاڈمی کے نوجوان فن کاروں پر جوش اور سرمستی کا عالم طاری ہے ۔
، صلاحیتوں کا کچھ اور مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں' کچھ اور داد چاہتے ہیں ـــــ اور اگر وہ اٹھ گئے تو یہ نشہ ٹوٹ جائیگا
بکھر جائے گی ـــ موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ـــ سری نواس لاہوٹی نے پوچھا ـــــ

"اب ختم کردیں ـــــ آپ تھک گئے ہوں گے ـــــ؟"

"ارے نہیں بھئی' بڑا اچھا پروگرام ہے ـــــ چلنے دیجئے ـــــ"

دوسرے دن صبح والے اجلاس میں آپ نے اپنا افسانہ "لوکی" اور مجتبیٰ حسین نے "تکیۂ کلام" سنایا ـــ
تکیۂ کلام" نے گویا پورے اجلاس کو لوٹ لیا ـــــ مجتبیٰ حسین کی کامیابی پر کرشن چندر اتنے خوش تھے جیسے ان کے
ٹی نمبر صحیح نکل آیا ہو ـــــ یا ریس میں ان کا گھوڑا جیت گیا ہو ـــــ داد کا اسٹاک ختم ہو ہی نہیں چکا تھا
بس لینے کو دم بھر رکتے ہوں تو اور بات ہے ـــ !!! اسٹیج پر بیٹھ ٹھونکی ـــــ نیچے اتر کر داد دی ۔ کھانے
میز پر پھر اُسی دلدار کی شان میں قصیدہ ـــــ !
کاش' ـــــ غالب' کرشن چندر کے زمانے میں ہوتے تو سخن فہموں کی تلاش میں تسکین کو ترستے ہوئے یوں نہ جیتے
تھے ـــــ !

سب کی نظریں بچاکر میں نے اُن گول گول بے رونق سی آنکھوں میں جھانکا ـــــ دل کا دریچہ کھل گیا تھا ـــ
س اور نیک نیتی کا سمندر لہریں لے رہا تھا ـــــ !!

کھانے کی میز پر اتفاق سے میں اُن کے برابر کی کرسی پر تھی ـــــ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں ـــ ـــ یعنی یہ کہ
نھیں کھانے کی کون کونسی چیزیں پسند ہیں ـــــ اور کونسی نہیں ـــــ "جب سے حیدرآباد آیا ہوں قسم لے لیجئے
قطرہ بھی نہیں پیا" ـــــ اور پھر "سردار جی کا یہ لطیفہ سنیئے ـــــ" وغیرہ وغیرہ
اور تب مجھے یہی نہیں' آس پاس کی تمام جنتا کو جو اُن سے بے حد ٹھوس قسم کی ادبی گفتگو کی ریہرسل کر کے آئی تھی
احساس ہوگیا کہ وہ اِس وقت ادیب کا رول ادا کرنے کے لئے قطعی تیار نہیں ـــــ تکلف' تصنع' سنجیدگی کے
ام لبادے سے اُتار کر وہ ایک سیدھا سادا عام انسان بننا چاہتے ہیں' جس کا بھوک کے مارے بُرا حال ہے اور جو کھانے
کا انتظار کر رہا ہے ـــــ
بارے سرو میں شروع ہوئی ۔ بیرے نے کچھ معشوقانہ اور شاعرانہ ادائیں دکھائیں' یعنی کرشن چندر کو قطعی نظر انداز کر دیا
آپ کہنے لگے ـــ "یہاں کے بیرے شاید میری کہانیاں نہیں پڑھتے' بمبئی کے اکثر بیرے اور ٹیکسی والے مجھے جانتے ہیں ۔
اکثر پیسے بھی نہیں لیتے ـــ"

مجھے ہنسی آگئی ـــ

کہنے لگے ـــ "ارے آپ کو یقین نہیں آتا ـــ بھئی' یہی لوگ میری چیزیں پڑھتے ہیں ـــــ
صرف یہی لوگ نہیں بلکہ ـــــ "یہ لوگ بھی ـــ" اور یہ ادیب کے فن کی معراج ہے کہ جن کی تصویریں اُس کی کہانیوں
میں جھانک رہی ہیں' وہی اُسے اپنا سمجھیں ـــ !!
تین بجے کانفرنس کا کاروباری اجلاس تھا ۔ تین چوتھائی حضرات آرام کرنے چلے گئے ـــ کرشن چندر چاہتے تو اپنی
رہائش گاہ "رٹیز" میں آرام کرنے جا سکتے تھے ـــ آرام نہ کرتے منہ ہاتھ ہی دھو لیتے ـــ کپڑے ہی بدل لیتے ـــ تاکہ منتظمین
کو اُن کے ہوٹل کے دو چار پھیرے صرف اُنھیں بلانے کے لئے کرنے پڑتے ـــ اِدھر اُردو ہال میں اُن کا انتظار تھا ...

بار بار ٹیلی فون کھڑکھڑایا جاتا — لیکن مجھے بے حد مایوسی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ اُنہوں نے نہ آرام کا ارادہ ظاہر کیا نہ تھکن کا اظہار کیا — کھانا ختم کرکے جس حالت میں تھے اُسی حالت میں اُردو ہال پہنچ گئے — ذرا تو ادیبانہ رعونت ہونی چاہیئے۔ یہ کیا کہ بجائے اِس کے لوگ آپ کا انتظار کریں، آپ صدر صاحب کے انتظار میں بیٹھے اُردو ہال کی کُرسیاں گن رہے ہیں — !!

تین سے چار تک ایک اجلاس میں شرکت کی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے بچے کھچے مسکین سے اراکین کے ساتھ چائے پی — اور پانچ سے آٹھ تک تیسرے اجلاس میں ڈٹے رہے — اور مشاعرے میں دیکھئے تو کھانا کھا کر پھر موجود — یا اللہ — !!

مشاعرے کے ساتھ ہی کانفرنس بھی ختم ہو گئی — لیکن ۱۶/۱۷/۱۸ مئی تک پروگرام چلتے رہے کسی نے کرشن چندر کو لنچ پر مدعو کیا، کسی نے ڈنر پر، کسی نے چائے پر — (اور طفیل میں ہم سب کا بھی بھلا ہو گیا —) مدّاحوں کا ہجوم ہے کہ رہائش گاہ پر ملنے چلا آرہا ہے — کوئی اپنے پھیپھڑے سے گاڑی بھر مضامین پر رائے لینا چاہتا ہے۔ تو کوئی اخبار کے لئے ایڈریس — کوئی شہر کے چار چھ کونوں میں منعقد کی جانے والی اَدبی نشستوں میں کہانیاں سُنانے کی فرمائش۔

گرمی اور تھکن نے باقاعدہ نہ سہی بے قاعدہ بیمار تو بنا ہی دیا — مگر آپ ہیں کہ ہر ایک کا حکم بسروچشم بجا لا رہے ہیں۔ (میرا خیال ہے کہ اگر کوئی آپ سے غزل سُنانے کی فرمائش کرتا تو شاید آپ اُسے بھی پورا کر ہی دیتے —!!) کبھی شہر کے مغربی حصّے میں پائے جاتے ہیں تو کبھی مشرقی میں۔ اور کبھی یہ عالم کہ — "ہیں مگر نہیں ہیں —"!

لیکن کسی کو کسی بات کے لئے منع نہیں کرنے — کہ

"ہم کُفر جانتے ہیں دِل توڑنا کسی کا —" ▲

صبغۃ اللہ بمباٹؔ

میرے دل کے بینک کا اِک دم دِوالہ ہوگیا
تارے گِن کے آنکھ کھولا تو اُجالا ہوگیا

مُدتوں سے گھر کے کونے میں پڑا ہوں دیکھئے
مَیں تمہارے عشق میں مکڑی کا جالا ہوگیا

کیوں جفا کی سِل پہ تم نے پیس ڈالا میرا دل
قلبِ عاشق گویا بیگن کا مسالا ہوگیا

لیلیٰ مجنوںؔ کے ٹکٹ مَیں نے خریدے تھے "بلیک"
آپ کو ممّی کا ڈر، اور میرا گھوٹالا ہوگیا

عشق میں گُم ہوگیا ہے فرقِ محمود و ایاز
تھا جو کل ماما کا بھائی، آج سالا ہوگیا

دوست کی چِٹھی دیا تھا، مُفت میں مَیں پھنس گیا
کوٹلے کی، کی دلالی، ہاتھ کالا ہوگیا

عشق میں بمباٹؔ اُن کے نوکری بھی چھُٹ گئی
ٹھوکریں کھاکر جو سنبھلا، پان والا ہوگیا

غزلیں

شاہ فیاض عالم رقیبؔ

راشن کی اِک دُکان پہ لمبی قطار ہے
یاری کا اپنی کب سے اسے انتظار ہے

چہرہ ہے فق، نگاہ حزیں، دل ہے سوگوار
بکھرے ہوئے ہیں بال، اور دل پہ غبار ہے

قاسمؔ کو مَیں نے دیکھا تو صدمہ ہُوا بہت
ہونٹوں پہ اس کے آہ، نگہ میں شرار ہے

جاناں کا غم جو تھا تو سنورتا تھا وہ بہت
دیکھو جہاں بھی اس کو تو نخلِ بہار ہے

آٹے نمک کی فِکر نے اس کو کیا تباہ
جاناں کا غم نہیں، یہ غمِ روزگار ہے

مَیں نے کہا کہ آپ کا حُلیہ یہ کیوں بنا
کہنے لگے کہ گردشِ "لیل و نہار" ہے

اَن پڑھ بھونگیری

عقد اُن سے کرا دیئے خالو
میرا کُمپا ڈُبا دیئے خالو

دل میں تارے دکھا دیئے خالو
نَڑلا اب دبا دیئے خالو

ہیرو بننے کے شوق میں اب تو
لمبی ڈاڑھی مُنڈا دیئے خالو

جس کسی پہ بھی کی ہے نظرِ کرم
اُس کو چِکلے لگا دیئے خالو

دواخانے سے تار آیا ہے
"گول" دسواں بھنا دیئے خالو

الیکشن میں --- ابرار ساغر

الیکشن میں کھڑے ہوتے تو ہم جانے کہاں جاتے
بگڑتا اس طرح حلیہ کہ پہچانے کہاں جاتے

ہوس میں ممبری کی ناک کٹوانے کہاں جاتے
کھڑے ہو کر ضمانت ضبط کروانے کہاں جاتے

تمہارے کارنامے کیا ہیں جب یہ پوچھتے ووٹر
تو ہم غزلوں کی کاپی ان کو دکھلانے کہاں جاتے

جماعت ورکروں کی شاعروں پر مشتمل ہوتی
ہم ان کی شاعری جنتا کو سنوانے کہاں جاتے

کوئی ورکر جو ضد کرتا مجھے چھپوائیے پہلے
کلام اس کا لئے پرچوں میں چھپوانے کہاں جاتے

وہ ہوٹل بند ہے جس میں کریڈٹ اپنا چلتا تھا
ہم اپنے ورکروں کو چائے پلوانے کہاں جاتے

وہی ورکر اگر پولنگ کے دن روٹھ جاتے تو
ہم اپنی بے بسی کی لاش اٹھوانے کہاں جاتے

یہاں تو جیب خالی تھی، کوئی کیوں ہم نوا ہوتا
کرائے پر جلوس اپنا نکلوانے کہاں جاتے

یہ مانا گھر کے اندر ڈانٹ ہم سننے کے خوگر ہیں
الیکشن میں سر بازار پٹ جانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا خبط الیکشن دل سے تو نکلا!
حجامت ووٹروں سے اپنی بنوانے کہاں جاتے

الیکشن میں کھڑے ہوتے تو سروس چھوڑنا پڑتی!
میاں ابرار ساغر ٹھوکریں کھانے کہاں جاتے

غزل ——— فیاض افسوس

جو نہ ہونی چاہیئے تھی ہوگئی وہ مجھ سے بھول
جب کہا قاضی نے "کر" تو کر لیا میں نے قبول

اب کے فصلِ گُل میں کیسی ہوگئی قدرت سے بھول
پھول کے کانٹے بنے اور بن گئے کانٹوں کے پھول

اہلِ دانش تو خلا میں جا رہے ہیں آج کل!
ایک ہم کہ ناپتے ہیں بس تری زلفوں کا طول

اس قدر ہے دیش کی آب و ہوا بگڑی ہوئی
آم کی گٹھلی لگائیں تو نکلتی ہے ببول!

سارے گیدڑ شہر کی جانب روانہ ہوگئے
تیرے وحشی نے اڑائی اس قدر صحرا میں دھول

وہ جواں تھے جب اگر کہتے تو ہم بھی مانتے
پیار کو کہنے لگے پیری میں اب کارِ فضول

میں تو اب فیاض خاں افسوس ہی افسوس ہوں
اس قدر ان کے تغافل نے کیا مجھ کو ملول

غزل ——— محبوب مانجھوی

بے نقط نہ یوں سناؤ، غزل کہہ رہا
بیگم! نہ کان کھاؤ، غزل کہہ رہا

آنکھیں نہ یوں دکھاؤ، غزل کہہ رہا
لِلّٰہ مان جاؤ، غزل کہہ رہا

کمبخت رو رہا ہے گلا پھاڑ
منّے کو چپ کراؤ، غزل کہہ ر

نازک خیالیوں کا مری خون
بچّو! نہ غل مچاؤ، غزل کہہ ر

ملنے جو مجھ سے کوئی اگر آئے
دروازے سے بھگاؤ، غزل کہہ

بیگم! تمہارے چونچلے مجھ کو نہیں
میری نہ جان کھاؤ، غزل کہہ ر

محبوب، میرا بھیجہ بہت کھا چکے ہو تم
اب تو یہاں سے جاؤ، غزل کہہ رہا ہوں میں

پرویز یداللہ مہدی قسط (۱۲)

چہ خوب...

ایک شیرنی سے پہلی مرتبہ بات چیت کرتے وقت "شیرنی ....؟" شبو نے متحیر لہجے میں کہا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اس کھنکتی ہوئی کھلکھلاہٹ پر ادھر دل میں عجیب سی گدگداہٹ ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے حسین ہونٹوں کے فوارے سے نکل کر مسکراہٹ کے موتی دل کی زرخیز زمین میں جذب ہو رہے ہوں۔ دل کی پیاسی زمین کو کسی قدر سیراب کرنے کے بعد شبو نے لفظوں کے بیج اُگانے شروع کئے ——— "میں نے شیرنی نہیں بلکہ لڑکی کہا تھا لڑکی"

ایک لڑکی سے پہلی مرتبہ گفتگو .....

"میرا مطلب وہی تھا' زبان شاید پھسل گئی ـــ"

ہم نے شبو کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اپنی زبان کا ہل چلانا شروع کر دیا ——— ایک لڑکی سے پہلی مرتبہ گفتگو کرتے وقت ویسے تو بہت ساری باتوں کا خیال رکھنا ازبس ضروری ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے ساتھ کوئی پالتو چیز از قسم کتّا وغیرہ تو نہیں ہے۔ جب اس طرف سے اطمینان ہو جائے تو پھر اس کے پیروں پر اچٹتی سی نظر ڈال کر سینڈل کی "ہیل" اس کی نوک اور اس کی مضبوطی کا اندازہ لگا لینا چاہیئے پھر اس کے بعد بہ نظر غائر اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ اس کے دستِ نازک میں کوئی زبردست وزنی چیز از قسم چھڑی' چھتری! ... [illegible] اطمینان ہو جائے

تو پھر نظریں جھکا کر ———

"ذرا اپنا سر اوپر اٹھا کر کہیئے ——— شبو نے ٹوکا ———

"جی ہاں اپنا سر اُٹھا کر ——— میرا مطلب ہے جھکا کر یعنی کہ نظریں جھکا کر سر اُٹھا کر کوئی ہلکی پھلکی بات چھیڑنی چاہیئے ——— ہم اپنی دقیق گڑبڑاہٹ پر قابو پانے کے لئے لمحہ بھر کو رُک گئے اور پھر دوبارہ شروع ہوئے

"پہلے پہل' موسم پر تبادلۂ خیال لڑکی کی صحت اور لڑکے کی عاقبت دونوں کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے البتہ اس سلسلہ میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے کہ موسم کی تعریف کم سے کم اور لڑکی کی تعریف زیادہ سے زیادہ ہو۔ لیکن کبھی کبھار موسم کی تعریف کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ جیسے آج موسم بڑا سہانا ہے۔ ایسے موسم میں شفتالو کی کاشت بڑی اچھی ہوتی ہے ——— شفتالو کے ذکر پر لڑکی کی آنکھوں میں دُور تک جھانکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جیسے اس کی آنکھیں نہ ہوں شفتالو ہوں ——— ! شفتالو کے ذکر پر شبو کی دبی دبی مسکراہٹ کھنکتی ہنسی میں بدل گئی۔ اور ادھر دل کی زمین پر پھر سے خواہشات کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ جنہیں تھپکیاں دے کر ہم نے بات آگے بڑھائی ———

اور اگر بدقسمتی سے موسم اپنی بے ہدایتی کی وجہ سے تعریف و استعمال کرنے کے قابل نہ ہو تو حالات حاضرہ پر

سود مند ثابت ہوتا ہے۔ لیکن تبصرہ عموماً حالاتِ حاضرہ کے بجائے حالاتِ غیر حاضرہ پر ہونا چاہیئے اس سے گرفت میں آئے بغیر لڑکی پر اپنی یعنی لڑکے کی علمیت کی دھاک اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ پھر زندگی بھر نہیں اٹھتی ——
دراگر فرض کیجئے کہ وقت پر حالاتِ حاضرہ وغیرہ حاضرہ یاد نہ آئیں تو سنسنی خیز واقعات از قسم اخباری پر بحث کرنے سے لڑکی پر لڑکے کی معلومات کا سکہ جم جاتا ہے اور وہ اُسے فوراً اپنے گھر کا پتہ بتا دیتی ہے ——

"بطور نمونے کے کوئی سنسنی خیز واقعہ بھی سُنا دیجیئے لگے ہاتھوں —— شبّو نے خاموشی سے ہماری بکواس سُننے سُننے اچانک ایک اڑنگا لگایا۔ اور ہم منھ کے بل گرتے گرتے بچے —— فوراً ہی ذہن میں ایک تازہ ترین سنسنی خیز اخباری قسم کا واقعہ گڑھا اور پھر کسی فلمی کہانی نویس کی طرح سُنانے لگے۔

"آج کی سب سے اہم خبر سُنی تم نے، چوک مرغاں کے گمنڈ گھر سے عین دوپہر کے وقت کسی نے گھڑی چرالی ... اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی یعنی گھڑی منہ کھولنے سے غائب اور خالی گھر سلامت ——

"واقعہ تو ٹھیک ٹھاک ہے لیکن اتنا سنسنی خیز نہیں —— " شبّو نے کسی قدر بے لاگ انداز میں تبصرہ فرمایا —— پھر آگے بولیں —— جب تک کہ مار پیٹ کا ذکر نہ ہو کوئی خبر سنسنی خیز نہیں بنتی —— ارے ہاں مجھ آپ ہی سے تھوکنا ہوں، اس مار پیٹ پر یاد آیا خان فولادی آپ سے ایک دوستانہ فری اسٹائل مقابلے کے خواہش مند ہیں۔

"جی —— ی —— ی —— " بدحواسی کے عالم میں ہم کرسی سے اس طرح اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اچانک کرسی میں برقی رو جاگ اٹھی ہو۔ ہماری اس بوکھلاہٹ پر شبّو بھی گڑبڑا کر کھڑی ہو گئیں ... "کیا ہوا ——"

"جی —— وہ —— کرسی —— !!"

"کیا ہوا کرسی کو —— ؟"

"کرسی —— کچھ نہیں، کرسی کو کچھ نہیں ہوا" ہم نے بوکھلائی ہوئی نظروں سے کرسی کی طرف دیکھا اور پھر جس تیزی سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اُسی تیزی سے دوڑنے لگے —— جی نہیں بلکہ دوبارہ پورے وزن کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہماری اس حرکت نے شبّو کو بھی غالباً بوکھلا دیا تھا وہ بھی اُسی پھرتی سے کرسی پر بیٹھ گئیں (ہماری نہیں اپنی کرسی پر) اور سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا —— "یہ اچانک آپ کو ہو کیا گیا ——

"جی وہ دراصل —— فری اسٹائل مقابلے کے ذکر پر، رگ اور پٹھوں میں ایک بجلی سی دوڑ گئی —— ہم چونکہ کسی حد تک اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا چکے تھے اس لئے بڑا کامیاب بہانہ سوجھ گیا۔ ایک زمانہ ہو گیا واقعی کسی ہم پلہ چیمپئن قسم کے مکّے باز سے مقابلہ کئے ہوئے۔ غالباً یہی دلی خوشی کا احساس جس نے ہمیں خوشی سے بے قابو کر دیا ——

جی ہاں —— ! —— ہماری زبانِ مبارک سے گویا خوشی کے پھول جھڑ رہے تھے، شگوفے پھوٹ رہے تھے مگر اندر ہی اندر دلِ بیمار، خون کے آنسو رو رہا تھا۔ خان فولادی کی آہنی گرفت کا مضبوط احساس دل و دماغ پر اس قدر حاوی ہو گیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے حدِ نظر تک سینکڑوں "فولادی مکّے" لہرانے لگے۔ یہاں تک کہ شبّو کا حسین چہرہ بھی "فولادی مکّے" میں تبدیل ہو گیا

....

وہ تو اپنے فرشتے خواب آور گولیاں کھا کر نہیں سوئے تھے۔ جو خان فولادی عرف طوطا پری کا بھرپور فولادی مکّہ صرف اچٹتا ہوا ہی ہمارے جبڑے پر پڑا۔ ورنہ اگر کہیں یہ اچٹتا ہوا فولادی مکّا راست ہمارے جبڑہ شریف پر پڑتا تو پھر آنکھوں کے آگے جتنے تارے ٹوٹے اُن سے کہیں زیادہ "دندان شریف" ریزوں کی شکل میں ہمارے دہن مبارک سے نکل کر دہن مبارک، یعنی "رِنگ" میں بکھرے ہوئے نظر آتے —— !

فری اسٹائل مکہ بازی کا یہ "رنگ" ہمارے حق میں میدانِ حشر کے پاکٹ ایڈیشن سے کم نہیں تھا۔ قیامت کبریٰ کا تو خیر ایک دن معین ہے چاہے نیند آئے یا نہ آئے لیکن قیامت صغریٰ جو عرف عام میں شامت کہلاتی ہے جب جی چاہے ،بیوی، بچوں ساس، سسر، سالے، سالیوں کے روپ میں نازل ہوکر اچھے بھلے آدمی کا قافیہ اسقدر تنگ کرتی ہے کہ وہ بالآخر "بحر" سے خارج ہوجاتا ہے ـــــ اور ہماری شامت کسی 'سسرالی' شکل میں نمودار ہونے کی بجائے 'فولادی' روپ میں ہم پر نازل ہوئی تھی! ہماری لرزتی، کانپتی، کپکپاتی نظروں کے سامنے خان فولادی، عرف طوطی پری اپنے دونوں فولادی مکے ہوا میں لہراتا ہوا اپنی فولادی ٹانگوں پر اس طرح تھرک رہا تھا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوں۔ جب کہ ہم اس کے ایک ہی گھونسے کی اچٹتی سی زد میں آکر 'رنگ' کی رسی پر کسی مرے ہوئے چوہے کی طرح جھول رہے تھے۔ ادھر طوطی پری کے پہلے ہی گھونسے کے اس کمال پر اس کے حمایتیوں نے کلب کے اس حصّے کو تالیوں اور سیٹیوں کے شور سے سر پر اٹھا لیا۔ جیسے عارضی طور پر رسیوں کی مدد سے گھیرا ڈال کر فری اسٹائل کشتیوں کے اکھاڑے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

ہم نے رسّی پر جھولتے جھولتے ہی تماشہ بینوں کے ہجوم پر اس خیال سے نظر ڈالی کہ شاید ایک آدھ اللہ کے بندے کی آنکھوں میں ہمارے زخمی وجود کے لئے ہمدردی یا رحم کا جذبہ نظر آجائے لیکن تماش بینوں کے اس ہجوم میں سب طاقتور کے حمایتی نظر آئے۔ یہاں تک کہ شستو بھی اُسی کی طرفدار نظر آئیں۔ سچ ہے جس کی لاٹھی بھینس اسی کی۔

ادھر ایک عدد جنگلی بھینسا طوطی پری کے روپ میں ہمیں ایک اور پچھاڑ لگانے کے لئے [illegible] لیٹے لیٹے ہی راہ فرار تلاش کر رہے تھے ـــــ اچانک پتہ نہیں طوطی پری کو کیا سوجھی کہ دوسرے سرے سے رسی کو پوری قوت سے جھلانے لگا نتیجہ میں ہم اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے۔ اور ایک جھٹکے میں ہاتھوں کے بل فرش پر آرہے۔ اس وقت ہمیں ہاتھوں کے صحیح مصرف اور اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اگر انسان کو قدرت نے ہاتھوں جیسی غیر مترقبہ نعمت سے نہ نوازا ہوتا تو اسی وقت ہمارے "روئے مبارک" کی ایسی مٹی پلید ہوتی کہ پھر کسی کو دکھانے کے لائق نہیں رہتا ـــــ ویسے ہماری تباہی کے پورے پورے آثار نظر آتے تھے۔ کیونکہ ہم ابھی اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کسی طفل شیر خوار کی طرح ہی بیٹھے ہوئے تھے کہ طوطی پری کسی مست گینڈے کی طرح پھر ہمارے سر پہ پہنچ گیا۔ اس کے تھرکتے ہوئے پاؤں ہمارے ہاتھوں کے اس قدر قریب تھے کہ یکبارگی یہ خیال ہمارے ذہن میں لہرا گیا کہ فوراً اس کے پاؤں میں گر کر گڑگڑا کر معافی مانگ لیں۔ بلکہ اس کی آٹھ دس پشتوں کے نام اپنی آٹھ دس پشتوں کی طرف سے غلامی کا پٹہ لکھ کر اس کے حوالے کر دیں ـــــ ادھر تماش بینوں نے غالباً ہمیں زمین چاٹتا ہوا محسوس کر کے پھر سے شور مچانا شروع کر دیا۔ طوطی پری کا سینہ غالباً فخر سے اس بار پھول گیا کہ وہ ہمیں واقعی طفل شیر خوار سمجھ کر اپنی گود میں اٹھانے کے لئے ہماری طرف جھکا ہی تھا کہ ہم اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کو "انڈیا گیٹ" سمجھ کر اس پھرتی سے ادھر ادھر نکل گئے کہ طوطی پری اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور اپنے ہی جھونک میں منھ کے بل فرش پر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر پڑا ـــــ اُسے فرش پر منھ کے بل لمبا لمبا لیٹا ہوا دیکھ کر ہماری کانپتی ٹانگوں میں پتہ نہیں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ ہم کسی فولادی کھمبے کی طرح ایکدم سیدھے کھڑے ہو گئے ـــــ اس بار لوگوں نے پھر خوب شور مچایا اور اس بار یہ شور ظاہر ہے ہماری تائید میں تھا ـــــ اور ظاہر ہے اس بار ہمارے

سینے کی فخر سے پھولنے کی باری تھی اور ایسے سنہری موقع کا دوبارہ ہمارے ہاتھ لگنا ناممکنات میں سے تھا۔ اس لئے اپنے سکڑے ہوئے سینے کو ہم نے اپنی استطاعت سے زیادہ پھلا اور پھیلا کر تماش بینوں کے ہجوم کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ ہر شخص ہمیں اپنی طرف ستائشی نظروں سے دیکھتا محسوس ہوا۔ سوائے شبّو کے۔۔۔ شبّو کی آنکھوں میں ہمیں کوئی رنگ۔ نظر نہیں آیا ستائش کا۔۔۔ نہ ہمّت افزائی کا۔۔۔ بلکہ اُلٹا یوں محسوس ہوا جیسے ہماری اس اتفاقی اور لمحاتی کامیابی سے انہیں زک ہی پہنچی ہے۔۔۔ اس احساس نے ہمیں شاید کچھ لمحوں کے لیئے طوطا پری کی طرف سے کسی قدر غافل کر دیا۔ بس ہماری اس غفلت سے فائدہ اُٹھا کر طوطا پری نہ صرف یہ کہ اُٹھ کھڑا ہوا بلکہ ہم پر چڑھ دوڑا۔ اس اچانک اور غیر متوقع حملے نے ہمیں سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔ نتیجۃً طوطا پری کا ایک فولادی مکّہ اپنی تمام تر قوت کے ساتھ ہمارے "پاپی پیٹ" سے ٹکرایا۔ یوں لگا جیسے پیٹ کے الاؤ میں شعلوں کا رقص شروع ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے وجود کے تمام تر مقامات آہ و فغاں سے پیٹ کے اندر بھڑکتے ہوئے ان شعلوں کی لپیٹیں نکلنے لگیں۔۔۔ طوطا پری کے اس بھرپور اور کامیاب وار نے ہمیں کافی دور تک پیچھے دھکیل دیا تھا۔ لیکن اس بار نہ تو ہم زمین ہی چاٹنے پر مجبور ہوئے تھے نہ ہی اپنے گھٹنے ٹیکے تھے۔ زندگی میں شاید پہلی مرتبہ اپنی قوت برداشت کا صحیح اندازہ ہوا۔ اگرچہ کہ طوطا پری کے بجلی کی طرح ٹوٹ پڑنے والے فولادی مکّہ نے ہمارے تن بدن میں آگ سی لگا دی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہماری قوت برداشت نے جس نئے حوصلے نئے عزم سے ہمیں روشناس کرایا تھا۔ اُس نے ہمیں خود کو مشہور عالم مکّے باز محمد علی دی گریٹ سمجھنے پر مجبور کر دیا۔۔۔ پھر کیا تھا ہم آنکھیں موند کر اُس بپھرے ہوئے سانڈ کے روبرو پہنچ گئے۔ اور قبل اس کے کہ ہمارا تیز رفتار مکّہ اُس کے پیٹ تک پہنچتا اس بار دوسری قیامت ہم پر ٹوٹ پڑی۔ ایک بجلی جبڑے پر گری اور دوسری پیٹ پر عین اسی جگہ جہاں ابھی کچھ لمحے پہلے گھمسان کا رن پڑ چکا تھا۔ اس دہرے وار نے ہمیں چاروں شانے چت کر دیا۔ فرش سے ٹکراتے ہی ہمارا، تصوّر بھی عرش سے کسی بے رنگ لفافے کی طرح نہ صرف یہ کہ لوٹ آیا، بلکہ چور چور ہو گیا۔ ایک "رنگروٹ" خود کو محمد علی دی گریٹ سمجھنے چلا تھا۔

فرش پر لمبے لیٹے ہوئے ہم نے سوچا کہ صرف ایک آدھ گھونسہ برداشت کر لینے سے چوہا، ہاتھی نہیں ہو جاتا چوہا ہی رہتا ہے۔۔۔ ادھر تماش بینوں نے یقیناً سارے اکھاڑے کو سر پر اُٹھا لیا ہو گا۔ لیکن ہمیں واقعی کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہماری ایک ایک حِس، بے حس ہو کر معطل ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ ریفری مہاشے جو ایک گھٹنے کے بل بیٹھے، شاید ہماری ہار اور طوطا پری کی جیت پر مُہر ثبت کرنے کے لئے نہ صرف زبان سے گنتی گن رہے تھے بلکہ انگلی کے اشارے سے تعداد بھی بتاتے جا رہے تھے۔ لیکن ہمیں نہ تو کچھ سنائی دے رہا تھا نہ سجھائی دے رہا تھا۔۔۔ البتہ دور کہیں شعور و لاشعور کی حدوں سے بھی پرے یہ احساس لمحہ بہ لمحہ پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ جیت کا سہرا صرف طوطا پری کے سر کے لئے ہی مختص ہے۔۔۔ اب تک اپنی زبان کے جوہر دکھا کر ہم نے کئی مورچے فتح کئے تھے۔ کئی بازیاں ماری تھیں لیکن افسوس ایک ہی جھٹکے میں ہماری تمام جیتی ہوئی بازیاں طوطا پری مار لینے والا تھا۔۔۔ اُس نے ہمیں ایسے ہاتھ دکھائے تھے کہ ہم اپنی ساری ہیکڑیاں بھول چکے تھے۔ بے زبانی کا یہ عالم تھا کہ کسی سے داد، فریاد بھی کرنے کے موقف میں نہیں تھے۔ اور پھر داد فریاد کرتے بھی تو کس سے اور کیوں کر جبکہ خود اپنی زبانِ ناہنجار سے کہا تھا کہ آ بیل مجھے مار۔۔۔ ویسے اس مسٹنڈے بیل سے ہمیں بھڑوانے میں، شبّو کا بھی تھوڑا بہت ہاتھ تھا۔ بلکہ ایک عمداً نکّی یقیناً شامل تھی جس کی مدد سے شبّو نے اس

بیل کی رسّی کھولی تھی۔ طوطا پری کے ہاتھوں اپنی اس
شکست، بلکہ شکستِ فاش کے بعد اب ہمارے لئے
رسّیاں توڑ کر بھاگنے کے سوا کوئی اور راستہ نظر
نہیں آیا تھا ـــــ اور یہاں سے نو دو گیارہ ہونے
کے لئے ہمارا اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ضروری تھا۔
چنانچہ اپنی رہی سہی، بچی کھچی تمام تر ہمّت یکجا کر کے ہم
اٹھ کھڑے ہوئے، ہمارا دوبارہ اٹھنا تھا کہ مجمع نے
سیٹیاں اور تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ جس کے
نتیجے میں اس سے پہلے کہ ہم شرم سے گردن جھکاتے
طوطا پری کو جھلّا کر مکّے لہراتا ہوا پوری قوت سے اپنی
طرف بڑھتا دیکھ کر ہم فوراً ریفری کے پیچھے چھپ گئے
طوطا پری کی جھلّاہٹ اس بات کی کھلی دلیل تھی کہ جیت
کا سہرا اس کے سر تک پہنچ کر بکھر گیا ہے۔ یعنے
ریفری نے ابھی پورے دس تک گنتی نہیں گنی تھی کہ
ہم اٹھ کھڑے ہوئے ـــــ لوگوں کی سیٹیوں اور تالیوں
کا سبب بھی دراصل یہی بات تھی۔ ان کے حساب سے
طوطا پری کے میدان مارنے سے پہلے ہی ہم دوبارہ
کسی مردِ میدان کی طرح میدان میں کود پڑے تھے۔
حالانکہ ہمارا خدا گواہ ہے ہم تو جان بچی سو لاکھوں پائے
لوٹ کے بدھو گھر کو آئے کہتے ہوئے یہاں سے
رفوچکر ہونے کی غرض سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
ادھر طوطا پری اپنی جھلّاہٹ میں ریفری کو لئے ہوئے
جیسے ہی ڈھیر ہوا، ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔
نتیجتہً اس کی جھلّاہٹ انتہا کو پہنچ گئی۔ جس کا ہم نے
پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ یعنے دوبارہ اس نے جیسے ہی
ہم پر حملہ کیا ہم پھر ریفری کی اوٹ میں ہو گئے۔ چوہے
بلی کا یہ کھیل کچھ دیر اور جاری رہا۔ جس سے ہمیں یہ فائدہ
ہوا کہ اپنی بے ترتیب سانسوں کو قابو میں لانے
کا موقع مل گیا۔ دوسرے طوطا پری بہت زیادہ اچھل
کود کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ ہانپنے لگا۔ لیکن
وہ جو کہتے ہیں کہ چوہا لاکھ پھرتیلا، لاکھ ہشیار سہی مگر
بلی کے گلے میں گھنٹی اس کے فرشتے بھی نہیں باندھ

بالآخر طوطا پری کی زد میں آ ہی گئے۔ لیکن اس وقت شاید
اپنے بخت اچھے تھے ـــــ وقت ہم پر مہربان تھا۔
جو اس کے حملے سے بال بال بچ گئے۔ بلکہ کامیابی
سے جوابی کارروائی بھی کر ڈالی۔ ہم چونکہ اس گدھے کو
اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر پہلے ہی سمت کا اندازہ کر چکے
تھے۔ اور اتفاق سے ہمارا یہ اندازہ درست بھی نکلا۔
اس لئے جھکائی دے کر نہ صرف یہ کہ حریف کا وار خالی دیا
بلکہ اندھی چوٹ کے طور پر ہمارا ہاتھ جو چلا تو اگلے ہی پل
طوطا پری اس طرح زمین پر سے اچھلا جیسے آدمی نہیں ربڑ
کی گیند ہو۔ ہمارے اس اچانک اور غیر متوقع کمال پر،
نہ صرف سامنے ناظرین بلکہ ہم خود بھی حیران تھے۔ البتہ
تماشائیوں کی حیرت، جلد ہی مسرّت میں تبدیل ہو گئی ـــــ
شاید بہتوں نے اسے ہمارا کوئی مخصوص داؤ پا کر تب سمجھا
ہوگا۔ چنانچہ تالیاں بجا بجا کر ہمیں مکرّر اس داؤ کو آزمانے
کو کہہ رہے تھے۔ بلکہ ورغلا رہے تھے۔ ادھر ہماری حیرت
جوں کی توں برقرار تھی۔ وہ کون سا داؤ تھا۔ آخر کیسی
حرکت تھی۔ جس کی بناء پر طوطا پری کسی غبارے کی طرح
ہوا میں اچھلا تھا ـــــ اس سے پہلے کہ ہم اپنے اس
ان سمجھے داؤ کی تہہ تک پہنچتے طوطا پری نے اس مرتبہ
کسی بپھرے ہوئے چیتے کی طرح ہم پر جست لگائی نتیجے
میں بچتے بچتے بھی ہم اس کے فولادی مکّے کی اچٹتی سی زد
میں آ گئے۔ البتہ اس کے داہنے مکّے کا وار پوری طرح خالی
گیا۔ اس وقت تک ہم اپنے داہنے گھٹنے کے بل
بیٹھ چکے تھے۔ اور بیٹھتے ہوئے غیر ارادی طور پر ہم پھر
وہی پچھلا داؤ بھی آزما چکے تھے۔ اس مرتبہ شاید وار کچھ
زیادہ ہی شدید تھا کیونکہ اس مرتبہ وہ اس زور سے
اچھلا کر دوبارہ فرش کے بجائے رسّی پر کسی مردہ چمگادڑ
کی طرح جھولتا نظر آیا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ پھر ایک بار
گونج اٹھی ـــــ اس مرتبہ ہمیں وہ داؤ بھی سمجھ میں آ گیا
جو بے خیالی میں ہم لگاتار دو مرتبہ آزما چکے تھے۔ دراصل
اس کا وار خالی دے کر گھٹنے کے بل بیٹھنے کے بعد ہمارا
ہاتھ اس کے پیٹ یا سینے کے بجائے کمر اور پسلیوں کو

اس کی کمر کے مخصوص حصّے کو چھو جانا کسی بجلی کے تار کے چھو جانے کے برابر ثابت ہوا تھا، اور وہ اپنے ہی زور میں گیند کی طرح اچھل گیا تھا۔ اب بات ایک دم صاف ہو گئی تھی۔ طوطا پری دراصل گدگدیاں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ گدگدیاں بعض لوگوں کی کمزوری ہوتی ہیں۔ پہاڑ جیسی جسامت ہو گی لیکن کسی نے انچ بھر کی انگلی دکھائی نہیں کہ سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں، انتڑیاں بل کھانے لگیں نتھنے پھڑکنے اور ہونٹ تھرکنے لگے ـــ بعض اشخاص کے حق میں تو سنا ہے کہ گدگدیاں لا علاج مرض کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور یہ ہماری خوش بختی تھی کہ طوطا پری کا شمار بھی ایسے ہی عجوبۂ روزگار گدگدیوں کا شکار نمونوں میں ہوتا تھا ـــ پھر کیا تھا۔ جو احساس طوطا پری کی کمزوری کا باعث ثابت ہوا وہی ہمارے لئے نفسیاتی طور پر، شہ زوری کا باعث بن گیا ویسے اسی دوران اس کے دو چار فولادی مکّوں کی زد میں آکر ہم بھی اپنے اصلی دم خم کا اندازہ لگا چکے تھے۔ اس لئے تھوڑی سی احتیاط اور خاصی بے جگری کے ساتھ طوطا پری پر اس طرح پل

پڑے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری بساط ہی الٹ گئی یعنی پہلے تو اسے حملہ کرنے پر اُکساتے اور جب وہ جھلّا کر وار کرتا تو جھکائی دے کر اس کی کمر کے مخصوص حصّہ کو اپنی انگلیوں سے چھو جاتے اور وہ کسی گیند کی طرح اُچھل پڑتا ـــ آخر میں تو یہ عالم ہو گیا کہ جیسے ہی وہ مکّہ تان کر دانت پیستا ہوا آگے بڑھتا۔ ہم اپنا ہاتھ آگے تو مکّے کی شکل میں بڑھاتے لیکن اس کے قریب پہنچتے ہی ریفری کی نظر بچا کر جو اتفاق سے عینک زدہ تھے۔ جس کے شیشے کافی حد تک ہیبت زدہ تھے۔ اپنے ہاتھ کی انگلیاں پوری طرح کھول دیتے اور پھر شہادت کی انگلی نچانے لگتے جسے دیکھ کر طوطا پری اچھل کر دور ہٹ جاتا۔

تقریباً بیس منٹ تک یہ کھیل چلتا رہا۔ پھر ریفری نے مجبور ہو کر ہار جیت کا فیصلہ کئے بغیر اختتام کا اعلان کر دیا۔ یہ چونکہ باضابطہ قسم کا مقابلہ نہیں تھا۔ اس لئے ایک ہی راونڈ میں اسکے خاتمہ پر تماش بینوں نے کوئی احتجاج نہیں کیا بلکہ ایک ہی راونڈ میں اس مقابلے نے انہیں اسقدر لطف اندوز کیا تھا کہ اختتام کا اعلان ہوتے ہی سب کے سب رِنگ کی طرف دوڑے اور پھر طوطا پری کے چند حامیوں نے اُسے گھیر لیا اور باقی تمام تماش بینوں نے مبارکباد دینے کے بہانے ہماری پیٹھ کو فوجی بیانڈ سمجھ کر ٹھوک بجا رکھدیا ـــ !!!

باقی آئندہ

رجسٹریشن آف نیوز پیپرز (سنٹرل) رولز ۱۹۵۶ء کی دفعہ ۸ کے مطابق شگوفہ (ماہنامہ) کی ملکیت اور دیگر باتوں کی تفصیلات

فارم (۴)

اڈیٹر، پرنٹر، پبلشر۔ سید مصطفٰے کمال قومیت: ہندوستانی

حصہ دار: قیصر؛ پتہ ۲۔۸۔۶۔۱۷ دبیر پورہ۔ حیدرآباد ۲۴

مالک؛ پتہ: ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱

مقام اشاعت: ۳۱۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد

وقفۂ اشاعت: ماہانہ

مَیں سید مصطفٰے کمال ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میری دانست میں صحیح ہیں۔

دستخط: سید مصطفٰے کمال

خرافات

★ مراسلات

○ علی سے آپ نے سنا ہوگا کہ (Cardiac Ischaemia) کے سلسلے میں میں دواخانہ میں شریک رہا۔ لیکن خدا کے فضل اور آپ جیسے دوستوں کی دعاؤں سے اب ٹھیک ہوں۔ سالنامہ شاندار ہے۔ جج پر اِس انداز سے لکھے گئے مضمون کو میں پسند نہیں کرتا۔

خواجہ عبدالغفور، بمبئی

○ آج ابھی ابھی جب "شگوفہ" کا فروری کا شمارہ ملا۔ تو یاد آیا کہ ابھی تک آپ کے خط کا جواب اور جنوری کے شمارے کی رسید بھی نہیں دے سکا۔ معروفیت حد سے زیادہ تھی۔ اسلئے امید ہے معاف فرمادیں گے۔ دراصل "فلمی دنیا" عجیب و غریب دنیا ہے یہاں یا تو کام ملتا نہیں۔ یا پھر اتنا ملتا ہے کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور خدا کے فضل سے میں اسوقت دوسرے زمرے میں ہوں۔ اِس سال میں "لگام" اور "پاپی" ریلیز ہو چکی ہیں۔ اسی سال میں سات آٹھ فلمیں اور ریلیز ہو جائیں گی۔ جنوری کا شمارہ بھی ابھی تک پوری طور پر پڑھ نہیں پایا۔ اسلئے ابھی اپنی رائے دوسرے وقت پر اُٹھا رکھتا ہوں۔ لیکن دعاگو ہوں کہ خدا "شگوفہ" کی عمر چاند ستاروں سے بھی لمبی کرے اور یوں ہی شگوفے کھلاتا رہے۔

نیاز گیش

کلونت سنگھ جانی۔ بمبئی

○ میں شگوفہ کرکٹ ٹیم میں شامل ہو کر ایک لمبی چوڑی اننگ کھیلنے کا مُشتاق تھا یعنی کرکٹ پر مضمون لکھنے والا تھا، لیکن آپ کی ٹیم کے فاسٹ بولر سید نصرت نے ایک QUICK گیند پھینک کر مجھے کلین بولڈ کردیا۔ لیکن میں نصرت صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے ریڈرس اینڈ رائٹرس کمبائنڈ الیون کے مقابل بہت ہی شاندار بولنگ کی۔ شگوفہ کرکٹ کلب کے تمام میچوں میں پرویز یداللہ مہدی کی Long Innings بہت ہی شاندار رہیں وہ ہر مرتبہ ناٹ آؤٹ ہی رہے خوب! حیدرآباد طنز و مزاح گراؤنڈ پر آپ بہت ہی بہترین کھیل کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مبارک ہو!

حامد اقبال صدیقی۔ بمبئی

○ سالنامہ واقعی توقعات سے کہیں زیادہ شاندار ہے۔ بھانت بھانت کے دیدہ زیب اور فکر انگیز گل بوٹوں کو یکجا کر دینا آپ ہی کا کام ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ چمنستانِ ادب کے ایک ماہرِ فن باغبان ہیں۔ دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

ارے ہاں! میری غزل کے چھٹے اور ساتویں شعروں میں کتابت کی غلطی ہو گئی ہے۔ اصل اشعار یوں تھے۔

بزدلی کا طعنہ میری بڑ دباری کو نہ دو
ورنہ کر بیٹھوں گا میں بھی داراں دی لانگ رن

شادی رحمت ہی نہیں ہے، دوستو زحمت بھی ہے
ایک سے دو، دو سے ہو گئے چاراں دی لانگ رن

طنز چکد نیوی

○ "شگوفہ" دیکھا، بہت خوب ہے احمد جمال پاشا اور نظر برنی شاندار رہے۔

بھتیا! بمبئی آیئے تو ملئے ضرور۔ آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ بڑی مسرت ہوئی شگوفہ کے "ڈرامہ نمبر" کا اعلان سن کر۔

والسلام

نظام الدین نظام۔ بمبئی

○ سالنامہ بے حد خوبصورت اور دیدہ زیب ہے

"منظوم رپورتاژ" کی اشاعت پر ہدیۂ تشکر قبول فرمائیے اس سلسلے میں کئی خطوط وصول ہوئے۔ جس میں مجھے مبارکباد پیش کی گئی ہے۔

خالد رحیم، کٹک

○ خوبصورت سالنامے کے لئے مبارک باد۔

فیاض افسوس، اکولہ

○ جناب کرشن چندر، جو ہمارے "شگوفہ" کی مجلس مشاورت کے رکن بھی تھے، کی وفات حسرت آیات پر دلی صدمہ ہے۔

رام لعل نابھوی (پنجاب)

○ شگوفہ کا سالنامہ پسند آیا۔ پٹنہ کے جشن کی منظوم رپورٹ بھی پسند آئی۔

مقرب حسین، رتلام

○ حیدرآباد کے دوران قیام آپ نے ایک محفل ترتیب دے کر ایک خوشگوار شام گزارنے کا موقع عطا فرمایا۔ بیگم ممتاز صاحب اور دہلوی صاحب کا پروگرام پہلی مرتبہ شاید بڑے سے نکلے ہوئے فنکار ہیں خدا انھیں ان کے فن میں مزید ترقی عطا فرمائیے ۔۔۔ ساگر سرحدی جیسے مشہور ادیب سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ توقع ہے کہ شگوفہ کا ڈرامہ نمبر بہت جلد منظر عام پر آجائیگا

فیض الرحمن۔ کرناٹک

○ سالنامہ نظر نواز ہوا۔ معنوی اور صوری دونوں حالتوں میں شگوفہ نے کھلا رہا ہے۔ امید ہے کہ ڈرامہ نمبر بھی طنز اور مزاح کی تمام خوبیوں کے ساتھ شائع ہوگا۔

احمد محی الدین۔ حیدرآباد

○ شگوفہ فروری ۱۹۷۸ء ملا۔ جو اتنا نمکین تھا کہ ایک بار کتب فروش کے یہاں اور کئی بار گھر میں چاٹنے کے باوجود دل نہیں بھرا۔ اتنا خوب صورت اور نمکین پرچہ نکالنے کا شکریہ۔ اس شمارے میں جناب خالد رحیم کا خاکہ۔ اور رئیس بانکے اور انجم مانپوری کی غزل یوسف ناظم کا رپورتاژ "جشن ظرافت (پٹنہ)" بہت پسند آئے۔ خدائے تعالیٰ سے دعا ہے وہ اس پرچہ کو دن دس گنی رات بیس گنی ترقی دے۔ آمین

جاوید علی، نانڈیڑ (مہاراشٹرا)۔

○ کل جب آفس جانے کے لئے گھر سے ریلوے اسٹیشن پہنچا تو خود بخود بک اسٹال کی طرف پیر چلا گیا۔ (کیوں نہ جاتے ماہ کا پہلا ہفتہ جو ٹھہرا) وہاں کئی کتابیں کھنگالنے کے بعد فروری کا شگوفہ ہاتھ لگا سرورق اتنا خوبصورت تھا کہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ اچانک ٹرین کی سیٹی نے میرے خیالوں کو درہم برہم کر دیا۔ اور ٹرین میں جب بیٹھ گیا تو خیال آیا کہ جب سے ایمرجنسی چل رہی ہے آفس میں میگزین دیکھنا تو درکنار چھونے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ بس کام ہے اور میں ہوں اور گھر میں بیوی کا ڈر! کہیں گی آٹھ دن سے کہہ رہی ہوں فلم سگینہ کے دو ٹکٹ لانے کے لئے لیکن ٹکٹ تو درکنار موا شگوفہ لیکر چلے آئے اسی ڈر سے اسی وقت ٹرین میں ہی پڑھ کر ختم کیا۔

پرچہ اتنا عمدہ ہے کہ خود بخود دعا کے لئے ہاتھ اٹھ گیا اے اللہ اس پرچے کو بھی مہنگائی کی طرح ترقی دے۔ اور رئیس بانکے کی غزل بہت پسند آئی اگر وہ شادی شدہ نہ ہوں تو ان سے گزارش ہے کہ وہ اس بول پر قائم رہیں اس طرح لکھتے رہیں۔ خالد رحیم کے خاکے۔ نشتر لکھنوی (مرحوم) اور ان پڑھ صاحب کی غزل قابل تعریف ہیں۔

ارے یہ کیا! آپکے پرچے کو آگے بڑھانے کی دعا کر رہا تھا اور خود کئی اسٹیشن آگے بڑھ گیا۔

نعیم الدین احمد۔ کیمول (بہار)

○ محفل ساہتہ دھارا ناگپور کی خصوصی نشست میں ہندوستان کے مایہ ناز شہرہ آفاق ادیب جناب کرشن چندر کی قبل از وفات حسرت آیات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ مرحوم کی اللہ ان پر [illegible] آفاقی [illegible] فنکار کی حامل ادبی خدمات پر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

گوربخش سنگھ بختی۔ سکریٹری (ناگپور)

نہرو جی نے کہا تھا

"میرے لئے یہ ایک مقدس تقریب ہے"

دُنیا کا سب سے بڑا میسنری ڈیم آندھرا پردیش ہے اور یہ ڈیم ہے عظیم ناگر جونا ساگر جو دریائے کرشنا پر واقع ہے، جس کے ہندوستانی روایات اور تاریخ میں زبردست گُن گائے گئے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں اِس 'بندھ' کا سنگ بُنیاد رکھتے ہوئے آزاد ہندوستان کے معمار جواہر لال نہرو نے کہا تھا: "یہاں اس ناگر جونا ساگر کا سنگِ بُنیاد رکھتے ہوئے میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے لئے یہ مقدس تقریب ہے۔ یہ سنگِ بُنیاد سرزمینِ ہند کی پوری انسانیت کے ایک مندر کا ہے۔ یہ ان تمام جدید مندروں کا مظہر اور نشان ہے جو' ہم ہندوستان بھر میں تعمیر کر رہے ہیں"۔ ہندوستان کے عظیم فرزند کے بلیغ و گراں مایہ ارشادات کا ایک جُزو بن چکے ہیں۔

ناگر جونا ساگر بُہتات و فراوانی کے دَور کا نقطۂ آغاز ہے۔ چوتھے منصوبے کے اختتام تک ہماری ریاست میں بڑی اور اوسط آب پاشی اسکیموں پر ۹۰ء۰۸ کروڑ روپے خرچ کئے گئے اور اس طرح مزید ۴ء۳۳ لاکھ ہیکٹر اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا کر لی گئی۔ پانچویں منصوبے میں بڑی اور اوسط آبپاشی اسکیموں پر جن میں ناگر جونا ساگر، پوچم پاڈ اور گوداوری بیراج شامل نہیں ہیں، ۱۱۲ کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز ہے۔

عالمی بینک کی امداد سے تعمیر کیا جانے والا پوچم پاڈ پراجکٹ ریاست کا ایک اہم اور بڑا پراجکٹ ہے۔ اس کے پہلے مرحلہ کی تکمیل پر توقع ہے کہ علاقۂ تلنگانہ میں تقریباً ۲ء۵ لاکھ ایکڑ رقبہ کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ جون ۱۹۷۵ء تک اس پراجکٹ کے ذریعہ ۱ء۳۵ لاکھ ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش مُہیّا ہو چکی ہے۔

ومسادھر پراجکٹ بھی ـــــ ایک حوصلہ مند اور عظیم تعمیری کام ہے جو ضلع سریکاکلم کے پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لئے رُو بہ عمل لایا جارہا ہے۔ اِس پراجکٹ کے تحت ایک بیراج اور ایک بڑی کنال تعمیر کی جائے گی اور اس سے ۱ء۴۸ لاکھ رقبے کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا ہوگی۔ پراجکٹ کے پہلے مرحلے کی تعمیر کا کام مارچ ۱۹۷۲ء سے آغاز ہو چکا ہے، اور پوری قوت کے ساتھ جاری ہے۔ پانچویں منصوبے میں اس پراجکٹ کے لئے ۱۵ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

DIPR: 28/76-77.

بھارتی معیشت میں وسیع پیمانے پر

مزید ترقی کے روشن امکانات

بھارتی معیشت میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔ بھارت نے نہ صرف سکّے کے پھیلاؤ پر قابو پالیا ہے بلکہ اس کا رُخ ہی موڑ دیا ہے اور قیمتوں میں ٹھیراؤ آگیا ہے۔

○ اناج کی ۱۱ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن کی پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور اس وقت ملک میں ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن سے زیادہ اناج کا اسٹاک ہے۔

○ اس سال کے پہلے چھ مہینوں میں صنعتی شعبے میں بارہ فیصد کی شرح سے ترقی ہوئی، جبکہ پچھلے سال کی اس مُدت میں یہ صرف تین فیصد تھی۔ ۷۷۔۱۹۷۶ء میں پچھلے سال کے مقابلہ میں دس فیصد زیادہ صنعتی پیداوار متوقع ہے۔

○ اپریل سے ستمبر ۱۹۷۶ء تک کے عرصہ میں ۱۹۷۵ء کی اس مُدت کے مقابلہ میں بجلی کی پیداوار ۱۶٫۴ فیصد بڑھی ہے۔

○ اپریل سے اکتوبر ۱۹۷۶ء تک کے عرصہ میں بھارتی برآمدات میں ۳۳٫۹ فیصد کا قابل ذکر اضافہ ہوا ہے اور اسی مُدت میں درآمدات میں ۹ فیصد تک کی کمی ہوئی ہے۔

○ بیرونی ادائیگیوں کی پوزیشن میں نمایاں بہتری ہوئی ہے۔ غیر ملکی سکّے کا ریزرو حصول آزادی کے بعد پہلی بار ۲۵۰۰ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔

○ پبلک سیکٹر میں ترقی کی شرح تقریباً بارہ فیصد ہے۔

○ روپے کی قوتِ خرید میں ۱۷ سے ۲۱ فیصد تک کا اضافہ ہوا ہے۔

یہ کامیابیاں اس بات کی مظہر ہیں کہ بھارت کی حکومت اور جنتا نے ترقی کے لئے ایک وسیع اور ہمہ گیر عمل کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد ـ دسویں سالانہ تقاریب

۲۲ر اور ۲۳ر اپریل ۱۹۷۷ء

سلور جوبلی نمبر

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

اپریل ۱۹۷۷ء

جلد (۱۰) ❖ شمارہ (۴)

زرِ سالانہ : (۲۰) روپے
بیرونِ ہند سے : (۳۰) شلنگ
سالانہ انفرادی : (۱۵) روپے
فی پرچہ : ۲/۵۰ روپے

ٹائٹل : طالب خوندمیری

کتابت : ادارہ سلام خوشنویس
نزد مسجد کیلہ یاقوت پورہ حیدرآباد ۲۳

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان، حیدرآباد ۲

بائنڈنگ : محمدیہ بائنڈنگ ورکس
روبرو دربار حسینی، پرانی حویلی حیدرآباد ۲

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ } ماہنامہ شگوفہ
۳۱ـ مجرد گاہ ـ معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (اے پی)

انعامی مقابلہ

سوونیر کے ٹائیٹل کو عنوان دیجیے

" شگوفہ " کے زیرِ نظر شمارہ (سوونیر اپریل ۱۹۷۷ء) کے ٹائیٹل کے لیے کوئی عنوان تجویز کیجیے

پسند آنے والے عنوان پر زندہ دلانِ حیدرآباد کی جانب سے دو انعامات انعام اوّل

۷۵ روپے اور انعام دوم ۵۰ روپے دیے جائینگے

عنوان کے ساتھ ٹوکن کا منسلک ہونا ضروری ہے ۔ ٹوکن (انگریزی میں) اس شمارہ کے آخری صفحہ پر دیا گیا ہے ۔۔ ایک ٹوکن پر زیادہ سے زیادہ دو عنوانات ارسال کیے جاسکتے ہیں ۔ انعامی کمیٹی کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا ۔

(کنوینر سوونیر کمیٹی)

زندہ دلانِ حیدرآباد کا دسواں سالانہ اجتماع ۲۲ اور ۲۳ اپریل ۷۷ء نمائش میدان

زندہ دلانِ حیدرآباد

۔ : جناب بھارت چند کھنہ
۔ود : جناب نریندر لوتھر آئی اے ایس
جناب ہاشم علی اختر آئی اے ایس
جناب رشید قریشی
: مصطفیٰ علی بیگ
۔ین : مسیح انجم
طالب خوندمیری
: گرشؔ حیدرآبادی
: محمد حمایت اللہ
سید مصطفیٰ کمال
حیدر صدیقی
بوگس حیدرآبادی
صبغتہ اللہ بھاٹ
سعادت علی خاں
رام سندر پرشاد

ادبی اجلاس

۲۲ اپریل ۱۹۷۷ء
۶ بجے شام نمائش کلب

: جناب بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
شفیقہ فرحت
نریندر لوتھر
مسیح انجم
پرویز یداللہ مہدی
ایم۔اے۔حنان
برہان حسین

کنوینر۔ رشید قریشی

رسم اجرا "گستاخی معاف"
جناب مجتبیٰ حسین

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ (۲۳ اپریل ۹ بجے شب)

صدارت : جناب پی نرسا ریڈی
وزیر مال حکومت آندھرا پردیش

مہمان خصوصی جناب آصف پاشاہ
وزیر قانون و صدر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش

طنز و مزاح نگار شعرا

ہلال سیوہاروی
مقرب حسین
سجنی بھوپالی
مخمل مدراسی
حمایت اللہ
کلی تلنگانوی
مصطفیٰ علی بیگ
اسمٰعیل ظریف
گرشؔ حیدرآبادی

طالب خوندمیری

سرپٹ حیدرآبادی

پاگل عادل آبادی

بگڑ رائچوری

اشرف خوندمیری

قادر حیدرآبادی

فیض الرحمٰن فیض

صبغۃ اللہ بھابٹ

ڈھکن رائچوری

حفیظ خاں سپاٹ

گلیم میدکی

رشید عبدالسمیع جلیل

عیاں حیدرآبادی

مرزا اٹکلی

کنوینر : لوگس حیدرآبادی

ذیلی کمیٹیاں

انتظامی کمیٹی

کنوینر : جناب ایم۔ اے قیوم

اراکین : جناب صفدر حسین، جناب محمد یوسف، جناب حمایت اللہ
جناب مصطفیٰ علی بیگ، جناب رام سندر پرشاد، جناب ممتاز احمد
جناب عبدالقادر

پبلسٹی کمیٹی

کنوینر : جناب عارف الدین سلیم (روزنامہ ملاپ)

اراکین : جناب بلال مرتضیٰ (روزنامہ رہنمائے دکن) جناب
نسیم عارفی (روزنامہ سیاست) جناب عطا محمد (روزنامہ
منصف) جناب شوکت علی (روزنامہ نوید دکن) جناب
جاندار افسر (روزنامہ انگارے) جناب پرتاب کشور
(روزنامہ دکن کرانیکل)

رابطہ کمیٹی

کنوینر جناب ولی تنویر

ارکان : جناب وہاب قیصر، جناب ایم۔ منظر الزماں خاں، جناب
ایس آئی محی الدین نواب، جناب حسین محی الدین سلیم اور
رشید عبدالسمیع جلیل

ڈائس کمیٹی

کنوینر : جناب قمر الدین احمد خان

ارکان : جناب سعادت علی خان، جناب اعجاز قریشی، جناب مجیب الطاف حسین
جناب مرزا نقی علی بیگ

بک اسٹال کمیٹی

کنوینر : جناب سید محی الدین علی شاہ

ارکان : جناب حمید الظفر، جناب اکبر حسین، جناب باقر مرزا،
جناب یوسف راہی

بکنگ کمیٹی

کنوینر : غلام محمد عثمانی

ارکان : علی الدین عزیز
احمد اللہ
حبیب
مرتضیٰ
قیوم

خواتین کمیٹی

کنوینر : طاہرہ بیگم

ارکان : شہناز سلطانہ
فریدہ

مالِ مفت :

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

شیطان کی آنت :

چورن :

سب تھیلی کے چٹے بٹے

جناب آصف پاشا
عزت مآب وزیر قانون، و صدر آندھرا پردیش اردو اکیڈمی
مہمان خصوصی

جناب پی نرسا ریڈی
عزت مآب وزیر مال حکومت آندھرا پردیش
صدر مشاعرہ

نریندر لوتھر
نائب صدر

بھارت چند کھنہ
صدر

رشید قریشی
نائب صدر، کنوینر ادبی اجلاس
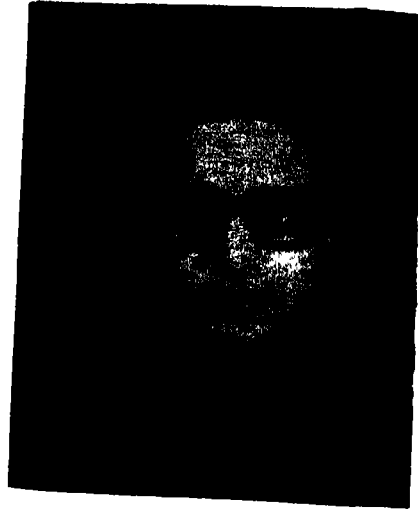
ہاشم علی اختر
نائب صدر

مصطفیٰ علی بیگ
معتمد

حمایت اللہ
رکن

مسیح انجم
نائب معتمد

گرد بڑ حیدرآبادی
خازن

طالب خوندمیری

بوگس حیدرآبادی
رکن و کنوینیر مشاعرہ

سعادت علی خاں
رکن

رام سندر پرشاد
رکن

حیدر صدیقی
رکن

صبغۃ اللہ بھاٹ
رکن

خواجہ عبدالغفور

مجتبیٰ حسین

یوسف ناظم

ایم اے حنان

پرویز یداللہ مہدی

ہلالؔ سیوہاروی

سجنیؔ بھوپالی

مقربؔ حسین
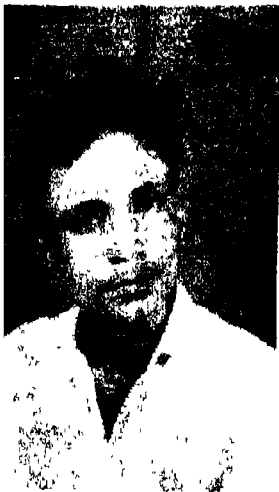
پاگلؔ عادل آبادی

منظور احمد
رکن مجلس ادارت شگوفہ
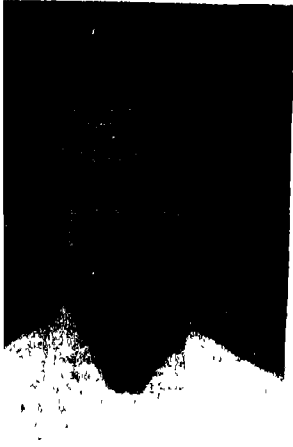
گلیؔ نلگنڈوی

عظمت بھلاواں

اسمٰعیل ظریفؔ

سسٹر پٹ حیدرآبادی

فیض الرحمٰن فیضؔ

ڈھکنؔ رائچوری

اشرفؔ خوندمیری

گلیسم میدکی

رشید عبدالسمیع جلیل

بگڑ رائچوری
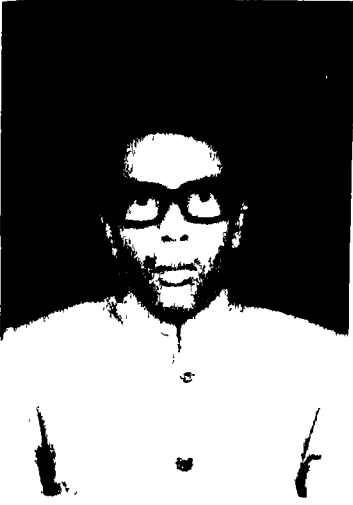
مرزا انکلی
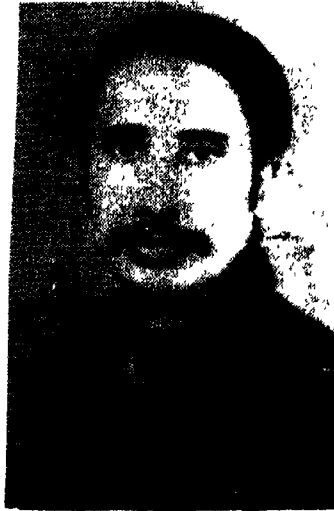
حفیظ خاں سپاٹ

برہان حسین

بھارت چند کھنہ

---جو کچھ کہ دیکھا!

آج کل ہمارے ملک میں وقت کی پابندی کی کوئی قدر نہیں مگر ہمارے پرانت کی اسمبلی اور کونسل کی اِکٹھی بیٹھک میں تقریر کرنے کے لئے لاٹ صاحب ٹھیک وقت پر اسمبلی پہنچے تو مخالف پارٹی والوں نے اِن کا سواگت پتھراؤ سے کیا۔ ایک پتھر گورنر بہادر کو لگا تو بے اختیار اِن کے مُنہ سے "ہائے میری ماں" نکل گیا اور اسمبلی کے احاطہ سے باہر نکلنے میں اُن کی پھُرتی کچھ ایسی تھی جیسے بر نے ڈِنر میں ہم لوگ کھانے کی میز پر ٹوٹ پڑتے ہوئے بتلاتے ہیں۔ پتھر برسانے والے دستور سازوں نے گورنر صاحب کے سَر دستور کی خلاف ورزی کرنے کا یہ الزام تھوپا کہ چوٹ کھانے پر اِن کی زبان سے درد کی دُہائی پرانت کی زبان میں کیوں نہیں نکلی۔ اُنہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ کسی سینیر وظیفہ پائے ہائی کورٹ جج کا ایک کمِشن مقرر کرکے گورنر صاحب کے خلاف سزا تجویز کرنے کی کارروائی کیجائے "تاکہ دُکھ سُکھ، عیش وطیش غم و غصّہ ہوش مدہوشی میں بھی وہ پابندی سے صرف خالص پرانت کی زبان بولیں!

کچھ دیر بعد مرہم پٹی کراکر گورنر بہادر کسی فلمی دلہن کا روپ دھارکر اسمبلی ہال میں آکر ڈائش پر پہنچ جانے میں کامیاب ہوگئے اور اپنی تقریر شروع کردی۔ اِن کی آواز سُنتے ہی مخالف پارٹی کے ممبر "ناپاس مردود کی گردن" کے نعرے لگاتے ہوئے ڈائش کی طرف جھپٹے اور گورنر صاحب اپنی تقریر کا مسودہ پھینک کسی ڈرے ہوئے ہرن کی طرح نزدیک والی کھڑکی سے کُود کر نو دو گیارہ ہوگئے۔ اِنکے سیکورٹی افسر نے اسمبلی کے بھڑکے ہوئے آپے سے باہر ممبروں کے قدموں پر سَر رکھتے ہوئے گورنر صاحب کی جان بخشی کے لئے منت کی مگر رحم کی بھیک بھڑکی ہوئی آگ پر تیل ثابت ہوئی اور

نام: بھارت چند کھنّہ، تعلیم بی،اے۔ (گورنمنٹ کالج لاہور) ایم۔اے۔ (تاریخ) عثمانیہ ٹرائی پوس TRIPOS کیمبرج (انگلستان) سے تاریخ اور قانون میں۔

ملازمت: آئی۔اے۔ایس آندھرا پردیش (موظف) سکرٹری، ڈائرکٹر آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی۔

اہم خدمات: بحیثیت معتمد پبلک سروس کمیشن، جوائنٹ سکریٹری، جنرل ایڈمنسٹریشن، ڈیپارٹمنٹ چیف الکٹورل آفیسر کمشنر ٹرانسپورٹ، لیبر کمشنر سکرٹری گورنر آندھرا پردیش۔ جہاں سے وظیفہ یاب ہوئے۔

مشغلے: کرکٹ واحد ہندوستانی جو کیمبرج کرکٹ بلو BLUE ہوتے ہوئے آئی اے ایس کارکن بھی رہے۔

زندگی: ازدواجی جس میں دستور کے تحت دی گئی سب آزادیاں صفر بن کر رہ گیئں۔

تصانیف: مسکراتے آنسو (افسانے) ۱۹۴۴ء انجمن ترقی اُردو حیدرآباد

مصیبتیں (مضامین) ۱۹۴۶ء " "

ٹھنڈی بجلیاں (مضامین) ۱۹۵۷ء ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد۔

"تیر نیم کش" (مضامین اور ڈرامے) ۱۹۷۲ء زندہ دِلان حیدرآباد (انعام یافتہ: آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی)۔

"مصیبتیں" ہندی پرچار سبھا حیدرآباد نے اُردو کتاب کو ہندی رسم الخط میں چھاپا۔

ایک اور مجموعہ مضامین زیرِ ترتیب ہے۔

ف ممبروں نے اسپیکر سے شکایت کی۔ وہ ان کو پولیس کی دھاندلی اور ظلم سے بچائے ورنہ استعفیٰ دیدے۔
بعض ممبروں نے سخت اعتراض کیا کہ صبح سے دوپہر ہوئی اور اب تو دھوپ بھی ڈھل رہی ہے۔ مگر ابھی تک
ز صاحب نے اسمبلی کو مخاطب کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اس لئے موجودہ حکومت کو ہٹ جانا چاہیئے
پیکر نے یہ فیصلہ سنایا کہ اس سے پہلے بھی گورنر کی تقریر "پڑھی گئی" سمجھی جاتی رہی ہے اور اب بھی یہی سمجھا
ئے گا۔ اس پر مخالف ممبروں نے اسپیکر پر یہ الزام دھرا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اسمبلی کے کاروبار
افراتفری پیدا کرتے رہے ہیں اور اب بھی اپنی بیہودہ حرکتوں سے باز نہیں آئے۔

اسمبلی کے ایک رکن چھچھوندر ناتھ سدھ مل نے جو سابق میں منسٹر بھی تھے، مخالف پارٹی سے گٹھ جوڑ کر لینے کے
اس مخالف پارٹی پر انتہائی بے رخی بزدلی اور بے دردی کا سلوک کرنے کا الزام لگایا کہ انہوں نے چھچھوندر مل
ما شید میں نہ جلوس نکالے نہ دھرنے ڈالے، نہ کہیں آگ لگائی نہ لوٹ مار مچائی۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر مخالف
ٹی کے کرتا دھرتا اور رفقا نے فوراً ہی آکر اُن کی غیر معینہ مدت کے لئے کی گئی، ایک دن پرانی بھوک ہڑتال توڑنے
ے لئے پھول مالا کے ساتھ سنترے کا رس اُن کو پیش نہیں کیا تو وہ خود کوکا کولا بازار سے منگا کر اور اسٹرا کے ذریعے
اس کے بغیر ہی بوتل کو منہ لگا کر پی بیٹھیں گے ـــــ اور سوُت کا ہار جو ان کی جیب میں ہر وقت رہتا ہے پہن لیں گے!

جب شہر کے ایک حصہ میں یہ گڑبڑ گھٹالا ہو رہا تھا تو شہر کے ایک اور حصہ میں ودیارتھیوں نے امتحان کے پرچے
مکل ہونے کا اعلان کرتے ہوئے اِن پرچوں کو سُلگا کر امتحان ہال کے فرنیچر کو آگ لگا دی۔ انہوں نے سخت اعتراض
یا کہ سوالات سیٹ کرتے وقت پرچہ بنانے والوں نے ان کی جائز اُمیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ
ب جمہوریت خطرے میں ہو تو وہ کیونکر خاموش رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے شکشا منتری کا گھیراؤ کیا اور یہ نعرہ لگایا
لہ ہم مونچھیں جھکا سکتے ہیں مگر آزاد نہیں جھکا سکتے ہیں، مگر اس سے پہلے کہ جمہوری ودیارتھی منتری کا گھر جلا کر
ور اِن کی مرمت کرتے ہوئے ان کو شکشا دینا شروع کرتے، منتری جی نے ان کے جوش کی آگ پر وعدہ کر کے
نڈی گرادی کہ وہ آئندہ کے لئے نقل مارنے کو قانونی لباس پہنا دینگے۔ ودیارتھیوں نے وضاحت فرمائی کہ نقل
ارنے کا طریقہ اس قدر پرانا ہو چکا ہے کہ لگاتار کثرت استعمال سے اس کے غیر قانونی کپڑے پھٹ کر تار تار ہو چکے
ہیں۔ ہر طریقہ اب اسلئے بھی بیکار ہو گیا ہے کہ جب امتحان ہال میں سب ودیارتھی ایک دوسرے کی نقل مارنے کی
کیفیت میں ہوں۔ اور ان میں کوئی مائی کا لعل ایسا نہ ہو جس کی نقل ماری جائے۔ تو کون کس کی نقل مارے۔ یہ سنکر
شکشا منتری جی نے کہا کہ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ حالات اس قدر گمبھیر ہو چکے ہیں۔ خیر اِن حالات میں وہ امتحان کے
سوالات کا امتحان سے بہت پہلے چوری چھپے ظاہر کئے جانے کا پکا اور معقول انتظام کر دینگے اور اس کے
باوجود بھی اگر ودیارتھی امتحان پاس نہ کر سکیں تو ان کو اس بناء پر اگلی جماعت میں بٹھا دیا جائیگا کہ کب تک ملک
کے....... نوجوان ایک ہی جماعت میں ایڑیاں رگڑتے اور پرانی کتابیں سنبھالے کتابوں کے بغیر بور ہوتے رہیں؟
محض تبدیلی ذائقہ اور سبق بدلنے کی خاطر اِن کو نئی جماعتوں میں داخلہ دے دیا جائیگا۔ جمہوری ودیارتھی یہ سنکر
جمہوری منتری جی کی جے جے کار مناتے ہوئے سنیماؤں میں میٹنی شو دیکھنے کے لئے چل پڑے! بالکل اُسی وقت
یونیورسٹی کے وائس چانسلر امتحان ہال کے جلے ہوئے فرنیچر کی راکھ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے!!

اُسی دن حکومت نے دعویٰ کیا کہ ریاست میں حالات بالکل معمول کے مطابق ہیں۔ حکومت کے اعلان میں
یہ بھی بتلایا گیا تھا کہ معمولی حالات سے یہ مطلب نہیں کہ توڑ پھوڑ، جلانے اور لوٹ مار کے واقعات نہیں ہو رہے
ہیں دراصل یہی وہ نشانیاں ہیں جو حالات کو جمہوری اور معمولی بناتی ہیں اور معاشرتی زندگی کے آنے کا پیغام لاتی

ہیں۔ حکومت کی مخالف پارٹیاں اِس اعلان کے خلاف ردِعمل کے طور پر اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئیں مگر جاتے جاتے یہ دھمکی بھی دیتی گئیں کہ کھانا کھاکر پان چباکر اور بیڑیاں پی کر پھر واپس یہ ھارینگی!

شہر کے کارخانوں والے علاقے میں لیبر لیڈروں نے مزدوروں کو کارخانوں میں سے نکال کر بڑے بڑے جلوس نکالے۔ شکایت یہ تھی کہ ریاست کے لیبر کے قانون اور قاعدے بالکل ایک طرفہ تھے اور لیبر طبقہ کی جائز اور کم سے کم اُمیدوں اور جمہوری حقوق کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ انہوں نے صرف چھوٹی سی مانگ کی کہ حکومت فوراً لیبر قوانین میں جہاں جہاں "مالک" "انتظامیہ" اور "ملازمت دینے والے" کے الفاظ استعمال کیئے گئے ہوں انکو بدل کر "مزدور" درج کر دے اُنہوں نے کہاکہ وہ کب تک خاموش بیٹھے خون کے گھونٹ پیتے اور اپنے حسرتوں کے زخموں کو صبر سے سہتے رہیں!

لیبر منتری نے اعلان کیاکہ جیسا اُن کے عہدے سے صاف ظاہر ہے وہ بالکلیہ مزدوروں کے منتری ہیں اور پوری طرح سے مزدوروں کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں مگر وہ ایسی دھمکیوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کے سامنے سر چھپا' جھکا' یا کٹا سکتے ہیں۔ انہوں نے فوج کا ایک مسلح دستہ اپنے مکان کی حفاظت کے لئے تعینات کرالیا اور کہا کہ وہ مزدوروں سے بالکل نہیں ڈرتے' مزدوروں نے چند فیکٹریوں کو آگ لگا دی اور یہ اعلان کیاکہ حکومت کہتی کچھ مگر کرتی کچھ اور ہی ہے۔ ہماری حقیر مانگ صرف اتنی ہے کہ ہر فیکٹری میں سارے انتظامات مزدور خود سنبھالیں۔ فیکٹری کے مالکوں کو غیر ضروری شئے اور فردی نعمت سمجھ کر اور فیکٹریوں سے ان کے پرانے تعلقات ہونے کی وجہ سے ان کی گزربسر کے لیئے کچھ گزارہ دیا جائے گا۔ مگر مہنگائی الاؤنس چیزوں کے بڑھتے ہوئے داموں کے ساتھ نہیں بڑھایا جائے گا۔ انہوں نے آخری اعلان یہ کیاکہ وہ دیانت داری' قومی یک جہتی' غریبی ھٹانے اور کم سے کم کام کے لئے زیادہ سے زیادہ اُجرت پانے کے سُنہرے اور ٹھوس اصولوں پر عمل کرتے ہیں!

پولیس نے ایک جگہ جہاں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور "روٹی۔ روٹی" کی رٹ لگا رہے تھے اور باوجود پولیس کے بڑی عاجزی سے سمجھانے کے خود ان کے پاس کھانے کو روٹی نہیں ہے' آپے سے باہر ہوتے جا رہے تھے' اپنی جان کی حفاظت کی خاطر گولی چلادی۔ پولیس نے بعد میں اپنی اعلیٰ' نشانہ بازی کی سند میں اعلان کیاکہ ان کی گولیوں سے چار سپاہی مر گئے۔ اور بارہ بُری طرح زخمی ہو گئے۔ اور اس بات کی بھی وضاحت کی کہ وہ آخر کب تک بے کار' فالتو اور فرسودہ ہونے کی پھبتیاں لوگوں سے برداشت کرسکتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اِس کلنک کے ٹیکے کو دھونے کے لیئے کیا تھا۔

ریاست کے پردھان منتری نے مان لیاکہ غلہ کی سربراہی کی حالت نازک ہوگئی ہے۔ مگر اس خراب حالت کے لیئے انہوں نے مخالف پارٹی والوں کو ذمہ دار قرار دیا۔ انہوں نے فرمایاکہ وہ یہ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے کسطرح یہ خراب حالت پیدا کر دی ہے مگر سوچنے کی بات ہے کہ جب اس کمی کے باعث سوکھا' سیلاب' حضرت عیسٰی اور امریکی ساتواں بیڑہ نہیں ہوسکتے تو اس کے لیئے سوائے مخالف پارٹی کے اور کس کو ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے!

مخالف پارٹیوں کے نیتاؤں نے پان چبانے' دانت پیستے اور سر دُھنتے ہوئے دوہائی مچائی کہ ریاست میں نظم ونسق بالکل نشٹ اور جیناکٹھن ہو چکا ہے' اس لیئے صدر راج لاگو اور نئے چناؤ کیئے جانے چاہئیں۔ پردھان منتری نے جواب دیاکہ انتظام وانتظام بالکل ویسا ہی ہے۔ جیسا جمہوری حکومت میں ہونا چاہیئے۔ جان ومال کو جو تھوڑا بہت خطرہ ہے وہ صدیوں کی غلامی کے بعد پیدا ہونے والی آزادی سے پیدا ہوگیا ہے۔ فاقہ کشی کے واقعات کے لیئے مخالف پارٹی والے خود ذمہ دار ہیں اور دستوری حکومت بدستور قائم ہے۔

مخالفین نے کل ریاستی پیمانے پر بند ھ منانے اور ریاست کے دریاؤں پر بنائے ہوئے جتنے بندھ باندھے گئے ہیں ان کو توڑنے کی دھمکی دی اور یہ بھی بتلایا کہ اگر ہم چناؤ کے ذریعے یا اس کے بغیر اقتدار حاصل نہ کر سکے تو مجبور ہو کر متقدر پارٹی سے مل جائینگے!

اِس آخری اعلان سے "مخالف پارٹی زندہ باد" کے ایسے زوردار نعرے اُٹھنے لگے کہ میری آنکھ کھُل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اپنی کھٹیا میں اڑا قمیض کے بٹن کھولے بغیر اس کو جسم سے اُتارنے کی بے سود کوشش میں ہاتھ پیر مار رہا ہوں — اور مجھ پر یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ —

"خواب تھا جو کچھ کے دیکھا اور سُنا افسانہ تھا"

ھلال سیوہاروی

اے ایمرجنسی!

ملک میں فرقہ پرستی بھی تھی رِستا ناسور
تیرے مرہم نے کیا اُس کی جلن کو کافور!
وہی نیتا کہ جو آپس میں رہے دُور ہی دُور
جیل پہنچے تو نظر آگئی شامِ جمہور!

دُور اندیش و خرد مند و غبی ایک ہوئے
جب حوالات میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ایک سے اِک کی اَدائیں ملیں، جذبات ملے
ایک سے ایک کے ٹھیلے ملے، حالات ملے
فلسفے، آئی ڈیئے اور خیالات ملے
جو لبِ پردہ تھے کل تک وہ کمالات ملے

اس میں کیا شک ہے کہ ہر فن کے وہ ماہر نکلے
یہ تو سب ایک ہی منزل کے مسافر نکلے

اے ایمرجنسی تُو اپنوں میں برانوں میں گئی
چھوٹے وڈگوں میں گئی اُونچے گھرانوں میں گئی
سَرفروشوں میں گئی، سوختہ جانوں میں گئی
بونڈری پھاند کے کالج کے جوانوں میں گئی

اے ایمرجنسی تُو کِس کِس کے ٹھکانوں پہ گئی
رکشے والوں سے بلی چھوٹے کسانوں پہ گئی
چائے والوں کی بھیتر سی دُکانوں پہ گئی
ٹاٹا برلا کے سوا سب کے مکانوں پہ گئی

یہ ترے ذہن سے معدوم ہیں ان سے بھی تو مل
تیرے درشن سے یہ محروم ہیں ان سے بھی تو مل
ورنہ اتہاس کے پنّے تجھے طعنے دیں گے
تجھ کو بھارت میں دوبارہ نہیں آنے دیں گے

میں جنوری ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوا تھا۔ میرا پُور
حبیب الرحمٰن ھلال ہے۔ شمالی ہند میں اُن د
زبردست پلیگ پھیلا ہوا تھا۔ ہزاروں مَرد
اور مَیں پیدا ہو گیا۔ اب اگر میں طنز و مزاح کا
نہ بنتا تو کیا بنتا۔ خاندان میں فارسی اور عربی
کا پُشت دَر پُشت ایک سِلسلہ چلا آرہا تھا، لہٰذا
ذوقِ شاعری ورثہ میں مِل ہی چکا تھا۔ اب
نے مناسب نہیں سمجھا کہ کسی اسکول میں جاکر مزید
حاصل کی جائے، بس گھر رہ کر جو پڑھ لیا سو پڑھ لیا
مرزا انیس و دبیر، غالب و اقبال کے مجموعے
گھر میں موجود تھے۔ یہ بھی سب اُس عمر میں پڑھ
تھے۔ جبکہ شعور میں کوئی پختگی نہیں تھی۔ پھر
ابتدائی شاعری ہجو گوئی سے ہوئی۔ ۱۹۵۲ء
غزلیات کا بھی سِلسلہ رہا۔ پھر اُس کے بعد
سماجی موضوعات لے کر صرف طنز و مزاح کی
کرتا ہوں جو کہ آج بھی جاری ہے۔ میں ۱۹۴۶
ایک شوگر مِل میں فِٹر کی حیثیت سے سروس
میری اِس ملازمت کی یہ دین ہے کہ مجھے مزدور
حلقہ میں رہ کر اور خود مزدور رہ کر مزدوروں
کو براہِ راست سمجھنے کا موقع فراہم ہوا۔ ۱۹۶۸ء
پاکستان گیا، جناب احسان دانش کی زیرِ صدارت
پڑھا، پھر ۱۹۶۹ء میں یورپ جانے کا اتفاق
کنور مہندر سنگھ بیدی کی قیادت میں لندن،
مانچسٹر، بیڈفورڈ اور نوٹنگھم میں مشاعرے

مقرب حسین مقرب دیوبندی

نام و تخلص، مقرب حسین۔ سید گھرانے سے تعلق ہے۔ والد جناب حامد حسین خود بھی شاعر تھے لیکن غزل کے۔ مشاعروں سے وہ دُور رہے۔ ماحول شاعرانہ رہا۔ شروع ہی سے طبیعت شعر و سخن پر مائل تھی۔ غزل سے شروعات کی۔ نظمیں سنجیدہ بھی لکھیں۔ لیکن شہرت طنز و مزاح سے ملی۔ میری رُسوائیوں میں زندہ دلان حیدرآباد کا کافی ہاتھ رہا۔ آج خدا کے فضل سے مشاعرے بہت ہیں۔ میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اکسائز آفیسر کے عہدہ پر مدھیہ پردیش میں فائز ہوں۔ تعلیم گوالیار میں ہوئی۔ وطن دیوبند (یو۔پی) ہے۔

نَس بَندی!

اِک ڈاکٹر کو اس لئے سسپنڈ کر دیا
اُس ڈاکٹر پہ اِس لئے نازل ہُوا عذاب
جب ڈاکٹر سے پوچھا یہ کیسے خطا ہوئی
کہنے لگا یہ ڈاکٹر میرا نہیں قصور
پوچھا تھا مَیں نے اُس سے کہ بچے ہیں کس قدر
کوئی سُسر بنا ہے نہ بیٹی کسی نے دی
جب یہ سُنا تو مَیں نے کہا اُس سے سَر پھرے
کیا بھائی پڑگیا ہے تری عقل میں فتور
اِس معاملہ میں ٹھیک ہے اُس وقت چھان بین
کہنے لگا کہ ڈاکٹر میں جانتا ہوں سب
اب کیا بتاؤں اس میں ہے اِک بات راز کی
بُنتے تھے تُند و تیز جو دھارے سِمٹ گئے
گھبرا کے اسپتال میں یُوں آگیا ہوں میں
کل سے اگر جو گاؤں میں کچھ اُونچ نیچ ہو
رَٹّا کوئی پھنسے گا تو ہو جائے گا غضب
اُٹھّے گی پورے گاؤں کی، میری طرف نظر
بندہ نواز، اور نہ ترسائیے مجھے
تم جانتے ہو ڈاکٹر ہو گا کسی کا کام
نس بندی اب بھی ڈاکٹر میری اگر نہ کی
میری بھی زندگی کا یہی اِک اُصول ہے

نَس بندیوں میں اُس سے مقرب ہوئی خطا
اُس نے کسی کنوارے کو نپٹا دیا جواب
وہ کام سے چلا گیا اچھی اَدا ہوئی
لایا نہ تھا میں اُس کو وہ آیا تھا خود حضور
کہنے لگا کہ شادی کو پھرتا ہُوں دَر بَدر
سرکار آج تک مِری شادی نہیں ہوئی
بہتر یہی ہے کام لے کچھ اپنی عقل سے
اچھا یہی ہے رہ ابھی نس بندیوں سے دُور
شادی کے بعد جب تِرے بچّے ہوں دو یا تین
مایوس تم کرو گے تو ہو جائے گا غضب
تم یہ سمجھ نہ لینا کہ کرتا ہوں دِل لگی
جس گاؤں کا ہوں میں وہاں سب ہی نمٹ گئے
ڈرتا ہوں اس لئے کہ اکیلا بچا ہُوں مَیں
سب گاؤں والے روئیں گے میرے ہی نام کو
تھانے میں نام میرا لکھائیں گے سب کے سب
لے دے کے سارے گاؤں میں مَیں ہی بچا ہُوں نر
یہ اِلتجا ہے جلد ہی نپٹائیے مجھے
پھوکٹ میں ہر زباں پہ آئے گا میرا نام
مَیں یہ بتائے دیتا ہوں، کرلوں گا خودکشی
بدنامیاں اگر ہوں تو جینا فضول ہے

میں ڈاکٹر تھا مجھ کو بھی کچھ رحم آگیا
درپیش اب سوال کسی زندگی کا تھا

اِلزام دے رہے ہو کہ مَیں نے بُرا کیا
مرضی تھی اُس کی مَیں نے ٹھکانے لگا دیا

یُوں بے قصور مجھ کو نہ سسپنڈ کیجئے
یہ اِلتجا ہے مجھ کو تو انعام دیجئے

بِلّی کی مَوت

نہلا رہا تھا سردی میں بِلّی کو اِک پٹھان
تھا اتفاق، گزرا اُدھر سے کوئی جوان

دیکھا جوان نے جو مقرب یہ ماجرا
اُس نے اِدب کے ساتھ وہیں خانؔ سے کہا

سَردی بہت ہے اِس کو نہ نہلائیے حضور
میرا خیال ہے کہ یہ مَرجائے گی ضرور

بولا پٹھان 'اوئے' تمہیں کیا ہے واسطہ
ہم مانگ تو نہیں رہے کچھ تم سے مشورہ

صابن ہمارے گھر کا ہے بلّی ہمارا ہے
نہلائے گا ضرور کوئی ڈر تمہارا ہے

دیتا ہے تم خبر ہمیں بِلّی کی موت کا
تم آدمی کا بچہ ہے کوئی نہیں خدا

جاؤ تم اپنا کام کرو تم کو کیا پڑی
کرنا نہ بات اب کبھی بِلّی کی موت کی

ایسا جواب جب دیا اُس کو پٹھان نے
یہ خانؔ کچھ کریک ہے' سوچا جوان نے

یہ سوچ کر جوان وھاں سے چلا گیا
مَرنے دو سالی بِلّی کو مجھ کو پڑی ہے کیا

دو تین گھنٹے بعد جو لَوٹا وہی جوان
دیکھا کہ رو رہا ہے سڑک پر وہی پٹھان

رونے سے ہے پٹھان کی گھگھی بندھی ہوئی
اِک سمت کو پڑی ہے وہ بِلّی مری ہوئی

سمجھا رہے تھے لوگ بہت سے پٹھان کو
روؤ نہ خانؔ اس طرح بِلّی کی جان کو

جُھٹ اس جوان نے بھی وہیں خانؔ سے کہا
افسوس تم نے مانا نہیں میرا مشورہ

مَیں نے نہیں کہا تھا نہ نہلائیے حضور
سردی میں بِلّی آپ کی مرجائے گی ضرور

بولا پٹھان تم تو حقیقت میں ہے گدھا
تم کو خبر نہیں ہے کہ کیا بات ہوگیا

دراصل بات یہ ہے ہُوا اور ماجرا
نہلانے سے یہ مان لو بِلّی نہیں مَرا

اب کیا بتائیں بِلّی نے یُوں جان چھوڑ دی
نہلا کے ہم نے بِلّی کو تھوڑی نچوڑ دی!

★

غزل

ضبط دو روز بھی ان سے نہ ہُوا میرے بعد
مَیں جو کہتی تھی وہی ہو کے رہا میرے بعد
اچھا کھاؤ تو قسم سر پہ مِرے رکھ کر ہاتھ
میرے بچّوں سے کرو گے نہ دَغا میرے بعد
میری مُٹّی کو وہ سینے سے لگا کر روئے
یاد آئی جو انھیں میری وفا میرے بعد
پے لیلیٰ کہا مجنوں نے یہ اپنی ماں سے
کس کے گھر جائے گی یہ کالی بَلا میرے بعد
جو مِرے واسطے چوتھی کا بنا تھا جوڑا
وہی جوڑا مِری سوتن کو چڑھا میرے بعد
رنڈیاں آئیں ہُوا ناچ ، چلے جام پہ جام
مَیں تو میکے میں تھی کیا کیا نہ ہُوا میرے بعد
جیتے جی اُس نے مِری بات نہ پُوچھی سجنی
کرنے بیٹھا ہے مِری سالگرہ میرے بعد

سجنی بھوپالی

۱۹۲۲ء میں ایک متوسط سید رضوی گھرانے میں سرزمینِ لکھنؤ کے لئے کلنگ بن کر وجود میں آئی ۳ سال سنٹرل اسکول میں زیرِ تعلیم بھی رہی اور ہاکی کی کیپٹن بھی۔ پھر شیعہ کالج لکھنؤ میں داخل ہوگئی وہاں بھی فرسٹ الیون کی پلیر رہی۔ اور وہیں سے میٹرک کرکے ۳۹ء میں سلسلۂ تعلیم ختم کرنا پڑا۔ ۴۶ء میں بھوپال آگئی اور ٹیکسٹائل مِل میں مختلف سکشن سے ہوکر اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں پراویڈنٹ فنڈ سکشن میں کام کرنے کو ملا۔ تا ایں اسی سکشن میں ہوں۔ بھوپال پہونچکر حضرت علامہ محوی صدیقی مرحوم سے تلمذ رہا۔ ۵۴ء میں جناب تخلص بھوپالی اور ناذم سیتاپوری نے مجھ کو ساجد سے سجنی بننے پر مجبور کیا۔ ۶۱ء میں تنظیمِ ادب کی تشکیل ہوئی، جس میں مَیں صدر بنائی گئی۔ اب اتحادِ ادب کی نائب صدر ہوں۔

قطعات

(۱)

اس بھری بزم میں سجنی آ کر !
شرم کے مارے گڑی جاتی ہے
شکریہ ، حسنِ سماعت کا حضورؔ
بندی آداب بجا لاتی ہے

(۲)

پہلی چھنگی تھی قبل شادی کے
زندگی جان کا وبال ہوئی
عیدِ قرباں کے روز عقد ہُوا
ہائے مَیں بن بھیری حلال ہوئی

(۳)

نہ کچھ آغاز بدلا ہے نہ کچھ انجام بدلا ہے
نہ ان کا کام بدلا ہے نہ میرا کام بدلا ہے
بظاہر ہوگئی ہیں صنف میں تبدیلیاں سجنو
انھیں نے رُوپ بدلا اور مَیں نے نام بدلا ہے

باورچی

مجتبیٰ حسین

آئیے ہم آپ کو اپنے باورچی سے ملائیں۔ ان سے مل کر آپ کو اس وقت تک خوشی ہوتی ہی رہے گی جب تک کہ آپ ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہ کھائیں یہ ہمارے گھر کے چالیسویں باورچی ہیں۔ اور یہ جو ہم گزشتہ چھ مہینوں سے پیٹ کے درد میں مبتلا ہیں۔ تو اس کے واحد ذمہ دار یہی ہیں۔ ان میں کئی خوبیاں ہیں۔ بس ایک یہی خرابی ان میں یہ ہے کہ انہیں کھانا پکانا نہیں آتا اور اگر یہ بھی آجاتا تو ہمیں یقین ہے کہ یہ ہرگز باورچی نہ بنتے چنانچہ اب یہ محض اس لئے باورچی بنے ہوتے ہیں کہ انہیں کھانا پکانے سے دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم نے زندگی میں اتنے سارے باورچی دیکھے ہیں کہ اب اُن کی یاد کے ساتھ ہی پیٹ میں گڑبڑ سی ہونے لگتی ہے۔ ہمیں تو اب ان باورچیوں کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ ہمیں تو ان کی حرکتیں یاد ہیں اور ان حرکتوں کی تفصیل کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک باورچی نے ہمارا قیمتی ٹی سٹ توڑ دیا تھا۔ ایک باورچی نے سالن میں اتنی زیادہ مرچ ڈال دی تھی کہ کئی دنوں تک ہم نے کھانے کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ایک باورچی نے ہمارے نئے سوٹ پر سالن کا کٹورا اُنڈیل دیا تھا۔ ایک باورچی کھانا تو بہت خوب پکاتا تھا۔ لیکن ایک دن وہ اچانک ہمارے گھر کا ساز و سامان لے کر کہیں منتقل ہو گیا۔ ہم عرصہ تک اس کی تلاش کرتے رہے

تاریخ پیدائش: ۱۵؍جولائی ۱۹۳۶ء
تعلیم: بی۔اے، ڈی۔پی۔اے، (عثمانیہ)
تصانیف: تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہرحال، شیشہ و تیشہ (شاہد صدیقی مرحوم کے مزاحیہ کالموں کا انتخاب)۔
مشاغل: مزاح نگاروں کے اجتماعات منعقد کروانا۔ دوستوں میں اپنی عمرِ عزیز کا قیمتی وقت ضائع کرنا۔ خطوط کے جوابات نہ دینا۔ اپنے سائے سے آپ ڈر جانا۔ دوسروں کی مشکلات کو اپنی مشکلات جاننا اور خود مشکلات میں گھر جانا۔ علی الصبح گھر کو واپس ہونا اور علی الصبح گھر سے نکل جانا۔

اس کی جائے قیام کا پتہ چلے تو ہم بھی وہیں منتقل ہو جائیں۔ اور بقیہ زندگی اپنے سانزد
کے ساتھ گزار دیں۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک باورچی تو اتنا تجربہ کار تھا کہ ایک
ب ہم نے اُس سے مچھلی کا سالن پکانے کو کہا تو اس نے سالن میں زندہ مچھلیاں چھوڑ دا
نب ہم کٹورے میں مچھلیاں تلاش کرنے لگے تو وہ کسی طرح بھی چمچے میں نہ سماتی تھیں۔
ناچار ہمیں ان مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے سالن میں بنسی ڈال دینی پڑی۔ ایک بزرگ باورچی
جن سے جب ہم کھانے کے خراب پکنے کی شکایت کرتے تو وہ ہمیں اخلاقیات کا درس
کے انداز میں کہتے کہ: "میاں! میں تم سے عمر میں بڑا ہوں اور اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ
احترام کرو۔ اور میری تلخ بات اور تلخ کھانے کو سہہ جاؤ۔ تمہیں کھانا اچھا نہیں ملتا تو
دکر ہمیشہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ نتیجے میں ہم صرف صبر کرتے رہے۔ مگر اس کا پھل
موصوف ہی کھاتے رہے۔ ہمیں میٹھا پھل تو کجا کڑوا پھل بھی کھانے کو نہ ملا۔ بالآخر یہ ایک
ہماری پاکٹ لے کر چلتے بنے۔ اور ہم بڑی دیر تک اخلاقیات کے درس میں کھو گئے۔ یہ چلے گئے
بے حد خوش ہو گئے کیونکہ ان کے پکائے ہوئے بدمزہ کھانے کھاتے کھاتے ہم سنجیدگی
اس امکان پر غور کرنے لگے تھے کہ ایک دن بڑے حضرت کو گھر میں سوتا چھوڑ کر چپ چاپ
سامان لے کر چلتے بنیں اور بقیہ زندگی کہیں آرام سے گزار لیں۔

ایک اور باورچی ہمیں اکثر یاد آتا ہے یہ جس دن ہمارے گھر کا باورچی بنا اور شام کو ہم نے کھانا
یا تو ہم اپنی قسمت پہ ناز کرنے لگے کہ عرصہ دراز کے بعد ہمیں وہ باورچی ملا جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ ایسا
کھانا ہم نے کبھی نہ کھایا تھا۔ ہم نے اس کے فن کی خوب تعریفیں کیں۔ تو اس نے جھک جھک کر یوں،
کیا جیسے وہ کسی شعر کی داد وصول کر رہا ہو۔ دوسرے دن بھی ہمیں بڑا ذائقہ دار کھانا ملا۔ ہم ہر روز
ین جاتے وقت سودا سلف کے لئے اُسے پیسے دے جاتے اور شام کو کافی مزے دار کھانا کھ
۔ یہ سلسلہ آٹھ دنوں تک چلتا رہا۔ لیکن نویں دن جب ہم تھکے ماندے گھر پہنچے تو میز پر اس باورچی
یک خط ملا۔ لکھا تھا ـــــ حضور آج آپ کو اچھا کھانا کھانے کو نہیں ملے گا۔ کیونکہ آج شہر کے
سے ہوٹل ہڑتال کی وجہ سے بند ہیں۔ میں نے ایک ہوٹل کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر کہیں سے مجھے
کے لئے کھانا دستیاب نہ ہو سکا۔ میں مجبور ہوں۔ خود میں بھی صبح سے بھوکا ہوں آپ نے سودا،
ف کے لئے جو پیسے دیئے تھے انہیں اپنی تنخواہ کے طور پر اپنے پاس رکھ رہا ہوں۔ اب آپ
ئی نیا باورچی تلاش کریں، تو مناسب ہے۔ اس خط کو پڑھ کر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہمیں
وقت پتہ چلا کہ ہم اتنے دنوں تک جو کھانا کھا رہے تھے وہ اصل میں ہوٹل کا "کھانا" تھا۔

بے شمار باورچیوں کا مزہ چکھنے کے بعد ہمارے گھر میں اب اس باورچی کا راج ہے۔ جس
نمبر چالیس ہے۔ اور جس کا بیان ہے کہ وہ چالیس کھانے پکانا جانتا ہے۔ لیکن کبھی ہم نے مارے
ف کے اس سے اپنے دعوٰی کا ثبوت پیش کرنے کو نہیں کہا۔ یہ جب باورچی کی حیثیت سے
زم ہونے کے لئے آیا تو ہم نے پوچھا کہ کھانے پکانے کا کیا تجربہ رکھتے ہو۔ اس نے برجستہ
با: "حضور! گزشتہ ایک برس میں تین سو پینسٹھ (۳۶۵) گھروں میں بہ حیثیت باورچی کام کر چکا
وں۔ اس سے بڑھ کر آپ کو اور کیا تجربہ چاہیئے۔" ہمیں باورچی کی شدید ضرورت تھی سو ہم نے،

کسی جرح کے بغیر اُسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ چھ مہینوں تک اُس کے ساتھ زندگی گذارنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اُسے کھانا پکانے سے زیادہ کھانا کھانے کا شوق ہے جہاں تک پکانے کا سوال ہے وہ صرف انڈا اُبالنے کے فن سے واقف ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کا کوئی باورچی اس کی طرح انڈا اُبال نہیں سکتا۔ انڈا اُبالنے سے قطع نظر سارے کھانے وہ یوں پکاتا ہے جیسے کوئی سائنس داں لیباریٹری میں کوئی تجربہ کر رہا ہو۔ کبھی کھانے میں نمک کی زیادتی کا شکوہ کیا جائے تو کہتا ہے کہ صاحب اس مہینے میں نمک کی اتنی بھاری مقدار منگوائی گئی ہے کہ جب تک سالنوں میں زیادہ نمک نہ ڈالا جائے اس وقت تک اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لہٰذا زیادہ نمک کھائیے۔ کبھی مرچ کی زیادتی کا گلہ کیجئے تو کہتا ہے کہ میں تو اپنے ذائقہ کے اعتبار سے مرچ ڈالتا ہوں اگر آپ کے ذائقہ کا لحاظ کرتے ہوئے سالن میں مرچ ڈالا کروں تو مجھ سے یہ سالن کھایا نہ جائے گا۔ اس کی ہر روز کی بے احتیاطیوں سے تنگ آکر کھانا پکانے کی ذمہ داری خود ہم نے قبول کرلی ہے۔ ہم باورچی خانہ میں بیٹھ کر اُسے ہدایتیں دیتے رہتے ہیں اور وہ ہماری ہدایتوں پر عمل کرتا رہتا ہے۔ مگر جب کھانا پک جاتا ہے تو ہمیں کوسنے لگتا ہے۔ کہ ہماری ہدایتوں کی وجہ سے اُسے خراب کھانا کھانے کو ملا۔

جب سے یہ باورچی ہمارے گھر میں آیا ہے اس وقت سے گرانی کا احساس بھی شدت سے ہونے لگا ہے۔ وہ جب سے بازار سے سودا سلف لے کر آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ تاجر ہر روز مستعمل اشیاء کی قیمتیں بڑھا رہے ہیں۔ چونکہ یہ جب آیا تھا تو اُس وقت انڈے کی قیمت بیس (۲۰) پیسے تھی مگر یہ آج پچاس پیسے تک پہنچ گئی ہے۔ کبھی ہم شکایت کرتے ہیں کہ تم ہمیشہ بہت مہنگا سودا لاتے ہو اور آئندہ سے ہم خود ہی لایا کریں گے۔ تو وہ دھمکی کے انداز میں کہتا ہے کہ "حضور جس دن آپ سودا سلف لانے جائیں گے اس دن میں ملازمت چھوڑ دوں گا۔ مجھے آپ تنخواہ نہ دیں کوئی بات نہیں مگر سودا لانے کا حق میں کسی اور کو نہیں سونپ سکتا"

پھر اس باورچی کے ناز و نخرے بھی ہمیں سہنے پڑتے ہیں۔ کسی دن ہم کسی دوست کے ہاں کھانے پر مدعو ہوں تو وہ ہم سے لڑنے جھگڑنے لگتا ہے کہ ہم نے تنہا دعوت کیوں قبول کرلی اس کی اس خفگی سے تنگ آکر ہم اسے بھی اپنے ساتھ دعوت میں لے جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ آخر اس بے چارے کو بھی اچھا کھانا ملنا چاہیئے۔ اس کی مہارتِ فن کا یہ عالم ہے کہ آلو کا سالن پکاتا ہے تو اس پر بیگن کے سالن کا گمان ہوتا ہے۔ اور بیگن کا سالن پکاتا ہے تو اس کا ذائقہ آلو کے سالن کی طرح بن جاتا ہے۔ اس لئے جب کبھی ہمارا جی آلو کھانا چاہتا ہے تو ہم اُس سے بیگن کا سالن پکانے کی فرمائش کر دیتے ہیں۔

اس باورچی سے ہمیں کئی شکایتیں ہیں:

پہلی شکایت تو یہ ہے کہ وہ کھانا کم پکاتا ہے اور برتن زیادہ توڑتا ہے۔ اور سارا قصور برتن بنانے والوں کے سر تھوپتا ہے۔ کہ وہ مضبوط برتن نہیں بناتے۔

دوسری شکایت یہ ہے کہ وہ ہر پندرہ دنوں کے بعد اپنی ایک مہینہ کی تنخواہ پیشگی وصول کرلیتا ہے۔ کہنے کو تو وہ صرف چھ مہینوں سے ہمارے ہاں ملازم ہے لیکن وہ

تک پورے ایک سال کی تنخواہ ہم سے وصول کر چکا ہے۔

تیسری شکایت یہ کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں ہماری ہر چیز کو اپنی چیز تصور کرتا ہے۔ ہمارے کپڑے پہنتا ہے ہمارے جوتے پہنتا ہے۔ ہمارے شیونگ سٹ سے داڑھی بناتا ہے۔ اور ہمارے پلنگ پر سو جاتا ہے۔

لیکن اتنی ساری شکایتوں کے باوجود ہم اُسے ملازمت سے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے۔ اس میں ایک اچھائی یہ ہے کہ اُس کے ہمارے گھر میں موجود رہنے سے ہمارے ہاں مہمان نہیں آتے اگر آتے بھی ہیں تو ایک ہی دن میں اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھا کر بیمار ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے ہی دن اپنا بوریہ بستر باندھ لیتے ہیں۔ ہم اپنے گھر کو مہمانوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر اس باورچی کو علیحدہ کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ ہم تو کبھی کبھار اس طرح بھی سوچتے ہیں کہ ایسا باورچی تو صرف خوش قسمت اصحاب کو ہی ملتا ہے۔ ✕✕

طالب خوندمیری

حیدرآباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں دونگل میں پیدا ہوا۔ (۱۴ فروری ۱۹۴۲ء) نام سید محمود ہے۔ دوست احباب طالب خوندمیری کے نام سے بھی جانتے ہیں۔ والد محترم سید عبدالکریم صاحب محکمۂ آبکاری میں برسرِ ملازمت تھے۔ اس لئے ان کے ساتھ حیدرآباد کے مختلف اضلاع میں بھی بچپن کا بڑا حصّہ گزرا۔ آدھی درجن بھائیوں میں تیسرا ہوں۔ اپنے بڑے بھائی اشرف خوندمیری کو شعر کہتے دیکھ کر شوق چرایا تو خود بھی تک بندی شروع کر دی' جو شاید اب شاعری کے حدود میں بھی داخل ہونے لگی ہے۔ آرکیٹکچر کا پانچ سالہ کورس کالج آف فائن آرٹس اینڈ آرکیٹکچر سے کیا چونکہ شروع ہی سے نقل مارنے اور اسباق کو بغیر سمجھے ازبر کرنے سے دلچسپی نہ تھی، اس لئے کبھی ذہین طلبہ میں شمار نہ ہوسکا تعلیمی دور جماعتوں سے زیادہ کھیل کے میدان اور اسٹیج پر گزرا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی "دیوانے مشغلے" میں مبتلا رہا کبھی شعر موزوں کیئے تو کبھی مضمون نگاری میں زور آزمائی کی' کبھی کارٹون بنائے اور کبھی خود کارٹون بن گیا' کبھی مصوّری سے دل بہلایا تو کبھی خوش نویسی کا شوق چرایا۔ مگر کبھی شہرت حاصل کرنے کا سودا سر میں نہ سمایا۔ اس لئے اپنی سوانح حیات میں آج تک رنگ نہ آیا۔ اگر اپنی فطری کوتاہیوں اور غلطیوں سے کبھی شہرت مل گئی تو لڑکپن سے آنے والی پیری تک اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کا ریکارڈ بھی خود بخود مہیّا ہو جائے گا' ورنہ کون اپنی زندگی کے پل پل کا حساب رکھتا ہے۔ اس لئے فی الحال اِنہی رُوکھی پھیکی سطور کو میری سوانح سمجھ کر برداشت کر لیجئے۔

تین سہیلیاں!

پہلی سہیلی :

آؤ نا' اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
صبح میں نے چائے تو پی تھی مگر کھایا نہیں
چائے ممّی نے بنائی تھی مگر بد ذائقہ
وہ بھی کالج میں پڑھاتی ہیں مضامینِ اَدق
۔وہ بھی جس گھر کی پلی ہیں تھے وہاں نوکر بہت
مَیں تو پڑھتی ہوں' کتابوں سے مجھے فرصت نہیں
ایک پیالی چائے بھی اپنی بنا سکتی نہیں
اِتنا پڑھ لکھ کر تو گھر کے کام کر سکتی نہیں
ویسے گھر کے کام تو ڈیڈی چلاتے ہیں مگر۔
ماسوا اُن کے تو کوئی کام والا ہی نہیں'
آؤ نا' اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے

بھوک لگتی ہے کسی ہوٹل میں جاکر کھائیں گے
کیوں کہ باورچی ہمارا آج گھر آیا نہیں
کیوں کہ وہ پکوان کا رکھتی نہیں ہیں تجربہ
فلسفہ، تاریخ، حیوانی مدارج کے سبق
محنتی تھے یُوں بھی نانی جان کے شوہر بہت
یُوں بھی گھر میں کام کرنے کی مجھے عادت نہیں
بلکہ میں باورچی خانے تک بھی جا سکتی نہیں
اپنے کالج کو بھی میں بدنام کر سکتی نہیں
آج کل وہ بھی کہیں باہر گئے ہیں ٹُور پر
اس لئے اب تک مرے مُنہ میں نِوالا ہی نہیں
بھوک لگتی ہے کسی ہوٹل میں دوشہ کھائیں گے

دوسری سہیلی

آؤ نا اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
اپنے بس اِسٹانڈ کا چکّر لگا کر آئیں گے

آج بھی شاید وہ دیوانہ کھڑا ہوگا وہاں
کچھ دِنوں سے جو نظر آتا ہے مجھ پر مہرباں

دیکھتے ہی مجھ کو رکھ لیتا ہے وہ سینہ پہ ہاتھ
سرد آہیں کھینچتا ہے پھر اداکاری کے ساتھ

گھر سے کالج تک برابر "چیز"[1] کرتا ہے مجھے
مدبھری نظروں سے بس میں "گیز"[2] کرتا ہے مجھے

مسکرا کر کوئی فلمی گیت گاتا ہے کبھی
زیرِ لب کچھ بڑبڑا کر، منہ بناتا ہے کبھی!

دیکھتے ہی مجھ کو سیٹی بھی بجاتا ہے کبھی
اپنی بائیں آنکھ دھیرے سے دَباتا ہے کبھی!

نت نئے انداز سے اکثر ستاتا ہے مجھے
اپنی ممّی کی بہو کہہ کر چڑاتا ہے مجھے

ہر گھڑی وہ چھیڑ کر غصّہ دلاتا ہے مجھے
پھر بھی جانے کیوں اُسی پر پیار آتا ہے مجھے

کیا کہوں کتنی اجیرن ہو گئی ہے زندگی
ہو گئی ہے دل لگی، اُسکی، مرے دِل کی لگی

اب کتابوں سے بھی اللہ، بور ہو جاتا ہے دِل
پڑھتے پڑھتے دفعتاً خوابوں میں کھو جاتا ہے دِل

کیا بتاؤں کس قدر بے تاب میرا ہارٹ ہے
ہائے اللہ کیا کروں میں وہ بہت اسمارٹ ہے

آؤ نا، اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
اپنے بس اسٹانڈ کا چکّر لگا کر آئیں گے

اس کی صورت دُور ہی سے دیکھ کر آجائیں گے

تیسری سہیلی:

آؤ نا اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
اپنے سارے گروپ کا فوٹو کہیں کھنچوائیں گے

امتحاں تو ہو چکے، اب چھٹیاں ہونے کو ہیں،
اور اس کے بعد سب کی شادیاں ہونے کو ہیں

کون جانے کل کہاں ہوں گے کدھر جائیں گے ہم
چھوڑ کر کالج نہ جانے کس کے گھر جائیں گے ہم

کون جانے کس کی قسمت میں ہے کیسا ہمسفر
کس سے ٹکرائے گا شاعر اور کس سے ڈاکٹر

کل ہماری زندگی میں اجنبی آجائیں گے
کوئی صفدر بیگ یا عبدالغنی آجائیں گے

دفعتاً تبدیل اپنی زندگی ہو جائے گی
آج کی صفیہ بھی کل بیگم صفی ہو جائے گی

آج ہم سب ساتھ ہیں، موقع نہ کھونا چاہیئے
یادگارِ دَورِ کالج کچھ تو ہونا چاہیئے

اپنا یہ فوٹو تو اللہ بسٹ ہونا چاہیئے
فلم بھی نیو، کیمرہ لیٹسٹ ہونا چاہیئے

اپنا میک اَپ بھی ہیں کچھ ٹھیک کرنا چاہیئے
رُوپ تو کچھ اور بھی اپنا نکھرنا چاہیئے

عالیہ تُو اپنی عینک ٹھیک کر لینا ذرا
دلکشی بھی پیار کی آنکھوں میں بھر لینا ذرا

تُو بھی رُخسانہ جمی زُلفوں کو بکھرا دے ذرا
آج کا فیشن یہی ہے ان کو اُلجھا دے ذرا

ورنہ فوٹو، مانگ چوٹی میں جو کھنچوائے گی تُو
دیکھ لینا، پوری مُلّانی نظر آئے گی تُو

راشدہ، تُو بھی ذرا پوڈر لگا لے گال پر
ورنہ ہم کو تو ترا چہرہ نہیں آتا نظر!

ٹھیک میک اَپ میں اگر فوٹو یہ کھنچوائیں گے ہم
اَپسراؤں سے بھی بیوٹی فل نظر آئیں گے ہم

آؤ نا اللہ! ذرا کالج کے باہر جائیں گے
اپنے سارے گروپ کا فوٹو کہیں کھنچوائیں گے

---
1) chase 2) Gaze

ستاروں کے کھیل

نریندر لوتھر

ہندوستان آزاد ملک ہے۔ لیکن یہاں کے رہنے والے بیشتر لوگ اپنے آپ کو تقدیر کا غلام مانتے ہیں۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اس غلامی کے پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے ازلی گردش میں جتتے ہوئے ستاروں کا ٹھکانہ اور اُن کا پروگرام دریافت کیا جاتا ہے۔ مختلف گرہوں کی پڑتال کی جاتی ہے اور پھر کوئی مبارک گھڑی چُنی جاتی ہے، پیدا ہونا، شادی کرنا، مکان بنانا، نوکری کی تلاش میں سفر پر جانا اور (بمبئی اور کلکتہ میں) فلم بنانا۔ یہ ہمارے ملک کے چند چیدہ اور اہم پیشے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی کام شروع کرنے سے پہلے مہورت نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ ہمیں کوئی آئیڈیا نہیں، لیکن ہم نے یہ ضرور دیکھا ہے کہ مہورت کے باوجود اکثر فلمیں فلاپ ہوجاتی ہیں۔ سفروں پر CRASH ہو جاتے ہیں، مکانوں کی ملکیت اور کرائے کے متعلق مقدمہ بازی ہو جاتی ہے۔ اور اکثر شادیاں عمر بھر کے لیئے جنجال ثابت ہوتی ہیں۔ آپ میں سے اکثر صاحبان کو "گارنٹی" کا تجربہ ہوگا۔ آپ کوئی مشین خریدیئے۔ اُس کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ اگر گارنٹی کے دوران مشین یا اس کا کوئی پرزہ خراب ہوجائے۔ تو آپ دُکان دار کے پاس اس کی گارنٹی کا پروانہ لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ اس کی حتی الوسع کوشش یہی ہوتی ہے کہ آپ کے طرز استعمال میں نقص نکال کر اپنی ذمہ داری سے بچے۔ ایسے ہی اگر کوئی ان جیوتشیوں اور نجومیوں کے پاس جائے، جن کی مبارک گھڑی سے نحوست نکلی تو اُن کا جواب بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ "اس وقت آپ کے خیالات نیک نہیں تھے اسی لیئے مہورت نکالنے کے باوجود آپ کا کام ٹھیک نہیں ہوا۔" کئی نجومیوں کا جواب،

پیدائش ۱۹۳۳ء۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ بعد میں برٹش کونسل کے وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لیئے انگلینڈ گئے ۱۹۵۵ء میں آئی، اے، ایس کے لیئے چُنے گئے۔ تب سے حکومت آندھرا پردیش اور حکومت ہند کے محکموں میں مختلف عہدوں پر کام کر چکے ہیں۔ پانچ سال تک محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر رہے اور ۶۷ء میں صنعت و حرفت کے ڈائرکٹر بنا دیئے گئے اور پھر ۱۹۷۴ء میں بہ حیثیت کلکٹر کارگزار ہوئے۔ ان دنوں اسپیشل آفیسر مجلس بلدیہ حیدرآباد کے عہدہ پر فائز ہیں۔ اُردو، ہندی اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔ طنز و مزاح محبوب موضوع ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہوتے ہیں۔ پہلا مجموعہ "بند کواڑ" ۱۹۶۲ء شائع ہوا۔ "مزاج پُرسی" دوسرا مجموعہ زندہ دلانِ حیدرآباد نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ مزاحیہ مضامین کا ایک اور مجموعہ اور ایک انگریزی ناول اشاعت کے لیئے تیار ہے۔ متعدد بیرونی ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں حکومت لیبیا کی حکومت کے صنعتی مشیر بن کر گئے تھے ایک بیوی، ایک لڑکا، ایک لڑکی خوشحال خاندان ہے۔

کسرِ نفسی میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ "صاحب اگر ہم انسان بھگوان کی اِچھا پوری طرح جان پاویں تو انسان نہ رہیں، خود بھگوان بن جائیں" نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مہورتوں اور شبھ گھڑیوں کے اتنی بار فیل ہونے کے باوجود ہمارا اعتقاد برقرار رہتا ہے۔

شادی بیاہ کے معاملے میں بھی بیشتر لوگ قسمت کو مانتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شادی سنجوگ کی بات ہے، اور جنم جنم کا رشتہ ہے۔ جو عورت آپ کے نام الاٹ ہو چکی ہے، بالآخر وہی آپ کے ساتھ مڑھی جائے گی۔ آپ کسی حسینہ کی تلاش میں چاہے کتنے ہی کافی ہاؤسوں اور یونیورسٹیوں کے چکر لگائیں ایک گنگھڑ بی بی کو ڈھونڈنے کے لئے آپ کے والدین چاہے تمام اخباروں کے کالم سیاہ کردیں خداوند تعالیٰ کے دفتر میں آپ کی شادی آپ کی پیدائش سے پہلے ہی رجسٹرڈ ہو چکی ہے۔ جیسا کہ ایک فلمی گانے میں کہا گیا ہے۔ "ہر عبدالرحمٰن کی عبدالرحمنیا ہوتی ہے" جوڑ بندی کا کام آسمان پر لاکھوں برس سے ہو رہا ہے۔ اور شادیاں مبارک گھڑیاں دیکھ کر ہوتی ہیں اس کے باوجود چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ دنیا مردوں اور عورتوں کا ایک عجائب خانہ ہے۔ جہاں خلقِ خدا کی تفریح کے لئے قدرت نے عجیب عجیب جوڑے بنا رکھے ہیں ان کو دیکھ کر ہرگز یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ جوڑے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یا تو قدرت نے بنی نوع آدم سے واقعی مذاق کیا ہے یا عرشی لغت میں جوڑے کا مطلب بگڑے ہوتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ خدا کی شان میں کچھ کہنا ناقابلِ معافی گستاخی ہوگی۔ لیکن پھر بھی ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر ایسے ہی جوڑے کوئی جمہوری حکومت بنا کر بھیجتی تو اُس ملک کی پارلیمنٹ میں ہلّا مچ جاتا۔ قدرت کے سامنے جنتا بے بس ہے وہ اپنے دل کا غبار کہاوتوں کے ذریعہ نکال لیتی ہے۔ مثلاً ہندی کی اس کہاوت میں کتنا طنز ہے۔ "رام ملائی جوڑی، ایک اندھا اور ایک کوڑھی" پنجابی لوگوں نے اپنی شکایت کا اظہار ان دو لفظوں میں کیا ہے۔ "جوڑیاں جگ تھوڑیاں تے نرڈ بہتیرے"

ہم نے اس موضوع پر کافی کھوج اور سوچ بچار کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ خدائی محکمۂ ازدواج میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ ہزاروں جوڑوں سے انٹرویو کر کے اُن سے بات چیت کر کے اُن کی زندگی کا بغور مطالعہ کر کے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ اور جان کی امان پائیں تو عرض کرتے ہیں کہ اس محکمہ میں ریفارم کی شدید ضرورت ہے۔

جوڑوں میں چند صفات مشترک ہوتی ہیں۔ صفات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک جسمانی، اور دوسرے غیر مادّی ہم نے جن جوڑوں کو دیکھا ہے۔ اُن میں زیادہ تر مندرجہ ذیل صفات مشترک پائی ہیں۔

جسمانی :

۱۔ میاں لمبا اور بیوی ناٹی : ایسے جوڑوں کو عام طور پر گلی ڈنڈا پکارا جاتا ہے۔

۲۔ بیوی خوبصورت اور میاں بدصورت : ایسے جوڑوں کے متعلق شاعر نے کہا ہے ! ع

حور کے پہلو میں منگور تری قدرت

۳۔ ایک موٹا اور دوسرا دُبلا پتلا :

دونوں کو ملانے سے دس (۱۰) کا ہندسہ بنتا ہے۔

غیر مادّی:

خاوند شرمیلا اور بیوی بے حیا : فلمی گانے کے مطابق ایسے خاوند کو مخاطب کر کے بیوی گاتی ہے، کہ "ہم سے نہ شرماؤ ...."

۲۔ بیوی ذہین اور خاوند اُلّو کی دم فاختہ۔

۳۔ خاوند ملنسار اور بیوی صفراوی مزاج۔

۴۔ بیوی دریا دل اور خاوند حریص۔

۵۔ بیوی فراخ چشم اور خاوند دبّو : ایسے خاوندوں نے دنیا کے مختلف شہروں میں زن مرید سوسائٹیاں Hen-pecked Husbands Societies کھولی ہیں۔

اب آپ ہی بتائیے، جب ساری خدائی ایسے جوڑوں سے اٹی پڑی ہو تو قدرتی بات ہے کہ دنیا میں رنج و غم اور کلفت کی بھرمار ہوگی۔ یہ دنیا بہشت بن سکتی ہے۔ اگر نظام الٰہی کی ایک خامی کو دور کیا جاسکے۔ طلاق اس کا کوئی موثر علاج نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتوں اور مردوں میں جسمانی اور غیر مادی صفات کے اشتراک کو مدِّ نظر رکھ کر دنیا بھر کے جوڑوں میں ایک بنیادی اور انقلابی ردّ و بدل کیا جائے۔ یہ ردّ و بدل بلا لحاظ مذہب و ملّت ہونا چاہیئے۔ اس سے باہمی تعصب اور فرقہ واریت میں بھی کمی ہوگی۔ اور انسانی برادری کے جذبے کو بھی فروغ ملے گا۔ اس ضمن میں ہماری یہ تجویز ہے کہ U.N.O. کی سطح پر جوڑوں کے ردّ و بدل کے لئے ایک بین الاقوامی کمیشن مقرر کیا جائے۔ اگر ریاستوں کی حد بندی اور آبادی کے تبادلے کے لئے کمیشن مقرر کئے جاسکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اتنے سنگین مسئلہ کے حل کے لئے جس پر سارے سماج کی خوشحالی کا دار و مدار ہے ایک کمیشن نہ مقرر کیا جائے۔ اپنا فیصلہ دیتے وقت کمیشن اس بات کا خیال نہیں رکھے گا کہ آیا جوڑے ایک دوسرے سے خوش ہیں۔ کمیشن کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ ہر جوڑے سے ان کی ایک تصویر حاصل کرے گا۔ اور ساتھ ہی میاں بیوی کی متضاد خصلتوں کا خلاصہ۔ اس کے بعد کمیشن ہمسایوں اور محلہ والوں سے ہر جوڑے کے بارے میں رائے مانگے گا۔ ایسی رائے دینے کے لئے میونسپل الیکشن کے لئے مقرر کردہ حلقہ ایک یونٹ ہوگا۔ اپنے آپ کو چھوڑ کر ہر جوڑا باقی تمام جوڑوں کی موزونیت پر رائے کا اظہار کرسکتا ہے۔ ان تمام امور کی بناء پر کمیشن اپنا فیصلہ دے گا۔ کہ کونسا مرد کونسی عورت کے لئے موزوں ہوگا۔ اس کے بعد ایک مقررہ تاریخ کو تمام شادیاں منسوخ ہو جائیں گی۔ اور نئی شادیاں کمیشن کے فیصلے کے مطابق عمل میں آئیں گی۔ آپ پوچھیں گے کہ بچوں کا کیا ہوگا؟ بچے والدین کے نہیں بلکہ تمام سماج کے مشترک ہوں گے۔ اس سے میرا پن اور تیرا پن ختم ہو جائے گا۔ اور سب لوگ ایک سانجھا کنبہ بن جائیں گے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ تجویز نہ صرف نرالی ہے بلکہ بیہودہ ہے تو صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ دنیا کے سب سے مشہور فلاسفر افلاطون نے آج سے دو ہزار سال قبل بھی ایسی ہی تجویز رکھی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے جرمنی کے حکمران ہٹلر نے بھی جرمن نسل کو بہتر بنانے کے لئے کچھ ایسی ہی قسم کی اسکیم لاگو کی تھی۔

جرمن حکومت خود نوجوان عورتوں اور مردوں کی شادیاں رچاتی تھی۔ لیکن ہٹلر کی موت کے ساتھ اس اسکیم کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

آپ پوچھیں گے کہ اس تجویز کو اپنانے سے دنیا میں واقعی خوشی بڑھے گی۔ ہمارا خیال ہے ضرور بڑھے گی۔ لیکن ہم اس بات کی کوئی گیارنٹی دینے سے معذور ہیں اگر بالفرض محال گیارنٹی دے بھی دیں تو وہ بھی ویسی ہی گیارنٹی ہوگی جیسی کہ عام طور پر دکاندار دیتے ہیں جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا۔ اور پھر آپ جانتے ہیں کہ خوشی تو ایک سراب ہے کوئی بھی اپنی جگہ خوش نہیں۔ اور غالب کے الفاظ میں غم ہستی کا بجز مرگ علاج نہیں۔ اور یہ بھی آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ:

"دولھا بھی روئے، سہاگن بھی روئے اور پاس کنواری کنیا بھی روئے!"

گرٹبڑ کیا ہے؟

گرٹبڑ حیدرآبادی کی شخصیت جسطرح پہلو دار اور بھاری بھرکم ہے، اسی طرح ان کے نام بھی بے شمار ہیں۔ کوئی ناظم مرزائی کہتا ہے، کوئی ڈاکٹر، کوئی عمردراز خاں، اور کوئی بابو بھائی اور چاند پاشا پکارتا ہے' اور اس مرد باہوش کا یہ حال ہے کہ وہ اکثر اپنے ناموں کا ہوش تک نہیں رکھتا۔ پیشہ کے لحاظ سے صحافی، اور مشغلہ کے لحاظ سے شاعر ہیں۔ ہررنگ کے شعر کہنے کے باوجود بہروپئے نہیں کہلائے جاسکتے۔ بات بڑے سلیقہ اور طریقے سے کرتے ہیں اور سلام سے حیدرآبادی تہذیب جھلکتی ہے اسی لئے غالبؔ ہرمحفل میں جانِ محفل بن جاتے ہیں۔ حصّہ بقدر جُثّہ کے قائل ہیں۔ پٹھان ہونے کے باوجود اپنے قبیلے سے واقف نہیں۔ مگر ان کے بے تکلف دوست' انھیں۔ خان دعوت زئی بھی ازراہِ مذاق پکارتے ہیں۔ پکّے مذہبی ہونے کے باوجود ــــــ وسیع المشرب ہیں اور' بامسلمان اللہ اللہ بابرہمن رام رام' کے قائل ہیں۔ سامع اور قاری خواہ کتنا ہی رنجیدہ یا سنجیدہ کیوں نہ ہو' ان کے طنزیہ کلام پہ کھلکھلا کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شعر سوچ بچار کر کہتے اور قاری وسامع کے وجدان سے دُعائیں لیتے ہیں۔ صدہا آل انڈیا مشاعرے رَوند چکے ہیں اور اَن گنت جرائد میں ان کا کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہوتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی اِن کی آواز ہَوا کے دوش پر اُڑتی رہتی ہے۔

دُعَاء

(۱)

مری عُمرِ رفتہ کو واپس بُلادے
پھر امّی کی میٹھی سی لوری سُنادے
پھر ابّا کے کندھے پہ مجھ کو چڑھادے
میں جینے سے بیزار ہوں آسرا دے
مجھے پھر سے مولا تو بچّہ بنادے

(۲)

عجب دَور تھا وہ' نہ تھی فکرِ فاقہ
سروکار غم سے نہ دُکھ سے علاقہ
نہ مالک' نہ خادم' ملازم نہ آقا
تھی لیلیٰ بھی مجنوں' تھا محمل بھی ناقہ
مجھے پھر سے مولا تو بچّہ بنادے

(۳)

لڑکپن گیا' جب سے آئی جوانی
گلے آگ گیا میرے طوقِ گرانی
کہاں بات کھانے کی' بِکتا ہے پانی
بڑی کسمپرسی کی ہے زندگانی
مجھے پھر سے مولا تو بچّہ بنادے

(۴)

بُرے دوستوں کی بھی حالت ہے خستہ
سرِ راہ کترا کے چلتے ہیں رستہ
عزیز و اقارب کا اخلاص سستا
یہی التجا تجھ سے ہے دست بستہ
مجھے پھر سے مولا تُو بچّہ بنا دے

(۵)

کہوں کیا ہے ارض و سما میں ملاوٹ
غذا میں ملاوٹ، دوا میں ملاوٹ
وفا میں ملاوٹ، ادا میں ملاوٹ
کہاں دودھ گھی، ڈالڈا میں ملاوٹ
مجھے پھر سے مولا تُو بچّہ بنا دے

(۶)

مَیں بیگم کی شاپنگ سے تنگ آگیا ہُوں
مَیں بٹیا کی سوئمنگ سے تنگ آگیا ہُوں
مَیں بیٹے کی ٹیوٹنگ سے تنگ آگیا ہُوں
غرض یہ ہر اِک ڈھنگ سے تنگ آگیا ہُوں
مجھے پھر سے مولا تُو بچّہ بنا دے

(۷)

کسی دن جو ناگاہ مہمان آیا!
سمجھتا ہوں دل میں کہ شیطان آیا
مصیبت کا گھر بیٹھے سامان آیا
کروں کیا کہ خطرہ میں ایمان آیا
مجھے پھر سے مولا تُو بچّہ بنا دے

(۸)

ذلالت کو ڈھانکے ہوئے ہے شریعت
فقط نفس کی پرورش ہے طریقت
خدا کو یہ مکّار دیتے ہیں رشوت
وہ بنتے ہیں دُکھ دے کے جو رکھیں عقیدت
مجھے پھر سے مولا تُو بچّہ بنا دے

(۹)

عبادت نہیں ہے ریاکاریاں ہیں
قیادت میں پوشیدہ غدّاریاں ہیں
سیاست کا منشا دل آزاریاں ہیں
حماقت ہیں جتنی بھی فنکاریاں ہیں
مجھے پھر سے مولا تُو بچّہ بنا دے

(۱۰)

غریبوں سے کرتی ہے دولت بغاوت
خدا بن چکی ہے زمانے میں دولت
سوسائٹی میں پاتے ہیں وہ لوگ عزّت
نہیں نام کو جن میں بُوئے شرافت
مجھے پھر سے مولا تُو بچّہ بنا دے

(۱۱)

یقیناً مری یہ نرالی دُعا ہے
مگر ہوشمندوں کو کہتے سُنا ہے
کہ بچّہ کو خونخوار بھی پالتا ہے
تو گرگٹ بڑے نے سوچا اسی میں بھلا ہے
مجھے پھر سے مولا تُو بچّہ بنا دے

○

اللہ بچائے کہ فقط جیب کی کٹ ہے
چت کا تو پتہ ہی نہیں جو پٹ تھا سو پٹ ہے
ہر سال خسارہ ہی خسارہ ہے جو گر گٹ بڑا!
یہ میرا بجٹ ہے حکومت کا بجٹ ہے

سماج دشمن دفتر میں

رشید قریشی

۲۸/جون ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم ایم۔ اے تک حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی میں جامعہ عثمانیہ کے شرخ' شریر اور نوش مزاج نگاری کا آغاز ہوا۔ حیدرآباد میں ابتداءً مزاح لکھنے والے چند ناموں میں ان کا شمار ہوتا ہے باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ مضامین کا ایک مجموعہ مزاح شریف شائع ہو چکا ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کے نائب صدر ہیں۔

ایک کہاوت ہے' جو اپنا دوست وہ سماج دشمن۔ اور آج کل خود غرضی کا ایسا دور دورہ ہے کہ دشمنوں کے بڑھتے ہجوم میں سماج کا گھٹتا وجود معدومیت کی گہرائیوں میں اترتا چلا ہے۔ تارپیڈو کا مارا جہاز سمندر میں غرق ہو رہا ہو جیسے یہ صورت حال سماج دشمنوں ہی کے لئے زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ ان کا انجام ان ناعاقبت اندیشوں کی تقدیر سے مختلف نہیں ہوگا۔ جو جس ڈالی پر بیٹھے ہیں اس پر کلہاڑی چلاتے ہیں۔ لیکن مفاد پرستی جب اصلاح کی منزل سے گزر جاتی ہے بچاؤ کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالتی ہے سماج دشمن جانتے ہیں کہ جس ڈالی نے ان کو سہارا دیا ہے۔ وہ' اسی کو کاٹ رہے ہیں۔ لیکن یہ خوش فہمی ان کی ہمت بندھاتی رہتی ہے کہ وہ ڈالی کے ساتھ گر کر ہلاک ہونے والے نہیں۔ ان کا مقصد تو کلہاڑی کی ضربوں کے ساتھ ساتھ اپنے وزن کا اضافہ کرکے ڈالی کو کمزور بنانا ہے۔ جو ہی ڈالی ٹوٹنے کو ہوگی وہ' انتہائی پھرتی کے ساتھ کود کر الگ ہو جائیں گے۔

جب سماج دشمن اس حکمت عملی پر کاربند ہوں سماج کو بھی اپنے تحفظ کے لئے جوابی جتن کرنا ہوگا وہ جہاں دشمنوں کے نرغہ میں تخریبی حملوں کا نشانہ ہے وہیں دوستوں کی حوصلہ افزا رفاقت میں حصار بند بھی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ دوست دشمن کی پہچان کا کوئی اطمینان بخش وسیلہ موجود نہیں۔

اگلے وقتوں میں یہ ہوتا تھا کہ کوئی سماج دشمن قرار پائے تو لوہے کی جلتی سلاخ سے اس کی پیشانی داغی جاتی تھی۔ اب کے

بعد وہ یا تو سماج سے روپوش ہو جاتا تھا یا پھر نمودار ہونے کی جسارت بھی کرتا تو سماج اس پر جھپٹتا اور اس کی کارستانیوں کے مقابل چوکس ہو جاتا۔ اب تو سماج دشمنوں کا بھی وہی بھیس ہے جو سماج دوستوں کا اس فریبی بھیس میں سماج دشمن سماج کو بے دھڑک ٹھگتے ہیں اور پناہ کے لئے سماج جب ان کی طرف بڑھتا ہے دوبارہ ٹھگا جاتا ہے۔ زخموں سے چور اندھے سپاہی کی طرح وہ سہارے کے لئے ہر کاندھے پہ اپنا سر رکھ دیتا ہے، اور ایک تازہ زخم سے اس کی مزاج پُرسی ہوتی ہے۔

دفتر ..... حکومت کا سرچشمہ ہوتا ہے اور بظاہر سماج دشمنوں کے لئے اس میدان میں کشش کے کوئی سامان نہیں لیکن حکومت کا دائرہ عمل زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہوگیا تو یہ مقام ان کے لئے مرکزی اہمیت کا حامل ہوگیا۔ آیئے میرے ساتھ دفتر چلئے۔ دیکھیں یہاں کون کون سماج دشمن کس کس طرح کارگزار ہے۔

یہ ریسپشن روم ہے۔ آج کل سماج دشمن کو دفتر باہر رکھنے کے لئے یہ ساری پابندیاں عاید ہیں۔ دیکھئے کونے میں ایک مفلوک الحال شخص بیٹھا ہے۔ دفتر میں اس کی کوئی کارروائی نہیں..... اس نے اپنے ایک عزیز سے ملنے کا بہانہ گھڑلیا ہے۔ ریسپشنسٹ کو اس کی حالتِ زار پر ترس آتا ہے۔ اور اسے داخلہ مل جاتا ہے ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ وہ شخص ایک عہدہ دار کے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ سنئے کیا بات چیت ہو رہی ہے:

حضور .... غمزدہ ہوں ..... چالیس سال کے بعد اب بیوی کا انتقال ہوا ہے۔ اگر جلد اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام نہ ہو تو میں مٹی میں مل جاؤں گا۔ حضور کچھ مدد کیجئے حضور ...... اللہ آپ کی بھی ایسی مدد کرے گا۔ عہدہ دار نے چپراسی کو بلایا ..... کچھ رقم اس کے حوالے کی اور اس شخص سے مخاطب ہوا۔ آپ میرے آدمی کے ساتھ تشریف لے جایئے۔ یہ آپ کی بیوی کی تجہیز و تکفین کا پورا انتظام کر دے گا.... مرحومہ سے محروم شوہر نے کہا، حضور اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ غریب کی بیوی ہے غریب ہی اس کو ٹھکانے لگا دے گا..... آپ صرف یہ رقم عنایت فرما دیجئے..... عہدہ دار کا لہجہ سخت ہوگیا..... جایئے..... یہ کام میرا چپراسی آپ سے بہتر طریقہ پر کرے گا.... اس کی اب تک دو بیویاں مر چکی ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد چپراسی واپس آگیا اور یہ خبر دی کہ چوراہے کے پاس سبز روشنی نہ ملی تو موٹر رکی اور وہ شخص کود کر بھاگ گیا۔ یہ سماج دشمن دفتروں کے پھیرے کرتا ہے اور اپنی چاق و چوبند بیوی کی... لاش کو ہر روز دفن کر کے اپنی زندگی کے دن بڑھاتا ہے۔

اور یہ تماشہ بھی ہوتا ہے۔ ایک نوجوان جوڑا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اس انداز سے محوِ خرام رہتا ہے جیسے دفتر گاہ نہیں گلگشت ہے۔ اور وہ کسی فلم کے ہیرو ہیروئین ہیں۔ دونوں ایک عہدہ دار کے پاس پہنچتے ہیں۔ نوجوان لڑکی کا تعارف اپنی بہن کی حیثیت سے کراتا ہے اور عہدہ دار فائل پر جھک جاتا ہے تو مخفی طور پر لڑکی کے پلّو کو جھٹکہ دیتا ہے۔ جب عہدہ دار سر اُٹھاتا ہے ایک نئی کارروائی اس سے روبرو ہوتی ہے۔

نوجوان کہتا ہے "میں اضلاع کے دوروں پہ نکلتا رہتا ہوں۔ اس لئے آپ کو یاد دلانے کے لئے میری بہن آیا کرے گی"۔

وہ باہر نکلتے ہیں تو عہدہ دار کا چپراسی ان کی سرگوشیاں سن لیتا ہے

نوجوان: بھولا شکار ہے بیگم جان! کام بن گیا۔

لڑکی: مگر ڈارلنگ تو نے اس کے تیوری کے بل نہیں دیکھے؟ بہت خرانٹ دکھائی دیتا ہے۔

نوجوان: تیوری کے بل ابھی تم جب تنہا آؤ گی' یہ تیوری کے بل مسکراہٹوں کی لہریں بن جائیں گی۔ جوان بن جائے گا فرتوت۔

لڑکی: مجھے تو ڈر لگتا ہے۔

نوجوان: بہادر بنو بیگم۔ بہادر ہی با مراد ہوتا ہے۔ شیر شکاری سے بچ نہیں سکتا۔ مرد عورت کے حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کارروائی اپنے موافق کیش پکا سمجھو۔

اور یہ صاحب کسی عہدہ دار سے تصدیقِ حیات حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ عہدہ دار کاغذات دیکھ کر کہتا ہے "جناب یہ تصویر جو آپ نے لگائی ہے کس قدر بوسیدہ اور دھندلی ہے۔ کوئی تازہ تصویر چسپاں کی جاتی تو اچھا ہوتا۔

اہلِ غرض نے انتہائی معصومیت سے جواب دیا "حضور! تازہ تصویر کس طرح لگائیں' ان کا تو انتقال ہو چکا" عہدہ دار نے تصدیق کرنے سے انکار کر دیا اور ایک غلط تصدیق کے وبال سے محفوظ ہو گیا۔

اور یہ سجے سجیلے مسکراتے تمکنت خرام کون مہاشے ہیں؟ یہ خود ساختہ سماج ردست ہیں۔ ہر دکھی کا... درد ان کے دل میں ہے۔ ایک اہلِ غرض بھی اُن کی دُم سے بندھا ہے۔ وہ ایک عہدہ دار کے کمرہ میں گھسے رسمی علیک سلیک کے بعد اُٹھ گئے۔ معذرت خواہ ہوئے۔ غلطی سے آپ کے کمرہ میں آ گیا تھا...... باہر نکل کر اہلِ غرض کو دلاسہ دیا "ابھی وہ صاحب تو میرے بچپن کے ساتھی نکلے۔ انھوں نے تمہارے موافق فیصلہ دینے کا وعدہ کیا ہے ...... کارروائی یہ ہے کہ اہلِ غرض اپنے دیوان خانہ کو سڑک کے کچھ حصہ پہ وسیع کرنا چاہتا ہے۔ بلدیہ رضامند نہیں ہے۔ اور آپ ان مہاشے کے توسط سے کوشاں ہیں کہ حکومت اُن کے موافق حکم جاری کر دے

اس قبیل کے کئی لوگ دفتروں میں گھومتے ملیں گے۔ غرض مندوں کی سادہ لوحی اور فریب جیبی ان کے لئے بہت آسان اور منفعت بخش پیشہ فراہم کر دیتی ہے۔ وہ اگر کبھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں تو لازمی طور پر سماج کا ایک حق دار فریا طبقہ ظلم و زیادتی کا نشانہ بنتا ہے۔ جو کارروائی حق و انصاف پر مبنی ہو اس کے لئے پیروی درکار نہیں ہوتی۔ پیروی بالعموم ایسی ہی کارروائیوں میں اختیار کی جاتی ہے جو کمزور اور قانون و ضابطہ کی تائید سے محروم ہوتی ہیں۔ پیروکار اس سلسلہ میں کسی چھان بین کو ضروری نہیں سمجھتا۔ وہ صرف اپنے محنتانہ پر نظر رکھتا ہے۔ اور اپنی پیروی کو کامیاب بنانے کے لئے بڑے بھلے تمام ذرائع ہر سطح پر بلا جھجک آزماتا ہے۔ ایک پیروکار تو اس ہنر کا بھی ہے کہ شرافت اور مسکینی کا چہرہ لگائے کسی مثل کا معائنہ کرنے لگا اور جو مراسلہ یا نوٹ اس کے مقصد کے خلاف ہے اسے مثل سے پھاڑ لیا اور نگل گیا۔ ایسے مثل خور کمیاب ضرور ہیں۔ لیکن ان کی کارستانیوں سے جو نقصان سماج کو بالواسطہ طور پر پہنچتا ہے وہ قابلِ لحاظ ہوتا ہے۔ پیروی اپنے محدود اور جائز دائرہ کار میں مفید اور موثر بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اہلِ دفتر عاجلانہ توجہ مبذول کرنے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ اس زحمت کی بھی چنداں ضرورت نہ ہو اگر دفتروں میں فرض شناسی اور کارکردگی... نصب العین بن جائے۔

وظیفہ حسنِ خدمت کی ایک مثال محافظ خانہ میں موجود ہے' جس میں کارروائی نے کچھ ایسا جھول لیا کہ منظوری کا مرحلہ طے بھی نہ ہوا اور وظیفہ حسن زندگی جاری ہو گیا۔ دریافت کیا گیا کہ کیا مرحوم کی بیوہ بقید حیات ہیں۔ معلوم ہوا کہ بیوہ البتہ بقید حیات ہیں۔ بیوہ کے نام وظیفہ کی اجرائی کی تجویز پیش ہوئی۔ اور دوران کارروائی

اطلاع ملی کہ بیوہ بھی چل بسیں۔ پوچھا گیا کہ مرحوم کی کتنی بیویاں تھیں اور ان کی اولادیں کتنی ہیں۔ اِس استفسار کا جواب کافی عرصہ تک وصول نہیں ہوا تو مثل ختم کر دی گئی۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ آئندہ جب بھی معلومات فراہم ہوں گی مثل زیر کارروائی لے لی جائے گی۔

دفتری تاخیر کی یہ ایک معمولی مثال ہے لیکن اس کے نتائج کی روشنی میں اس کی اہمیت جانچی جائے تو ایک بھیانک سماجی بدخدمتی کا نمونہ سامنے آجاتا ہے۔ دفتروں میں نہ صرف اس قبیل کی کارروائیاں بلکہ پلوں، پراجکٹوں، سماجی فلاح و بہبود، حقوق، امن و امان سب ہی اقسام کی کارروائیاں، منصوبہ بندی، اور منظوری کے مرحلوں سے گزرتی ہیں، کسی بھی میز پر ان امثلہ کا طویل قیام سماجی نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ اور ترقی کی منزل دور پڑ جاتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا حکومت نے ضعیف اور بے سہارا لوگوں کی پرورش کی اسکیم بنائی تھی۔ اس اسکیم کے تحت اکثر نوجوان لڑکے لڑکیوں نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا اور ضعیفوں، مستحقوں کی قبروں پر دندنانے لگے۔ اس ناکامی کی تمام تر ذمہ داری دفتر والوں پر عاید ہوتی ہے۔ دفتری معیار پر وہ چاہے جتنے کارگزار اُتریں لیکن ان کی یہ اقربا نوازی یا سہل انگاری جرم کی تعریف میں آتی ہے جس کو سماج کبھی معاف نہیں کرے گا اور معاف کرنا بھی نہیں چاہئے۔ سماج کے دشمن وہ بھی ہیں جو باہر سے دفتروں میں داخل ہوتے ہیں اور وہ بھی جو دفتروں کے اندر ہوتے ہیں اور خود کو سماج سے بالاتر مقام پر فائز سمجھتے ہیں۔ میرا ناچیز خیال یہ ہے کہ اگر دفتری سماج باہری سماج سے ہم آہنگ ہو جائے اور دفتری اپنے آپ کو انسان سمجھنے لگیں تو پھر کوئی سماج دشمن اس اُبھرتے نکھرتے سنورتے سماج کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ▲

محمد اسمٰعیل ظریف

میں ہوں اسماعیل ظریف. آبائی وطن ناندیڑ ربع صدی سے حیدرآباد میں رہتا ہوں اور پیشۂ تجارت سے وابستہ ہوں زمانۂ طالب علمی سے مزاح نگاری کا شوق ہے جو کچھ محسوس کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں اپنے ضمیر سے مشورہ کرنیکے بعد جو جی میں آئے وہ لکھ مارتا ہوں کیوں کہ میرا ضمیر ہی میرا اُستاد ہے. مختلف پرچوں میں چھپنے کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے سامعین میں مسکراہٹیں تقسیم کرتا ہوں مشاعرے بازی کا جنون ہے. دھلی، بمبئی. مدراس بنگلور. میسور اور ہبلی دھاڑ واڑ وغیرہ کے کل ہند مشاعروں میں شرکت کے مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں. بہرکیف پیشۂ آبا سپہ گری تو نہ تھا مگر شاعری ذریعۂ عزت بنی ہوئی ہے جانے کہاں کہاں، اس ظالم نے میری رسوائی کا سامان کردیا ہے.

قطعات

شاعری سے کم سے کم یہ تو ہوا اک فائدہ
واہ واہ کے شور میں دادِ سخن پانے لگے!
جاگنے سے بڑھ گئی شاعر کی بینائی ظریف
اب تو دن میں بھی اُسے تارے نظر آنے لگے!

کوئی بھری محفل میں آکر راز کسی کا کھولے ہے
کوئی ڈنڈی مار کے سودا منڈی میں کم تولے ہے
کیا تیرے بھیجے میں خلل ہے کیا سوجھی ہے تجھکو ظریف
اپنی بولی چھوڑ کے جو تو میسر کی بولی بولے ہے

غزل

آج بھی سالے نے پھر قرض لیا ہے مجھ سے
پھر بھی سسرال کا ہر فرد خفا ہے مجھ سے

ابتدا ہی سے میں بدنام ہوں بدنام سہی
آپ کا نام تو دنیا میں ہوا ہے مجھ سے

دوست کے گھر سے کل اک مار کے لایا ہوں کتاب
دوستی میں ادبی جرم ہوا ہے مجھ سے

پھول محفل میں جو اک دوست نے کل پہنچایا
مفت پہنایا نہیں دام لیا ہے مجھ سے

ایسے ویسے تو وہاں ہوتے ہیں اکثر لیکن
آج میخانہ میں واعظ بھی ملا ہے مجھ سے

باپ کو میں نے بچپن میں ستایا تھا بہت
اُس کا بدلہ مرے بیٹے نے لیا ہے مجھ سے

بعد محفل کے دکھائینگے وہ سب کو ٹھینگا
محترم صدر نے وعدہ جو کیا ہے مجھ سے

جانے والو یہ اُدھار ہے چکاتے جاؤ
آپ نے داد جو محفل میں لیا ہے مجھ سے

داد دل کھول کے جن لوگوں نے دی ہے مجھکو
چائے ہر شخص نے ہوٹل میں پیا ہے مجھ سے

میں اکیلا ہی نہیں طنز و مزاح کا شاعر
اور بھی کوئی پر رنگ جدا ہے مجھ سے

یہ غزل آپ کی یہ آپ کا کہنا ہے ظریف
کہنے والے نے تو کچھ اور کہا ہے مجھ سے

بوگس حیدرآبادی

میں پہلی مرتبہ ۱۰ اکٹوبر ۱۹۴۷ء کو شہر حیدرآباد کے ایک محلہ کاغذی گوڑہ میں پیدا ہوا۔ میرا پورا نام سید نصیرالدین احمد، شاعری کا آغاز ہائی اسکول کے زمانے سے سنجیدہ شاعری سے ہوا۔ ۱۹۶۵ء سے مزاحیہ شاعری شروع کی۔ سنجیدگی میں جب بھی اپنے آپ پر غور کیا تو اپنا تخلص مجاہد بھی لکھتا رہا اور جب اپنے آپ پر ہنسنے لگا تو بوگس ہوگیا۔ ۶۴ء میں بحیثیت مددگار مدرسہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوا۔ جب ملازمت اختیار کی تھی تو میٹرک میں تھا۔ ۶۸ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے میٹرک کامیاب کیا۔ ۶۹ء میں پہلی اور آخری شادی کی۔ ۷۰ء میں اُردو آرٹس ایوننگ کالج میں داخلہ لیا۔ طلباء انجمن کا نائب معتمد اور کالج میگزین پولین کا مدیر اعلیٰ رہا۔ ۷۴ء میں بی۔ اے کیا۔ حیدرآباد ایوننگ کالج سے ۷۶ء میں ایم۔ اے درجہ اول کامیاب کیا۔ زندہ دلان حیدرآباد کے ابتدائی دنوں میں مجھے آرگنائزر پھر کنوینر منتخب کیا گیا۔ ۷۶ء میں نائب معتمد بنایا گیا اور اب رکن عاملہ ہوں۔ ہندوستان کے بیشتر کل ہند مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد اور دیگر اسٹیشنوں سے سنوایا گیا ہوں اور دہلی کے ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا ہوں۔

غزل

جو لڑتی ہے وہ مجبوبہ فلاں بنت فلاں کیوں ہو
اگر سچی محبت ہے تو پھر بکواس کیا معنیٰ
وہ روٹھی ہیں تو روٹھیں اُن سے اچھی دیکھ لیں گے ہم
غلط تعمیر دیکھیں اور نہ توڑ دیں بلدیہ والے
کوئی چوروں کا اڈّہ یا جوتے خانہ کوئی ہوگا
ملاوٹ بھی گرانی بھی ہے اور بے روزگاری بھی
یہ مانا مہہ بانو نام ہے اُس کا مگر بوگس!

کسی کو دے کے دِل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دِل ہی پہلو میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو
شبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
تو پھر اے سنگدِل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
گری ہے جس پہ کل تجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
ہوئے تم دوست جس کے دُشمن اُس کا آسماں کیوں ہو
تیرے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پہ مہرباں کیوں ہو
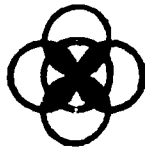
پُرانا سینما گھر پُرانی فِلم!

مسیح انجم

نام : محمد مسیح الدین
قلمی نام : مسیح انجم
مقامِ پیدائش : موضع دیلگٹور تعلقہ سدا سیو پیٹھ
ضلع میدک
۶؍اکتوبر ۱۹۳۳ء
تعلیم : بی۔اے، بی ایڈ (عثمانیہ)
پیشہ : درس و تدریس
(ایک پشت سے ہے پیشۂ آبا "مدرسی")
کمزوری : آج کا کام کل پر ڈالنا شاگردوں کے خوف سے ہوٹلوں اور سڑکوں پر کھاتے اور پیتے (سگریٹ) ہوئے گھبرانا۔
تصانیف : "سائیڈ سے چلئے" اور "در پردہ"

میں پُرانی فلمیں دیکھنا قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اور میں یہ بات اپنی عمر کا ایک بیشتر حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گزارنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔ جب آدمی کچھ کرنے کرانے کے قابل نہیں رہتا تو وہ صرف مشورے دیا کرتا ہے۔ اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے اکثر دانشور یہی کچھ تو کیا کرتے ہیں۔ جب وہ اپنی تین، چوتھائی زندگی لغویات میں، ناقابلِ علاج کی حد تک گزار لیتے ہیں تو وہ دوسروں کو ناقابلِ عمل مشورے دیا کرتے ہیں۔ تو ہمارا ناقابلِ عمل مشورہ یہ ہے کہ آپ پُرانی فلم ہرگز نہ دیکھیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ پُرانی فلم کسی پرانی محبوبہ کی طرح بور کرتی ہے بلکہ اصلی سبب یہ ہے کہ پرانی فلم دیکھتے ہوئے ایک فلم بین کو پھر ایک بار اپنے زمانہ طالب علمی کو آواز دینا پڑتا ہے۔ اَن پڑھ اور جاہل فلم بین فلم آپریٹر کو آواز دیتے ہیں — "ابے ساؤنڈ کھول!" — "پنکھے کھول!"

آپ یقین کریں یا نہ کریں، مجھے پرانی فلمیں دیکھتے ہوئے بارہا شدت سے یہ احساس ہوا کہ میں فلم نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ آئی۔ اے۔ ایس کیڈر کے ایک (Compe tative Exameination) میں حصہ لے رہا ہوں اور مجھے.... آبجکٹیو پیپر (objective paper) حل کرنا ہے۔ اُدھر جیسے ہی پردہ سیمیں پر ہیرو یا ہیرو ئمن کے مکالمے کٹے، اِدھر میں نے فوراً اپنی پچھلی یادداشت کو کام میں لاکر خانہ پُری کر لیا۔ اب آپ ہی بتائیے یہ آبجکٹیو پیپر (objective paper) نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ پرسوں ہی کی بات ہے کہ پُرانے

شہر کے ایک پرانے سینما گھر میں ایک بہت ہی پرانی فلم لگی تھی۔ یوں بھی پرانے شہر میں چند پرانی تاریخی عمارتوں اور چند پرانی تھیٹروں کے سوا رہ ہی کیا گیا ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی نیا سینما گھر تعمیر ہوا تو اس کی خیر نہیں۔ وہ اس علاقے کے شائقین سینما کے ایک نظر نہیں بھاتا جب تک کہ وہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اپنے اپنے گھروں کو چند اینٹیں نہیں لے جاتے۔

یہاں ٹکٹ خریدنا گویا ایک بہت بڑی مہم سر کرنا ہے۔ یہ مہم وہی حضرات سر کر سکتے ہیں جو گھونسہ پروف، لات پروف، شاک پروف اور واٹر پروف قسم کے ہوں۔ ورنہ کس شریف آدمی کو یہ پڑی ہے کہ وہ اپنا ٹرلین یا ٹیری کاٹ کا پیرہن صرف ایک معمولی ٹکٹ کے لئے تار تار کر لے یا اپنے جسم کے کسی اہم عضو کو ناکارہ بنا لے۔ یہاں جو کوئی قاعدے اور قانون کی پابندی کرتا ہے، وہ مارا جاتا ہے۔

سینما ہال میں داخل ہوتے وقت دروازوں سے احتجاجی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ لیکن ان احتجاجی صداؤں کو سینما گھر کے مالک یوں نظرانداز کر دیتے ہیں جس طرح فسادات کے وقت اقلیتوں کی چیخ و پکار۔ یہاں کی سیٹیں بھی کچھ کم تاریخی نہیں ہوتیں۔ یہ آپ کو آداب نشست و برخاست سکھاتی ہیں۔ جیسے ہی آپ نے رونگھنا شروع کیا، یا بے ڈھنگے پن کا ثبوت دیا، بس سمجھئے کہ تحت الثریٰ پہنچ گئے۔ بعض سیٹیں تو بالکل کشتی کی طرح ڈولنے لگتی ہیں۔ ان سیٹوں پر بیٹھ کر "تن ڈولے، من ڈولے" کا صحیح لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور بعض سیٹوں سے چوں چیں، چر کھٹ کی یوں آوازیں آنے لگتی ہیں جیسے مرڈر سین کے وقت خوفناک قسم کا آرکسٹرا بج رہا ہو۔ ہال میں داخل ہونے کے بعد ہر ایک شخص کو یہ آزادی حاصل رہتی ہے کہ وہ چاہے تو پردہ کی طرف منھ کر کے بیٹھے، یا پھر پلٹ کر بیٹھ جائے تاکہ عورتوں کو گھور سکے۔

ان سینما گھروں میں جب کبھی کوئی فلم زیادہ رش لیتی ہے تو زائد ٹکٹ جاری کئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سینما ہال کی دیواریں ربر کی ہوتی ہیں کہ جتنا چاہو وسعت دے لو۔ بلکہ طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ ہال کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بنچ اور ٹیبل رکھ دیئے جاتے ہیں۔ جو دیر سے آنے والوں کے لئے سزا کا کام دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا تو انھیں ہال کے دیواروں کے سہارے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر یا مرغا بن کر یا پھر دروازوں کے پردوں سے لٹک کر اپنے شوق دید کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ اب ہم آپ سے کیا چھپائیں ہم نے بھی ایک بار اسٹیج کے پردے کے قریب لیٹ کر فلم دیکھی تھی۔ ان سینما گھروں میں فلم دیکھنے والوں کے اعصاب کافی مضبوط ہوتے ہیں۔ ان پر نہ تو سردی کا اثر ہوتا ہے اور نہ گرمی کا۔ خیر سردی تو انھیں کیا ستائے گی۔ البتہ جب گرمی بہت ہی ستانے لگتی ہے۔ تو وہ قمیض اور بشرٹ اتار دیتے ہیں۔ شکر ہے کہ بات اس سے اور آگے بڑھنے نہیں پاتی۔

انھیں کھٹملوں اور مچھروں کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ تو ان کی باضابطہ پرورش کرتے ہیں۔ ان کے فلم دیکھنے کے انداز بھی بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ جب وہ موڈ میں آجاتے ہیں تو سیٹیاں بجانے لگتے ہیں۔ اور کبھی کبھار رقص بھی کرنے لگتے ہیں۔ ان کے لئے (Smoking prohibited) کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ حضرات اس تھیٹر کے نئے فلم بینوں کو بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں اگر کسی نئے فلم بین نے گرمی کی تاب نہ لا کر ہش ہش شروع کی، یا کھٹملوں کے کاٹنے پر پہلو بدلنے شروع

کہئے تو فوراً کوئی نہ کوئی یہ جملہ کس دے گا۔

"ارے کوئی نیا بلبل آگیا ہے!"

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ پرانے شہر کے ایک پرانے سینما گھر میں ایک پرانی فلم لگی تھی۔ یہ وہی فلم تھی جو میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں پانی پینے کے بہانے کلاس سے نکل کر اور والد بزرگوار کی جیب سے پیسے اُڑا کر میٹنی شو میں دیکھی تھی یہی وہ شہرہ آفاق فلم تھی جس کے انتظار میں شائقین سینما نے دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام کر لی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب یہ فلم ہمارے شہر میں ریلیز ہوئی تھی تو شائقین سینما نے پہلا شو دیکھنے کا اعزاز حاصل کرنے کے لئے رات ہی سے کیو میں اپنے اپنے بستر لگا دیئے تھے اور دوسرے دن کے ناشتہ کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ یہی نہیں بعض خواتین کی گودیں کیو میں ہی ہری ہو گئی تھیں۔ بھلا ایسی معرکتہ الآرا فلم مجھ سے کیسے چھوٹ سکتی تھی۔ جب تک یہ فلم ہمارے شہر میں دکھائی جاتی رہی۔ میں نے ہر روز ہر شو دیکھا۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے دن کے پہلے ہی شو کے دوران فلم کی ہیروئین نے میرے دل میں محبت کا بیج بو دیا تھا۔ جو رفتہ رفتہ ہر شو کے ساتھ ساتھ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ جی میں آتا تھا کہ میں اُسی فلم کا Represeutative بن کر فلم کے ڈبے کے ساتھ ساتھ شہر شہر گھوموں اور بالآخر بمبئی پہنچ کر ہیروئین کے قدموں پہ گر کر گڑگڑاؤں کہ اے ایرے ٹہ سیمیں کی ہیروئین! مجھ سے یہ فراق کے دن کاٹے نہیں کٹتے مہربانی کر کے تو مجھے اپنے فلیٹ کا دربان بنا لے۔

اب جب کہ دوبارہ پُرانے شہر کے پرانے سینما گھر میں "بالکل نئی کاپی" کے عنوان سے اس فلم کی "بالکل پرانی کاپی" دکھائی جا رہی تھی تو بھلا مجھ سے کیسے چپ رہا جاتا۔ کیونکہ محبت نے پھر ایک بار انگڑائی لی تھی۔ ناچار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور ایک دوست سے پیسے اُدھار لیکر سینما گھر کا رُخ کیا ہی تھا کہ راستے میں ایک پرانے قرضخواہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نے اپنے بچاؤ کی خاطر فوراً بلدیہ کے ایک Urinal کا رُخ کیا اور اس کے دوسرے راستہ سے چکمہ دے کر سینما گھر کی جانب روانہ ہوا۔ میرے پہنچنے تک کافی دیر ہو چکی تھی اور بکنگ بھی بند ہو گئی تھی۔ لہٰذا بلاک میں ٹکٹ خریدنا پڑا۔ جب میں سینما ہال میں داخل ہوا تو گھپ اندھیرا تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے ایک سیٹ کو خالی جان کر بیٹھنا چاہا تو کسی نے اس زور سے دھکا دیا کہ میں ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچا اور دھپ سے فرش پر گر پڑا۔ پھر دوسرے ہی لمحہ میں ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ تب کہیں پتہ چلا کہ ہال بالکل بھرا ہے۔ اب جو میں نے اٹھنا چاہا تو پیچھے سے آوازیں آئیں۔

"ارے بیٹھ! ارے ہٹ!"

فوراً خاک نشینی اختیار کرنی پڑی۔ اتنے میں پبلک کی سیٹیوں کی گونج میں اشتہارات کے سلائڈس پردہ پر نظر آنے لگے۔ پھر نیوز ریل شروع ہوئی۔ پھر کسی آنے والی فلم کا ٹریلر۔ پھر مزید ایک اور آنے والی فلم کا ٹریلر۔ میرے دل سے آہ نکلی — "کب تک میرے مولا!"....

----آخر کب تک "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں" کے مصداق پبلک کو ان ٹریلروں سے بہلایا جائیگا اور اصلی فلم کب شروع ہوگی۔ اتنے میں یکایک کچھ مکالموں کے ساتھ فلم شروع ہوئی — "شیلا! میں

اُس گدھے کے بچے سے .... ہوں ....
.... جس نے تیری ماں .... میری ماں .... شادی .... جلد ... لوٹوں گا۔
پھر جدائی کا گانا شروع ہوا۔ ہیروئین گانے لگی ـــــ
بچپن کی محبت کو ...... سے .... کرنا
جب ...... میری آئے .... کرنا

میں حیران کہ آخر یہ کونسی فلم ہے۔ یہ کرنا کیا ہے ـــ یہ کون کرنا ہے۔ اور اس فلم کی کاسٹ کیا ہے؟ پھر مجھے شبہ سا ہونے لگا کہ شاید جلدی میں ـــ میں کسی دوسرے سینما ہال میں گھس آیا ہوں۔ شبہ دور کرنے کی خاطر میں نے ایک بازو والے صاحب کو جھنجھوڑ کر پوچھا "جناب! یہ کونسا تھیٹر ہے اور یہ کونسی فلم ہے؟ کچھ اتنا پتا تو بتائیے؟" جواب میں ایک خاتون کی جھڑکی سُنائی دی" پتہ نہیں کدھر سے آجاتے ہیں شہدے۔ پولیس کو بلاؤں کیا؟" ـــ یا اللہ ایک نہ شد دو شد۔ فوراً آگے کی جانب کھسک گیا۔ اور پورے انہماک کے ساتھ پردے پر نظریں گاڑ دیں۔ اور دماغ پر زور ڈال کر سوچنا شروع کیا کہ کچھ تو فلم سمجھ میں آئے۔ مگر اتنے میں دیکھتا کیا ہوں کہ پردہ پر ایک بھونچال سا آگیا ہے اور تمام مناظر گڈ مڈ ہو رہے ہیں۔ یکایک پردے پر کالی گھٹا سی چھا گئی ـــ تارے سے چمکے ـــ بجلی سی چمکی اندھیرا چھا گیا۔ فلم جل گئی ـــ ٹن ٹن ٹن ـــ پردہ پر سلائیڈس کی بھرمار شروع ہوگئی۔ ("Smoking prohibited") "بادام چھاپ بیڑی پیجئے" ـــ

"اب ہم ایک نئے مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں"۔ انٹرول ـ پورا ہال روشنی میں نہا گیا ـــ چائے گرم۔ سوڈا لیمن ـــ پان بیڑی سگریٹ۔ لیکن میرا دماغ ان تمام ہنگاموں سے دور، گتھیاں سلجھانے میں معروف تھا۔ مجھے اس سین کے کٹ جانے کا کافی افسوس تھا جبکہ ہیرو اور ہیروئن ایک ہی مدرسہ میں عشق و عاشقی کے تمام مراحل طے کرتے ہیں۔ پھر وہ سین بھی تو نہیں تھا جب ماسٹر صاحب ہیرو کو مارتے ہیں تو ہیروئن کے ہاتھ پر مار کے نشانات اُبھر آتے ہیں۔ جنھیں وہ محبت کی نشانی سمجھ کر بڑی جتن سے دیکھ بھال کرتی ہے۔ یہی وہ اہم سین تھا جس نے مجھے فلسفہ محبت سکھایا تھا اور میں ہیروئن کا گرویدہ ہو چلا تھا۔ ابھی میں ان گتھیوں کو سلجھانے بھی نہ پایا تھا کہ گھنٹی کی ٹرن ٹرن نے میری توجہ پردہ کی جانب کروادی۔

کھیل کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔ وہی کٹی ہوئی فلم کے ٹکڑے وہی ہنگامہ وہی بے ترتیبی۔ جب ہیرو پورے موڈ کے ساتھ گانا گاتے ہوئے ہیروئن کی طرف لپکا تو ہیروئن کی ماں سامنے آگئی۔ ہیرو جب ویلن کو گالیاں دیتے ہوئے مارنے کے لئے آگے بڑھا تو ہیرو کا باپ آگیا۔ پھر وہ سین بالکل ہی غائب تھا جس میں ایک رقاصہ، رقص کے دوران ـ "یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا ہے نہ سیدھا اُلٹا" کی تیرہن کر پیش ہوتی ہے۔ اب بھلا پبلک میں تاب کہاں ارے مارو! ارے توڑو کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اتنے میں فلم نے خود دم توڑ دیا۔ میں توڑ پھوڑ کی آوازوں سے گھبرا کر لوگوں سے بچتے بچاتے، دیواروں سے ٹکراتے ہوئے باہر نکلا۔ لیکن افسوس کہ بش شرٹ کی ایک آستین اور چپل سے محروم ہوگیا۔

اس تلخ تجربے کے بعد سے میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ کبھی بھول کر بھی پرانی فلم پرانی تھیٹر میں نہیں دیکھونگا۔ اور اگر دیکھنا ہی ٹھیرا تو کوئی نئی فلم دیکھونگا اور کسی ایرکنڈیشنڈ تھیٹر میں دیکھونگا۔ چاہے اس کے لئے مجھے مقروض ہی کیوں نہ ہونا پڑے!!

XX

سَرپٹ حیدرآبادی

میرا پورا نام محمد اسد حسن انصاری ہے مزاحیہ کلام میں تخلص سرپٹ اور سنجیدہ کلام میں اسد ہے۔ میری پیدائش ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد کے مشہور محلہ مغلپورہ میں ہوئی میرا ددھیالی وطن لکھنو اور نانہیالی وطن حیدرآباد ہے۔

لکھنو یونیورسٹی سے مولوی، عالم، فاضل ادیب، دبیر کامل کے امتحانات کامیاب کئے ہندوستان کی علوم شرقیہ کی مشہور درس گاہ مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل لکھنو سے مولوی مولانا فاضل حدیث کی سندیں بھی حاصل کیں، طبیہ داجیہ کالج لکھنؤ سے الحکیم الفاضل کی سند اور امریکن ہومیو پیتھک کالج لکھنؤ سے ایم، ڈی، ایچ کی سند بھی حاصل کی ۱۹۷۶ء میں حکومت آندھراپردیش سے میں نے آر، ایم۔ پی کا بھی امتحان کامیاب کیا۔

۱۹۶۱ء سے میری مزاحیہ شاعری چل رہی ہے ۱۹۲۰ء سے سنجیدہ کلام کا بھی سلسلہ جاری ہے۔ میری تصانیف کے مندرجۂ ذیل قلمی نسخے فی الوقت طباعت کیلئے تیار ہیں۔

۱. الٹ پلٹ (تقریباً ڈیڑھ سو مزاحیہ قطعات)
۲. دھرگھسیٹ (تقریباً ڈھائی سو مزاحیہ غزلیات)
۳. نذرانۂ عقیدت (تقریباً پانچسو حمد و نعت و سلام و مناقب پر مشتمل سنجیدہ کلام)
۴. نیستان (تقریباً ڈیڑھ ہزار سنجیدہ غزلیات کا منتخب مجموعہ)

قطعات

عشق ہے یہاں تنہا، حسن ہے وہاں تنہا
دینگے کس طرح آخر، دونوں امتحان تنہا
میری میڈیم انگلش، اُن کی میڈیم تلگو
بیچ میں کریگا کیا، کوئی اُردو دان تنہا!

عاشقی میں مصلحت سے کام لینا چاہیئے
نام اپنا بھی برائے نام لینا چاہیئے!
ہر حسین سے اب وفائے عہد کی تحریر پر
دستخط یا کم سے کم ابہام لینا چاہیئے!

گھوڑے جوڑے کی رقم میں سارا بڑا پار ہے
آج کل شادی بھی اچھا خاصا کاروبار ہے
زندگی کیسے گزارے، گھر چلائے کس طرح
گھوڑے جوڑے کی رقم میں جس کو مار ہے

شاعر اپنے حلقے میں پینترے بدلتا ہے
کوئی شعر کہتا ہے، کوئی شعر اُگلتا ہے
کم بھی نہیں ہوتی روشنی حماقت کی
اک چراغ بجھتا ہے، اِک چراغ جلتا ہے

غزل

عجیب گورِ غریباں کا بھی سماں ہے میاں
جہاں نہ ہوں ہے کوئی اور نہ کوئی ہاں ہے میاں

پسپائی انسان کی دونوں کے درمیاں ہے میاں!
اِدھر زمین، اُدھر گردش میں آسماں ہے میاں

یہ دل ہی حسرت و ارمان کا ہے زچہ خانہ
یہ دل ہی حسرت و ارمان کا مرتباں ہے میاں

وجود دونوں کا اب بھی ہے بے قرار مگر
نہ اب وہ بیوی ہے بیوی، نہ وہ میاں ہے میاں

وہ نانختے بھی گئے، وہ خلیل خاں بھی گئے
نہ نانختے ہیں کہ اب وہ خلیل خاں ہے میاں

ہمارا اللہ ابھی پر ہمیں اُڑاتا ہے
زمین نہیں ہے ہماری یہ آسماں ہے میاں!

وجود مرغی کا پہلے ہوا کہ انڈے کا!!
جو چیستاں تھی ابھی تک وہ چیستان ہے میاں!

ہماری کی جو زباں ناشتے میں کھاتا ہے
وہی ادیب تو بس صاحب زباں ہے میاں!

اسی مریض کو کہتے ہیں لوگ دق کا مریض
بغیر گوشت کے جو صرف ہڈیاں ہے میاں!

جیسے بھی قدر رہو منظور اپنی مرجائیے
زمانہ ان دنوں مُردوں کا قدرداں ہے میاں!

وہ شاعری کا ہو میدان کہ گھر کے ہنگامے
جہاں بھی دیکھئے سرپٹ رواں دواں ہے میاں

○

محفل میں اپنا رنگ جمانے کی دیر ہے
غزلیں چرا چرا کے سُنانے کی دیر ہے

سلجھینگے سارے اُلجھے ہوئے مسئلے بھی
ہر مسئلے میں ٹانگ اُڑانے کی دیر ہے!

گمراہ شوق راہ پہ آنے کے ہے قریب
دو ایک ڈھول اور بجانے کی دیر ہے!

دوزخ کی سیر کرے گا ہر کوئی جیتے جی
جنت ہتھیلیوں میں دکھانے کی دیر ہے!

غنڈوں کی غنڈہ گردی کی تکمیل کے لئے
کچھ دبوؤں کو اور دبانے کی دیر ہے!

ہر بے وفا خود اپنے کو مارے گا جوتیاں
اہلِ وفا کے جوتیاں کھانے کی دیر ہے!

مجبور ہو کے بدلینگے طرزِ عمل وہ خود!
بیمارِ غم کے ڈھونگ رچانے کی دیر ہے!

ہے ہاتھ کی صفائی میں باقی کسر ابھی
کچھ جیب صاف کرکے دکھانے کی دیر ہے!

آمادہ جنگ پر ہیں اُدھر وہ تو میں اِدھر
سب ٹھیک ہے لگانے بجھانے کی دیر ہے!

باقی ہے دائرے میں بس اک قبر کی جگہ
سب آچکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے!

سرپٹ کے سر ہی سہرا رہے گا مآل کار
محفل سے شاعروں کو بھگانے کی دیر ہے

اب جب کہ ہم اپنے نئے نوکر "پیرو" کا آپ سے تعارف کروانے جا رہے ہیں تو اس موقع پر آپ ہم سے یہ ضرور دریافت کریں گے کہ بھئی پُرانے نوکر کو کیوں نکالا؟ آیا وہ تھا بھی یا نہیں؟ یا زندگی میں نوکر رکھنے کا پہلا اتفاق ہے۔ لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس جہانِ فانی میں قدم رکھتے ہوئے ماں باپ کے بعد جس ہستی کا دیدار نصیب ہوا تھا وہ نوکر ہی ہے۔ بلکہ ہم تو وہ خوش نصیب ہیں جنھیں اونچے گھرانے کے لوگوں کی طرح ماں باپ سے زیادہ نوکروں کا پیار ملا ہے۔ اور متعدد بھلے چنگے نوکر ہم کو روتا، بلکتا چھوڑ گئے۔

دراصل اس نئے نوکر کو خوش آمدید کہنے کی وجہ ہمارے پُرانے نوکر "بکھنٹو" کا اچانک خدا حافظ کہہ دینا ہے جو دو دن کی چھٹی مانگ کر گیا تو پورے ڈھائی سال ہوگئے بالکل لاپتہ ہے۔ اور اُس کی پُراسرار گمشدگی ہمارے لئے معمّہ بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ ہم اُن لوگوں میں سے نہیں جو نوکروں سے دھوبی کے گدھے کی طرح کام لیتے ہیں۔ اور اُسی طرح کا سلوک کرتے ہیں یا اُن سے اتنا کام لیتے ہیں کہ صبح کھائی ہوئی کیسی ہی مقوی غذا ہو آدھے گھنٹے کے اندر ہضم ہو جاتی ہے۔ یا پھر ہمارے پڑوسی لالہ کی طرح صرف ہنگامی حالات میں ایک عدد نوکر رکھ لینے کا خبط بھی نہیں ہے۔ یعنے وہ اُس وقت نوکر رکھیں گے جب اُن کو پانچ ہزار مربع گز رقبہ پر مشتمل مخدوش حویلی کی داغ دوزی یا سفیدی کرانی ہوگی۔ یا گھر کی کوئی ماؤنٹ

۱۹۵۱ء کے ایک مبارک دن میں نے ضلع نظام آباد میں آنکھیں کھولیں اور کسی نا مبارک دن آنکھیں بند بھی ہوجائینگی والد ماجد نے میرا نام محمد عبدالحنّان رکھا اور 'حنّان' کو نمایاں کرنے کی چکر میں میں نے 'محمد عبدل' کو "ایم۔ اے" میں بدل دیا۔ ۱۹۷۲ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ لائبریری سائنس میں ڈپلوما کیا۔

۱۹۷۱ء میں پہلا مزاحیہ مضمون لکھا، جو شگوفہ کے سالنامہ میں شائع ہوا۔

حال ہی میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام میرے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "گستاخی معاف" منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

ایورسٹ کے مماثل دیوار کو ڈھانا اور اُس کا ملبہ اُٹھانا مقصود ہوگا۔ یا پھر دو چار باولیاں کھدوانی یا دس پندرہ موریاں کھلوانی ہوں گی۔ جس عمل سے نہ صرف نوکر بھاگ جایا کرتے ہیں بلکہ اُس دن سے نوکر اور مالک میں سانپ اور نیولے کا سا بیر ہو جاتا۔ یہ بھی سُنا ہے کہ نان ویجیٹرین نوکر ویجیٹرین گھرانے میں سانس نہیں لے سکتا۔ اور ویجیٹرین نوکر کا نان ویجیٹرین گھر میں دم گھٹتا ہے۔ لیکن یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ صاحب جہاں ویجیٹرین اور نان ویجیٹرین کھانوں کا مضبوط اتحاد ہو وہاں بھی نوکر آج کل کے گھر آئے مہمان کی طرح دو چار ماہ کیوں نہیں رہنے پاتے اور قدیم زمانے کے مہمانوں کی طرح دو تین ہفتوں میں کیوں رفو چکر ہو جاتے ہیں اور پھر کسی نئے نوکر کو تلاش کرتے ہوئے ہم کو چکر پہ چکر آنے لگتے ہیں۔

چنانچہ اس ماہ ہمارے گھر آیا ہوا نیا نوکر بھی چھ ماہ کی لگاتار کھوج اور انتھک جد وجہد کا نتیجہ ہے۔ جو وضع قطع اور چال ڈھال سے کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں دکھائی دیتا۔ گھوڑوں کے ایال جیسے لمبے لمبے بال، سیاہ فام چہرہ پہ صبح و شام سیاہ چشمہ چڑھا ہوا، "چگی" ڈاڑھی، کمر کے گرد تپے ہوئے فولاد جیسا گومڑوں والا بیلٹ ہر وقت کسا ہوا، زندہ، مردہ اور بے ہوش جانوروں کی، تصویروں والا بیل باٹم پوشاک اور کالے کالے ننگے پیر۔

اوّل تو ہم ایسے خطرناک خد و خال آدمی کو نوکر رکھنا تو کجا گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے جس کو دیکھ کر نہ صرف معصوم بچے ڈر جائیں بلکہ ہفتوں اُن کا بخار نہ اُترے گا۔ لیکن وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ کہنا پڑتا ہے۔ نوکروں کی شدید قلّت اور انہیں ڈھونڈنے کی اذیّت سے فی الفور نجات پانے کے لئے ہم نے اُسے اپنے ہاں مُلازم رکھ لیا۔ لیکن اب پچھتا رہے ہیں۔

کیونکہ ایک تو یہ مسٹر، کلکٹر یا کسی آئی۔ اے۔ ایس عہدہ دار کے ہاں کام کرنے کا قائل ہے۔ جہاں سے معقول تنخواہ اور پیٹ بھر غذا کے ساتھ رہنے کے لئے ہمارے گھر سے بڑھ کو اوٹ مل سکتا ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے اسے نوکر رکھا گیا ہے وہ اُن ہی کاموں سے شدید نفرت کرتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد غیر معیّنہ مدّت تک قیلولہ کرنے کا عادی ہے۔ اور یہ کام بھی ایسا کرتا ہے کہ دیکھنے والے کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ یعنے انا لانے راشن شاپ بھیجو تو دکان کھلنے سے دو گھنٹے قبل ہی گھر سے نکل جائے گا۔ اور دکان پر سب سے پہلے دھونی رما دے گا۔ لیکن جب دکان پر آہستہ آہستہ ہجوم ہو جائے گا تو آگے بڑھ کر غلّہ لینے کے بجائے فوراً اپنی جگہ دو چار آنے لے کر کسی دوسرے گاہک کو دے دے گا۔ جس طرح اسٹیشنوں پر قلی کرتے ہیں اور اطمینان کے ساتھ بیڑی کے کش کھینچتا ہوا سب سے آخر میں کھڑا ہو کر چین کی بنسی بجاتے گا۔ بلکہ یہاں بھی اُس سے نچلا نہ بیٹھا جائے گا۔ کسی کو ہمارے تھیلے مستعار دے دے گا۔ اور کسی کو سیل اور دوسرے چھوٹے بڑے کاموں میں ہاتھ بٹا کر پیسے ٹرخائے گا۔ پھر تھیلے سیل اور اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے جب دکان کا وقت ختم ہو جائے گا تو گھر آکر بڑی ڈھٹائی سے کہے گا کہ راشن لینے والوں کے بے پناہ ہجوم اور افراتفری

وجہ سے اسے غصہ نہ بل سکا۔
اس طرح دودھ لانے جائے گا تو بجائے اپنا کام کرنے کے دودھ والے سے گپ شپ لڑائے گا۔ اور اس سے دریافت کرے گا کہ یہ دودھ گائے کا ہے یا بھینس کا، جڑی بوٹی کا ہے یا علی قلی پارک کی گھاس کا۔ اس دودھ پر اس کا کمیشن کیا ہے۔ اس کی بالائی کون کھاتا ہے، پانی ملانے کا تناسب کیا ہے؟ اوسطاً کتنا دودھ بچ رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر دودھ والے سے ان سوالات کے جوابات یا گالیاں سن کر اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے قریب میں مسطح زمین ڈھونڈ کر اپنی کچی نیند کو پوری کرے گا۔ پھر دھوپ کی حدت یا دودھ والے کی چپت سے بیدار ہو کر بوتلوں سے دھویا ہوا پانی دودھ سمجھ کر لے آئے گا۔
ترکاری کتنی ہی باسی اور سڑی گلی کیوں نہ ہو پورے خضوع اور خشوع کے ساتھ خرید لائے گا۔ اور اپنی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہی لائی ہوئی سبزی سے آدھے سے زیادہ کچرا نکال کر پھینک دے گا۔ اور بڑے فخر سے سینہ تان کر کہے گا۔ "کہ دیکھئے میں نے صرف ایک آدمی سے تین کیڑے نکالے ہیں۔
اس کی ان بے شمار خوبیوں اور لاپرواہیوں سے بدظن ہو کر جب بیگم صلواتیں سنانا شروع کر دیں تو آکر ہم سے شکایت اس ڈھٹائی سے کرے گا کہ صاحب! بیگم صاحبہ آپ کو گھڑکیاں دے سکتی ہیں، ڈانٹ ڈپٹ کر سکتی ہیں، حملہ آور بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر ان کو مجھے کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ میں شوہر نہیں نوکر ہوں!
اسے ہماری بدنصیبی ہی کہنا چاہیئے کہ ہمارا نیا نوکر، کام کاج کرنے سے زیادہ گپیں ہانکنے اور ڈینگیں مارنے میں ماہر ہے۔ وقت بے وقت سابق مالکوں کے قصّے اور مبالغہ آمیز مزے لے لے کر سناتا ہے۔ کہتا ہے "ہمارے ایک پرانے مالک اپنے بیٹے سے زیادہ مجھے چاہتے تھے دسترخوان پر اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ ایک صاحب تو مہینے بھر کی تنخواہ بیگم کے بجائے اس کے ہاتھ میں لاکر رکھ دیتے تھے۔ اور ایک پائی کا حساب تک نہ مانگتے تھے۔ یہاں تک کہ شادی بیاہ میں بھی سب سے پہلے اس سے صلاح لیتے تھے۔ چنانچہ ان کی سات شادیاں کرانے کا سہرا اسی کے سر ہے اور انجام کار خودکشی کا مشورہ دینے والے بھی یہی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ ایک آقا کے دل پر تو اتنا چڑھا ہوا تھا کہ وہ اپنی ساری جائیداد اس کے نام کرنے والے تھے۔ لیکن عین وقت پر ان کے ناخلف فرزندوں نے مجسٹریٹ کا سرٹیفکٹ پیش کر کے انہیں پاگل قرار دیدیا۔
اس نئے نوکر کو ہمارے گھر آئے جمعہ، جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن یہ برسوں کے رفیق کی طرح بے تکلفی کی حد تک ناک چڑھا ہو گیا ہے۔ جو منھ میں آئے کہہ دیتا ہے۔ اور جدھر سینگ سمائے نکل جاتا ہے۔ حال ہی کی بات ہے جب ہم کو شیونگ کرتے ہوئے دو ایک زخم آگئے تو بے ساختہ کہہ اٹھا: "صاحب! یہ آپ کو جرنیٹے کیسے لگے ہیں" یا آپ دن پر دن اوپن ٹاپ ہوتے جا رہے ہیں۔ یا پھر یہ کہ آپ کو محلے کے لوگ زن مرید کیوں کہتے ہیں وغیرہ۔" یہ گفتگو کوئی سن لے تو سمجھے گا موصوف نوکر نہیں بلکہ ہمارے لنگوٹیا یار ہیں۔
اس کی ایک اور بڑی عادت یہ ہے کہ یہ جس تھالی میں کھائے گا اس میں چھید

کرے گا۔ چنانچہ اس سے قبل وہ جن صاحب کے ہاں ملازم تھا اُن کو "کدو" کے نام سے شہرتِ دوام بخش چکا ہے۔ اُس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُن کے گھر ملازمت کے دوران جب کبھی وہ پوچھتا کہ "صاحب! آج کیا پکائیں؟" تو وہ فوراً کہتے "رات کا خشکہ بچا ہے۔ بس کھٹا بنا دو"۔

اس کی ان تمام خوبیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ہم اسے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہمیں اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ "کدو" صاحب کی طرح ہم کو بھی کسی نئے لقب سے نہ نواز دے کیونکہ اُسے ہمارے گھریلو حالات و معاملات کا اچھی طرح علم ہو چکا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ہماری کوئی نوکری وغیرہ نہیں ہے۔ ہمارے خسر ہم کو ہر ماہ سو گالیاں دے کر سو روپے روانہ فرما دیتے ہیں۔ ہم بیوی کی پرانی ساڑیوں کے بشرٹ بنا لیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں گوشت صرف عیدین کو پکتا ہے۔ آدھا پاؤ دودھ میں ہم تھوڑا سا بچے کو پلاتے ہیں کچھ چائے کے لئے رکھ لیتے ہیں باقی بچے ہوئے دودھ کا دہی جمانے کی کوشش کرتے ہیں وغیرہ۔

ان حالات میں نوکر کے بارے میں کچھ کہنا مصلحت کے خلاف ہے۔ کہیں یہ گھر کا بھیدی لنکا نہ ڈھا دے۔ اس لئے خاموشی ہی بھلی ہے۔

مصطفیٰ علی بیگ ؒ

جامعہ عثمانیہ کے گریجویٹ ہیں ! زندہ دلانِ حیدرآباد سے ابتدا ہی سے تعلق ہے۔ اِن دنوں زندہ دلان کے معتمد بھی ہیں۔ اپنے خاص 'اینگلو اُردو' انداز میں شعر کہتے ہیں۔ اِسٹیج اور ریڈیو کے مقبول فن کار ہیں۔
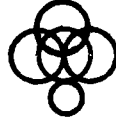
چہرہ کیا ہے رنگوں کی گلکاری، آئی ایم ساری
بن میک اَپ کے آپ لگیں نہ ناری، آئی ایم ساری

چھوٹے قد کو فیٹ کہیں ہم، لانبے کو اسپالا
موٹے بھدّے ہیں لی لینڈ کی لاری، آئی ایم ساری

باس بلا ہے غصہ والا، وائف بلی ہے لڑاکا
دفتر اور گھر میں بھی بم باری، آئی ایم ساری

گارڈن گارڈن ڈریسنگ جن کی اور زُلفیں ہیں لانبی
پوچھو تو یہ نر ہیں یا کہ ناری، آئی ایم ساری

ٹاپ گھرانہ، ہائی سوسائٹی، باتیں جن کی اُونچی
لو لیول کی گھر میں مارا ماری، آئی ایم ساری

پاپ سے اِنکم، پُن سے خرچہ اور ڈسکاؤنٹ میں شہرت
ٹھاٹ سے یہ بھی جاری وہ بھی جاری، آئی ایم ساری

غزلیں

خالی نہ بیٹھ کچھ تو قیامت اُٹھا کے دیکھ
مضبوط کتنے ہوتے ہیں یہ آزما کے دیکھ
عشاق کے دلوں کے پرخچے اُڑا کے دیکھ
ڈینگ مارنے کا شوق ہے تجھکو اگر اے دوست
پایا نہ جو کسی نے وہ "ایوارڈ" پائے گا
مُردے بھی چیخ مار کے بھاگیں گے جانِ من
گر دیکھنا ہے تجھ کو نکموں کی فوج کو
بوڑھی ہوئی تو کیا ہوا ابھاری ہے چارپر
مرنا کوئی تو چھانپ میں ممکن ہے پھنس ہی جائے
آ تینگے دھوبیوں کے گدھے دوڑ دوڑ کر

نکٹے کے آگے ناک تو اپنی کٹھا کے دیکھ
عاشق کی کھال کے کبھی جوتے سلا کے دیکھ
ترپٹ نظر سے یار "اٹم بم" گرا کے دیکھ
سرکاری نَل کی ٹونٹی میں گل کو پھنسا کے دیکھ
گنجے کی کھوپڑی پہ تو دھنیہ اگا کے دیکھ
میک اپ بغیر سامنے اُن کے تو آ کے دیکھ
دفتر میں بلدیہ کے کسی روز جا کے دیکھ
اپنی "پرانی ناٹ" کی آئلنگ کرا کے دیکھ
تو بھی ملے یار لٹھ کو ہوا میں گھما کے دیکھ
پاگل کی یہ غزل ذرا گنگنا کے دیکھ

○

سیزن ہے کتنا رانگ ارے باپ کیا کروں
بیگم ہے کنگ کانگ ارے باپ کیا کروں
کیا جانے کیا لکھا تھا گرُ بیبے کے جوشش میں
طبلہ بجا کے سر پہ وہ کہتے ہیں گاڈ نا
جب ہو چکا نکاح تو یہ راز بھی کھلا!
اولاد ہٹ کٹی یہ کہتی ہے باپ سے
شرمندہ اُس کے آگے اب اک قطب مینار
شوٹنگ کے بعد کہتے ہیں وہ ہلے اللہ اب
دُولہن بضد ہے اپنی ہنی مون کے لئے
پاگل اب ٹیلی فون کروں ان کو کس طرح

دیتی ہے مُرغی بانگ ارے باپ کیا کروں
توڑی ہے میری ٹانگ ارے باپ کیا کروں
غنڈوں کی لائے گیا نگ ارے باپ کیا کروں
"محمد رفیع" کا سانگ ارے باپ کیا کروں
لنگڑی ہے اُن کی ٹانگ ارے باپ کیا کروں
جابڈ ھے بھیک مانگ ارے باپ کیا کروں
دل بر ہے کتنا رانگ ارے باپ کیا کروں
کس کس کرے ہے آنگ ارے باپ کیا کروں
جائیگے ہانگ کانگ ارے باپ کیا کروں!
نمبر ہے اُن کا رانگ ارے باپ کیا کروں

نام احمد شریف تخلص پاگل
وطن مالوف نظام آباد،
پیشہ درس و تدریس
بغرض ملازمت عادل آباد
میں قیام پذیر ہوں۔ بچپن
ہی سے فطری رجحان
طنز و مزاح کی طرف تھا
مگر باضابطہ مزاحیہ شاعری
کا آغاز ۱۹۷۰ء سے کیا
پچھلے سال میرا ایک شعری
مجموعہ "الم غلم" بزم تعمیر
ادب کے زیر اہتمام شائع
ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ
چوں چوں کا مرّبہ زیر
طبع ہے۔ زندہ دلان
حیدرآباد کے توسط سے
اب تک ملک کے مختلف
حصّوں میں منعقدہ متعدد
آل انڈیا مشاعروں میں
شرکت کر چکا ہوں۔
زندہ دلانِ حیدرآباد اور
اس کے ترجمان ماہنامہ
شگوفہ نے جو ان دنوں طنز و
مزاح کے باب میں مرکز ثقل کی
حیثیت رکھتا ہے میری شعری
صلاحیتوں کو اُبھارنے اور
اُسے پروان چڑھانے میں
بڑا حصّہ لیا ہے۔
پاگل عادل آبادی

رشید عبدالسمیع جلیل

نام رشید عبدالسمیع۔ تخلص جلیل۔ پیدائش ۱۹۴۵ء مقام قبضہ مکہّ راج پیٹ تعلقہ ضلع میدک ریاست آندھرا پردیش۔ تعلیم ایم۔ اے سیاسیات عثمانیہ یونیورسٹی۔ گھرانا عالمانہ۔ انداز عاشقانہ۔ مزاج شاعرانہ۔ کلام قادرانہ۔ رنگ ادیبانہ نظم کے میدانِ ثلاثہ (سنجیدہ، طنزیہ و مزاحیہ) میں ذوقِ شہسواری۔ ثانیاً شوقِ مضمون نگاری تسلم محکمۂ خزانہ و حسابات کا دبیر ہاتھ شگوفہ کے نصیر قدم زندہ دلی کے سفیر دل زلفِ کمالِ فن کا اسیر سنجیدہ شاعری کا پہلا مجموعہ ترتیب کے مراحل میں ہے۔ رخِ زندگی ہنوز دید کی منزل میں ہے۔

غزل

کبھی ہم جو پی کے سنک گئے تو قدم ہوا میں جما دیئے
جو شگوفے پہلے کھلے نہ تھے ہم اُچھل اُچھل کے کھلا دیئے

وہ عجائبات زباں کریں، وہ جدیدیات بیاں کریں
وہ مغلّظات رواں کریں، کئی شعر تازہ سنا دیئے

کسی راہرو کو پکڑ کے ہم، اُسے بازوؤں میں جکڑ کے ہم
یہ خمارِ بادہ اکڑ کے ہم، وہ حجابِ زیریں اُٹھا دیئے

وہ جو ہم نے پی کے اُگل دیا، رہے جھونک میں تو کھندل دیا
وہی یعنی رونقِ بلدیہ، جسے مکھیوں کو چٹا دیئے

وہ اگرچہ کوئی غریب تھا، دمِ میکشی تو جیب تھا
وہ سگِ غلیظ قریب تھا اُسے پیار کر کے بھگا دیئے

چلے ہم جدھر تو زمیں چلے، نہ مکاں چلے نہ مکیں چلے
یہ نظامِ شمسی نہیں چلے، یہی حکم پی کے چلا دیئے

کبھی گر کے شور مچا دیئے، کبھی اُٹھ کے سب کو گرا دیئے
کبھی زور اپنا دکھا دیئے، کبھی سب کو اپنی ہرا دیئے

جو نشہ کی آگ بھڑک اُٹھی، ہمیں یوں لگا کہ سڑک اُٹھی
رگِ قرض اپنی پھڑک اُٹھی تو پولس کی ڈیوٹی بجا دیئے

ہوئی فصلِ گل تو لٹک گئے تجھے یاد کر کے اُچک گئے
نہ خبر کہ گال پچک گئے نہ پتہ کہ توند پھُلا دیئے

ہوئے پی کے ڈھت تو سدا اٹھی کہ پڑوسیوں سے نہیں بنی
پکی ایسی کھچڑی کہ ٹھنی کہ جسے کھا کے زور پھُلا دیئے

کسی زلفِ ناز میں پھنس گئے تو سفید شہر میں بس گئے
کبھی دید کو جو ترس گئے تو لپک کے جام چڑھا دیئے

غمِ عاشقی کے یہ دل جلے کبھی اُٹھ کے پچھلے پہر چلے
درِ میکدہ نہ کھلا ملے تو چمن میں دھونی رما دیئے

نہ امیر ہم نہ فقیر ہم، غمِ زندگی کے اسیر ہم
کبھی پی لیئے تو وزیر ہم نہ ہوئے تو لوگ بنا دیئے

وہ جو دل میں بنتِ عنب رچی تو نظر میں کوئی نہیں جچی
کوئی شئے بھی گھر کی نہیں بچی کہ جلیلؔ اُسی پہ لٹا دیئے
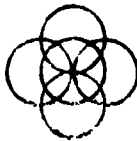
کہتے ہیں فیض اُس کو

نام میرا فیض الزماں ۔۔۔ میں ہوں جہازِ ریگستاں
پیدائش معلوم نہیں ہے ۔۔۔ ماہ محرم یا شعبان!
شہرت اِن سے میرے شہر کی ۔۔۔ چارمینار اور چارکمان
دفتر میں ہوں ڈرافٹسمین! ۔۔۔ نرمی بنالو آپ مکان
لکھو مختصر حالات اپنے! ۔۔۔ بوگس کا ہے یہ فرمان!

دُعا ہے بس اتنی سی مولا
رہے سلامت زندہ دِلان

○

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی ۔۔۔ یہ تو بالکل غلط ہے بیاں دوستو
اَب سنئے پُل میں وہ بات باقی نہیں ۔۔۔ جب سے ٹوٹی ہے اس کی کماں دوستو
قاضی صاحب تو نکلے بڑے نمبری ۔۔۔ اُن کی تعریف کیا ہو بیاں دوستو
مارکیٹ میں پڑا سڑ رہا ہے مگر ۔۔۔ پھر بھی مہنگا رہا ہے نشان دوستو
شیخ نے کی ضیافت بڑی شان سے ۔۔۔ تھیں چرائی ہوئی مرغیاں دوستو
آستین میں چھپا کر وہ چلتے بنے ۔۔۔ ہیں کھڑے چوستے نلیاں دوستو
ہڈیاں رہ گئی ہیں فقط جسم پر ۔۔۔ بیویاں نوچ لیں بوٹیاں دوستو

فیض تو پہلوانِ سخن ہے مگر!
شعر جتنے بھی ہیں ناتواں دوستو!

○

ہے نوکری تو نقد میں تنخواہ اُدھار میں ۔۔۔ لگتا نہیں ہے جی میرا آفس کے کار میں
پیرس میں دِل ہے میرا تو لندن میں ہے دماغ ۔۔۔ آتا نہیں ہے کوئی شمار و قطار میں
اَڈوانس لیکے جاؤں میں آفس سے کس طرح ۔۔۔ سکھ اور پٹھان گیٹ پہ ہیں انتظار میں
مہنگائیوں کی نذر آتا تھا ہوا تمام ۔۔۔ اب زندگی گزار رہا ہوں اُدھار میں
نقشِ عمل کا ردِّ عمل اُن پہ ہو تو ہو! ۔۔۔ اشخاص وہ جو رہتے ہیں جورو کی مار میں
صنعت سمجھ کے عشق کو سرمایہ دار نے ۔۔۔ دولت لٹا رہا ہے اُسی کاروبار میں
جو شاعری کو کھیل سمجھتے ہیں آج کل ۔۔۔ یہ مورِ ناتواں ہیں بھلا کس شمار میں
کہنے کو لاکھ کہتا ہے کرتا نہیں ہے کچھ ۔۔۔ تاثیر کیسے آئیگی واعظ پکار میں
آنسو میں اُنکے میری جھلک بھی سما گئی ۔۔۔ اَٹکا ہوا ہوں قطرۂ مژگانِ یار میں

آنکھوں میں دھول جھونک کے جانا پڑیگا فیض
ڈیرا لگا ہے غنڈوں کا اب کوئے یار میں

سخن فہم لوگ

محمد برہان حسین

ایک مشاعرہ میں ایک صاحب ہر شعر لکھتے جاتے تھے۔ ہم نے کہا: "لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اشعار چھپے ہوئے آپ کو مل جائیں گے۔" تو وہ بولے: "یہ میری عادت ہے۔"
ایک طرف دو حضرات بغلگیر ہوتے ہوئے باتیں کر رہے تھے، اُن سے کہا گیا: "بھائی صاحب مشاعرہ سُنیئے۔" تو وہ بولے: "سارا مشاعرہ چھپا ہوا مل جاتا ہے، مگر ہم دوست صرف مشاعروں میں ہی ملتے ہیں۔"

دہلی میں غالب صدی کا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ایک عورت نے دوسری سے کہا: "اب چل بھی بڑی شاعر بنی پھرتی ہے۔" تو شاعرہ نے کہا: "ٹھہر جا: ابھی گالب صاحب گزل سنائیں گے پھر چلوں گی۔"

لیجئے صاحب شاعروں کو یہ غم کہ ہم سخن فہم نہیں —
ہم کو یہ شکایت کہ وہ اہلِ سخن نہیں۔

انیس نے کہا:

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

تو لوگوں نے کہا ہم بھی آپ کے اشعار کو ہزار ڈھنگ سے پڑھیں گے۔ بقول شفیق الرحمن:

ناحق ہم سنگوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہے سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

ہمارے پڑوس میں سش فو میاں لاوڈ اسپیکر والے مشاعروں کے شاعر گر ہیں۔ انہوں نے کتنے ہی چھوٹے موٹے

محمد برہان حسین کو "شگوفہ" نے پروان چڑھایا ہے وہ حیدرآبادی ہیں اور عثمانین بھی۔ اپنے زمانہ کے بہترین ہاکی کے کھلاڑی رہے۔ ریجنل ریسرچ لیبارٹری حیدرآباد میں سائنٹسٹ کے عہدہ پر ہیں۔ مزاح کے علاوہ، سائنسی اور مذہبی فلسفہ پر بھی مضامین لکھتے ہیں۔ جو اخباروں ریڈیو اور رسالوں کی زینت بنتے رہے ہیں۔ سائنسی معلوماتی ڈرامہ "آرشمیدس" لکھ کر ریڈیو پر پیش کیا جو بے حد پسند کیا گیا۔

شاعروں کو ایک ہی مشاعرہ میں آل انڈیا بنا ڈالا۔ ان کی تکنک بڑی ماڈرن ہے۔ جب مشاعرہ میں کسی شاعر کو داد ملتی ہے تو یہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو خوب بڑھا دیتے ہیں۔ اور آوازیں اس قدر شدید ہوجاتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شعر نے دھماکہ کر دیا۔ اور شاعر نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ چنانچہ ان کے کمال کا یہ جادو ہے کہ جس طرح فلمی ہیرو اپنے لئے کشور کمار کی آواز کی شرط رکھ کر معاہدہ کرتے ہیں شاعر ان کے انتظام لاؤڈ اسپیکر کی شرط رکھتے ہیں۔ ہاں تو ایک دن شرفو میاں نے ہم سے پوچھا: "آپ نمائش میدان کے مشاعرہ میں نہیں آئے؟" ہم نے کہدیا: "بھئی! ہم جوش و جگر کے زمانہ کے سامع ہیں۔ یہ نئے شاعر کچھ ہمارے پلے نہیں پڑتے"

تو وہ بولے: "کمال ہے آپ نے سُنا بھی نئے شاعروں کو..... آپ نے چراغ علی کو سُنا ہے" "نہیں سُنا نا!" حالانکہ وہ آج کل ہر دلعزیز شاعر ہے..... ہر پان کے ٹھیلہ پر، آٹو رکشاؤں پر یہاں تک کہ سیکل رکشاؤں پر تک اُسی کے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ ویسے اب علامہ اقبال کا یہ شعر آپ کو کسی رکشہ پر نظر نہیں آتے گا۔

ہم آٹو والوں کی بھی ایک عمر بسر ہوتی ہے
شام ہوتی ہے ہم دم نہ سحر ہوتی ہے

آپ کو میں چند اشعار اس کے سنواؤں گا۔ ذرا میں اپنی سب سے چھوٹی سالی کو بلاؤں انہوں نے آواز لگائی۔ "گوری بی! اوبھئی گوری بی!" یک لخت پردہ اُٹھا اور ایک پستہ قد سیاہ فام خوب موٹی معمر عورت وندناتی ہوئی داخل ہوئی اور اٹھلا کر بولی: "بھائی جان آپ تو میری صورت سامنے سے ہٹنا نہیں بولتے" پھر اُس نے مجھے دیکھا اور اسی رفتار سے پلٹی: "اوئی! مردؤوں کے سامنے بُلالیتے مجھے" شرفو میاں نے کہا: "ارے بھائی! آؤ، آؤ بچیوں کا کاہے کا پردہ وہ بھی بزرگوں سے" اچھا تم چراغ علی کے اشعار تو لے آؤ۔

گوری بی نے شرما کر کہا: "بھائی جان! آپ مردؤوں کے متعلق میرے سے بات ہی مت کرو۔ آپ کو تو معلوم ہے میں کسی مرد کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ مگر آپ کونسے چراغ علی کو پوچھ رہے ہیں۔ ایک چراغ علی تو بھائی کے دوست ہیں نا! جنہوں نے بال بڑھا لئے ہیں۔ اور باریک مونچھیں رکھ لی ہیں۔ دوسرے اپنے پڑوس والے ہیں۔ جو گلاب کے پھول بھجواتے ہیں ذرا کالے ہیں مگر اُن کی آنکھیں بھوری ہیں۔ تیسرے تو آپ کے کزن ہی ہیں۔ اُن کے بھی بھورے بال اور لال ہونٹ ہیں نچلا ہونٹ تو موٹا مگر بڑا سکسی (Sexy) ہے۔

شرفو میاں بولے: "ارے یہ سب نہیں بھئی۔ نمائش میدان کے مشاعرہ والے چراغ علی"
گوری بی: "کونسے مشاعرہ والے، جس میں وہ رضا صاحب کے داماد مجھے آنکھ مارے تھے"
شرفو میاں نے کہا: "اری منی اُس مشاعرہ میں تو نے گلابی جھولدار شلوار پہنی تھی اور بڑی آ کا چُٹلا لگایا تھا"

گوری بی نے کہا: "ابّا! کیا لوگاں گھورے تھے مجھے۔ اُن لوگوں کا گھروں کو جا کے کیا حشر ہوا کی؟ ہم تو مزے میں گھر آ کر سو گئے تھے۔

ہم نے بور ہو کر کہا: "شرفو میاں! اب اجازت دیجئے۔ آپ کی سالی بھی جگر کے

زمانہ ہی کی چیز ہے۔" وہ ایک دم قہقہہ مار کر بولے: "آپ بھی اس کے الّٹر پن پر لٹّو ہو گئے۔"
ہم نے دوبارہ کہا: "لٹّو، گلی، ڈنڈا سب آپ ہوتے رہیئے۔ میں کہہ رہا تھا کہ آپ کی سالی جگر کے زمانہ کی یعنی قدیم چیز ہے۔"

ایک اور سخن فہم تھے۔ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ مولانا چپکا رکھا تھا۔ دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ لیکن مشاعروں کو خوب چندہ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ مشاعروں کی صدارت بھی کرنے لگے تھے۔ میرے ایک دوست احقر ناسوری نے ان کا انٹرویو لیا تھا وہی پیش کرتا ہوں۔

احقر: "مولانا! آپ کو کونسا غزل گو شاعر پسند ہے؟"
مولانا: "جی! طلعت محمود" ——— احقر: "طلعت محمود؟" ———
مولانا: "ہاں! ویسے بیگم اختر، سہیگل اور مہدی حسن بھی اچھے ہی ہیں۔"
احقر: "آپ کا غالبؔ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
مولانا: "بھئی شہرہ تو بہت ہے مگر کسی مشاعرہ میں سُننے کا موقع نہیں ملا۔ اس سال آل انڈیا مشاعرہ کرنا ہے، سو، غالبؔ، میرؔ، اقبالؔ، اور مخدوم سب کوشش لیں گے دراصل ہم جنوبی ہند والے شمالی ہند کے شاعروں سے بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اُدھر بھی اچھے شاعر ہیں۔ پرسوں ایک لاری کے پیچھے جو دہلی کی تھی یہ شعر کسی شاعر محمود و ایاز کا پڑھا۔ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز!!

واہ واہ کیا شعر ہے!
احقر: "کیا آپ اُردو کے مستقبل سے مایوس ہیں؟"
مولانا: "نہیں صاحب! جب تک ہمارا دودھ کا کاروبار چل رہا ہے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہم مشاعروں کو چندہ دیتے رہیں گے۔ بلکہ میرا ارادہ چار چھ بھینسوں کا ایک اُردو ادبی ٹرسٹ قائم کر دینے کا ہے۔"
احقر: "نئی نسل کی اُردو سے ناواقفیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"
مولانا: "دیکھئے صاحب! میرے بچے انگریزی پڑھتے ہیں۔ اُردو سے ناواقف ہیں۔ لیکن میں نے انھیں کہدیا ہے کہ خبردار! بچّو! اردو تمہاری مادری زبان ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ وہ سُنتے ہی سہم جاتے ہیں۔ اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔ چند دن قبل اُردو کی ایم۔ اے کی کلاس میں لکچرر نے ایک شاہین بچّہ سے پوچھا:
"تم چلبست کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"
تو وہ بولا: "چکس بٹ انگریزی کے مشہور شاعر تھے۔"
بھئی! میرے خیال میں اُردو والوں کا دوسری زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں سے واقف ہونا نیک فال ہے ——— احقر: "اُردو والوں کے لئے کوئی پیام؟"
مولانا: اُردو جاننے والی لڑکیوں سے شادی کیجئے۔ چنانچہ میری تین لڑکیاں ہیں۔ میرا پیغام محبت

گلیم میدکی

میدک کے سرکاری اسکول میں میڈل تک تعلیم پانے کے بعد حصول علم کے لئے حیدرآباد میں مولانا غلام احمد صاحب گلیمی کے ادارۂ اشاعت العلوم میں شریک ہوکر جامعہ نظامیہ سے منشی منشی فاضل کے امتحانات میں فراغت پانے کے بعد سررشتۂ مال میں سرکاری ملازمت سے منسلک ہوا۔ اضلاع بودو باش اور گاؤں گاؤں کا پانی پینے کی وجہ سے رہی سہی علمی قابلیت بھی نذر دیہات ہوکر دیہاتیوں کے ماحول میں گم ہوگئی تھی۔ اگرچیکہ والد بزرگوار ایک جیّد عالم اور اچھے شاعر تھے۔ چونکہ مجھ پہ مزاح کا رنگ غالب تھا۔ اس لئے سنجیدگی کے میدان سے گریز کرتا رہا۔ اگرچیکہ سنجیدہ کلام بھی مزاحیہ کلام سے کئی گنا زیادہ ہے۔

○

بھائی بھی اس زمانہ کا دشمن کے ناد ہے
سگی بہن بھی پیٹ کی سوکن کے ناد ہے

بیٹی پرائی گھر کی ہوئی اُس کا کیا گلہ
گھر کی بہو بھی اپنی پڑوسن کے ناد ہے

جب سے ملا ہے نُھی کو کالج میں داخلہ
ہرنی کے ناد دوڑتی ناگن کے ناد ہے

پڑھنے میں زیرو گانے بجانے میں فسٹ ہے
بیٹی شریف گھر کی میراثن کے ناد ہے

چونڈے میں پھول چہرے پوڈر کی راک ہے
گلشن کے ناد سر ہے منہ آگن کے ناد ہے

منہ میٹھا بات میٹھی میٹھی ہر چال بھی
یہ میٹھی شکر کی فیکٹری بودھن کے ناد ہے

بہو کو چرالو ساس کو کہتے ہیں ناپ لو
فطرت انوں کی تھالی میں بیگن کے ناد ہے

نان جوار اپنے پسینے کی اے گلیمؔ
عزت سے گر ملے تو متنجن کے ناد ہے

○

ھٹتا نہیں پیچھے میں کبھی خوف و خطر سے
واقف ہے زمانہ تو میرے عیب و ہنر سے

فولاد کا انسان ہوں پولیس میں ملازم
ڈرتا نہیں بیگم کے سوا شیر و ببر سے

○

نیا فیشن جو نانی کرتے جا رئیں
دیوانے ہوکو نانا مرتے جا رئیں

بڑھاپے میں رنگیلے بن پوان کے
جواناں ٹھنڈی سانساں بھرتے جا رئیں

اشرف خوندمیری

۲؍ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو جب اِن کی تشریف آوری کے ساتھ ہی اِدھر زندگی کے مرغے نے ان کے کانوں میں بانگ دی اور اُدھر دوسری جنگِ عظیم کا بگل بج اُٹھا تو لوگوں نے اِنھیں بہت ہی بجت آور سمجھا۔ "قینچی مارنے" کے قابل ہوئے تو زندگی کا ہینڈل سفیدی کی سڑکوں پر گھومتے پھرتے جب بیالیسویں سڑک پر آ پہنچا تو ماقبلِ جوانی ہی "جوانی کی مڑگی" کو کچھ اس طرح "جھٹکے" لگنے شروع ہوگئے کہ آنکھوں کے آنگن اور دِل کے دالان میں جتنے بھی "لیسٹان" تھے، اُن کا فیوز اُڑ گیا۔ پھر بھی ؎

بچ گیا سو کرنٹ ابی تار پو رچ ہے

شاید اسی لئے یہ اب بھی اپنے آپ میں مگن ہوکر اپنے احباب کے آگے ڈینگیں مارنے لگتے ہیں کہ ؎

یارخاں کی بھنڈولی بہار پو رچ ہے

"تلے دانی!"

اکڑ گو تھا سو کالرکے ہُسکاں سارے مُدڑ کو گئیں　　کھڑے گلّے پوٹا کیا تھا سو گھنڈیاں بی اُکھڑ کو گئیں
ہمارے باپ بچارے دوستوں کے دوستانے میں　　لگے تھے جیبنوں کو جتّے بی تھکلے اُدھڑ کو گئیں
سِلا لیُوں تھا کِکو۔ آیا تھا یَں پھٹ گئی سو شیروانی
تُمیں سماں رَک کو بھُل گئیں کی حجانی ماں تلے دانی

تُراخاں اِس قدر پڑ گئیں مری قسمت کی جھولی میں　　ابی کوئی چیز نَیں ٹِک رِئیے مُرادوں کی ہنڈولی میں
مرے پھٹے پُرانے حال پو تھوڑا رحم کھا کو　　ذرا جا کو ڈھُنو بھُل گئیں سو یادوں کی بھنڈولی میں
پِلا تُوش لا کو ہوٹل سے یَں اِک پونا سلیمانی
تُمیں سماں رَک کو بھُل گئیں کی حجانی ماں تلے دانی

پتہ نیں بیچ مدھریں کیوں سواری آ کو رُک جا رہئیے
ارے لیٹو تین وقت پو میری باری آ کو رُک جا رہئیے
مری حالت پو موں لوگاں تو کیا بی بنالیں گے
مجھے خود اپنی حالت پو اکاری آ کو رُک جا رہئیے
مجھے متلیاں کرا رہئیے آج کھٹے دہیں کی بُرھانی
تمیں کاں رُک کو بھُل گیئیں کی حجانی ماں تلے دانی

چُوس باقیچ نیں ہے پاڑ جینے کی جلیبی میں!
اُنے بن ہوگیا ہوں گا کسی چٹنی کی ڈبی میں
مرے چندیوں کے اندر جھانک ریں لوگاں جو ہس ہس کو
تو کنوراُ پڑ کو ہیں بی جھانک روں غم کی تسبی ہیں
مری اتڑی سڑا کو چھوڑ دی اُ تری سو بریانی
تمیں کاں رُک کو بھُل گیئیں کی حجانی ماں تلے دانی

مرے اچھے نصیباں جا کو کاں رہ گیئیں سو بولو نا!
اُنوں کس کے دروزے پو ذرا ٹھیریں سو بولو نا!
اسی تھکلوں کی تھیلی یں مرے غم کے جلا جاں ہیں!
تمیں اپنی تلے دانی کو کاں سینتیں سو بولو نا!
مری دادی کی پڑ دادی مری نانی کی پڑ نانی!
تمیں کاں رُک کو بھُل گیئیں کی حجانی ماں تلے دانی!

پُرو یا تھا یَں تاگے آس کی سُیتوں کے ناکوں میں
مگر جا کو اُنوں چُپ گیئیں مرے زخموں کے ٹاکوں یں
رَوا سمجیا تھا سو تاگے کے دہ پنڈے اِچ کاں گیئیں کی
دلاسے تن کو پھر جاریں اُنوں انکھیوں کے پھاکوں ہیں
ابی کب تک کے رہیں گی میری آنکھوں کی یہ حیرانی
تمیں کاں رُک کو بھُل گیئیں کی حجانی ماں تلے دانی
نصیبہ بان کی رسّی بی اب باٹیا تو کیا ہونگا؛
اُسے عزت سا کھُلنگا تو ڈر کو بھاگیا تو کیا ہوں گا؛
ہماری مفلسی میں چو طرف کھُل گیئیں سو موکھوں میں!
ذرا بھُل کو ج کوئی بی لاڑ سے جھانکیا تو کیا ہوں گا
نکل کو بھار پڑ جائیں گی جو اندر سے پریشانی!
تمیں کاں رُک کو بھُل گیئیں کی حجانی ماں تلے دانی! ▲

آدبی نوشاہ

۱۹۲۱ء میں بمقام جالنہ، ضلع اورنگ آباد پیدا ہوئے۔
۱۹۴۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کیا۔ لیبر ڈپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کی۔
۱۹۵۶ء میں ریاست بمبئی منتقل ہوئے
۱۹۷۶ء (دسمبر) میں ڈپٹی کمشنر لیبر کے عہدے سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔
شعر کہنا پہلے شروع کیا اور پھر نثر کے میدان میں پھل پھول گئے۔
پانچ کتابیں:

کیف و کم
نوٹ نوٹ
دیوار یئے
زیرِ غور اور
سائے تہمل ئے

شائع ہو چکے ہیں۔
'فقط' اور
'سماک ٹیل' زیرِ طبع ہیں۔

۱۹۴۲ء میں جب ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع ہوئی تو اس کے بعد کے چار پانچ سال کا زمانہ بڑی افراتفری اور گھما گھمی کا زمانہ تھا۔ یونس اگاسکر اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ نئے سال کا تحفہ بھی ہیں۔ اپنی سرکاری تاریخ پیدائش کے مطابق یہ پہلی جنوری ۱۹۴۵ء کو طلوع ہوئے (بظاہر ۱۹۴۵ء ان کا سنہ پیدائش ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار سال کا ہیر پھیر ہوگا)۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ۱۹۴۵ء کی ولادتوں کے سلسلے کا افتتاح یونس اگاسکر نے کیا لیکن اس افتتاحی جلسے میں اُن کی شرکت دستاویزی شہادت کی بناء پر مسلّم ہے۔

میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ جس شخص کے نام کے ساتھ بھی "کر" لگا ہوگا وہ پہلے ہی دن سے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا ہمیشہ کرتا رہے گا اور ایک نہ ایک دن کچھ کر دکھائے گا۔ (شروع شروع میں تو میں یونس اگاسکر اور شنیل گواسکر کو تقریباً ایک ہی شخص سمجھتا تھا) یونس اگاسکر بہرحال ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ ادب کی اسمگلنگ ان کا خاص مشغلہ ہے۔ اور یہی ایک اسمگلنگ ہے جو ہمارے یہاں غیر قانونی نہیں بلکہ اُلٹا اس اسمگلنگ میں' اسمگلر کو انعامات وغیرہ ملتے ہیں میں نے سنا ہے۔ مراٹھی سے اُردو اور اُردو سے مراٹھی میں ترجمہ کرنے میں یونس اگاسکر کا ہاتھ بہت صاف ہے۔ یقیناً ہوگا۔ شیکسپیئر کا قول ہے۔ دُبلے پتلے آدمی ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔

(Lean and Lanky people are always dangeros)

ان کا صرف ہاتھ ہی صاف نہیں ہے۔ یہ خود بھی معقول حد تک صاف ستھرے رہتے ہیں۔ (حالانکہ ہمارے ملک میں صاف ستھرے رہنے کا کوئی ایسا خاص قاعدہ نہیں ہے) لیکن شاید یونس اگاسکر جانتے ہیں کہ صاف ستھرے نہ رہنے کا حق مترجموں کو نہیں ہے۔ یوں بھی غیر شادی شدہ لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ صفائی پسند سمجھے جائیں۔ (بعض لوگ غلطی سے محکمہ صفائی میں ملازمت کرنا کافی سمجھتے ہیں جو صحیح نہیں ہے) غیر شادی شدہ لوگوں کو اس وقت تک صفائی پسند رہنا چاہیئے۔ جب تک کہ مسئلہ حل نہ ہو جائے (دھلائی تو بعد میں خود بخود ہوتی رہتی ہے) لباس کے معاملہ میں یونس اگاسکر بڑے تناسب اور توازن کا خیال رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ تو میں نے انہیں سیاہ پتلون اور سیاہ بش شرٹ میں ملفوف دیکھا۔ چلتا پھرتا بلیک مارکٹ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر میں نے سوچا یونس اگاسکر کالج میں ادب پڑھاتے ہیں اس لئے یہ لباس انہوں نے طالب علموں کو شاید یہ سمجھانے کے لئے پہنا ہوکر "کالی نظم" کیسی ہوتی ہے۔ اور ایسا ڈیمانسٹریشن ضروری ہے۔ یہ تو میں نے سنا تھا۔ لیکن ادب پڑھانے کے لئے یہ کب سے ضروری قرار دیا گیا اس کی مجھے اطلاع نہیں تھی۔ داصل میں قصہ یہ ہے کہ نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم یہ دونوں چیزیں ہر سال کیلنڈر کی طرح بدلتی رہتی ہیں،

یونس اگاسکر اپنی طالب علمی کے زمانے میں بڑے خطرناک طالب علم رہے ہیں۔ سنا ہے ۱۹۶۶ء میں جب انہوں نے اردو اور عربی کے مضامین کے ساتھ بی۔ اے کا امتحان دیا تو اس امتحان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر بمبئی یونیورسٹی نے انہیں گولڈ میڈل سے نوازا۔ سب سے زیادہ نمبر انہوں نے اس لئے حاصل کئے کہ وہ اس شعبے کے تنہا طالب علم تھے اور گولڈ میڈل انہیں اس لئے دے دیا گیا کہ اس وقت تک گولڈ کنٹرول آرڈر کی اطلاع یونیورسٹی میں نہیں پہنچی تھی۔ ہندوستان میں جب سے گولڈ کنٹرول آرڈر نافذ ہوا ہے۔ ہماری ہاکی ٹیم نے اولمپک میں گولڈ میڈل حاصل کرنا ترک کر دیا۔ کون قانون شکنی کرے اور اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالے۔ اب طالب علم بھی اس قانون کی پابندی کرنے لگے ہیں۔

یونس اگاسکر بدن کے تو اکہرے ہیں لیکن وہ ایم۔ اے۔ ڈبل ہیں۔ (وزن بڑھانے کی یہ بھی ایک ترکیب ہے)۔ آدمی عقل مند ہو تو کیا نہیں کر سکتا۔ یونس اگاسکر نے پہلے سماجیات میں ایم۔ اے کیا۔ کیونکہ سماجیات بھی آسان مضمون ہے لیکن اس میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آنے کی وہ سہولتیں نہیں ہیں۔ جو اردو اور فارسی میں ایم۔ اے کرنے والوں کے لئے مختص ہیں۔ اس لئے انہوں نے فوراً ہی اپنی غلطی کے ازالے کے لئے دوسرے سال اردو اور فارسی میں ایم۔ اے کا امتحان دیا۔ اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ یونیورسٹی بھر میں اوّل آ گئے۔ لکچرر بھی وہ اردو ہی کے ہوئے۔ اردو کے لکچرروں کو حق حاصل ہے کہ وہ غالب کے ہر شعر کا نیا مطلب نکال سکتے ہیں۔ غالب نے جب شعر کہے تھے تو اُن کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ تھا کہ آگے چل کر اُن کے ہر شعر کے کم سے کم ایک درجن مطلب نکالے جائیں گے۔ یونس اگاسکر اگر اس سہولت سے فائدہ نہیں اُٹھاتے ہیں تو انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے میں بڑی دقت ہوگی۔

میں نے سنا ہے کہ یونس اگاسکر اچھے مضمون نگار، اچھے مترجم اور اچھے تبصرہ نگار ہونے کے علاوہ اچھے اُستاد بھی ہیں۔ وہ طالب علموں میں اس لئے مقبول ہیں کہ وہ اپنی کلاس میں صرف اُس وقت آتے ہیں جب انہیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدھی کلاس انتظار کر کے گھر چلی گئی۔

میں اسے فالِ نیک سمجھتا ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ مقبول ہونا مناسب نہیں ہے۔

دُہرے ایم۔ اے اور دو زبانوں پر قابض ہونے کے علاوہ یُونس اگاسکر جرنلزم کا ایک ڈپلوما بھی اپنی جیب میں تیار رکھتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جس طرح کی جرنلزم ہمارے ہاں رائج ہے اُس کے لئے کسی ڈپلوما کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بہرحال جرنلزم کے اس ڈپلوما کو بھی وہ بیکار نہیں جانے دیتے۔ اور ہر ماہ نقش کوکن کا ایک شمارہ پابندی سے برآمد کرتے ہیں۔ چونکہ صرف ایک پرچے سے ان کی تشفی نہیں ہوتی اس لئے وہ "شاعر" کے بھی معاون مدیر ہیں۔ یعنے نقش کوکن میں ان کی حیثیت نوشاہ کی ہے اور شاعر میں نوشاہ کے بھائی کی۔ (کہا جاتا ہے بارات کے موقع پر نوشاہ کے بھائی کے کافی وسیع اختیارات ہوتے ہیں۔ اور وہ گھوڑا جس پر نوشاہ سوار ہو اس گھوڑے کی لگام، نوشاہ کے بھائی کے ہاتھ میں ہوتی ہے)۔

یُونس اگاسکر کو مصروف رہنے کا شوق ہے اور یہ شوق تحقیقی کاموں ہی سے پورا ہوتا ہے۔ کوئی لائبریری اُن سے محفوظ نہیں ہے۔ لکچرر بننے سے پہلے ہی اُن کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور تحقیق کا مرض اُن میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں اردو، ہندی، ہندوستانی اور مراٹھی سب سے یکساں عشق فرماتے ہیں۔ بُنیادی ہندوستانی لغت کی تیاری میں انہوں نے کافی ورزش کی ہے۔ بُنیادی ہندوستانی ریڈر (قاعدے) بھی مُرتّب فرمائے ہیں۔ بہرحال وہ ایک ایسا ریستوران ہیں جس میں ہر مذاق اور ذائقے کی ڈش موجود رہتی ہے۔ (ہر ڈش اُنہی کی تیار کی ہوئی ہوتی ہے) اُن کے متعلق اُن کے اُستادوں کی رائے ہے کہ وہ بہت سنجیدہ طالب علم رہے ہیں لیکن ادھر کچھ دنوں سے انہیں مُسکراتے اور ہنستے بھی دیکھا جا رہا ہے۔ یہ ترقی کی علامت ہے۔ چرچل اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بہت سنجیدہ ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ الیکشن ہار گئے۔ یوں بھی تحقیقی کتابیں لکھنے کے لئے بہت زیادہ سنجیدہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

یُونس اگاسکر نے ایم۔ اے تو اردو میں کیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے وہ چاہتے تو مراٹھی میں بھی ایم۔ اے کر لیتے (اوّل شاید نہ آتے)۔ مراٹھی شاعری، ناول، افسانہ، اسٹیج، ڈرامہ، ان سارے موضوعات پر اُن کی نظر ہے۔ یعنی گہری نظر ہے۔ (گہری نظر اور اچھی نظر کا فرق کچھ نہیں معلوم ہے)۔ مراٹھی داں لوگوں (لوگ سے مُراد دانشور ہیں) کا خیال ہے کہ ان کی معلومات مستند ہیں اور مراٹھی ادب سے اُن کی واقفیت کو ماہرانہ واقفیت کہا جا سکتا ہے۔ (ایسی رائے سُن کر بھی یُونس اگاسکر پھولے نہیں۔ ویسے ہی دُبلے کے دُبلے ہیں)۔ اگر یُونس اگاسکر، عام لکھنے والوں کی طرح اپنے متعلق غلط فہمی میں مُبتلا نہیں ہوئے تو اُن کے اصلی قد میں مزید اضافے کی گنجائش ہے۔

یُونس اگاسکر کا کہنا ہے کہ وہ پچھلے پندرہ سال سے مراٹھی ادب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ پندرہ سال میں تو تین پنج سالہ منصوبے تیار ہو جاتے ہیں (اُن پر عمل ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو یہ الگ بات ہے) پندرہ سال کے مطالعے کے بعد ایک کتاب پیدا کرنا۔ اِمساک نویسی ہے۔ لوگ تو صرف چھ ماہ کے مطالعے میں دانشور اور علامہ بن جاتے ہیں۔ اُن سے کس نے کہا تھا کہ وہ اتنی دیر تک رُکے رہیں۔ وہ اور معاملوں میں بھی اگر اسی طرح رُکے رہے تو بس ادبی نوشاہ ہی رہیں گے۔

نوٹ: یہ مضمون یُونس اگاسکر کی تصنیف "مراٹھی ادب کا مطالعہ" کے جشنِ اجراء کے موقع پر مہاراشٹرا کالج میں ۱۱ جنوری ۷۷ء کو پڑھا گیا۔ یعنی میں نے خود پڑھا۔

بگڑ رائچوری

نام : محمد عبدالقیوم
تخلص : بگڑ
وطن : دوندگل جاگیر ضلع میدک
تاریخ پیدائش : ۹ر ستمبر ۱۹۲۳ء
تعلیم : میٹرک سے ایک درجہ کم
۲۵ سال سے ضلع رائچور میں محکمہ لینڈ ریکارڈ سے وابستہ ہوں۔
شاعری کا شوق اسکول ہی سے شروع ہوا میرے استاد سید مخدوم حسینیؔ سے اصلاحِ سخن لیا کرتا ہوں۔ غزلیں، نظمیں اور قطعات کم از کم دو دیوان شائع کرنے کے برابر ہیں۔
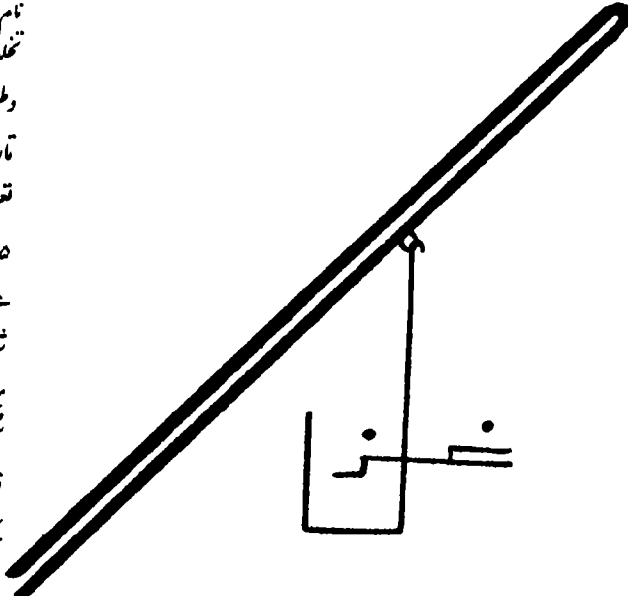
جینا مرنا اُن کا شاہانہ کتے — زندگی میری فقیرانہ کتے
ان کے دروازہ پہ نئیں آنا کتے — دَر بَدر کی ٹھوکریں کھانا کتے
مُدتوں سے کھڑکیوں پہ ہے نظر — کب تلک آنکھوں کو ترسانا کتے
ایسی ضِد کا ایسی ہَٹ کا کیا جواب — خواب میں بی انکے نئیں آنا کتے
پُوریاں کھانے کو سب حاضر جناب — مَیں اکیلا جُوتیاں کھانا کتے
روز مرتے ہیں رقیباں جھُوٹ مُوٹ — سچّی مُچّی مَیں ئچ مرجانا کتے
مَرد مارو، گھر بگاڑو، چھوریاں — عابدہ بی بی دفترزانہ کتے
کل تلک تھی خادمہ گُلشن بوُا — اب بدل کو نام سُلطانہ کتے
پاؤں میں پہنے تو پاتابہ ہُوا — ہاتھ میں پہنے تو دستانہ کتے
پیتے ہیں گھر میں منگا کر شیخ جی — ایسا پینا ہے شریفانہ کتے

بات بگڑؔ کی نہیں سُنتا کوئی
بولنا اب چھوڑ کو، گانا کتے

محمد صبغۃ اللہ بمباٹ

محمد صبغۃ اللہ بمباٹ ۲۰ر جولائی ۱۹۳۹ء کو تعلقہ بھونگیر ضلع نلگنڈہ میں پیدا ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد کالج آف فزیکل ایجوکیشن پوسٹ گریجویشن کا ڈپلوما حاصل کیا۔ کالج کے زمانے ہی سے مزاحیہ شاعری کی ابتداء کی۔ اسٹیج کے بھی اچھے اداکار اور ریڈیو کے بہترین صداکار ہیں، چنانچہ گزشتہ چند سال سے وقتاً فوقتاً آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اناونسر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ کئی اسٹیج اور ان گنت ریڈیو ڈراموں میں حصّہ لے چکے ہیں۔ مشہور مزاحیہ ڈرامہ "چچا چور بھتیجے قاضی" میں چچا کے کردار میں لاجواب اداکاری پیش کر چکے ہیں۔ شاعری میں سماج کے ساتھ ساتھ اپنے سسر کو بھی نشانہ بناتے ہیں۔

غزل

جب سے ہوئی ہے شادی آنسو بہا رہا ہوں
آفت گلے پڑی ہے اُس کو بھا رہا ہوں

دس صبح کے بجے ہیں دیوی سو رہی ہیں
ہمت نہیں جگانے پنکھا ہلا رہا ہوں!

کرتی ہیں دردِ سر کا بیگم میری بہانہ
میں جانتا ہوں لیکن میں سر دبا رہا ہوں

گھر کے نئے بجٹ میں دھوبی کا پوسٹ گم ہے
میں سارے گھر کے کپڑے دھو کر سکھا رہا ہوں

گاتی ہیں، ناچتی ہیں کھانا نہیں پکاتی،
سنتا ہوں گانا ہوٹل میں کھا رہا ہوں

گھر ہسپتال دفتر ہیں زندگی کے محور
کولھو کا بیل ہوں میں چکر لگا رہا ہوں

علم و ہنر کے بدلے شعر و ادب کے بدلے
بیوی کے اور بہن کے جھگڑے چکا رہا ہوں

کہتے ہیں دوست مجھ کو شادی تمہیں مبارک
دل رو رہا ہے میرا میں مسکرا رہا ہوں

لے دیکھے اس قدر تو ہے اطمینان دل کو
دنیا نہیں تو بیگم کے کام آ رہا ہوں!

سہیلی کے گھر ڈنر پر بیگم گئی ہوئی ہیں
بچے کو اور دل کو سمجھا بجھا رہا ہوں!!

کیا دن دکھا رہی ہے بمباٹ اپنی شادی
غم مجھ کو کھا رہا ہے میں غم کو کھا رہا ہوں

ڈھکن رائچوری کا اصلی نام محمد قاسم ہے ۔ ۲۶ر جون ۱۹۴۱ء کو رائچور میں پیدا ہوئے ۔ میٹرک کامیاب کیا اور پھر ٹائپ کا امتحان امتیازی نشانات سے کامیاب کیا ۔ جنوری ۱۹۶۴ء سے بہ حیثیت ٹائپسٹ محکمۂ جنگلات رائچور میں ملازم ہیں ۔ قاسم نورؔ کے نام سے شستہ زبان میں لکھتے رہے مگر دکنی زبان سے فطری لگاؤ نے شستہ پن کو خیرباد کر دیا ۔ ان کا پہلا مجموعہ "گلر کے پھول" شائع ہو چکا ہے ۔

سَمدھن!
(ڈھولک کا گیت)

کھانے کو آئیں سمدھن
نکو بگاڑو بیگن

(۱)
ہنڈی سے تم اُتارو
لال پیلے دانے وارو
نیں تو پڑیں گی اَڑ چن
نکو بگاڑو بیگن

(۲)
مَرداں کو سوب ہٹاؤ
سمدھن کو پھر بلاؤ
دِیلان پو ڈالو چلمن
نکو بگاڑو بیگن

(۳)
لاؤ جی بھیگی چھانواں
دھولیں گی اُن بی پانواں
پینیں گی بادو بَین جن
نکو بگاڑو بیگن

(۴)
دلیغاں سے کھانا کاڑو
اَنپڑ سے ڈَلیاں گاڑو
دِسنا نَکو نَیں جی کھُرچن
نکو بگاڑو بیگن

(۵)
سَمدھن ہے بھاری بھرکم
آتا ئیگے اُن کو دَم دَم
دل کی رُکیں گی دَھڑکن
نکو بگاڑو بیگن

(۶)
تالُو پو نَیں ہے بالاں
اُلٹی چلیں گی چالاں
جھگڑا کرینگی سمدَن
نکو بگاڑو بیگن

(۷)
سَمدھن ہے بہوت کالی
توے کی ہوں گی سالی
دِستی ہیں جے ہے بھجن
نکو بگاڑو بیگن

(۸)
سَمدھی ہمارے ہَر فن
باداتے اُن کے جھکن
نوشہ بنے ہیں ڈھکن
نکو بگاڑو بیگن

▲

عظمت بھلاواں

میرا پورا نام عظمت اللہ شاہ اور تخلص بھیلاواں ہے۔ مشائخین کے خاندان کا جھلملاتا چراغ ہوں۔ ۱۹۳۵ء کے خوشحال زمانے میں ناندیڑ کی سیاہ سرزمین پہ میری ولادت ہوئی۔ تعلیم بھی ناندیڑ ہی میں ہوئی۔

مزاحیہ شاعری کی چاٹ بچپن سے لگی ہوئی تھی۔ دکنی زبان کے نامور شاعر حضرت سلیمان خطیب نے میرے رنگ و روغن کی مناسبت سے "بھیلاواں" تخلص تجویز فرمایا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

مہاراشٹرا۔ کرناٹک۔ مدھیہ پردیش۔ اترپردیش آندھرا میں جہاں جہاں بھی مجھے رونمائی کا موقع ملا میں نے اپنی لیاقت بھر کوشش سے عوام کو ہنسانے کا جتن کیا۔ گلبرگہ دھاروار، اورنگ آباد پر بھی ریڈیو اسٹیشنوں سے کلام نشر ہو چکا ہے۔ مزاحیہ شاعری کے ساتھ ساتھ اسٹیج اور مسخری آرٹ کا بھی شوق کرتا ہوں اور کئی شہروں میں کامیاب one man show دے چکا ہوں۔

غزلیں

[حضرت سکندر علی وجد سے معذرت کیساتھ]

ڈرکر پلٹ کے آئے ہیں گنگ دجمن سے ہم
نل پر نہا رہے ہیں بہت بانکپن سے ہم
احباب و رشتہ دار و مکاں کچھ نہیں ہے یاد
بچپن ہی میں فرار ہوئے تھے وطن سے ہم
اغیار "ٹیکسی" لیے پکنک کو چل دیئے
تکرار ہے ہیں گھر میں پرانی دلہن سے ہم
کانٹوں نے بے لباس کیا چیر پھاڑ کر
خود کو چھپا رہے ہیں ہر اک گل بدن سے ہم
مہنگائی نے زبان کو کڑوا بنا دیا
چونچیں لڑائیں گے کسی شیریں دہن سے ہم
سیندھی شراب بھنگ و چرس کے نشوں کے بعد
اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم

○

ادب کا شوق فرمانے لگے ہیں!
گدھے بھی گلگلے کھانے لگے ہیں!
'بنا کا گیت مالا' بدھ کے دن تھا!
لفنگے روز کیوں گانے لگے ہیں!
خدا کے فضل سے چندیا پہ اپنی!
نئے کچھ بال لہرانے لگے ہیں!
قلعی کرنے کا فن سیکھا ہے جب سے!
مقدر سب کا چمکانے لگے ہیں!
نئی شادی رچا کے شیخ چھتر د!
پرانی دیوڑھی ڈھانے لگے ہیں!
بھیلادیں پہ سے کچھ صدقہ اتار د!
پیام اس کو بہت آنے لگے ہیں؟

قطعات

اُن کی کومل کمر پہ غلطی سے
کیا کھردچا لگا ہے جھانوں کا
کوئی کرتہ بچا نہ پاجامہ
داغ سب پر ہے اب بھلاویں کا

○

پیار سے جس کا لے لیا بوسہ
نقش اُس پر ہے برقرار اپنا
کسی صابن سے مٹ نہیں سکتا
داغ ایسا ہے پائیدار اپنا

۱۳

نوٹ: پچھلی قسطیں آپ نے ضرور پڑھی ہوں گی۔ اگر نہیں پڑھیں تو خبردار اس قسط کی طرف دیکھنا بھی نہیں۔ کیونکہ اب آپ جہاں جاگے ہیں سویرا نہیں بلکہ دوپہر ہو چکی ہے۔ اولاً پہلی اقساط ملاحظہ فرمائیے پھر موجودہ قسط۔

سُنا ہے چہ خوب تم نے خان فولادی کے وہ ہاتھ دِکھائے کہ 'چین' بول گیا" ——— قبلہ چہ خوب نے لفظِ 'چین' پر اس قدر زور دیا کہ ہماری سماعت سے ٹکراتے وہ 'چین' کا ہم پلّہ ہو گیا ——— لیکن قبل اس کے کہ اس لفظی ہیرا پھیری سے ہم کچھ فائدہ اُٹھاتے شبّو نے برجستگی کا مظاہرہ کیا ——— "لو آپ صرف 'چین' کہتے ہیں۔ اس نے تو جاپان' ملایا' ہانگ کانگ ' سنگاپور سارے ملکوں کے پہاڑے پڑھ ڈالے اتنا کہہ کر شبّو نے ہماری طرف ایسی داد طلب نظروں سے دیکھا جیسے کامیابی کا یہ سہرا جو ہم اکھاڑے سے مار لائے تھے، اُسے دلوانے میں انہی کا ہاتھ رہا ہو ——— حالانکہ سچ پوچھا جائے تو اُس "اونے بچھیے" نے اس مسکین صورت بکری کو بھڑوانے میں شبّو ہی کا ہاتھ بلکہ دونوں ہاتھ رہے تھے ——— لیکن اپنے دستِ نازک کی اس خطرناک کارستانی پر پردہ ڈال کر، شبّو نے ہمارے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ———:

"میں تو کہتی ہوں ان مضبوط ہاتھوں کی نظر اُتاری جانی چاہئے"

ہم نے اپنے ہاتھوں کو گھورتے ہوئے دل ہی دل میں کہا:

پرویز یداللہ مہدی

پرویز یداللہ مہدی حیدرآباد میں پیدا ہوئے میٹریکولیشن کے بعد ریفریجریشن میں ڈپلوما کیا۔ شاعری کو چھوڑ کر طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ گزشتہ پانچ چھ برسوں سے لکھ رہے ہیں۔

امین سایانی کے ساتھ ریڈیو سیلون کے لئے کام کرتے ہیں۔ ایک مجموعہ 'چھیڑ چھاڑ' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ اب دوسرا 'چڑی کے غلام' زیر اشاعت ہے۔ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ بھی زیر ترتیب ہے۔ شگوفہ میں زیرِ نظر ناول قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ مکمل ہو جائے تو خدشہ ہے کہ کتابی صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔

اگر نذر اُتارنی ہی ہے تو ان ہاتھوں کی نہیں بلکہ صرف اُنگلی کی نظر اُتار دیجئے۔ کیونکہ سارا کرشمہ اس ایک عدد اُنگلی کا ہے۔ بقول شاعر ؎ ساری خدائی ایک طرف، انگشتِ شہادت ایک طرف بلا مبالغہ یہ انگشتِ شہادت ہی تھی جس کی وجہ سے ہمارے حصّے کا جامِ شہادت عرف اکھاڑے کی ندامت طوطا پری کے سر گئی ـــــ طوطا پری سے ہمارے فری اسٹائل مقابلہ کی اگر کوئی اخباری خبر بنتی تو اُس کی سُرخی کچھ یوں لگتی۔

"انگشتِ شہادت بمقابلہ فولادی مکّہ"

"اس سے پہلے تم نے یقیناً کسی فری اسٹائل چرخوب میں حصّہ لیا ہوگا۔ برخوردار ـــــ!" قبلہ چرخوب نے چائے کا ایک بھاری بھرکم جرعہ لے کر گویا انٹرویو کے ایک اور راونڈ کا آغاز کر دیا ـــــ ناشتے کے بعد والا چائے کا دَور چل رہا تھا۔ موصوف اسی موضوع پر یقیناً لنچ تک بور کر سکتے تھے۔ رستم زماں گاما پہلوان سے لے کر سارے 'گا' 'ما' بلکہ 'پا' 'دھا' 'نی' 'سا' تک سارے پہلوانوں کی تاریخ مع جغرافیہ کے کھنگال کر ہمارے دماغ کی 'اوور ہالنگ' کر سکتے تھے ـــــ ہمارا قصور صرف اتنا تھا کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ خواہ مخواہ طوطا پری جیسے نامور درمیانہ مکہ باز سے بھڑ گئے تھے۔ بلکہ اسی فولادی پنجے سے اپنا لوہا بھی منوا لائے تھے ـــــ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی فری اسٹائل اکھاڑے میں اُترے تھے جسے آخری مرتبہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ بکرے کی ماں ہر بار خیر نہیں منا سکتی۔ اگر طوطا پری گدگدیوں کے مرض میں اس شدت سے مبتلا نہ ہوتا تو پھر کچھ اور ہی نقشہ ہوتا۔ ہمیں اسٹریچر پر لدوا کر 'بذریعہ ایمبولنس' مقامی ہسپتال پہنچا دیا گیا ہوتا۔ تصویر کے اس خطرناک رُخ کا تصوّر کرتے ہی ہم کانپ اُٹھے ـــــ

اُدھر قبلہ چرخوب ہمارے جواب کے انتظار میں پائپ کے تیز تیز کش لے کر گویا ہمارے گرد دھوئیں کا حصار باندھ رہے تھے۔ ہم نے اس مرتبہ حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے سچ سچ عرض کیا ـــــ: "جناب والا آپ کو شاید یقین نہ آئے کسی فری اسٹائل اکھاڑے میں اُترنے کا یہ موقع بھی پہلا تھا اور تجربہ بھی البتہ مغلئی کشتیاں

دیکھنے کا بارہا اتفاق ہوا ہے۔ کیونکہ اسکول کے راستے میں علی پہلوان کا دنگل پڑتا تھا۔ اسکول جاتے آتے ہوئے اکثر پہلوانوں کو زور آزمائی کرتے ہوئے دیکھا کرتے تھے"۔

اسی لئے تو کہتے ہیں کہ بعض مشاہدات، تجربات سے بڑھ کر چہ خوب ہوتے ہیں۔ باریک بینی سے کیا ہوا ہر مشاہدہ حالت چہ خوب میں کئے ہوئے ہر تجربہ پر بھاری ثابت ہوتا ہے۔ موصوف نے گُر کی بات بتائی۔ اور دوسرا شر چھیڑا ہی تھا کہ مُلازم نے آکر اپنی بے سُری تان چھیڑی کہ شبّو کی کچھ سہیلیاں آئی ہیں اور لان پر ان کا انتظار کر رہی ہیں ــــــ شبّو کی سہیلیوں کی یہ غیر متوقع آمد ہمارے حق میں گرچہ کسی نئے طوفان کی آمد کا پیش خیمہ بلکہ 'پیش ڈیرہ' تھی۔ لیکن قبلہ چہ خوب کے بے سَر و پا انٹرویو سے نجات بھی اسی نے دلوائی ــــــ !!

اپنے کمرے کی اس کھڑکی کی اوٹ سے جو لان کی طرف کھُلتی تھی۔ ہم نے کپڑے بدلتے ہوئے ان بلائے بے درماؤں کا جائزہ لیا۔ جن سے بقولِ شبّو ہمارا ملنا بے حد ضروری تھا۔ کیونکہ وہ سب دراصل ہمیں سے ملنے کی غرض سے آئی تھیں۔ اس غرض کے پیچھے اصلی غرض و غایت کیا تھی۔ یہ ہم نے تجسّس کے باوجود جاننے کی کوشش نہیں کی، البتہ دُور ہی سے اپنی اس غرض مندوں کے منڈے کا جائزہ لینے کی غرض سے کپڑے بدلنے کا بہانہ بنا کر شبّو سے کچھ منٹوں کی مہلت مانگی اور پھر اُسی ابروئے ہلالی پُر جلالی کی ہلکی سی جُنبش کو پروانۂ اجازت جان کر اپنے عارضی کمرے میں چلے آئے کھڑکی سے لان کا فاصلہ اگرچہ کہ کافی تھا۔ تاہم اپنے غرض مندوں کی تعداد کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ضرور ہو گیا ــــــ انٹرنیشنل ویمنس لب International women's lib

یعنے بین الاقوامی تحریک آزادیٔ نسواں کی مقامی شاخ کا یہ دستہ جو غالباً ہمیں بے دست و پا کرنے کے لئے تشریف لایا تھا کُل چار عدد گلدستوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک عدد گلدستہ کو ہم نے فوراً پہچان لیا۔ وہ مس ایک تارہ ریس کورس والا تھی ــــــ البتہ لبقیہ تین چہرے نئی دریافت تھے۔ بلکہ جہاں تک اُن کے اسمائے گرامی اور حسب نسب کا تعلق تھا انہیں نایافت کہنا درست ہوگا۔

جب بیچے تُلے قدم اُٹھاتے ہوئے ہم اس دستۂ تازہ کے قریب پہنچے تو کھُلا کہ ع
"ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ" یعنے ان میں سے دو عدد کاغذی گلدستے تھے۔ ایک گیندے کا اور ایک انگریزی گلاب کا جس میں رنگ تو ہوتا ہے' خوشبو نہیں ہوتی۔ کاغذی گلدستوں میں بھی ایک عدد گلدستہ اس قدر پھیلاؤ لئے ہوئے تھا کہ اُسے اگر 'گول دستہ' کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ البتہ دوسرا کاغذی گلدستہ، کمر کے آس پاس معمول سے کچھ زیادہ ہی گھیر دار تھا۔ اس لئے جو تشبیہ ہمارے ذہن میں اُبھری وہ تھی 'گول پیٹھا'

سارے گلدستوں کو اپنی طرف متوجہ پاکر ہم نے دست بستہ 'تسلیمات' عرض کیں لیکن جواب میں ادھر سے جو مظاہرہ ہوا بڑا عجیب و غریب تھا۔ مس یک تارہ نے اس طرح پیشانی کو چھوا جیسے مکھی اڑائی ہو۔ انگریزی گلاب دستے نے ہاتھ تو اُٹھایا سلام کرنے والے انداز میں لیکن اُٹھا ہوا ہاتھ پیشانی کو چھونے کے بجائے عینک برابر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کاغذی گول پیٹھے نے تو ہاتھ تک اُٹھانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ بس ہونٹوں کے گوشہ کو تھوڑا سا پھڑ پھڑایا اور پھر کسی ذبیحہ مرغی کی طرح خاموش ــــــ البتہ چوتھی محترمہ یعنے گول دستہ

نے بآوازِ بلند قرأت کے ساتھ "وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ" کہہ کر مجھے چونکا دیا۔
ان حرکاتی، سکناتی اور قراتی سلاموں کے بعد شبو نے تعارفی کارروائی کا آغاز کیا ــــــ
سب سے پہلے قراتی سلام والی محترمہ یعنی "گول دستہ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ
ہیں عاقلہ امۃ الزہرہ، ڈبل ایم۔ اے اردو اور فارسی ان کے مرغوب ترین مضامین ہیں ــــــ"
"از حد مسرت ہوئی محترمہ آپ سے مل کر ــــــ" ہم نے رٹا رٹایا جملہ اگلا ــــــ:
"ناچیز کو ویسے آپ سے ملنے کی سعادت آج ہی حاصل ہوئی ہے لیکن شرفِ ملاقات کی
تمنا کئی ایام سے قلب میں موجزن تھی ــــــ شہرہ بہت سُن رکھا ہے آپ کا۔ جب سے آپ کی آ
سعید ہمارے اس شہرِ حقیر میں ہوئی ہے۔ تمام باشندگانِ شہر کی زبان پر آپ ہی کا نام نامی ہے۔ ہ
کس و ناکس آپ کی بذلہ سنجی، بے باکی اور علم و فضل کے چرچوں میں ہمہ تن مصروف ہے ــــــ او
پھر جب سے یہ تازہ ترین ناقابلِ یقین خبر ملی ہے کہ آپ نے اپنے دستِ آہن کے زورِ
خانِ فولادی جیسے منھ زور رکنے باز کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں، میں انگشت بدندان حیرت و
استعجاب کا مرقع بنی ہوئی ہوں ــــــ"

محترمہ کی اس "گاڑھی" بلکہ "پہاڑی" اردو پر ہم انگشت بدنداں حیرت و استعجاب کے تال
میں سر بہ سر ڈوب گئے۔ ہمیں تو محترمہ پر فیروز اللغات کے چلتے پھرتے اڈیشن کا گمان ہوا۔ ویسے
محترمہ کا اسم شریف نزد انتہائی گاڑھا بلکہ پہاڑہ صفت تھا۔ خواتین کے ایسے تکڑے اور غیر شاعر
نام ہمارے ہاضمے کے لئے اکثر ثقیلی ثابت ہوتے آئے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں عاقلہ نام سن کر ہمار
عقل ہمیشہ دنگ رہ جاتی ہے۔ اور جی چاہتا ہے نام رکھنے والے کا گریبان پکڑ کر پوچھیں کہ نامعقو
نام رکھتے وقت کیا تیری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے ــــــ ایسے نام سُن کر جن میں کسی صورت عقل
ذکرِ خیر ہو ہمیں نہ جانے کیوں ذوضعافِ اقل مشترک، عادِ اعظم مشترک، وغیرہ کی یاد آجاتی ہے ــــــ
البتہ عاقلہ صاحبہ کا نام اس اعتبار سے موزوں معلوم ہوتا تھا کہ محترمہ جثے کے اعتبار ـــ
قافلہ نظر آتی تھیں ــــــ محترمہ کی گاڑھی اردو نے البتہ ہمارے گلے میں "گولا" سا لا اٹکایا
ہم نے جواباً کچھ عرض کرنے سے پہلے ذہن کے کینوس پر اپنے دوست آقائی سید نصرت آغ
کے ان خطوط کو واضح کرنے کی کوشش کی جو موصوف نے اپنے دورانِ قیامِ ایران میں
تھے۔ جن کے بارے میں انہیں آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ بہ زبانِ اردو، جدید فارسی کا ا
بیش قیمت سرمایہ ان خطوط میں محفوظ ہے۔ اس خط و کتابت سے جو خط کم ہوا کرتی تھی
زیادہ، صحیح معنوں میں فائدہ اُٹھانے کا موقع اب آیا تھا ــ چنانچہ آقائی سید نصر
کے فارسی آمیز اردو خطوط کی روشنی میں محترمہ عاقلہ امۃ الزہرہ کی گاڑھی اردو کے ج
میں اپنی زبان کا گاڑا چلایا ــــــ ماشاء اللہ آپ کی اردو تو اردوئے معلّٰی ہے جس نے اس
ترین بلکہ کم ترین کے قلبِ زباں گزیدہ پر سکّہ رائج الوقت کو ہٹا کر اپنا سکّہ بٹھا دیا ــ آپ
و بلاغت نے سماعت کو اس قدر حیرتیں بخشیں کہ نکھر کر آئینہ ہو گئی۔ البتہ یہ آپ کی کرم گستری
جو اس شہرِ دلداراں میں خاکسار کی بدنامی کو نیک نامی مشہور فرمایا ورنہ یہاں تو یہ حال ہے
"آنم کہ من دانم" ہمارے اس طرزِ تخاطب پر تمام گلدستوں نے تحسین آمیز نظروں سے ہم

طرف دیکھا، البتہ شبو کی آنکھوں میں تحسین کے ساتھ تشویش کی لہر بھی نظر آئی۔ شاید ہمارے دائرہ فقرے کے کسی "ناکردہ" حصے یا لفظ نے انہیں تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ جب ہم نے اس جملے کو ذہن کے بلاک بورڈ پر یاد داشت کے چاک سے دوبارہ تحریر کیا تو بالآخر وہ لفظ ہماری پکڑ میں آگیا یقیناً "گرم گستری" ہی وہ لفظ تھا جو تشویش کا باعث ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس ثقیل لفظ کے قافیوں میں ایک قافیہ ایسا بھی آتا ہے جو ترسیل کے المیہ سے بے نیاز ہوتا ہے یعنی کسی لڑکی سے جس کے اظہار کے نتیجے میں کسی ایک کی عزت کا اُتر آنا یقینی ہوتا ہے ——— ہم نے آئندہ کے لئے ایسے تمام خطرناک قافیوں سے توبہ کی اور ٹھہر ٹھہر کر سنبھل سنبھل کر بات ختم کرنے کی کوشش کی ——— بہرحال بندۂ عاجز کو آپ نے جس طرح خاروں سے گلوں کی طرف کھینچا ہے۔ اس کے لئے خادم 'مرحوم و مغفور' ہونے کے بعد بھی آپ کا ممنون و مشکور رہے گا ——— لفظوں کے اس انتخاب پر جس میں نشست و برخاست کا خاص طور سے خیال رکھا گیا تھا، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس میں نشست کم تھی اور برخاست زیادہ شبو کی آنکھیں ہم سے یہ درخواست کرتی محسوس ہوئیں کہ صرف ایک ہی نشست میں غافلہ صاحبہ کو برخاست کر کے اُن کی علمیت کے گنج گراں مایہ پر گنجے مت گرائیے پلیز ———!! حسین نگاہوں کی یہ درخواست ہم نے فوراً منظور کر لی چنانچہ وہ فوراً انگریزی گلاب دستے کی طرف رجوع ہوئیں ——— یہ عطیہ ربّانی ہیں ... ماڈرن آرٹ میں کافی دخل رکھتی ہیں ——— ملک کے مشہور آرٹسٹ رنگین ربّانی صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ اس اطلاع پر عطیہ ربّانی کے ہونٹوں پر اس طرح مسکراہٹ پھیل گئی جیسے کسی آرٹسٹ نے سادے کاغذ پر رنگ بھرا برش پھیر دیا ہو۔ ہم نے بھی اخلاقاً مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔ البتہ ہماری مسکراہٹ رنگین تھی یا سنگین پتہ نہیں ——— چہرے بُشرے کے اعتبار سے محترمہ کا نام بجائے عطیہ ربّانی کے عطیہ خوبانی ہوتا تو مناسب ہوتا ویسے نام چاہے کچھ بھی ہو ہماری نظر میں ہر لڑکی قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے۔ مس عطیہ ربّانی نے رنگین مسکراہٹ عطا کرنے کے بعد فرمایا: "خان فولادی کے بھونڈے پورٹریٹ پر سیاہی پھیر کر آپ نے اس کی ساری اکڑفوں نکال دی۔ اس کے لئے میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ کم بخت اپنے علاوہ ہر شخص کو ادھوری پنٹنگ سمجھتا تھا۔" بات کیا کر رہی تھیں محترمہ، لگتا تھا منہ سے رنگ جھڑ رہے ہیں۔ رنگ مبارکباد کے جو رنگین چھینٹے ہم پر اُڑے تھے انہیں ہم نے گل بوٹے سمجھ کر اپنے وجود کے کینوس پر چپکنے دمکنے کا موقع دیا۔

اب شبو نے تیسرے اور آخری نئے چہرے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتے ہوئے فرمایا: "یہ حمیدہ امیر جان ہیں۔ طبِ یونانی میں ڈگری یافتہ ہیں"

بہت خوب! جیسا نام ویسا کام ہم نے دل ہی دل میں کہا آپ کے نام پر تو کسی یونانی دوا کا گمان ہو سکتا ہے۔ بلکہ حمیدہ امیر جان کے وزن پر ہمارے ذہن میں فوراً خمیرہ گاؤزبان کا نام آگیا جُثّے کے اعتبار سے بھی موصوفہ پورا یونانی شفاخانہ معلوم ہوتی تھیں ——— لیکن جب دہن مبارک کے نشریات کا مظاہرہ کیا تو یوں لگا جیسے محترمہ کے حلق میں کوئل نے گھونسلہ بنا رکھا ہے اور وہی اب کو کو کر رہی ہے۔ اتنے بھاری بھرکم جُثّے پر اتنی مہین آواز ——— یوں لگتا تھا جیسے کسی شریر میکانک نے کسی دو کل ٹرانسسٹر کا اسپیکر کسی بڑے ریڈیوگرام میں فٹ کر دیا ہے ——

محترمہ نے بھی وہی مبارکباد کی نغمہ الاپا جسے ہم نے اس طرح شرماتے ہوئے قبول کیا جیسے مبارکباد نہ ہو بلکہ کسی ماہر امراض خبیثہ کا 'صیغۂ راز' والا مشورہ ہو ــــــ!

بالآخر یہ بات کھل گئی کہ ان گلدستوں کی آمد کا مقصد دراصل ہمیں مبارکباد دینا تھا۔ اس سے ایک اور بات صاف ہوئی کہ خان فولادی عرف طوطا پری سے لوہا لے کر ہم یقیناً زیرو سے 'ہیرو' کے زمرے میں آگئے ہیں ــــــ!

پچھلی چند راتوں سے بھوتوں کے ایک 'شر سگال' گروپ اور ہمارے مابین بیت بازی کا ایک دھواں دھار مقابلہ ہوتا رہا ہے۔ ہم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے شبّو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ــــــ: "ہمارے اس طرز تخاطب پر پہلے تو شبّو کی آنکھوں کی رنگت بدلی پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ عنابی رخسار خجالت سے تمتمانے لگے۔ آنکھیں غم و غصے اور ندامت سے جھک گئیں۔ اس لئے ہونٹوں کا زاویہ سکڑ کر ایسی شکل میں آگیا جیسے محترمہ ابھی رو پڑیں گی۔ ہم نے ہاتھ بھی تو ان کی دُکھتی رگ پر رکھا تھا۔ قبل اس کے کہ شبّو صفائی میں کچھ کہتی ہم نے ان کا آتشدان میں نصب کردہ ٹیپ ریکارڈ ان کے حوالے کرتے ہوئے مزید کہا "بھوتوں سے بیت بازی کے اس مقابلے میں آپ کی دُعا سے خاکسار نے بازی جیت کر یہ ٹیپ ریکارڈ انعام میں حاصل کیا ہے۔ جو آپ کی نذر ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف ــــــ:

ادھر شبّو کا یہ عالم کہ جیسے کسی نے انہیں کوئی نازیبا حرکت کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو ــــــ ہمارا پھینکا ہوا طنز کا پتھر برابر نشانے پر بیٹھا تھا۔ شبّو کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ ساری چہک، ساری چنچلتا جیسے کسی نے سلب کرلی ہو۔ شبّو کے اس گمبھیر اور اداس روپ میں بھی ایک عجیب نکھار تھا۔ ایک نیا لوچ تھا۔ ایک نئی کشش تھی۔

اس روپ متی کے نئے روپ سے اور بھی لطف اندوز ہونے کے لئے ہم نے مزید چھیڑ خوانی کی ــــــ ویسے بھوتوں کے شر سگال گروپ کے تمام تر بھوت آپ ہی کے پالے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بطور خاص آپ کو سلام کہا ہے۔ بلکہ آپ کے نام خیر سگالی کا ایک پیغام بھی بھیجا ہے۔ جو اس 'کیسٹ' میں محفوظ ہے ــــــ!

ہم نے وہی کیسٹ شبّو کے حوالے کردیا جو انہوں نے ہمیں خوفزدہ کرنے کے لئے ٹیپ ریکارڈر میں فٹ کیا تھا ــــــ اس آخری وار نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ خفت، ندامت جھینپ اور پتہ نہیں کون کون سے احساسات نے ملکر سارے بندھ توڑ ڈالے اب جو شبّو کی آنکھوں سے جوار بھاٹا شروع ہوا ہے تو ہمارا دل، جواری اور بھٹے کے دانوں کی طرح آنسوؤں کے اس سیلاب میں بہنے لگا۔ لیکن ہم نے اپنے ناعاقبت اندیش دل کو سنبھالا اور سنجیدگی سے کہا ــــــ

"آپ کے ان تحفوں کی سنگت میں ہماری راتیں بڑی پُرسکون گذریں ــــــ افسوس کہ میں اور زیادہ رُک نہیں سکتا، آج اور اس وقت یہاں سے جارہا ہوں لیکن جانے سے پہلے کاش یہ جان سکتا کہ اس سارے 'بھوتیہ ڈرامے' کے پیچھے کونسا بھید چھپا ہے ــــــ کیا راز ہے؟ ــــــ کون ہے وہ ہستی؟ ــــــ جس کی وجہ سے آپ کو میرا یہاں رہنا گوارا نہیں؟ ــــــ

وہ راز ــــــ! وہ بھید ــــــ! وہ ہستی ــــــ! شبّو نے بہت دیر بعد زبان

کھولی، آنسوؤں کی روانی میں کسی قدر کمی آگئی تھی۔ شبو نے راست ہماری آنکھوں میں دیکھا ــــ آنسوؤں سے لبریز ان پیمانوں کو دیکھ کر ہم نے دل ہی دل میں خود پر کم از کم سو دفعہ لعنت بھیجی کہ اتنی حسین، اتنی پیاری، اتنی معصوم آنکھوں میں آنسوؤں کی بھیانک طغیانی لانے کے ذمہ دار ہم ہی تھے بس نہیں چلتا تھا۔ ورنہ اپنے دامن میں ان بیش بہا موتیوں کو چُن لیتے کہ ایک ایک موتی یقیناً، حاتم طائی والے مُرغابی کے انڈے کے برابر والے موتی کا ہم پلّہ تھا۔ لیکن افسوس ہماری آنکھوں کے آگے بیش قیمت موتی ضائع ہوتے رہے۔ اور ہم دل مسوسے دیکھتے رہے ــــ شبو نے ٹھہر ٹھہر کر تھم تھم کر دھیمے لہجے میں بات آگئے بڑھائی ــــ "وہ ہستی جسے میں کم از کم آپ سے آگے۔ ایک بھید، ایک راز رکھنا چاہتی تھی ــــ وہ اب بھید نہیں رہے گا ــــ راز نہیں رہے گا۔ ــــ! پلیز کل تک رُک جایئے۔ کل یہ راز ــــ یہ بھید خود چل کر یہاں آرہا ہے ــــ"

اتنا کہہ کر شبو اچانک اُٹھ کھڑی ہوگئی ــــ اور پھر تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں ــــ شبو کے اس گمبھیر روپ کو دیکھ کر دل و دماغ میں ایک عجیب سی کھینچا تانی شروع ہوگئی۔

مرزا اُڈگلی

نام مرزا قادر بیگ ولد مرزا کریم بیگ صاحب (مرحوم) تعلقہ بلولی ضلع ناندیڑ کے نامور بزرگ نواب سرفراز خاں شہیدؒ کے خاندان سے ہوں بلولی میں پیدا ہوا بعض وجوہات کی بناء پر مجھے اپنی ننھیال کے گاؤں ضلع اُڈگلی منتقل ہونا پڑا۔ اور اسطرح اُڈگلی میرے نام سے دانستہ یا نادانستہ مستقل طور پر وابستہ ہوگیا۔

بچپن میں اُردو۔ عربی۔ مرہٹی میں تعلیم حاصل کی پہلے منشی کامیاب کیا بعد میں ملازمت کرتے ہوئے میٹرک پاس کیا محکمہ تعلیمات میں مدرس ہوں۔ اُردو کے ساتھ ساتھ مرہٹی میں بھی مزاحیہ شاعری کرتا ہوں۔ اب تک مہاراشٹرا کے کئی رسالوں میں چھپ چکا ہوں۔ میرا اُردو میں مزاحیہ شاعری کا مجموعہ کلام "گٹھلیاں" مہاراشٹرا اُردو اکیڈمی کے تعاون سے ۱۹۷۶ء میں چھپ چکا ہے اور اب مرہٹی مجموعہ کلام چھپوانے کی کوشش میں ہوں بلولی اور اُڈگلی میں تھوڑی سی زراعت ہے۔ اسی پر اپنی زندگی گزارتا ہوں۔

غزلیں

نشہ دارو کا لیمو پیاز کھانے سے اُترتا ہے
تونگر کا نشہ دولت کے جانے سے اُترتا ہے
پھنسا دو کرئی حیلے سے نکھٹو کو شکنجے میں
نشہ کاہل کا گھانے کو لگانے سے اُترتا ہے
کھٹائی سے مٹھائی سے نہیں اُترے گا بہرِ باشا
نشہ شاعر کا شعروں کے سُناتے سے اُترتا ہے
ڈھکے ہیں کان بالوں سے سُنائی کچھ نہیں دیتا
نشہ ہپّی کا اُس کا سر منڈانے سے اُترتا ہے
چکاری جانور قابو میں آجائے گا کچھ دن میں
کنوارے کا نشہ شادی رچانے سے اُترتا ہے
نہیں ٹکتی کبھی چکنے گھڑے پر بوند پانی کی
لفنگوں کا نشہ ڈنڈے بجانے سے اُترتا ہے
نشہ کرسی کا لیکن سب نشوں کا باپ ہے مرزا
کہ لیڈر کا نشہ کرسی کھے جانے سے اُترتا ہے

غرارہ کی طرح پتلون سلا رہیں ہت تمہاری کی
نوے فیشن کدھر سے لیکو آرئیں ہت تمہاری کی
بہادر مرد کی ٹھوکر سے پتھر پانی بنتا ہے
لگی ٹھوکر تو تم آنسو بہارئیں ہت تمہاری کی
نماز و روزہ سب چھوڑئیں چلیئں صندل چراغاں کو
سراں مرشد کے قدماں پو جھکارئیں ہت تمہاری کی
وہ دیکھو لوگاں جاکو چاند میں جھنڈے گڑا دیرئیں
تمہیں نالی میں گر کو ڈبکیاں کھارئیں ہت تمہاری کی
تمہیں بی دلو تڑی مولانا مرشد ماڈرن بن جاؤ
یہ باسی روز کیا ٹکڑے چبارئیں ہت تمہاری کی
رہے لگ پیسے جوا کھیلتے تھے سندی پیتے تھے
سرے پیسے تو اب گرگٹی لکا رئیں ہت تمہاری کی
کھلے قسمت کے پھولاں تو وہ چل کو گھر کو خود آئینگی
یہ کیا ماموں کے جاکو پاؤں دبارئیں ہت تمہاری کی
وطن کے واسطے سرحد پو لوگاں جان دیدیرہیں
تمیں ہنڈیاں میں اپنا مُنہ چھپا رہیں ہت تمہاری کی
جمع ہیں جس جگہ اُردو کی ناڑی دیکھنے والے
تم ایسی جا غزل مرزا سنارہیں ہت تمہاری کی

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد (۱۰)   شمارہ (۵)

کتابت: ادارۂ سلام خوشنویس، حیدرآباد ۲۳ ـ اور دوسرے

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو دربارِ حسینی، پرانی حویلی حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

سالانہ (۲۰) روپے ــــ بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ

سالانہ انفرادی (۱۵) روپے ــــ فی پرچہ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

(ٹائٹل: طالب خوندمیری)

خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ ۳۱/ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (اے پی)

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

اِس ہفتہ ہندوستان کے کونے کونے میں
پہونچ چکا ہے!
اپنے ایجنٹوں سے طلب کیجئے
فلمی تصویر
ایڈیٹر
فلمی و ادبی ماہنامہ
پہلا شمارہ۔ جون ۱۹۷۷ء
اردو صحافت کی تاریخ میں حسین ترین اضافہ۔ نفیس ترین کاغذ، ضخیم مواد، فوٹو آفسیٹ پر بہترین طباعت، رنگا رنگ تصویریں، غیر معمولی سائز۔ نامور ادبی اور فلمی شخصیتوں کی نگارشات۔
بے شمار خوبیاں۔
پہلے شمارہ کی چند جھلکیاں
کشور کمار کو چھوڑنے کے بعد کیا یوگیتا بالی جوہر سے شادی کرے گی؟
ہمارے سوال اور ـــــ "جوہر شادیوں کا چکر" کے زیر عنوان جوہر کا جواب پڑھیئے۔
شعلے، کی بسنتی (ہیما مالینی) کیا رضیہ سلطان اور میرا بن سکے گی؟ مضمون "ہماری ہیروئنیں" "بھیگے کپڑوں میں غنچہ ہائے ناشگفتہ تماش بینوں کے ہونٹوں سے سیٹی نکلوا دیتے ہیں؟ تب بھی کوئی کسر رہ جائے تو عصمت دری کا منظر موجود ہے ـــــ اگر سنسر بورڈ اسکرین پر بوسہ کی اجازت دیدے تو غیر ضروری گھٹن اور عریانیت کا خاتمہ ہو جائے گا"۔ ہندوستانی فلمیں اور جنس" (مضمون) حسن کمال ایڈیٹر اردو بلٹز
آپ صحافیوں نے مجھے شیطان کی شہرت بخشی ہے۔ مجھے انٹرویو دینے سے گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ "رضیہ سلطان" اور" مجنوں" کیا " پاکیزہ" سے بڑھ چڑھ کر ہوں گی"؟ کمال امروہوی کا انٹرویو
"کتابی زندگی سے نکل کر جب میں فلمی زندگی میں آیا تو ہر فلم بنانے والا میری طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے کسی شیش محل میں کتا گھس آیا ہو"۔ راجندر سنگھ بیدی کا مضمون "میں پروڈیوسر کیسے بنا"؟
یہ اور اس کے علاوہ
آج کا کامیاب ترین ہیرو کون؟ (مباحثہ)
ابن سیانی اور بنا کا گیت مالا کی مقبولیت کا راز؟ (مضمون)
دلیپ کمار پر خصوصی مضمون
شترو گھن سنہا سے ریڈیو ٹیلیویژن اسٹار تبسم کا انٹرویو
ہمارے سوال اور آپ کے جواب (ایک نیا اور انوکھا سلسلہ)
زیر تکمیل فلموں سے متعلق دلچسپ نیوز لیٹر
فلموں پر تبصرے
مصور کا فلمنامہ
تبسم سے پوچھیئے (سوال پوچھیئے جواب ملیں گے)
یادوں کے جھروکے
ادبی افسانے اور منظومات اور اس کے علاوہ دلکش رنگین اور دل نشین تصاویر، انٹرویو، ڈبل سپریڈ فوٹو کیلنڈر، ہمہ رنگی ٹائٹل۔ قیمت ۲/۵۰ روپے
فلمی تصویر "گرین پیلس"
3.6.373/A
حمایت نگر حیدرآباد۔ 500029
فون: 62626 62640

زندہ دلانِ حیدرآباد

دسویں سالانہ تقاریب

ا

خطبۂ صدارت

بھارت چند کھنہ

زندہ دلان حیدرآباد کا یہ دسواں سالانہ اُدبی اجلاس اپنی بے پناہ دلچسپیوں کے ساتھ ختم ہو رہا ہے گو اس ادارے کو قائم ہو کر گیارہ سال ہو چکے ہیں، ہم صرف ایک سال اپنی سالانہ تقاریب منعقد نہیں کر سکے تھے کیونکہ اُس سال تلنگانہ تحریک اپنے شباب پر تھی، اور پتھراؤ کا چلن اس قدر عام تھا کہ ہم مزاح نگاروں اور مزاحیہ شاعروں کی محدود مخلوق میں کمی ہو جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ اُردو ادب کے کسی ادارے کے لئے اتنی مدت تک باقاعدگی سے بقیدِ حیات رہنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ خاص طور پر ایک ایسے ادارے کے لئے جس کی وابستگی اُردو کی ایسی صنف ادب سے ہے جس کے اکھاڑے میں زور مارنے والے بہت کم ہیں۔ گو سنجیدہ اُدب سے تعلق رکھنے والے ہمیں ایسی حقارت سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی ہاتھی کسی چیونٹی کو، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس صنفِ ادب میں طبع آزمائی کرنے والے اُردو ادب کی تاریخ کے ہر دَور میں اِس سے دُور دُور ہی رہے ہیں۔ اور اس کی صرف یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ اُردو ادب کا یہ میدان ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اسکے باوجود پرانے زمانے کے اساتذہ سے لے کر آج کل کے ظرفائے اُردو نے اِس صنفِ اُدب کو اس کا جائز مقام اور وقار حاصل ہونے نہیں دیا۔

ہمارے ادارے کی غرض و غایت یہی ہے کہ مزاحیہ اُدب کو اُردو ادب میں اسکا حق جس سے وہ اب تک محروم رکھا گیا ہے، دلائے ——— اور یہ اُسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جبکہ طنز و مزاح کے لکھنے والوں کی تعداد بڑھے اور وہ اچھے معیاری اُدب کی تخلیق کریں جس کا مقصد انبساط اور قہقہے پیدا کرنے کے علاوہ سماج، رواج اور زندگی کے ہر پہلو کے رِستے ہوئے ناسوروں پر اُنگلی رکھنا ہو، تاکہ اِن کی، خامیاں صاف صاف نظر آنے لگیں اور ان کی اصلاح ہو سکے۔

اس کے علاوہ اسبات کی بھی بہت ضرورت ہے کہ اِس اُدب کی زیادہ سے زیادہ معیاری کتابیں، چھپیں اور اِس اُدب کا سرمایہ بڑھے۔ اِس ضمن میں میرے خیال میں ایک اور اہم کام جو کیا جانا چاہیئے یہ ہے کہ اِس ادب کے لکھنے والے زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں سے روشناس کرائے جائیں تاکہ اُن کی کتابوں کی مانگ بڑھے۔ یہ اُسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے اگر اُردو میں لکھی ہوئی کتابوں کے ہندی اڈیشن شائع ہوں یا اُن کو محض ہندی رسم الخط میں چھپوا کر ہندی پڑھنے والوں کے لئے ہندی رُوپ میں پیش کیا جائے۔

اب تک ہم صرف بارہ کتابیں طنز و مزاح پر چھپوا سکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد ہر اعتبار سے بہت کم ہے
اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جیسا میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ اس میدان میں طبع آزمائی کرنے والوں کی تعداد بہت
کم ہے اور ہمارے وسائل ایسے نہیں ہیں کہ ہم کسی قسم کے وسیع اشاعتی پروگرام کو روبہ عمل لاسکیں۔ حتی المقد
اس ریاست کے لکھنے والوں کی تخلیقات کی اشاعت میں ہم نے معاونت اور تعاون کا ہاتھ بڑھانے سے
کبھی گریز نہیں کیا۔ اس پروگرام کو وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے، اور اس بارے میں طبع شدہ کتابوں کو
ہیں شائع کرانے کے لئے ہم آیندہ ممکنہ کوشش کرینگے۔

ہمارے ایک جواں سال مزاح نگار کے مضامین کا مجموعہ "گستاخی معاف" سال رواں میں چھپ
اور اس کی رسم اجراء ابھی ابھی عمل میں آئی۔ موصوف چند سال پہلے زندہ دلان کے ایک سالانہ جلسہ
متعارف کرائے گئے تھے۔ میں ان کو اس مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور توقع کرتا ہوں
مزاحیہ ادب کی تخلیق میں وہ پیش پیش رہینگے۔ میں یہ بھی امید اور دعا کرتا ہوں کہ موصوف کی کتاب کی نکا
کا واحد ذریعہ بار ادب تحفتہً پیش کر کے "زہے عز و شرف" حاصل کرنا نہیں ہوگا۔

اِس سال ہم نے ایک اور نئے مزاح نگار برہان حسین صاحب کو پیش کیا ہے۔ جن کو آج کی محفل میں
سن اور سراہ چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ موصوف اپنے اِس شوق کو جاری رکھینگے اور کسی اور شوق
پڑ کر خود کو فراموش اور اپنی لکھنے کی صلاحیت کو ایقاً نہیں کر دینگے۔

اب کچھ حال ہماری سال گزشتہ کی مصروفیات کا سُنیے۔ اِس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ زندہ
حیدرآباد کے اراکین پٹنہ کے جشنِ مزاح میں شریک ہوئے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ مسیح ا
کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "در پردہ" پردے سے باہر آیا۔ اِسکی رسمِ اجراء ایک شاندار جلسہ میں ا
پائی۔ آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی نے اُن کی اس کتاب پر ایک ہزار روپے کا گرانقدر انعام ان کو دیا۔
جس کے لئے میں موصوف کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ دورانِ سال سرور ڈنڈا مرحوم کی یاد
شایانِ شان طریقے سے منائی گئی۔ ہم نے طے کیا ہے کہ مرحوم کے کلام کو حاصل کر کے اس کی اشاع
انتظام کیا جائے۔ اِسکے علاوہ جناب سرحدی صاحب کے ساتھ ایک شام ہم نے گزاری، جو بہت
ایک ادبی محفل اور مشاعرے کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے علاوہ ہمیں جناب ہلال سیدی
صاحب اور محترمہ شفیقہ فرحت صاحبہ کا سواگت کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

ہمارا ایک رسالہ "شگوفہ" نہایت باقاعدگی سے ہر ماہ آب و تاب سے طلوع ہوتا ہے اور اِ
معیاری ہونے کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا۔ اُردو کا کوئی ادبی رسالہ تاوقتیکہ وہ سر
طور پر شائع ہوتا ہے، بالعموم کمسنی ہی میں داغِ مفارقت دے جاتا ہے۔ اِن رسالوں کی طبعی عمر مزاحیہ
کی حد تک پروانے جتنی اور سنجیدہ رسالوں کی شمع کی طرح مختصر ہوتی ہے۔ شگوفہ کا آٹھ نو سال تک زندہ
زندہ رہنا، بلکہ پھلنا، پھولنا اور نشوونما پانا ایک معجزے سے کم نہیں جس کے لئے اسکے مدیر جناب مصطفےٰ
صاحب قابلِ صد مبارکباد ہیں۔ شگوفہ میں پرانے اور نئے لکھنے والوں کے لئے بہت جگہ رہتی ہے
لکھنے والوں کے لئے شگوفہ ایک نعمت متبرکہ سے کم نہیں۔ مگر نئے لکھنے والوں کو بھی چاہیے کہ وہ
رسالے کے معیار کو برقرار رکھنے میں کوشاں رہیں۔ اور لکھتے وقت مزاح کی تخلیق کے ساتھ۔

مقصد، کوئی پیام پڑھنے والوں تک پہنچانا ہے جس میں ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا فروغ مضمر ہو۔

۸ مارچ کو کرشن چندر اپنے بے شمار چاہنے والوں کو چھوڑ کر چل بسے زندہ دلانِ حیدرآباد خاص طور پر سوگوار ہیں کہ کرشن چندر نے ہمکو نصب العین بتلایا تھا اور ہماری بقا کی بنیاد رکھنے میں ہماری بڑی حوصلہ افزائی اور مدد کی تھی۔ خالق انہیں جوارِ رحمت میں پناہ دے۔

میں ہمارے باہر سے آئے ہوئے ادیبوں اور شعراء کا خیر مقدم اور شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہماری دعوت قبول فرما کر آنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ میں زندہ دلوں کے عہدہ دار صاحبان اور کارکنوں کا بھی بے حد مشکور و ممنون ہوں جنکی انتھک اور پسِ پردہ عرق ریزیوں کے باعث ہمارا یہ جلسہ کامیاب ہو سکا ہے۔

اور پھر یہ سراسر ناانصافی ہوگی اگر میں ہمارے کاروانِ جلسہ کے زندہ دل ساربان جناب رشید قریشی صاحب کی خدمت میں کنوینر کے فرائض نہایت دلفریب انداز سے ادا کرنے پر اُن کو خراجِ عقیدت پیش نہ کروں۔

بالآخر مجھے ہمارے معزز سامعین کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے ہمارے مزاح نگاروں کی تخلیقات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اُن کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

پہاڑی بچے ایک تابناک مستقبل کے منتظر ہیں

"جہاں دنیا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور محدود گھریلو چار دیواریوں میں بٹی ہوئی نہ ہو، میرے خدا! آزادی کی ایسی جنت میں میرے ملک کو بیدار کرنا" یہ تھا آزاد ہندوستان کا اعلیٰ وارفع خاکہ جو ایک شاعر کے تخیل میں ابھرا تھا۔ لیکن ایک طویل عرصے تک ہندوستان میں گھریلو چار دیواریوں نے آدمی کو آدمی سے جدا رکھا۔ اس لیے صبحِ آزادی کے طلوع کے بعد کمزور طبقات اور قبائلی باشندوں کے ساتھ نئے انداز سے پیش آنے پر زور دیا جانے لگا۔

گزشتہ ۲۰ برس کے عرصے میں پہاڑی بچوں یعنی قبائلیوں کی فلاح و بہبود پر پانچسالہ منصوبوں میں غیر منقسم توجہ دی گئی ہے۔ پہلے پانچسالہ منصوبے میں ۱۸۸٫۷۱ لاکھ روپیوں کے اخراجات کی گنجائش فراہم کرکے آندھرا پردیش میں قبائلی علاقوں اور قبائلی باشندوں کی فلاح بہبود کا کام باقاعدہ طور پر شروع کیا گیا۔ دوسرا منصوبہ اس سلسلے میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس منصوبے کی مدت میں قبائلی بہبود سے متعلق گوناگوں سرگرمیوں پر مشتمل آتنور۔ اراکو۔ نرسم پیٹھ اور باڈیرو میں چار کثیر المقصدی پراجکٹس قائم کیے گئے۔

تیسرے منصوبے کے دوران میں ۲۴ قبائلی ترقیاتی بلاکس کے قیام کی بدولت قبائلی بہبود کے پروگراموں کو مزید بڑھاوا ملا۔ چوتھے منصوبے میں اخراجات کی سطح ۴۰٫۲۴۷ لاکھ روپے تک بڑھا دینے سے ترقی کی رفتار میں تیزی پیدا کردی گئی اور اب پانچویں منصوبے کے پیش نظر رفتار ترقی کو تیز تر کردینا ہے۔

گریجن کوآپریٹیو کارپوریشن جو اپنی قسم کا پہلا ادارہ ہے ان تمام برسوں کے دوران قبائلیوں کو قرض اور مارکٹنگ کی سہولتیں فراہم کرنے میں نمایاں اور فائدہ مند کردار ادا کرما رہا ہے۔ اس کارپوریشن کی سرگرمیاں ۱۷ اضلاع پر محیط ہیں اور یہ اس سے ملحقہ ۲۸ ابتدائی انجمنوں اور ۴۰۲ گھریلو ضروریات کے ڈپوز کے ایک جال کے توسط سے اپنے کاروبار انجام دیتا ہے۔

منتخبہ قبائلی علاقوں کی تیز رفتار ترقی کے لیے ۱۵۰ لاکھ روپیوں کے مصارف سے زراعت پر مبنی ایک ہمہ مقصدی پراجکٹ بنایا گیا ہے۔ جو گریجن ڈیولپمنٹ ایجنسی کے نام سے معروف ہے۔ اس پراجکٹ میں مرکزی حکومت کا سرمایہ لگا ہے اور یہ ضلع سریکاکلم کے تعلقہ جات بالاکنڈہ۔ پاروتی پورم۔ سالور۔ ٹیکالی۔ سوم پیٹھ اور پاتھا پٹنم کے شیڈولڈ اور نان شیڈولڈ دونوں علاقوں پر محیط ہے۔ اس پائلٹ پراجکٹ کی عمل آوری کے لیے تخمیناً ۱۱۰۷ مربع میل علاقہ جس میں ۴۲۳۰۰ قبائلی گھرانے ہیں منتخب کیا گیا ہے۔

پہاڑی بچے۔ قبائلی۔ ایک ایسے تابناک مستقبل کی جھلک دیکھ رہے ہیں جو ان کی توقعات اور اُمیدوں کے عین مطابق ہے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR : 27/76-77

مجتبیٰ حسین

لَوٹ پیچھے کی طرف...

قاضی غیاث الدین سے پہلی بار میں کافی ہاؤس میں ملا تھا۔ کافی ہاؤس کے سوائے ان سے کہیں اور ملاقات ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ ناپسندیدہ اشخاص صرف کافی ہاؤس میں ہی پائے جاتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے قاضی غیاث الدین سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا ـــــ "اِن سے ملیئے، یہ قاضی غیاث الدین ہیں، مشہور ماہر آثارِ قدیمہ" ـــــ میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میرے دوست نے اُچک کر میرے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہا: ـــــ "یہ کیا غضب کرتے ہو، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ قاضی صاحب کسی سے مصافحہ نہیں کرتے ان کے سیدھے ہاتھ نے ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کے آخری وائسرائے اور پہلے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے پہلا اور آخری مصافحہ کیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اُنھوں نے اس تاریخی مصافحہ کو اپنے ہاتھ میں محفوظ رکھا ہے۔ وہ اس تاریخی اور جغرافیائی مصافحہ کو ہم جیسے نتھو خیروں کے مصافحوں سے ملوّث کرنا نہیں چاہتے۔"

مَیں نے قاضی غیاث الدین کے ہاتھ میں چھپے ہوئے مصافحہ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ قاضی صاحب میرا مطلب سمجھ گئے اور بولے ـــــ "میاں! یہ مصافحہ تمہیں یوں ننگی آنکھ سے دکھائی نہیں دے گا، اس کے لئے ایک ماہر آثارِ قدیمہ کی آنکھ درکار ہے۔ ایسی آنکھ جو آگے نہیں پیچھے کی طرف دیکھتی ہو۔ کہنے کو تو میں اس وقت بیسویں صدی کے اس کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوں مگر میری اُلٹی آنکھیں پانی پت کے میدان میں گھوڑوں کو دوڑتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ نادرشاہ کا قتل عام میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے دیکھتے نہیں، میری آنکھ میں کتنا خون اُتر آیا ہے۔ اور یہ دیکھو کہ بابل و نینوا کی سیکڑوں برس پرانی تہذیب میری آنکھوں میں انگڑائی لینے لگی ہے۔" پھر آنکھ مار کر اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولے ـــــ "وہ دیکھو اپنی تغیڑوں میں حسینائیں کس شان سے چہل قدمی کر رہی ہیں۔" میں نے اُن کی اُنگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ وہاں چند ہپّی لڑکے اور لڑکیاں چرس اور بھنگ سے فارغ ہونے کے بعد خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔

میں نے کہا ـــــ "قاضی صاحب! آپ کی یہ اُلٹی بینائی تو بہت تیز ہے۔ ایک ہی نظر میں پانی پت کے میدان، بابل و نینوا [illegible] کھنڈروں کو پھلانگ لیتی ہے۔"

بولے : " میاں ! اس مخصوص بصارت کو حاصل کرنے کے لئے آدمی کو بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔ ع

این بصارت بہ زورِ بازو نیست" !

یہ کہہ کر قاضی غیاث الدین نے اپنی آنکھوں پر سے وہ عینک اُتاری جس کے فریم میں سوڈے کی بوتلوں کے پیندے جُڑے ہوئے تھے۔ عینک کے اُترنے کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ اب کی بار میری بصارت ٹھیک ہوگئی اور اُن کی ایک مصنوعی آنکھ مجھے صاف دکھائی دینے لگی۔

میں نے بات کا رُخ موڑتے ہوئے کہا : " قاضی صاحب ! کافی پینے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے" ؟

میرے دوست نے پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا : " دیکھتے نہیں ! قاضی صاحب کے سامنے کافی کا وہ پیالہ رکھا ہوا ہے جو اُنھوں نے صبح میں منگوایا تھا۔ قاضی صاحب ماہر آثارِ قدیمہ ہیں نا، اس لئے صبح کافی ہاؤس آتے ہی وہ کافی منگوا لیتے ہیں اور اُسے اُس وقت تک نہیں پیتے جب تک کہ کافی میں " آثارِ قدیمہ" نمودار نہ ہوجائیں"۔ اور میں نے کافی کے پیالے میں جھانک کر دیکھا، وہاں سچ مچ آثارِ قدیمہ نمودار ہوگئے تھے اور کافی کی سطح پر تاریخ کی ایک دبیز اور سیاہ تہہ جم گئی تھی۔

اِس ملاقات کے بعد قاضی صاحب سے پھر ہر روز ملاقات ہونے لگی۔ قاضی صاحب کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ نئے دوستوں کو مُنہ نہیں لگاتے تھے اور پُرانے دوست اُن کو مُنہ نہیں لگاتے تھے۔ تاہم اُن کے دوست اُن سے گھبراتے بہت تھے، کیونکہ مشہور تھا کہ اُن کے ایک دوست نے ایک بار ان کی بڑائی کی اور دوسرے ہی دن قاضی صاحب نے انکشاف کیا کہ اُن کے اس دوست کا گھر جس قطعہ اراضی پر واقع ہے، اُس کے نیچے چندر گپت موریا کے عہد کی کچھ باقیات دبی ہوئی ہیں، جنھیں کھُدائی کے ذریعہ باہر نکالا جاسکتا ہے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں اپنے دوست کے گھر کی کھُدائی کا بندوبست کرلیا۔ اگرچہ اِس کھُدائی میں کچھ بھی نہ نکلا مگر قاضی صاحب کی حسرت نکل گئی !

وہ ہر پُرانی اور بوسیدہ چیز پر یُوں جھپٹتے تھے جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ سُنا ہے کہ قاضی صاحب نے بیس سال کے وقفے سے دو شادیاں کی تھیں۔ دوسری شادی کے بعد وہ پہلی بیوی پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مہربان رہنے لگے تھے۔ یُوں بھی فطری طور پر اُنھیں کھنڈرات ہی زیادہ بھلے لگتے تھے۔ سارا وقت پہلی بیوی کے ساتھ گزارتے اور دوسری بیوی کو اُنھوں نے یہ کہہ کر ٹرخا دیا تھا کہ ابھی اُس کے حُسن کو تاریخ اور زمانہ کی گرمی میں تپنا ہے اور تپ کر کندن بننا ہے۔ تپ کر کندن بننے سے اُن کی مُراد یہ تھی کہ اُس کے چہرے پر جھُرّیاں پڑجائیں اور وقت اُس کی کمر کو دوہرا بنا دے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ بیچاری کندن بنتی، کسی منچلے نے اُسے قاضی صاحب کے گھر سے کھود نکالا اور اُسے موجودہ تاریخ کے دھارے میں بہا دیا۔ ع

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن مُرجھائے کھِل گئے" !

زندگی کے ہر شعبے میں قاضی صاحب کا یہی رویّہ تھا۔ کسی نئی عالیشان عمارت کو دیکھتے تو بڑی حسرت کے ساتھ کہتے : " میاں ! زندگی آنی جانی چیز ہے۔ اِس چار روزہ زندگی میں مجھے یہ موقع کبھی نہ مِل سکے گا کہ میں اِس عمارت کو کھنڈر بنتا ہُوا دیکھوں۔ تاریخ کے مضمون سے مجھے محض اِس لئے دلچسپی ہے کہ تاریخ نے دُنیا کو بڑے بڑے کھنڈرات دیئے ہیں، جنگ کے میدان دیئے ہیں اور سُننے کو بڑی دلچسپ کہانیاں دی ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ ایک بار جب میں سفر کرتا ہوا پانی پت کے میدان سے گزرا تو پانی پت کی ساری جنگیں بیک وقت میرے اندر لڑی جانے لگیں۔ وہ گھمسان کا رَن پڑا کہ کنڈکٹر سے منّت سماجت کرکے بس رُکوائی۔

سفر منقطع کیا۔ لیکن اس ملک کی بدقسمتی دیکھو کہ جس میدان نے ہندوستان کی تاریخ کا رُخ موڑ دیا تھا، وہاں مجھے جا بجا بھینسیں گھومتی ہوئی دکھائی دیں"۔ پھر ایک آہ بھر کر کہا: "اصل میں ہم لوگ اپنے ماضی کا احترام کرنا نہیں جانتے"۔

مَیں نے کہا: "ماضی کے احترام سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ پانی پت کے میدان میں اب بھی جنگیں لڑی جائیں"؟

بولے: "جنگ لڑنے کے لئے اِس سے بہتر کوئی اور مقام نہیں ہے"۔

مَیں نے کہا: "قاضی صاحب! آپ کی یہ منطق میرے پلّے نہیں پڑی کہ محض چونکہ ہمارے پاس ایک میدان ہے، اس لئے ہم جنگیں لڑتے رہیں۔ تاریخ میں جنگیں اِس لئے لڑی گئیں کہ ان کے لڑے جانے کے بارے میں پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا۔ ہر جنگ اپنے مقررہ وقت پر ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد تیسری جنگِ عظیم لڑی نہیں گئی بلکہ دوسری جنگِ عظیم ہی لڑی گئی، کیونکہ یہ پہلے سے طے تھا کہ پہلی کے بعد دوسری جنگ ہی ہو گی"۔

قاضی غیاث الدین بولے: "میاں! تمہارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ تم ہمیشہ بھٹک جاتے ہو۔ مَیں بڑی جنگ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ مَیں اصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ جو ہم آئے دِن اپنے گھر کے افراد اور دوستوں سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتے رہتے ہیں، اُنھیں پانی پت کے میدان میں جاکر لڑا جائے۔ اس میدان میں لڑنے کا لُطف ہی کچھ اور ہے۔ اس طرح ہم اپنے ماضی کو بھی تازہ کرتے رہیں گے اور پانی پت کے میدان کی اہمیت بھی بنی رہے گی۔ انگریز کو دیکھو کہ وہ اپنے ماضی کی کس طرح حفاظت کر رہا ہے"۔

مَیں نے کہا: "جبھی تو اُس کے پاس اب صرف ماضی ہی ماضی رہ گیا ہے"۔

قاضی صاحب پر تاریخ کے ایسے دَورے اکثر پڑتے رہتے ہیں۔ اپنی اُفتادِ طبع کے باعث اُنھیں بیسویں صدی کے واقعات اور بیسویں صدی کے انسان سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ اُن کی دلچسپی اٹھارھویں صدی کے اُس پَرے سے شروع ہوتی ہے اور اُلٹی چلتی ہوئی زمانہ ماقبل تاریخ میں پہونچ جاتی ہے۔ حد ہو گئی کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے۔ کہتے ہیں: "بھئی! یہ تو کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ دُنیا نے دو بڑی جنگیں لڑیں، لیکن وہ اب بھی راجہ پورس اور سکندرِ اعظم کی جنگ میں جُٹے ہوئے ہیں"۔ ایک دن مجھے ایک بھالا بتلا کر کہنے لگے: "یہ وہی بھالا ہے، جسے راجہ پورس نے سکندرِ اعظم پر پھینکا تھا مگر راجہ پورس کا نشانہ خطا ہو گیا"۔

"اور یہ آپ کے لگ گیا"۔ مَیں نے فوراً کہا۔

بولے: "آپ مذاق نہ کیجئے۔ اگر اس بھالے کا نشانہ خطا نہ ہوتا تو آج ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی"۔

ایک دن قاضی صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ تنگ و تاریک گلیوں سے جب ہم گزرنے لگے تو مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے ہم ہڑپا موہنجو داڑو کے صدیوں پُرانے راستوں سے گزر رہے ہیں۔ قاضی صاحب کا گھر، گھر نہیں بلکہ اچھا خاصا مقبرہ تھا۔ جب یہ مجھے اندر لیجانے لگے تو مَیں نے پوچھا: "قاضی صاحب! یہاں کون مدفون ہے"؟ بولے: "مدفون ہے! بھائی صاحب، یہ میری رہائش گاہ ہے"۔

مَیں نے رہائش گاہ کو چھو کر دیکھنے کی کوشش کی تو مجھ پر تھوڑی سی رہائش گاہ آ گری۔ قاضی صاحب نے مجھے فوراً پَرے کھینچتے ہوئے کہا: "برخوردار! آثارِ قدیمہ کو اِس طرح نہیں دیکھا جاتا، اس کے بھی کچھ آداب

ہوتے ہیں "

مَیں نے پوچھا ، " قاضی صاحب ! کیا آپ نے اس گھر کو کبھی کھود نکالا ہے ؟"

بولے ، " یہ گھر میرے دادا کے پر دادا نے اُس وقت بنایا تھا جب اورنگ زیب نے گولکنڈہ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اُس وقت سے اب تک اس گھر کی کبھی کوئی مرمت نہیں کی گئی ۔ یہ خالص آثارِ قدیمہ والی عمارت ہے ۔ گولکنڈہ کے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی مگر اس گھر کی بنیادیں اب بھی مضبوط ہیں "

ہم لوگ ذرا اور آگے بڑھے تو چھت میں سے آثارِ قدیمہ کا کچھ حصہ میرے سر پر آگرا ۔ مَیں نے چھت کی طرف دیکھا تو وہاں چند چمگادڑیں قاضی صاحب کی بینائی کی طرح اُلٹی لٹکی ہوی تھیں ۔

پھر وہ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گئے ، جسے وہ بار بار دیوان خانہ کہہ رہے تھے ۔ اس میں پہونچ کر مجھے یُوں لگا ، جیسے میں سیکڑوں برس پہلے کی دُنیا میں پہونچ گیا ہوں ۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جب معذوری نے ترقی نہیں کی تھی تو اُس وقت انسان چینی مٹی کی بنی ہوئی رکابیاں اور اسی قماش کے دیگر برتن تزئین و آرائش کی خاطر دیواروں پر لگاتا تھا قاضی صاحب کے دیوان خانے میں چاروں طرف دیواروں پر رکابیاں ٹنگی ہوی تھیں ۔ حالانکہ اُن کا صحیح مقام ڈائننگ ٹیبل ہونا چاہیئے تھا ، جو قاضی صاحب کے پاس نہیں تھا ۔ مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ قاضی صاحب نے دیواروں پر ان رکابیوں کا پلاسٹر چڑھا کر ٹھیک ہی کیا تھا ، کیونکہ جہاں جہاں پلیٹ ٹنگی تھی ، وہاں وہاں تاریخ نے دیوان خانے کی دیواروں میں سوراخ ڈال دیئے تھے ۔ میں بڑی دیر تک ان رکابیوں کو دیکھتا رہا ۔ اور سوچتا رہا کہ اگر قدرت نے قاضی غیاث الدین کو کھانے پینے کی نعمتوں سے نوازا ہوتا تو پھر یہ رکابیاں دیوار پر اُلٹی نہ لٹکی رہتیں ۔ دیوان خانے کے چاروں کونوں میں چند بے ترتیب پتھر پڑے تھے ۔ ان پتھروں کے بارے میں قاضی صاحب کا کہنا تھا کہ یہ وہی پتھر ہیں جو کبھی بابل و نینوا کی عمارتوں میں جڑے ہوئے تھے ۔ ان پتھروں نے کئی تہذیبیں دیکھی ہیں ، کئی انقلابات دیکھے ہیں ، کئی جلیل القدر ہستیاں دیکھی ہیں "

" اور اب آپ کو دیکھ رہے ہیں " میں نے فوراً کہا ۔

دیوان خانے میں ایک الماری بھی رکھی ہوئی تھی جو لکڑی کی بنی ہوئی تھی ۔ اس الماری کے پٹ میں کبھی شیشے بھی لگے ہوں گے مگر اب یہ ٹوٹ چکے تھے ۔ مگر ان میں رکھی ہوی چیزوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب ان ٹوٹے ہوئے پٹوں کو مقفل کرتے تھے ۔ وہ مجھے الماری میں رکھی ہوئی چیزیں بتانے کے لئے لے گئے تو ایک چوہا اس میں سے نکل کر بھاگنے لگا ۔

قاضی صاحب بولے ، " آپ جس چوہے کو دیکھ رہے ہیں ، وہ کوئی معمولی چوہا نہیں ہے ۔ اِس چوہے کے ایرانی آباواجداد درۂ خیبر کے راستے سے ہندوستان آئے تھے ۔ ایسے نجیب الطرفین چوہے آپ کو عام طور پر دکھائی نہیں دیں گے "

مَیں الماری میں رکھی ہوی عجیب و غریب چیزوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ قاضی صاحب نے ایک پیالہ اپنے ہاتھ میں اُٹھا لیا اور بولے ، " لیجئے ، مَیں آپ کو ایک نادر چیز دکھاؤں ۔ ذرا اِس پیالے کو غور سے دیکھئے ۔ یہ وہی پیالہ ہے ، جس میں آج سے سینکڑوں برس پہلے سقراط کو زہر پیش کیا گیا تھا "

میرا تجسس بڑھ گیا ۔ میں نے فوراً پیالے کو ہاتھ میں لے لیا اور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا ۔ پھر اسے روشنی میں لے گیا ۔ پیالہ چونکہ پُرانا تھا ، اس لئے اس پر جا بجا میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں ۔ میں نے ایک جگہ مَیل کو صاف کیا تو مجھے ایک تحریر صاف دکھائی دینے لگی اور آپ یقین کریں کہ وہ تحریر یونانی زبان میں نہیں

انگریزی میں لکھی ہوئی تھی ۔ اور پیالہ پر نہایت چھوٹے حروف میں لکھا ہوا تھا :

"Made in England"

قاضی صاحب اس پیالے کے بارے میں ایک لمبا چوڑا لکچر دیتے رہے اور میں انگریزوں کی سفاکی کے بارے میں سوچتا رہا کہ سقراط کو زہر دینے کے پیچھے بھی انگریزوں کا ہاتھ تھا۔ !▲

ہمارے جری کسانوں کی واحد امّید

کسی شک و شبہ کے بغیر امداد باہمی اداروں کو ہمارے جری اور مایہ ناز کسانوں کی دعاؤں کا پھل کہا جاسکتا ہے۔ تحریک امداد باہمی کے فروغ کے معاملے میں آندھراپردیش کا ریکارڈ بہت شاندار ہے اور گزشتہ دو دہوں کے دوران میں اس بات کی متواتر کوششیں جاری رہیں کہ دھرتی کے لال وسیع اور مختلف ذرائع سے قرض کی سہولتیں حاصل کرنے کے قابل بن جائیں۔

ان پورے برسوں کے دوران میں قلیل مدتی اور اوسط مدتی قرضوں کی اجرائی میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۵۵-۵۶ء سے ۱۹۶۴-۶۵ء تک کے دہے میں بطور قرض اجرا ہونے والی ملتسم کی مقدار ۱۸۹ر۹۸ کروڑ روپے تھی جو ۱۹۶۵-۶۶ء اور ۱۹۷۴-۷۵ء کے درمیانی دہے میں بڑھ کر ۲۱۲ر۴۰ کروڑ روپے ہوگئی۔

پرائمری ایگریکلچرل ڈیولپمنٹ بینکوں کی جانب سے اب قرضوں کی اجرائی کے سلسلے میں فراخدلانہ پالیسی پر عمل کیا جارہا ہے جس کے نتیجے میں ان بینکوں کے توسط سے اجرا ہونے والے قرضوں کی مقدار میں پہلے دوسرے اور تیسرے پانچ سالہ منصوبوں کے دوران برابر اضافہ ہوتا رہا۔

چنانچہ ان منصوبوں کے دوران دیئے جانے والے قرضوں کی مقدار علی الترتیب ۲۵۶ر۰۲ کروڑ روپے ۴۷۷ر۸۵ کروڑ روپے اور ۳۷۴۶ر۱۸۱ کروڑ روپے رہی۔ پانچویں منصوبے کے دوسرے سال میں قرضوں کی رقم ۲۷۲۳ر۶۰ کروڑ روپے تھی جبکہ ۱۹۷۴-۷۵ء میں اجرا شدہ قرضوں کی رقم ۱۸۸۶ر۱۶ کروڑ روپے ہوگئی۔

ریاست کی زرعی معیشت میں مارکٹنگ سوسائٹیز اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جون ۱۹۵۶ء میں ہماری ریاست میں ۱۴۸ پرائمری مارکٹنگ سوسائٹیز تھیں جن کا سرمایۂ حصص ۲۶٫۷۱ لاکھ روپے تھا لیکن جون ۱۹۷۶ء میں ان سوسائٹیوں کی تعداد ۲۶۵ اور ان کے سرمایۂ حصص کی مقدار ۲۶۹ر۲۲ لاکھ روپے ہوگئی۔ ان اعداد سے گزشتہ ۲۰ برسوں کے دوران جاری پرزور سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامّہ حکومتِ آندھراپردیش حیدرآباد

DIPR: 24/76-77

مسیح انجم

فُل ھینڈ!

"فُل ھینڈ" نہ دہی رہانوی کے کسی جنسی ناول کا نام ہے، اور نہ واجدہ تبسم کے کسی غیر مطبوعہ تازہ ترین افسانے کا عنوان۔ دراصل "فُل ہینڈ" رمی کی ایک اصطلاح ہے۔ جب ایک ہم جیسا قسمت کا مارا شریف رمی باز کھیل کے دوران پورے سو ۱۰۰ پوائنٹس، بغیر ڈنڈی مارے ــــ ٹو ــــ فائیو ــــ فائیو، ٹن ــــ یا ــــ ٹن، ٹوینٹی کے حساب سے پیسے گن کر رمی بنانے والے کی خدمت میں بڑی حقارت سے دل ہی کوستے ہوئے پیش کرتا ہے تو اسے "فل ہینڈ" کہتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ "فُل ہینڈ" پہ تبصرہ عموماً بعد برخاست رمی۔ شروع ہوتا ہے۔

ایک رمی باز دوسرے رمی باز سے پوچھے گا۔ "ارے یار! آج تم نے کتنے فُل ہینڈ دیئے؟" دوسرا رمی باز اپنی رمیوں کی مناسبت سے جواب دے گا "کوئی سات فُل ہینڈ دیئے اور تین فل ہینڈ لیئے! لیکن تم؟"

ہارنے والا منھ لٹکائے جواب دے گا "ارے یار! میرا حال مت پوچھو۔ بس فل ہینڈ ہی دیتے رہا! حسرت رہ گئی فل ہینڈ لینے کی!" پھر وہ تیسرے سے دریافت کرے گا "بتا یار! تیرا کیا رہا؟"

وہ جواب دے گا "یں؟ میں جاں کو واں رہا! نہ دیا نہ لیا!"

ہم نے خواہ مخواہ "فل ہینڈ" کی وضاحت کر دی! کیونکہ آج کے روشن دور میں ایسا کون شخص ہے جو رمی سے واقف نہو؟ یہاں تک کہ عورتیں تک رمی کھیلتی ہیں۔ ویسے، عورتیں کونسا کھیل نہیں کھیلتیں؟ ــــ ہر کھیل کھیلتی ہیں۔ اور خوب کھیلتی ہیں۔ پتے اگر ساتھ دیں تو وہ بھی فُل ہینڈ لیتی ہیں۔ اور اگر پتے ہاتھ دیں تو انھیں بھی فل ہینڈ دینا پڑتا ہے۔ اس طرح جیت اور ہار کا سارا دارومدار پتوں کے ساتھ اور ہاتھ دینے پہ ہے۔

رمی کا کوئی وقت اور جگہ مقرر نہیں۔ کلبوں میں رمی۔ دفتروں میں رمی۔ کالجوں اور ہاسٹلوں میں رمی۔ پکنک اسپاٹ پہ رمی۔ فٹ پاتھ پر رمی۔ سفر کے دوران ریلوں میں رمی۔ بیوی میکے گئی ہو تو گھر پہ رمی اور اگر بیوی بھی رمی باز ہو تو "رم" کے ساتھ ہینڈ ٹو ہینڈ رمی!

پرسوں جب ہم سو روپے کے پیسوں سے ہینڈ ٹو ہینڈ رمی کھیل کر ایک فُل ہینڈ لینے کی حسرت میں گیارہ فُل ہینڈ دیکر

اور آخری فل ہینڈ ڈیو (Dummy) رکھ کر بغیر شیک ہینڈ کئے، منہ لٹکائے رات کے بارہ بجے گھر پہنچے تو ہماری نصف بہتر اور نصف بدتر نے ہمیں آڑے ہاتھوں لیا کہ: "یہ چہرے پر ٹھیکرے کیوں برس رہے ہیں!"
واضح رہے کہ یہ جملہ رواروی میں نہیں کہا گیا تھا۔ بلکہ مذہب کی پاسداری کے تحت شوہر نامدار کے رتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ادا کیا گیا تھا۔ اگر ہماری بیگم بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ماڈرن قسم کی ہوتیں تو وہ اس قسم کے جملہ سے وار کرتیں کہ: "تمہارے چہرے پر یہ باٹا شوز کمپنی کا اشتہار زیور طبع سے کیوں آراستہ ہے؟"
ہم اس کا جواب کیا دیتے ؟ رمی میں سو دو سو کے پیسے ہار کر جو آرہے تھے۔ اس لئے موضوع کو بدلنے کے لئے سیریل آرڈر میں سوئے ہوئے بچوں کی طرف اشارہ کرکے رمی ہی کی اصطلاح میں فرمایا: "اے میری پھول کی رانی! یہ جو ہماری پانچ پتوں والی اوریجنل سیک وینس سو رہی ہے، ہماری تو تو میں میں کی وجہ سے جاگ جائے گی۔ جس کے نتیجے میں مجھے "بڈل پیاک" ہوجانا پڑے گا!" یہ سنتے ہی وہ خاموش ہوگئیں۔ پتہ نہیں "پھول کی رانی" والے لفظ پر یا بڈل پیاک والے حربہ پر۔
سچ بات تو یہ ہے کہ ہم نے رمی کی اصطلاحوں کو جملوں میں استعمال کرنا اپنے ایک رمی کے ساتھی واحد کلام سے سیکھا ہے۔ وہ رمی کے ایک کہنہ مشق کھلاڑی ہیں۔ ان کے متعلق سے ان کے دشمنوں نے یہ افواہ پھیلا رکھی ہے کہ جب وہ پیدا ہوئے تھے تو ان کے ایک ہاتھ میں جوکر تھا۔ ایسے پیدائشی رمی باز کی ترتیب دی ہوئی یہ جدید لغت ملاحظہ فرمائیے:

پتوں کی شفلنگ کرنا = بیوی میک اپ کے سامان کے لئے پیسے مانگے، اور بچے کتابوں اور اسکول کی فیس کے لئے تنگ کریں تو دو چار چانٹے رسید کرکے انھیں چپ کروانا۔
آل سیک وینس ودھ آوٹ جوکر = وہ خوش قسمت گھرانا جہاں سسرالی رشتہ دار کا کوئی فرد نہ آتا ہو۔
اوریجنل سیک وینس = آپ کے اپنے بچے
رانگ شو = ایک لڑکی کو دکھا کر کسی دوسری لڑکی کو لڑکے کے گلے باندھ دینا۔ یعنی "چاند" کو دکھا کر "توا" حوالہ کرنا، ڈسکارڈ کرنا۔ بیوی کو طلاق دینا۔
پیپر جوکر = وہ شخص ثالث جو دو انجانوں کو، دو بول پڑھوا کر ملانے کے لئے کبھی وقت پر نہ آتا ہو۔ یعنی (قاضی صاحب)۔
کٹ جوکر = سسرال کا وہ فرد جس کے آتے ہی بیوی کو پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اور گھر کا سارا کام اپنے شوہر سے کرواتی ہے۔
ڈیو (Dead) رکھنا = شوہر کے کھاتے میں بقایہ کے طور پر مسلسل چلی آنے والی رقم جو دم آخر بیوی سے معاف کروالی جاتی ہے (یعنی مہر)
بڈل پیک ہونا = جی بھر جانے کے بعد کسی مرد کا عورت سے اچانک قطع تعلق کر لینا۔
پیک ہونا = بیوی بچوں سے تنگ آکر گھر سے ہمیشہ کے لئے شوہر کا فرار ہو جانا۔
ڈبل کیٹ = شادی، ملازمت اور ترقی کے مواقع پر درمیان میں حائل ہونے والا شخص۔

بات فل ہینڈ سے شروع ہوئی تھی۔ ہمارے رمی کے ساتھی واحد کلام "فل ہینڈ" کو "پورا ہاتھ" کہتے ہیں۔ اس لفظی ترجمہ سے آپ کو اتفاق نہ ہو تو جانے دیجئے۔ ہم اس کی تشریح یوں کریں گے

" فلُ ہینڈ" ایک ایسی ضرب ہے جس کی کوئی آواز نہیں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ فلُ ہینڈ دینے والے کے چہرے پر کچھ ایسے کرب کے آثار چھوڑ جاتی ہے جو عموماً بیوی کے اس جہاں سے گزر جانے پر شوہر کے چہرے پر نمودار ہوتے ہیں ۔ اس طرح یہ ثابت ہوا کہ رمیّ کے پلیر کے ہاں بیوی کی جدائی کا غم صرف ایک فل ہینڈ دینے کے برابر ہے ۔ ہم نے بازایسے بھی رمیّ کے پلیر دیکھے ہیں ۔ جنھوں نے بیوی کے گزر جانے کا اتنا اثر نہیں لیا جتنا کہ ایک فل ہینڈ دینے کا ۔ ابھی کوئی ایسی صابن کی ٹکیہ یا لوشن ایجاد نہیں ہوا جو اس فلُ ہینڈ کے تاثر کو دور کرسکے ۔ اس فلُ ہینڈ سے تو " دھوبی پچھاڑ " اچھی جس سے صرف جسم دُکھتا ہے ۔ لیکن چہرے پر لعنت نہیں برستی ایک فلُ ہینڈ دینے کے بعد ایک رمیّ باز کو نارمل حالت میں آنے کے لئے کتنا وقت درکار ہوتا ہے ۔ یہ بتانا بہت مشکل ہے ۔ ابھی ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا ۔ جو فل ہینڈ کے کرب اور مدت کی پیمائش کرسکے ۔ البتہ ہم اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں ۔ ایک فل ہینڈ دینے کے بعد ہمیں ہمیشہ پتوں کی گڈّی خطرے کی اس سرخ پلیٹ کی سی نظر آئی جس میں دو ہڈیوں کے درمیان ایک کھوپڑی ( ) اُتارکر " فور فار ٹی وولٹس ڈینجر" لکھ دیا جاتا ہے ۔

جیسا کہ ابتداء میں کہا گیا ہے کہ عموماً کھیل پر نہرہ بعد برخاست رمیّ شروع ہوتا ہے ۔ اور آپ جانتے ہیں ۔ کہ رمیّ ایسے وقت برخاست کی جاتی ہے جبکہ سارے کھلاڑی پٹ پٹاکر اور لٹ لٹاکر بالکل نڈھال ہو جاتے ہیں ۔ اور بعض فلُ ہینڈ دے دے کر اس حد تک پٹ جاتے ہیں کہ سیکل کے پہیّہ میں ہوا بھروانے کے لئے پانچ پیسے تک ان کے پاس نہیں رہتے ۔ ایسی بے چارگی کے موقع پر بھائی چارگی کا وہ زبردست مظاہرہ ہوتا ہے کہ سارے رمیّ باز بلا لحاظ مذہب و ملت ایک دوسرے کے جھوٹے سگریٹ مانگ مانگ کر ۔۔۔ اور اگر نہ دیں تو چھین چھین کر پینے پر اُتر آتے ہیں ۔ اس سے اچھا بھائی چارگی کا نمونہ اور کیا ہوسکتا ہے ۔ ایسے موقع پر ہم کو وہ لیڈر بہت یاد آتے ہیں جو صرف بھائی چارگی کی باتیں کرتے ہیں ۔ اگر ہمیں رمیّ سے فرصت ملے تو ان سارے لیڈروں کو رمیّ کھیلنے بٹھا ئیں تاکہ وہ بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کو پروان چڑھانے کے طریقے سیکھ سکیں ۔ سگریٹوں کی " چھینم چھانی " کے بعد ایک ایسی منزل بھی آجاتی ہے جبکہ پھینکے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کی قسمت جاگ پڑتی ہے ۔ ایسے موقع پر ہم نے دھن وان رمیّ باز کو بھی اپنے پھینکے ہوئے سگریٹ کے " ادّھے " تلاش کرتے دیکھا ۔

ہم نے جس وقت رمیّ کی کلاسیس اٹنڈ کی تھیں تو اس وقت سات پتوں والی " نیشنل رمیّ " کا چلن تھا جس میں صرف دو جوکر ہی ہوا کرتے تھے ۔ لیکن آج کل انٹرنیشنل رمیّ کا بہت چرچا ہے ، جس میں دو پیپر جوکر اور سات کٹ جوکر ہوا کرتے ہیں ۔ (تباہی مچانے کیلئے وہ دو جوکر ہی کیا کم تھے جو مزید سات جوکر شامل کئے گئے) یہ جوکر بھی بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں ۔ جب وہ کسی پلیر کی فیور (FAVOUR) کرتے ہیں تو دوسرے پلیروں کو پانی مانگنے کی تک مہلت نہیں دیتے ۔ اور جب وہ فیور (FAVOUR) نہیں کرتے تو پانچ پانچ جوکر ہاتھ پر رکھ کر فلُ ہینڈ دینا پڑتا ہے ۔ بقول واحد کلام کے خوب " گندی " ہوتی ہے ۔ انٹرنیشنل پالیٹکس میں بھی انٹرنیشنل سیاسی جوکر اسی قسم کا فیورازم (favourism) چلاکر خوب تباہی مچاتے ہیں ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رمیّ نے کسی کو بھی سرفراز نہیں کیا ۔ یہ کھیل وہی کھیلے جو " توڑ جوڑ " کے فن سے بخوبی واقف ہو ۔ یہ ہم جیسے شرفا کا کھیل نہیں ، جو پتوں کے توڑ جوڑ تو کیا جائز تعلقات کو بڑھانے کے سلسلے میں بھی توڑ جوڑ کے فن سے کام نہیں لیتے ۔ اس لئے خدا کرے کہ انٹرنیشنل رمیّ کے بعد مزید تباہی کیلئے یونیورسل رمیّ کا رواج نہ چل پڑے کیونکہ ہم آل ریک دینی بدصاوٹ جوکر کے قائل ہیں !

نسل انسانی پر ان کا احسان عظیم ہے

حبیب توفیق

ہمارے پاس جو نئی کام والی آئی تھی یہ اس کا تکیہ کلام تھا یہاں تکیہ کو نظر انداز کر کے صرف اُس کے کلام سے بحث کرنی ہے دس سال سے ایک شریف، عورت پکانے کے سوا دوسرے اوپری کام چین سے کر رہی تھی۔ پتہ نہیں ہمیں کیا سوجھی اور کیوں سوجھی ہم نے حماقت میں سو روپیہ کا نیا بجٹ نکال کر باورچی خانے کے کام کے لئے ایک شریف، معمر، لاولد، لاشوہر اور بدصورت عورت کو رکھنے کا اعلان کر دیا۔ اس پر کئی درخواستیں آئیں لیکن ان سب میں ایک نہ ایک خامی تھی۔ کوئی شریف تھی لیکن صاحبِ اولاد۔ کوئی لاولد تھی لیکن صاحبِ شوہر۔ ایک دو ایسی بھی آئیں جن کے اولاد تھی نہ شوہر۔ لیکن وہ یا تو کم عمر تھیں یا خوب صورت۔ مایوس ہو کر ہم نے کام والی کا دھیان چھوڑ دیا۔ ایک سال بعد ایک صاحبہ کا پتہ چلا جو ہماری شرائط پر سو فیصدی پوری اُترتی تھیں۔ سب سے بڑھ کر شرافت اور ایمان داری کی ایسی زبردست مہر تھی کہ گھر اور "گھر والے" دونوں کو بلا کھٹکے ان پر چھوڑا جا سکتا تھا۔

آنے سے پہلے ان کی چند شرائط سنائی گئیں۔ شریف خاندان کی شریف عورت ہیں، نام ادب سے لیا جائے۔ شہزادی بیگم نام ہے۔ گھر کے سب لوگ شہزادی آپا پکاریں۔ انھیں نوکر نہ سمجھا جائے۔ خاندان کا ایک فرد بلکہ اہم ترین فرد شمار کیا جائے سگی بہن بنا لیا جائے تو ٹھیک ہوگا۔ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہم نے سوچا جب سگی بہن بنانا ہی ہے تو اپنے بجائے صاحب کی بہن کیوں نہ بنایا جائے۔ لیکن شہزادی آپا نے کہلوا دیا کہ ہماری ہی بہن بنیں گی۔ نیز گھر کی مالکن اور بچوں کے سوا "باقی سب" سے محبت کا برتاؤ کریں گی۔ کپڑے لتے، جوتے چپل، دکھ بیماری

پان ہوا خوری غرض اس قسم کے تمام ضروری اور غیرضروری اخراجات بالکلیہ طور پر ہمارے ذمے ہوں گے انھیں دی جانے والی پاکٹ منی سے اِن کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

بہرحال وہ دن آگیا جس کا بے چینی سے انتظار تھا۔ شہزادی آپا ڈری سہمی آئیں۔ صبح گیارہ بجے اُنھوں نے ایک نماز پڑھی جو غالباً گھر میں قدم جمانے کی تھی۔ باقی پورا دن رو کر ہماری ہمدردیاں حاصل کرنے میں گزار دیا۔ وہ روتی رہیں، ہم انھیں سمجھا کر کھانا کھلاتے رہے۔ دو چار دن اِن کا برتاؤ ہمارے ساتھ بہت ہی خوشگوار اور اطمینان بخش رہا۔ ایک دن کہنے لگیں۔ "آپ پڑھانے جاتی ہیں۔ روزانہ ۵ بجے کچھ کھا کر جایا کیجئے۔ میں آپ کو پابندی سے کوئی اچھی ڈش بنا کر کھلایا کروں گی۔ پہلا جاپانی حلوہ جو انھوں نے ایک دن بنایا تھا۔ وہ ہمارے لئے بالکل نیا تھا۔ ہوا یوں کہ ہماری غیرموجودگی میں انھوں نے تمام ڈبے ٹٹولے، مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ جس ڈبے میں جو ملا۔ اکٹھا کر کے حلوہ تیار کیا۔ یہ حلوہ مونگ پھلی، تیل، گڑ، شکر اور آٹے کو ملا کر بنایا گیا تھا۔

رفتہ رفتہ شہزادی آپا نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ اپنی زبان سے انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہ آرام لینے آئی ہیں۔ کم سے کم کام کریں گی۔ مصالحے نہیں پیسیں گی۔ پانی نہیں بھریں گی، برتن نہیں دھوئیں گی۔ ہم نے اطمینان دلایا کہ اس کام کے لئے ایک اور نوکر موجود ہے۔

ایک دن اوپری کام والی بیمار ہو گئی۔ شہزادی آپا برتن دھونے کے نام سے کوسوں بھاگتی تھیں۔ ہم نے اُن سے کہا "میں چولہے کا کام سنبھالتی ہوں۔ آپ برتن دھولیں"۔ اس پر وہ بہت چراغ پا ہوئیں۔ کہنے لگیں۔ "بڑی مشکل ہے آپ لوگوں سے۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل، میں بیٹھ کر برتن دھوتی ہوں۔ تو کمر درد ہوتی ہے، کھڑی ہو کر دھوتی ہوں تو کپڑوں پر چھینٹے اُڑتے ہیں۔ آپ لوگ میری مجبوری کو نہیں سمجھتے۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ اللہ نے مجھے اتنا دیا ہوتا کہ کسی کو رکھ کر برتن دھلواتی"۔

آخری فقرہ ہمارے دل میں نقش ہو گیا۔ شہزادی آپا کا یہ شاہانہ مزاج خطرناک لگا۔ اس فقرہ پر جتنا سوچا اتنے ہی گہرے معنی نکلتے دکھائی دیئے۔ ہم نے انھیں رکھا، ان کا کسی اور کو رکھ کر برتن دھلوانا کیا معنی؟ مصلحت اسی میں تھی کہ خاموشی اختیار کی جائے اور شہزادی آپا کا بوریا بستر ایک دم گول کر دیا جائے۔ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہم نے عجلت کے خیال سے کھچڑی پکائی اور شہزادی آپا سے کہا۔ "چلیئے"۔ ہمارے اُس "چلیئے" کے صحیح معنی نہ سمجھتے ہوئے وہ بھنّا اٹھیں۔ تیوری پر بل ڈال کر کہنے لگیں۔ "آپ خود تیار ہو کر مجھے عین وقت پر چلنے کے لئے کہہ رہی ہیں۔ اب جانے سے منزلِ اعظم کا ٹکٹ نہیں ملے گا۔ ایسا ہی ہے تو شام کو چلیئے"۔ ہم نے کہا "منزلِ اعظم نہیں، جہاں سے آپ آئی تھیں وہاں لوٹ کر جانا ہے"۔ شہزادی آپا سمجھ گئیں۔ کہنے لگیں۔ "اف اوہ!... کیا گہری چال ہے آپ کی یہ بالکل انگریزوں کی پالیسی ہے"۔

خدا بہتر جانتا ہے ہمیں تاریخ یاد نہیں کہ انگریزوں نے مسور کی کھچڑی پکائی تھی یا تورکی۔ ان کی پالیسی اور گہری چال سے بھی ہم ناواقف ہیں۔ بہرحال ہم نے بڑی مشکل سے گویم مشکل کو نکال باہر کیا۔ بعد میں ضمنی طور پر کہیں بھی کام یا کام والی کا ذکر آتا تو ہم پر ہر طرف سے سوالات کی بوچھاریں ہوتی ——

۱. کام والی کی عمر کیا تھی ؟
۲. صورت شکل کیسی تھی ؟
۳. رنگ کالا تھا یا گورا ؟
۴. شادی شدہ تھی یا کنواری یا بیوہ ؟
۵. آپ نے اُسے رکھا کیوں تھا ؟

ان سوالات کے جوابات بڑے مشکل تھے ۔ پہلا سوال عمر کے تعلق سے بڑا خطرناک، نازک اور اہم سوال تھا ۔ شرافت کی مہر کی وجہ سے ہم نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا ۔ بعد میں غور کیا تو ماتھا ٹھنکا کہ ۴۵ سال پار کرنے والی نوکرانی بھی خطرناک ہو سکتی ہے ۔

سوال نمبر ۲ اور ۳ صورت شکل اور رنگ کے تعلق سے تھے ۔ صورت شکل بُری نہ تھی ۔ رنگ کھلتا ہوا تھا ۔ ہم نے اُن چیزوں کو اس لئے نظرانداز کر دیا تھا اُس کے سر پر بال نہ تھے ۔ سرپٹی انتہائی بدوضع نظر آتی تھی ۔ ہم اُس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ من پسند کام والی مل گئی چار دن میں ہمارا وزن چار پونڈ بڑھ گیا تھا ۔ اب ہمارا کافی وقت بچنے لگا ۔ خیالوں ہی خیالوں میں ہم نے کئی مضامین لکھ دیئے ۔ کئی کتابوں کے مصنّف ہو گئے ۔ کئی اکیڈیمیوں نے ہماری کتابوں پر انعام بھی دیا ۔ لیکن یہ، سب ہوائی قلعے تھے ۔ ایک ہفتہ ہی میں اُس نے بال لانبے کرنے والے تیل کی فرمائش شروع کردی اصرار کرنے لگی ۔ "بتایئے آپ کونسا تیل ڈالتی ہیں ؟ مجھے کم از کم ایک پونی ٹیل آجائے تو اچھا ہے ۔ اس حلیہ میں صاحب کے سامنے آتے مجھے اچھا نہیں لگتا " یہ سن کر ہمارا سَر چکرانے لگا ۔ گورے رنگ پر پونی ٹیل باندھی کام والی رات دن سوتے جاگتے ہمیں پریشان کرنے لگی تھی ۔

سوال نمبر چار ازدواجی زندگی کے تعلق سے تھا ۔ شادی شدہ، کنواری یا بیوہ ؟ بات یہ ہے کہ وہ "شادی شدہ کنواری بیوہ" تھی ۔ ایک ہی وقت میں، ایک ہی گھر میں وہ اپنے بارے میں مختلف باتیں بتایا کرتی تھی ۔ کسی سے کہتی کہ شوہر ہے لیکن پالتا نہیں کسی سے کہتی کہ شادی نہیں ہوئی اور کسی سے کہتی کہ شوہر مر گیا ہے ۔

آخری سوال "آپ نے اُسے رکھا کیوں تھا" اس سوال کا جواب ہم سے بن نہ پڑا ۔ ہم نے جھنجھلاتے ہوئے کہا " دیوانے کتے نے کاٹا تھا ۔ واقعی ہم نے اُسے کیوں رکھا ہوگا ۔ ایک نوکر پہلے سے موجود، انسان کو کھا جانے والی مہنگائی، مستقبل کے لئے لازمی بچت ان باتوں کو دیکھتے ہوئے دوسرے آدمی کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیئے تھی ۔ ہم اپنی غلطی پر سخت نادم ہیں ۔ اب ہم آدمی بن گئے ہیں ۔

یہ خوب جان لیا ہے کہ " ماما کم تکرار" رہنے ہی میں خیریت ہے ۔ شہزادی آپا کا، خوف ایسا چھا گیا ہے کہ گھر کے سامنے کبھی شہزادی آپا قسم کی کوئی چیز نظر آجائے تو ہم دوڑ کر گھر کا دروازہ بند کر لیتے ہیں ۔

بشیر بانو

رکشا نچلے سے بالشت بھر نیچے طبقہ کا پیشہ اور اوسط سے بالشت بھر اونچے طبقہ کی سواری ہے۔ اس کا نام غالباً اس طرح پڑا کہ ایک دفعہ ایک ہمالیاتی سنیاسی بنارس پہنچا اور ایک عجیب گاڑی پر سوار ہوا۔ گاڑی بان نے تیز تیز پنڈل گھما کر گاڑی کو ہوا پہ سوار کر دیا۔ بےچارہ سنیاسی پکارتا رہا چلاتا رہا "آہستہ آہستہ" مگر ہمالیائی زبان کون سمجھتا تھا۔ جب وہ گاڑی سے اترا تو غصّہ سے کہا "راکمشش" بس صاحب وہی اس گاڑی کا نام چل نکلا اور اس کے چلانے والے کا کردار بھی تاریخ انسانیت میں سنہرے حرفوں میں لکھ دیا گیا "رکشا وال" جیسے آپ کسی سنیاسی سے یہ اُمید نہیں کر سکتے کہ وہ شادی بچوں میں پھنسے گا یا فلسفی سے کسی معاملہ میں سیدھی بات کی اُمید نہیں رکھ سکتے یا سائنس داں سے کام کی بات کی اُمید نہیں رکھ سکتے اسی طرح کسی رکشا والے سے متوازن کردار اور کرایہ کے بارے میں مناسب بات کی اُمید نہیں رکھ سکتے چنانچہ ہر رکشا والا ایک عجیب نظریۂ عمل کرتا ہے یعنی کم فاصلہ زیادہ کرایہ زیادہ فاصلہ زیادہ کرایہ۔

رکشا والوں کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا پہلے گروہ میں خوش مزاج، بے غرض، باذوق، شریف الطبع، خوش لباس، فیشن ایبل، تندرست، طاقتور، عقل مند، نیک فطرت معصوم، گنگنانے والے، سیٹی بجانے والے قصّے سنانے والے ہوتے ہیں۔

دوسرے گروہ میں بدمزاج، ضدی، غصیلے، خود غرض، بدذوق، گندے، بیمار، حماقتی بے وقوف، چالاک، مکار، دھوکر باز، جھوٹے، گالیاں بکنے والے، الّو بنانے والے، ہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ رکشے والوں کی پسند بھی دنیا کے عام مردوں جیسی ہوتی ہے۔ وہی نہ گھر کا کھانا اچھا لگتا ہے نہ بیوی میرے خیال میں رکشا والوں جیسا خالص توکل پسند اور کوئی نہیں۔ کل کیلئے آج کچھ بھی نہیں رکھتے۔ کھانے کے بعد پی کر روز کی کمائی روز ختم کر دیتے ہیں کہ کل کا اللہ مالک ہے۔

رکشا والوں میں تعلیم کا اوسط کم ہے۔ لیکن وہ حالات حاضرہ کو سمجھتے ہوئے بازار کے بھاؤ کے اُتار چڑھاؤ کے علاوہ جیبوں کے اُتار چڑھاؤ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں کرائے بڑھا دیتے ہیں اور آخری تاریخوں میں گھٹا دیتے ہیں۔ لیکن اس کو

کیا کیا جائے کہ آخری تاریخوں میں کرایہ گھٹا دینے پر بھی آمدنی کم رہ جاتی ہے۔ کیونکہ ہمارے شہر میں لوگ عام طور سے ۲۰ تاریخ کے بعد سے پیدل چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ آخر رکشا والے سے رہا نہیں جاتا کہ دفتر میں کام کرنے والے بابو وقت سے پہلے گھر سے نکل کر دفتر کے لئے پیدل روانہ ہو جائیں۔ وہ ان کو آدھے بلکہ پاؤ کرایہ کا پیش کش کرتا ہے مگر بابو رکشا کیسے لے سکتا ہے۔ جب کہ اس کے منہ میں سگریٹ بھی اُدھار کا ہے۔

چنانچہ بابو اور رکشا ساتھ ساتھ چلتے ہیں" آئیے صاحب کچھ بھی کرایہ دیدیجئے"" ۴ آنے میں نامپلی چھوڑ دونگا صاحب" لیکن صاحب برابر کے رکشے کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں یہاں تک کہ اصرار اور انکار کرتے ہوئے اکھٹے نامپلی پہنچ جاتے ہیں۔

عوام میں ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ رکشا والوں کی نظر ہمیشہ لوگوں کی جیب پر ہوا کرتی ہے حالانکہ رکشا والے نہایت حسین نظر رکھتے ہیں اور فطرتاً حسن پرست بھی ہوتے ہیں لکڑی کے پُل سے نامپلی کا فاصلہ کوئی میں بھر کا ہوگا ایک دفعہ ہم لکڑی کے پُل پر کھڑے رکشے پر رکشا پکار رہے ہیں۔ کوئی ڈیڑھ روپے سے کم راضی ہی نہیں ہو رہا ہے۔ اتنے میں ایک "جانِ بہار" "گل گلزار" قسم کی حسینہ نمودار ہوئی۔ کئی رکشے والے برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھے۔ حسینہ نے انداز سے کہا۔

" رکشا والے نامپلی چلو گے ؟"

" آئیے صاحب آٹھ آنے دلا دیجئے" وہ سوار ہو گئیں اور وہ فاتحانہ نظروں سے دوسرے رکشا والوں کو دیکھتا ہوا یہ جا وہ جا۔

ایک برسی کی دعوت میں ایک حسین صاحبہ تقریباً دوڑتی ہوئی آئیں۔ اور مرحوم کی بیوی سے لپٹ کر بے تحاشہ رونے لگیں۔ موصوفہ نے کہا ارے یہ ایک سال کے بعد مرحوم کے لئے اس قدر غم کیوں۔ وہ صاف بولیں۔ " ہائے مجھے تو اپنی پریشانی پہ رونا آرہا ہے "

" کاہے کی پریشانی بہن ؟ کیا قصہ ہے ؟"

ہائے اللہ کیا بتاؤں گھر سے نکل کر رکشا لیا اور اس سے کہا " ذرا جلدی پہنچانا " بس میرا یہ کہنا غضب ہو گیا اس قدر تیز چلانا شروع کیا ہے کہ خدا کی پناہ! آگے پیچھے آزو بازو دیکھا ہی نہیں یوں سمجھو دو سو میل کی رفتار سے اُڑا جا رہا تھا۔ میری تو گھگی بندھ گئی تھی چلا چلا کر کہہ رہی ہوں خوشامد کر رہی ہوں کہ پورا کرایہ لے لے بلکہ ڈبل لے کر کہیں راستے میں اُتار دے مگر کمبخت میری پریشانی سے خوش ہو ہو کر اور تیز چلانے لگتا تھا مجھے تو یقین ہو گیا تھا کہ آئندہ سال ٹھیک آج کے دن میری بھی برسی ہو گی۔

راتب کے رکشے والے تو خاندان کے رازداں اور بعض وقت محسن بھی ہوتے ہیں۔ ایک صاحبہ رکشہ والے کے بچوں کیلئے عید کی خریدی کر رہی تھیں۔ میں نے اس عنایت کی وجہ پوچھی تو وہ برس پڑیں " ارے یہی بے چارا تو ہے جو ہر حال میں میرا ساتھ دیتا ہے۔ میرے سارے راز چھپاتا ہے ورنہ ہمارے صاحب کا غصہ تو تم کو معلوم ہی ہے اب تک کئی طلاق مل گئے ہوتے۔

رکشا والے اس قول پر بالکل ایمان نہیں رکھتے کہ " لڑھکتے پتھر پر کائی نہیں جم پاتی"۔ بلکہ وہ خود کو نہایت جہاندیدہ اور سیانا سمجھتے ہیں۔ آپ تڑپتے پھڑکتے رکشے میں بیٹھے رہتے ہیں اور وہ ہرگز اُس دکان پر رکشا نہیں روکے گا جہاں سے آپ کو خریدنا ہے بلکہ اپنی پسند کی کسی دکان پر روکے گا اور وہ یہاں بھی اُس

دھاندلی چلتی ہے۔ جو چیز آپ کو ایک سیر لینا ہے وہ پاؤ سیر دلائے گا اور جس چیز کی ضرورت آپ کو صرف پاؤ سیر کی ہے وہ آپ کی ایک نہ سنے گا اور دکان دار سے کہہ کر سیر بھر تلوا دے گا۔ اِدھر آپ بھاؤ پوچھتے ہی رہ جائینگے۔ اُدھر وہ آپ کے ہاتھ میں رسید تھما دے گا۔

بعض رکشے والے اس قدر گفتگو کے ماہر اور چالاک ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے مسائل کو راستہ ناپتے ناپتے حل کر دیتے ہیں چنانچہ ایک سیٹھ جی اپنی بیوی کو گالیاں دیتے ہوئے رکشہ پر سوار ہوئے۔

" ابھی وکیل کے یہاں جاکر طلاق نامہ لکھوانا ہوں۔ ذلیل کہیں کی"

رکشہ روانہ ہوا تو آہستہ سے رکشہ والے نے کہا " سیٹھ جی! عورت ذات کو چار جوتے مار دینا لیکن گھر کی بات باہر نہ نکلنے دینا"۔

سیٹھ جی بگڑ کر بولے " ارے تم کون ہو جی۔ تم اپنا رکشہ چلاؤ۔

" حضور ہم غریب آدمی ہیں۔ مگر میرے گھر میں بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ تو ہر گھر کا معاملہ ہے مگر میں تو بات بڑھنے نہیں دیتا۔ یہ عورت ذات ہوتی ہی کمینی ہے۔ ہمارا کھا کر ہم پر ہی غراتی ہے۔ آپ تو بہت نیک آدمی ٹھہرے" سیٹھ جی بولے " ارے میاں! کیا بتاؤں .... اور وہ سارا قصہ سنا دیتے ہیں۔ اِسطرح ان کی بھڑاس جب نکل گئی تو رکشہ والے نے رائے دی۔

"حضور! یہ وکیل لوگ روپیہ الگ لینگے پھر سارے شہر کو آپ کا قصہ معلوم ہو جائے گا۔ مجھ غریب کی بات مانیئے تو کہوں کہ سیٹھانی کو رہنے دیجئے آپ مرد آدمی اور شادی کر لیجئے۔ آپ کو کون دل نہیں دیتا سونے میں پیلی ہوکر رہے گی"۔

سیٹھ جی نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا " اچھا دکان چلو اس معاملے کو پھر دیکھیں گے"۔ ☆

سلطان نیازی

زلف بر گوش

روزِ ازل سے مرد عورت کے بوجھ کو برداشت کرتا چلا آرہا ہے اور شاید روزِ ابد تک کرتا رہے گا۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو چیز بار یا بوجھ معلوم ہو اُسے اتار پھینکنا عورت کی فطرت ہے اور اس بوجھ کو خود پر لادلینا مرد کی فطرت، پتہ نہیں یہ پُرانے زمانے کی عورت کی جہالت یا شرافت کہ بے چاری اپنے ہر بوجھ کو جیسے تیسے برداشت کر جاتی تھی۔ مگر نئے زمانے کی عورت ہر اُس چیز کو بڑی آسانی سے اتار پھینکتی ہے جو اُسے بوجھ معلوم ہو۔ پردہ اور دوپٹہ دقیانوسی ٹھہرے شرم و حیا کی بات دور رہی اب جدید اور ماڈرن عورت تو شوہر کو بھی ایک بوجھ سمجھتی ہے اور اس بوجھ کو اتنی آسانی سے اُتار پھینکتی ہے گویا شوہر نہ ہوا چپل سینڈل ہوا۔

ذکر چونکہ چھڑ گیا ہے چپل اور سینڈل کا تو بات کو لازمی طور پر پیر دسر تک پہنچنا چاہیئے۔ تو آیئے پہلے پیر سے کمر تک ایک نظر ڈالیں بے چاری صنفِ نازک کی نازک کمر (ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے) ساڑی، غرارے اور اسی قسم کے دوسرے بوجھ نہ جانے کب سے برداشت کر رہی تھی۔ نئی روشنی نے جہالت کے پردے کو پاش پاش کیا تو دُکھیاری صنفِ نازک کو اپنے بوجھ کا احساس ہوا۔ فطرت سے مجبور، اُس نے کمر پر لدے ہوئے زائد بوجھ کو کاٹ پھینکا۔ اب مرد اور عورت دونوں میں غرارے ہیں بڑے خوش ہیں ع

" خوش ہوا، ہیں اُسی میں تو جس میں خوش رہے"

اب ذرا آیئے کمر سے سر کی طرف سفر کریں۔ کمر تک پھیلے ہوئے اُلجھے ہوئے بالوں کا یہ گھنا جنگل، کسی پہاڑی ندی کی طرح اٹھلاتی لہراتی، جھومتی گاتی سر کی یہ سرکش زلف اس مشینی دور میں ایک مصیبت سے کم نہیں۔ اس مصروف زندگی میں عورت کے پاس اتنا وقت اور اتنی فرصت کہاں کہ اسے سنوارے سجائے۔ یوں سے حیران و پریشان عورت کے ہاتھوں جب ترقی کی تیز قینچی لگی تو اس کی فطرت پھر سے جاگ اُٹھی اس نے ترقی کے نام پر سر کے زائد بوجھ کو اُتار پھینکا اِدھر مرد کب پیچھے رہنے والا تھا اُس نے بھی ترقی کا نعرہ بلند کیا، اس زائد بوجھ کو اپنا لیا اور اپنے سر کی زینت بنا لیا۔

اب حالت یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے بال ایک جیسے ہو گئے ہیں۔ دونوں کے بال کانوں تک آگئے ہیں بلکہ کانوں پر چھا گئے ہیں۔ اور کان اسی طرح غائب ہو گئے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ

دونوں میں حیرت انگیز حد تک یکسانیت پیدا ہو گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ (پیچھے سے) مرد اور عورت دونوں میں زبردست مساوات قائم ہو گئی ہے اور یہی مساوات موجودہ فیشن کا سب سے روشن اور تابناک پہلو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس فیشن کے بڑے قائل ہیں اور اسے مساوات و برابری کا زبردست علم بردار قرار دیتے ہیں۔ اس نے عورت اور مرد کے امتیازات اس حد تک ختم کر دیئے ہیں کہ اب صرف دیکھ کر یہ بتلانا دشوار ہے کہ کون کیا ہے؟ اب تو صرف چھو کر ہی بتلایا جا سکتا ہے کہ کون گل خان ہے اور کون گل بدن۔

زلف برگوشش یا کانوں پر چھائے ہوئے بالوں کا یہ اسٹائل بڑے فوائد کا حامل ہے۔ موسم سرما میں ٹھنڈی ہواؤں سے کانوں کو بچانے کے لئے اب دو ڈھائی گز لمبے مفلر کی ضرورت نہیں۔ یہ بال قدرتی مفلر کا کام دیتا ہے۔ نہ اس کے گم ہو جانے کا ڈر ہے اور نہ پھٹ جانے یا میلے ہونے کا خدشہ سائے کی طرح ہمیشہ اور ہر جگہ موجود اور پھر یہ کہ روپیہ لگے نہ پیسہ مفت ہاتھ آجاتا ہے۔

یہ بہت سارے دکھوں کا آسان علاج بھی ہے۔ مرزا صاحب سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ مرزا صاحب ہمارے پڑوسی نہایت بڑے فرماں بردار اور بے ضرر قسم کے شوہر ہیں۔ بے چارے گھر میں داخل ہوتے کہ بیوی ٹیپ ریکارڈ کی طرح شروع ہو جاتی ہے۔ بیوی کے ساتھ بچوں کی فرمائش اور ان کا شور بھی برابر جاری رہتا ہے۔ ان ہنگاموں نے مرزا کو دائمی مریض بنا دیا تھا۔ چہرہ لٹکا ہوا، آنکھیں اداس، ہمیشہ کھوئے کھوئے سے نظر آتے۔ لیکن جب سے اُن کا حلیہ بدل گیا ہے۔ ان کے سارے دُکھ دلدر جیسے دُور ہو گئے ہیں۔ اب ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ آنکھوں میں ایک چمک اور ہونٹوں پر فاتحانہ تبسّم رقص کرتا ہے حالانکہ گھر کے اندرونی حالات بدستور ہنگامہ خیز ہیں۔ جب ہم مرزا کو دیکھتے اور ان کے گھریلو حالات کا منظر سامنے ہوتا تو ہمیں بڑا تعجب ہوتا سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی بڑی تبدیلی مرزا کے اندر کہاں سے آگئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" والی بات ہو گئی ہے۔ آخر ایک دن ہم ان سے اُس کا سبب پوچھ ہی بیٹھے۔ مرزا نے ہمیں پہلے تو ایسی نظروں سے دیکھا گویا ہماری صحیح الدماغی پر انہیں کچھ شبہ ہو۔ پھر مسکراتے ہوئے اپنے لمبے لمبے گھنے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہے میرے سب دکھوں کا علاج جب سے زلف برگوشش ہوا ہوں خدا جھوٹ نہ بلوائے بڑا سکون اور اطمینان نصیب ہوا"۔ "وہ کیسے"؟ ہم نے پوچھا، جواب ملا" بیگم کی بڑبڑاہٹ اور بچوں کا ہنگامہ ان بالوں سے جب چھن چھن کر کانوں تک پہنچتا ہے تو ایک پیار بھرے گیت (مع سنگیت) میں ڈھل جاتا ہے۔ اور میں مزہ لے لے کر سنتا رہتا ہوں"۔

مرزا صاحب کے اس انکشاف نے ہم پر ایک بہت بڑی حقیقت کو آشکار کر دیا۔ "زلف برگوشی" کے ایک وبا کی طرح پھیلنے کی سائنٹفک وجہ ہماری سمجھ میں آگئی۔ آج دنیا میں شور و غل اور ہنگاموں کا راج ہے۔ آپ خطِ استوا سے قطب شمالی کی طرف کوچ کریں یا قطب جنوبی کی طرف ہر جگہ ہنگامے آپ کے استقبال کے لئے موجود ہونگے۔ ان سے چھٹکارا پانا کم از کم مرنے سے پہلے تو ناممکن ہے۔ (اور مرنے کے بعد آپ کے نامۂ اعمال پر منحصر ہے) کسی منچلے نے اس سے بچنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی ہونگی اور اتفاقیہ یہ تیر بہدف نسخہ اس کے ہاتھوں لگ گیا ہوگا اور آج شور و ہنگامے سے بیزار دنیا شعوری و لاشعوری طور پر زلف برگوشش ہوتی جا رہی ہے۔

ہمارے زلف برگوشش نوجوان ان بالوں کو کئی اور طریقوں سے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بالوں کے

سے اس گچھے سے پرس اور سگریٹ کیس کا کام لیا جاتا ہے۔ کالج کے بعض ہونہار نوجوان ان بالوں میں چھوٹے چھوٹے ٹرانسسٹر اس طرح چھپا لیتے ہیں جیسے گھونسلے میں انڈے اور مزے سے کلاس روم میں لیکچر کے ساتھ ساتھ اپنا من پسند پروگرام بھی سنتے رہتے ہیں۔ (ایک پنتھ دو کاج شاید اسی کو کہا جاتا ہے۔)

زلف برگوشش تحریک شاعری میں زبردست تبدیلیوں کی ذمہ دار ہے۔ گھٹا سی لہراتی بل کھاتی زلفوں پر ہمارے شاعروں نے کیا کیا مضامین نہیں باندھے۔ محبوب کی زلفوں پر دیوان کے دیوان لکھ مارے .... مگر جب سے محبوب کی زلف اور عاشق کے آوارہ و پریشان بال آپس میں گڈمڈ ہو کر زلف برگوشش کی شکل میں برآمد ہوئے ہیں۔ تب سے ہمارے شاعروں کے ہاتھوں سے ایک اہم موضوع چھن گیا۔ بغیر زلف کے محبوب کا سراپا ادھورا رہ گیا۔ اس کا حسن ماند پڑ گیا۔ حسن و عشق کی بنیاد ڈھ گئی۔ وہ دیوار گر گئی جو عاشق کو محبوب سے جدا کرتی تھی۔ وہ پردہ اٹھ گیا جو دونوں کے درمیان حائل تھا۔ اب عشق و معشوق میں تمیز کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ یہ حالات دیکھ کر شاعروں کا ایک گروپ شدید مایوسی اور غم و غصے کا شکار ہو گیا ان سب باتوں کا ردعمل یہ ہوا کہ نہ صرف زلف بلکہ اس سے متعلق لب و رخسار، خال و ابرو، عارض و تل غرض ہر دلکش، نازک حسین اور خوب صورت چیز سے بغاوت کر دی، بھونڈی، بھدی اور گندی چیزوں کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا اور کچھ ایسی زبان میں شاعری شروع کر دی ہے جسے یا تو جانور سمجھ سکتے ہیں یا جنات (دوسرے انسانوں کی بات تو الگ رہی وہ خود اپنی شاعری کو صحیح معنوں میں نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ سمجھا سکتے ہیں) قصہ مختصر شاعری کے نام پر کچھ اس قسم کی شاعری شروع کر دی ہے جس کے متعلق غالب نے برسوں پہلے کہا تھا:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

زندہ دلانِ حیدرآباد
کا
۱۵ واں
کُل ہند مزاحیہ مشاعرہ

مرتب : اَن پڑھ بھونگیری

زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام "کُل ہند مزاحیہ مشاعرہ" کا ہر سال انعقاد موسمِ گرما میں ہی ہُوا کرتا ہے ۔ اس میں نہ صرف مقامی بلکہ دوسرے شہروں ، دیہاتوں سے بھی لوگ جوق در جوق شرکت کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتے ہیں ۔ مشاعرہ کی خصوصیات میں دکنی اور قلی قطب کی زبان کو بطورِ خاص اہمیت دی جاتی رہی ہے ۔ سامعین کرام اس مشاعرے میں شرکت محض اس لئے کرتے ہیں کہ ان کو ہنسنے ہنسانے کا ایک بہترین موقع میسر آتا ہے جو ان کی زندگی میں بہاریں کر رچ بس جاتا ہے ۔ اس مقولے کے مصداق کہ "ایک قہقہہ بھی زندگی کے ہزار دن سے بڑھ کر ہے ۔"

لوگ مشاعرہ گاہ میں ہنستے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور اختتام پر بھی قہقہہ بردوش روانہ ہوتے ہیں ، یہی مشاعرہ کی کامیابی کا راز ہے ۔

۲۳ر اپریل ۷۷ء کی شب ۸ بجے ہی سے عوام کا ٹھاٹیں مارتا ہُوا اژدہام نمائش میدان کے وسیع عریض پنڈال میں جمع ہونے لگا ۔ ٹھیک ½ ۹ بجے مشاعرے کے کنوینر بوگس حیدرآبادی نے جیسے ہی مائک سنبھالا ، عوام میں ایک کھلبلی محسوس ہونے لگی ۔ لوگ اپنی اپنی نشستوں پر براجمان ہوگئے ۔ چند ہی لمحوں بعد مشاعرے کی کارروائی شروع کی جائے گی کے الفاظ کے ساتھ ہی سامعین گوش برآواز ہوگئے ۔ مشاعرے کا آغاز حیدرآباد کے کہنہ مشق میزبان شاعر سرتپٹ حیدرآبادی کے مزاح سے بھرپور نوجوانوں کے دِلوں کو لُوٹ لینے والے قطعہ سے ہوا ۔ اپنے نام کے اعلان کے ساتھ ہی بے چارے ڈاکٹر اسد انصاری سرتپٹ ، سرتپٹ دوڑتے ہوئے آئے ، ان کے کلام سے ایسا محسوس ہوتا تھا یہ بھی عشق کے مارے ہیں ۔ بڑھاپا تو اجازت نہیں دیتا مگر دِل کے ابھی بوڑھے نہیں ہیں ۔

بے تحاشا عشق کر سکتا ہوں میں
جس حسیں پر چاہوں مر سکتا ہوں میں
چال سرپٹ چلتا ہے گھوڑا مرا
کیا کسی مشکل سے ڈر سکتا ہوں میں

○

میں خود استاد ہوں میرا کوئی استاد نہیں
ایسی تعمیر ہوں، جس کی کوئی بنیاد نہیں
فسٹ اِن فسٹ ہمیشہ ہی رہا عشق مرا
عہدِ حاضر کا سڑک چھاپ میں فرہاد نہیں

○

ہمیں پرواہ زیر و بم نہیں ہے
ہماری لے کسی سے کم نہیں ہے
کریں ہم جب بھی چاہے حماقت
حماقت کا کوئی موسم نہیں ہے

○

ہم ایسے عالی ظرف جہاں میں کہاں رہے
دن رات کھا کے جوتیاں جو شادماں رہے
پھرتے رہے حسینوں کے رکشوں کے ساتھ ساتھ
ستر برس کی عمر میں بھی ہم جواں رہے

○

میں تو اپنے کو سمجھتا تھا کہ بڈھا ہوں میں
مگر اتنی نے بتایا مجھے بچہ ہوں میں
کل وہ دن تھا کہ پھدکنا بھی بہت مشکل تھا
آج تو ان کے اشاروں پہ اچکتا ہوں میں

○

کرو نہ کچھ تو کم از کم معاشقہ تو کرو
اگر جواں ہو جوانی کا حق ادا تو کرو
یہ کونے کھدرے میں چھپ چھپ کے عاشقی کب تک
جتا کے عشق کبھی راہ میں پٹا تو کرو
ثبوت چاہیے دنیا کو بادہ نوشی کا
کبھی کبھی ہی سہی نالی میں گرا تو کرو
کرو نہ بھول کے بھی قصدِ ترکِ مے نوشی
گراں ہے مے تو گڑمبہ سہی پیا تو کرو
جہاں جہاں بھی گیا ہوں سویرے ملتے ہیں
[illegible] تو کرو

شاعروں میں ہو گر اتفاق شرکت کا
چرا کے اوروں کی غزلیں سنا دیا تو کرو
بڑھاپے کا نہ کرو عذرِ لنگ اے سرپٹ
دکھاؤ جوشِ جوانی، لڑا بھڑا تو کرو!

دیکھا آپ نے، اِس عمر میں ان کا کلام سننے سے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ان میں عشق کے جراثیم اب بھی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ عوام نے دل کھول کر داد دی۔ میں نے سوچا، مشاعرے کا آغاز تو بہت اچھا ہے، انجام خدا جانے!

دوسری آواز کے ساتھ ہی بوگس حیدرآبادی نے سرپٹ کو دوڑا کر پاگل کو عوام پر مسلط کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ پاگل عادل آبادی کے کلام سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ پاگل کم اور سیانے زیادہ ہیں بہت لہک کر پڑھے اور دادِ تحسین حاصل کی۔ انھوں نے بھی اپنے کلام کا آغاز ان مزاحیہ قطعات سے کیا:

جان کر لیڈر فری سروس کرا لیتے ہیں لوگ
پمپ کے دو چار پیسے بھی بچا لیتے ہیں لوگ
جب بھی ہجرِ یار میں بھرتا ہوں آہیں زور کی
سیکلیں لا کر ہوا جھٹ پٹ بھرا لیتے ہیں لوگ

○

اور بھی دنیا میں بے شک کھیکڑے ہونگے ضرور
انڈیا کے کھیکڑوں کی پر یہ خوبی ہے حضور
کھیکڑا کوئی اگر محنت سے اوپر آئے گا
کھیکڑے سب مل کے اسکی ٹانگ کھینچیں گے ضرور

○

اگلے منصوبے میں یہ اسکیم شامل کیجئے
عاشقوں کے آنسوؤں کا ڈیم بنوا دیجئے
خشک سالی، قحط، سوکھا جن دنوں ہو دیش میں
ان دنوں اس ڈیم سے کھیتوں کو پانی دیجئے

○

پیرو کاری، چاپلوسی [illegible] ہے
[illegible] سے

اِک سے بڑھ کر ایک چالُو ہے جہاں میں آجکل
باپ انڈے چور ہے تو بیٹا مرغی چور ہے

غزل سُناتے وقت عوام پر سنّاٹے کی کیفیت طاری تھی، حالانکہ مزاحیہ مشاعرے میں ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئل کی کُوکُو، یا مَینا کی چہک کسی باغ میں جو کیفیت پیدا کرتی ہے، اس سے کہیں بڑھ کر پاگل نے دِل موہ لینے والی مترنم آواز سے عوام کے دِلوں پر اِس غزل سے جادو سا کر دیا ؏

○

لگانے پھر مجھے چِکلے مِری تلاش میں ہیں
میں ایک دیگ ہوں چمچے مِری تلاش میں ہیں
مِلا ہے نسخہ جوانی پلٹ کا جب سے مجھے
تمام شہر کے بُڈھے مِری تلاش میں ہیں
کھجائی ناک جو اِک بار بھُول کر مَیں نے
تمام سَر پھرے نکٹے مِری تلاش میں ہیں
وصول کرنے بقایا اُدھار کھاتوں کا
تمام شہر کے بنیے مِری تلاش میں ہیں
مَیں جن کے واسطے جُوتے چُرا کے جیل گیا
وہ لے کے ہاتھ میں جُوتے مِری تلاش میں ہیں
دیا ہے نام کفن چور تم نے جب سے مجھے
پُرانی قبر کے مُردے مِری تلاش میں ہیں
رکھا ہوں جب سے قدم دوستو سیاست میں
حرام خوری کے دھندے مِری تلاش میں ہیں
سُنائی مَیں نے ترنّم سے جب غزل پاگل
پُرانے شہر کے دھیڑے مِری تلاش میں ہیں

پاگل عادل آبادی داد حاصل کر کے رخصت ہوئے ہیں۔ اناؤنسر بوگس حیدرآبادی نے اِس مشاعرے کے ایک مہمان بزرگ شاعر حضرت عبدالحبیب عیاں کا تعارف کراتے ہوئے، عیاں راچہ بیاں کے مصداق شاعر کو اسٹیج پر لے آیا ؏

یا خدا ایک ہی پوری مِری خواہش ہو جائے
رندِ دیرینہ کی منظور گزارش ہو جائے
رُت میں برکھا کی برستا ہے ہمیشہ پانی
اب کے موسم میں مئے ناب کی بارش ہو جائے

مُفت ہاتھ آئے تو پی لیتا ہُوں
یا کوئی حسین چاہے تو پی لیتا ہُوں
مَے خانہ کو جاتے ہوئے ہوتی ہے جھجک
گھر تک کوئی لے آئے تو پی لیتا ہُوں

زُلفوں کی گھٹا چھائے تو پی لیتا ہُوں
آنکھوں سے وہ برسائے تو پی لیتا ہُوں
حاجت ہی نہیں باغِ بہاری کی مجھے
آنچل کی ہَوا آئے تو پی لیتا ہُوں

میکدے شہر کے معمُور نظر آتے ہیں
زاہدِ خشک بھی مخمور نظر آتے ہیں
حیدرآباد کے اطراف دُعاؤں سے مِری
جس طرف دیکھئے انگُور نظر آتے ہیں

حیدرآباد کے نوجوان شاعر عبدالسمیع جلیل نا پر ہیں۔ پہلے یہ قطعہ مشاعرہ گاہ کی نذر کرتے ہوئے اپنے کلام کا آغاز کیا ؏

برپا ہے آج شہرِ قتل میں مشاعرہ
زندہ دِلوں نے کھینچ دیا ایک دائرہ
پروانے بے شمار ہیں طنز و مزاح کے
ان میں کوئی دلیپ ہے، تو کوئی سائرہ

ان کی غزل بھی سُنیئے :

○

جو عاشقِ جمال تھے افیون کھا گئے
شرمندگی اُٹھانے کو معجون کھا گئے

کھڑکی پڑوسں کی جو کھلی بھوک بھی کھلی
ہم اُٹھ کے آدھی رات کو شب خون کھا گئے
کھانے کو جب نہیں تھا مدیروں کے پاس کچھ
ظالم کبھی غزل، کبھی مضمون کھا گئے
کہتے ہیں جنگ چھڑ گئی دُنیا میں پہلی بار
جرمن اِک اپنے نام سے جب لُون کھا گئے
فلموں میں گیت لکھنے کی حسرت لئے ہوئے
بھنڈی بازار جا کے فلاطون کھا گئے
کہتے ہیں ایک شخص اسی شہر میں حلیل
تھا یوسفِ غزل، جسے شمعون کھا گئے

میزبان دکنی زبان کے نوجوان شاعر حنیف خاں سپاٹ جو دیہاتی زبان میں چوٹی دار ناپ کی طرح نہیں، مگر سپاٹ ضرور تھے، ڈائس پر آئے، طنز و مزاح سے بھرپور اپنی تازہ نظم "فیشن کی گڑیاں" اپنے مخصوص لہجے میں سُناتے ہوئے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔
فیشن ایبل خواتین سے معذرت کے ساتھ کلام سُنایا:

فیشن کی گُڑیاں آئیں کناں، دیکھ لیکو جاؤ کناں
بوشرٹ بھی پائنٹ پہنتیں ہوگئیں اُلال سے
لڑکی میں ہے شمار نہ لڑکا ہے چال سے
تقسیم دو پو ہو گئے چوٹی کے بال سے
انگریزوں کو بھگائیں کناں دیکھ لیکو جاؤ کناں
فیشن کی گُڑیاں آئیں کناں، دیکھ لیکو جاؤ کناں
ململ کی میکسی پو بُرقع ہے اِتنا سادہ
نیچے سے بھی اُپر سے دِکھ رئیں وہ ادھا ادھا
کر ڈالے اپنے ہاتھوں سے پردے کا بُرادہ
غارت ہو ایسا فیشن غارت ہو یہ لباساں
تہذیب کو آگ لگائیں کتے، دیکھ لیکو جاؤ کناں
فیشن کی گُڑیاں آئیں کناں، دیکھ لیکو جاؤ کناں
کر رئیں سلام باوا کو تو ہائے ہائے کتے
پڑھنے کو جارئیں گھر سے تو بس بائے بائے کتے
بچپن سے انکے آنگ پو انگریزاں آئے کتے
انگریزی کے بلیتوں کا پانی پلائے کتے
عادتاں انھیں سِکھلائیں کنا، دیکھ لیکو جاؤ کناں
فیشن کی گُڑیاں آئیں کنا ۔۔۔۔۔۔۔
کالج کا نام لیکو وہ ٹاکیز کو جا رئیں
اماں کو اور باوا کو اچھا بچ گھما رئیں
سڑکوں پو چلتے چلتے وہ کٹیا بھی چلا رئیں
مردانہ چال ہی سہی بجلی تو گرا رئیں
ماں باپ کا نام ڈبائیں کناں، دیکھ لیکو جاؤ کناں
فیشن کی گُڑیاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
لڑکی سمجھ کو جو بھی انھیں بہو بنائیں گے
سمجھو کہ اپنے قبراں وہ خود ہی کھدائیں گے
سُسرے بھی ساتھ آئیچ تو یوں بھاگ جائیں گے
شوہر کو بارہ گھاٹ کا پانی پلائیں گے
ٹِنگنی کا ناچ نچائیں کناں دیکھ لیکو جاؤ کناں
فیشن کی گُڑیاں آئیں کنا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
یہ لڑکیاں ہے جتنے، ہیں زہر کے پیالے
کِتّوں کے دِل کو توڑے کِتّوں کو مار ڈالے
ہے خنجروں سے زیادہ اِن کی نظر کے بھالے
یہ آوندھی صورتوں کو اللہ میاں اُٹھالے
ڈھانچہ ہمیں بنائیں کناں، دیکھ لیکو جاؤ کناں
فیشن کی گُڑیاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
پڑھ لکھ کو بھی یہ بھینڈرے چالے کرو نکو
میک اَپ سے اپنے صورتاں کالے کرو نکو
کپڑوں سے خود کو ننگے ڈھالے کرو نکو
تہذیب کو مغرب کے حوالے کرو نکو
گھر کو بھی ٹانگ اڑائیں کنا دیکھ لیکو جاؤ کناں
فیشن کی گُڑیاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حنیف خاں سپاٹ نے اپنا پُرمزاح کلام سُنا کر خوب داد حاصل کی۔ یہ آ رہے ہیں شیروانی اور پاجامہ میں ملبوس سلیم صاحب۔ سُننے ہیں کہ میدک کے یہ ہیں، قہقہوں کو قائم رکھتے ہوئے اپنا کلام سُنایا: ؎

ہٹتا نہیں پیچھے میں کبھی خوف و خطر سے
واقف ہے زمانہ تو مرے عیب و ہنر سے
فولاد کا انسان ہوں میں پولس میں ملازم
ڈرتا نہیں بیگم کے سوا شیر و ببر سے

نیا فیشن جو نانی کرتے جا رئیں
دیوانے ہوکو نانا مرتے جا رئیں
بڑھاپے میں رنگیلے پن پو اِن کے
جواناں ٹھنڈی سانساں بھرتے جا رئیں

پوری نہ ہوئی ان سے کبھی آس ہماری
سائے کی طرح ساتھ رہی ساس ہماری
ہر بات میں اِک ٹانگ اڑا دیتی ہے مرغی
ملنے کبھی دیتی نہیں خناس ہماری

رات کو کرکو اندھیرا دن کو لیٹاں کھول ریں
لیٹاں والے تو برابر بل کے پیسے رول ریں
ہے اندھیرا شہر کی قسمت میں میدکی چُپ رہو
بولنے والے تو چُپ ہیں آپ کیکو بول ریں

یہ لیجیئے، گجڑ راٹھوری آرہے ہیں۔ ان کے مائیک پر آتے ہی "چھو۔ چھو" کی آوازیں آنے لگیں۔ واقعی اس مرتبہ وہ مزا نہیں آیا جو گزشتہ 'چھو' میں آیا تھا ؎

اسی سے شان ہے باقی اسی سے بانکپن میرا
قیامت تک سلامت رکھ خدا سیدھی کا پن میرا
جو چوٹ ہیں وہ پیتے ہی رہیں گے تا دمِ آخر
اسی واسطے مشہور ہے یہ ملک دکن میرا

گجڑ نے یہ ڈھولک کا گیت سُنایا ؎

گھڑو بھائی کی شادی میں بڑا مزہ آیا
دُولہن سے بڑ کو تھی دُولہن کی خالہ
جھولے کو لاکو دُولہے کو بٹھائے
دُولے کے پاواں دُودھ سے دُھلائے
نَیں نَیں سو تُتے تو تے رسمان کرائے
سب مِل کو دُولے کو ہولا بنائے
ڈھول بجائی دُولن تو دُولا گیتاں گایا
گھڑو بھائی کی شادی میں بڑا مزہ آیا
دس سال سے پالے سو بوکڑ کٹا کو
پانچ سیر پو پائی بھر اس کو لگا کو
آدھا تھیلا نمک کھانے میں ڈالا کو
خوش خوش تھے دُولن والے کھانا کھلا کو
حلق سے اُترا یا نَیں اِک بھی نوالا
گھڑو بھائی کی شادی میں بڑا مزہ آیا
دُولے کی اماں تھی دُبلی پتلی
دُولن کے لوگاں بھی گھونس سے تگڑے
دُولن بچاری اکیچ تھی اصلی
سب مِل کو کر دیں جی گڑ بڑ گھوٹالا
گھڑو بھائی کی شادی میں بڑا مزہ آیا
دال لیکو جلوہ دولن کو لائے
آوازاں دھڑ دھڑ کی سُن کو سب آئے
رورئے تھے دولا دُولن کرئے تھے ہائے
گجڑ میاں جا کو آئیڈن لگائے
دُولن کے پلنگ کا ٹوٹا تھا پایا
گھڑو بھائی کی شادی میں بڑا مزہ آیا

اناؤنسر نے ایک تندرست و توانا، اونچے پورے لحیم شحیم قد اور شخصیت کے تو نہیں مگر صفاچٹ .... کے مالک، یعنی صبغتہ اللہ بمباٹ کے نام کا اعلان کیا جنہوں نے بمباٹ کلام سُنا کر اپنے چوڑوں اور چھکوں سے تہقہوں کی سُشل بارش کی۔ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ نوجوانوں کی نذر کرتے ہوئے یہ نظم سُنائی:

اور پھر لڑکے نے لڑکی سے کہا:
"کیا ارادہ ہے"؟
چلو پکچر چلیں اور گزشتہ کی طرح
اے جانِ من!

کار نر کی پچھلی سیٹوں پر جمیں،
اور اگر وہ سیٹیں آکوپائیڈ (OCCUPIED) ہوں؟
لڑکی کہتی ہے:
"جانے دو اس بار پکچر دیکھ لیں"!

سیکل پہ جارہا تھا اپنی دُھن میں آپ میں
اک سپاہی دوڑتا آیا Attention ہو گیا
سر جھکا کر دی مبارکباد اور مجھ سے کہا
کراش ہیلمٹ اور سیکل پر مجبّی، مرحبا

ایک نظم بہ عنوان "نیا رکشہ" سنائی ملاحظہ ہو:
مارکٹ پہ کھڑے ہوئے تھے ہم، اور کوٹھی ہمیں پہونچنا تھا
ایسی جلدی میں دُور سے ہم کو ایک رکشہ نظر پڑا
جس کو ہم نے ٹھہرایا اور پوچھا، بھئی کوٹھی چلنا ہے بولو کیا لوگے
رکشہ راں نے کہا "میرے سرکار ہم تو ہیں آپ ہی کے خدمتگار!
لیکن ایک بات پوچھنی ہے ضرور، کونسے درجہ میں ملیں گے حضور!
کونسے درجہ میں! رکشہ میں درجہ بندی کیا مطلب؟
اتنی جلدی خفا نہ ہوں سرکار، یوں تو لیجئے گا اصل خدمتگار

ریل میں ہیں حضور درجے تین
رکشا میں بھی وہی ہیں کیجیے یقین
(یعنی، فرسٹ کلاس، سکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس)
(اسمیں فرسٹ کلاس کی سہولتیں)
پہلے درجہ میں گر چلیں گے آپ
میں چڑھاؤں گا سب سے پہلے ٹاپ
سیٹ کو کپڑے سے کروں گا صاف
تب سواری کو میں بٹھاؤں گا
پھول کی طرح لے کے جاؤں گا
ہو سڑک کھُردری تو، آہستہ
تیز تر صاف ہو اگر رستہ
دل لگے آپ کا تو گاؤں گا
فلمی گانے بھی میں سناؤں گا

راستے میں کوئی حسینہ ملے
رکشہ بس اس کے ساتھ ساتھ چلے
جیسے قدموں سے جُڑ گیا رکشہ
وہ مُڑی اور مُڑ گیا رکشہ
(دوسرے درجہ کی سہولتیں)
دوسرے درجہ میں گر چلیں گے آپ
آپ کو خود چڑھانا ہو گا ٹاپ
سیٹ کا صاف کرنا نا ممکن!
خود سے انصاف کرنا نا ممکن!
سڑک اچھی ہو یا بُری چلیئے
ٹاپ ہو بند یا کھُلی چلیئے

اپنی ہی دُھن میں چلتا جاؤں گا
دُھن سناؤں گا نہ میں گاؤں گا
لاکھ آئیں حسین رستے میں
ٹوکیں بھی مہ جبین رستے میں
رکشا میرا نہ رُکے گا جناب
چاہے رُک جائیں راوی اور چناب

تیسرے درجہ میں ہو خرچ سفر
آئیے! کیجئے اگر نہ مگر
بیٹھ جاؤں خود میں چڑھا کے ٹاپ
رکشا لیکن گر چلائیں گے آپ!

ہندوستان کے منفرد شاعر سجنی بھوپالی، جو ریختی شاعری میں اپنا ایک علاحدہ مقام رکھتے ہیں۔ ان کا استقبال لوگوں نے قہقہوں اور خواتین کی نظروں نے چہچہاہٹ سے کیا۔ مشاعرہ کا سماں تو باندھ نہ سکے۔ کیونکہ پہلی مرتبہ ریختی کے شاعر کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے، یہاں کے عوام نے اِن کو گوارہ کرلیا۔ اسمیں شک نہیں کہ اِن کے اشعار میں شوکتِ لفظی اور عورت کی زبان سے مدعا کا اظہار عوام کو پسند ضرور آیا ۔

تھکن سے لمبے سفر کے میں چور چور آئی
مشاعرے میں بلائی گئی، ضرور آئی
ابھی نہ چھیڑیو، زندہ دلانِ حیدرآباد
تمہارے ہی لئے بندی تو اتنی دور آئی

اب سے پہلے میں عورت نہیں تھی مگر
جس طرف سب چلے مجھ کو چلنا پڑا
وہ غرارے سے پتلون میں آگئیں
مجھ کو بھی اپنا چونڈہ بدلنا پڑا

میری منی رو رہی ہے، میں ابھی سلا کے آئی
ذرا بھابی دیکھتے رہنا کہیں دودھ اُبل نہ جائے
کرو چھیڑ اب نہ مجھ سے نہ جگاؤ سوتے فتنے
جو چراغ بجھ چکا ہے کہیں پھر سے جل نہ جائے

سنجنی بھوپالی کے کلام پر خواتین اپنے آنچلوں کو دانتوں تلے دبائے ہنستی رہیں۔

جس طرح بھلاویں کا نشان نہیں مٹتا، اسی طرح عظمت بھلاواں کے یہ اشعار بھی خوب تھے ؎

پیار سے جس کا لے لیا بوسہ
نقش اس پر ہے برقرار اپنا
کسی صابن سے مٹ نہیں سکتا
داغ ایسا ہے پائیدار اپنا

مترنم آواز میں اپنی اس غزل پر داد حاصل کی ؎

سامنے کوئی یار ہے پیارے
دیکھ اپنا مزار ہے پیارے
کیوں لگاتا ہے عطر کا پھایا
خود ہی تو گلبہار ہے پیارے
کتنی مکھیاں ہیں تیری چکر میں
تو بھی شیرے کا تار ہے پیارے
ناف تیری کہیں نہ ٹل جائے
ہار گردن میں بار ہے پیارے
مرنے والے تو مر گئے سارے
تو، تو حسد قد کے پار ہے پیارے
تیرے ابرو کے کاٹ کیا بولوں
یہ تو خنجر کا وار ہے پیارے
ایک دن آڑ کر کے آتا ہے
تو بھی جاڑا بخار ہے پیارے
جنکو گھیرے کھڑی ہیں سب سنکھیاں
لو تو کس کا شکار ہے پیارے
دم پہ رکھی ہوئی ہے بریانی
اتنا کیوں بے قرار ہے پیارے
جانور ہر طرح کے ہیں موجود
کیوں گدھے پر سوار ہے پیارے
مستقل داغ جس کا رہ جائے
وہ بھلاویں کا پیار ہے پیارے

مقرب حسین عاجز حیدرآبادی عوام کے لیے نئے نہیں، پہلے انہوں نے موجودہ حالات پر دو بند پیش کئے ؎

وہ آج کہہ رہے ہیں کہ کل ہو گئی تھی بھول
کچھ کچھ ضرور کام ہوئے تھے خلافِ رول
ہمنے سمجھ لیا تھا ہر ایک آدمی کو فول FOOL
میں نے کہا، یہی تو ہے قدرت کا اک اصول
ٹھنڈی ہوا چلے گی تو کلیاں کھلائیگی
آندھی اگر بنی تو تباہی مچائیگی

تم تو اٹھے تھے ظلم مٹانے کے واسطے
سب کے دلوں میں پیار بڑھانے کے واسطے
نعرے دیئے تھے سب کو جگانے کے واسطے
کس نے کہا تھا تم سے ستانے کے واسطے

تم کو تمہارے خون نے یہ کیا صلہ دیا
تم باغباں تھے تمکو ستمگر بنا دیا

مقرب حسین نے بھرپور طنز یہ مقصدی نظم "دوسری شادی" پیش کی ؂

ایک شوہر نے کسی دن اپنی بیوی سے کہا
میرے گھر کی مالکن ایک بات تو سن لے ذرا
زندگی بھر میں نے چاہا تجھکو زیادہ جان سے
تجھ سے شادی کرکے میں محروم ہوں سنتان سے
یہ شکایت زندگی بھر میں نے تجھ سے کی نہیں
تو نے مجھکو سُکھ دیئے اولاد لیکن دی نہیں

یہ تجھے معلوم ہے تو جانتی ہے دلربا
میں نے جیون بھر سبھی کچھ تیری مرضی سے کیا
فیصلہ میں نے کیا ہے "دوسری شادی کروں"
میں نے سوچا ہے کہ اسکی بھی اجازت تجھ سے لوں
کھیلتی آنگن میں میرے کوئی ننھی جان ہو
چاہتا ہوں میرے بھی گھر میں کوئی سنتان ہو

بیوی :۔

پوچھنا یہ ہے مجھے اتنا بتا دیجئے حضور
کیا نظر آتا ہے اس ٹانک میں میرا ہی قصور
جس زمیں سے آپکو اچھی فصل درکار ہو
کیا یہی کافی ہے بس دھرتی ہی کچھ ہموار ہو
اچھی فصلیں کاٹنے کو لوگ سب بیتاب ہیں
ہر زمیں پر ہل چلانے کے الگ آداب ہیں
روکتی ہرگز نہیں ہوں شوق سے شادی کرو
نقص یہ کس کا ہے پہلے ڈاکٹر سے پوچھ لو
بات کچھ کڑوی سی ہے سنیئے تو اسے
آپ کیا شادی کرا سکتے ہیں میری اور سے

ٹھیک ہے اولاد سے آتا ہے جینے کا مزہ
یہ بھی لیکن جان لے اولاد دیتا ہے خدا
جس طرح سے تیز آندھی میں دیئے جلتے نہیں
نام ایسے ہی کبھی اولاد سے چلتے نہیں
آپ شاید بے خبر لگتے ہیں اس انجام سے
نام رہتے ہیں زمانے میں ہمارے کام سے
کام سے باقی ہیں اب تک نام کے یہ سلسلے
نام دنیا میں کبھی رہتے نہیں اولاد سے
یہ بتاؤ تو ذرا تلسی کا پوتا کون ہے
آج اس دنیا میں غالب کا بھتیجا کون ہے
غم میں یوں اولاد کے مت دوسری شادی کرو
آشرم سے اس سے بہتر ہے کسی کو گود لو
یہ نمونہ بھی تو ہو سکتا ہے اپنے پیار کا
کوئی بچہ گود لے لیں اپنے رشتہ دار کا
سن کے بیوی کی کتھا شوہر بھی پچھتانے لگا
دوسری شادی کا سارا حوصلہ جاتا رہا
چاہتے ہو گر مقرب اپنا گھر جنت لگے
یہ ضروری ہے کہ گھر میں ایک ہی بیوی رہے

O

گڑبڑ حیدرآبادی کے نام کے اعلان کے ساتھ ہی مشاعرے میں گڑبڑ پیدا ہو گئی :۔

مہ جبیں طرحدار ہے کُرسی
سب کے دل کا قرار ہے کُرسی
بوڑھے بیٹھیں جوان ہو جائیں
واقعی گلبہار ہے کرسی
غنڈے قاتل سلام کرتے ہیں
واہ کیا رعب دار ہے کرسی

آ ہنی ہو کہ سا گوانی ہو
ہمتِ عہدیدار ہے کرسی
تیرے ملتے ہی مل گئی دولت
تو بڑی مال دار ہے کرسی
بیٹھ کر اس پہ جو بھی چاہیں کریں
غیب کی پردہ دار ہے کرسی
زعمِ کرسی میں لوٹیئے دولت
خوب خدمت گزار ہے کرسی
چمچے ملتے ہیں تیرے ملنے سے
تیرے دم سے بہار ہے کرسی
ناک کیا سر بھی کاٹ ڈالے گی
تیغ خنجر کٹار ہے کرسی
تیرے پائے میں دفن ہیں لاکھوں
تو وہ زندہ مزار ہے کرسی

○

محمل مدراسی نے اپنا رنگ جمانے کی کوشش کی

کون جنا ہے کون جنی ہے، نیچے حالاں کیا بولوں
ایک سے ہیں بس سب کے لباساں لمبے بالاں کیا بولوں

ایک نام کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ جیسے ہی کنوینر مشاعرہ نے "گگلی" کا نام لیا۔ سامعین نے "اسے" جھیل لیا، پھر کیا تھا، گگلی نے ڈنڈے کے بغیر وہ وہ پھلجھڑیاں اور انار چھوڑے کہ سامعین گگلی کو تبغضہ سے جانے نہیں دے رہے تھے۔

گگلی کا مخصوص ترنم طنز و مزاح سے بھرپور کلام ان کی مقبولیت کا ایک خاص سبب ہے، ہنسی ہنسی میں سماجی نقائص کو دلنشیں انداز میں بیان کرنا گگلی کا ایک خاص وصف ہے۔ اپنے کلام کا آغاز روایتی مخصوص انداز میں پُر مزاح، قہقہہ بردوش دو چرّوں سے کیا

سر دُھنو ہر شعر پہ واہوا کرو
اس کے ہر ایک شعر کو اُونچا کرو
اِس سے بڑھ کو اور کیا دینگے تمہیں
مَر گیا شاعر تو تم جلسہ کرو

کرڑکی میں بھی چھوڑے نئیں بھی آخر منجے جھاڑے ناں
اُدپر اُدپر سے میں خوش تھا زندہ منجے گاڑے ناں
عید گزر گئی بات گزر گئی یاراں میرے کیا بولوں
تھا سو ایک بُوشکوٹ پرانا گگلی کو پھاڑے ناں

راجہ مہدی علیخاں کی روح سے معذرت کے ساتھ، نظم "ماڈرن محبوبہ کا خط عاشق کے نام" سنائی

"میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو"

میں تجھے شاعرِ رنگیں بیاں مانوں گی
اے میرے نیم خدا پورے خدا مانوں گی
اچھا سہرا تمے اک لکھ کو سنانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو....

میرے گردن کی تو تعریف بہت کرتے تھے
میری زلفوں کی تو تعریف بہت کرتے تھے
میرے دولہے کی بھی کچھ شان میں گانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو....

تم مرے گھر کے بھی کُتّے پہ جو مر سکتے ہو
مرے دولہے سے بھی تم دوستی کر سکتے ہو
دوستی حد سے زیادہ نہ بڑھانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو....

میری تصویراں جو دالِس کرے سچے عاشق
دنیا والے تو کہینگے تمُے سچےّ عاشق
عشق کرنا بھی زمانے کو سکھانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو....

مجھے معلوم ہے یہ عشق مسلسل ہے عذاب
"عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب"
میرے پاؤں میں بھی تم مہندی لگانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو....

سب براتیوں میں تم ایک خاص براتی ہونگے
میرے ڈنّر کے تمیں خاص باورچی ہونگے
اچھی بریانی ذرا سبکو کھلانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو....

تمُیں اک چانس رکھیوں چھوٹیں جھمگی میں مری
ڈانس ہجڑوں کا رکھیوں چھوٹیں جھمگی میں مری
سچے عاشق ہے تو تم کمر ہلانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو....

عقد ہے صبح میں تو شام میں جلوہ ہوگا
میرے دولہے کا حشر شام تلک کیا ہوگا
میٹنی اس کو فلمَ "شعلے" دکھانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو ...

کتنےّ جوڑے ہے جو الفت میں بچھڑ جاتے ہیں
مرنے جینے کی جو آپسمیں قسم کھاتے ہیں
آج کل عشق ہے ایک ڈھونگ سنانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو..

لو لیٹر میرے تمیں سارے جلا کوسٹ دیلو
جتنےّ لکھی ہوں تمہیں سارے کھیا کوسٹ دیلو
نوّی معشوق کو بھی ساتھ میں لانا دیکھو

میرے محبوب میری شادی میں آنا دیکھو..

سلسلہ صفحہ ۳۸ پر

گلّی نے "کھیڑے کی بٹّی" کے بعد مسلسل قہقہوں سے گونجتے ہوئے۔
مشاعرے میں "شہر کا مُوّا" اپنے مخصوص دیہقانی ترنم میں سنایا۔

نکّو نکّو بولی یہ شہر کا مُوّا
اَئی یَئی یو اَئی یَئی یو بالش بھر کا چھوّا

انے کرتا سو باتاں گھٹ پٹ گھٹ پٹ!
باتوں باتوں میں بولیا اَن فِٹ، ان فٹ!
اِنے کونسے فیلڈ کا کی چمٹا

یہ شہر کا مُوّا.....

میں شمع کہتے اِنے پروانہ کہتے
اِنے جلتا کہتے میں جلانا کہتے
اِنے مجنوں کہتے میں لیلیٰ

یہ شہر کا مُوّا، میں نکّو نکّو بولیوں.....

اِنے کرتا سو نغمے کا نغمہ گتے
اِنے راکٹ کی بیگی کا پونگا کہتے
اِنے اصل میں پونگّی نہ پونگا

یہ شہر کا مُوّا اَئی یَئی یو، اَئی یَئی یو بالش بھر کا چھوّا.....

اِنے شاعر کہتے کیا کی گلّی کہتے
میری سہیلی بولی تیخ چلّی کہتے
اِنے مونگے کی لکڑی کا ڈنڈا

یہ شہر کا مُوّا......

سامعین کی فرمائش پر انھوں نے "بچھوں کا مرثیہ" پیش کیا۔

باوا رے، داتا رے، کاں کی جاتا رے، جاتا رے!

تیرے دم سے زندہ تھے سارے، سارے مرگئے بلّٹ رے
اماں باوا جورو بچے زندہ، مر گئے پلٹے رے
تیری ڈِش میں کھاتے تھے اب کس کی ڈش میں کھانا رے

باوا رے داتا رے، کاں کی......

تیری جھوٹی خادین گی وہسکی پیتے تھے اب کیا پینا رے
جھوٹا گڑمبہ بھی نئیں ملا تو بول رے کیسا جینا رے
ساقی تھا، مے خانہ تھا۔ جمشید کا تھا پیمانہ رے

باوا رے، داتا رے......

کونسا الیکشن لڑنے کو جا رے خواب میں آکو بتلا رے
سب کو دھوکا دیتے مرلیا ہمنا نکّو دھوکا رے
جینا تیرا دھوکا تھا یہ مرنا بھی ہے کیا دھوکا رے

باوا رے، داتا رے......

تیسرا ایکسپیج، ایکسپیج بیٹا اللہ میاں کی گالی آئی
ہمارا کیا کلیان کریں گا پودا برہما جاری آئی
شیطان کے پیٹ میں ولی کے جیسا بنکو ہوا اُنے پیدا رے

باوا رے، داتا رے......

ہر مجید کا تھا متولّی کونسی بھی مجید میں دکھیا یچ نئیں
سال میں دو آتے سو نمازاں وہ بھی تو پیارے پڑیا یچ نئیں
نماز جنازہ تری پڑھانے کونسی مجید کو لیجانا رے

باوا رے، داتا رے......

اسمگلنگ اور بلاک مارکٹ سب کے سب بند ہو جائینگے
تیرے ٹیبل کے پھر چیچے گوا غلاٹیاں کھائینگے
سونے کا انڈا دیتا تھا سو، تھا تو اصلی مُرغا رے

جاتا رے، جاتا رے کاں کی وہ کاں کی.....

بغیر سیکونس رمیّوں پو رمیّاں، کھیلوں پہ کھیلا کرتے تھے
جوکر بچارا کاں رہتا تھا کی ہم اپنا دھندہ کرتے تھے
تاش کے باون پتّوں میں تو ایکّوں کا تھا اک اِکّا رے

باوا رے داتا رے.....

چیف منسٹر بننے کے تیرے بھو تیج چرچے ہو رئیں تھے
کتّے کی چیچے اڈوانس میں تیرے منسٹر بن رئیں تھے

آگے پیچھے سو نچنا نئیں رے کیسے وقت میں سرکا رے

باوا رے داتا رے ....

فوڈ کا منسٹر تھا تو پیارے جنگ بھی دیش میں چھڑ گئی تھی

تیرے بنگلے کے پچھواڑے سے سونے کی کان نکل رئی تھی

گولڈن چانس کو مِس کریا رے پاگل ارے تو ہولا رے

باوا رے ....

تیرے بجائے چچوں میں سے چچوں کے بچے مرنا تھا

چچوں کے بچے بھی نئیں مرے تو چچوں کے سگے مرنا تھا

تیری بلا سے کیوں نئیں مریا رے، چچوں میں سے کوئی چچا رے

باوا رے داتا رے .....

کیا کرنا دل کھٹ کرلیں گے نیر تجھے دفنا دینگے

تیری قبر کے اوپر پختہ گنبد بھی بنوا دینگے

تربت پو تیری بیٹھیں گا ہنکو جیچہ کوئی سجادہ رے

باوا رے داتا رے .....

کونسے ہاتھوں سے اب تجھکو بول ہمیں دفنا نا رے

پلاٹینم تھا تو پارس تھا تو مٹی میں کیسا ملانا رے

میوزیم میں رکھ کو جنازہ سب کو ٹکٹ سے دکھانا رے

باوا رے داتا رے .....

تازہ قتل اور اغواء کے کچھ تیرٹے جھگڑے کیساں تھے

دلّی میں اک بیانک لٹا سو ہم لوہی الزاماں تھے

گلّی کے سر لیکا اڑتے تھے کیساں ڈنڈوں کا تھا تو ڈنڈا رے

باوا رے داتا رے ....

منسٹر کی آتما کا جواب چچوں کو

لچّے رے چچے رے بیٹے لوٹے رے لوٹے رے

ظلم زبردستی سے الیکشن میں جو کھڑا کر ڈالے رے

نام بھی رکھنا تھا قائم نام بڑا کر ڈالے رے

منسٹری کی کرسی کو کھا گئے دیمک کے بن کو کیڑے رے

لچّے رے پیچے رے .....

کھاؤ قسم جورو بچوں کی کون رے تو تو بولا تھا

مارو توڑو قتل کرو رے کون رے غنڈو بولا تھا

بھارت ماتا کے سنگار سے لوٹے سنہری جھمکے رے

بیٹے لوٹے رے لوٹے رے ....

کار بولے تو کار دلایا بنگلہ بولے تو بنگلہ دیا

تمہارے خاطر، مرغا بن کو سونے کا بھی انڈہ دیا

تن کے اُجلے من کے کالے برٹش کے نکلے گھوڑے رے

لچّے رے پیچے رے ......

"ہارٹ فیل" میرا کیوں ہوتا تھا ٹھنڈے دل سے سوچو رے

تمہارے کالے دھندے مارے میں کیوں مرتا بولو رے

دیش دروہی بنکو چلائے دیش میں جالی سکّے رے

لچّے رے پیچے رے ....

چکلے سو جیلواں توڑ کے سو بھلواں کتے بیٹے تکتے تھے

تعریف میں چوبیس گھنٹے کیا کیا کی کیا کیا کی بکتے تھے

باڑوں کے حوض میں مجھکو ڈوبا کو دیئے مسلسل غوطے رے

لچّے رے پیچے رے ......

بنگالی جادو سے بڑ کو تم اپنا جادو کرتے تھے

ترائی کو کدّو، کدّو کو مرچی، مرچی کو آلو کرتے تھے

دن میں اندھیرا کر کو دکھائے دنیا کو دن میں تارے رے

لچّے رے پیچے رے ....

مر بھی گیا تو کیوں خون میرا پینے کی کوشش کر رئیں تم

میوزیم میں رکھ کو جنازہ بیچنے کی کوشش کر رئیں تم

بچے مرے میں سمجھیا تھا تمنا، نکلے تمے بور بچے رے

لچّے رے پیچے رے بیٹے لوٹے رے .....

بولتا تھا میں ہلو ہلو، دھیرے دھیرے کام کرو

اسمگلنگ میں سب ہے چوراں بیٹے نکو بدنام کرو

اپنی موج کی گلی اڑائے شیشم کے بن کے ڈنڈے رے
بچے رسے پچے رے ....

گلی کے بعد آئے فیض الرحمٰن فیض :۔

هر بات نرالی ہے تری ایسی کی تیسی
هر چال مثالی ہے تری ایسی کی تیسی
اوروں کو ملے داد مرے شعر پہ ہو
ذرہ پرذہ یہ کمالی ہے تری ایسی کی تیسی
اولاد کی خاطر تو بہت بیلے ہیں پاپڑ
کلدارنہ حالی ہے تری ایسی کی تیسی
کیوں بار گلے کا ہوئی چھ بچوں کی اماں
لٹو کی وہ جالی ہے تری ایسی کی تیسی
اک ہاتھ سے تالی نہ بجی ہے نہ بجے گی
منطق یہ نرالی ہے تری ایسی کی تیسی

اپنی نظم نورماں کے جنوئیں لئے دکنی زبان کے نوجوان شاعر اشرف خوندمیری نمودار ہوئے ۔

کلوں پو چھپا چھپک جو پھٹئے اُن کی جوانی
بڑ معنے کو نکل گئی انوں گھر سے نکے خوانی
دولن کے گھر پہنچے جو بن ٹھن کو سنور کو
سالوں کیساتھ، سالوں کے سالوں کی ٹھماتی
دھنگانہ پکڑنے کو دروزے پو جو اڑگئیں
نورماں کے جنوائیں سورماسیٹی بن کو اکڑ گئیں

قسمت کھلی جو بیٹی کی تو بیٹی گھر جنوئیں ہوئیں
بے کار تھے زمانے سے تو اب کام پو چڑئیں
اُن کے کنوارے دل کی صفاچٹ زمین تھی
پانی پڑیا تو واں بھی زرسے مولکے ٹھیں
آلنے کے بھی کنوے سو بجھاں بس ساں پو چڑئیں

نورماں کے جنوئیں سورماسیٹی بن کو اکڑ گئیں ....

تھپلی کا جھگی کا ذرا دالچہ کھانا
اپنے میں اپن گانے لگیئں پیار کا گانا
اپنے پرانے یاروں کو اک ڈھاک بٹھانے
چپکا کو اُنوں منجھی پو بریانی کا دانہ
چوکٹ پہ ادھر ہو گئیں تو مند ھم سے اکڑ گئیں
نورماں کے جنوئیں سورماسیٹی بن کر اکڑ گئیں....

جس دن سے اُنوں پیار کے جنگل میں بھٹک گئیں
جورو کے رُو کھے بالوں کے گچھوں میں اٹک گئیں
گلے کو ٹھدر چوٹلے کے پھندے میں پھنسا کو
آنکھوں کو سخت کھینچ کو سولی پو لٹک گئیں
مکمتی کے ناد مکھڑی کے جالے میں سپٹر گئیں
نورماں کے جنوئیں سورماسیٹی بن کو اکڑ گئیں...

پوٹے بنجالے پلپلے بنگلین بیٹھے ہوئے ہیں
دارخاں لگی سو کچھڑی کی کھرچن بنے ہوئے ہیں
بادا گھسے وے تختے کے مافق جو گھس گو گئیں
اماں گھسے وے تختے کی بیلن بنے ہوئے ہیں
اولے پڑے ہوئے تالو پو تو بالاں بھی جھڑ گئیں
نورماں کے جنوئیں سورماسیٹی بن کو اکڑ گئیں...

اناؤنسر نے تعارف کروایا "لیجئے جن کا انتظار تھا وہ آرہے ہیں آپ کے عزیز ترین مہمان شاعر جو طنز و مزاح کے امام مانے جاتے ہیں اسم بامسمّیٰ۔ دل میں کھب جانے والے اشعار، دل کو متاثر کرنے والی آواز انداز تکلم یہ کہ خون کے آنسو بہہ جائیں، یہ ہیں ہمارے مہمان شاعر حضرت ہلال سیوہاروی۔ سامعین گوش برآواز ہو گئے ۔ ہلال سیوہاروی جو کئی بار حیدرآباد آچکے ہیں زندہ دلان حیدرآباد کے پُر اہتمام مشاعرے کی روح رواں تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کی نظم "جوتے" پیش خدمت ہے۔

اس نئی تجویز پر اک شور تھا ایوان میں
اور بھی تو ٹیکس جاں لیوا تھے ہندوستان میں
اور بھی چیزیں تھیں جن پر ٹیکس کی بھرمار ہے
اس رعایت کا مگر "جوتا" ہی کیوں حق دار ہے
رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا ہر اک ممبر کا جوش
تڑسے اک جوتے نے آکر کر دیا سب کو خموش
بولا جوتا مجھکو یہ تکرار بھاتی ہی نہیں
اور یہ بھی بتلادوں خوشامد مجھکو آتی ہی نہیں
یہ بھی واضح ہو کہ وہ روز ازل سے بدمزاج
"ٹیکس" اور مجھ پر" لیا ہے میں نے دنیا سے خراج
تم نے دیکھی ہی نہیں شاید مری شان عظیم
مدح خواں ہے میرا ہر دور زماں، دور قدیم
دخل رکھتا ہوں، نہ رکھتا تھا کبھی اخلاق میں
پھر بھی میرا ذکر ہے تاریخ کے اوراق میں
میں کہ ہوں "قہر الٰہی" میں کہ عالی جاہ بھی
میں ہی چنگیز و ہلاکو، میں ہی نادر شاہ بھی
مدتیں گزریں مگر رنگ طبیعت ہے وہی
آج بھی دنیا میں میری شان و شوکت ہے وہی
آج پاکستان قائل ہے میری تاثیر کا
وہ بھی مجھ سے پوچھتا رہتا ہے حل کشمیر کا

●

میں نہیں ساتھی، تو کوئی بھی نہیں لیتا خبر
پا برہنہ جیسے اردو پھر رہی ہے دربدر

ہر قدم پر چھوڑتا جاتا ہوں اپنی یادگار
خطۂ پنجاب و ہریانہ ہے جس کا شاہکار
یہ تو قسمت ہے کہ سستے دام آجاتا ہوں میں
ورنہ ہر اسمبلی میں کام آجاتا ہوں میں

●

اچھے اچھوں کی بنا رکھی ہے میں نے دردشا
میں ہوں طاقت، نام ہے میرا ہی پرتو شکتیا
کون ہے جو جاکے واشنگٹن میں جھک جاتا نہیں
ایک وہ ہوں میں جو U.N.O سے گھبراتا نہیں
بات اونچی ہی سدا رکھتا ہوں اپنی آپ کی
میں نہیں سنتا کسی پوتھان اور ادتھان کی
مرحلہ کوئی بھی ہو میں موجب تکمیل ہوں
دیدۂ ورہوں میں ہی فیروز میں ہی اسرائیل ہوں
جس طرف دیکھو گے پاؤ گے میرا ہی انتظام
الجزائر ہو وہ کوئی یا کوئی ہو ویٹ نام
مجھ کو حیرت ہے کہ کیسے نام پیچھے تھا مرا
لیڈروں سے تو الیکشن کا پرےچۓ تھا مرا
ٹیکس مجھ پر لگ گیا ہوگا کسی کی بھول سے
یا کوئی ناآشنا ہوگا پرانے رول سے
کون ہے مرنا نہیں واقف جو میرے نام سے
میری عادت میری خصلت اور میرے کام سے
جس کو تم سمجھے رعایت وہ میرا ادھیکار ہے
سچ اگر پوچھو تو یہ دنیا ہی اپنی یار ہے
اہل دانش جانتے تھے قدر و قیمت کو مری .....

★

پہلی مرتبہ ابراہیم عتیق نے زندہ دلان حیدرآباد کے اس مشاعرہ میں شرکت کی اور اپنے کلام میں اردو اور تلگو کے امتزاج کو پیش کیا

یہ حال ہے اپنی الفت کا
لو ایوارو اور نین ایوارو
پہلو میں ادھر دل گم سم ہے
پشرٹ کی ادھر جیبیں خالی
یہ حال ہے اپنی الفت کا اب
لو ایوارو اور نین ایوارو

نی پریم لو جو میرا حال ہوا
بیم چپالے، بیم چپالے

▲

وہ پکچی پینڈلو یاد کرو
وہ گولڈن دو نگرڈم یاد کرو
وہ بزنس پیار و محبت کا
وہ لابھم نشٹم یاد کرو
یہ حال ہے اپنی الفت کا اب
لو ایوارو اور نین ایوارو

نی ناناکو گوشی الو الو
مرے ابا کو ٹھاٹ شرائی سے
نی اماں کو ستری گوڑ اپند
مرے ابا کو پیار ملائی سے
یہ حال ہے اپنی الفت کا اب
لو ایوارو اور نین ایوارو

تیری اماں اسلیے چولے والی
میری ماں ہے پان کی متوالی
اک منہ میں زردے کی خوشبو
اک منہ ہے سڑی گندی نالی
یہ حال ہے اپنی الفت کا اب
لو ایوارو اور نین ایوارو

اس کے بعد مصطفیٰ علی بیگ نے اپنی اینگلو اردو غزل سے محفل کو زعفران زار بنا دیا اور داد تحسین حاصل کر کے رخصت ہوئے۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

PIECES ہارٹ کے کرنے والے
تو SOLID ہے بس یہ غم ہے

TAPED ہیں ان کی ساری باتیں
مر بھی گئے تو ناک میں دم ہے

❖

بوگس حیدرآبادی نے قطب مینار اور چار مینار سے مقابلہ کرتے ہوئے دکنی کے مشہور شاعر حمایت اللہ کو دعوت سخن دی۔ "حیدرآباد کا لڑکا اور یوپی کی لڑکی" نہایت خوبصورت انداز میں پیش کر کے محفل کو لوٹ پوٹ کر دیا۔

شوہر (باہر سے آتے ہیں)
اجی کاں ہے جی ہو چھوڑو وہ سب جلدی سے یاں آؤ
تمہارے واسطے کیا لے کو آیا ہوں دیکھو کو جاؤ

بیوی:۔
خدارا چیخیے مت آ رہی ہوں ماجرا کیا ہے
میں بہری تو نہیں ہوں آ رہی ہوں بولیے کیا ہے

شوہر:۔
کھڑک رئیں کیوں پھڑک جاتا سنو کیا لے کو آیا ہوں
لے دیکھو رئیں دیکھو رئیں کیسا خزانہ لے کو آیا ہوں

بیوی:۔

خزانہ کیا ہے وو ی یہ تو لپسٹک اور پوڈر ہے
یہ وہ چیزیں ہیں جو گھر گھر ہے

شوہر:-
لپسٹک اور پوڈر یہ وہ چیزاں ہے جو گھر گھر ہے
یہ گرمیوں میں سلک جاتے جی میرے کو یہ ڈر ہے
یہ نخ نخ کی تمہارے کو زبردستی کی عادت ہے
میری اچھی بری ہر چیز سے تم کو عداوت ہے
لپسٹک اور پوڈر کیا میں میرے واسطے لایوں؟
شکر ما تو یہ سب چیزاں تمہارے واسطے لایوں،

بیوی:-
اے اللہ کیا ہوا ہے آپ کو رہنے گا آپے میں
نگوڑی لپسٹک اور میں لگاؤں اس بڑھاپے میں

شوہر:-
بڑھاپے کو لپسٹک اور پوڈر کی ضرورت ہے
پرانے گھر کو جیسا داغ دوزی کی ضرورت ہے

★

بیوی:-
پڑوسی سن رہے ہوں گے ذرا آہستہ کہیئے نا
خدارا چند لمحوں کے لئے خاموش رہئے نا

شوہر:-
پڑوسیاں ہیں آوازاں ان کے اپنے آتے جاتے ہیں
صبح سے شام تک ان کے آوازاں ہم کو آتے ہیں
تمے یوپی کے ہوں گے پن یہ کاٹھی تو سرحد کی ہے
تمیں دیکھنے کو جورو ہے طبیعت تو مرد کی ہے

بیوی:-
مجھے یہ لفظ "جورو" سے مجھے نفرت سی ہوتی ہے

شوہر:-
برو بر تم میری جورو ہے' جورو پکاروں گا
میری دل کی مڑی ہے' دھتڑی کیا بھی پکاروں گا
کتے ان کو یہ جورو بولنے سے بھوت نفرت ہے
تمارے کو میں' جورو' نئیں تو کیا اماں پکاروں گا

بیوی:-
یقیناً آپ کی ہوں میں' پکاریں آپ جو چاہے
محل کہئے' مکاں کہئے یا میرا نام لے لیجئے
مگر یہ لفظ جورو کو زباں سے مت ادا کیجئے

شوہر:-
میں مر جاؤں گا مگر یہ نام لینا مشکل ہے
ہمارے باپ دادا نئیں کرے سو کام مشکل ہے
تمہارا نام لینے کو تو دل میں گدگدی ہو رئی ہے
تمہارا نام سوچا بھی تو دل میں کھلبلی ہو رئی ہے
تمہارے کو کوئی بچہ بھی نئیں ہوا اگر ہوتا تو
اچی بچے کی ماں بولکو تمہارے کو بلاتا تھا
مگر تم میاں کے وال پہ تم چڑھے تو ایک بھی سیڑھی
جہیز میں آئے سو کمری کی ہو گئی سا تو یں سیڑھی
محل کیسا پکاروں' محل کیسا کی دکھتا ہے
تو سے دولا دولن ہے تو محل اچھا بھی دکھتا ہے
ہماری شادی ہو کو پورے بارہ سال ہو کو ہے
ہماری زندگانی ایک بڑا جنجال ہو کو ہے
محل کیسا پکاروں' محل کیسا کی دکتا ہے
نوے دولا دولن رہے تو محل اچھا بھی دکتا ہے

محل جا کو تمیں تو گولکنڈہ کا قلعہ ہو گئے
پہاڑیوں کا تمیں نیچارہ ہل کی سلسلہ ہو گئے

"دکھڑا اپنا اپنا" حیدرآباد کے نوجوان جانے پہچانے
شاعر طالب خوندمیری جنہوں نے پیوستہ سال
"پسند اپنی اپنی" سنائی تھی اس میں کچھ نوجوانوں نے اپنی
ہونے والی بیویوں کے تعلق سے اپنی اپنی پسند کا اظہار کیا
تھا۔ اب ان کی شادیاں ہوگئیں، یہاں سے "دکھڑا"
شروع ہوتا ہے:۔

ایک دن کچھ زن مریدوں کی کہیں محفل سجی
جس میں موضوعِ سخن ہر ایک کی بیوی رہی
ایک کے بعد ایک اپنا غم بیاں کرنے لگا
اور کوئی گفتگو کرتے ہوئے ڈرنے لگا

●

اک جواں جو تھا ذرا کم کم ہی گھبرایا ہوا
سب سے پہلے یوں دبی آواز میں کہنے لگا
میں بھی اب شادی شدہ لوگوں میں شامل ہوں جناب
آپ ہی میں اپنی آزادی کا قاتل ہوں جناب
گو میری اپنی ہی محبوبہ سے شادی ہوگئی
وہ مگر پہلے ہی دن سے مجھ پہ حاوی ہوگئی
اپنے شاگردوں کی مجھ کو بھی سزا دیتی ہے وہ
گھر میں آتے ہی مجھے مرغا بنا دیتی ہے وہ

●

اور اس کے بعد اک گوشے سے آئی یہ صدا
ہے بہت پُر درد میری زندگی کا واقعہ
ایک ہی بیوی ہوئی بچے مگر بارہ ہوئے
جن میں دو تو ٹھیک نکلے باقی آوارہ ہوئے
میں تو شاعر تھا مگر شادی سے پہلے تھا مگن
ہوگیا جنجال میں جب آگئی گھر میں دولہن
قرض بڑھتا ہی گیا گھر کا مری شادی کے بعد
آگیا فٹ پاتھ پہ میں خانہ آبادی کے بعد
لکھ پتی ماں باپ کی بیٹی مری بیوی ہے آج

میرے گھر آنے سے پہلے میری محبوبہ تھی وہ
خانہ آبادی کا گویا پورا منصوبہ تھی وہ
عشق سچا تھا مرا جلدی اثر کرنے لگا
مجھ پہ وہ تو کیا اس کا باپ بھی مرنے لگا
پھر میں عاشق سے ترقی کرکے شوہر ہوگیا
رفتہ رفتہ اس کے گھر والوں کا نوکر ہوگیا
آج کل سب کام گھر کے خود ہی کرتا ہوں میں
وقت پڑ جائے تو باورچی بھی بن جاتا ہوں میں
جب کبھی جاتی ہے بیگم فلم بینی کے لئے
گھر میں بچوں کو کھلونے دے کے بہلاتا ہوں میں
جب کبھی روتا ہے منا دودھ پینے کے لئے
اپنی مجبوری پہ بل کھا کھا کے رہ جاتا ہوں میں

رات ہونے تک تھکن سے چور ہو جاتا ہوں میں
پھر اکیلا ہی کسی کونے میں سو جاتا ہوں میں

●

لیجئے اب پیش ہو رہے ہیں اس مشاعرے کے کنوینر
بوگس حیدرآبادی نے اس غزل سے سامعین کو
محظوظ کیا۔

کونسا وقت ملاقات کسے پیش کروں
دن کسے پیش کروں اور رات کسے پیش کروں
کوئی سنتا ہی نہیں دیوان لئے پھرتا ہوں
اپنی بکواس خرافات کسے پیش کروں
گھر میں بیگم تو دفتر میں ہے افسر برہم
میں پریشاں ہوں کہ صدمات کسے پیش کروں

دل ہے صرف ایک مگر اس کے طلبگار ہزار
آپ فرمائیے حضرات کسے پیش کروں ؟
ہر میں ہے مرضِ ہجر کا بیمار یہاں
دل ہے ایک زندہ طلسمات کسے پیش کروں
ڈال دوں گا کسی ہرا ج میں بوگس دل کو
کوئی لیتا نہیں سوغات کسے پیش کروں

•

اس مشاعرے میں محمّل مدراسی، مرزا اٹکلی، ڈھکن رائچوری، اسمٰعیل ظریف نے بھی اپنا اپنا کلام سنا کر سامعین سے داد حاصل کی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ٹیپ ریکارڈر کی خرابی کی وجہ سے یہ کلام اس رپورٹ میں جگہ نہ پاسکا
زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام یہ دسواں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کنوینر مشاعرہ جناب بوگس حیدرآبادی کے شکریے پر اپنے یادگار نقوش چھوڑتا ہوا یہ کہہ کر رخصت ہوا " پھر ملیں گے اگر خدا لایا "

انعامی مقابلہ

ٹائیٹل کو عنوان دیجئے

شگوفہ کے سوونیر (اپریل ۷۷ ۱۹ء) میں اعلان کیا گیا تھا کہ اِس شمارہ کے ٹائیٹل کو سب سے خوبصورت عنوان تجویز کرنے پر دو انعامات، انعامِ اوّل پچہتر روپے اور انعامِ دوم پچاس روپے دیئے جائیں گے۔

اِس انعامی مقابلہ کی آخری تاریخ ۱۰/ جون ۷۷ء ہے۔ ڈاک سے ۱۲/ جون تک عنوانات قبول ہوں گے۔

طالب خوندمیری کنوینر سوونیر کمیٹی

چہ خوب

۱۴

پرویز یداللہ مہدی

جس راز کے منکشف ہونے، جس معمّے کے حل ہونے، جس بھید کے کھلنے کے انتظار میں ہم رات بھر بے خوابی کی اذیت ناک کیفیت سے دوچار رہے جب صبح تمام پردوں کو چاک کر کے " ریزلٹ آؤٹ" ہوا تو بدن کے پائے تخت عرف شہرِ دل میں کچھ ویسی ہی کھلبلی مچ گئی جیسی کہ قتالۂ عالم قلوپطرہ کی سواری کے نکلنے پر باشندگانِ مصر کے دل و دماغ میں مچا کرتی تھی ______ ساری بستی میں جس ہستی کے تذکرے تھے چرچے تھے جب اس کا سامنا ہوا تو ہمارے سارے اندیشہ ہائے دور دراز سچے ثابت ہوئے۔ کسی کے حسن اور جوانی کے جلوؤں کے ذکر اور بھی قیامت خیز بنانے کے لئے شاعرانہ ذوق رکھنے والے اہلِ دل حضرات عموماً اسی قسم کی تک بندیوں کی پیوندکاری کرتے ہیں۔ ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا!
بات پہنچی تری جوانی تک!

یا

ذکر ہوتا ہے جب قیامت کا!
تیرے جلوؤں کی بات ہوتی ہے!

لیکن مذکورہ بالا ہستی کے آگے یہ اشعار اپنی کم مائیگی پر ساقط الجرہ ہوتے ہوئے محسوس ہوئے بلکہ ان کی جگہ یہ نیا شعر ہمارے ذہن کے بلیک بورڈ پر ابھرا۔ ؎

جس قیامت کا ذکر ہوتا تھا!
وہ تری اک ادا کا پرتو ہے!

وہ ہستی' قیامت جس کے پیکر کا اک ٹریلر کہلائی جاسکتی ہے، جس کے لئے بستی کے سربرآوردہ نوجوان خان نولادی عرف طوطا پری کے لہجے میں لگاڈٹ ہی لگاڈٹ تھی' وہ ہستی جس کے لئے شبّو کے دل میں نفرت اور آنکھوں میں بے تعلقی صاف محسوس ہوتی تھی' وہ ہستی جس کی خاطر شبّو نے اتنے سارے ڈرامے کھیلے تھے بلکہ ہمارا بوریا بستر گول کروانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا ______ وہی ہستی جو کل تک ایک راز تھی' ایک معمّہ تھی' ایک پہیلی تھی' ایک بھید تھی اب اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ ہمارے روبرو موجود تھی جس سے ہمارا تعارف حالانکہ مسز چہ خوب اور شبّو کی ممّی کی حیثیت سے ہوا لیکن

ماں اور بیٹی کی عمر میں بمشکل تمام پانچ چھ برس کا فرق ہوگا۔ بلکہ میک اپ اور لباس کی وضع قطع سے تو مسز موخوب نے خود کو شبّو کا ہم عمر ہی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ہمارے تصور میں چونکہ ان کا خاکہ شبّو کی ممّی کے روپ میں ابھرا تھا اس لئے وہ ہمیں شبّو سے بہرحال کچھ بڑی ہی نظر آئیں ـــــــ محترمہ یقیناً قبلہ چہ خوب کی دوسری غلطی تھیں جو غالباً حال ہی میں موصوف سے سرزد ہوئی تھی اگر ایسی ہر غلطی اسی طرح جاندار اور "بھرپور" ہو تو پھر آدمی کسی بھی عمر میں بخوشی ایسی غلطی کرسکتا ہے بلکہ بار بار کرسکتا ہے ـــــــ کہتے ہیں نزاکت اور ملاحت کی آمیزش سے صنفِ نازک کے حسن کو چار چاند اور سینکڑوں ستارے لگ جاتے ہیں۔ شبّو کا حسین پیکر کم از کم ہمارے لئے اس کی تابندہ مثال تھا لیکن مسز چہ خوب اس معاملے میں حسن کے اس کلیہ کو چیلنج کرتی نظر آئیں محترمہ کا ناک نقشہ اس قدر تیکھا اور چہرے کے خطوط اس قدر صحیح زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے تھے کہ ابھرا کسی کتاب میں اس قدر مکمل زاویۂ قائمہ شاید ہی نظر آئے۔ غالباً یہی وجہ تھی جو نزاکت اور ملاحت کی کمی کے باوجود محترمہ کے چہرے پر کشش اور نسوانیت مکمل اور بھرپور تھی۔ یا پھر ہوسکتا ہے چہرے کی ظاہری نزاکت اور ملاحت کی کمی محترمہ کی بھرپور جسمانی ساخت اور غضبناک نشیب و فراز کی وجہ سے پوری ہوجاتی ہو۔ ایسا "بھرپور" جسم ہم نے تو بہت کم دیکھا ہے بلکہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا معیارِ حسن جس کسوٹی پر جانچا جاتا ہے۔ محترمہ کا حسن اپنے توبہ شکن شباب کی وجہ سے اس کسوٹی پر یقیناً پورا اتر سکتا ہے بلکہ جہاں تک معیارِ حسن کے نشیب و فراز کے حدود کا تعلق ہے۔ محترمہ کے نشیب و فراز خود اپنی جگہ ایک کسوٹی ثابت ہوسکتے ہیں۔ جن کی روشنی میں عالمی مقابلہ حسن میں حصہ لینے والی حسیناؤں کے جسمانی خطوط و نشیب و فراز کو جانچا پرکھا اور تولا جاسکتا ہے ـــــــ

سر سے قدم تک کئی قیامتیں مختلف شکلوں میں ڈولتی نظر آرہی تھیں جبکہ دیکھنے والے کی عاقبت کو ڈانواڈول کرنے کے لئے نیچے سے اوپر تک صرف ایک ہی قیامت کا پایا جانا کافی سمجھا جاتا ہے ـــــــ

اگر ہم قبلہ چہ خوب کے ہم عمر ہوتے یا پھر شبّو سے بھینٹ نہ ہوتی ہوتی تو موصوف کی دوسری جاندار اور بھرپور غلطی کو دیکھ کر یقیناً ان کی قسمت پر رشک بلکہ حسد کرنے لگتے بلکہ ہوسکتا ہے اقابت کا جذبہ ہمیں ان سے ڈوئیل لڑنے پر اکسانے میں بھی کامیاب ہوجاتا ـــــــ!

ہمیں رہ رہ کر بس ایک ہی خیال کچوکے لگا رہا تھا کہ قبلہ چہ خوب کی اس مست شباب دوشیزہ اس کس بل والی ہرنی سے کہاں اور کس طرح مڈبھیڑ ہوئی ہوگی اور پھر کس مجبوری کے تحت یہ "پری" اس بوڑھے گلفام کے شیشے میں اتری ہوگی ـــــــ!

ہوسکتا ہے قبلہ چہ خوب جوانی میں واقعی گلفام رہے ہوں ویسے بھی ؎
آثار بتاتے ہیں عمارت تھی شاندار!

لیکن قدرت کی ستم ظریفی بھی بڑی عجیب ہے کہ "کاروانِ عمر" جوانی کی پُر شباب وادیوں سے گذر کر جیسے ہی "بڑھاپے کے لق و دق صحرا" میں داخل ہوتا ہے، ہر حسین "گلفام" "کلوروفام" میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ قبلہ چہ خوب جو سابقہ گلفام اور موجودہ کلوروفارم تھے یقیناً قسمت کے دھنی تھے جو شباب کی دھن دولت سے مالا مال بلکہ لبریز پیمانے کے تمام تر حقوق ملکیت بلا شرکت غیرے انہی کے نام تھے۔
مسز چہ خوب سے تعارف اور دعا سلام ہوچکا تھا۔ اس دوران میں ہم محترمہ کے ظاہری رنگ روپ

خاصہ جائزہ بھی لے چکے تھے۔ بلکہ دلِ نابکار تو اور بھی گہرائی و گیرائی سے محترمہ کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کو مچل رہا تھا۔ دلِ ناخلف کو اس نامعقول حرکت سے باز رکھنے کے لئے ہم نے اپنی تمام تر توجہات منہ چڑھ خوب کی طرف سے ہٹا کر شبّو کی طرف منتقل کر دیں۔ شبّو کے چہرے پر ناگواری کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی۔ ناگواری کی یہ تہہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ جب جب بھی شبّو نے کسی مجبوری کے تحت منہ چڑھ خوب کا تذکرہ کیا، یا شبّو کے سامنے کسی نے اس ذکر کو دہرایا، تمام تر ضبط کے باوجود ناگواری کی اسی تہہ کو ہم نے ان کے سارے چہرے پر مسلط پایا ہماری ناقص سمجھ کے اعتبار سے ناگواری کی یہ تہہ دراصل سوتیلے پن کا وہ کربناک اور نفرت انگیز احساس ہے جو شبّو اور ان کی ہم عمر ممّی کے درمیان کسی زہر میں بجھی تلوار کی طرح لٹکتا رہتا ہے اور ہمیشہ لٹکا رہے گا ـــــــ لیکن فی الحال یہ تلوار ہمیں اپنے سر پر لٹکتی محسوس ہوئی۔ قبل اسکے کہ یہ تلوار ہم پر وار کرتی توپ کا گولہ چھوٹا یعنی قبلہ چڑھ خوب چراغ کے جن کی طرح اچانک نمودار ہوئے۔ میں نے کہا، "بیگم! ذرا اپنے برادرِ عزیز کی چڑھ خوب ملاحظہ فرمائیے"۔ موصوف کے بھاری بھرکم لہجے میں غصّے کی گھن گرج بھی شامل تھی۔ اتنا کہہ کر موصوف کے پیچھے بیگم چڑھ خوب موصوف جس راستے سے آئے تھے اُسی راستے سے باہر نکل گئے۔

شبّو اور ہم بھی آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر نکلے۔ برادرِ عزیز کے ذکر پر یاد آیا کہ قبلہ چڑھ خوب نے بیگم چڑھ خوب کی آمد کے بارے میں بتاتے ہوئے۔ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے ایک عدد نامعقول کی آمد کی بھی اطلاع دی تھی جس کے بارے میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے شبّو نے گرہ لگائی تھی کہ یہ "نامعقول" بیگم چڑھ خوب کا کزن" ہے اور شاعری کی بیماری میں مبتلا ہے بلکہ شاعری کم کرتا ہے اور تخلص زیادہ بدلتا ہے ـــــــ

جب ہم قبلہ چڑھ خوب کی سرکردگی میں برآمدے میں پہنچے تو ایک عجیب و غریب منظر کو اپنا منتظر پایا۔ ایک بوڑھا جو وضع قطع اور لباس کی تراش خراش سے پہاڑی معلوم ہوتا تھا۔ ایک جوان العمر خوش نشین اہلِ شہری کا گریبان مضبوطی سے پکڑے ہوئے اپنی زبان میں کچھ ارشاد فرما رہا تھا۔ بوڑھے کے چہرے کے تاثرات اور لہجے کی گرمی سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اُس "نامعقول" کی شان میں قصیدے نہیں پڑھ رہا ہے پاس ہی ایک نوجوان پہاڑن بھی نظر آئی۔ جو یقیناً اس پہاڑی کی بیٹی رہی ہوگی۔ لڑکی بھی نامعقول پر برافروختہ نظر آتی تھی۔ البتہ قبلہ چڑھ خوب اور ہم لوگوں کی موجودگی نے شائد اسے پاس لحاظ کرنے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ پہاڑن کا جثہ اور ہاتھوں کی بناوٹ بتاتی تھی کہ نامعقول "جیسے درجن بھر نوجوانوں کو ایک ساتھ دن میں تارے اور رات میں سورج دکھا سکتی ہے۔ بوڑھا بھی غم و غصّے کی شدت کے باوجود حدِ ادب کو ملحوظ رکھنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا ہم لوگوں کو دیکھتے ہی اس نے نامعقول کا گریبان چھوڑ دیا تھا۔ قبلہ چڑھ خوب کا چونکہ بستی کے ذی اثر لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس لئے بوڑھے کا اشتعال حد سے آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔ اس نے بڑے ہی ادب سے قبلہ چڑھ خوب کو مخاطب کیا ـــ "نیاب صاحب!

یہ جھینگر کی اولاد کیا آپ کا ناطے دار ہے ـــ؟"

"ہاں، ہاں یہ نواب صاحب کے سالے ہیں" قبلہ چڑھ خوب سے پہلے بیگم چڑھ خوب بول اٹھیں ـــ

"مگر چچا خوب! اس نامعقول نے آخر کیا کیا ـــ؟" موصوف بڑے اضطراب کے عالم میں بولے۔
"یہ اُبلا ہوا آلو ہماری چھوکری کو 'ساعری' سنانے چلا تھا"۔ بوڑھا منہ بنا کر بولا پھر اپنی بیٹی سے مخاطب ہوا ـــ "کیا بھنبھارہا تھا یہ مکھی کی اولاد ذرا بتا نا تو نباب صاحب کو ـــ!"
پہاڑن چھوکری جیسے اشارے کی منتظر تھی آگے بڑھ کر جلے کٹے لہجے میں بولی ـــ "یہ رانجھے کا ناطے دار کہا تھا ہاتھ تھام لو میرا ـــ اور ـــ اور آگے کیا بولا۔ برو بر یاد تو نہیں ہاں او بولا.... نام لو میرا...؟" "ارے ارے کم بخت... شعر کے زاویئے اور پیمانے کا خون کر دو تُو نے اس نامعقول نے اطراف واکناف کی پرواہ کئے بغیر جھٹ سے مداخلت کی ـــ "ہر شعر کا اپنا ایک زاویہ ہوتا ہے پیمانہ ہوتا ہے۔ صحیح شعر یوں ہے ـــ

بہت حسین ہو تم ہاتھ تھام لو میرا!
کسی نے پوچھا اگر کچھ تو نام لو میرا!

"خاموش بے وقوف، پاجی، چچا خوب گدھے ـــ" قبلہ چچا خوب غصہ سے کانپنے لگے۔
"آداب عرض! تسلیمات۔ "وارنش" ـــ!" نامعقول کمر تک خمیدہ ہو کر سلام جھاڑنے لگا۔ ہم نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ وارنش سے کیا مراد ہے کیا بکی؟"
"وارنش ـــ! وارنش کہا میں نے وارنش یعنی وہ جو اسی زاویئے اور پیمانے میں ایک اور قافیہ آتا ہے کیا کہتے ہیں اُسے کورنش، کورنش بجالانا...؟" اس وضاحت کے ساتھ نامعقول اس طرح کورنش بجالانے لگا جیسے ہم لوگوں نے واقعی اس کے کسی شعر پر داد دی ہو ـــــ اور وہ جواباً کورنش بجالا کر اس داد کا حق ادا کر رہا ہو ـــــ! اس کی اسی نامعقول حرکت پر قبلہ چچا خوب ایکدم ہتھے سے اکھڑ گئے اور انہیں یوں بے قابو ہوتا دیکھ کر بڑھا پہاڑی اور اس کی بیٹی نے جھک کر سلام کرتے ہوئے اُلٹے قدموں سے دروازے تک کا فاصلہ طے کیا اور باہر نکل گئے۔ اِدھر قبل اس کے کہ قبلہ چچا خوب کا چڑھا ہوا پارہ، تھرمامیٹر کو توڑ کر باہر نکل آتا بیگم چچا خوب نے باسی کڑی کے اسی بوڑھے اُبال کو اپنی پُر شباب اداؤں اور لچھے دار طرز گفتگو سے کچھ اس طرح دبا دیا کہ موصوف کا سارا غصّہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ موقع کی اس نزاکت سے فائدہ اٹھا کر ہم اور شبّو اُس نامعقول سمیت وہاں سے ہٹ گئے ـــــ!!

"ملاحظہ فرمایا آپ نے میرا کارنامہ ـــ؟" نامعقول نے فخریہ لہجے میں کہا۔
"کیا کہنے صاحب" آپ اسے صرف کارنامہ کہتے ہیں یہ تو "ٹرک نامہ" ہے بلکہ "بُل ڈوزر نامہ" ہے ـــ!" ہماری یہ پھبتی ہوئی چوٹ اُس بے وقوف کے سر سے گذر گئی البتہ شبّو نے ایسی توصیفی نظروں سے ہماری طرف دیکھا جیسے لفظ "کارنامہ" میں "کار" کی جگہ "ٹرک" اور "بُل ڈوزر" فٹ کر کے ہم نے واقعی زبان وادب، پر احسان عظیم کیا ہو۔ وہ نامعقول بولا ـــ "جناب والا میں نے عہد کیا ہے کہ اُردو زبان اور اسکے شعر و ادب کو تمام تر زاویوں اور پیمانوں کے ساتھ عوام الناس تک پہنچاؤں، چنانچہ میرا یہ تازہ ترین کارنامہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا..."
"واہ واہ صاحب! آپکے اس جذبے کی تو اعلیٰ پیمانے پر قدر کی جانی چاہیئے" ہم نے فوراً

لقمہ دیا ——— "عام لوگ اپنی زبان اور اسکے ادبی ورثے کو بھولتے چلے جا رہے ہیں' ادب شعر و ادب صرف شاعروں اور ادیبوں تک ہی محدود رہ گیا ہے' ایسے ناسازگار اور نازک وقت میں آپ کی یہ کوشش قابلِ صد ستائش ہیں ——"

"نوازش ہے حضور آپ کی' کرم ہے آپکا ورنہ آج تو ہر شخص کی سوچوں کے زاویئے اور پیمانے بدل چکے ہیں۔" بات ختم ہونے ہوتے اس کا لہجہ شکایتی ہوگیا ہم نے بات کو ایک اور پلٹا دینے کی غرض سے پوچھا ——— "ویسے حضور جس شعر کے ذریعہ آپ نے اُردو ادب کے ورثے کو اس جاہل پہاڑن تک پہنچانے کی کوشش کی وہ آپ ہی کی مشقِ سخن کا نتیجہ ہے" ۔ "مشق کسی نے بھی کی ہو حضور سخن فہم ہونے کے ناطے مشقِ سخن کے ہر نتیجہ میں اپنا بھی برابر کا حصہ ہوتا ہے" وہ بڑے ٹھوس بلکہ اٹل لہجے میں فرمانے لگا: "آپ کسی اور زاویئے اور پیمانے سے کوئی چیز کہتے ہیں میں کسی اور زاویئے اور پیمانے سے اسے پرکھتا ہوں اور دیکھتا ہوں اور پھر پسند آنے پر اسے اپنا لینے کا پورا پورا حق رکھتا ہوں' شعر و ادب کا ورثہ اسی طرح تو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے" نامعقول کی اس دلیلِ نامعقول پر سر پیٹ لینے کو جی چاہا ہم نے اردو زبان اور اس کے ادبی ورثے کی عافیت کی خاطر فوراً موضوعِ گفتگو کو بدل کر سیدھے اس کی ذاتیات پر اُتر آئے ۔

"جناب کی تعریف ابھی تک نہیں معلوم ہوسکی ۔ تاہم اتنا یقین ضرور ہے ۔ کہ دماغ بلند و بالا ہوگی ہمارے اس چاپلوسانہ اندازِ بیان پر تو وہ نامعقول ریشہ خطمی ہوگیا بلکہ خوشی سے اس مینڈک کی طرح پھول نے لگا جو "بیل" کے برابر ہونے کی کوشش میں بالآخر پھٹ گیا تھا۔ سچ پوچھئے تو اس نامعقول کا جُثہ کسی مینڈک ہی سے شابہ تھا ۔ ٹھگنا قد' پھولے پھولے ہاتھ پاؤں' چھوٹی چھوٹی سیپوں کی سی چمکدار آنکھیں اور اس پر موٹے فریم کا محدّب شیشوں کا چشمہ' غبارے کی طرح پھولے ہوئے گال چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی ، جسے ہماری طرف عرفِ عام میں "چگر" کہتے ہیں ——— قد کے اعتبار سے سر بے حد بڑا لیکن عقل اس مناسبت سے نہیں معلوم ہوتی تھی البتہ لباس بے حد نفیس اور جدید وضع کا تھا ۔

ہمارے چاپلوسانہ انداز پر کافی دیر تک شرمانے کے بعد چہرے پر "پھکارانہ یاسیت" طاری کرتے ہوئے بڑے ہی گمبھیر لہجے میں بولا "میں بہت ہی پامال اور ٹھکرایا ہوا آدمی ہوں ' احساس کمتری نے میرے وجود کے سارے زاویوں اور پیمانوں کو یوں اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے جیسے ایک شاطر مکڑی کسی بے وقوف مکھی کو اپنے جالے میں پھانس کر الجھا لیتی ہے' خلوصِ دل کے تمام تر زاویوں اور پیمانوں سے کی ہوئی تعریف میں بھی مجھے خواہ مخواہ تذلیل کے پہلو نظر آنے لگتے ہیں آدمی کا بہت زیادہ سینٹی مینٹل (Senti. mental) ہونا بھی ایک عذاب ہے ۔

"جی ہاں ——— آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ——" شبّو نے غالباً بور ہوکر مداخلت کی پھر اسی کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے آگے کہا —— "آدمی چاہے سینٹی مینٹل ہو یا صرف "مینٹل" (Mental) یہ دنیا کسی زاویئے اور پیمانے سے اس کے لائق نہیں ——" لفظ "مینٹل" ادا کرتے وقت شریر شبّو نے اپنی شہادت کی اُنگلی کا رُخ کنپٹی کی طرف ——— کرتے ہوئے اسے گھمایا جسے وہ نامعقول شاید دیکھ نہیں سکا ۔ اس لئے چہک کر بولا "میں تمہارے اس خیال سے اپنے تمام تر زاویوں اور پیمانوں کے ساتھ صد فی صد متفق ہوں ———"

"اگرچیکہ میرے زاویئے اور پیمانے قدرے مختلف ہیں لیکن مجھے آپ دونوں کے اس خیال سے

کلیتہً اتفاق ہے ۔" ہم نے دو ہم خیالوں کے بیچ اپنے خیال کی ٹانگ اڑانے کی کوشش کی اور مزید کہا ۔ آپ دونوں کے اس خیال کی روشنی میں لفظ "تعریف" کو واپس لیتے ہوئے گزارش کرتا ہوں کہ حضور والا اپنا سیدھا سادا سا تعارف پیش کریں ۔۔"

"ناچیز کو ا'ب'ت'ث بے دھڑک شکارپوری کہتے ہیں ۔۔"

اس انکشاف پر ہم نے اسے سر سے پیر تک حیرت سے دیکھا کہ واقعی آدمی کا بچہ ہے یا ا'ب کی تختی والا بولتا قاعدہ ۔۔ ہماری یہ حیرت فوراً زبان پر بھی آگئی ۔۔" ا'ب کی یہ تختی کوئی نئی ڈگری تو نہیں ؟"

"نہیں حضور یہ ڈگری نہیں بلکہ شارٹ فارم یعنی مخفف ہے خاکسار کے نام کے زادِ تیے اور پیمانے کا یعنی احمد بدرالدین تسکین ثناءاللہ بے دھڑک شکارپوری ۔۔"

"یہ آپ کا نام ہے یا خاندانی شجرہ ۔۔؟" شبو نے چوٹ کی ...

"جی نہیں صرف میرا نام ہے وہ خم ٹھوک کر بولا خاندانی شجرے کے زادِ تیے اور پیمانے تو اس قدر طویل و عریض ہیں کہ خود مجھے یاد نہیں رہتے ۔۔" ہم نے حسبِ عادت حملہ کیا ۔۔" ویسے جناب آپ جب بھی اپنے نام پر غور فرماتے ہوں گے یقیناً چچا غالب کا یہ مصرعہ دہراتے ہوں گے کہ ؎

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا

"ارے حضور کہاں میں اور کہاں چچا غالب ' ان کے زادِ تیے اور پیمانے سارے زمانے میں مستند اور میرے زادِ تیے اور پیمانے ابھی کچے پکے ..." وہ بڑی ہی خاکساری سے بولا ..." ناچیز کے بارے میں تو آپ نے بہت کچھ جان لیا یعنی چراغ کو سورج نے دیکھ لیا اب ذرا چراغ کو بھی سورج کے دیدار سے مشرف فرمائیے ۔۔۔"!

"خود کو چراغ اور ناچیز کہہ کر آپ اپنی بے قدری کر رہے ہیں بالکل اس مرغ کی طرح جسے کچرے کے ڈھیر میں "موتی" مل گیا تھا ' لیکن بھوک کے مارے مرغ نے اس موتی کو واپس کچرے کے ڈھیر میں پھینک کر حسرت سے سوچا کاش اس موتی کے بجائے جوار کا ایک دانہ مل گیا ہوتا ۔ ہیرے کی قدر تو جوہری سے پوچھئے ۔۔" ہم نے بظاہر بڑی چاپلوسی سے کہا حالانکہ نہ ہم جوہری تھے اور نہ وہ نامعقول 'ہیرا" لیکن بات چونکہ شروع کر چکے تھے اب اسے ختم کرنا ضروری تھا اس لئے مزید کہا:"اپنے آپ کو ناچیز مت کہئے آپ تو بہت بڑی چیز ہیں بلکہ جس طرح کچھ شخصیتیں اپنی ذات میں انجمن ہوتی ہیں اُسی طرح آپ کی ناچیز ذات کے اندر کئی معرکۃ الآراء چیزیں پوشیدہ ہیں بس دیکھنے والی نظر چاہئے. میری مانیئے تو اپنے چشمے کا نمبر چیک کروائیے !" ہمارے اس نئے حملے پر وہ پھر شرمانے لگا ۔ شبو نے کمالِ ضبط سے اپنے بے ساختہ قہقہے کو صرف مسکراہٹ تک محدود رکھا ۔ جب اس کا شرمانا ختم ہوا تو پھر تعارف کی گردان کرنے لگا ۔ اس اثناء میں ہمارا بھی حاضر موڈ بن چکا تھا اسی لئے ہم اپنی مخصوص ترنگ میں شروع ہوگئے ۔۔" اس حقیر فقیر پُر تقصیر کا مختصر سا تعارف بس یہی ہے کہ خدوی س' ش' ط' ظ نامعلوم کے نام سے دوستوں میں عام اور دشمنوں میں بدنام ہے ۔۔"

ہمارے اسی بھرپور جوابی حملے سے شبو بے حد محظوظ ہوئیں البتہ بے دھڑک کی چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھوں میں گھڑی بھر کے لئے ایک عجیب و غریب چمک لہرائی جسے ہم کوئی نام نہیں دے سکے ۔

ہونقوں کے سے انداز میں بولا ـــــ " اگر بارِ خاطر نہ ہو تو ذرا اپنے نام کے زاویئے اور پیمانے کی وضاحت کر دیجئے ـــــ "

" مزدور مزدور ـــــ " ہم نے فوراً حکم کی تعمیل شروع کر دی ـــ " س، ش، ظ، نا سے مراد ہے سعید شہزاد طُرّل ظالم نا معلوم ـــ ظالم اور نا معلوم خاکسار کے تخلص ہیں ـــ "

" اُردو شاعری میں جتنے بھی شعر کسی نا معلوم شاعر سے منسوب ہیں وہ تمام شعر آپ ہی کے ہیں ـــ ؟" اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

" جی ہاں ـــ !" ہم نے قدرے سر جھکا کر اقرار کیا۔ بس ہمارے اقرار کرنے کی دیر تھی اسی نا معقول کی آنکھوں میں حیرت واستعجاب مسرّت و عقیدت کے نہ جانے کتنے رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے اس نے اچانک آگے بڑھ کر ہمارا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر اُسے بے ساختہ چوم کر بولا ـــ "

" اِس قدر اُستادانہ شعر کہنے کے باوجود آپ نے گمنامی کے اندھیرے کو پسند فرمایا واقعی آپ اُستادِ سُخن ہیں ـــ "

اس کی آواز مسرّت اور عقیدت سے کانپنے لگی۔ اس نے پھر ایکبار جھک کر ہمارے ہاتھ کی پُشت پر بوسہ دیا۔ ہم نے آہستگی سے کہا میں داہنے ہاتھ سے نہیں بائیں ہاتھ سے لکھتا ہوں ـــ "

ہماری اس کاری چوٹ پر شبّو کو غالباً اپنا قہقہہ روکنا مشکل ہو گیا تھا چنانچہ وہ تیز قدموں کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ اور وہ نا معقول ہونقوں کی طرح کبھی ہمارے چہرے کی طرف اور کبھی اس دروازے کی طرف دیکھتا رہا جس سے شبّو باہر گئی تھیں ـــــــ !!!

(باقی آئندہ) ▲▼

خرافات

(مراسلے)

عزیزی حمایت سلمہٗ

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے ہمدم دیرینہ مرحوم سرور ڈنڈا کی یاد کے جلسے کے لئے مجھے اپنے تاثرات بھیجنے کی فرمائش کی ہے۔ آپ کی اس فرمائش کی تعمیل میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ میرا مقدس فریضہ بھی ہے چنانچہ آپ کا خط مجھے شام کے ۵ بجے ملا اور میں نے رات میں یہ چند سطریں تحریر کر دیں۔ اگر یہ خط بروقت آپ کو مل جائے اور آپ چاہیں تو اسے جلسے میں میری طرف سے بطور نذرانۂ عقیدت پڑھ کر سنا دیجئے۔ یہ مجھ پر احسانِ عظیم ہوگا۔

سرور ڈنڈا کو مرحوم لکھتے ہوئے قلب و دماغ اور دست و قلم کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے کیونکہ وہ بہت جلد ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ اللہ پاک ان کی روح کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین سرور ڈنڈا کے نام کے ساتھ گزشتہ پچیس ۲۵ برسوں کی خوشگوار یادیں تصور کے پردۂ سیمیں پر اجاگر ہو کر کچھ دیر کے لئے کراچی سے حیدرآباد پہنچا دیتی ہیں۔

سرور ڈنڈا کو مرے ہوئے شاید دو تین سال ہوئے ہوں گے لیکن میرے حق میں تو وہ آج سے ۱۲ سال پہلے ہی مر چکے تھے جب میں اگست ۱۹۶۴ء میں آخری بار اُن سے ملا تھا۔ وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے اُس گروہ میں شامل تھے جس میں فائن آرٹس اکیڈمی کے جیالوں کے علاوہ نوجوان فن کار، شاعر اور ادیب بھی شریک تھے۔ فائن آرٹس اکیڈمی کے زیر اہتمام ادبی اور ثقافتی کانفرنس میں دکنی لوک گیت، موسیقی، ڈراما اور مشاعرے کے جو پروگرام پیش کئے جاتے تھے۔ اُن میں سرور ڈنڈا بڑی دلچسپی و انہماک سے حصّہ لیتے تھے۔ کئی دن پہلے سے اقبال قریشی، حمایت (چھوٹے نواب)، وٹھل ممتاز، ابن احمد تاب، خیرات ندیم، سلیمان اریب، قمر ساحری، رشید موسوی، میگھا دتی، عطیہ ڈلعن، صفیہ، طلبہ رحمت اللہ اور کئی لوگ جن کے نام اب یاد نہیں آرہے ہیں، میرے گھر پر ریہرسل کے لئے اکٹھا ہوتے تھے اور کئی شامیں دھما چوکڑی میں گزر جاتی تھیں۔ اب اُن دنوں کی یاد آتی ہے تو دل بے قرار ہو جاتا ہے۔

سردر ڈنڈا نہ صرف ایک اچھے شاعر بلکہ ایک اچھے ساتھی اور انسان دوستی کے شیدائی تھے اُن کو دکنی زبان میں شعر کہنے پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے عوامی مسائل کو عوام کی زبان میں پیش کر کے ساری قوم میں احساس و بیداری کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔

حیدرآباد کی کوئی محفل شعر و سخن ایسی نہیں تھی۔ جس میں سردر ڈنڈا کا کلام بڑے شوق سے نہ سُنا جاتا تھا۔ اور تعریف و تحسین کے نعروں سے محفل گونج نہ اُٹھتی۔ عوام اور خاص طور پر دکن کے دیہاتوں میں رہنے والوں کی زبان میں شہر والوں کی زندگی کا خاکہ اڑانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اِن کی شاعری اِن کے اپنے دور کی آئینہ دار ہے جس میں ان کے گرد و پیش کے ماحول کی ہر تصویر کے خط و خال نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے خیالات اور جذبات بالکل سچے اور اسلوب زبان و بیان اتنا سادہ اور عام فہم ہوتا ہے کہ بچہ، جوان، بوڑھا، مرد، عورت، پڑھا لکھا اور اَن پڑھ ہر ایک اُن کے کلام سے محظوظ اور مستفید ہوتا ہے۔ چونکہ ان کی شاعری میں صداقت اور انفرادیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس لئے اُن کا نام اور کام زندہ ہے اور اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اردو زبان اور اس کے بولنے والے زندہ ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ اُن کا کلام کتابی صورت، میں شائع ہوا بھی ہے کہ نہیں۔ اگر شائع نہیں ہوا ہے تو اس یادگاری جلسے میں اس کی طباعت و اشاعت کے لئے فنڈ فراہم کر کے جلد از جلد شائع کر دینا چاہیئے تاکہ ایک جوہر قابل کی تخلیقات، زمانے کی دست برد سے محفوظ ہو جائے۔

میں اُن کے بعض اشعار جو رسالوں وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ پڑھتا ہوں تو بے حد لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اِن میں سے چند اشعار آپ کی ضیافت طبع کے لئے پیش کر رہا ہوں:

ہوکر برباد اُن کے ہاتھاں سے
اب بھی اُن کا خیال ہے سو ہے
اُن کی قسمت میں مُرغی اور مچھی،
میری قسمت میں دال ہے سو ہے
جب بھی چاہیں گے رنگ بدلیں گے
یّتا ہم میں کمال ہے سو ہے
ایسے روشن زمانے میں ڈنڈے
اَیو الفت کا کال ہے سو ہے

ان اشعار میں کتنا بھرپور طنز ہے:

جاں جینے پو ٹکساں جاں مرنے پو ٹکساں
جاں جنور سے بدتر ہیں بے چارے انساں
جاں ملنا بھی مشکل ہے بیڑی کے دو دَم
ادے نا ما دیشم، ادے نا ما دیشم

پولیس کی ڈائری میں   ڈنڈے کی شاعری میں
فلُ اسٹاپ ہے نہ کاما
سنجوا ریڈی ماما، سنجوا ریڈی ماما

آج کل سیاست کی تعریف کیا ہے؟ آیئے سردر ڈنڈا کی زبان سے سُنیئے:

تعریف سیاست کی مَرَف اِتّی ہے یارو
جس کو ملیا موقع اُنے دھول جا نا

سیاست والوں کو اس شعر میں متنبہ کیا ہے:

کھیل سیاسی کھیلنے ہارے
شام صبح چت پٹ نکورے

اس شعر میں امن کا پرچار اور جنگ کی مذمت کی ہے:

امن کی باتاں امن سے کرنا
ہاتھ میں برچھی لٹ نکورے

سردر ڈنڈا کی شاعری پر تبصرہ کرنے کا میں اہل نہیں ہوں۔ یہ کام آپ کے دانشور اور نقاد کریں گے۔

میں توان کا دوست ہوں اور اپنے ایک بچھڑے ہوئے دوست کی یاد میں عقیدت ومحبت کا نذرانہ پیش کر رہا ہوں۔ (حمیدالدین شاہد۔ کراچی)

ایوان اردو، کراچی ۔ ۱۹/اکتوبر ۷۶ء
شگوفہ پابندی سے مل رہا ہے ۔ تخلیقات کی رنگا رنگی کے ساتھ خوشبو کا سحر مجھے آپ تک پہنچا دیتا ہے . . . مزاحیہ ڈرامہ نمبر کی جدت بھی کمال کی ہے ۔ کہاں کہاں کی سوجھ لے آتے ہیں۔ میری طرف سے پیشگی مبارکباد قبول فرمایئے ۔ اس نمبر کی کامیابی کے لئے دُعاگو ہوں۔

مناظر عاشق ہرگانوی

مارچ کے شگوفہ میں زندہ دلان حیدرآباد کا سالانہ اجتماع کا اعلان دیکھ کر جی مچل گیا کہ جب پٹنہ میں اتنا شاندار جشن آپ لوگوں کی وجہ سے ہوا تو خود حیدرآباد میں کتنا شاندار پروگرام ہوگا۔ اجتماع کی شاندار کامیابی کے لئے میری دُعا ہے۔

تمنا مظفرپوری

شگوفہ کا سالنامہ ملا ۔ اس دفعہ آپ نے بہت اچھے ناموں کے ساتھ ساتھ انتہائی دلچسپ اور معیاری مزاح پیش کیا ہے ۔ طنز بھی گوارا ہے پٹنہ کا جشن منظوم رپورتاژ کی وجہ سے نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ بڑے دل گردہ والے لوگ ہیں پٹنہ کے . . . . ڈرامہ نمبر کا اعلان پڑھا۔ خدا نظر بد سے بچائے ۔ خاص نمبر پر خاص نمبر نکالے جا رہے ہیں ۔

فضل جاوید، بھوپال

شگوفہ کا مطالعہ بدستور کر رہا ہوں۔ پرچہ یقیناً روز بروز نکھرتا جا رہا ہے ۔ تازہ شمارہ کو دیکھ کر اس بات کی خوشی ہوئی کہ آپ عنقریب شگوفہ کا مزاحیہ ڈرامہ نمبر نکالنے جا رہے ہیں ۔

شبنم قیوم، سوپی نگر

"شگوفہ" اداس اور دکھ بھرے جیون کو زندگی کی چہل پہل میں تبدیل کر دینے والا رسالہ ہے ۔ طنز وظرافت کے لئے پورے ہندوستان میں قابل تعریف ہے ۔ دل بہلانے کے لئے ایسے رسالے زندگی کا کام کرتے ہیں ۔

اطہر حسین پیردی، بہار

شگوفہ کا عرصہ ایک سال سے برابر مطالعہ کر رہی ہوں۔ طنز ومزاح پر شائع ہندوستان کا یہ واحد رسالہ ہے ۔ لیکن بہت کم مٹیریل ہوتا ہے۔ بہت جلد سماپت ہو جاتا ہے۔ سالنامہ بہت پسند آیا تھا۔

سہانہ حمید شمسی، نینی تال

شگوفہ کی روزافزوں ترقی دیکھ کر دل مسرت سے جھوم اٹھتا ہے ۔ خدا اسے نظر بد سے بچائے ۔

آفتاب احمد، گیا

مارچ کا شگوفہ باعرہ نواز ہوا ۔ پرچہ بہت اچھا ہے ۔ مضامین بھی اچھے ہیں ۔ نظموں میں خاص طور پر جوہر سیوانی کی نظم پسند آئی . . . . آپ کا رسالہ بلکہ ہمارا روزافزوں ترقی پذیر ہے ۔ اس سے خوشی ہوتی ہے ۔

قسیم الحق، گیا

میں نے آسنسول سے آتے ہوئے اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے ہاتھ میں مارچ کا شگوفہ دیکھا مطالعہ کا اشتیاق بڑھا تو میں نے اس رسالے کو پڑھنا شروع کیا۔ شگوفہ پڑھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ مجھے تعجب ہے کہ ایسے معیاری رسالے سے میری نظر اتنے دنوں تک محروم رہی ۔ آپ کے اس مزاحیہ اور طنز یہ رسالے کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہ ایک ایسا گلدستہ ہے ۔ جس میں ادب کے رنگارنگ پھول آپ کے انتخاب اور ادبی صلاحیت کے آئینہ دار ہیں ۔ اس شمارے میں جناب جوہر سیوانی کی نظم

"جیتے کو کوئی ہار ے" ایک مثالی شعری تخلیق ہے جس نے میرے ذہن کو بے حد متاثر کیا۔ ...

ایس۔ ایم۔ نعمانی، گوپال گنج

شگوفہ کا پچھلا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہترین اشاعت کے لئے مبارکباد قبول فرمائیے۔

شارق آفتابی، اکولہ

پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

(اداریہ)

زندہ دلانِ حیدرآباد کی دسویں سالانہ تقاریب ہر سال کی طرح اہتمام کے ساتھ منعقد ہوئیں ملک کے ممتاز مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں نے ان تقاریب میں شرکت کی۔ ان تقاریب کی تاریخوں کا تعین مارچ کے شمارہ کی اشاعت کے بعد ہوا۔ اس لئے اپریل کا شمارہ اعلان کے بغیر سوونیر میں تبدیل ہوگیا تھا۔ مشاعرہ اور ادبی اجلاس میں سُنایا گیا کلام اور بعض مضامین زیرِ نظر شمارہ میں شریک ہیں۔

اُترپردیش اُردو اکیڈیمی نے ممتاز مزاح نگار جناب خواجہ عبدالغفور اور جناب مسیح انجم کو ان کی تصانیف "گل و گلزار" اور "درپردہ" پر ایک ایک ہزار کے گراں قدر انعام سے نوازا ہے ہم محترم خواجہ عبدالغفور اور جناب مسیح انجم کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

،، زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

مجلسِ ادارت

یٹر : سید مصطفیٰ کمال ایم۔اے (عثمانیہ)

★ منظور احمد ★ حمایت اللہ ★ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت : راجندر سنگھ بیدی ٭ بھارت چند کھنہ ٭ خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر ٭ مجتبیٰ حسین

کچھ صفحات : سلام خوشنویس، نزد مسجد کلیہ، یاقوت پورہ، حیدرآباد ۲۳ ٭ جنرل منیجر : ممتاز احمد

طباعت : اعجاز پرنٹنگ، چھتہ بازار، حیدرآباد (براشتہ) نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ حیدرآباد۔

بائنڈنگ : محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو دربارِ حسینی،
پرانی حویلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

، (۲۰) روپے

بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ

انہ انفرادی (۱۵) روپے

یہ : ایک روپیہ ۵۰ پیسے

جلد (۱۰) ○ جون ۱۹۷۷ء ○ شمارہ (۶)

شگوفہ ۳۱ر مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (اے، پی)

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

خواجہ عبداللہ

تجدیدِ لغات

آدمی ـــــ آدم سے آدمی بنا جس کو میسر نہیں انسان ہونا اس لئے کہ حوّا نے ساتھ نہیں دیا۔

آرٹ ـــ فنونِ لطیفہ جیسے جھوٹ، غیبت، تہمت

آمدنی ـــ وہ جو انکم ٹیکس لے لے اور ٹیکس چھوڑ دے۔

ادیب ـــ محض قلم کار جو اپنے آپ کو بادب اور دوسروں کو بلاحظہ دیکھتا ہے۔

باپ ـــ بچوں کا والی جس کا فرض ہے کہ بچوں کا نام روشن کرے صاحب خانہ لیکن گھر والی کا ـــ تابعدار۔

بچے ـــ اللہ کی دین کسی کی مہربانی۔ لیکن زیادہ ہوں تو ماں باپ کے بہت سارے سرکاری حقوق چھن جاتے ہیں۔

بیوی ـــ بیوہ ہونے پر ہی گھر کی مالکن بنتی ہے۔

برسات ـــ ہندوستانی فلموں میں پریم کے پینگ بڑھانے کا موسم۔

بوسہ ـــ منہ در منہ بات چیت یا بلا رجیت۔

پڑوسی ـــ وہ جو اپنا حق تو ہمیشہ جتاتا ہے لیکن اپنا فرض جانتا ہے نہ آپ کا حق ادا کرتا ہے۔

تکرار ـــ جب دلیل و حجت سے کام نہیں بنتا تو اس پر اتر آتے ہیں۔

تشریف "آوری" منشوں کا کام اور تشریف لے جانا گھنٹوں کی بات

تنخواہ ـــ جو غراہ تنخواہ ملتی ہے لیکن تن پر نہیں قرض کی ادائی میں خرچ ہوتی ہے۔

تفریح ـــ تُف زیادہ فرحت کم

جوتا ـــ نوکری کی تلاش اور محبوب کی جستجو میں چٹخایا جاتا ہے اور نازک موقعوں پر چل جاتا ہے۔

جوتشی ـــ جو تش جانتا ہے لیکن ماضی اور مستقبل سے بے خبر۔

حاضر جوابی ـــ وہ منہ توڑ جواب جو حاضری میں نہیں بلکہ بعد میں سوجھتا ہے کہ جب منہ توڑنے کا موقعہ نہیں رہتا۔

دوست ـــ جو اپنی مصیبت کا ساتھی آپ کو بناتا ہے اور پھر کسی مصیبت میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

زبان ـــ کبھی دراز کبھی زدِ عام، مادری زبان تو کبھی بد زبان اور اکثر تو یہ کسی کسی کے منہ میں ہوتی ہی نہیں۔

شیخ چلی ـــ اس میں شیخی ہوتی ہے خیالی پلاؤ کھاتا ہے ہوائی قلعہ میں رہتا ہے۔ ریت کے محل بناتا

ہے۔ سمندر کی لہروں پر جیتا ہے۔

عمل ـــــ ملاّ ردِ عمل کا محرک ہوتا ہے۔

عشق ـــــ حسن ظن کا حسن ظن

ظریف ـــــ سب سے بڑا وہ، جس کا ظرف اتنا بڑا ہوتا ہے کہ وہ خود کو نشانۂ ملامت بنا سکتا ہے۔

نابالغ ـــــ جو بے ضرورت بلیغ ہوتا ہے۔

مشاعرہ ـــــ داد طلب شعرا کا مجمع جو حسن طلب کے سارے حربے استعمال کرتے ہیں۔ بے داد مر جاتے ہیں۔

جہاں سامعین سے بڑھ کر کلام سنانے والے ہوتے ہیں۔

گناہِ بے لذت جہاں لذت ہو وہ گناہ نہیں جہاں گناہ ہو تو لذت نہیں۔

ہچکی ـــــ وہ ہچکچاہٹ جو حلق میں پھنس پھنس جائے۔

مریض کا کمرہ۔ جہاں اس کے جان پہچان والے آپس میں یارانہ بڑھانے کو اکٹھا ہوتے ہیں۔

کاہلی جو انی ـ تحفے تحائف۔

★

برق آشیانوی

ڈرائیور نہ ملا

کسی نے کیا خوب کہا ہے یہ ضروری نہیں کہ دولت اپنے ساتھ خوشی بھی لائے۔

اس قول کی صداقت پر ہمیں اس وقت ایمان لانا پڑا جب ہم سیکل نشیں سے موٹر سیکل نشین اور موٹر سیکل نشین سے موٹر نشین
جب اللہ میاں دولت دینے پر اُتر آتے ہیں تو چھپّر پھاڑ کر دیتے ہیں ——— چنانچہ جب چھپّر پھاڑ کر دینے لگے تو ہم نے ایک
خرید لی۔

چھپّر پھٹتے پھٹتے جب بالکل غائب ہوگیا اور دولت' بغیر کسی رکاوٹ کے برسنے لگی تو ہم نے ایک اعلیٰ درجے کی موٹر کار خو
موٹر کار خریدتے وقت ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہمیں ایک موٹر ڈرائیور بھی خریدنا پڑے گا۔ "خریدنا" ہم۔
کہہ دیا ورنہ ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ ایک موٹر ڈرائیور بھی ملازم رکھنا پڑے گا۔ کار تو ہمارے گیاریج میں آکر کھڑی ہوگئی لیکن ڈرائیور نہ
گویا' کار حاضر ——— ڈرائیور غائب والا معاملہ تھا اس سلسلہ میں کچھ تو خود ہم نے اپنے چند دوستوں سے مشورہ کیا اور کچھ دوستوں
مانگے ہی مفت مشورے عطا فرمائے۔

یہ دونوں قسم کے دوست موٹر نشین تھے۔ ایک صاحب سے ہم نے رائے لی کہ موٹر ڈرائیور کے بارے میں کیا کیا جائے۔ تو انھوں نے
چڑھا کر کہا۔ "بھائی صاحب اس دنیا میں موٹر ملنا آسان ہے مگر موٹر ڈرائیور ملنا دشوار!" ایک جہاندیدہ بزرگ نے فرمایا۔ "میاں !!
چار بیویاں ہوسکتی ہیں۔ اِن چار بیویوں کی تلاش میں اتنی دشواری نہیں ہوتی جتنی ایک ڈرائیور کی تلاش میں۔ بیویاں تو چار ضرب چار بھی
تھیں مگر ہم نے شرع کی حد توڑ کر آگے نہیں بڑھے۔ ڈرائیور تو ایک ضرب ایک بھی نہ مل سکا۔ ہمیشہ زیرو (۰) ضرب زیرو کا نتیجہ
ایک تجربہ کار موٹر نشین صاحب نے فرمایا۔ "برادر' ملازمت' بیوی' اور ڈرائیور کبھی اپنی مرضی کے مطابق نہیں ملتے' اگر اتفاقاً اِن میں
بھی مرضی کے مطابق مل جائے تو اس کو طیبہ . کا استثنیٰ سمجھو!"

ایک عزیز نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ڈرائیور کو ملازم رکھتے وقت یہ یاد رکھو کہ تم ڈرائیور کو ملازم نہیں رکھ رہے ہو بلکہ ڈرائیور تم
رکھ رہا ہے!" ایک بے تکلف دوست نے کہا۔ "یاشا ہمارے لئے خود ڈرائیور بن جانا آسان ہے' ڈرائیور رکھنا مشکل ہے"

اِن تمام باتوں نے ہمیں مایوس کر دیا۔ دوست' احباب' عزیز' رشتہ دار' سب ڈرائیور کے بارے میں ہمیں اس طرح ڈ
دھمکاتے رہے کہ جس طرح حضرتِ واعظ دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہیں لیکن کسی نے کوئی معقول قسم کا ڈرائیور نہیں دلایا ؟
میں ایک تلخ تجربہ بھی ہوا وہ یہ کہ ایک صاحب نے ہمارے لئے ڈرائیور تلاش کیا جب ایک بہتر ڈرائیور دستیاب ہوا تو اس کو خود ا
لیا اور اپنے سابقہ ڈرائیور کو ہمارے پاس ایک سفارشی چٹھی کے ساتھ روانہ کر دیا کہ ہم اس کو ملازم رکھ لیں حالانکہ اس ڈرائیور

اوصاف "حمیدہ" کئی مرتبہ خود اپنی زبان سے بیان کر چکے تھے ۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ڈرائیور کے لئے اخبار میں اشتہار دیا جائے چنانچہ اشتہار دے دیا کہ : ــــــ

" ایک تجربہ کار، خاندانی ، شریف، ایماندار اور صحت مند موٹر ڈرائیور کی ضرورت ہے ۔"

تاریخ مقررہ پر چند امیدوار حاضر ہوئے، ہم نے بھی باقاعدہ انٹرویو لینا شروع کر دیا ــــ ایک امیدوار ــــ آتے ہی ا[illegible] غور سے دیکھنا چاہئے تو یہ تھا کہ ہم انھیں غور سے دیکھتے لیکن جب وہ اپنی بڑی بڑی اور سُرخ سُرخ آنکھوں سے ہمیں گھورنے ہم میں نظر ملا کر بات کرنے کی تاب نہ رہی چنانچہ ہم نے انھیں اجازت دیدی کہ وہی ہمیں غور سے دیکھیں اور ہم کچھ دیر کے لئے چ[illegible] طرف غور سے دیکھنے لگے ۔ جب ہم نے چھت کو پوری طرح غور سے دیکھ لیا تو دل میں طے کر لیا کہ ہم انھیں ملازم نہیں رکھ سکتے اس[illegible] پر نظر جمائے ہوئے کہہ دیا ــــ " آپ جا سکتے ہیں " انھوں نے پہاڑی آواز میں گرج کر کہا ــ " پھر آپ نے بُلایا ہی کیوں تھا ہم نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا اور کہا " غلطی ہوگئی " انھوں نے جاتے ہوئے کچھ اس انداز میں غرّایا کہ جیسے کہ ہوں ــــ " تم ہمیں کیا ملازم رکھو گے ، تم خود ہمارے پاس ملازمت کرنے کے قابل ہو ۔"

دوسرے صاحب آئے آتے ہی اُنھوں نے ایک فرشی سلام جھاڑ دیا، ہم نے پُر وقار انداز سے انھیں سر سے پیر تک د[illegible] کسی زاویئے سے بھی وہ ڈرائیور نظر نہ آتے تھے ۔ قد و قامت میں نہایت مختصر ہونے کے علاوہ پوست و استخوان کا ایک ڈھانچہ تھے پورے جسم پر دو چار تولے سے زیادہ نہ ہوگا چنانچہ ہم نے انھیں بھی واپسی کی اجازت دے دی ۔

تیسرے صاحب آئے ، آتے ہی اُنھوں نے اس طرح مسکرا کر سلام کیا جیسے برسوں سے ہمیں جانتے ہوں ۔ آدمی [illegible] ہونے کی وجہ سے پسند آئے ۔ کچھ "ایجاب و قبول" کے بعد ہم نے انھیں ملازم رکھ لیا ۔ جب وہ جانے کے لئے تیار ہوئے تو [illegible] صاحب دس روپے دیجئے ، تنخواہ میں سے وضع فرما لیجے گا " ہم نے پس و پیش کیا لیکن جب انھوں نے بتایا کہ چند روز کی بیروزگ[illegible] وجہ سے گھر کی حالت بہت خستہ ہے تو ہم نے دس کا نوٹ دے دیا ۔ دوسرے دن ڈیوٹی پر اتنی دیر سے آئے کہ ہم اپنے کاروبا[illegible] سلسلے میں ایک ضروری کام پر بروقت نہ جا سکے ۔ شام جب رخصت ہونے لگے تو پھر پانچ روپے کا مطالبہ کیا ۔ تیسرے روز ان کی [illegible] ہوگئی تو نہ آسکے اور دو، چار روز وہ خود بیمار ہو گئے ۔ آج تک نہ ان کے غسلِ صحت کی اور نہ غسلِ میّت کی اطلاع ملی ۔

ہم نے پھر ایک ڈرائیور کی تلاش شروع کر دی اس دوران یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ ہم موٹر نشین ہو گئے ہیں ۔ اور ہمیں ڈرائیور کی ضرورت ہے چنانچہ اب ڈرائیور بغیر بُلائے آنے لگے ۔ ہم نے اچھی طرح ٹھونک بجا کر ایک ڈرائیور صاحب کا انتخاب کیا ملازم رکھ لیا ۔ چار دن تو خیریت سے گزرے پانچویں دن وہ دیر سے آئے ، چھٹے روز اور زیادہ دیر کی ، تب ہم نے تاکید کی کہ وقت پر آیا کریں ۔ یہ بات انھیں ناگوار گزری ۔ انھوں نے جواب میں کہا " وقت پر ضرور آؤں گا لیکن جاؤں گا وقت پر ہی " ہم خامو[illegible] جس کا یہ مطلب تھا کہ ہم راضی ہیں ۔ دوسرے روز وہ ٹھیک وقت پر آگئے ۔ کام سے واپس ہو رہے تھے کہ راستے میں انھوں [illegible] دیکھی اور فوراً کار روک کر اُتر گئے پھر ہمیں گھڑی دکھا کر کہا " حضور ، وقت ہو چکا ہے اور اب میں چلا ۔ یہ کہہ کر وہ بس اسٹا[illegible] جا کر کھڑے ہو گئے ــــ سوائے اس کے کہ انھیں نوکری سے جواب دے دیا جائے اور کوئی چارہ کار نہ تھا ۔ کچھ دن گذرے تھے پھر ایک ڈرائیور کو ملازم رکھ لیا ، انھوں نے گیاریج سے کار نکالی ، ہم کار میں بیٹھے ۔ گیٹ سے کار نکلتے ہی دیر تھی کہ فراٹے بھرنے [illegible] نے گھبرا کر اُن سے کہا کہ اتنا تیز نہ چلائیں تو وہ پیچھے کی طرف پلٹ گئے اور کہا " آپ اطمینان رکھیں ، مجھے اتنا کنٹرول ہے کہ آپ کی کار کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا ۔" ادھر ہماری جان میں جان نہ تھی ، واپسی پر ہم اُن کے پہلو میں بیٹھ گئے اور جب تیز رفتاری سے ر[illegible] کوشش کی تو پھر راستہ چھوڑ کر ہمیں ایسی غضبناک نظروں سے دیکھنے لگے کہ ہمارا دل دہل گیا ، ظاہر ہے کہ اس رویّے کے بعد ان سے [illegible] ضروری تھا ، ورنہ ہم شاید اپنے دلِ ناتواں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتے ۔

ایک ہفتہ بعد پھر ایک ڈرائیور صاحب کو ملازم رکھ لیا۔ آدمی، صورت شکل، رکھ رکھاؤ، عادات و اطوار سے شریف معلوم ہوتے تھے لیکن اپنے فن کچے تھے تاہم اُن سے کام لیا جانے لگا، ایک دن ہم نے اُن کی نا اہلی کی بنا پر کہا۔ بھئی ـــ تم ڈرائیونگ بھی جانتے ہو؟"

اس پر انھوں نے فی البدیہہ جواب دیا حضور ع

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا ڈرائیوری

ہم نے یونہی کہہ دیا "شاعر معلوم ہوتے ہو" جب انھوں نے کہا "جی ہاں حضور! آپ کی دعا سے"

تو ہمارے ہوش اُڑ گئے ـــ کیونکہ خود ہم بھی شاعر تھے، دوسرے دن جب وہ کام پر آئے تو ایک لفافہ ہمیں دیا۔ کھول کر تو ایک مشاعرے کا دعوت نامہ تھا۔ خود اُن کے گھر پر شب میں دس بجے ایک محفل شعر مقرر تھی ـــ غالباً کسی سے انھیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ہم شا اس لئے انھوں نے ہمیں دعوتِ شعر و سخن دیدی۔ ہم تو خیر مشاعرہ میں نہ گئے ـــ لیکن رفتہ رفتہ شاعری کے بارے میں ان سے گفتگو ہوئی تو نے خیالات بڑے دلچسپ معلوم ہوئے۔ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا "حضور آج کل جو شاعری ہو رہی ہے اس کو دیکھ کر تو فیصلہ کرنا پڑتا ہے مرزا غالب کے خطوط کو بھی اُن کے اشعار کہہ دینا چاہیئے۔ بس اتنا کرنا ہوگا کہ ان کے ایک ایک جملے کو چھوٹے بڑے مصرعوں میں تبدیل کر دیا جائے، پھر "عود ہندی" مرزا غالب کا ایک شعری مجموعہ بلکہ دیوان ہو جائے گا ـــ پھر انھوں نے کہا "سچ ہے کہ شاعری بغیر وستاد (استاد کا بگڑا ہوا تلفظ) کے نہیں آتی ـــ "وستاد" سُن کر ہم نے ان کی شاعری کا معیار جانچ لیا۔ آگے کر انھوں نے کہا ـــ "کوئی "وستاد" اچھا نہیں ملتا غزل کو ذرا ریپیر (REPAIR) کر کے دے دیتا ہے اور "پیسے" پوری او ہالنگ بھی لیتا لیکن اُیلنگ کرنا تو جانتا نہیں۔ "وستاد" ایسا ہونا چاہیئے کہ جس کے پاس شاعری کا لائیسنس (LICENSE) ہو۔ لائسنس کا مطلب انھوں نے یہ بتایا کہ اس کا کلام مشہور رسائل میں شائع ہوتا ہو۔

ان شاعر ڈرائیور صاحب نے ایک روز کار کو ایک گڑھے میں جھونک دیا اور اسپرنگ توڑ دیا۔ پھر سارا الزام سڑک پر دیا کہ اگر سمنٹ کی سڑک پر اتنے گڑھے ہوں تو یہ اُن کا قصور نہیں ہے۔ انھوں نے تو بار بار ہارن بجایا پھر بھی کوئی نا معقول گڑھا میں آجائے تو وہ کیا کر سکتے ہیں۔ چار و ناچار کار درست کروالی گئی پھر ان شاعر ڈرائیور صاحب کو ایک شادی کی تقریب میں لے گئے جس میں ہم مع خاندان مدعو تھے، ساڑھے گیارہ بجے دعوت سے فارغ ہو کر جب ہم نے گھر لوٹنا چاہا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ڈرائیور صاحب غائب ہیں، آخر جب ڈیڑھ بجے شب وہ آئے تو بتایا کہ قریب ہی اُن کے عزیز کا گھر تھا جن سے وہ ملنے چلے گئے تھے۔ ہمیں یقین نہ آیا کہ عزیز کے گھر آدمی رات کے وقت ملنے گئے ہوں گے، ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ کوئی پکچر دیکھنے گئے ہوں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ایک مشاعرہ کی محفل میں شریک ہو کر آئے تھے۔ ایک دن اُنھوں نے کار باہر نکالتے وقت گیٹ کو ٹکر دیدی نہ صرف کار زخمی ہو بلکہ گیٹ بھی شہید ہو گیا ـــ تنگ آکر ہم نے انھیں چھٹی دیدی۔

اس کے بعد جو ڈرائیور سلسلے سے آتے اور جاتے رہے اُن کے صحیح اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے ہم آپ کو یہ بتائے ہیں کہ موجودہ ڈرائیور صاحب کا نمبر گزشتہ دو سال کے عرصے میں چوبیسواں ہے، گویا اس حساب سے برس میں بارہ اور مہینے میں ایک ڈرائیور ہوا ـــ لیکن اب دو سال کے بعد ہم ڈرائیوروں کے بارے میں زیادہ پریشان نہیں ہیں اس لئے کہ اس دوران ہم اور ہمارے بڑے صاحبزادے نے خود ڈرائیونگ سیکھ لی ہے۔ جب کوئی ڈرائیور ملازم نہیں ہوتا تو ہم یا ہمارے صاحبزادے خود ہی اپنی کار ہانک لیتے ہیں یعنی ڈرائیو کر لیتے ہیں۔

راہیؔ + غالبؔ

راہیؔ قریشی

گو کہ اِس دور میں میک اَپ کا کمال اچھا ہے　　"پھر بھی میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے"
نرس کے حُسن پہ مَیں ہاسپٹل میں خوش ہوں　　"وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے"
جُڑواں بچّوں کی ولادت کا ہے خطرہ اِس بار　　"اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"
دو سلیقے سے فریب اِتنے کہ نیتا بن جاؤ　　"کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے"
اِتنا چھوٹا ہے کہ بھر دیتا ہے ہر شخص اِسے　　"ساغرِ جم سے مِرا جامِ سفال اچھا ہے"
چار سو بیسی ہو، چوری ہو کہ اسمگلری ہو　　"جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے"
کون دیتا ہے بھلا مانگنے والے کو یہاں　　"وہ گدا جس میں نہ ہو خُوئے سوال اچھا ہے"
بعدِ نس بندی ہُوا بارھواں بچّہ راہیؔ　　"آپ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے"

مَیں بھی بن جاؤں گا اِک روز وزیرِ اعظم
"دِل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے"

من تِرا حاجی بگویم

نظرؔ برنی

جب بِلاوٹ عِشق کا دستور ہو کر رہ گئی　　عاشقوں کی عاشقی اَمجُور ہو کر رہ گئی
ایک عاشق کو جو زُلفوں کا تصوّر آگیا　　اس کی نظروں پر گھٹا کا رُوپ سا لہرا گیا
جوش میں زُلفوں کو چھُو کر ہو گیا مستی سے چوُر　　دوسرے ہی لمحے اس کا ڈھ گیا سارا غرور
ہاتھ میں لرزہ تھا اس کے اور بتیسی گِر گئی　　ہائے اُس محبوب کو یہ عاشقی مہنگی پڑی
دستِ عاشق میں سُنہری وِگ کا کھانچہ آگیا　　اصلیت کُھلتے ہی خود محبوب بھی گھبرا گیا

فون پر محبوب کی آواز یہ آئی: "ھَلو"
"مَن ترا حاجی بگویم تُو مِرا حاجی بگو"!

ایم۔ اے۔ حنّان

پتا پوچھنا

لفظ "پوچھنے" کا جہاں تک تعلق ہے یہ شروع ہی سے ہمیں شرمندہ و شرمسار کرتا آیا ہے۔ چنانچہ بچپن میں استاد محترم کوئی معمولی سا سوال پوچھ کر اکثر ہم کو شرمندہ کیا کرتے اور خود بھی شرمندہ ہوتے تھے۔ ابتدائی جماعتوں سے ترقی پاکر کالج میں آئے تو دوست احباب اور رشتہ دار ہر سال نتیجہ پوچھ پوچھ کر شرمندہ کرنے لگے۔ شاید انھیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ بعض طلبہ کو کامیابی برسوں بعد حاصل ہوتی ہے۔ خدا خدا کرکے کالج کو خیرباد کہا تو اب لوگ مصروفیت پوچھ پوچھ کر شرمندہ کرنے لگے۔ ایک طویل عرصہ بعد جب ہم کو معجزاتی طور پر نوکری مل گئی، تب بھی یار لوگوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا اور یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ بھئی شادی کب کرو گے؟ چنانچہ زندگی میں پہلی بار ہم نے اُن سے فخر سے سینہ تان کر کہا کہ "آپ تو صرف ایک شادی کے بارے میں استفسار فرما رہے ہیں جب کہ ہمارا تو ایک ہی ساتھ دو چار شادیاں رچانے کا ارادہ ہے۔"

ہم اپنے نام نہاد مخلصوں کو یہ جواب دے کر کافی مطمئن ہو گئے تھے کہ زندگی میں اب سوائے حشر کی پوچھ کے کسی اور پوچھ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی اور ہماری بدنصیبی کو کیا کہیے کہ پچھلے چند دنوں سے حیرت انگیز طور پر ایک نئی پوچھ سے سابقہ پڑ رہا ہے اور لوگ ہم سے طرح طرح کے پتے پوچھ رہے ہیں۔ اور پتے بھی اس غضب کے کہ ہم بھی

"کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا"

... کی مکمل نہیں تو نصف تصویر ضرور بنے ہوتے ہیں۔ اب آپ ہی دیکھیے نا کہ پرسوں (اس سے مُراد حیدرآباد کا پرسوں ہرگز نہیں ہے) ایک صاحب مسکین سی صورت بنائے ہمارے پاس تشریف لائے اور انتہائی معصومیت سے دریافت کیا کہ صاحب یہاں ناظم صاحب کہاں رہتے ہیں۔ ہم نے جواباً عرض کیا کہ یہاں ایک عرصہ سے صدر مدرس صاحب رہتے ہیں۔ انھیں ضرور اس بات کا علم ہو گا کہ ناظم صاحب کہاں مکین ہیں۔ یہ جواب پاکر انھوں نے قدرے خفگی سے کہا کہ "میری مُراد" ناظم صاحب "سوپروائزر" سے ہے جو پی ڈبلیو ڈی میں کام کرتے ہیں۔" ان کی صحیح رہنمائی کی نیت سے ہم نے مزید دریافت کیا کہ ناظم صاحب نے آپ کو اپنا مکان نمبر دیا ہے؟ انھوں نے فرمایا "نہیں۔" یا کسی مشہور مقام، مسجد، مندر، چرچ، اسکول، کارخانہ، فیکٹری اور کسی میخانہ وغیرہ کے آس پاس واقع ہونا بتلایا ہے۔ جواب ملا "نہیں۔" پھر ہم نے اُن سے کریدتے ہوئے پوچھا کہ آپ اُن کے کسی بھائی، بہن، بہنوئی، چاچا، ماموں، خالہ وغیرہ کو جانتے ہیں یا اُن کے کسی مرحوم دادا، نانا، اور پھوپھا کے اسم گرامی یا اُن کی آخری آرام گاہ سے واقف ہیں۔ جواب ملا "بالکل نہیں۔" ذہن پر کافی زور ڈالنے کے باوجود جب ہماری کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بالآخر ہم نے تھک ہار کر پوچھا کہ آخر اُن صاحب نے اپنا کیا پتہ بتلایا تھا وہ بولے "ناظم صاحب نے کہا تھا کہ چار مینار کے پاس بس سے اُتر کر کوئی بارہ فرلانگ چلنے کے بعد داہنی جانب مُڑ جائیے۔ وہاں آپ کو کروسین کی ایک بند دوکان ملے گی۔ کروسین کی دوکان سے چند قدم چلنے کے بعد بائیں جانب ایک الکٹرک پول ملے گا۔ اس پول سے چالیس قدم کے فاصلہ پر ایک مرا ہوا گدھا پڑا ملے گا۔ بس وہیں میرا

ت خانہ ہے۔" وہ یہ عمل پانچ مرتبہ دُہرا چکے تھے۔ لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس نازک موقع پر ہم نے انھیں یہ نوٹین
رہ دیا کہ اُن کا عہدہ کچھ نیچے اوپر کر کے دیکھیے شاید مِل جائیں۔ کیونکہ ہمیں ایک بار اس کا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ اور ایک مطلوبہ جونیر
ر صاحب کا خود ان کے دفتر میں پتہ نہ چلا تو بڑی حیرت ہوئی۔ اُن دنوں وہ رخصت خاص پر تھے۔ لیکن صاحب کسی کے رخصت لینے
یہ مطلب نہیں کہ لوگ اُنھیں پہچاننے سے انکار کر دیں۔ کچھ دیر بعد چھان بین کے دوران جب قدرتی طور پر ہمارے منہ سے جونیر انجینئر
بجائے "جونیر سرونٹ" نکل گیا تو دفتر کے عملہ نے نہ صرف اُنھیں پہچان لیا بلکہ بجلی کی سرعت کے ساتھ اُن کی دونوں بیویوں کے پتوں سے
ف کروایا۔

پھر بھی یہ بے چارے غنیمت ہی تھے جو مطلوبہ شخص کے نام اور عہدہ کے ساتھ وارد ہوئے۔ کیونکہ اُن کے ایک ہم زلف تو لکھنوی
زمیں تسلیمات بجا لانے کے بعد ہم سے یوں استفسار فرمانے لگے۔ صاحب "کیا آپ غ فہیم صاحب کو جانتے ہیں۔؟ جو گورے چٹے
بھاری بھرکم شحیم آدمی ہیں۔ ان کے گال اور لب دونوں پھولے ہوئے ہیں، نیز دایاں کان بائیں کان سے چھوٹا ہے اور گال پر سیاہ تل کا
کا سا نشان ہے۔" پتہ پوچھنے کے اس انداز نے چونکا دیا۔ جب ہم اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے اور جواب میں ایک زوردار قہقہہ لگا دیا تو وہ اسے
اپنی توہین خیال کر کے غصے سے خود ہی لوگوں کے چہروں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

اس طرح ایک مرتبہ ایک صاحب حیران و پریشان سرتاپا پسینہ میں شرابور اسکوٹر پر سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہمارے
ب آکر رک گئے۔ اور پتلون کی جیب سے تولیہ کے سائز کی دستی نکال کر پسینہ اور میل صاف کرتے ہوئے ہم کو غور سے دیکھنے
ے۔ ہم سمجھ گئے کہ انھیں کسی کی تلاش ہے۔ چنانچہ قدرے توقف کے بعد آخر انھوں نے ہم سے پوچھ ہی لیا کہ یہاں ترویدی صاحب
ال رہتے ہیں۔ ہم نے بھانپ کی بند کی طرح پوچھا کہ کیا کام کرتے ہیں۔؟ فرمایا کہ "کوئی مستقل پیشہ نہیں ہے۔ کبھی مقدمہ کی
دکان کھول لیتے ہیں تو کبھی پرانے لوہے کا سامان فروخت کرنے لگ جاتے ہیں۔ کبھی مشاعرے کرواتے ہیں تو کبھی سرکاری ملازمت
اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر وقت بغیر استری کا قمیص اور بغیر استری کا پتلون اڑس لئے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ۱۹۴۷ء سے قبل کی ٹائی بھی لگا لیتے
ہیں۔ یہ اُن کی آبائی ٹائی ہے۔ یوں بھی آجکل کے معاشی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ایک ٹائی کے موجودگی میں دوسری
ٹائی خریدی جائے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا جمعہ کے دن اکثر ململ کا قمیص اور تنگ مہری کا پاجامہ زیب تن
کرتے ہیں۔ اور تبدیلی لباس کے اس موقع پر کانپوری سینڈل میں سرخ موزے پہننا ہرگز نہیں بھولتے۔ ان ڈھیر ساری باتوں میں جب
ہم کو ایک بھی ایسی معقول بات نظر نہ آئی جس سے ترویدی صاحب کا کچھ اتا پتہ چل سکے۔ اور ہم دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ
آخر انھیں کیسے چلتا کریں۔ لیکن چند ثانیہ بعد صاحب موصوف نے یہ کہہ کر ہماری مشکل آسان کر دی کہ وہ منٹ منٹ کوئی مشہور و
معروف نام اپنی نخنق سی ناک میں چڑھاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ نسوار کا نام سنتے ہی ہم نے اُنھیں ہمارے پاس میں واقع جنرل اسٹور کے مالک کے
سپرد کر دیا۔ اس خیال سے کہ شاید ترویدی صاحب نسوار لینے آجائیں اور اس بہانے اُن سے ملاقات ہو جائے۔

ایک محترمہ کے پتہ پوچھنے کی ادا پر تو ہمارے ہی کیا افراد خاندان کے بھی ہوش اُڑ گئے۔ کہ وہ کیسے گھر کے مالک کی طرح کہے
سنے بغیر سیدھے گھر میں گھس آئیں۔ اور بڑی "دھٹائی" سے صحن پار کر کے دالان میں آکر دائیں بائیں جانب دیکھتی ہوئی زیر لب
بڑبڑانے لگیں: "بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ متی نے کہا تھا۔" بڑا سا صحن کے آگے دالان، دالان سے متصل دائیں بائیں چار عدد کمرے

کہہ کر فرطِ مسرت سے ایک زوردار چیخ مار کر کہنے لگیں۔ "اری او منّی کہاں مری ہے۔ میرے لئے ڈکاشن بنا کر لا اور دیکھ کون آیا ہے۔
یہ چیخ و پکار سن کر گھر کے تمام افراد اپنے اپنے کمروں سے بدحواسی کے عالم میں باہر نکل آئے اور ایک اجنبی بڑھیا کو گھر کے قلب میں پتہ پوچھتا پا کر حیران رہ گئے۔ لیکن قربان جائیں اُن بڑی بی کے جو کسی جیالے سپاہی کی طرح ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔ اور بار بار یہی کہتی کہ منّی کا دیا ہوا پتہ تو بالکل ایسا ہی ہے۔۔!

یہ بات بھی نہیں ہے کہ تمام حضرات اس قسم کی اوٹ پٹانگ پتے لئے آتے ہیں۔ بلکہ ہمیں یہ کہتے ہوئے بے حد مسرت ہوتی ہے کہ بعض صاحب فہم تو اس معاملہ میں تبدیلی قلب کے آپریشن کرنے والے ڈاکٹر برنارڈ کی طرح احتیاط برتتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی ہمیں اُس واقعہ کی یاد آتی ہے تو چہرہ خوشی سے پھول جاتا ہے کہ کسی طرح ایک صاحب نے اپنے دوست کا پتہ پوچھتے ہوئے ایک رنگ برنگی نقشہ ہمارے آگے کر دیا گیا۔ شہر کا اتنا خوبصورت نقشہ اس سے قبل کبھی ہماری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ اگر کوئی ویسا ہی نقشہ تیار کروانا چاہے تو ہزار پانچ سو روپیوں سے کیا کم خرچ بیٹھتا ہوگا۔ نقشہ میں صاحب نقشہ کے گھر سے مطلوب گھر تک راستہ کی ماہرانہ نشان دہی کی گئی تھی۔ چنانچہ سرِراہ پائے جانے والے درختوں کو سبز رنگ سے ظاہر کیا گیا تھا تو موریوں کو نیلے رنگ سے۔ سمنٹ روڈ کی مرمّتی رنگ کی نشان دہی کی گئی تھی تو کچی سڑک کی چاکلیٹی رنگ سے۔ نیز راستہ میں پائے جانے والے جملہ گڑھوں، پتھروں اور قبور کی کافی خوبصورت انداز میں وضاحت کی گئی تھی۔ غرض کہ کچھ ایسی ہدایات دی گئی تھیں جس طرح پہلی مرتبہ چاند پر اترتے وقت امریکی سائنس دانوں نے آسٹروناٹس کو دی تھیں۔
چنانچہ ہم نقشہ کے مطابق کسی خزانہ کی تلاش میں نکلنے والے آدمی کی طرح آگے بڑھتے رہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد صاحب نقشہ یکایک رُک گئے اور کہا کہ یہاں تک تو ہم آچکے ہیں۔ حسبِ نقشہ بائیں جانب مکان نمبر ۱۸۹/۸ ہونا چاہیئے۔ اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ واقعی بائیں جانب واقع مکان کی پیشانی پر وہی نمبر تحریر تھا۔ ہم نے فرطِ مسرت سے لپک کر کال بیل بجائی۔ یہ سوچ کر کہ زندگی میں پہلی بار کسی نے صحیح پتہ دیا ہے۔ لیکن دروازہ کھلنے پر یہ دردناک اِنکشاف ہوا کہ ہم غلط پتے پر آگئے ہیں۔ کیونکہ عرصہ ہوا صاحب خانہ اس دُنیا سے تخلیہ فرما چکے ہیں اور ان کے لواحقین مکان دار کو پورا کرایہ ادا کرنے کے بعد کسی نامعلوم مقام کو روانہ ہو چکے ہیں۔ اور جانے کیوں اُنھوں نے نقل مقام کی اِطلاع اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کو نہیں دی۔

اِس آخری واقعہ کا تو ہمارے قلب و دماغ پر اتنا گہرا اثر ہوا ہے کہ اب ہم پتہ پوچھنے والوں سے بے حد گھبرانے لگے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی راہرو ہم کو تسلیم بجا لینے کے بعد متجسس و متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے تو ہم انتہائی بداخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی بے مروتی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مبادا کہ وہ کہیں یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ جناب آپ فلاں صاحب کو جانتے ہیں جن کے ہاتھ کی چھ انگلیاں ہیں، اور گردن پر جڑواں رسولی ہے۔

غزل

ظفر چکدینوی

آنکھیں نہ کرو تم ہی جب چار، کہاں جائے
پینے کو شراب آخر میخوار، کہاں جائے

دنیا سے تو اُکتا کر سب جاتے ہیں جنت میں
ہو جائے جو جنت سے بیزار، کہاں جائے

سنتے ہیں مسیحا خود بیمارِ محبت ہے
اب اس کی محبت کا بیمار، کہاں جائے

لگتے تھے وہ دو بچے جو پہلے ہوئے پیدا
جو ماں کے شکم میں ہے "شہکار" کہاں جائے

اس پیسے کی دنیا میں بک جاتی ہے غیرت بھی
لیکن جو ذرا بھی ہے "خود دار" کہاں جائے

گرداب سے بچ بچ کر ساحل کو چلی کشتی
ساحل ہی پہ گر اُٹھے منجدھار، کہاں جائے

گلشن میں ہوا کرتے ہیں پھول بھی کانٹے بھی!
سب پھول ہی ہتھیالیں تو "خار" کہاں جائے

جو طالب آراء ہیں اِک وہ ہی نہیں مضطر
خود ووٹ پریشاں ہے اِس بار، کہاں جائے

جینے کا جو خواہاں ہو، جی لیتا ہے مر کر بھی!
جینے سے جو ہو جائے بیزار، کہاں جائے

جیتے جو الیکشن میں وہ کرسی پہ جا بیٹھے
قسمت سے گر جائے جو "ہار" کہاں جائے

جو عقل سے کورے ہیں بنتے ہیں ظفر عاقل
دیوانوں کا جمگھٹ ہے ہشیار کہاں جائے

نمکین پارچے

مختار یونس مالیگانوی

یہ پتلون ہندوستانی نہیں ہے
کہاں کی ہے ہرگز بتانی نہیں ہے

میں فرمائشی لَے میں کیسے سناؤں
مرا منہ ہے آکاش وانی نہیں ہے

عدالت میں کل بھینس نے دی گواہی
یہ ہے دودھ قلفی کا، پانی نہیں ہے

"نشانی" مری نوٹ پر نوٹ کر لو
ق یہ تحفہ ہے رشوت نشانی نہیں ہے

میں انکار کرنے لگا تو وہ بولے
تمہیں کیا غریبی ہٹانی نہیں ہے

محبت کے حلقے سے تو ہی کھڑا رہے
مجھے تو ضمانت گنوانی نہیں ہے

شہیدِ الیکشن ہوں پُتلا بٹھا دو
مری جیتنی گر مٹانی نہیں ہے

الیکشن کا تم نے ٹکٹ دے دیا کیوں
ارے اس کی ہڈی پرانی نہیں ہے

ترا جشن مختار کیوں کر منائے
تو شاعر ہے پر آنجہانی نہیں ہے

یصر شمیم

ایسے میں کس طرح سے کوئی زندگی کرے

اسے ہماری ہمہ دانی پر محمول نہ کیجئے، یہ کسی ظریف کے ذہن کی اختراع
نہایت معتبر روایت ہے کہ ایک نائی نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں
اڑے ترچھے ڈیزائن بنائے کہ وہ فیشن میں داخل ہو گیا اور
یات ہوئی کہ "کٹی ناک والوں" نے ناک والوں کو ہی "نکو" کہہ
انا شروع کر دیا۔ ہمیں جب اس روایت کا علم ہوا تو کافی غور و خوض
اس نتیجہ تک پہنچے کہ حماقت اور حجامت دونوں ہی کی ابتدا
ت ہوئی ہو گی جب انسان پر "مہذب" ہونے کا خبط سوار ہوا ہو گا
رپ والے ہم سے پہلے ہی اس نکتہ سے واقف ہو گئے تھے کمبخت ہر
میں آگے ہی نظر آتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں ترقی یافتہ قوم۔ ہمارے
ب بھی یہ عالم ہے کہ بڑے بال کو "امپورٹڈ ہپی ازم" نامی دیوانے پن
بیر کیا جاتا ہے۔ اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم بھی "ترقی یافتہ" بننے کی
ت رکھتے ہیں!

ہم سے بچپن کے وہ دن بھلائے نہیں بھولتے جب ایک نائی
ے مہینہ میں ایک بار ہمارے یہاں نازل ہوا کرتا تھا۔ وہ دن ہمارے
لیے "قیامت صغریٰ" سے کم نہیں ہوتا تھا۔ دو آدمی ہمارے ہاتھ پیر جکڑے
ہوتے۔ ہم چیختے، چلاتے، مگر ہماری زبان سے زیادہ تیز اس نائی کی زبان
اور قینچی چلا کرتی تھی۔ اس کی دست درازی تو یہاں تک بڑھی کہ سزا دینے
کے لیے اس نے ایک دن ہمیں "سونے کی اڑتی چڑیا" دکھا دی۔ اور ہم یقین
جانئے ہم کئی دن تک بستر پر لیٹے رہنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔
(گذارش ہے کہ اگر آپ کے پاس کوئی نائی موجود ہو تو یہ آواز بلند نہ پڑھا جائے
کیونکہ نائی خدا کی ان بے بہا نعمتوں میں سے ایک ہے جس کا "دست
شفقت" تقریباً ہر سر پر پھرا کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گردن پر کوئی
اور آن موجود ہوتا ہے) کبھی کبھی ایسے سر بھی ہماری نگاہ سے گزرے ہیں کہ
ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ سر کہاں سے شروع ہوا ہے
اور چہرہ کہاں ختم ہو گیا ہے۔ یہی نہیں ایک طرف اس کی قینچی سر کو صاف
کرتی جاتی ہے دوسری طرف اس کی زبان خیالات سے جکڑ کے دماغ
کو "ہلکا" کئے جاتی ہے۔ پھر اس کے ہاتھ کے لطیف جھٹکوں کا کیا کہنا؟
اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب ہم سیلون سے باہر نکلے تو جیب کے ساتھ دماغ بھی

"جہانِ شوق میں جی بھر کے مسکرانے دو!"

—— جوہرؔ سیوانی ——

بڑھائے سر کا اگر بال تو بڑھانے دو
تم اپنے بیٹے کو ہپّی کی صف میں آنے دو

ہمیں تو اپنی زمیں پر ہی گُل کھلانے دو
جو ماہتاب پہ جاتے ہیں اُن کو جانے دو

نہ روکو شیخ کو، پاسن کے پاس جانے دو
کبھی تو تاڑ کے رَس سے وضو بنانے دو

اُسے بھی شعر سُنانے کی داد پانے دو
کسی سے مانگ کے لائے غزل تو لانے دو

سُنا ہے شاعرِ خود ساختہ پریشاں ہے
غزل کسی کی سُنائے اُسے سُنانے دو

اُنھیں تو مانگے کی غزلوں کا ہی بھروسا ہے
سُنا رہے ہیں بہت جَم کے وہ، سُنانے دو

وہ لاکھ چاہیں نہ ٹوٹے گی میرے فن کی چٹان
ہتھوڑا بغض و حسد کا انھیں چلانے دو

غزل جو تحت میں پڑھتے ہیں ہوٹ ہوتے ہیں
مشاعرے میں جو گاتے ہیں اُن کو گانے دو

وہ یوں نہ بند کرے گی زبان کی قینچی
دوا پٹائی ہے، ڈنڈا مجھے اُٹھانے دو

وہ دیکھ لیں گی تو کر دیں گی ایک حشر بپا
یہ ہیں خطوطِ محبت انھیں جلانے دو

جُگالی کرتی رہے گی وہ سامنے بیٹھی
نہ بین بھینس کے آگے مجھے بجانے دو

خیال و فکر کی لائن پہ دو گھڑی کے لئے
مزاح و طنز کا انجن مجھے چلانے دو

ہمارا آسیبِ ظرافت بہت ہی بھوکا ہے
اسے مزاح کا دانہ خوشی سے کھانے دو

مرے خیال کی رادھا ضرور ناچے گی
ذرا کرشن کی مُرلی مجھے بجانے دو

غمِ حیات نے چھوڑا ہے دو گھڑی کیلئے
"جہانِ شوق میں جی بھر کے مسکرانے دو"

تم اِس کے بعد کرا لینا اپنی نس بندی
جو آنے والا ہے مہمان اُس کو آنے دو

چُناؤ آیا ہے ہانڈی میں راج نیتی کے
غرض کی دال مجھے دوستو گلانے دو

چُناؤ آ ہی گیا بن کے عید چمچوں کی
ہر ایک دیگ میں اب اُن کو چمچانے دو

اُداسی بزم کی خود قہقہوں میں بدلے گی
کلامِ حضرتِ جوہرؔ کی باری آنے دو

غزل

شارقؔ آفاقی (اکولہ)

حسینوں کے ہر اک کوچے میں لاکھوں دل مچلتے ہیں
تعجب ہے کہ انساں صورتِ بندر اُچھلتے ہیں

ہزاروں دل، نگاہیں لاکھ، فرشِ راہ ہوتی ہیں
حسینانِ جہاں جس سمت سے سڑکوں پہ چلتے ہیں

مچی ہے چار سُو ہلچل، حسینوں کو شکایت ہے
کہ اِن کو دیکھنے کو طفلِ مکتب بھی اُچھلتے ہیں

یہ ممکن تھا کہ شارقؔ بھی کہیں دل ہار ہی جاتا
سُنا ہے کہ فرشتے بھی یہاں گر کر سنبھلتے ہیں!

سمعیل سعیدی آذر

چور سلامت اور ہم

ہم نے ایک بار ایک بے حد دلچسپ اور قہقہہ آمیز پروگرام سُنا تھا۔ آدھی رات کو گھر میں چور گھُس آتا ہے۔ گھر کی مالکن آہٹ
ی ہیں اور اپنے شوہر کو دبی آواز میں یوں ہوشیار کرتی ہیں "اجی سُنتے ہو! گھر میں چور گھُس آیا ہے۔" شوہر صاحب نیند میں خلل پڑجانے
تا کر جواب دیتے ہیں "ارے! چور گھُس آیا ہے تو محلے کے کسی مرد کو آواز دے لونا!" بیوی نے برجستہ یاد دلایا ۔ "اجی آپ بھی تو مرد
مکان اپنی اس بے خیالی پر سٹ پٹا گئے مگر فوراً ہڑبڑا کر فرمادیا ۔ "ارے ہاں! خوب یاد دلایا ۔ ذرا لانا تو ڈنڈا!"
! بعد میں پتہ چلا کہ جناب نووارد نہ تو چور تھے اور نہ سامان چُرانے کی غرض سے آئے تھے بلکہ شاعر تھے اور شاعر ہی کے گھر تشریف
پی تازہ غزل سنانے کے لئے جو آدھی رات کو مکمل ہوئی تھی۔

اس پروگرام کو سُن کر ہم نے خوب قہقہے لگائے تھے اور کئی دنوں تک مالک مکان کی بے وقوفی اور بُزدلی کا قصہ سُنا سُنا کر اپنے دوستوں
ر خوب محظوظ کیا حتیٰ کہ اپنی دوسالہ بچی کو بھی سُنا ڈالا اور خود ہی ہنس لیا تھا۔ لیکن قدرت کو ہمارا یہ مذاق پسند نہیں آیا۔ اور ایک دن
ا کا چور ہماری دلیری پرکھنے کے لئے دوسرے لفظوں میں ہمیں مزہ چکھانے کے لئے ہماری کھپریل کی چھت پر نازل فرمایا۔

ہوا یہ کہ تقریباً رات دو بجے جب کہ گھر کے تمام لوگ گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے تو یہ جناب چور سلامت محکمۂ انکمٹیکس کے انسپکٹر کی
نے کے لئے تشریف لے آئے انھیں شاید کسی طرح پتہ چل گیا کہ ہمارا پڑیار گھوڑے بیچ چکا ہے۔ خانہ تلاشی سے گھوڑا تو گھوڑا دُم بھی ہاتھ
۔ لہٰذا انھوں نے مسٹر جارج کی نیند کا جرمانہ وصول کرنا مناسب سمجھا۔ جارج صاحب ہمارے ہمسایہ ہیں اُن کا اور ہمارا مکان اس طرح
ہ ایک جان دو قالب یعنی ہماری اولتی ان کی دو منزلہ عمارت کی دیوار کو ازل سے چومتی آرہی ہے۔ جارج صاحب کا بیڈ روم دوسری منزلہ
کھڑکی ہمارے مکان کی طرف کھلتی ہے' وہ اُسے ہمیشہ راتوں کو تازہ ہوا کے لئے کھُلا رکھ چھوڑتے ہیں۔ جارج صاحب کا مکان کچھ اس
ہوا ہے کہ ایک چور کا اندر داخل ہونا فرہاد کی کوہکنی سے کم نہیں۔ ہمارے مکان کی طرف وہی ایک کھڑکی ہے جس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے
پہنچنے کے لئے ہماری اولتی کا سہارا بہت ہے' کہنے کو کھڑکیاں تو کئی ہیں مگر ان میں کو آپریشن کا جذبہ قطعی نہیں ہے سب کی سب حوصلہ شکن
کھڑکی سے کوئی اگر اندر داخل نہیں ہوسکتا تو کم از کم روڈ تھامے ہوئے کئی ایک زاویئے سے آؤٹ ڈور تحفظ کرلے سکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنے بیان کو آگے لے جائیں ایک اور واقعہ گوش گزار کردینا چاہتے ہیں جو اس واقعہ کی اہم کڑی ہے جس زمانے کی ہم
ب اس وقت ایک پاگل بندر ہمارے شہر میں آنکلا تھا اور کمبخت ایک تہلکہ مچائے ہوئے تھا روزانہ اس پاگل بندر کے عجیب و غریب
ے جاتے تھے۔ ہم نے البتہ اس پاگل کو کبھی نہیں دیکھا مگر ہر گلی کوچہ میں اس کے چرچے ہوتے سُنے تھے مثلاً آج فلاں کے گھر میں گھس
ہ کو کاٹ لیا' فلاں کی ناک نوچ لی۔ فلاں کا سامان لے بھاگا وغیرہ وغیرہ۔

یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ شہر کے کتنے فیصد لوگ ان واقعات سے خوفزدہ تھے یا تھے بھی کہ نہیں لیکن ہم پر اس کا کافی اثر پڑا ہوا تھا
اندر بے حد ڈرے ہوئے تھے تاہم اپنی دہشت کا راز فاش نہیں ہونے دیا اس خیال سے کہ بندر ہماری طرف نہ آنکلے ہم کسی نہ کسی
ے دروازے بند رکھا کرتے تھے۔

ہاں تو صاحب بلاشبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ چور سلامت ہمارے گھر کا ہی سہارا لے کر جارج صاحب کی کھڑکی تک پہنچ پائے تھے

کھڑکی پر پہونچ کر یقیناً انھوں نے کمرے کی تاریکی کا کچھ دیر جائزہ لیا ہوگا تاکہ معلوم کر سکیں کہ آیا کوئی شریف النفس جاگ تو نہیں رہا ہے۔ اتنی دیر میں کمرے کی گہری تاریکی ہلکے سرمئی اُجالے میں تبدیل ہوئی ہوگی۔ اور اس ہلکے اُجالے میں اُنھیں سامنے تار پر لٹکتے ہوئے کپڑے نظر آ گئے ہوں گے چور سلامت چونکہ مسلح تھے یعنی ایک عدد بانس کا ٹکڑا اپنے ساتھ لائے تھے لہٰذا اُنھوں نے اُسے اندر لہرایا اور کپڑوں کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ ادھر جارج صاحب کا یہ حال تھا کہ نیم مُردہ نیم زندہ۔ عالمِ خواب میں دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے اوپر لٹکے ہوئے کپڑے کرسمس کے بیلون بن کر حرکت کر رہے ہیں۔ سماں بڑا سحر انگیز تھا۔ وہ اِن رنگینیوں سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ ناگہاں ان میں سے ایک بیلون پھٹ پڑا اور صاحب کی نیند اُچاٹ ہوگئی۔ آنکھ کھُلی تو ایک دوسرا طلسم پیشِ نظر تھا۔ کپڑوں کو آہستہ آہستہ سرکتے دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ اُن کا سر چونکہ کھڑکی کی طرف تھا اس لئے چور موصوف پر نظر نہ پڑ سکی۔ سامنے دیوار پر جب چھپکلی پرچھائیں دیکھی تو سچویشن سمجھ گئے اور (بقول ان کے) انھوں نے سرہانے سے چاقو نکالا اور یکبارگی کھڑکی کی طرف جھپٹے اور وار کر دیا۔ ادھر چور سلامت کی گرفت گھبراہٹ میں جو چھُوٹی تو سیدھے کھپریل پر دھڑام سے آ گرے اور بڑی سُرعت سے کھپریل کو روندتے ہوئے گلی میں کود کر فرار ہو گئے۔

اب آپ ہی اندازہ لگائیں کہ سنسان رات میں دھڑام کی آواز کتنی قیامت خیز رہی ہوگی۔ دھڑام کی آواز سے ہماری آنکھ کھُل گئی۔ چونکہ بندر کا بھوت ذہن میں پہلے ہی مسلط تھا لہٰذا ہم نے سمجھا کہ اس نے اب ہمارے گھر حملہ کیا ہے۔ ہڑبڑا کر ہم مسہری کے اندر کھڑے ہو گئے۔ ہمارا کھڑا ہونا دیکھ کر ہماری بیگم بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ دروازے پر جو ہماری نظر پڑی تو اُسے کھلا دیکھ کر ہماری کھوپڑی ہوا میں اُڑنے لگی۔ پیروں میں پاشے عاشق کی سی لغزش ہونے لگی۔ عالمِ اضطراب میں ہم اسی طرح کھڑے ہوئے تھے کہ دفعتاً ہمارے متصل کمرے سے ادرع ' ادرع ' ادورع کی آواز آئی ــــــــ

ہم نے آواز پہچاننے میں دیر نہ کی۔ یہ آواز ہمارے خلیرے بھائی کی تھی۔ ہمارا شبہ اب یقین میں بدل گیا۔ کہ یہ بندر ہی ہے اور ہمارے چھوٹے بھائی کا گلا دبا رہا ہے۔ پھر تو ہم ساری سٹی پٹی بھُول گئے۔ ہمارے پیروں میں جان نہ رہی۔ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کھڑے ہونے کے لئے ہم کو ایک سہارے کی ضرورت تھی لہٰذا ہم بیگم سے لپٹ گئے۔ اور بہ مشکل تمام اور پوری طاقت سے چلانا شروع کیا

"ارے دروازہ بند کرو، بندر، بندر دروازہ ـــ بند دروازہ ـــــ کرو"

ہماری یہ گھُٹی گھُٹی سی آواز ہمارے لئے بذاتِ خود ڈراونی لگ رہی تھی۔

بیگم کو ہماری آواز پر ہماری عدم موجودگی کا شبہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ انھوں نے اپنے سے الگ کر کے ہمارے چہرے کو دیکھا اور مطمئن ہو گئی تھیں۔ ہم بھی پتہ نہیں دروازہ بند کرنے کے لئے کس کو ڈائرکشن دے رہے تھے جبکہ کمرہ میں ہم دو ہی تھے اور ہماری بچی تھی جو سو رہی تھی۔ دروازہ بند کرنے کے لئے بیگم تو نہیں جا سکتی تھیں کیونکہ ہم نے انھیں جکڑ رکھا تھا۔ اگر ہمیں بر وقت یاد آ جاتا کہ ہم مرد ہیں تو بندر سے نپٹنے کا کوئی موثر اقدام کرتے یا امن پسندی کا اعلان کرتے ہوئے کم از کم بڑھ کر دروازہ بند کر لیتے۔ خیر صاحب یہ ہنگامہ ہو ہی رہا تھا کہ اچانک ہماری خالہ صاحبہ ہمارے کمرے میں آ گئیں اور بتایا کہ بھئی وہ بندر نہیں چور تھا اور گھبرانے کی ضرورت نہیں اب وہ بھاگ چکا ہے"۔ لفظ "بھاگ چکا" پر ہم کو کچھ اطمینان ہوا۔ اور ہوش و حواس قابو میں آنے لگے۔

جیسے جیسے ہماری حالت سنبھلتی رہی ایک خوشی کی لہر بھی آتی گئی مگر ہم نے بجائے خوشی کے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے جارج صاحب اور چند دیگر افراد کے نام چارج شیٹ دینی شروع کی کہ ان لوگوں نے فوراً "چور، چور" کہہ کر لوگوں کو خبردار کیوں نہیں کیا۔ ادھر جارج صاحب پر بھی شاید گھبراہٹ طاری تھی کیونکہ بڑی دیر تک انھوں نے کسی سے کچھ نہیں بولا۔

کچھ دیر بعد ان کے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ اسی اثنا میں ہم بھی مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس درست کر چکے تھے لہٰذا ہم نے انھیں پکارا اور بڑی شائستگی سے اصل واقعہ انگریزی میں دریافت کیا حالانکہ وہ اُردو اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں لیکن انسان کو اپنی خفت

مٹانے کے لئے کبھی کبھی انگریزی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ہماری اس گھبراہٹ راگ کی آواز دوسرے دن سے بڑی دور تک گونجنے لگی۔ ایک کان سے دوسرے کان ہوتے ہوتے اس واقعہ کو کئی ایک دوستوں اور احباب نے سُنا۔ ملاقات پر وہ ہماری ہنسی اڑانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہم اپنی غیرت اور خفگی کو بڑی چابکدستی سے دبا دیتے ہیں اور واقعہ کو اس انداز سے سُناتے ہیں کہ ان کے لئے یہ ایک شاندار لطیفہ بن جاتا ہے۔ عزیزوں کو ہنستا چھوڑ کر جب ہم چلنے لگتے ہیں تو یہ شعر ہمارے دل و دماغ میں خوامخواہ کھٹکنے لگتا ہے۔

زمانہ ہنس رہا ہے آج بسمل تیرے رونے پر
نہ جانے کس کے رونے کی اڑائی تھی ہنسی میں نے

غزلیں

○

آپ آئے جو اِس گرانی میں
لُٹ گئے ہم تو چائے پانی میں

کیا مزا گوشت کا ملے ہم کو
دانت جب گر گئے جوانی میں

گھر سے ہر چیز ہو گئی غائب
فائدہ یہ ہے میزبانی میں

شاعرِ نیل ہو گئے لاغر
اپنی تھوڑی سی پہلوانی میں

خُوب ہے حُسن و عشق کا بزنس
اُن کا شُبھ لابھ میری ہانی میں

قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے کھوپچ
چھید شائد ہے چائے دانی میں

مسز [illegible]

○

ہے میرا لین دین شری گھاسی رام سے
واقف نہیں ہوں میں کسی سید امام سے

میرے سپرد کر دیا کچھ اپنا کام بھی
خوش ہو گیا جو باس مرا میرے کام سے

مَیں ٹاپتا ہوں دیر سے کھڑکی کے سامنے
گھر میں پڑے ہوئے ہیں وہ سردی زکام سے

مُنہ سے لگا کے شیشہ جو پیتے تھے کل تلک
پینے لگے ہیں آج گرامبہ وہ جام سے

کمرے میں بیٹھ کر کبھی بنگلے پہ چڑھ کے مَیں
"آواز دے رہا ہوں تجھے ہر مقام سے"

کہتا ہوں اُس کو آپ تو، کہتا ہے مجھ کو تُو
پالا پڑا ہے مجھ کو عجب بدکلام سے

آؤ میرے مکان تو جائیں گے سیر کو
نزدیک ہے مکان مرا باغِ عام سے

جگرؔ خدا کے واسطے بکواس مت کرو
محفل ہوئی ہے بور تمہارے کلام سے

جگرؔ نظام آبادی

○

[عزیز قیسی کی غزل ع
عالم یہ نہ تھا اُن کی ملاقات سے پہلے
سے متاثر ہو کر، معذرت کے ساتھ!]
واقف تو نہ تھا اُن کی مَیں عادات سے پہلے
اب ہوتی ہے تکرار ہر اک بات سے پہلے

دن رات رُلاتے ہیں مجھے خون کے آنسُو
یہ رنگ نہ تھا پیار کی برسات سے پہلے

شادی تو بنی ہے مری اِک قیدِ مسلسل
مسرُور بہت تھا میں حوالات سے پہلے

ہر شام تو جاتے ہیں وہ پکچر کو برابر
بچوں کو سُلاتا ہوں مَیں ہر رات سے پہلے

ہر بات پہ دیتے ہیں مجھے بھائی کی دھمکی
شہ جیسے دیا کرتے ہیں سب مات سے پہلے

شیخ آر۔ رحیم الدین
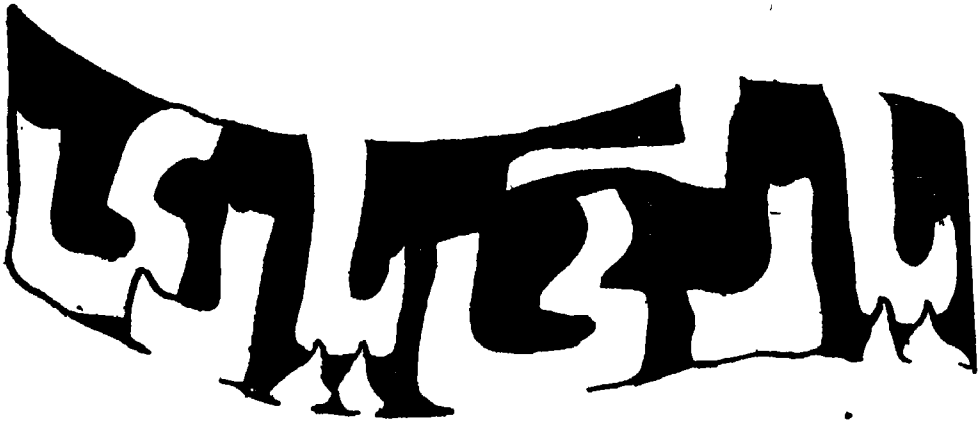
رفیق جعفر

●●● ایک ہمارے دوست تھے ۔ دوست کیا تھے یوں کہئیے ہمارا سایہ تھے ۔
ہم نے موصوف کے متعلق بہت کچھ سُن رکھا تھا کہ موصوف انتہائی خودغرض، موقع پرست اور ابن الوقت قسم کے آدمی ہیں ۔ دوسروں کے ساتھ غلط کام کئے ہوں لیکن ہمارے ساتھ بہت ہی اچھے تھے ۔ ہماری بات سنتے تھے ۔ ہمارے لطیفوں پر ہنستے تھے ۔ ہمارے انشائیوں پر سر دُھنتے اور ہماری جی کھول کر تعریف کیا کرتے تھے ۔ اگر کوئی ہماری مخالفت کرتا تو اُس سے لڑ بھڑ بھی جاتے تھے ۔ چنانچہ ہم نے سوچا کہ یہ شخص ہم سے اچھا ہے تو پھر ٹھیک ہے یار کی یاری سے کام ۔

عزیزوں دوستوں کو یہ "ہاتھ" بھی دے چکے ہیں ۔ لیکن ہم نے ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اس قسم کی ساری باتیں جھٹک دی تھیں کیونکہ یہ پہلے ہی دوسروں کے ساتھ غلط کام کئے ہوں لیکن ہمارے ساتھ بہت ہی اچھے تھے ۔

ایک دن ہم اپنے گھر میں آرام کر رہے تھے کہ موصوف تشریف لے آئے ۔ ہماری بیگم نے کہا " اجی دیکھو تمہاری دُم آئی ہے ۔ بیگم نے جب دو تین مرتبہ یہ جملہ کہتے ہوئے ہمیں جگانے کی کوشش کی تو ہم دبکی مارے پڑے سوچنے لگے کہ آخر ہماری بیگم کہنا کیا چاہتی ہیں ۔ بہرحال ہم نے اُس وقت تک آنکھیں نہیں کھولیں جب تک کہ بات سمجھ میں نہ آئی ۔ جب بات سمجھ میں آگئی تو ہم نے بیگم سے چپکے سے کہا : " بیگم اُس اُلّو کی دُم سے کہو کہ ہم گھر پر نہیں ہیں " ــــــ ہماری بیگم قہقہے لگانے لگیں تو ہماری سمجھ میں آیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بیگم نے موصوف کو ہماری دُم کہا تھا ۔ چنانچہ ہم بھی ہنسنے لگے ۔ ہنسی ذرا تھمی تو معلوم ہوا کہ بیگم نے موصوف کو ڈرائینگ روم میں بلا کر بٹھا دیا ہے اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ہم بہ نفس نفیس موجود ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں حاضر ہونے والے ہیں ۔ بیگم کی اس حرکت پر ہمیں بہت افسوس ہوا بلکہ غصہ آگیا ۔ ہم نے کہا ، تم تو

بس ہمیشہ ہی بغیر سوچے سمجھے کچھ بھی کام کر لیتی ہو" ۔۔۔ ہمارے یہ کہنے کی دیر تھی کہ بیگم جنگ پر آمادہ ہوگئیں ہم کچھ بول رہے تھے وہ کچھ بول رہی تھیں۔ گویا مکالموں کی ادائیگی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

اُدھر ہمارے دوست موصوف ہمارا انتظار کر رہے تھے اور اِدھر گھر میں "مہابھارت" چھڑ گئی تھی۔ ہماری بیگم اتنی زور زور سے چلا رہی تھیں کہ چھت کے ٹوٹ پڑنے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ ہم نے کہا: "بیگم کیوں خواہ مخواہ چھت کو اپنے نازک سر پر اٹھائے کھڑی ہو، یہ بوجھ تم سے سہا نہیں جائے گا۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ ہم اپنے دوست سے مل کر آتے ہیں۔ الغرض بڑی مشکل سے ہم نے اپنی بیگم کو چپ کیا اور ڈرائینگ روم میں چلے گئے۔ وہاں ہمارے دوست بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ ہمیں ان کی مسکراہٹ میں طنز کا زہر چھپا نظر آیا۔ ہمیں لگا کہ یہ ہماری گھریلو زندگی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ہم نے کہا: "کیا بات ہے بھئی کیوں خواہ مخواہ مسکرا رہے ہو!" یہ سن کر تو موصوف کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ ہمیں محسوس ہوا کہ یہ یقیناً ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ہم نے ذرا تلخ لہجے میں کہا:

"یہ کیا مذاق ہے بھئی، کہو کیا بات ہے؟"

"جی کچھ نہیں" ۔۔۔ اتنا کہکر وہ بدستور مسکرانے لگے۔ ایک بار ہمیں غصہ آگیا۔ ہم نے کہا:

"کیا آپ کے گھر کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔ یہ میری اور میری بیوی کا معاملہ ہے جناب، آپ کیوں بیچ میں ....."

ہم اپنی بات بھی پوری نہیں کر پائے تھے کہ موصوف نے کہا: "کیا بات ہے میں سمجھا نہیں!"

"آپ سمجھ بھی نہیں سکتے" ہم نے رعب دار آواز میں کہا۔

وہ بوکھلا گئے کہنے لگے: "کون سے جھگڑے، آپ کہہ کیا رہے ہیں؟" ۔۔۔ ہم ان کی بات کا جواب بھی نہیں دے پائے تھے کہ ہماری بیگم آگئیں اور آتے ہی ہم پر برسنے لگیں: "شرم نہیں آتی آپکو گھریلو باتیں اپنے دوستوں کے سامنے کہتے ہوئے اور اگر میں ساری رام کہانی سنا دوں تو اس محلے میں رہنا دشوار ہوجائے گا تمہارا۔ سمجھے!"

بیگم کی اس دھمکی نے ہماری نیند کی غنودگی کو بھگا دیا اور ہوش کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ ہم پریشان تھے کہ یہاں ایسی ویسی بات وات تو ہوئی نہیں یہ خواہ مخواہ کا جھگڑا لکھڑا ہوگیا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟۔ ہم نے بیگم کو اپنے کمرے میں لے جاکر خوب خوب خوشامدیں کیں۔ اور بہت ساری فرمائشیں پوری کرنے کے وعدے بھی کئے۔ تب کہیں جاکر بیگم کا غصہ ٹھنڈا پڑا۔ جب ہم واپس آئے تو موصوف پھر ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے جی چاہا کہ انہیں گولی سے اڑادیں۔ لیکن ہاتھ میں بندوق نہیں تھی۔ سوچا اپنے "منے" سے غلیل ہی لے لیں تاکہ اس وقت کام آئے لیکن "منے" کو جگانے کا مطلب تھا بیگم سے پھر ایک بار جنگ! یہ سوچکر ہم گھبرا گئے اور جھلا کر بولے۔

کیا بات ہے یار بولو نا۔ ہمیں نیند آرہی ہے"

جواب میں وہ پھر مسکرانے لگے۔ اب تو ہمارا غصہ شباب پر تھا۔ ہم مارے غصے کے لال پیلے ہوگئے تھے۔ اور یہ سوچ رہے تھے کہ اب کے اگر موصوف مسکرائے تو ان کی تو خیر نہیں۔ ان کو ہم اتنا پیٹیں گے، اتنا پیٹیں گے کہ انھیں اپنی چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ ہمارے بگڑے تیور دیکھکر موصوف یکدم سنجیدہ ہوگئے اور ہمارے ساتھ نفسیاتی حربے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ہماری شہرت کی باتیں کرنے لگے۔ ہمارے انشائیوں کے جملے دہرانے لگے۔ ہماری تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیا۔ جب موصوف نے دیکھا کہ ان کے نفسیاتی حربے کامیاب ہوگئے ہیں تو وہ بولے ۔۔۔۔۔۔ "حضور میں آج آپکو ایک خوشخبری سنانے آیا ہوں" ہم نے کہا: "جلدی سے کہئے

کیا بات ہے؟" وہ بولے ——— "حضور میں شاعر بن گیا ہوں" ہم نے کہا "وہ کب سے" وہ بولے: "کل رات سے ......" ہم نے انھیں مبارکباد دی لیکن ہمارا دل اندر ہی اندر کہہ رہا تھا: چلو ایک اور گیا کام سے!

"خدا نخواستہ آپ ہمیں اپنا کلام تو سنانے ......" ہماری بات کو کاٹتے ہوئے موصوف بولے:

"جی آپکو نہیں تو اور کسکو سناؤں گا!" ہم موصوف کی یہ بات سُن کر چکرا گئے پھر ہمیں شرارت سوجھی ہم نے بیٹھے بیٹھے اچانک چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ہماری بیگم دوڑی دوڑی آئیں ہم نے موقع تلاش کر کے ہماری بیگم سے کہدیا کہ ہمیں کچھ بھی نہیں ہوا فکر نہ کریں ذرا موصوف کی خبر لے لیں" ——— ادھر ہمارے دوست موصوف شاعری واعری بھول بھال کر حیران پریشان کھڑے ہماری بیگم سے کہنے لگے:

"بھابی کہو تو ڈاکٹر کو بُلا لاؤں" موصوف کا یہ کہنا ہی تھا کہ ہماری بیگم نے انھیں خوب ڈانٹا پھٹکارا اور کہا: "آپ کی وجہ سے میرے شوہر کی یہ حالت ہوگئی ہے اب آپ کی ہمدردی کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ مہربانی کر کے چلے جائیے یہاں سے ..."

موصوف خاموشی سے باہر نکل گئے اور ہم اُٹھکر بیٹھ گئے اور بیگم کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگے۔ بیگم نے پوچھا، "کیا ہوا تھا تمہیں یہ سب ڈرامے کی ضرورت کیا تھی" ——— پھر ہم نے کہا کہ موصوف نے شاعری شروع کر دی ہے تو بیگم ہنسنے لگیں اور بولیں: "اس کا مطلب ہوا کہ آپ کی دُم کٹ گئی" ہم نے کہا "کٹ گئی ورنہ وہ سانپ بن کر ہمیں ڈس لیتی" ——— ہم دونوں اپنی کامیاب اداکاری پر ہنسنے لگے۔

آجکل ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ یار کی یاری سے کام رکھنے سے پہلے ان دنوں یار کے فعلوں پر بھی نظر رکھنا ضروری ہوگیا ہے کیونکہ پتہ نہیں کون کب....

یکم جون ۷۷ ۱۹ء سے سارے آندھرا پردیش میں فہرست رائے دہندگان پر سرگرمی سے نظر ثانی کی جا رہی ہے اور تمام اہل افراد کا نام شریک کرنے کے لئے شمار کنندے ہر گھر تک پہنچیں گے۔ اگر آپ کی عمر یکم جنوری ۷۷ ۱۹ء کو (۲۱) سال ہو اور کوئی خامی نہ ہو تو آپ کو یہ حق ہے کہ اپنا نام فہرست رائے دہندگان میں شریک کرائیں۔ شمار کنندہ بہت جلد آپ کے مکان پر پہونچے گا۔ براہ کرم اس سے تعاونِ عمل کیجئے۔ صحیح تفصیلات فراہم کیجئے۔

اگر ۲۵ جون ۷۷ ۱۹ء تک شمار کنندہ آپ کے گھر تک نہ پہنچے یا پھر شمار کنندہ کے فارم کی مثنیٰ کاپی بھی نہ دے تو ایسی صورت میں آپ فی الفور حسبِ ذیل عہدہ داروں سے ربط قائم کرسکتے ہیں۔

قریبی ریونیو ڈویژنل آفیسر یا تحصیلدار
(مضافات میں)

دونوں شہروں، حیدرآباد اور سکندرآباد میں

علاقہ حیدرآباد:
متعلقہ ڈپٹی کمشنرس سرکل آفس میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد حیدرآباد
یا
اڈیشنل کمشنر (ریونیو) میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد حیدرآباد

فون نمبر 57796 57763

علاقہ سکندرآباد:
ڈپٹی کمشنر میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد
سکندرآباد (فون: 72012)

DIPR

کے۔ بی۔ لال
چیف الکٹورل آفیسر

موسیٰ ابوخالد

ماڈرن فقیر

پرانے زمانے میں بھیک مانگنا بہت ہی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ معذور اور مجبور لوگ مجبوری کے تحت بھیک مانگا کرتے تھے مگر آج کل اچھے خاصے تندرست لوگ اس پیشہ کو اپنائے ہوئے ہیں جب کہ معذور اور اپاہج بھی کسی نہ کسی طرح محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ فقیر آپ کو پیدائشی مقام گھر اور دواخانہ سے لے کر آخری مقام قبرستان تک مل جائیں گے۔ مسجد، مندر، ہوٹل، بس اسٹانڈ، ریلوے اسٹیشن۔ یہ سب فقیروں کے جنکشن ہیں جہاں سے وہ مختلف سڑکوں میں بٹ جاتے ہیں۔ آج کل سڑکوں پر فقیروں کی تعداد کافی ہوگئی ہے، سڑک کے چلنے والوں میں ہر تیسرا آدمی آپ کو فقیر کے روپ میں ملے گا۔

جو فقیر آپ کو بس اسٹانڈ پر ملیں گے وہ، یہ دیکھ کر بھیک طلب کریں گے کہ مطلوبہ مسافر کہاں تک سفر کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ کتنا سامان ہے، اس کے جسم کے کپڑوں کی قیمت کیا ہے۔

فقیروں میں ایسے فقیر بھی ہوتے ہیں جو لوگوں کے لئے بجائے زحمت کے راحت کا ذریعہ بن جاتے ہیں مثال کے طور پر ایک مرتبہ بس اسٹانڈ پر دو صاجبین آپس میں باتیں کر رہے تھے، اُن میں سے ایک لڑکی کی شادی ہونے والی تھی، دولہے والوں کی جانب سے جوڑے کی رقم کا زور و شور سے مطالبہ ہو رہا تھا، ایک فقیر جو کونے میں کھڑا تمام باتیں سن رہا تھا اور اس کی ایک ٹانگ دنیا کی راہوں سے بے خبر تھی، لنگڑاتا ہوا وہ صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا "معاف کرنا آپ مجھے بھیک تو نہیں دے سکیں گے مگر میں آپ کو دو ہزار روپے ماہوار دو روپے سیکڑہ کے حساب سے قرض دے سکتا ہوں۔ ہم دور کھڑے یہ سارا تماشہ دیکھ رہے تھے دم بخود ہوگئے اور جو صاحب پریشانی اظہار کر رہے تھے، وہ اپنے چاروں طرف پریشانی سے دیکھ رہے تھے، ان کو شاید اس بات کی ندامت تھی کہ فقیر کے کہے ہوئے الفاظ کو کوئی سن نہ لے۔

جو فقیر ریلوے پلیٹ فارم کو اپنا مسکن بناتے ہیں وہ کسی بھی آدمی کو زیادہ تنگ نہیں کرتے کیوں کہ ان کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ ریل سے سفر کرنے والوں میں اکثر بلاٹکٹ ہی سفر کرتے ہیں مگر ان فقیروں کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اُن کی نظر مسافروں کے سامان پر زیادہ رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ریل سے سفر کرتا ہے تو سفر ختم ہونے تک کسی نہ کسی چیز کو کہیں نہ کہیں کھو دیتا ہے۔ سوائے بیوی کے۔ جو ہر وقت، ہر صورت میں موت تک اس کے ساتھ رہتی ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہم اپنے گھر میں تشریف فرما تھے کہ باہر سے آواز آئی، صاحب ذرا باہر تو آئیں" ہم یہ سمجھے کہ مالک مکان کرایہ طلب کرنے آئے ہیں یا پھر سردارجی اپنا قرض واپس لینے کے لئے تشریف فرما ہیں، ایک کلرک ہونے کی وجہ سے ہماری زندگی میں دو ہی چیزوں کی بہتات تھی ایک تو کثرت اولاد، دوسرے قرض اور ادھار، ہم ڈرتے ڈرتے سہمے سہمے جب باہر نکلے تو ایک صاحب جو کافی تندرست اور ہشاش بشاش تھے اور جن کے پیر پر ایک عارضی پٹی بندھی ہوئی تھی فرمانے لگے " میں کافی تکلیف میں ہوں اگر آپ دو روپے سے

میری مدد کریں تو عنایت ہوگی ہم حیرت میں تھے کہ یہ بھی کوئی طریقہ ہے بھیک مانگنے کا کہ کسی کو گھر سے نکال کر ایسی شان سے بھیک طلب کی جاتی ہے جیسے وہ ہمارے داماد ہیں جن کی فرمائش پوری نہ کرنے پر ہماری بیٹی کی پر مسرّت زندگی کو خطرہ لاحق ہو۔

موجودہ دَور میں کچھ ماڈرن فقیر ایسے ہیں جو وقتی طور پر پیشہ فقیری اختیار کرتے ہیں اور بقیہ دن بڑے آرام سے گذارتے ہیں، یعنی بھیک مانگنا آج کل پارٹ ٹائم جاب ہوگیا ہے۔ ایسے فقیر کبھی اندھے کبھی بہرے اور کبھی لنگڑے کا کامیاب پارٹ ادا کرتے ہیں وہ اپنے پیشے کی خاطر کبھی بار بیوی کو مار دیتے ہیں یا پھر اس کے ہاتھ پیر توڑ دیتے ہیں ایسے فقیر جو ہر روز نئے انداز میں پیش ہوتے ہیں اور نئے نئے ڈھونگ رچاتے ہیں ان میں کافی ترقی کے امکانات ہوتے ہیں اور اکثر تو اُن میں آگے چل کر اسمگلر بن جاتے ہیں چنانچہ حال ہی میں بمبئی پولیس نے ایک ایسے فقیر کو پکڑا جس کی جھولی جو کہ گودام کی شکل اختیار کرگئی تھی، سے دو لاکھ روپیے برآمد ہوئے

بعض سنجیدہ فقیر ہوٹل کے بیرے بن جاتے ہیں اور ٹپ کی شکل میں اعلیٰ پیمانے پر بھیک وصول کرتے ہیں جس پر آج کل پڑھا لکھا بے روزگار طبقہ بھی عمل کرنے آمادہ ہے۔

اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض فقیر کسی کی صورت دیکھ کر اس شخص کے تاریخ جغرافیہ کا اندازہ بخوبی کر لیتے ہیں ایک صاحب راستے سے گذر رہے تھے کہ کسی فقیر نے روک کر اُن سے امداد مانگی' ان صاحب نے اپنے کچھ پیسے فقیر کو دینا چاہا' ان کو کافی ندامت ہوئی جب کسی بھی جیب سے پیسے نہیں نکلے' وہ بہت شرمندہ ہوئے' یہ بات فقیر بھانپ گیا اور کہنے لگا 'معاف کرنا کیا آپ شاعر ہیں اس پر انھوں نے جواب نہیں دیا۔ کیوں کہ فقیر کی بات بالکل صحیح تھی۔

آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ فقیری کے بھیس میں عاشقی بھی ہوا کرتی ہے' ایک نوجوان محبّت کے جال میں پھنس جانے کے بعد محبوبہ سے ملاقات کا کوئی بہانہ نہ مل سکا تو فقیر بن گیا حالانکہ عام طور پر لوگ شادی کے بعد فقیر بنتے دیکھے گئے مگر جو شخص شادی سے پہلے فقیر بن گیا ہو اس کی محبت کے مستقبل کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے وہ روز کسی نہ کسی بہانے محبوبہ کے گھر جاتا اور آواز لگاتا

"آیا ہوں تیرے در پہ' واپس نہ جاؤں گا"

اور اگر محبوبہ اور بھیک کے آنے میں دیر ہو جاتی ہے تو یہ آواز لگاتا ؎

تیرے آشیانے پہ ناتواں جبیں لے کر
لڑکھڑاتے آئے ہیں' واپسی نہیں ہوتی

جب محبوبہ اپنے معشوق کا اشارہ سمجھ جاتی ہے تو بھیک کے ساتھ ساتھ ایک عشقیہ چٹّھی بھی عاشق کی جھولی میں ڈال دیتی ہے جس میں آئندہ پروگرام کی تفصیل رہتی ہے۔

بعض فقیر ایسے بھی ہیں جو درگاہوں پر' پر مسرّت زندگی گزارتے ہیں مگر کبھی کبھی عید' بارات کے موقع پر تفریحاً گھریلو فقیر کی طرح دوسرے گاؤں میں جاکر بھیک مانگتے ہیں' ایسے فقیر جو کہ جلالی ہوتے ہیں عام طور پر لوگوں کو ڈراتے دیکھے گئے۔

کسی گھریلو فقیر نے آواز لگائی' جب کافی دیر ہوئی کسی قسم کا جواب یا بھیک نہیں آئی تو فقیر نے چلّا کر کہا "ارے کوئی ہے یا نہیں نہیں ہے تو کہہ دو' دوسرے گھر پہ بھی جانا ہے ہمیں" فقیر کی یہ بات سُن کر سبھی گھر کے افراد غصّہ کی حالت میں باہر آئے اور کہنے لگے "جب آپ کو اتنی فرصت نہیں ہے تو اتنی دیر یہاں بھیک مانگتے کیوں کھڑے رہے۔

اس پر فقیر نے کہا۔۔۔ "تمیز سے بات کرو۔ ہم درگاہ کے فقیر ہیں' خواجہ صاحب سے شکایت کر دوں گا"۔

پہلے زمانے میں فقیر اپنی مجبوری کی خاطر بھیک مانگتے تھے' اُن کی آواز میں درد اور تڑپ ہوتی تھی وہ درد بھری آواز لگاتے "روٹی کا سوال ہے بابا' دونوں آنکھوں سے نابینا ہوں بابا' دو دن سے بھوکا ہوں بابا' پیٹ کے لئے بھیک مانگ رہا ہوں بابا۔
—— روٹی کا سوال ہے بابا"

مگر آج کل کے ماڈرن فقیر اپنی خواہشات پورا کرنے بھیک مانگتے ہیں، ان کی آواز اس طرح ہوتی ہے " مدد کرو بابا' جاتے جاتے دو روپیا دیتے جاؤ بابا' کپڑوں کا سوال ہے بابا ۔ ایک بیڑی چاہیئے صاحب' شادی ہوگئی ہے بستر کا سوال ہے بابا' بچہ ہوا ہے' جھولے کا سوال ہے بابا ۔ یہاں تک کہ فقیر مئے خانے پر بھی جاکر یہ آواز لگاتا ہے ۔

یا رب یہ میکدہ ہے یا میدان کربلا
پینے کی بات نہ یہاں پلانے کی بات ہے

لوگوں کا کہنا غلط ہے کہ فقیری زندگی میں سوائے غربت اور لاچاری کے کسی چیز کا دخل نہیں ہوتا' فقیر اپنی ڈیوٹی یعنی بھیک مانگنے کے علاوہ دوسرے مشاغل میں بھی حصہ لیتا ہے مثلاً پکچر دیکھنا' تاش کھیلنا' سیاسی مشاغل پر گھنٹوں بحث کرنا وغیرہ ۔

غرض ایک عام آدمی اور فقیر کی زندگی میں فرق یہ ہوتا ہے کہ عام آدمی بھیک نہیں مانگتا بلکہ قرض لے کر مصیبتیں جھیل کر چپ چاپ موت کے دامن میں سو جاتا ہے جبکہ فقیر بھیک مانگ کر خوش حال اور خوش گوار زندگی گذارتا ہے اور کسی کا مقروض نہیں رہتا ۔

مطبوعات زندہ دلان حیدرآباد و دیگر مزاحیہ کتب

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعہ کلام	۳/۵۰
تیسرا نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰
مزاح شریفانہ	رشید قریشی	"	۳/۵۰
چھیڑ چھاڑ	پروفیسر یداللہ مہدی	"	۶/-
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	۶/-
مکرر ارشاد	برق آشیانوی	مجموعہ کلام	۴/-
لالہ زار	خواجہ عبدالغفور	مضامین	۵/-
قطع کلام	مجتبیٰ حسین	"	۳/۵۰
بہر حال	مجتبیٰ حسین	"	۷/-
گل و گلزار	خواجہ عبدالغفور	"	۶/-
قصہ مختصر	مجتبیٰ حسین	"	۶/-
در پردہ	مسیح انجم	"	۶/-
گستاخی معاف	ایم اے حنان	"	۶/-

(بتوسط شگوفہ)

جن کا غلام

ایم منظہر الزماں خاں

بچپن سے جنوں، بھوتوں اور شیطانوں کے قصے سُنتے سُنتے جب ہم بالغ ہو گئے تو ہمیں بھی کسی جن کو تابع کرنے کا شوق چرایا۔ کیونکہ حال ہی میں ہمارے پڑوسی مولوی رفیع الدین صاحب نے عمل زور سے ایک جن کو اپنا غلام بنایا تھا اور بقول ان کے وہ کسی بھی وقت اُس کو بلا کر ہر طرح کا کام لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کے تعویذ فلیتوں کا کاروبار بھی بڑے زوروں پر چل رہا تھا۔ جس کی وجہ سے انھیں کافی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ اور ہم تو ایک بے روزگار گریجویٹ تھے اور اب تک ملازمت کے لیے سینکڑوں دروازے کھٹکھٹا چکے تھے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ـــــ چنانچہ اب کی بار ہم نے بھی اٹل ارادہ کر لیا تھا کہ مولوی رفیع الدین صاحب سے عمل سیکھ کر کسی جن کو ضرور بہ ضرور اپنا غلام بنائیں گے۔ لہٰذا ہم نے نہ صرف مولوی رفیع الدین صاحب سے میل ملاپ بڑھانا شروع کیا بلکہ اُن کے گھر کے ملازم بھی بن گئے یعنی سودا سُلف بھی لایا کرنے لگے اور موصوف سالے بھی مفت ہاتھ آئے ہو جتے اس خاکسار غلام سے خوب رگڑ کر کام کیا لیا۔ چنانچہ ہم بھی بڑی دلچسپی سے اُن کے سارے گھر کا کام بڑی خوشی سے کرنے لگے اور جب جب کام کرتے کرتے ایک سال کا طویل عرصہ گذر چکا تو ایک دن ہم نے موصوف سے کہا کہ قبلہ۔ ہمیں بچپن سے جنوں، بھوتوں اور شیطانوں سے نہ صرف دلچسپی رہی ہے بلکہ ہم اُن کے عاشق ہو گئے ہیں اور مدتوں سے یہ آرزو دل میں مچل بلکہ اُبل رہی ہے کہ ہم بھی آپ کی طرح عامل بن کر اپنے عمل سے کسی جن یا بھوت کو اپنا غلام بے دام بنائیں۔ اگر جناب اس خاکسار پر کرم فرمائیں تو کوئی جن یا بھوت یا پھر کم از کم شیطان آنکھیں میچ کر خادم کے قدموں میں چلا آئے گا۔ بشرطیکہ جناب کی نظرِ عنایت ہو ـــــ اور ہماری اس خواہش کو سن کر موصوف نے ہمیں سرتا پا گھور کر دیکھا اور پھر اپنا داتیں ہاتھ اُٹھا کر گردن پر ملتے ہوئے کہا ـــــ " بڑے دل گُردے کا کام ہے بچے ـــــ جن کو اپنا غلام بنانا کوئی مذاق نہیں ہے۔ سمجھا!" ـــــ ہم نے دست بستہ عرض کیا۔ " جناب ہمارے پاس دل اور گُردہ۔ دونوں موجود ہے۔ بس آپ کی ایک نگاہِ التفات چاہیئے ـــ " وہ بولے: " ٹھیک ہے۔ مگر تجھے اکیس دن کا چلّہ بیٹھنا ہوگا۔ ہم نے گھبرا کر فوراً کہا۔ " جناب! چلّہ اور چھٹی تو عورت کی ہوتی ہے اور ہم تو پورے کے پورے مرد ہیں ـــــ وہ بولے۔ " ارے بیوقوف وہ چلّہ نہیں ہے۔ ہم تجھے اُس چلے کی بات بتا رہے ہیں جو ایک بند کمرے میں بیٹھ کر علم سے عمل کیا جاتا ہے۔" " جی ہاں! اب اچھی طرح سمجھ میں آگیا ہے۔" ہم نے کہا۔ " پھر خادم کو کب اجازت ہے؟ ـ وہ بولے۔ " آئندہ ہفتے پہلی جمعرات ہے۔ بس تو اُسی دن سے عمل شروع کر دے۔ ہم تجھے جن کو تابع کرنے کا علم سِکھا دیں گے۔ مگر یاد رکھ۔ اگر ذرا بھی بھول چوک کی تو تیری خیر نہیں اور پھر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ سمجھا کہ نہیں سمجھا!؟ ـــ ہم نے

کہا۔ آپ مطمئن رہیو۔ آخر ہم نے بھی آپ شاگرد ہیں کسی نائی کے نہیں۔" اور ہماری اسی بات پر وہ خوشی سے پھول گئے۔ اور ہماری پیٹھ پر شفقت سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ہم تیری جرأت کی داد دیتے ہیں ورنہ کئی آتے اور سنتے ہی دم دبا کر بھاگ گئے۔ اور تو پہلا شخص ہے جو اپنے ارادے کا اٹل معلوم ہوتا ہے۔ اور ہم نے بڑے ادب سے پھر وہی جملہ دہرایا۔ چنانچہ ہم باقاعدہ مسلسل ایک ہفتے تک جن کو تابع کرنے کا عمل بہت دل دلچسپی سے سیکھتے رہے اور جب اچھی طرح سیکھ چکے تو بقول مولوی رفیع الدین صاحب کے نہا دھو کر ایک کمرے میں بند ہو گئے۔ اور اُن سے سیکھا ہوا جن کو تابع کرنے کا علم پڑھنے لگے ــــ اکیسویں دن ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ پورا گھر بلکہ پوری دنیا ایک نقطے میں سمٹ گئی ہے اور وہ نقطہ آہستہ آہستہ پنڈولم کی طرح جھول رہا ہے ــــ ہم گھبرا گئے۔ مگر فوراً مولوی صاحب کی نصیحت ہمیں یاد آگئی کہ اگر ڈر کے مارے ذرا سی بھی بھول چوک ہو گئی تو پھر ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ یعنی ہم بجائے جن پر مسلط ہونے کے جن ہم پر مسلط ہو جائے گا۔ اور ہم پاگلوں کی طرح گلی گلی، کوچہ کوچہ کپڑے پھاڑ کر مجنوں کی طرح گھوما کریں گے۔ چنانچہ جوں ہی ہمیں مولوی صاحب کی نصیحت یاد آئی ہم فوراً سنبھل گئے اور ہمت کر کے پڑھنے لگے۔ جب اکیسویں رات ختم ہونے کے لیے چند منٹ باقی رہ گئے تو ایک دردانگیز چیخ ہمیں سنائی دی اور دفعتاً ایک دھوئیں کا مرغولہ کھڑکی کے راستے سے ہمارے کمرہ میں داخل ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہ دیو قامت ــــ پیکر کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ اور جب وہ مکمل شکل اختیار کر چکا تو آواز آئی ــــ "آقا!" آج سے میں آپ کا غلام بن چکا ہوں ــــ اور آپ کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرتا ہوں ــــ اس آواز پر ہم چونکے اور پھر اپنی جھکی ہوئی نگاہیں اٹھا کر دیکھا ــ اُس کا سر ہمارے کمرہ کی چھت کو چھو رہا تھا اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی ــــ وہ سفید کھادی کا کرتا اور سفید کھادی کا پاجامہ میں ملبوس تھا ــــ اُسے دیکھ کر ہم نے خوشی سے نعرہ لگا کر کہا ــــ "ایک مرتبہ پھر کہو ــــ" کیا واقعی تو ہمارا غلام ہے؟ ــــ وہ دست بستہ عرض کیا ــــ " ہاں آقا! میں آپ کا غلام ہوں۔ اور آج سے آپ میرے آقا ہیں۔ اور ہم نے آقا اور غلام والا جملہ بار ہا اس سے کہلوایا کیونکہ کان اس ایک لفظ "آقا" سننے کے لیے بچپن سے ترس رہے تھے اور آج ہماری آرزو بر آئی تھی۔ اس لیے ہم سینکڑوں مرتبہ سُنے جا رہے تھے ــــ "آہ!" یہ دونوں لفظ کتنے پیارے ہیں۔ "آقا اور غلام! ــ ازل سے ابد تک گہرے کی بنی ہوئی زنجیر کی طرح ۔ کڑیاں در کڑیاں۔ اور ان دو لفظوں کے بیچ پوری دنیا گردش کر رہی ہے۔ پھر بھی آقا اور غلام کی گردان ابد تک ختم نہیں ہو گی کیونکہ ان دو لفظوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔

"کہتے رہو۔" وہ چند لمحوں کے لیے رُکا تو ہم نے کہا۔ تمہاری زبان سے لفظِ آقا سن کر ہمیں دلی خوشی ہو رہی ہے۔ اس لیے مسلسل کہتے رہو۔

"میرے اچھے آقا۔" وہ بڑی معصومیت سے بولا۔ اگر حکم ہو تو میں اپنی تازہ غزل کے چند شعر سُنا دوں۔ کیونکہ ایک طویل عرصے سے مجھے کوئی اچھا سامع نہیں ملا۔ اس لیے میرے پیٹ میں شدید مروڑ ہو رہی ہے۔ اور جب تک میں کسی کو اپنے اشعار سُنا نہیں دیتا۔ یہ ظالم درد مجھے چین نہیں لینے دیتا اس لیے آقا کا ورد پھر کروں گا پہلے آپ میرے اشعار سماعت فرمائیے۔ جن پر اردو اکیڈمی کی طرف سے حال ہی میں انعام حاصل ہو چکا ہے۔

"تم شاعر ہو؟!" ہم نے تعجب سے غلام کو گھورتے ہوئے کہا ــــ وہ بولا۔" ہاں میرے آقا۔ مجھے شعر و شاعری کا

خبط ہے اور میرا تخلص "ریز" ہے۔

"ریز — !" ہم نے مزید حیرت کا اظہار کیا — صرف ریز یا آگے پیچھے کچھ اور بھی ہے؟"

وہ بولا۔ بات دراصل یہ ہے آقا کہ میرا تخلص ریز ہے اور میری بیوی کا "ترنم" اس طرح دونوں کو یکجا کیا جائے تو ترنم ریز ہو جاتا ہے۔

"کیا تمہاری بیوی بھی شاعرہ ہے؟" ہماری آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں۔ "وہ بولا"۔ وہ شاعرہ تو نہیں ہے۔ ہاں البتہ افسانہ نگار ہے اور اس کے مجموعے پر بھی اُردو اکیڈمی کا انعام مل چکا ہے۔

"بہت خوب! ہم نے کہا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم دونوں یکجا ہوئے کیسے میرا مطلب ہے کہ تمہاری شادی کیسے ہوگئی۔

"دراصل بات یوں ہے میرے آقا۔ وہ بولا۔ ایک ادبی محفل میں ہم دونوں کو مدعو کیا گیا تھا اور وہاں "وہ" اور اس کا افسانہ دونوں مجھے پسند آ گئے اور اُسے میرا کلام بھا گیا۔ چنانچہ ہم دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اگر ہم ایک ہو جائیں گے تو ہماری اُولاد یقیناً نقاد نکلے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب ہمارا لڑکا پیدا ہوا تو وہ بڑا ہو کر نقاد بن گیا مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ظالم نے سب سے پہلے ہم دونوں پر ہی تنقید کی۔ اور اپنی ماں کی افسانہ نگاری کو خبطی کی بے جوڑ داستان قرار دیا اور میری شاعری کو مجنوں کی بڑ لکھ دیا اس کے باوجود اُسکی کتاب پر بھی اکیڈمی کا انعام ملا۔

"ہاہاہا! ہم بے ساختہ ہنس پڑے۔

"بہت ایماندار نقاد ہے تمہارا بیٹا۔! ہم نے کہا: "پہلے آقا کا ورد جاری رکھو۔ پھر کبھی ہم تمہارا کلام سنیں گے۔ اور وہ حقارت سے ہماری طرف دیکھ کر شروع ہو گیا۔ آقا میں آپ کا غلام ہوں اور آپ میرے آقا ہیں۔

کئی گھنٹوں کی مسلسل گردان کے بعد وہ بولا۔ آقا کہتے کہتے میرا حلق خشک ہو چکا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ غلام تھوڑا سا پانی پی کر آئے گا۔

"اجازت ہے!" ہم نے شاہی لہجے میں کہا۔ اب تجھے چھٹی دی جاتی ہے۔ مگر ہم جب بھی تین مرتبہ دستک دیں تو فوراً چلے آنا اور صبح دس بجے سے شام کے پانچ بجے تک آقا کی مالا جپتے رہنا۔ بس یہی تیری ڈیوٹی ہوگی۔

جو حکم میرے آقا! یہ کہہ کر وہ دھوئیں کی شکل میں غائب ہو گیا۔ اور اس طرح ہر روز وہ آتا اور پورے آٹھ گھنٹے آقا کی مالا جپ کر چلا جاتا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد ہم نے اس میں کچھ جھنجھلاہٹ محسوس کی اور پھر وہ جھنجھلاہٹ روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ ایک دن معاً ہمارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں غلام کہتے کہتے اس کی اَنا نہ جاگ جائے اور جب کسی غلام کی اَنا جاگتی تو ایک انقلاب آتا ہے۔ تب آقا، آقا نہیں رہتا اور غلام، غلام نہیں رہتا۔ اور جوں ہی یہ خیال ذہن میں آیا تو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب ہم میں آقا بنے رہنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے اور اس میں غلام بنے رہنے کی۔ لہذا بہتر ہے کہ پانی سر سے اُونچا ہو جائے ہم نے ایک رات اُسے بلا کر پورے ایک ہزار نو سو سینتالیس منٹ کے بعد آزاد کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنا کرایہ کا مکان بھی خالی کر کے اپنے دیس کو چلے گئے ——— !!

قبائیلی بہبود کے لئے نئی طرز سے جد وجہد

جنوبی ہندوستان میں آندھرا پردیش قبائیلیوں کی کثیر ترین آبادی رکھتا ہے یعنی ۱۶،۵۷ لاکھ ۔ اس لئے ہمارے پانچسالہ منصوبوں میں قبائیلی بہبود کی جانب ترجیحی توجہ دی گئی ہے ۔ اس ضمن میں پہلے منصوبے میں ۱۸۸،۷۷ لاکھ روپے کے خرچ کی گنجائش فراہم کی گئی تھی ۔ دوسرے منصوبے کے دوران اٹنور ۔ اراکا ۔ نرسم پیٹھ اور بادیرد میں ۴ مقصدی پراجکٹس قائم کئے گئے ۔

تیسرے منصوبے کے دوران ۲۴ قبائیلی ترقیاتی بلاکس عالم وجود میں آئے ۔ چوتھے منصوبے میں خرچ کی گنجائش بڑھ کر ۷۳۴،۰۳ لاکھ روپے ہوگئی ۔ پانچویں منصوبے میں ترقی کی رفتار میں تیزی پیدا ہوئی ۔

آشرم اسکول قبائیلیوں کے لئے ایک نعمت عظمیٰ ہیں ۔ فی الوقت ۲۶۷ آشرم اسکول قائم ھیں ۔ جن میں ۱۶۶۵۰ قبائیلی طلباء کے لئے گنجائش موجود ہے ۔ سال ۷۷-۱۹۷۶ء میں اس مد پر ۱۱۶،۷۵ لاکھ روپے کا صرفہ آیا ۔

قبائیلیوں کے لئے قرض کی سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں گریجن کوآپریٹیو کارپوریشن کی سرگرمیاں ریاست کے ۲۱ اضلاع میں سے ۱۷ اضلاع پر محیط ہیں ۔ یہ کارپوریشن ۴۰۲ گھریلو ضروریات کے ڈپوز اور ۲۸ ابتدائی سوسائٹیوں کے ایک جال کے ذریعہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے ۔

ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

DIPR 2-77-78

مشتاق شاہ

مسیح انجم ـــــ پردے کے پیچھے

درپردہ کیا ہے ؟

یہ کوئی نہیں جانتا! اور نہ کسی کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ دروازے پر پردہ اس لیے ڈالا جاتا ہے کہ اطمینان سے ہر وہ حرکت کی جائے جو پردے کے باہر سب کے سامنے ممکن نہیں!

یہ دوسری بات ہے کہ بعض حضرات اس نظریئے کے حامل ہوتے ہیں کہ پردے کے باہر بھی ایسی ویسی حرکت ہونی چاہیئے کیونکہ یہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ لہذا جائز ہے۔ اور اپنے اس نظریئے کی وکالت میں وہ بڑی عالمانہ تقریریں کرتے ہیں۔ اور اپنے معتقدین کو اس راستے پر لگا دیتے ہیں۔ لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ایسے حضرات کبھی اپنے نظریئے پر عمل نہیں کرتے۔ اور خود کو ایک پردے کے پیچھے نہیں بلکہ کئی پردوں کے پیچھے سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ ان کا ایک چہرہ ہی کیا، ان کی شخصیت کا، سرکاری اور غیر سرکاری زندگی کا، گھر کا، جائیداد کا، کاروبار کا، اور ان کی سوشیل مصروفیتوں کا ہر پہلو کسی نہ کسی پردے کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ اب کسے اتنی فرصت ہے کہ کوئی ان کے چہروں پر سے اور ان کے گھروں پر سے پردوں کو اٹھاتا پھرے!

پردہ اٹھانا اور پردہ ڈالنا اصل میں ایک ہی عمل کے دو مختلف طریقے ہیں۔ کبھی پردہ ڈالنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اور کبھی پردہ اٹھانا۔ ان دونوں کاموں کے لیے بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر اس وقت جب کہ کوئی اپنے چہرے پر سے، اور اپنے گھر پر سے پڑے ہوئے پردے کو اٹھادے۔

مسیح انجم نے نہ پردہ اٹھایا ہے۔ اور نہ پردہ ڈالا ہے۔ بلکہ بڑے سلیقے سے اپنے قاری کو پردے کے اندر رکھ لیا ہے!

دوسروں کے گھروں یا کمروں پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھانا یا تانک جھانک کرنا بڑا آسان کام ہے۔ اور یہ حرکت ایک نابالغ بھی کرسکتا ہے۔ لیکن پردے کے پیچھے چھپی ہوئی اپنی زندگی کو سب کے سامنے پیش کردینا صرف ایک ظرف کی نہیں بلکہ بڑے دل گردے کی بات ہے۔ دوسرے الفاظ میں خود کو کمرے سے، گھر سے نکال کر چوراہے پر لانا ہے ـــ مسیح انجم نے یہ سب کچھ اتنی خاموشی اور اعتماد کے ساتھ کیا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ کیا یہ نوجوان اتنا باحوصلہ ہوسکتا ہے! ویسے دیکھنے میں کسی رخ سے بھی یہ مسیح انجم، مسیح انجم نہیں معلوم ہوتا ہے جس کی طرف ابھی میں نے اشارہ کیا ہے۔ قفل

میں اس طرح خاموشی سے آئے گا اور کسی کونے میں یوں بیٹھ جائے گا کہ پتہ ہی نہیں چلے گا۔ دو چار آوازیں دینے پر قریب آئے گا اور اس طرح شرمائے گا جیسے کوئی لڑکی ــــ

بھئی مسیح انجم کہاں ہو؟

اماں یار بولتے کیوں نہیں ــــ کہاں چھپے بیٹھے تھے؟

پیچھے بیٹھا تھا ــــ

یہاں بھی مسیح انجم شرمائے گا۔ اور اس طرح جواب دے گا جیسے کسی ناجائز یا غیر قانونی فعل سرزد ہونے پر اُسے "ریڈ ہینڈڈ" پکڑ لیا گیا ہے ــــ!

ایسے میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ کی روشنی اس کے چہرے پہ دیکھی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ روشنی بھی اس کی مختصر داڑھی کی سیاہی میں کھو جاتی ہے!

پتہ نہیں وہ اپنے گھر میں بھی کھل کر مسکراتا ہے یا نہیں!

سوا پانچ فیٹ کا یہ خاموش خاموش سانولا سلونا نوجوان جو سر تا پا خاکساری کا ایک نمونہ ہے ادبی محفلوں اور دوستوں کے ہجوم میں یوں کھو جائے گا کہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ آوازیں دیتے جائیے ــــ پتہ چلتا ہے کہ ابھی مصطفےٰ کمال سے بات کر رہا تھا ــــ ابھی سمیع کے ساتھ دیکھا گیا ــــ اور مظہر الزماں خاں کے ساتھ بیچلر کوارٹرز کے قریب کی ہوٹل میں گھسا ہے۔ وہاں جا کر جھانکیے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کہیں اور ہے بلکہ "شگوفہ" کے دفتر میں بیٹھا ہوا مسکرا رہا ہے ــــ

مسکراہٹ اس لیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بیچلر کوارٹرز کے گراؤنڈ فلور سے تیسری منزل پہ پہنچ گیا۔ جیسے وہ زینہ پہ نہیں بلکہ ہمالیہ پربت پر کھڑا ہے۔ اور احباب اُسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ خاموش خاموش۔ جیسے وہ سب کا مذاق اڑا رہا ہے۔ جیسے وہ سب سے کہہ رہا ہے کہ ڈھونڈنے کے لیے نظر چاہیئے۔ اگر آپ میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑتی تو اِس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تو میں ہوں ــــ

میں ــــ میں ــــ مسیح انجم!

دیکھنے میں کیا سننے میں بھی مسیح انجم کے وجود کا احساس نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں یہ بات اُس کے فن اور اُس کی شخصیت دونوں پر بھی صادق آتی ہے۔ لیکن جیسے ہی مسیح انجم نظروں سے اُوجھل ہو جاتا ہے تو یوں احساس ہوتا ہے جیسے کسی چیز کی کمی ہے۔ کوئی چیز ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اس طرح اس کے مضمون کا اور اُس کے طنز کا کوئی تیر اور کوئی فقرہ دل کو پکڑ کے دینا لگتا ہے ــــ

پہلے پہلے میں نے کبھی اُس کا مضمون نہیں پڑھا۔ اور جب بھی اُس نے مجھ سے پوچھا میں نے اسے بڑے خوبصورت انداز میں ٹال دیا۔ مجھے اپنی اِس کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے "یا جھجک" چاہیئے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ پہلی اور دوسری ملاقات میں ہم کس کو اپنا دوست بنالیں یا کس کے دوست بن جائیں۔ بالکل اسی طرح مضامین کے ــــ

ــــ ادب کے بارے میں میں یہ محتاط رویہ کچھ مناسب نہیں ہوتا۔ پڑھنا تو سب کو چاہیئے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جب فنکار

ہی قاری کو اپنی طرف متوجہ نہ کرے تو پڑھنا کیسا ـــــ ؟

پہلے میں مسیح انجم سے واقف ہوا۔ اور بعد میں اُس کے مضامین سے۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ قاری کسی فنکار کے فن سے پہلے واقف ہوتا ہے۔ اور بعد میں شخصیت سے لیکن میرے ساتھ یا مسیح انجم کے ساتھ بات الٹی ہوئی۔ اس سے مسیح انجم کا نقصان تو نہیں ہوا۔ البتہ میرا نقصان ضرور ہوا کہ میں نے اسے دیر سے پڑھنا شروع کیا۔ کیونکہ مسیح انجم کی شخصیت سے واقف ہونے کے بعد میں خود کو آمادہ نہ کر سکا کہ اُسے پڑھوں میں شروع شروع میں یہی سوچتا تھا کہ اتفاقاً واجبی واجبی مختصر سا نوجوان کیا لکھتا ہوگا۔ لیکن اُس کی پہلی کتاب "سائیڈ سے چلیئے" میرے ہاتھ میں آئی تو میں چونک گیا۔

میں نے کہا، میرے نوجوان دوست! تمہارا جواب نہیں ـــــ

لیکن اس کے بعد سے آج تک میں حیران رہا کہ اس وقت میں نے اپنے ساتھ ایسی زیادتی کیوں روا رکھی۔ تجزیئے کے بعد ایسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس میں قاری کی حیثیت سے میرا قصور نہیں بلکہ شخصیت کا وہ تضاد ہے جو اس کے فن اور اُس کے وجود کے بیچ میں ایک لکیر کھینچتا ہے۔! اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مسیح انجم نے اپنی شخصیت کو ایک پردے کے پیچھے چھپا رکھا ہے۔ اور وہ پردہ ہے اُس کی مختصر داڑھی!

میں مسیح انجم کو پسند کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ یہ میرے عزیز دوست مصطفےٰ کمال کی دریافت ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اس نے لطیفہ گوئی اور مزاح کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچی ہے۔ بڈن خان، سبزی فروش، یا پیارے لال تاڑی والا اچھے، بُرے، بھونڈے انداز میں لطیفہ سنا کر کسی کو ہنسا سکتا ہے۔ یا سرکس کے کسی جوکر کی طرح اپنے سر پر ایک لمبی ٹوپی رکھ کر عوام کی توجہ اپنی طرف کر لیا، کوئی کمال کی بات نہیں۔ یا منہ بنا کر یا چڑا کر کسی سنجیدہ آدمی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ لانا کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا بھی کر سکتا ہے۔ لیکن دل کو چھو لینے والی بات کر کے لوگوں کو اس طرح ہنسانا کہ ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ ایک آرٹ ہے۔ اور اس آرٹ سے مسیح انجم واقف ہے۔ لیکن اس آرٹ کو اس نے ادب اور تنقید کی کسی کتاب سے نہیں بلکہ زندگی سے حاصل کیا ہے ـــــ

یہ مسیح انجم کی انفرادیت ہے ـــ

اور وہ اپنے لب و لہجے کی وجہ سے آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔

مسیح انجم کے ہر مضمون میں آپ کو کوئی نہ کوئی ایسی بات ملے گی۔ اور آپ کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائنگے۔ مسیح کے مختلف مضامین سے چند فقرے آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے :-

"مخلوط وزارت اور مشترکہ مکان میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ جس طرح ایک بڑا سیاست داں یا نجومی یہ حکم نہیں لگا سکتا کہ مخلوط وزارت کب ٹوٹے گی، بالکل اسی طرح یہ کوئی بھی دعویٰ کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ "مکان خالی کرد" کی دھمکی کب دی جائے گی۔ بہ الفاظ دیگر "مکان خالی کرد" کی ننگی تلوار ہمیشہ سروں پر لٹکتی رہتی ہے"

صـ ۱۲ "مشترکہ مکان"

"یہ بکری دوسری بکریوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ چارہ بھی کھاتی ہے اور کھانا، سالن، روٹی وغیرہ بھی تناول

فرماجاتی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ " وجھڑین " بھی ہے اور " نان وجیٹرین " بھی ——

" افسانہ در افسانہ "

" اعلیٰ قسم کے بار میں شراب پینے کی بجائے کمپاونڈ میں سینڈھی پیاکرتا تھا۔ یوں بھی ہر شاعر کا مالی موقف کمزور ہی ہوتا ہے۔ ورنہ سوچیے کہ سینڈھی اور شراب پینے والوں کو پینے سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ اصطلاحوں میں سوچیں۔ اور اصطلاحیں گڑھیں۔ "

" سفید شہر " صفحہ ۱۹

پینے کا ذکر کرتے ہوئے آگے چل کر کہتے ہیں ——

" شیخ اور لیڈر کو پیتے دیکھ کر ان کے شوہروں کی نیت بھی ڈانواں ڈول نہ ہو جائے۔ اگر بالفرض میاں اور بیوی ایک ہی کشتی کے سوار ہوں تو ذمہ داری اولاد کو پوری کرنی ہوتی ہے۔ "

صفحہ ۲ " سفید شہر "

" بھینسے کا دل اچانک بھینس کی بجائے گھاس کے بنڈل پر آگیا۔ وہ بھینس کو دھکا دے کر گھاس کی طرف یوں لپکا جیسے آج کل کے نوجوان لڑکی کی بجائے جہیز اور گھوڑے جوڑے کی رقم کی طرف لپکتے ہیں۔ بھینسا گھاس کی طرف لپک کر انسانوں کو یاد دلایا کہ بھوک کے آگے محبت کی کوئی حقیقت نہیں! "

صفحہ ۲۷ " سفید شہر "

" اُن کے پاس وہی کھٹارا سیکل موجود تھی جسے وہ گذشتہ تین چار برسوں سے پنکچر بناتے، ٹائر ٹیوب بدلتے اور غطوسے کے وقت ٹھوکر اور شُش شُش کی آوازیں نکالتے یوں برداشت کرتے چلے آرہے تھے۔ جیسے کوئی مطیع و فرماں بردار شوہر اپنی بدصورت و تند مزاج بیوی کی موجودگی میں کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جسارت نہ کرتا ہو۔ "

صفحہ ۱۹ " مدیر شگوفہ اور سکنڈ ہینڈ اسکوٹر "

" انھوں نے سیکل کی سواری کو ترک کر دیا تو کیا ہوا۔ ان کے اعصاب پر ابھی تک سیکل سوار تھی " صفحہ ۳۲

دراصل ہوا یہ تھا کہ پچھلے پہیے کے " نٹ " نے دھکوں کی تاب نہ لاکر اپنی جگہ چھوڑ دی تھی جس کے نتیجے میں پہیہ گھومتے گھومتے آخری تھریڈ پر رُک کر فیصلہ کن چکر لگا رہا تھا۔ گویا اس کا مطلب یہی تھا کہ زندگی اور موت کے درمیان صرف ایک " تھریڈ " کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ "

صفحہ ۳۲ " مدیر شگوفہ ..... "

" دنیا کی تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ کئی جوڑے اپنی ازدواجی زندگی بغیر بات کیے گزار کر اس دنیا سے چل بسے۔ یہاں تک کہ بوقت آخر اپنا بولا چالا تک معاف کروانا مناسب نہ سمجھا۔ اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے پیچھے ایک ایک درجن بچے بھی رونے کے لیے چھوڑ گئے۔ "

صفحہ ۴۵ " کوئی معشوق ہے ..... "

"ریڈی میڈ عید" میں عید کی تعریف سنیئے ——

"شوال کی پہلی تاریخ کو عید گاہ میں نماز پڑھ کر اگلے رمضان تک خدا کو بھول جانے کا نام عید الفطر ہے۔" صلا

"رمضان کا چاند دیکھتے ہی مردوں کے چہروں کا جلال یوں غایب ہوتا ہے جیسے کسی نے بھری پُری تقریب میں ملاقات کا سوئچ آف کر دیا ہو۔" صلا

"عید چاہے ریڈی میڈ ہو کر ہوم میڈ کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن —— عید ملاقات کے بغیر وہ یوں ادھوری رہ جاتی ہے جیسے کسی نے ایک آستین کی شیروانی پہن لی ہو۔"

"ریڈی میڈ عید"

"جب تک مجتبیٰ محکمہ اطلاعات میں کام کرتے رہے ان کی کرسی ان کی ملاقات کے لیے ترستی رہی تھی۔"

ص۱۱۶ خاکہ "مجتبیٰ حسین"

"انھوں نے داڑھی بڑھالی ہے۔ یا یوں کہیے کہ انھوں نے سایڈ لاکس کو اور آگے کی جانب بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے۔" ص۱۲۲

خاکہ "پرویز یداللہ مہدی"

"گیان پیٹھ انعام پر تو دل کی حرکت بند ہوگئی ہے۔ ایک عام انسان کی بات چھوڑیئے۔ ایسے ایسے دانشور، ادیب اور شاعر جو عوام کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں بالکل برخوردار قسم کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جب ان تمام بدحواسیوں کے بعد مطلع صاف ہو جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ انعام ایک تر نوالا تھا جسے بدحواسی کے عالم میں نگلنے کی وجہ سے ایک دانہ ہوائی نالی میں داخل ہو کر ندامت کے آنسو لانے کا موجب بنا۔"

ص۵۹ "کوئی معشوق ہے ...."

"میں نے اس فرضی انعامی لفافے کو یادگار کے طور پر محفوظ رکھا ہے۔ میں اُس شخص کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ میری عین خواہش ہے کہ اس کی تعویذ بنا کر بطور خاص اپنے ساتھ رکھوں۔ کیوں کہ یہی کاغذ آج کے ادیب اور شاعر کا مقدر ہے۔"

ص۶۱ "کوئی معشوق ہے ...."

دیکھا آپ نے کس طرح ہنسی ہنسی میں زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹتے ہیں۔

زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹتے ہیں!

ہنسانے والا ہمیشہ روتا آیا ہے۔ اور رو کر ہنساتا ہے۔ میں بنیادی طور پر یوسف ناظم کو طنز نگار سمجھتا ہوں۔ اُس نے پردے کے پیچھے چھپی ہوئی ان تمام بے ہودگیوں، گندگیوں اور ناانصافیوں کو دکھایا ہے جو مشینی سماج کی پیداوار ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں ان باتوں پر ہنسی آتی ہے! اصل میں مزاح اور طنز ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں!

مختصر یہ کہ یوسف ناظم کے مضامین میں دبی ہوئی کئی چنگاریاں ہیں۔ اب یہ چنگاریاں کب شعلہ بنیں گی کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اور نہ ادب میں آرٹ میں پیشین گوئی کی روایت اتنی مقبول ہوئی ہے۔ ویسے ادب کے ہاتھ میں ٹیڑھی ترچھی لکیروں کو پڑھنے والا پامسٹ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اس خواہش کا ضرور اظہار کیا جا سکتا ہے کہ خدا کرے کہ

زندگی کی بھٹی سے نکلتی ہوئی آگ کی تپش مسیح انجم کے وجود کو دہکاتے رہے ۔ تب کہیں جاکر یہ چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں گی!

میں ان تمناؤں اور احساسات کے ساتھ مسیح انجم کو ان کے دوسرے مجموعے " درپردہ " کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں ، اور اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں ۔ کیونکہ جب کوئی اچھی کتاب چھپ کر بازار میں آتی ہے تو وہ مصنف کی ملکیت نہیں ہوتی ۔ بلکہ ایسے پڑھنے والوں کی ایک میراث بن جاتی ہے !

رشید عبدالسمیع جلیل

"در پردہ" ـــــــ مسیح انجم

"سائیڈ سے چلئے" ابھی عالمِ آب و گِل میں تھی۔ کاتب کے چکّر کاٹے جا رہے تھے اور کتاب ورق ورق جمع کی جا رہی تھی۔ اسی دوران میری ملاقات مسیح انجم سے ہوئی اس حالت میں کہ ایک رات حیدرآباد کے پُرانے شہر کی ایک بارونق سڑک پر جناب مصطفےٰ کمال مدیر شگوفہ اپنی سیکل پر مسیح انجم کو "سائیڈ سے چلئے" کے چند اوراق سمیت بٹھائے اُڑے چلے جا رہے تھے۔ میں نے آواز دی۔ کمال صاحب رُک گئے اور مسیح انجم اور اُن کے اوراقِ پریشاں سے مجھے متعارف کروایا۔ اس تعارف کی بنیاد کچھ اس طرح مستحکم ہوئی کہ آج تک ہم ربط و تعلق کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔

پہلی ملاقات میں مسیح انجم مجھے ایک سیدھے سادے معصوم اور سنجیدہ قسم کے آدمی محسوس ہوئے۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ ان کی شخصیت اور طبیعت پر پڑے ہوئے پردے اُٹھتے گئے اور مجھے ان کی خوش طبعی اور ظریفانہ موشگافیوں سے محظوظ ہونے کا موقع ملتا گیا۔

مسیح انجم پیشہ کے اعتبار سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ طنز و مزاح کو انھوں نے ٹرافک کی ہماہمی میں سائیڈ سے چلتے ہوئے اپنی شناخت کا ذریعہ بنالیا ہے۔ تاکہ بھیڑ اپنے بہاؤ کے زور پر انھیں کہیں اور نہ پہنچا دے۔ ویسے ادبی راہ پر چلنے کے لیے انھوں نے ابتداءً افسانے بھی لکھے تھے لیکن پہلا قدم اُٹھاتے ہی شاید انھیں احساس ہوگیا تھا کہ افسانہ ان کی مکمل شناخت کا باعث نہ بن سکے گا۔ کسی فن کار کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہوتا ہے کہ وہ اپنی شناخت اور اپنی شخصیت کے بھرپور اظہار کے لیے صحیح سمت اور صحیح راستے کا تعین کرلے۔ مسیح انجم اس اعتبار سے خوش نصیب ہیں کہ اس دریافت کے سلسلے میں انھیں اِدھر اُدھر بھٹکنا نہیں پڑا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسیح انجم افسانہ لکھ نہیں سکتے۔ بلکہ فطری رجحان کی موزونیت افسانے کی روایتی فضاؤں میں محصور نہ رہ سکتی تھی۔ مسیح انجم نے طنز و مزاح کو اپنی ادبی کاوشوں کی بنیاد قرار دے کر افسانے کو بھی اس رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کا ثمر "تاک جھانک" اور "غموں کی دھوپ" میں پایا جاتا ہے جو "در پردہ" میں شامل ہیں۔

"در پردہ" مسیح انجم کی دوسری تصنیف ہے۔ "سائیڈ سے چلئے" کا خالق اپنے محتاط رویّہ کے باوصف ٹرافک کے ہجوم سے بچ کر سائیڈ سے چلتے ہوئے اب در پردہ اپنی آواز بلند کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ آواز جو قریب کی ہو کر بھی دور کی محسوس ہوتی ہے۔ جسے سن کر لوگ چونک پڑتے ہیں اور شگفتگی کی رو میں دور تک بہتے چلے جاتے ہیں۔

مزاح مسیح انجم کی تحریر میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں ہلکے پھلکے طنز کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ مسیح انجم کا مزاج بھی طبعی خصوصیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مزاح مسیح انجم کی طبیعت پر چوبیس گھنٹے سوار نہیں رہتا بلکہ دن اور رات کے کسی حصّہ میں اچانک نمودار ہوتا ہے۔ جس کا تعین قبل از وقت کرنا بھی دشوار ہے۔ دوستوں کے حلقہ میں اچانک وہ پھول کی مانند کھل اٹھتے ہیں۔ اور اتنے شگوفے بکھیرتے ہیں کہ اچھی خاصی تفریح میسر آجاتی ہے۔ لطیفہ گوئی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ لیکن اپنے مضامین میں لطیفوں سے شعوری طور پر احتراز کر جاتے ہیں جو اُن کے اسلوب کی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

مسیح انجم کی حسِ مزاح شائستگی اور تہذیب کی علمبردار ہے۔ ان کی تحریروں میں زیادہ تر سماج کی اخلاقی قدروں کو ابھارنے کا عمل پایا جاتا ہے۔ قوتِ مشاہدہ کی تیزی انھیں چلتی پھرتی زندگی سے مضحک پہلوؤں کو چن لینے کا سلیقہ عطا کرتی ہے۔ زبان و بیان پر انہیں درجہ قدرت حاصل ہے کہ ان کی تحریریں بڑی رواں دواں محسوس ہوتی ہیں' انداز بیان میں سادگی اور شگفتگی کا امتزاج پایا جاتا ہے جو کبھی کبھار سنجیدگی کی حدوں کو چھوتا ہوا بھی محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود طنز و مزاح کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ شگفتہ بیانی مسیح انجم کی مزاح نگاری کے لیے کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ محو لفظی کی وضاحت اور اثر انگیزی کے لئے لفظوں کے صحیح انتخاب اور استعمال سے ان کی سلیقہ مندی کا اظہار ہوتا ہے۔

واقعات کی بنیاد پر مزاح پیدا کرنا مشکل امر ہے تاوقتیکہ اس میں اضافی قوتِ تخیل کی کارفرمائی موجود نہ ہو۔ مسیح انجم کی ظرافت نگاری کا اسلوب واقعات نگاری اور اضافی قوت تخیل کی آمیزش سے تشکیل پاتا ہے جس کے نتیجہ میں مزاح بوجھل پن کی حدوں میں داخل ہوتا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ افزائشِ طنز و مزاح کے لئے طرزِ نگارش اور موضوع کے برتنے میں مسیح انجم مشہور امریکی مزاح نگار فرینک آر۔ اسٹاکٹن Frank.R.Stockton سے بہت قریب نظر آتے ہیں' حقیقت حال اور نفسِ واقعہ کا اظہار بھی اکثر مسیح انجم کے پاس طنز کا روپ اختیار کرلیتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے قاری کو سوچنے پر مجبور کردیتا ہے۔

"درپردہ" کے مضامین پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ تمام مضامین منظم پیمانے پر سوچ کر لکھے گئے ہیں' موضوع سے گریز یا انتشار کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ وضاحت اور ناقابل برداشت طوالت کے اثرات بھی بہت کم پائے جاتے ہیں' مضامین میں نظم و ضبط کی مستقل کیفیت فنی رچاؤ کی دلیل ہے جس سے مسیح انجم کی کہنہ مشقی اور مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ جو ڈسپلین مسیح انجم کو اسکول کی فضاؤں میں ملا ہوا ہے زندگی کے ساتھ ان کے رویہ میں بھی وہی ڈسپلین کارفرما نظر آتا ہے۔ جس کا عکس ان کی تحریروں میں جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ درس تدریس سے وابستہ رہ کر دن رات بچوں کو پڑھانے کے باوجود ان کی تحریروں میں ناصحانہ انداز پیدا نہ ہوسکا۔ جو طنزیہ مزاحیہ ادب میں کسی خول کا باعث نہیں۔ البتہ اکثر مضامین میں معلمانہ طنز کی جھلکیاں ضرور پائی جاتی ہیں جو اسکول اور کلاس روم میں وقوع پذیر مشاہدے کی دین ہیں۔

مسیح انجم کے زیادہ تر موضوعات ان کی روز مرہ زندگی کے مشاہدات میں آنے والے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی قوت تخیل کے بل بوتے پر وہ کچھ اس طرح رنگ آمیزی کرتے ہیں کہ طنز و مزاح کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور ان کے مضامین ایک باشعور فنکار کے تخلیقی فن پارے محسوس ہوتے ہیں جن میں طنز مزاح کی شائستگی اپنے پورے بانکپن کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کسی موضوع کے مضحک پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے مسیح انجم خود کو تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ تماشہ کا ایک حصہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو مسیح انجم کے اسلوب میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے اور ہر مرحلہ پر نہ صرف لطف دے جاتی ہے بلکہ انھیں دوسرے مزاح نگاروں سے ممتاز بھی کردیتی ہے۔

"درپردہ" کے موضوعات زیادہ تر سماجی' ثقافتی اور تعزیلی نوعیت کے ہیں۔ "مشترکہ مکان" میں شہری زندگی کے ایک اہم مسئلہ کو بڑے سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ "افسانہ در افسانہ" تکنیک کے اعتبار سے تازگی اور شعور کی مضطرب لہروں کا عکس پیش کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مزاح نگار کے سینے میں ایک دردمند دل چھپا ہوا ہے۔ اور درد کی درپردگی کو وہ خود کلامی کے آئینہ میں دیکھتا ہے اور فہم کا

زندگی کی گھٹن اور سماج کی لعنتوں پر ہلکے پھلکے انداز میں فقرہ زنی کرجاتا ہے۔ "ہیکڈ ہینڈ اسکوٹر اور مدیر شگوفہ" کوئی مشوق ہے اس پردہ نگاری میں"۔ "ہم نے کبڈی کھیلی" اور "سفید شہر" وغیرہ واقعاتی مزاح کی عمدہ مثالیں ہیں "اگر اوصیتے رہتے حاتم طائی" اور "نقلستان" میں مسیح انجم کی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ "ریڈی میڈ عید" میں ایک مخصوص طبقہ کی عید کی مشکلات کو نہ صرف پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ مزاح نگار نے مزاحیہ انداز میں ان کا حل بھی پیش کرکے مزاح کی ایک چمکتی ہوئی کرن پھینکی ہے۔

"پنگ پانگ کی ڈائری کا ایک ورق" قدیم تاریخی سفرناموں کی پیروڈی کی ایک کوشش ہے۔ اس سفرنامہ میں اعلیٰ ثانوی سطح کی حد تک موجودہ نظام تعلیم پر دلچسپ انداز میں طنز کیا گیا ہے، مسیح انجم اس سلسلہ کو جاری رکھیں تو مجھے امید ہے کہ سفرناموں کی پیروڈی طنز و مزاح میں ایک خوبصورت اضافہ کا باعث ہوگی۔

"گلے ملنے کے موڈرن طریقے" میں دوست احباب کے ساتھ گلے ملتے وقت پیدا ہوئی ہوئی مضحک سچویشن کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے جسے پڑھ کر قاری قہقہے لگانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ "غموں کی دھوپ" پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر شمیم نکہت کا کردار جیسے افسانہ نگار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ غموں کی دھوپ میں تپ کر شگوفے کھلانے پر مجبور ہے۔

"یہ مسائل اور جانِ ناتواں" میں آبادی اور غذا کے مسائل کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے جس میں طنز و مزاح کی بھرپور چاشنی پائی جاتی ہے۔

مسیح انجم نے اگرچہ کہ خاکے بہت کم لکھے ہیں لیکن خاکہ نگاری کے لوازمات سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔ "در پردہ" میں ان کے تین خاکے شامل ہیں جو مجتبیٰ حسین، پرویز یداللہ مہدی اور ستار رجنتی پر لکھے گئے ہیں۔ بقول مسیح انجم، مجتبیٰ حسین کو وہ عقیدت کی حد تک چاہتے ہیں۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین پر لکھے گئے خاکے میں وہ عقیدت کے پھول ہی پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پرویز یداللہ مہدی کے خاکے میں کسی حد تک اعتدال کی جھلکیاں ملتی ہیں، البتہ ستار رجنتی سے بے تکلفی کے نتیجہ میں اس خاکے میں بھی بے تکلفی کی فضا پائی جاتی ہے۔

مسیح انجم نے اپنے اطراف پھیلی ہوئی زندگی کو ڈوب کر دیکھا ہے۔ اور اس کا مزہ بھی چکھا ہے۔ جس کے تلخ و شیریں ذائقہ کو انھوں نے اپنی مزاح نگاری کے ذریعہ درپردہ وہ دوسروں کو بھی مزہ چکھانا چاہتے ہیں، یہی وہ خلوص فن ہے جو میرے نزدیک مسیح انجم کو ایک کامیاب مزاح نگار قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

ششی بھوشن پانڈے
ترجمہ: سالیکا پرشاد

ناک کی مصیبت

زکام ہو جائے تو بار بار ناک پونچھنی پڑتی ہے۔ بڑا گندہ کام ہے۔ بار بار ناک صاف کرو اور پھر رومال بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اس سے تو اچھا ہوتا کہ آدمی کے ناک ہی نہ ہوتی۔ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر ناک نہ ہوتی تو چشمہ کس پر ٹکتا؟ حالانکہ اب تو کانٹکٹ لینس بن گئے ہیں۔ لیکن چشمے کی بات اور ہی ہے۔ چشمہ لگا کر ہی انسان چار آنکھ والا بن جاتا ہے۔

ویسے اگر ناک نہ ہوتی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیوں کہ منھ سے بھی سانس لی جا سکتی ہے لیکن پھر ناک کیسے اونچی رکھی جاتی؟ اور ناک کی سیدھ میں چلنا بھی ممکن نہ ہوتا۔ حالانکہ ناک نہ ہونے پر یہ آسانی تو ضرور ہوتی کہ چاہے کچھ بھی کر د "ناک کٹنے" کی نوبت کبھی نہ آتی۔

لیکن یہ تو ماننا ہی پڑے گا ناک بھی کیا خوب بنی ہے۔ بڑی نایاب چیز ہے۔ جی چاہے تو ناک سے عطر، پھلیل، خوش بو سونگھ کر لطف اٹھا سکتے یا دل چاہے تو بدبو سونگھ کر ناک سکوڑتے۔ غصہ آجائے تو ناک کے نتھنے پھلاتے۔ بڑے غور د خوض کے بعد ہی اوپر والے نے ناک کو چہرے پر ٹھیک سنٹر میں رکھا ہے۔ آدمی بڑے شوق سے اپنی ناک پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ کیونکہ آدمی کو اپنے چہرے یعنی صرف اپنی ناک کا اگلا حصہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اجی جناب یہ اچھا خاصا مذاق ہے۔ آپ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اپنا چہرہ خود دیکھ لے ایسا مائی کا لال ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوا۔

اسی لئے سبھی اپنی ناک بچا کر چلتے ہیں۔ کہیں غلطی سے ناک پر مکہ مار دیا جائے تو جناب ستارے نظر آجاتے ہیں۔ لہذا ناک بڑی نازک چیز ہے۔ بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔ آدمی تو آدمی یہاں تک کہ جانور بھی اپنی ناک کے بارے میں بڑی احتیاط کرتے ہیں۔ کبھی کتے کی ناک پر بلی پنجہ مار دے تو پھر دیکھئے خوفناک بلی کتے کی لڑائی شروع ہو جائے گی غرض یہ کہ ناک کا گمان سب کو ہے۔

ناک کے معاملہ میں بھلا عورتیں پیچھے کیوں رہتیں یہ مساوات کا زمانہ ہے۔ خوبصورت ناک کو طوطے کی ناک سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ اور ایسی خوبصورت ناک والی لڑکیاں اپنی ناک کو سجا سنوار کر رکھتی ہیں۔ بلاک، نتھ، چکر نما ڈائمنڈ والا، نتھنی، لونگ یعنے ناک کی کیل سے ناک کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اس پر یہ گانا کہ "میری نتھنی ہالے ڈولے .... غضب ڈھاتا ہے۔ ویسے تیز مزاج

والی عورتوں کو "نک چڑھی" بھی کہتے ہیں۔

ناک سے صرف سانس ہی لی جاتی ہے، ایسی بات نہیں۔ بیڑی، سگریٹ پی کر ناک سے دھواں بھی نکالا جاتا ہے۔ نسوار سونگھنے والے کس ادا سے سونگھنی کی چٹکی ناک میں چڑھاتے ہیں، قابلِ دید ہوتا ہے، اور پھر رات کا شاستری سنگیت یعنے خرّاٹے بھی ناک سے ہی نکلتے ہیں۔ اس قدرتی خرخر سنگیت کے کیا کہنے! آپ تو جناب گہری نیند میں سو رہے ہیں۔ لیکن اپنی اس ناک کی موسیقی سے گھر والوں کی نیند حرام کر رہے ہیں۔ سائنس نے لاکھ ترقی کی ہو۔ لیکن دنیا کے سائنسداں اور ڈاکٹر چھوٹی سی ناک کے ان خرّاٹوں کا علاج ابھی تک نہیں تلاش کر سکے۔

ناک کی بڑی اہمیت ہے۔ عالموں نے ناک کو خوب پرکھا ہے، رکھا ہے۔ جانچا ہے۔ پونچھا ہے۔ ناک پونچھنا تعلیمیافتہ اور مہذب ہونے کی علامت ہے۔ تبھی تو لوگ کہتے ہیں کہ ناک پونچھنے کی تمیز نہیں ہے۔ گہرے غور کے وقت ناک پر ہاتھ پھرانا، ناک میں انگلی ڈال کر گھمانا بڑا فائدہ بخش ہے۔ ناک کی خدمت فوری اپنا اثر دکھاتی ہے۔ تجربے کی بات ہے آپ گہرے فکر میں ہوں۔ مسئلہ کا حل نہ سوجھتا ہو۔ آزمودہ طریقہ ہے کہ ناک پر ہاتھ پھیرتے، ناک میں انگلی ڈال کر گھماتے۔ ناک کا تبرک انگلی میں لگ جائے تو پتلون کے پیچھے پونچھتے جاتے۔ اس عمل سے فوراً دل یکجا ہوگا۔ اور آپ کو مسئلہ کا حل فوراً مل جائے گا۔

ناک کے فن کم نہیں جان کر لوگ انسان کی ناک دیکھ کر اس کا کردار بتلا دیتے ہیں۔ دنیا کے الگ الگ ملکوں کے لوگ۔ اپنی ناک کی بناوٹ سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ جیسی اونچی ناک والے آریا قوم کے چپٹی ناک والے چینی، منگول وغیرہ وغیرہ۔ ویسے ایک موٹا اصول ہے کہ چوڑی پھیلی ناک والے انسان زیادہ صحت مند، دم دار اور صبر والے مانے جاتے ہیں۔ جبکہ اونچی پتلی ناک والے، نازک و تنک مزاج مانے جاتے ہیں۔

ناک سے واسطہ معمولی انسانوں کو ہی ہو۔ ایسی بات نہیں۔ بھوگی (عیاش) ہو یا یوگی (فقیر) سب کو ناک سے لگاؤ ہے۔ سادھو، اور سنیاسی اگرچہ کہ اس جھوٹی اور مکار دنیا سے الگ ہیں۔ فانی جسم سے لگاؤ نہیں ہے۔ لیکن وہ بھی اس ناک سے بڑا پریم رکھتے ہیں۔ ناک اور یوگ (ریاضت) کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ ناک کے بغیر یوگ نہیں چل سکتا۔ یعنے پرانا یام (سانس روکنے کی ریاضت) اس بے چاری ناک کی ہی کسرت ہے۔ کبھی دایاں نتھنا دبایا جا رہا ہے، غرض یہ ہے کہ ناک کی بارہ مو نہم بجا رہے ہیں۔

اگر آپ پوچھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو جواب دیں گے کہ پرانایام کے ذریعہ دل کو یکجا کر رہے ہیں۔ ہے نا اندھیر۔ "خطا تو دل کی ہے کہ یکجا نہیں ہوتا" اور ناک بے چاری کو مفت میں اینٹھ رہے ہیں اور پھر دروڑ پرانایام تو اور مصیبت، سر کے پیچھے سے ہاتھ گھما کر ناک کو دبایا جاتا ہے ویسے دیکھنے لائق دلچسپ نظارہ ہوتا ہوگا۔ جب نیا بر ہمچاری جو فی الصبح سرد پانی کے حمام کی وجہ زکام سے جکڑ گیا ہو۔ گرو کے حکم کے مطابق مضبوطی سے ناک دبا کر ایکدم سے سانس کھینچتا یا نکالتا ہو بڑا دلچسپ منظر ہوتا ہے۔

پرانایام تک ہی ناک کی مصیبت ہوتی تو بھی غنیمت تھا۔ یوگی بھلا ناک کو اتنی آسانی سے کب چھوڑنے والے تھے۔ پرانایام کے بعد شروع ہوتی ہے اور بھی سخت قسم کی ریاضت، کبھی حمام کے وقت، تھوڑا سا بھی پانی ناک میں چڑھ جائے تو کھوپڑی بھنا جاتی ہے۔ اور یہ یوگی مہاراج پورا لوٹا

بھر پانی ناک میں انڈیلتے ہیں۔ ساری کائنات نظروں کے آگے گھوم جاتی ہے۔

پھر سوترنیتی تو ناک کی اور بھی درگت ہے۔ ناک کے چھیدوں میں سوت کی پتلی ڈوری پرو کر یوں کھینچا جاتا ہے گویا انسان نہیں کوئی بیل ہو۔ جس کے نتھنوں میں رسّی ڈال دی گئی ہو۔ کیا مذاق ہے؟

ناک پھر بھی قابو میں نہیں آتی۔ اپنی مرضی پر چلتی ہے۔ دائیں کروٹ لیٹے تو بائیں نتھنے سے سانس چلے گی۔ بائیں کروٹ تو دائیں نتھنے سے سانس چلے گی۔ کب دایاں کب بایاں نتھنا سانس لیتا ہے پتہ ہی نہیں چلتا۔ قابلِ تعریف آٹومیٹک کنٹرول ہے۔ دائیں یا بائیں سُر کے چلنے پر جیوتشی پیشین گوئی کرنے والے بتلا دیتے ہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ اتنا ہی نہیں کام بنے گا یا نہیں۔ یہ بھی بتا دیتے ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں ماننے والے مانتے ہیں اور نجومیوں کی کمائی چلتی ہے۔

یہی حال ناک کی چھینک کا بھی ہے۔ آپ لاکھ پڑھے لکھے ہوں۔ کہیں جا رہے ہوں اور تبھی کوئی چھینک دے تو آپ شک میں ضرور پڑ جائیں گے۔ پتہ نہیں کام بنے گا یا نہیں۔

نجومیوں کے علاوہ اور بھی لوگ ہیں جو ناک کی کمائی کھاتے ہیں۔ ناک کا عام روگ زکام نہ ہوتا تو تمام ڈاکٹر بھوکوں مر جاتے۔ ناک کے سہارے ہی 'نوز اسپیشلسٹ' کا کام چلتا ہے۔ 'ان ہیلر' اور 'ناسل ڈراپس' بنانے والی کمپنیوں کا دھندا ناک پر ہی ٹکا ہے۔ لیکن مذاق یہ ہے کہ اتنے پر بھی ناک کی نزاکت قابو میں نہیں آتی۔ زکام پرانا پڑ جائے تو 'سائنس ٹربل' کافی سیریس مانا جاتا ہے۔

یوں تو ناک کے نقشے کے بارے میں کافی تحقیق ہو چکی ہے لیکن اپنی سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ ناک میں بال کیوں ہوتے ہیں۔ اگر ان باتوں کی افادیت صرف یہ ہے کہ سانس لیتے وقت ہوا کے ذرّات اور دھول بالوں میں سے چھن جائیں تو بہتر تھا کہ بالوں کے بجائے ناک میں چھلنی جیسا فلٹر لگا ہوتا کیوں کہ ناک کے بال بڑھ جاتے ہیں تو بڑے معیوب نظر آتے ہیں۔ بڑی ہوشیاری سے سدھے ہاتھوں سے قینچی ناک میں گھما کر صفائی سے بال کاٹنے پڑتے ہیں۔ ذرا غفلت ہوئی نہیں کہ قینچی کی نوک ناک میں اندر چبھی پھر گئے کام سے۔

اس لئے بہتر تھا کہ نہ یہ بال ہوتے اور نہ یہ زحمت اٹھانی پڑتی۔ نہ 'ناک کے بال' کی کہاوت بنتی۔ خیر اور تو جو ہو سو ہو اپنی ناک بچا کر رکھیئے۔ ایسا کام نہ کریں کہ آپ کی ناک نیچی ہو یا کبھی مجبوری میں دوسروں کے آگے ناک رگڑنی پڑے۔

پروین ید اللہ مہدی

چہ خوب قسط (۱۵)

گھوڑے کی ہنہناہٹ نے ہماری سماعت کو اُسی طرح تہس نہس کر دیا جس طرح ہیروشما کو امریکی بموں نے تباہ و تاراج کر دیا تھا۔

ہم اُس گدھے کی طرح بستر پر اچھل پڑے جو اپنی دُم میں "پٹاخوں" کے پھٹنے پر پہلے تو چونک کر اچھلتا ہے پھر بغیر بریک کے ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ ہم البتہ بھاگ نہیں سکے کہ انسان تھے کاش گدھے ہوتے —!

صبح ہی صبح آس پاس گھوڑے کا یہ ہنہناہٹ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت تھی کہ ہماری نام نہاد گھوڑ سواری کی آزمائش کا وہ وقت آہی گیا جسے ہماری خوش بختی اب تک ٹالتی چلی آئی تھی۔ لیکن بخت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ یہ بخت ہی تو ہے جو بڑے بڑے شاہوں کو شاہی تخت سے پھانسی کے تختے تک لے آتا ہے پھر ہم جیسے ہماشما بھلا کس شمار میں۔ جب کسی کی شامت پکارتی ہے تو پھر نہ دن دیکھتی ہے نہ رات بس نازل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس وقت ہماری شامت نے گھوڑے کی ہنہناہٹ کے روپ میں ٹریلر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ہنہناہٹ کے معدوم ہوتے ہی نقرئی گنگناہٹ سے لبریز شبنم کی بلوریں آواز نے ہماری منجمد ہوتی سماعت کو اپنی گرمی سے پگھلا دیا —" میں نے کہا حضور شہزادے صاحب! آپ بیدار ہو چکے یا ابھی تک محو خواب ہیں — ؟"

[illegible] دم سادھے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ ہم نے جواباً بغیر آواز بیرونی کھڑکی کے پردے کو ذرا سا سرکایا اور اس طرح اوٹ میں ہو کر جھانکنے لگے کہ باہر سے سراپا ہمارا واضح طور پر نظر نہ آسکے —

ہماری دیدۂ حیرانی نے باہر چار پاؤں والی شامت پر دو پاؤں والی قیامت کو مضبوطی سے جما دیکھا۔ گھوڑا اس طرح چمک رہا تھا کہ صبح کے سورج کی نرم کرنیں بھی اس کی چمکدار چکنی جلد سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی تھیں۔ کم بخت اپنے چاروں پیروں پر اس طرح متحرک رہا تھا جیسے جسم میں خون نہیں بلکہ پارہ ہو — یوں لگتا تھا جیسے اُس شعلہ بدا ماں حسینہ کے مرمریں جسم سے برقی رَو، نکل کر گھوڑے کے بدن میں منتقل ہو رہی ہو — اس "برقی تصور" نے ہمیں وہ "شاک" پہنچایا کہ تلوے کی چمڑی سے سر کے بالوں تک کانپ اٹھے۔ یوں لگا جیسے ان مرمریں 'رانوں' کی گرفت میں گھوڑے کی پیٹھ نہیں بلکہ ہماری گردن ہو — ویسے جب بھی کسی دوشیزہ کو گھوڑے کی پیٹھ پر گردن اکڑائے بیٹھا ہوا دیکھا ہے ہم خود کو نہ جانے کیوں گدھا سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ایک معصوم اور بے وقوف سا گدھا — اس دوران میں ہم نے دیکھا

کہ شبّو گھوڑے کی پیٹھ پر سے اتر چکی تھیں اور اب سامان کا رُخ ہمارا سے ہی کمرے کی طرف تھا۔ شاید وہ یہ دیکھنے کے لیے تشریف لارہی تھیں کہ ہم واقعی بیدار ہو چکے ہیں یا ابھی تک خواب غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں، ہمیں بیدار ہوئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ حوائج ضروریہ و دیگر مراحل سے فارغ ہو کر "بورن ویٹا" کا ایک پیالہ بھی صاف کر چکے تھے لیکن اب مزید بیدار نظر آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ (اسی لیے خطرے کی بُو سونگھتے ہی ہم دوبارہ بڑی سرعت کے ساتھ بستر میں داخل ہو گئے اور خوب اوڑھ لپیٹ کر سونے کی ایکٹنگ کرنے لگے) ـــــ لیکن اتنا اوڑھنے اور لپیٹنے کے باوجود کم بخت کان شبّو کے قدموں کی آہٹ کے ہی منتظر رہے ـــــ !!

"آپ کا من پسند گھوڑا آپ کا منتظر ہے۔ اٹھیے فوراً ـــــ!" شبّو نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بہ آواز بلند کہا۔ اب مزید سونے کی ایکٹنگ کرنا انتہائی غیر اخلاقی فعل ہوتا کہ یہ "حسین میزبان" خود چل کر مہمان کو بیدار کرنے چلا آیا تھا۔ چنانچہ ہم نے تھوڑا سا کسمسا کر سر سے چادر سرکائی۔ آنکھیں ملیں۔ اور پھر شبّو کی طرف دیکھ کر ہڑبڑانے کی ایکٹنگ کی یعنی گڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور فوراً "صبح بخیر" کا کلمہ ہمارے منہ سے نکل گیا۔ جواباً شبّو نے بھی "صبح بخیر" سے نوازا ـــــ اگرچہ مسز چوب کی آمد کے بعد سے شبّو کسی قدر بجھ سی گئی تھیں۔ تاہم اس وقت محترمہ اس موڈ میں واپس نظر آرہی تھیں جس موڈ میں پہلی مرتبہ ان سے تعارف ہوا تھا اور جس موڈ میں مسز چوب کی آمد سے پہلے تک اکثر ہم نے انہیں دیکھا تھا۔ اب ہماری طرف سے اگر کسی معاملے میں شبّو کی دل شکنی ہوئی تو پھر شبّو کے موڈ کا خدا ہی حافظ، چنانچہ ہم نے بلا چوں و چرا سر تسلیم خم کر دیا۔ ویسے بھی بکرے کی ماں بلکہ سارا کنبہ بھی کب تک خیر منا تا جس کے مقدر میں چھری لکھ ہی دی گئی ہے اُسے تو بہر حال حلال ہونا ہی ہے۔ چنانچہ ہم نے بستر چھوڑ دیا لیکن فرش پر پیر ٹکایا ہی تھا کہ پہلے ہی قدم میں توازن برقرار نہ ہونے کے باعث کسی قدر لڑکھڑا گئے۔ شبّو کے لبوں سے بے ساختہ نکلا ـــــ کیا ہوا ـــــ ؟

"جی کچھ نہیں ـــــ پاؤں شاید بل کھا گیا ـــــ" ہم بڑی سرعت کے ساتھ دوبارہ پلنگ پر بیٹھ گئے۔ وقتی لڑکھڑاہٹ اندھیرے میں کرن کی طرح لہرائی وقت پر اندھے کو اگر ایک آنکھ بھی مل جائے تو غنیمت ہے۔ چنانچہ گھپ اندھیرے میں اُمید کی اس ایک آنکھ نے وہ راستہ دکھایا کہ جس پر گھڑ سواری، قطعی ناممکن تھی۔ ہم نے ذہن میں کھچڑی پکائی اور جب یہ پک کر تیار ہو گئی تو شبّو کے سامنے پلیٹ بھر پیش کر دی ـــــ "رات خواب میں بڑی عجیب بات ہوئی میں نے دیکھا گھڑ سواری کا بین الاقوامی مقابلہ ہو رہا ہے۔ اور اس میں آپ اور میں دونوں شریک ہیں ـــــ مقابلہ بڑا دھواں دھار ہے، ہم دونوں اپنے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائے جا رہے ہیں دوسرے سوار پیچھے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور آخر میں ہم دونوں ہی میدان میں نظر آتے ہیں کبھی آپ آگے تو کبھی میں ـــــ" ہم نے جس انداز سے اس من گھڑت خواب کو بُنا اس سے کہیں اچھے انداز سے اسے سنا رہے تھے یہی وجہ تھی جو شبّو تمام تر دلچسپی سے سن رہی تھیں ہم نے آگے کہا ـــــ "قبل اس کے کہ ہم دونوں برابری سے یہ مقابلہ جیت لیتے میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور میں جو اچھل کر گرا تو بس آنکھ کھل گئی اور اس پیر میں بس تب ہی سے درد ہو رہا ہے ـــــ"

"یعنی ـــــ خواب میں گھوڑے سے گرنے پر آپ کے پیر میں واقعی چوٹ آگئی ـــــ" شبّو نے حیرت سے کہا ـــــ

"جی ہاں ـــــ" ہم نے گردن ہلا دی ـــــ

"یعنی خواب میں گھوڑے پر سے گر گئے اور حقیقت میں اُسے چوٹ لگے" شبو نے ناقابل یقین لہجے میں کہا۔ تب ہمیں احساس ہوا کہ ہمارا مقدمہ کمزور پڑ رہا ہے چنانچہ اسے مضبوط کرنے کے لیے۔ ٹھوس دلیل پیش کی ــــــ"

"میرا مطلب یہ تھا کہ گھوڑے سے تو میں خواب میں گرا۔ لیکن نتیجے میں نیند میں واقعی پلنگ پر اچھل پڑا۔ جس سے شاید پیر میں چوٹ آگئی ــــ" ہم کسی قدر لنگڑاتے ہوئے شبو کے ساتھ ہو لیے چہرے پر شدید کرب کے آثار پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش بھی کرتے رہے کہ شاید یہی دیکھ کر شبو کو ہم پر رحم آجائے اور ہم گھوڑ سواری کی جان لیوا آزمائش سے بچ جائیں ــــ

باہر نکلتے ہی ایک سرکش گھوڑے سے نظریں چار ہوتیں۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ نظریں چار' سے آٹھ ہے اور پھر آٹھ سے اسّی تک جاپہنچیں شبو نے نوکر کو آواز دے کر بلایا اور پھر یہ حکم صادر فرمایا کہ گھوڑے کو اصطبل واپس پہنچا دیا جائے۔ اس دل خوش کن حکم پر ہماری جان میں جان لوٹ آئی۔ گھوڑے کی نظروں کے فوکس سے ہٹتے ہی مسز چہ خوب کا پیکر نظر آیا۔ محترمہ لان کے ایک پرسکون گوشے میں آرام کرسی پر نیم دراز غالباً "سن باتھ" فرما رہی تھیں۔ ہم نے اخلاقاً نظریں اُدھر سے ہٹا لیں لیکن "تیسری چور نظریں صوفہ کو برابر گھورے جا رہی تھی۔ کیونکہ محترمہ نے اس وقت لباس کے نام پر جو ملبوس زیب تن کیا تھا اس پر یہ مصرعہ پوری طرح صادق آتا تھا ــ

صاف اِس پار سے اُس پار کا ہوتا ہے نظارہ

اور اس توبہ شکن نظارے سے پوری طرح یعنی کما حقہ لطف اندوز ہونے کے لیے ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرنے کی بجائے خود کو منجدھار کے حوالے کر دینا ضروری تھا لیکن اس وقت ہمارا "ناخدا" یعنی شبو ہمارے ساتھ تھیں اور "ناخدا" کی مرضی کے بغیر ہم اپنے "بیڑے" کا لنگر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ہم نے چور نظروں سے "ناخدا" کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جہاں ملامت کی جگہ کرختگی، حلاوتِ، کی جگہ جلال، نرمی کی جگہ سختی، اور ناگواری بے شمار رنگ اپنے اپنے بھرپور تاثر کے ساتھ موجود تھے ــــ

محترمہ نے ایک جھٹکے سے اپنا رُخ گیراج کی طرف کر دیا۔ ہم تو حکم کے بندے تھے ہی پیچھے ہو لیے۔ یہی سوچتے ہوئے کاش انسان کے ایک اور آنکھ اس کی گُدّی میں بھی ہوتی پھر وہ پیچھے کے بھی نظارے کر سکتا۔

ہم نے کل ہی اپنے محکمۂ خفیہ کی مدد سے جو واحد ہماری ذات بابرکات پر معہ حرکات و سکنات کے مشتمل تھا، مسز چہ خوب کے بارے میں خاصی معلومات حاصل کی تھیں جن کا لبّ لباب یہ ہے کہ محترمہ کا اصلی نام نادرہ خانم ہے۔ پچھلے سال قبلہ چہ خوب پر دل کا ہلکا دورہ پڑا تھا جس کے نتیجے میں ڈاکٹر نے انہیں تبدیلی آب و ہوا کا بھاری مشورہ دیا یعنی کسی پُر فضا پہاڑی مقام پر کم از کم تین مہینے قیام فرمانے کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ قبلہ چہ خوب پہاڑ پر سدھارے۔ لوگ عموماً پہاڑ پر اپنے جھنڈے گاڑھ کر لوٹتے ہیں لیکن موصوف کسی اور کا گاڑھا ہوا بلکہ جھکا ہوا جھنڈا اٹھا لائے یعنی محترمہ نادرہ خانم عرف "سیکس بم" کو لے آئے جو سنا ہے دو بار کی طلاق یافتہ بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود محترمہ "اُردو غزل" کے اس شعر سے کم نہیں جسے بار بار سن کر بھی سامعین، کا جی نہیں بھرتا بلکہ مکرّر ارشاد، مکرّر ارشاد کی گردان کم نہیں ہوتی، چلتے ہوئے شعر کی یہی نشانی ہے جتنا گھِستا ہے اتنا ہی نکھرتا ہے اور مسز چہ خوب عرف نادرہ خانم میں ابھی کئی اور مشاعرے لوٹنے کی صلاحیت سر سے پاؤں تک نظر آتی ہے ــــ بلکہ نیچے سے اوپر تک محترمہ میں صلاحیتیں ہی صلاحیتیں نظر آتی ہیں، اور ہر "صلاحیت" اپنی جگہ "صلاحیت"

کا درجہ رکھتی ہے بس آزمائش شرط ہے۔ یعنی صرف ایک بار کسی کا ان صلاحیتوں کی زد میں آنا کافی ہے پھر "صلاحیت گزیدہ" کتنا ہی پُرانا کافر کیوں نہ ہو "دانہ گندم" کے پیدا کرنے والے پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسی کافرانہ صلاحیتوں کو دیکھ کر انسانی "رگ پٹھے" تو ایک طرف "کاغذی پٹھوں" میں تک زندگی اور جوانی کی لہر دوڑ جائے۔

مسز چہ خوب کی کاروباری مصروفیات بھی بڑی دلچسپ اور آرٹسٹک ہیں۔ محترمہ نے حُسن کی آرائش و زیبائش کے سلسلہ میں لندن کے کسی بیوٹی کالج سے ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ وطن لوٹ کر خود کا ایک "بیوٹی کلینک" کھولا تھوڑے ہی عرصے میں "حُسن" کی ڈاکٹر بن بیٹھیں۔ اس کے علاوہ 'کپڑے تیار کرنے والی بڑی بڑی ملوں' کے لیے فیشن شوز 'فلمی ڈریس شوز' کا اہتمام بھی کرتی ہیں۔ اور اس ضمن میں محترمہ کے برادر حضرت بے دھڑک بھی ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ایسے کام میں صرف ہاتھ بٹانا کیا معنی ہمیں اگر کوئی ایسے کام پر مامور کرے تو ہم اپنا سب کچھ "بٹانے" کو تیار ہو جائیں۔ ایسے کام سے جس میں آم کے آم بھی ہوں اور گٹھلیوں کے دام بھی، کوئی انکار کر سکتا ہے بھلا ویسے سنا ہے مسز چہ خوب خود بھی کسی زمانے میں ملک کی شہرہ آفاق ماڈل رہ چکی ہیں اب بھی کبھی کبھی موقع محل کی مناسبت سے ماڈلنگ میں حصہ لیتی ہیں ـــــ محترمہ کے کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ آتے دن گھومنا پڑتا ہے کبھی اس شہر میں مقام تو کبھی اس شہر میں پڑاؤ۔ البتہ مہینے دو مہینے میں ہفتہ دس دن کے لیے قبلہ چہ خوب کی خیر خیریت دریافت کرنے کی غرض سے شوہر کے گھر چلی آتی ہیں۔ لیکن عموماً ایسے وقت جب شبو گھر پر نہیں ہوسٹل میں ہوتیں۔ البتہ اس مرتبہ شبو کی موجودگی میں موصوفہ کی آمد کی وجہ تسمیہ، مقامی کلب کی تسمیہ خوانی تھی ـــــ یعنی اس کلب کو قائم ہوئے پورے چار سال ہو چکے تھے چنانچہ اس موقع پر کلب کی چوتھی سال گرہ کا زور دار جشن منانے کا پروگرام تھا بلکہ تیاریاں اپنے شباب پر تھیں۔ کلب کے قیام اور پھر اس کی مالی امداد کے سلسلے میں چونکہ مسز چہ خوب ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی ہیں اس لیے انہیں اس مبارک و مسعود موقع پر تمام ممبروں کی جانب سے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا ـــــ کلب کی امداد کے سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ موصوفہ نہ صرف "دامے ورمے" ہی حصہ لیتی رہی ہیں بلکہ "قدمے وہ سخنے اور بدنے" بھی اعانت فرماتی رہی ہوں گی۔ ویسے ہمارا یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اندازہ ہم نے محترمہ کے "آزادانہ رویے" حد سے زیادہ وسیع النظری' اور ان کے آرٹسٹک "پیشے" کے اعتبار سے لگایا ہے ـــــ!

گیراج کا دروازہ جو کافی بھاری بھرکم تھا زور دار اور بھاری بھرکم آواز کے ساتھ کھلا ـــــ غالباً شبو نے بندر کی بلا طویلے کے سر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ یعنی کسی اور کا غصہ بے چارے دروازے پر نکالنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اپنے آپ کو نارمل ثابت کرنے کے لیے مصنوعی مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی بولیں۔

"یہ رہا آپ کا من پسند گھوڑا "ہارس پاور" ـــــ!

اشارہ یقیناً آئینہ کی طرح چمکتی ہوئی موٹر سائیکل کی طرف تھا جو سامنے ہی کھڑی تھی ـــــ مزید کہا ـــــ "اس روز جب آپ نے گھوڑے اور مشین کا موازنہ کیا تھا مجھے بھائی جان کی موٹر سائیکل کا اچانک خیال آ گیا، ان کے امریکہ جانے کے بعد سے میکانک کے ہاں بے کار پڑی سڑ رہی تھی، میں نے اسی روز فون کر کے دو روز کے اندر اندر اسے چالو حالت میں لے آنے کا الٹی میٹم دیا تھا اسے ـــــ دیکھیے شاید کسی قابل ہو ـــــ" اس خوش خبری پر ہم نے موٹر سائیکل کی طرف بڑ۔

پیار سے دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ ! لیکن کچھ توقف کے بعد احساس ہوا کہ اس پیار بھری نظر کی مستحق موٹر سائیکل نہیں بلکہ شبو ہیں جنھوں نے محض ہمارے آرام اور سہولت کے پیشِ نظر یہ موٹر سائیکل فراہم کی ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنی پیار بھری نظروں کا فوکس موٹر سائیکل سے ہٹا کر شبو کی طرف کیا اور کہا ـــــ "آپ کی اس نوازش کا زبانی شکریہ ادا کر کے میں اس کی اہمیت کو گھٹانا نہیں چاہتا بلکہ اس سلسلے میں مجھے آپ "عملی طور" پر شکریہ ادا کرنے کا موقع عنایت کیجیے۔"

"جی ـــ جی ـــ جی ـــ عملی شکریے" سے کیا مراد ہے آپ کی ـــ؟"

شبو کے اس جوابی وار نے ہمیں گڑبڑا دیا۔ ہمارا شکریہ واقعی ذومعنی ہو گیا تھا۔ ہم نے ہاتھ سے نکلتی ہوئی بات دوبارہ مٹھی میں دبانے کی کوشش کی ـــ "عملی شکریے سے میری مراد ہے کہ پچھلی نشست پر میں بیٹھوں گا اور موٹر سائیکل چلائیں گی آپ ـــ!"

"وہ کیوں ـــ؟" شبو نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ اگر موٹر سائیکل میں چلاؤں تو لوگ مجھ پر ہنسیں گے کہ یہ کیسا جاہل اور بے وقوف انسان ہے جس کے کانوں تک "ومین لب" یعنی تحریکِ آزادیٔ نسواں کے نعرے ابھی تک نہیں پہنچے۔ حالانکہ بین الاقوامی سال نسواں بھی ختم ہو گیا ـــ ہم نے بڑے لچے دار لہجے میں بات کا بتنگڑ بنانا شروع کیا ـــ "آپ کو پچھلی نشست پر بیٹھا دیکھ کر خواتین راہ گیروں کو یہ دکھ ہوگا کہ خواتین سال یوں ہی رائیگاں گیا۔ جب کہ تحریک آزادیٔ نسواں یہ خواب دیکھ رہی تھی کہ جب لڑکیاں سہرا باندھے گھوڑی چڑھ کے اپنے دولہا کے گھر جائیں گی اور دولہا چھوئی موئی بنا آنسو بہاتا رہ اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں سر جھکائے بیٹھا یہ گیت گا رہا ہوگا ـــ

چھوٹ ـــ بابل کا گھر موہے بیوی کے گھر آج جانا پڑا۔

ہاں آج جانا پڑا ـــ

ہماری یہ بکواس شبو کی مسکراہٹ کو ہنسی میں تبدیل کرنے میں کامیاب ضرور ہوئی۔ لیکن ہنسی میں پھیکا پن بدستور باقی تھا ـــ مسز پہ خوب کی آمد کے بعد سے ہی شبو کی چنچلتا اور شوخی پر ایک عجیب سا پھیکا پن طاری ہو گیا تھا۔ گھر کے ماحول پر غیر محسوس طور پر ایک گھٹن سی چھا گئی تھی۔ قبلہ پہ خوب کی زندہ دلی اور قہقہے بھی ماند پڑ گئے تھے۔ خصوصاً مسز پہ خوب کی موجودگی میں وہ ایک دم بجھے بجھے سے نظر آتے تھے۔ سچ ہے انسان غلطی کرنے سے پہلے کبھی نہیں سوچتا اور کر گزرنے کے بعد پچھتاتا رہتا ہے۔ اور قبلہ پہ خوب کی "چپ" دراصل پچھتاوا تھی ـــ اور ہو سکتا ہے قبلہ پہ خوب کی "چپ" اور گھٹن کو محسوس کر کے ہی شبو اس قدر سنجیدہ اور کبیدہ خاطر نظر آتی تھیں ـــ اور ہمیں پتہ نہیں کیوں ایسی "سنجیدگی" سے وحشت ہوتی ہے جس کی حدود "رنجیدگی" سے جا ملتی ہوں۔ چنانچہ ہم نے شبو کو پھر سے شگفتگی کی طرف لانے کے لیے مناسب یہی سمجھا کہ انہیں فوراً گھر کی اس غیر محسوس گھٹن سے دور کہیں کسی کھلی فضا میں لے جایا جائے ـــــــ !!!

مشتاق احمد یوسفی

تزکِ یوسفی

ایک زمانے میں دستور تھا کہ امرا و روسا عمارت تعمیر کراتے تو اس کی نیو میں اپنی حیثیت و مرتبے کے مطا[بق]
کوئی قیمتی چیز رکھ دیا کرتے تھے۔ نواب واجد علی شاہ اپنی ایک مُنہ چڑھی بیگم معشوق محل سے آزردہ ہوئے تو اس کی حویلی ڈھا کر
نئی عمارت تعمیر کرائی۔ معشوق محل' ذات کی ڈومنی تھی۔ اسی نسبت سے اس کی تذلیل و تضحیک کے لئے نیو میں طبلہ سارنگی رکھوائے
میں نے اس کتاب کی بُنیاد اپنی ذات پر رکھی ہے جس سے ایک مدّت سے آزردہ خاطر ہوں کہ "ہیشہ مجھے تھے ہو گ[ئی]
وہ ذات اپنی"

یہ سرگزشت ایک عام آدمی کی کہانی ہے جس پر بحمد اللہ کسی بڑے آدمی کی پرچھائیں تک نہیں پڑی ———— ایک
ایسے آدمی کے شب و روز کا احوال جو ہیرو تو کجا ANTI - HERO ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ عام آدمی تو بے چارہ اتنی بھی سکت
اور استطاعت نہیں رکھتا کہ اپنی زندگی کو مردم آزاری کے تین مسلّمہ ادوار میں تقسیم کر سکے۔ یعنی جوانی میں فضیحت، ڈھلتی عمر میں نصیحت
اور بڑھاپے میں وصیت۔ یہ طغیانِ شباب لاف ہائے شادکامی' معاصرانہ چشمکوں اور سیاست کی شورا شوری کی داستان نہیں۔ نہ ک[سی]
کی مہم جوئی اور کشور کشائی کا "ساگا" ہے۔ بایں ہمہ میں خود کو سکندرِ اعظم سے زیادہ خوش نصیب و کامران سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ میں ز[ندہ ہوں]
میری ایک سانس کی بادشاہت ابھی باقی ہے۔ نہاں خانۂ دل کی ہیرو گیلری پر نگاہ کی تو کسی کی رمق تک اپنی ذات میں نظر نہ آئی
مہری بشتم' سیمول جانسن' گوتم بدھ' فالسٹاف' بابر' غالب' پک وک' بچے' امیر خسرو . . . ہاں ذہن پر ذرا زور ڈالا تو بعض مشاہیر کے چ[ند]
چیدہ چیدہ اوصاف اور شباہتوں کا اپنی ذات میں جھگھٹا نظر آیا' کاش وہ نہ ہوتیں تو زندگی سنور جاتی۔ مثلاً نپولین کا قد' جولیس سیزر کا چٹیل سر
جینا لولو بریجیڈا کا وزن' سیمول جانسن کی بینائی' ناک بالکل قلوپطرہ کی مانند کہ اگر ½ انچ بھی چھوٹی ہوتی تو اُس دُکھیا کا شمار بدصورتوں میں اور ا[یسی]
خوبصورتوں میں ہوتا۔ عمر وہی جو شیکسپیر کے انتقال کے وقت تھی۔ غالب نے خود کو اس بنا پر آدھا مسلمان کہا تھا کہ شراب پیتا ہوں' سؤر نہ[یں]
کھاتا۔ فقیر سُود کھاتا ہے' حرام شئے نہیں پیتا کہ وہ وسیلہ معاش نہیں۔ حضرت موسیٰ کی امّت نے تو سونے کے بچھڑے کی صرف پرستش ہی کی تھ[ی]
ہم تو اس سے افزائشِ نسل کا کام بھی لینے لگے ہیں۔ سُود پر روپیہ چلانا انسان کا دوسرا قدیم ترین پیشہ ہے' اس کے بارے میں کم از کم اُر[دو]
میں ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ پہلے قدیم ترین پیشے کا حق تو مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا میں اور بعد ازاں سعادت حسن منٹو نے بکمال حس[ن]
خوبی و خوباں ادا کر دیا بلکہ کہنا چاہیئے کہ منٹو تو ساری عمر قلم برداشتہ ہی رہے۔

ان واقعات' مشاہدات اور تاثرات کا تعلق میرے بنکنگ کیریر کے ان ابتدائی چھ سات برسوں سے ہے جب اس پیشے کا [بھرم]
قائم تھا۔ البتہ انشورنس ایجنٹوں سے لوگ چھپتے پھرتے تھے پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ انشورنس ایجنٹ تک بینکروں سے منہ چھپانے لگے:

پھرتے ہیں سُود خوار کوئی پُوچھتا نہیں

نامۂ اعمال میں چند تبدیلیاں بوجوہ ناگزیر تھیں، اس میں پردہ نشینوں کے علاوہ کچھ کرسی نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ چنانچہ باستثنائے مسٹر اینڈرسن، نام و مقام بدل دیئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں واقعات و ابواب میں تقدیم و تاخیر نظر آئے گی۔ چند کردار بھی عمداً گڈمڈ کر دیئے ہیں اور خوفِ فسادِ خلق سے سیاہ و سفید کو 'سفید و سیاہ' کر دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر کہیں کسی شخصیت یا حقیقت سے مماثلت پائی جائے تو اُسے "فکشن" کا سقم تصوّر کیا جائے۔ یہ ایک توآموز بینکار کی آشفتہ بیانی ہے۔ کسی مقتول کا بیانِ نزعی نہیں جس کے اختتام پر اسے مرنے کی اجازت اور ملزم کو پھانسی دے دی جائے۔

کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

کچھ روداد ہی میں بنائے ہوئے چالو کول ایسکیچ ہیں کچھ کیری کیچر اور تین چار جی لگا کر بنائی ہوئی کیمیو تصویریں۔ آپ بیتی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ آدمی اپنی بڑائی آپ کرے تو خودستائی کہلائے اور از راہ کسرِنفسی یا جھوٹ موٹ اپنی بُرائی خود کرنے بیٹھ جائے تو یہ احتمال کہ لوگ جھٹ یقین کر لیں گے۔ ممکن ہے بعض پڑھنے والوں کو اس خود نوشت سوانح عمری میں لکھنے والا خود کہیں نظر نہ آئے اگر ایسا تاثر ہے تو یہ عین ترین حقیقت ہوگا۔ اس لئے اپنی زندگی میں بھی ہر قدم پر دوسرے ہی دخیل نظر آتے ہیں عام آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں صرف تین موقعے ایسے آتے ہیں جب وہ تنہا سب کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے: عقیقہ۔ نکاح اور تدفین۔ اس کتاب کا مرکزی کردار کون ہے؟ راقم الحروف؟ مسٹر اینڈرسن؟ وہ فرزانے جن کے دم سے کوچۂ سُود خواراں شاد و آباد ہے۔؟ یا زمانے کی رَو جو ALICE IN WONDERLAND کی بلّی کی طرح خود تو "فیڈ آؤٹ" ہو جاتی ہے لیکن اپنی اَمر مسکراہٹ پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔

امریکہ کے مقبول شاعر رابرٹ فراسٹ سے کسی نے دریافت کیا "وہ کون سا واقعہ ہے جو آپ کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا؟" فراسٹ نے جواب دیا "جب میں بارہ سال کا تھا تو ایک موچی کے ہاں کام کرتا تھا اور دن بھر منہ میں کیلیں دبائے پھرتا تھا۔ آج میں جو کچھ ہوں اور جس مقام پر بھی ہوں اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ سانس لیتے وقت میں نے وہ کیلیں اور کو کے نہیں نگلے۔" اگر آپ کو بھی انکشافِ احوالِ واقعی پر اصرار ہے تو مجھے اعتراف کرنا پڑے گا کہ ۱۹۷۴ء میں میرے یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ کا پریزیڈنٹ ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ جس انگریز جنرل منیجر نے ۱۹۵۰ میں انٹرویو کر کے مجھے بینک میں ملازم رکھا وہ اس وقت نشہ میں دھت تھا۔ اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ شراب نوشی کے نتائج کتنے دُور رس ہوتے ہیں۔

مشہور و مقبول مزاح نگار جارج میکش کا خیال ہے کہ مغرب میں مزاح مرچکا ہے اب زندہ نہ ہوگا۔ لیکن مغرب ہی پر موقوف نہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب انسان میں اپنے آپ پر ہنسنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ اور دوسروں پر ہنسنے سے اُسے ڈر لگتا ہے۔

نہ کوئی خندہ رہا اور نہ کوئی خندہ نواز

انگلینڈ میں لارڈ راچیسٹر نام کا ایک بانکا گزرا ہے۔ کسی گھر بند نہیں تھا۔ زندِ شاہد باز، شاعر، شرابی، جلے باز، پھکیت، ہزل گو، بدنام ہی نہیں، سچ مچ بد، فحاشی میں بے مثال، اس کی ظرافت سے لوگ خائف رہتے تھے۔ مرنے لگا تو بیٹے کو بلا کر کہا "بیٹا! میری واحد وصیت یہ ہے کہ ظرافت سے پرہیز کرنا" معلوم ہوتا ہے اس کی ظرافت میں ایک نہیں، کئی آنچ کی کسر رہ گئی ہے، ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔ جہاں سچ بول کر سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑتا ہے وہاں چاتر مزاح نگار الف لیلیٰ کی شہرزاد کی طرح ایک ہزار ایک کہانیاں سُنا کر اپنی جان اور آبرو صاف بچالے جاتا ہے۔ میں نے گمبھیر، بین الاقوامی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی سوالوں سے جان چھڑانے کے لئے بیس سال پہلے ایک جملہ گھڑا تھا۔ "دنیا میں جہاں کہیں، جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہماری اجازت کے بغیر ہو رہا ہے۔" مزاح نگار کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں اس طرح کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو بھی بہت بعد میں خبر ہوتی ہے۔ میں نے کبھی کسی پختہ کار مولوی یا مزاح نگار کو محض تقریر و تحریر کی پاداش میں جیل جاتے نہیں دیکھا۔ مزاح کی میٹھی مار بھی شوخ آنکھ، پُرکار عورت اور دلیر کے وار کی طرح کبھی

خالی نہیں جاتی ۔

بین چُھپائے نا چُھپیں ، پٹ گھونگھٹ کی اوٹ
چَتر نار اور سور ما کریں لاکھ میں چوٹ

ہمارے دَور کے سب سے بڑے مزاح نگار ابنِ انشا کے بارے میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ بچھو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے ، اِنشاجی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے ۔ جس شگفتہ نگار کی تحریر اس معیار پر پوری نہ اترے اُسے یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کر دینا چاہیئے ۔

یہاں ایک چھوٹی سی دُنیا کی جھلک دکھانی مقصود ہے جس کا ہر خانہ ، ہر کابک ، بھانت بھانت کے فرماں روایانِ ناوقت کا مُجلّہ پندار ہے ۔ بقول مولانا حالی :

جانور ، آدمی ، فرشتہ ، خدا
آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں

منشا سبق آموزی جہاں نہیں ۔ نہ اپنے سینے میں کوئی ایسی امانت یا آگ کہ امیر خسرو کی طرح یہ کہہ سکیں کہ اس صندوقِ استخوانی میں بے شمار تحفہ ہائے آسمانی ایسے تھے جو میں نے اس دن کے لئے بچا رکھے تھے ۔ اپنے وسیلۂ اظہار ـــــ مزاح ـــــ کے باب میں میں کسی خوش گمانی میں مبتلا نہیں ۔ قہقہوں سے قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں ۔ چٹنی اور اچار لاکھ چٹخارے دار سہی ، لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا ۔ نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے ۔ ہاں ، ریگستان کے شدائد کم ہو جاتے ہیں ۔ زندگی کے نشیب و فراز ، اندوہ و انبساط ، کرب و لذت کی منزلوں سے بے نیازانہ گزر جانا ، بڑے حوصلے کی بات ہے

بارِ الم اُٹھایا ، رنگِ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

مگر یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ خوش دلی کی ایک منزل بے حسی سے پہلے پڑتی ہے اور ایک اس کے بعد آتی ہے ۔

سبھی کی مسکراہٹیں اور ہنسی ایک جیسی نہیں ہوا کرتی فالسٹاف قہقہہ لگاتا ہے تو دمدم دوم تُھرکا اُٹھتا ہے ۔ کوئی بڑا گرتا ہے تو چھوٹے ٹھٹھے لگتے ہیں ۔ قومیں جب اللہ کی زمین پر اِترا اِترا چلنے لگتی ہیں تو زمین اپنے ہی زہر خند سے شق ہو جاتی ہے اور تہذیبیں اس میں سما جاتی ہیں ۔ شیر خوار بچے خوش ہوتے ہیں تو کلکاریاں مارتے ، ہمک کر ماں کی گود میں چلے جاتے ہیں ۔ ادھر مونالیزا ہے کہ صدیوں سے مسکرائے چلی جا رہی ہے اور ایک مسکراہٹ وہ بھی ہے جو نِروان کے بعد گوتم بدھ کے لبوں کو ہلکا سا خمیدہ کر کے اس کی نظریں جھکا دیتی ہے ۔ یہ سب سہی لیکن ماورائے تبسم ، وہ اہتزاز اور مزاح جو سوچ ، سچائی اور دانائی سے عاری ہے دریدہ دہنی ، پھکڑپن اور ٹھٹھول سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ، زر ، زن ، زمین اور زبان کی دُنیا ، یک رُخوں ، یک چشموں کی دُنیا ہے مگر تتلی کی سینکڑوں آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ ان سب کی مجموعی مدد سے دیکھتی ہے ۔ شگفتہ نگار بھی اپنے پورے وجود سے سب کچھ دیکھتا ، سنتا ، سہتا اور سہارتا چلا جاتا ہے اور فضا میں اپنے سارے رنگ بکھیر کے کسی نئے اُفق ، کسی اور شفق کی تلاش میں گم ہو جاتا ہے ۔

(باقی آئندہ)

O

٭ ماخوذ از مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی خود نوشت سوانح حیات " زرگزشت " کا مقدمہ

خرافات

★ مراسلات

● مجتبیٰ سید مصطفیٰ کمال صاحب

آج کی ڈاک سے اپریل کا "شگوفہ" (سوونیر) ملا۔ ماشاءاللہ خوب ہے۔ سرورق خاص طور پر بہت اچھا ہے' تصاویر کے اضافے نے اس چھوٹے سے خاص نمبر کی جاذبیت اور بھی بڑھادی ہے۔ مندرجات سے گزرنے کا موقع نہیں ہے' اچھے طنز و مزاح نگار شریک ہیں ظاہر ہے نگارشات بھی اچھی ہونگی۔

اعجاز صدیقی مدیر 'شاعر' بمبئی

● مصطفیٰ کمال صاحب

بڑے بنو۔ اپریل ۷۷ء کا خصوصی شمارہ کل ہی ملا' خوب سے خوب تر ہے۔ مبارک۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ تبصرہ ایک ہی دن میں کیسے ہوگیا۔ یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ بمبئی میں کالج سے گھر اور گھر سے کالج تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ٹرین میں بیٹھنا پڑتا ہے جس میں یا تو پڑھائی ہوتی ہے یا لڑائی۔ علاوہ ازیں آج کل تعطیلات میں کافی فرصت ہے اور پھر یہ بھی جو ہاتھ میں تھا شگوفہ' اس لئے تقریباً پورا شمارہ پڑھ ڈالا۔ اس "تقریباً" کی تشریح یہ ہے کہ زیر نظر شمارہ میں صفحہ ۴۸ کے بعد صفحہ ۶۵ ہے' درمیان کی ایک مکمل جلد غائب ہے جس کی وجہ سے کافی چوزن سے محرومی رہی۔

زیر نظر شمارہ کے علاوہ گذشتہ چند شماروں میں بھی 'اداریہ' نظر نہ آسکے۔ کچھ بھی لکھئے' صفحہ اول پر لکھئے یا آخر پر' لیکن لکھیئے ضرور۔'
۴۔ CAPTION COMPETITION پسند آیا۔

پروفیسر ایس اے ایم ہاشمی' بمبئی

● 'شگوفہ' مئی نمبر نظروں سے گذرا' ٹائٹل کیا ہے۔ دیکھتے ہی گدگدیاں شروع ہوئیں' سرورق رنگین ہوتے ہوئے بھی کافی سنگین ہے۔

دیوانوں سے کہہ دو کہ چلا راکٹ ظرافت
کیا اب کے برس چاکِ گریباں نہ کریں گے

زندہ دلانِ حیدرآباد نے ظرافت کا راکٹ آج فضائے بسیط میں داغ دیا ہے' لیکن ہائے رے مجبوری کہ وہ قلم جو سنجیدگی اور شستگی سے ذہنوں کو مفلوج کرتا رہا۔ اب اس کے لئے کوئی جگہ نہ رہی اِلّا یہ کہ ظرافت کی (N.I.S) سنبھال لی' اس قدر شاندار ٹائٹل کے لئے طالب صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں ــــ مقرب حسین کی "بلّی کی موت" خوب ہے اس کے بجائے اگر عنوان 'آج کا پاکستان' ہوتا تو مناسب تھا' ــــ طالب خوندمیری کی "تین سہیلیاں" اور ان کی رازدارانہ گفتگو خوب ہے۔

آپ کے زندہ دلان سے کچھ مُردہ دلان کو چھانٹ دیجئے ــــ آخر کب تک یہ عشقِ شگوفہ و بزمِ زندہ دلان کے لئے نظر توڑ کا کام کریں گے "شیطان کی آنت" "پہ خوب" ابھی کتنی ملی میٹر باقی ہے۔

عبد النعیم خاں' رائچور

● مئی ۷۷ء کا تازہ شمارہ دیکھا میرے بھیجے ہوئے "مالِ مسروقہ" (زندہ دلان حیدرآباد کا دسواں کل ہند مزاحیہ مشاعرے کی رپورٹ) کی اشاعت کا بیحد شکریہ' شاید ہی کسی کو پسند آیا ہو! اس دور میں بھی میری یہ رپورتاژ سنسر کی دستِ ظلم و نگاہِ بد سے نہ بچ سکی۔ کاتب نے بھی بعض بعض مقامات پر اپنا کرشمہ دکھایا ہے۔ میں ان شعرائے کرام سے معذرت خواہ ہوں جن کا کلام اس رپورٹ میں شائع نہ ہوسکا' خود مجھے بھی اس کا افسوس ہے' مجبور تھا' بہتر ہوتا اگر منعقدہ مشاعرہ کی ایک دو تصاویر بھی شاملِ اشاعت ہوتیں۔

"شگوفہ" کو ہندوستان کا واحد و منفرد طنز و مزاح کے ترجمان ہونے کا شرف حاصل ہے جو نئے اور پرانے قلمکاروں کی تخلیقات کو شائع کرتے ہوئے قارئین تک پہنچا کر عوام کے مردہ دلوں میں ہنسی و خوشی کا طوفان بپا کر دیتا ہے' وقتی طور پر ہی سہی انھیں دنیا و مافیہا کے غموں سے نجات دلاتا ہے' کہتے ہیں کہ ایک قہقہہ انسانی جسم میں ایک خاص مقدار کو بڑھانے اور اس سے آسودگی کے جرثوموں کو تقویت پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔

"شگوفہ کو پھولنے پھلنے اور اس کو سنوارنے میں آپ نے اپنا خون

پانی ایک کر دیا ہے، خدا کرے آپ کی یہ محنت عوام کے دلوں کی شگفتہ دھڑکن بن جائے اور "شگوفہ" ترقی کی بلند ترین منزلوں کو چھوتا ہوا قیامت تک عالم نزاع سے گزرنے والی "اردو" زبان کی خدمت کرتے ہوئے لوگوں کی زندگی میں ہنسی اور خوشی کی کلیاں سدا کھلاتا رہے۔

پرچہ خوب ہے، مبارک۔ اچھا خدا حافظ۔ "شگوفہ" زندہ باد۔

اَن پڑھ بھونگیری مقیم حیدرآباد

● تازہ شمارہ زیر مطالعہ ہے، دسویں کل ہند مزاحیہ مشاعرے میں عدم شرکت کا مجھے افسوس تھا بڑی خوشی کی بات ہے کہ زیر نظر شمارے میں "اَن پڑھ" بھونگیری" صاحب کی رپورٹ پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ میں خود اس مشاعرے میں بیٹھا لطف اندوز ہو رہا ہوں، میں آپ کا اور اَن پڑھ صاحب کا بے حد شکر گذار ہوں کہ آپ نے طنز و مزاح کے سب سے بڑے اجتماع میں جن کو شرکت کا موقع نہیں ملتا اس کی رپورٹ کے ذریعہ وہ اپنی پابجائی کر لیتے ہیں، ان کے ٹیپ ریکارڈنگ خرابی کا ہمیں بھی افسوس ہے کہ بعض شعرائے کرام کے کلام کو پڑھنے سے قاصر رہے، ان کا یہ "پرانا دھیڑا" ہی سہی مگر پھر بھی سیر حاصل مواد فراہم کیا ہے، دوسرے مضامین بھی خوب ہیں اور پرچہ بھی، اس کی ترقی کے لئے دست بدعا ہوں۔ خدا حافظ

احمد عارف اللہ شریف

انیس الدین حیدرآباد

● "شگوفہ" آپ کی سرکردگی میں دن بدن نکھرتا ہی جا رہا ہے خدا اسے دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین

انصاری اصغر جمیل، ناگپور

اداریہ

فلمی دنیا کے مشہور و ممتاز مکالمہ نگار ساگر سرحدی کو سال ۱۹۷۶ء کا بہترین مکالمہ نگار قرار دیا گیا اور فلم فیر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ یہ انعام فلم "کبھی کبھی" کے لکھے گئے مکالموں پر دیا گیا ہے۔ اس حقیقت سے سبھی واقف ہیں کہ طنز و مزاح کی چاشنی اور مکالموں کے نئے پن نے فلم "کبھی کبھی" کو خاص شہرت بخشی، ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی فلم کی مقبولیت میں مکالموں نے اس قدر اہم حصہ ادا کیا ہو۔ فلم "کبھی کبھی" کی شہرت کو ساگر کے شوخ، چلبلے اور جاندار مکالموں نے چار چاند لگائے۔ ہم مزاحیہ ڈرامہ نمبر کے مہمان مدیر جناب ساگر سرحدی کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے فلمی مکالموں کو نئی جہت عطا کرتے رہیں گے۔

■ یہ خبر بڑے دکھ و ملال کے ساتھ سُنی گئی کہ نوجوان افسانہ نگار ابراہیم شفیق، مختصر سی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ جب وہ شریک ہسپتال ہوئے تو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوگی ـــــ اس قدر کم عمری میں اس ممتاز افسانہ نگار کی موت پر کس منہ سے پرسہ دیں اور کس انداز میں رنج و غم کا اظہار کریں ؟ یہ ضرور کہنا ہے کہ اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش اور دوسرے اُردو ادارے آگے آئیں اور پسماندگان کی اعانت کے ذریعہ کم از کم ان کی وقتی مالی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال ایم اے (عثمانیہ)

مجلس ادارت: منظور احمد • حمایت اللہ • مسیح انجم

مجلس مشاورت: راجندر سنگھ بیدی • بھارت چند کھنہ • خواجہ عبدالغفور
زیندر لوتھر • مجتبیٰ حسین

جنرل منیجر: ممتاز احمد

کتابت: غوث محمد • محمود سلیم • شمیم النساء • عصمت سلطانہ

فی پرچہ: ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ: ۲۰ روپے • بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ

جلد: ۱۰ • جولائی ۱۹۷۷ • شمارہ: ۷

شگوفہ

مجردگاہ معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (اے، پی)

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ کے لئے
اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار میں چھپا۔

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

● اپنے مُنہ میاں مٹھّو (خود نوشت سوانح حیات)

▲ مال مفت (انشائیے)

▬ اڑیں گے پُرزے (شخصیات)

■ نہیں آتی تو یاد اُن کی (یاد رفتگاں)

◢ دخل در نامعقولات (افسانہ)

I قاضی جی دُبلے (آنکھوں دیکھا حال)

▬ شیطان کی آنت (قسط وار ناول)

پھوڑن (نظمیں)

ہماری کامیابی لائق ستائش ہے

آندھرا پردیش کے مویشی ہندوستان کے مویشیوں کی جملہ تعداد کا (۷) فیصد ہیں۔ ریاست میں مویشیوں کے فروغ کے کام کو ترجیحی توجہ حاصل ہے۔ کلیدی مواضعاتی مراکز مویشیوں سے متعلق پرزور ترقیاتی پراجکٹس کے قیام کے سلسلہ میں پیشرو ادارہ جات کی خدمات ادا کر رہے ہیں۔

فی الوقت ۴۱ کلیدی مواضعاتی مراکز موجود ہیں جو تقریباً ۱۳ء۴ لاکھ گائیوں اور بھینسوں پر محیط ہیں۔ اس اسکیم کا مقصد فروغ مویشیاں کے سلسلہ میں کثیر رخی حکمت عمل کو بروئے کار لانا ہے

علاوہ ازیں ریاست میں (۱۰) افزائش مویشیاں کے مراکز قائم ہیں نیز کریم نگر اور اما دلا وسلا میں مویشیوں کی غذا ملانے والے دو پلانٹس بھی کام کر رہے ہیں۔

مادہ تولید اکٹھا کرنے والے ۱۵ مراکز ہیں جو فروغ مویشیاں کے مختلف پروگراموں کے تحت سرگرم عمل مصنوعی طریقے سے مادہ تولید رحم مادہ میں داخل کرنے والی ۲۰۰۰ یونٹوں کی ضروریات کی پابجائی کرتے ہیں۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR/ No. 6 - 77-78.

مشتاق احمد یوسفی

زرگزشت

(سوانح نوعمری)

کراچی میں سردی اتنی ہی پڑتی ہے جتنی مری میں گرمی۔ اس سے ساکنانِ کوہ مری کی دل آزاری نہیں، بلکہ عروس البلاد کراچی کی دلداری مقصود ہے۔ کبھی کبھار شہرِ خوباں کا درجۂ حرارت جسم کے نارمل درجۂ حرارت یعنی ۹۸٫۴ سے دو تین ڈگری نیچے پھسل جائے تو خوبانِ شہر لحاف اوڑھ کر ایر کنڈیشنر تیز کر دیتے ہیں۔ عشقِ خود بیں و خود آرا جب ۳۶ نمبر کے مشمولات کا ۳۴ نمبر کے سوئٹر میں خلاصہ کر کے آئینہ دیکھتا ہے تو حیا کی سرخی رخساروں پر دوڑ جاتی ہے جسے موسمِ سرما کے خونِ صالح پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس حسن تضاد کو کراچی کے محکمہ موسمیات کی اصطلاح میں "کولڈ ویو" (سردی کی لہر) کہتے ہیں۔ یہ خوبی صرف کراچی کے متلوّن موسم میں دیکھی کہ گھر سے جو لباس بھی پہن کر نکلو، دو گھنٹے بعد غلط معلوم ہوتا ہے۔ لوگ جب اخبار میں لاہور اور پنڈی کی سردی کی شدید خبریں پڑھتے ہیں تو ان سے بچاؤ کے لئے بالو کی بھنی مونگ پھلی اور گزک کے پھنکے مارتے ہیں۔ اُن کے بچے بھی انھیں پہ پڑے ہیں۔ بادِ شمال اور گو شمالی سے بچنے کے لئے اُونی کنٹوپ پہن کر آئسکریم کھاتے اور بڑوں کے سامنے بتیسی بجاتے ہیں۔ کراچی میں پنڈی سے تین لحاف کم سردی پڑتی ہے۔ نووارد حیران ہوتا ہے کہ اگر یہ جاڑا ہے تو اللہ جانے گرمی کیسی ہوتی ہوگی۔ بیس سال سرد و گرم جھیلنے کے بعد ہمیں اب معلوم ہوا کہ کراچی کے جاڑے اور گرمی میں تو اتنا واضح فرق ہے کہ بچہ بھی بتا سکتا ہے۔ ۹۰ ڈگری ٹمپریچر اگر مئی میں ہو تو یہ موسم گرما کی علامت ہے۔ اگر دسمبر میں ہو تو ظاہر ہے کہ جاڑا پڑ رہا ہے البتہ جولائی ۹۰ ڈگری ٹمپریچر ہو اور شام کو گرج چمک کے ساتھ بیری برس پڑے تو برسات کا موسم کہلاتا ہے۔ غالباً کیا یقیناً ایسے ہی کسی نیم گرم، گنگنے کراچوی جاڑے سے اُکتا کر نظیر اکبر آبادی نے تمنا کی تھی

هر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا
اور تن میں نیمہ شبنم کا، ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا
ہاتھوں میں پیالہ شربت کا، ہو آگے اِک فرّاش کھڑا
فرّاش بھی پنکھا جھلتا ہو، تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

تین چار سال بعد دو تین دن کے لئے سردی کا موسم آ جائے تو اہلِ کراچی اس کا الزام "کوئٹہ ونڈ" پر دھرتے ہیں۔ اور کوئٹہ کا سردی کی شدّت کو کسی سیم تن کے ستر نما سوئٹر سے ناپتے ہیں۔ کراچی کی سردی بیوہ کی جوانی کی طرح ہوتی ہے۔ ہر ایک کی نظر پڑتی ہے اور وہیں ٹھہر بلکہ ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ اُدھر کوئٹہ میں جب دستانے، کمبل، مفلر اور سمور کے انبار میں سے صرف جھکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جائے کہ ان کے جنوب میں مونچھ ہے یا پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے تو کوئٹہ والے

اس علاقے کا ذمہ دار قندھاری ہوا کو ٹھیراتے ہیں اور جب قندھار میں سائبیریا کی زہریلی ہواؤں سے درختوں پہ اناروں کی بجائے کے لڈو لٹکتے ہیں۔ گوالے گائے کے تھنوں سے آئس کریم دوہتے ہیں اور سردی سے تھر تھر کانپتے ہوئے انسان کے دل میں جہنم کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے تو اہالیانِ قندھار کابل سے چمٹ کر ہمسایہ ملک کی طرف دیکھتے ہیں چھوٹے ملکوں کے موسم بھی نہیں ہوتے ہوائیں اور طوفان بھی دوسرے ملکوں سے آتے ہیں زلزلوں کا مرکز بھی سرحد پار ہوتا ہے۔

یہ جنوری ۱۹۵۰ء کی ایک ایسی ہی صبح کا ذکر ہے۔ موسمی کیفیت ہم نے قدرے تفصیل و تنقیص کے ساتھ اس لئے کی کہ کراچی میں یہ ہماری پہلی صبح تھی۔ گوارا حد تک گرم ہونے کے علاوہ یہ ایک تاریخ ساز صبح بھی تھی۔ زمستان کی اس صبح کے پیٹے سے ہمارے طویل "فلرٹیشن" کا آغاز ہوا۔ اور صبح اس وقت نہیں ہوتی جب سورج نکلتا ہے۔ صبح اس وقت ہوتی ہے جب آدمی جاگ اٹھے۔ کسی نے ایک دن فرانس کے شہرۂ آفاق ادیب پروست سے پوچھا کہ دنیا کی عسکری تاریخ میں کس واقعہ نے سب سے زیادہ متاثر کیا تو اس نے بلا تامل جواب دیا، فوج میں میری بھرتی۔

ہمارے فلرٹیشن کا آغاز

کراچی میں براہ کھوکھراپار وارد ہوئے ہمیں ۲۰ گھنٹے ہوئے تھے۔ وہ صبح نہیں بھولے گی جب ریلوے لائن کے کنارے سی سفید چمکتی تختی پر پہلے پہل "پاکستان" لکھا نظر آیا تو اسے ہاتھ سے چھو چھو کر دیکھا تھا۔ پھر مٹی اٹھا کر دیکھی۔ السلام علیکم کہتے ساربان دیکھے۔ ہندوستان کے نوٹ پر پہلی دفعہ حکومتِ پاکستان چھپا ہوا دیکھا اور پھر ریگزار راجستھان میں پرکھوں کی خبریں، ماں کے دودھ کے ساتھ وجود میں رچی بسی تھی اور اپنے پیاروں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے، خیرگی امروز میں دھندلاتے چلے گئے۔

مری بار کیوں دیر اتنی کری

منا باؤ کے اجاڑ اسٹیشن پر دو راتیں تارے بھرے آسمان کے نیچے گزارنے سے گلا خراب ہو گیا تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ ٹانسلز میں کوئی بد چلن مینڈک پھنس گیا ہے۔ ذرا منہ کھولتے تو ٹرٹرانے لگتا۔ میکلوڈ روڈ پر بینک کا ہیڈ آفس تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ ہم نے ایک چھپی ہوئی پرچی پر اپنا نام لکھ کر جنرل منیجر مسٹر ڈبلو۔ جی۔ ایم اینڈرسن کو بھجوایا۔ تقریب بہر ملاقات کے خانے میں حروف میں "سرکاری" لکھ دیا۔ جس سے ہماری مراد بھی یعنی بسلسلہ ملازمت تھی اور آخر میں جلی حروف میں: "فرستادہ اصفہانی، چیرمین بینک ہٰذا" سفارش میں لپٹی ہوئی یہ دھمکی ہمارے کام نہ آئی اس لئے کہ ہمارے بعد آنے والے ملاقاتی جو ہمارے سے زیادہ خوش پوش اور حیثیت دار نہ تھے، باری باری شرفِ باریابی حاصل کر کے رخصت ہو گئے اور ہم سر جھکائے سوچتے رہے کہ مری بار کیوں دیر اتنی کری؟

ڈیڑھ دو گھنٹے بنچ پر انتظار ساغر کھینچنے کے بعد جی میں آئی کہ لعنت بھیجو ایسی ذلت کی نوکری سے بے روزگاری بہتر ہے، اندھیر بھی ہوگا۔ چل خسرو گھر آپنے سانج بھئی چو دیس۔ مرزا غالب بھی تو فارسی مدرسی کی سو روپے ماہوار اسامی کے لئے بیٹھو کر مسٹر ٹامسن کے پاس انٹرویو کے لئے گئے تھے۔ لیکن الٹے پھر آئے اس لئے کہ وہ ان کی پیشوائی کو باہر نہیں آیا۔ کہا کہاں ہو چکی ملاقات، پالکی اٹھاؤ، ہم بھی استاد کے تتبع میں واپس پالکی میں سوار ہو رہے تھے کہ اندر والا بولا ہوش تم کہاں کے دانا ہو کس ہنر میں یکتا ہو؟ مرزا تو شاعر آدمی ٹھیرے اس کے بعد بھی جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نیا آتا قصیدہ بطریق نذر گزرانتے رہے اور پنشن کے علاوہ سات پارچے کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید برابر وصول تم کیا کرو گے؟ تم تو صرف نثر میں خوشامد کرنی جانتے ہو۔ پھر واپسی کے لئے باہر پالکی بھی تو نہیں ہے کہ ٹھنٹھناتے ہوئے بیٹھ

آ گئے اور راستے میں کہاروں کو کندھا تک نہ بدلنے دیا اور ہاں' روزی پہ لات مار کر چلے بھی گئے تو اس مظاہرہ پندار کو شہرت دوام بخشنے کے لئے محمد حسین آزاد کو کہاں سے لاؤ گے ؟ کہاں وہ خود داری کہاں یہ سجدۂ ناقبول ۔ بندہ ناخدا ! مزے سے بیٹھے کشکول بجاتے رہو تین برس تم ڈپٹی کمشنر رہے ۔ سچ کہو کبھی کسی اہلِ غرض سے سیدھے مُنہ بات کی ؟

کچھ دیر بعد چپراسی ہماری کس مپرسی پہ ترس کھا کے خود ہی کہنے لگا کہ اگر نوکری کی سفارش لے کر آئے ہو تو آج مڈبھیڑ نہ کرو ۔ اُجّن نجر سے سالے کا مغز پھر لیا ہے ۔ الّھا باٹلی دارو پیٹے لا ہے ۔ پاکٹ میں چھوٹا باٹلی کے اندر " مکسچر " بھر کے لایا ہے ۔ دو کلاک پہلے سگرٹ سے تجوری کھولنا مانگتا تھا ۔ اصلی رنگت سولہ آنے مُولی کے مُوافق ہے پن اس ٹیم جاستی بلڈ پریشر سے ایک دم چقندر لگتا پڑا ہے تمیرا کام آج کے دن نہیں ہونے سکتا ۔

پون بجے جب اسٹاف ایک ایک کر کے لنچ کے لئے کھسکنے لگا اور مہتر اس چابکدستی سے جھاڑو دینے لگا کہ گرد کا ایک ایک ذرّہ کھنچ کر ہماری عینک اور چہرے پر جمع ہو جائے تو زور سے گھنٹی بجی اور بجتی ہی چلی گئی ۔ معلوم ہوتا تھا کوئی گھنٹی کے بٹن پر بیٹھ گیا ہے ۔ چپراسی نے کوئی نوٹس نہ لیا ۔ چند لمحے پہلے سلگائی ہوئی پہلوان مارکہ بیڑی کے کش لیتا رہا پھر اُسے چھنگلیا میں دبا کر الوداعی دم لگایا اور جوتے کی ایڑی پر رگڑ کر بجھا دیا ۔ بیڑی کا بنڈل چونّی فلمی گانوں کا کتابچہ سر پر رکھا اور اُس پہ ترکی ٹوپی کو کج کیا ۔ پھر اس " سیف ڈپازٹ لاکر ' کا پھندنا ہلا کر کہنے لگا کہ لگتا پڑا ہے اب کے تمہاری آئی ہے ۔ قسمت کی بدنصیبی کو صیّاد کیا کرے ؟ لارا لپّا لارا لپّا ! لا لا لا !

... کچھ نے کہا چہرہ ترا

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے اپنی دائیں ہتھیلی کا پسینہ پونچھ کر ہاتھ مصافحہ کے لئے تیّار کیا ۔ سامنے کرسی پر ایک نہایت بارعب انگریز نظر آیا ۔ سر بیضوی اور ویسا ہی صاف اور چکنا ۔ جس پر پنکھے کا عکس اتنا صاف تھا کہ اس کے بلیڈ گنے جا سکتے تھے ۔ آجکل کے پنکھوں کی طرح اس پنکھے کا وسطی حصّہ نیچے سے چپٹا نہ تھا بلکہ اس میں ایک گاؤ دُم چونچ نکلی ہوئی تھی' جس کا مصرف بظاہر یہ نظر آیا کہ پنکھا سر پر گرے تو کھوپڑی پاش پاش نہ ہو ۔ بلکہ اس میں ایک صاف گاؤ دم سوراخ ہو جائے ۔ بعد میں اکثر خیال آیا کہ سر پر اگر بال ہوتے تو اس کی وجاہت و دبدبہ میں فرق آ جاتا میز کے نیچے ایک اُدھڑا اُدھڑا " کیمل کلر " کا قالین بچھا تھا رنگ میں واقعی اس قدر مشابہت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی خارش زدہ اونٹ اپنی کھال فرش راہ کئے پڑا ہے ۔ بھرے بھرے چہرے پر سیاہ فریم کی عینک ۔ کچھ پڑھنا یا پاس کی چیز دیکھنی ہو تو ماتھے پر چڑھا کر اس کے نیچے سے دیکھتا تھا ۔ دُور کی چیز دیکھنی ہو تو ناک کی پھننگ پر رکھ کر اُس کے اوپر سے دیکھتا تھا ۔ البتہ آنکھ بند کر کے کچھ دیر سوچنا ہو تو ٹھیک سے عینک لگا لیتا تھا ۔ بعد میں دیکھا کہ دُھوپ کی عینک بھی ناک کی نوک پر ٹکائے' اس کے اوپر سے دھوپ' کا معائنہ کرتا ہوا بینک آتا جاتا ہے ۔ آنکھیں ہلکی نیلی جو یقیناً کبھی روشن روشن رہی ہوں گی ۔ ناک ستواں تیرشی ترشائی ۔ نچلا ہونٹ تحکمانہ انداز سے ذرا آگے کو نکلا ہوا ۔ سگریٹ کے دھوئیں سے ارغوانی ۔ بائیں ابرو ۔ بے ایمان دکاندار کی ترازو کی طرح مستقلاً اوپر چڑھی ہوئی ۔ گرجدار آواز ۔ جسم مائل بہ فربہی ۔ رنگ وہی جو انگریزوں کا ہوتا ہے ۔ آپ نے شاید دیکھا ہو گا کہ چینیوں کا چہرہ عمر سے بے نیاز ہوتا ہے اور انگریزوں کا جذبات سے عاری بلکہ بعض اوقات تو چہرے سے بھی عاری ہوتا ہے لیکن یہ بالکل مختلف چہرہ تھا ۔ ایک عجیب تمکنت اور دبدبہ تھا اس چہرہ پہ ۔ کمرے میں فرنیچر برائے نام نہ آرائش کی کوئی چیز سارا کمرہ اس کے چہرے سے ہی بھرا بھرا نظر آتا تھا ۔ یہ مقابل ہو تو اور کوئی چیز ــــ اس کا اپنا جسم بھی نظر نہیں آتا تھا ۔

اس کا سراپا ہے یہ مصرع ۔ چہرہ ہی چہرہ پاؤں سے سر تک

ہم نے تیار شدہ ہاتھ مصافحہ کو بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیا ۔ کچھ دیر بعد " کریون اے " کا " کارک ٹپڈ " سگریٹ ڈبّے سے نکال کر الٹی طرف سے ہونٹوں میں دبایا ۔ وہ بہت بُرے موڈ میں تھا ۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے چائے کی پیالی اٹھائی

اور دوسرے کانپتے ہوئے ہاتھ سے زیادہ کانپتے ہاتھ کو تھاما۔ کپ کی ڈگڈگی سی بجنے لگی اور چائے چھلک کر ہماری درخواست کو رنگین کرگئی۔ اب ایک دیاسلائی کو اپنے بہتر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کے اس پر ڈبیا رگڑنے لگا لیکن وہ کسی طرح جل کر نہیں دیتی تھی۔ راہ مخواہ کا تکلف تھا، ورنہ چاہتا تو اسے اپنے بلڈ پریشر پہ رگڑ کے بآسانی جلاسکتا تھا۔

ہمارا سنِ پیدائش

اس نے غلط طرف سے سگریٹ سلگایا۔ کارک کچھ دیر بعد خود جل جلا کر ہماری گیلی درخواست پر چھن سے بجھ گیا۔ اُس نے چھنگلیا کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ ہم تعمیلاً بیٹھنے والے ہی تھے کہ ناگاہ اسی کرسی کی گہرائیوں سے ایک کتا اُٹھ کھڑا ہوا اور ہمارے شانوں پر دونوں پنجے رکھ کر ہمارا گرد آلود مُنھ اپنی زبان سے صاف کیا "مائی ڈاگ از ویری فرینڈلی" کتے سے تعارف کرانے کے بعد اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لیا۔ کیسے ہو؟ کون ہو؟ کیا ہو؟ اور کیوں ہو؟

سوائے آخری سوال کے، ہم نے تمام سوالات کے نہایت تسلی بخش جواب دیئے۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس بینک کو میں چلا رہا ہوں، مسٹر اصفہانی نہیں۔ خیر۔ تم نے معاشیات پڑھی ہے؟" اس نے کہا۔

"نوسر!"

"حساب میں بہت اچھے تھے؟"

"نوسر! حساب میں ہمیشہ رعایتی نمبروں سے پاس ہوا، حالانکہ انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم اے تک فرسٹ ڈویژن

"حساب میں فیل ہونے کے علاوہ تمہارے پاس اس پیشے کے لئے اور کیا کوالی فیکیشن ہے؟"

"میں نے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا ہے"

"ہاہاہا! تمہارا سوشل بیک گراونڈ کیا ہے؟ کس خاندان سے تعلق ہے؟"

"میرا تعلق اپنے ہی خاندان سے ہے"

سچ بولنے کا شکریہ"

جی تو بہتیرا چاہا کہ لگے ہاتھوں یہ بھی بتادیں کہ بزرگ جب جاہ و مال سے بے نیاز تھے۔ فقط ہمیں اپنی نشانی چھوڑا۔ نادر شاہ نے تو اپنی ولدیت شمشیر، ابنِ شمشیر، ابنِ شمشیر بتا کر بد خواہوں اور مورخوں کا مُنہ بند کر دیا تھا، لیکن یہ فقیر، ابنِ آدم، ابنِ آدم، ابنِ آدم کے علاوہ کیا بتاتا۔

اس کے منہ سے ایسی لپٹ آرہی تھی جیسی روئی کے اس پھوئے سے آتی ہے جو انجکشن سے پہلے نقطۂ اذیت پر رگڑا جاتا ہے استفسار فرمایا "تم کب اور کہاں 'ڈلیور' ہوئے تھے؟ ہاہاہا!"

وہ زور سے ہنسا ہم ذرا چکرائے تو کہنے لگا، اچھا یہ تو بتاؤ کہ جس سنہ میں تم پیدا ہوئے، اس سال اور کون سا بین الاقوامی سانحہ ہوا تھا؟

انٹرویو کے سلسلے میں ایک عرصہ پہلے ہم نے معلومات عامہ کے نامعقول سے نامعقول سوالوں کے جواب رٹ لئے تھے مثلاً کرکٹ کی گیند کا وزن۔ مکھی کی ٹانگوں اور بیل کے دانتوں کی تعداد۔ نپولین کا قد۔ اگر بینک سے صرف ۱۰۰ روپے بڑے سود پر قرض لئے جائیں تو وہ کس طرح ۲۵۰ سال میں ۲,۲۱۷,۹۰۲,۴۰۰ ہو جائیں گے! خالص سونا کتنے کیرٹ کا ہوتا ہے؟ بلی کی آنتوں کی لمبائی۔ کتا زبان کیوں باہر نکالے رکھتا ہے؟ انسان منہ کھولنے سے کیوں ڈرتا ہے، اچھا خاصا اور Rs

فیں حرف غلط کی طرح کاٹا (... ، ...) کیوں جاتا ہے تخلص پہ ڈوڈی کیلا بتائی جاتی ہے ؟ شیکسپیئر کے ہاں شادی کے کتنے
بچہ تولد ہوا ؟ بانس پولا کیوں ہوتا ہے ؟ وغیرہ وغیرہ ؟ .... لیکن اپنی پیدائش کے بین الاقوامی متوازیات کی طرف ہمارا دھیان
یں گیا تھا ۔

ہمارا آدھا جسم جو اس کے مقابل تھا بالکل ٹھنڈا ہو گیا اور ہم انتہائی بے بسی کے عالم میں جھومنے لگے تو اس نے ہماری درخواست
پیدائش دیکھ کر اندوہ گیں لہجہ میں کہا کہ بائی دی وے، جس سال تم پیدا ہوئے اُسی سال میرے باپ کا انتقال ہوا۔ بڑا
تھا وہ سال !"

شہر تھا عالم میں انتخاب

"رہنے والے کہاں کے ہو ؟"
دفعہ تو جی میں آئی کہ میر بے دماغ کی طرح کہہ دیں :

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو

لیکن یہ لکھنؤ کا مشاعرہ نہیں، ملازمت کا انٹرویو تھا ۔
"جے پور ـــــ اجمیر کے پاس ہے "۔ ہم نے معذرتی لہجے میں اس شہر کا نام لیا جو کبھی عالم میں انتخاب تھا۔
" OH ! YES ! THE PINK CITY کیا بات ہے ! برٹش ریزیڈنٹ نے ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی تھی ۔
ا ہم دونوں کا ایک ساتھ کورٹ مارشل ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہے تمہارا جے پور ۔ سارے شہر میں [illegible] کے دونوں طرف ہر عمارت
ل زعفرانی رنگ ۔ اونچے طرے والے راجپوتی صافے اور ان سے بھی اونچی مونچھیں اور ہر دو کو سونڈ سے سلام کرتے ہوئے
آسٹریلین گھوڑوں پر پولو ۔ کچرے اور غلاظت کی گڈز ٹرین جسے مقامی بھینسے کھینچ رہے تھے ۔ ایسی ریل میں نے امرتسر میں بھی
فی جو ایک محلہ کے رقیق غلاظت کی دوسرے محلوں میں گشتی نمائش کرتی پھرتی تھی۔ بھرے بازار میں بلکتے بچوں کے منہ میں کھڑے
چھاتی دیتی ہوئی عورتیں ۔ بعض لاڈلے تو اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ خود کھڑے ہو کر کھڑے ہوئے منبع سے جوئے شیر نکال
تھے ۔ درشنی جھروکوں سے آنکھ مارتی ہوئی نارنج گریلز ۔ دھنک کے رنگ کے ابرک سے جھلملاتے ہوئے لہریئے شانوں سے
ئے ـــــ ایک ایک انچ جوانی، راجستھانی روپ سنگھار اور سفلس سے بھرپور ۔ شلوکے میں خس کی ٹٹی کا سینٹ بالوں
ا COOKING OI (چونک کر) عورت کبھی میری کمزوری نہیں رہی اور وہ تو میں بھول ہی گیا ۔ مادر زاد معصوم اور اتنی ہی مدت
ہنہ فقیروں کی قطار جن کے پیر وغیرہ کو عورتیں دھو دھو کر پیتی ہے ۔ کیا کہتے ہیں ان کو ؟"
" دگمبر جین سادھو "

FOLIES - BERGERE کی لڑکیاں اور یہ سادھو کپڑوں کا شمار مکروہاتِ دنیوی میں کرتے ہیں ۔ اور ہاں ! مجھے سب
ے ۔ تمہارے ہوم ٹاؤن میں ہر چوراہے پہ مرحوم بزرگوں کے نام پہ چھوڑے ہوئے مقدس سانڈ اپنے فرائضِ منصبی انجام
پھرتے ہیں تمہارے سب بزرگ زندہ ہیں یا ـــــ ؟ پرسٹلی نے کہیں لکھا ہے کہ جے پور سے زیادہ صاف سڑکیں میں نے
آنکھوں نہیں دیکھیں ۔ وجہ یہ کہ گوبر اور لید زمین پہ گرنے سے پہلے ہی اچھوت عورتیں کیچ لیتی ہیں ۔"
اس نے زعفرانی بادبانوں کی ساری ہوا نکال دی ۔ غریب شہر سر جھکائے چھوڑے ہوئے دیس کو پردیسی کی آنکھوں سے دیکھتا
شکل نظر آئی تصویر نظر آئی ۔
" تم راجپوت ہو ؟ "

آدھا۔ نانا تھے۔ نومسلم راٹھور۔ طوطے کی چونچ جیسی ناک والے راٹھور۔"

"بالکل لال ؟"

"نہیں۔خمدار۔"

مردانہ کھیلوں سے ہماری دلچسپی

"آخر تم یہ پیشہ کیوں اختیار کرنا چاہتے ہو ؟ کوئی معقول وجہ ؟"

ہم کافی نروس ہو چکے تھے۔ دو تین دفعہ زور لگانے کے بعد جو آواز اچانک ہمارے مُنہ سے نکلی وہ اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں سُنی تھی۔

شاید اُسے بھی ترس آگیا۔ اب کے آسان سوال کیا۔ "جوانی، میرا مطلب ہے طالب علمی کے زمانے میں کن کھیلوں سے دلچسپی رہی؟"

"کیرم اور لوڈو"

"میرا مطلب مردانہ کھیلوں سے تھا۔"

ہمارا یہ خانہ بالکل خالی تھا۔ پانچویں جماعت میں البتہ سالانہ اسپورٹس کی دوڑ میں ہمارا اکیسواں نمبر آیا تھا۔ دوڑ میں اتنے ہی لڑکے شریک ہوئے تھے۔ کچھ دن فٹبال سے بھی سر مارا۔ آخری لمحہ اتصال تک یہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ اس دفعہ فٹبال پہ اپنا دایاں پاؤں ماریں یا بایاں زیادہ مناسب رہے گا۔ دُودھ کے دانت ٹوٹنے سے پہلے ہی ہم خاصے دبیز شیشے کی عینک لگانے لگے تھے۔ (جو حضرات ضعفِ بصارت سے محروم ہیں، ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب کبھی ہم عینک اُتار کر آئینہ دیکھتے ہیں تو بخدا اپنے کان نظر نہیں آتے) کئی دفعہ عینک توڑنے کے بعد اب ہم اُسے اُتار کر بے خطر کھیلنے لگے تھے۔ کھیلتے کیا تھے، ہر ایک سے مینڈھے کی طرح ٹکریں لیتے پھرتے تھے۔ مخالف ٹیم میں ہمیشہ بہت "پاپولر" اس لئے کہ اپنی ہی ٹیم سے گیند چھینتے اور انھیں کو فاؤل مارتے پھرتے تھے۔ کھیل کے شروع میں "ٹاس کیا جاتا" جو کپتان ٹاس ہار جاتا وہ ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کرنے کا پابند ہوتا۔ جب تک مخالف کھلاڑی تاک کر ہمارے پاؤں پہ زور سے فٹبال نہ مارے، وہ ہمارے کِک سے محروم ہی رہتی تھی۔ چونکہ سر ہمارے دیدۂ نیم بینا سے قریب ترین عضو تھا، اس لئے ہم نے سر سے فٹبال روکنے اور گول کرنے کی مشق و مہارت پیدا کی۔ ایک دن ہم نے تین فٹ اچھل کر "ہیڈ" کیا تو جس گول شئے سے ہم نے آنکھ بند کر کے اپنی پوری قوت سے ٹکر لی وہ دیو قامت جسونت سنگھ چوہان کا منڈا ہوا سر نکلا۔ وہ شام کو ٹھنڈائی (بھنگ) پی کر فٹبال کھیلتا تھا۔ ہماری ناک کا بانسہ اور دل ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔

ہم نے عینک اُتار کر مردانہ کھیل سے اپنی دیرینہ وابستگی کا ثبوت اینڈرسن کو دکھایا۔ ناک کی خمیدہ ہڈی دیکھ کر بہت ہنسا۔ کہنے لگا تمہارا ایک کان بھی ٹیڑھا لگا ہوا ہے۔

"اور تم RIMLESS GLASSES کیوں لگاتے ہو ؟ تمہاری صورت سر اسٹیفرڈ کرپس سے ملتی ہے۔"

"ذرّہ نوازی کا شکریہ!" ہم نے خوش ہو کر کہا۔

مجھے اُس باسٹرڈ کی صورت سے نفرت ہے۔"

تو پھر اب کیا جگہ کی قید

ہم ابھی اس چوٹ کو ٹھیک سے سہلا بھی نہ پائے تھے کہ استفسار فرمایا "کنوارے ہو؟"

"نو سر!"

"کتنی بیویاں ہیں ؟" اس نے سوال کر کے دونوں ہونٹ بھینچ لئے۔

"ایک"
مجھے تو چار پر بھی اعتراض نہیں۔ لیکن چار بیویوں میں قباحت یہ ہے کہ چار دفعہ طلاق دینی پڑتی ہے۔"
بھلاوا دے کر پھر وہی سوال دہرایا "سفارش اپنی جگہ، لیکن بینک میں کیوں ملازمت کرنا چاہتے ہو؟ بینکر کے کیا فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں؟"

یہ سوال سنتے ہی ہمارے ہاتھوں کے روایتی طوطے دوبارہ اُڑ گئے اور ایسے اُڑے کہ پھر نہ لوٹے۔ ہم پھر "جھومنے" لگے۔ معقول وجہ کے بجائے لطیفے یاد آنے لگے لیکن یہ موقع اس کے دامن کو ظریفانہ کھینچنے کا نہیں تھا۔ ہم نے تادم تقریر و تقرر کسی بینک کو اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اتنا معلوم تھا کہ اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ اس کے پاس اتنی جائداد اور سرمایہ ہے کہ قرض کی قطعاً ضرورت نہیں تو بینک اسے قرض دینے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ مارک ٹوین کا یہ مقولہ بھی کہیں پڑھا تھا کہ بینکر اچھے وقتوں کا بہترین ساتھی ہوتا ہے۔ موسم اچھا ہو تو زبردستی اپنی چھتری ہاتھ میں تھما دیتا ہے لیکن جیسے ہی چھینٹے پڑنے لگیں تو کہتا ہے لاؤ میری چھتری، ہمیں تو بس اتنا بتایا گیا تھا کہ بینکر دھڑلے سے سود لیتے ہیں۔ سود دیتے ہیں اور سود کا حساب رکھتے ہیں اور یہ تینوں فعل از روئے شرع حرام ہیں۔

رہی "بزنس مین" سے واقفیت، سو ہمارا حلقہ شناسائی صرف ایک کاٹیاں مارواڑی سیٹھ پر مشتمل تھا جو روپیہ اپنی تجوری میں رکھتا تھا اور زیورات بینک کے لاکر میں اور جہاں بینکنگ کے بارے میں کتابی معلومات کا تعلق تھا تو وہ اس ادبی دریافت تک محدود تھیں کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے جب (WASTELAND) لکھی تو وہ لائیڈز بینک میں کلرک تھا اور اس پیشے سے اس کا پنڈ چھڑانے کے لئے ازرا پاؤنڈ نے چندے کی ایک عالم گیر مہم چلائی تھی جس میں کل تیس پاؤنڈ جمع ہوئے۔ اسی طرح مشہور مزاح نگار جارد سلاؤ ہسلک بھی ایک بینک میں ملازم ہو گیا تھا۔ وہاں جو کچھ اس نے دیکھا، اس سے اتنا اثر لیا کہ بھرے بھتولے گھر پر جھاڑو پھیر کر ہمیشہ ہمیش کے لئے خانہ بدوش ہو گیا اور اگر او ہنری بینک میں غبن نہ کرتا تو دنیا ایک عظیم افسانہ نگار سے محروم ہو جاتی۔ اس نے بینک کے خشک اعداد و شمار میں افسانہ کا رنگ بھر دیا۔ چنانچہ بینک دوالے میں چلا گیا اور اسے خیانت مجرمانہ کے الزام میں پانچ سال کی سزا ہوئی۔ جیل ہی میں اس نے اپنا پہلا افسانہ لکھا اور نام تبدیل کر کے ولیم سڈنی پورٹر سے او۔ ہنری بن گیا۔ او۔ ہنری دراصل اس جیل کے سنتری کا نام تھا اس زمانے میں ہمیں اپنی معلومات عامہ پر بڑا گھمنڈ تھا اور دن میں بھی وہ سرمستی و نخوت طاری رہتی تھی جو خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کو صرف رات گئے میسر آتی تھی:

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

لیکن اس کڈھب سوال سے سارا نشۂ علم ہرن ہو گیا۔

NEGOTIABLE INSTRUMENTS ACT کا نام ضرور سنا تھا۔ شروع میں تو ہم سمجھتے تھے کہ ARMS ACT کی طرح سود خوروں کے لئے انتقال آلات قتل کا کوئی قانون ہوگا بعد میں بھی معلوم ہوا تو بس اتنا کہ کسی لیڈر کی روح عالم بالا کو پرواز کر جائے یا سکے کی قیمت زمین پر آ رہے تو بینک اس قانون کے تحت بند کئے جاتے ہیں لیکن جب تک کوئی لیڈر قوم کو داغ مفارقت نہ دے تو اس قانون کا کیا مصرف ہے، بینک اس طویل وقفۂ انتظار میں وقت گزاری کے لئے کیا کرتے ہیں —— اس کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔
(باقی آئندہ)

اسماعیل ظریف

غزل

پکڑ کے اور بھی شعرا کو آپ لاؤ میاں
صبح کے تین بجے تک انھیں تپاؤ میاں
پلا کے چائے دلوں کو نہ یوں جلاؤ میاں
کبھی کبھو تو کوئی اور شے پلاؤ میاں
جو سو رہے ہیں پڑوسی انھیں جگاؤ میاں
مشاعرے میں پکڑ کر انھیں بھی لاؤ میاں
کسی کو باغ ہرا آج کل دکھاؤ میاں
تقاضہ وقت کا ہے گل نئے کھلاؤ میاں
مہنگے ہوگئے سگرٹ تو کوئی بات نہیں
ہے مشورہ مرا اب بیڑیاں جلاؤ میاں
پرانا مال پٹاروں میں بند کروا دو
نئے نمونوں کو شوکیس میں سجاؤ میاں
بدل کے چہرے جو دنیا کو دے رہے تھے فریب
فریب کاروں کو اب آئینہ دکھاؤ میاں
اب اسکوٹر پہ بھی پیادہ چھوٹتے ہی نہیں
ہے ذاتی کار تو بازو انھیں بٹھاؤ میاں
شریک زندگی جب ان کو تم سمجھتے ہو
مرو گے جب بھی انھیں ساتھ لیکے جاؤ میاں
فلم میں دیکھ کے دل جس کو آپ دے بیٹھے
اب اُس کے نوٹو کو بس لیکے چاٹ جاؤ میاں
سنا ہے اب وہاں کتوں کا سخت پہرہ ہے
اب ان کے گیٹ پہ تم بھول کر نہ جاؤ میاں
تحت میں سنتے ہوئے بور ہو چکے ہم لوگ
ظریف ذاتی غزل گا کے خود سناؤ میاں

ثریا امچور۔ بھوپال

غزل

جو لڑکیاں ہیں اصل میں لنگور کی طرح
میک اپ میں لگ رہی ہیں وہی حور کی طرح

روٹی پکا رہی ہوں محبت کی رات دن
دل ہو گیا ہے عشق میں تندور کی طرح

سکھیو! چلو کہ پیٹ بھریں سوشل ازم سے
گیہوں تو گھر نہیں آتے ہیں انگور کی طرح

ٹیڈی لباس کا یہ کرشمہ تو دیکھئے
ہر نوجوان لگتا ہے لنگور کی طرح

ممکن نہیں حکیم بھی اب کر سکیں علاج
فیشن نے جڑ پکڑ لی ہے ناسور کی طرح

گانجا، چرس، افیم نے کیسا بنا دیا
چہرہ جو تھا کسی کا رخ حور کی طرح

ساری مٹھاس چھین لی تلخی نے وقت کی
کھٹا بنا دیا مجھے امچور کی طرح

ہم نے یہ کیا کہہ دیا؟

ہم نے ہمیشہ زندگی کے رُخِ روشن کو دیکھا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے اور دُنیا ہنسنے ہنسانے کی دلچسپیوں سے بھری پڑی ہے اپنا مزاج اور اپنا موڈ صحیح رہیں تو ہر طرف حُسن ہے ہر شئے دلکش دکھائی دیتی ہے۔ زندگی دو روزہ ہے تو پھر کیوں نہ اس کو ہنس کر گذاریں' اوروں پر ہنسیں تو شاید وہ زہر خند ہے طنز سمجھا جائے' استہزاء کا گمان ہو یا پھر کا شُبہ ہو اس لئے ہم تو اس کے قائل ہیں کہ خود ہی کو ہنسی کا نشانہ بنا کر خوش ہو لیں اور دوسروں کو بھی خوش ہونے کا موقع دیں۔

اسی اصول کے تحت ہم دوسروں کی تمام باتیں نہ صرف برداشت کر لیتے ہیں بلکہ ان کو موقع بے موقع چڑھاتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں اور خوبیوں کے حامل ہیں' ان کی شخصیت جاذب و پُرکشش ہے۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ کن لوگوں سے کس موضوع پر گفتگو کی جائے' کن کو بنایا جائے کہ ان کے کون کون مدّاح ہیں تاکہ ان کی انا کو بڑھاوا ملے۔ کس کی کون سی خوبیاں گنائی جائیں۔ پارٹی میں جب کچھ لوگ آپس میں خوش گپیاں کر رہے ہوں تو ہم اس میں دخل در معقولات کی نیت سے کسی زندہ دل سے مخاطب ہو کر ضرور کہیں گے "کہو یار کیسے ہو؟"

"لگتا ہے زندگی اور قدرت دونوں بھی تم پر بے حد مہربان ہیں۔"

"تمہاری شریکِ حیات کیسی ہیں؟ تم دونوں تو بس خدا کی قدرت کا بہترین اور قابلِ رشک نمونہ ہیں؟"

ہم یہ سب بغیر اُن کا چہرہ پڑھے کہے جاتے ہیں' اس یقین کہ وہ بے حد خوش ہوں گے لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ان کے چہرہ پر سخت اضمحلال اور کرب کی کیفیات طاری ہوتی جا رہی ہیں اور وہ ٹھیٹ پڑنے ہی والے ہیں۔ ہمیں یہ کیا معلوم کہ اس درمیان ان کی اور ان کی بیگم کی علیحدگی ہو چکی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ان کا ذکر بھی گوارا نہیں کرتے۔

اسی طرح ہم متعارف ہونے پر ایک صاحب سے بڑے ہی پُرخلوص انداز میں کہتے ہیں۔ بھئی واہ آپ سر کے بال تو بڑے خوبصورت ہیں کتنے کالے اور گھنے ہیں۔ لگتا ہے کہ آپ نے لندن کی کسی بڑھیا دکان سے بالوں کا وِگ خرید کر لگا لیا ہے۔ اس پر وہ بڑے چراغ پا نظر آتے ہیں اور ہم حیران و پریشان۔ اصل ماجرا ہم کو بتایا جاتا ہے کہ وہ فی الواقعی وگ پہنے ہیں مگر یہ چاہتے ہیں کہ لوگ اس کو اُن کے اصلی بال ہی سمجھیں۔

ہم کھلے دل اور پُرخلوص جذبات کے ساتھ ہر ایک کی تعریف و توصیف پر ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں اور کسی بھی جا و بے جا تعریف سے نہیں چوکتے لیکن ہماری ایسی عادت نے ہمیں شرمسار بھی کیا ہے۔ میزبان خاتون سے کھانے کے دوران

ہم عادتاً یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے ہر چیز بہت ہی نفاست اور اہتمام سے بنائی ہے اور پھر کسی ایک چیز کی بطور خاص تعریف کی نیت سے کہیں گے " مرغ تو آپ نے فی الواقعی بڑا ہی لذیذ اور ذائقہ دار بنایا ہے مزہ میں تو بالکل فلاں ہوٹل کے مرغ جیسا ہے ۔ اسپر میزبان خاتون جز بجز ہوتی ہیں اور ہم حیران کہ اتنی ساری تعریف کے باوجود وہ خوش نہیں ۔ اب ہمیں یہ کیسے معلوم ہوتا کہ وہ مرغ اسی ہوٹل کا ہے کہ جس کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں اور میزبان سب پر یہ رعب جمانا چاہتی تھیں کہ انھوں نے خود ہی بنایا ہے ہماری باتوں سے لوگوں کو لگتا ہے کہ ہم نے ان کا راز طشت از بام کر دیا ۔

ہماری تو ہمیشہ نیت یہی رہی کہ لوگوں کے متعلق کھینچ تان کر اچھی اچھی باتیں کہی جائیں تاکہ وہ خوش ہو جائیں اور پارٹی کا موڈ بنا رہے ، فضاء خوشگوار رہے اس کے لئے ہم بہت سوچ سوچ کر باتیں بناتے ہیں اور جھوٹ سچ کہہ کر خوش ہونا اور خوش کرنا چاہتے ہیں ۔ نئی نئی ملاقات پر ہم کو خاتون نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی ایک لڑکی کی ماں بنی ہیں ۔ ہم نے اپنی خوش طبعی کے جوش میں مبارکباد دیتے ہوئے پوچھا " صاحبزادی کے خوش نصیب والد محترم کون ہیں ؟ اس سوال کے پس پردہ ہماری خواہش محض یہی تھی کہ ان کے شوہر نامدار سے بھی تعارف کا شرف حاصل ہو ۔ لیکن اس خاتون کے قہر آلود چہرہ کو دیکھ کر ہمارے اوسان ایسے خطا ہوئے کہ ہم نے ایک بے ہودہ سا سوال کر ڈالا " ارے آپ اتنے ناراض کیوں ہیں ۔ ہم معافی کے خواستگار ہیں کہ اگر آپ کی صاحبزادی کے والد بزرگوار کا آپ کو بھی پتہ نہیں " سمجھئے عذر گناہ بدتر از گناہ "

ایک اور محفل میں ایک نوجوان بڑی ڈینگیں مار رہے تھے اور لوگوں کی پوری توجہ حاصل کر لینے کے بعد انھوں نے بڑے فخر و افتخار کے ساتھ کہا " آپ لوگ جانتے ہیں میرے والد کون ہیں ۔ ؟ " ہم بہت دیر سے ان کی تعلی برداشت کر رہے تھے ۔ ہم سے رہا نہ گیا ۔ اور یکایک ہمارے منہ سے نکلا " جی ہم تو نہیں جانتے پر آپ خود واقف ہیں تو ہمیں بتا دیجئے " لیجئے بات کہاں سے کہاں نکل گئی اور ہم کس قدر معتوب ہوئے ہیں وہ بتانے سے ہم قاصر ہیں ۔

ایک مرتبہ تو ایسا حادثہ ہوا کہ انتہائی غمگین اور ماتمی مجلس میں بھی اسی طرح کا ایک آدھ جملہ ہمارے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ جس پر ہمیں مدت العمر پچھتانا پڑا شہر کی سب سے اونچی سوسائٹی کے بے انتہا رنگین جوڑے کی بیگم کا اچانک انتقال ہو گیا ۔ اور چونکہ اس آزاد معاشرہ میں سب کچھ برداشت ہی نہیں بلکہ جائز گردانا جاتا ہے ۔ یہ بات شاید سب کو معلوم تھی کہ بیگم کے ایک بہت ہی خاص دوست تھے اور پُرسہ کے وقت سب سے زیادہ غم گساری اور اندوہ ظاہر کر رہے تھے ۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور اپنا بے پناہ غم ظاہر کر رہے تھے ۔ ہم سے خاموش نہ رہا گیا ہم نے یوں ہی کہہ دیا ۔" اجی جناب مرحوم کا اتنا غم نہ کیجئے ہمارے دوست بہت جلد پھر سے شادی کرنے والے ہیں آپ کو نعم البدل مل جائے گا "

دھکے مار کر ہم کو اس محفل سے نکالا نہ گیا مگر سب کی نظروں میں جو خواری ہم کو نظر آ رہی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ تھی ۔

ہمارے دوست زماں تشریف لائے اور اپنی دادی کی رحلت کی برسی کی فاتحہ میں شرکت کی دعوت دی ۔ ہم نے تاریخ پوچھی تو پتہ چلا کہ ان دنوں ہم دلّی میں ہوں گے اس لئے معذرت خواہی کی اور یوں ہی خلوص جتانے کی خاطر منہ سے نکلا ۔ " ہم یقیناً شرکت کرتے لیکن بمبئی سے باہر ہوں گے اس لئے مجبوری ہے ۔ انشاء اللہ پھر کبھی ضرور حاضر ہوں گے "

یہ جملہ ختم کیا نہ تھا کہ ان کی صورت دیکھی جس پر کچھ عجیب کیفیت طاری تھی جیسے کہ یہ ظاہر تھا کہ ایک فاتحہ میں تو شریک نہیں ہو رہے ہو آئندہ کسی اور کی موت کا انتظار ہے کہ اس میں آپ ضرور حاضر ہوں گے ۔

حاضر دماغی نے آناً فاناً یہ سمجھایا " ضرور ضرور حاضر ہوں گے ۔ اور یقیناً خوشی کی محفل میں "

یہ کہنے کے بعد سر سے بڑا بوجھ ہلکا ہوا ۔۔۔۔

ہمیں ہماری بے لگام زبان ہمیشہ الجھنوں میں مبتلا کرتی ہی رہتی ہے اور جب کبھی اپنی کہی ہوئی بات نباہنے کو اور نہ کھلتے

ہیں تو مزید پیچیدگی کا سامنا ہوتا ہے ۔ معمولی سی بات ہے گانے کی محفل جمی تھی کچھ اجنبی لوگ پاس میں تھے جو محترمہ گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں وہ برداشت سے باہر ہوئی جا رہی تھیں بوریت دور کرنے کی غرض سے ہم نے ساتھ بیٹھے ہوئے صاحب سے کہا

" کیا بے سر اور بے ہنگم گا رہی ہیں یہ خاتون ۔۔۔ آخر ہیں کون ؟"

اُن صاحب نے بڑی بے زارگی سے کہا " جی وہ تو مسز رائے ہیں ، میری بیوی " ۔۔۔ لیجئے کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلی بات لوٹائے نہیں جا سکتے ، ہم نے جو کہہ دیا تو اس کا مداوا کیسے اور کیا ہو ۔ پھر بھی اپنی دانست میں حاضر دماغی کا سہارا لیتے ہوئے ہم نے پینترا بدلا ۔

" اوہ یہ محترمہ تو اچھا ہی گا رہی ہیں لیکن نہ معلوم کس کا کلام ہے کہ محض بکواس ہے اور اچھے سے اچھے فنکار مغنی بھی اسکو سنبھال نہیں سکتے " آں جناب نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا " جی وہ میری ہی غزل گا رہی ہیں "

ہمارے لئے اس کے سوا کیا چارہ کار ہو سکتا تھا کہ اس محفل سے دفع ہو جائیں اور اپنا نام اور شخصیت اُن شاعر صاحب اور مغنیّہ کے شوہر نامدار سے چھپا رکھیں ۔

ایسے موقعوں پر ہماری سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس کے اندر کسی سرنگ کے راستے کہیں دور نکل جائیں ۔

پبلک میٹنگ میں ایک مہاشئے دھواں دھار تقریر کر رہے تھے لیکن وہ نہ کسی موضوع پر تھے اور نہ کوئی سُلجھی سمجھی بات کر رہے تھے محض گلا پھاڑ پھاڑ کر حاضرین و سامعین پر رُعب گانٹھنا چاہتے تھے ، ہم کچھ دیر سے پہونچے اور ایک خاتون کے برابر خالی کرسی پر براجمان ہو گئے ، کچھ دیر تو برداشت کیا لیکن مقرر صاحب کسی طرح بھی سننے کے لائق بات کہہ نہ پا رہے تھے ، بوریت دُور کرنے کو ساتھ میں بیٹھی خاتون سے ہم نے یوں ہی کہہ دیا " یہ کون صاحب ہیں کہ جو نہ بول سکتے ہیں اور نہ انھیں کوئی بات کہنے کا سلیقہ ہے " محترمہ نے بڑی تنک مزاجی سے کہا " آپ جانتے نہیں تو خاموش کیوں نہیں رہتے ، یہ تو میرے پتی ست نارائن جی ہیں "

اب ہم انھیں کیا بتائیں کہ ہم کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے سوائے اس کے کہ اپنی عافیت کی خاطر انھیں یہ نہ جانتے دیں کہ ہم کون ہیں ۔ ایک اور حادثہ کی روئداد سنئے کہ شخصی عناد تھا نہ کوئی پرخاش مگر ہمیں راجن کبھی پسند نہ آئے کچھ بغض للّٰہی بھی نہیں مگر ان کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں ایک مجلس میں وہ کہیں دُور سے نظر آئے تو قوت برداشت غائب ہو گئی یوں ہی برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے صاحب سے عالم بیزارگی میں کہہ ڈالا " اوہ ! یہ کدھر سے ٹپک پڑے ان کو تو ہم دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتے کیسی مکروہ صورت ہے ان کی " سننے والے صاحب نے بڑی متانت سے کہا " کیوں ناراض ہیں آپ ان سے ؟ یہ تو میرے بھائی ہیں " ان کا یہ کہنا کہ وہ ان کے بھائی ہیں ہم کو کھلا دیا ۔ سراسیمگی کی حالت میں بے اختیار زبان سے نکلا " اوہ ہم بھی کس قدر بے وقوف ہیں ہم نے آپ دونوں کی مشابہت کو تو دیکھا ہی نہیں ۔

اس بے ساختہ ریمارک کے بعد ہم خود ایسے سوکھ گئے کہ کاٹو جسم میں سے خون نہ نکلے ۔

ویسے ہم بات پر سے بات نکالنے اور سلسلۂ گفتگو جاری رکھنے میں اپنے آپ کو ماہر سمجھتے ہیں اور بالعموم ہر محفل میں طبعی ظرافت بذلہ سنجی اور خوشگوار مکالموں کی وجہ سے کچھ حد تک مقبول بھی ہیں لیکن اپنی حد سے بڑھی ہوئی جولانیٔ طبع میں کبھی کبھی بات الٹ پلٹ بھی ہو جاتی ہے چنانچہ ایک عشائیہ میں جو خاتون تشریف فرما تھیں اُن سے ہم نے سیدھا سادھا سوال کیا " آپ کے کتنے بچے ہیں " انھوں نے بتایا کہ ان کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے اب بات چیت چلانے کے لئے ہم نے بلا سوچے سمجھے دوسرا سوال کر دیا ۔ " کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے " اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا تھا اور ہماری بوالعجبی کہاں تک ہمیں محفل میں رہنے دیتی اس کا اندازہ آپ ہی فرما سکتے ہیں ۔ ہم نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ ہر محفل میں دوسروں کے سوال کے جواب میں صرف ہاں یا نہیں کہیں گے اور خود سے کسی بات کو چھیڑیں گے نہ کوئی سوال کریں گے ۔

جنس بدلی کا ہے دنیا میں چلن باپ رے باپ
کیا عجب ہو گھڑ دبی شیخ بڈھن باپ رے باپ

بن گئے میر شکاری وہ خدا خیر کرے
جو نہیں جانتے کیا چیز ہے گن باپ رے باپ

چار آنے کے گڑ بیسے کا کرشمہ دیکھو
طشتری کو بھی وہ کہتے ہیں لگن باپ رے باپ

رات دن کاٹتے رہتے ہیں وہ جنتا کا گلا
اور پھر گاتے ہیں جنتا کا بھجن باپ رے باپ

دام کیوں کر نہ بڑھیں کیوں نہ ہوں جھینگے بکرے
دال سب چھوڑ کے کھاتے ہیں مٹن باپ رے باپ

مرنے والا بھی سکھی مارنے والا بھی سکھی
یہ ہے اس دور کے نیتاؤں کا فن باپ رے باپ

وقت کہتا ہے گدھوں کی بھی برائی نہ کرو
کہیں کہنا نہ پڑے "مصلحتاً" باپ رے باپ

سنتے ہیں شیخ نے کل پی کے جو کی تھی گڑ بڑ
نام پر اس کے بھی نکلا ہے سمن باپ رے باپ

پہن کر پھولوں کا بش شرٹ جو چلے ہیں پاگل
نظر آنے لگے ہیرو بھی چمن باپ رے باپ

پاگل عادل آبادی

غزل

صابر بہاری رانچی

اینگلو انڈین غزل

کوئی اسمارٹ کہتا ہے کوئی کہتا ہے آئیڈل ہے
زبانِ یار سے خود کو سمجھنا سخت مشکل ہے

نہ جانے کس طرح ملکِ عدم کا طے سفر ہوگا
نہ موٹر ہے نہ ٹمٹم ہے نہ رکشہ ہے نہ سائکل ہے

دوائیں لاکھ ہیں ڈسپنسری میں آپ کی مانا
مریضِ عشق کی خاطر کوئی مکسچر ہے یا پل ہے

ترس حالِ پریشاں پر ذرا بھی کیوں نہیں کھاتے
کہ دل ہے آپ کے سینے میں یا جانِ جہاں سل ہے

مہذب کس طرح بنتے ہیں دنیا میں ریا والے
کہیں ٹپے سے زیادہ آج ان کا غتغلی بل ہے

سجائے ہیں وہ اس انداز سے زلفِ پریشاں کو
گماں ہوتا ہے جیسے سر پہ ان کے مونٹ یا ہل ہے

چلے آتے ہیں نمبروار بچے اک تسلسل سے
خدایا کیوں نہیں دیتا وہاں بچہ جہاں نل ہے

گلی ہے آپ کی وہ، یا کوئی قصاب خانہ ہے
قدم کوئی کہاں رکھے جدھر دیکھو ادھر دل ہے

چلے جاؤ گے تم بھی اس جہاں سے ایک دن صابر
سکندر ہے نہ پورس ہے نہ ہٹلر ہے نہ چرچل ہے

سید نصرت آرکیٹکٹ

گر یونہی روتا رہا...

رونا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جسے وہ پیدا ہونے سے لے کر ملک الموت سے ہاتھ ملانے تک بے تحاشہ استعمال کرتا ہے رونے کی بنیادی وجہ ایک بچے کے پاس بھوک، نوجوان کے پاس شادی شدہ زندگی اور بوڑھے کے پاس یادِ ایامِ جوانی ہوتی ہے بلکہ بچوں کے رونے دھونے کے اسٹائیل سے ہم اس بات کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس بچہ کا مستقبل کیا ہوگا چنانچہ کچھ بچے اوزان میں روتے ہیں یعنی سُر تال میں آواز کے اُتار چڑھاؤ اور مُرکیوں سے اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ وہ بڑے ہوکر شاعر بننے والے ہیں اسی طرح کچھ بچے دھیمے سُروں میں اور ہلکے ہلکے احتجاجی طریقوں سے رو رو کر اپنی ماؤں کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو بڑے ہوکر ناولسٹ یا افسانہ نگار کے مقام پر جا پہنچتے ہیں۔ کچھ بچوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کرتے ہیں اور مارے غصّے کے کئی چیزیں توڑ پھوڑ دیتے ہیں ایسے بچوں کو بڑے ہوکر نقّاد بن جانے میں کافی سہولت ہوتی ہے۔ کچھ بچّے ایسے بھی ہوتے ہیں جو بالکل ہی نہیں روتے (یعنی ان کے گلوں میں سوز و گداز نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں ہوتی اور وہ ہر بات کو بڑی خاموشی سے قبول کر لیتے ہیں جن کو اس بات کی بالکل پروا نہیں ہوتی کہ انھیں وقت پر دودھ دیا گیا ہے یا نہیں اور جن کی ہر حرکت اُن کے موڈ کے تابع ہوتی ہے تو ایسے بچے بڑے ہوکر فلسفی بن جاتے ہیں کچھ بچوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو بے تحاشہ روتے روتے یکدم ہنس پڑتے ہیں اور اپنے اس طرزِ عمل سے دوسروں کو بھی ہنسا دیتے ہیں ایسے بچّے بڑے ہوکر یا تو مزاح نگار کہلاتے ہیں یا پھر پاگل بن جاتے ہیں۔ اکثر بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسرے روتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر خود بھی رونے کی اداکاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نتیجتاً ان کے گلے سے ہنسی اور رونے کی آمیزش سے ایک ایسی درمیانی آواز پھوٹ پڑتی ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بڑے ہوکر متشاعر کا بڑا ہی موثر رول ادا کرنے والے ہیں۔ جدید شاعروں کا بچپن اگر کسی نے دیکھا ہے تو وہ بخوبی جانتا ہے کہ جدید شاعری کی طرف راغب ہونے والا بچہ کبھی سُر تال اور ترنم میں نہیں روتا بلکہ گھگھیا گھگھیا کر رونا بلکہ بلک بلک کر ٹسوے بہانا اس کا وطیرہ ہوتا ہے۔

عشق و عاشقی کے نصاب میں رونا دھونا ایک کمپلسری سبجیکٹ (لازمی مضمون) کی حیثیت رکھتا ہے یعنی ہر عاشق کو عشق کے دوسرے اور لوازمات (جیسے بٹوے کا لبالب ہونا، بال بے تحاشہ بڑھالینا، لباس ڈھیلا ڈھالا ہونا اور ہمیشہ چہرے پر مسکینی لئے پھرنا) کے ساتھ ساتھ رونے دھونے میں بھی مہارت ضروری ہوتی ہے تاکہ وقتاً فوقتاً وہ آنسوؤں کے سیلاب میں اپنی محبوبۂ دلنواز کو کسی گوشۂ تنہائی میں بہالے جائیں۔ عاشق برادری کی طرح شاعر حضرات اور خواتین (شادی شدہ اور کنواری) دونوں طبقوں کے لئے رونے دھونے کے طریقوں کو جاننا اور سیکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کسی مراسلہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق نہ ہونا۔

مرد "بچوں" کی طرح خواتین "بچیوں" کا مستقبل بھی اُن کے رونے دھونے کے طور طریقوں سے بآسانی پہچانا جاسکتا ہے

چنانچہ جو لڑکی گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی ہے وہ بڑی ہو کر ایک کامیاب "لڑاکا پڑوسن" بن جاتی ہے اور جو بچیاں رونے کے دوران آنسو بھی بہایا کرتی ہیں وہ بڑی ہو کر ایک ماہر گرہست خاتون کا روپ دھار لیتی ہیں جو شوہر کی جھڑکیوں اور ہمسایوں کی بہتان طرازیوں پر رو رو کر آنسوؤں کو تکیوں میں جذب کرنے کا گر بخوبی جانتی ہیں۔ اسی طرح جو لڑکیاں پوتڑوں کو گیلا کرنے کے بعد بے اختیار رو پڑتی ہیں وہ بڑی ہو کر سماج کی اصلاح و سدھار کو اپنا شعار بنا لیتی ہیں۔ نیم عریاں افسانے لکھنے والی خواتین کے بچپن کے تعلق گمان غالب ہے کہ وہ بجائے رونے کے صرف سسکیوں پر ہی اکتفا کرتی ہونگیں (روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ ....) پاؤں پٹک پٹک کر رونے والی لڑکیاں بڑی ہو کر سیاست کے میدان میں کود پڑتی ہیں اور اپنی ہٹ دھرمی کے باعث بہت جلد عوام میں مقبول ہو کر اُن کے ذہنوں سے اچانک محو بھی ہو جاتی ہیں۔ شاعرات کا بچپن تو ہم نے اب تک نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح روتی ہیں کیونکہ زنانہ شاعری کی بہتات ہمارے عالم وجود میں آنے کے بعد کی پیداوار ہے (اس میں سراسر ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہے) البتہ گمان غالب ہے کہ خاتون شعرا انتہائی رومانٹک موڈ اور ترنم سے روتی ہونگیں۔ رونے دھونے سے پہلے ایک اسٹیج اور بھی ہوتا ہے جس میں آہ و زاریاں کی جاتی ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں کے ساتھ وقفہ وقفہ سے آنکھیں بھی گیلی ہونے لگتی ہیں۔ یہ اسٹیج درحقیقت رونے دھونے کا ٹرائیل شو ہوتا ہے اور رونے دھونے میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اس ٹرائیل شو میں سو فیصد کامیابی حاصل کرنا از حد ضروری ہے آہ و زاری کا درجہ شاعر حضرات کے لئے کافی اہمیت رکھتا ہے اور وہ ہمیشہ عشق میں مبتلا ہونے کے بعد سنگل یا مکس ڈبل (MIX DOUBLE) آہ و زاریاں کرنا ضروری گردانتے ہیں چنانچہ چچا غالب جب بھی کوئی نیا عشق فرماتے تو آہ و زاری کی منزل میں پہنچ کر اپنی عزیزہ خادمہ عندلیب بیگم محبوبۂ گل محمد خاں کے ساتھ مل کر آہ و زاری کرنے کے آرزومند ہوتے تھے اور عندلیب بیگم کو مخاطب کر کے یوں کہتے تھے ؂

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

جس کے جواب میں عندلیب یوں کہتی ؂

آہ و زاری مجھ "سراپا ناز" کا شیوہ نہیں یہ تو آپ ہی کو مبارک ہو

عندلیب سے مایوس ہو کر غالب زار زار روتے جاتے اور کہتے جاتے

گر یونہی روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اور جب خوب جی بھر کر رو لیتے ہونگے تو ڈریسنگ روم میں داخل ہو کر اپنے جسم پر فرانس کی بنی خوشبوؤں کا چھڑکاؤ کر کے خوب چاق و چوبند یہ شعر گنگناتے ہوئے نکلتے ہونگے۔

رونے سے عشق میں اور بھی بے باک ہو گئے ہم دھوئے گئے ایسے کہ بس پاک ہو گئے ہم

حضرت میر جب چھوٹے تھے تو اور خراب عادتوں کے ساتھ اُن میں ایک بُری عادت یہ بھی تھی کہ وہ رونے کے ساتھ ساتھ انگوٹھا چوسا کرتے تھے اور پھر سو جایا کرتے تھے جس پہ ان کی والدہ محترمہ ان کے سرہانے یہ شعر

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ایک بڑی سی تختی پر لکھ کر آویزاں کر دیتی تھیں ایک اور شاعر صاحب کو جب کبھی رونے دھونے کی حاجت در پیش ہوتی تو وہ بجائے خود کو تکلیف دینے کے کسی ایسے ادارے کی تلاش میں سرگرداں رہتے جو مناسب معاوضہ پر ان کا رونا رو سکے چنانچہ فرماتے ہیں:

رونے والوں سے کہو کچھ اُن کا بھی رونا رو لیں جن کو مجبوریٔ حالات نے رونے نہ دیا

اس کے برعکس طفیل کا یقین ہے کہ:

آنکھ نم ہو کہ نہ ہو اشک بہیں یا نہ بہیں جن کو رونا ہے وہ ہر حال میں رو لیتے ہیں

حضرت ذوق جب کبھی رونے پہ آتے تو شہر کے اعلیٰ حکام کو اپنے رونے کی پیشگی اطلاع دے دیا کرتے تھے تاکہ آنے والے سیلاب

کی ہولناکیوں کا سامنا کرنے کے لئے وہ تیار رہ سکیں کیونکہ ان کا ایقان تھا کہ

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

خیر یہ تو حضرت ذوق کا ظرف تھا کہ وہ اس قدر دریائی رونا روتے تھے ورنہ فی زمانہ اکثر حضرات کو مختلف واقعات پر صرف نالوں پر نالوں موسلادھار بارش یا ماہ ستمبر کی جھڑی کی طرح روتے ہوئے پایا گیا ہے۔ کوئی اپنے دفتر کا رونا روتا ہے تو کوئی گھر کا رونا، کسی کو مسلسل بڑھتی ہوئی مہنگائی پر رونا آتا ہے تو کوئی اپنی محبوبہ کی بے وفائی پر آنسو بہاتا ہے، ساس بہو کو روتی ہے تو بہو ساس کی زیادتیوں پر ٹسوے بہاتی ہے۔ بیوی نئی نئی ساڑیوں اور زیورات کی عدم فراہمی پر اپنے شوہر کے نکھٹو پن پر روتی ہے تو شوہر اپنی قلیل تنخواہ کو دیکھ دیکھ کر بسورتا ہے جس طرح کسی شادی شدہ عورت کو اس کے منگل سوتر یا گلے کی پوت سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شادی شدہ مرد کی پہچان یہ ہے کہ اس کے چہرے پر ہمیشہ بے چارگی اور حزن و ملال چھایا رہتا ہے چنانچہ ایک دفتر ازدواج میں نکاح رجسٹرار نے جب دروازہ کھولا اور دفتر کے باہر کھڑے ہوئے آدمیوں میں سے ایک خوش پوش نوجوان کو اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا۔ " دولہا میاں آگئے تشریف لائیے" تو نوجوان نے اعتراض کیا " میں دولہا نہیں ہوں " اس پر رجسٹرار نے کہا " تو پھر تم رونی صورت بنائے کیوں کھڑے ہو" اسی طرح ایک صاحب کی بیوی ان کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی اس پر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور جب ان کو تسلیاں دی گئیں کہ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا اور اب سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں ہے تو وہ روتے ہوئے بولے " مجھے تو اس بات کا غم کھائے جا رہا ہے کہ اب میں کار کس طرح استعمال کروں کا کیونکہ مجھے ڈرائیونگ بالکل ہی نہیں آتی۔

رونے دھونے کی مختلف کیفیتوں کے لئے زبان اردو میں مختلف عنوانات دیئے جا سکتے ہیں جن میں سے چند کیفیتیں اور ان کی تشریحات کچھ اس طرح ہیں ۔

۱۔ پاؤں گھس گھس کر رونا : کسی الکشن میں برسر اقتدار پارٹی کے ٹکٹ کے حصول کے لئے امیدواران کرام یہی رونا استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ بلک بلک کر رونا : الکشن یا محبت میں ناکامی کے بعد کا رونا بلک بلک کر رونا کہلاتا ہے۔

۳۔ دھاڑیں مار مار کر رونا : بڑے گھرانوں کی لڑکیاں اپنے عزیز کتے یا بلی کی موت پر چیخ چیخ کر جو ماتم کرتی ہیں وہ دھاڑیں مار مار کر رونا کہلاتا ہے۔

۴۔ سسک سسک کر رونا : اس قسم کا رونا خواتین میں بہت مقبول ہے۔ شوہروں سے کی گئیں فرمائشیں پوری نہ ہونے پر خواتین اکثر وبیشتر سسکیاں لے کر روتی ہیں اور رونے کے ساتھ ساتھ اپنی ساڑی کے پلّو سے "ناک شریف" کو بھی صاف کرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔

۵۔ گلا پھاڑ کر رونا : کسی مشاعرہ میں جب کوئی شاعر انقلابی نظمیں چیخ چیخ کر ترنم سے پڑھتا ہے تو اس کیفیت کو گلا پھاڑ کر رونا کہتے ہیں۔ اکثر گویتے اور قوال حضرات کو بھی اس قسم کی بیماری میں مبتلا پایا گیا ہے۔

۶۔ ٹھنک ٹھنک کر رونا : غیر شادی شدہ لڑکیوں اور بوڑھی خواتین کا اکثر اپنی خواہش اور ضد کے اظہار اور عدم تکمیل کے عوض جو رونا ہوتا ہے اس کو ٹھنک ٹھنک کر رونا کہتے ہیں جو دیگر رونوں کی بہ نسبت زیادہ نقصان دہ نہیں ہوتا۔

مندرجہ بالا قسموں کے علاوہ اور بھی بہت ساری قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور ہر شخص اپنے ظرف اور کمال فن کے لحاظ سے رونے کی قسم اور پیمانہ متعین کر لیتا ہے۔ ایک مشہور اور قدیم کہاوت ہے کہ روتی عورت اور ہنستا مرد دونوں خطرناک اس کا مطلب یہ ہے کہ شادی شدہ خاتون اور کنوارہ مرد دونوں ناقابل بھروسہ شخصیتیں ہیں لیکن فی زمانہ یہ کہاوت کچھ الٹی ہی ہوگئی ہے اور اب ہنستی عورت اور روتا ہوا مرد دونوں کا اعتبار جاتا رہا ہے۔ کہاوت کا الٹ جانا فی زمانہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کہاوتیں بھی اتنی مصلحت کوشی کا شکار ہوچکی ہیں کہ زمانے کی شاطرانہ چالوں کے ساتھ ساتھ اپنے معنی و مطلب بھی اسی طرح بدل دیتی ہیں جس طرح

ایک ہوشیار لیڈر انقلاباتِ زمانہ کے سرد و گرم حالات میں پھنس کر رونے دھونے کے بجائے اپنا دھونا دوسروں کے سر تھوپ کر نہایت چابک دستی سے اپنے چہرے پر ایک اور نیا چہرہ لگا کر قہقہہ بر دوشوں میں شامل ہو جاتا ہے اور رونا تو صرف اُن ہی کا مقدر ہوتا ہے جو اپنی اصول پسندی اور اخلاقی حد بندیوں میں پھنسے ہوئے نہ صرف خود روتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی زندگی کے ہر کام پر رونے کی ترغیب دیتے ہیں، اب یہی دیکھئے کہ میں اس وقت آپ کے سامنے کئی باتوں کا رونا رو رہا ہوں اور مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ آپ بھی اس وقت زندگی کے کسی نہ کسی رونے میں مبتلا ہونگے چنانچہ بلحاظِ ضابطہ نمبر ایک یہ بات ثابت ہوئی کہ رونا دھونا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

مطبوعاتِ زندہ دلانِ حیدرآباد و دیگر مزاحیہ کتب

نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعہ کلام	۳/۵۰
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰
مزاج شریف	رشید قریشی	مضامین	۳/۵۰
چھیڑ چھاڑ	پرویز ید اللہ مہدی	مضامین	-/۶
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	مضامین	-/۶
مکرّر ارشاد	برق آشیانوی	مجموعہ کلام	-/۴
لالہ زار	خواجہ عبد الغفور	مضامین	-/۵
قطع کلام	مجتبیٰ حسین	مضامین	۳/۵۰
بہر حال	مجتبیٰ حسین	مضامین	-/۷
گل و گلزار	خواجہ عبد الغفور	مضامین	-/۶
قصّہ مختصر	مجتبیٰ حسین	مضامین	-/۶
در پردہ	مسیح انجم	مضامین	-/۶
گستاخی معاف	ایم اے حنّان	مضامین	-/۶

بتوسط "شگوفہ"

۳۱۔ مجرّد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (اے پی)

غموں کا اندھیرا بہت دُور ہوگا

کِسے تھا پتا وہ بھی مجبور ہوگا — فنِ شاعری پر جو مغرور ہوگا
گھمنڈ اس کا اک روز کافور ہوگا — غزل چور ہوکر جو مغرور ہوگا
عجب شہرِ الفت کا دستور ہوگا — نہ انکار ہوگا نہ منظور ہوگا
غزل چور کو بخش دیں اہلِ محفل — کہ بیچارہ چوری پہ مجبور ہوگا
پکڑ جائے گی جب کبھی اس کی چوری — پشیماں وہ خود ہوکے رنجور ہوگا
جو شاعر غمِ زندگی سے ہے آزاد — وہ فعلن فعولن میں محصور ہوگا
جہاں اس نے لوٹی تھی محفل کسی دن — وہیں بیچتا وہ چنا چور ہوگا
یہ بزمِ سخن ہی ہے یارو جہاں سے — غموں کا اندھیرا بہت دُور ہوگا
خبر کیا تھی فیشن میں گیسو بڑھاکر — بھلا چنگا انسان لنگور ہوگا
ترا مجھ کو ہر صبح گالی سُنانا — کتابِ محبت میں مذکور ہوگا
لئے بیگ میڈم کا جو چل رہا ہے — وہ شوہر نہیں گھر کا مزدور ہوگا
مجھے کھوٹے سکّے ہیں منظور لیکن — پھٹا نوٹ مجھ کو نہ منظور ہوگا
سیاست کے داداؤں کی مدح میں اب — قلم خوش بیانی میں تیمور ہوگا

جلن ہے جنھیں تیری شہرت سے جوہرؔ
وہ بدنام ہوں گے تو مشہور ہوگا!

جوہر سیوانی

ہم وقت کی منھ بولتی تصویر میں ہوں گے

چمچوں میں نہ دیگوں میں نہ کفگیر میں ہوں گے
ہم وقت کی منھ بولتی تصویر میں ہوں گے

مُلّا نہ عبادت میں نہ تقریر میں ہوں گے
مشغول وہ تعویذ کی تحریر میں ہوں گے

برچھی کی طرح تیز میری بیوی کے طعنے
کیا مجھ کو پتا تھا میری تقدیر میں ہوں گے

بیگم کو غزل اپنی سُناؤں گا اُسی وقت
بچے میرے الجھے ہوئے جب کھیر میں ہوں گے

چولھے پہ نہ ہانڈی میں نہ الماری کے اندر
حلوے کے حسیں جلوے تو کفگیر میں ہوں گے

اِس دَل سے جو اُس دَل میں لگاتے ہیں چھلانگیں
مل جائے ٹکٹ بس اسی تدبیر میں ہوں گے

خود داریِ فن بیچتے پھرتے ہیں جو فن کار
وہ داغؔ کی صف میں نہ صفِ میرؔ میں ہوں گے

جن لوگوں نے تخریب کی کھا رکھی ہیں قسمیں
وہ خاک کبھی کوشش تعمیر میں ہوں گے

اُن پر نہ کھلے گی کبھی ہستی کی حقیقت
جو خواب لئے وادیِ تعبیر میں ہوں گے

گلشن کی فضا میں نہ کبھی ڈھونڈنا جوہرؔ
گلدستے ہنسی کے مری تحریر میں ہوں گے

ماہی گیری کی ترقی میں ایک سنگ میل

آندھرا پردیش فشریز ڈیولپمنٹ کارپوریشن ریاست آندھرا پردیش میں ماہی گیری کی ترقی میں ایک سنگ میل اور نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کارپوریشن اکتوبر ۷۴ ۱۹ء میں ۳ کروڑ روپے کے منظور سرمائے سے عالم وجود میں آیا۔

اس کارپوریشن کی گوناگوں سرگرمیاں مارکٹنگ۔ برف خانوں کی دیکھ بھال۔ کاکیناڈا کی گھر یونٹ۔ بوٹ بلڈنگ یارڈ اور ماہی گیروں کی فلاح و بہبود کے کاموں پر مرکوز ہیں۔

برسوں سے ماہی گیروں کو امداد باہمی کے حلقے میں لانے کی مسلسل کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس وقت ماہی گیروں ۸۵۴ امداد باہمی انجمنیں اور ۱۳ مارکٹنگ سوسائٹیاں قائم ہیں جن اراکین کی تعداد ۱۶۶۰۲۵ ہے اور جن کا ادا شدہ سرمایۂ حصص ۱۸،۰۷ لاکھ روپے ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

DIPR/ No. 5-77-78

انجم نجمی

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس...

امیروں میں کئی درجے کے امیر ہوتے ہیں ـــ تو پھر غریب کیوں پیچھے رہیں ـــ چناں چہ ان میں بھی درجے بن گئے ہیں ـــ ایک درجہ ہے ـــ فقیروں کا ـــ کچھ غریب تو کام کاج کر کے زندگی گزار لیتے ہیں اس لیے غریب کہلاتے ہیں۔ رہے فقیر ـــ سو یہ وہ لوگ ہیں جو بھیک مانگتے ہیں۔ اب ان میں بھی اسٹینڈرڈ ہیں ـــ مثلاً ان میں کچھ تو پیدائشی بھیک منگے ہوتے ہیں۔ کچھ بن جاتے ہیں۔ کچھ کو زبردستی بنایا جاتا ہے اور کچھ بھیک مانگ کر دوسروں کو بھکاری بنانا چاہتے ہیں یہ بھیک منگے جن کا ذکر ابھی ہم نے کیا، ذرا مہذب قسم کے پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں ـــ اب ہم آپ سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ـــ آئیے چلیں فقیروں کی بستی میں۔ ویسے بھی ان کی بستی مشکل ہی سے کہیں ہوتی ہے ـــ یہ صبح سویرے چلتے ہیں ـــ اور جہاں شام ہو جاتی ہے وہیں ڈیرا ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر اگلے دن آگے کا سفر ـــ

ایسی ہی حرکت کرتی ہوئی زندگی میں ہم جا ٹکرائے ایک صاحب سے ـــ ہم ٹیکسی میں تھے ـــ سگنل آیا ٹیکسی رکی۔

اور پھر ـــ

"اکس کیوز می ـــ"

"جی، فرمائیے۔ کہیں جانا چاہتے ہیں ـــ آئیے میں ـــ تو چھوڑ دوں ـــ"

"نو ـــ تھینکس سر۔ بات یہ ہے کہ میں تھانہ جانا چاہتا ہوں کسی شریف آدمی نے بٹوا مار دیا ـــ کچھ روپے عنایت کر دیجئے یہ دیکھیے ـــ یہ رہا میرا کارڈ ـــ اس میں میرا پورا پتہ ہے۔ آپ اپنا پتہ دے دیں۔ میں روپے بذریعے منی آرڈر بھجوا دوں گا ـــ"

(ان کی باتوں نے ہمیں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اب سوچتے ہیں، اگر دیا بھی ہوتا تو ہماری شرافت ہم سے یہی کہلوا‌تی)

"صاحب۔ یہ دنیا ہے ہی ایسی جگہ ـــ کوئی بات نہیں۔ کتنے روپیوں کی ضرورت ہوگی ـــ؟"

"جی ـــ بس یہی کوئی دس روپے عنایت کر دیں۔"

"جی ـــ دس کا نوٹ تو نہیں، بیس کا ہوگا ـــ" اتنے میں صاحب سگنل مل گیا ـــ انھوں نے بیس کا نوٹ اُچک کر ہمیں لال جھنڈی دکھا دی ـــ اور کہا ـــ "شکریہ صاحب ـــ شکریہ ـــ جلد ہی لوٹا دوں گا ـــ"

اور ہم ـــ بس منہ دیکھتے ہی رہ گئے اپنا۔ ٹیکسی کے آئینے میں ـــ کچھ دیر بعد ٹیکسی کے ڈرائیور نے جلتی پر تیل یوں چھڑکا۔

"جناب اب مل چکے آپ کے بیس روپے۔ اجی صاحب یہ بھی ایک قسم کا بزنس ہے، بزنس ـــ سو، دو سو روپے خرچ کر کے ایک اچھا سا سوٹ سلوا لیا، ہاتھ میں بیگ۔ ہونٹوں میں سگریٹ

اور بزنس شروع ۔۔ یا یوں کہ لیجیے' بھیک مانگنا شروع ۔۔ یہ
حضرت میری ہی ٹیکسی میں سفر کرنے والے کئی مسافروں سے روپے
اُدھار لے کر انھیں تھانہ پہنچا چکے ہیں :

"کیوں صاحب ۔ جب آپ جانتے تھے تو بتایا کیوں نہیں؟"

"موقع ہی کب ملا ۔۔ اب تو جناب' آپ فقیر صاحب
کے لیے' اپنے لیے اور روپیوں کے لیے دعائے مغفرت کیجیے۔
کیوں کہ اللہ جو کرتا ہے' اس میں ہماری بھلائی ضرور ہوتی ہے'
یا پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جائیے کہ "حق بحق دار رسید"۔

خیر صاحب' ہم تھانہ جاتے جاتے تو رہ گئے ۔۔ مگر یاد
آگیا وہ پہاڑی سفر' جو ہم نے کیا تھا کلیان تک کا (اپنا کلیان
کروانے کے لیے) ۔ حاجی ملنگ کی درگاہ شریف کے لیے ۔
ایک پہاڑ تھا جو سر کرنا تھا ۔ ہر دس قدم پر ایک فقیر اور ہر فقیر
کی ایک نئی بولی ۔۔ دیدار کے لیے جا رہے تھے ۔۔ کام
نیک تھا ۔۔ سو صاحب ہر فقیر کو کچھ نہ کچھ دے کر ثواب دارین
حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش کر رہے تھے ۔ ہم نے جو
بھی دیا بہتوں نے خاموشی سے لے لیا ۔ لیکن ایک نے ہماری
غریبی کی پول ہی کھول دی ۔۔ خوب ہٹے کٹے ۔ مضبوط اور
توانا تھے (دھان پان ہوتے تو سمجھ لیتے) پیٹ کو اندر کی طرف
کر کے ایک زور سے ہاتھ مارا اور حلق سے آواز نکال کر کہا ۔۔

"چمڑے کی جھونپڑی میں آگ لگی ہے مائی ۔ (پیٹ پر ہاتھ)
آگ لگی ہے باوا (پھر پیٹ پر ہاتھ) جھونپڑی کی آگ بجھا ۔
اپنے محلوں کو روشن کر ۔۔ مائی ۔ اے مائی ۔۔ دے اللہ
کے نام مائی ۔۔ اے بابا فقیر کو دے' باوا تیری مراد پوری
کرے گا (آپ چاہیں تو صاحب مرادیں بھی کہلوا سکتے ہیں) البتہ
دان زیادہ دینا پڑے گا ۔ خیر صاحب ہم تو ان کو کچھ دینا ہی
نہیں چاہتے تھے ۔ کیوں کہ یہ جان بوجھ کر فقیر بنے ہوئے تھے۔
چاہتے تو نوکری بھی کر سکتے تھے ۔ مگر آدبوچا کچھ اپنی شرافت نے
اور کچھ انگریزی کے اس مقولے نے کہ ۔۔ " BEGGARS
SHOUED NOT BE CHOOSES —) ۔ اور صاحب
جب ہم نے دس پیسے ان کی ہتھیلی میں رکھے ۔

" اے نے چلا ہے ۔۔ دس پیسے میں مرادیں پوری کروانے
ارے ۔ جا ۔ جا ۔ (پیٹ پر ہاتھ) جا کہیں اور جا ۔ دس پیسے
کا زمانہ گیا ۔ آیا ہے دس پیسے میں اپنی مرادیں پوری کروانے ۔
ارے جا ۔۔ جا ۔۔ (پیٹ پر ہاتھ) اے باوا' چمڑے کی
جھونپڑی میں آگ لگی ہے ۔

اور ہم سوچ رہے تھے ۔ یہ کیسی آگ ہے ۔ یہ کیسے بجھے گی
ہاں ۔۔ اسے بیس سوتری کاریہ کرم بجھا دے گا ۔ یہ سوچ کر
ہم آگے بڑھنے والے ہی تھے کہ ایک پہچانی آواز ہمارے کانوں سے
ٹکرائی ۔۔" او جانے والے بابو ایک پیسہ دے دے ۔۔"
کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے ۔۔ بڑے کی مانگ بڑی' اور چھوٹے
کی ضرورت چھوٹی ۔۔ یہ ضرورتوں کے ہاتھوں فقیر بنے تھے ۔
باپ اندھا ۔ بچہ محتاج لنگڑا ۔۔ لنگڑا لنگڑا کے چلتا جائے'
کہتا جائے ۔

" او سیٹھ ۔۔ باپ دونوں آنکھوں سے لاچار ۔۔ میں
لنگڑا محتاج ۔۔ بابا ۔۔ بہن جی ۔۔ بہن جی ۔ صاحب
سیٹھ ۔ کھانا کھانے کا انتظام کر دے ۔ اللہ آپ پر کرم کرے گا
سیٹھ ۔ ہے کوئی اولاد والا ۔۔ ہے کوئی اولاد والا ۔۔ بچے پر
دیا کرو ۔۔ اندھے محتاج پر دیا کرو بابا ۔۔"

لوگ بچے کی ہتھیلی پر پیسے رکھتے رہے ۔ پانچ پیسے
دس پیسے ۔۔ جب کہ اس دور جاتے ہوئے بچے کی مانگ تو
صرف ایک پیسے کی تھی ۔ شاید اس کے لاشعور میں کہیں کوئی
خیال ہو کہ قطرہ قطرہ سمندر ہوتا ہے ۔۔ مگر کیا یہ قطرے جمع
بھی ہوئے ہیں جو سمندر بنتا ۔

ایک فقیر ہیں جنھوں نے اپنا ایک اسٹینڈرڈ بنا رکھا ہے
اور ان کا اسٹینڈرڈ ہے" سوا روپیہ" ۔۔ روپیہ وصول کیے
کرتے تھے' یہ انھی کے جلوں میں حاضر ہے ۔۔ جو کچھ جتنا بھی

ہمیں یاد ہے ـــ ہاں مذہب و قوم کا فرق انھوں نے مٹا دیا ہے
اللہ اور داتا دونوں کو ساتھ کر کے ۔

" او سکھی (سخی) سائی بابا ـ دے اللہ کے نام داتا ـــ
جو دے اس کا بھی بھلا ـــ جو نہ دے اس کا بھی بھلا ـــ سکھی
(سخی) کا بھلا ـ سکھی کی آل اولاد کا بھلا ـــ سوا روپیے کا سوال
ہے بابا ـــ غریب کا سوال پورا کر ـــ داتا تیری مرادیں پوری کرے گا
اے داتا ـــ دے داتا کے نام بادا ـــ"

اور اس سے پہلے کہ ہم اپنی پھٹی جیبوں کا جائزہ لیتے کہ
سوا روپیہ ہمارے پاس ہے یا نہیں، انھوں نے ایک فلمی گانا
غیر فلمی طرز پر گانا شروع کر دیا ـــ وہی اپنے وقت کا مقبول ترین
گانا ـــ " تجھ کو رکھے رام تجھ کو اللہ رکھے ـــ (خیال رہے
اگلا مصرعہ یوں تھا " دے داتا کے نام تجھ کو اللہ رکھے ـــ"
(شکر ہے ہمارا نام اللہ رکھا یا رکھی نہیں) ۔

ایک دن صاحب، ہم ایک مشاعرے میں پہنچ گئے ـ
معلوم ہوا غریبوں کی یہ ذات جنھیں بھک منگا کہتے ہیں، ان
میں ایک ایسے بھی صاحب ہیں جو شاعرانہ طریقے سے سوال
کرتے ہیں ۔ موڈ میں ہوتے ہیں تو لے لیتے ہیں ورنہ دعا دے کر
آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ ہمارے دوست کے کہنے کا ہمیں یقین نہیں
آیا ـــ مگر جب باہر نکلے تو اتفاق دیکھئے ان ہی سے مڈبھیڑ
ہوگئی ۔

" سنیے صاحب! اجی سنیے تو، غالب صاحب کیا
فرما گئے ہیں ـــ"

ہم پہلے ہی کافی شعر ہضم کر چکے تھے، اور اب مزید بدہضمی
کے ڈر سے بچ کر بھاگنا چاہتے تھے کہ انھوں نے لہک کر چھپا
غالب کی لحد کی اینٹیں تک بجا دیں ۔ (لہک کر پڑھا) ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ہاں ۔ دیکھتے ہیں ـــ اجی سنیے تو

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

ہاں جی ـــ کیا ـــ

اب ہم رُکے تو صاحب فرماتے ہیں ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

ہاں جی کر چلے ـــ

اور اس سے پہلے کہ ہم ہا دو یتے یا داد دیتے دعا دکان اپنی
بڑھا گئے ۔ یہ شاعر قسم کے صاحب کس کلاس کے طالب علم
تھے ـــ یہ آپ پر چھوڑا ـــ آگے سنئے ـــ

بہت دنوں کی بات ہے، ہم سمندر کے کنارے اپنی بیگم
کے ساتھ چہل قدمی کے لیے گئے ۔ بیگم مچل گئیں کہ چلیے دُور دُور
تک چلتے چلے جائیں ۔ جبھی نئی نئی شادی ہوئی تھی ۔ ناراض کرنا
نہیں چاہتے تھے ۔ سوچا یہ بھی ایک سنک ہی ہوگی ۔ اب قسمت
دیکھیے، آ ٹکرائے ایک صاحب ۔ ہماری مراد مانگنے والے سے
ہی ہے ۔ تھا بڑا سمجھ دار ۔ دیکھتے ہی آواز لگائی (آواز ناک
سے نکالتے تھے) "جمعرات بھری مراد ـــ دیوے چراغ ـــ
یا دے مراد ـــ جمعرات بھری مراد ـــ پیاروں کی عمر دراز ۔
بس بیگم اَڑ گئیں ۔ قیامت یہ کہ دن بھی جمعرات ہی کا تھا
بیگم کا اَڑنا تھا کہ پھر بولے ـــ " جو دے اس کا بھی بھلا، جو
نہ دے اس کا بھی بھلا ـــ دے دے مائی ـ دودھو پھلیں
تیرے لال ـــ اے جمعرات بھری مراد ـــ دیوے چراغ ۔
پائے مراد ۔ پیاروں کی عمر دراز ـــ" اور صاحب ہم نے چراغی
یعنی پیسے دے دیے ۔ اور رہی مراد ـــ تو ہم نامراد باقی بچے
تو مرادیں ہی مرادیں ہیں ۔

بس اسٹاپ پر کھڑے رہنے کا ـــ اور جس کا انتظار کرنے
کی سزا تو آپ سب نے اُٹھائی ہی ہوگی ۔ یہ مزا ـــ اور یہ انتظار
اس وقت اور جان لیوا ہو جاتا ہے ۔ جب دو ننھے منے بچے

آپ کے سامنے تپتی ہوئی سڑک پر طرح طرح کے کرتب دکھائیں۔ تھک جائیں۔ پسینہ پسینہ ہوجائیں، تو آپس میں لڑ پڑیں۔ بڑا بھائی جو مشکل سے پانچ سال کا ہو — اپنی چھوٹی تین یا چار سالہ بہن کے ایک تھپڑ رسید کردے۔ وہ آنسو بہاتی جائے، روتی جائے۔ اور تپتی ہوئی سڑک پر کرتب بھی دکھاتی جائے۔ اور پھر ایک تھکی ماندی آواز کانوں سے ٹکرائے — "ماں جی — او بہن جی — او بابا — او سیٹھ جی —! پیسہ دو بابا —! بھوک لگی ہے۔ چائے پئیں گے بابا۔ سیٹھ صاحب، کھانا کھائیں گے —!!

بچے کی سمجھ بچے کی عمر کے برابر ہی تو ہوگی۔ مجھ جیسے لوگ جب ان کا تھوڑا سا بھلا کر دیتے ہیں تو وہ دوڑ کر سڑک پار کر جاتے ہیں — اور وہاں — وہاں ان ہی بچوں کے ہٹے کٹے جوان ماں باپ پیڑ کی چھاؤں میں ٹھنڈی سڑک پر بیٹھ کر چائے پاو "کھاتے نظر آئیں گے — اور جب یہ بچے ان سے اپنا حق مانگیں تو یہ انھیں کسی اور بس اسٹاپ پر جاکر بھیک مانگنے کے لیے کہیں — تو بتائیے اس وقت آپ کا جی کیا چاہے گا — کھولتے رہنا اپنی بےبسی پر — یا پھر یہ کہہ کر دل کو دلاسہ دینا کہ اُوپر والے نے ان کا نصیب یوں ہی بنایا ہے۔ دیش کے یہ ننھے منے دماغ جو کل کے نگہبان ہیں، ہماری تہذیب و تمدن کو کیا دیں گے —؟

ہاں ایک آس ہے — کہ اب وہ دن نزدیک آگیا ہے جب ان بچوں کی تقدیر ان کی اپنی مٹھی میں ہوگی۔ کبھی آپ کا سامنا ان فقیروں سے بھی ہوا ہوگا جنھیں جذام کی بیماری ہوتی ہے ان میں سے ایک لکڑی کی گاڑی پر بیٹھا ہوتا ہے، دوسرا اسے کھینچتا ہوا گلی گلی گھومتا ہے۔ یہ کبھی دو ہوتے ہیں۔ کبھی دو سے زیادہ۔ جب بھی مانگتے ہیں گاکر مانگتے ہیں۔ بول جو ہماری سمجھ میں آتے ہیں وہ کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں —

"ایک دن پیسہ بابا — دیا کرو بابا — لولا لنگڑا ہے بابا

کرو — دیو سیٹھ صاحب — دیوا تمہارا بھلا کرے گا"

انھیں ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ان کے علاج کے لیے ہماری حکومت نے بھی بہت کچھ کیا ہے — مگر نہیں صاحب، یہ بھیک مانگیں گے — اس لیے کہ انھیں عادت ہے۔

مقصود احمد مکی

ذوق: ـ 　　اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر 　　آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

اور حالی نے فرمایا 　　بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ 　　مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلّف علامت ہے بیگانگی کی 　　نہ ڈالو تکلّف کی عادت زیادہ

ہمارے بزرگ شعرا نے اپنی زندگی کا نچوڑ ان اشعار میں پیش کیا ہے۔ تکلّف میں شدّت نہ کرنے اور میانہ روی اختیار کرنے کا کس قدر مخلصانہ مشورہ انھوں نے دیا ہے۔ قربان جائیے۔

تکلّف میں تکلیف پہنچنے کا اچھا خاصہ تجربہ تو بچپن میں ہی ہوا۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں جامعہ ملیہ میں سائنس کے استاد جناب علی احمد صاحب تھے وہ اپنی سائنسی صلاحیتوں کی بنیاد پر جامعہ آئل "مفید منجن" اور "پھر بجاؤ تیل" وغیرہ ایجاد کر چکے تھے اور اب چاکلیٹ مارکیٹ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ تجربہ گاہ میں چاکلیٹ بنائی گئی۔ خوش قسمتی نہیں، بدقسمتی کہ سب سے پہلے ماسٹر صاحب نے چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا میری طرف بڑھایا "تو مقصود مزا بتاؤ" ـــــ "لیجئے نا ماس ساب۔۔۔۔۔۔ پہلے آپ ۔۔۔۔۔آپ ۔۔۔۔۔ میں نہیں۔۔۔۔۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ ماسٹر صاحب پہلے نوش فرمالیں۔ بعد میں میں لونگا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں چاکلیٹ پسند نہیں کرتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آموں کے بعد سے تنک گدھے چاکلیٹ نہیں کھاتے۔ اس کے بعد ماسٹر صاحب نے چاکلیٹ کے ٹکڑے دوسرے لڑکوں میں تقسیم کر دیئے۔ ایک ساتھی نے کہا بھی کہ "مقصود کو دیجئے نا!" ماسٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ نہیں کھاتے۔"

سب ساتھی چاکلیٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور یہ خاکسار اکیلا ـــــ بس کچھ نہ پوچھئے ـــــ میں نے اسی وقت مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ سے ہرگز تکلف نہ کروں گا۔ تکلّف میں سراسر تکلیف ہی تو ہے۔

ایک بار والد صاحب کی ملازمت کے زمانہ میں کرگی "جانا پڑا جہاں وہ بہ حیثیت دیوان مقیم تھے۔ "کرگی" جانے کے لئے ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر اتر کر پانچ میل کا سفر پیدل، بیل گاڑی یا موٹر سے طے کرنا پڑتا تھا۔ اس اسٹیشن کے قریب صدیق صاحب رہتے تھے صدیق صاحب کے خاندان کا ہر فرد مخلص ملنسار و مہمان نواز تھا۔ جب کبھی ہم لوگ آتے یا جاتے ہوئے چند منٹ کے لئے وہاں رکتے تو صدیق صاحب یا ان کے گھر کے لوگ "پانی" کے لئے ضرور پوچھتے اور پانی کا مطلب ناشتہ ہوتا تھا۔ بغیر ناشتہ کئے پانی نہ ملتا تھا۔

ایک دفعہ ایک لمبے سفر کے بعد میں وہاں پہنچا۔ بھوک خوب لگی تھی اور ناشتہ کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ایک بچّہ نے پانی کے لئے دریافت کیا۔ میں نے کہا "ضرور۔۔۔۔" لیکن اس روز ان کا بچّہ ٹھنڈا پانی ایک خوب صورت گلاس میں لے کر آگیا۔ میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ بے تکلفی سے طلب کرنے کا خوب صورت طریقہ مجھے ننھی عذرا نے بتایا۔ ہوا یوں کہ ایک بار میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں اتفاقاً مہمان ہوا۔ اس روز دسترخوان پہ انڈے کا سالن تھا۔ انڈے سب نے لے لئے۔ اور سب سے پہلے عذرا نے اپنی پلیٹ کا انڈا چٹ کیا اور پھر بولی "ابا جان

انڈا اور چاہیئے۔؟"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا" اب کہاں ہے" عذرا نے فوراً اپنے بھائی کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا" وہ تو ہے......!"

انڈے اور مرغ آپ بلا ناغہ روزانہ استعمال نہیں کر سکتے طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔ لیکن قدرت نے بکرے کے گوشت میں یہ خوبی رکھی ہے کہ صبح شام کھانے کے باوجود اس سے اُکتاہٹ نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ تو بہت گوشت خور ہوتے ہیں تو کچھ لوگ اس کی خوشبو سے خوش ہو جاتے ہیں۔

ایک صاحب مجرّد گاہ میں مجرّد زندگی گذار رہے تھے۔

ایک نیا باورچی ملازمت کے لیے آیا پوچھا گیا" کیا کیا پکانا جانتے ہو۔"

وہ بولا" یوں تو بہت کچھ جانتا ہوں لیکن سبزی عمدہ پکاتا ہوں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں گوشت زیادہ پسند نہیں کرتا"

ملازم نے مہینہ بھر عمدہ سبزی کھلائی۔ صاحب تو اس کی خوشبو سے ہی خوش ہو جاتے تھے۔ پہلی تاریخ کو دھوبی انڈے دودھ اور بجلی کے بل آئے تو قصاب نے بھی اپنا بل پیش کر دیا۔ صاحب کو بڑا تعجب ہوا۔ انھوں نے ملازم سے دریافت کیا یہ قصاب کا بل کیا۔؟ میں نے تو مہینہ بھر ایک بوٹی بھی نہیں چکھی۔ وہ بولا آپ نے بوٹی نہ چکھی ہو یہ دوسری بات ہے میں سالن سبزی اور گوشت ملا کر پکاتا تھا۔ سبزی آپ کو دیا کرتا تھا گوشت میں کھایا کرتا تھا۔ آپ ہی نے تو فرمایا تھا کہ گوشت آپ کو زیادہ پسند نہیں!"

دستر خوان پر گوشت تو گوشت سبزی بھی نہ ہو تو بعض میزبان اپنے مہمان کو مزا لے لے کر کھانا کھلاتے ہیں تاکہ کھانے کی خوشبو اور میزبان کی گفتگو سے ہی مہمان شکم سیر ہو جائے ایسے موقع پر مہمان کتنا ہی بے شرمی کی حد تک بے تکلفی کا مظاہرہ کرے بلا کھائے اپنا شکم سیری اور میزبان کی مہمان نوازی کا دل سے معترف ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب کسی کام سے ایک گھر میں اس وقت پہنچ گئے جب کہ دستر خوان پہ کھانا چُنا جا رہا تھا۔ نووارد دور بیٹھ گیا۔ میزبانوں نے بڑے اصرار سے نووارد کو بھی بُلا لیا۔ آؤ میاں کھانا کھاؤ تب ہاتھ دھو کر وہ شامل ہو گیا۔ چند لقمے لئے تھے کہ میزبانوں نے کہنا شروع کیا میاں اتنا ہی! کچھ اور لینا تھا" ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک نے کہا" بہت کم خوراک ہے۔" دوسرے نے دریافت کیا" کھانا کھا کر آئے تھے۔؟ جو اتنا کم کھایا...... ارے ارے یہ کیا....." اتنے میں مہمان نے میزبانوں سے مخاطب ہو کر ہاتھ نہ دھوئیے۔ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑنا" ایک پُرانی مثل ہے۔ اوپر بیان کئے ہوئے واقعہ میں میزبان ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے تھے اور بے چارہ مہمان نے سچ مچ ہاتھ دھو کر میزبان سے اپنا پیچھا چھڑایا تھا۔ لیکن مجھے تو ایک بار اپنے میزبان کا پیچھا کرنا پڑا تھا۔

ایک ماسٹر صاحب نے اپنی بچی کے نکاح پر دعوت طعام رکھی۔ دعوت نامے انگریزی میں طبع ہوئے تھے۔ دعوت طعام" اس طرح لکھا گیا تھا کہ" دعوت عام" بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ پروگرام یوں تھا۔ سنیچر کی شام میں نکاح اور اتوار کی صبح دس بجے دعوت طعام دولہا والے موٹر اور ٹرین کا لمبا سفر طے کر کے آنے والے تھے لیکن وہ مقررہ وقت پر نہ آئے اور سنیچر کی شام میں نکاح نہ ہوا۔ نتیجتاً اتوار کا کھانا ملتوی۔

نکاح کا وقت ۷ بجے شام کا دیا گیا تھا۔ لیکن جب اتوار کی شام ہم انور میاں کے ساتھ نکاح میں شرکت کے لیے وہاں پہنچے تو شادی کے کوئی آثار دور دور تک نہ تھے۔ یعنی چہل پہل دوڑ دھوپ، ڈھول تاشہ روشنی یا پھلواری کچھ نہ تھا ایک ٹٹو تھا جیسے کہ سجایا جا رہا تھا ۹ بجے تک طویل انتظار کے باوجود ٹٹو ایک قدم آگے نہ بڑھا تو ہم لوگ اس خیال سے واپس آگئے کہ نہ جانے شادی میں کتنی دیر لگ جائے۔ لیکن اس خیال سے کہ ماسٹر صاحب کو شکایت ہو جائے گی۔ پیر کی صبح ماسٹر صاحب کے گھر پہنچے۔ کوئی چہل پہل نہیں تھی۔ ماسٹر صاحب کا مکان اندر سے بند، دھوپ

،دن کوئی سایہ نہیں، کوئی شامیانہ نہیں، نہ دیگوں کی کھڑکھڑاہٹ نہ پلیٹوں چلنے کی گھڑگھڑاہٹ" نہ پلاؤ کی خوشبو نہ بوٹیوں کی جستجو نہ ہاتھ
تے مہمان ـــ کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا' دھوپ پریشان کررہی تھی اور تشویش الگ تھی کہ آخر یہ سب کیا ہے۔؟

اتنے میں ماسٹر صاحب کے مکان سے دو اصحاب نکلے۔ ایک ہاتھ دھونے والا دوسرا ہاتھ دھولانے والا' ایک کا ہاتھ خالی' دوسرے کے
ین صابن تولیہ اور بالٹی' ہاتھ دھلا کر ہاتھ دھلانے والا جیسے ہی کمرہ کی طرف واپس جانے لگا' میں نے جالیا اور کہا" ذرا ماسٹر صاحب سے
نی فرما کر یہ کہہ دیجئے کہ ایک صاحب تکی نام کے آئے ہیں۔" اس شخص نے بڑی مہربانی کی۔ ماسٹر صاحب تشریف لائے فرمایا۔

" تکی صاحب ہم نے تو دعوت طعام منسوخ کردی ہے۔"

" اوہ ...... کوئی بات نہیں۔ اجازت دیجئے"

"جی نہیں ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ آیئے ماحضر تناول فرمایئے۔

اور پھر دولہا والوں کے ساتھ ماحضر بریانی سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ اگر ہم لوگ زیادہ تکلف کرتے یقیناً اس سے ہاتھ دھونا پڑتا
جب ہم کھانا کھا کر لوٹ رہے تھے تو بہت سے لوگ خالی ہاتھ واپس جاتے نظر آئے۔ راستہ میں یہ خیال ہوا کہ آخر ماسٹر صاحب نے
ت طعام کیوں کر منسوخ کی؟ ـــ "ایک صاحب مل گئے انھوں نے پان کھلایا (شاید ماسٹر صاحب نے پان نہ کھلایا تھا..... یہ عام
ور ہے کہ میزبان کلیجہ کا ٹکڑا نکال کر رکھ دے مہمان کو کچھ نہ کچھ شکایت باقی رہ ہی جاتی ہے)...... پوچھنے لگے" ماسٹر صاحب کے ہاں سے
ے ہیں۔ کھانا کھا کر آرہے ہیں کیا۔؟ ـــ ہم نے کہا" الحمدللہ" اور پورا واقعہ بیان کیا اس پر انھوں نے بتانا شروع کیا کہ دعوت کس کے لئے
خ کی گئی۔

ہوا یہ کہ لین دین اور چڑھاوے کے زیور سے بات بڑھی۔ مہر کا معاملہ جھگڑے سے کیوں کر بچ سکتا تھا۔ دولہن والے گیارہ ہزار کہہ
ے تھے اور دولہا والے صرف پانچ سو! بھلا اس خلیج کو کون انجینئر اتنی جلدی پاٹ سکتا تھا۔ رات گیارہ بجے نکاح کی کارروائی شروع ہوئی تھی
پھر گیارہ سے بارہ۔ بارہ سے ایک اور پھر ایک سے دو بجنے والے تھے کہ ایک بزرگ نے مداخلت کی دیکھئے اتنے سارے لوگ یہاں سات
شام سے جمع ہیں ان کی پریشانی کا خیال کیجئے۔ آپ لوگ سمجھدار ہیں تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک طرف ماسٹر صاحب ہیں دوسری طرف وکیل صاحب
.اور سالے بہنوئی کا رشتہ ہے آپ میں۔ اس پر ماسٹر صاحب کے سمدھی وکیل صاحب نے فرمایا" آپ اگر کہیں تو مہر کی رقم گیارہ ہزار کی بارہ
.ہوسکتی ہے لیکن ماسٹر صاحب کی بات نہیں مانی جائے گی۔"

" تو پھر بسم اللہ ......" اور بارہ ہزار مہر پر نکاح ہوگیا۔
لیکن ماسٹر صاحب نے اپنی مانگ سے زیادہ مہر طے ہونے پہ بھی عوام کو طعام سے محروم کردیا۔ تعجب ہے
خدا خوش رکھے ماسٹر صاحب کو انھوں نے ہمیں تو خوب کھلایا۔
ہم نے ذوقؔ اور حالیؔ جیسے بزرگوں کے لئے دعا کی جو تکلف کو طاق میں رکھنے کا سبق بہت پہلے دے چکے ہیں۔

O

غزل

پانی بدن کا دیدۂ پرنم میں آگیا
دل جب لہو ہوا ہے تو بلغم میں آگیا

دونوں پہ ختم ہو گیا اندازِ حسن عشق
کچھ تم میں آگیا ہے تو کچھ ہم میں آگیا

رہنے لگا ہے اپنا گلا اب چھری تلے
انداز قاتلوں کا جو بیگم میں آگیا

بھڑکی ہے جب یہ آگ تو سسرال تک گئی
فوٹو جو میرا آپ کے البم میں آگیا،

ایم، او ملا ہے آپ کا کڑکی کے دور میں
بادل کا ٹکڑا دھوپ کے موسم میں آگیا

تھی قید جو لکھی ہوئی دل کے نصیب میں
سینے سے نکلا گیسوئے پُرخم میں آگیا

افسوس انقلاب جہاں کچھ نہ پوچھئے
جو ٹاپ پہ تھا آج وہ باٹم میں آگیا

فیاض افسوس

•

ادریس بانکے

چور اُچکوں کے لئے مشل ہنر لگتی ہے
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

تیرے چہرے کو تکوں یا تری چپل دیکھوں
آجکل یہ بھی مجھے ریڈ کلر لگتی ہے

وہ دبے پاؤں کھسک جاتی ہیں بستر سے
جب مری آنکھ ذرا وقتِ سحر لگتی ہے

جیسے گدھے کے عوض مار پڑے دھوبی کو
ایسے ہر جرم کی تہمت مرے سر لگتی ہے

اتنی دبلی ہے کہ ٹن ٹن کی سہیلی کہئے
میری محبوب کو بانکے کی نظر لگتی ہے

پیروڈی

(شکیل بدایونی کی روح سے معذرت کے ساتھ)

بڑی کرکری میں ہے جی میرے عشق کا کھٹارہ
خدا جانے میں رہوں گا یوں ہی کب تلک کنوارہ

ذرا ان کے کھیل دیکھو ہاتھ لمبی رکھ کے داڑھی
کئے زندگی میں کئی گھر تین تیرہ نو اٹھارہ

یہ تمہاری بے وقوفی جو نہیں تو اور کیا ہے
کہ تمہارا بیل باٹم ہے اصل میں غرارہ !

نکلے ہیں وہ نصیحت دنیا کو کرنے یارو
رکھ کر بغل میں بھاری خود باپ کا پٹارہ

تم پوچھتے ہو جن کا ذریعہ معاش کیا ہے
خادم ہیں قوم ہی کے چندے پہ ہے گذارہ

بائکاٹ میں دل میں گھر میں ہر آدمی کے سر میں
زینت امان دیکھا و راکھی ہے ملکا سارا

امام رائچوری

•

کوثر جعفری

چھیڑے سے جس کی، رگِ جاں پھڑکے
وہ صفت حسن کی مضراب میں ہے

دردِ دل، سوزِ وفا، اشکِ الم
عشق پوشیدہ ان اسباب میں ہے

جس کنول پر گلِ نرگس ہے نثار
وہ مری آنکھ کے تالاب میں ہے

کھول دیں شیخ نے بانہیں کوثر!
کفر اب دین کی محراب میں ہے

احمد جمال پاشا

ابوالمزاح علامہ اسرار جامعی کے ادبی معرکے!

دبستانِ عظیم آباد کی تاریخ میں اپنی قسم کی واحد معرکتہ الآرا شخصیت اسرارالحق اسرار جامعی، المتخلص بہ علّامہ دہقی کی ہے۔ جن کے لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے پہلے ہی ادبی معرکہ سے اس ادبی خطّے کو زیر وزبر کردیا۔

عظیم آباد کی ادبی کان سے یہ اس طرح اچانک دریافت ہوگئے جیسے کہ بقول ڈاکٹر عبدالمغنی "کوئلے کی کان سے ہیرا نکل آئے"۔ پتھر سے ہیرے کی دریافت یُوں ہوی کہ پٹنہ میں "جشنِ جمیل" علامہ جمیل مظہری کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر، بَرپا کیا گیا تو اُس میں پبلک کے بے حد اِصرار پر علامہ اسرار جامعی بھی سُنانے بلکہ منتظمینِ جشن کو ہُوٹ کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اُن کے خارا شگاف طنز کا نشانہ اَدب کا وہ رُجحان تھا جس میں اِس قِسم کے جشن شکار ہو رہے تھے جو آجکل شاعر ادیب کی عزّت اَفزائی سے زیادہ بے ادب حضرات کی جیبیں بھرنے کے لئے بَرپا کیۓ جاتے ہیں اور جنھوں نے ادبی جشن کو اَدب سے زیادہ کاروبار بنا لیا ہے۔

ہرچند کہ علامہ جمیل مظہری نہ تو ایسے شاعر ہیں کہ ان کو اس دائرے میں لایا جا سکتا ہے نہ یہ جشن اِس قسم کا تھا۔ مگر اسرار جامعی کے طنز کے تیروں سے علامہ اور اُن کا جشن بھی محفوظ نہ رہ سکا اور اِس اچانک حملہ نے اِس سنجیدہ جشن کو ایک طُوفانِ بے تمیزی میں تبدیل کر دیا۔ خاص طور پر جب اُنھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

ہر ذرّہ چمکنے کی سیاست میں ہے معروف
یہ جشنِ جمیل آپ کا انعام نہیں ہے

تو منتظمینِ جشن میں بے چینی پیدا ہوگئی، جو لوگ اِس میں نُمایاں تھے وہ بِپھر گئے۔ مگر انجام کی پرواہ کیۓ بغیر علامہ نے دوسرا گولہ داغ دیا ؎

بیچو نہ اِسے مصر کے بازار میں لوگوں
اِس عظمتِ یُوسف کا کوئی دام نہیں ہے

اس کے بعد یہ ہیرو ہوگئے۔ مجمع نے دَوڑ کر علامہ مظہری کے سارے ہار نوچ کر اسرار جامعی کے گلے میں ڈال دیۓ اور انھیں کاندھوں پر بٹھا لیا۔ اِس شکل میں علامہ نے اپنا پہلا جلوس کیا اور اسی کے ساتھ افراتفری پر یہ

جشن ختم ہوگیا۔ جس کے لئے سلطان اختر نے کیا پتے کی بات کہی کہ اس جشن کا عروج اور زوال دونوں اسرار جامعی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عظیم آباد کی زمین اور آسمان میں ایک ادبی بھونچال آگیا۔ ایک بہت بڑا مشاعرہ جو اگلے ہی دن تھا اُس میں سامعین نے "اسرار جامعی" کا اس شدت سے بآواز بلند مطالبہ کیا کہ کسی بھی شاعر کو سُننے سے انکار کر دیا۔ جب میدانِ شعر و نغمہ میں شاعر پر شاعر شہید ہونے لگے تو منتظمین مجبوراً علامہ کو گھر سے برآمد کر کے مشاعرہ گاہ میں لے آئے۔ علامہ کا ہر ہر شعر آسمان توڑ ثابت ہوا، چھتیں اُلٹ گئیں۔ اُن کے طنزیہ کلام کے صَید نے مشاعرہ میں کسی کو بھی نہ چھوڑا۔ بار بار پڑھوائے گئے بلکہ اخیر تک پڑھوائے گئے۔ یہ اپنی قسم کا پہلا مشاعرہ تھا، جس میں سامعین اور شعراء نے نہ صرف علامہ کو سُنا بلکہ بہت سے شاعر تو بیاضیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے اور ایک سنگین مسئلہ یہ پیدا ہوگیا کہ علامہ کے ہوتے ہوئے اب اس شہر میں مشاعرہ کیسے کیا جائے۔ مشاعرہ کروانے والے تو صرف ایک شاعر یعنی علامہ کا مشاعرہ کرنے تک پر تیار تھے، مگر شاعر اِس پہ تیار نہ تھے۔ علامہ کے اِس "وَن مَین شو" کی وجہ سے مشاعرے خُفیہ ہونے لگے۔ جن میں صرف شاعر ہوتے، سامعین ڈر کے مارے بُلوائے نہ جاتے کہ وہ علامہ کو نہ بُلا لائیں۔

جب حضرت رضا نقوی واہی کو ۔۔۔ صرف علامہ پر ہی مشاعرہ ختم ہو جانے اور ان کے جلوس کا علم ہُوا تو انھیں بے حد اشتیاقِ دید ہوا۔ انھوں نے علامہ کو فوراً ایک نامۂ شوقِ طلب سے سرفراز فرمایا۔ جس میں انھوں نے بلا انھیں دیکھے ہی "فخرِ بہار" کے خطاب سے نواز دیا اور لکھا کہ "مہمان شعراء سے آپ کی اتنی تعریف سُنی کہ اگر صحت اجازت دیتی تو خود حاضر ہوتا۔ اس لئے آپ تشریف لائیں اور شب کا کھانا میرے ساتھ کھائیں"۔

علامہ کو جب حضرتِ واہی کا رقعہ موصول ہوا تو انھوں نے کبھی خود کو دیکھا، کبھی خط کو بھانپا اور کثرت اہلِ شہر سے مشورہ لیا۔ کچھ دانشوروں نے واہی صاحب کے خط کی تصدیق کر دی۔ اس کے بعد جدید شعراء کا ایک جلوس انھیں لے کر واہی صاحب کے دولت خانے پہونچا۔ واہی صاحب نے کھڑے ہو کر علامہ کا استقبال کیا اور اُن کے اعزاز میں ایک نظم پڑھی، جس کے چند شعر بطور تفنن پیش ہیں ؎

فخرِ عظیم آباد ہیں اسرار جامعی — اِس دورِ نو کے شاد ہیں اسرار جامعی
کیا کیا نہ ان کی دھوم تھی جشنِ جمیل میں — اب تک سبھوں کو یاد ہیں اسرار جامعی
قسمت یہ اِن کی رشک ہے اہلِ جدید کو — گو اُن کے مستزاد ہیں اسرار جامعی
ان کا عروج دیکھ کے دِل میں کھٹک سی ہے — گویا کہ زہرباد ہیں اسرار جامعی
زندہ دلانِ شہر کا مرکز ہے اِن کی ذات — مرہم برائے داد ہیں اسرار جامعی
ٹوٹا جمودِ شہر، ہوئے جب سے یہ طلوع — مفتاحِ انجماد ہیں اسرار جامعی

ایک ممتاز اخبار نویس نے واہی صاحب کی نظم نوٹ کر کے جا بجا اخباروں میں اشاعت کے لئے جاری کر دی۔ جس پر جل بھُن کر علامہ کے معاصر سپاہی کیوان شکوہی نے ایک نظم "عظیم آباد ایکسپریس" میں چھاپ دی، جن کے چند اشعار قیامت تھے ؎

محفل کے ایک چراغ ہیں اسرار جامعی — یعنی ادب کے داغ ہیں اسرار جامعی
ہر اک منڈیر پر ہیں جا جا کے بیٹھتے — ایسے اصیل زاغ ہیں اسرار جامعی
تم بھی سپاہی اصل میں واہی کا دم بھرو — . . . . : اسرار جامعی

اس وقت اہلِ بزم کے سچ سچ جو پوچھیئے — گردہ جگر دماغ ہیں استرار جامی۔

علامہ پر دوسری طرف سے اچانک جناب عظیم آبادی کے فرضی نام سے کسی حریف ظریف نے حملہ کر دیا ؎

سمجھو نہ یہ شراب ہیں استرار جامی — ویرانے کے گلاب ہیں استرار جامی
جس میں نہ نون مرچ نہ کوئی ہے ذائقہ — آلو کے بس کباب ہیں استرار جامی
گردہ بھی ہے کلیجی بھی ہے پھیپھڑا بھی ہے — یعنی کوئی قصاب ہیں استرار جامی
داہی کے واسطے تو ہیں دریائے بے کنار — سب کے لئے سراب ہیں استرار جامی
گردن پہ جوں سوار ہو ایک پیر تسمہ پا — اس طرح کے عذاب ہیں استرار جامی
چاروں طرف سے چچوں کی یلغار جس پہ ہے — مرغوں کی ایسی قاب ہیں استرار جامی

علامہ پر دوہرا حملہ ہوا تھا کہ ان کے حلیفوں کا توپ خانہ حرکت میں آگیا۔ جناب ظہیر صدیقی نے سپاہی پر حملہ کرتے ہوئے علامہ کے دفاع میں کہا ؎

داہی نے ان کو شاد کیا بھی تو کیا کیا — میں کہہ رہا ہوں میر ہیں استرار جامی
سوچا بہت تو داغ سپاہی کی عقل کیا — اقبال اور ٹیگور ہیں استرار جامی
نظم و غزل کی خاک لگا دی ہے میز پر — الفاظ کے امیر ہیں استرار جامی
محفل میں کیف و عاجز و سلطان کے لئے — اک خطرۂ خطیر ہیں استرار جامی

ڈاکٹر طلعو رضوی برق نے سامنے سے ایسا حملہ کیا کہ غنیم پر بجلی کی طرح گرے ؎

اک ضربِ لا الٰہ ہیں استرار جامی — اللہ کی پناہ ہیں استرار جامی
میدانِ پانی پت میں پچھاڑا غنیم کو — وہ نادری سپاہ ہیں استرار جامی

تاج پیامی نے چٹکی لیتے ہوئے کہا ؎

کانٹوں کے حق میں بڑھ کے ہیں بادِ سموم سے — گُل کے لئے نسیم ہیں استرار جامی
اک شاعرِ عظیم ہیں استرار جامی — فخرِ عظیم آباد کی ترکیب ہے درست

ماہر آروی نے ٹکڑا لگایا ؎

چلتی ہوئی ردیف ہیں استرار جامی — انساں عجب شریف ہیں استرار جامی

منیر سیفی نے کہا ؎

کتنے سپاہیوں نے دیں آکر سلامیاں — دار و دفۂ بہار ہیں استرار جامی

یگانۂ ظرافت حضرتِ جوہر سیوانی نے زبردست جوابی حملہ کیا ؎

رُخ موڑنا ہے فتنۂ سیل و بہار کا — کرنا ہے توڑ ایک سپاہی کے وار کا
استرار جامی کا بنا ہے حریف وہ، — راکٹ سے ہے مقابلہ اک گھوڑ سوار کا
فخرِ عظیم آباد کو کہتا ہے داغ داغ — یہ حوصلہ تو دیکھئے تہمت شعار کا
جتنی شتنے پی کے نکلا ہے بکتا ہے اول فول — گہرا دماغ سے نہ چھٹا ہے خمار کا
ڈنڈے چلانا کام سپاہی کا ہے مگر — لازم ہے یہ وطیرہ نہ سیکھے گنوار کا

شمیم قاسمی نے لکھا ؎

لڑتے ہو کیوں سپاہی اسرار جامی سے
خوش نہیں جناب واہی اسرار جامی سے

داغِ ادب وہ خود ہیں بنتے ہیں جو سپاہی
ڈھل جائے گی سیاہی اسرار جامی سے

رحمانیہ میں چائے مدت سے پی رہے ہیں
کھائیں گے بالوشاہی اسرار جامی سے

رحمانیہ میں بیٹھے بکتے ہیں اُلٹا سیدھا،
کھا کھا کے مرغ و ماہی اسرار جامی سے

تنکا چھپا ہوا ہے داڑھی میں اُن کے لیکن
بنتے ہیں خانقاہی اسرار جامی سے

اس پر جوابی حملہ علامہ پر جناب اعجاز حسن نے کر دیا ؎

معدے کا انتشار ہیں اسرار جامی
بدہضمی کی ڈکار ہیں اسرار جامی

گھوڑا کسی کا اور بصد ناز و تمکنت
کس شان سے سوار ہیں اسرار جامی

پر وردۂ بہار ہیں اسرار جامی!
واہی کی پیداوار ہیں اسرار جامی!

پٹنہ سے حبس کی خوشبوگئی کا شمیہ تک
وہ دال کی بگھار ہیں اسرار جامی

اِدھر فتنۂ معاصرین سے ایک حشر بپا تھا اُدھر علامہ بہار کے مشاعرے مارتے ہوئے بھوپال پہونچے —
اہلِ بھوپال نے سر آنکھوں پہ بٹھایا۔ انہوں نے اپنے ظریفانہ کلام کے قہقہوں سے آسمان اُڑا دیئے۔ فاتح بھوپال کی
واپسی پر اخبارات سے جب مخالفینِ عظیم آباد کو ان کی تابڑ توڑ کامیابیوں کا علم ہوا تو وہ کباب ہو گئے۔

ادھر کچھ مخالفین نے سر اٹھایا ہی تھا کہ حضرت سلطان اختر کمک پر پہونچ گئے اور دھر دبایا ؎

پہونچے ہوئے فقیر ہیں اسرار جامی
مثلِ حسن شہیر ہیں اسرار جامی

ان کو بڑھو تو راشد و امیر سے کم نہیں
سُن لو تو بس ظہیر ہیں اسرار جامی

اک شاعرِ عظیم ہیں اسرار جامی
اس دور کے حکیم ہیں اسرار جامی

جن کی دمک سے بہار سے سخنور ہیں آب آب
وہ دُرِ صد یتیم ہیں اسرار جامی

میدانِ شاعری میں بھی تنہا نہیں ہیں یہ
اک شاعروں کی ٹیم ہیں اسرار جامی

کہنے کو یوں تو لاکھ ملیں گے سڑک حکیم
دل کے مگر حکیم ہیں اسرار جامی

بزمِ ادب کی جان ہیں اسرار جامی
سو تیر اک کمان ہیں اسرار جامی

آنکھیں تر چھی نہ اُن سے اب اہلِ عظیم آباد
خطرے کا اک نشان ہیں اسرار جامی

جن میں ادب کے جو نکون کی ہو فتا ہے پرورش
اک ایسے مرتبان ہیں اسرار جامی

اُڑتے ہوئے غبار کو کرلیں نہ قید کیوں
شہباز کی اُڑان ہیں اسرار جامی

اِدھر علامہ اسرار جامی کو حضرت رضا نقی واہی نے دانشورانِ عظیم آباد کے ایک نمائندہ جلسہ میں سپاس
استقبالیہ پیش کیا جس میں اسرار جامی کی گل پوشی فرمائی اور انہیں علامہ کے خطاب سے سرفراز فرمایا جلسہ کی صدارت
ممتاز اردو افسانہ نگار جناب احمد یوسف نے کی — مجمع نے تالیوں کی گونج میں خطاب کی تائید کی۔

"علامہ" کے خطاب نے آگ پر تیل کا کام کیا اور بہار کے متعدد شعراء مخالفت اور حمایت میں
حرکت میں آگئے علامہ کا کلام ہندوستان کے ممتاز ادبی رسائل و اخبارات میں لگی دلچسپی سے بکثرت چھاپ اور نقل

کر رہے تھے مخالفین کی بے بسی تھی کہ بڑھتی سی جاتی تھی۔ ادھر شہرت تھی کہ کنیز بن کر خواص میں آگئی تھی۔ آج وہ حیدرآباد کے مشاعرے میں چلے جا رہے ہیں تو کل کشمیر یا کلکتہ کے مشاعرے میں مدعو ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاصرین بلکہ حاسدین نے مقامی مشاعروں میں علامہ پر رکیک حملے اور دلخراش فقرے چست کرنے شروع کر دیئے۔ جو لوگ مشاعروں کو اپنی اجارہ داری سمجھتے تھے۔ ان کے بازوں کی ساکھ مٹنے لگی اور وہ متحد ہوکر انہیں جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی دوران انہوں نے اپنی نظم "خانہ داماد" کا بم پھینک کر اپنے مخالفین کی صفوں میں ایک انتشار پیدا کر دیا ؂

میری نظروں میں ہے سسرال کی دولت کی بہار — میری پیشانی پہ ہے خسر کے جوتے کا وقار
چاٹتا رہتا ہوں لالچ کا خوشامد کا اچار — میرے معدے میں پھنسی مرغ مسلّم کی ڈکار
شکر سسرال کی نعمت کا ادا کرتی ہے۔
بعد ہر کھانے کے توصیف وثنا کرتی ہے۔

عزتِ نفس کو چورا ہے پہ کر کے نیلام — توڑ کر ہاتھوں سے خودداری کردار کا جام
ساس کی زلف سے جب باندھ دی قیمت کی لگام — تب کہیں جاکے میسّر ہوا شادی کا پیام
رشتۂ عمر اِس انداز سے جوڑا میں نے
کسی قیمت پہ نہ سسرال کو چھوڑا میں نے

ہوسِ گل میں؟ میں اور اک چمن بھول گیا — رہ کے سسرال میں اپنا ہی وطن بھول گیا

ساس اور خسر کا اک بندۂ بے دام ہوں میں — بزمِ یاراں میں مگر آج بھی بدنام ہوں میں

رشک ہے قسمتِ داماد پہ دیوانوں کو — بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو!

ساس کے حکم کو فرمانِ الٰہی سمجھا — ان کی ناراضگی کو اپنی تباہی سمجھا!

اپنی حکمت سے کیا خسر کو نازاں میں نے — اپنی خدمت سے کیا ساس کو حیراں میں نے
اپنے تحفوں سے کیا اُن کو بھی خنداں میں نے
اپنی محنت سے کیا گھر کو گلستاں میں نے
اس کے ساتھ ہی اُن کا دوسرا دھماکا "خانۂ داماد کی فریاد" تھا ؂
میں تو آیا تھا کہ ہر دم یہاں دل شاد رہوں — گھر کا نوکر نہ بنوں صورتِ داماد رہوں

علامہ کا نشانہ دانستہ یا نادانستہ ان کے عزیز ترین گھر داماد درست بن گئے۔ اس سلسلے میں قصے اور روایتیں تو بہت ہیں مگر خود ان کے بیان کے مطابق یہ معاملہ بزرگ مرحوم قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر حلیم اللہ حالی سے شروع ہوا۔ ہفتہ وار "مرغ وماہی" بمبئی میں شائع ہونے والے علامہ کے انٹرویو کے مطابق ــــ

" علامہ کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ دونوں بزرگ خانہ داماد بھی ہیں ۔ " دونوں نظمیں بے شمار اخبارات اور رسائل نے نقل کیں یا اپنے مزاحیہ کالم میں شائع کیں ۔ عام طور پر دور دور تک یہ مشہور ہو گیا کہ انہوں نے جان بوجھ کر یہ نظمیں حالی صاحب پر لکھیں ہیں ۔ اور انٹرویو میں انہوں نے گھما پھرا کر اس کا اعتراف بھی کیا ہے ۔ علامہ کے بیان کے مطابق محترم قاضی صاحب کے حضور میں اِن کی طلبی ہوئی ۔ انہوں نے سرزنش کرتے ہوئے فرمایا " حضرت قلم سنبھال کر رکھیئے ! آپ نے علیم اللہ حالی کی ہجو ملیح کی ہے ! " علامہ نے صفائی پیش کرتے ہوئے عرض کیا ——" یہ تو جتنے بھی خانہ داماد ہیں ۔ اُن سب ہی کے لئے لکھی گئی ہے ۔ ! " — اس پر بقول علامہ " محترم قاضی صاحب قبلہ جھینپ کر خاموش ہو گئے ۔ " جب یہ قاضی صاحب کے یہاں سے واپس لوٹ رہے تھے تو ہرنی اور رشدنی کے راستے میں ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے انہیں چیلنج کر دیا ——

" اسرار صاحب ! آپ نے ہمارے خلاف نظم لکھدی ، ہم آپ کو " کیس " (CASE) کریں گے ۔ ! "

علامہ نے برجستہ جواب دیا ——

" ہم فیس (FACE) کریں گے —— ! "

پروفیسر حالی نے دھمکی دی ——

" ہم آپ کو سڑکوں پہ پٹوا دیں گے ——

علامہ جھک کر بولے ——

" ہم آپ کو لڑکوں سے پٹوا دیں گے ——

اس کے بعد وہ بقول علامہ کے " منہ پھلا کر پسپا ہو گئے ۔ اورنگ آباد ایکسپریس " کے جس شمارے میں " نظم خانہ داماد " چھپی تھی اُس کی تمام کاپیاں بازار سے خرید کر جلا دیں ۔ لیکن دوسرے رسائل اور اخبارات اسے اس کثرت سے چھاپ رہے تھے کہ اب اس نظم کو چھپانے کے لئے انہیں پورے اُردو ادب کو جلانا پڑتا ۔ جو اُن کے بس سے باہر تھا ۔ اس لئے بیان کے مطابق وہ روپوش ہو گئے ۔ جس مشاعرے میں یہ جاتے وہ اُس میں شرکت سے انکار کر دیتے —— "

علامہ نے اُن کے کالج میں گھس کر اُن کے ساتھی اساتذہ اور طلباء میں وہ اخبار مفت تقسیم کئے ۔ جن میں " نظم خانہ داماد " اور " خانہ داماد کی فریاد ' چھپی تھی ' — بقول انٹرویو کے " اس کے بعد اُن کا نام ہی ' پروفیسر علیم اللہ حالی ' سے پروفیسر خانہ داماد پڑ گیا ۔ "

مخالفت مذاق میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی جو مخالفین علامہ کے لئے عذاب ہوتی جا رہی تھی ۔ علامہ نے اپنے توپ خانے سے ایک تیسرا گولا داغ دیا ۔ " ایمرجنسی اور خانہ داماد —— ! جس میں یہ تھا کہ پولیس کی مدد سے خانہ داماد کو سسرال سے نکال کر جیل میں بند کیا جا رہا ہے ؎

مفت خوروں کی نئی شکل میں خانہ داماد | کرتا رہتا تھا معیشت کو سسر کی برباد
کیبنٹ میں ہوا اس مسئلے پر سوچ بچار | اور نافذ ہوا قانون یہ پھر تو اک بار
خانہ داماد نہ سسرال میں رہنے پائے | مفت خوروں کو ہر اک گھر سے نکالا جائے
پھر تو گھر گھر میں پولیس والوں نے مارے چھاپے | جوق در جوق گرفتار ہوئے بے چارے
سر جھکائے ہوئے سسرال سے نکلے سارے | عبرت آموز تھے رسوائی کے یہ نظارے

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں خوش رہیں ساس سسر ہم تو سفر کرتے ہیں

"اِس نظم کی اشاعت کے ہنگامے سے (بقول علامہ) فرار ہوکر پروفیسر علیم اللہ حالیؔ پٹنہ سے (اپنا تبادلہ کرا کر) مستقل طور پر راتوں رات گیا چلے گئے ــــ اور مشاعروں میں بلائے جانے تک پر بھی پٹنہ واپس نہ آئے۔"
اِس طوفان میں جناب سلطان اختر بھی شامل تھے ؎

اشعار کا کھاتے ہیں تو گاتے ہیں وفا کی حالیؔ کی طرح کوئی بھی بدخواہ نہیں ہے
آجاتا ہے میدان میں تو ہٹتا نہیں یارو یہ شیر ببر ہے کوئی روباہ نہیں ہے

گرانڈ ہوٹل والا معرکہ پندرہ روزہ "میٹھی چھری" دہلی میں بہت تفصیل سے شائع ہوا تھا۔ جس کے مطابق گرانڈ کے مشاعرے میں جناب اطہر شیر نے پروفیسر عطا کاکوی، جناب بہاء الدین احمد، جناب کلیم عاجزؔ اور شمیم فاروقی صاحب کے سامنے مذاق اُڑا اُڑا کر علامہ کو مشورہ دینا شروع کیا کہ "علامہ آپ ریختی کہا کیجئے" ــــ اس پر علامہ کی رگِ ہجو پھڑک اُٹھی، جب وہ پڑھنے کے لئے بُلائے گئے تو فی البدیہہ اُن کا مُنہ اس طرح نوچ لیا ؎

پٹنے میں ایک شخص بڑا ہی دلیر ہے طاقت تو ہے نہ خاک مگر شہر میں شیر ہے
چھوٹے بڑے کی اس کو ذرا بھی نہ ہے تمیز بس سب سے چھیڑ چھاڑ اُسے ہے سدا عزیز
محفل میں حامتی سے وہ ناحق اُلجھ گیا بس اکی شور پشتی کا رشتہ سلجھ گیا
دیں حامتی نے اُس کو کچھ ایسی چوبکاریاں آنکھوں میں جھلملانے لگی دن میں کہکشاں

ابھی ان اشعار پر جناب اطہر شیر حزبز ہو ہی رہے تھے کہ علامہ نے ایک راؤنڈ مشین گن بھی چلا دی ؎

دفعتاً گو رنگا سخن چین بن گیا صورت گربہ وہ مسکین بن گیا

شیرِ مجلس شیرِ قالین ہوگیا اس حملے کی تاب نہ لاکر وہ فوراً مشاعرہ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔
"خلیفۂ اَدَب" کی نشست میں علامہ کے کلام کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ قیوم خضر صاحب مدیر "اشارہ" نے یہ کہتے ہوئے اُن کا مذاق اُڑانا چاہا کہ "تعریف اُس شخص کی ہے جس نے اس کندۂ ناتراش کو اس بلندی پر پہنچا دیا۔" یہ سُن کر علامہ نے اُسی وقت اُن کا حساب صاف کر دیا ؎

جو سب چوٹ اُن کو دیئے جا رہے ہیں تو وہ بے تکا پن کئے جا رہے ہیں
میں کھینچوں گا اُن کو تو چیں بول دیں گے چچا چیں جو چٹکی لئے جا رہے ہیں
وہ ڈھبری ہیں ایسی نہیں تیل جس میں سرِ بزم بھبک بھبک کے سجا رہے ہیں
اُن کے چہرے پر بارہ بجا ہے ہمیشہ وہ ٹن ٹن کئے جا رہے ہیں
ہر اک بزم میں بن بلائے پہنچ کر پھٹا پھٹ پھٹا پھٹ کئے جا رہے ہیں
وہ چمچوں سے مُنہ لگ کے بزمِ ادب میں خود اپنی حجامت کئے جا رہے ہیں

نتیجہ یہ ہوا کہ جس مشاعرے میں علامہ پر اُن کی نظر پڑ جاتی تو ہے۔ بقول علامہ وہ "چپکے سے کھسک جاتے ہیں ـــ
پروفیسر حفیظ بنارسی بڑے زندہ دل اور یار باش ہیں بڑے نستعلیق، اور مہذب حضرت واہی علامہ

نے آپ کو بے وقوف بنالیا ہے ۔ آپ سے بھلا اُن کا مذاق کا کیا رشتہ ہے ؟ کہ انہوں نے آپ کو مرہم برائے داد اور زہر باد بنا دیا ۔۔۔ ؟

بی این کالج کے مشاعرے میں جناب یقوم عفرا ڈیر "اشارہ" اور پروفیسر حفیظ بنارسی، صاحبان کی چھیڑ چھاڑ جاری تھی کہ علامہ کا نام پکارا گیا ۔ انہوں نے ایک ہی وار میں اگلا پچھلا سب حساب مع سود کے صاف کر دیا ۔۔۔

رخیائے ہیں جو خفر تو کھلی حفیظ ہیں
مرہم برائے داد ہیں استرار جامی

اس پر دونوں حریف ملریف سٹ پٹائے ہی تھے کہ علامہ نے ایک زبردست نظم داغ دی ۔

ہیں کچھ ایسے بھی سخنور الاماں والحیفظ ! جو بنے پھرتے ہیں ہٹلر الاماں والحیفظ !
محفلِ شعر و سخن میں بھیڑ قوالوں کی ہے اُف یہ اُردو کا مقدر الاماں والحیفظ !
جو در دروازے سے بزمِ شعر میں داخل ہوا یہ گلوکاروں کا لشکر الاماں والحیفظ !
آتے آتے منتظمیں سے فیس لے لی پیشگی یہ مغل سے بھی ہیں بڑھ کر الاماں والحیفظ !
والنٹی سے سند گانے کی لے آنے کے بعد بینچ پر بیٹھے اکڑ کر الاماں والحیفظ !
دائیں بائیں شاعروں کو گھورتے ہیں دمبدم دیکھئے حضرت کا تیور الاماں والحیفظ !
بس چلے تو دوسرے شاعر کو پڑھنے ہی نہ دیں یہ حسد اللہ ہو اکبر الاماں والحیفظ !
گنگڑی لیتے ہیں کتوڑی دبا اس انداز سے جیسے ہو کر گھے کی گھر گھر الاماں والحیفظ !
مشتری بائی کی دُھن میں جیسے ہی چھیڑیں غزل ڈر کے بھاگیں بیگم اختر الاماں والحیفظ !
کوئی رکھتا ہے چھرا انٹیے میں یا در آستیں اور کوئی داڑھی کے اندر الاماں والحیفظ !
جامی پہ طنز کرتے تھے جو بزمِ شعر میں اب وہ کہتے ہیں یہ ڈر کر الاماں والحیفظ !

علامہ کے اس حملۂ حیدری کے بعد نہ صرف جناب حفیظ بنارسی بلکہ تمام مخالفین کے حوصلے ہمیشہ کے لئے بقول علامہ پست ہو گئے ۔

اب استرار جامی صاحب ہر مشاعرے میں دندناتے پھرتے ہیں اور کسی کی ہمت اعتراض یا چوٹ کرنے کی نہیں پڑتی، وہی سب اب ان کی خوشامد کرتے نظر آتے ہیں ۔۔۔ کہ برسرِ مشاعرہ یا اپنے خطرناک اخبار "چٹنی" میں اُن کی پگڑی نہ اُچھال دیں ۔

ابوالمزاح علامہ استرار جامی کے یہ باغ و بہار ادبی معرکے ہماری تاریخ کا ایک سدابہار باب ہیں ۔ جن کی شگفتہ یادوں سے ہمیشہ سب کے دلوں کے کنول کھلتے رہیں گے ۔۔۔

ان کے انہی کارناموں پر شہرآرہ کے دانشوروں نے ایک عظیم الشان تقریب میں انہیں "ابوالمزاح" کے خطاب سے نوازا تھا !۔۔۔۔

انجم مانپوری

وزیر بننے کا خواب

میں نے دیکھا جو اپنا حالِ خراب
مفلسی بن گئی ہے جاں کا عذاب
اس پہ بے شغلی اور بے کاری
پھٹے کپڑے ہیں اور غذا نایاب
میں نے سوچا ہے انقلاب کا وقت
ہر طرف کانگریس کا ہے سیلاب
سوچا موقع یہ اک غنیمت ہے
کانسل کا لگا میں دیکھنے خواب
کہا دل نے کہ کون مشکل ہے
نام کے ساتھ ایم ایل اے کا خطاب
کانگریس سے بھی مل گیا جو ٹکٹ
بن گئے ورکر اپنے کل احباب
گانٹھا سیٹھوں کو میں نے یہ کہہ کر
جلد ہوتے ہیں ہم وزیر جناب
ہوئی سیٹھوں مہاجنوں کی مدد
پھر الکشن کا پوچھئے نہ حساب
دے دیا ورکروں نے جو مانگا
نقد کے ساتھ ہی شراب و کباب
لیکن ایک دن فریق موذی نے
ڈالی الٹ میری لیڈری کی نقاب
میرے بارے میں کر دیا مشہور
دشمن ملک ہے یہ خانہ خراب
ناسمجھ بے وقوف جنتا میں
پڑ گیا میرا دھوکہ باز خطاب
پھر ملے کتنے ووٹ کیا کہیئے
سیکڑے صرف پانچ کا تھا حساب
ہوگئی ضبط ضمانت بھی
کشتیٔ آرزو ہوئی غرقاب
کیا کیا باندھی تھیں میں نے امیدیں
سارے منصوبے نکلے نقش بر آب
ایک دن کر رہا تھا غور اس پر
تھے جو میرے شکست کے اسباب
تھا اسی سوچ میں پڑا شب کو
آگئی نیند تو یہ دیکھا خواب
آیا صوبے میں حکم سنٹر کا
لے لو اس کو بھی کانسل میں شتاب
پھر تو اس ممبری کے ساتھ ملا
آنریبل وزیر کا بھی خطاب
دو طرف زرق برق اوڈر لی
چھایا پبلک میں رعب و داب
کانسل ہال میں پہنچتے ہی
قبل اس کے، کہ ہو کسی سے خطاب
سب کھڑے ہوگئے پئے تعظیم
سر جھکے سب کے ازراہِ آداب

کاونسل کی وہ خوشنما بلڈنگ
شاہی محلوں کا کہیے جس کو جواب
وہ حکومت کا شاندار ایوان
شعرا کی زبان میں عرش جناب
شان سے کرسیٔ وزارت پر
بیٹھا میں جا کے صورت نواب
ناگہاں سنتے ہی یہ چونک پڑا
یہ الکشن کے خرچ کا ہے حساب
کھل گئی آنکھ جب تو یہ دیکھا
جھونپڑی میں یہ تھا محل کا خواب
سن کے یہ حال مانپوری کا
فاعتبروا یا اُولی الالباب

(۱۹۳۱ء میں یہ نظم لکھی گئی)

آپ ہیں کانسل کے کنڈیڈیٹ

ماہر پولیٹکس، اپٹوڈیٹ
راز دار سیاسی ایٹی کیٹ
اپنا خود ساختہ نمائندہ
فرضی اک انجمن کے ڈیلی گیٹ
ووٹ کے تذکرے سے پہلے آپ
پیش کر دیں گے پان اور سگریٹ
اور پھر چکنی چپڑی باتوں سے
دام میں دوستی کے لیں گے لپیٹ
دیکھیے آ رہے ہیں دق کرنے
بند جلدی سے کیجے اپنا گیٹ
گفتگو ان کی پوری اک اسپیچ
بحث ہے گویا کانسل کی ڈیبیٹ
کبھی سردار ہیں اچھوتوں کے
کبھی یہ بھنگیوں کے بن گئے میٹ
نذر ہر وقت ووٹروں کے لیے
ناشتہ، چائے، پان اور سگریٹ
بدحواسی سے ان کے ظاہر ہے
ان کے ووٹنگ کا اب قریب ہے ڈیٹ
خلق و ایثار کا ہے یہ عالم
بیٹھنے کو کہو تو جائیں لیٹ
حاضری دے رہے ہیں ہر در پر
ہاتھ میں لسٹ، منہ میں ہے سگریٹ
مانپوری ہے مختصر تعریف
آپ ہیں کانسل کے کنڈیڈیٹ

(مرسلہ: معین شاہد، مدیر، آدرش، گیا)

تلاشی

عمر مجید
افسانہ

مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ میں ابھی ابھی دفتر سے لوٹا تھا اور اپنے سامنے کی دیوار پر لٹکے ہوئے کوٹ کی اُس جیب کو دیکھ رہا تھا جس میں میری تنخواہ پڑی تھی —— دفعتاً کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ بیوی کسی پڑوسن کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ بچے باہر گلی میں کھیل رہے تھے۔ اس لئے مجھے خود ہی دروازہ کھولنا پڑا۔

میرے سامنے ایک مریل قسم کا آدمی کھڑا تھا جس کی قمیض کے کالر پر بالوں کی خشکی کی ایک تہہ بڑی آسانی کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک موٹا آدمی ایک بے حد تنگ سوٹ میں ملبوس سگریٹ کے آخری ٹکڑے کو جوتے کی نوک سے مسل رہا تھا۔ "ڈیجلنس کمیشن" —— !" مریل قسم کے آدمی کے پتلے پتلے ہونٹ بڑی تیزی سے ہلے۔ "ہم آپ کے مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ کے گھر میں فارین چیزوں کا ایک بھاری اسٹاک موجود ہے — !"

"اور ہمارے پاس باضابطہ وارنٹ —" اب کی بار موٹا آدمی بولا اور مجھے ایسا لگا جیسے کسی پرانے پیانو کے موٹے سُر دبائے جا رہے ہوں۔

"لیکن ——"

"دیکھئے مسٹر — ہمارے کام میں رخنہ ڈالنے کی کوشش نہ کیجئے ——" مریل قسم کے آدمی کا لہجہ بڑا سرد تھا۔

"دیکھئے جناب — میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے گھر کا سب سامان دیسی ہے — اپنے ملک کا بنایا ہوا — اپنے ملک میں بنا ہوا ——"

"آپ کے گھر میں کونسا سامان ہے یہ دیکھنا ہمارا کام ہے اور آپ کے لئے بھی بہتر رہے گا کہ آپ ایک طرف ہٹ جائیں تاکہ ہم اندر داخل ہو سکیں اور اپنا کام شروع کریں ——!"

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور وہ دونوں اُس کمرے میں داخل ہوئے جو بیک وقت کئی کاموں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کئی کاموں کے لئے کیا، کھانا پکانے کے سوا ہر کام اسی کمرے میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اِسے سال دو سال کے وقفہ کے بعد بطور لیبر روم بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

سُرخ فیتے سے بندھی ہوئی فائیل کھولتے ہوئے مریل قسم کے آدمی نے مجھ سے کہا ——

"آپ کا نام ——؟"

"تعجب ہے آپ کے پاس میرے نام تلاشی کا وارنٹ ہے اور اس کے باوجود آپ مجھ سے میرا نام پوچھ رہے ہیں۔"

"مسٹر procedure is procedure —— آپ سے جو کچھ بھی پوچھا جائے اس کا صحیح جواب دیجئے —"

"جی بہتر ——"

"آپ کا نام ——"

"رادھاکرشن ــــــ"

"باپ کا نام ــــــ"

"جناب ــــــ میرے والد اب دنیا میں نہیں بجلا وہ اس معاملے میں کیسے ملوث ہو سکتے ہیں ــــــ؟"

"رادھاکرشن جی ــــــ آپ کارروائی کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں اور ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں ــــــ اپنے باپ کا نام بتائیے" "کستوری لال ــــــ"

"پیشہ ــــــ؟"

"کس کا ــــــ؟"

"آپ کے باپ کا ــــــ؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تھا تو اُس وقت وہ صرف کھانسا کرتے تھے ــــــ"

"انہوں نے آپ کیلئے کیا چھوڑا تھا ــــــ؟"

"پندرہ ہزار روپئے قرض ــــــ"

"اور ــــــ"

"گلستان بوستان ــــــ"

"اور ــــــ"

"تین جوان بہنیں ــــــ تین چھوٹے بھائی ــــــ"

"اور ــــــ"

"اور کچھ نہیں ــــــ"

"یہ مکان جس میں آپ رہتے ہیں کس کا ہے ــــــ؟"

"مکان نہیں ــــــ میں اس مکان کے صرف دو کمروں میں رہتا ہوں اور ہر ماہ ساٹھ روپیہ کرایہ ادا کرتا ہوں ــــــ"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مکان آپ کا نہیں ہے ــــــ"

میں نے اب کی بار خاموش رہنے میں اپنی عافیت سمجھی ــــــ

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے پاس اپنا مکان نہیں ــــــ"

اب کی بار میں خاموش بیٹھا رہا۔

"آپ جواب کیوں نہیں دیتے ــــــ؟"

"جناب میرے خیال میں آپ میرے تلاشی لینے کے لئے تشریف لاتے ہیں ــــــ"

"او۔ہاں ــــــ یاد آیا ــــــ اس صندوق میں کیا ہے ــــــ؟" اُس نے کمرے میں پڑے ہوئے واحد صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک سرد آہ بھری اور پھر کہا ــــــ"

"اس میں میرے خواب بند ہیں ——"

موٹا آدمی صندوق کو کھینچتے ہوئے کمرے کے وسط میں لے آیا۔

"چابی ——!"

"کھو گئی ہے ——؟"

"تالا توڑ دیا جائے ——!"

"موٹے آدمی نے تالا توڑنے میں بڑی پھرتی دکھائی —— مریل قسم کے آدمی نے دوبارہ فائل کھولی اور لکھنے کے لئے تیار ہو گیا۔

"ساٹن کی دو مردانہ قمیض —— ایک کا کالر پھٹا ہوا اور دوسری کی آستین ندارد ——"

موٹا آدمی ایک ایک کر کے صندوق میں سے چیزیں نکالنے لگا۔

"واش اینڈ ویئر کی دو زنانہ قمیض ——"

"انھیں فراک کہتے ہیں ——" میں نے لقمہ دیا۔

"آپ چپ رہیئے ——"

"موٹے آدمی کے ہاتھوں میں اب ایک شلوار تھی۔

"یہ کس کی شلوار ہے ——؟"

"میری بیوی کی ——"

"یہ کس کپڑے کی بنی ہوئی ہے ——" وہ کپڑے کا بغور جائزہ لینے لگا وہ کپڑے کو کبھی کھینچنے لگتا اور کبھی دبانے لگتا —— اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ میری بیوی کی ٹانگیں دبا رہا ہو —— میں کسی بزدل آدمی کی طرح خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دبلے آدمی نے لکھا

"ایک زنانہ شلوار —— کپڑا نفیس، سلائی اعلیٰ۔ لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا میڈ MADE کیا ہے ——"

موٹے آدمی نے اب کی بار جو ہاتھ باہر نکالا تو اس میں ایک انگیا لٹک رہی تھی میں نے اس کی آنکھوں میں ایک ایسی وحشیانہ چمک دیکھی جو ایک مرد کی آنکھوں میں خاص موقعوں پر عود کر آتی ہے۔ وہ انگیا کی کٹوریوں کو وحشیانہ طریقے سے دبا رہا تھا۔ اور یکایک مجھے ایسا لگا جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ میری بیوی کا ۔ ۔ میں نے سگریٹ کا کش اس زور سے کھینچ لیا کہ کھانستے کھانستے میری آنکھیں ابل پڑیں

"میڈ ان فرانس ——"

مریل قسم کا آدمی چونک پڑا —— "تو یہ غیر ملکی ہے یعنی فارین ——"

"اور یہ لپ اسٹک ——" موٹے آدمی کے ہاتھ میں لپ اسٹک کا ایک، ایک سنٹی میٹر لمبا ٹکڑا تھا —— جسے وہ بار بار سونگھ رہا تھا۔ کبھی اپنی ناک کے قریب لے جاتا کبھی ہونٹوں کے قریب۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میری کے ہونٹ چوم رہا ہو —— اس کے ہونٹ بھیگ سے رہے تھے۔

"لگتا ہے۔ امریکی ہے۔"

"جی نہیں جاپانی ہے ——"

"فارین ـــــ امریکی ہو یا جاپانی ـــ مگر ہے فارین ـــــ"

صندوق خالی ہوچکا تھا اور کسی بدنصیب بھکاری کے خالی کشکول کی طرح نظر آرہا تھا ـــ اب وہ دونوں اُس طاقچے کی طرف متوجہ تھے جس میں کتابیں اور رسالے ٹھونسے گئے تھے۔ موٹا آدمی انھیں ایک ایک کر کے نیچے گرانے لگا۔

گلستان، بوستان، کارل مارکس، شب خون، بیسویں صدی، ہدایت نامہ خاوند، دھوپ چھاؤں، کرشن چندر، اقبال کا فلسفۂ خودی، گلزار نسیم، موپاساں، غالب اور تصوف، او ہنری، اک محل ہو سپنوں کا، باتے میں لٹ گئی، تاریخ ہند، دولت مند بننے کے ایک ہزار ایک طریقے، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، فلمی دنیا، ٹائم، آج کل، ہندسماچار، فسانہ عجائب۔ ایک سُرخ کتاب کو دیکھ کر وہ دونوں چونک پڑے۔

"یہ کتاب کہاں چھپی ہے ـــــ" موٹے آدمی نے مجھ سے پوچھا۔

"اس پر لکھا ہوگا ـــــ"

"وہ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

"اوہ تو تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی ہاں ٹھیک سمجھے۔ میں سب کچھ ہوں ـــ ہندو بھی، مسلمان بھی، عیسائی بھی، فاسشٹ بھی، انارکسٹ بھی اور الو کا پٹھا بھی ـــــ"

"اس کا فیصلہ عدالت کرے گی ـــــ"

مریل قسم کا آدمی رپورٹ مکمل کرچکا تو مجھ سے بولا ـــ "اس پر اپنے دستخط کردیجیے" اُس نے میری طرف کاغذ اور اپنا قلم بڑھایا۔ قلم بڑا خوبصورت تھا۔ میں نے اُس پر کندہ الفاظ پڑھے ـــــ وہ دنیا کے ایک امیر ترین ملک کا بنا ہوا پین تھا ـــــ!!"

ان پڑھ بھونگیری

آنکھوں دیکھا حال

بزمِ اُردو ادب نظام آباد کا پہلا مزاحیہ مُشاعرہ

عرصہ دراز کے بعد مستقر نظام آباد میں ' بزم اُردو ادب ' کے زیر اہتمام پہلا سالانہ مزاحیہ مشاعرہ ٹاون ہال میں ۱۹/جون ۱۹۷۷ء کی رات جناب یم گنگا ریڈی صاحب ایڈ ووکیٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کہنہ مشاعرہ کے آغاز کے لیے ایک ایسے بھلا واں رنگ کے ناندیڑ سے آئے ہوئے مہمان شاعر کو اپنا پیہ مزاح کلام سنانے کی دعوت دی ' اپنے روایتی ترنم میں غزل سنا رہے ہیں۔ داد کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

رات کو جگمگا گئے سالے
ٹارچ میری جلا گئے سالے

میرے بستر پہ بیڑیاں پی کر
سارا بستر جلا گئے سالے

بیچ کر کھا گئے میری عینک
اندھا باشا بنا گئے سالے

ٹڈیاں کھا گئیں تھی فصلوں کو
یہ تو ٹڈوں کو کھا گئے سالے

اس کے بعد ایک اور غزل سنائی سامنے بیٹھے ہوئے منچلے بھلا واں پہ فقرے کس رہے تھے اس جانب سے بھلا واں نے اپنی غزل کا یہ شعر منچلوں کی نذر کیا ؎

روڈ پہ کر رہے ہیں خر مستی
کیا گدھوں پہ شباب آیا ہے

بھلا واں ناندیڑی داد تحسین پا کر تالیوں کے شور میں مشاعرہ کی شاندار بسم اللہ کر کے کامراں جا رہے ہیں۔ اس حسین ماحول کو کھٹ پھٹ بھینسہ نے بنائے رکھا ؎

میرے کو کیا غرض اوروں کے منانے سے
مجھے فرصت ہی نہیں پینے اور پلانے سے
کیسے توڑوں میں نوبت پرانے گھر کی
دادا مرکو نکلے تھے سیدھی خانے سے

پوچم پاڑ سے آئے ہوئے نوجوان شاعر خان انجم کو بلایا گیا ان کے اس قطعہ پر کافی داد ملی ؎

ان کا ملیہ بگاڑ توں ٹہرو
زندہ رہنے کو گاڑ توں ٹہرو
ہاتھا پائی میں جیت گئیں تو کیا
شاعری میں پچھاڑ توں ٹہرو

ان قطعات پہ کافی داد ملی ؎

○

زہے نصیب کہ شوہر وظیفہ خوار ملے
نظر کے شوخ طبیعت کے پُر بہار ملے
نہ چاہیئے کی انھیں عادت ہے اور نہ کالی کی
ملے جو وہ بھی تو قسمت سے شیر خوار ملے

○

غم کو سینے میں ڈھال لیتے ہیں
قوم کا درد پال لیتے ہیں
جو بھی آتا ہے ان کے حصے میں
اپنا حصّہ نکال لیتے ہیں

○

اُدھر دَم مارو لٹکانا لگ رہا ہے
اِدھر دلہن بے چاری رو رہی ہے
سبب پوچھا تو ہچکی لے کر بولی
کسی ہیجڑے سے شادی ہو رہی ہے

✡

خان انجم اپنی نشست پر بیٹھے ہی تھے کہ کنوینر پاگل عادل آبادی نے اقبال شانہ سے کلام سنانے کی خواہش کی یہ اشعار پسند کئے گئے ؎

میرے گھر کا حال کیا ہے ادھر آ تجھے بتا دوں
کبھی برتنوں کو بیچوں کبھی گھر رہن رکھا دوں
تیرے گیسوؤں سے لمبے میرے بال ہو گئے ہیں
تو سنوار میری زلفیں تیری مانگ میں سجا دوں

یہ شعر بے حد پسند کیا گیا ؎
یہ تیرے بھی کام آئے تو میرے بھی کام آئے
میں بنا کے بیل باٹم تیری ہر خوشی لٹا دوں

○○○

پھر خنجر بھیمگلی نے ترنم میں غزل سنائی مطلع خوب رہا ؎

بدلے بدلے میرے سب یار نظر آتے ہیں
جوتیاں کھانے کے آثار نظر آتے ہیں

خنجر صاحب واپس لوٹ رہے ہیں۔ محفل کو زعفران زار بنانے حفیظ خاں سپاٹ نمودار ہوئے تالیوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ مخصوص لہجے میں "فیشن کی گڑیاں" سنا رہے ہیں۔ داد شباب پر ہے اس بند پر سامعین لوٹ پوٹ گئے ؎

کر رئیں سلام با وا کو ہائے! ہائے!! کتے!!!
پڑھنے کو جائیں گھر سے تو بس بائے! بائے!! کتے!!!
بچپن سے ان کے آنگن پو انگریزاں آئے کتے
انگریزی کے پلیٹوں کا کاپا فیڈا بنی پلائے کتے
تھا دن انھیں نھلائیں کناں دیکھنے کو جاؤں
فیشن کی گڑیاں آئیں کناں دیکھنے کو جاؤں کناں

داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ اسی دھج سے لہک رہے ہیں ؎

آنسو کے گھونٹ پی کو جئے جا رہا ہوں میں
دل چندیاں ہوا تھا سیئے جا رہا ہوں میں
تنگ آ کو بھیک منگتے محبت کی میں سپاٹ
ارماں کا چپّہ سر پو لیے جا رہا ہوں میں

***

مہنگائی اس قدر ہے کہ جینا وبال ہے
ہے نیم جان کوئی تو کوئی نڈھال ہے
اللہ چشم بد سے بچائے سپاٹ کی
بیگم ہماری آج بھی پیدا رسال ہے
اوندھے فیشن کا یہ زمانہ ہے
آنکھاں رکھ کو بھی دھکا کھانا ہے
بھائی لالا وہ میری عورت کا
جسے سمجھے تھے ہم زنانہ ہے

محفل کو لوٹ کر تالیوں کے شور میں سپاٹ مائیک سے
ہٹتے ہی سراج نرملی کو اناؤنسر نے مائیک پر لا کھڑا کیا ان اشعار
پر قہقہے بلند ہوئے ؎

سن کے آپ کا گانا آ گئے گدھے رانے
پھر بھی آپ کہتی ہیں "مجھ کو تم لتا سمجھو"

شاعری میں دلچسپی اس کی بڑھتی جاتی ہے
گر یہی رہی حالت ہاتھ سے گیا سمجھو

⦿

مشاعرے میں شریک دکنی زبان کے مقبول و ممتاز شاعر
اشرف خوندمیری نے دہقانی ترنم میں اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ
کیا ان کے ہر بند پر بھرپور داد مل رہی تھی۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیے ؎

لیٹن پو بولی مرکٹ تھا یوں مڑ گیا
ان کے دل کے پلنگ سے انے پڑ گیا
آنکھوں کے آنگن دل کے دئے لان میں
لیٹاں جتے بی تھے ان کا فیوز اڑ گیا
بچ گیا سو کرا بی تار پورچ ہے
یار تحاں کی بھنڈولی بہار پورچ ہے

▫⊠▫

"دگمگیتوں" کے صاحب کلام ناندیڑ کے کہنہ مشق شاعر مرزا الکلی
اپنا نام سن کر تشریف لا رہے ہیں ان کی غزل پر خوب داد ملی اس سے
قبل یہ قطعہ سنایا ؎

تم ہم سے دور ہی جاؤ نہ آؤ پاس میاں
ہمیں کسی سے نہیں اب کوئی بھی آس میاں
گلاب جامناں کھانے لگے گدھے لیکن
نصیب گھوڑوں کو اب تک نہیں ہے گھاس میاں

اس محفل قہقہہ میں جہاں پڑھے لکھے شاعر تھے وہیں پر ایک
ان پڑھ بھی موجود تھا ابھرتے ہوئے اس نوجوان مزاحیہ شاعر نے پہلے
چند قطعات سنانے کے بعد ترنم میں غزل پیش کی اور ....؟

وہ بے حجاب سڑک پر سے جب گزرتے ہیں
تمام دل جلے کہتے ہیں 'مال' آتا ہے

▵▲▵

ان پڑھ بھونگری کے بعد نظام آباد کا چکر چلا یہ شعر قابل توجہ
رہا ؎

طاقت میں ویسے کم نہیں کلّے سے میں مگر
کٹتی ہے زندگی میری بیوی کے داب میں

◬

اب تک آپ پوری غزل سن رہے تھے اب آدھی غزل سماعت
فرمائیے، اناؤنسر پاگل عادل آبادی نے 'آدھی غزل' کے منفرد شاعر
جناب بوگس حیدرآبادی کو کلام سنانے کے لیے دعوت دی چند شعر ؎

وہ دلہن ہماری بنتی جو اسے بھی پیار ہوتا
یہ نہ تھی ہماری ....
کئی بار ہیرو بن کر میں فلم میں مر چکا ہوں
مجھے کیا برا تھا مرنا ....

بوگس کے بعد پاگل (عادل آبادی) نے دل موہ لینے والے
ترنم سے دو غزلیں سنا کر داد حاصل کی "میری تلاش میں پولیس کا
محکمہ ہی نہیں ورود بیچے بھی میری تلاش میں ہیں" حیدرآباد کے پسندیدہ
شاعر جناب ڈاکٹر ناظم مرزائی (گڑبڑ حیدرآبادی) پوری آب و
تاب کے ساتھ "معہ کرسی" کے جلوہ گر ہوتے ؎

بڑھے بیٹھیں جوان ہو جاتیں
واقعی گلبہار ہے کرسی
تیرے ملتے ہی مل گئی دولت
تو بڑی مال دار ہے کرسی

گڑبڑ حیدرآبادی کے بعد اناؤنسر نے حیدرآباد کے

ممتاز و مقبول پسندیدہ شاعر کا تعارف کراتے ہوئے جناب طالب خوندمیری کو زحمت کلام دی "آرکیٹک غالب" سنا کر قہقہوں کے روپ میں خوب داد ملی ؎

سبزۂ شاداب کی شطرنجیاں بچھوائیے
چوبِ صندل کی بنی سب کھڑکیاں لگوائیے
گیسوئے پرپیچ و خم کی چلمن ڈلوائیے

سرخیِ لب کی یہاں ڈسٹمپر نگ کروائیے
شب کو دیواروں پہ داغِ دل لگایا کیجئے
پھول بھی زخموں کے منیروں پہ سجایا کیجئے
ایرکنڈیشنڈ ہوں کمرے تو ایسا کیجئے
عاشقوں کے پھیپھڑے سیلنگ سے لٹکائیے

طالب خوندمیری پہلے دور کے آخری شاعر تھے۔ یہاں سے دوسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ دوسرے دور میں اشرف خوندمیری، بوگس حیدرآبادی، مرزا الکل، پاگل عادل آبادی کے علاوہ حفیظ خاں سپاٹ اور عظمت بھلاواں کو بار بار سنا گیا۔

قسط وار ناول

چہ خوب

پرویز یداللہ مہدی

"زندگی میں کبھی کبھی ان حقیقتوں سے سمجھوتہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے جن کی تلخی زہریلا پن سے کم نہیں ہوتی ــــ!" اب تو زندگی بجائے خود ایک تپتا ہوا ریگ زار بن گئی ہے جہاں ہر حقیقت ایک دھوکہ ہے فریب ہے، سراب ہے ــــ؟"

"یہ تمھاری خام خیالی ہے ــــ" ہم نے شبّو کے استدلال کو سراسر غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ــــ "تمھارے اُلجھے ہوئے ذہن کی اختراع ہے یہ ــــ کیا تمھارا وجود حقیقت نہیں صرف دھوکہ ہے۔؟ میں میرا وجود بھی کیا فریب ہے۔؟ یہ زمین وہ آسمان وہ پہاڑ وہ سورج سب کچھ جھوٹ ہے، دھوکہ ہے، فریب ہے، سراب ہے ــــ؟" ہماری سنجیدگی نے غالباً شبّو کو چونکا دیا تھا، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے آگے کہا ــــ "جس طرح ہمارا وجود ایک سچ ہے ایک اٹل حقیقت ہے۔ اسی طرح وہ "ہستی" بھی ایک حقیقت ہے جس کی وجہ سے گھر کا ہنستا کھیلتا ماحول پراگندہ ہو گیا ہے، جس نے ایک گھنٹی سی چاروں طرف پھیلا دی ہے جس کی زد میں آکر گھر کے افراد کے ذہن آہستہ آہستہ مفلوج ہوتے جا رہے ہیں۔ تم اگر اس "وجود" کی حقیقت کو گھر میں اس کی "حیثیت" کو تسلیم کر لو تو یہ ساری گھٹن ــــ خود بخود دور ہو جائے گی ــــ"

"میں نے کب اس سے انکار کیا ہے ــــ!" شبّو نے پُرزور مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا ــــ "بلکہ جب تمام رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں نے عمر کی اس ڈھلتی منزل میں "ابّو" کی اس حرکت پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں کیں طرح طرح کی باتیں بنائیں تو وہ میں ہی تھی جس نے ابّو کے اس اقدام کی تائید کر کے سب کے منھ بند کر دیئے، لیکن ایسی "عورت" نے خود کبھی ابّو کی عزت اور ناموس کی پرواہ نہیں کی اور اس کی یہ آزادانہ روش ہی ہمارے بیچ کبھی نہ گرنے والی ایک دیوار بن گئی میں نے تو اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی کہ اس عورت کو گھر میں وہی مقام حاصل ہو وہی درجہ ملے جو میری جنت مکانی ممی کا تھا، لیکن ــــ لیکن ــــ" شبّو کا گلا بہت دیر سے رندھا ہوا تھا اب جو آنسو تمام بند توڑ کر بہہ نکلے تو ہمیں اپنی خیریت کو خطرہ لاحق ہو گیا، حسین آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے جھلملاتے دیکھ کر ہمارے ستارے بلکہ سیارے بھی گردش میں آجاتے ہیں۔ اور ہم خود کو دنیا کا سب سے بڑا "چغد" محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور آج شبّو غالباً ہمیں "چغدِ اعظم" ثابت کرنے پر تُلی ہوئی تھیں سسکیوں اور ہچکیوں کے ملے جلے سر اور تال کے ساتھ یہ تازہ اطلاع بہم پہنچائی ــــ "مہمان کو اسلام نے بہت بلند درجہ عطا کیا ہے مہمان کو خدا کی رحمت سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن میں نے آپ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ اپنی مرضی اور طبیعت کے خلاف جا کر ایسی ایسی حرکتیں کی ہیں کہ ان کے بارے میں سوچ کر ہی مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے، لیکن خدا گواہ ہے میں نے آپ کے ساتھ جو کچھ بھی بدتمیزی کی ہے اس کے پیچھے صرف یہی جذبہ کارفرما تھا کہ آپ کس طرح اس "عورت" کے آنے سے پہلے ہی یہاں سے چلے جائیں تا کہ "ابّو" کا جو امیج آپ کے ذہن اور ان کے ہموطنوں کی نظر میں ہے وہ اسی طرح قائم رہے مجروح نہ ہونے پائے ــــ لیکن ــــ" شبّو کے آنسوؤں کی روانی میں پھر طغیانی آگئی اور ہمیں کوشش کے باوجود تسلی بخش اور تشفی آمیز الفاظ نہیں مل پا سکے تھے چنانچہ ہم نے گڑ بڑا کر شبّو کے شانے تھام لیے، ہمارے اس اقدام نے غضب ڈھا دیا شبّو نے ہمارے شانے سے سر ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اِدھر ہمارے وجود کے "انگ انگ" پر ستارے

جلیے اور سرور کی ملی جلی جنگل بندی، دوبارہ شروع ہوگئی۔ چوچڑی تو اس وقت تھی جب بڑنہا مکل پر ہمارے پیچھے بیٹھے بیٹھے شبّو نے رفتار کے تیز ہوتے ہی اپنے آپ کو ہماری پیٹ سے لٹکا دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سر سے پاؤں تک دوڑنے والے "سنّا" اسی سنسان جگہ پر ہم سے کوئی قابلِ تقریر "جرم سرزد کرواتی" ایک علد" مالی بردار ٹرک" کی گڑگڑاہٹ نے ہماری توجہ ہٹادی ٹرک جب نظروں کے سامنے سے گذر گیا تو اس کی پشت پر کندہ جلی تحریر پر ہماری نظر پڑی لکھا تھا۔ "یا رب تیرا سہارا"

گویا خاموشی خاموشی میں وہ ٹرک ہمیں اس بات کی تلقین کر گیا کہ اب صرف رب ہی کا سہارا ہے۔ اُس روز پہلی مرتبہ ہمیں لاریوں ٹرکٹروں و دیگر چلتی پھرتی مال بردار گاڑیوں کی پشت پر جلی حرفوں میں کندہ بے وزن اشعار اور حیرت انگیز کلمات" کی افادیت کا اندازہ ہوا۔ یہ جدید کلمات، یہ بے وزن اشعار دراصل عجیب و غریب الجھنوں میں پھنسے، مجبور و بے بس انسانوں کے حق میں تلقینِ صبر و تاکیدِ ضبط کا بروقت اور موثر ذریعہ ہوتے ہیں ــــــ

اگر وہ "مال بردار ٹرک" مع اُس کلمۂ صبر و تلقین کے بروقت وہاں سے نہیں گزرتا تو ہو سکتا تھا ہم "ایکو پوائنٹ Echo Point" کی بلندی سے مع شبّو کے نیچے چھلانگ لگا دیتے ــــ ہم گھر سے یہی سوچ کر چلے تھے کہ کھلی فضا میں پہنچ کر ذہنوں میں بسیرا لیتی ہوئی گھٹن دُور ہو جائے گی چنانچہ اس نیت سے شبّو کی دیما یہ" ایکو پوائنٹ" عرف" مقام بازگشت" کا رُخ کیا تھا۔ جو اس علاقے کا سب سے خوب صورت پوائنٹ تھا ـــ قومی شاہراہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر پہاڑی سلسلے کے روبرو ایک چھوٹا سا سطح "قطع" تھا جس کے اطراف سفیدی کئے ہوئے پتھروں سے حصار بندی کر دی گئی تھی۔ اس قطعہ، کے بالکل نیچے گہری کھائی تھی جو مقامی طور پر "موت کی وادی" کے نام مشہور تھی۔ پچھلے دنوں سنا ہے یہاں لگاتار پانچ ہے جین واقع ہوئی تھیں جس کی وجہ سے لوگ اب اس طرف رُخ کرنے سے کترانے لگے تھے کبھی کبھار سیاحوں کا کوئی بھولا بھٹکا جتھا اس طرف نکل آتا تھا ورنہ بقول شبّو عام طور سے یہ جگہ ویران ہی پڑی رہتی ہے اور یہاں دن میں بھی الّو بولتے ہیں ـــــ

جس طرح ایک جنگل میں صرف ایک ہی شیر کا راج ہوتا ہے اُسی طرح ہمارے خیال میں کسی ویرانے میں صرف ایک ہی الّو کو بولنا چاہئے چنانچہ اپنے اس خیال کو مزید تقویت پہنچانے کے لئے ہم نے "ایکو پوائنٹ" کے اس مخصوص قطعہ" کا رُخ نہیں کیا بلکہ اس قطع سے کافی فاصلے پر قومی شاہراہ سے نزدیک بڑ کے گھنے درخت کی چھاؤں کا انتخاب کر کے اس کے نیچے ہی ڈیرا ڈالا گیا جس وقت ہم یہاں پہنچے تھے دھوپ میں تمازت نام کو نہیں تھی۔ لیکن اب دھوپ کی شدّت بڑھ چکی تھی چنانچہ شبّو نے جیسے ہی اٹھنے کی تجویز پیش کی ہم فوراً تیار ہو گئے ـــ

البتہ جس مقصد کے تحت ہم یہاں آئے تھے اس میں تھوڑی سی کامیابی ضرور ہوئی ویسے "لفظ مقصد" کو غلط معنی مت پہنائیے، شبّو کے ساتھ تنہا آنے میں نعوذ باللہ ہلذا یہ مطلب ہرگز پوشیدہ نہیں تھا کہ انھیں اپنے بازوؤں میں بھر لیں اپنے سینے سے لگالیں، ـــ مقصد سے ہماری مراد تھی، گھر کے ماحول پر چھانے والی جان لیوا گھٹن کا خاتمہ، اور ذہن کے جن دریچوں سے وہ گھٹن، دبے پاؤں داخل ہو رہی تھی، ان دریچوں کے بند ہونے کا ثبوت تھی شبّو کے ساتھ ہماری یہ ہلکی فضا میں ہونے والی "سَیر" جس کی وجہ سے شبّو کے دل کا غبار بڑی حد تک کم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کھلی فضا کے ساتھ ساتھ غالباً اس احساس نے بھی شبّو کو کافی طمانیت بخشی کہ زندگی کی اس کشمکش اور گھر کے پُرسکون ماحول میں مردار گدھ کی طرح اپنے نوکیلے پنجے پھیلانے والی گھٹن سے مقابلہ کرنے کے لئے اب وہ اکیلی نہیں ہیں بلکہ ہم بھی ان کے ساتھ ہیں ـــ جب اکیلے تھکے ہارے انسان کو کوئی راز دار غم گسار مل جاتا ہے تو پھر وہ ہر آزمائش سے ہنستے ہوئے گزر جاتا ہے ـــ"!

"مسٹر شہزاد" آپ مجھ سے اس طرح کیوں بات کرتے ہیں جیسے کوا غلیل سے یا ـــ" بات ادھوری چھوڑ کر منہ چھپا کر خوب ہنسنے لگیں۔ بڑی

عجیب قسم کی ہنسی تھی ۔ ہنسی کی ایک عجیب کھنک کا ردعمل یہ ہوا کہ ہمیں اپنے رگ و پٹھوں میں عجیب سی گدگداہٹ محسوس ہونے لگی۔ "ہشات" کے بند "دریچوں" پر ہلکی ہلکی "دستک" سی سنائی دینے لگی۔ ہم نے گڑبڑا کر کہا ــــ

"بات دراصل یہ ہے محترمہ ...... کہ آ ...... میرا مطلب ہے عقیل ...... میرا مطلب ہے مسز ...... میں دراصل اب تک اس الجھن کو سلجھا سکا کہ آپ کو کس نام سے مخاطب کروں ......"

"کیا نام لے کر مخاطب کرنا ضروری ہے ــــ؟" محترمہ نے معنی خیز انداز میں لقمہ دیا اور پھر بے تحاشہ ہنسنے لگیں یہاں تک کہ ان کی آنکھیں ئیں۔ پتہ نہیں یہ واقعی آنسو تھے یا ــــ "محترمہ نے آگے کہا ــــ "میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ میں لوگوں کے لئے خواہ مخواہ الجھنیں کھڑی کر دیتی ں ــــ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں بجائے خود ایک الجھن ہوں ــــ" بات ختم کرتے ہی پھر ان پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اور ہمیں اپنی خواہشات ے بند دریچوں کی خیر نظر نہیں آ رہی تھی ــــ!

ہم اس وقت بڑے پھنسے تھے ــــ شبلو کسی سہیلی کے ساتھ شاپنگ کی غرض سے گئی ہوئی تھی، اور قبلہ چچہ خوب تو اب تقریباً حجرہ نشین ئے تھے صرف کھانے کی میز پر نظر آتے تھے وہ بھی ایک دم بجھے بجھے خاموش ــــ بے دھڑک شاید معمول کے مطابق مہرگنگی کھاٹن "پہاڑن" کو رومانی شقیہ اشعار سنانے گیا ہوا تھا۔ اس وقت گھر میں سوائے ملازموں کے کوئی نہیں تھا۔ اور ملازم بھی شائد اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ یا ہماری شامت نے پکارا تھا جو شبلو کے اصرار کے باوجود ہم نے شاپنگ کی مہم میں ان کا ساتھ دینے سے معذرت کر لی تھی۔ اس وقت طبیعت واقعی بڑی کسل مندی اور پستی سی محسوس ہو رہی تھی کچھ دیر کے لئے لیٹنے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔ جب گھنٹہ بھر تک "قیلولہ" فرمانے کے بعد بیدار ے تو کمرے میں اکیلے بوریت محسوس ہونے لگی۔ ہاتھ منہ دھو کر حسب عادت "چائے خوری" کی غرض سے لان میں پہنچے اور سیدھے مسز چچہ خوب تھے چڑھ گئے ــــ

ملازم کے چائے کی ٹرے پہنچا کر لوٹتے ہی مسز چچہ خوب پیالیوں میں چائے انڈیلنے کی غرض سے اس قدر آگے جھک آئیں کہ ہماری نظروں ا پہاڑوں کا سینہ چیر کر "بے پناہ بلندیوں" سے "بے اختیار گہرائیوں" میں گرنے والے آبشاروں" کا نقشہ گھوم کر رہ گیا۔ کیا قیامت کی گہرائیاں تھیں، آدمی بس ایک بار ان میں ڈوبے تو پھر کبھی نہ ابھرے ــــ ہم نے مارے گڑبڑاہٹ کے پانی کا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ چڑھا گئے ــــ

"معلوم ہوتا ہے مسٹر شہزاد آپ ابھی تک نارمل نہیں ہوئے ــــ؟" موصوفہ کے اس اچانک حملے پر ہماری گڑبڑاہٹ بجائے کم ہونے کے کچھ اور بڑھ گئی اور ہم صرف کھنکار کر رہ گئے ــــ محترمہ ویسے بھی گہری نظروں سے ہمارا جائزہ لے رہی تھی، اس جائزے میں مزید گہرائی و گیرائی پیدا کرتے ہوئے بولیں ــــ "مسٹر شہزاد آپ تو ــــ آپ ــــ میں بھی کتنی عجیب ہوں، تمہیں جب سے آپ آپ کہہ کر مخاطب کئے جا رہی ہوں، اور تم نے ٹوکا بھی نہیں ــــ؟ تم تو میرے شوہر کے قریبی دوست کے صاحبزادے ہو یعنی میرے شوہر کے بھتیجے ہو اس اعتبار سے میں بھی تمہاری بزرگ ہوئی ــــ ہوں نا بزرگ ــ؟" جملہ ختم کرتے کرتے پھر وہی ہذیانی ہنسی کا دورہ پڑ گیا، جس نے اس بار کہیں بھی خفقان ں مبتلا کر دیا۔ ابھی ہنسی تھمنے بھی نہیں پائی تھی کہ فرمایا ــــ "تم نے کسی کو دیکھا ہے جوانی میں بزرگی اور بڑھاپے کا رتبہ پاتے ہوئے ــــ ہیں نا ــــ مجھے دیکھو ــــ میں تمہاری بزرگ ہوں ــــ!" محترمہ کی دم توڑتی ہوئی ہنسی نے پھر زور پکڑ لیا۔ اور ہم نے اس حملے کو "کم زور" کرنے کے لئے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا ــــ

"ہمارے معاشرے میں عمر کے لحاظ سے نہیں بلکہ رشتے کے اعتبار سے کسی بزرگ سمجھا جاتا ہے، اس لئے آپ کو اس قدر سیریس نہیں

ہونا چاہیئے ـــــــ ؟"

"اودھ ہل وِدھ یُوَر رِشتہ (Hell With Your Rishta)" ـــــــ "محترمہ نے جھلا کر کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔"
بزرگی کا یہ لیبل صرف اس قصور کی پاداش میں کہ اپنی جوانی کی پرواہ کیئے بغیر ایک روشن خیال حساس دل لڑکی اپنے سے دگنی عمر کے بوڑھے کا دل رکھنے کے لئے اس سے شادی کر لیتی ہے ـــــــ اسے کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال، لوگ کسی کے بُرے وقت میں زبانی ہمدردی کے روادار نہیں ہوتے اور میں نے ایک ضدی بوڑھے کی بچکانہ خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس سے شادی کر لی اور بڑھاپے کی چوکھٹ پر اپنی جوانی کی قربانی کا صلہ بزرگی کا یہ لیبل ـــــــ بوڑھے شوہر کی نوجوان بیوی ہونے کی تہمت ـــــــ"

تیسرے بوڑھے شوہر کی دوسری بیوی کا کہنا زیادہ صحیح ہوگا ـــــــ " ہم میں پتہ نہیں کس طرح اتنی ہمت جمع ہوگئی جو دیکھتے ہوئے اس لو ہے ایک اور ضرب لگا دی، دراصل یہ تازہ اطلاع ہمیں پچھلی رات میں ملی تھی اور اس نئی خبر کو اگل دینے کے لئے ہم شاید بے حد بے تاب تھے چنانچہ اسی بے تابی نے ہمیں کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا اور یہ خبر جس کے متعلق تھی اس کے آگے اگل دیا ـــــــ
اُدھر محبوب اچانک چپ لگ گئی یوں لگتا تھا جیسے ہماری اس اطلاع نے انھیں سر سے پیر تک پتھر کا بنا دیا ہو۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں سر ابھارنے لگے کہیں اس خبر نے مسز چیّہ خوب کی حرکتِ قلب تو نہیں بند کر دی۔
اس سے پہلے کہ یہ وسوسے ہماری حرکتِ قلب پر کوئی برا اثر ڈالتے، اُدھر مسز چیّہ خوب کے وجود میں زندگی کے آثار نمودار ہونے شروع ہوگئے۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں حرکت میں آئیں، دو چار ٹھنڈی سانسیں ناک کے نتھنوں سے آزاد کرنے کے بعد محترمہ کے ہونٹوں پر مُردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یوں لگتا تھا جیسے محترمہ ابھی ابھی میلوں کا سفر پیدل طے کر کے آئی ہوں ـــــــ بڑی تھکی تھکی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ لبوں میں جنبش ہوئی اور دھیمے لہجے میں کہا ـــــــ " سچ بڑا کڑوا ہوتا ہے، اسے قبول کرنے میں انسان کا کلیجہ خون ہو جاتا ہے، اور میرا کلیجہ تو اب چھلنی ہو چکا ہے پھر بھی جب ایک نئی چوٹ لگتی ہے، تازہ وار ہوتا ہے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے سارا وجود جیسے مفلوج ہو جاتا ہے ـــــــ کتنا سچ کتنا درست کہا ہے تم نے، تیسرے بوڑھے شوہر کی دوسری بیوی ـــــــ بیوی نہیں بلکہ الجھن کہنا زیادہ صحیح ہوگا ـــــــ نوجوان الجھن ـــــــ کاغذی ناؤ میں جیسے ایک دہکتا ہوا انگارہ ـــــــ " محترمہ کی مردہ سی ہنسی میں پھر سے جان پڑنے لگی، کھنکھناہٹ بتدریج بڑھنے لگی اور پھر بڑھتے بڑھتے اس نے پھر "ہذیانی" حدود کو چھو لیا۔ اور ہم دم سادھے بیٹھے رہے ـــــــ اور جب ہنسی کا زور کسی قدر ٹوٹا تو محترمہ بڑے ہی راز دارانہ لہجے میں فرمایا ـــــــ
"ایک راز کی بات بتاؤں ـــــــ ؟" اتنا کہہ کر وہ اپنی کرسی پر آگے اس قدر سرک آئیں کہ ان کی اکھڑی ہوئی سانسوں کی "دھمک" میں اپنے کانوں کے ذریعے جسم کے "روئیں روئیں" میں محسوس ہونے لگی، محترمہ کی "صلاحیتوں" کا زیر و بم" ہمارے رگ پٹھوں کو "زیر و زبر" کرنے لگا۔ بڑی بڑی آسیبی آنکھوں میں عجیب سی، ان بجھی، ان مٹی پیاس لہریں لیتی نظر آنے لگی، اِدھر ہمارے حلق میں کانٹے میں چبھنے لگے، وہ کھسر پھسر والے انداز میں بولیں ـــــــ " بستی میں جتنی بھی مال دار بوڑھیاں ہیں، وہ مجھ سے یوں لرزتی ہیں تھرتھراتی ہیں جیسے میں ان کے کھوسٹ شوہروں کو ان سے چھین لوں گی ـــــــ وہ سمجھتی ہیں میں "کالا جادو" جانتی ہوں میرے بدن میں کہیں کوئی "مقناطیس" پوشیدہ ہے ـــــــ !"
چند ثانیوں کے لئے پھر ان پر ہنسی کا حملہ ہوا، جس کے فوراً بعد بڑے ہی عجیب لہجے میں ہماری آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے مثریہ انداز میں پوچھا ـــــــ " کیا سچ مچ میرے بدن میں "مقناطیس" پوشیدہ ہے ـــــــ ؟" اتنا کہہ کر اچانک انگڑائی لینے کے انداز میں ہاتھ اٹھایئے، محد

اس غیر متوقع "دلبری یلغار" پر ہماری نظریں، جن میں تمام تر احتیاط کے باوجود "للچاہٹ کے ڈورے" دوڑنے لگے تھے محترمہ کے "قیامت یت" بدن جائزہ لینے کی بجائے اپنے ہی پاؤں کے انگوٹھے کو گھاس سے شغل فرماتا دیکھنے پر مجبور ہوگئیں، حالانکہ محترمہ نے خود اپنی زبانِ مبارک سے "دعوت نظارہ" دی تھی، لیکن جس طرح "داعیٔ اجل" کو کوئی بھی ذی روح بخوشی لبیک نہیں کہتا اسی طرح اپنی تمام تر خواہش اور کوشش کے باوجود ہم اس "باصلاحیت ۔۔۔" داعیٔ بلاخیز" کو لبیک نہیں کہہ سکے ـــــ اُدھر وہ قیامت خیز انگڑائی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ موصوفہ نے مسکرا کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور اس شعر کی جیتی جاگتی تفسیر بن گئیں ـــ

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ　　دیکھا "کیسے" جو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

اور جب اس "کیسے" کی تلاش میں ہماری نظریں محترمہ کی نظروں کے تعاقب میں تو دیکھا کہ خان فولادی عرف طوطا پری بھاٹک سے ہو کر اسی طرف چلا آرہا تھا۔ مسز جذبہ خوب نے بڑی ہی آہستگی تمسخرانہ انداز میں کہا ـــــ "اس شخص کا نام پتہ نہیں کس نے خان فولادی رکھ دیا، میرا بس چلے تو میں اس کا نام بدل کر خان کاغذی رکھ دوں ـــــ ویسے سنا ہے تم نے پچھلے دنوں اس فولادی بچے کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ کیا واقعی اتنے جاندار ہو تم ـــــ ؟" محترمہ کے اس حملے پر ہم گڑبڑا گئے، وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں، خان فولادی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور ہم سے دوبارہ مخاطب ہوئیں ـــــ

"اچھا تو ڈارلنگ ـــــ ؟"

"جی۔ جی ـــ جی ـــ ؟" ہم جو کہ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس "گیٹ" جملے کی مار سہہ نہ سکے اور دوبارہ کرسی میں ڈھیر ہوگئے۔

"سوری! "محترمہ نے بڑا عجیب سا منہ بنایا اور آگے بولیں ـــ "ڈارلنگ سے میری مراد سوئیٹ ہارٹ، یا جانِ من نہیں تھی، پھر اس سے پہلے کہ میں تم سے وداع لوں، ایک مشورہ چاہتی ہوں، کچھ دنوں سے پتہ نہیں کیوں مجھے بار بار یہ خیال آرہا ہے کہ تمہارے "چاچا جان" قبلہ کو اب آزاد کر دینا چاہیئے اس سلسلے میں قیمتی مشورے سے ضرور آگاہ کرنا، دو دن کی مہلت کافی ہوگی نا ـــــ اچھا ـــــ سوئیٹ ـــ سوری، ـــــ بھتیجے ـــــ بائی بائی ـــــ" !!

ماہنامہ

شگوفہ

کی

ایک اور یادگار خصوصی اشاعت

مزاحیہ

ڈرامہ نمبر

چند خصوصیات

مزاحیہ ڈراموں کا جائزہ

اُردو کے مزاحیہ ڈرامے

ہندوستانی زبانوں کے

شاہکار مزاحیہ ڈرامے

(تراجم)

اور

کئی

دوسری دلچسپیاں

مزاحیہ ڈرامہ نمبر کے مہمان مدیر

ساگر سرحدی مشہور ڈرامہ نگار و فلم اسکرین پلے رائٹر

اور مکالمہ نویس

مزاحیہ ڈرامہ نمبر کے مضامین روانہ کرنے کا پتہ :

ساگر سرحدی

363/30 سردار نگر

3۔ سائن، بمبئی 400022

مزید تفصیلات کا متعاقب اعلان کیا جائے گا

پنچایت راج کا کلیدی کردار

آندھرا پردیش ہندوستان کی ان اولین ریاستوں میں سے ہے جنھوں نے ضلع کی سطح پر اور اس سے نیچے منصوبہ بند ترقی میں زور پیدا کرنے کی نیّت سے پنچایت راج کو رائج کیا۔ ریاست میں بلاک کی سطح پر ترقیاتی پروگراموں کی عمل آوری کے لئے پنچایت سمیتی کو مکمل طور پر ذمہ داری سونپی گئی ہے جبکہ ضلع پریشدوں کی حیثیت مشاورتی اور نگراں کار اداروں کی ہے۔

ریاستی حکومت نے پنچایت راج اداروں کو متعدد محکموں کے ذریعہ خصوصی مالی امداد فراہم کی ہے ۔ ۶۲ ۔ ۱۹۶۱ء میں دی گئی امداد ۱۳ کروڑ روپیوں کو بڑھا کر ۶۶ ۔ ۱۹۶۵ء میں ۴۱ کروڑ روپے اور ۶۹ ۔ ۱۹۶۸ء میں ۵۰ کروڑ روپے کر دیا گیا۔ ۷۷ ۔ ۱۹۷۶ء کے دوران میں امدادی رقم کی جملہ مقدار بڑھ کر ۹۳٫۵۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئی ۔

یقیناً پنچایت راج ادارے ہمارے مستقبل کی تشکیل جدید میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR/ No. 4-77-78.

مجلس مشاورت :-

راجندر سنگھ بیدی بھارت چند کھنہ خواجہ عبدالغفور نریندر لوتھر مجتبیٰ حسین

مجلس ادارت :

منظور احمد حمایت اللہ مسیح انجم

جنرل منیجر :

ممتاز احمد

طباعت :

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

بائنڈنگ :

محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس روبرو دربار حسینی پرانی حویلی

حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

زرِ سالانہ : ۲۰ روپے

بیرونِ ہند سے : ۳۰ شلنگ

فی پرچہ : ۱/۵۰ روپیہ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ شگوفہ ۳۱ نجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

فون ۵۲۰۱۶

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ
کراچی بیکری
معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ فون نمبر (43502)

(فہرست)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

دخل در نامعقولات (ڈرامہ)

مال مفت (انشائیے)

حق تو یہ ہے ..... (ترجمہ)

پورن (نظمیں)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

مشتاق احمد یوسفی

ایک کم پانچ* اور ایک اوپر تین کا فرق!

بینکاری کے اسرار و رموز تو کجا، ہم نے تو زندگی میں کسی مسلمان بینکر کا نام بھی نہیں سُنا تھا تقسیم ہند سے پہلے اس "آرٹ آف باؤنڈز" پیشے میں اعلیٰ ہی نہیں، ادنیٰ عہدوں پر بھی انگریز اور ہندو ، فائز تھے۔ البتہ مسلمانوں پر اپنی جمع جتھا سیونگ بینک اکاؤنٹ میں جمع کرانے پر کوئی پابندی نہیں تھی: اور بیچارے مسلماں سے فقط وعدہ سود! لیکن ہم دھوکے میں آنے والے نہیں۔ بزرگوں نے صدیوں پہلے کفایت شعاری کو ہندوانہ رسم سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔ سوئیٹ سے جن قوموں اور قبیلوں کا پیشہ گرا باسپہ گری (یعنی پہلے دشمن بنانا اور پھر انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتارنا یا وہ اس پر رضامند نہ ہو تو خود اُتر جانا) رہا ہو، وہ تجارت کو پتلی دال کھانے والے بقالوں کا حق سمجھ کر اس سے اجتناب کریں تو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ مہابلی اکبر نے بھی آخرکار محکمہ مال کا چارج راجہ ٹوڈرمل کو تفویض کیا اور فیضی کو بھگوت گیتا اور مہابھارت کے فارسی ترجمے میں جوت دیا۔ (بیربل کو البتہ راقم الحروف کے فرائض سونپے گئے کہ خبردار! منہ سے کبھی کوئی سنجیدہ بات نکالی تو وہیں۔ زبان گدّی سے کھینچ لی جائے گی) ایک ریت سی پڑ گئی تھی کہ مسلمان رؤسا اور جاگیرداروں کی آمدنی کا حساب تو ہندو منیم رکھتے اور خرچ کا حساب خود عدالت کو قرق کے وقت بنانا پڑتا تھا۔ اعمال کے حساب کتاب کا جنجال بھی ہم نے کراماً کاتبین کو اور متعلقہ آڈٹ منکر نکیر کو سونپ رکھا ہے۔ ہمیں روپیہ ہمیشہ کم ہی معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان ۲ اور ۲ کو ۴ نہیں، بلکہ ایک کم پانچ کہتا ہے، جب ایک اوپر ۳ کہتا ہے۔ یہ قول رابرٹ کلایو کے ایک ہم عصر سے منسوب ہے کہ روپیہ بچا کر رکھنے کے معاملے میں مسلمان چھلنی کی طرح ہوتا ہے اور ہندو اسفنج کی مانند۔

سوداگری کو کسرشان سمجھنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ دودمان تیموریہ پر جب ملک خدا تنگ ہوا تو اس کا آخری چشم و چراغ مہاجن سے قرض لے کر فوج کی تنخواہیں چکاتا اور اپنی غزلوں کی اصلاح کرنے والے اُستاد، نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کو چاندی کے طشت میں زربفت سے

*مشتاق احمد یوسفی کی خودنوشت سوانح "سرگزشت" کا سلسلہ

تورہ پوشش سے ڈھکا ہوا. سیم کے بیجوں کا توشہ بھیجا. تقسیم سے پہلے کے تین چار سو برسوں میں
خاص کر، برصغیر کے مسلمان نے تجارت کو اپنی شانِ قلندری کے خلاف سمجھا. اس لئے کہ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ
زراسی غفلت یالاپرواہی سے کہیں منافع نہ ہو جائے. چمڑے اور کھالوں کی ساری تجارت البتہ مسلمانوں کے ہاتھ میں
رہی، جس کی تین وجہیں تھیں. اوّل تو یہ اگلی مرحومین کی آخری نشانی تھی. جنہیں وہ بہ رغبت کھا چکے تھے. دوّم یہ کہ
ہندو اس کاروبار کو ناپاک سمجھتے تھے. سوم، خوش قسمتی سے ان تاجروں کا تعلق چنیوٹ سے تھا جو دلّی کے دربار
سے ہنوز دور تھا. ان کی سوجھ بوجھ کے سامنے مارواڑی بھی کان پکڑتے ہیں. مشہور ہے کہ چنیوٹی یا میمن پاگل ہو
جائے تب بھی دوسرے کی پگڑی اتار کر اپنے ہی گھر میں پھینکتا ہے. پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ.

حساب کتاب کا جنجال

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اردو کی داستانوں میں سوداگروں کا ذکر اگر کہیں آتا ہے
تو وہ محض قزاقوں سے لٹنے کے لئے. اور یہ بھی اس طور پر کہ پڑھنے والے کی
اخلاقی ہمدردی ہمیشہ لوٹنے والے کے ساتھ رہتی ہے. اردو غزل میں ہمیں یاد نہیں کہ کسی شاعر نے سوداگر کو
خیر کے ساتھ یاد کیا ہو. ہاں ایک نظم 'مثنوی زہرِ عشق' میں سوداگر در آیا ہے. وہ بھی فقط اس لئے کہ اس کی ایک
دختر تھی جو، خلافِ محاورہ، نیک اختر نہ نکلی. مگر جس سے آگے چل کر شاعر کو ردیف و قافیہ کی چولیں بٹھانے کے
علاوہ اور بھی بہت سے کام لینے تھے جن میں خلوت کی ملاقاتیں، ان کے لازمی نتیجہ میں خودکشی اور آخرالذکر
سے پہلے "پان کل کے لئے لگاتے جائیں" کا فریضہ شامل تھا:

جس محلّے میں تھا، ہمارا گھر
وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
ایک دختر تھی اس کی ماہ جبین
شادی اس کی ہوئی نہیں تھی کہیں

آخری مصرع میں جو نوید مسرت ہے بس اسی نے پچھلے تین مصرعوں میں جان سی ڈال دی ہے اور تو اور
عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی نے سود بڑھا کر لانے اور ٹوٹا گھاٹا پانے والے بنجارے کے ٹھاٹ باٹ کو مٹی میں
ملایا سو ملایا، تعلقات زناشوئی پر بھی ہاتھ صاف کر گئے:

دھن، پوت، جنوائی، بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی

بچپن کی بات ہے. شاید اسی لئے اچھی طرح یاد ہے. پورے قصبہ چاکسو (خورد) میں تجارت
وجارت تو بڑی بات ہے، کسی مسلمان کی پنساری تک کی دکان نہ تھی. ۱۹۳۳ء میں چند مسلمانوں نے قرض حسنہ اور
چندہ جمع کر کے سرمایہ فراہم کیا اور صولت یار خان ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس کو مسلمانوں کے محلے میں پرچون کی
دکان کھلوا دی اس زمانے میں کوڑیاں بھی چلتی تھیں. دھیلے کا گھی اور چھدام کے بینگن خریدتے غریبوں کو ہم نے
بھی دیکھا ہے. چھوٹے بینگن کا "جھونگا" اس کے علاوہ صولت یار خاں کو منافع سے تو دلچسپی تھی. لیکن حساب کتاب
کو مکروہ گردانتے تھے. دکان میں ان کی مسند تکیے، حقے اور ترازو کے سامنے آٹا، شکر، بیسن، نمک، مرچ،
دالیں مسالے، الٹی ہوئی آستین کی طرح اُدھ
کھلی بوریوں میں بھرے رہتے تھے. جو چیز جتنی بکتی اس کی قیمت اسی بوری یا کنستر پر مسالے سے ون پڑی رہتی تا کہ
حساب میں آسانی ہو. شام کو ہر جنس کی بکری کو علیحدہ علیحدہ گننے [illegible] دل نہیں چاہتا

بھی کھاتوں میں ایک نئی مد "بھول چوک لینی دینی" کھول لی تھی۔ روزانہ کیش میں جو کمی واقع ہوتی وہ اسی کے متھے مارتے ہوتے ہوتے اس مد میں کافی رقم چڑھ گئی جو تقریباً اصل سرمایہ کے برابر تھی۔ شب برات کی صبح مرزا عبدالودود بیگ جن کی عمر اس وقت سات سال ہوگی، چھ پیسے کی زعفران لینے گئے۔ زعفران کی پڑیا پاکر انہوں نے صولت یارخاں کو ایک کلدار روپیہ تھمایا۔ اتفاق سے زعفران کی بوہنی نہیں ہوئی تھی۔ اور اس کے ڈبے پر کوئی ریزگاری نہیں تھی۔ صولت یارخاں نے بندھی بندھائی پڑیا مرزا کے ہاتھ سے چھین کر کہا ہٹشت! ہمارے پاس ریزگاری نہیں۔ گوبند بنئے کی دکان سے خرید لے۔ مرزا نے انگلی سے ریزگاری کی ان ڈھیریوں کی طرف اشارہ کیا جو تقریباً ہر بوری اور کنستر پر پڑی تھیں۔ ارے صاحب وہ تو آپے سے باہر ہو گئے۔ دھمکی آمیز انداز سے دوسیری اٹھاتے ہوئے بولے "مرغی کے! دوسری ڈھیری میں سے ریزگاری نکال کے تجھے دے دوں تو شام کو حساب کون، کرے گا؟ تیرا باپ؟

ہمارا چوتھی کھونٹ جانا

بچپن میں ہم کبھی "کیریر" کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے تھے تو انجن ڈرائیوری کے سامنے بادشاہی بھی ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ نام خدا ذرا سیانے ہوئے اور دل سے جن، بھوت اور بزرگوں کا ڈر نکلا اور وہ جب دن آئے "جب سائے دھانی ہوتے ہیں جب دھوپ گلابی ہوتی ہے"؟ تو گھنے جنگلوں میں ٹارزن کی سی سادہ زندگی گزارنے کا عزم کیا۔ نہ امتحان کا کھٹکا نہ روز صبح کو منہ دھونے کا کھڑاگ۔ محبوبہ ایک گز بھی دور کھڑی ہو تو زور شباب میں اکیس گز کی چھلانگ لگانا۔ پھر دائیں بیں گز کی چھلانگ لگاکر پہلو میں پہنچنا اور چنگھاڑنا۔ جٹا دھاری برگد کی داڑھی یا یہ ہاتھ نہ لگے تو لنگور کی دم پکڑ کے جھوٹے لیتے ہوئے زوں سے ایک درخت سے دوسرے درخت اور ایک مقام سے دوسری دم تک پہنچنا۔ بن میں ترسے کو اکوئی یوں دھم سے نہ ہوگا! پھر اپنے اور حور صحرائی کے درمیان کوئی دریا، ظالم سماج کی طرح حائل ہو جاتا تو اسے اس کے والد یا مگرمچھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر پار کرتے۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ جو کہانی بھی پڑھتے اس کے ہیرو کا محبوب مشغلہ بلکہ محبوبہ تک کو اپنانے کا فیصلہ کر لیتے کسی کے منھ پر سہرا لٹکا دیکھتے تو واللہ تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ محسوس ہوتا گویا ہماری ذاتی حق تلفی ہو رہی ہے۔ اور اگر صلیبی جنگیں بند کرنے میں فریقین اور مولانا عبدالحلیم شرر اتنی عجلت سے کام نہ لیتے کہ ہمیں پیدا ہونے کا موقع تک نہ دیا۔ تو آج ہماری قبر قسطنطنیہ، رومانیہ، ہسپانیہ یا کسی اور ترقی یافتہ ملک میں ہوتی۔

ہم نے خود کو بہروپ، ہر سوانگ میں دیکھا تھا، سوائے بینکر کے یہ وہ چوتھی کھونٹ تھی جس طرف جانے کی داستانوں میں سخت مناہی ہوتی ہے لیکن جدھر جانے والا مر در جاتا ہے اور پچھتاتا ہے۔

حلال وحرام

"پڑھوگے لکھوگے بنوگے نواب، کھیلوگے کودوگے ہوگے خراب"۔ بزرگوں کی اس نصیحت اور علم نجوم سے لبریز پیشن گوئی پر سارا بچپن نچھاور کردانے کے بعد، جب ہماری باری آنے لگی تو یار لوگوں نے ریاستیں رجواڑے ہی ختم کر دیئے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آدمی ذرا اوریجنل ہو تو کھیلے کودے بغیر بھی خود کو خراب وخوار کرنے کی کوئی نئی راہ نکال ہی لیتا ہے تیسری جماعت تک ٹونک (راجستھان) میں خود پر تعلیمی تجربے کروائے۔ وہاں اسکول میں ظہر کی نماز باجماعت ہوتی تھی جیسے بے وضو ادا کرنے یا سجدے میں ہنسنے پر انگلیوں کے درمیان نیزہ کا قلم رکھ کر دبایا جاتا تھا جو اکثر اس سزا کی تاب نہ لاکر ٹوٹ جاتا تھا۔ قتل عمد کی سزا موت تھی۔ جلاد

جب ٹھراپی کر کر دن اترا تا تو تماشہ دیکھنے کے لئے شہر کا شہر امنڈ پڑتا۔ رقیق القلب لوگ سبز عینک لگا کر جاتے تھے جو اس زمانے میں صرف اس وقت پہنی جاتی تھی جب آنکھیں دکھنی آجائیں۔ اس سے خون بینگنی اور تلوار سبز نظر آتی تھی۔ محکمۂ قضاۃ اور عدالت شرع شریف بھی تھی۔ گو کہ اس کا دائرہ بے اختیاری سکڑتے سکڑتے طلاق اور آشنائی کے لذیذ قضیوں تک محدود ہو گیا تھا۔ (حیدرآباد دکن میں تو طوائفوں اور تاڑی پر نظر رکھنے والے سرکاری محکمے کو محکمہ بدعت کہتے تھے)۔ ٹونک میں دین اور شاعری کا بڑا چرچہ تھا جلاد اور امراء و شرفا کے علاوہ عام آدمی کو شراب پینے کی اجازت نہ تھی۔ خدا نہ سہی قاضئ شہر کا خوف ابھی دلوں سے دور نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ خلاف شرع کوئی کام کرنا ہو تو مسلمان اپنی ترکی ٹوپیاں اتار کر جیب میں رکھ لیتے ہیں ٹونک کے ایک سیلانی نواب زادے مصر اور ترکی گئے تو اس بات پر بہت متعجب ہوئے کہ وہاں تو مسلمان نماز بھی ٹوپی اتار کر پڑھتے ہیں۔

ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سود جسے حرام ٹھہرایا گیا ہے اور ربا جس کی حرمت میں ہمیں آج بھی شمہ برابر شبہ نہیں، ہمارا ذریعہ معاش ہی نہیں۔ بلکہ ہر اعتبار سے غالب کار آفریں کارکشا و کارساز ثابت ہوگا۔ والد مرحوم پاکستان آنے لگے تو اپنے پوسٹ آفس سیونگ بینک اکاونٹ میں ساڑھے چار ہزار روپے چھوڑ آئے تھے جو ان کے حساب سے بیس سال کے سود کی رقم بنتی تھی۔ وہ کبھی ایسے مسلمان کے ہاں دعوت کھانا تو بڑی بات ہے، پانی پینا بھی حرام سمجھتے تھے جس کے متعلق انھیں معلوم ہو کہ وہ اپنے اکاونٹ پر سود لیتا ہے۔ انہوں نے ایک دن امام ابوحنیفہ کا قصہ سنایا تھا کہ ایک شخص کی تدفین کے بعد لوگ ایک مکان کی دیوار کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ مگر امام ابوحنیفہ دور چلچلاتی دھوپ میں کھڑے رہے۔ کسی نے پوچھا حضرت! آپ سائے میں کیوں نہیں آجاتے؟ آپ نے جواب دیا اس مکان کا مالک میرا مقروض ہے اگر میں اس کے سایۂ دیوار سے فائدہ اٹھاؤں تو ڈرتا ہوں کہ روزِ حساب اس کا شمار سود میں نہ ہو جائے۔

خیال آیا کہ ملازمت مل بھی گئی تو ایسے باپ کو یہ کیسے بتائیں گے کہ چھ ہندر نے بہر طور روٹی کمانے کے لئے کیا کسب اختیار کیا ہے۔ وہ ریاست ٹونک میں پولیٹکل سیکرٹری رہ چکے تھے۔ ریاستی خوبوتے میرا، پابند شرع، سادہ دل مسلمان تھے۔ کٹّے، بے عمل نہ تھے۔ جے پور کے پہلے مقامی مسلمان تھے جس نے ۱۹۱۴ء میں بی اے کیا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ ٹونک میں بڑے کنویں کے سامنے ہماری لق ودق حویلی میں ہز ہائی نس نواب حافظ سر ابراہیم علی خاں، والئ ریاست کے درجنوں فوٹو ہر اس جگہ ٹنگے تھے جہاں کیل ٹھونکنے کے خدشہ کے ٹھونکی جا سکتی تھی کہ ساری دیوار نہ آن پڑے۔ انہوں نے ہر ایک کی ناک چاقو سے چھیل دی تھی، اس لئے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ شبیہ مکمل ہو تو اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ ساتھ امراء صاحبزادگان اور درباریوں پر مشتمل ایک گروپ فوٹو، جس میں وہ خود بھی شامل تھے، ایک طاقچے کی زینت تھا۔ اس کا بھی وہی نقشہ تھا۔ ناوک نے تیرے ناک نہ چھوڑی زمانے میں! نواب صاحب، جو اسی پیٹے میں ہوں گے، خود بھی حافظ و متشرع، تہجد گزار، سادہ نیک طینت مسلمان تھے۔ اپنی ناک آپ چھیلتے۔ تبھی رحمیں سے انہوں نے جو اپنی قد آدم پینٹنگ بمبئی جا کر بصرف کثیر بنوائی تھی، اس کی ناک انہوں نے اپنے جدِ اعلیٰ امیر خاں لیٹرے کی قزلی سے اڑوا کر میں وہ چھپیلی تھی۔ رعایا کو اس خدا ترس، دردر

منش فرمانروا سے بے پناہ عقیدت تھی۔ چنانچہ مرحوم کو پیدائش کے بعد ہمیں اس وقت تک کوئی کپڑا نہیں پہنایا گیا جب تک عشرہ کے بعد اس بزرگ کی اُترن کے تبرّک سے ہمارا پہلا کُرتہ نہ سِل گیا۔ خدا علیم و خبیر ہے۔ وہی جانتا ہے کہ اس عقیدت و ارادت میں مصلحت و مصاحبت کو کتنا دخل تھا۔ ہم نے اپنے ہوش میں پہلی دفعہ جے پور کا میوزیم دیکھا تو بڑا تعجب ہوا کہ صدیوں پرانی مورتیاں اور بُت البرٹ ہال کے کاریڈور میں قطار اندر قطار سجے ہیں۔ ہر طرح صحیح و سالم لیکن ناک ہر ایک کی ٹوٹی ہوئی جب ذرا سوجھ بوجھ پیدا ہوئی تو سمجھ میں آیا کہ اس آذرکدے سے ہر دور، ہر صدی میں نام بدل بدل کر کوئی ابراہیم علیماں مع اپنے مشیر با تدبیر کے گزرتا رہا ہے۔

ہمارے برہمچاری آشرم میں چھ ہفتے کی توسیع

تم یہ پیشہ کیوں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ کوئی معقول وجہ؟ ذہن پر بہتیرا زور دیا۔ وہ اگر معقول کی قید نہ لگاتا تو ہم ایک ہزار ایک وجوہات گِنوا سکتے تھے۔ اور اگر اس نے ہماری سچ بولنے کی عادت کو اس شدت سے نہ سراہا ہوتا تو ہم یہ جھوٹ بول کر پیچھا چھڑا لیتے کہ حساب کتاب سے ہمیں پیدائشی لگاؤ ہے لیکن یہ امر واقع ہے کہ بزرگ ہمارے حساب کے نمبر دیکھ کر مشتعل ہو جاتے اور ہر سوال پر صفر کو صحبت بد کا ثمرہ سمجھتے۔ (حاشا و کلّا! مرحوم بزرگوں کی خطا کی گرفت کرنا ہمارا کام نہیں، فرشتوں کا فرض ہے۔ لیکن صحبت بد کی وضاحت اور "ریکارڈ درست رکھنے" کی خاطر خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتے ہیں کہ جتنی بھی گالیاں ہمیں یاد تھیں وہ سب ہم نے اپنے بزرگوں اور ماسٹروں ہی سے سیکھی تھیں) ان دنوں ہمیں اس کا بڑا ارمان تھا کہ کاش ہمارے سر پہ سینگ ہوتے تو بزرگ ہمیں کم از کم گدھا تو نہ سمجھتے، مرزا کے ددھیالی بزرگ تو ان کی پیٹھ پہ باکسنگ کی مشق بھی کرتے تھے۔ ساتویں جماعت میں جب ہمیں انگریزی میں ۱۰۰ میں سے ۹۱ اور حساب میں پندرہ نمبر ملے تو ہم نے گردھاری لال شرما سے رجوع کیا جس نے بالکل یہی نمبر حاصل کئے تھے۔ مضامین کی ترتیب البتہ اُلٹی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا ریاضی داں راما نج رات کو چراغ کی روشنی میں اس طرح پڑھتا تھا کہ ایک ڈوری سے اپنی چوٹی کو چھت کے کڑے سے باندھ لیتا تھا تاکہ نیند کا جھونکا آئے تو آنکھوں کے آگے بجلی سی کوند جائے لیکن ہم نے اسے بتایا کہ ہماری چھت کے کڑوں میں تو پہلے سے ہی فرشی پنکھا لٹک رہا ہے، جسے صرف بقرعید پر اتارتے ہیں تاکہ قصائی ان میں بکرے لٹکا کر کھال اتار سکے۔ بغل تک ہاتھ اور بند مٹھی کھال میں گھسا گھسا کر گردھاری لال شرما نے ہاتھ جوڑ کر ہمیں مزید تفصیلات میں اترنے سے روکا اور اپنی تجویز فوراً واپس لے لی۔

کچھ دیر بعد کہنے لگا کہ چنتا نہ کرو۔ بچار کر کے کل تک کوئی اور اُپائے نکالوں گا۔ دوسرے دن اُس نے اپنا بچن پورا کیا اور حساب میں ۹۱ نمبر لانے کے دو گر بتائے۔ پہلا تو یہ کہ بھوگ بلاس سے دُور رہو۔ آج سے پرتجّیہ کر لو کہ امتحان تک برہمچریہ کا پالن کرو گے۔ ہتھیلی کا مناپیش یا چنچل بچار پلٹ بھول دیں تو تین دفعہ "اوم! شانتی! شانتی! شانتی!" جپو۔ اس سے بیاکل ساگر اور بھڑکتا جوالا مکھی بھی شانت ہو جاتا ہے۔ اوم! شانتی!

شانتی! شانتی!

ہم نے کہا نہ بابا! یہ ہم سے نہ ہوگا۔ بولا بھائی جی! تم مسلے ہوتے ہو بڑے کٹھے۔ ہم نے کہا یار! یہ بات نہیں۔ ہمیں تو اس سے شانتی کھتا یاد آنے لگی تھی۔ بولا نا! نا! پھر تو سوتے میں پڑا سنے پڑے کی لسی پی لینا۔ کسی کو ٹوک جائے تو پلا تے ہیں۔ اور جیسے ہی سندر سپنا دکھائی دینے لگے تو انڑ دل میں ہی اُٹھ کھڑے ہونا اور ایک لال مرچ کی دھونی لے لینا۔ ایک پل' ایک چھن کے لئے بھی استری کا دھیان من میں نہ لانا۔

"کوئلے سے گرم ہونے والی کا بھی نہیں؟" ہم نے وضاحت چاہی۔

"پاس ہونا ہے تو برہمچریہ کا پالن کرنا ہوگا۔"

خیر۔ اس شرط سے تو ہم زیادہ بددل نہ ہوئے۔ اس لئے کہ بارہ برس کی عمر میں ڈیڑھ دو مہینے اور برہمچاری رہنا کچھ ایسا دشوار نہ تھا۔ ہم نے حق الامتحان کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرا گُر یہ بتایا کہ چوٹی کا کشٹ نہیں اٹھا سکتے تو سر پر باریک مشین پھروالو۔ اور بیچ میں اُسترے سے منڈوا کر ایک پان بنوالو اور اسے سردلی آم کی گٹھلی سے رگڑوا دو۔ ساری بھوسی جھڑ جائے تو اس پر گائے کے مکھن کی ٹکیہ رکھ کر کھلے آکاش تلے سوال نکالا کرو۔ ہاں! تالو اسی کارن منڈواتے ہیں کہ دھرماتما ڈکے پران کھوپڑی کے رستے ہی نکلتے ہیں۔ پھر اس کا چمتکار دیکھنا۔ میری چوٹی ٹائیفائڈ کے بعد جھڑ گئی تھی۔ میں نے تو یہی کیا۔ اور یار میاں جی! ساد ھارن جیون بتانا سیکھو۔ گرم چیزوں سے ایک دم پرہیز' گوشت' گرم مصالحے' گڑ کی گجک' اور اُردو گجل سے چالیس دن الگ رہنا۔

اس کے بدلے' انگریزی میں ۹۱ نمبر حاصل کرنے کا جو نسخہ ہم نے اس رامانج کے لئے تجویز کیا اس میں صرف وہ اجزا شامل تھے جن سے اس نے ہمیں پرہیز کرنے کی تاکید کی تھی۔ بہر حال ہم نے اس کی ترکیب پر ۱۲' ۱۳ شب عمل کیا' جس میں یوم الحساب کی چاندرات بھی شامل تھی۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ کھلے آسمان کے نیچے پان اور اس کے متصلہ علاقے کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگتی تو آنکھیں آٹھ بجے آپ ہی آپ بند ہو جاتیں۔ بڑے بڑے خیال آنے کا انتظار ہی رہا۔

ہمیں تو نیند ہی آئی شباب کے بدلے

سمندری موت کی ہوائی موت پر فضیلت

مسٹر اینڈرسن نے آخری مرتبہ بڑی دھیرج سے سوال کیا "تم اس پیشے میں کیوں آنا چاہتے ہو؟ میں یہ سوال تمہیں انٹرویو میں فیل کرنے کے لئے نہیں پوچھ رہا ہوں۔ اگر یہی منشا ہوتا تو میں یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ بتاؤ اس کُتے کے والد کا کیا نام ہے؟ ہو! ہو! ہو!"

"میرا تقرر مسٹر ایم اے۔ اصفہانی نے اورینٹ ایرویز میں کیا تھا۔ میں سول سروس چھوڑ کر ہندوستان سے کراچی آیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ حال ہی میں ایک ہوائی جہاز گر گیا ہے۔"

"تم پائلٹ ہو؟"

"نہیں تو! اس کو شپ میں ملازمت پانے کے لئے [illegible]"

"You're telling me!"

"سر! مجھے یوں بھی ہوائی جہاز سے سخت نفرت ہے"۔ ہم نے جھوٹ بولا جبکہ سچ یہ تھا کہ ہم نے اپنی عمر صرف اس قدر تھا کہ مناباؤ سے کھوکھراپار تک ہندوستان و پاکستان کا سرحدی علاقہ ہم نے اونٹ کے کوہان پر بیٹھ کر طے کیا تھا۔ (اونٹ کے بقیہ حصوں پر دوسروں کا اسباب رکھا تھا)۔ انٹرویو کے دن تک ہماری ٹانگوں کا درمیانی فاصلہ اسی کوہان کے برابر یعنی ایک گز تھا جیسے کسی نے چمٹے کو چیر کر سیدھا کر دیا ہو۔

"ہاہاہا! عالی دماغ لوگ ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ مجھے بھی اس شیطانی ایجاد سے سخت چڑ ہے۔ سمندری سفر سے بہتر کوئی سفر نہیں۔ شاہی سواری صرف ایک ہے — اسٹیمر۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ چوبیس گھنٹے کا سفر چوبیس دن میں طے ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ یہ فری ڈرنکس ہیں تو، پچھلے تیس سال سے لندن سے ہمیشہ بحری جہاز سے آتا ہوں۔

AFTERALL, A SHIP-WRECK IS MUCH SAFER THAN AN AIR CRASH! DON'T YOU AGREE?

مجھے یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ تم بھی ہوائی جہاز سے الرجک ہو۔ آج سے تم خود کو بنک کا COVENANTED OF-FICER سمجھو!"

پسلی پھڑک اٹھی نگہ انتخاب کی

اس انٹرویو کو تیئس سال ہو گئے۔ ہمارا خیال کیا، پختہ یقین ہے کہ اس نے ہمیں بینک میں محض اس لئے ملازم رکھ لیا کہ ہمیں بھی ہوائی جہاز سے نفرت تھی۔ ہوائی کمپنی اور خدا ہمیں معاف کرے۔ ہمیں اس ایجاد سے ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ تادم تحریر ہم کسی ہوائی حادثے میں ہلاک نہیں ہوئے، جیسا کہ بہت سے ذہین قارئین نے اندازہ لگایا ہوگا۔ لیکن کبھی کبھی احمقانہ فقرے سے بھی آدمی کے دن پھر جاتے ہیں، بشرطیکہ سننے والا بھی اس صنفِ سخن کا قدرداں ہو۔ اینڈرسن کم و بیش نو سال پاکستان میں رہا، لیکن لاہور محض اس لئے نہیں گیا کہ وہاں پانی کا جہاز نہیں جاتا۔ لاہور کو "کنٹری سائیڈ" کہتا تھا۔ حالانکہ اس کے اپنے آبائی گاؤں کی آبادی دو سو نفوس پر مشتمل تھی۔ نصف آبادی وہسکی بناتی اور بقیہ نصف اسے پیتی تھی۔ خیر، ہم ٹوکنے والے کون۔ کنویں کے مینڈک کو تالاب کے مینڈک کا مذاق اڑانے کا حق نہیں پہنچتا۔ ہم خود اندرون سانگانیری گیٹ، جے پور کے رہنے والے تھے اور عرصہ دراز تک باقی ماندہ برصغیر کو OUTSIDE SANGANRI GATE سمجھتے رہے۔

ہماری سیہ پوشی

اس نے ہمیں تقرری پر مبارکباد دی۔ ہم نے بھی جی کھول کر اس کے حسنِ انتخاب کی داد دی۔ ابھی ہم نے انگریزی کا دوسرا جملہ اپنے خراد پر چڑھایا ہی تھا کہ اس نے پوچھا:

"اسکاٹ لینڈ کی کس چیز کی ساری دنیا میں دھوم ہے؟"

"بیگ پائپ میوزک، وہسکی اور کنجوسی۔"

"اور؟" اس نے منہ بگاڑ کر پوچھا۔

"بل ٹیریر کتے، گاف کلب، KILT اور HAGGIS" ہم نے سب کچھ اُگل دیا۔

[KILT مردوں کا گھٹنوں سے اوپر تک کا اسکرٹ جو اسکاٹ لینڈ والے پہنتے ہیں۔

HAGGIS دل، کلیجی اور پھیپھڑے کو اوجھڑی میں بند کر کے دم پخت کرتے ہیں]

وہ انگارہ ہو گیا "معلوم ہوتا ہے تم نے اپنا سارا جنرل نالج ان گندے لطیفوں سے کشید کیا جو انگریزوں نے اسکاٹ لینڈ کے بارے میں گھڑ رکھے ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسکاٹ لینڈ کا سب سے مشہور چیز تمہارے سامنے بیٹھی ہے۔ اسکاٹ بینکر۔ ہمارا لوہا ساری دنیا مانتی ہے۔ ہم جب قرض دیتے ہیں تو اس میں سے سارا سود پیشگی مجرا کر کے دھروا لیتے ہیں۔ ہمارا سود کبھی نہیں ڈوبتا۔ اصل رقم بھلے ہی ڈوب جائے اور محتاط اور وہمی اتنے کہ جب تک یکم جنوری کے سورج کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں، اسکاٹ لینڈ میں کوئی شخص دیوار پر نئے سال کا کیلنڈر نہیں ٹانگتا۔ مجھے تو تمہاری خوش نصیبی پر رشک آرہا ہے کہ تم ایک اسکاٹ بینکر سے اس پیشے کی ابجد سیکھو گے۔ اولین فرصت میں لندن سے RAE'S COUNTRY BANKER منگا کر حفظ کر لو۔ ہمارے پیشے کی بائبل ہے۔ اس کے علاوہ لارڈ چیسٹر فیلڈ کے خطوط پڑھا کرو۔ دو سو سال سے ان کا شمار کلاسکس میں ہوتا ہے۔ پندرہ نصائح اور 'ورڈلی وزڈم' (فراستِ ارضی) سے بھرپور اخلاقیات، نفسیات اور آدابِ مجلس کے بڑے باریک نکتے" ملیں گے۔ خونِ جگر سے لکھی ہوئی یہ کتاب مجموعہ ہے ان خطوط کا جو انہوں نے بتیس سال کی مدت میں اپنے NATURAL SON کو لکھے تھے۔ جانتے ہو، انگریزی میں ناجائز اولاد کو فطری بیٹا کہتے ہیں؟ اس لحاظ سے ہم تم غیر فطری اولاد ہوئے۔ ہا ہا ہا!"

اُس کا موڈ بدل چکا تھا۔ ہم رخصت ہونے لگے تو اس کے کتے نے پھر اٹھ کر ہمیں چاپلوسی کی اور رسوم کیں، اور دروازے تک دُم اٹھائے مشایعت کو آیا۔ ہم دروازہ کھول کر نکلنے والے ہی تھے کہ "لے مومنٹ!" کہہ کر واپس بلا لیا۔ رب العزت! اب کون سی کسر باقی رہ گئی؟ یہ ابا نتوں کا ٹھیکرا جسے پاپی کہتے ہیں، یہ تو کبھی کا بھر چکا۔ "اور اگر تم نفری رپیں سوٹ پہن کر ہی بھرے دفتر میں کراچی اسٹیم پر مصر ہو! جس کی وجہ اندر پھٹی قمیض بھی ہو سکتی ہے، ہا ہا ہا! — تمہاری خوشامد مجھے مقصود نہیں، لیکن ایمان ہے، اس سے زیادہ WELL-DRESSED SCARE-CROW میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ کچھ نہ ہتیا ہو سے تو یہ تیسکر رنگ کی بیاہ کا ایا چیتا نے رار سوگی اور ایسے ویسی کوئی کارشن بلاوٗ سنا آؤ ساری دنیا میں بینکروں اور کسبیوں کا روایتی پہناوا سیاہ لباس ہے سیاہ سوٹ پہنا کرو۔"

اور یوں ہماری زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ بلکہ بقول پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے ... اپنے ولادوست میاں محمد تقی کے ...
... کر جانا کے نام

مشتاق جلیلی*

دھنی کاکا

کردار

دھنی کاکا ______
گھنشام ______
شرفو ______

[دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز]

شرفو : (دور سے) گھنشام او گھنشام

گھنشام : (" ") کون ہو بھئی ؟

شرفو : (" ") میں شرفو ہوں کھول دروازہ

گھنشام : (" ") "اچھا بھائی اچھا!"

[دروازہ کھولنے کی آواز]

ﺻ ﺻبح صورت دیکھ لی تیری
تو میں کہنے جارہا تھا اب دیکھ آج روٹی ملتی بھی ہے یا نہیں
ہے !
ہا ہماری بلی ہمیں سے میاؤں میاؤں، اچھا بچو یہ تو
ات کدھر تڑپا دی !

شرفو : نائٹ شوٹنگ تھی یار، اکھڑ گئے رات بھر، ایکسٹرا کا مطلب کتے کا بڑا بھائی۔

گھنشام : چھوٹا بڑا چھوڑ، کیسہ تو گرم ہو گیا نا، پیارے آج ایک روپیہ اُدھار نکال دے بڑی کڑکی ہے۔

شرفو : پہلے کا ایک روپیہ دینا ہے تو

گھنشام : جہاں ایک وہاں دو لے لینا بھئی، ذرا اپنے دن پھرے لے ہیں آج کل۔

شرفو : جنم ہی پھرے لا ہے تیرا، لینا جانتا ہے، دینا نہیں جانتا تیرے ساتھ رہنے میں اپنا پاٹیا گل!

گھنشام : ابے جا! (اچانک گھبرا کر) ارے باپ رے، ذرا دیکھ شرفو یہ کون آیا ہے ادہر

شرفو : یہ تو دھنی کاکا ہے

گھنشام : مفلسی میں آٹا گیلا، جلدی سے کڑی مار دروازے کی۔

شرفو : چاہے سر مار، چاہے کڑی مار، آج کاکا اپنا قرض لئے بنا ٹلنے کا نہیں، تیسری چکر ہے اس کا۔

گھنشام : میرا نام بھی گھنشام ہے بندو، ایسا چکر چلاؤں گا کہ

چکر آ جائے گا کاکا کو، لینے کے دینے پڑ جائیں گے ــــ ایک چھلّی نکال جلدی ــــ

شرفو : چھلّی!

گھنشام : چونّی کا روپیہ لے مجھ سے، جلدی کر، وہ مصیبت کا ٹھیلہ آ رہا ہے

شرفو : یہ لے بابا

گھنشام : تھینک یو، اب تو کل جو فوٹو دکھا رہا تھا نا، وہ بھی دے مجھے ــــ

شرفو : وہ اکسٹرا لڑکی کی؟

گھنشام : ہاں، ہاں،

شرفو : مگر ... !

گھنشام : مگر کو ڈال دریا میں، چمتکار دیکھ فوٹو کا، بھگوان نے چاہا تو چاندی ہی چاندی۔ تیری سمجھ کے بیچ نہیں آنے کا بھئی ــــ

شرفو : لے بھئی لے،

گھنشام : تھینک یو پیارے، اب میں مارا، کھڑکی سے کودی، تو اتنا بول دے دھنی کاکا سے تمہارے پاس گیا ہے گھنشام۔

شرفو : شیطان تو شیطان، تجھ سے بھگوان بھی بھاگتا ہوگا۔

[زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز]

دھنی کاکا: (دور سے) گھنشام ہو، او گھنشام

شرفو : کون ہو بھئی، ارے تم دھنی کاکا، آ جاؤ نا اندر

دھنی کاکا: کدھر ہے وہ گھنشام کا بچہ، نکال اُسے اندر سے آج وہ ہے یا میں ہوں، سسرال ہے یہ! چھ مہینے کھسک گئے اور ایک پیسہ دینے کا نام نہیں اور کچھ چڑھ ہی جائے اوپر سے ایک آدھ روپیہ واہ!

شرفو : مگر سنو تو کاکا

دھنی کاکا: کاکا کی ایسی کی تیسی، اپنے جوڑی دار کو لا سامنے، نہیں تو گردن سے پَیر تک ناپ دوں گا۔

شرفو : اوپر نہیں ہے کاکا، وہ تو صبح صبح .. ..

دھنی کاکا: دیکھ شرفو آج اپنا مستغ گرم ہے ہاں تم دونوں مکر گرم مسالہ بنانا چاہتے ہو کاکا کا۔ ایک نوالہ میں ہضم کر جاؤں تم دونوں کو،

شرفو : تم خالی پیلی مجھے کیوں گھسیٹ رہے ہو؟

دھنی کاکا: اونہہ! ایک کے دو دو بناتے ہو تم دونوں، سچ بتا دے شرفو، وہ ہے کدھر گھنشام رنگ شاہ

شرفو : وہ تو صبح ہی تمہارے گھر گیا ہے کاکا،

دھنی کاکا: پھر وہی اُلٹی کی بات۔ میرے گھر جائے گا، اپنی منحوس صورت لے کر، آج کوئی چال چلنے کی نہیں۔ دہلیز پر گوند لگا کر بیٹھ جاؤں گا۔ پیسے لے کر نہ جاؤں آج تو تھوک دینا میرے مُنہ پر، میرا نام بھی دھنی کاکا ہے، دھنی

گھنشام : (دور سے) ہلو دھنی کاکا، تم اِدھر، میں اُدھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر .. ..

دھنی کاکا: رہنے دے چار بیسی اپنی۔

گھنشام : سنو تو کاکا!

دھنی کاکا: سُنّا وُنّا کچھ نہیں، پہلے رکھ دے میرے پیسے اتنے دس پھر دس بیس، پھر بعد میں پانچ ایک دن پانچ، ایک دفعہ پورے بیس روپے

گھنشام : تیس کے پچاس لے لو، اپن بھی دل والے ہیں۔

دھنی کاکا: تو بیس کے بیس دیدے مجھے بھئی۔

گھنشام : وہ پُچھو تمہاری مرضی، پر آج دو دن سے چکر کاٹتے کاٹتے اپنے پَیر تو گئے کام سے۔

دھنی کاکا: دیکھ گھنشام، یہ جھوٹا جھوٹا بات .....

گھنشام : میں بول رہا ہوں کاکا مستغ مت پھرا میرا، دھرم بول کل شام گھر پہ تھا۔

دھنی کاکا: کل شام؟

گھنشام : ہاں ہاں وہ پان والا لڈوں سے مقابلہ دون چل ...

دھنی کاکا: ارے کل تو منگل وار تھا، میں تو ہر منگل وار کو ... مہاراج کے درشن کرنے مندر جاتا ہوں۔

گھنشام : اب مجھے یہ کیا معلوم، یہ دیکھ کاکا، برفی کے ٹکڑے ... گئے تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔

دھنی کاکا: برفی کی نہیں، پیسے کی بات کر، پیسے کی۔

گھنشام : پھر وہی مستغ خراب کرنے کی بات، ذرا آنکھیں ... کر دیکھ ملیان سے مٹھائی لا رہا ہوں۔

نی کاکا : کلیان سے !

شام : تو خود بھیجا اور خود بھول گیا۔

نی کاکا : ئیں ! !

شام : گئے کام سے تو مجھے تڑی پار کرا کے چھوڑے گا' بمبئی سے کاکا۔

نی کاکا : دیکھ گھنشام ۔

شام : دھرم سے بول کاکا' تو نے شادی کرنے کی بات نہیں کی تھی مجھ سے ! یاد کر ۔

ھنی کاکا : ارے اس کو ہو گیا برس

نشام : تو کیا ہوا ؟ زبان دیا غلام' اپن تو اسی لفڑے میں پڑ گئے نا ! اب پرسوں کرشنا مل گیا تھا ۔ وہ رات پالی والا' بولا کلیان میں ایک لڑکی ہے ۔ گھر بھی کھاتا پیتا ہے میں بولا ابھی چل' شرفو بولا چالیس روپے ہاتھ سے نکل جائیں گے ۔ میں بولا کاکا کا فائدہ ہوتا ہے تو اپنا نقصان بھی' میں تو جھٹ کرشنا کو لے کر کلیان پہونچا ۔

ھنی کاکا : لڑکی کو دیکھا کیا ؟

نشام : دیکھا ! بات کر کے آرہا ہوں' تھوڑی شکل ملتی جلتی ہے ہیما مالنی سے ۔

ھنی کاکا : ہیما مالنی !؟

نشام : پھر' اب تو صاف بولا' ادھر تو مسکا پالش' چالیس برس کا دولہا ہے مگر بیس بیس برس کے لڑکوں کو بغل میں دبا لے تو چپ کر جائیں ۔

ھنی کاکا : پھر کیا ہوا ؟

نشام : بات پکی' تبھی تو یہ رہی برفی دُلہن کے گھر کی ۔

ھنی کاکا : (فوراً مٹھائی کھاتے ہوئے) گھنشام بڑی میٹھی ہے

نشام : اب تجھے تو کاکا سسرال کے گھر کا نیم بھی میٹھا لگے

ھنی کاکا : (ہنستے ہوئے) مگر لڑکی . . . . . .

گھنشام : دیکھ لینا ساتھ لایا ہوں آج ۔

دھنی کاکا : پھر کدھر ہے وہ

گھنشام : (فوٹو بتاتے ہوئے) یہ دیکھ' گھنشام کی کاکی ۔

دھنی کاکا : ہا ہا مجھے دے

گھنشام : اتنا نہ گھور کاکا' نظر لگ جائے گی کاکی کو' ارے یہ تو نقل ہے اصل دیکھو تو سات مالے سے کھلاڑی کھا کر سیدھے گراونڈ فلور پر ..

دھنی کاکا : پھر دیر کیا ہے !

گھنشام : تمہاری طرف سے ہاں یا نا ہونا منگتا نا' آٹھ کی گاڑی پکڑنی تھی اب نو ہیں ۔

دھنی کاکا : پھر جلدی کر' میری طرف سے یکدم ہاں' یہ لے پانچ روپے ٹکٹ کے اور یہ پانچ پرسوں کے خرچ کے

گھنشام : نہیں کاکا'

دھنی کاکا : میں بولتا ہوں لے اور یہ پانچ رکھ معلوم نہیں کیسا وقت آجائے' سمدھانے کا معاملہ ہے ۔

گھنشام : میں چلا کاکا ۔

دھنی کاکا : اور سُن پانچ روپے کی مٹھائی لے جانا ۔ یہ لے ۔

گھنشام : دو روپے کی بہت ہوئی کاکا ۔

دھنی کاکا : تو کیا ناک کٹائے گا میری' یہ لے پانچ کا نوٹ ۔

گھنشام : تیرا بھی جواب نہیں کاکا ۔ اچھا — ٹاٹا' بائی بائی چھیوری اُو

[آواز دُور ہوتی جاتی ہے]

ناظم انصاری

مریض وہ بھی تمہارے دکھائی دیتے ہیں ۔۔۔ کھڑے جو سب سے کنارے دکھائی دیتے ہیں
اگر ہو جیب میں نقدی تو حسن والوں کو ۔۔۔ بڑے میاں بھی کنوارے دکھائی دیتے ہیں
اودھ کی شام، بنارس کی صبح سے بڑھ کر ۔۔۔ تری گلی کے نظارے دکھائی دیتے ہیں
دکھائی دیتے تھے ہیرو جنھیں ابھی کل تک ۔۔۔ ہم آج انھیں کو کھٹارے دکھائی دیتے ہیں
قصور کیا ہوا ایسا، جو خون کے پیاسے ۔۔۔ تمہارے باپ ہمارے دکھائی دیتے ہیں
وہ اونچی کیٹیگری کے نہ ہوں گے دلوانے ۔۔۔ جو آگے پیچھے تمہارے دکھائی دیتے ہیں

کسی کے ایک طمانچے کا ہے اثر ناظم
کہ دن میں بھی ہمیں تارے دکھائی دیتے ہیں

قطعات

اعجاز وارثی سنبھلی

صنعتِ تضاد

دوشیزہ مل ہی جاتی ہے کوئی تلاش سے ۔۔۔ دیکھیسی، ہوتی ہے جو حرم میں تو شیخ کو
لیکن کمالِ فکر ہے یہ صنعتِ تضاد ۔۔۔ سن میں بڑے ہیں آپ سے داماد آپ کے

بھول گئے

ہے جو شیخ و برہمن کل اک وزیر کے ساتھ ۔۔۔ تو دونوں فرطِ مسرت سے پھول پھول گئے
کمالِ سحرِ سیاست! ارے معاذاللہ ۔۔۔ وہ پوجا بھول گئے، یہ نماز بھول گئے

فریبِ مسلسل

سدا بہار مسز ایکس کے شباب کی خیر ۔۔۔ ہزار طرح سے عمرِ رواں چھپاتی ہیں
اب اس فریبِ مسلسل کی داد کیا دیجے ۔۔۔ جوان بیٹی کو چھوٹی بہن بتاتی ہیں

شادی

جنابِ جہلؔ و مِس تعلیم کی شادی کا کیا کہنا! ۔۔۔ شبِ تاریک کے آغوش میں شمعِ فروزاں ہے
مگر یکسانیت تو دیکھیے دونوں کے ناموں میں ۔۔۔ دلہن مس خالق ایم۔اے ہے تو دولہا ایم اے خالق ہے

فنا سے فانی بنا ہے اور بقا سے باقی بنا ہے۔ فانی کے معنی ہیں فنا ہونے والا اور باقی کے معنی ہیں باقی رہنے والا، لیکن قاضی کے معنے وہ ہستی نہیں جس کو قضا کا لقمہ بلکہ لقمۂ تر ہونا چاہیے، چنانچہ یہیں سے بات بگڑ گئی، اور قاضی صاحب خود لقمۂ اجل بننے کے بجائے سیکڑوں معصوم نوجوانوں کے گلوں میں ایسے ایسے پھندے ڈالتے پھرتے ہیں جو برسوں نہیں ٹوٹتے ــــ اگر اتفاق سے کسی کے گلے کا پھندا ٹوٹ جائے تو فوراً دوسرا نیا یا پرانا پھندا (جو سیکنڈ ہینڈ بھی ہو سکتا ہے یا پھر تھرڈ ہینڈ بھی) لے آتے ہیں اور گلے میں ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ آخر دم تک گھٹ گھٹ کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جائے۔ صاحب، بے رحمی میں قصائی تو خواہ مخواہ بدنام ہے جو بکروں کے گلوں پر صرف ایک بار نہایت تیز اور آبدار چھری پھیر دیتا ہے اور منٹوں میں بکرا دم توڑ دیتا ہے مگر قاضی صاحب کی بے رحمی کسی کو نظر نہیں آتی جو معصوم نوجوانوں کے گلوں پر ایسی ایسی کُند چھریاں پھیر دیتے ہیں کہ بیچارے عمر بھر تڑپتے اور پھڑپھڑاتے رہتے ہیں لیکن ان کا دم نہیں نکلتا بلکہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی بسر کرتے چلے جاتے ہیں۔

ایک نوجوان کو جب سر سے کفن باندھ کر (جس کا خوبصورت نام سہرا رکھا گیا ہے) تختۂ نکاح پر چڑھایا گیا تو قاضی صاحب "قضا" کی طرح اس کے سر پر سوار نظر آئے۔ جب نوجوان نے سہمی سہمی نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ "میاں تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟" نوجوان پھر اٹھا تھا۔ اس نے کہا۔ "قاضی صاحب میری آخری خواہش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ آپ میرا نکاح باندھیں، میں آپ کا نکاح باندھ دوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ قصائی کی طرح نوجوانوں کے گلے کاٹتے پھرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔" قاضی صاحب نے جواب دیا۔ "میاں میرا نکاح ہو چکا ہے۔ میرے نکاح سے پہلے میں قاضی نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ میرے باپ قاضی تھے نہ میرے دادا قاضی، بلکہ وہ سب قصائی تھے۔ جب ایسے قاضی صاحب نے میرا نکاح باندھ دیا تو میں نے ان کے ظلم و ستم کا انتقام لینے کے لئے قاضی کا منصب اختیار کر لیا۔ رات دن [illegible] صاحب کا نکاح باندھنے کا مجھے موقع ملے۔ چنانچہ

جب انھوں نے اپنی تین بیویوں کو لاعلم رکھ کر چوتھی شادی پوشیدہ طور پر کرنے کا ارادہ کیا تو مجھے ان کے نکاح باندھنے کا موقع مل گیا چنانچہ میں نے ان کے راہ فرار کی چوتھی سمت بھی بند کر دی تو آج تک قید با مشقت کی سزا بھگت رہے ہیں جس کی میعاد نہیں اور مخدوم کی نظم کے یہ دو مصرعے ہمیشہ گنگناتے رہتے ہیں ؎

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں

قاضی صاحب سے انتقام لینے کے بعد بھی میرے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تو میں نے پوری نوع انسانی سے انتقام لینا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں آپ ایک سو بچاسویں نوجوان ہیں جن کے گلے میں میں نکاح کا پھندا ڈال رہا ہوں۔" یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرّا گئی اور رندھے ہوئے گلے سے انھوں نے کہا "میاں اب زیادہ دیر نہ کرو ، ورنہ میری بیوی اس سے ناراض ہو جائے گی کہ میں نے ایک ہی محفل عقد میں اتنی دیر کر دی کہ دوسری محفل عقد میں وقت پر نہ جا سکا اور ایک دوسرے قاضی صاحب نے وہاں نکاح باندھ دیا۔ اس سے جتنا رقمی نقصان ہو گا اس کی پابجائی کے لئے مجھے کسی مسلخ میں بکرے چھیل کر اس کی مزدوری سے کرنی پڑے گی۔" یہ سن کر اس نوجوان کو قاضی صاحب کی حالت زار پر رحم آ گیا اور اس نے جلدی جلدی قاضی صاحب کے حکم کی تعمیل کرنا شروع کر دی۔ یہاں تک تو قاضی صاحب کے نکاح باندھنے کی بات چلی۔ اب قاضی صاحب کے بارے میں کچھ اور دلچسپ باتیں ملاحظہ فرمائیے۔

قاضی صاحب کسی محفل عقد میں وقت پر نہیں آتے۔ البتہ "نئے قاضی کو فیس کی جلدی" رہتی ہے اس لئے وہ وقت پر پہنچ جاتا ہے کیونکہ اسے اس بات کا اندیشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی پُرانا قاضی موقع واردات نکاح پر پہنچ کر اس کا حق نہ مار لے۔ پُرانے قاضی کو ایسا کوئی اندیشہ لاحق نہیں ہوتا۔ ایک تو یہ کہ لوگ نئے قاضی کے مقابلہ میں پرانے قاضی کو ترجیح دیتے ہیں، دوسرے کسی پُرانے قاضی کے "اڈے" پر کوئی دوسرا قاضی، خواہ نیا ہو یا پُرانا، پہنچنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پُرانے قاضی ہمیشہ دیر سے آتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کو دو قسم کی تکلیف میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ ایک تو قدیم روایت کی پابندی کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی دولہا اور اس کے ساتھ کے براتی کبھی وقت مقررہ پر دلہن کے گھر نہیں آتے۔ دوسرے دولہا آ جاتا ہے تو قاضی صاحب وقت پر نہیں آتے۔ بالخصوص اس زمانے میں جبکہ شادیوں کا موسم اپنے عروج پر ہوتا ہے اور ہر محلہ شادیوں سے لہلہاتا ہوا نظر آتا ہے۔ جدھر دیکھو شادی کی فصل تیار کھڑی ہے۔ ایسے میں قاضی صاحب کو ایک ہی دن میں کئی شادیوں کی فصلیں کاٹنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس زمانہ میں قاضی صاحب کی بدحواسی بھی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ کسی شادی میں دیر سے جانے پر قاضی صاحب کو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بارات نہیں آئی ہے۔ وہاں سے یہ سوچ کر نکلتے ہیں کہ دلہا ان کا بھی استاد نکلا تو دوسری شادی میں بھی یہی صورتحال رہتی ہے۔ تیسری شادی کے مقام پر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دلہا تو آ گیا ہے لیکن جہیز اور جوڑے کی رقم کا تصفیہ نہ ہونے کی وجہ سے نکاح میں تاخیر ہے۔ تب وہ چوتھی شادی کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں، ابھی وہاں پہنچنے بھی نہیں پاتے کہ شادی نمبر ۳ اور ۲ کے لوگ، ارنٹ گرفتاری لئے پہنچ جاتے ہیں۔ اب دونوں پارٹیوں میں بحث و تکرار شروع ہو جاتی ہے اور قاضی صاحب دو بیویوں کے شوہر کی طرح دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھ کر اطمینان کے ساتھ بٹوہ نکال کر پان کھانا شروع کر دیتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ جس پارٹی کی فتح ہو گی اسی کا نقارہ بجائیں گے۔ اس دوران میں تیسری شادی کے لوگ آ کر چپکے سے قاضی صاحب کو پکڑ لے جاتے ہیں جب سابقہ دو پارٹیوں میں سے ایک کے حق میں تصفیہ ہو جاتا ہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ قاضی صاحب غائب ہیں۔ یہ دونوں پارٹیاں تیسری پارٹی کے مقام پر پہنچتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ قاضی صاحب نے جلدی جلدی ادھورا نکاح پڑھ کر چوتھی شادی کے مقام

کارا ستہ لے لیا ہے۔ جب چوتھی شادی کے مقام پر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے قاضی صاحب ایک ایسی شادی کے مقام پر روانہ ہوگئے ہیں جہاں کے قاضی صاحب اچانک بیمار ہو کر غیر حاضر ہوگئے تھے اور ایک فی البدیہہ قاضی کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ وہاں پہنچنے پر اطلاع ملتی ہے کہ قاضی صاحب ابھی ابھی شادی نمبر ۱ کی محفل میں پہنچ گئے ہیں۔ جب دونوں پارٹیاں وہاں پہنچتی ہیں تو علم ہوتا ہے کہ اس دوران میں قاضی صاحب نکاح باندھ کر شادی نمبر ۲ کی محفل میں چلنے کے لئے کمر باندھے ہوئے تیار بیٹھے ہیں۔ انہی تمام مصیبتوں کے بعد جب قاضی صاحب شادی نمبر ۱ کی محفل میں پہنچتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نیا قاضی نکاح باندھ رہا ہے۔ یہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہتے ہیں تو "بانیان شادی" اس نئے قاضی کے حق میں فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کیونکہ پرانے قاضی صاحب نے عین وقت پر دھوکہ دے دیا تھا۔ اس پر پرانے قاضی صاحب فتویٰ دے کر وہاں سے روانہ ہوتے ہیں کہ نئے قاضی کا باندھا ہوا نکاح جائز نہیں، اس لئے کہ اس کی ڈاڑھی شرع کے مطابق ضروری حد تک لانبی نہیں ہے بلکہ اتنی مختصر ڈاڑھی ہے کہ اس میں تنکہ بھی نہیں سما سکتا۔ قاضی کی ڈاڑھی اتنی لانبی ہونی چاہیئے کہ اس میں تنکہ تو تنکہ پہاڑ بھی سما جائے تو کسی کو نظر نہ آئے۔ یہ فتویٰ سن کر لوگ نکاح کے ناجائز ہو جانے سے پریشان ہو جاتے ہیں اور پرانے قاضی صاحب کی خوشامد پر اتر آتے ہیں۔ بالآخر نئے اور پرانے قاضی میں "نفٹی - نفٹی" پر تصفیہ ہو جاتا ہے اور پرانے قاضی صاحب نئے قاضی سے بھی زیادہ ناقص اور نامکمل طریقہ پر نکاح باندھ کر اپنا محنتانہ یعنی "نفٹی" لے کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ نیا قاضی چلاتا رہ جاتا ہے کہ پرانے قاضی صاحب کو خطبۂ نکاح تک صحیح پڑھنا نہیں آتا کیوں کہ انھوں نے محمد اسماعیل کی دوسری کتاب سے آگے کچھ نہیں پڑھا اور خطبۂ نکاح تو مولویوں سے سن کر "منہ زبانی" یاد کر لیا تھا کئی پرانے لوگ پرانے قاضی کے مقابلہ میں نئے قاضی کی بات کو نہیں مانتے اس لئے کہ خود ان کے نکاح خطرے میں پڑ جاتے ہیں جو پرانے قاضی نے باندھے تھے۔

آج کل جب کہ عدالتوں میں بھی بغیر باجے اور بغیر بارات کے شادیاں ہونے لگی ہیں تو لوگ سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں کہ کیوں نہ دلہا دلہن کو تیار کر کے سیدھا کورٹ آف سیول میاریج میں لے جائیں اور وہیں نکاح بندھوا دیں۔ کچھ قدامت پسند لوگ اعتراض کرتے ہیں تو نوجوان جواب دیتے ہیں کہ "جائیے حضرت میاں بیوی راضی تو کیا کرے قاضی" اصل مسئلہ تو دلہا دلہن کی رضامندی ہے۔ اس کے آگے رسم و رواج کی کوئی حقیقت نہیں۔"

قاضیوں کی کئی اقسام ہیں۔ ان میں دو بڑی قسمیں اہم ہیں۔ ایک خاندانی قاضی، دوسرا درمیانی قاضی۔ خاندانی قاضی وہ ہوتا ہے جس کا سو پشت سے پیشۂ آبا قاضی گری چلا آرہا ہے۔ درمیانی قاضی وہ ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طرح دارالقضاۃ سے نکاح باندھنے کا صداقت نامہ حاصل کر لیتا ہے۔ ان کے علاوہ غیر سند یافتہ قاضی بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایسے قاضی وہیں دیکھنے میں آتے ہیں جہاں پہلی اور دوسری قسم کے قاضی موجود نہ ہوں۔ قاضی کا عالم یا علامہ ہونا ضروری نہیں اگر وہ خاندانی قاضی ہے تو اس پر خواندہ یعنی لکھنا پڑھنا جاننے کی بھی شرط نہیں ہے۔ وہ خطبۂ نکاح سن کر ہی رٹ لیتا ہے اور وقت ضرورت دہرا دیتا ہے، علاوہ ازیں بعض نام کے قاضی بھی ہوتے ہیں نام کے نہیں ـــ مطلب یہ کہ ان کے نام کے ساتھ قاضی تو ہوتا ہے لیکن وہ نکاح نہیں باندھتے۔ ایسے قاضی کسی یونیورسٹی میں لکچرر ہوتے ہیں یا اسپتال میں ڈاکٹر یا کوئی مشہور طبیب یا پھر چمڑے کے مشہور بیوپاری۔ ان کے نام کے ساتھ قاضی ضرور لکھا ہوتا ہے۔ مثلاً قاضی عبدالحکیم پی ایچ ڈی لکچرار، قاضی محمد شرف الدین ایم بی بی ایس۔ اسسٹنٹ سرجن، یا افسرالاطبا قاضی شیخ داؤد، یا قاضی چھیے میاں تاجر چرم وغیرہ۔ اگر کسی دعوت کے رقعہ میں یا کسی جلسے کے نظام العمل میں ان کے نام کے ساتھ قاضی کا لفظ نہ لکھا جائے تو اس قدر برہم ہوتے ہیں کہ احتجاجاً تقریب یا جلسے میں شریک نہیں ہوتے۔

مثل مشہور ہے کہ " قاضی جی شہر کی فکر میں دبلے " ہوتے ہیں۔ ہم نے کسی قاضی کو کسی شہر کی فکر میں دبلے ہو
نہیں دیکھا۔ البتہ جب شادیوں کا موسم نہیں ہوتا تو وہ خود اپنی فکر میں ضرور دبلے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضرب المثل
ہم یہ ترمیم ضروری سمجھتے ہیں ۔ " قاضی جی شادیوں کی فکر میں دبلے "

لیجئے صاحب ایک قاضی صاحب آ دھمکے ہیں اور شادی کا رقعہ بتا کر ہم سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ یہ شادی ک
مقرر ہے کیونکہ رقعہ پر جو پتہ درج ہے وہاں ویرانی کا یہ عالم ہے کہ دلہا کی جگہ الّو بول رہا ہے۔ ہم اس حقیقت سے وا
تھے کہ شادی کا مقام بدل گیا ہے۔ ہم اصلی مقام سے واقف ہیں چنانچہ ہم نے ان سے اس شرط پر شادی کا نیا مقام بتا
کا وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ دعوتِ طعام لے چلیں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے ہیں۔ ہمارے دماغ میں بریانی کی
بھینی خوشبو مہک رہی ہے۔ ایسے میں مضمون جاری رکھنا دشوار ہو گیا ہے۔ اس لئے اب ختم کر کے دعوت کی تیا
کرتے ہیں۔

غزل

ہولے آج زمانہ یہ کیسا زیر و زبر
جو عیب عیب تھے کل تک وہ عیب اب ہیں ہنر
نہ راس آئی کبھی کوئی ہم کو راہگزر
بنے جو ہم کسی منحوس کے رفیقِ سفر
بھٹک رہے تھے جو کل تک وہ آج ہیں رہبر
نگاہیں جن کی تھیں کمزور وہ ہیں اہلِ نظر!!
بنایا جاتا ہے دن رات اس کو گھن چکر
خدا کرے نہ ہو کوئی کسی کے زیر اثر
وہ پینا کیا جو پئے کوئی اپنے ساغر سے
جو پینا ہو، پیو اوروں کے چھین کر ساغر!
جو کل تھی مس وہی عورت شری متی ہے آج
شری ہے آج وہی مرد کل جو تھا مسٹر
سنا ہے شیخ کو سوجھی ہے عقدِ ثانی کی
خزاں رسیدہ شجر ہو رہا ہے بارآور
لبشر کے سر سے اگر اب کی گر گئی پگڑی
لبشر، لبشر نہ رہا، وہ تو صرف رہ گیا شر
بہانہ کوئی نہیں ہے لیند ستریٹ کو
وہ ہو چنانچہ کہ چونکہ وہ ہو اگر کہ مگر

سرپٹ حیدرآبادی

شیطان یہی ہے

اب تیسری شادی کریں ارمان یہی ہے
"جینے کا مزہ ہے تو مری جان یہی ہے"
تعلیم کو چھوڑا ہے تو نیتا جی بنیں گے
پیشہ یہی بہتر ہے کہ آسان یہی ہے
ہم نے جو کہا: "کھاتے ہو کیوں قوم سے رشوت؟"
وہ پیٹ دکھاتے ہیں کہ شیطان یہی ہے
پھرتا ہوں جلم "باس" کی امید کرم پر
دنیائے ترقی کا تو سامان یہی ہے!
اک دل میں اگر آج ہیں کل دوسرا دل ہے
ہارے ہوئے نیتاؤں کی پہچان یہی ہے
مکاری و غیبت سے ملے گی مجھے کرسی!
ہاں میرے گرو دیو کا وردان یہی ہے
دسویں میں وہ پڑھتے ہیں فقط سات برس سے
نیتا وہی بن جائیں گے امکان یہی ہے
جو صاحب کرسی ہے کرو اس کی خوشامد
اپنا تو ہے جو بھی ہو 'میدان یہی ہے
احباب سے ہم کھنچ کے رہو خود بھی نظر بند
بیگم کی ہدایت یہی' فرمان یہی ہے!

نظر برنی

صنعتی ترقی کو زبردست بڑھاوا

بندھیاچل کے جنوب میں آندھرا پردیش معدنی وسائل کے لحاظ سے مالا مال ہے۔ اس لئے صنعتی ارتقاء اور فروغ کے لئے اس ریاست میں عظیم مواقع وامکانات موجود ہیں۔

گزشتہ دو برسوں کے دوران میں ۶۲۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری اور ۴۵۰۰۰ افراد کے لئے روزگار کی گنجائش رکھنے والی صنعتوں کے قیام کے لئے ۱۵۰ اجازت نامے اور صنعتی لائسنس وصول ہوئے ہیں۔

یہاں چھوٹے پیمانے کی ۱۶۰۰۰ صنعتی یونٹیں بھی قائم ہیں جن میں ۴۸ کروڑ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے اور جو ۲ لاکھ افراد کو روزگار پر لگائے ہوئے ہیں۔

آندھرا پردیش انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن۔ دی اسمال اسکیل انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور انڈسٹریل انفرا اسٹرکچر کارپوریشنز جیسے ادارے ان تمام برسوں کے دوران انتہائی قابلِ تحسین انداز میں ہماری صنعتی ترقی پر غیر منقسم توجہ دیتے آرہے ہیں۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ

حکومت اندھرا پردیش، حیدرآباد

DIPR No. 8/77-78

ہمارا شہر

خلیب تحسین
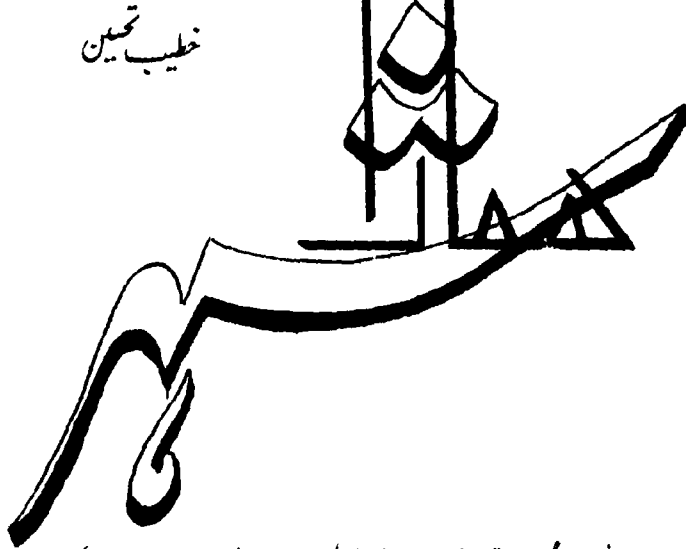
ایک دن ہم اپنے ہی شہر میں اُن دوستوں کے ہاں پہنچے جو بمبئی، مدراس وغیرہ میں دو چار دن رہ آئے ہیں اور بات بے بات ہمارے شہر کی تحقیر کیا کرتے کہ ہمارا بمبئی، ہمارا مدراس ایسا ہے ویسا ہے۔ ہم نے ان سے بصد فخر کہا "اب ہمارے شہر کی ترقی و خوبصورتی کے لیے سٹی ڈیولپمنٹ بورڈ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ جلد ہی ہمارا شہر تیز رفتار ترقی کی دوڑ میں تمہارے شہروں کو اوور ٹیک کر دے گا۔"

مگر آج ہماری یہ حالت ہے کہ ان دوستوں سے قرض خواہ کی طرح منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ اس بات سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ سٹی ڈیولپمنٹ بورڈ کچھ کام نہیں کر رہا ہے۔ آئے دن بورڈ کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ شہر کی ترقی اور خوبصورتی کے موضوع پر زبردست مباحثے ہوتے ہیں۔ حسبِ روایت اس دوران ہر ممبر ایک دوسرے کی پُرجوش و پُرخلوص مزاج پُرسی کرتا ہے۔ جب کوئی صاحب اپنے پہلو میں بیٹھے دوسرے صاحب کی کسی بات پر خوش ہو کر ان کی پیٹھ تھپتھپاتے ہیں تو صاحب موصوف کا کرتا ہاتھ میں آجاتا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ بات چل نکلی تو رکنے کا نام نہیں لیتی۔ بحث کے خاتمہ پر ہر ممبر ایک ہاتھ آگے اور ایک ہاتھ پیچھے لگائے اگلے روز کی تیاری کے لئے چل پڑتا ہے۔

شہر کی ترقی اور خوبصورتی کے لئے کافی اقدامات بھی کئے گئے ہیں۔ اس تعلق سے عوام، بلدیہ اور سٹی ڈیولپمنٹ بورڈ مل کر کیا کچھ کرتے ہیں ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جا بجا دبے جا بجھرتے بڑے گڑھے بنا دیئے جاتے ہیں۔ ہر سڑک ادھیڑ دی جاتی ہے۔ سڑکوں پر کیلے اور آم وغیرہ کے چھلکے پھنکوا دیئے جاتے ہیں۔ صاف ستھرے مقامات پر جلی حرفوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔ "یہاں پیشاب کرنا منع ہے۔" لیکن عوام اس تنبیہ کا مطلب خوب سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس تنبیہ کی خلاف ورزی نہ کی گئی تو بھاری جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ بچے مذکورہ مقامات پر جملہ ضروریات سے فارغ ہو کر اپنا فرض قرض سمجھتے ہوئے بحسن خوبی ادا کرتے ہیں۔ بچوں کی اُن گلکاریوں کی نفاست اور مہارت کی داد نہ دینا حق تلفی ہوگی۔

شہر کی کچرے کی کنڈیوں کا استعمال بھی قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے اطراف کا ڈھیروں کوڑا بلدیہ والوں کے فراق میں تڑپتا اور لوٹتا اپنے معشوق کے دیدار کے لئے کئی کی سرحدیں پار کرنے لگتا ہے۔ بلدیہ کی یہ کارکردگی صرف دو جنسوں کو خوش رکھ سکتی

ہے۔ ایک تو کچرے کو نرم گرم لبستر تصور کرنے والے کتے اور دوسری شادیانے بجاتی مکھیاں۔ مگر کچرے کی کنڈی کا باطن سٹی ڈیولپمنٹ بورڈ کی کارکردگی کی طرح بہت ہی صاف اور کورا ہوتا ہے۔ (گو بورڈ کے اخراجات کا کالم پُرا اور "کھاد" کا متقاضی ملے گا) کچرے کی کنڈی وہی لوگ استعمال کرتے ہیں جن کے ہاں "کھٹا" یا اسی قسم کی دوسری چیزیں پکتی ہوں۔ ایسے لوگ چور نظروں سے چو طرف دیکھتے اور اپنی دانست میں سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر "املی" کے بیج اور چھلکے کچرے کی کنڈی میں پھینکتے ہیں مگر جیسے ہی وہ اُدھر پلٹے سمجھئے ادھر گھات میں بیٹھے کسی شخص کی جانب سے ان کی خستہ حالی کی منادی شروع ہوگئی۔ آج کل تو والدین اپنی لڑکی کہیں بیاہنے سے پہلے تفتیش کرلیتے ہیں کہ لڑکے والے کوڑا کرکٹ کنڈی میں پھینکتے ہیں یا کنڈی کے باہر۔ ہم ایک ایسے صاحب سے بھی واقف ہیں جو عزت بچانے کی خاطر علی الصبح مارکیٹ میں پڑے پھلوں کے چھلکے اٹھا لاتے ہیں اور بعدازاں جب گلی میں لوگوں کی آمد و رفت بڑھ جاتی ہے یہ بڑے فخر سے گردن اکڑائے کنڈی کے اطراف چھلکے پھیلا آتے ہیں۔ صفائی کا خیال بلدیہ والوں کو کچھ زیادہ ہی پریشان کرنے لگے اور ان کی نیندیں حرام کردے تو چھوٹے چھوٹے ویسٹ پیپر باکس شاہراہِ عام اور پارکس میں جلوہ افروز ہوکر حکام کو میٹھی لوریاں سنانے لگتے ہیں۔ بچوں کے ڈالے ہوئے پتھروں سے ہی ویسٹ پیپر باکس کی گود ہری ہو تو ہو ورنہ ان کا کوئی دوسرا مصرف نہیں۔ البتہ ایک معمر عاشق نے اس سے بہت خوب کام لیا تھا۔ ہوا یہ کہ ان کی محبوبہ نے اپنے ہونے والے شوہروں کی انتخابی لسٹ سے نہ صرف ان کا نام خارج کردیا بلکہ آئندہ ملاقات سے بھی انکار کردیا۔ نوعمر محبوبہ کسی عقل مند شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر اس کے کہنے کے مطابق عاشق صاحب عقل سے محروم تھے۔ عاشقِ موصوف نے دیر تک آہیں بھرنے کے بعد خط لکھا "تمہارا یہ استدلال بچکانہ ہے اور تمہارا یہ فیصلہ جلد بازی کا شکار معلوم ہوتا ہے۔ براہِ کرم اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرو۔ آٹھ روز بعد، پانچ بجے شام، فلاں روڈ پر، فلاں دکان کے سامنے کے ویسٹ پیپر باکس میں مجھے سرخ گلاب ملیں تو میں سمجھوں گا میرا دماغ شفق کی طرح خوبصورت اور قابلِ قبول ہے۔ باکس کے خالی پن کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اب بھی میرے سر کو خالی سمجھتی ہو۔" آٹھ دن بعد حضرتِ عاشق مقررہ جگہ پر مقررہ وقت پہنچے تو ڈبہ گوبھی سے بھرا پایا۔

وہ دن صفحۂ پارینہ بن گئے جب ہم وقت پر نل سے پانی حاصل کیا کرتے اور جتنا چاہے پانی مل جاتا تھا۔ اب گھنٹوں پانی کی کیو میں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ بعض منچلے دوڑتے ہوئے قریبی محلوں سے خبر لے آتے ہیں کہ پانی "اندھیر نگری" تک آگیا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد دوسری خبر خوشی کی لہر دوڑا دیتی ہے کہ پانی "جاہل پورہ" تک پہنچ گیا ہے۔ مگر خاصی دیر بعد بھی خوشی کی یہ لہر پانی کی لہر میں تبدیل نہیں ہوتی نل سے سیٹیاں بجاتی نکلنے والی ہوا بھی ہمیں مطمئن نہیں کرپاتی کیوں کہ اس سے قبل کئی دفعہ دن بھر صرف ہوا ہی خارج ہوتی رہی ہے۔ "ٹپ ٹپ ٹپ" اچانک بوندیں شرماتی، بل کھاتی نکلنے لگیں اور کیو میں کھڑے سب سے آگے والے صاحب نے نل اور گھڑے کے گرد کپڑا تان لیا مبادا کسی کی نظر بد نہ لگے۔

حکومت جب ان انتظامات سے بھی غیر مطمئن رہتی ہے تو وسیع پیمانہ پر برقی بریک ڈاؤن کا اہتمام کرتی ہے۔ برقی بھی کسی ایسے موقع پر بریک کردی جاتی ہے جب آپ کوئی بہت ہی اہم اور بے حد دلچسپ کام میں مصروف ہوں بلکہ ہمارے کرم فرما کسی ایسے ہی موقع کے منتظر رہتے ہیں مثلاً آپ فلم دیکھ رہے ہیں۔ "ہیروئن دوڑ رہی ہے پہاڑی کی بلندی کی جانب تاکہ پہاڑی کی دوسری جانب بہتی ندی میں کود کر جان دے دے۔ ساڑی پیروں میں الجھ کر موت کی گہری کھائی میں گرا نہ دے اس ڈر سے وہ ساڑی تھوڑا سا اٹھائے ہوئے ہے۔ ہیرو جدید فیشن کی اپنی نئی پینٹ کو خاردار جھاڑیوں سے بچاتے غلط فہمی دور کرنے اور ہیروئن کو اس خطرناک ارادہ سے روکنے کے لئے پیچھے لپک رہا ہے لیکن ہیرو کے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی ہیروئن پہاڑی سے چھلانگ لگاتی ہے ہیرو چیخنے کے لئے منہ کھولتا ہے ......" اور عین اسی وقت لائٹ چلی جاتی ہے۔ اب لائٹ کے آنے تک تصور میں ہیروئن ہوا میں معلق رہے گی اور ہیرو کا منہ کھلا رہے گا، تب تک فلم بین جانکنی کے عالم میں تڑپتا رہے گا۔

ی۔ لوگ چور اور پولیس کی دوڑ کے لئے راستہ بنانے لگے۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد چور کی ہمت ٹوٹنے لگی اور یہ امید بندھ چلی تھی کہ پولیس ہار کر حاوی ہوگی مگر اچانک بتیاں گل ہو گئیں، چور نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ لگا کر قریبی تاریک گلیوں کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔

کل ان باتوں یاد کرتے ہوئے ہمارے ہونٹوں پر ایک حسرتناک مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ اس کے سوا ہم سے کچھ ممکن نہیں کیونکہ ہم نے ایک دفعہ حکومت سے شہریان کی نمائندگی کی تھی اور وہاں سے بڑے خوار ہو کر نکلے۔ ہمیں سوالیہ جواب ملا، جناب! اگر ہم آپ کی باتوں پر عمل کریں تو قصبہ اور شہر میں کیا فرق رہ جائے گا؟ شہر کی ترقی کیسے ہو؟" ساتھ ہی سرکاری کاروبار میں روڑے اٹکانے کے جرم میں ہمیں پولیس کے حوالہ کرنے کی دھمکی دی گئی۔

یہ بات ہم نے یہاں اس لئے بتا دی کہ چند اشخاص جو نوجوانی میں حکومت سے احتجاج کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ہم انھیں تنبیہ دیتے ہیں کہ باز آئیے ایسے غیر انسانی وغیر اخلاقی فعل سے۔ یہ حرکت وطن دوستی کی تعریف میں آتی ہے اور وطن دوستی سماجی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ غداری ہے۔ ہماری مانئے کیا آپ بھی دوسروں کی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم چند ایک ادا کیا کر سکتے ہیں؟ ●●

لئیق صلاح

عادت نہیں نہیں کی ہے؟

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جس کام سے اُسے منع کیا جاتا ہے۔ نا جانے کیوں؟ اُسی کام سے دلچسپی زیادہ ہوتی ہے۔ اللہ میاں نے اپنی وحدانیت کا اعلان کیا، لیکن جہاں دوسرے خداؤں کے انکار کا اقرار کرانا چاہا، وہیں اُن کی طرف بندوں کی رغبت زیادہ ہوگئی۔ یعنی جس چیز سے منع کیا گیا، سب اُسی کی طرف مائل ہو گئے۔ اور جس طرف اُنھیں آنے کی دعوت دی گئی، وہ اُس طرف سے بھاگنے لگے۔ خیر! اللہ میاں، اللہ میاں ہی ہیں۔ ہم میں اُن میں زمین آسمان کا فرق، بندوں کی اس فطرت سے وہ ناآشنا ہوں تو تعجب نہیں۔ مگر انسان تو انسان کو خوب سمجھتا ہے۔ پھر وہ کیسے اس دھوکے میں آگیا۔ اس نے تو گستاخی کر کے اللہ میاں سے کہا تھا کہ فرشتوں کو ہمارے حساب کتاب کے لئے کیوں متعین کیا گیا۔ آدمی ہی ہوتے تو انھیں اندازہ ہوتا کہ انسان کب، کس وجہ سے کون سی بُرائی میں مُبتلا ہوا۔ چنانچہ غالبؔ کہتے ہیں۔ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

لیکن جب ہم اپنی زندگیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ فطرت شناس انسان بھی اُسی غلطی میں مبتلا ہے۔ روزآنہ کے معمولی واقعات کا جائزہ لیجئے اور اپنی فطرت کے عکس کو ان میں دیکھنے کی کوشش کیجئے۔ مثلاً ایک چھوٹے سے ناسمجھ بچے کو جب ہم منع کرتے ہیں کہ آگ کے قریب نہ جانا تو وہ ضرور اُسی طرف جائے گا۔ یا ہم اُسے رونے سے منع کرتے ہیں تو وہ اور گلا پھاڑ کر اپنی ساری توانائیوں کو یکجا کر کے روتا رہے گا۔ خواہ اس پروگرام کو برقرار رکھنے کے لئے اُسے کتنی ہی صعوبت اور تکلیف برداشت کرنی نہ پڑے۔ بیچ بیچ میں بطور وقفہ کچھ آرام لے گا لیکن سلسلہ برقرار رہے گا۔ روکنے اور منع کرنے کے بجائے ہم اگر کہیں کہ روتے جاؤ تو چند لمحوں میں وہ بھلا چنگا ہو جائے گا۔ شیر خوارگی سے جب لڑکپن میں قدم رکھتے ہیں تو اُس وقت انھیں کھیل کود سے منع کیا جاتا ہے۔ اور پڑھنے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ لیکن اس اسٹیج پر بھی فطرت کا وہی تقاضہ باقی رہتا ہے۔ یعنی پڑھنے سے زیادہ کھیل کود سے دلچسپی، نوے فی صد بچے ایسے ہوں گے جنہیں اپنی کتابوں اور اُستادوں سے زیادہ دنیا میں کوئی اور بُرا محسوس نہ ہوتا ہوگا — پڑھنے کو جس قدر [illegible] کہا جاتا ہے اُس طرف بہت کم توجہ مبذول ہوتی ہے، اور کھیل کود میں چوری چھپے جو بیاضت

ہوتی ہے وہ انھیں اپنے وقت کے بہترین کھلاڑی ثابت کرتی ہے۔

لڑکپن اور نوعمری کی سرحدوں کو پھلانگ کر جب اور آگے بڑھتے ہیں تو نظرت کا یہ جادو سرچڑھکر بولتا ہے۔ مثلاً دفتروں، اسکولوں اور فیاکٹریوں میں کام کرنے والے ملازمین کیلئے سب سے پہلی اور بڑی شرط وقت کی پابندی ہے اور اگر اس شرط پر پورا اُترتا ہے تو ہمیں اُس کے انسان ہونے میں شک ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ ہم نے اُسے شیطان کہا۔ کیونکہ جلدی کا کام عموماً شیطان ہی کے سر کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے فرشتہ ہی ہو۔ ایسا لیئے کہ شیطان اور فرشتے میں کچھ ازلی مناسبت بھی تو ہے۔ اور جب ان ملازمین کو یہ تاکید کیجاتی ہے کہ کام زیادہ اور باتیں کم تو اس کا رَدِعمل اس کے برعکس صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ رشوت ستانی سے باز آنے کی تلقین کیجاتی ہے تو معاملہ کچھ اُلٹا ہی ہو جاتا ہے۔ یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی بڑی باتیں ہیں۔ چھوٹے لوگ بھی اپنی کارکردگیوں میں بڑوں سے کچھ کم ہیں۔ مثلاً گوالے کو یہ تاکیداً اگر کہیں کہ دودھ خالص ہونا چاہیئے، تو پانی خالص ملے گا۔ اور اور دہی، دودھ کا اتا پتہ معلوم نہ ہو سکے گا۔ یا دھوبی سے کہیں کہ کپڑوں کو احتیاط سے دھویا جائے پھاڑنے اور دھبے لگانے سے گریز کریں تو موخر الذکر ہی پر عمل ہوگا۔ اور یہی بات سنی ان سنی ہو جائے گی۔ سڑکوں پر جس طرف سے آنے کے لیئے منع کیا جاتا ہے تو پبلک کا رجحان اُسی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ بائیں ہاتھ سے چلنے کے لیئے کہیں تو پولیس والے کی آنکھ بچا کر داہنی طرف سے نکلنے کی لامتناہی کوشش ہوتی ہے۔ راستوں پر جہاں Urinals ہیں وہاں رفع حاجت سے فراغت حاصل ہیں کرتے ہیں اور جہاں یہ لکھدیا جاتا ہے کہ "یہاں پیشاب نہ کیجئے".... تو آپ دیکھیں گے کہ وہیں تمام حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔ کچرے کی کنڈیوں میں آپ کو کچرا نہیں ملے گا۔ سڑک پر جدھر نظر دوڑائیے بس کچرا ہی کچرا نظر آئے گا۔ اور نہ ہوگا تو کچرے کی کنڈیوں میں!

ان تمام تجربات اور مشاہدات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اب "روایت سے بغاوت" کرنی چاہیئے یعنی جو کام کرواتے ہیں، اُنھیں سختی سے منع کیا جائے۔ اور جس کام سے روکنا ہے اُس کے لیئے سختی سے یہ تاکید کیجائے کہ ہونا چاہیئے۔ مثلاً بچوں سے یہ کہیں کہ خوب کھیلیں، کودیں، اور قطعاً کتابوں کو ہاتھ نہ لگائیں، اندھیری راتوں میں جب سڑک پر بھی روشنی کا انتظام نہ ہو تو بغیر قندیل کے سیکل چلائیں، چوری چھپے دوسروں کے خطوط پڑھیں، دوسروں کے راز جاننے کی جہاں تک ہو سکے ممکنہ سعی کریں، بغیر ٹکٹ سفر کرنا لازمی قرار دیں، ہر قسم کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کریں، سردیوں میں ٹھنڈا پئیں اور گرمیوں میں گرم کپڑے پہنیں امتحانوں میں نقل کرنے کی اجازت دے دیں، جھوٹے اسناد کو قابل ترجیح قرار دیں، کنڈیوں میں کچرا نہ ڈالیں شہر کو غلیظ اور گندہ رکھیں Urinals رفع حاجت کے لیئے نہیں ہیں، ڈاکٹروں کو چاہیئے کہ وہ مریض کو اُن چیزوں کے کھانے کے لیئے سختی سے منع کریں جنکی مریض کو واقعی ضرورت ہے۔ چوری کا مال خریدیں اور فروخت کریں، اسمگلنگ پرانے دور میں ایک گناہ تھی۔ اب نئے دور والے اسے جائز قرار دیں۔ یعنی جتنے جائز کام ہیں اُن سے بچنے کی تلقین کیجائے اور جتنے ناجائز کام ہیں اُن کے کرنے کی ترغیب دلائیں۔ پھر دیکھئے چند دنوں ہی میں خاطرخواہ نتائج حاصل ہونگے دنیا کا رنگ روپ بدل جائیگا۔ ہر طرف اچھائیاں ہی اچھائیاں ہوں گی۔ برائیوں سے لوگ کنارہ کش ہوں گے یہی سوچ کر کے برائی کرنا انسان کے حق میں اچھا ہے ——

قسمت نے لاکے پھر سے ٹپکا تری گلی میں
ٹپکا جو آسماں سے اٹکا تری گلی میں
دن دہاڑے حسن والے دل لوٹ لے نہ جائیں
رہتا ہے چوڑیوں کا کھٹکا تری گلی میں
کیا جانے پڑ ہی جائے بے بھاؤ کی کہیں پر
رکھتا ہوں سر پہ باندھے ٹپکا تری گلی میں
گانجہ، شراب، جوا کیا کم تھے میرے ہمدم
کیوں پھر سے کھل گیا ہے "مٹکا" تری گلی میں
ہے سر کٹ کوئی تو ہے کوئی سر کے بل بھی
ہے روز و شب تماشا نٹ کا تری گلی میں
پولس نہ مارے چھاپہ کردے نہ سب کو اندر
ہر دم لگا ہوا ہے کھٹکا تری گلی میں
اک میں گدھا تھا لیکن رہبر کو کیا ہوا تھا
میری طرح سے وہ بھی بھٹکا تری گلی میں

محمد عابد علی غافل

پیٹ پٹنے کا دیکھ لیرھیں بس — دن ڈھلنے کا دیکھ لیرھیں بس
حق یہ حق دار کو ملے نہ ملے — حق لگنے کا دیکھ لیرھیں بس
نام کو چوری چھوڑے کو ڈھوڑیں — نقد ملنے کا دیکھ لیرھیں بس
ڈھنگے ڈھکلے یا بن گئے چمچہ — کام بنے کا دیکھ لیرھیں بس
فکر بیمار سے ہے باپ کی نئیں — دم نکلنے کا دیکھ لیرھیں بس
دیکھ رہیں کاں ہے اُنچا پورزواں — پھر پھسلنے کا دیکھ لیرھیں بس
کون کس کو سنبھالیں اناڑی
خود سنبھلنے کا دیکھ لیرھیں بس

نوٹے باتاں

سر پو بڑھالیں بالاں کلوں تلک قلم ہے
مچھیاں ہیں منہ پو سوکو لوٹی بھی کیا ستم ہے
جتی کسر اناڑی ہے خوبصورتی میں
لکڑی کی ایک بندوق جھولی لبغل میں کم ہے

اناڑی (محبوب آبادی)

کتنے ہی گھر گیا پیغام مری شادی کا
بڑھ سکی بات نہ جوڑے کی رقم سے آگے
دی ہے درخواست یہ پولس میں کسی عاشق نے
بڑھ گئی ان کی جفا ظلم و ستم سے آگے

یوں تو دنیا میں کئی اور بھی کاتب ہیں مگر
بڑھ سکا کوئی نہ تنویر رقم سے آگے
گھر میں شادی ہو کسی کے یا ولیمہ ہو جگر
وہ نظر آتے ہیں بیٹھے ہوئے ہم سے آگے

جگر نظام آبادی

مُردوں کا مال کھا کر گلفام ہو گیا ہوں
برلا کا جیسے خفیہ گودام ہو گیا ہوں
دھوبی گدھا بھٹیجر حجام ہو گیا ہوں
آکر تری گلی میں بدنام ہو گیا ہوں

ہر امتحاں میں اوّل آ تو گیا ہوں لیکن
مضمون عاشقی میں ناکام ہو گیا ہوں
لاکھوں کا مال تھا میں جب تک جوان تھا تو
بوڑھا ہوا تو گویا بے دام ہو گیا ہوں

معید جاوید کروٹ

بلدی و پنچائتی اداروں سے پرزور اپیل

پودے لگانے کا موسم آچکا ہے

سڑکوں کے کنارے، دفتروں، اسکولوں، باغوں اور کھلے مقامات پر

درخت لگائیے

اور

ہمارے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کو خوبصورت اور سرسبز و شاداب بنائیے

ہر جگہ ہرے بھرے درخت لگا کر ماحول کو دلکش بنا لیجئے

پودے اور مشورے مفت دستیاب ہو سکتے ہیں

ازراہ کرم ربط پیدا کیجئے

شہر حیدرآباد و سکندرآباد کے لئے:

ڈویژنل فاریسٹ آفیسر
اکسٹنشن ڈویژن، محکمہ جنگلات
حیدرآباد ۵۰۰۰۴۰
(فون نمبر ۔ ۲۰۵۳۱ اکسٹنشن ۴۵)

اضلاع کے لئے

ڈویژنل فاریسٹ آفیسر
(ضلع متعلقہ)

DIPR 15/[illegible]

یوسف ہستی

بولنا ایک فن ہے!

بولنا ایک فن ہے ؟!
جسے بولنا نہیں آتا وہ منھ کی کھاتا ہے ؟!

بولنا خدا کی لازوال نعمتوں میں سے ایک ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے جسے جتنا خرچ کریں اتنا ہی بڑھتا ہے آدمی کو حیوانِ ناطق کہا ہی اس لئے جاتا ہے کہ حیوان بول نہیں سکتے اور بولتے رہنے کا دوسرا نام آدمی ہے زندگی کے ہر شعبے میں بولنے کا ہی بول بالا ہے۔ ہوٹلیں، ریستوران اور کلب آدمی کے بولنے کے مخصوص اڈے ہیں جہاں وہ دن بھر کی گھٹن اور دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ مئے خانے خالص دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کے ملنے اور بولنے کے مقامات ہیں۔ یہاں جتنی چیزیں پڑی ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی گروہ یا برانڈ (مسلک) کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جب رات اور نشہ ان دانشوروں پر چڑھتا ہے۔ تو وہ طرح طرح کی بولیاں بولتے ہیں۔ کوئی ادب برائے ادب کی پرچھائیوں تلے بولتا ہے تو دوسرا ادب برائے زندگی پر ہچکیاں لے لے کر الف ننگی گالیاں بکتا ہے۔ ان دونوں کی آواز پر ایک نئی آواز ہاتھوں کو نچاتے اور منھ کو عجیب طور بنانے اور بگاڑتے ابھرتی ہے لیکن یہ آواز، اشارات، کنایات اور علائم کی دیواروں سے ٹکرا کر مئے خانے کی عام آوازوں میں گڈمڈ ہو جاتی ہے۔ پھر یہ تینوں اور وہ لوگ جو ان ذہین لوگوں کے لول سننے آئے تھے کورس کی شکل میں بولنا شروع کر دیتے ہیں اور تب مئے خانہ اپنے وجود کے خول سے باہر آ کر رنگین بن جاتا ہے اور "ادبی لوک ناچ" شروع ہو جاتا ہے!

بہرحال ہم نے ایسے بیسیوں آدمیوں کو بھی دیکھا ہے جو کسی انسان کو سپردِ خاک کرنے بھی جاتے ہیں تو وہاں بھی بولنے سے نہیں چوکتے بلکہ مرحوم کی خوبیوں یا کمزوریوں پر کچھ زیادہ ہی بولتے ہیں۔

مختصر یہ کہ انسان مہد سے لحد تک بولتا آیا ہے۔ اور بولتا رہیگا۔ ہمارے دفاتر ان سب مقامات سے بالاتر ہیں۔ دراصل یہ بولنے کے "رجسٹرڈ اکھاڑے" ہیں جہاں تربیت یافتہ بولنے والے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ یہاں وہ اور اُن کے عہدیدار اپنے اپنے بولنے کے داؤ پیچ دکھا کر مزے سے وقت گزار لیتے ہیں اور ہر ماہ پابندی سے اپنے بولنے کی اُجرت پا لیتے ہیں!

اگر دفاتر میں بولنے کے سوا کچھ کیا جاتا تو پھر کام کرنے یا لینے کے لئے کسی ترغیبی نعرے یا تادیبی کارروائی کی ضرورت ہی کیوں درپیش آتی ؟ یہاں بولنے میں پڑھے لکھے یا ان پڑھ، ذمہ دار یا غیر ذمہ دار کی کوئی درجہ بندی نہیں۔ سبھی محمود و ایاز ایک دوسرے کو بولنے میں مشغول رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بولنا دفتریت کی جان ہے، اور روز ہی کتنے اہل غرض اس جان کے تلے اپنے کام کی تکمیل نہ پا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں اور بولنا بند کر دیتے ہیں۔

بولنا حقیقتاً زندگی کی علامت ہے اگر اس علامت کو کاٹ دیں تو بس ایک آزاد ہی ذہن رہتا۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا، ہمارے بعض ماہر نفسیات ججوں نے کئی قاتلوں کو سزائے موت کے عوض قیدِ تنہائی کی سزا یعنی کسی سے کچھ نہ بولنے کی سزا دی ہے۔ یہ سزا صاف ظاہر کرتی ہے کہ آدمی کو مرنے میں اتنی تکلیف یا اذیت نہیں ملتی جتنی جیتے جی بولنے کی عادت ترک کرنے پر!

میاں بیوی، محبوب محبوبہ دو پڑوسیوں یا ملکوں میں کسی بھی چپقلش یا تصادم کے نتیجے میں سب سے پہلے دو بول بولنا ہی بند کر دیا جاتا ہے کیونکہ یہ دو بول ہی بند کر دیا جاتا ہے کیونکہ یہ دو بول ہی کسی رنجش تصادم کا باعث بنے تھے مگر اس ستم ظریفی کی بھی داد دیجئے کہ تعلقات و حالات کی از سر نو بہتری کا آغاز بھی یہی دو بول سے شروع ہوتا ہے۔ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ اگر بین الاقوامی سطح پر بولنے کا رشتہ ٹوٹ جائے تو ساری دنیا کے کاروبار ہی ٹھپ ہو کر رہ جائیں گے دنیا سے سیمیناروں، کانفرنسوں اور میٹنگوں کا رواج ہی اٹھ جائے گا جن پر لاکھوں روپئے پانی کی طرح بہائے جاتے ہیں اور ان لوگوں کی جان پر بن آئے گی جو سال کے ٣٦٥ دن دنیا کے حساس اور بے چین دانشوروں کو بولنے کی ترغیب دینے کے نئے نئے عنوان یا بہانے تراشتے ہیں۔ یہ بے چین دانشور دور دراز ملکوں سے آکر، نہایت ہی آرام دہ ہوٹلوں یا بنگلوں میں قیام کرتے ہیں، لذیذ اور مرغن غذائیں کھا کھا کر انسان کے غموں اور دکھوں پر بولتے ہیں اور اتنا بولتے ہیں کہ بالآخر فرطِ غم میں غرق نشہ ہو جاتے ہیں!!

خیر چھوڑیئے ہم تو صرف اتنا بولنا چاہتے تھے کہ بولنا خدا کی دین ہے اور یہ کسی کے روکے نہیں رکتا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے، ہمارا قد اچھا خاصہ نکل آیا تھا اور ہم کچھ بول نہ پاتے تھے ہماری ماں کے لئے ہماری یہ حرکت ان کی کھلی توہین تھی کیونکہ وہ دوسری عورتوں سے ڈنکے کی چوٹ کہا کرتی تھیں بچہ بولنے ہی سے پہچانا جاتا ہے اور وہ جتنا بولے گا خدا اسے اتنا ہی اونچا مقام عطا کرے گا۔ بلکہ وہ تو بعض دفعہ یہاں تک کہہ گزرتی تھی کہ بچہ چاہے کچھ نہ بنے مگر بولنے میں کسی سے ہیٹا نہ رہے۔ پھر کیا تھا ڈاکٹروں اور حکیموں کی بن آئی اور انہوں نے ہماری پیاری ماں کو خوب خوب طرح عالموں اور درگاہوں کی جبہ سائی میں ہماری ماں نے ہندوستان بھر کا سفر کاٹ دیا پھر بھی نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ہمیں بولنا نہ آتا تھا اس لئے ہم نے بولا ہی نہیں ــــ جیسا کہ کہا جاتا ہے اللہ رحیم و کریم ہے اس کو ہماری ماں پر رحم آ ہی گیا اور ایک خوشگوار دن ہمارے منہ سے پہلا بول پھوٹ پڑا اور ہماری ماں کا دل بلیوں ناچ اٹھا۔ فرطِ مسرت میں انہوں نے ہمیں دو بوسے لئے گالوں پر ادھر ادھر پیار کئی چراغ روشن کر ڈالے! اس پر بھی ان کا جی نہ بھرا تو ہمیں ایک اسٹول پر کھڑا کر گئیں اس طرح بیٹھ گئیں جیسے کوئی ہماری آرتی اتار رہا ہو ــــ بس ایک بہار سی تھی۔ بولنے کی دیر تھی کہ سنا دیا، اگر بولنے اور نہ

اور رات دیر گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

رفتہ رفتہ ہماری بول چال ہماری عمر سے آگے چوکڑیاں بھرنے لگی۔ ہم اپنے ماں باپ سے اس بے تکلفی سے بولا کرتے جیسے وہ ہمارے بازو برابر والے ہوں! عزیز و اقارب اور دوست احباب شمار ہی کیا وہ تو ہمارے ایک دو بول سن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیا کرتے تھے اور اس طرح ہم خدا کی دین خزانہ دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے تھے۔

ایک زمانہ بعد اچانک ہمارے ڈیڈی نے ہمارا نوٹس لینا شروع کر دیا (کیونکہ اس درمیان ان کو فرصت ہی ملا نہ کرتی تھی) ماں تو ماں ہی تھی جو ہمارے بولوں میں صرف ہمارا "بڑا پن" تلاش کیا کرتی تھی۔ جب بھی ہم کچھ بول پڑتے وہ ہم پر بری طرح برس پڑتے اور بولنے کے طور طریقے اور آداب پر لیکچر دے بیٹھتے۔ وہ باتیں ہمارے لئے حیرت انگیز بھی تھیں اور خلاف طبیعت بھی۔ ہماری بول چال شیشہ کی طرح بے داغ اور فطرت کے عین مطابق تھی اس لئے اُن کی باتیں ہمیں اپیل نہ کیں اور ہم اُن سے بدظن ہو گئے۔

ایک دن جب انہوں نے ہمیں نظر نیچی کئے بات کرنے کی تاکید کی تو ہم بھڑک اُٹھے اور وہ ــــ اری ماں کو پیٹے در پیٹے آوازیں دینے لگے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اُن کے نوٹس لینے تک پانی ہمارے سر سے بہت ہی اونچا نکل چکا تھا۔ مگر ہم اپنے ڈیڈی سے خوف کھاتے ضرور تھے۔ کیونکہ وہ ایک دولت مند اور با اثر آدمی تھے!

خوش قسمتی سے ہمیں اچھا خاصہ بولنا آ گیا تھا۔ وقت اور اثرات بھی ہم کاب تھے ہم نے بھی ادھر ادھر بول بنا کر "پرائیویٹ طریقے" سے ایم اے کی تکمیل کر لی۔ اور سارے خاندان میں ہماری لیاقت کی دھوم مچ گئی۔ کئی دنوں تک ہمارے عزیز و اقارب اور دوست احباب (جن میں ہمارے ڈیڈی کے لوگ بھی شامل ہیں) ٹولیوں کی شکل میں مبارکباد دینے کے لئے گھر پر آتے رہے اور پڑوسیوں نے سمجھا ہمارے یہاں کوئی ادبی محفل یا جلسے کی کارروائی چل رہی ہے۔

ایم اے کرنے کے بعد اب ہماری ایک ہی خواہش تھی کہ "بولنے" پر تحقیقی کام کے جوہر دکھائیں کس طرح آدمی دو بول بول کر گرفتار بلا ہوتا ہے؟ داستان گو، واعظ اور مقررین حضرات کب اور کیونکر معرض وجود میں آئے؟ ہماری شاعری کا اثاثہ جھوٹ اور جھوٹے بولوں کا ذخیرہ ہے وہ کیا عوامل تھے کہ لوگوں نے اُن کی جھوٹ کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اُلٹے انھیں انعام و اکرام سے نوازا۔ کہ آج بھی اُن کے جھوٹے بول، میٹھے بولوں کی طرح ہمارے دلوں میں زندہ ہیں اور نوک زباں پر مچل مچل جاتے ہیں۔

کام کے آغاز کرنے کے لئے دیر ہی کس بات کی تھی؟ روپیہ پیسہ تھا، وقت اور قابل اساتذہ کا تعاون ہمارے ساتھ تھا۔ سب سے پہلے ہم نے کئی موٹی موٹی کتابوں کو زر کثیر دے کر خرید لیا اور پھر پروٹین سے بھری غذائیں کھا کر مطالعہ میں ڈوب ڈوب گئے۔ [illegible] کی ورق گردانی اور غذا خوردنی کے بعد صرف اس بات کا پتہ چل سکا کہ [illegible] آدا ب [illegible] سب [illegible] اسے [illegible] گئے!! ...

آپ نے سُنا ہو گا (کیونکہ آپ کو کتب خریدنے اور پڑھنے، روپیہ اور وقت کہاں ملا ہوگا) ایک دور بادشاہوں کا گزرا ہے اور اُن کے دور میں دربار سجائے جاتے تھے۔ درباریوں (یعنی، خوشامدی لوگوں) کو طرح طرح سے تیار کیا جاتا تھا۔ بادشاہی مزاج داری کے بول سدھائے جاتے تھے تاکہ انعام و اکرام، خطابات و القابات حاصل کریں۔ تعظیم و تسلیمات کی باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی تھی، قدم و آنکھ کی نشست بتائی جاتی تھی کہ وہ بادشاہ کی آمد پر کہاں اور کس سمت قیام کرے اور ـــــ یہ سب کچھ پاپڑ اس لئے بیلے جاتے تھے کہ بادشاہ کی شخصیت کو عظیم تر مانیں اور اُس کے ہر بول کی تعمیل میں اپنی جانیں تک نچھاور کر دیں۔ یہ لو لینے کے "آداب و حقوق" کا پہلا مظاہرہ تھا۔ مگر ہم تو اب بھی یہی سمجھتے ہیں اور ثابت کر دکھائیں گے کہ بولنا صرف خدا کی دین ہے اس کو نہ کوئی کتاب احاطہ کرسکتی ہے اور نہ کوئی تنہا فرد اپنے نام سارے حقوق بک کرا سکتا ہے۔

ہمارے ماں باپ کو شاید ہماری "تحقیق" پسند نہ آئی تھی اس لئے وہ خفا سے لگتے تھے۔ اُنھیں اب ہمارا دن بھر گھر پہ پڑا رہنا بھی سخت ناپسند تھا۔ بچہ کتنا ہی لائق اور سن رسیدہ ہو جائے مگر اپنے باپ کے تیوری کے بل دیکھ کر سہم ہی جاتا ہے اور ہم بھی اندر ہی اندر سہم سے گئے تھے۔

اور ـــــ ایک دن ہم نے اپنے ڈیڈی سے کسی کالج کا لکچرار بنا ڈالنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ چونک سے گئے یہ بات ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ہمارے ماں باپ قومی کاموں میں بھاری عطیے اور چندے دے دے کر سرکاریں اچھے خاصے رسوخ پیدا کر لئے تھے اور بھاری چندوں کے طفیل کئی کالجوں نے اُنھیں اپنے "بورڈ آف ڈائرکٹرز" میں بھی جگہ دے رکھی تھی، اور اُن کے لئے لکچراری دلانا بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

دوسرے ہی دن ہم شہر کے ایک کالج میں لکچرار بن کر، کالج کی رونق بڑھانے چلے گئے اور اُسی دن ہم نے کلاس لے کر طالب علموں پر ایک ڈھاک سی بٹھا دی۔

کئی ماہرانِ تعلیم کہتے ہیں کہ چھوٹے بچوں کو پڑھانا بڑا ہی کٹھن دشوار ہوتا ہے لیکن ایک ہی گھنٹے کے تجربے نے ہمیں یہ بتایا کہ "بالغوں" کو پڑھانا اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہوتا ہے کیونکہ ـــــ بڑے ہی واہیات سوالات لکچرار سے پوچھے جاتے ہیں؟!

ہم صرف بولنا جانتے تھے اور اسی عمل کو دُہرانے کے لئے یہاں دوڑے دوڑے آئے تھے لیکن بدقسمتی سے ہم جو کچھ بولتے، طالب علم اُسے اپنی کتابوں میں تلاش کیا کرتے تھے۔ ہماری باتوں کو نصاب سے کیا نسبت تھی؛ ہم کتاب پڑھ کر کہاں بول رہے تھے جو کتابوں میں ڈھونڈنے سے اُنھیں ملتا، ہم تو طالب علموں میں بولنے کے جوہر پیدا کرنے کے خواہاں تھے اور جن میں از خود بولنے کے جوہر تھے، اُن میں نکھار پیدا کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ کم بخت طالب علم تو "ریڈی میڈ نوٹس" رٹ رٹ کر امتحان پاس کر لینے ہی کو بڑی بات سمجھتے تھے۔ اگر طالب علموں میں ذہانت کا فقدان ہو۔ کاہلی اور رنگ نظری کوٹ کوٹ کر بھری ہو تو وہ کسی کے عمدہ بول سننے اور سمجھنے کے اہل ہی نہیں بن پاتے۔ ہاں! صرف شکایتوں کے انبار لگا سکتے ہیں اور یہاں سب کچھ ہوا۔ چند ہی دنوں میں ہمارے خلاف ایک قلعہ تعمیر ہوگیا اور ان سے ہر طالب علموں نے پرنسپال سے ہماری شکایت کر ڈالی۔ پرنسپال

نے خلافِ نصاب طالب علموں کو پڑھانے اور اوٹ پٹانگ بولنے کی وضاحت طلب کی۔ پہلی بار ہمارے دل پہ ایک گھونسہ سا لگا اور اگلے ہی لمحہ جناب ہم نے بھی وہ وہ بول پرنسپال صاحب کو سنائے کہ وہ غش کھا کر کرسی سے زمین پہ جا گرے اور ہم سیٹی بجاتے ہوئے اُن کے چیمبر سے ایسے نکلے کہ پھر آج تک کالج کا منھ نہ دیکھا ــــ

پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ بولنا ایک فن ہے اور جسے بولنا نہیں آتا وہ منھ کی کھاتا ہے!۔ ۵

میں جو ہوں دل سے فدائے ابلیس
نامزد مجھ کو ہی کرتا اللہ
مجھ سے کیا بڑھ کے وہ ہوگا یارو
میرے کرتوتوں سے مانگے ہے پناہ
کوئی خوش مجھ سے نہیں دنیا میں
شکلِ انسان میں اس دنیا پر

گُن مرے بھی تو ہے گائے ابلیس،
غلطی ہوتی جو یہ جائے ابلیس
سامنے میرے تو آئے ابلیس
مجھ سے شرمندہ ہے ہائے ابلیس،
سب ہی نالاں ہیں سوائے ابلیس
ایک سے ایک ہیں چھائے ابلیس

کس نے لاحول پڑھی ہے محبوب!
بھاگے ہے دُم کو دبائے ابلیس

محبوب مانجھوی

غزلیں

میں ابھرتا شاعر ہوں
ردّی کا بھی ماہر ہوں
گو پینے سے لاغر ہوں
صورت ہی سے ظاہر ہوں
دوستوں میں اندر ہوں
گھر سے ہر دم باہر ہوں،
دیکھنے میں تو بندر ہوں
من کا لیکن سندر ہوں
اچھا خاصہ ایکٹر ہوں
کامیڈی میں جوہر ہوں
پانچ سو کا نوکر ہوں
پچیس برس کا جوکر ہوں
غالب ہوں نہ اکبر ہوں
میں تو چھوٹا شاعر ہوں

محمد حمید الدین حمید

جب سے پابندیٔ مے کتنی ہوگئی
ہجر کی رات بھی کیا بڑی ہوگئی
عشق کرتا ہوں اور جان دیتا بھی ہوں
اس کا نازک بدن آتشیں ہوگیا
کتنی چنچل ہیں کالج کی یہ لڑکیاں
ہیں یہاں بھی بہت ہی اہم ہستیاں

دخترِ رز کی پردہ دری ہوگئی
میری کھٹیا بھی تھی کھڑی ہوگئی
عشق کرنا مری زندگی ہوگئی
پھول پہلے تھی اب پھلجھڑی ہوگئی
جس کو دیکھو وہی پھلجھڑی ہوگئی
کتنی مشہور اب کا مٹی ہوگئی

میں ہوں بیڈھب مگر کام کا آدمی
میری مشہور اب لیڈری ہوگئی

معیارِ حُسن

پاوڈر، اسنو، لپ اسٹک کے طفیل
حسن کا معیار گھٹ کر رہ گیا
نوجوانوں کو حسینوں کا فریب
دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر گیا

بیڈھب کانٹوی

محمد یسین انصاری مالیگانوی

جھوٹ زندہ باد

صاحبو، صدقے جاواں اس جھوٹ کے۔ مانئے نہ مانئے، جھوٹ کامیابی و کامرانی کی علامت ہے۔ رزمگہ حیات میں فتح کی ضامن ہے۔ سربستہ رازوں کو کھولنے کی کنجی ہے۔ دشمن پر غالب آنے اور اسے مغلوب کرنے کا انتہائی آسان داؤ ہے۔ عوام کو رام کرنے اور شیشہ میں اتارنے کا بہترین آلہ اور آزمودہ نسخہ ہے۔ شہرت اور ترقی کا زینہ ہے۔ آج ہر جگہ جھوٹ ہی کا راج ہے۔ جھوٹ ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ جھوٹ کے بغیر زندگی کی گاڑی کھینچنا محال ہے۔ اس لئے اس کی جے جے کار کے نعرے لگائیے۔ بولئے، جھوٹ کی جے! جھوٹ..... زندہ باد و پائندہ باد!

آپ جھوٹ زندہ باد کے نعرے لگائیں نہ لگائیں پھر بھی جھوٹ زندہ و پائندہ ہے اور رہے گا اور کیوں نہ ہو۔ جھوٹ کو پروان چڑھانے میں، چھوٹے بڑے، امیر و غریب، حاکم و محکوم، مولوی و پنڈت، شیخ و برہمن، ادنیٰ و اعلیٰ، ایرے غیرے نتھو خیرے سبھی نے کمال سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ اس جھوٹ کو اتنا خون جگر دیا ہے کہ وہ اس سے پروان چڑھ کر ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا ہے جس کا اکھاڑنا جوئے شیر لانا ہے۔

جھوٹ کی کرم فرمائی کے تعلق سے علامہ اقبال کے چند اشعار تھوڑے ردّ و بدل کے ساتھ پڑھے جائیں تو جھوٹ کی صداقت کا لیبل چسپاں ہو جاتا ہے ؎

کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے جھوٹ
گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے جھوٹ
کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں جھوٹ
دشت و در میں، دہر میں، گلشن میں ویرانے میں جھوٹ

ارے بھائی، آپ تو حیرانی کی تصویر بنے جا رہے ہیں! آپ حیران کیوں ہو رہے ہیں؟ اگر آپ کو جھوٹ کی صداقت پر ذرا بھی شک ہو تو بذات خود جھوٹے بن کر، جھوٹ کہہ کر، اس جھوٹ کو پرکھ لیجئے۔

آپ کہیں گے عجیب احمق ہے، فول ہے، اول فول بک رہا ہے، دیوانہ ہے۔ بڑ ہانک رہا ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے اور گناہ عظیم کر رہا ہے۔ لیکن بھائی سچ کے باعث اس قدر گھاٹے اٹھا رہے ہیں اور اب اس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں کہ جھوٹ پر اتفاق سا ہو چلا ہے۔ اب چاہے جھوٹ گناہ ہو یا ثواب، ہم تو یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ جھوٹ سے فائدے ہی فائدے ہیں۔ ہم نے خود اسے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہے، برت کر تجربہ کر لیا ہے اور پھر ہمارے بزرگوں کا بھی تو کہنا ہے کہ اسی راستے پر چلیے جس پر چلنے سے فائدہ ہو۔

اب فرض کر لیجیے آپ نے کسی سے ہاتھا پائی کر لی۔ بھلے ہی آپ کے ہاتھ میں ایک پائی بھی نہ رہی ہو اور جیسا کہ عام طور پر ہاتھا پائی میں ہاتھ پہلے آتا ہے، اسی طرح آپ نے بھی اس ہاتھا پائی میں پہل کی ہو اور ہاتھ اٹھانے میں اوّل رہے ہوں اور اوّل رہنا ہم چاہیے کیونکہ اوّل نمبر رہنا اچھی بات ہے اور اتنی زیادتی کے باوجود آپ نے تھانہ پہنچ کر جھوٹی رپورٹ لکھوا دی، اگر رپورٹ نہ لکھواتے تو اندر اور جھوٹی رپورٹ لکھوا دی تو سکندر! یقیناً آپ کی جیت ہوگی۔

بالفرض کسی دشمن نے آپ پر مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ مقدمہ کا فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا جس کے حق میں ناحق بولنے والوں کی قطار زیادہ لمبی ہوگی۔

آپ کسی قسم کا بیوپار کرتے ہوں۔ چاہے امپورٹ، ایکسپورٹ کا، کپڑوں کا، چاہے بھاجی پالے کا، قدم قدم پر آپ کو جھوٹ کا سہارا لینا پڑے گا۔ ہر گاہک کو یقین دلانا ہوگا کہ آپ اپنے مال کو محض گاہک کو خوش کرنے کے لئے اونے پونے داموں فروخت کر رہے ہیں، جبھی آپ کی دکان چلے گی ورنہ ٹھپ۔

آپ اگر لیڈر ہیں تو دھواں دھار تقریر کرنا چاہیے اور اس تقریر کے دھارے میں آپ کا جھوٹ اس طرح گھل جائے کہ جھوٹ، جھوٹ ہی نہ معلوم ہو، جبھی آپ کی لیڈری کی دکان خوب چمکے گی۔ ہم ایسے بہت سے لیڈروں کو جانتے ہیں جنھوں نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر دھواں دھار تقریریں کیں اور جھوٹے وعدے کئے۔ عوام کو سبز باغ دکھائے لیکن مطلب نکل جانے کے بعد اس طرح غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ! اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی ہم نے انھیں خوشحال و فارغ البال ہی دیکھا ہے۔

اب کہاں تک جھوٹ کی کارفرمائیاں گنوائیں۔ جھوٹ کی عجوبہ کاریوں سے سچ کا کیا مقابلہ؟

ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی بات ہے کہ آخری مہینے کے آخری ہفتہ کا آخری دن تھا۔ نئے سال کی تعطیل کے باعث تنخواہ ایک روز پہلے ہی مل گئی۔ ہماری جیب گرما گرم تھی۔ واہ بھئی واہ، روپیہ بھی عجیب شئے ہے۔ جیب میں روپیہ ہو تو آدمی کی حالت عجیب ہوتی ہے۔ ہماری حالت بھی بدلی ہوئی تھی۔ روپے کی گرمی سے ہمارا چہرہ چمک رہا تھا۔ جسم میں عجیب توانائی آگئی تھی۔ ہم چلے جا رہے تھے۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ قدم بہت تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ سینہ تنا جا رہا تھا کہ راستے میں ایک مہربان مل گئے۔ یہ تھے قومی کارکن قسم کے آدمی۔ اُن کے ہاتھ میں چندے کی کچھ رسیدیں تھیں۔ انھیں دیکھ کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ خوشیاں بھاپ بن کر طرح اڑ گئیں۔ اس خیال سے کہ ایک آدھ پتہ ہاتھ سے گیا! ہم بڑے پس و پیش میں پڑ گئے۔ یکایک جھوٹ کے خیال سے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ہمارا چہرہ پھر دمک اٹھا۔ ہم نے جھوٹ کے داؤ پیچ آزمانے کے لئے پینترا بدلا اور جان بوجھ کر، انجان بن کر اپنی جگہ جم گئے اور کہا۔ "معاف کرنا، ہم ذرا جلدی میں ہیں، پھر ملیں گے۔" یہ کہہ کر ہم آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ بات آگے بڑھے بغیر ہی ختم ہو جائے لیکن انھوں نے ہمارا دامن تھام لیا اور آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اگر ذرا بھی زور آزمائی کرتے تو اپنی اکلوتی قمیص سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ وہ بولے "ارے کچھ گھنٹہ دو گھنٹے کا کام تھوڑا ہی ہے، کبھی کچھ خیال کیا کرو۔" ہم سمجھے وہ اخبار کے بل کا تقاضا کر رہے ہیں حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے تھے وہ کیا چاہتے تھے ہم۔ دوسرا داؤ آزمایا اور فوراً بول اٹھے۔ آپ کا خیال تو ہم ہمیشہ ہی کرتے آئے ہیں۔ کئی دنوں سے ہم بل ادا کرنے کی سوچ رہے

لیکن آپ نہ جانے کب اخبار پھینک کر رفوچکر ہو جاتے ہیں۔

انھوں نے کہا: "بھئی ہم اخبار کے ہی کے بارے میں نہیں، 'چل رے نوجوان' کے متعلق کہہ رہے تھے" ہم نے ان کی بات ہنسی میں اڑا کر کھسکنا چاہا اور بولے:

"بھئی یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ ہمیں آپ نوجوان سمجھتے ہیں اور پھر چلنے کی دعوت بھی دے رہے ہیں لیکن اس وقت تو ایک ضروری کام ہے۔ ہم اسٹینڈ تک جا رہے ہیں اور آپ مخالف سمت جا رہے ہیں۔ ہمارا آپ کا میل کیسے ہو۔ جانے دیجئے پھر کبھی!" اور ہم نے پھر قدم آگے بڑھانا چاہا لیکن ہماری ایک نہ چلی اور پھر انھوں نے ہماری قمیص کا دامن تھام کر جانے سے روک دیا اور وضاحت کرتے ہوئے بولے۔

"ارے بھئی آپ سمجھتے کیوں نہیں میں تو فلم 'چل چل رے نوجوان' کے چیریٹی شو کے متعلق کہہ رہا تھا جو اس ہفتہ کے دن نوزنگ لائبریری کے لئے ہم نے بجرنگ تھیٹر میں فکس کیا ہے۔ ایک ہفتہ سے ہم نے شہر کے چوراہوں پر بورڈ آویزاں کر رکھے ہیں۔ آپ تو قطعی لاعلم نظر آتے ہیں۔ کیا آپ نے اشتہارات نہیں دیکھے؟"

ہم نے جواب دیا: "بھئی راستہ چلتے ہوئے ہم آسمان نہیں دیکھتے۔ ہم آسمان تاکنے سے کتراتے ہیں۔"

بہرحال وہ ہمیں چھوڑتے نظر نہ آتے تھے۔ بضد ہو گئے کہ آپ کو پانچ روپے والا ٹکٹ بھڑوانا ہی پڑے گا۔ ہم نے ایک بار ان کی ٹانگ اور کھینچی کہ شائد ان کا شکنجہ ڈھیلا پڑے۔ ہم نے کہا: "آپ اخبارات تقسیم کرتے ہیں تو اکثر ہمیں پھٹا ہوا اخبار ملتا ہے۔ آپ اسٹیج پر تقریر کرتے ہیں تو کان کے پردے پھاڑتے ہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ نے ہماری قمیص ہی پھاڑ دی ہوتی اور اب ٹکٹ پھاڑنے پر اصرار کر رہے ہیں۔"

ہمارا یہ مذاق بھی انھیں کھلا نہیں اور پھر وہ لگے ٹکٹ پھاڑنے پر اصرار کرنے۔ ہم اسی ادھیڑبن میں تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ وہ بولے۔

"بھئی مذاق چھوڑیئے۔ آپ کو ٹکٹ خریدنے ہی پڑیں گے! کیونکہ یہ کوئی اپنے گھر کا معاملہ تو ہے نہیں۔ یہ تو لائبریری کا سوال ہے۔ قوم کی ایک ضرورت کا معاملہ ہے۔"

ہم نے جل کر کہا۔ "بھئی اگر یہ لائبریری کا سوال ہے تو ہماری جیب کا جواب یہ ہے کہ ہمیں معاف ہی رکھیے۔"

وہ بولے: "بھئی آج تنخواہ کا دن ہے اور آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے ہماری جیب میں ہاتھ ڈال دیا ہم نے جھٹ جیب پکڑلی۔ نوٹ ان کے ہاتھ آئے ضرور لیکن وہ نکالنے سے قاصر رہے۔

"اتنے سارے نوٹ ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ پیسے ہی نہیں؟"

ہم نے جان لیا کہ یہ حضرت ٹلنے والے نہیں جب تک انھیں کسی اور جھوٹ سے قائل نہ کیا جائے۔ ہم نے فوراً بات کا رخ بدلا اور کہا۔

"بھئی یہ میرے اپنے روپے تھوڑے ہیں۔ یہ تو اس غریب الوطن کے روپے ہیں جو اپنے وطنِ عزیز کو لوٹنا چاہتا ہے اور اسٹینڈ پر ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ ہم وہیں جا رہے تھے۔ ہم نے کچھ دوستوں سے چندہ وصول کیا ہے تاکہ ہم اسے بخیر و خوبی روانہ کر سکیں جلدی میں میں تو بھول ہی گیا تھا۔" ہم نے فوراً دستِ سوال دراز کر دیا۔ "آپ بھی اس بیچارہ کی کچھ مدد کیجئے۔"

اس داؤ پر تو وہ حضرت چکرا ہی گئے۔ بغلیں جھانکنے لگے۔ بہت پس و پیش کے بعد انھوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک روپیہ کا نوٹ نکال کر بڑی بے دلی سے ہماری طرف بڑھایا۔ ہم نے کہا۔

"نہیں بھئی، ایک روپے سے کام نہیں چلے گا۔ اس غریب کو کرایہ کے لئے چھ روپے کم پڑ رہے ہیں۔ اس لئے ہم چھ

روپے سے کم ہرگز نہیں گے۔" اس پر انھوں نے معذرت چاہی اور کہا واقعی اُن کے پاس ایک روپے سے زیادہ نہیں۔ ہم نے ایک داؤ اور کیا اور بولے ۔" یہ ایک روپیہ دے دیجئے اور ایسا کیجئے پانچ روپے کا ٹکٹ لائبریری کی امداد کا پھاڑ دیجئے میرے نام پر ــــ کل چھ روپے میں اس غریب الوطن کو اپنی جیب سے دئیے دیتا ہوں اور آپ لائبریری کے فنڈ میں پانچ روپے بعد میں دے دیجئے گا۔ آپ کا ہمارا حساب برابر ــــ"

یہ کہہ کر ہم نے ان کے ہاتھ سے ایک روپیہ کا نوٹ اچک لیا اور پانچ روپے کا ٹکٹ بھی لے لیا۔ مزید گفتگو کئے بغیر سلام کیا اور یہ جا وہ جا۔

اب ہمارے چہرے پر خوشی ہی پھوٹ رہی تھی۔ ہمارے قدم بہت تیزی سے اٹھ رہے تھے۔

٥

٥٥

انصاری اصغر جمیل، ناگپور

"آئی لو یو"

انگریزی کا ایک لفظ ساری (sorry) آج کل ہر زبان میں رائج ہے۔ (آپ ساری پر چاند لگنے سے چونکئے نہیں (sorry) انگریزی لفظ ہے اگر اسے اردو میں "و" کے اضافے کے ساتھ لکھیں تو سواری پڑھا جائیگا اور اگر "و" کا اضافہ نہ کریں تو ساڑی والا ساری پڑھا جائیگا جس سے اس لفظ کا مفہوم پورا نہ ہوگا اس لئے اس کی پیشانی پر چاند کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ آپ اسے صحیح طور پر پڑھ سکیں اور انگریزی زبان کی ٹانگ نہ توڑ سکیں) غرض یہ کہ آپ سے دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی غلطی ہو جائے تو فوراً ساری کہہ دیجئے سارا قصہ ختم آجکل تو یہ حال ہے کہ رکشے والے بھی جان بوجھ کر پیدل چلنے والوں کو مار دیتے ہیں اور فوراً کہہ اٹھتے ہیں ساری اور آپ انگریزی زبان کا خیال کرتے ہوئے صرف مسکرا دیتے ہیں اور خیر کوئی بات نہیں (حالانکہ اسوقت آپکا دل تو چاہتا ہے کہ رکشہ والے کو رکشہ سمیت اٹھا کر کارپوریشن کی گڑھی میں ڈال دیا)

بالکل اسی طرح انگریزی زبان کا ہی ایک جملہ بھی ہے۔ "آئی لو یو" (I love you) اگر آپ کو کسی سے پیار ہو جائے تو محبوبہ یا محبوب کو سالہا سال ایک ٹک دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں صرف ہمت کیجئے اور "آئی لو یو" کہہ دیجئے۔ اس منتر سے محبوبہ سر کے بل آپکے قدموں پر حاضر ہو جائیگی۔ ہمارے خیال میں "آئی لو یو" کا اردو ترجمہ ہونا چاہئے تھا "میں پیار اور تم" اور وہ اس طرح کہ "آئی یعنی "میں" لو یعنی "پیار" اور یو یعنی تم (یہ ضروری نہیں کہ آپ بھی ہمارے خیال سے متفق ہوں) لیکن کیا ہو اس انگریزی زبان کا جس میں "چچا کو بھی انکل" "ماموں کو بھی انکل" اور خالو کو بھی انکل" کہتے ہیں بالکل اسی طرح اردو میں بھی اس جملہ کا ترجمہ کیا گیا "میں تم سے پیار کرتا ہوں" (اگر آپ مذکر ہوں اور آپکے مدِ مقابل مونث ہو) یا "میں تم سے پیار کرتی ہوں" (اگر آپ مونث اور آپکے مدِ مقابل مذکر ہو) ساری کی طرح یہ جملہ بھی آجکل بہت مشہور ہے بس یہ سمجھ لیجئے کہ جس طرح ناگپور کے سنترے اور کشمیر کے سیب مشہور ہیں اسی طرح یہ جملہ بھی۔ دراصل دیکھا جائے تو یہ جملہ کالج اسٹوڈنٹس کی جاگیر ہے۔ والدین اپنی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت کے لئے کالج میں داخل کرتے ہیں لیکن وہاں جاکر وہ تعلیم حاصل کرنے کی بجائے "آئی لو یو" کی گردان کرتے رہتے ہیں۔ یہ جملہ کسی بھی خاندان، طبقہ یا نسل میں کوئی فرق محسوس نہیں ہونے دیتا اس سے آپ یہ نتیجہ اخذ نہ کیجئے کہ ہم اپنے آپ کو پارسا ثابت کر رہے ہیں بلکہ حقیقت تو ہے کہ ہم نے ایک دو نہیں بلکہ بارہا یہ جملہ مختلف حسیناؤں کے روبرو دہرایا ہے جس کے نتیجہ میں ہمیں ہر بار نئی نئی مشکلات کا سامنا

کرنا پڑا۔ ہمیں یہ جملہ دہرانے کی ایسی لت پڑ چکی تھی کہ کسی کے سامنے بھی یہ جملہ ہماری زبان سے بات بات میں نکل پڑتا تھا۔ اور اسی وجہ سے ہمیں کئی بار والد صاحب و بھائی فلاں کے ہاتھوں تھپڑ کھانے پڑے کیونکہ ہم نے ان سے بھی کہا تھا "آئی لو یو" ہم آپکے سامنے صرف دو واقعات دہرانا چاہتے ہیں جن میں "آئی لو یو" دو مختلف نسلوں کی حسیناؤں کے سامنے دہرائے گئے ہیں لیکن دونوں کے انجام میں مہاراشٹرا اور کشمیر کا فرق ہے۔

ہم نے بے شمار مجنوؤں کو اپنی لیلاؤں سے "آئی لو یو" کہتے سنا اور دیکھا تھا جس کے جواب میں چند لیلائیں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی لپا اسٹک کی کمر لچکاتے ہوئے جواب میں آئی لو یو کہا کرتی تھیں لیکن ان میں سے چند ایسی بھی تھیں جنہوں نے اپنے مجنوؤں کو اسکے جواب میں "آئی ہیٹ یو" (I hate you) بھی کہا تھا۔

ہم نے بھی اس سلسلے میں ایک تجربہ کرنا چاہا اور اس کے لئے ایک کالی کلوٹی لڑکی کو پسند کیا۔ ہماری لیلیٰ کانونٹ اسکول کی طالبہ تھی جو روزآنہ ہمارے اسکول کے سامنے سے نو بجکر ساڑھے بارہ منٹ پر گزرتی تھیں۔ کچھ دنوں تک ہم نے اس کا بغور جائزہ لیا اور پھر ہمارا کام شروع ہوگیا۔ نہ جانے کیسے ایکدن اس نے ہمیں آنکھ ماردی ہم سمجھ گئے کہ بس ہمارا کام بن گیا اور "آئی لو یو" کا نعرہ بلند کرنا چاہئے لہٰذا ایک دن سناٹا دیکھ کر ہم نے اس سے کہدیا "آئی لو یو" اور وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ اور نہ جانے کیسے اس نے ہمارے گھر کا پتہ لگالیا اور ہماری گلی کے چکر لگانے شروع کر دئے۔ وہ ہمارے پیچھے اس طرح لگ گئی جس طرح شہد کے پیچھے مکھی۔ نتیجتاً ہمیں وہ اسکول اور شہر بھی چھوڑ دینا پڑا جس کا ہمیں آج تک افسوس ہے (آج بھی اسکی یاد آنے پر ہم بستر میں گھس کر آنسو بہاتے ہیں۔)

دو سال سڑکوں پر آوارہ گردی کی طرح پھرنے کے بعد ہم نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج میں جب آنکھ کھلی تو چاروں سمت ہم نے خوبصورت لڑکیوں کی ٹولیاں دیکھیں۔

کالج میں ایک اعلیٰ نسل کی خوبصورت حسینہ سے ہمیں سچی محبت ہوگئی۔ ہمارے دانت اس پر جم گئے۔ ہم اسے کسی بھی صورت میں حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن وہ ہمارے آگے گھاس بھی نہیں ڈالتی تھی۔ اور بقول ناظم انصاری ؎

دیوانہ اس نے کر دیا ایک بار دیکھ کر
ہم کچھ بھی کر سکے نہ لگاتار دیکھ کر

غرض اسی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں پورا سال گزر گیا۔ نہ ہم نے اس سے بات کی اور نہ ہی اس نے ہم سے۔ ہمیں اس سے بات کرنی تھی لیکن بات کرنے کی کوئی صورت ہی نظر آرہی تھی۔ وہ کالج کا آخری دن تھا اور بات کرنے کیلئے ہمیں "آئی لو یو" یاد آگیا۔ اسے تنہا دیکھ کر ہم اس کے قریب پہنچے اور اپنی ساری قوتوں کو یکجا کر کے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن رعب حسن سے ہماری زبان گنگ ہوگئی تھی۔ اور پھر نہ جانے کیسے ہماری زبان سے "آئی لو یو" نکل گیا۔ یہ سُن کر وہ پہلے ہولے سے مسکرائی۔ ہم بھی اسے دیکھ کر مسکرا دئے۔ وہ نیچے کی جانب جھکی ہم نے سوچا شاید وہ ہمارے پیر چھو کر اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتی ہے۔ لیکن ہم نے اچانک اس کے خوبصورت اور نازک ہاتھوں میں باٹا

شوکیس کی نئی سینڈل دیکھی اور ایک شریف النفس کیل اپنا سر اُٹھائے کسی حکم کی منتظر تھی۔ اور اپنے آقا کا حکم پاتے وہ کیل ہمارے چہرہ پہ ہندوستان کا نقشہ بناتی چلی گئی۔ (شاید اس حسینہ نے جان بوجھ کر ایک کیل اپنی سینڈل میں اسی کام کیلئے وقف کر رکھی تھی)۔ اور ہم نے یہ سب ایک سچے عاشق ہونے کے ناطے برداشت کر لیا۔

لیکن موقع پاکر ایک روز اسے زبردستی لے اڑے اور شادی رچالی۔ اب وہ ہر صبح و شام ہمارے چہرہ پہ بنے ہندوستان کے نقشہ کو دیکھ کر "آئی لو یو" کی مالا جپتی ہے —— ▲

ایک ملک ــــ ایک قوم

سائنس لیبارٹری میں ــــ

"پروفیسر کپور" ریسرچ کا کام کرنے والوں اور طالب علموں کے ساتھ ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ جب سے وہ لیکچرار بن کر پونا آئے ہیں، بڑے ہی ہردلعزیز ہو گئے ہیں۔ اُن کو اس جگہ سے بڑی محبت ہو گئی ہے۔ اُن کے بچے فر فر مراٹھی بولتے ہیں۔ اُن کے رفیق کار اور طالب علم گھروں میں مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں اور مختلف قسم کے کھانے کھاتے ہیں، مگر لیبارٹری میں وہ ایک ہی زبان بولتے ہیں، اور وہ ہے سائنس کی زبان۔ علم کسی حدبندی کو نہیں مانتا۔

حدبندیاں نکمّے آدمیوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں، ان کو دُور کرنے میں مدد دیجیے

نظام الدین نظام

ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے

"بھوک" کتنا چھوٹا سا لفظ ہے لیکن ساری دنیا کو نچائے ہوئے ہے۔ سارے مفکروں، مدبروں اور ادیبوں نے اسے اپنا موضوع بنایا اور یہ ثابت کیا کہ روئے زمین پر بسنے والے ہر جاندار کے پیٹ سے اس کا تعلق چولی دامن سے بھی کچھ زیادہ ہی مضبوط ہے۔ کئی چولیاں بغیر دامن کی ہو سکتی ہیں مگر وہ پیٹ آج تک نظر نہیں آیا جس میں بھوک نہ ہو اور اگر کوئی پیٹ ایسا ہے تو پھر وہ پیٹ نہیں (بیچش کے وائرس کا گھر ہے (بلکہ گاؤں ہے)۔ چونکہ ہر جاندار پیٹ رکھتا ہے، اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر جاندار بھوک کو محسوس کرتا ہے۔ اب اگر ہم "دانشوروں" کے سے انداز میں سوچیں تو بھوک پیٹ کی ہی نہیں اور کئی چیزوں کی ہو سکتی ہے۔ مگر ہماری بحث پیٹ کی بھوک کے گرد گھومتی ہے کیونکہ دنیا کا ہر شخص پیٹ کے گرد گھومتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ انسان صرف کھانے کے لئے ہی زندہ ہے بے شک بعض آدمی ایسے بھی ہوں گے جو صرف جینے کے لئے کھاتے ہوں گے۔ مگر کھاتے تو ہیں نا! بھوک مٹانے کے لئے ہی سہی! تو صاحب گویا آپ بھی اسی زمرے میں آگئے۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں جس میں بھوک نہ ہو وہ پیٹ نہیں۔ اور پیٹ ہے تو بھوک ضرور لگے گی، جب بھوک لگتی ہے تو سارے نقاب آہستہ آہستہ اتر جاتے ہیں اور اصلی چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ جب تک پیٹ بھرا رہتا ہے لوگ ہنس ہنس کر زندگی گزارتے ہیں تاکہ سماج میں خوش مزاج ثابت ہوں۔ مگر جہاں بھوک لگی ساری خوش مزاجی معدہ میں پہنچ کر ہضم ہوئی اور بھوک تب بھی نہ مٹی تو جھنجھلاہٹ کے دورے پڑنے لگے۔ اسی طرح اگر کسی کو شاعر یا سخن شناس ہونے کا دعویٰ ہے تو بس اس وقت تک جب تک پیٹ میں بھوک کا گزر نہیں۔ خوب لہک لہک کر اشعار سنائے گا۔ میر و غالب سے لے کر احمد فراز اور عبداللہ کمال تک کے اشعار بر وقت یاد آئیں گے۔ مگر جہاں بھوک نے انگڑائی لی کیسے غالب اور کیسے کمال ـــــ کمال تو بھوک کا ہے کہ شاعری تو کیا مصوری، موسیقی تک بھلا دیتی ہے مگر اس کے باوجود بھی ہم ازراہ خلوص کسی کو یہ دعا نہیں دے سکتے کہ "خدا آپ کو بھوک سے بچائے" کیونکہ جس کے حق میں دعا کی جا رہی ہے ذرا سمجھ دار ہوا تو فوراً تاڑ جائے گا کہ آپ اس کی تندرستی کے دشمن ہیں اور تندرستی کسے پیاری نہیں ہوتی۔

چچا غالب جو زندگی بھر شراب کا زہر پی پی کر اپنی تندرستی کے دشمن خود ہی بنے رہے آخر میں وہ بھی کہہ گئے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے اور تندرستی کیسے قائم رہ سکتی ہے جب آدمی کھائے پئے ہی نہیں اور صاحب کھانا پینا اسی وقت ہو سکتا ہے جب بھوک محسوس ہو۔ تو گویا غالب کا بھی یہی خیال تھا کہ بھوک ہزار نعمت ہے کیونکہ "تندرستی اگر نہ ہو" کہہ کر انھوں نے اور زیادہ واضح کر دیا کہ کھانے پینے کی کوئی شئے مفت ملتی رہی، اب اگر ہاتھ ہی تنگ ہو تو کوئی دوکاندار ہمیں قریب بھی پھٹکنے دے گا؟ ہاں اگر اُدھار چلتا ہو تو بات دوسری ہے مگر اُدھار بھی کب تک چلے گا۔ ایک نہ ایک دن بنیا تقاضہ کرے گا ہی کیونکہ بنیا بھی انسان ہے سو وہ بھی پیٹ رکھتا ہے اور بھوک اسے بھی ستاتی ہے اور چونکہ بنیوں کا پیٹ ذرا کچھ زیادہ ہی بڑا ہوتا ہے اس لئے وہ زیادہ اچھے قسم کا کھانا چاہتا ہے اور اچھا وہ اسی وقت خرید سکے گا جب آپ قرض کی رقم ادا کر دیں ـــــ غرض کہ صاحب بڑی ظالم چیز ہے یہ بھوک اس لئے ہم خدا سے دعا گو ہیں کہ بھوک ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے۔ آمین!

ڈاکٹر ایس۔ پی۔ کھتری
مترجم: کالیکا پرشاد

گپ بازی کا آرٹ

اگر آپ اسے بھی گپ نہ سمجھیں تو جان لیجئے کہ گپ اڑانا بھی حقیقت میں ایک آرٹ ہے۔ اس آرٹ کے فن کار سبھی جگہ ایسے پھیلے ہوئے ہیں جیسے شاعر کی آہ اور مصور کی تصویروں کی نمائش۔

جس طرح کوئی چاٹ والا ہمہ اقسام کے لوازمات کی چیزوں کی نمائش لگا کر گاہکوں کے ذوق کے مطابق انھیں اپنی پسند کی چیزیں فراہم کرتا ہے اور مصالحوں کی پیالیوں میں اس کی انگلیاں کسی ستار بجانے والے کی انگلیوں کی طرح تیزی سے چلتی پھرتی ہیں اور کھانے والے چٹخارے لے کر داد دیتے ہیں اور کھاتے ہوئے زیچ نہیں ہوتے اسی طرح گپ اڑانے والا آرٹسٹ زندگی کے سبھی پہلوؤں پر سرگم بجاتا ہوا اپنی محفل میں کئی سامعین اکٹھا کر لیتا ہے۔ اس کا آرٹ سبھی کو متاثر کرتا ہے اور آخر میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ جو سُنے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ سُنے وہ بھی پچھتائے۔

کامیاب اور نامور گپ باز بننے کے لئے تین باتیں نہایت ضروری ہیں۔ پہلی تو یہ کہ گپ باز کو اپنے نانا یا دادا یا پرنانا یا پر دادا میں سے کسی کو ختم کرنا لازمی ہے کیوں کہ اس کے بغیر کامیاب گپ باز بننے کی بالکل گنجائش نہیں۔ مثال کے طور پر میں آپ کو ایک بہت پرانی کہانی یاد دلا دوں جس میں دو گپ باز خم ٹھونک کر اکھاڑے میں اتر گئے۔ ایک صاحب نے کہا "جناب! کیا بتاؤں کہ میرے دادا کا کیا زمانہ تھا۔ آج کل جہاں اپنے خاندان کے افراد کے علاوہ ایک گدھا بھی نہیں رکھ سکتا ہوں اور رہنے کے لئے صرف ایک کوٹھری وہاں میرے پردادا باون لاکھ چھیاسٹھ ہزار نو سو ننانوے گھوڑے رکھتے تھے اور ان کے اصطبل میں اس تعداد کی دس گنی آ سکتی تھی"۔ دوسرے گپ باز نے کہا۔ "جناب آپ کیا کہتے ہیں؟ میرے پرنانا کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا! جب پانی نہیں برستا تھا تو علاقہ کے سب لوگ ان کے ہاں دستک دیتے اور کہتے۔ پنڈت جی اپنا وہ بانس نکالئے جس سے آپ بادل چھید کر پانی برساتے ہیں ورنہ ہم لوگ بن پانی کے مر جائیں گے۔ اتنا سنتے ہی ہمارے پرنانا ایک ہاتھ میں وہ بانس نکال لاتے جو بادلوں کو چیرتا ہوا پانی کی جھڑی لگا دیتا"۔ یہ سُن کر پہلے گپ باز کی ہمت کچھ ٹوٹ گئی اور اس کے دل میں شک نے سر ابھارا۔ وہ بولے۔ "مگر پنڈت جی یہ تو بتلایئے کہ آپ کے پرنانا! وہ بانس کہاں رکھتے تھے؟" پنڈت جی کو جواب دینے میں دیر نہ لگی۔ انھوں نے کہا۔ "یار کیا بات پوچھی۔ رکھتے کہاں تھے؟ تمہارے دادا کے اصطبل میں اور کہاں؟

بھائی دونوں گہرے دوست تھے اور ایک دوسرے کے کام آنا پرانے لوگ ہی جانتے تھے۔"

ہاں! اگر گپ باز کے دادا یا نانا زندہ ہوں تو بات تو بن سکتی ہے مگر اُس میں یہ بات نہیں آسکتی۔

گپ باز کے لئے دوسرا گُن یہ ضروری ہے کہ سامعین میں سقراط اور ارسطو جیسے فلسفی نہ ہوں بلکہ ایسے بھلے مانس ہوں جو بھلے مانسوں کی بات کا یقین کریں اور اپنے علم و معلومات کا دفتر نہ کھول کر اپنی شرافت کا ہی ثبوت دیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو گپ باز اپنی دوکان بڑھا چلیں گے اور سب بھلے مانس ماتم کرتے پھریں گے۔

" وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے!"

گپ باز کے لئے تیسرا اور سب سے زیادہ اہم گُن یہ ہونا چاہئے کہ اُس میں ذرا بھی جھجک نہ ہو۔ گپ بازی اور جھجک میں پشتینی عداوت ہے اور جس قدر بے جھجک ہو کر گپ بازی کی جائے گی گپ بازی کا آرٹ اتنا ہی نکھرے گا اور سامعین دم سادھے اُسے سننے میں محو رہیں گے۔ میرے ایک پروفیسر دوست کا خیال ابھی ابھی آیا۔ میں ایسے گپ بازوں کی اعلیٰ ترین صف میں رکھوں گا۔ ہاں! میں یہ بتلانا تو بھول گیا کہ گپ بازوں کو میں تین درجوں میں رکھوں گا۔ سب سے ادنیٰ درجہ کو میں "گپی" کہوں گا۔ دوسرا درجہ جو اس سے اونچا ہے اُسے میں "گپ باز" کہوں گا اور اعلیٰ ترین ماہرِ فن گپ بازی "مہاگپ باز" کے نام سے پکاروں گا۔ ان سبھی کے الگ الگ اصول ہوں گے۔ اپنے پروفیسر دوست کو میں "مہاگپ باز" ہی کہوں گا کیونکہ اس سے کم درجہ دینا گویا ان کے فن کا مذاق اڑانا ہے۔ جب وہ اچھے موڈ میں ہوتے ہیں اور ان کو ہم جیسے شریفوں کی صحبت حاصل ہوتی ہے تو وہ ایک سگریٹ اپنے لمبے سگریٹ ہولڈر میں لگا لیتے ہیں اور بڑے قرینے سے دیاسلائی جیب سے نکال کر اسے ایک منٹ کھنکناتے ہیں اور اپنے داہنے ہاتھ کی تین انگلیوں کو موڑ کر الگ کرتے ہوئے دو انگلیوں سے تیلی نکالتے اور سگریٹ جلا کر اس کے دھوئیں کے مرغولے ہوا میں اڑاتے ہوئے کہتے ہیں۔ "ارے بھائی، مجھ سے یہ نوکری نہیں ہوسکتی۔ میری طبیعت بھی اب اُچاٹ ہوگئی ہے اور اسی لئے میں نے چار سو بیس ایکڑ کا ایک فارم خرید لیا ہے اور اس کے چاروں طرف میں نے بجلی کا ننگا تار چہار دیواری کی طرح پھیلا دیا ہے۔ آپ پوچھیں گے کیوں؟ بات یہ تھی" وہ خود ہی جواب دیتے۔ "وہ علاقہ جنگلی جانوروں کا ہے اور میں نے یہ نیا تجربہ اس لئے کیا کہ دنیا کی آنکھیں تو کھلیں۔ رات کو تمام جنگلی جانور سناٹے میں پھلوں کی کھیتی اجاڑنے آتے اور بجلی کا تار چھوتے ہی وہ راہی ملک عدم ہو جاتے ہیں اور میں صبح اٹھ کر دیکھتا ہوں کہ پچیسوں چیتے، سیکڑوں تیندوے، ہزاروں ہرن، لاکھوں چڑیاں مری پڑی ہیں۔ آپ سمجھیں گے شاید یہ مصیبت تھی" پھر وہ خود جواب دیتے۔ "جی نہیں! یہ تو ایک پنتھ دو نہیں تین کاج ہوئے۔ میں نے وہاں ایک بڑی بھاری فیکٹری کھول دی جس میں چیتے اور تیندوں کی کھالیں صاف کی جاتی ہیں اور ہرن کے چمڑے سے خوبصورت "مرگ چھالے" بنائے جاتے ہیں۔ شاید آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہرنوں اور چڑیوں کا گوشت میں یوں ہی پھینک دیتا ہوں" وہ پھر جواب دیتے۔ "جی نہیں ان سب کے لئے بھی میں نے ایک دوسری فیکٹری کھول رکھی ہے جہاں ان کا گوشت نہائت سائنٹفک طریقوں سے ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے اور ایک بدیشی کمپنی سے میں نے بیس سال کا ٹھیکہ بھی لے لیا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ آپ کو اتنے مزدور کہاں ملتے ہیں؟" سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے وہ کہتے۔ "جناب میرے فارم کے آس پاس کے سیکڑوں گاؤں میں ایک بھی آدمی، عورت اور بچہ بے کار نہیں ہے اور یہی نہیں وہ میری نوکری سے الگ ہونا بھی نہیں چاہتے آپ سب پوچھیں گے کیوں؟ بھائی اس کا سبب یہ ہے کہ میں ان کی اتنی خبر گیری کرتا ہوں کہ کوئی سرکار بھی کیا کرے گی چاہے وہ کیسی بھی کیوں نہ ہو۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس علاقہ میں مچھر بہت ہیں اور ملیریا بُری طرح پھیلتا ہے۔ میں نے پچھلے سال ہر ایک کو مچھر دانیاں بنوا دیں اور اگر آپ رات کو کبھی میرے علاقہ میں گھوم جائیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ سفید چھتریاں اوڑھے لاکھوں آدمی پیراشوٹ سے اتر پڑے ہیں۔" اتنے پر بھی ان کی کہانی ختم نہیں ہوتی اور ہم ان کی پیشہ ورانہ سوجھ بوجھ اور دور اندیشی کو سراہتے

ہوئے دنگ رہ جاتے۔

گپ بازی میں دوسرا درجہ "گپ باز" کا ہے۔ لگے ہاتھوں ایک واقعہ گپ باز کا بھی سن لیجیے۔ میرے ایک دوسرے دوست جو پروفیسر بنتے بنتے وکیل بن گئے ہیں شاید ان کا شمار گپ بازوں میں ہی ہوتا ہو۔ ایک دن یوں ہی کتابوں اور کتب خانوں کا ذکر چل رہا تھا۔ ہم لوگ کتب خانوں سے کتب حاصل کرنے اور الماریوں سے انھیں نکلوانے کی مشکلات پر بحث کر رہے تھے۔ اتنے میں ہی ہمارے وکیل گپ باز دوست وہاں آگئے اور انھوں نے کہا۔ "آپ لوگ بھی کتنے دقیانوسی ہیں۔ کبھی ہمارے یہاں آئیے تو دیکھیے میں نے اس دقت کو بڑی خوبی سے دور کر دیا ہے۔ میں نے ایک لمبی میز بنوا رکھی ہے جس پر ٹائپ کرنے کی مشین جیسی کنجیاں لگی ہوئی ہیں۔ اگر مجھے کرشن چندر کی کوئی کتاب پڑھنے کی خواہش ہوئی تو میں نے بٹن دبا دیا۔ بٹن دباتے ہی ایک ہاتھ اٹھتا ہے جو سیدھے الماری پر جاتا ہے اور اسے اٹھا کر میرے سامنے لا رکھتا ہے اور کتاب پڑھ لینے کے بعد دوسرا بٹن دباتے ہی ایک دوسرا ہاتھ سامنے آتا ہے اور کتاب اٹھا کر الماری میں رکھ دیتا ہے۔"

تیسرا درجہ "گپی" کا ہے۔ یہ بہت ہی اوچھے اور ہلکے قسم کا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی باتوں میں نہ تو گپ بازی کی خوبصورتی ہوگی اور نہ ہنسی مذاق پیدا کرنے کی استطاعت۔ ان کی گپ جھوٹ معلوم دیتی ہے اور اس میں بھونڈا پن زیادہ ہوگا اور تعجب کم۔ لکھنؤ کی شہری زبان میں انھیں شاید لیمو نچوڑ کہتے ہیں۔ جب کبھی کسی رئیس کے ہاں دعوت ہوتی ہے یا کھانے کا وقت ہوتا ہے تو وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں اور اپنے گھر پر بنے ہوئے خیالی پلاؤ کی تعریف کرتے ہوئے لیمو کے فائدوں پر سیر حاصل تقریر کرتے ہوئے فوراً جیب سے لیمو نکال حاضر کرتے ہیں اور کہیں نہ کہیں روز ہی مہمان بن جاتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ آرٹ ہونے کے ناطے گپ کا آرٹ بھی اعلیٰ درجے کے فن کاروں کو ڈھونڈتا ہے اور جب اعلیٰ فن ادنیٰ لوگوں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے تو اس کی درگت نہ ہو تو کیا ہو؟ عصر حاضر میں اس آرٹ کی اہمیت شاید پچھلے زمانوں سے زیادہ ہے کیوں کہ گپ بازی ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کی بے حد خوبصورتی سے عکاسی کرتی ہے۔ جو کچھ بھی ہم حاصل نہ کر سکے اور جو کچھ ہم سے نہ ہو سکے۔ گپ باز ہمارے سامنے سب کچھ لا دیتا ہے اور ہمیں سب کچھ بتا دیتا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں وہ ہمیں زندگی کی ایسی جھلکیاں دکھلا دیتا ہے جس کی طرف ہم ایک سارس کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں۔ لیکن جہاں اس زمانہ میں گپ کے آرٹ کی بے حد ضرورت ہے وہاں اس کے کئی دشمن بھی جنم لیتے جا رہے ہیں۔ گمبھیر سیاست داں، علم و دانش کا چولہ پہنے ہوئے عالم اور دانشور اور سچ اور جھوٹ کا انبار لگائے ہوئے دھرماتما اور آتما اور پرماتما کی رسہ کشی میں پڑے ہوئے دھرم کے ٹھیکیدار، گپ بازی کی عظمت کو کیا پہچانیں گے؟ جو افضلیت موسموں میں موسم بہار کو ملی ہے وہی افضلیت بات چیت میں گپ کو ملنی چاہیے اور جب تک ہم گپ بازوں کو دوبارہ ان کے باوقار عہدے اور نشست پر نہیں لا بٹھاتے ہماری موجودہ زندگی بے کیف و بے جان ہو جائے گی اس لیے بھی اگر آپ گپ کو آرٹ نہ سمجھیں اور گپ ہی سمجھیں تو یہی کہنا پڑے گا۔

"پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا"

٭٭

پرویز یداللہ مہدی

چہ خوب

آنکھوں میں جو کاجل کی اک لکیر ہے جاناں

بندہ اسی لکیر کا فقیر ہے جاناں

دنیا نے محبت جسے کہتے ہیں اہل دل

خادم اسی جہان کا سفیر ہے جاناں

بے دھڑک کے اس قطعہ پر کلب کے اس مخصوص خطّے میں دھوم مچ گئی جو شانذ لائبریری کا کام دیتا تھا۔ یہ چار مصرعے بے دھڑک نے دراصل حسینوں کے ایک گروپ کی نذر کیے تھے لیکن داد کے معاملے میں ان حسیناؤں نے انتہائی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ اور فراخدلی سے داد دے کر تن تنہا اس خطۂ کلب میں دھوم مچانے کا سہرا اگر کسی کے سر بندھا تو وہ ہمارا واحد سر تھا۔ حسینوں کا یہ ادب ناشناس نافہم گروپ یقیناً اس بے بہرہ نسل سے تعلق رکھتا تھا جس کا نہ صرف ذریعۂ تعلیم انگریزی ہوتا ہے بلکہ ہر معاملہ میں جو انگریزوں کی نقالی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں ——

ہم پر نظر پڑتے ہی بے دھڑک لپک کر ہمارے قریب پہنچ گیا —— "آپ نے میرے چار مصرعے سُنے ان کے زاویے اور پیمانے ملاحظہ فرمائیے ——؟

" غالباً آپ نے میری داد فریاد نہیں سنی شاید جناب ترسیل کے المیئے میں ڈوبے ہوئے تھے ——" ہم نے حسینوں کے اس گروپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جواب میں بے دھڑک کچھ دیر تک شرماتا رہا پھر بولا —— " دیکھئے میں بھی اپنے تمام زاویوں اور پیمانوں کی قسم کس قدر اُلّو کا پٹھا ہوں"

" دراصل چہ خوب —— " فوراً ہماری زبان سے نکلا۔

" جی —— کیا —— کی —— عینک کے پیچھے اس کے گول گول دیدے گھوم گئے۔

" میرا مطلب ہے کہ آپ نے کسر نفسی سے کام لیا ——"

" یعنی کہ ——"

" یعنی کہ لاحول ولا قوۃ کہنا کچھ چاہتا تھا کہہ کچھ گیا' میرا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو اُلّو کا پٹھا کہہ کر تمام الوؤں اور ان کے پٹھوں کو بڑی خوب صورتی سے عقلمند ثابت کر دیا۔ جی ہاں —— " ہماری اس نامعقول دلیل پر وہ نامعقول ریشہ خطمی ہونے لگا۔ پھر بولا —— " آپ کی یہ باتیں اور باتوں کے زاویے و پیمانے ہی تو ہیں جن کی وجہ سے دو چار دن میں ہی سارا شہر آپ کا گرویدہ ہو گیا ہے۔ محفلوں پر یوں چھا جاتے ہیں آپ جیسے ہم کی سفیدی پر خضاب' اور یہ سارا کرشمہ ہے آپ کی زبانِ مبارک کا اور اس کے زاویوں اور پیمانوں کا —— خیر' اس سے پہلے کہ مجھے دار باتوں کے زاویے اور پیمانے مجھے دوبارہ اُلجھا لیں میری مبارکباد قبول فرمائیے ——؟"

" مبارکباد —— ! کس خوشی میں —— ؟" ہم نے تحیّر سے پوچھا

" واہ صاحب کیا تجاہلِ عارفانہ ہے —— ! قربان جائیے آپ کے اس بھولپن کے کیا زاویے اور پیمانے ہیں' ہم تو سمجھتے تھے کہ سیّد کی صرف باتیں ہی باتیں ہیں مگر معلوم ہوا کہ باتیں تو صرف ہم بناتے ہیں اور سیّد کام کرتا ہے ——"

بے دھڑک کی اس بے پر کی پر اس نے بات کو اور الجھا دیا ہم نے جھنجلا کر کہا ——— "بھئی ہم اب بھی آپ کی اس گول مول بات کا مطلب نہیں سمجھا ———؟"

"ہاں صاحب، آپ بھلا کیوں سمجھیں گے، بڑے پن کی ہی تو نشانیاں ہیں بڑے آدمیوں کے زاویے اور پیمانے بھی بڑے ہوتے ہیں ——— بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دینا اور یوں بھول جانا جیسے معمولی مکھی اڑائی ہو ——— لیکن خاں فولادی جیسے کندۂ آبنوس کے دانت کھٹے کر دینا معمولی زاویوں اور پیمانوں والے انسانوں کا کام نہیں، فولادی سے ٹکرانا، دیوارِ چین سے ٹکر لینے سے کم نہیں جبکہ ہم نے تو سُنا ہے کہ آپ نے اس فولادی پیکر کے زاویوں اور پیمانوں کی جڑ بنیاد ہلا ڈالی ——— میری طرف سے ڈھیروں مبارکباد وہاں قبول فرمائیے ———" موصوف نے بات ختم کرتے ہی جھپٹ کر ہمارا ہاتھ پکڑ لیا اور اس طرح جھٹکے دینے لگے جیسے کندھے سے لے کر تمام تر تعلق توڑ کر دم لیں گے۔ اس نامعقول کی دیکھا دیکھی لائبریری میں موجود دو چار حضرات جو بظاہر اخبارات کی سرخیاں چاٹنے میں مصروف تھے لیکن جن کے کان یقیناً ہماری جانب ہی متوجہ تھے فوراً اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر باری باری "بالمصافحہ" مبارکباد دے کر "بے دھڑک" کے دستی جھٹکوں" سے ہمیں نجات دلائی۔ ان حضرات کو مقابلے کے روز اپنے موجود نہ نہ ہونے کا بڑا پچھتاوا تھا یوں ہاتھ مل رہے تھے (اپنے) جیسے عالمی چمپین محمد علی دی گریٹ اور "جو فریزر" کے مابین ہونے والا فیصلہ کن مقابلہ دیکھنے سے محروم رہ گئے ہوں۔ ویسے مقابلے کی تاریخ سے آج کے دن تک اس سلسلے میں ہمارے اس قدر "چرچے" ہو چکے تھے کہ اب ہم اپنے آپ کو کوئی تاریخی بلکہ "جغرافیائی چیز" سمجھنے لگے تھے۔ البتہ خاں فولادی عرف طوطا پری کے تعلق سے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ بستی کے لوگ اس سے ایک طرح سے بیزار ہی تھے بلکہ کسی حد تک خائف بھی تھے شاید اسی لئے اسے برداشت کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی جو اس کارنامے کے بعد ہمیں اس قدر ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا ورنہ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ہم میں کوئی ایسا کمال لازوال نہیں ہماری شخصیت میں ایسے کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے ہیں کہ لوگ ہم سے اس طرح مرعوب ہوتے ——— بے دھڑک لاکھ نامعقول سہی لیکن اس نے بھی لوگوں کی اس مرعوبیت کا اندازہ لگا لیا تھا چنانچہ لوگوں کو ہم سے مزید مرعوب کرنے لئے لائبریری کے "پڑھاکو" ماحول کی مناسبت سے .... ہمارے ان "ادبی کارناموں" کا ذکر چھیڑ دیا جن سے خود ہم لاعلم تھے ——— لیکن ہم بھی چونکہ انسان تھے اور انسانی کمزوریوں اور خامیوں کا جیتا جاگتا مرقع تھے اس لئے اپنی اس بے جا تعریف کی بالکل تردید نہیں کی ایک صاحب نے جو غالباً مقامی ادیب تھے یعنی ادب میں جن کا کچھ مقام تھا اپنا چشمہ برابر کرتے ہوئے اِستفسار کیا ——— "آپ، ادب میں کس "ازم" کے قائل ہیں ———؟"

جواب میں ہم نے گڑبڑا کر بے دھڑک کی طرف دیکھا کہ یہ فتنہ، اسی پاکٹ سائز جاپانی فتنے نے کھڑا کیا تھا۔ لیکن وہ کم بخت تو ہمیں اس "ادبی آگ" میں دھکیل کر خود اپنے ہاتھ تاپ رہا تھا۔ اُدھر سوالی جواب کا منتظر تھا۔ سوالی کے سوال سے بھی بڑا سوال چونکہ اپنی عزت اور قبلہ چہ خوب اور شبو کے وقار کا تھا اس لئے اپنی چھٹی ہوئی "چھٹی حس" بیدار ہو گئی۔ لوگ عموماً مسکے میں بال نکالتے ہیں۔ لیکن ہماری "چھٹی حس" بال میں سے "مسکہ" نکالتی ہے چنانچہ ہم نے کھنکھارتے ہوئے "ادبی گٹ بندیوں" کے قائل اس مقامی ادیب کے سوال کا یہ منہ توڑ جواب دیا ——— "سب سے پہلے تو جناب والا یہ واضح کر دوں کہ میں ادب کو زندگی سے علاحدہ نہیں سمجھتا اور دونوں کے سلسلے میں کسی "اِزم" کا نہیں بلکہ "عزم" کا قائل ہوں ———"

"لاجواب، بے جوڑ بے مثال ———" بے دھڑک بچوں کی طرح خوشی سے پھدکنے لگا ——— "کیا جواب دیا ہے واللہ آپ کے جواب کے زاویوں اور پیمانوں کا جواب نہیں ———" بے دھڑک کی اس بچکانہ "اچھل کود" پہ مقامی ادیب نے اس پر قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے ہم سے کہا ——— "اِزم سے میری مراد تھی کہ ادب میں آپ کس گروپ سے وابستہ یا حامی ہیں ———" گویا مقامی ادیب نے اپنے پہلے سوال سے ایک

اور سوال پیدا کرنے کی کوشش کی ہم نے جواب میں برجستگی سے کہا ــــــ "ہتھوڑا ازم" کا حامی ہوں میں ــــــ"

"یعنی کمیونزم ــــــ ؟" مقامی ادیب نے اپنے تئیں وضاحت کی ــــــ "جی نہیں" ہم نے فوراً ان کی اس وضاحت کی تردید کر دی ــــ "ان کے ہاں تو ہتھوڑے کے ساتھ درانتی بھی اتنی ہی لازمی ہے جتنا کہ سارنگی کے ساتھ طاؤس ــــــ"

"واہ واہ ــــــ" بے دھڑک پھر بے ساختگی سے بولا ــــــ "کیا مثال ہے بے مثال، سارنگی کے ساتھ بلا وجہ ہی زاویہ اور پیمانہ فٹ ہو سکتا ہے ــــ ! واہ ــــــ" بے دھڑک کی اس اوٹ پٹانگ داد کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم نے مزید کہا۔

"اپنا مذہب ہے خدائے واحد کی اطاعت، خلقِ خدا کی خدمت اور مسلک ہے تزکیۂ نفس و ترک دنیا ــــــ !!" مقامی ادیب کا غالباً مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اس لئے موصوف نے فوراً اگلا سوال داغ دیا ــــــ"

"کیا آپ ادب میں 'جدیدیت' کے قائل ہیں ــــــ ؟"

"صرف ادب ہی کیوں ــــــ ؟ میں تو زندگی کے ہر شعبے میں ایسی ہر جدت کا خیر مقدم کرتا ہوں جو صالح ہو ــــــ !" ہم نے جواب میں اس مرتبہ بڑا ہی نپا تلا انداز اختیار کیا ــــــ "صالح جدیدیت سے میری مراد ایسی جدت ہے جو ہمارے اجداد کے تہذیبی ورثے میں اچھا اقدار کا اضافہ کرتی ہو ــــــ"

"جدیدیت کے نام پر ان دنوں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں ــــــ ؟" مقامی ادیب کے اس سوال پر ہم نے اپنے آپ کو ٹٹولا اپنے ادبی مقام کو کھنگالا ــــــ کیا واقعی ہم اتنے بڑے ادیب اور دانشور ہیں کہ ہم سے اس پائے کے سوال کئے جا سکتے ہیں ــــــ ؟ جب تخیل کے آئینے میں جھانک کر دیکھا تو دور بے دھڑک شریر مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے نظر آیا۔ اسی نامعقول چوپائے ہی نے تو ہمارے معمولی زاویوں اور پیمانوں کے باوجود ہمیں پائے کا ادیب ٹھہرا کر اس مقامی ادیب کے پیچھے لگا دیا تھا۔ اب اوپر والا ہی ہمیں اس چھتے سے اتار سکتا تھا۔ چھتے پر لٹکے لٹکے ہی ہم نے مقامی ادیب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ــــــ "جدیدیت کے نام پر جو ادیب یا شاعر اپنی جنسی ناآسودگی اور بے راہ روی کی تسکین کے لئے اگلی ہوئی اپنی لایعنی بکواس کو شاعری یا ادب کا نام دیتے ہیں میں اُسے فضلہ سمجھتا ہوں اور مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس خلائی دور میں زیادہ تر بیت الخلائی ادب ہی تخلیق ہو رہا ہے ــــــ"

"بیت الخلائی ادب" کی ترکیب پر بے دھڑک کے ساتھ دیگر حضرات نے بھی واہ واہ کی داویلا مچایا لیکن مقامی ادیب موصوف بدستور "موت" کی طرح گمبیر تھے اُسی گمبیرتا سے اگلا سوال اُگلا آپ کی نظر میں ــــ شاعری کا فارم میں ہونا ضروری ہے یعنی پولٹری کیلئے آپ فارم کی قید کو ضروری سمجھتے ہیں یا غیر ضروری ــــــ ؟"

"اچھی شاعری کے لئے فارم اتنا ہی ضروری اور لازمی ہے جتنا کہ مرغیوں کی بہتر افزائش نسل کے لئے پولٹری فارم ــــــ !"

ہمارے اس جملے پر پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پھر بے دھڑک کی آواز بلند ہوئی ــــــ "میں شہزاد صاحب کے اس خیال کی بھرپور تائید کرتا ہوں میری رائے میں پولٹری فارموں کی طرح ایک منظم اسکیم کے تحت اگر پوئٹری کے فارم بھی تشکیل دیئے جائیں تو "کڑک مرغیوں" کی طرح "کڑک شاعروں" کی گردن ناپی جا سکتی ہے ــــــ" بے دھڑک کی اس بے تکی بکواس کو مقامی ادیب نے ناقابلِ اعتنا قرار دیتے ہوئے ہماری جانب اگلا سوال اُچھالا ــــــ "ادب میں ابہام اور علامت کے ان دنوں بڑے چرچے ہیں کیا آج کا ادب واقعی ابہام آلود علامتی گورکھ دھندہ ہو کر رہ گیا ہے ــــــ ؟"

ہاں!" ہم نے پورے وثوق کے ساتھ کہنا شروع کیا ——— "آج اُردو کے نام نہاد جدید ادب میں علامتوں کی اس
ہے کہ آج کا ادب پہیلیوں، معمّوں بلکہ بھول بھلیوں کا گورکھ دھندہ ہو کر رہ گیا ہے مثال کے طور پر چند ایسی علامتیں ملاحظہ فرمائیے
جدید ادب ادھورا تصور کیا جاتا ہے ———؟"
ن کہہ کر ہم رک گئے اور ایک بار پھر اُس مقامی ادیب کا بغور مطالعہ کرنے لگے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ان کے عجیب و غریب گنجے سر
وجود و منبع کے پائپ سا گہرائی و گیرائی سے جائزہ لینے لگے موصوف کی ان دونوں خصوصیتوں پر یہ گمان ہوتا تھا کہ یقیناً یہ "ہزیۃ" اور
سی کھدائی کے دوران معرض وجود میں آئے ہیں جنہیں اپنی طرف ہمہ تن متوجہ پا کر ہم نے بات آگے بڑھائی ——— "جدید ادب
امے تندرست و توانا سورج مہاراج آگ اگلتا ہیں۔ لیکن اس کے باوجود شاعری کا نحیف و ناتواں مرغا اسے اپنی چونچ میں بہ آسانی
ہے، چندا ماما بے چارے کوکا گولا ہیں اس ادب میں ستارے دھتورے کے پھول، آسمان کسی بیوہ کی میلی پیوند زدہ چادر اور زمین
بھکاری کے کشکول کا مکمل و مفصل جواب ———؟"
س سے پہلے کہ یہ موضوع کوئی اور رُخ بدلتا اور مقامی ادیب موصوف ہمارے دماغ شریف کو اس کے محور سے ہٹانے میں کامیاب
نے بات کا خاتمہ بالخیر کرنے کے لئے انہیں لگے ہاتھوں یہ مشورہ دیا ——— "ادب اور جدیدیت کے موضوع پر اگر آپ کو سیر حاصل اظہار
فوراً اُردو کے بزعم خود مشہور، ادیب نقاد اور شاعر حضرت لاغر ایدی سے فوراً رجوع فرمائیے سنا ہے موصوف ان دنوں یہیں تشریف
لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ موصوف کے خیالات سے آپ کا صد فی صد متفق ہوتا ہونا ضروری ہے البتہ آپ کے خیالات سے موصوف
ہونا قطعی ضروری نہیں کیونکہ موصوف اپنے خیالات سے اکثر خود متفق نہیں ہوتے ———!"
ہمارے اس مشورہ پر بجائے اس کے کہ مقامی ادیب ہمارے مشکور ہوتے پہلے تو موصوف نے چونکنے کا مظاہرہ کیا پھر جھینپنے کا اور پھر نہ دکھانہ
مزید کلام اچانک اڑن چھو ہو گئے موصوف کی اس غیر متوقع اور غیر شائستہ حرکت پر سخت تعجب ہوا۔ اس سے پہلے کہ اس سلسلے میں
ق سے کچھ کہتے، وہ خود دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ بول اٹھا ——— "آپ سے کیا کیا کمالات سرزد ہوتے ہیں جواب نہیں آپ
یوں اور بیانوں کا جس شخص کے ساتھ اتنی دیر سے آپ کو شرف ہم کلامی حاصل رہا وہی تو منفرد نقاد ادیب و شاعر لاغر ایدی تھے ———!"
لائبریری میں ابھی تین حضرات اور موجود تھے ہم نے سوچا قبل اس کے یہ تینوں حضرات بھی مشہور نقاد ادیب یا شاعر ثابت ہوں یہاں سے
ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ فوراً اس ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ لائبریری سے جو اڑن بھری ہے تو کلب کے "مرکزی ہال" میں پہنچ کر دم لیا
ل یہاں بھی سائے کی طرح ہمارے ساتھ موجود تھا ——— "مرکزی ہال" تقریباً سج سنور کر دلہن کی طرح رخصتی کا منتظر تھا۔ رنگین کاغذی
، جھنڈیوں، غباروں اور برقی قمقموں کے رنگ برنگے سلسلے نے ایک عجیب سا سماں باندھ دیا تھا۔ حالانکہ "جشن" میں ابھی چار روز
ملہ شبو کی کچھ سہیلیاں نظر آئیں۔ "ہائے وائے" کا تبادلہ ہوا۔ شبو البتہ نظر نہیں آئیں۔ "ہائے وائے" کے نغمہ کے دوران حاصل غزل شعر
ہوا یعنی مسز چوپڑہ خوب بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ساتھ خان فولادی عرف طوطا پری کا بھی تھا۔ گویا مکمل غزل کے ساتھ
رشید تھا ———

اس دوران میں اتفاقاً ہماری نظر بے دھڑک بے پرتی اس کی آنکھوں میں ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ جو اس بات کا کھلا ثبوت تھا
بھی غیرت مند عزت دار انسان خاندان کی عزت کو کسی بے غیرت اور دل پھینک مرد کے ساتھ یوں باہوں میں باہیں ڈالے دیکھ کر جب کچھ

نہیں کرسکتا تو کم از کم شرمندہ ضرور ہوتا ہے۔

اس سے یہ ایک بات واضح ہوئی کہ بے دھڑک ایک غیرت مند جاتی ہے لیکن یہ سوسائٹی بھی تو ایسے ہی غیرت مندوں کی بنائی ہوئی ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی سوسائٹی میں پناہ لینے کے بعد کیا ایک انسان میں غیرت کا مادہ بھی باقی رہتا ہے ــــــــ؟!!

رات ــــــ!

اگرچہ کہ یہ رات بھی پچھلی چند راتوں کی طرح پرسکون دکھائی دیتی تھی کسی زاویئے سے ابتدائی دو تین راتوں کی طرح بھیانک اور ڈراؤنی نہیں معلوم ہوتی تھی تاہم ایک غیر محسوس سا خوف دل کے کسی گوشے میں کہیں انگڑائی لیتا ضرور محسوس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں اس غیر محسوس خوف اور خدشے کے پیچھے کون سا جذبہ تھا کیا وجہ تھی ــــــ؟

باہر موسم بے حد خنک تھا۔ اندر بھی کسی قدر سردی زیادہ تھی۔ کمرے کی تمام کھڑکیوں کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد ہم نے جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے بستر پکڑ لیا۔ گلے تک چادر کھینچے چاروں شانے چت دم سادھے ہوئے یوں چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے لیٹے تھے جیسے دل کے گوشے میں چھپا ہوا انجانا خوف ان دیکھا خدشہ کسی بھی پل کسی بلا کی شکل میں اچانک چھت سے ٹپک پڑے گا۔ آنکھوں کے آگے عجیب عجیب بے ہنگم سے دائرے بنتے بگڑتے رہے۔ دائروں کا ایک تار تھا جو دراز ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دل کے گوشے میں دھڑکتا خوف کمرے کے کسی کونے میں کہیں رینگ رہا ہے رینگتا ہوا جیسے ہماری ہی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے ــــــ۔

رینگنے والی بلاؤں کی شکلیں ذہن کے تھم تھراتے کینوس پر بننے بگڑنے لگیں اور پھر ایک ہی شکل ہر پل لیتی ہوئی کینوس پر جم کر رہ گئی جو آہستہ آہستہ واضح ہوتی چلی گئی ــــــ "سانپ" یہ شکل یقیناً سانپ کی شکل تھی۔ "سانپ" کا تصور کرتے ہی سانس اکھڑنے لگی بلکہ یوں لگا کہ اگلے کسی بھی پل "سانسوں" کی "آمد و شد" ختم شد ہو سکتی ہے ــــــ اسی احساس نے ہمیں اس قدر بوکھلا دیا کہ گڑبڑا کر چادر ایک طرف کر اٹھ بیٹھے اور پلنگ سے نیچے قدم دھرا ہی چاہتے تھے کہ جیسے اچانک بجلی کا تار چھو گیا ــــــ

پلنگ سے کچھ فاصلے پر واقعی ایک عدد سانپ لہراتا ہوا ہماری جانب کو رینگتا چلا آرہا تھا ــــــ ادھر بدن میں کاٹو تو لہو نہیں اس ساکت و جامد بیٹھے تھے جیسے شہر کی معروف ترین شاہراہ کے بیچوں بیچ پتھر کی بنچ پر بیٹھا ہوا سابق وزیر اعظم کا پتھر کا مجسمہ ــــــ!

(باقی، باقی)

خرافات — (مراسلے)

● شگوفہ میں بھوپال والوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اس دفعہ بسی ثریا آچور کو چھاپا ہے یہ خبر دکھ کے ساتھ دے رہا ہوں کہ بیچارے بھوپالی دل کا دورہ پڑنے سے رحلت فرما گئے۔ ہم ناچار بندے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں کہ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

فضل جاوید' بھوپال

● برادرم' آداب

آپ پر تو آجکل بھرپور شباب آیا ہوا ہے اللہ کرے شباب اور زیادہ۔

ڈی کے کنول' بڈگام (کشمیر)

● تازہ شمارہ میں میرے بھیجے ہوئے 'بنام اردو ادب کا پہلا آجیہ مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال' کی اشاعت کا بہت بہت شکریہ تو ہوں ہی' مجھے لکھنا بھی کیا آتا ہے۔ ارے ہاں! اس تازہ شمارہ ...ر کی کھٹاس پایا جس کا شاید مجھ جیسے اور کئی زندہ دلوں کو ایک ...راز سے انتظار تھا ہوگا۔ امید ہے کہ آچور کا کلام شائع ہوتا رہیگا ...بر کے قطعی اعلان کے لئے دل بے چین ہے۔

اَن پڑھ' جونگیری

● ڈرامہ نمبر کی تیاری غالباً زور و شور سے چل رہی ہوگی۔ کیا ...ہیں؟ جولائی کا شگوفہ دیکھا۔ مشتاق احمد یوسفی کا بہترین مضمون ...تی کی شکل میں بے حد پسند آیا۔ خواجہ صاحب سے اتنی گزارش ہے ...نے زیادہ لطیفے کسی مضمون میں یکجا نہ کر دیا کریں۔ ہنستے ہنستے دورہ ...اشکار ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا خواجہ صاحب کے ...ا کی کوئی کتاب بھی شائع ہونے والی ہے؟ کیا شگوفہ کی کتابت دو ...دی ال کر کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ شگوفہ یونہی ترقی کی ...منزلیں طے کرتا رہے اور دنیائے طنز و مزاح میں اپنا مقام بلند سے بلند تر ...بنائے۔ زندہ دلان مالیگاؤں' زندہ دلان حیدرآباد کی خدمت میں سلام کا پارسل ارسال کرتے ہیں۔

الیاس صدیقی' مالیگاؤں

● جولائی کے شمارہ میں جناب احمد جمال پاشا کا مضمون "اولوالعزم علامہ اسرار جامعی کے ادبی معرکے" پڑھا۔ واقعی جمال صاحب نے یکتائے طنز و مزاح حضرتِ اسرار جامعی کی شخصیت اور فنی و ادبی محاسن کا ایک حسین گلدستہ پیش کیا ہے۔

جوہر سہوانی

● ایک عرصہ سے 'شگوفہ' کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ طنز و مزاح کے میدان میں جو کام کر رہے ہیں' قابلِ ستائش ہے۔

محمد یٰسین انصاری' مالیگاؤں

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

ملیں گے اگر خدا لایا

سوونیئر ٹائٹل کے انعامی مقابلہ کا نتیجہ

شگوفہ کے سوونیئر (اپریل ۱۹۷۷ء) میں ٹائٹل کے لئے موزوں عنوان پر دو انعامات دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں بے شمار عنوانات ہمیں موصول ہوئے۔ ججس کی کمیٹی نے حسب ذیل کو انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔

انعام اوّل : (مبلغ پچھتر روپے) "جس قلم پر تم ہو نازاں وہ ہمارے بس میں ہے"
مرسلہ جوہر سیوانی ، سیوان بہار

انعام دوم : (مبلغ پچاس روپے) "قلم کا بوجھ"
مرسلہ عصمی دسنوی ، سیفیہ کالج ، بھوپال

ہم ہر دو انعام یافتگان کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔
ان کے علاوہ حسب ذیل عنوانات بھی پسندیدہ قرار دیئے گئے۔

"مظلوم ادیب" مرسلہ محمد جعفر ، بلگام (کرناٹک)
"متاع قلم" مرسلہ ممتاز فرخ سبزی باغ ، پٹنہ
"اسیر جنسی" مرسلہ صادق علی متین چھتہ بازار ، حیدرآباد
"ادبی تکون" مرسلہ محمود سلیم ملک پیٹھ

آرٹسٹ جناب طالب خوندمیری نے اس ٹائٹل کے لئے عنوان "مصلوب ادب" تجویز کیا ہے۔

▲ یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ مشہور مزاح نگار تخلص بھوپالی انتقال کر گئے۔ تخلص بھوپالی نے "پاندان والی خالہ" کے توسط سے بھوپال کی تہذیب کا خاکہ اڑایا اور طنز و مزاح کے میدان میں اپنے لئے خاص جگہ بنائی۔ ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں منعقدہ مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس میں بھی موصوف نے شرکت کی تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اس کانفرنس کے رپورتاژ کا عنوان "ایک پلیٹ تخلص بھوپالی" رکھا تھا۔ تخلص بھوپالی کے انتقال پر ہم گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر

سید مصطفیٰ کمال ایم۔اے (عثمانیہ)

مجلسِ ادارت

منظور احمد ★ حمایت اللہ ★ مسیح انجم

مَجلسِ مشاورت: راجندر سنگھ بیدی، بھارت چند کھنہ، خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین

سالانہ ـــــ ۲۰ ـــــ روپے

بیرونِ ہند سے ـــ ۳۵ ـــــ شلنگ

فی پرچہ ـــــ ایک روپیہ پچاس پیسے

جنرل منیجر: ممتاز احمد

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۲

بائینڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس روبرو دربارِ حسینی
پرانی حویلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

خط وکتابت کا پتہ

شگوفہ ۳۱ر مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (اے پی)
فون نمبر: 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

کراچی بیکری

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔ فون نمبر 2[illegible]

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ

کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

نقل اور ملتے جلتے مال سے بچئے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لئے اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھ لیجئے۔

تیار کنندگان

گلزار حوض، حیدرآباد ۲.....۵، اے پی

جنتا پارٹی

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

نہیں آتی تو یاد اُن کی (یادِ رفتگاں)

شیطان کی آنت (قسط وار ناول)

پچھورن (نظمیں)

مشتاق احمد یوسفی*

روٹی تو بہر طور کما کھائے مچھند

از بسکہ ہماری ہر تباہی اور ہر خانہ بربادی ہمارے مخدوم مرزا عبدالودود بیگ کی ذاتی نگرانی میں نہیں ہوتی ہے ہم نے انھیں خوش خبری سنائی کہ ہم بینکنگ کے پیشہ میں حادثاتی طور پر داخل ہوگئے ہیں۔ بولے "دست بخیر! دھکا کو چوٹ تو نہیں آئی؟" مبارکباد کے بجائے انھوں نے اسے اس صدی کا سب سے بھونڈا مذاق قرار دیا۔ ہم نے کہا "تمھیں یقین نہیں آتا ہم تو کل صبح سے بینک جانا شروع کر دیں گے"۔

فرمایا "جب تک کوئی شخص نشے میں دُھت نہ ہو، تمھیں بینک میں ملازم نہیں رکھ سکتا"۔

جس شخص نے ہمیں ملازم رکھا وہ اسی عالم میں تھا"۔

"سچ؟"

"سچ۔ خدا خیر کرے! ہم نے اندھیرے میں چھلانگ لگائی ہے"۔

"چھلانگ تو ضرور لگائی ہے، مگر کپاس کے ڈھیر میں۔ بدن پر ریشم' مل کر عیش کرو گے' دوست! آدمی اپنی گرہ سے ادھار دے اور وہ ڈوب جائے تو وہ احمق کہلاتا ہے۔ وصول ہو جائے تو سود خور۔ لیکن دوسروں کا روپیہ بیاج پر چلائے اور مونچھیں داڑھی سے بڑھ جائیں، یعنی بیاج مول سے زیادہ ہو جائے تو بینکر بابے! سود میں بڑی برکت ہے۔ سود اور سلطان کو بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مزہ تو جب تھا کہ

پیشہ بھی ڈھونڈا، سود کا سودا بھی چھوڑ دے"

بقول غالب "پیشہ میں عیب نہیں"۔

*حضور نے تو شرعی عیب ہی کو پیشہ بنالیا۔ خیر بینک کے پاس تو تمھیں ملازم رکھنے کی ایک نہایت معقول وجہ

موجود ہے۔ وہ یہ کہ اس کا جنرل منیجر لنشے میں تھا۔ لیکن تمھارے پاس کیا جواز ہے؟"

"بینک میں تنخواہ ۲۶ تاریخ کو ہی مل جاتی ہے۔"

"نہیں اس سے بھی قبل مل جاتی ہے۔ ۲۴ تاریخ کو!"

"سنو۔ ہمارے پاس ایک چھوڑ تین معقول وجہیں ہیں۔ اول، اس پیشہ میں دیانت، ذہانت اور نجابت کی بڑی قدر ہے۔ دوم، پاکستان بن رہا ہے۔ قوم کو نئے خون، ایثار و قربانی کی اشد ضرورت ہے۔ سوم، ہمیں کوئی اور ملازمت نہیں ملی۔"

"ملازمت! ملازمت! کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ آخر حیات انسانی کا مقصد اعلیٰ کیا ہے؟"

"ہم تو زمین پر محض اس لئے اتارے گئے ہیں کہ آپ کو ہماری اصلاح کا موقع ملے۔ نہیں تو آپ کی ساری زندگی بے مقصد ہو جاتی۔"

"پھر بھی یہ سوجھی کیا؟ ایک تو اذ ٹنی تھی ہی دِوانی، اوپر سے گھنگھرو اور باندھ لئے۔"

"پہلے تو اس نے ہمیں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ پھر یکبارگی اتنے پیار سے آفر دی کہ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مجھ ڈرتی نے کر لئے قول و قرار۔ تنخواہ تک پوچھنی بھول گئے۔ وہی حال ہوا جو جیمز جوائس کی MOLLY کا ہوا تھا:

"He asked me with his eyes, Yes, and with his hands, Yes, and Yes, I said, Yes, I will, Yes!"

اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اس ایجاب و قبول پر تیئیس سال گزر گئے۔ اور ان تیئیس برسوں میں دنیا نے کیا کچھ نہیں دیا۔ لیکن اپنا قرض جو اپنے آپ پر تھا، وہ آج تک نہ اتر سکا۔ حساب کتاب سے دلی نفرت تھی وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا۔ اس سے زیادہ بدنصیبی اور کیا ہو گی کہ آدمی ایک غلط پیشہ اپنائے اور اس میں کامیاب ہوتا چلا جائے۔ اور پھر، تھا جو ناخوب بتدریج وہی خواب ہوا۔ روپیہ اور اس سے متعلق تمام تر کاروبار میں کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ آدمی ہر چیز سے ناتا توڑ کر اسی کا ہو رہے۔ پیسہ ہی اس کے لئے بس ہے۔ بھروسہ رکھنے والے اسی پہ بھروسہ رکھتے ہیں۔ عالم نزع میں بھی وہ "پانی! پانی!" نہیں پکارتا۔ "پیسہ! پیسہ!! پیسہ!!!" دولت، سیاست، عورت اور عبادت، کامل یکسوئی، مکمل خود گزاشتگی، سرتاپا سپردگی، چاہتی ہیں۔ ذرا دھیان بھٹکا اور منزل کھوٹی ہوئی۔ رچی بسی، جامع الحیثیات و حسیات شخصیت کا اس کوچے میں گزر نہیں۔ جب تک آدمی اپنے دل و دماغ سے ہر آرزو کو رخصت اور ہر آدرش کو ارپن کر کے، خود کو ان کے لئے خالص نہ کرے، یہ چھلاوے کہیں ہاتھ آتے ہیں۔ پھر جب مسافر اپنے قافلے سے بچھڑ کر ان کی جستجو میں بہت دور اکیلا نکل جاتا ہے اور شام کا جھٹپٹا سا ہونے لگتا ہے تو یکبارگی اسے احساس ہوتا ہے کہ منزل تو وہیں تھی جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اتنے میں سورج ڈوب جاتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے راجپوت سرداروں کے ایک جیش کو ایک دور دراز مہم پر بھیجا تھا۔ جگ بیت گئے چاندنی راتیں آئیں اور اپنی چاندی لٹا کے گزر گئیں۔ کتنے ہی ساون آئے اور نین کٹوروں کو چھلکا کر چلے گئے۔ پر وہ نہ لوٹے نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں، نہ بھیجیں پتیاں۔ آخر برہ کی ماری ٹھکرائنوں نے بادشاہ کو ایک عرضداشت پیش کی جو صرف ایک دوہے پر مشتمل تھی:

سونا لاون پی گئے، سونا کر گئے دیس
سونا ملا نہ پی ملے، رُدپا ہو گئے کیس★

چاہیں تو اسے انسانی روح کے سفر کی داستان سمجھ لیجئے۔

گڈ مارننگ کے جواب میں گڈ آفٹرنون

پہلے دن ڈیوٹی پر رپورٹ کرنے ہم سوا نو بجے مسٹر اینڈرسن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہماری "گڈ مارننگ" کے جواب ں فرمایا "گڈ آفٹرنون! اس پیشے میں پابندی وقت کا نمبر ایمانداری سے بھی پہلے آتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، یہاں لوگ دفتر تنے لیٹ کیوں آتے ہیں۔ میری اور تمہاری پیدائش میں اتنا لمبا وقفہ ہے کہ اس میں ایک نسل پیدا بھی ہوئی، بدراہ بھی ہوئی اور ار جھک مار کر راہِ راست پر بھی آ گئی۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب لندن میں کار کو Horse-less Carriage (بغیر گھوڑے ی گاڑی) کہتے تھے۔ میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب ٹرام کو گھوڑے کھینچتے تھے۔ اس لئے اس کی رفتار موجودہ ٹرام سے کہیں زیادہ تیز ہوتی تھی۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، یہاں لوگ آفس اتنے لیٹ کیوں آتے ہیں۔ آج سے پینتالیس سال پہلے جب میں نے اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے سے بینک میں ملازمت کی تو صبح برف گرتی ہوتی تھی۔ سڑکوں پر گھٹنوں گھٹنوں ہوتی تھی۔ لیکن میں صفر سے بھی دس ڈگری نیچے ٹمپریچر میں ٹھیک آٹھ بجے بینک پہنچ جاتا تھا۔ تم لوگ ۱۱۳ ڈگری ٹمپریچر (۱۱۳ ڈگری = ۴۵ سنٹی گریڈ) میں بھی وقت پر نہیں آ سکتے!

اسٹول کی ایجاد کا اصل مقصد

اس پندِ سود مند کے بعد اس نے چپراسی کو حکم دیا کہ اس "کو وننڈڈ افسر" کو اس کے آفس تک پہنچا آؤ۔

چپراسی جس مقام تک ہمیں لے گیا وہ زمین سے ساڑھے چار فٹ کی بلندی پر ایک چوبی سطحِ مرتفع تھی۔ یہ تختہ جس کی قسمت میں ہماری دارِ منصبی ہونا لکھا تھا، ۱۲ × ۱۲ انچ سے زیادہ نہ ہوگا۔ بینکوں میں ایسے گوانیز کلرک موجود تھے جو بیس بیس برس سے ایک ہی اسٹول پر بیٹھے ٹٹ پونجیوں کو کروڑ پتی بنتے دیکھ چکے تھے۔ انگلش بینکنگ کی یہ دیرینہ روایت تھی کہ کلرک جس اسٹول پر پہلے دن آ کر بیٹھتا ہے، اسی سے ریٹائر ہو کر اترتا ہے۔ اس خیال سے وحشت ہونے لگی کہ ایک انسان کی پوری زندگی، دیوار کی طرف منہ کر کے، ایک مربع فٹ تختہ پر بیت سکتی ہے۔ اس پر سے کودنا اس پر چڑھنے سے زیادہ دشوار تھا۔ اور گرم تھری پیس سوٹ، بغیر فریم کی عینک اور سنہری پاکٹ واچ کے ساتھ یہ کرتب انگلش بینکنگ کے بجائے کسی انگلش کامیڈی کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ اسٹول کے بیچ میں گردے کی شکل کا ایک کثیر المقاصد سوراخ تھا۔ گدی کا تکلف بھی نہ تھا جس میں غالباً یہ مصلحت تھی کہ اس سے اصلی برما ساگوان کے ابرا اور جوہر چھپ جانے کا احتمال تھا۔ اپنے "آفس" کو دیکھ کر ہماری نومولود امیدوں پر روایتی اوس کے بجائے اولے پڑ گئے۔ ہم پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے کہ جس بینک میں "کوونڈڈ افسر" اسٹول پر قبضہ جما لیں وہاں غریب کلرک کیا کرتے ہوں گے، لیکن ہمیں کوئی نظر نہ آیا چپ

★ پیا سونا لینے گئے اور ہمارا دیس سونا کر گئے۔ چاں تو نہ سونا ملا نہ پی ملے۔ اور بال روئی کے گالے ہو گئے

نظر نہ آئی۔ کچھ دن بعد ہم نے جمعدار اجمل خاں کو ڈانٹا کہ ہمارا اسٹول گرد سے اٹا رہتا ہے۔ ہم انگلی سے اس پر سود در سلف کا حساب کرتے ہیں۔ مگر کوئی اسے صاف نہیں کرتا۔ بولا: بادشاہو! ایس بینک دے اسٹول تو بڑے افسراں دے پینڈے نال صاف کئے جاندے نے۔"★

ایک دن ہم نے لیجر کیپر شیخ قریشی سے کہا کہ گردجی! گیارہ گھنٹے روز اسٹول پر بیٹھنے سے آپ کے چیلے کے کولھے سلیٹ کی طرح سپاٹ اور چورس ہو گئے ہیں تو اس نے مطلع کیا کہ اسٹول تو کبھی ٹکانے کے لئے ہوا کرتا ہے۔ اسٹول کی ایجاد کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس کے تلفظ و املا پر پنجابی اور غیر پنجابی ایک دوسرے پر ہنس سکیں۔

اب اور تب

اس زمانے میں بینکوں میں یہ طمطراق نہ تھا جو آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض بینکوں میں تو ویسا ہی فرنیچر ہوتا تھا جیسا چھوٹے ریلوے اسٹیشنوں اور قصباتی پوسٹ آفسوں میں، جہاں کرسی کی بدنمائی اُدھڑنے کے بعد اس میں فارغ التحصیل صاحبزادے کی تختی جڑ دی جاتی ہے اور ریٹائر ہونے سے پہلے ہر بابو چاقو سے اپنا نام میز پر کندہ کر جاتا ہے۔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔ میز کرسیوں کو ابھی پولیو نہیں ہوا تھا۔ اور بینکوں میں لیکڑوں جیسی ٹانگوں والے مڑے تڑے فرنیچر نے "پیریڈ فرنیچر" کا روپ دھار کر رواج نہیں پایا تھا۔ باتھ روم کی دیوار پر بھی پنسل سے جو Graffitos (بالتصویر عبارتیں) تحریر ہوتی تھیں، ان کے بارے میں ہم اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ نسل کشی کے گھوڑے اگر اپنی خواہشات قلمبند کرنے پر قادر ہوتے تو یہی کچھ رقم کرتے۔ (پروفیسر قاضی عبدالقدوس کو ایسی عبارتوں کے فحش مضمون پر اتنا غصہ نہیں آتا جتنا کہ املا کی فاش غلطیوں پر) صورت حال بحمداللہ روبہ اصلاح ہے۔ غسل خانوں میں اب فحش اور ناشائستہ فقرے بالکل نظر نہیں آتے۔ باتھ روم ٹائلز اتنی چکنی اور گلیزڈ ہوتی ہیں کہ ان پر پنسل سے کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔

اور کمرشیل بینکوں کا کیا ذکر، خود اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا صدر دفتر جس میں اعلیٰ حکام بیٹھتے تھے ایک ایسی عمارت میں واقع تھا جس نے کبھی اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ مطلب یہ کہ پہلے یہاں ایک عجائب گھر تھا جس میں ہڑپہ، موہن جو ڈرو اور گندھارا کے گڑے ہوئے مردے اکھاڑ کر سجائے گئے تھے جو کسی کو آزار نہیں پہنچاتے تھے۔ اس عمارت میں کبوتروں کی اتنی کثرت تھی کہ چپراسی گھر میں چپراسی کی بجائے غٹیل ڈالے پھرتے تھے۔ چہار سو غٹرغوں اور "بسم اللہ اللہ اکبر" کا غلغلہ! سادگی و پُرکاری کا یہ عالم کہ بینک دولت پاکستان کے خزانوں پر کنڈلی مار کے بیٹھنے والے ایک اعلیٰ افسر (۲۵ انچ چوڑے پائنچے کی پتلون پہن کر (جس کا ایک پائنچہ ہی ان کی اور ہماری ضروریات کے لئے کافی تھا) سائکل پر اسٹیٹ بینک آتے تھے۔ اور ہم انھیں رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ ہمارے پاس تو وہ بھی نہ تھی۔ وہ سائیکل کو تالا لگا کر نظروں کے سامنے اپنے کمرے ہی میں پارک کرتے تھے۔ تالہ کا تکلف اس لئے کہ سائکل عربی گھوڑے کی طرح وفادار تو ہوتی نہیں کہ اپنے سوار کے علاوہ کسی کو پٹھے پر ہاتھ ہی نہ رکھنے دے اور زخمی مالک کو منھ میں دابے میدان جنگ سے بگ ٹٹ جرّاح کے پاس لے جائے اور تلوار اور اپنے ہی دانتوں کے لگے ہوئے زخموں پر مومیائی رکھوائے چپراسی کا بیان تھا کہ موصوف ہر ملاقاتی کے جانے کے بعد دو انگلیاں رکھ کر ٹائروں کی نبض دیکھ لیتے ہیں۔ پھر دیکھتے دیکھتے نقشہ بدل گیا اور دم بھر میں یہ ماجرا ہو گیا کہ عمارتوں کا جنگل کھڑا ہو گیا۔ زردی مائل بھُربھُرے پتھر کی جگہ سیمنٹ نے لے لی۔ کھلے "فرنٹ" اور ننگ دھڑنگ ریلوں کم کم نظر آنے لگیں اس لئے کہ بینک ذرا سیانے ہو گئے تو ستر پوشی کے لئے سنگ مرمر استعمال کرنے لگے۔

★ بادشاہو! اس بینک میں اسٹول بڑے افسروں کے پینڈے سے صاف کئے جاتے ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ مغلوں نے سرد اور سنگِ مرمر کا استعمال حتی الامکان مقبروں کے لیے مختص و محدود رکھا۔ ذوقِ سلیم مانع تھا، ورنہ کس چیز کی کمی تھی۔ وہ چاہتے تو تالاب کے پشتے، منجنیق سے پھینکنے کے پتھر اور توپ کے گولے تک سنگِ مرمر کے بنوا سکتے تھے۔ اور قلعے کی فصیلیں بھی، جن پر سے معتوب کو زندہ نیچے پھنکوایا جاتا تھا۔ چونکہ اسٹیٹ بینک کو دوسروں کے مقبرے بنانے کی قانونی اجازت نہیں ہے، اس لئے اس نے اپنی آرام گاہ کی نہ صرف دیواریں بلکہ فرش بھی رنگین سنگِ مرمر* کا بنوا ڈالا جو اتنا چکنا اور پھسلنا تھا کہ پہلے ہی ہفتہ میں پندرہ آدمیوں کی سولہ ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ چنانچہ بہ نظرِ احتیاط یہ حکم صادر ہوا کہ چپراسی چمڑے کے جوتے نہ پہنیں، کریپ سول کے پہن کر آئیں تاکہ پڑی پسلی تڑواکر اپاہج نہ ہو جائیں۔ افسروں کو تاکید تھی کہ صرف چمڑے کے جوتے پہنیں۔ اس زمانے میں خوش خلقی کا یہ عالم تھا کہ کرایہ دار، مالکِ مکان کو گالی دئے بغیر پانچ پانچ منزلہ زینہ چڑھ جاتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اسٹیٹ بینک نے صرف پہلی منزل تک جانے کے لئے زینۂ رواں (Escalator) کا بصرفِ زر (مبادلہ) کثیر جو چلا کیا تو ڈیڑھ دو مہینے تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب اس کی آخری سیڑھی میں پھنس کر ڈیڑھ دو سو لاوارث جوتے جمع نہ ہو گئے ہوں۔ ان جوتوں کا سابقہ تعلق ان خواتین سے تھا جو شوہروں کی اجازت کے بغیر چوری چھپے "ایسکے لیٹر" دیکھنے آئیں اور بمشکل تمام پیر سلامت لے کر گھر لوٹیں۔ صبح کی بھولی اگر شام تک ننگے پیر بھی لوٹ آئے تو اُسے بھولی نہیں کہنا چاہیئے۔ ان جوتوں میں کبھی کوئی مردانہ جوتا نہیں پایا گیا۔ اس کے دو سبب تھے۔ اوّل تو مرد جوتے چھوڑ کر بھاگنا بزدلی سمجھتے ہیں۔ دوم، وہ اپنے جوتوں کے فیتے کس کر باندھتے ہیں۔

دارالخلافہ اسلام آباد ابھی پاکستان کے نقشہ پر نہیں ابھرا تھا اور کراچی ہی دارالخلافہ بنا تھا۔ کراچی کا نقشہ ہی نہیں، تلفظ اور املا تک گنوارو سا تھا۔ زکام نہ ہو، تب بھی لوگ کراچی کو کرانچی ہی کہتے تھے۔ چیف کورٹ کے سامنے گاندھی جی کا ایک نہایت بھونڈا مجسمہ نصب تھا جس کی کوئی چیز گاندھی جی سے مشابہت نہیں رکھتی تھی، سوائے لنگوٹی کی سلوٹوں کے۔ گوانیز جوڑے وکٹوریہ گاڑی میں بندر روڈ پر ہوا خوری کے لئے نکلتے اور نورانی شکل کے پیران پارسی شام کو ایلفنسٹن اسٹریٹ کی دکانوں کے تھڑوں پر ٹھیکی لیتے۔ ایلفنسٹن اسٹریٹ پر کراچی والوں کو ابھی پیار نہیں آیا تھا اور وہ "ایلفی" نہیں کہلاتی تھی۔ سارے شہر میں ایک بھی نیون سائن نہ تھا۔ اس زمانہ میں خراب مال بیچنے کے لئے اتنی اشتہار بازی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ نیپیر روڈ پر طوائفوں کے کوٹھے، ڈان اخبار کا دفتر اور اونٹ گاڑیوں کا اڈا تھا۔ یہاں دن میں اونٹ گاڑیوں کا اوّل الذکر حصّہ کلیلیں کرتا اور رات کو تماش بین۔ اہلِ کمال اس زمانہ میں بھی آشفتہ حال پھرتے تھے۔ کچھ ہماری طرح تھے کہ محض آشفتہ حال تھے۔ شریف گھرانوں میں جہیز میں سنگر مشین، ٹین کا ٹرنک اور بہشتی زیور دیا جاتا تھا۔ اردو غزل سے معشوق کو ہنوز شہر بدر نہیں کیا گیا تھا اور گیتوں اور مجروں میں وہی ندیا، نندیا اور نندیا کا رونا تھا۔ سیٹھانیوں اور اونچے گھرانوں کی بیگمات نے ابھی ساریاں خریدنے اور ہندوستانی فلمیں دیکھنے کے لئے بمبئی جانا نہیں چھوڑا تھا۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے پٹ سن کے بڑے تاجر "ویک اینڈ" پر اپنی آرمینین داشتاؤں کی خیر خیریت لینے اور اپنی طبیعت اور امارت کا بار ہلکا کرنے کے لئے کلکتہ کے ہوائی پھیرے لگاتے تھے۔ کیا زمانہ تھا۔ کلکتہ جانے کے لئے پاسپورٹ ہی نہیں، بہانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ آم، کیلا اور شاعر ہندوستان سے اور لٹھا جاپان سے آتا تھا۔ بینکوں میں ابھی ایرکنڈیشنر، میز پر فانشیل ٹائمز، ایرانی قالین، جاہ مرسیڈیز کار، قلم چھوڑ ہڑتال، رشوت، آسٹن ریڈ کے سوٹ، مگرمچھ کی کھال کے بریف کیس اور اتنی ہی موٹی ذاتی کھال رکھنے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ فقیر ابھی ہاتھ پھیلا پھیلا کر ایک پیسہ مانگتے اور مل جائے تو سخی داتا کو کثرتِ اولاد کی بددعا دیتے تھے۔ اور یہ فقیر پرتقصیر اپنی اوقات کو نہیں بھولا تھا۔ کنڈوں کی آنچ پر چکنی ہانڈی میں ڈوئی سے گھٹی ہوئی اُرد کی بے دُھلی دال چٹخارے لے لے کر کھاتا

---

* سنگِ مرمر سفید ہوتا ہے۔ افسوس کہ رنگ برنگے ONYX کا اردو مترادف مجھے نہیں معلوم۔ عقیق، زنگار رنگ، بجزع اور سنگ یاقوتی اردو میں کشتہ جات کے نام معلوم ہوتے ہیں۔

اور اپنے رب کا شکر ادا کرتا تھا۔

ہم اُلٹے، یار اُلٹا، بات اُلٹی

جن صاحب کے ذمہ ہمیں بینکنگ کے اسرار و رموز سے واقفیت پیدا کروانی تھی، اُن کی خست کا عجب عالم تھا۔ عقل کے استعمال میں بھی کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ دن بھر آئی ہوئی ڈاک کے لفافوں کو جمع کرتے رہتے اور انھیں الٹ کر "رف پیڈ" کے طور پر استعمال کرتے۔ اپنی دور افتادہ بیگم کو بھی اسی کاغذ پر اپنی عدم خیریت سے مطلع فرماتے۔ ان کے ایک نامۂ محبت کا فقرہ آج تک لوحِ دل پر نقش ہے۔ لکھا تھا "بیگم! اس دنیا میں صرف تمھی میری مونث و غم خوار ہو۔" پنسل جب گھستے گھستے اتنی سی رہ جاتی کہ بغیر چمٹی کے گرفت میں نہ آسکے تو وہ لوٹے پر اسی کاغذ کی نلکی چڑھا کر اتنا لمبا کر لیتے کہ لکھتے میں دوسرا سرا ان کی عینک کے شیشہ پر "وائپر" کی طرح بچارا پھیرتا رہتا تھا۔ اس نلکی میں ایک خلال اور پانچ چھ لونگیں ڈال لیتے تھے۔ درد بہت ستاتا تو ایک لونگ نکال کر ڈاڑھ کے نیچے رکھ لیتے۔ جتنی دیر لونگ ڈاڑھ تلے دبی رہتی، اسٹاف لذتِ دشنام سے محروم رہتا۔ ایک دن ہماری تربیت پر توجہ فرمائی تو ہمیں بھی نلکی بنانی سکھائی اور رسان سے سمجھایا کہ ہاتھ روم جائیں تو پنکھے کا سوئچ آف کر کے جایا کریں۔ اور خدارا اپنے غصہ اور مثانہ کو کنٹرول کرنا سیکھیں۔ ٹِک مارک لگانا بھی اسی دن سکھایا۔ کہنے لگے "بینک میں ٹِک مارک اس طرح (✓) نہیں، بلکہ اس طرح الٹا (✓) لگایا جاتا ہے۔ تم ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی ہو۔ اتنا بھی معلوم نہیں!" ہم اس غلطی سے اتنے نادم اور خائف ہوئے کہ اپنی ہر بات کو الٹی اور غلط سمجھنے لگے۔ تین چار بعد ہمارا پھر چالان ہوا۔ کہنے لگے "میں تو عاجز آ گیا۔ آپ کی ہر بات الٹی ہے۔ تقسیم کا نشان اس طرح (۰۱۰) بنا ہوا میں نے تو خدا کی قسم اپنے پورے بینکنگ کیریئر میں نہیں دیکھا" ہم نے معذرت کی کہ ہم نے از روئے احتیاط و خوف اسے کھڑا کر دیا ہے۔ خیریت گزری کہ انھوں نے ضرب کے نشان (×) میں کوئی تبدیلی نوٹس نہیں کی، ورنہ ہم نے تو اپنی طرف سے دائیں ڈنڈے کو بائیں طرف اور بائیں کو دائیں طرف کر دیا تھا۔

یعسوب الحسن غوری، کہ ان کا یہی نام تھا، کسی کلرک سے خفا ہوتے تو بزبان انگریزی اس کے درجات بلند کرتے۔ اس سے سیری نہ ہوتی تو آخر میں اصلی دیسی گالی کا کڑکڑاتا بگھار دیتے۔ منہ زور ماتحتوں کو ان چپراسیوں اور کلرکوں کی فہرست دکھاتے جو گزشتہ تیس سال میں ان کی چھنگلیا کے اشارے سے برخاست ہوئے تھے۔ بابر نے بھی دو تین دفعہ اپنے دشمنوں کے کٹے ہوئے سروں کے مینار بنوائے تھا تاکہ پسماندگان عبرت پکڑیں۔ ہاں کبھی ہمیں ترقی پر اکسانا مقصود ہوتا تو دراز میں سے ایک گراف نکال کر دکھاتے۔ اس میں لکیروں کے ذریعہ یہ دکھایا گیا تھا کہ انھوں نے پچھلے تیس برسوں میں سال بسال کتنی ترقی کی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ۲۷ سال تک، یعنی پاکستان بننے سے پہلے، ان کے کیریئر کے گراف کی جو لکیریں زمین پر لوٹیں لگا رہی تھیں وہ ۱۹۴۷ء میں کپڑے جھاڑ کر ایک دم کھڑی ہو گئیں اور اب ان کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ ان کی ترغیب و تشویش پر ہم نے بھی اپنے کیریئر کا چار سالہ گراف بنایا۔ اگر اسے اُلٹا کر کے دیکھا جاتا تو ہم نے بھی بڑی تیزی سے ترقی کی تھی۔

کچھ تو فطرتاً وہمی اور کچھ شک و شبہہ کو پیشہ ورانہ ڈسپلن کے طور پر اپنا لیا تھا۔ موقع بے موقع یہی نصیحت کرتے کہ ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھنا سیکھو۔ جو کیس بینکر نوٹ کھڑکنے کی آواز سے بھی چونک پڑتا ہے۔ آٹھ کھونٹ کی آبادی میں کچھ نہیں تو سولہ کروڑ تالے ضرور ہوں گے۔ اسی سے اندازہ لگا لو کہ ہم ایک دوسرے پر کتنے فی صد بھروسہ کرتے ہیں۔ اکثر فرماتے کہ جب ہر دستخط اور چہرہ جعلی اور ہر ہندسے میں ہتھکڑی نظر آنے لگے تو سمجھو لو کہ اب تم اکاؤنٹنٹ بننے کے لائق ہو گئے ہو۔ ٹائپ کئے ہوئے خط کی تین چار کاپیاں ہوں تو ہر کاپی کا ایک ایک حرف از سرِ نو چیک کرتے۔ رجسٹروں کے اندراجات کا محدب شیشے سے بار بار معائنہ کرتے کہ کسی

ربڑ سے مٹا کر کچھ اور تو نہیں لکھ دیا۔ کسی کے قبضہ سے چرس یا بغیر لائسنس کی بندوق یا بیوی برآمد ہو جاتی تو غالباً اتنا تہلکہ نہ مچا جتنا ہماری دراز سے ربڑ برآمد ہونے پر۔ حد یہ کہ اپنی قسمت کی لکیروں میں بھی انھیں کاتب تقدیر کی کچھ جعلسازی نظر آتی تھی۔ قاعدے قانون کے پابند تھے۔ باتھ روم میں بھی سڑک کے بائیں طرف چلتے تھے۔ ان کے دشمنوں کا کہنا تھا کہ کبھی ٹرین سے لاہور جانا ہو تو اپنی برتھ پر رات اکڑوں بیٹھے اسٹیشنوں کو ٹائم ٹیبل سے، اور ہر دو سے اپنی گھڑی کو ملاتے رہتے ہیں۔ اس خوف سے آنکھ نہیں جھپکتے کہ خوابِ غفلت میں کہیں ان کا ڈبہ نہ کٹ جائے اور انجن انھیں جنگل بیابان میں چھوڑ کر خالی ہاتھ لیسٹن ہلاتا لاہور پہنچ جائے۔

ایک دن ہمارے سامنے جمعدار اجمل خان کو اپنی بیگم کے نام خط دیا کہ اندر کی جیب میں رکھ کر بے جاؤ اور جنرل پوسٹ آفس کے لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔ وہ پوسٹ کر کے آیا تو اس پر یہ جرح ہوئی :

"خط ڈال آئے ؟"

"جی ہاں! ڈال آیا۔"

"لیٹر بکس کے تالے کو زور سے کھینچ کر دیکھ لیا تھا کہ ٹھیک سے بند ہے یا نہیں"

"میں زور زور سے کھینچ رہا تھا کہ ایک ڈاکیہ نے پکڑ لیا۔"

"ابے فارن میل کے ڈبّے میں تو نہیں ڈال آیا؟ لیٹر بکس کے اندر چاروں انگلیاں ڈال کر پوسٹ کیا تھا۔"

"یس سر! میں نے تو انگوٹھا بھی ڈال دیا تھا۔"

"لیٹر بکس سے کان لگا کے لفافہ گرنے کی آواز سنی تھی؟ یا اس دفعہ بھی دور سے مستی کر کے آگیا؟"

وہ ایک چھوٹے سے برساتی گاؤں میں پلے بڑھے تھے، جہاں قدم قدم پہ سانپ، بچھو اور مشترکہ بزرگ کاٹنے کو دوڑتے تھے چنانچہ اب بھی یہ حال تھا کہ صبح جوتے میں اس ڈر سے پاؤں نہیں ڈالتے تھے کہ سانپ ولکانہ بیٹھا ہو اور پیر ڈالتے ہی ڈس لے۔ لہٰذا پہلے ہاتھ ڈال کر اطمینان کر لیتے تھے۔ دفتر میں بنی ہوئی چائے کبھی نہیں پیتے تھے مبادا کوئی کچھ ملا دے۔ ملباری ہوٹل سے ایک آنے کی کڑک سلیمانی چائے منگا کر دن میں تین چار دفعہ طلب مٹا لیتے تھے۔ اسے چائے کہنے کے لئے رواداری کے علاوہ ضعفِ بصارت و شامہ بھی درکار تھا۔ اس میں پودینہ، بڑی الائچی، اجوائین، سفید زیرہ، لاہوری نمک، زعفران، تمباکو کے پتوں پر پلی ہوئی مکھیوں کا شہد، لیموں، دار چینی اور کیوڑہ تو ہم بھی پہچان لیتے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ عبداللہ ملباری اس میں دودھ کی بجائے "بہلن" (پنجابی میں پہلی بار بیائی ہوئی گائے یا بھینس کو کہتے ہیں) کی کھیس ڈال کر افیم اور سلاجیت کی سلائی پھیر دیتا ہے۔ جس نے ایک دفعہ اس کے ہاتھ کی چائے پی لی، ہمیشہ کے لئے اسی کا ہو رہتا۔ یعسوب صاحب تو چائے کا جوگا تک حلق میں انڈیل لیتے تھے۔ کسی حکیم کو بھنک نہیں پڑی ورنہ اس نسخہ سے تو یونانی امراض کا علاج کیا جا سکتا تھا۔ بہت سی روٹھی ہوئی، الوائی کھٹوائی لئے پڑی ہوئی جوانیوں کو منایا جا سکتا تھا۔

ہم نے ایک دن شکایت کی کہ ہمیں ایک ہی سولی پر لٹکے چار مہینے ہو گئے۔ دوسرے شعبوں کا بھی الف ب سیکھنے کی اجازت ملنی چاہیئے۔ دوسرے دن انھوں نے ہمیں رانگی واڑہ میں شیخ شمس الدین اینڈ سنس کے چمڑے کے گوداموں اور کچی کھالیں کمانے کے حوضوں کا معائنہ کرنے بھیج دیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ دوزخ میں، منجملہ دیگر ضیافتوں کے، بدبو کا تکلف بھی ہو گا یا نہیں۔ لیکن اگر ہوا تو دیکھ لیجئے گا یہی ہو گی۔ تین دن تک ہر چیز میں سے وہی سڑاند آتی رہی۔ دماغ میں بس کے رہ گئی۔ تھوڑی بہت اس وقت نکلی جب چوتھے دن ہم مرچوں کے گودام کا معائنہ کر کے دو دن تک چھینکتے پھرے۔ یہ تو بقول شاعر وصل کی حسرت کی طرح نکلنے کو تو نکلی مگر جیسی نکلنی چاہیئے ویسی نہیں نکلی۔

پرانے خیال کی حیادار بیبیاں ہر مرد کا نام لے سکتی ہیں سوائے اپنے میاں کے۔ اپنے مرد کا نام لینا بے حیائی میں شمار ہوتا ہے۔

یعسوب الحسن غوری بھی کسی محرم انگریز کا نام نہیں لیتے تھے۔ ان کا ذکر آتے ہی "بڑا صاحب" "باس" اور "چیف" کا گھونگھٹ نکال لیتے تھے اینڈرسن کے کمرے سے الٹے قدموں نکلتے، کبھی پیٹھ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آخری قدم تک منہ در منہ ڈانٹ کھاتے نکلتے۔ اینڈرسن کبھی اچانک آنکلتے تو جلتے ہوئے سگریٹ کو مٹھی میں دم بخت کر دیتے۔ ناک اور مٹھی سے دیر تک دھواں لیک (Leak) ہوتا رہتا۔ وہ گالی بھی دیتا تو بالکل اس طرح سنتے جیسے ہز ماسٹرز وائس کے ریکارڈ کی تصویر میں دکھایا جاتا ہے۔ سخت جاڑے میں اس کی بات کا جواب محض گردن کے اشارے سے دیتے۔ انگریز کے سامنے مُنہ سے بھاپ نکالنے کو گستاخی جانتے تھے۔ غرض کہ انگریز کی تعظیم و تکریم میں غلو برتتے اور انھیں فطری تقاضوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ انگلستان کی ملکہ معظمہ کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا تو ہفتوں شرمائے شرمائے پھرے۔

آئندہ اِس واقعہ کو نہ دُہرایا جائے

اگر کسی سے غلطی ہو جائے یا لندن کیبل بھیجنے میں ایک گھنٹہ کی تاخیر کے باعث بینک پر ایک دن کا سود چڑھ جائے تو خطا وار کو وہ رقم گرہ سے بھرنی پڑتی ہے۔ برٹش بینکوں میں ناوان عام تھا۔ رخصت کا نام لیتے ہی "بھنویں تنی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں" والا نقشہ ہو جاتا تھا۔ ہمیں یاد ہے۔ جون کا مہینہ، فری امپورٹ کا زمانہ تھا۔ کام بے اندازہ، آدمی کم۔ ہم چار آدمیوں کے برابر کام اور آٹھ آدمیوں کے برابر غلطیاں بڑی تندہی سے کر رہے تھے۔ ایک منحوس صبح خبر آئی کہ ٹنڈو آدم میں اخبار پڑھتے پڑھتے ابا جان پر دل کا دورہ پڑا اور زمین نے اپنی امانت واپس لے لی۔ حیدرآباد میں ان کی تدفین کے سلسلہ میں تین دن کی رخصت اتفاقیہ لینے کی پاداش میں یعسوب الحسن غوری نے ہماری تنخواہ کاٹ لی، جو کچھ عرصہ بعد اینڈرسن نے اس "وارننگ" کے ساتھ واپس دلوا دی کہ "آئندہ اس واقعہ کو نہیں دُہرایا جائے گا"۔ سلطان علاءالدین خلجی کا بھی کچھ ایسا ہی دستور تھا۔ اگر کوئی سوار لڑائی کے وقت غیر حاضر ہو جائے تو سلطان اس سے گزشتہ تین برس کی ساری تنخواہ دھروا لیتا تھا۔ اور احمد شاہ درّانی نے تو ذرا سی حکم عدولی پر دو سو سپاہیوں کی مشکیں بندھوائیں ناک میں تیروں سے چھید کروا کے نکیلیں ڈالیں اور اونٹوں کی طرح ہانک کر شجاع الدّولہ کے پاس بھیج دیا کہ چاہے قتل کرو، چاہے از راہِ ترحم معاف کر کے انھیں اسی حالت میں دشمن سے لڑواؤ۔

ہاتھ کی لکیریں بولتی ہیں

ہم ایوڑ میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ ہر ایک سینگ مارتا تھا۔ کی جس سے بات اس نے ہدایت فرما دی۔ یوں تو ہمارے جہاں کی کھڑکیاں ہمارے ہی آنگن میں کھلتی تھیں، لیکن یعسوب الحسن غوری کا انگوٹھا ہمارے ٹینٹوے پر ہی رہتا تھا۔ روز روز کے طعن و تشنیع سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔ بلکہ چھلنی میں چھید بھی ہو گئے تھے جن میں سے اب تو موٹے موٹے طعنے چھن کر نکلنے لگے تھے۔ منجملہ دیگر الزامات کے ہم پر ایک الزام یہ تھا کہ ہمارے دستخط گستاخانہ حد تک لمبے ہیں۔ اتنی قلیل تنخواہ اتنے بڑے دستخط کی کفالت نہیں کر سکتی۔ یعسوب الحسن غوری کو اینڈرسن دن میں کئی بار طلب کرتا۔ کبھی کچھ پوچھتا کبھی کچھ۔ اندر جانے سے پہلے وہ اپنی ہتھیلی پر کاپنگ پنسل سے وہ تمام متعلقہ و غیر متعلقہ اعداد و شمار نوٹ کر لیتے جن کے بارے میں اینڈرسن سوال کر سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ سوال کرتا، یعسوب الحسن غوری منہ پھیر کر ید بیضا (؟) کے متعلقہ حصّہ کو زبان سے چاٹ کر حروف کو روشن کرتے اور کھٹاک سے صحیح اعداد و شمار آنے پائی سمیت بتا دیتے۔ ایک دن ہم نے عرض کیا آپ کاغذ پر لکھ کر کیوں نہیں لے جاتے؟ ارشاد ہوا، آپ کو بینک میں جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ آپ انگریزوں کے مزاج سے واقف نہیں۔ کاغذ پر نوٹ کر کے لے جاؤں تو وہ یہ سمجھے گا کہ میرا حافظہ جواب دے چکا ہے۔ میں خدانخواستہ بوڑھا ہو گیا ہوں! ابھی

تک تو وہ ولائتی الو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے تمام اعداد و شمار منہ زبانی یاد ہیں۔
اس کے کچھ دن بعد اینڈرسن نے ہمیں طلب کیا اور پوچھا کہ نرائن گنج برانچ کے بٹے کھاتہ قرضوں کی مجموعی رقم اور تعداد کیا بنتی ہے؟ صحیح صحیح بتاؤ۔
صحیح صحیح تو درکنار، ہم تو غلط جواب دینے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ہمیں شش و پنج میں مبتلا دیکھا تو کہنے لگا:
"ہری اپ! جلدی سے تفصیلی چاٹ کر بتاؤ۔"
اس دن ہم نے دیکھا کہ اینڈرسن کی میز پر نقشین پیتل کے پیپرویٹ کی جگہ پلاسٹک کے چھ گھٹیا پیپرویٹ رکھے ہوئے تھے ہم نے جمعدار اجمل خاں سے کہا کہ پیتل کے پیپرویٹ اچھے لگتے تھے کیوں بدل دیئے؟ کہنے لگا غوری صاحب بولتے ہیں کہ پلاسٹک کی چوٹ پیسٹنگ نہیں ہوتی۔

کیا بیئر حرام ہے؟

ایک دفعہ جمعہ کی اذان کے وقت ہمیں بینک میں گپ شپ کرتے دیکھا تو اشارے سے تخلیہ میں، یعنی باتھ روم کے دروازے تک، لے گئے اور نصیحت کی کہ نماز پڑھا کرو۔ اس سے دھیان غبن کی طرف نہیں جاتا، بشرطیکہ پنج وقتہ پڑھی جائے۔
اتوار کی صبح کو حضرت غلام احمد پرویز کا درس سننے جاتے۔ دو تین دفعہ ہمیں بھی لے گئے پر طبیعت ادھر نہیں آئی۔ فلسفہ اور اشعار کی بھرمار سے وعظ اور درس پر ہمیں اپنی نثر کا گمان ہونے لگا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی "رولر اسکیٹ" پہن کر سجدہ کرنے کی کوشش کرے۔ رہے ابوالکلام آزاد سو وہ اپنی انا کے قتیل تھے۔ اسلام میں اگر انسان کو سجدہ روا ہوتا تو وہ اپنے آپ کو سجدہ کرتے یعسوب الحسن غوری کہتے تھے کہ عالم دین کی صحبت سے روح کا سارا زنگ اتر جاتا ہے۔ البتہ دل پر جو پھپھوندی لگ گئی تھی، اسے اتوار کی سہ پہر کو بیئر سے رگڑ رگڑ کر دھوتے تھے۔ ایک ڈاکٹر نے کہا تھا کہ تمھارے گردے میں جو سنگریزے ہیں وہ اس ہفتہ واری عمل سے فلش ہو جائیں گے۔ اکثر فرماتے کہ یوں بھی بیئر کو کٹھ ملاؤں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے۔ ایران میں تو اسے آب جو کہتے ہیں۔
خدا جانے کہاں تک صحیح ہے، دشمنوں نے اڑائی تھی کہ ایوب خاں کے عشرہ انحطاط میں سرکاری مفتی اعظم ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہ شکاگو یونیورسٹی سے علم دین کی سند لائے تھے، یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ ازبسکہ بیئر میں فقط پانچ فیصد الکحل اور ۹۵ فیصد پانی ہوتا ہے اس کا پینا ازروئے شرع حلال ہے۔ اسی نوع کے دو تین فتاویٰ پُر فتور کی پاداش میں انھیں، جلا وطن ہو کر دس گنی تنخواہ پر امریکہ جانا پڑا۔ اگر ڈاکٹر صاحب قبلہ ذرا بھی سمجھ اور سائنس سے کام لیتے تو فتویٰ میں عاقلوں کو بس اتنا اشارہ کافی تھا کہ بیئر ۹۵ فی صد حلال ہے!

نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

غبن، خیانت مجرمانہ اور جعلی نوٹ اور دستخط بنانے کی جتنی بھی با مشقت یا بے مشقت سزائیں تعزیرات پاکستان میں ہیں، ان کی متعلقہ دفعات ہمیں سامنے بٹھا کے حفظ کروا دی تھیں۔ چار پانچ سبق کے بعد ہم اتنے رواں ہو گئے کہ اپنا ہر فعل کسی نہ کسی دفعہ کے تحت نظر آنے لگا۔ ہر لحظہ قانون کے لمبے ہاتھ کا بوجھ اپنے کندھے پر محسوس کرتے کرتے ہماری چال میں فرق آگیا تھا۔ پھر ایک دن معاً خیال آیا کہ ہمارے اور غبن کے درمیان تو کئی مضبوط تجوریاں اور ہم سے بھی زیادہ بدنیت افسر حائل ہیں۔ پھر ڈر کاہے کا۔ اب

سر اٹھا کر چلنے لگے۔ ابتدائی مغلیہ عہد کے شاعر نوری نے بھی اسی قسم کی بے خوفی کا اظہار کیا ہے حالانکہ اس نے تو خود کو ایماندار ثابت کرنے کے لئے کسی بینک میں بھی ملازمت نہیں کی تھی :

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بے چارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

بیماری اس علاج سے بہتر ہے

اکثر فرماتے کہ تفکرات سے میرے گردے میں پتھریاں ہوگئی ہیں۔ خان سیف الملوک خان کی تشخیص تھی کہ پتھریوں کی تعداد ان کے دیئے ہوئے بٹے کھاتے قرضوں کے برابر ہے۔ انھیں نکالنے کے لئے ہر پندرہ منٹ بعد ایک گلاس پانی پینے اور اس کی ایک لکیر اپنے سگریٹ کے پیکٹ پر کھینچ دیتے۔ شام کو خالی پیکٹ جمع کرتے اور ان پر لگائے ہوئے نشانوں کو جوڑ کر یہ دیکھتے کہ آج کتنے گلاس پانی پیا۔ پھر Fa c i l i مشین پر گلاسوں کے گیلن اور گیلن کے پیکٹ بنا کر دیکھتے کہ بقیہ سنگریزوں کو خارج کرنے کے لئے سگریٹ کے کتنے پیکٹ اور پھونکنے پڑیں گے۔

بلا کے وہمی تھے۔ مزاج پوچھو تو جواب نہیں دیتے تھے۔ کراہنے لگتے تھے۔ اس عمل سے فارغ ہوتے تو "الحمد للہ" یا "خدا کا شکر ہے" اس طرح کہتے گویا محض عقیدے کی پختگی کا اعلان مقصود ہے۔ خیریت کہاں؟ چالیس سال سے اپنی زندگی سے مایوس تھے۔ اینڈرسن کے اصرار پر ایک دفعہ ڈاکٹر ہیم کاکس سے بھی رجوع کیا تھا۔ انہی کا بیان ہے کہ میرا حال دیکھ کر ڈاکٹر ہیم کاکس کی نبضیں چھوٹ گئیں۔ اپنے پلنگ کی پائنتی ایک قدآدم Anatomy Chart (انسانی ڈھانچہ کا نقشہ، جیسا فٹ پاتھ پر مجمع لگانے والے دوا فروش ساتھ رکھتے ہیں) کھڑا کر رکھا تھا۔ دن میں جسم کے کسی نہ کسی حصّے میں درد ضرور اٹھتا، کہیں ٹیس اٹھتی، شام کو چارٹ کے سامنے کھڑے ہو کر، منہ سے منہ، ہڈی سے ہڈی، گردے سے گردہ اور رگ سے رگ ملا کر تشخیص کرتے کہ آج کون سا عضو یا عضلہ اور ماؤف ہوا۔ پھر اس کا علاج کشمیر ہوٹل کے ادلے کے قورمے اور بریانی سے کرتے جس میں برابر کے بادام پڑے ہوتے تھے۔

ہم نے تو انھیں اپنی تنخواہ اور تندرستی کی طرف سے ہمیشہ فکر مند (یا پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے الفاظ میں' متردد و متوحش) ہی دیکھا۔ ایک سال پہلے ان کے چچا جان قبلہ صبح سو کر اٹھے تو پتہ چلا کہ لقوہ مار گیا۔ اوپر کا ہونٹ ٹیڑھا ہوگیا۔ دو مہینے بعد فالج کا حملہ ہوا اور دائیں ٹانگ بھی بیکار ہوگئی۔ چچا جان قبلہ پر ان حملوں سے ان کی اپنی طبیعت ایسی مخلوج ہوئی کہ صبح آنکھ کھلتے ہی آئینے میں اپنا اوپر کا ہونٹ ضرور چیک کر لیتے تھے اور نلکے کے نیچے نہانے سے پہلے گھٹنے پر ڈاکٹر کی طرح چھوٹی سی ہتھوڑی مار کر Re-flexes دیکھ لیتے تھے کہ رات فالج گرا یا نہیں۔ غسلخانے کی اندر سے چٹخنی بھی نہیں لگاتے تھے تاکہ میت نکلنے میں آسانی رہے۔

یہ تھے ہمارے معلّمِ اوّل!　　۸۸

کتابت کی تصحیح

بعض اوقات کتابت کی غلطیاں اتنی
پ ہوتی ہیں کہ اعلیٰ مزاحیہ ادب میں انھیں
ل جاتی ہے ۔مثال کے طور پر ایک بار حضرت
لہ آبادی نے ایڈیٹر "الناظر" مولانا ظفرالملک
شکایت کی

"میرا جو مضمون آپ کے رسالے میں
شائع ہوا ہے اس میں کاتب صاحب
نے بڑی دلچسپ غلطی کی ہے ۔میں
نے لکھا تھا ۔
"کونسلوں میں سیٹ "
کاتب صاحب نے اسے یوں لکھا ۔
"کھونسلوں میں بیٹ "

مگر دورِ حاضر میں کاتب صاحبان کتابت
ں غلطیاں نہیں کرتے بلکہ تصحیح کرتے ہیں
س کا تازہ ترین ثبوت یوں ملا ہے کہ پاکستان کے
یک بڑے سرمایہ دار صنعت کار جو دوسرے
بڑے سرمایہ داروں کی طرح اپنے روپے
پیسے کے زور پر سیاست داں بن بیٹھے ہیں

بڑے غصّے کے عالم میں ایک اخبار کے دفتر
میں گھسے اور ایڈیٹر پر گرجنے برسنے لگے کہ
"میں تمہارے اخبار کو بند
کرا دوں گا۔ تمہیں جیل
بھجوا دوں گا ۔ وغیرہ وغیرہ"
ایڈیٹر نے پوچھا ۔
"غصّہ کا سبب؟"
تو سرمایہ دار سیاست داں نے اخبار اس
کے آگے رکھتے ہوئے کہا ۔
لو یہ خبر پڑھو ۔ میں نے تحریک کے
دوران "جیلیں" کاٹی تھیں تو اس میں
لکھا ہے
"میں نے "جیبیں" کاٹی ہیں
کتابت کی اس غلطی کی فوراً تصحیح اور
مجھ سے معذرت کل صبح کے اخبار کے صفحہ
اوّل پر چھپوا دو ورنہ تمہیں کورٹ میں

گھسیٹ لوں گا ۔ تمہیں جیل بھجوا دوں گا ۔
ایڈیٹر نے قدرے توقف کے بعد اطمینان
سے کہا ۔
"جناب سرمایہ دار سیاست دان!
آپ نے اس ملک کے عوام کو دونوں
ہاتھوں سے جس طرح لوٹا ہے اس
لحاظ سے تو ہمارے کاتب صاحب
نے کتابت کی غلطی نہیں کی بلکہ
واقعہ کی تصحیح کی ہے ۔ اب
آپ ہی خدا کو حاضر و ناظر جان
کر ایمان سے اعتراف کریں کہ
"آپ نے "جیلیں" زیادہ
کاٹی ہیں یا "جیبیں" ـــ ؟

ابراہیم جلیس

"مساوات" (کراچی)

غزل

بر زمین غالب

انگلینڈ سے لائے ہیں وہ اِک آفتِ جاں اور
اِس کو بھی کھپا دیں گے، کھپا دی ہیں جہاں اور

پہلی کو بھی اے یار نہیں چھوڑا ہے مَیں نے
مَیں چھوڑ دوں اس کو تو وہ کر لے گی میاں اور

اُردو کی ترقی کوئی دیکھے مرے گھر میں
بیوی سے خطرناک ہے بیٹی کی زباں اور

محبوب کی مہندی کی طرف مَیں نہیں جاتا
رستے سے گزرتا ہوں تو ہوتا ہے گماں اور

غلّے کی گرانی سے ہے کثرتِ شعرا کی
کر دے گی نئی پود ابھی غلّہ گراں اور

ڈائس پہ مرے باپ کی جاگیر نہیں ہے
اب مجھ سے نہ کہیئے ارے خاں، ارے خاں اور

مَیں بنڈی بڑھاتا ہوں کہ مجھ سے بڑے بوگس
بم آ کے گرائیں گے ابھی زندہ دلاں اور

بوگس حیدرآبادی

رمضانی غزل

غیر روزہ داروں کے نام

عُمدہ افطار پہ رمضاں کے ہیں قائل ہم لوگ
روزہ رکھ لیتے ہیں از رُوئے مسائل ہم لوگ

صبح تا شام ہے محبوب فقط ذکرِ "حلیم"
مُرغ و ماہی کے گِناتے ہیں فضائل ہم لوگ

سحر و افطار کے پابند ہیں، پائیں گے ثواب
فکر کیا ہے جو "ایقمو" پہ ہیں گھائل ہم لوگ

جنّت اُس کی جو بِلا ناغہ کرا دے افطار
سوئے تناول پہ ہیں باقاعدہ مائل ہم لوگ

لیلۃ القدر میں آتے ہیں بہت خواب ہمیں
کُفرِ نعمت، جو کریں نیند کو زائل ہم لوگ

یاد حُوروں کی ستاتی ہے بُڑھاپے میں اگر
یاد کرتے ہیں جوانی کے اَوائل ہم لوگ

زاہدِ خُشک بنے خُلد کی رِندی کے لئے
حُور و غِلماں کے بگاڑیں گے خصائل ہم لوگ

قرض ہر شئے پہ ملے مالِ غنیمت کی طرح
فاتحِ عید رہے صورتِ سائل ہم لوگ

شمع کے دَم سے ہے کچھ ذَوقِ تلاوت بھی جلیلؔ
خاک برا، جو پڑھیں اور رسائلِ ہم لوگ

رشید عبدالسمیع جلیلؔ

یوسف ناظم

عید کا چاند

یوں تو ہر مہینے نیا چاند نکلا ہی کرتا ہے لیکن ان چاندوں میں وہ بات نہیں ہوتی جو عید کے چاند میں ہوا کرتی ہے عید کا چاند' نظام شمسی میں چیف گیسٹ کی حیثیت کا چاند ہوا کرتا ہے۔

عید کا چاند بڑی محنت سے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ اپنی نازکی اور باریکی کے لئے بہت مشہور ہے' اس سے زیادہ باریک چیز آسمان پر ملنی مشکل ہے۔

یہ چاند اس قرض دار شخص کی طرح ہوتا ہے جو چھپ کر نکلتا ہے اور نظر آنے سے پہلے چھپ جاتا ہے۔

یہ چاند دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ نظر آنا چاہیئے چاند رات کو اس سمت میں جس سمت میں کہ چاند کو نکلنا چاہیئے، لوگ انگلی کے اشارے سے بتاتے ہیں کہ چاند اس طرف ہے۔ وہ اونچے درخت کی سیدھی جانب ذرا نیچے کی طرف۔ وہ جو ٹہنی نظر آرہی ہے بس اسی سے لگ کر۔ یہ سن کر سمجھ لینا چاہیئے کہ چاند وہاں نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جسے چاند نظر نہیں آتا' دوسرے شخص کو ضرور دکھاتا ہے۔ یہ صرف انگشت نمائی ہے۔

عید کے چاند کے دن دوپہر ہی سے مطلع ابر آلود ہو جاتا ہے (جہاں تک مطلع کا تعلق ہے یہ بہت کم موقعوں پر صاف ہوا کرتا ہے۔ چند غزلوں کے مطلعے البتہ صاف معلوم ہوتے ہیں) اس لئے عید کے چاند کو لوگ اب دیکھتے نہیں صرف ریڈیو پر سن لیتے ہیں (اگر یہ خبر ہندی میں نشر ہو تو خود ہندی والوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتی) ریڈیو پر سنے ہوئے چاند کا بھی وہی مرتبہ ہے جو چشم دید چاند کا ہوا کرتا ہے (زمانہ مساویانہ حقوق کا ہے)

عید کے چاند کو' زمین پر کھڑے رہ کر نہیں دیکھا جاتا۔ اسے گھر کی چھت پر چڑھ کر دیکھنا چاہئے۔ (گھر کی چھت کی غرض و غایت ہی یہ ہے۔ یہاں سے پتنگ بھی اڑائی جا سکتی ہے کیونکہ اس سے زیادہ غیر محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہوتی) گھر کی چھت اس چھت کو کہتے ہیں جو بارش میں ٹپکا کرے۔ جو چھتیں بہت اچھی ہوتی ہیں وہ بغیر بارش کے بھی ٹپکا کرتی ہیں چاند کو دیکھنے

کی مساعیٔ جمیلہ، ہر قسم کی چھت پر کی جاسکتی ہیں۔ چاند کو نظر آتا ہے تو وہ ضرور دکھائی دے گا خواہ آدمی کتنی ہی ناقص اور کمزور چھت پر کیوں نہ دم سادھے کھڑا ہو۔ (ہاؤزنگ بورڈ کے بنائے ہوئے مکانوں کی چھتیں تک بھی اس کام کے لئے استعمال کی جاسکتی ہیں)

پہلے زمانے میں تو اس چاند کے مطالعے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے تھے۔ کئی گھوڑے سوار شہر سے باہر جاکر پہاڑیوں پر چڑھ جاتے اور اسے دیکھنے کی سعادت بزورِ بازو حاصل کرتے تھے (بیچارے گھوڑوں کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ وہ ایسے بے وقت، پہاڑیوں پر کیوں لے جائے گئے ہیں انہیں کیا معلوم کہ آدمی، ہارس پاور کہاں کہاں استعمال کرتا ہے) جب کافی وقت گذر جاتا ہے اور لوگ یہ سمجھ لیتے کہ اب یہ گھوڑے سوار کل شام ہی کو واپس ہوں گے تو یہ حضرت اچانک واپس آکر یہ خبر پھیلاتے کہ وہ چاند کو دیکھ آئے ہیں ــــ آج بھی جب کہ سائنس نے اپنی دانست میں کافی ترقی کر لی ہے اور آدمی خود چاند پر ہو آیا ہے پہلی تاریخ کے اس مختصر سے چاند کے اعمال و افعال میں کوئی سیاسی یا سماجی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ عید کے چاند کو اب بھی اس طرح ڈھونڈنا پڑتا ہے جیسے روزگار ڈھونڈا جاتا ہو۔

عید کے چاند کو مقررہ تاریخ پر نمودار ہونے میں کوئی خاص دقّت تو نہیں ہوتی لیکن اس کی مجبوری صرف اتنی ہوتی ہے کہ عید سے دو مہینے پہلے ہی اس کے نمودار ہونے کی تاریخ بدل دی جاتی ہے۔ عید کا چاند اس لئے یا تو ایک دن پہلے یا ایک دن بعد ہوا کرتا ہے۔

نورجہاں اور جہاں گیر بلکہ یوں کہیے کہ جہاں گیر اور نورجہاں کے عہد میں یہ دونوں زن و شوہر عید کا چاند دیکھ کر فنِ شعر گوئی کا مظاہرہ کرتے تھے جہانگیر نے ایک مرتبہ کہیں عید کا چاند دیکھ لیا تو اس نے نورجہاں کو مخاطب کر کے کہا۔

ع ہلالِ عید بر اوجِ فلک ہویدا شد

تو نورجہاں نے جو کسی معاملے میں جہاں گیر سے کم نہیں تھی فوراً دوسرا مصرعہ چست کر دیا

کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود، پیدا شد

بحیثیت سخن فہم، ہم نورجہاں کے مصرعے سے زیادہ خوش ہیں، ایک تو اس شعر میں تشبیہہ بہت عمدہ ہے۔ ہلالِ عید بالکل کُنجی کی شکل کا ہوتا ہے۔ جوشؔ نے اس مختصر سے چاند کو ٹوٹے ہوئے کنگن سے تشبیہہ دی ہے ؎

جب ناز سے قندیلِ مئے نو ہوئی روشن جیسے کسی معشوق کا ٹوٹا ہوا کنگن

یہ تو تیسری چوتھی تاریخ کے چاند کی بات ہوئی۔ پہلی تاریخ کا چاند تو کُنجی ہی کے قد و قامت کا ہوا کرتا ہے۔ کُنجی اور وہ بھی بریف کیس کی کُنجی۔ دوسرا اہم نکتہ جو نورجہاں کے کہے ہوئے مصرعے میں ہے وہ ہے میکدہ والی بات یعنی شاہی محل کا "وائن کا ونٹر" کامل ایک ماہ بند رہا۔

اگر کسی شخص کو بینائی کے کسی نقص کی وجہ سے عید کا چاند نظر آ جائے تو ایک اچھے شہری کی حیثیت سے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سب کو سلام کرے (ہو سکے تو مصافحہ بھی کرے)

عید کا چاند، اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی الیکشن میں کامیاب ہو جانے کے بعد چھ سال تک بالکل دکھائی نہ دے۔ لیکن یہ غلط ہے کیوں کہ عید کا چاند دو چار سال میں تو ایک مرتبہ دکھائی دیتا ہی ہے۔

بھارت چند کھنہ

معاشرتی طرزِ زندگی

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر
ہر جگہ پا بہ زنجیر ہے۔ طوقِ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہمارا
ملک ایک ایسے معاشرے کے قیام کے لئے کوشاں ہے جس میں ہر شخص آزاد ہو،
اس کو بولنے، سوچنے، اظہارِ خیالات اور عمل کرنے کی پوری پوری آزادی ہو جس میں ہر شخص کو برابر
برابر موقعے ترقی کرنے کے حاصل رہیں، ذات پات اور اونچ نیچ کی تفریق دور ہو جائے اور اس آزاد
ملک میں ہر شخص آزادی کا سانس لے سکے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں صدیوں پرانی روایات، طور طریقے اور پراچین نظریات نے
ملک کی اس آزاد فضا کو مکدر کر رکھا ہے۔ ایک طرف ملک کا خوشحال، خوشباش ترقی یافتہ اور
دولت مند طبقہ ہے تو اس کے برعکس ملک کی کثیر آبادی ایسے پس ماندہ، بچھڑے لوگوں کی ہے جن کو
صدیوں سے چھوت چھات وغیرہ کی بنا پر ترقی کرنے کے ذرائع اور موقعوں سے محروم رکھا
گیا ہے۔ اس لئے یہ لوگ ترقی کرنے والوں سے بچھڑ کر پیچھے، بہت پیچھے رہ گئے
ہیں اور ان پر عائد کی ہوئی پابندیاں کچھ ایسی تھیں کہ یہ بالکل سست گام اور
بے کام ہو کر پستی کی عمیق اور اندھیری کھائیوں میں پڑے ہوئے ہیں
یہی وجہ ہے کہ ہماری حکومت نے بڑی تحقیق اور

اور تفتیش کے بعد پس ماندہ اقوام اور تہائی کو درج فہرست کر دیا تاکہ وہ قوم کے دوسرے افراد سے اس قدر نہ بچھڑ جائیں کہ نظروں سے ہی غائب ہو جائیں۔ ان لوگوں کو متعدد رعایات اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے مختلف قواعد اور قوانین بنائے گئے تاکہ یہ ترقی کر سکیں۔ مگر ابھی تک یہ بے کار ثابت ہوئے ہیں اور پس ماندہ ابھی تک پس ماندہ ہی ہیں۔

ترقی یافتہ اور پست اقوام کے درمیان جو خلیج حائل ہے، اس کو پاٹنے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں:

— اول یہ کہ پست اقوام کے لوگوں کو اٹھا کر ترقی یافتہ لوگوں کی صف میں لا کر بٹھا دیا جائے۔ یہ صرف ایسی صورت میں ممکن ہے اگر حکومت کے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہو جس کو پھیر کر وہ پست اقوام کو آنِ واحد میں ترقی یافتہ بنا دے۔ مگر ہمارے ملک کی موجودہ فضا ایسی ہے کہ اگر کسی کے پاس الٰہ دین کا چراغ ہو تو اس کو رگڑنے سے جو جن پیدا ہوگا وہ حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے یہ جاننا چاہے گا کہ ملک کے کس قوانین کے تحت کیا جادوگر کو یہ حق حاصل تھا کہ جن کو میٹھی نیند سے بے وقت بیدار کر دے — اور پھر اگر یہ حماقت کرنا ہی تھا تو پہلے اس بات کی وضاحت کی جائے کہ جن کو اوور ٹائم کس شرح سے دیا جائے گا!

— دوسرا طریقہ جو پس ماندگان کو ترقی یافتہ لوگوں کے قریب لانے کا ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ طبقہ کو جہاں تک وہ ترقی کر چکے ہیں وہیں پر روک دیا جائے اور تب تک بڑھنے نہ دیا جائے جب تک کہ پست اقوام کے لوگ ترقی کرتے ہوئے ان سے آ ملیں — یہ طریقہ بھی موزوں نہیں کیونکہ پس ماندہ لوگوں کی پس ماندگی کچھ ایسی ہمہ گیر ہے کہ ان کو ترقی یافتہ طبقہ تک پہنچنے کے لئے ممکن ہے صدیاں گزر جائیں۔

— تیسرا اور نہایت موثر طریقہ ان دو طبقوں کو ایک جگہ لانے کا یہ ہے کہ ترقی یافتہ طبقہ کو نہ صرف ان کے موجودہ مقام پر روک دیا جائے بلکہ ان کی گردن میں ہاتھ دے کر ان کو واپس اس راستے پر ڈال دیا جائے جہاں سے وہ چلے تھے۔ اگرچہ فاصلہ دور کا ہے مگر دیر لگتی ہے ترقی کرنے میں، پستی کی طرف جانا ایسا ہی ہوگا جیسا کسی پہاڑ کی چوٹی سے زمین کی طرف آنا۔ چنانچہ ترقی یافتہ طبقہ بہت جلد اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں سے آن ملے گا اور ان دو طبقوں میں جو فرق صدیوں سے چلا آ رہا ہے وہ مٹ جائے گا اور پھر دونوں ترقی کی منزلوں کی طرف مل کر قدم بڑھائیں گے۔

اس ترکیب سے ایک ایسی ٹھوس قوم کی تشکیل عمل میں آسکے گی جو بالکل پس ماندہ ہوگی اور بہر حال ہماری حکومت کا بھی تو یہی نصب العین ہے کہ ملک میں اونچ نیچ، چھوت چھات، بڑے چھوٹے، ذہین اور کند ذہن اور گدھے گھوڑے کا فرق یکسر مٹ جائے۔ یہ بات جدا ہے کہ ایسا کرنے سے ترقی یافتہ طبقہ اور ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا مگر چھوڑیئے اس معمولی سی بات کو۔ ہم کو اس معاملہ میں دیکھنا یہ ہے کہ آیا حکومت کی توقعات پوری ہوئیں یا نہیں —؟

توقعات پوری ہونے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی ترقی کا انحصار بالکلیہ ہماری پنج روشی یوجناؤں کی کامیابی پر ہے۔ ان یوجناؤں کی کامیابی کو پرکھنے کے لئے ہمارے ملک کے دانشور یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں اسکیم کے لئے جس قدر رقم مختص کی گئی تھی آیا وہ خرچ ہوئی ہے یا نہیں۔ وہی یوجنا کامیاب سمجھی جاتی ہے جس کے تعلق سے دی گئی رقم پوری پوری صرف ہو جائے۔ البتہ یہ بات جدا ہے کہ رقم کس طرح اور کہاں صرف ہوئی۔ رقم مختص کرنے والے ماہر دانشور توقع کرتے ہیں کہ پوری رقم پلان میں بتلائے ہوئے منصوبے کے مطابق بروقت استعمال ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ خاندانی منصوبہ بندی کے تحت دی گئی رقم سے جو STERLIZERS خریدے گئے تھے وہ سبز انقلاب کی اسکیم میں استعمال ہو گئے اور خوش قسمتی سے FERTILIZER کا استعمال فیملی پلاننگ میں ہو گیا۔ ان کا اثر جو ان اسکیموں پر ہوا وہ ظاہر ہے مگر پلاننگ کے ماہر خوش تھے کہ مختص کردہ رقوم ان کی توقعات کے مطابق خرچ کر دی گئی تھیں۔ الغرض ہماری حکومت کا اعلان کردہ منصوبہ یہ ہے کہ پس ماندہ اور ترقی یافتہ لوگ دونوں ایک سا

آجائیں ۔

معاشرتی طرز زندگی کے قیام کے لئے یہ پہلا قدم اُٹھانے کے ر اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ پست اقوام کے لوگ پھر بچھڑ کر پیچھے نہ رہ جائیں ۔ ان کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کرنا ضروری ہوگا ۔ آپ کہیں گے کہ یہ کس قسم کا سوشلزم ہے جس ننص کو برابر موقعے ترقی کے حاصل نہیں ۔ مگر یہ بحث و حجت ، بے معنے ہے کیونکہ صدیوں سے ترقی یافتہ طبقہ نے پست اقوام طرح کے ظلم وستم ڈھائے اور ان کو اپنے حقیر مقام سے سر اونچا ہنے دیا ۔ اب جبکہ پانسہ پلٹ گیا ہے تو ان کو ان محروم لوگوں تھ کئے جانے والے خاص سلوک کے خلاف کوئی شکایت نہیں چاہئے ۔

پس ماندہ طبقے کے لوگوں کے سدھار کے لئے سُنتے ہیں کہ پردیش کی حکومت نے ڈاکٹری کے کورس میں داخلہ کے لئے ان نہ امتحان متعلقہ میں صرف ۲۰ فیصد نشانات حاصل کرنے کا کھا ہے، اور اس کے باوجود بھی محفوظ کردہ جگہیں پُر نہیں ہو رہی ہوسکتا ہے کہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے ۲۰ فیصد ن کڑی شرط کو گھٹا کر پندرہ یا دس فیصد تک کر دیا جائے جب یہ رعایت بھی خاطر خواہ نہ ثابت ہو تو پھر شاید اس کے لوگوں کا داخلہ کے امتحان میں موجود رہنا ہی ایم' بی' بی' ایس ئے جانے کے لئے کافی سمجھا جائے گا ۔ ملحوظ رہے کہ پس ماندگان ، یافتہ بنانے کی کوشش میں جو کچھ نہ کیا جائے کم ہے ۔

خیر ڈاکٹری کے کورس میں ان کی شرکت سے کوئی اندیشہ نہیں کل اس وقت درپیش آئے گی جب یہی لوگ پانچ چھ سال ں کالج میں گزارنے کے بعد دس یا پندرہ فیصد نمبر حاصل کرکے اور خطرۂ جان بن جائیں گے ۔ ایسے ماحول میں مریض اپنی زیز کسی ڈاکٹر کے حوالے کرنے سے پہلے یہ جاننا چاہے گا کہ ا تعلق پس ماندہ طبقہ سے تو نہیں ۔ پھر یہ ہونے لگے گا ست کو ان ڈاکٹروں کو اپنے علم کی کھپت کے مواقع فراہم کے لئے ایسے قوانین بھی بنانے پڑیں گے جن کے تحت ا سرکار کو لازماً پس ماندہ طبقہ کے ڈاکٹروں سے علاج کروانے کے لئے خود کو ان کی تحویل میں دے دینا پڑے گا اور جو ملازم سرکار نہیں ان پر یہ پابندی عاید کی جائے گی کہ اگر وہ خود کو ان ڈاکٹروں کے حوالے نہیں کریں گے تو ان کی برقی' پانی' راشن کی سپلائی (بشرطیکہ یہ چل رہی ہو) کاٹ دی جائے گی ۔

کہتے ہیں کہ ڈاکٹران زیر بحث کی سی قابلیت کے کسی ڈاکٹر کے علاج سے جب ایک بدنصیب مریض جملہ امراض سے نجات پاکر جنّت کے دروازے پر پہنچ گیا تو وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی جنّت سے جب وہ دوزخ کے دروازے پر پہنچا تو وہاں کے داروغہ نے بھی اس کو شریک دوزخ کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہاں بھی اس کی سیٹ محفوظ نہیں کی گئی تھی ۔ الغرض خدا کا بندہ سیدھا خدا کے حضور میں پہنچا اور فریاد کی کہ میں کہاں جاؤں ۔ خالق دو جہاں کو بہت غصہ آیا اور جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کیا ہے تمہارا انتظام کہ میرے بندوں کو جہان فانی سے رخصت ہونے پر جنّت اور نہ دوزخ میں جگہ ملتی ہے ۔ جبرئیل نے اپنے رجسٹروں کو دیکھ کر مودبانہ عرض کی کہ حضور یہ شخص وقت سے پہلے یہاں آگیا ہے ۔ اپنی صحت اور اعمال کے مطابق ابھی اس کو دنیا میں بہت عرصہ گزارنا تھا مگر یہ ایک ایسے ڈاکٹر کے ہتھے چڑھ گیا تھا جس نے اس کی کشتی حیات کو ہمارے احکام کے خلاف چشم زدن میں ڈبو دیا ۔

خیر اس ڈاکٹری کی بات کو چھوڑیئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ پس ماندہ طبقہ کے لوگوں کے ساتھ مدتوں سے انتہائی بدسلوکی کی جا رہی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے لئے اسکولوں، کالجوں اور محکموں میں جگہیں محفوظ کر دی گئی ہیں اور ان کے لئے ترقی پانے کے بھی ایسے مواقع محفوظ ہیں جن سے وہ اپنے ساتھیوں سے بہت پہلے ترقی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں مگر صدیوں کی پس ماندگی کی وجہ سے وہ اس کیفیت میں نہیں رہے کہ زندگی کے دیگر مراحل میں غیر پس ماندہ لوگوں کی برابری کر سکیں ۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جن کے تحت پندرہ یا بیس فیصد نشستیں ریلوں، بسوں، ہوائی جہازوں وغیرہ میں بھی ان کے لئے مختص کر دی جائیں تاکہ ان کو سفر کرنے میں دشواریاں پیش نہ آئیں ۔

پھر ان کو چند رعایات بھی دی جانی چاہئیں ۔ محض درخواست

کے خانہ میں چار آنے کی رعایت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ ہونا یہ چاہئے کہ انکم ٹیکس، پراپرٹی ٹیکس، جرمانوں اور جیل جانے کی سزاؤں میں بھی ان کے لئے کمی کی جائے اور یہ رعایت ۲۵ فیصد تک جائز ہونی چاہئے۔ الغرض ان احکام کی عمل آوری میں کچھ اس نوعیت کے حکم جاری کئے جائیں گے کہ :

خاطی کو پانچ ہزار روپے (پس ماندہ طبقہ والوں کے لئے صرف بارہ سو پچاس) جرمانہ یا چار سال کی قید بامشقت (پس ماندہ لوگوں کے لئے صرف ایک سال) دی جائے گی :

جب ایسے قوانین لاگو ہو جائیں گے تو پس ماندہ طبقہ کے لوگ، پس ماندہ رہنے کے لئے نہ صرف ۲۵ فی صد (جس کی رعایت انھیں حاصل ہے) بلکہ اپنا آخری قطرہ خون تک بہا دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ مگر جب ایسے ہی قوانین کی رُو سے پس ماندہ طبقہ کے ڈاکٹروں کے لئے صرف علاج کا صرف چوتھائی حصّہ کرنا کافی سمجھا جائے گا) تو اس وقت شاید قانون سازوں کی عقل پر جو پردہ پڑگیا ہے، اُٹھ جائے۔ ▲▲

رفیع الدین رازؔ

قطعات

کھیر چکھی نہ قورمہ کھایا
حلوہ کھایا نہ پوریاں کھائیں
عید کے دن بھی دوستو ہم نے
اپنی بیوی کی گالیاں کھائیں۔

★

عید کے دن بھی بیوی سے چخ چخ
بس یہی عرضِ حال ہے یارو
بڑھ گئی جب سے گھر میں آبادی
میرا جینا محال ہے یارو!

★

خاک سمجھیں نماز اور روزہ
کیا خبر کیسی عید ہوتی ہے؟
دل کے ماروں کی عید تو یارو
حُسن والوں کی دید ہوتی ہے

طارق جامی
ریاض، سعودی عرب

خدمتِ خلق

خدمتِ خلق ایک عظیم ہمہ گیر جذبہ ہے جو آپ کے ارد گرد، پاس پڑوس میں واقع کسی بھی شخص میں کسی بھی وقت عود کر سکتا ہے اور جس کا ہدف کسی بھی وقت آپ کی ذات بابرکات بن سکتی ہے۔ یہ ہمارا وہ قولِ زرّیں ہے جسے ہم خود بھی ہمہ وقت پلّے سے باندھے رکھتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے دوسرے اقوالِ زرّیں کچھ زیادہ اہم نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ وہ قولِ زرّیں ہے جس کے "سائیڈ ایفکٹس" اپنی تخلیق سے پہلے ہی رونما ہونے لگے تھے سو یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے دیدۂ و دل "وقفِ قولِ زرّیں" لہٰذا کرنے پڑ گئے ہیں۔

ہمارے ایک بزرگ پڑوسی حد درجہ جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ جذباتیت بذاتِ خود کوئی بری چیز نہیں کہ جذباتی آدمی ہر کام جذبے سے شروع کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ادھورا چھوڑ دیتا ہے مگر جب ان کی جذباتیت کی تان دستک کی صورت میں ہمارے دروازے پر ٹوٹتی ہے تو اگرچہ ہمارے اوسان خطا ہونے لگتے ہیں لیکن وہ اسے اپنی خدمتِ خلق پر محمول کرتے ہیں اور اپنے اس جذبے کی بنا پر ہمیشہ ہماری بھلائی کے درپے رہتے ہیں جب کبھی اور کہیں ملتے ہیں وہ اپنے جذبۂ خدمتِ خلق کا مظاہرہ ضرور کرتے ہیں اور ہم جیسے گناہگار کے گناہوں کا کفارہ اپنے پلّے سے ادا کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

ایک دن بازار میں مل گئے دور ہی سے آواز دے کر بولے "بھئی میاں! کہاں جا رہے ہو؟" عرض کیا "اس زمانے میں غریب (جو اپنے تئیں شریف ہونے کی غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو) کے رہنے کی دو ہی جگہیں ہیں ـــ گھر یا تھانہ، فی الحال اوّل الذکر ہماری منزل ہے"۔ ارشاد ہوا "ٹھہرو یا ہم بھی چلتے ہیں، رستہ خوب کٹے گا"۔ (یقیناً ان کا رستہ خوب کٹتا ہے) اب ہم ہیں کہ سراپا انتظار کھمبے سے لگے "بیٹھے" ہیں اور وہ ہیں کہ پھل فروش سے آدھ پاؤ انگور کی قیمت پر نوک جھونک فرما رہے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے ان کی جان چھوڑ کر آئے فرمایا "بہت دنوں سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہم آج سوچ بھی رہے تھے کہ تمہارے گھر معلوم کیا جائے"۔ موصوف اپنے تئیں ہم بولتے ہیں اور ہمارے لئے تم کا استعمال کرتے ہیں۔ خیر رستہ بھر گزشتہ ہفتہ کی سردی پر گفتگو فرماتے رہے۔ اچانک ایک گلی کے موڑ پر ایک غیر ملکی کو کچھ خریدتے پایا تو ان کی رگِ مہمان نوازی پھڑک پھڑک اٹھی ہمیں یکسر نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے اس کی طرف بڑھے اس سے سرگوشی میں کچھ گفتگو فرمائی۔ ہاتھ ملایا اور پھر وہیں سے آواز لگائی ـــ "تم چلو ہم آ رہے ہیں، شام کو گھر پہ ملیں گے"۔ اور ہم شام کے منظر کو چشمِ تصوّر میں سجائے ہوئے گھر بڑھ لئے۔

شام ہوئی تو ملول چہرے کے ساتھ تشریف لائے۔ ہم اخلاقاً پوچھ بیٹھے "خیریت تو ہے نا؟" چہرے پر رنگِ ملال مزید گہرا ہوا، آنکھوں میں دکھ کے سائے اور تاریکیاں چھٹے اور لہجے میں گویا رقّت کا تلاطم سما گیا۔ "غضب ہو گیا" ہم نے بھی اخلاق کی رسّی ڈھیلی کرنے لی

عافیت جانا۔" کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔ رقّت مزید رقیق ہوگئی۔ دھیمے لہجے میں داستان سرائی کی ابتدا ہوئی۔" وہ طاقتا نا' تھا دو پہر والا اُس نے بڑا کا زیادتی کی ہمارے ساتھ۔ اب کے ہم نے لقمہ نہ دینے کی ٹھانی اور خاموش رہے کچھ دیر بعد خود ہی رواں ہوئے۔ "گویا گیئر بدلا وہ سوید سش تھا' باتوں باتوں میں کھانے کو پوچھا تو اُس نے قطعاً نہ نہ کی۔ پھر جب اُسی کے ہوٹل پہنچے تو وہاں اُس کے دو ساتھی اور بھی تھے پُورے سو روپے کا بل بنا' ہم دکانوں کا کرایہ لا رہے تھے۔" "مگر یہ تو خود آپ نے کیا' بھلا کسی کا کیا قصور؟" ہاں بس اُن لوگوں نے اپنی تنگی کے واقعات کچھ اس ڈھنگ سے بیان کئے کہ ہم سے برداشت نہ ہو سکا اور بٹوے میں جو کچھ باقی تھا وہ اُنہیں دینا پڑا۔" اب ایسے موقعے پر آدمی ڈھنگ سے تسلی بھی نہیں دے سکتا جبکہ مخاطب فاضل جذبۂ خدمتِ خلق سے بھی لبریز و سرشار ہو۔ بہرکیف اپنے تئیں پوری کوشش کی "چلیے جو ہوا' سو ہوا آئندہ را احتیاط۔" "مگر احتیاط کیسے ممکن ہے۔ انہوں نے کل پھر ملنے کا وعدہ لیا ہے۔" "اچھا تو آپ مت جائیے۔" ہم نے بقسم الٰہی مجادلے تے ہوئے اخلاق کی رسّی مزید ڈھیلی کی لیکن اُن کے جوابِ لاجواب کا کیجئے "خوب کہی میاں! آخر اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے" اور ہم نے اپنے اخلاق کی رسّی فوراً واپس کھینچ لی۔

اتوار کا دن تھا' صبح سویرے سے ناشتے کے وقت عین دس بجے تشریف لائے۔ وہ تو خیر گزری ناشتہ فرما کر آئے تھے۔ ایک بات موصوف کو ہمارے بارے میں بہت پریشان رکھتی ہے اور وہ ہے ہماری بے پرہیزی اور بے احتیاطی' جسے ہم نے کبھی محسوس نہیں کیا لیکن آپ جب کبھی تشریف لائیں گے دس بارہ اموات کے رقّت انگیز واقعات سُنا کر تان اس بات پر توڑیں گے کہ ہم نے جو صحت کا خیال نہیں رکھا اُس کا یہ حشر ہوتا ہے اور یہی باعث ہے کہ حضرت سے ہمیشہ ہمارا کا یہ حالت نہیں دیکھی جاتی سو ہر مرتبہ صدہا نصیحتوں کے پلندے ساتھ لاتے ہیں۔ اُس دن بھی جب اس غرضِ مقدس سے فارغ ہو چکے تو پوچھنے لگے۔ "کوئی تازہ خبر؟" عرض کیا "کوئی خاص بات نہیں ہے' یہ رہا اخبار" بس وہ کل حادثہ ہوا تھا خانیوال روڈ پر۔ اُس کی تفصیل چھپی ہے؟" "اچھا اچھا' لائیے تو دیکھیں۔" انہوں نے اخبار لیا اور ہم نے شکر ادا کیا کہ کچھ دیر کو تو سکون کا سامان ہوا۔ لیکن چند لمحوں بعد ایک لمبی سی "ہوں" ارشاد ہوئی اور ہم "مکرّر ارشاد" کے بعد کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے تیار ہوگئے "اچھا تو پندرہ آدمی مرے" ہم نے "جی" کے سہارے کچھ امان پائی۔ انہوں نے ورق اُلٹا' اداریے کے کالم پر نظر دوڑانی شروع کی اور ہم نے شیو بنانے میں خود کو معروف "پوز" کرنے کی کوشش کی۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ پھر سوال ہوا۔ "آخر یہ حادثہ ہوا کیسے؟ بھلا ایک بے ضرر سے پڑوسی کو جس کی صحت ہمیشہ ٹھیک رہی ہو مگر جس کے پاس دال روٹی کے چکر میں حقیقتاً کان کھجانے کو فرصت نہ ہو۔ خانیوال روڈ پر شہر سے ۲۵ میل دور ہونے والے کسی حادثے کی وجوہات کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ واقعات پوچھتے تو اخبارات کے مندرجات سے اُن کی تشفی کی جا سکتی تھی۔ نتائج کا سوال بھی درسی پیپروں کی بدولت ہم حل کرنے کے قابل تھے۔ جو نتائج جنگِ عظیم اول و دوم کے تھے۔ اُسی سے مختلف نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ بہرطور جو کچھ ذہن میں موجود تھا اُسے صورتِ حال کے مطابق سمیٹ کر ہم نے بیان کرنا شروع کیا "دراصل ایک بس لاہور سے آرہی تھی۔" انہوں نے فکاہی کالم پر نظریں گاڑتے ہوئے جواباً کہا "ہوں"۔ "دوسری بس ملتان سے جا رہی تھی" اب کے پھر بچوں کی کہانی سننے کے سے انداز میں جواب ملا "ہوں"۔ "غالباً دونوں بسیں ایک ہی کمپنی کی تھیں"۔ اب کے جواب میں "ہوں" ذرا مختصر اور قدرے توقف سے آئی۔ "لاہور سے آنے والی بس کا ڈرائیور شروع ہی سے اونگھ رہا تھا" لیکن اب "ہوں" کا طرف تعطیل ہوگئی لیکن اُن کی دلچسپی کے مدِنظر ہم نے یہی جانا کہ خاصی محویت سے ہماری تفصیل سُنی جا رہی ہے سو ہم نے اپنی رفتار برقرار رکھی "جہاں یہ حادثہ ہوا۔ وہاں ایک خطرناک موڑ آگیا۔ بس حد درجہ تیز رفتار تھی' بس موڑ کاٹتے ہی بے قابو ہو گئی اور سامنے سے آنے والی بس سے ٹکرا گئی۔" ہم نے تفصیل ختم کی تو تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ہفتہ وار خصوصی کالم میں منہمک ہیں اور ہم بھی منہ بگاڑ بگاڑ کے شیو کرنے میں معروف ہو گئے' چلو جان بچی اور لاکھوں پائے کہ اچانک انہوں نے اول الذکر "ہوں" کو ایک سرد آہ طویل

یں "ری کمپوز" کیا اور فرمان ہوا۔ "اچھا تو تم کیا کہہ رہے تھے۔" ہم نے ٹھیک سے نہیں سنا۔ البتہ اُسی لمحے ریڈر نے ہمارے چہرے کے ایک خوبصورت زاویے کو دائمی طور پر روک لیا اور گلنار کر دیا۔

ذاتی لائبریری بنانے کا شوق، ہمیں بہت عرصے سے تھا ایک بار جو موقعہ ملا تو دوستوں سے ہتھیائی ہوئی چند کتابوں سے ایک چھوٹے سے شیلف کو سجا کر لائبریری بنانے کا آغاز کیا چند کتابیں بچوں کے تبدیل شدہ نصاب سے بھی میسر آگئیں۔ کچھ پمفلٹ خاندانی منصوبہ بندی کے ہاتھ لگ گئے، چند شمارے ایک مذہبی ہفت روزہ کے مل گئے جو ہمیں مفت ملا کرتا تھا۔ یوں گویا ہم نے شیلف کو پوری طرح بھر لیا۔ ایک دن بزرگ موصوف کی نظرِ شفقت اس شیلف پر جا پڑی۔ "خوب! خوب بھئی واہ! تم نے تو اچھی خاصی لائبریری بنالی ہے۔ یہ تو بہت اچھا کیا ہے مجھے بھی اکثر کتابوں کے سلسلے میں تکلیف رہتی تھی۔" اور اُن کی تکلیف رفع ہوتے ہی ہمارے ہاں تکلیف کا آغاز ہوگیا۔ نظرِ شفقت کے بعد جب اُن کا دستِ مبارک کتابوں کی طرف بڑھا تو وہ ہاتھ ہمیں اپنے کلیجے پر پڑتا دکھائی دیا۔ لیکن کیا کریں وہ ہمارے مخلص بزرگ ہیں اور اُن سے ہمیشہ ہماری یہ حالت (کوئی سی حالت) دیکھی نہیں جاتی۔ اب صورت یوں ہوتی ہے کہ وہ کتابوں کے کند حصوں کو انگلیوں کے پوروں سے یوں الگ الگ کرکے دیکھ رہے ہیں جیسے مائیں بچوں کی جوئیں دیکھتی ہیں اور جونہی اُن کے ہاتھ کوئی اچھی سی "جوں" لگتی ہے وہ فوراً ناخنوں کے بل اُسے نکال باہر کرتے ہیں: "اخاہ! تو یہ کتاب تمہارے پاس موجود ہے۔ بھئی بڑی تلاش کی" اور اُن کی اس تلاش میں آدھے سے زیادہ شیلف خالی ہو جاتا ہے تسکین جاتے وقت چونکہ اُنہیں دوسرے فرائضِ ضروریہ میں بھی منہمک ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا کبھی کوئی کتاب نہیں لے جاسکتے اور ہمیں وہ ساری کتابیں از سرِ نو شیلف میں ترتیب دینی پڑتی ہیں اور وہ تو شکر ہے کہ کوئی کتاب کبھی پڑھنے کو لے نہیں گئے۔

خدمتِ خلق کے سلسلے میں بہت سے مردانِ حُر کو دیکھا ہے کہ کسی ایک میدان میں خود کو محدود کرلیتے ہیں اور اُسی میدان کی شہسواری میں عمرِ عزیز کے چار دن کاٹ دیتے ہیں مگر ہمارے بزرگ موصوف اس معاملے میں ہر فن مولا قسم کے خادمِ خلق ہیں۔ ہر شعبہ اُن کے لئے میدانِ کارزار ہے۔ ہر پہلو سے خدمتِ خلق اِن کی خدمات سے سرشار ہے گویا زندگی کا کوئی گوشہ اِن کی خدمتِ خلق سے محفوظ نہیں اخبار میں اخبار کے نام سے لے کر نجومیوں کے اشتہارات تک پڑھتے ہیں۔ اخبار میں ضرورتِ رشتہ کا اشتہار چھپے تو وضاحت کو تشریف لاتے ہیں کہ اس سے کیا مقصد ہے اور بندہ اس سلسلے میں کس کام آسکتا ہے ہر جلسے میں شرکت فرماتے ہیں اور ہر جلوس گویا انہی کی شمولیت کے لئے ترتیب دیا جاتا ہے۔ ریڈیو سے محکمۂ موسمیات آئندہ موسم خشک رہنے کی اطلاع دے تو قدم رنجہ فرماتے ہیں کہ بندہ اس معاملہ میں کس حد تک کفالت کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اذان سُن کر یہی پوچھنے آجاتے ہیں کہ اذان ہوئی نا' کوئی اعلان تو نہیں ہوا مبادا کوئی شخص اِن کے جلال سے محروم نہ رہے۔ کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔

اکثر بازار سے دوائیں خرید لاتے ہیں، خود بھی استعمال کرتے ہیں اور ہمیں بھی مشورۃً استعمال کراتے ہیں گویا ہم پر اُن دواؤں کے تجربے کرتے ہیں۔ "میاں! بازار میں یہ سُرمہ کہیں نہیں ملتا۔ ایک پہنچے ہوئے بزرگ سے لائے ہیں، ایک مرتبہ استعمال کرکے تو دیکھو" یا "بھئی یہ دوا نزلے میں انتہائی مفید ہے" "عرض کیا" آپ کو نزلہ ہے کیا؟ "نہیں نہیں۔ ابھی دوائی مل گئی تو آپ نے لئے" "خرید لائے استعمال میں تو لائیے۔" اب ہم دست بستہ عرض کرتے ہیں "حضور! ہمیں زندگی بھر نزلہ نہیں ہوا مگر وہ چونکہ دوائی ہمارے لئے خرید لائے ہیں۔ لہٰذا ہمیں وہ ضرور لینی پڑتی ہے تاکہ اگر نزلہ نہیں ہوتا تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ نزلہ کیسا ہوتا ہے۔

کچھ ایسی ہی نوعیت اُن کی اخباروں اور رسالوں کے بارے میں ہے "کہ میاں دیکھو یہ رسالہ ہم نے تمہاری وجہ سے خریدا ہے۔ بڑے دردناک افسانے ہیں۔ تم چونکہ پڑھنے لکھنے والے آدمی ہو ضرور پڑھو" اور یوں وہ عورتوں کے ماہنامے ہمارے سر تھوپ جاتے ہیں ایک بار کوئی موت کے مابعد سکراتِ موت منافع کی کتاب خرید لائے۔ اب چونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب ہمارے سامان عبرت کو خریدی گئی ہے۔

سو لے لیتے ہیں مگر وہ مُصر ہیں کہ پڑھو ۔ عرض کرتے ہیں کہ پڑھ لی۔ فرمان ہوتا ہے کہ بس ایک بار ؟ یہ کتاب تو بار بار پڑھنے کی ہے۔ اس کے صفحہ نمبر دو سو چھتیس پر جو منظر بیان کیا گیا ہے وہ تو دل دہلا دینے کا ہے ۔ اب ہر چند کہ ہم صحت کے معاملے میں خاصے خود کفیل واقع ہوئے ہیں مگر دل کا معاملہ ذرا عجز رسی کا ہے تو بھلا اس صورت میں آدمی کتنی عبرت حاصل کر سکتا ہے ؟

ایک بار صبح نور کے تڑکے چھ بجے تشریف آور ہوئے ۔ کاغذ قلم ہاتھ میں تھے ۔ اس طرح آدھی رات کو تشریف آوری اور کچی نیند سے جگانے کا سبب پوچھا تو فرمانے لگے ۔ ایک خط لکھنا تھا ' سوچا تم سے مضمون بنوا لوں " ناچار حُسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرنا پڑا ۔ استفسار سے معلوم ہوا کہ حضرت رات بھر آرام سے نہیں سو سکے ۔ لہذا ریڈیو کی سوئی پر مشقِ ستم میں مصروف رہے ۔ بدقسمتی سے (سوئی کی) کہیں ریڈیو ماسکو لگ گیا اُردو سروس نشر ہو رہی تھی ' پروگرام تو نجانے کیا تھا ' آخر میں پروگرام سے متعلق خط لکھنے کی دعوت دی گئی اور پتہ بھی بتایا گیا تھا ' اب حضرت ریڈیو ماسکو کے نام خط لکھنے پر مُصر تھے کہ آخر اتنی راتیں گئے پروگرام نشر کرنے کی کیا تُک ہے جبکہ ہم سوئے ہوتے ہیں ۔

ایک رسالے میں لکھا تھا کہ " ہر اچھی تحریر ہمارے لئے ۔ جو لکھیئے ہمیں بھیجئے " ۔ اب چونکہ ہمارے بارے میں مستند اور اہم رائے رکھتے ہیں ' سو حکم ہوا " لکھیئے " ۔ پوچھا " کیا لکھیں " جواب ملا " کچھ تو لکھیئے " ! اب مزید جسارت کی گنجائش تو نہ تھی مگر پوچھ بیٹھے کہ حضور لکھنا کیا اتنا ضروری ہے تو حکم دوبارہ ہوا کہ اگر لکھنے والے نہ لکھیں تو یہ رسالے کہاں سے چلیں گے ۔ اُن کی اس بات پر ہنسی تو آئی مگر ذرا سنجیدگی سے سوچنے پر اپنی اہمیت کا احساس بھی ہوا اور یاد آیا کہ کس طرح ایک مدیر نے جب ہماری ایک تحریر شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا تو جواباً ہم نے بھی انہیں مزید تحریریں بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور نتیجتاً اُس کے بعد وہ رسالہ اب تک ہماری نظر سے نہیں گزرا یقیناً اُس کے حالات پر خاصہ اثر پڑا ہوگا ۔ اب آپ ہی سوچیئے کہ اگر وہ اس نازک لمحے میں اپنا خدمتِ خلق کے پُر خلوص جذبے سے کام نہ لیتے تو ایک اچھے خاصے نامور ادیب کی موت واقع ہو چلی تھی نا ؟ اسی بناء پر ہم اسے ہمہ گیر جذبہ قرار دیتے ہیں ۔

کسی طرح سے ریڈیو پر تقریر کرنے کا بلاوا آگیا ۔ تقریر کا موضوع تھا " خدمتِ خلق ' وقت کا اہم تقاضہ " ظاہر ہے کہ اُن کے قلم کا ہدف ہم ہی کو بننا تھا ' سو فرمانے لگے " اس مسئلے پر کچھ لکھا ہے ' سوچا کچھ پوائنٹ تم سے لے لوں " ۔ ناچار چار صفحوں پر تقریباً چار سو سطروں کو پڑھنا پڑا ۔ کہیں دائیں سے بائیں کو لکھا تھا ۔ کہیں اُوپر سے نیچے کو ' کہیں ایسا بھی ہوا کہ ہمیں نیچے سے اُوپر کی طرف لکھی سطریں پڑھنا پڑیں ۔ اور جب پورا یقین ہو گیا کہ ان سب صفحوں پہ موجود ہر حرف ہماری چشمِ گناہگار جذب کر چکی ہے تو دست بستہ عرض کیا ۔ " ٹھیک ' اب ہمارے لئے کیا حکم ہے ؟ " ارشاد بھی مکرّر ہوا کہ یہ خدمتِ خلق پر ایک مضمون ہے اور ہم نے .... " بات کاٹ کر کے جسارت کی ۔ " ٹھہریئے ذرا ! یہ اور تو سب کچھ ہو سکتا ہے ' مضمون نہیں ۔ " چہرے کو سوالیہ نشان کی طرح خوبصورت کرتے ہوئے بولے ۔ " اچھا تو ' مضمون کیسا ہوتا ہے اور خدمتِ خلق پر کیسا ہونا چاہیئے ؟ " ہم سے جو کچھ خدمتِ خلق کی شان میں بیان آرائی ہو سکتی تھی ۔ اُن سے بیان کر دی ۔ کہنے لگے " بس بس ! یہی پوائنٹس اسی ترتیب وار اسی انداز سے لکھ دیجئے " ۔ عرض کیا " تقریر آپ کو کرنی ہے ۔ وہ آپ خود ان پوائنٹس کو ترتیب دیں ' کچھ بڑھائیں " ۔ کہنے لگے " نہیں نہیں مجھے کچھ نہیں بڑھانا ' یہ ترتیب زیادہ مناسب ہے " عرض کیا " تقریر آپ کریں گے ' پیسے آپ کو ملیں گے ' نام آپ کا ہوگا ۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں آپ کو یونہی لکھ کے دے دوں ؟ " یکدم حیرت انگیز نظریں ہمارے چہرے پہ ڈالتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے گویا اُنہیں ہماری دماغی صحت مشکوک لگنے لگی ۔ فوراً تیز لہجے میں گویا ہوئے " تو میاں ! خدمتِ خلق کے معاملے میں بھی تم یوں سوچتے ہو ۔ افسوس ہے ' بہت افسوس ہے " ۔ انہیں تو یقیناً افسوس ہوا ہوگا مگر ہمیں خوشی ضرور ہوئی کہ اگلے دن کے بعد وہ ہمارے گھر نہیں آئے بس باہر ہی کی علیک سلیک پر رہتے ہیں ۔

ممکن ہے خدمتِ خلق کے بارے میں آپ کے تجربات و مشاہدات ہم سے کہیں مختلف ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ان احساسات کو ابھی نہ سمجھ سکیں جو ہمیں ناچار خدمتِ خلق کے تحت بیان کرنے پڑ رہے ہیں لیکن اگر واقعی صورتِ حال یہی رہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کے اندر گر دبے حس اور خود غرض لوگ بستے ہیں' جن کا رشتہ آپ سے انسانی نہیں رہا۔ جن کے جذبات مشینی ہو کر رہ گئے ہیں۔ کیونکہ خدمتِ خلق سے بھرپور شخص انسانی زندگی کا قابلِ قدر نمونہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ فقط باتوں سے ہی اس فریضے کو اِس خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں کہ ہر لمحہ اُن پر عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے اور اب یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے اِرد گرد بہت سے حساس اور دوسروں کے کام آنے والے لوگوں کا ایک جمِ غفیر رہتا ہے۔

ہمارے ایک اور بزرگ جو ماشاء اللہ شاعری سے شغف رکھتے ہیں۔ رسالوں اور ریڈیو کے لئے فرمائشی طور پر بھی بہت کچھ لکھتے ہیں نوجوان اور نوآموز شاعروں کے کلام کی تصحیح بھی کرتے ہیں (جو عموماً تقطیع تک محدود ہوتی ہے) محلے میں ہونے والی ہر شادی کے لئے سہرہ اور رخصتی تک چھپوانے کا اہتمام بھی بذاتِ خود کرتے ہیں۔ اور اتنی ساری خوبیوں کے باوجود خدمتِ خلق کے دوسرے اہم پہلو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اِن سے جب ملاقات ہو' کسی نہ کسی واقع کو لے بیٹھیں گے۔ واقعے کی نوعیت سن کر آپ کو اس واقعے کی سنجیدگی اور اہمیت کا احساس ہوگا اور آپ کا جی چاہے گا کہ واقعہ پورا سنا جائے اور اُس کا جذبہ واخلاص ملاحظہ کیجئے کہ وہ آپ کی اِس خواہش کا پورا پورا احترام کریں گے۔ واقعہ ہوگا کہ بڑھتا ہی چلا جائے گا اور وہ ہوں گے کہ آپ کے لئے جزیات نگاری پر خصوصی توجہ رکھیں گے۔ اور جب کبھی اتفاق سے واقعہ انجام پذیر ہوگا تو آپ کو یکایک احساس ہوگا کہ اس واقعے کے اصل ہیرو یعنی مرکزی شخصیت موصوف ہی کی ذاتِ بابرکات ہے اور اِس واقعے میں جو جذبۂ صادق زیرِ استعمال رہا ہے وہ یقیناً خدمتِ خلق سے معنون ہوگا۔

اس کے علاوہ اُن کے اِس جذبے نے شہر کے آدھے شاعروں ادیبوں کو بھی ممنونِ احسان کر رکھا ہے گویا کوئی شاعر اِن کی زد سے محفوظ نہیں۔ ارشاد ہوگا فلاں ادیب کو تو قلم پکڑنا ہم نے ہی سکھایا ہے، فلاں شاعر کو برسوں کچھ قافیہ مدد گار تھے' آخر ہم ہی اُن کے کام آئے۔ فلاں صاحب سے گرہ نہیں بندھ رہی تھی' ہمیں کو یہ بار بھی اُٹھانا پڑا۔ اتنی تفصیل آپ تک منتقل کرنے کے بعد نہایت راز داری سے کہیں گے کہ آپ کو تو اِن سب باتوں کا علم ہے' کسی اور سے نہ کہیئے گا' خواہ مخواہ اُن کی بدنامی ہوگی' جس کے اصل معنے یہ ہوں گے میاں دیکھتے ہیں تم پیٹ کے کتنے پکے ہو۔ ہر شاعر کے سامنے دوسرے بڑے شاعروں کے بارے میں اپنے ارشاداتِ عالیہ سے یوں مستفیض فرمائیں گے کہ مخاطبِ موجود کو دُنیا ہیچ نظر آئے گی اور یہی فارمولا اُن کی پیٹھ پیچھے اُن کی شانِ عالی بیان کرنے کے لئے استعمال فرمائیں گے اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ان سب باتوں کی تہہ میں کونسا جذبہ کار فرما ہو سکتا ہے۔

آپ کے ذمہ رشتے داروں اور پڑوسیوں کے بہت سے حقوق ہیں اگر آپ انہیں سمجھنے سے قاصر ہیں تو حقیقتاً آپ بے حس ہیں مگر آپ اِن حساس اور ذی فہم لوگوں کو تو اپنے حقوق سے دست بردار ہونے پر رضا مند نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہی سبب ہے کہ آپ جذبۂ خدمتِ خلق کو سمجھنے میں غلطی پر ہیں۔ اور اگر آپ میں اس جذبے کا فقدان ہے تو ضروری نہیں کہ یہ جذبہ ہی قابلِ توجہ نہ ٹھہرے۔ جبکہ اس جذبے کا خمیر ہر لمحہ اور ہر جگہ بکثرت موجود ہے مگر اُف یہ سنگدل زمانہ کہ چشمِ جوہر شناس سے محروم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے اس نقار خانے میں جتنی طوطیوں کی آواز نہیں سنی جا رہی یقیناً اُن کے ساتھ زیادتی کی جا رہی ہے کیونکہ حسنِ اخلاقِ صادق کی ہمیشہ ناقدری ہوئی ہے جس کے معنے دوسرے لفظوں میں یہی ہیں کہ جن لوگوں کی ناقدری ہوتی ہے وہ بعد میں ہمیشہ بڑے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں مثال کے طور پر صرف مرزا غالب کا نام ہی سامنے رکھ کر دیکھ لیجئے۔ آج اگر خدمتِ خلق کا صلہ کچھ نہیں تو کل زیادہ اِن خدمات کو ضرور سراہے گا اور سچ پوچھیئے تو ہم بھی ناقدریٔ زمانہ کا گلہ اِس ضمن میں کر رہے ہیں کہ ہر دور کے نالاں انسان اپنے بعد کے زمانے میں ہمیشہ بڑے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ●●

اسمٰعیل ظریف

...... مرا آپ سے یہ سوال ہے؟

کسی مولوی سے نہ شیخ سے مرا آپ سے یہ سوال ہے
اگر آئے مرغی پڑوس کی تو حرام ہے کہ حلال ہے

وہ اڑا رہے ہیں ڈنر کہیں کرئی فاقہ کرکے نڈھال ہے
یہاں کون کس کو کھلائیگا جہاں اپنی روٹی پہ دال ہے

نہ تو ڈگریوں سے غرض ہمیں نہ ملازمت کا سوال ہے
کہیں اپنا ڈبہ ہے پان کا کہیں سوکھی لکڑی کی ٹال ہے

جہاں کشمکش ہے ضمیر سے وہاں تنگدستی بحال ہے
جہاں دھاندلی پہ ہے دھاندلی وہیں آج کثرت مال ہے

کوئی کیوں جیا کوئی کیوں مرا ہمیں غم ہے مفت کا خواہ مخواہ
"دل مضطرب میں ہے یہ تڑپ کہ سکون خواب و خیال ہے"

کبھی ایسا موقع تو دیجئے کہ تواضع آپ کی کرسکوں!
کبھی تعطیلات میں آئیے مرے گھر کے بازو کلال ہے

گیا عشق وعدہ پہ جس جگہ وہاں ان کا بھائی اُسے ملا
ہوئی تاجپوشی غریب کی یہ کسی رقیب کی چال ہے!

نہ ملے گی داد اگر مجھے کوئی آج مجھ سے بُرا نہیں
کرے اختیار جو خامشی یہاں اب یہ کس کی مجال ہے!

کوئی شاعروں کو کہے برا کہیں شاعری پہ ہے تبصرہ
میں کروں کہ شاعری چھوڑ دوں مرا آپ سے یہ سوال ہے

کسی رازداں کا ہے یہ بیاں جو غزل سنائی گئی یہاں!
یہ غزل نہیں ہے ظریف کی کسی کمپنی کا یہ مال ہے

غلمت بھلاواں

آج بھی کس قدر سہانی ہے
میری شادی کی شیروانی ہے
ایک عرصہ جو پہلے آفت تھی
چھ نواسوں کی آج نانی ہے
کون دیتا ہے بے سبب گالی
یہ تو غصّے کی ترجمانی ہے
کل ولیمہ تو ٹل نہیں سکتا!
آج کی رات امتحانی ہے
چھوڑ دے اب گلی گلی چرنا
گھر میں بیٹی تری سیانی ہے!
سارا گاؤں ہے اُس کا دیوانہ!
اور بھلا دین کی وہ روانی ہے

عبدالرحیم نشتر

انت کچھ اور ہو کہانی کا
رخ بدلتا ہے بہتے پانی کا
کچھ "ترقی" نہ کرسکے حضرت
"شور" کرتے رہے "جوانی" کا
ہیں "جہاں کے تہاں" پڑے لیکن
شعر میں "جوش" تھا روانی کا
"گرنے والوں" میں کرلیا شامل
شکریہ ان کی "مہربانی" کا
کام کرکے دکھائیے نشتر
ذکر کیجئے نہ آنجہانی کا

خیال انصاری
(مالیگاؤں)

گرچہ ہمارا ماہواری رسالہ "بکواس" ہر قسم کے "ضرورت ہے" "تلاش گمشدہ" "ضرورتِ رشتہ" جیسے تمام اوچھے آڑھے ترچھے گندے اشتہارات اور مریل پبلسٹی کے ہتھکنڈوں سے ہنوز پاک و صاف رہا ہے۔ ویسے بھی ہم بکواسیات کے قائل نہیں، چونکہ ہم نہ تو قاضیٔ شہر ہیں اور نہ شیخ صاحب!

پھر بھلا شہر کے غم میں کیوں دبلے ہوں؟ (ویسے اللہ کے فضل و کرم سے اور بیگم صاحبہ کی ذاتِ گرامی کے طفیل پہلے ہی اتنے دبلے ہیں کہ مزید دبلے ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں) اب اس صورت میں کسی کا گھر بسے یا اجڑے ہم کو اس سے کیا غرض؟ (اور آپ کو بھی نہیں ہونی چاہیئے) ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں سہ چل شیخ اپنی دیکھ! (اگر دیکھنا لازمی ہی ہو تو ورنہ کوئی بات نہیں)

لیکن صاحبو! ہم مجبور ہو گئے 'اپنے نام آئے ہوئے یادگارِ گزشتہ کے اُن مختلف "ضرورتِ رشتہ" کے خطوط کے ہاتھوں، جن کی لکھنے والیوں کے آگے ہم نے گھاس تک نہیں ڈالی (اور آج ان حسیناؤں نے ہمارے آگے گھاس چھوڑ کر ہمیں چرنے پر مجبور کر دیا ہے۔)

ہاں تو! اُن حسیناؤں نے ایک دن ہنگامی میٹنگ بلوا کر یہ بل پاس کر ہی لیا کہ "اگر تم خود ہمارے قابل نہیں تو کم از کم اپنے پھٹیچر رسالہ "بکواس" میں تو ہمارے خطوط کا چربہ چھاپ دو تا کہ کوئی دوسرا "بکرا" پھنس سکے۔

لہذا ہمارے بحرِ بیکراں جیسے بھاری دماغ میں یہ باتیں بادبانی کشتی کی طرح ڈوب گئیں۔ اور ہم نے بھی سوچا! چلو بھائی جب خندق تیار ہی ہے تو کسی نہ کسی کو بہر صورت گرنا ہی پڑے گا۔

بس...... تو اب آپ حضرات ہیں اور آپ کی قسمت! اشتہارات ہم بڑے بڑے چوکھٹوں میں دے رہے ہیں، لیکن قسم ربّ العزت کی ان سے ہمارا کوئی بھی جائز و ناجائز خدا واسطے کا بھی رشتہ نہیں!

ہر کوئی اپنی خطا کی سزا پائے گا۔

تو کیجئے ـــ اپنا جیون ساتھی تلاش کیجئے اور ہم سے کسی ایک کا انتخاب فرما کر بیاہ رچا لیجئے۔

سوہنی گڈی والیا

میرا آئیڈیل نہ بہت بڑا اسمگلر ہے اور نہ ہی ماروتی مندر کا پجاری، نہ دولت مند، نہ فقیہہ!
لیکن اس کی ماہوار آمدنی ایک ہزار ایک ہونی چاہیئے۔ مصداق سہ چوری کرو چماری کرو، میری مانگ پوری کرو (مانگ پوری کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ سر کی مانگ کی خانہ پُری، ایسا سمجھنے والا بڑا بدھو ہے، اس کی گنجائش نہیں)

۳۰۔۳۵ سالہ چھیل چھبیلا۔ نسل اعلیٰ قبیلہ ہو، نہ بہت شریف نہ ہی محلے بھر کی ناک میں دم کرنے والا غنڈہ۔ کم پڑھا لکھا چلے گا۔ جاہل اور بی ایس سی کی گنجائش نہیں۔ ذات کا بات کا، پات کا لات کا (ہاتھ۔ پیر) گو تمام صفات کا مکمل صحت مند صفات ہو۔

میں ایک متوسط گھرانے کی البیلی، چلبلی، منچلی، ادھ کھلی، صاف گلی، سڑک پر چلی، شرمیلی کلی ہوں۔ میرے والد تھانیدار، بھائی پاکٹ مار اور میں خود چھُری مار ہوں۔ بدن کی نہ فلمسٹار سائرہ بانو اور نہ ہی مثل ٹن ٹن۔ بس نامناسب حد تک بڑی مناسب ہوں۔ خدا کرے مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔

آپ میرے حق میں دعا کے ساتھ ساتھ اپنے لئے بھی کوشش کریں تو انشاء اللہ بڑا فائدہ ہوگا۔

خط: "گلبدن"، کشمیر کی کلی، آخری گلی۔ پھول گاؤں

وفاکی دیوی

میری لڑکی پیاری۔ قسمت کی ماری۔ بدن بھاری۔ پہنے ساری۔ کومل ناری۔ مثل کنواری، اپنے تیسرے شوہر نامدار کے انتقالِ پُرملال کے سبب آج کل میرے ہی گھر میں قیام پذیر ہے۔ یہ تیسرا سانحۂ عظیم ہے کہ وہ بیوہ ہوگئی (یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے)۔ پہلا شوہر اس کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوب کر مرا۔ دوسرا شوہر۔ ہائے ہائے۔ اللہ اسے جنت نصیب کرے کروٹ کروٹ (اگر وہ قبر یا آسمان پر بھی سونے کے وقت کروٹیں بدلنے کا عادی ہو) بڑی محبت تھی اسے اپنی بیوی سے۔ اب شوہر بیوی میں پیار جھگڑا تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ لڑکی نے ایک دن فرطِ محبت میں میاں کی ناک کیا دبائی۔ میاں صاحب سانس لینا ہی بھول گئے۔ تیسرا شوہر: دیکھتے دیکھتے چھ مہینے میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اس کے کیا اسباب تھے ہمیں یا لڑکی کو بھی ہنوز علم نہ ہوسکا۔ اللہ مغفرت کرے، بہت تھیں خوبیاں مرنے والے میں۔

ہاں تو زمانے کی ہوا بڑی سرد گرم ہے۔ اوپر سے لڑکی ذات کا معاملہ۔ کب اونچے نیچے قدم پڑجائیں، بہتر ہے جو تھ بیاہ کر دیا جائے۔

لہٰذا صرف صحت مند، تنومند، دولت مند، مثلِ شکرقند اور حاجت بیوی مند ہی حضرات اس سنہرے موقعہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

چوتھے شوہر کی حیثیت سے امیدوار یہ جان لے میری بیٹی کی بے گناہی کے متعلق کہ اب تک کے سابقہ تین شوہروں نے خود ہی اپنی قیدِ زندگی سے فرار حاصل کی ہے۔ میری بیٹی تو آخری دم تک ان سے جونک کی طرح چمٹی رہی۔ اتنا ہی نہیں ان کے آٹھویں، دسویں اور چالیسویں پر اپنے عزیز و اقارب کی خوب دعوتیں کیں، پھر کہیں وہ میرے گھر آئی۔

آپ تو جانتے ہیں شادی خوشی، موت میت کی مجالس میں شریک ہونا ہی کتنا ثوابِ عظیم ہے۔

اپنی درخواستیں اس پتہ پر بھیجیں: "سدا سہاگن"۔ پریت نگر۔ جہاں آباد

کانٹوں میں پھول

ہر پاگل لڑکی کی طرح میرا بھی ایک خوبصورت آئیڈیل تھا۔ مگر اب مجھے تمام خوبصورت چیزوں سے نفرت ہے۔ چھ مہینے قبل میری شادی ایک خوبصورت چہرہ سے ہوئی، مگر اس خوبصورت چہرہ کے پیچھے موشے دایان کا مکروہ چہرہ بھی تھا۔ (بیراگ فلم کا گیت یاد کیجئے، ایک چہرہ اور ہے چہرے پہ ہر ایک کے)

یہ سب کچھ میرے والدین کی نادانی سے ہوا۔
جس کی سزا میں بھگت رہی ہوں!
ہے کوئی مائی کا لعل ایسا جو مجھے اس قید سے نجات دلائے؟ جمانی لوٹ پھوٹ کی میں ذمہ دار، ہاسپٹل کے اخراجات میں دوں گی!

پہلوان نما۔ بھدے جسم والے حضرات توجہ دیں۔
سانولے رنگ کے بدلے رقیب رو سیاہ چہرے کو ترجیح دی جائے گی
قسمت آزمایئے! کانٹوں سے پھول نکالئے! اپنی زندگی سنواریئے!

فقط: "ایک ابھاگن"۔ قصاب باڑہ۔ مولیشی پور

میں لڑکی بھولی بھالی

اے بی سی سے ناواقف۔ اُترا سیاہ چیچک زدہ میرا چہرہ۔ نہ سر پر بالوں کی جھاڑ جھنکاڑ اور نہ ہی آنکھوں پر ابرو کا پہرہ۔ پچکے گال گڑھا ہے گہرا۔ سلیقہ شعور سے بے بہرہ، آنکھیں میری مثل ڈل جھیل، جسم پہ میرے نہ کوئی تنگ میل۔
کھیلی ہوں میں ہر اک کھیل، کبھی کبھی میں گئی ہوں جیل، میرے گھر نہ باقی نہ تیل، چاہیئے مجھ کو شوہر مندرجۂ ذیل:
خوبصورت ہو، نیک سیرت ہو، خاموش مورت ہو، لہٰذا جس کو مجھ جیسی عورت کی ضرورت ہو۔
ایک ہاتھ میں نقد دو ہزار اور دوسرے میں پھولوں کا ہار لے کر آجائے۔
جہیز نہیں دیا جائے گا! اس کا خیال رکھیں! پتہ ہے:
"کستوری"۔ سندر بن۔ اجاڑ بستی

بیمار فلمیریا

زینت، ریکھا، ہیما، راکھی، کی ہوں میں لوگو بالکل کاپی
دلیپ کی دیو آنند کی پجارن دھرمیندر کے گھر کی بھکارن!
شترو اور امیتابھ کی داسی ششی بندر میں بھی پیاسی!
بنوں میں ہیروئن شوق یہی ہے ناچوں چھم چھم ذوق یہی ہے!
دیکھ کے مجھ کو لڑکوں نے گایا! بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا
دیکھنے میں ہوں ڈمپل کی بہنا کاش ملے مجھے راجیش کھنہ
ملئے یا پھر آکر ملئے! مندا دلیش پنجاب دا کڑیئے

مہکی مہکی ہستی

میں گاؤں کی سب سے بڑی درگاہ شریف کے جنرل مجاور صاحب کی مہکی مہکی لڑکی ہوں۔ پھولوں کی خوشبو کی طرح بکھرے بالوں والی۔ عود و لوبان اور عطر کی طرح فرحت بخش مسکراہٹیں ہر وقت میرے لبوں پر رقصاں ہوتی ہیں۔ میرا آئیڈیل ایسا مرد ہے جو درگاہوں سے عقیدت رکھتا ہو۔ مجاور بننے کی بھرپور صلاحیتوں کا مالک ہو، موہنی صورت اور باتونی ہو۔ پیغام دینے سے پیشتر ابا جان اس کا انٹرویو لیں گے

اس لئے فن مجاوری۔ یعنی: عود و لوبان جلانے، قبر پر چادر چڑھانے، درگاہ میں جھاڑو دینے، شیرینی تقسیم کرنے اور عقیدت مندوں کو گمراہ کرنے کا ملکہ رکھتا ہو۔ چراغی وصول کرنے میں اچھا خاصا ڈھیٹ ہو۔

اگر ان سب کاموں کا تجربہ نہ ہو تو ماہانہ تیس روپے فیس کے بدلے ابا جان سے ٹیوشن اور ٹریننگ کے ذریعہ وہ اس کورس کو چند ماہ میں پورا کر سکتا ہے۔ کامیابی پر آم کے آم گٹھلیوں کے دام مل جائیں گے۔ آزمائش شرط ہے۔

پتہ: جنرل مجاور۔ بڑی درگاہ، مکی دھام نگر

ہیرو جیسا

میرا آئیڈیل مرد ہیرو جیسا ہے۔

دلیپ کمار جیسے بال، دیوآنند جیسی چال، امیتابھ جیسے گال، شتروگھن سنہا جیسی کھال، دھرمیندر جیسے حال اور راجیش کھنہ جیسے مال۔

ان مشترکہ خوبیوں کا مالک ہی پیغام بھیجے، ورنہ مایوسی ہوگی!

میں خود بھی ہیما مالینی، ریکھا، سائرہ بانو، راکھی، زینت امان، ممتاز کا ملا جلا خوبصورت تاج محل ہوں!

کاش میرا کوئی شاہ جہاں مل جائے (اشوک کمار اور پردیپ کمار جیسا نہیں)

جہیز میں گاڑی، کوٹھی، بنگلہ، روپیہ کوڑی سب کچھ دینا ہوگا! قسمت آزمائیے!

حسن بانو۔ مکان نمبر ۴۲۰، فلم نگر، فلمستان

آ انتظار ہے تیرا

مجھے ایک پورے مرد کی تلاش ہے!

پورے مرد سے مراد "م" سے مکار ہو "ر" سے ریاکار ہو "د" سے دغاباز ہو۔

رقیب روسیاہ کی طرح کالا بھجنگ ہو۔ اس کے دانت آئی فالیس جوہر کی طرح باہر نکلے ہوں۔ ایک آنکھ کی لائٹ ڈیم ہو، چہرے پر چیچک ماتا دیوی کا جگہ جگہ پرشاد بکھرا ہو۔ کتا داہنے طرف کا کان چبا گیا ہو۔ ٹیڈی کی طرح چندیا صاف ہو۔ دور سے آتا ہوا تیمور لنگ دکھائی دے۔

بس مجھے ایسا ہی کوڑھ مغز پورا مرد چاہیے۔ کیونکہ میں خود بھی ان تمام جمالی و کمالی صفات کا مجسم نمونہ ہوں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا قسمت آزما سکتا ہے۔

"مرا در کھلا ہے کھلا ہی رہے گا"

فقط مہتاب جہاں بیگم۔ منگل پور

ظفر چکدینوی

مت بجلیاں گراؤ رستے میں چلتے چلتے
ہم تنگ آ گئے ہیں آنکھوں کو ملتے ملتے

وعدے وصال کے وہ کرتے ہیں روز لیکن
شاید چلے قضا تک یہ بات ٹلتے ٹلتے

گھر والی نیند میں بھی گرمی سے مضطرب ہے
بے چارہ مرد عاجز ہے پنکھا جھلتے جھلتے

میں تجھ کو چاند ہی کیا سورج بھی مانتا ہوں
چھپ جاتے ہیں مگر یہ دونوں ہی ڈھلتے ڈھلتے

منزل کو رہزنوں نے شاید چرا لیا ہے!
بے طرح تھک گئے ہیں ہم لوگ چلتے چلتے

بلّی کو تو سوچو ہے کھانے تو دو ابھی تم
کرے گی حج بھی اک دن وہ عمر ڈھلتے ڈھلتے

ہم سایے جب جدا ہیں سائے کا کیا بھروسہ
یہ بھی بچھڑ نہ جائے کچھ دور چلتے چلتے

بازار سے میں مچھلی لاتا ہوں جب کسی دن
کر دیتی ہیں وہ آدھا صاف اس کو تلتے تلتے

میووں کی زیادتیوں سے میں خوش نہیں کہ ڈر ہے
ممکن ہے سوکھ جائے خود پیڑ پھلتے پھلتے

تم ان سے مل رہے ہو میں ہاتھ مل رہا ہوں
دھو لوں نہ ہاتھ اک دن میں ہاتھ ملتے ملتے

تم آستیں کے سانپوں کو بے ضرر نہ سمجھو
ڈس لیں گے اک نہ اک دن وہ یوں ہی پلتے پلتے

شہرت مری ہے آتش، ایسی ظفر کہ حاسد
رہ جائیں گے جھلس کر دن رات جلتے جلتے

اسرار جامعی

شیطان کا فرمان

اٹھو! مرے مخصوص مریدوں کو جگا دو
فن کار جو ہیں ان کو یہ فرمان سنا دو

جس ملک میں یاروں کو میسر نہ ہو "وہسکی"
اس ملک کا ہر خوشۂ انگور جلا دو

گرماؤ ادیبوں کا لہو "وہسکی" "وارم" سے
شاعر کوئی مل جائے تو ٹھرّا ہی پلا دو!!

لیڈر جو نظر آئے تو لو لو یہ ادب سے
تقریر میں تم گرمیٔ "وہسکی" سے "جلا" دو

"پیپر" کے ایڈیٹر سے اگر کام ہو لینا
لے جا کے "پرنسز" میں بیئر اُن کو پلا دو

ہر بزم میں انگور کی بیٹی کو بلاؤ!!
"ملّا" سے اندھیرے میں گلے اس کو لگا دو

شاعر کوئی محفل میں جو پی کر نہیں آئے
وہ پڑھ نہ سکے اپنی غزل شور مچا دو

احساسِ حمیت نہ رہے دل میں کسی کے
"پٹرول" چھڑک کر حسِ غیرت کو جلا دو!

اس شاعرِ گستاخ کو اسرارِ ادب کو!
اس نظم کی تخلیق پہ پھانسی کی سزا دو

فیض الرحمٰن فیضؔ

تری ناک میں رستی

کیوں شعر چراتا ہے، تری ناک میں رستی
محفل میں سناتا ہے، تری ناک میں رستی

اوروں سے لکھاتا ہے تری ناک میں رستی
کیا شان دکھاتا ہے تری ناک میں رستی

غماز ہے دل کی تری دزدیدہ نگاہی!
کیوں آنکھ چراتا ہے تری ناک میں رستی

حجام نے ہپی کو جو دیکھا تو کہا یہ
کیوں بال بڑھاتا ہے تری ناک میں رستی

واعظ کا ہے میخانہ میں بگڑا ہوا حلیہ!
اور طرّہ اڑھاتا ہے تری ناک میں رستی

سو طرح مناتا ہے الکشن سے جو پہلے
پھر گول پھراتا ہے تری ناک میں رستی

سامع مجھے کہتا ہے ترنم سے سنانے
شاعر کہیں گاتا ہے تری ناک میں رستی

چپلوں سے مرمت ہوئی چانٹوں سے ٹھکائی
اکڑے ہوئے آتا ہے تری ناک میں رستی

پھینکے ہوئے سگریٹ کو پیتا ہے چھپ کر
مرغولے بناتا ہے تری ناک میں رستی

ومٹو کے بہانے دیا، آمیزۂ وہسکی
دھوکے سے پلاتا ہے تری ناک میں رستی

مطلب کی کبھی بات تو کرتا ہے تجاہل
باتوں میں اڑاتا ہے تری ناک میں رستی

فرہاد بنا ہے تو سمجھ عشق کے آداب
شیریں کو بلاتا ہے تری ناک میں رستی

دن دھاڑے پڑوسن کی تڑی دے دیا مرغی
کیا ناک دکھاتا ہے تری ناک میں رستی

ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے بیلوں کو گھما کر
رستی لئے آتا ہے تری ناک میں رستی

اظہارِ محبت پہ حقارت کی ہنسی ہے!
آئینہ دکھاتا ہے تری ناک میں رستی

عمامہ و جبہ کا تجھے پاس نہیں ہے!
کھا کر لئے جاتا ہے تری ناک میں رستی

ہو جائے گی نیچی تری یہ ناک کسی دن
کیوں ناک پھلاتا ہے تری ناک میں رستی

نقال ترے شعروں کی نقالی کریں گے
طرحیں جو بناتا ہے تری ناک میں رستی

چونک اٹھتی ہے محفل ترے ہر شعر پہ اے فیضؔ!
گالی کو نبھاتا ہے تری ناک میں رستی

ایم اے نسیم

حیدرآباد کا پرسوں

جس طرح پرسوں تک حیدرآباد کا محترم سارے ہندوستان میں مشہور تھا اسی طرح آج کے زمانے میں حیدرآباد کے پرسوں کی بھی دن دونی رات چوگنی شہرت ہوتی چلی جارہی ہے۔ پرسوں کی ہی بات ہے کہ صاحب موصوف نے پان کی جگالی کرتے ہوئے اور پیک تھوکتے ہوئے چارمینار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "دیکھو میاں! پرسوں پرسوں کا چارمینار کتنا پرانا ہوچکا ہے۔ میں سوچ میں پڑگیا کہ چارمینار تو چارمینار ہے لیکن یہ پرسوں کیا بلا ہے۔ ریسرچ کرنے پر معلوم ہوا کہ جس طرح صفر ہندوستان کی ایجاد ہے اسی طرح پرسوں بھی پیور PURE حیدرآباد کی ایجاد ہے اور حیدرآبادیوں کا تکیہ کلام بلکہ مجموعہ کلام ہے۔ کسی چیز کا تذکرہ یا جب بھی کسی واقعہ کا ذکر ہوتا ہے تو ذرا غور کرکے دیکھیے گا کہ وہ لفظ پرسوں سے شروع ہوکر پرسوں پر ہی ختم ہوگا۔ دیکھنے میں یہ صرف پانچ حرفی لفظ ہے لیکن ہے بلا کا فتنہ پرور کبھی یہ کافر حسینہ کی شوخ و چنچل ادا کی طرح من کو موہ لینے والا ہوتا ہے تو کبھی یہ ایک سات بچوں والی گھر کی بیوی کی طرح بدنما اور بھونڈا بھی۔

لفظ پرسوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے اور جتنی بھی برائی کی جائے وہ زیادہ نہیں۔ لفظ پرسوں پل بھر میں گذرے ہوئے ماضی کو کان پکڑ کر حال کی چوکھٹ پر لا کھڑا کرتا ہے تو دوسری جانب اپنا جال ڈال کر حال کو ماضی میں تبدیل کرنے کی پوری پوری صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ پرسوں ہی کی کرامت ہے جو پلک جھپکتے مُردوں کو زندہ کردیتا ہے۔ خزاں کو بہار میں تبدیل کردیتا ہے تو لڑکی کو دلہن، دلہن کو بیوہ اور بڑھیا کو ٹھیا بنا دیتا ہے

برسوں کی بات کو پرسوں لگا کر سنا دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ اس بات کا حُسن ایسے نکھر آئے گا جیسے شادی کے بعد عورت کا حسن نکھر آتا ہے۔ لفظ پرسوں میں جو طاقت پنہاں ہے وہ کل آج اور کل میں نہیں

آپ کا ہمارا مشاہدہ ہے کہ عورت چاہے میک اپ کرے یا اپنے چوٹ لکڑی جیسے چہرے کا کھردرا پن چھپانے کے لئے جھوٹ بولے یا اپنے تین چار بچوں کو گھر میں رکھ کر خود بچہ بن کے آئے یا اپنی بڑی بیٹی کو چھوٹی بہن کہے یا کسی اور طریقہ سے اپنے آپ کو ماں ظاہر کرنے سے گریز کرے غرض لاکھ کوشش کے باوجود بھی عورت اپنی عمر کو نہیں چھپا سکتی لیکن صرف ایک لفظ پرسوں اس قدر ہے عورت کی عمر پر پردہ ڈال دیتا ہے کہ ہم دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ بلکہ دانتوں تلے انگوٹھا دبا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر۔۔۔ کسی لڑکی کے گھر پیغام لے کر جائیں اور لڑکی کو دیکھنے کے بعد اس کی عمر دریافت کریں تو لڑکی والے یہی کہیں گے کہ ارے بھئی لڑکی کی عمر ہی

گیاہے۔ پرسوں پرسوں تو جوان ہوتی ہے۔ کھاتے پیتے گھر کی ہے اس لئے ذرا جلد ہی جوان نظر آ رہی ہے۔ عقد ثانی کے لئے کسی بیوہ معلوم کرنا چاہیں تو بھی یہی جواب ملے گا کہ ارے بھئی بے چاری کی عمر ہی کیا ہے پرسوں پرسوں تو شادی ہوئی تھی لیکن کیا کریں قسمت ہی خراب تھی پرسوں پرسوں ہی بیوہ ہوگئی۔ گویا پرسوں کیا ہوا عورت کی عمر چھپانے کا آلہ ہوگیا پرسوں کا نقاب ڈالوا عمر چھپا لو!

آیئے ـــــ اب پرسوں کے کرتوتوں کا لوہا منوانے کے لئے دو تین واقعات آپکے پیش نظر رکھتا ہوں جس سے آپ کو پتہ چل جائے گا کہ اوپر لکھی ہوئی حکایت میں کتنی صداقت ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کو بھی یہ احساس ہوجائے گا کہ یہ پرسوں کا آفت کا پرکالا ہے۔

پرسوں ہی کی تو بات ہے جب ہم پورے پانچ سال بعد بنگلور سے ٹرانسفر ہوکر جب شہر حیدرآباد آئے تو ہمیں اپنے دوست احباب سے ملاقات کرنے اور ایک دوسرے کا حال جاننے کا شوق چرایا اور ہم نے روزانہ پانچ دوستوں کے حساب سے کا حال جاننے کا بیڑہ اُٹھایا۔

ایک دن باتوں باتوں میں ہمارے ایک پُرانے یارِ غار سے پتہ چلا کہ پرسوں ہی مرتبان خان کی بیوی کا انتقال ہوچکا ہے ہمیں بہت ہی افسوس ہوا۔ دوسرے دن پُرسہ دینے کی غرض سے ہم ان کے دولت خانہ کو پہونچے اور لگے پُرسہ دینے۔ مرتبان خان کو بہت حیرت ہوا۔ وہ پوچھنے لگے کہ بھئی آخر یہ کس سلسلہ میں تم ہمیں پُرسہ دے رہے ہو۔؟ جب ہم نے سارا ماجرا کہہ سنایا تو کہنے لگے' ارے بھئی ڈیڑھ سال کے بعد اب پھر سے کیوں میرے زخموں پہ نمک چھڑک رہے ہو۔ میں اس غم کو بھلانے کے لئے دوسری شادی بھی کرچکا ہوں اور عنقریب تم چاچا بھی بننے والے ہو۔

پرسوں ہمیں معلوم ہوا کہ لال بھائی ہرے خاں پرسوں سے سخت علیل ہیں ہم اُسی روز شام' اُن کی عیادت کو پہونچے تو اُن کے گھر دعوت کا اہتمام تھا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ لال بھائی ہرے خاں کو اس دارِ فانی سے گذرے ہوئے ایک مدت ہوچکی ہے اور آج چہلم ہے اور یہ چہلم کی دعوت ہے۔

لیجئے چلتے چلتے ایک قصہ اور سنتے چلئے گا ـــ ہوا یوں کہ ایک دن ناشتہ کی میز پر ہمارے خانو نے آلو کھاتے ہوئے ہمیں بتایا کہ ہمارے دوست چاند پاشا کی شادی ہوچکی ہے چونکہ ہم اس وقت ہیڈکوارٹر پر موجود نہیں تھے جس کی وجہ سے ان کی شادی میں شرکت نہ کرسکے تھے اس لئے ان کی شادی یا سمجھئے بربادی کی مبارکباد دینے کی غرض سے ایک عمدہ سا تحفہ (جو عام طور پر دعوتوں میں جانے کا ہوتا ہے) لیئے ان کے گھر پہونچے لیکن وہاں جانے کے بعد پتہ چلا کہ ان کی شادی ہوئے ابھی چند مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ محبت اور اقرار تکرار میں بدل چکی ہے اور نوبت عاق سے طلاق تک جا پہونچی ہے اور چشم دید گواہوں کا تو یہ کہنا تھا کہ بہت ممکن ہے ہفتہ تک طلاق کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اتنا سنتے ہی ہم اپنا منہ لٹکائے گھر واپس ہوگئے۔

دیکھا آپ نے لفظ پرسوں کی کرامات ـــ ہم سے غلطی صرف اتنی ہی ہوئی تھی کہ ہم نے لفظ پرسوں پر غور نہیں کیا اس کو ٹھیک ایسے ہی نظرانداز کردیا تھا جیسے ایک شوہر اپنی سکنڈ ہینڈ بیوی کی فرمائش کو نظرانداز کردیتا ہے لیکن آپ نے دیکھا ہماری اس لاپرواہی کی قدم قدم پر سزا ملتی گئی اور ہمیں بڑے بے آبرو ہوکر' ہر کوچے سے نکلنا پڑا۔

خدا گواہ ہے ان حادثوں کے بعد سے تو ہم لفظ "پرسوں" سے ایسے بچ کے رہتے ہیں جیسے مالدار لوگ انکم ٹیکس

درویش

احسان جبلپوری

ایک درویش خستہ و بے حال
دور سے مسجدیں جو آئیں نظر
دل میں سوچا ہے شہر اسلامی!
ایسی بستی میں کامراں ہوں گا
فقر و فاقہ کا دل سے نکلے ڈر
ان خیالوں میں تھا ابھی غلطاں
سُن کے آواز دفعتاً چونکا!
وقت مغرب کا اور سجود و رکوع
صدقِ دل سے دعائیں تسبیحیں
رسم پوری ہوئی عبادت کی
صحن مسجد میں چھوڑی دینداری
ایک کے بعد ایک جب نکلا
دیکھ کر اس کو منھ بنانے لگے
اک نمازی نے آن کر ڈانٹا
ناک بھوں کو چڑھایا فرمایا
لوگ آتے ہیں بندگی کے لئے
گرچہ سائل کا ہاتھ تھا پھیلا
دیکھا درویش نے جو یہ ماحول
فکر تھی دل میں اب کہاں جاؤں
فکر میں ہو رہا تھا دیوانہ
سوچا اس در پہ ہاتھ پھیلائیں
خیر ہو! کچھ یہاں سے مل جائے
میکدہ تھا شباب پر اس دم
مہ وشوں کی شراب کی باتیں
دختِ رز نے کیا تھا وہ جادو
ہر شرابی تھا رقت کا حاتم
دی اٹھنی، کسی نے چار آنے
جھولی سائل کی بھر گئی جس دم
آہ اک سرد کھینچ کر بولا!!
میکدے میں قیام ہے تیرا

اتفاقاً پہنچ گیا بھوپال!
شکرِ خالق میں بس جھکایا سر
ہے سنا لوگ ہیں یہاں نامی!
بعد مدت کے شادماں ہوں گا
جلد بھیجوں گا گھر منی آرڈر
مسجدوں سے ہوئی بلند اذاں
ایک مسجد کے در پہ جا پہنچا
لحنِ داؤدی اور خشوع و خضوع
دل سے نکلی ہوئی وہ تکبیریں
اب نکلنے میں سب نے عجلت کی
اپنے جوتوں کی فکر تھی طاری
در پہ درویش کو کھڑا پایا!
ٹھوکروں سے اسے ہٹانے لگے
دوسرے نے لگایا اک چانٹا
ارے کمبخت کیوں یہاں آیا
تو یہاں آیا گندگی کے لئے
پر کسی نے دیا نہ اک دھیلا
چل دیا واں سے پڑھ کے وہ لاحول
کس محلے سے روٹیاں پاؤں
سامنے دیکھا ایک میخانہ
اب کہاں قسمت آزمانے جائیں
آج کی رات کام چل جائے
جام گردش میں تھا دہاں پیہم
نہ تھی دوزخ عذاب کی باتیں
رام کے ساتھ نعرۂ یا ہو
اک سخاوت کا دور تھا قائم
کام کے تھے بہت یہ دیوانے
اس کی حیرت کا تھا عجب عالم
واہ! کیسا مذاق ہے مولا!!
ایڈریس دے رکھا ہے مسجد کا!

آفتاب احمد
ریسرچ فیلو، علی گڑھ یونیورسٹی

سرکاری ملازمت

وہ دن ہوا ہوئے جب لوگ تعلیم کو سرسوتی کا وردان سمجھتے تھے۔ ترقی یافتہ زمانے میں لوگ تعلیم کا PORTFOLIO بھی لکشمی کے ذمہ دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اگلے زمانے میں تعلیم کو علم کی روشنی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا لیکن ترقی یافتہ عہد میں تعلیم کو دولت سمیٹنے کا ایک کارگر فورمولا تصور کیا جاتا ہے۔ میں بھی اس ترقی یافتہ زمانے کا ایک تعلیم یافتہ فرد ہوں۔ اگلے سال میں نے معاشیات میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور ان دنوں حصول ملازمت کے تمام طریقوں پر معاشی نقطۂ نظر سے غور و خوض کر رہا ہوں۔ اکثر خیر اندیشوں نے مجھے آئی۔اے۔ایس کے امتحان میں شریک ہونے کی رائے دی ہے۔ لیکن سچ پوچھیئے تو ایم۔اے۔کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے مجھے امتحانات کے کتنے HURDLE پھاندنے پڑے ہیں کہ آئی۔اے۔ایس کے چکر میں پڑنے کی ہمت ہی نہیں۔ لفظ امتحان میرے لئے اتنا ہی مہلک ہے جتنا کہ حضرت ابلیس کے لئے لاحول۔

جب کوئی بزرگ یہ پوچھ بیٹھتے ہیں کہ برخوردار ایم۔اے کرنے کے بعد آج کل کیا شغل ہے؟ تو میں تھوڑی دیر کے لئے گھبرا سا جاتا ہوں۔ اور پھر یہ سوال تو اتنی مرتبہ دہرایا گیا ہے کہ اب یہ سوال میرے لئے صرف سوال نہیں بلکہ مسئلہ بھی بن گیا ہے۔ دراصل مجھے ملازمت کی اتنی شدید تلاش ہرگز نہ ہوتی لیکن میں "آج کل کیا شغل ہے؟" کا جواب جلد از جلد دے کر بری ہو جانا چاہتا ہوں۔ ویسے جب میں نے اس مسئلہ کو اپنے ایک ذہین دوست کے سامنے رکھا تو انہوں نے فرمایا کہ میاں یہ کوئی مسئلہ ہے! تم نرے احمق ہو، کہہ دیا چاہئے کہ آئی۔اے۔ایس کی تیاری کر رہا ہوں۔ آئی۔اے۔ایس کے الفاظ سنتے ہی میں بھڑک اٹھا تو موصوف نے کہا کہ میں کب تمہیں آئی۔اے۔ایس۔ کی تیاری کرنے کہہ رہا ہوں۔ میں تو تمہیں صرف "آج کل کیا شغل ہے؟" کا جواب بتا رہا ہوں۔ بقول اپنے زماں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ میرے خیال میں آج کل کے UN EMPLOYED GRADUATES کو اپنے "ایام بے کاری" میں آئی۔اے۔ایس کی تیاری کرنا چاہئیے۔ ویسے وہ کلرکی کی تلاش میں پورے زور و شور سے سرگرداں رہیں۔ یہ تیاری تو ہاتھی کے سامنے والے دانتوں کی طرح ہو جو "آج کل کیا شغل ہے؟" کا بھرپور جواب ہے۔

آپ سے کیا چھپانا، آپ تو میری مجبوری یا کمزوری سے واقف ہی ہیں کہ آئی۔اے۔ایس۔ میرے بس کا روگ نہیں۔ دراصل میں کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے بغیر ہی سرکاری ملازمت حاصل کر لوں۔ سرکاری ملازمت کی جانب میرا جھکاؤ خاندان کی روایت کے بموجب تھا۔ پشتوں سے ہمارے خاندان کے بزرگوں کے لئے "ذریعہ عزت" سرکاری ملازمت ہی رہی ہے۔ یوں بھی مجھ میں خاندانی روایات سے بغاوت کرنے کی مجال نہیں۔

خوبیٔ قسمت سے میری نظر سکریٹریٹ سے شائع ہونے والے ایک اشتہار پر پڑی۔ اس اشتہار کے جواب میں میں نے ایک افسر کے عہدے کے لئے اپنی درخواست روانہ کر دی۔ درخواست کے روانہ کرتے ہی انٹرویو کی تیاری بڑے شد و مد کے ساتھ

شروع کردی۔ اس تیاری میں میں نے عام معلومات کی کئی کتابوں کو ذہن کے نہاں خانوں میں قید کرلیا۔ (اس زمانے میں مجھے سال گذشتہ اور سالِ رواں کے تمام قومی اور بین الاقوامی اہم واقعات ازبر تھے اس کے علاوہ وہ تمام حادثات و فتوحات کے سنہ یاد تھے جو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں) بچا جان کی بتائی ہوئی ترکیب کارگر ہوئی اور میں انٹرویو میں کامیاب ہوگیا۔ انٹرویو میں کامیابی کے بعد میرا طبی معائنہ ہوا اور مجھے ایک ہفتہ تک تقرر کا انتظار کرنے کو کہا گیا۔

اپنی اس کامیابی پر میں بہت خوش تھا۔ سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ بغیر امتحان کے سرکاری ملازمت مل گئی مجھ سے زیادہ قدرت اور کس پہ مہربان ہوگی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی خوشی زیادہ دنوں تک میرے ساتھ نہ ٹک سکی اور کسی ستم گر معشوق کی طرح مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ ہوا یہ کہ ایک ہفتہ کیا دوسرا ہفتہ بھی گذر گیا لیکن تقرر کا خط نہ آیا۔ اس زمانے میں میری کیا حالت ہوگئی تھی یہ نہ پوچھیے۔ وہ دن یاد آتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دو چیزیں مجھے ہمیشہ عزیز رہی ہیں۔ ایک تو لذیذ کھانا اور دوسری میٹھی نیند۔ لیکن یقین جانیے، اس زمانے میں مجھے لذیذ سے لذیذ کھانا بھی باسی کڑھی کا مزہ دیتا۔ اور نیند، ارے وہ تو ایسے مجھ سے بھاگ گئی جیسے کوئی قرض خواہ کا بلی سے بھاگتا ہے۔ دوستوں میں سبکی کا خوف الگ میری جان سے چمٹا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ آتا کہ بغیر تقرری کے مجھے اتنی ڈینگ مارنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟۔ اسی الجھن میں تیسرا ہفتہ بھی گذر گیا۔ تیسرے ہفتے کا گذرنا کیا تھا کہ میرے صبر کا پیمانہ نہ صرف چھلک اٹھا بلکہ جھنجھنا کر ٹوٹ گیا۔ پیمانۂ صبر کا ٹوٹنا تھا کہ میں متعلق افسران سے ملنے جا پہونچا۔ ڈائرکٹر صاحب نے بڑے اطمینان سے میری عرضداشت سنی اور فرمایا کہ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ کام شروع کر چکے ہوں گے۔ خیر آپ جا کر کھنہ صاحب سے ملیں وہ آپ کو بتا سکیں گے کہ بات کیا ہے۔"

کھنہ صاحب کے کمرے کے باہر مجھے پتہ چلا کہ وہ حضرت ایک ماہ کی رخصت پر ہیں اور ان کی جگہ اب میری فائل پانڈے صاحب ڈیل کریں گے۔ خیر میں پانڈے صاحب سے ملا اور عرضِ حال سنایا۔ موصوف نے بڑے تپاک سے جواب دیا "تو میں کیا کروں، میڈیکل رپورٹ آج ہی آئی ہے دو تین روز میں تقرری کی اطلاع آپ کو مل جائے گی۔ پانڈے صاحب کے ان الفاظ نے میری تن جوتھائی نکلی ہوئی روح کو پھر سے جسم کے اندر ڈھکیل دیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ (لیکن وہ اطمینان کی سانس تھی یا سرد آہ یہ بتانا مشکل ہے) میں دفتر سے نکل کر ایسے باہر آیا جیسے کوئی مریض شفا پا کر اسپتال سے نکلتا ہے راستے میں مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ ڈاکٹر نے تو میرا معائنہ آدھ گھنٹے میں کرلیا تھا لیکن کم بخت نے رپورٹ ایک ماہ بعد کیوں بھیجی۔ یہی سوچ سوچ کر دل کڑھتا رہا لیکن میں نے دیر آید درست آید کا فورمولا دل کو بتا کر مطمئن کر دیا۔

تیسرے روز کے انتظار میں ایک ہفتہ گذر گیا تو مجھے پتہ چلا کہ ابھی بھی میرے ستارے گردش میں ہیں۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ کربِ انتظار کے تجربے سے مجھے مراحلِ عشق کی سختیوں کا اندازہ ہوگیا تھا اور میں نے اسی وقت کان پکڑ کر زندگی بھر عشق کے سائے سے دور رہنے کی قسم کھائی تھی۔

جب دوسرا ہفتہ گذر گیا اور تقرری کا پروانہ نہیں ملا تو پانڈے صاحب سے ملنے چلا گیا۔ موصوف نے بڑی نرمی کے ساتھ فرمایا کہ میں آپ کے کام کے سلسلے میں بے حد پریشان ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ منتخب امیدواروں کی لسٹ گم ہوگئی لہٰذا آپ کو مزید دو روز انتظار کرنا ہوگا۔ میں با دلِ ناخواستہ کی مانند لوٹ آیا۔ لیکن دو روز کے بعد میں انتظار کرنے کے بجائے سیدھا دفتر چلا گیا۔ پانڈے صاحب مجھے دیکھتے ہی بگڑ اٹھے جیسے کہ فائل ان سے نہیں مجھ سے گم ہوئی ہو۔ ویسے میں اس

APPIONTMENT - LETTER لینے نہیں بلکہ فائل ملا یا نہیں یہ دریافت کرنے گیا تھا

پانڈے صاحب کے ہمدردانہ سلوک نے ہماری ہمت کو ایک زبردست تازیانہ لگایا۔ میں اس دوڑ دھوپ سے تنگ آچکا تھا۔ میں چونکہ معاشیات کا طالب علم ہوں اس لئے معاشی نقطۂ نظر سے بھی یہ ملازمت مجھے کچھ ہلکی لگی ہفتے میں دوبار دفتر کا چکر لگاتا اور ہر چکر میں بیس روپیہ صرف کرنا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ جب میں نے حصولِ ملازمت کے سلسلے میں خرچ ہونے والے اخراجات کا حساب لگایا تو پتہ چلا کہ آئی۔ اے۔ ایس۔ کی فیس کی چوگنی رقم اب تک خرچ کر چکا ہوں۔ اور خون پسینہ جو جلا اس کی بات الگ ہے۔ ویسے بھی خون پسینہ کی قیمت ہی کیا ہے؟ لیکن حصولِ ملازمت کے سلسلے میں اٹھائی گئی مصیبتوں کا خیال آتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ اس سے سخت امتحان آئی۔ اے۔ ایس کیا قیامت کا بھی نہ ہوگا!

دستی کپڑے کی صنعت کے ساتھ

نیا برتاؤ

دستی کپڑے کی صنعت آندھرا پردیش میں تقریباً ۳۰ لاکھ عوام کو روزگار فراہم کرتی ہے۔ زراعت کے بعد دستی کپڑے کے شعبہ میں عوام کی سب سے زیادہ تعداد روزی کماتی ہے۔

تحریک امداد باہمی اس شعبہ کے لئے ایک عظیم نعمت ثابت ہوئی ہے۔ ۱۹۵۳-۵۴ء میں بافندوں کی امداد باہمی انجمنوں کی تعداد ۶۴۹ تھی لیکن فی الوقت ریاست میں ۹۷۷ انجمنیں قائم ہیں۔

آندھرا پردیش اسٹیٹ ٹیکسٹائل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا قیام عمل میں لے آیا گیا ہے۔ اس کارپوریشن نے مختلف اضلاع میں ۹ پیداواری مراکز قائم کئے ہیں جو تقریباً ۳۰۰۰ ہزار بافندوں پر محیط ہیں۔

کنٹرولڈ اقسام کی ساڑیوں اور دھوتیوں کی تیاری دستی کپڑے کے شعبہ کو تفویض کی گئی ہے۔ اس وقت ۱۰۰۰ اسوسائٹیوں میں ۳۰۰۰ کرگھے کنٹرولڈ اقسام کی ساڑیوں اور دھوتیوں کی تیاری میں مصروف ہیں۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامّہ

حکومتِ آندھرا پردیش حیدرآباد

عبدالمجید سالک

منکہ ایک . . .
خاندانی معتبر نائی ہوں

بھائیو! میں ایک معتبر نائی ہوں، میرے دادا بادشاہی نائی تھے کنور نونہال سنگھ کی شادی شام سنگھ اٹاری والے کے ہاں میرے ہی دادا نے کرائی تھی۔ ہائے کیا زمانہ تھا۔ سنا ہے کہ جب میرے دادا اٹاری سے شاد بامراد ہوکر واپس لوٹے ہیں تو مہاراج ان کی پیشوائی کے لئے قلعہ کے حضوری دروازے تک چل کر آئے تھے اور دادا پر انعام واکرام کا وہ مینہ برسایا تھا کہ کھاتے کھاتے تین پشتیں گذر گئیں اور اب بھی مولا کی مہربانی سے بیس بیگھہ زمین کا مالک ہوں کھانے پینے کی کمی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے گذران اچھی ہے لیکن دیکھتا ہوں کہ میرے بعد یہ خاندانی معتبری چلتی نظر نہیں آتی۔ زمانہ کا رنگ بدل گیا۔ طور طریقے بدل گئے۔ پرانے زمانے کے بھائیوں کی یاد آتی ہے تو کلیجے پر استرا چل جاتا ہے، زبان قینچی کی طرح چلنے لگتی ہے۔ یار دوست سمجھاتے ہیں میاں ہوش کے ناخن لو۔ تم کس چکر میں پڑ گئے جس طرح زمانے نے پرانے طریقوں کو مونڈ کے صفاچٹ کر دیا۔ اسی طرح آجکل کے فیشن بھی صاف ہوجائیں گے لیکن بھائیو! ذرا یہ اندھیر تو دیکھو کہ ہم لوگوں کا کوئی کام بھی ہمارے ہاتھ میں نہ رہا۔ ہمارے زمانے میں حجامت بناتے تھے تو نائی ختنہ کرتے تھے تو نائی زخموں پر مرہم لگاتے تھے تو نائی پچھنے اور سینگی لگاتے تھے تو نائی، شادی بیاہ میں کھانا پکاتے تھے تو نائی اور بر کے لئے کنیا اور کنیا کے لئے بر ڈھونڈتے تھے تو نائی، لیکن آج کل یہ کیا قیامت آئی کہ ہم لوگوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں اور کل کے لونڈے چھاؤنیوں میں گوروں کی ڈاڑھیاں مونڈ مونڈ کر اپنے آپ کو نائی کہتے ہیں اور چار چار آنے بٹور لیتے ہیں۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی۔ ہم لوگوں کا یہ قاعدہ تھا کہ نقتو موچی سے، اللہ بخشے بڑا کاریگر تھا، خاص کر کسوت بنانے میں تو سنا ہے ولایت تک مشہور تھا، اس سے کسوت سلوائی اور جب وہ لایا تو اللہ دین تیلی کے ہاں دے آئے، اس نے پندرہ پندرہ دن کڑوے تیل میں ڈلو کر رکھی، اس کے بعد اللہ تمہارا بھلا کرے، اسے پونچھ پانچھ کے صاف کیا۔ چار استرے، دو قینچیاں، ایک نہرنا، ایک مہندی وسمہ لگانے کی کٹوری اور ایک کٹوری، یہ سب چیزیں اس میں رکھیں اور سارا ہا سال کے لئے بے فکر ہو گئے۔ اب جو تم دیکھو تو آج کے نائی کہنے، آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ ماں ٹھینا باپ کلنگ ولایت کے چار چار روپے کے استرے اور صابن اور چھٹکرا اور روآنا ساجنے پوڈر کہتے ہیں لئے پھرتے ہیں، جیسے کوئی نسخہ تیار کریں گے اور پھر ایک حجامت میں پورا ایک گھنٹہ غارت کر دیتے ہیں ہاتھ کی صفائی کا نام نشان نہیں، بزرگوں کا ذکر تو کیا کیجئے مجھ روسیاہ کا واقعہ سنئے لالہ بھبھوتی سرن کے پتا سرگباش ہو گئے۔ بیٹوں پوتوں اور رشتہ داروں کا ہجوم ہو گیا لالہ جی نے مجھے بلا کر کہا "علیا" جو پرماتما کی اچھا تھی وہ پوری ہو گئی۔ ذرا جلدی سے بھون کر دو، اس سے فارغ ہو جاؤ تو بیسیوں کام

اور پٹے ہیں۔

بس میاں اللہ دے اور بندہ لے، میں نے کورا اُسترا جو ہاتھ میں لیا تو پچیس آدمیوں کو آدھ گھنٹے میں مونڈ کر رکھ دیا قدردان ججمان نے پانچ روپے چہرہ شاہی میری ہتھیلی پہ رکھ دیئے اور کہا "علیا ہم جیسے ساہوکار تو ہزاروں ہو لگے پر تجھ جیسا نائی چار کھونٹ میں نہ ملے گا۔

اب حالت یہ ہے کہ نہ کوئی سر گھٹاتا ہے نہ پٹے رکھتا ہے نہ ڈاڑھی کا خط بنواتا ہے جسے دیکھو ماتھے پہ بالوں کا ایک مٹھا سا لئے پھرتا ہے اور سر کے پچھلے حصّہ میں صفا چٹ میدان، بال ہیں کہ گاؤ دم۔ آگے زیادہ پیچھے کم پہلے خال خال لڑکے بالے ڈاڑھی منڈاتے تھے اب جسے دیکھو جوان ہو یا بوڑھا، مونچھیں تک چٹ کرائے بیٹھا ہے جیسے ابھی باپ مرا ہے۔ نا صاحب ہم سے تو ایسی حجامتیں ہوتیں نہیں، مولا آباد رکھے اپنے مولویوں اور چودھریوں کو جو پرانی وضع نباہے جا رہے ہیں اور ان کے ساتھ ہماری بھی نبھتی جاتی ہے۔ ہم لوگ بچوں کا ختنہ کیا کرتے تھے ذراسی فلک سیر کھلا دی۔ بچہ اتنا غفیل ہو گیا۔ بکھیاڑی چڑھائی اور ایک اشارے میں ختنہ کر چولہے کی جلی ہوئی مٹی سے غمن بند کر راکھ کی پوٹلی لپیٹ لنگوٹا بندھوا دیا اور بچہ ہے کہ کھیلتا پھر رہا ہے اب یہ کام ڈاکٹروں کے سپرد ہو گیا ہے۔ انھیں کیا معلوم ختنہ کس کو کہتے ہیں نہ باپ نے کیا نہ دادا نے۔ انگریزوں کے پڑھائے ہوئے اور انگریزوں میں ختنہ کا رواج نہیں جبھی تو ہم نے دیکھا ہے کہ ان سے ختنہ کرا کے بچہ مہینوں بستر پہ ایڑیاں رگڑتا ہے اور ڈاکٹر مارے دواؤں کے بے چارے کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ کنوؤں میں ڈالنے کی دوا سے دھوؤ، یہ چیز چھڑکو وہ چیز لگاؤ۔ دس روپے روئی اور مرہم پٹی میں غارت ہو جاتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچّے کا زخم اچھا نہیں ہوتا اور پھر ہمیں کو بُلانا پڑتا ہے۔ ہم لوگ زہری سے زہری پھوڑوں کا علاج دم کے دم کر لیا کرتے تھے زنگاری مرہم کا پھاہا چپکا دیا چلو چھٹی ہوئی اب وہ جبھی اترے گا جب پھوڑا اچھا ہو جائے گا، نہ روزانہ دھونے کا کھڑاگ، نہ باندھنے کا قضیہ۔ یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اچھے اچھے عقل شناس والے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ڈاکٹروں کے جال میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ دھڑا دھڑ روپیہ بھی خرچ کرتے ہیں۔ روزانہ درد سے چیختے چلّاتے بھی ہیں۔ چیرے بھی دلواتے ہیں۔ مدّت تک پھوڑا بھی اچھا نہیں ہوتا لیکن ڈاکٹر کا جادو ایسا سر پہ سوار ہے کہ اس کا دامن نہیں چھوڑتے پہ نہیں چھوڑتے۔

ججمانو! یہ تو عام نائیوں کے کام تھے۔ اب بھی نائی یہی کچھ کر رہے ہیں، لیکن ہم خاندانی معتبر نائی ان ٹکے ٹکے کے نائیوں سے بہت اونچا مرتبہ رکھتے تھے۔ غریب آدمی تو شادی بیاہ میں کیا خرچ کرے گا اور مہمانوں کو کیا کھلائے گا۔ ہم کھاتے پیتے ججمانوں کے ہاں شادیوں پر کھانا پکاتے تھے بس چار گھڑی پہلے کہہ دیجئے اور پانچسو آدمیوں کا کھانا تیار لیجئے پھر ہم خودغرض بھی نہ تھے دوسرے کا گھر پھونک کر تماشہ نہ دیکھتے تھے آج کل کے نمک حرام نائیوں کی طرح چاول اور گھی اور پستہ اور بادام اور گوشت چرا کر چپکے سے اپنے گھروں کو نہیں بھجوا دیتے تھے بلکہ اپنے ججمانوں کی بھی کفایت اور پردہ داری کرتے تھے پلاؤ پکایا اس کی بوٹیاں الگ نکال لیں کچھ گھی بھی نچوڑ لیا۔ اور وہی بوٹیاں اور گھی، قلیئے اور ساگ میں ڈال کر وہ سالن مہمانوں کے آگے رکھ دیئے۔ بس پھر کیا تھا ججمان عش عش کر گیا۔

اب پچھلے دنوں کا ایک قصہ سنئے۔ ایک نئے فیشن کے گھر میں شادی تھی میں تو اپنے ججمانوں کے سوا کسی دوسرے کے ہاں جاتا نہیں لیکن ایک ججمان ہی نے سفارش کی، میں چلا گیا بابو صاحب نے حکم دے دیا کہ نائی جو سامان اور مصالحہ مانگے اُسے دے دیا جائے

ں نے اپنی عادت کے مطابق مالک کی خیر خواہی اور بچت کے خیال سے وہاں ہیر پھیر یہاں بھی کیا، پھر کیا ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بابو صاحب غصہ میں بھرے ہوئے چولہوں کے پاس آئے اور مجھے ہزاروں بے نقط سنا ڈالیں "کم بخت خاندانی نائی بنا پھرتا ہے پورا سامان لے لیا، پورا مسالہ لے لیا اور پلاؤ میں گھی نہیں، سالن میں لذت نہیں برادری کے لوگ کیا کہیں گے کہ کس باتوں میرے گھر میں دعوت کھانے گئے کم بخت تو نے تو میری ناک کٹوادی۔" اب میں ہوں کہ ششدر کھڑا ہوں یا الٰہی نیکی برباد گنہ لازم، سامان اور مسالہ میں خود نہیں کھا گیا، گھر نہیں لے گیا، یہیں رکھا ہے اور یہ بابو صاحب ہیں کہ شکر گذار ہونے کی جگہ الٹا میری جان کو آرہے ہیں اس دن سے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ فیشن کے گھرانوں میں جا کر جھانکوں گا بھی نہیں۔ مجھے اپنے ڈھنگ کے کھانے ہی کافی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں دولت مندوں کے ہاں کھانا پکانے سے عاجز ہوں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خاندانی نائی ہوں میرے بزرگ بادشاہوں کے نائی تھے اب نہ بادشاہی رہی نہ نائی رہ گئے۔ آج کل جو لوگ شادی بیاہوں پر زیادہ خرچ کرتے ہیں ان کی حیثیت مجھے خوب معلوم ہے۔ میرے گاؤں کے سارے ہی چودھری لالہ پکوڑی شاہ کے قرض دار ہیں چودھری اپنے گھر کو آگ لگا کر تاپیں تو تاپیں مجھ سے تو یہ نہیں ہوتا کہ قرض لئے ہوئے روپے کو بے دردی سے خرچ کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مجھ سے کفایت ہوسکتی ہے پوچھے گچھے بغیر کر دیتا ہوں۔ باقی پکانے کو پلاؤ، بریانی، متنجن، مزعفر، قورمہ، روغن جوش، ہر قسم کا سالن، مچھلی، مرغ، ہر قسم کی فرنی ہر چیز پکا سکتا ہوں البتہ انگریزی شوربا نہیں پکا سکتا، میٹھے ٹکڑے نہیں پکا سکتا۔ پٹین بنانی نہیں آتی یہ چیزیں نہ ہمارے دادا کے وقت میں تھیں نہ کسی نے ہمیں سکھائیں نہ خدا ایسا موقع لائے۔

ایک زمانہ تھا بڑے بڑے امیر لوگ اپنے خاندانی معتبر نائیوں کو اپنا راز دار سمجھتے تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتے سے زیادہ نازک معاملہ اور کیا ہوگا۔ لڑکے کے لئے لڑکی والوں کے ہاں پیغام لے کر جانا اور لڑکی کے لئے لڑکا تلاش کرنا پھر لڑکے لڑکی کی شکل صورت، مزاج، سبھاؤ، ماں باپ کی حیثیت اور طبیعت کے متعلق ٹھیک ٹھیک معلومات فراہم کرنا اور باہم پہونچانا پسند کی صورت میں شادی کی شرطوں کا فیصلہ کرنا، تاریخ مقرر کرنا، غرض یہ سارے کام خاندان کے معتبر نائی کے ہاتھوں انجام پاتے تھے۔ ہزاروں کا زیور کپڑا صندوق میں بند کر کے نائی کے حوالے کر دیا جاتا اور کیا مجال کہ ایک سوئی بھی ادھر سے ادھر ہو جائے اسی لئے تو معتبر کا لفظ نائی کے ساتھ ایسا لگا ہے کہ چسپاں ہو کے رہ گیا ہے آج کل کے ٹٹ پونجئے نائی بھی ہیں جن کا سارا نائی پن صابن لگا کر ڈاڑھیاں مونڈھنے ہی تک محدود ہے ذرا کسی ایسے نائی کے ہاتھ کسی دوست کے پاس دیا سلائی کی ایک ڈبیا ہی بھیج کر دیکھئے رستہ ہی میں بیچ کر اس پیسے کا پان نہ کھا جائے تو میرا نام علیا نہیں کچھ اور رکھ دیجئے۔

صرف شادی بیاہ ہی پر موقوف نہیں، عام پیغام رسانی بھی ہمارے سپرد ہوتی تھی۔ بڑے بڑے معزز آدمی اپنی بیٹیوں کو سسرال سے بلانا چاہتے اور گھر کا کوئی آدمی فارغ نہ ہوتا تو یہ کام بھی معتبر نائی ہی کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اسی اعتبار کی وجہ سے ہم لوگوں کی عزت کا ڈنکا بجتا تھا۔ ہندو ہمیں راجہ اور مسلمان خلیفہ کہتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک راجہ کے بیٹے اور ایک نائی کے لڑکے میں بحث ہو گئی۔ راجہ کا بیٹا کہتا تھا کہ میرا باپ بڑا ہے، نائی کا لڑکا دعویٰ کرتا تھا کہ میرے باپ کا مرتبہ تیرے باپ سے بھی اونچا ہے۔ راجہ کے بیٹے نے کہا تو نے دیکھا نہیں ساری دنیا میرے باپ کے آگے سر جھکاتی ہے، نائی کے بیٹے نے برجستہ جواب دیا کہ تو نے دیکھا نہیں کہ تیرا باپ جب حجامت بنواتا ہے تو میرے باپ کے آگے سر جھکا کر بیٹھتا ہے لیکن زمانہ کا الٹ

پھر دیکھو، اب یہ بات بھی جاتی رہی۔ حجامت بنوانے والا کرسی پر بیٹھتا ہے۔ سامنے لمبا تڑنگا سا آئینہ دیوار سے لگا ہے اور نائی اس کے دائیں بائیں بلائیں لیتا پھرتا ہے۔ اب تو وہ سر جھکانے کا معاملہ بھی نہ رہا۔ غرض کس کس چیز کو رووں مہربانو! دل پکا پھوڑا ہو رہا ہے۔ تم کو اپنے حال کی طرف متوجہ دیکھا تو دو باتیں کر لیں۔ پرانی شان نہ رہی۔ پرانی آن نہ رہی۔ پرانی باتیں نہ رہیں۔ اگلے دن نہ رہے لیکن آج کے زمانے کے اناڑی پن کو دیکھتا ہوں۔ آج کل کے نائیوں کی کی ناکارگی اور بددیانتی کو دیکھتا ہوں تو دل فخر سے بھر جاتا ہے اور گردن اونچی کر کے کہتا ہوں کہ آخر میں ایک خاندانی معتبر نائی ہوں۔ نائی تو اور بھی ہوں گے لیکن میرے خاندانی اور معتبر ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔؟

کلیم میدکی

مہمانی

ان سے بھی زیادہ ہیں مہربان ممانی
ہر بات پہ ہو جاتے ہیں قربان ممانی

وہ دن بھی مجھے یاد ہیں غربت میں ہماری
کو رتنے بنے ماموں رہے انجان ممانی

بچپن سے یہاں تک مجھے امی نے سنبھالا
اب آکے چڑھانے لگے پروان ممانی

بارش کی طرح آکے ٹپکتے ہیں مرے گھر
بجلی کی طرح ہو کے پریشان ممانی

اک پل بھی انھیں چھوڑ کے رہتے نہیں تنہا
جاناں کی مرے کھاتے ہیں کیوں جان ممانی

دو بات بھی کرنے نہیں پایا تھا میں ان سے
پھر آکے مرے بیچ میں شیطان ممانی

ممی سے مری بول کے رشتہ تو جمادو
تا عمر نہ بھولوں گا میں احسان ممانی

دن رات سدا آپ کے قدموں میں رہوں گا
مانوں گا ہر اک آپ کا فرمان ممانی

جب سے کہ مرے دوستو شادی ہوئی ان سے
ہر روز مرے گھر میں ہیں مہمان ممانی

ماموں کی طرح جال میں جکڑو نہ مجھے بھی
تم باندھ کے رکھ لو کہیں ارمان ممانی

محبوب راہی

غزل کے شاعر

(بالاستثنائے چند)

نہ تو گرتے ہیں نہ چلتے ہیں سنبھل کے شاعر
قابلِ رحم ہیں بیچارے غزل کے شاعر

ان کے افکار ہیں بیمار خیالات مریض
قول کے ہیں نہ تو پابند عمل کے شاعر

زندہ رہتے ہیں شب و روز بھی جل کے شاعر
جانے کس دھات کے ہوتے ہیں غزل کے شاعر

کچھ نہ بن پائیں تو پھر چاہے وہ اینٹیں ڈھوئیں
آج کے بچے خدایا نہ ہوں کل کے شاعر

چند اشعار بھی یہ ہضم نہیں کر پاتے
اس قدر ہوتے ہیں کچھ پیٹ کے ہلکے شاعر

شعلۂ حسن جوان کو نظر آجائے کہیں
پانی پانی وہیں ہوتے ہیں پگھل کے شاعر

ایسے لگتا ہے کہ سرکس کا ہو جوکر کوئی
شعر پڑھتے ہیں جو ڈائس پہ اچھل کے شاعر

پار کر لیتے ہیں یہ سات سمندر پل میں
آگ کے دشت سے آتے ہیں نکل کے شاعر

کچھ بجد تا بہ لحد وقفِ سخن ہوتے ہیں
اور کچھ ہوتے ہیں دو چار ہی پل کے شاعر

سب کا اسلوب جدا سب کا ہے انداز الگ
زندگانی کے ہیں کچھ، کچھ ہیں اجل کے شاعر

ہم تو افکار کی دلدل کے ہیں شاعر راہی
تم تو بتلاؤ کہ ہو کون سے دل کے شاعر

مقدس دریاؤں کی سرزمین

آندھرا پردیش مقدس دریاؤں کی سرزمین ہے جن کے گن ہمارے قدیم ترین رزمیہ گیتوں اور پرانوں میں گائے گئے ہیں۔ ۱۹۵۶ء ہی سے ہماری ریاست نے آبپاشی کے فروغ اور ترقی کی جانب غیر منقسم توجہ دی ہے۔

منصوبوں کے دوران میں آبپاشی کے لئے پیدا کردہ جملہ گنجائش ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

پہلا منصوبہ	:	۲۲۰۹۸۰ ایکڑ
دوسرا منصوبہ	:	۴۴۲۹۹۸ ایکڑ
تیسرا منصوبہ	:	۲۷۹۵۲۴ ایکڑ
پانچویں منصوبہ کا ٹارگٹ آبپاشی کی اضافہ گنجائش کے لئے		۴۶۵۰۰۰ ایکڑ

ناگرجنا ساگر ہندوستان کے سب سے بڑے کثیر مقصدی پراجکٹوں میں سے ایک ہے۔ پوچم پاڈ پراجکٹ پر کام پوری قوت کے ساتھ جاری ہے۔ ۱۸۲ کروڑ روپے لاگت والا ومسادھرا پراجکٹ کی تکمیل پر سریکاکلم میں ۱۴۸۲۸۸ ایکڑ زمین سیراب کرسکے گا۔

مناظر عاشق ہرگانوی

نوکر کا مسئلہ:

واجدہ تبسم اپنے شوہر اشفاق کے ساتھ کرشن چندر کے گھر گئیں۔ سلمیٰ صدیقی اور کرشن چندر دونوں ہی نوکر کے لئے سخت پریشان تھے۔ نوکر انھیں ایسا چاہیئے تھا جو صفائی پسند بھی ہو اور کھانا بھی لذیذ بنائے۔ واجدہ تبسم نے کرشن چندر سے کہا "آپ کو ایسا نوکر مل تو سکتا ہے جو دونوں صفات پر پورا اترتا ہے، لیکن پتہ نہیں، آپ اسے رکھنا پسند بھی کریں یا نہیں"

کرشن چندر بے حد اٹل فیصلہ کے انداز میں بولے "ان دونوں صفات کے ساتھ تو ہم کسی کو بھی رکھ لیں گے، بھیجیں تو سہی"

واجدہ تبسم نے سنجیدگی سے کہا "تو پھر مجھے رکھ لیجئے"

تصویر کا چکّر:

بیس کانفرنس اور انڈو پاک کلچرل کانفرنس میں دنیا بھر کے ادیب و شاعر جمع تھے۔ خوشتر گرامی نے دہلی کے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں ٹی پارٹی دی تھی۔ اسی پارٹی میں ایک صاحبہ کرشن چندر سے بولیں "میری بڑی تمنا ہے کہ آپ کے ساتھ تصویر کھنچواؤں"

کرشن چندر ہنس کر بولے "مجھے کوئی اعتراض نہیں"

اسی لمحہ ایک ادیبہ صاحبہ آگئیں اور کرشن چندر کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی بولیں "پلیز ایک منٹ، مجھے جلدی ہے اور آپ کے ساتھ تصویر لینا بھی ضروری ہے"

کرشن چندر اس آکورڈ پوزیشن سے گھبرا گئے اور کسی طرح بیچ بچا کر اس میز تک پہنچے جہاں واجدہ تبسم، اشفاق اور ساحر وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے — اسی وقت کسی نے تصویر لے لی۔ کرشن چندر بہت ہنسے بولے "نہ ایک صاحبہ

کے ساتھ، نہ اُن صاحبہ کے ساتھ۔ دراصل آج ہماری تصویر زاہدہ تبسم کے ساتھ کھنچی تھی سو کھنچ کے رہی۔"

سُنّی مُسلمان:

بانکی پور کلب پٹنہ میں ڈاکٹر قمر رئیس، مجتبیٰ حسین، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، مصطفےٰ کمال، سرور جمال اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سہیل عظیم آبادی گفتگو میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ شکیلہ اختر نے انھیں مخاطب کرکے کہا: "آپ بہت سوتے ہیں!"

"سوتا نہیں ہوں بلکہ میں سنی مسلمان ہوں، اس لئے صرف سنتا ہوں۔"

سہیل عظیم آبادی نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔

کھانسی:

ٹیلی ویژن سنٹر سری نگر میں جگن ناتھ آزاد، شکیل الرحمٰن، حامدی کاشمیری، ظفر احمد، امین کامل، شمس الدین احمد اور مناظر عاشق ہرگانوی محوِ گفتگو تھے کہ یکایک کسی نے کھانسنا شروع کر دیا۔ جگن ناتھ آزاد بولے "اس کھانسی پر مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک مشاعرہ میں صدر مشاعرہ کھانسنے لگے۔ جو شاعر کلام پڑھ رہے تھے وہ خاموش ہوگئے۔ جب صدر مشاعرہ کی کھانسی رکی تو وہ خاموش ہو جانے والے شاعر سے بولے۔

"اب آپ کھانسیے! میں کلام پڑھتا ہوں۔"

شادی کی وجہ:

مظہر امام کے گھر سری نگر میں خلیل الرحمٰن اعظمی، مظہر امام، سبینہ امام، شاہدہ کمال، شہیر امام اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شادی کی بات نکلی تو خلیل الرحمٰن اعظمی نے کہا "اردو کے ایک شاعر کو شادیاں کرنے کا شوق تھا ان سے لوگوں نے اس شوق کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا جب دولہا بن کر لڑکی کے گھر جاتا ہوں تو عورتیں کہتی ہیں "لڑکا آرہا ہے"۔ میں یہی لفظ "لڑکا" سننے کے لئے شادیاں کرتی ہوں۔"

اصل اور کم اصل:

آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں شمیم فاروقی، تاج پیامی اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے ایک دوسرے سے لطیفہ سُن رہے تھے۔ تاج پیامی نے کہا "میرے دادا اور کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بھانڈ آگیا۔

لوگوں نے پوچھا "کون ہو؟"

"میں بھانڈ ہوں!"

"یہاں سب بھانڈ ہیں۔ جاؤ" دادا نے اسے بھگانا چاہا

"لیکن حضور اصل اور کم اصل میں فرق ہے۔" بھانڈ کا جواب تھا۔

پرویز یداللہ مہدی

چہ خوب

۱۸

لیکن پتھر کے مجسموں میں خوف کی ہر نہیں دوڑتی کہ وہ بے حس ہوتے ہیں ہر احساس سے عاری اور ہمارا وجود اگرچہ یکسر ساکت و جامد ہو چکا تھا لیکن سانس کی دھونکنی بدستور چل رہی تھی اُدھر سانپ بھی لہراتا، بل کھاتا ہوا آگے کی طرف سرک رہا تھا ہم نے سوچا اس سے پہلے کہ یہ موذی پلنگ کے نیچے پہنچ کر ہمارے نرم گرم بستر کو کانٹوں کی سیج میں تبدیل کرے، اس کا کام تمام کر دینا چاہیئے۔ لیکن اس اقدام کے لیئے کسی مہلک ہتھیار کی ضرورت تھی اور ہتھیار کی تلاش اور دستیابی تک اس موذی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا بلکہ اُسے نظر بند کر دینا اشد ضروری تھا۔ چنانچہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، پیروں کے پاس پڑی ہوئی چادر کو آہستگی سے اُٹھا کر اس طرح نشانہ لے کر اُس پر اتنی بلا کی طرف اُچھالا جیسے مچھیرے سمندر میں اپنا جال پھینکتے ہیں قسمت اچھی تھی جو نشانہ خطا نہیں ہوا۔ سانپ پوری طرح چادر کی زد میں آ گیا۔ ہم نے فوراً لپک کر اپنے جوتے اور دو چار وزنی کتابیں چاروں طرف سے چادر کے کونوں پر اس طرح جما دیں کہ اُس موذی کے چادر کی حد سے نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔

مارگزیدہ اگرچہ کہ چادر میں قید ہو چکا تھا لیکن ہمارے کھڑے رونگٹے پھر بھی نہیں بیٹھے۔ نیند آنکھوں سے اچٹ چکی تھی ذہن اسی گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھا کہ آدھی رات کو ہمارے کمرے میں سانپ کی موجودگی محض اتفاق ہے یا سازش؟ لفظ سازش کے اُجاگر ہوتے ہی تصور میں خان فولادی عرف طوطاہری کی مکروہ شبیہ اُبھری۔ پچھلی شام کلب میں مسز چہ خوب کے ہمراہ اس سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ اگرچہ کہ اس نے زبان سے کچھ زہر نہیں اُگلا تھا لیکن اس کی چنگارتی ہوئی آنکھوں میں قہر و غضب کے شعلے لپلپاتے ہوئے ضرور محسوس کیئے تھے۔ مسز چہ خوب کا بھی اندازہ بتاتا تھا کہ وہ اُس ادنے بھینسے کو خوب سمجھ رہی ہیں۔ فری اسٹائیل مقابلے میں ہمارے ہاتھوں اُسے جو ہزیمت اُٹھانی پڑی تھی اُسے موصوف شاید خان فولادی کی چتر بنانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ بات کے اس سرے کے ہاتھ آتے ہی ہمارا شک یقین میں بدل گیا کہ ہمارے کمرے میں سانپ کی موجودگی دراصل خان فولادی کا ایک اوچھا وار ہے۔ اپنی ہزیمت کے خلاف بدلے کی جانب ایک گھناؤنا اقدام ۔ ۔ ۔ ۔

● کسی کے بُری طرح جھنجھوڑنے پر ہماری آنکھ کھل گئی جو بڑی مشکل سے لگی تھی۔

سامنے ہی شبو کا چہرہ نظر آیا۔ الٰہی خیر محترمہ کے چہرے پر غم و اندوہ کی ایسی کیفیت طاری تھی کہ ہماری نیند یک لخت ہوا ہو گئی۔ "کس کا ماتم ہے خدا خیر کرے:" چہرے کی یہ ماتمی فضا و اسراپات کا اعلان تھی کہ ضرور محترمہ کی کسی چہیتی ہستی نے دارِ فانی کو لبیک کہا ہے۔ ہمارا ہاتھ مشینی انداز میں فوراً اپنے دل کی طرف بڑھا کہ کہیں ہم ہی تو کوچ نہیں فرما گئے۔ لیکن وہاں تو دل اپنی نارمل رفتار سے دھڑک رہا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم وہ چہیتی اور عزیز ہستی نہیں تھے۔ البتہ یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر

شبو کا یہ حسین ماتمی چہرہ کچھ دیر اور اسی طرح چُپ سادھے نظروں کے سامنے رہا تو ہمارے حقیر وجود کی اس "عالم گڑبڑ گھٹالا" سے "عالم بالا" کی طرف منتقلی ناگزیر ہو جائے گی۔

شبو کا یہ نیا ماتمی رُوپ دیکھ کر رات کا سارا "ہنگامہ" ہمارے ذہن کے کینوس سے یوں دُھل گیا جیسے کسی نے اس پر سفیدی پھیر دی ہو۔ اس سے پہلے کہ شبو کی یہ گھمبیر ماتمی خاموشی ہمیں چھاتی کوٹتے ہوئے بین کرنے پر مجبور کر دیتی محترمہ کے سفیدی مائل، منجمد ہونٹوں میں جنبش ہوئی لیکن آواز نہیں نکل سکی۔ اِدھر طرح طرح کے وسوسے ہمارے "شاک زدہ" ذہن میں اُجاگر ہو رہے تھے، کہیں قبلہ حبہ خوب تو "خرچ" نہیں ہو گئے۔ اس تصور کے ساتھ ہی ہم ہڑبڑا اُٹھے اور گڑبڑا کر ایک جھٹکے کے ساتھ بستر چھوڑ دیا اور کھڑے ہو گئے۔ غالباً ہماری اسی گڑبڑاہٹ نے شبو کی گھمبیر "ماتمی خاموشی" کے پردے کو چاک کر دیا۔ تھرتھراتے ہوئے لہجے میں فرمایا ــــ "ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ پھوپھی اماں ....!" شبو کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ ہم نے بے ساختہ مداخلت کی ــــ "کیا کیا پھوپھی اماں، یعنی کہ واقعی پھوپھی اماں، یعنی کہ اتنی اچھی، اتنی پیاری، اتنی موٹی تازی صحت مند تندرست ہنس مکھ، پیاری پیاری بہت ساری باتیں کرنے والی پھوپھی اماں، آٹے کی چکیوں والی پھوپھی اماں ــــ افسوس ــــ اناللہ ــــ"

"نہیں نہیں پھوپھی اماں نہیں ــــ" شبو کی مداخلت نے ہماری بکواس میں بریک لگا دیا۔ ہم نے مزید گڑبڑا کر کہا۔

"پھوپھی اماں نہیں تو پھر کون ــــ"

"پھوپھی اماں کی چہیتی مالا ــــ!" شبو نے بڑے کربناک لہجے میں بات مکمل کی۔

"مالا ــــ" ہم نے ذہن پہ زور دے کر کہا۔ مالا لیکن ــــ وہی مالا جس پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا تھا۔

"جی ہاں اسی آسیب نے اس کی جان لے لی"۔ شبو نے ٹھنڈی سانسوں کے درمیان کہا۔ "سُنا ہے اس کی موت کے صدمے نے پھوپھی اماں کو نیم پاگل کر دیا ہے، رُوتے رُوتے ان کا بُرا حال ہے؛ اس وقت انہیں تسلی و تشفی کی سخت ضرورت ہے"۔ "چلیے" فوراً چلیے" میں ابھی تیار ہوا جاتا ہوں ــ" ہم نے لپک کر ہینگر پر ٹنگے کپڑے سنبھالے اور باتھ روم میں گھس گئے

○ راستہ تمام ہم دونوں خاموش ہی رہے۔ لیکن ذہن میں حسبِ عادت سوچتا رہا۔ جب سے خدا کی اس لبستی میں آئے ہیں ہماری ہستی، طرح طرح کی آزمائشوں کی چکی میں پستی ہی رہی ہے۔ تعزیت کا مرحلہ بھی ہمارے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں۔ اکثر ایسے موقعوں پر ہم نے تنگ آکر یہی سوچا ہے کہ مرحوم کی تعزیت کے سلسلے میں ان کے متعلقین کے روبرو پہنچ کر اس طرح "ذبح" ہونے کے بجائے کاش ہم ہی اس جہانِ فانی سے اُٹھ گئے ہوتے اور مرحوم اپنے متعلقین کے ہمراہ ہمارے متعلقین کے پاس پہنچ کر ہماری تعزیت فرماتے ــــ خدا کی مار اس بار تو تعزیت کا یہ مرحلہ شروع سے آخر تک جنس مخالف سے متعلق تھا۔ یعنی وہی مثال ہوئی کریلا اُوپر سے نیم چڑھا۔ ہم نے سوچا کاش ہم آدمی کا بچہ نہ ہوتے کریلا ہوتے، نیم پر چڑھا ہی سہی، اس طرح کم از کم تعزیت کی پھانسی چڑھنے سے تو بچ جاتے۔ ان اوٹ پٹانگ سوچوں سے بچنے کے لئے ہم نے اُن تمام "تعزیتی واردانوں" کو یادداشت کی ڈور سے کھینچنا شروع کیا جن سے دوچار ہو چکے تھے۔ ایک ایک کر کے ان تعزیتی کلمات کو یاد کرنے لگے جو ایسے موقعوں پر دُہرا کر لوگ اپنی تعزیت کا سکّہ جما دیتے ہیں ایسے موقعوں پہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ پیشہ ور قسم کے "تعزیت بازوں کی صورت پہ پھٹکار برستی ہے: ہونٹ کپکپاتے ہیں

حٗ مالا کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیے قسط ؟

ہیں آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ سر سے پیر تک "تعزیت" کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتے ہیں۔ ہم نے بھی پھوپھی اماں کے گھر پہنچتے پہنچتے کم از کم صورت تو اتنی سوگوار بنالی تھی کہ اس صدمۂ جانکاہ سے اگر راست ہمارا تعلق نہ بھی ظاہر ہوتا تو بالواسطہ تعلق تو بہرحال ظاہر ہوتا ہی تھا۔ اب رہیں شبو تو ان کا سوگوار حسن سادگی میں وہ غضب کی پُرکاری لیے ہوئے تھا کہ قدم قدم پر ہمیں اپنے دل کی "تعزیت" ضروری معلوم ہو رہی تھی۔

• شبو کو دیکھتے ہی پھوپھی اماں کے بھاری بھرکم جسثے میں ایک عجیب ارتعاش سا پیدا ہوا پھر سارا وجود یوں کپکپانے لگا جیسے کوئی عظیم الجثہ عمارت زلزلے کے شدید جھٹکے کی زد میں آ گئی ہو۔ حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکلنے لگیں جیسے بلیاں آپس میں لڑ رہی ہوں۔ اور قبل اس کے کہ ان تمام حرکتوں کی مناسبت سے پھوپھی اماں کی آنکھوں سے آنسو اس طرح اُبلنے لگے جیسے میونسپلٹی کا نلکا پھٹ جانے پر پانی اُبلنے لگتا ہے، شبو نے آگے بڑھ کر موصوفہ کا سر اپنے شانے سے ٹکا دیا۔ جس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ پھوپھی اماں پھپھک پھپھک کر رونے لگیں اور ہم ان تعزیتی الفاظ کا سرا پکڑنے کی کوشش کرنے لگے جنھیں راستہ تمام یادداشت کی نوٹ بک سے کھرچ کھرچ کر ہار کی شکل میں پرو دیا تھا۔ لیکن الفاظ کا سرا تھا کہ پھوپھی اماں کی ہر "ہارس پاور" قسم کی سسکی کی زد میں آ کر ہاتھ سے یوں نکلا جا رہا تھا جیسے مچھلی۔ پھوپھی اماں کی یہ بے تابی یہ آہ و بکا کلیجہ شگاف سسکیاں، اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ موصوفہ نے واقعی اپنے جگر کے ٹکڑے کو کھو دیا ہے۔ جبکہ ہمارے اندازے کے مطابق مرحومہ مالا پھوپھی اماں کی اپنی اولاد نہیں تھی بلکہ شائد لے پالک تھی یا ملازمہ تھی ـــــ لیکن تھی تو بہرحال انسان ہی ـــ اس نکتے پر پہنچ کر ہمیں یوں لگا جیسے مالا کے روپ میں واقعی کوئی بہت بڑی ہستی دنیا سے اُٹھ گئی۔ ہمیں شدت سے اس بات کا قلق ہونے لگا کہ اتنی بڑی ہستی کے دیدار سے ایک ہم ہی ہیں جو محروم رہے۔ پتہ نہیں مرحومہ کا ناک نقشہ کیا تھا، رنگ روپ چال ڈھال کیسی تھی ـــــ تعزیت کا مرحلہ ویسے بھی صبر آزما ہوتا ہے اس پر اگر مرحوم ہستی کو زندگی میں کبھی دیکھا ہی نہ ہو تو یہ مرحلہ اور بھی جان لیوا ہو جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم "تعزیت" کے ماتمی ساز، کا کوئی تار چھیڑتے، پھوپھی اماں کو جیسے ہی ہماری موجودگی کا احساس ہوا۔ شبو کو پرے ہٹا کر ہمارا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر "اڑلاتے" ہوئے لہجے میں واویلا مچایا ـــ" ہائے شہزاد میاں "کیا کہوں کیسے کہوں، کس طرح کہوں کہ میری مالا مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ کیسے کہوں میاں کہ وہ میری کیا تھی، وہ میری سب کچھ تھی، میری بیٹی تھی، میری سہیلی تھی، میری رازدار غمگسار تھی ـــ" اتنا کہہ کر پھوپھی اماں رُک گئیں کیونکہ ان کی سسکیوں کا "راگ مالا" دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔ ذرا نزدیک سے موصوفہ کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی چیخ و پکار، آہ و بکا اور واویلے کے باوجود آنکھوں میں دُور دُور تک آنسو کا ایک قطرہ نہ تھا ـــ شاید اب تک محترمہ اتنا رو چکی تھیں کہ آنسوؤں کا سارا اسٹاک ہی ختم ہو گیا تھا ہم یہ سوچ کر اپنے تئیں مطمئن ہو گئے۔ پھوپھی اماں کی الاپ دوبارہ سنائی دی ـــ" اب تم سے کیا کہوں شہزاد میاں جب میری بچی، میری مالا "میاؤں میاؤں" کہتی ہوئی میری گود میں سر رکھ دیتی ـــ" کیا کیا ـــ کہا؟ ـــ میاؤں ـــ! میاؤں ـــ!" ہم نے گڑبڑا کر مداخلت کی ـــ" میاؤں، میاؤں، یعنی کہ مالا اور میاؤں میاؤں، یعنی کہ بلی ـــ کا ـــ ی ـــ" اُسے بلی مت کہو میاں۔" پھوپھی اماں نے تڑپ کر ہمیں ٹوک دیا ـــ" وہ بلی نہیں تھی، جانور نہیں تھی، بلکہ وہ تو میرے لیے" انسانوں سے بڑھ کر تھی ـــ ـــ ـــ!"

"یقیناً یقیناً ـــ جانوروں میں آج کل انسانوں سے زیادہ وفا کی خوبو پائی جاتی ہے" ہم کسی قدر سنبھل چکے تھے حالانکہ مالا کا بلی ثابت ہونا ایک ایسا شاک تھا جو ہماری حرکتِ قلب بھی بند کر سکتا تھا ـــ تو گویا سارا ہنگامہ یہ سارا واویلا ایک منحوس "بلی" کی موت پر ہو رہا تھا ـــ ہم نے سوچا اچھا ہوا جو بدبخت پہلے ہی مرگئی ورنہ ہم اس منحوس کو پٹک پٹک کر شہید کر دیتے۔ منحوس خود تو سدھار گئی لیکن ہمیں ایک عجیب مخمصے میں پھنسا گئی۔ تعزیت کا یہ مرحلہ اب تو ہمارے لئے اور بھی جان لیوا ہو گیا کیونکہ اب سے پہلے کسی بلی یا کتے کے سانحۂ ارتحال پر پرسہ دینے کی سعادت حاصل نہیں ہوتی تھی ـــ اُدھر پھوپھی اماں ہمیں "تعزیت طلب" نظروں سے دیکھ رہی تھیں، اب منہ سے کچھ نہ کچھ پھوٹنا ضروری تھا۔ چنانچہ شروع ہوگئے "مرحومہ کی اچانک رحلت نے میرے بھی ہوش و حواس معطل کر دیئے۔ اگرچہ کہ مجھ بدنصیب کو مرحومہ کے دیدار سے مشرف ہونے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ لیکن مرحومہ کی بہادری، دلیری اور وفاداری کے قصے بہت سنے ہیں۔ افسوس ایسی شیر صفت ہستی اب ہمارے درمیان نہیں رہی" اب سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں، جس کی چیز تھی اس نے لے لی۔ کسی شاعر نے بھی تو کہا ہے ؎
موت سے کس کو رستگاری ہے ؎ آج وہ کل ہماری باری ہے۔

ہمارے اس تعزیتی آغاز نے رنگ جمانا شروع کر دیا تھا چنانچہ ہم نے مزید رنگوں کی آمیزش کی۔ ـــ "سچ پوچھیئے تو کیا یہ دن تھے مرحومہ کے مرنے کے، ابھی تو کھانے کھیلنے کا زمانہ تھا کس کمسنی میں داغ دے گئیں افسوس، کون سی آرزو پوری ہوتی ہوگی کیا ارمان نکلے ہوں گے بقول چچا غالب ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ؎ بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔

ہمارے اس اندازِ تعزیت میں جانے مزاح کا کون سا پہلو نظر آیا کہ شبو اپنی بے ساختہ ہنسی کو روک نہ سکیں لیکن موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دوپٹے سے اپنا چہرہ اس طرح چھپالیا جیسے چاند کبھی کبھی سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے، اتفاق سے مرحومہ کا دوپٹہ بھی گہرے سیاہ رنگ کا تھا۔ پھوپھی اماں نے شبو کی اس عارضی روپوشی کو غالباً اس بات پر محمول کیا کہ شبو سے ان کی نامعقول بلی کا غم برداشت نہیں ہو سکا اور وہ آنچل میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہیں۔ پھر کیا تھا پھوپھی اماں اپنا غم بھول کر شبو کو تسلی تشفی دینے لگیں۔ ہمیں تو ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے پھوپھی اماں کا غم بٹ جائے گا۔ اس غم کو اور بٹانے کے لئے ہم نے مزید مرچ مسالہ لگا کر آگے کہا ـــ "مرحوم فانی بدایونی سابق صدر مدرس چنچل گوڑہ ہائی اسکول حیدرآباد دکن نے کس قدر خدا لگتی کہی ہے کہ ؎
کیا بھروسہ ہے زندگی کا ؎ آدمی بلبلہ ہے پانی کا

اور مرحومہ جنت مکانی تو پانی کے بلبلے سے بھی کمزور نکلیں ـــ" اُدھر شبو کا ہنسی کے مارے برا حال اور انہیں مناتے دُھارس دیتے ہوئے پھوپھی اماں الگ بے حال، بڑا دلچسپ سماں تھا، شبو نے پھوپھی اماں کی نظر بچا کر ہماری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التماس تھا گذارش تھی کہ اس "تعزیتی کارروائی" کو یہیں ختم کر دیا جائے۔

ان سے اب اور ہنسی برداشت نہیں ہوتی۔ حسین آنکھوں کی ہر گذارش ہم اب تک مانتے آئے تھے اس بار بھی انکار نہیں کر سکے۔ شبو نے ہماری طرف سے مطمئن ہوتے ہی پھوپھی اماں سے گھر چلنے کے لئے اصرار کرنے لگیں اور جواب میں موصوفہ ایسی مسمسی صورتیں بنانے لگیں جو زبانِ حال و ماضی و مستقبل سے کہہ رہی تھیں۔ "گھر میں میت اٹھے دن بھی نہیں گذرا اور تم لوگ گھر چھوڑنے کے لئے کہتے ہو، دنیا کیا کہے گی۔" پھوپھی اماں کو اسی کرب آمیز کیفیت سے نجات لینا تھی کہ اسی دوران ان کی ہم پلہ و ہم غلہ سہیلیاں و بزنس پارٹنرس ہانپتی کانپتی لڑھکتی ہوئی تشریف لائیں۔ سب کی زبان پہ یہی طرحی مصرعہ تھا ـــ "یہ سب کیسے ہوا، کب ہوا۔ کیوں ہوا"

جواب میں پھوپھی اماں نے نہایت ہی افسردگی سے فرمایا۔۔۔ "صبح جب میں حسب معمول مالا کے بستر کے پاس گئی تو وہ موجود نہ تھی، سارے کمرے چھان ڈالے میں نے، نوکروں کو چاروں طرف اس کی تلاش میں دوڑایا، کچھ دیر بعد یہ منحوس خبر ملی کہ مالا عقبی پارک میں سکرات کے عالم میں پڑی ہے، میں دوڑی دوڑی پہنچی، دیکھا تو نزع کا عالم طاری ہو چکا تھا جیسے میری ہی منتظر تھی، نظر بھر کر دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔۔۔۔۔!"

"ہائے کیا کیا آرزوں ارمانوں سے پالا تھا تم نے۔۔۔" کسی نے سسکی آمیز لقمہ دیا

"کیا اسی دن کے لئے کہ ایک روز یوں داغ دے کر چلی جائے۔۔" اور کسی نے پچھلے لقمے میں اپنی چٹنی لگائی۔ اور ہم نے برموقع شعر چسپاں کر دیا۔

"کیا اسی لئے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے ؎ بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے"

ہمارے اس برجستہ شعر نے تو موجودہ ماتمی فضا کو اور بھی ماتمی بنا دیا۔ ایک عدد بھاری بھرکم موصوفہ جن کے چہرے مہرے اور ناک نقشے میں ناک خاصی نمایاں تھی، گمبھیر لہجے میں فرمائیں۔۔۔ "اب افسوس کرنے اور رونے دھونے سے مالا تو واپس نہیں آسکتی آؤ اس کے حق میں ہم سب مل کر دعائے خیر کریں کہ خداوند تعالیٰ اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔۔"

موصوفہ کا دعائیہ کلمہ ختم ہوتے ہی ہم نے اپنی ٹانگ اڑائی۔۔۔ "مرحومہ اگرچہ کہ داعی اجل کو لبیک کہہ چکی ہیں پھر بھی میری گذارش ہے کہ آپ لوگ انہیں مردہ نہ کہیں۔۔ بقول شاعر ؎

انہیں کہتا ہے مردہ کون وہ زندوں کے زندہ ہیں ؎ کہ ان کی نیکیاں باقی کہ ان کی خوبیاں زندہ

میں نے تو سنا ہے کہ مرحومہ اس قدر فرمانبردار، وفاشعار اور نیک صفت تھیں کہ بلیوں کے تعلق سے لوگوں نے اپنی رائے بدل دی تھی، ایسی بلیاں سچ کہتا ہوں بہت کم پائی گئی ہیں، ایک تو سنا ہے کہ ملکہ الزبتھ کی مرحومہ نانی کے ہاں پائی جاتی تھی اور اس کے بارے میں بھی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ بھی نوعمری ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی، اور اب دوسرا کیس ہے مرحومہ کا، معلوم ہوتا ہے ایسی صفات کی حامل بلیاں اللہ میاں کو کچھ زیادہ ہی مرغوب ہوتی ہیں۔۔۔۔۔!"

ہماری بات کے ختم ہوتے ہی ایک عدد موصوفہ نے نہایت ہی رازدارانہ انداز میں پھوپھی اماں سے مرحومہ کے کفن دفن کے تعلق سے پوچھا۔۔۔ جواب میں موصوفہ نے جو کچھ فرمایا اس نے ہمیں ایک عدد ذہنی جھٹکے سے ضرور دوچار کیا۔ پھوپھی اماں نے نوکروں کی فوج کے ہمراہ باضابطہ اس کے کفن دفن کا انتظام کیا، عقبی پارک کے ایک کونے میں قبر کھدوائی جسے ان کا ارادہ بہت جلد پکی کروانے کا ہے۔ ہم نے سوچا پھر تو ہر سال اعلیٰ پیمانے پر اس منحوس بلی کا عرس بھی ہوا کرے گا اس تازہ اطلاع نے ہمارے تجسس کو اس قدر اکسایا، ورغلایا کہ ہم پہلی فرصت میں مرحومہ کی قبر دیکھنے عقبی پارک میں پہنچ گئے۔ لیکن وہاں پہنچ کر ایک اور ذہنی جھٹکے سے سامنا ہوا۔ جوبے دھڑک شکار پورہ کے روپ میں سر پہ رومال باندھے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھائے اس طرح کھڑا تھا جیسے مرحومہ بلی کی قبر پر پڑھ رہا ہو۔۔۔

(باقی۔ باقی)

ممتاز مزاح نگار تخلص بھوپالی کو

ماہنامہ "شگوفہ" کا خراج عقیدت

تخلص بھوپالی نمبر

نومبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوگا

مہمان مدیر : پروفیسر آفاق احمد

قارئین شگوفہ کی خدمت میں

عید کی پُرخلوص مبارکباد
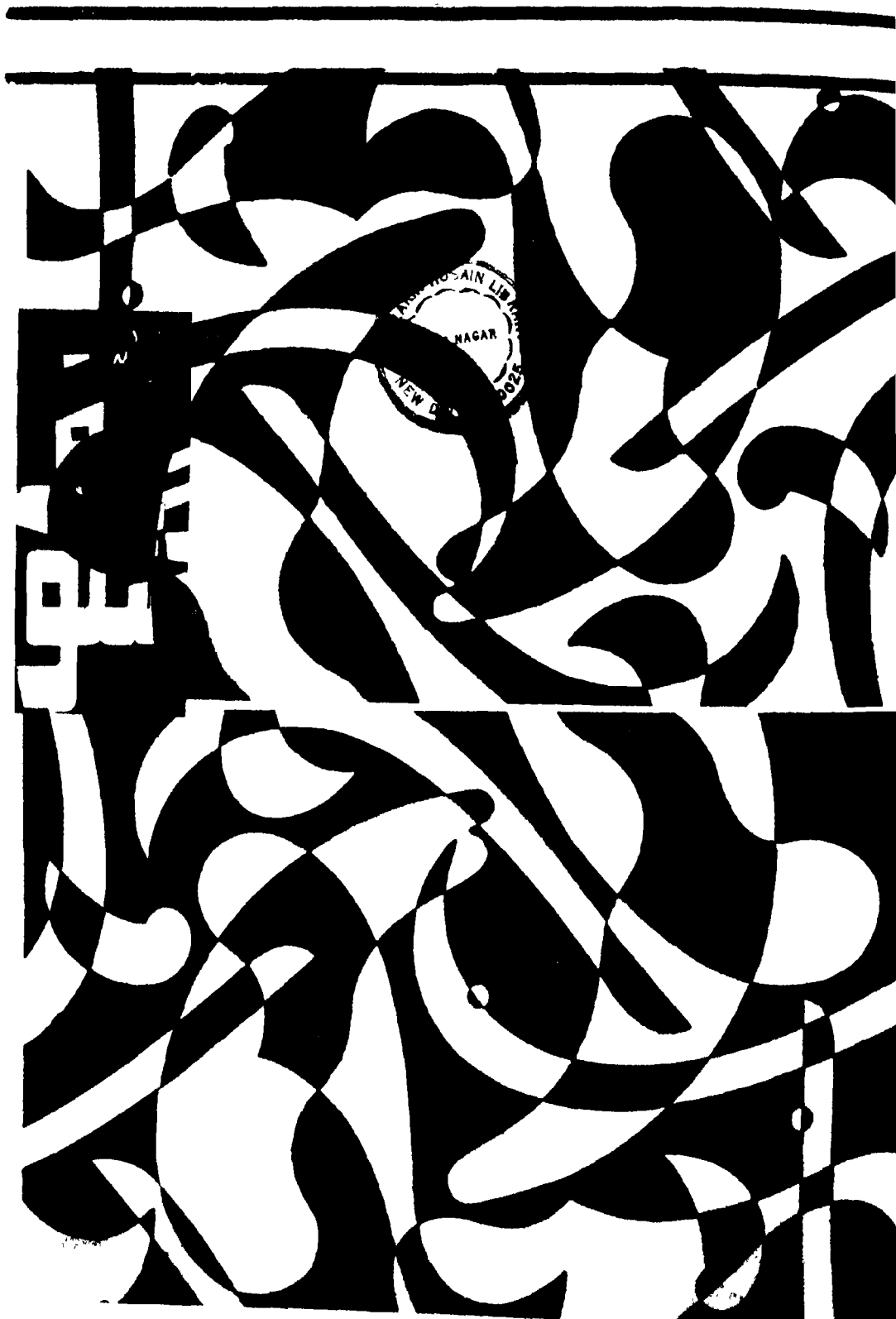
زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان !
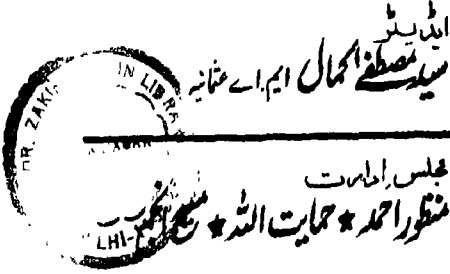
ایڈیٹر
سید مصطفیٰ کمال ایم اے عثمانیہ

مجلس ادارت
منظور احمد * حمایت اللہ * مسیح انجم

مجلس مشاورت
راجندر سنگھ بیدی، بھارت چند کھنہ، خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین

سالانہ ۲۰ روپے
بیرونِ ہند سے ۳۵ شلنگ
فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

جلد ۱۰ * شمارہ ۱۰

جنرل منیجر : ممتاز احمد

طباعت
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۲

بائنڈنگ
محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، روبرو دربار حسینی، پرانی حویلی
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

ماہنامہ

اکتوبر ۱۹۷۷ء

خط و کتابت کا پتہ

شگوفہ
۳۱۔ مجرّد گاہ، معظّم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱۔ ۵۰۰۰۰۱

فون نمبر : 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مشتاق احمد یوسفی

رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر ★

۲ — ڈی سوزا کی قینچی

اس زمانہ میں نہ کوئی ٹریننگ ہوتی تھی نہ لیکچروں کا بکھیڑا۔ نووارد گھس بیٹھ کر خود کچھ سیکھ لے تو سیکھ لے، ورنہ کوئی کچھ بتا کر نہیں دیتا تھا۔ واحد ہدایت یہ تھی کہ ہر بات "آبزرو" کرتے رہو۔ بس دیکھتے چلے جاؤ۔ نئے رنگروٹ پر جگادریوں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جیسے ایک زمانہ میں روم میں حق و ناحق کا فیصلہ بھوکے شیر کیا کرتے تھے جنھیں مسیحیوں پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ شیر ویجی ٹیرین نہ تھے۔ خلقت تالیاں بجا بجا کر حق یعنی شیر کی فتح پر مسرت کا اظہار کرتی تھی۔

بینک اپنے تار اور کیبل خفیہ "کوڈ" میں بھیجتے ہیں۔ فائدہ اس کا یہ کہ جن کو بینک کے ساتھ فراڈ کرنا ہو، انھیں پہلے اس کا کوڈ چرانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ کوڈ اتنی ہی ضخیم ہوتی ہے جتنی عام ڈکشنری۔ ڈی سوزا پچیس سال سے سادہ انگریزی کو "پیٹرسن کوڈ" میں منتقل کرنے اور پھر اس آملیٹ سے انڈہ بنانے پر مامور تھا۔ ساری کوڈ حفظ ہو گئی تھی اور بغیر دیکھے ترجمہ کر لیا کرتا تھا۔ تنہا پانچ آدمیوں کے برابر کام کرتا تھا۔ اسکے ذمے ہمیں اس جناتی زبان میں تار بنانا سکھانا تھا۔ سراقی تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ پندرہ سال پہلے اسے ایک گرائنز ٹائپسٹ سے عشق ہو گیا تھا لیکن وہ ایک ہندو تاجر سے شادی کر کے ہانگ کانگ چلی گئی۔ اس دن سے اس کا یہی حال تھا۔ فرصت کے اوقات میں محبوبہ کے نام "پیٹرسن کوڈ" میں ایکسپرس تار ڈرافٹ کرتا اور پھاڑتا رہتا تھا۔ کوئی قریب جاتا تو تار کو ہاتھ سے ڈھانک کر کہتا کیا تمھاری ماں تمھیں نہیں ہے؟

بڑی بڑی آنکھوں میں، جو ابلی پڑتی تھیں، بے خوابی کے سرخ ڈورے۔ سر آگے سے گول، پیچھے سے چپٹا۔ گندمی (میکسی پاک ورائٹی) رنگ۔ چہرے پر دائمی دحشت۔ رات کو دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتا تھا۔ دفتر آتے ہی اپنا سیاہ کوٹ، جس کا کالر روزانہ استری کرنے سے چلکنے لگا تھا، کرسی پر ٹانک دیتا۔ نظر اتنی کمزور کہ جب تک ہمارا چہرہ اس کی آنکھ کے ڈھیلے سے تین انچ

★ مشتاق احمد یوسفی کی خودنوشت سوانح "زرگزشت" سے

فاصلے پر نہ ہو ہمیں پہچان نہیں پاتا تھا۔ اس فاصلے سے ہمارے سر میں پڑے ہوئے گارڈینیا تیل کی خوشبو سے ہمیں فوراً پہچان لیتا تھا۔ عینک کی قسم تھی۔ صبح ٹھیک ۸ بجے رجسٹر پر سجدہ ریز ہوتا تو چھ بجے سلام پھیرتا تھا۔ کبھی کوئی جھولڑں بھی پھیڑ دیتا تو دفتر میں بھونچال آجاتا۔ مار پٹائی کے بعد وہ بائیں ہاتھ پر کوٹ ڈال کر چیف اکاؤنٹنٹ کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ دائیں ہاتھ سے اپنے سولا ہیٹ کو چھوتا۔ دہرا ہو کر BOW کرتا اور بغیر کچھ کہے سنے دروازے سے گولی کی طرح نکل جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس نے وہیں اُڑ اسی وقت استعفیٰ دے دیا ہے۔ کل سے بینک نہیں آئے گا۔ شام کو دو تین چرب زبان افسر اسے منانے گھر جاتے اور منتیں کرکے دوسرے دن آنے پر رضامند کرتے۔ جون جولائی میں بھی کمبل اوڑھ کر سوتا۔ کہتا تھا کمبل نہ اوڑھوں تو ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ دفتر میں جہاں بیٹھتا وہاں پنکھا نہیں چلنے دیتا تھا۔ کہتا تھا پنکھا چلنے سے مجھے خونی بواسیر ہو جاتی ہے۔ اس سے بینکنگ کے رموز اگلوانا ایسا ہی تھا جیسے کسی خونخوار کتے کے جبڑے میں دبی ہوئی نلی سے گودا نکالنا۔

ڈی سوزا کی صحت قابلِ رشک حد تک اچھی تھی۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہاری تندرستی کا کیا راز ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں کبھی چت نہیں سوتا اور میں نے پچیس سال سے کوئی چھٹی نہیں لی۔ ایک روز وہ اچانک غیر حاضر ہو گیا۔ دوسرے دن اس کے گھر ایک افسر بھیجا تو وہ خبر لایا کہ ڈی سوزا پولیس تھانہ بریڈی اسٹریٹ کی حوالات میں بند، جہازی سائز کی گالیاں بک رہا ہے۔ اس کے باپ کی سمرسٹ اسٹریٹ میں ٹیلرنگ کی بڑی دکان تھی۔ کسی بات پر باپ سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے جہازی سائز کی قینچی اس کے کولہے میں گھونپ دی۔ نو ٹانکے آئے۔

اس واقعے سے بینک میں دہشت پھیل گئی۔ لوگ اس کے دائیں بائیں دو دو کرسیاں چھوڑ کر بیٹھنے لگے۔ ڈسپیچ کلرک نے اپنی قینچی کیش بکس میں مقفل کر دی۔ دوسری قسم کی قینچیاں بھی تالوت لگ گئیں۔ بڑے بڑے افسر کمر پر پیچھے ہاتھ باندھ کر چلنے لگے۔ ڈی سوزا کو پنسل کی نوک بھی تیز کرتے دیکھتے تو لرز اُٹھتے۔ ایک دن چار پانچ کلرک ہماری قیادت میں چیف اکاؤنٹنٹ کے سامنے وفد کی صورت میں پیش ہوئے۔ فریاد کی کہ دو دن سے ڈی سوزا کے سامنے ایک سات انچ پیوست ہونے والا پیپر نائف (کاغذ تراش) پڑا ہے جس سے وہ کھیلتا رہتا ہے۔ ہمیں ٹانکے لگوانے سے ڈر لگتا ہے۔ چیف اکاؤنٹنٹ نے ڈی سوزا کو بلا کر نرمی سے سمجھایا کہ تم چاقو واپس کر دو۔ ان بیچاروں کو ڈر لگتا ہے۔ کہنے لگا یہ سالا لوگ کائے کو ہرٹم مارتا ہے۔ بے فضول ڈرتا پڑا ہے۔ یہ میرے فادر تھوڑا ہی ہیں۔

— ۳ —

عباد الرحمٰن قالب

... ہر شخص کباب پر اٹھا کھا ...
... اور فرنگا اشائل کشتی لڑ ...
... اپنے سارے حسین زنجیر رکھے ...
... کا جواب شہرت دیتا ہوگا۔ الحمدللہ
... کی جیک میں سب سے ہٹ یانقیس تیلو

عبادالرحمٰن قالب کے۔ وہ ہمیشہ لٹھر کی شیروانی پہنتے اور اس کی اوپر کی جیب میں، فاؤنٹن پن کی طرح، مسواک لگاتے، جس کا فعال سرا باہر نکلا ہوتا تھا۔ نچلی جیب میں بیاض اور ساتھ ہی پان کی ڈبیا۔ ڈبیا میں پانوں کے اوپر چنبیلی کے تین پھول۔ انھوں نے ہمیں کروڑپتیوں کے کرنٹ اکاؤنٹ کی جھلکیاں دکھائیں۔ ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ کوّے کی طرح کالا "کریڈٹ بیلنس" کس طرح دھیرے دھیرے سرمئی ہوتا ہے اور پھر لال بھبھوکا ہو جاتا ہے۔ سنتے تھے سیونگ ڈپازٹ سے بڑے بڑے اوور ڈرافٹ بنتے ہیں اور ان سے بڑے بڑے کارخانے، جو انہی سیونگ ڈپازٹ رکھنے والوں کو نوکر رکھ لیتے ہیں۔

عبادالرحمٰن قالب اخبار بڑی توجہ سے پڑھتے تھے۔ جہاں کہیں بری خبر نظر آ جائے، ٹانک لیتے۔ اکثر فرماتے "دیکھا آخر میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ دن بھر بیٹھے اخبار کی جوئیں بینتے رہتے۔ شام تک ــــــ خدشہ خدشہ بہم شود خطرہ۔ کبھی کسی اچھی خبر پر نظر پڑ جائے تو دوسرے دن تک طبیعت منغض رہتی۔ ایک دن بہت ہی خبرناک صورت بنائے بیٹھے تھے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ آہ سرد کے بعد فرمایا: "میرے ریٹائرمنٹ میں کل ۲۲ سال باقی رہ گئے ہیں۔ کچا ساتھ ہے۔" اس زمانہ میں بینک کا بیشتر عملہ گجراتی بولتا تھا۔ اہم عہدوں پر گجراتی بولنے والے حضرات فائز تھے جن کا اردو بولنے والوں کے بارے میں غالباً یہ خیال تھا کہ انھوں نے شعر و شاعری کے لئے نہایت موزوں طبیعت پائی ہے لیکن "کیش" (نقد) اور ان کے ذہن رسا کے درمیان ایک محتاط فاصلہ ضروری ہے۔ عبادالرحمٰن قالب اس پر بہت کڑھتے تھے۔ شعر و شاعری کے بہتان کی تردید میں وہ ایک طویل مسدس "مکالمۂ جبرئیل و ابلیس" لکھ رہے تھے، جس کا مرکزی خیال دانتے کے جہنم اور مرکزی کردار بینک سے لئے گئے تھے۔ اس نظم میں فرشتے فارسی میں، آدم اردو میں اور حوّا ریختی میں گفتگو کرتے تھے۔ داروغۂ جہنم ہم سے گجراتی میں خطاب کرتا تھا۔ تاریخ گوئی میں البتہ اپنی نظیر آپ تھے۔ معمولی سے معمولی واقعہ اور تازہ سے تازہ واردات میں سے سارا تاریخی مادہ و مراد کھینچ کر نکال لیتے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ قالب صاحب کے والد مرحوم بھی شاعر تھے اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں گردانتے تھے۔ چنانچہ مرتے وقت بھی اپنا ہی ایک مقطع زبان پر جاری تھا۔ قالب تخلص کرنے کی بادی النظر میں تو یہی وجہ معلوم ہوتی تھی کہ غالب کے مقطعوں میں بغیر رندا مارے یا پچّر ٹھونکے فٹ ہو جاتا تھا۔ بینک میں شعر و ادب کا معیار معلوم؟ غالب کے شعر اپنے بتا کر سخن ناشناسوں سے داد لیتے تھے۔ مجیب صاحب بھی اکثر یہی کرتے تھے۔ ایک دن قالب صاحب نے اپنا ایک ایسا شعر سنایا جو ایک ہفتہ پہلے مجیب صاحب ایک صدی قبل غالب اپنا کہہ کر سنا چکے تھے۔ ہم نے تخلیہ میں توجہ دلائی تو قالب صاحب نے کمالِ کشادہ پیشانی سے زاف کر لیا کہ سرقہ میں توارد ہو گیا ہے۔

وہ نیم کہاں سے لائیں؟

[illegible] قالب بلند شہری، ثم ٹونکی، ٹونک کی میونسپل کمیٹی میں منصدی تھے۔ مشاہرہ ۳۰ روپے جو زرشاہی کہ جس [illegible] تھے۔ مگر یہ نشہ کیا کم تھا کہ چار دانگ ٹونک میں کوئی کتا ان کی منشا کے بغیر بھونک نہیں سکتا تھا۔ [illegible] بغیر غلط جگہ گر سکتا تھا۔ اپنی متروکہ حویلی سے زیادہ اس شفیق نیم کو یاد کرتے تھے جسے آنگن میں سر [illegible] تھے۔ مکان کے عوض مجھے مکان الاٹ ہو گیا لیکن حکومت وہ نیم کہاں سے لائے گی جس [illegible] جھلاتی تھیں۔ جس کے نیچے ایک بچے نے نبولیوں سے آم کی دکان لگائی تھی۔ جہاں [illegible] [illegible] باپ کا جنازہ رکھا گیا۔ پھر اسی بڑھے نیم کی سینک سر گرا مالی نے کانوں میں [illegible] جب یہ خبر سنی کہ کشمیر کی تاریخی مسجد میں آگ لگ گئی ہے تو اس نے کہا مسجد تو دوبارہ تعمیر ہو جائے گی

لیکن صحنِ مسجد کے چنار جل گئے تو ایک ہزار عالمگیر مل کر بھی ایک بوڑھا چنار پیدا نہیں کر سکتے۔

اب انھیں کون بتاتا کہ یادوں کے ایسے بوڑھے نیم تو ہر گاؤں' ہر دل کے آنگن میں سایہ فگن ہوتے ہیں۔ ہاں جب دل کی آگ بجھ جائے تو ان کی جڑیں شریانوں کی جگہ لے لیتی ہیں۔

کیا وہ بھی ٹُنکن شے کا ہے؟

جب تک۔ ٹونک میں رہے اپنے مولد و آبائی مسکن ٹُنکن شے (بلند شہر کا وہ اسی طرح تلفظ فرماتے تھے) کے گُن گاتے رہے۔ کراچی کو اپنا دارالقرار بنانے کے بعد بھی ان گلیوں سے نہیں نکلے جہاں جوانی کھوئی تھی۔ کہیں کسی بھلے آدمی کی تعریف ہو رہی ہو تو فوراً پوچھتے:

"کیا وہ بھی ٹُنکن شے کا ہے؟"

کبھی کوئی لاہور کے موتیا، چناب روپ' یا کراچی کی سہانی سلونی شام کی تعریف کر دے تو مقابلہ پر فوراً صبحِ بنارس' بدایوں کے پیڑے، ٹونک کے خربوزوں اور وہیں کی برقع پوش پٹھانیوں کو کھڑا کر دیتے۔ دریائے بناس کے کنارے کنارے گلو دگھاٹ کی ان مہکتی فالیزوں کو یاد کرتے، جہاں چاندنی راتوں میں لونگ کے لشکارے سے لہو میں شرارے ناچنے لگتے تھے۔ چوڑیوں کے سامنے دف اور دائرے پر وحشت بھرے "چار بیت" گاتے گاتے ذرا سی بات پر پنڈاری خانزادوں اور قائم خانی پٹھانوں کے سان چڑھے خنجر اور مرصع بیش قبض لہرانے لگتے۔ ارمان بھرے سینے ان کے نیام بن جاتے اور خون میں نہائے ہوئے جسم اسی بالو پہ تڑپ تڑپ کے ٹھنڈے ہوتے جہاں کیوڑے میں بسی ہوئی سرخ صافی سے ڈھکی ہوئی' پانی کی قدِ آدم گول[*] ٹھنڈی ہونے کے لئے دریائی ریتہ میں گلے گلے تک گڑی ہوتی تھی۔ بناس کی موجیں روز یہی منظر دیکھتی تھیں۔ پچھلے پہر تک جوا سے کی باڑھ، بیلے کے گجروں، تازہ خون' لو میں پکے ہوئے خربوزوں' خس کی پنکھیا' مہندی رچے ہاتھوں کی نمی، سوندھے چھڑکاؤ' کوری ٹھلیا اور کورے بنڈے کی مہکار سے ہوائیں دیوانی ہو جاتیں۔ اور رات چاند کا جھومر اتار دیتی۔

ہر شاخ پہ پنچھی بیٹھا ہے

اور دریائے بناس بہتا رہتا اور وہ لہروں لہروں "ٹُنکن شے" پہنچ جاتے۔ کہاں ٹُنکن شے کہاں کراچی۔ ٹُنکن شے کی کیا بات ہے ؎

اک تیر تو نے مارا جگر میں کہ ہائے ہائے!

"اوپر کوٹ پہ برسات کی بہاریں کیا کہنے! رم جھم رم جھم مینہ برس رہا ہے۔ ندی نالے اور پانچے چڑھے ہوئے ہیں۔ سنگی گھمگی حالیت میں کوئی پالی پہ ریپٹ رہی ہے' کوئی ڈال پہ ریپٹ رہی

---

[*] گول: پانی یا اناج رکھنے کے بڑے بڑے مٹکے۔ راجستھان میں اونچی لمبی تری گھڑوں میں اودے بدر قرار ادانی سورج دنشی راجپوت سردار توز انڈہ بھی گور زندہ گاڑ دیتے تھے۔

ہے★ کچی کچی امبیا پہ روم جھوم پانی برس رہا ہے۔ کوئل کوک رہی ہے۔ دل میں اک ہوک سی اٹھ رہی ہے۔ امبوا کی ڈالی پہ جھولا پڑا ہوا ہے۔ بہو بیٹیاں ٹھمر لچکا لچکا کے گا رہی ہیں، چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے۔ سہیلیاں جھونٹے دے رہی ہیں۔ کاسنی دوپٹے ہوا میں اڑتے جا رہے ہیں۔ حرام کے جنے لمڈے دن کو حریان کر رہے ہیں۔ بلبلیں چہچہا رہی ہیں۔ مینائیں چہک رہی ہیں۔ دوسری ڈال پر مور بول رہا ہے، جس کی جڑواں الگ ایک ٹہنے پہ مستا رہی ہیں۔ تیسری ڈال پہ شاما ایسا جی توڑ کے گا رہی ہے، بانو جی جان سے گزر جائے گی۔ چوتھی پہ، کیا نام جس کا، پاپی پپیا پی او پی او کر رہا ہے۔"

"پی او، پی او" یہ خان سیف الملوک خان کے صبر کا پیمانہ ایک دن لبریز ہو گیا، وہی لہجہ بنا کر بولے۔

"اماں بس کر د۔ سالا آم کا پیڑ نہ ہوا، شہر کراچی ہو گیا کہ دنیا جہان کا جنا ور اپنی اپنی بولی بولے جا رہا ہے اور خدا کی قسم اڑنے کا نام نہیں لے رہا!"

پھٹکر آدمی؟

ہر بنک کا ایک اپنا محکمہ تفتیش و سراغ رسانی ہوتا ہے، جس کا کام کم و بیش وہی ہوتا ہے جو اگلے وقتوں میں شادی بیاہ کے موقع پر نائنوں اور مغلانیوں کا ہوتا تھا۔ یعنی چال چلن وغیرہ کی پوری طرح چھان بین کر کے غلط فیصلہ کرنا۔۔۔۔۔ طرفین کی کون سی پشت میں فی ہے؟ دولہا کی بائیں آنکھ دبی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ معمولی لقوہ ہے یا چال چلن کی مستقل خرابی؟ دلہن کی ننھیال برقع سے باہر کب نکلی؟ نئی کوٹھی کی نیو میں سیمنٹ، سریا، بجری اور بلیک کا تناسب معمول کے مطابق ہے یا کمی بیشی کی ہے؟ اگر مقروض نہیں ہے تو وجہ بتاؤ۔ کیا لوگ بھروسہ نہیں کرتے؟ خاندان خالص ہے یا جد امجد پاندان اٹھاتے تھے؟ آدمی ایماندار، شریف اور سو فیصد قابل بھروسہ ہے یا نہیں؟ مطلب یہ کہ محکمہ انکم ٹیکس کے علاوہ کسی اور کو دھوکا تو نہیں دیتا؟ اچانک روئی کی قیمت گرنے سے اس کی روئی آگ تو نہیں پکڑ لی؟ ہارٹ اٹیک نہ ہونے کا کہیں یہ سبب تو نہیں کہ نفع نقصان کا حساب ہی نہیں کرتا؟ دفتر سے سیدھا جم خانہ جاتا ہے یا گھر گھستا ہے؟ کون سے دوالہ کے بعد نام سے پہلے حاجی لکھنا شروع کیا؟ یہ سارا محکمہ حسن احمد فاروقی کی تنہا ذات پر مشتمل تھا کہ وہ خود اپنے باس تھے اور خود ہی ماتحت۔ ہم نے ان کی شاگردی اختیار کی تو کہنے لگے برخوردار! جس تندہی اور بے جگری سے تم کام کر رہے ہو اس پر تو ناکام اقدام خودکشی کا گمان ہوتا ہے۔ خودکشی کی اور بھی ترکیبیں ہیں جن میں اتنی محنت نہیں پڑتی۔ ہمیں وہ باتونی، بے فکرے، آسانی سے گھل مل جانے والے پھٹکر آدمی لگے۔ سنیچر کی سہ پہر کو شطرنج کھیلنے بیٹھتے تو اتوار کی رات کو دبکے اٹھتے۔ پان کی لت ایسی کہ رات کو بھی کلے میں دبا کر سوتے۔ دلی کے روڑے تھے۔ انھیں ہمارے ذہن کی اصلاح سے زیادہ زبان کی فکر کھائے جاتی تھی۔ ہر ایک کے لہجہ، چال اور MANNERISM کی بڑی اچھی نقل اتارتے تھے۔ کوئی لکھنؤ جاتا تو اس سے اصغر علی محمد علی کے عطر شمامۃ العنبر کی فرمائش ضرور کرتے۔ بیگم کو بہت پسند تھا۔

★ ہم نے بہت ضبط و اختصار سے کام لیا ہے ورنہ وہ تو اپنے پھسلنے حافظہ پر گھنٹوں پٹخنیاں کھلواتے رہتے تھے۔ اور اس وقت تک دم نہیں لیتے تھے جب تک سراپا کی تمام تفصیلات بتا کر فارغ التفصیل نہ ہو جائیں۔

بانس بُدّھی

ہمارے سامنے کی بات ہے، ایک عامتہ الورود واقعہ ـــــ موت ـــــ نے فاروقی صاحب کی ساری زندگی یکلخت منقلب کر دی۔ ان کے ایک ساتھی اور ہم عمر کو ان کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے اچانک سینہ میں درد محسوس ہوا، دیکھتے دیکھتے ان کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ اسے دفنا کر لوٹے تو شطرنج کا دوسرا کھلاڑی بھی مر چکا تھا۔ فراق گورکھپوری کہتے ہیں کہ بُدّھی (عقل) کی تین قسمیں ہوتی ہیں: گھڑا بدّھی، نمدہ بدّھی، بانس بدھی۔ گھڑا بدھی وہ کہ چکنے گھڑے پر کتنا ہی پانی ڈالو، وہی سوکھے کا سوکھا۔ نمدہ بدھی ـــــ نمدے کی سمان کہ جب تک سوئی نمدے کے اندر ہے، سوراخ قائم ہے، سوئی نکلی اور گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ اور سب سے اتم بدّھی، بانس بدھی کہ اوپر ایک ذرا چوٹ لگی اور بانس نیچے تک چرتا چلا گیا۔ سو ان کی چھاتی شق ہو چکی تھی۔

عیّاشی سے توبہ

کئی دن گم صم رہے۔ پھر ایک دن سنا کہ سہون شریف کے ایک بزرگ سے بیعت ہو گئے ہیں۔ پھر اس کے بعد بلیڈ کو رخسار سے نہ لگنے دیا۔ بڑی بھرواں داڑھی نکلی۔ ایسی ہی ڈاڑھی کو دیکھ کر ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے کہا تھا کہ حضرت آپ تو میدان حشر کے بھڑ بھڑکے میں اپنی ڈاڑھی کے چھپر تلے چھپ جائیں گے۔ میں خدا کو اپنا ننگا منہ کیسے دکھاؤں گا۔ پیر و مرشد کبھی کراچی تشریف لاتے تو جمعہ اور اتوار کو عصر اور مغرب کے درمیان منگھو پیر کی طرف سفید گھوڑی پر سیر کو نکلتے۔ یہ رکاب تھامے ساتھ ساتھ چلتے۔ انھیں سے مروی ہے کہ حضرت جتنی دیر گھوڑی پر سوار رہتے ہیں، لید میں شمامتہ العنبر کی خوشبو آتی ہے۔ حجرے میں تہجد سے پہلے ببر شیر اپنی دُم سے جھاڑو دیتا ہے۔

ہم نے ٹوکا "شیر ببر تو افریقہ کے جنگلوں میں ہوتا ہے"

فرمایا "یہ میں نے کب کہا کہ وہ منگھو پیر کی جھاڑیوں میں سے آتا ہے؟ اپنی طرف سے آپ بات خوب جوڑتے ہیں"

ہمیں بھی نیک رہنے اور باز آنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ہمیں بڑا قلق تھا کہ خدا نے ہمیں بدی کی استطاعت دی ہوتی تو آج ہم بھی اس سے توبہ کر کے ثواب لوٹتے۔ ابھی تک یاد ہے۔ جاڑوں کے دن تھے کے بارہ بجا چاہتے تھے۔ ہم مع اپنے چار بچوں اور بیوی کے پیر الٰہی بخش کالونی کے کوارٹر کے چھوٹے سے کمرے میں فرشی دیا سلائیوں کی طرح ایک طرف سُرکئے پڑے تھے کہ کسی نے گھر کے سامنے حیدرآبادی انداز میں تالی بجائی★۔ آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکلے تو دیکھا کہ فاروقی صاحب سر پر روئی کا ٹوپا پہنے، ہاتھ میں لالٹین لئے کھڑے ہیں۔ ان کے دانت کٹکٹانے بج رہے تھے۔ گھبراہٹ میں ہم بھی ململ کا پھٹا کرتا پہنے، ننگے پیر بستر سے نکل آئے تھے۔ بہتیرا ہاتھ سے جبڑے

★ حیدرآباد دکن میں شرفا کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر آواز دے کر بلانا خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ تالی بجاتے ہیں۔

لیکن واقف تھے کہ اس آلے کی طرح کٹ کٹ کٹا کٹ "مارس کوڈ" میں بجے چلے جا رہے تھے جو ٹیلی گراف آفس میں تار دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سادہ زبان میں سلام وکلام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دیر تک دونوں آمنے سامنے کھڑے بصد خلوص کلکلاتے رہے۔ ہمارے تصرف میں ایک ہی کمرہ تھا اس لئے ہم انھیں اندر آنے کو بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ خود بھی خاصی عجلت میں تھے۔ انھوں نے بکمالِ شفقت ہمیں اپنی ڈاڑھی سے لگایا۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑی دیر تک چمٹے رہے۔ اس میں خلوص کی شدت سے زیادہ جاڑے کی شدت کو دخل تھا۔ وہ اپنی شلوار اور ہم اپنے پاجامے میں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ بار بار معانقہ اور مسلسل معانقہ کی گرمائی سے الفاظ پگھلے تو انھوں نے چھوٹتے ہی ہمیں شراب اور زنا سے پرہیز کرنے کی تلقین کی۔ ہم نے ننگے پیر، پھٹے کرتے کے نیچے دھڑکتے دل پر ٹھٹھرا ہوا ہاتھ رکھ کر رئیسانہ طرزِ زندگی اور عیاشی سے اجتناب اور پرہیزی زندگی گزارنے کا وعدہ کیا اور عرض پرداز ہوئے کہ حضرت! آپ نے رات گئے بڑی زحمت فرمائی۔ جواب میں انھوں نے (اپنے یخ ہاتھ کو، دونوں طرف سے ہماری گدی پر اس طرح گرم کرتے ہوئے جس طرح نائی اُسترے کو چمڑے پر چلاتا ہے) فرمایا کہ انھوں نے اپنے پیر صاحب قبلہ کے سامنے مترجم قرآن اٹھا کر عہد کیا ہے کہ روزانہ کم از کم سات آدمیوں کو شراب اور زنا سے باز رہنے کی تلقین کریں گے۔ عشاء کے بعد وہ اپنی "رونڈ" پر نکلے ہوئے تھے۔ آج کی رات ہم چوتھے آدمی تھے۔ مگر ان کی لالٹین میں ابھی کافی تیل باقی تھا اور بتی خاصی لمبی تھی۔

وقتِ رخصت سکوت کیا اور فرمایا کہ ہمارے شیخ کا قول ہے کہ جاڑے اور بڑھاپے کو جتنا زیادہ محسوس کرو اتنا ہی لگتا چلا جاتا ہے۔ پیر صاحب کا سن شریف ۱۰۵ سال تھا۔ چالیس حج کر آئے تھے۔ بال کالے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

وہ پوپھٹی وہ کرن سے کرن میں آگ لگی

سادہ دل کثیر العیال آدمی تھے۔ اس مرحلہ پر فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان کے ہاں تنگدستی پہلے آئی یا اولاد۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے ہمیں اپنے گھر لے جاتے جو برنس روڈ کے گنجان علاقہ میں ادیب سہارنپوری کے فلیٹ کے قریب تھا۔ راستے میں ادیب کو ساتھ لیتے۔ چائے، شاعری اور اسکینڈل کا دور چلتا۔ اس کے بعد تینوں کباب کھانے نکل جاتے ادیب کی عمر اس وقت چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہتے تھے اور بھاوج سے اس قدر خوفزدہ کہ کبھی اپنے فلیٹ میں گندے لطیفے اور اپنا کلام نہیں سناتے تھے۔ اور نہ وہاں بیگم ...... کے قصے سناتے۔ وہ ان کا کلام انہی کے ترنم میں اس طرح پڑھتیں کہ جب خود ادیب یہی غزل پڑھتے تو اصل پر نقل کا گمان ہوتا۔ آنکھیں بند کرکے لہک کر پڑھتے تھے۔ بعض حسینوں کے بال گھنگریالے ہوتے ہیں ادیب کی آواز گھنگریالی تھی۔ رسیلی اور پُر امید تان میں نہ جانے درد کی گونج کہاں سے آتی تھی۔ جیسے ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئیں اور چہرہ ہنستا رہ جائے۔ یہ مسکراہٹ

وہ پو پھٹی، وہ کرن سے کرن میں آگ لگی

کے لہرے کے ساتھ ابھرتی اور "اے مری عمرِ رواں! اور ذرا آہستہ!" اور ذرا آہستہ! اور ذرا آہستہ میں گم ہو جاتی۔

ادیب بڑے میٹھے اور ملائم لہجہ میں بات کرتے۔ نجی محفلوں میں دیکھا کہ لطیفہ کے پہلے فقرہ پر اپنی نشست چھوڑ کر لطیفہ گو کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر، اس طرح داد دینے کو آتے جیسے ریس میں پستول چلنے سے پہلے ہی بعض بے صبرے دوڑ پڑتے

ہیں اور واپس بُلائے جاتے ہیں۔ پھر سب کے ساتھ اسی جوش و خروش کے ساتھ دوڑتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک مدّاح نے جوشِ عقیدت میں ادیب کی غزل کو ایک دوسرے شاعر کی اسی زمین میں کہی ہوئی غزل سے بہتر قرار دیا۔ اس شاعر کا ادیب بہت احترام کرتے تھے۔ کہنے لگے یہ سب انہی کا فیضان ہے۔ پھر انھوں نے حضرت جگرؔ مرادآبادی کا قصہ سنایا کہ انھوں نے اپنے بھتیجے کو متبنّیٰ کر لیا تھا۔ ایک دن وہ ان کے کاندھے پر بیٹھ کر کہنے لگا کہ ابّا! میں آپ سے بڑا ہوں۔ جگرؔ صاحب نے کہا بیٹا! تم ٹھیک کہتے ہو، تمہاری اس بڑائی میں میرے جسم کی لمبائی بھی شامل ہے۔

ٹاٹ کا ایک تھیلا، جس میں بیاض، عینک، تین چار کتابیں اور رسالے، قلم، ڈائری اور چھوٹا سا کٹوردان، بالعموم ہاتھ میں رہتا۔ بغلگیر ہونے سے پہلے اسے اپنی اور فریقِ ثانی کی ٹانگوں کے درمیان رکھ دیتے۔ بحریہ کی ایک لائبریری میں ملازم تھے۔ تنخواہ قلیل، چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ، جن کے یہ باپ بھی تھے اور ماں بھی۔ بیوی کے انتقال کو کئی برس گزر چکے تھے۔ کبھی کوئی دوسری شادی کا مشورہ دیتا تو ہنس کر کہتے کہ بجلی ایک ہی جگہ دوبارہ نہیں گرا کرتی۔ کبھی انھیں دل گرفتہ و مغموم نہ پایا۔ شام کو کسی نہ کسی کے ساتھ SNAKES AND LADDER کھیلتے اور اپنی ہار پر قہقہے لگاتے ہی دیکھا۔ لوٹتے ہی ہمارے ساتھ ہو لیتے۔ ساتھی سانپ بیٹھا رہ جاتا۔ بارہ تیرہ سال کے عرصہ میں صرف ایک موقع ایسا آیا جب ادیب نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ اتوار کی سہ پہر کو ہم پہنچے تو کہنے لگے کہ جناب آج بندہ شعر سنائے گا نہ کباب کھائے گا۔ مجھے اشد ضروری کام ہے۔ ادیب نے جو اپنی دلداری و دلنوازی کے لئے مشہور تھے، ایسا کورا جواب ہمیں ہی کیا، کسی کو نہ دیا ہوگا۔ کریدا تو معلوم ہوا کہ ہندوستان سے ایک فٹ بال ٹیم میچ کھیلنے آئی ہوئی ہے۔ اس میں ایک سکھ کھلاڑی بھی ہے۔ "یوسفی بھائی! مجھے فٹ بال سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مگر خدا کی قسم! سات سال سے کوئی زندہ لطیفہ نہیں دیکھا۔"

دَف کیسے مارا جاتا ہے؟

گرم چائے، تازہ غزل اور تیز چونے کے پان سے تواضع کے بعد فاروقی صاحب دلّی کے کبابیے کی دوکان پر لے جاتے اور گولے کے کباب کھلاتے، پیٹ بھرنے سے پہلے آنکھیں بھر آتیں۔ جب پہلی دفعہ دوکان پر لے گئے تو دلّی کے کلچر اور قیمہ کی باریکیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کباب کھانے کے ادب آداب اتنی تفصیل سے بتائے کہ ہم جیسے مارواڑی رانگڑ کی بھی سمجھ میں آگیا کہ سلطنت ہاتھ سے کیسے نکلی۔ دلّی کے کبابوں کا کیا کہنا۔ بالکل وہی تیزابی مصالحے جو بہادر شاہ ظفرؔ کے زمانے میں تھے۔ وہی شاہی رکابداروں کی ترکیبیں سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں۔ اور وہی امراض بھی معدہ بہ معدہ۔ حالانکہ اب نہ وہ تکّڑی راسیں رہیں نہ وہ قدردان کچری اور پپیتے کی ایسی لگاوٹ لگاتے ہیں کہ موٹے سے موٹا گوشت پل بھر میں سرمہ ہو جائے۔ بقول شخصے مت بجا دیکھے یہ مصالحہ لگادیں تو وہیں کھڑا کھڑا اگل کے قیمہ کا ڈھیر بن جائے۔ یوں تو دنیا میں غیبت سے زیادہ زود ہضم کوئی چیز نہیں۔ لیکن یہ کباب بھی حلق سے اترتے ہی جزوِ بدن ہو جاتے ہیں۔ انھیں سے معلوم ہوا کہ گولے کے کباب میں ایک حصہ قیمہ، ایک حصہ مرچیں اور ایک حصہ دھاگے* پڑتے ہیں۔ سیخ سے اتار کے کڑکڑاتے گھی کا بگھار

---

* دھاگے: کباب پر بہ کثرت لپیٹے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ دلّی میں دھاگے اور سوت کے گولے کے کارخانے انھیں حضرات کے تھے جو گولے کے کبابوں کے رسیا تھے۔

دیتے ہیں۔

"سیخ کباب میں بگھار؟ یہ کس خوشی میں؟" ہم نے پوچھا۔

"اس سے مرچوں کا دَف مرجاتا ہے۔ ساتھ بھرت کی سبک سی کٹوری میں گرم مصالحہ رکھ دیتے ہیں۔ پھر کبابوں ن بکری کا بھیجا اور المٹر بچھڑے کی نلیوں کا گودا علٰحدہ سے ڈالتے ہیں۔"

"یہ کیوں؟"

"اس سے گرم مصالحہ اور جالفل جاوتری کا دَف مرجاتا ہے۔ پھر بڑی پیاز کے لچھے اور ادرک کی ہوا بُساں دران پر ہری مرچیں کتر کے ڈالتے ہیں۔ یہ میسّر نہ ہوں تو محض سی سی کرنے سے بھی لذّت بڑھتی ہے۔ خمیری نان کے ساتھ ماتے وقت برف کا پانی خوب پینا چاہئے۔"

"کیوں؟"

"برف سے خمیری روٹی اور ہری مرچوں کا دَف مرتا ہے۔ مصلح ہے۔ بعض نفاست پسند تو کبابوں پر تتیا رچ کی چٹنی چھڑک کر کھاتے ہیں۔ پھر حسبِ حیثیت دہی بڑے یا قلفی فالودے کی ڈاٹ لگاتے ہیں۔"

"کیوں؟"

اس سے چٹنی کا دف مرتا ہے۔"

"اگر یہ سارے چونچلے فقط کسی نہ کسی کا دف مارنے کے لئے ہیں تو چٹوروں کی سمجھ میں اتنی سی بات کیوں نہیں آتی کہ یکے بعد دیگرے دَف مارنے کے بجائے، شروع میں ہی کم مرچیں ڈالیں یا پھر زبان پر ربر کا دستانہ بڑھا کر کھائیں۔"

ادیب سہارن پوری نے (جو پیدائش وتوطّن ہی نہیں، طبیعت کے لحاظ سے بھی دلّی اور پنجاب کی سرحد پر واقع ہوئے تھے) اس مرحلہ پر شعر کا سفید پرچم لہرا کر جنگ بندی کرائی۔ ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے نضرت! دنیا میں ہر بات منطق کے مطابق ہونے لگے تو خدا کی قسم زندگی اجیرن ہو جائے۔ اسی بات پر ایک الم کا شعر سنیے:

سپردِ خاک ہی کرنا تھا مجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں؟

بعد ازاں اسی نکتۂ راز کو پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے نے اپنے بقراطی انداز میں یوں ذہن نشین رایا کہ جوانی کا دَف بیوی سے مارا جاتا ہے۔ بیوی کا دف اولاد سے مارتے ہیں اور اولاد کا سائنسی تعلیم سے۔ سائنسی علیم کا دف اپنے ہاں دینیات سے مارا جاتا ہے۔ ارے صاحب دف کا مرنا کھیل نہیں ہے، مرتے مرتے مرتا ہے۔

فاروقی صاحب ان لوگوں میں نہیں تھے جو دسترخوان کی بجائے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ انھیں کھانے سے زیادہ کھلانے میں مزا آتا تھا۔ ہر لقمے کے ساتھ دہلوی دسترخوان کی نزاکتیں بھی ذہن نشین کراتے جاتے۔ ایک دن کہنے لگے کہ دلّی میں جو شخص شیرمال اور تافتان میں فرق نہ کر سکے اسے کلچرڈ نہیں سمجھتے۔

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔" ہم نے کہا
"بتائیے کیا فرق ہوتا ہے؟"
"ایک زیادہ بدمزہ ہوتا ہے۔"

اجرک

بیعت کے بعد فاروقی صاحب نے اپنے شیخ کے ایما پر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عارفانہ کلام سے کسب فیض کی خاطر سندھی سیکھنی شروع کی۔ قلب گداز ہو چکا تھا۔ ویسے بھی صلح کل آدمی تھے۔ سندھی کی پہلی کتاب سبقاً سبقاً پڑھ کر بولے کہ صاحبو! مجھے تو اردو اور سندھی میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ سندھی کے لفظوں کو الٹا لگا دیا جائے تو اردو بن جاتی ہے۔ گھر پر سیاہ کرتا اور ٹخنے سے اونچی شلوار پہننے لگے تھے۔ شانے پر شیخ کی بخشی ہوئی ایک چھوٹی سی سندھی اجرک جسے لمبا رومال یا انگوچھا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کثیر المقاصد شئے ہم نے نہیں دیکھی ہائیڈروجن بم اور قمری راکٹ بنانے والے ایسی کوئی چیز ایجاد کر کے دکھائیں، تو ہم جانیں۔ فاروقی صاحب اس سے منہ پونچھتے۔ دستر خوان کا کام لیتے۔ کہیں پیدل منزل مارتے تو اسی سے گرد سفر جھاڑتے۔ لو چلنے لگے تو اسے پانی میں تر کر کے عربوں کے فترہ و عقال کی طرح سر پر ڈال لیتے۔ حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم ہوں اور عین غیبت میں اگر وقت نماز آجائے، تو اسی کو فرش پر قبلہ رو بچھا کر سربسجود ہو جاتے اور رب کا شکر ادا کرتے جس نے انسان کو قوت گویائی عطا کی۔ دن میں پنکھے اور رات کو مچھر ستاتے تو اسے منہ پر تان کر سو جاتے۔ جاڑے اور زکام میں یہ مفلر کا کام دیتی۔ اور رات کو حلوائی کی دکان سے بیمار بچے کے لئے اونٹا دودھ لاتے تو اس کا اینڈوا بنا کر ہتھیلی پر رکھ لیتے۔ بیوی کو اچانک ننگے سر دروازہ کھولنے جانا پڑے تو اس کی بکل مار کے اوڑھنی بنا لیتی۔ خود نروس یا کھسیانے ہوتے تو کونے کو بل پہ بل دیتے یا یونہی عینک کا شیشہ صاف کرنے لگتے۔ سودا سلف لینے بازار جائیں تو یادہانی کے لئے بیوی اس میں گرہیں لگا دیتی تھی، مگر یہ بھول جاتے کہ کون سی گرہ کس شئے مطلوبہ کا سمبل ہے۔ پہلی تاریخ کو مہینے کا سودا خریدنے نکلتے تو یہ دیہاتن کی مینڈھی کی طرح گرندی ہوئی ہوتی تھی۔ رات کو بچے اس کا کوڑا بنا کر اگلے پچھلے حساب چکاتے۔ عجلت میں ہوں یا کسی خاص مہم پر جا رہے ہوں تو کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے کر چلتے۔ کوئی گھر ملنے آئے تو بٹھانے سے پہلے اسی سے مونڈھے کو صاف کر لیتے۔ خانقاہ میں ایک دن وضو کرتے ہوئے مسجد کے حوض میں گر پڑے اور کہنی زخمی ہو گئی تو دوسرے دن اسی کے 'سلنگ' میں ہاتھ کوے کے ہندسے کی طرح رکھ کر بینک آئے۔ کوئی بھری محفل میں ذومعنی بات یا مذاق کر بیٹھے تو اسے منہ میں ٹھونس کر کھُس کھُس ہنسی چھلنتے رہتے۔ بیان کرتے تھے کہ ایک دفعہ رات کو خانقاہ سے ایک جلالی وظیفہ پڑھ کر لوٹ رہے تھے کہ راستے میں چار غنڈوں نے گھیر لیا۔ اب کیا تھا۔ انھوں نے امام ضامن کا کلدار روپیہ اجرک کے کونے میں باندھ کر بنوٹ کے ایسے ہاتھ دکھائے کہ ایک غنڈے کی کنپٹی میں بھیجا تا کھل گیا۔ وہیں کھیت رہا۔ پسماندہ غنڈے تھانے میں رپٹ لکھوانے بھاگے۔ ہماری مسکراہٹ میں انھیں استہزا کی جھلک نظر آئی تو طیش میں آکر فرمایا کہ آپ جیسوں کو تو چوتی میں ہی ڈھیر کر سکتا ہوں۔

دوپہر کو فرش پر کھانا کھانا بیٹھتے تو بیوی اسی اجرک کی چنوٹی بنا کر مکھیاں جھلتی رہتی۔ روز صبح اسے دھو کر شام کے استعمال کے لئے سکھا کر دیتی۔ بڑی بیٹی کی شادی طے ہوئی تو بینک سے پانچ سو روپے قرض لئے اور ایک دن شام کو شاداں و فرحاں اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے کپڑے اس میں باندھ کر دکھلانے لائے۔ پھر وہ گھڑی بھی آئی جب سکھی سہیلیوں نے ایسی رندھی ہوئی آواز میں "لکھی بابل مورے! کاہے کو بیاہی بدیس رے، لکھی بابل مورے" گایا کہ دولہا والوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ جس باپ نے جہیز میں چاندی کے زیور، ململ کے دوپٹے اور ایلومینیم کے برتن دیئے اس کے سینے سے

مگ کے بیچ جس طرح پھوٹ کے روئی ہے، ہم نے کسی امیر کبیر کی بیٹی کو اس طرح تڑپ کر روتے نہیں دیکھا۔ شادی بخیر وخوبی انجام پا گئی تو میاں بیوی کو اطمینان ہوا کہ بائے بوجھ ہلکا ہوا۔

لیکن مشیت کو کچھ اور منظور تھا۔ تین مہینے بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ بیوی کو ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ پانچ چھ دن تک تیز بخار میں کھانا پکاتی، جھاڑو بہارو دیتی، بچوں کو نہلا دھلا کر اسکول بھیجتی رہی۔ قرض میں بال بال بندھا ہوا تھا۔ شام کو گھر جاتے تو پاکستان چوک سے ایک ہومیوپیتھی ڈاکٹر سے چار آنے کی پڑیا لیتے جاتے۔ کسی سے تذکرہ تک نہ کیا۔ رات کی جگار سے سوجی سوجی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مل مل کر دن بھر کام کرتے رہتے۔ دس دن بیمار رہ کر وہ نیک بی بی اپنے رب سے جا ملی۔ دل پر کیا کچھ نہ گزری ہو گی۔ لیکن کیا مجال کہ حرفِ شکایت زبان پر آئے۔ یہی شیخ کی بیت تھی۔ جنازے میں محلے کے سبھی لوگ شریک تھے۔ بیٹا جو مشکل سے نو سال کا ہو گا اسی اجرک میں پھولوں کی چادر، اگربتی، گلاب جل اور شمامۃ العنبر باندھے بے خبر پیچھے چل رہا تھا۔ اس میں ابھی تک کچھ یاد دلانے کے لئے، ایک ننھی سی گرہ مرحومہ کے ہاتھ کی لگی ہوئی تھی۔ جسے انھوں نے تین دن سے نہیں کھولا تھا۔ ڈولا لحد کے پہلو میں رکھا گیا اور سرہانے سے غلافِ کعبہ کا پارچہ ہٹا دیا گیا۔ میت قبر میں اتارنے لگے تو اپنے ہاتھوں سے اجرک کمر میں ڈال کر دکھ درد کے ساتھی کو مٹی میں سلا دیا۔ اسی سے گوشۂ چشم پونچھا۔ دھیرے سے گرہ کھولی۔ اور پھر اپنے شیخ کے اس تبرک کو کفن پر ڈال دیا۔ ۸۸
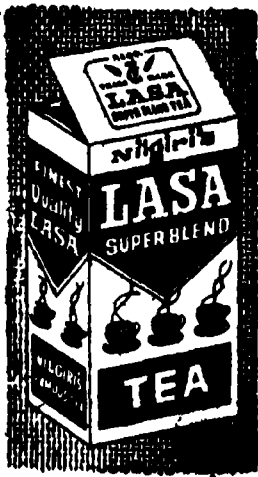
اسمٰعیل آذر

دانتوں کی خصوصیات

سمجھو نہ سبھی دانت چبانے کے لئے ہیں
ایسے بھی ہیں ان میں جو دکھانے کے لئے ہیں
شفاف و چمکدار دکھانے کے لئے ہیں
جو پیلے کچیلے ہیں چھپانے کے لئے ہیں
کچھ کھانے چبانے میں ہی مصرف نہیں ان کا
سردی کے زمانے میں بجانے کے لئے ہیں
کوکر ہی پریشر سے گلائے نہ غذا کو
دانتوں کی درازیں بھی گلانے کے لئے ہیں
دو تین کے گرنے سے جو کھل جاتی ہیں راہیں
وہ راہیں فقط رال بہانے کے لئے ہیں
طوفاں کی طرح اٹھتی ہوئی دل کی ترنگیں
دانتوں میں زباں رکھ کے دبانے کے لئے ہیں
عاشق کو کھڑا دیکھ کے ڈیوڑھی پہ یہی دانت
معشوق کی انگلی کو دبانے کے لئے ہیں!
ہلتے ہوئے دانتوں سے چنے تو نہ چبیں گے
یہ دانے تو ناکوں ہی چبانے کے لئے ہیں
نقلی بھی زمانے میں بڑی چیز ہیں پیارے
روئے جو بڑھاپا تو ہنسانے کے لئے ہیں!
آذر تو سمجھتے تھے انھیں پنسل کٹر ہی!
رخسار پہ نرمی سی جمانے کے لئے ہیں

ناچیز★

گورکھ دھندا

سنٹو، سیٹو، ناٹو، سی آئی اے، ایل ایس ڈی
یہ کیسا گورکھ دھندا ہے، سمجھاؤ تو اس کی اے بی سی
جی او تو سمجھ میں آتا ہے پر یہ سی جی جی او کیا شے ہو
یو ڈی سی تو کچھ، حیران ہیں سارے پی آر او اے ڈی سی
بحث کا ٹاپک تھا اے آئی آر ہے بہتر یا بی بی سی
سب سے اچھا سیلون اپنا، دھیرے سے بولی لڑکی
بیٹا ہے ایم اے ایم ایڈ تو خیر سے بیٹی ہے بی اے بی ٹی
داماد ہو کم از کم آئی اے ایس اور بہو رانی ہو ایم ٹی
یہ کس کا پتہ ہے پہچانو تو جانیں، تم بھی ہو کچھ ناچیز
ایس اے ایچ ایم اے ڈی یو ڈی آئی پی ٹی ملے پہ

★ مشہور ادیب اختر حسن

خواجہ عبدالغفور

بچپن سے پچپن تک

بچپن وہ زمانہ ہے جب فکرِ فردا ہوتی ہے نہ اور کسی قسم کی فکر ـــــ اور جو کوئی فکر ہوتی ہے تو محض پڑھائی سے اور استاد کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کی فکر ہوتی ہے یا پھر یہ فکر کہ کب چھٹی ہوگی اور کب کھیل کے لئے وقت ملے گا۔

بچپن کے سہانے سپنے اب بھی یاد آتے ہیں تو دل مچل جاتا ہے کہ کاش ان کی تعبیر اب بھی مل جائے اور زندگی کے دن دلچسپ ہو جائیں۔

بچپن کی یاد آتی ہے تو آتی ہی چلی جاتی ہے۔

پڑھائی کا خیال آتا ہے تو اسمٰعیل میرٹھی کی کتاب نظروں میں پھر جاتی ہے اور ان کا وہ سبق یاد آتا ہے "ایک لڑکی بگھارتی ہے دال اور دال کرتی ہے عرض یوں احوال"۔ اس کے بعد وہ تمنا کہ ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدا یا میری

ان کے ساتھ وہ حب الوطنی سے بھرا ترانہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

بچپن میں کرید، تجسس، ہر چیز کی اصلیت اور ماہیت معلوم کرنے کی فکر ـــــ نہ مصلحت نہ دوراندیشی جو دل میں ہو وہی زبان پر اور جو کہیں اس کا وہی مطلب۔

ہمیں یاد ہے کہ ایک طالب علم جھوٹ بولتے پکڑے گئے تو ماسٹر صاحب نے بڑا لمبا لیکچر دیا۔ جھوٹ کی برائیاں سمجھائیں اور کہا دیکھو صاحبزادے ہم تمہاری عمر میں کبھی جھوٹ نہیں کہا کرتے تھے۔ اس برخوردار نے جھٹ

سے پوچھا " تو صاحب آپ نے کس عمر سے جھوٹ بولنا شروع کیا ؟ "

ایک بار شرارت پر سخت پٹائی ہوئی اور تنبیہاً بڑے بھائی صاحب نے کہا " جانتے ہو ہم نے تمہاری پٹائی کیوں کی ؟ اور خود ہی کہا اس لئے کہ ہمیں تم سے پیار ہے اور ہم تمہاری بھلائی چاہتے ہیں "

لڑکے نے معصومیت سے کہا " کاش کہ بھیا ہم بھی آپ کے پیار کا جواب اسی طرح دے سکتے "

ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہمارے ہاتھ گھر کے خوبصورت قالین پر سیاہی گر گئی ۔ جب ہماری اس حرکت پر گوشمالی کی گئی تو ہم نے پوچھا کیا سیاہی اتنی قیمتی چیز ہے کہ اتنی سی گر گئی تو ہم پر اس قدر سخت غصہ کیا جاتا ہے ۔

ہماری دسویں سالگرہ پر بڑا اہتمام کیا گیا ایک بڑا سا کیک اور دس موم بتیاں آرڈر کی گئیں چونکہ ہمارے بہت سارے دوست آ رہے تھے ہم نے فرمائش کی کہ ایک موم بتی اور دس کیک منگوائے جائیں ۔

بچپن وہ زمانہ ہے کہ جب آداب و اخلاق سکھائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ جب کوئی ہمیں بہت ساری مٹھائی اور ٹافی دے رہا ہو تو لینے کو بے اختیار جی چاہے بھی تو تہذیب و اخلاق کے پردہ میں یہ کہا جائے " جی بس شکریہ اور نہیں چاہئے ۔" ہم نے اس سبق پر کبھی دھیان نہیں دیا ۔ ہمارے دوست کی سالگرہ کی پارٹی ختم ہونے کو آئی تو اس کی والدہ نے ہم سے کہا " پیٹ بھر کر کھا لو بیٹا ۔"

ہم نے حقیقت بتاتے ہوئے کہا " جی پیٹ تو کبھی کا بھر چکا ۔" اس پر مہربان خاتون نے کہا " تب تو کچھ ٹافی اور چاکلیٹ جیب میں رکھ لو " ہم نے سچ سچ کہہ دیا " جی ہمارے دونوں جیب بھی بھرے ہوئے ہیں ۔"

اور جب گھر لوٹنے کا وقت آیا تو لکایک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ۔ میزبان خاتون نے کہا ۔ " چھتری اور برساتی لیتے جاؤ " ہم نے شکریہ ادا کیا تو وہ بولیں ۔ " یقیناً تمہاری ماں بھی میرے بیٹے راجو کی اسی طرح دیکھ بھال کرتیں ۔" ہم نے کہا " جی میری ماں تو راجو کو ایسے میں کھانا بھی کھلا کر اپنی موٹر میں واپس کرتیں " ۔ کھری کھری بات کہ جو دل میں ہو وہی زبان پر ۔

بچپن کی باتیں بھی خوب ہوتی ہیں نہ لاگ ، نہ لپیٹ ، نہ طنز نہ استہزار ۔ بلا سوچے سمجھے بھی بڑے پتہ کی باتیں منہ سے نکلتی ہیں ۔ ہم نے ایک بار اپنی امی سے کہا " آپ کی سالگرہ پر ہم آپ کو بہت ہی بڑھیا تحفہ دیں گے " امی نے پوچھا " وہ کیا ؟ " ہم نے بتایا " چینی کے برتنوں کا سیٹ " امی نے کہا " بیٹا وہ تو میرے پاس ہے " ہم نے کہا " جی ہے نہیں ، تھا جو تھا وہ ہمارے ہاتھوں چکنا چور ہو چکا ہے ۔"

ہاسٹل سے ایک برخوردار نے اپنے والد بزرگوار کو خط لکھا ۔ " عرصہ سے آپ کی خیریت کی کوئی اطلاع نہیں ملی جس کی وجہ سے پریشانی ہے ۔ فوراً سو روپیہ کا منی آرڈر بھجوائیے تاکہ آپ کی خیر خیریت معلوم ہو ۔"

ایک بار ہمارے ابا کے دوست نے ہم سے پوچھا " بیٹا کیا تم اسکول جاتے ہو " ہم نے جواب دیا " جاتا نہیں ، بھیجا جاتا ہوں ۔"

کچھ دیر بعد انھوں نے ہم سے پوچھا " بیٹا کوئی گانا وانا آتا ہو تو سناؤ " ہم نے صداقت بھرا جواب دیا " جی ہم سے ابا گانے کی فرمائش اس وقت کرتے ہیں جب انھیں اپنے بن بلائے مہمانوں کو بھگانا ہوتا ہے ۔"

ہمارے ایک ہم عمر ہم جماعت نے بتایا کہ اس نے اپنے ابا سے کہا " ابا جان اگر میں آپ کے دس روپے بچاؤں تو آپ مجھے پانچ روپے دیں گے ؟ " ابا جان نے کہا " ضرور " تو پھر اس نے کہا " نکالئے پانچ روپے ، آپ نے کہا تھا نا کہ ہم اچھے نمبروں سے امتحان میں کامیاب ہوں گے تو آپ دس روپے انعام دیں گے ۔ ہم اچھے نمبروں سے نہیں پاس ہوئے ہیں لہذا

آپ کے دس روپے بچا دیئے ہم نے ۔ تو پھر پانچ روپے دے دیجئے ۔"

بچپن کے بعد جوانی کا دور بھی بہت دلچسپ ہوتا ہے جب "ہر چیز پر بہار تھی ہر شئے حسین تھی / دنیا حسین تھی مرے عہدِ شباب کی" اس کے بعد ؎

شباب مٹ گیا ' یادِ شباب باقی ہے !
ہے بوئے شراب کی ساغر میں اب شراب نہیں

اب جو بچپن سے بڑی طول طویل منزلیں طے کرکے بچپن سے آگے نکل آئے ہیں تو بار بار یہ شعر زبان پر آتا ہے

بچپن کے دن بھی کیا دن تھے　　اڑتے پھرتے تتلی بن کے

بچپن بھی عجیب وغریب عمر ہے کہ جہاں قرار ہے نہ سکون ۔ دل میں یہی کسک اور پچھتاوا ہے کہ کاش ہم نے نوعمری اور جواں سالی میں یہ کر لیا ہوتا ۔ وہ کر لیا ہوتا ۔ اپنی زندگی اس طرح بنائی ہوتی ۔ یہ پچھتاوے کسی تاسف کے تحت نہیں محض اپنی دانشمندی اور دانش وری کے زعم میں یہ احساسات اجاگر ہوتے ہیں ۔ ورنہ پھر سے زندگی لوٹا دی جائے اور یہ اختیار ہو کہ اس کو جس طرح بھی چاہے بنایا جائے تو یقیناً ہم اسی ڈھنگ اور اسی نہج پر گزاریں گے اور خوشی محسوس کریں گے. یہ احساس اس لئے ہوتا ہے کہ آئندہ کچھ اور کرنے کا عزم مصمم ہوتا ہے ' اس کے لئے گئے گزرے دور کا سہارا لیا جاتا ہے. حالانکہ عمرِ رواں اس طرح رواں اور پراں ہے کہ جس طرح عمرِ رفتہ سے آگے بڑھنا مقسوم میں ہے ۔

بچپن میں زیادہ تر میں پن تھا تو اب کلیتاً تجربہ کا سہارا ہے ۔ بچپن ایسی عمر ہے جس کو منجدھار کا اگلا دوآبہ کہا جا سکتا ہے ۔ جہاں آدمی تھک ہار کر کچھ دیر سستاتا ہے اور دم لیتا ہے ۔ عمرِ گزشتہ کا جائزہ لیتا ہے اور آگے کی باتیں دھیرج سے سوچتا ہے ۔ کبھی اس کا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ پیچھے کو لوٹ جائے مگر یہ ناممکن العمل ہے ۔

بچپن عمر کا وہ نازک دور ہے ۔ جب آدمی محنت و مشقت سے کتراتا ہے ' تساہل اور کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے مگر بزعمِ خود یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہوتا ۔ چنانچہ جن بیویوں کو اپنے شوہروں سے سخت اور دقت طلب کام لینا ہوتا ہے تو وہ اس طرح پر کہتی ہوئی سنائی دیتی ہیں " لو اب رہنے بھی دو اب اس عمر میں آپ سے گھر کے لان کی پوری کھدائی اور وزنی فرنیچر کو ایک طرف سے دوسری طرف رکھنے کا کام کیا ہوگا " جہاں پیرانہ سالی کا حوالہ دیا کہ بس طیش طیش میں سخت سے سخت محنت کا کام بھی چٹکی بجاتے میں کر ڈالتے ہیں اور اپنی مستعدی اور طاقت کا سکہ جماتے ہیں ۔ ویسے کام ٹالنا ہو تو ضرور کہیں گے کہ بھئی رہنے بھی دو اب تو ہم بچپن کے ہو گئے ۔ لیکن بہت سوں کو دیکھا کہ ساٹھ کے قریب ہوں گے تو ساٹھا اور پاٹھا پر عمل کرنے تیار ہو جائیں گے ۔

راہی قریشی

راہی + غالب

ریل اور بس کا سفر باعث تاخیر بھی تھا / "آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا"

بیویوں سے مجھے بے جا ہے تباہی کا گلہ / "اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا"

یاد کر، ہم نے اسی کے تو بنائے تھے کباب / "کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا"

سر سے ہکلانے کی انسلٹ سے بہتر تھا یہی / "بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا"

شکر صد شکر کہ کتا ترا چپ ہے، ورنہ / "گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا"

جیل میں تھیں ترے قیدی کو دبی باہیں یاد / "ہاں کچھ اک رنج گراں باریٔ زنجیر بھی تھا"

گھر کیا رہن، تو غیروں نے ہی لکھا "کاغذ" / "آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا"

گولی پستول میں باقی نہ تھی، لیکن یارو / "آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا"

اس کی غزلوں کے چراتے رہے راہی اشعار
"کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا"

گنجا ہوں، مرے سر کی تقدیر بدلنے دے / تالو پہ ذرا میری زلفوں کو مچلنے دے

میں بھی تو بنوں لیڈر، مجھ کو بھی تو پلنے دے / مجھ کو بھی تو جنتا کا کچھ مال نگلنے دے

کچھ دیر ٹرانسسٹر اے دوست بجائے جا / بیمار شب غم کا کچھ موڈ بدلنے دے

کیوں ٹانگ اڑاتا ہے دھندے میں شریفوں کے / ٹڈوں کا زمانہ ہے ٹڈوں کو اچھلنے دے

جنت بھی ہتھیلی میں آئے گی نظر تجھ کو! / اک دور مرے ساقی گانجے کا بھی چلنے دے

دل بدلی میں پرٹل کا آیا ہے زمانہ پھر / گرگٹ کی طرح مجھ کو پھر رنگ بدلنے دے

ہر موہنی صورت پر حق اپنا جتائے جا / ہر موہنی صورت پہ دم اپنا نکلنے دے

لیڈیز بھی اتری ہیں میدان میں کرکٹ کے / چنڈول کی طرح اپنے دل کو بھی مچلنے دے

تت تیرے سوا میرا کون سنے دکھڑا / بیمار محبت ہوں، ہکلا ہوں، ہکلنے دے

پولیس میں مجھے دے کر کہتے ہیں وہ غصے سے / چربی مرے پاگل کی لاک اپ میں پگھلنے دے

برق آشیانوی

رہائش کا مسئلہ

یوں تو انسان کی جانِ ناتوان سے کئی مسائل اس طرح لپٹے ہوئے ہیں جیسے عشق پیچاں کی بیل ..... لیکن تین بنیادی مسائل ایسے ہیں جن سے سب سے پہلے نمٹنا ضروری ہے۔ ان میں اولین مسئلہ کھانے کا ہے دوسرا کپڑے کا اور تیسرا رہائش کا۔ کھانے کا مسئلہ تو انسان کے پیدا ہوتے ہی خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر خود بخود حل بھی ہو جاتا ہے اگر خود بخود حل نہیں ہوتا تو دیگر ذرائع سے حل کر دیا جاتا ہے۔ البتہ یہی مسئلہ جب انسان کے ساتھ ساتھ اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو اس قدر مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کو حل کرتے کرتے خود انسان تحلیل ہو جاتا ہے۔ دوسرا مسئلہ لباس کا ہے جس سے انسان فطرتاً تو پیدائش کے وقت بے نیاز ہوتا ہے لیکن تہذیب و تمدن کے شکنجے لباس بن کر اس کے جسم کو جکڑ لیتے ہیں تو یہ بھی پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کو آج کل کی خواتین نے بڑی عمدگی کے ساتھ حل کر لیا ہے اور ایک انچ کپڑا بھی جسم پر غیر ضروری طور پر استعمال نہیں کرتیں اور کسی قدر زیادہ عمدگی کے ساتھ حل کرنے کی مساعی جاری ہیں۔ امید ہے کہ یہ مسئلہ حل ہوتے ہوتے ایک روز تحلیل ہو جائے اور اس کا وجود ہی باقی نہ رہے۔

تیسرا مسئلہ رہائش کا ہے جو آج کل کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر انتہائی پریشان کن بن گیا ہے۔ رہائش کے مسئلہ کو دیگر مسائل کے مقابلہ میں اس لئے بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ یہ مسئلہ نہ صرف زندہ رہنے تک محدود ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ مرنے کے بعد بھی مقامِ رہائش کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے کم از کم دو گز زمین درکار ہے۔ اس دو گز زمین کے لئے کوئے یار کی شرط نہیں ....! کوئے رقیب بھی مل جائے تو غنیمت ہے' لیکن یہ بھی آسانی سے نہیں ملتی۔ غرض جو مسئلہ مرنے کے بعد بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا بھلا وہ زندگی میں کس طرح چین لینے دیتا ہے۔

دنیا میں چند ہی ایسے خوش نصیب ہیں جو فلک بوس عمارتوں میں آرام سے یا زمین بوس فٹ پاتھ پر اطمینان سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ البتہ کروڑوں انسان ایسے بھی ہیں جو کوٹھوں اور فٹ پاتھ کے درمیان معلق لٹک رہے ہیں۔ رہائش کے لئے مکان کی ضرورت ہے اور آج کل مکان کا ملنا انتہائی مشکل ہے۔ مکان کی تلاش میں تھک کر لوگوں نے

عجیب عجیب طریقے مکان کے حصول کے لئے اختیار کر لئے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ایک دوست کو مکان کی ضرورت تھی تو سب سے پہلے انھوں نے ایک مکان کا انتخاب کر لیا جو ان کی رہائش کے لئے موزوں اور کرایہ کے لحاظ سے قابل برداشت تھا۔ پھر اس مکان میں رہنے والے صاحب سے بازار میں مل کر باتوں باتوں میں یہ بتایا کہ اس مکان میں بھوت ہے۔ یہ سُن کر وہ صاحب کچھ پریشان ہوئے، پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ پھر ہمارے دوست نے اپنی بیوی کو اس مکان میں بھیج کر صاحب خانہ کی بیوی کو بتایا کہ اس مکان میں بھوت ہے۔ وہ بیچاری کچھ عرصہ سے بیمار تھی تو ہمارے دوست کی بیوی نے بتایا کہ بیماری وغیرہ کچھ نہیں ہے یہ سب اس بھوت کی کارستانی ہے۔ عورتوں کو شوہروں اور بھوتوں کے معاملہ میں ہر ممکن اور ناممکن بات پر بہت جلد یقین آ جاتا ہے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں وہ مکان خالی ہو گیا اور ہمارے دوست نے اس کو کرایہ پر حاصل کر لیا۔

ایک صاحب اپنے مکان کو فروخت کرنا چاہتے تھے۔ خریدار نے شرط رکھی کہ پہلے مکان خالی کروایا جائے لیکن قابض مکان خالی نہ کرتے تھے۔ جو کوئی خریدی کے لئے مکان دیکھنے آتا اس کو یقین دلاتے کہ اس مکان میں بلا ہے۔ جب مالکِ مکان کو معلوم ہوا تو انھوں نے باز پُرس کی، کرایہ دار صاحب نے بیان کیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے ہیں، اس مکان میں بلا ہے جس کو وہ روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ مالکِ مکان نے کہا کہ وہ خود بھی اس بلا کو دیکھنا چاہتے ہیں، تو کرایہ دار صاحب نے اپنی بیوی کو بلا کر کھڑا کر دیا اور کہا کہ " دیکھئے صاحب یہی بلا اس مکان میں ہے، میں نے جھوٹ تو نہیں کہا ـــ " اتنا سننا تھا کہ بیوی نے شوہر پر برسنا شروع کر دیا۔ جب مالک مکان نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا تو جھاڑو اٹھا کر اُن کی طرف بڑھیں اور مکان دار صاحب کو وہاں سے بھاگتے ہی بنی اور اس بات پر یقین کرنا پڑا کہ اس مکان میں وہ بلا ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی اور بلا نہیں کر سکتی۔

ایک خالی مکان کے مالک صاحب نے اپنے خالی مکان سے کچھ عجیب طریقہ سے فائدہ اٹھایا۔ وہ چار پانچ آدمیوں سے تین چار ماہ کا کرایہ پیشگی لے لیتے اور جب دو تین آدمی اپنا سامان لے کر اترنے کے لئے آتے تو آپس میں جھگڑا شروع ہو جاتا۔ مالک مکان درمیان میں آتے اور کہتے کہ وہ آپس میں کسی ایک کے حق میں تصفیہ کر کے آئیں تو اُن کو مکان کرایہ پر دیں گے۔ سال بھر کا عرصہ گزرنے پر بھی تصفیہ نہ ہوتا تو یہ کہہ کر مالک مکان سب کے پیشگی کرایے ہڑپ کر لیتے کہ اُن لوگوں کے لئے مکان کو سال بھر خالی رکھنا پڑا جس کی وجہ سے ان کا سال بھر کے کرایہ کا نقصان ہو گیا۔

وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کے آباء و اجداد نے رہائش کے لئے کم از کم ایک عدد مکان وراثت میں چھوڑا ہے البتہ ان لوگوں کی حالت قابلِ رحم ہے جن کا اپنا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے اور انھیں کرایہ کے مکانوں میں گزارا کرنا پڑتا ہے۔

کرایہ کا مکان تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ حاتم طائی نے شہزادی کے سات سوالوں کو تو آسانی سے حل کر لیا اگر اسے آٹھواں سوال " مکان کی تلاش " کا حل کرنے کے لئے دیا جاتا تو یہ سوال حل کرنے میں وہ اسی طرح ناکام رہتا جس طرح آجکل کے طلبہ کو امتحان سے قبل پرچہ سوالات مل جانے پر بھی وہ حل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

ہمارے ایک قدیم ملاقاتی بازار میں مل گئے۔ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا: " بھائی صاحب! آپ کے محلّہ میں کوئی مکان خالی ہے؟ " ہم نے الٹے دریافت کیا: " برادر پچیس سال پہلے بھی آپ نے یہی سوال کیا تھا ... کیا آپ کو ابھی تک کوئی مکان نہیں ملا؟ "

انھوں نے جواب دیا: " بھائی ان پچیس برسوں میں انچاس مکانوں میں وہ بدل چکا ہوں۔ اب پچاسویں مکان کی تلاش ہے؟ "
ہم نے کہا: " اتنے مکان کیوں بدل چکے ہو۔ "

انہوں نے جواب دیا: "اب تک جن انچاس مکانوں میں رہ چکا ہوں یوں سمجھئے کہ وہ انچاس قبریں تھیں جن میں یکے بعد دیگرے اس امید پر منتقل ہوتا رہا کہ شاید کوئی مکان کا بھی کام دے سکے۔"

ہم نے کہا: "ہمارے محلہ میں بھی ایک قبر خالی ہے جس کو آپ مکان سمجھ کر گزارا کرنا چاہیں تو کرایہ پہ لے لیجئے۔"

انہوں نے یہ کہہ کر رضامندی ظاہر کی: "انچاسویں قبر کا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس قبر کی جگہ ایک مکان بنائے۔ چنانچہ وہ مجھ سے اس قبر کو خالی کروا رہا ہے۔"

قبر کا ذکر آگیا ہے تو کچھ گفتگو حقیقتاً قبر کے بارے میں بھی ہو جائے .... قبر کے لئے زمین ملنا بھی اتنا ہی دشوار ہے جتنا کسی مکان کا ملنا ..... ہمارے ایک دوست جب اپنے والد صاحب کی برسی کے موقع پر فاتحہ پڑھنے قبر پر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک اور صاحب کھڑے فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر بتایا کہ وہ ان کے والد کی قبر ہے جنھیں چھ ماہ اسی مقام پر دفن کر دیا گیا ہے۔

قبر کی زمین کے مالک بھی عجیب عجیب کھیل کھیل رہے ہیں۔ ایک قبر کی زمین ایک شخص کو فروخت کر دیتے ہیں کچھ عرصہ بعد دوسرا شخص آتا ہے تو وہی زمین اس کو بھی فروخت کر دیتے ہیں۔ جب پہلا خریدار کوئی میت لے کر پہنچتا ہے تو اپنی خریدی ہوئی زمین پر ایک قبر کو دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور ادھر فروخت کنندہ صاحب غائب رہتے ہیں۔ مجبوراً پھر ایک بار دو گز زمین خریدنا پڑتا ہے۔

غرض رہائش کا مسئلہ اس قدر سنگین ہو گیا ہے کہ اس کے مقابلہ میں دیگر مسائل مثلاً غذائی قلت، گرانی وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اس مسئلہ کا واحد حل یہی ہے کہ جس شخص کو رہنے کے لئے اپنا ذاتی مکان میسر نہیں ہے وہ خود ایک مکان تعمیر کرے اور اس میں رہائش اختیار کرے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ کرایہ کے مکانوں میں رہتے ہیں ان کے پاس اگر اتنا سرمایہ ہوتا کہ وہ ایک مکان تعمیر کر سکتے تو کرایہ کے مکان میں کیوں رہتے۔ جواب بالکل صحیح ہے بلکہ اتنا صحیح ہے کہ اس پر سو فیصدی نمبرات دیئے جا سکتے ہیں لیکن ہم جس مکان کی تعمیر کا مشورہ دے رہے ہیں وہ بغیر کسی سرمایہ کے بالکل مفت میں بن جاتا ہے۔ البتہ اس میں تھوڑی سی دماغی محنت کی ضرورت ہے چنانچہ مرزا غالبؔ کے اس شعر کو سمجھ لیا جائے تو مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ مرزا صاحب نے کیا اچھی بات بتائی ہے، فرماتے ہیں:

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

اس شعر کو سن کر ہمارے ایک زندہ دل شاعر نے فرمایا کہ مرزا غالبؔ کے اس مشورہ کو ہم بخوشی قبول کرتے ہوئے ایک ایسا مکان بنا تو لیتے ہیں البتہ ہمسایے کی حد تک ہمارا خیال ہے کہ:

اور اگر ہمسایہ کوئی ہو تو اک خاتون ہو ۔۔۔ جس کی گردن پر ہزاروں عاشقوں کا خون ہو
علم میں سقراط ہو، حکمت میں افلاطون ہو ۔۔۔ حسن کی تازہ غزل ہو عشق کا مضمون ہو
"لیکن اتنی شرط ہے اس کا میاں کوئی نہ ہو"

اگرچہ زندگی کے صرف چار دن ہی ہوتے ہیں (بقول بہادر شاہ ظفر) جن میں سے دو دن آرزو میں کٹ جاتے ہیں اور دو انتظار میں۔ لیکن یہ چار دن بھی کہیں نہ کہیں سر چھپا کر گزارنا پڑتا ہے جس کے لئے دو گز زمین کا ملنا بھی دشوار ہے۔

رشید عبدالسمیع جلیل

اخباروں میں چھپ کر ہم جب نام خریدے
گھر والی نے مٹی کے دو جام خریدے
یہ دنیا ہے دنیا جس نے رام خریدے
چرچ میں عیسیٰ، مسجد میں اسلام خریدے
دفتر بھاگے، گھر لوٹے، یاروں سے نپٹے
دل بیچے اور پل پل پیاسی شام خریدے
دھوپ کی شدت میں ہم ٹھنڈی چھاؤں کو ترسے
دھن والے تو دھن سے دل آرام خریدے
شہر وفا کی آب و ہوا او کالی ہو گئی !
سیتا پھل کے موسم میں بھی آم خریدے
مینہ برسا جب دھوپ میں، ہم نے بیاہ رچایا
کوّوں کی تقلید کا یوں الزام خریدے
ہم نے ہنر کو جانا تھا خوش انجام جلیل
لیکن شاعر بن کے بُرے انجام خریدے

دو چار شعر لکھ کے جو مشہور ہو گئے
شاعر ہمارے شعر کے مزدور ہو گئے
افسانے لکھ کے بن گئے چوٹی کے جب ادیب
کنگھی پھنسا کے بالوں میں مغرور ہو گئے
ناقد بنے تو روشنی آنکھوں کی لُٹ گئی
بھٹکے جو تیرگی میں تو معذور ہو گئے
اندھوں کا یوں بھی دعویٰ دانشوری غلط
افسوس رہبری پہ وہ مامور ہو گئے
چھپ جائے جب کتاب تو اجرا ضرور ہے
قینچی چلا کے فیتے سے، مسرور ہو گئے
شعر و ادب کی محفلیں جمتی تو ہیں جلیل
شعر و ادب کے حُسن سے ہم دور ہو گئے

غزلیں
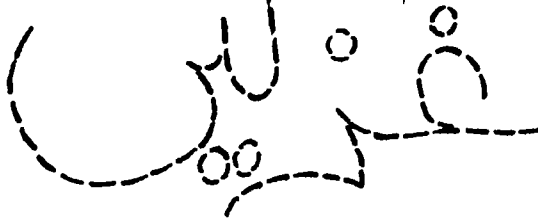
اقبال ہاشمی

ڈھیلی ڈھالی ہے ان کی کمر
اُن سے کیسے ملاؤں نظر
حسن کے چلتے پھرتے ہنر
ان کی پڑ جائے جس پر نظر
کب سرک جائے کس کو خبر
ان کی نظریں مری جیب پر
شوخیاں، دھمکیاں، چشم تر
وہ نظر آئے گا گھاٹ پر
ان میں اقبال کیا تھا بھلا
کھائی میں گر پڑا جان کر

معین اعجاز (نئی دہلی)

محبوباؤں کا احتجاج

سننے میں آیا ہے کہ محبوباؤں کا ایک متحدہ محاذ بننے والا ہے جو ملک گیر پیمانے پر ایجی ٹیشن شروع کرے گا۔ محبوباؤں کے احتجاج کا خاص نشانہ کچھ فلمی شاعر ہوں گے۔ یہ تحریک دراصل کچھ شاعروں کے غیر ذمہ دارانہ اشعار کے ردّ عمل کے طور پر ابھر رہی ہے کیونکہ ان کے خیال میں بعض اشعار سے نہ صرف یہ کہ محبوباؤں کی دلآزاری ہوتی ہے بلکہ حسن و عشق کی جو انٹرنیشنل روایت ہے اس کی بھی توہین ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک ایڈہاک کمیٹی بھی بن چکی ہے جو بڑی تیزی سے اپنے ہمہ گیر پروگرام کی تیاریاں کر رہی ہے۔

حال ہی میں بمبئی کے ایک انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں اس تحریک کی ایک ترجمان مس زرینہ نخرے والا نے بتایا کہ "احتجاج تو ہم ۱۹۷۵ء ہی میں خواتین کے بین الاقوامی سال کے موقع پر کرنے والے تھے لیکن جب ہم آرگنائز ہوئے تو بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ اور ہمارا سارا پروگرام دھرا کا دھرا رہ گیا۔

یعنی انسانی تاریخ کا ایک سال جو دنیا بھر کی عورتوں کے لئے الاٹ کیا گیا تھا اس میں بھی کٹوتی کر دی گئی اور ہمارے ملک کی خواتین کے حصے میں نصف سال آیا۔ خیر دیر آید درست آید۔ اب ہم کھل کر میدان میں آنا چاہتے ہیں۔ اور بیانگِ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے مطالبات اگر تسلیم نہ کئے گئے تو ہم فلم انڈسٹری کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے"

ان تمام محبوباؤں میں جوش و خروش پایا جاتا ہے جو اس میں حصہ لے رہی ہیں۔ انھوں نے کچھ ایسے اشعار کے حوالے دیئے ہیں جنھیں سن کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی ان کے مطالبات میں بڑی جان ہے۔

مثلاً ان کا کہنا ہے کہ کچھ فلمی شاعر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ محبوبہ بس دلچسپی کا ایک سامان ہوتی ہے جس کے پیار بے کار وقت ضائع کرنے کے لئے جایا جا سکتا ہے۔ جب ایک رپورٹر نے پوچھا کہ اس کا کیا ثبوت ہے تو ان کی ترجمان

نے فوراً کہا کہ ذرا آپ ہی اس شعر پر غور کریں:

تیرے پاس آکے مرا وقت گزر جاتا ہے!
دو گھڑی کے لئے غم جانے کدھر جاتا ہے

اس شعر میں شاعر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محبوبہ سے مل لینے سے وقت کٹ جاتا ہے اور دو گھڑی کے لئے غم سے نجات مل جاتی ہے۔ یعنی محبوبہ نہ ہوئی غم غلط کرنے کا سامان ہوئی۔ جیسے کوئی غم غلط کرنے کے لئے شراب پیتا ہو یا کوئی دوسری غیر اخلاقی حرکت کرتا ہو۔ اسی طرح ایک فلم میں آپ نے یہ بھی سنا ہوگا:

حسین ہو تم خدا نہیں ہو تمہارا سجدہ نہیں کریں گے

ظاہر ہے اس قسم کی شاعری سے محبوباؤں کی ہتک مقصود ہے۔ جو آداب عاشقی کے سراسر خلاف ہے۔ دنیا بھر کی شاعری میں اور بالخصوص مشرق کی شاعری میں محبوبہ کو کافی اونچا مقام دیا گیا ہے۔ فارسی کے ایک شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ معشوق کے چہرے کے ایک تل کے لئے میں سمرقند و بخارا کو بھی ٹھکرا دوں گا۔ ہمارے ملک کی شاعری اور خاص طور سے اردو شاعری کے اعصاب پر ہمیشہ محبوبہ سوار رہی۔ مومن کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

مومن سوئے شرق اس بت کافر کا تو گھر ہے
ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے

یعنی بت کافر کے گھر کو کعبہ کے بالمقابل کھڑا کیا گیا ہے۔ اور ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں محبوبہ کو (Top-Priority) دی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ فلمی صنعت جو اردو شاعری ہی سے فیضیاب ہوتی رہی ہے اس روایت سے دھیرے دھیرے دور ہوتی جا رہی ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ اُن ہیروئنوں کی غیرت کہاں چلی گئی تھی جنھوں نے ایسی فلم میں کام کیا۔

ہم تو صاحب محبوباؤں کی اس تحریک سے بہت متاثر ہوئے کیونکہ ان کی Spokesman (معاف کیجئے گا Spokeswoman) کی صلاحیت اور علمیت نے بُری طرح قائل کر دیا۔ ہم نے ایک خاتون سے چپکے سے پوچھا کہ "محترمہ آپ کے پروگرام میں کیا کیا شامل ہے۔" انھوں نے بھی چپکے سے بتایا کہ ہم پہلا کام تو یہ کریں گے کہ جتنی ٹاپ کی ہیروئنیں ہیں ان سے رابطہ قائم کرکے کہیں گے کہ اگر اب ایسی کسی فلم کے کنٹریکٹ پر انھوں نے دستخط کئے تو سارے نسوانی طبقے کی بالعموم اور محبوباؤں کی بالخصوص بے عزتی ہوگی۔ جس کا اثر کچھ اچھا نہیں پڑے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان شعراء سے معافی مانگنے کا بھی مطالبہ کیا جائے گا جنھوں نے ایسے بے ہودہ اشعار لکھے ہیں۔ ایک پلان یہ بھی ہے کہ اگر اس قسم کی فلم کہیں دکھائی جا رہی ہے تو اس کی نمائش روکنے کے اقدام کئے جائیں گے۔ اسی طرح فلم فینانس کارپوریشن کو متنبہ کیا جائے گا کہ وہ ایسی فلم بنانے والے کسی پروڈیوسر کو مالی امداد نہ دے۔" اپوا کے صدر کو بھی اس صورتحال سے آگاہ کر دیا جائے گا۔

میں نے ان محترمہ سے پوچھا: "آخر ایسا کون سا طوفان آگیا ہے کہ آپ لوگ اتنے بڑے پیمانہ پر احتجاج کرنے کا پلان بنا رہی ہیں؟"

محترمہ برافروختہ ہو اٹھیں۔ "مسٹر ایک جھوٹ کو دس بار دہرایا جاتا ہے تو وہ سچ ہو جاتا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلمیں عوام سے رابطہ قائم کرنے کے بہترین ذرائع ہیں۔ اگر ان کے ذریعہ اس قسم کے اشعار سنائے جائیں گے تو عاشقوں پر اس کا خراب اثر پڑے گا اور بہت سے سیدھے سادے عاشق جو محبوبہ کے لئے زمین سے چھلانگ

کہ اگر آسمان سے تارے توڑنے کا عزم رکھتے ہیں، وہ بزدل ہو جائیں گے اور اس طرح قوم کا ایک بہت بڑا طبقہ کمزور ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ ہم نہیں چاہتے کہ معصوم عاشق اپنی سادہ لوحی چھوڑ کر خواہ مخواہ کی سیاست میں پڑیں۔ اور مسٹر آپ سے کیا چھپانا ایک بار تو میری سہیلی کا ایک عاشق اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ مصرعہ گنگنا رہا تھا:

حسین ہو تم خدا نہیں ہو تمہارا سجدہ نہیں کریں گے

اسی وقت ہم لوگوں کا ماتھا ٹھنکا اور ہم نے آنے والے خطرہ کو بھانپ لیا۔ لیکن اب ہم میں بیداری آ چکی ہے اور ہم ایسے شعرار کی سازش کو نیست و نابود کر دیں گے جو صدیوں سے چلے آ رہے حسن و عشق کے ضابطوں میں ترمیم کر کے عاشقوں کو بھڑکانا چاہتے ہیں۔

محترمہ نے ہمیں پورے طور پر کنوینس کر لیا۔ سنا ہے کہ فلم انڈسٹری تک اس کی بھنک پہنچ چکی ہے اور کئی ہیروئنیں پروڈیوسروں کو بلیک میل کرنے کا پلان بنا رہی ہیں۔ بمبئی کے ایک پروڈیوسر کو تو سنا ہے کہ دل کا ہلکا سا دورہ پڑا ہے کیونکہ اس کی فلم کی ہیروئن بھی اسے بلیک میل کرنے والی ہے۔ اس کی آدھی فلم مکمل ہو چکی ہے اور کافی پیسے خرچ ہو چکے ہیں۔

قیاس ہے کہ محبوباؤں کا پہلا کل ہند جلسہ دلی کے رام لیلا گراؤنڈ پر منعقد ہو گا۔ اس سلسلہ میں نمائندہ محبوباؤں کا ایک وفد شاعر جمال فراق گورکھپوری سے آشیرواد لینے الہ آباد بھی جائے گا۔

۸۸

"کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے جال بچھایا گیا ہے میرے لئے"

جوہر سیوانی

مجھی کو دیکھ کے بلڈاگ بھونکتا کیوں ہے
یہ روکتا ہے مجھے اپنے گھر میں جانے سے
یہ اور لوگوں کو آخر نہ ٹوکتا کیوں ہے
یہ پہرہ صرف بٹھایا گیا ہے میرے لئے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے جال بچھایا گیا ہے میرے لئے

کبھی تو روٹی کبھی دال بھات چلتا تھا
کبھی تو ستو ہی آتا تھا میرے حصے میں
کسی طرح مرا ہر روز پیٹ پلتا تھا
کہاں سے مرغ پکایا گیا ہے میرے لئے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے جال بچھایا گیا ہے میرے لئے

کبھی نہ ماں نے تری میرا حال پوچھا ہے
رہے ہیں سب ترے بھائی بھی دشمنوں کی طرح
انھوں نے آج مجھے کیسے اپنا سمجھا ہے
یہ سبز باغ دکھایا گیا ہے میرے لئے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے جال بچھایا گیا ہے میرے لئے

یہ التفات کی بارش ہے آج کیوں مجھ پر
حقیر تو بھی تو کل تک مجھے سمجھتی تھی؟
یہ آج کھول دیا کیسے پیار کا دفتر
یہ کیا سوانگ رچایا گیا ہے میرے لئے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے جال بچھایا گیا ہے میرے لئے

دیا ہے تو نے مجھے کب مری وفا کا صلہ
یہ آج کیسے مرا سر دبانے بیٹھی ہے
کئی دنوں سے مجھے تو نے ناشتہ نہ دیا
یہ کیسے چولھا جلایا گیا ہے میرے لئے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے!
کہ جیسے جال بچھایا گیا ہے میرے لئے

تجھے تو گالیاں از بر تھیں چار سو چوّن
ہر ایک صبح زبانی سنایا کرتی تھی
تو آج کیسے دکھاتی ہے پیار کا درپن
دغا کا پھندا بنایا گیا ہے میرے لئے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے جال بچھایا گیا ہے میرے لئے

ہوا ہے عقد ترا مجھ سے ہوں ترا شوہر
یہ تجھ پہ ہے تو مرا ساتھ دے کہ بھائی کا
ہمیشہ تیرا رہے گا یہ دل جلا جوہر
بلا سے ڈنکا بجایا گیا ہے میرے لئے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے جال بچھایا گیا ہے میرے لئے

محمد برہان حسین

جوابی بیاض ... پرچہ تاریخ

اسپیشل نوٹ برائے ممتحن :

۱۔ جو پرچہ دو دن قبل آؤٹ ہوگیا تھا وہ بہتر تھا۔ یہ پرچہ شاید جلدی میں ترتیب دیا گیا ہے اس لئے متوازن نہیں ہے۔

۲۔ چونکہ پرچہ میں بعض نزاعی سوالات ہیں اس لئے امیدوار کا ممتحن کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں ہوگا۔

سوال ۱ "اورنگ زیب کی پالیسی سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا سبب بنی"۔ بحث کرو!

جواب : مغلیہ سلطنت کا زوال دراصل اکبر اعظم کے زمانہ ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ گو اس وقت مغلیہ سلطنت اپنے بامِ عروج پر تھی (ملاحظہ ہو مقولہ "ہر عروجے را زوال") اورنگ زیب کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا! شیواجی کی جوان شرارتیں، اورنگ زیب کی بوڑھی حکمتِ عملی، راجپوتوں کی ضد، جاٹوں کی داداگیری، اورنگ زیب کی آنکھ مچولی۔ اس پر اورنگ زیب کی شراب دشمنی، راجپوت دشمنی، انگریز دشمنی، اولاد دشمنی، ماں باپ دشمنی وغیرہ وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب سے پہلے کے اور بعد کے بادشاہ بڑے مزے میں رہے۔ پہلے والوں سے کوئی سلطنت چھیننے والا نہ تھا اور بعد والوں کے پاس سلطنت ہی نہ تھی۔

اورنگ زیب کی وجہ سے دکن میں پچیس سالوں تک میلوں کی سی چہل پہل قائم رہی۔ ورنہ دکن میں سیاست اور ادب میں جمود طاری تھا۔ حد یہ ہے کہ اگر دوسرا شخص کسی کی معشوقہ کو لے اڑتا تو عاشق صاحب کہتے: "جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے قاضی"! کبھی کوئی بھولی بھٹکی فوج شمال سے آجاتی تو قلعوں کی مرمت اور آہک پاشی ہوتی۔ لوگ آبا و اجداد کے پرانے ہتھیار نکال کر اس کا زنگ صاف کرتے۔ نئے بانس خرید کر بھالے چڑھاتے۔ نئے رنگین ریشمی لباس پہن کر محبوباؤں سے گلے ملتے اور روتے، لیکن یہ سب تیاری دھری کی دھری رہ جاتی جب راجہ یا بادشاہ، چند بیکار ہاتھی، چند ردکئے ہوئے موتی اور نقلی سونا دے کر حملہ آور سے صلح کر لیتا۔ ویسے بھی شمال سے نکلتے ہوئے حملہ آوروں میں آب و ہوا کی وجہ سے جو جوش ہوتا وہ جنوب پہنچ کر گوداوری پار

کرتے ہی ٹھنڈا پڑجاتا تھا۔ اور صلح کی طرف زیادہ مائل رہتا تھا۔ ان مسلسل صلحوں کی وجہ سے کئی نقصانات ہوتے۔ ہتھیاروں کا صنعتوں کو دھکا پہنچتا۔ آبادی کا مسئلہ جوں کا توں رہ جاتا۔ ہتھیاروں کو دوبارہ تیل لگا کر رکھ دینے سے تیل کی کمی ہو جاتی۔ آخر اس جمود کے خلاف دکن گیر احتجاجی مظاہرے شروع ہوئے کیونکہ جنگ کا ہر بڑا ٹورنمنٹ یا مقابلہ شمال ہی میں منعقد ہوتا تھا۔ آخر گولکنڈہ، بیجاپور، احمد نگر اور بیدر کے بادشاہوں نے 'تالی کوٹہ' کے مقام پر ایک مقابلہ رکھا جس میں صرف دو ہی ٹیمیں بجانگر بمقابلہ ریسٹ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ چاروں سلطنتیں علٰحدہ علٰحدہ ٹیمیں شریک نہیں کروا سکتی تھیں۔

سنتے ہیں اورنگ زیب آم کھانے ملتان گیا' ارادہ تھا اگر آم اچھے نکلتے تو ملتان کو سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیا جائے گا وہاں جا کر اس نے ذیل کا شعر پڑھا ؎

چار چیز است تحفۂ ملتان !
گرد و گرما' گدا و گورستان !

اورنگ زیب کے بعد اس کے ضعیف لڑکے تخت پر بیٹھتے' اترتے رہے' کیونکہ اورنگ زیب کے سب سے چھوٹے لڑکے کی عمر بھی وظیفہ پر علٰحدگی کی تھی اور بڑے کو تو مر کر زمانہ گزر جانا چاہیے تھا۔ درباری امیر سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ آخر محمد شاہ رنگیلے نے نئی ٹیکنیک ایجاد کی۔ اس نے دو امیروں 'سیّد برادران' کو جملہ اختیارات دے کر معاملہ امیروں کے حوالہ کر دیا۔ آپس کی مارا ماری میں بادشاہ کو جملہ امیروں سے چھٹکارا مل گیا۔ اسی دوران نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر دیا اور اس کا ارادہ مزید حملوں کا بھی تھا لیکن محمد شاہ نے یہاں بھی نیا فارمولہ استعمال کیا۔ اس نے نادر شاہ کو اتنی دولت دی کہ اس کے ساتھیوں نے اس دولت کی خاطر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد محمد شاہ نے چین کی وہ بنسی بجائی کہ رنگیلا مشہور ہوا۔ وہ رات کو نیند نہ آنے کی دوا کھا کر جاگتا تھا۔ اور دن تمام نیند کی گولیاں کھا کر سو جاتا تھا۔ بادشاہ کے شوق دیکھتے ہوئے لوگ دور دور سے حسین لڑکیوں کو دہلی پہنچاتے تھے۔ بادشاہ نے ان قافلوں کی سہولتوں کی خاطر سڑکیں بنوائیں اور جگہ جگہ آرام دہ سرائیں بنوائیں' کنویں کھدوائے۔ چنانچہ مغل سرائے مشہور ہوئی۔ اس کے زمانہ میں ہندو مسلم رعایا خوش تھی کیونکہ بادشاہ کو حکومت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اس کے جانشینوں نے سلطنت کے زائد علاقوں کو مرہٹوں' راجپوتوں اور انگریزوں کے حوالہ کر کے سلطنت کو مختصر' مفید اور مستحکم بنانا شروع کیا۔ چنانچہ شاہ عالم نے تو حد کر دی کہ صرف دہلی کے میونسپل علاقہ کو رکھ کر باقی دہلی بھی انگریزوں کو دے دی۔ رواداری اور رعایا پروری کا یہ حال تھا کہ ہر شخص بادشاہ تک جا سکتا بلکہ اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ قادر خان روہیلے نے شاہِ عالم کو دیوانِ خاص کے فرش پر پچھاڑ کر اس کی آنکھیں نکال لی تھیں۔ کسی شاعر نے ایک مصرعہ میں شاہ عالم کی سلطنت کو بیان کیا تھا ؎

سلطنتِ شاہ عالم' از دلّی تا پالم !!

شاہ عالم نے پالم کو آخر تک نہیں چھوڑا۔ شاید وہ ہوائی اڈہ بنانا چاہتا تھا لیکن کرتا کیا ہوائی جہاز ہی ایجاد نہ ہوا تھا۔

اورنگ زیب کے مرنے کے ڈیڑھ سو سال تک سلطنت چلتی رہی لیکن اس کے نا اہل جانشینوں پر اس کے زوال کا الزام نہیں لگایا جاتا کیونکہ ان کی وجہ سے دوسروں کی سلطنتوں کو عروج نصیب ہوا۔ اورنگ زیب میں انتظامی صلاحیتوں کا فقدان تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی رشوت نہیں لے سکتا تھا۔ کوئی ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیکس کی چوری نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی کوئی انتظامِ سلطنت ہے کہ عوام کو سانس لینے کا موقع ملے نہ اپنی صلاحیتوں کے استعمال کا۔ اس نے خود

قرآن شریف لکھ لکھ کر اپنے اخراجات پورے کئے اور خزانہ سے کچھ نہ لیا۔ بھلا ایسے شریف آدمی کا حکومت میں کیا کام؟

سوال ۲ : چھوڑی ہوئی جگہوں کو پُر کیجئے :
ا : ہندوستان میں ایک ...تکلیف دہ... طرز کی حکومت رائج ہے۔
ب : ہندوستان کے تین طرف ...دشمن... اور ایک طرف ...سمندر... ہے۔
ج : پرتھوی راج ...فلمی دنیا... کا راجہ تھا۔

سوال ۳ : مختصر جواب دیجئے (ایک سطر میں)
ا۔ مغلیہ سلطنت کی کامیابی کا کیا راز تھا؟
جواب : مغل بادشاہ ہمیشہ اپنے دشمن کو سسر بنا لیتے تھے۔
ب۔ ہندوستان میں سب سے پہلے بم کب استعمال ہوا؟
جواب۔ سمستی پور میں ۱۹۰۰ء میں۔
ج۔ دوسری جنگ پانی پت کب ہوئی؟
جواب۔ پہلی جنگ پانی پت کے بعد۔
د۔ بھنڈارا نائک کون ہیں؟
جواب : لفظ لفٹننٹ کرنل کا ہندی ترجمہ۔

سوال ۴ : ایک لفظ میں جواب دیجئے۔
ا۔ ہندوستان کے صدر مملکت کو کیا کہتے ہیں؟
جواب۔ صدر
ب۔ میر جعفر کو تاریخ ہند میں کس نام سے یاد کیا جاتا ہے؟
جواب۔ اسی (نام سے)
ج۔ پرتھوی راج کے گھوڑے کا کیا نام تھا؟
جواب۔ کس فلم میں!

سوال ۵۔ "ہندوستان کے لئے جمہوریت ہی موزوں طرز حکومت ہے۔" بحث کرو!
جواب : جمہوریت کے فوائد یہ ہیں کہ اس میں کوئی قاعدہ قانون نہیں ہوتا۔ وزیر اعظم ۲/۳ اکثریت سے دن کو رات اور رات کو دن ثابت کر سکتا ہے۔ جمہوریت ایک موم کی ناک ہوتی ہے جس کو جیسا چاہے موڑ کر چہرہ بدلا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہر نئی ریاستی اور مرکزی کابینہ میں کُل ملا کر تین ہزار انسان وزیر بن جاتے ہیں اور خوب کما لیتے ہیں۔ اس طرح چند صدیوں میں ہندوستان کا ہر شخص مالدار بن سکتا ہے۔ جمہوریت میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک خراب اور بد معاش آدمی خود کو انتخاب کے لئے پیش کرتے ہیں اور ان میں سے ایک فرد منتخب ہو جاتا ہے چاہے سالے شہر کا بھی ووٹ نہ دیں۔ دادا مرحوم فرماتے تھے "اچھے آدمی اور شعر میں وزن نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ معنی پر غور کرنا چاہئے۔ چنانچہ

عرض ہے سہ

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں !
سروں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا

یہ بھی جمہوریت کی ایک خوبی ہے کہ اس میں سروں کو گنا جاتا ہے ورنہ اگر ہندوستان کے سارے لوگوں کے سروں کو تولنے بیٹھیں تو کئی صدیاں درکار ہوں گی اور اس دوران آبادی دگنی ہو کر مزید تلنے تیار ہو جائے گی۔ اس لئے ایسا طرزِ حکومت جس میں سروں کو تولا جائے ہندوستان کے لئے ناموزوں ہو گا۔
پرچہ ختم کرتے ہوئے آخر میں میں اپنے لئے پاس ہونے کی اور آپ کے لئے پرموشن کی دعا کرتا ہوں سر! ***

داماد کی فریاد

رؤف رحیم

اپنے داماد کا ہر ناز اٹھانا ہوگا
چاہے خود بھوکے رہو مجھ کو کھلانا ہوگا

میں تو خوددار ہوں آؤں گا نہ خود اپنے سے
دعوتیں دے کے مجھے روز بلانا ہوگا

چاہے سو جاؤ چٹائی پہ مجھے کیا غم ہے
نرم گدّوں پہ مگر مجھ کو سلانا ہوگا

گر ملے نوکری تنخواہ نہ پوچھے کوئی
میرا پہلے کی طرح بوجھ اٹھانا ہوگا

طبع نازک ہے مری یہ بھی ذرا یاد رہے
روٹھ جاؤں تو بہرحال منانا ہوگا

شوق فلموں کا بھی ناچیز کو بے حد ہے سنو
ہر جمعہ ایک نیا کھیل دکھانا ہوگا

مقام عبرت (فیملی پلاننگ)

اشرف مالوی

شیرنی نے چار بچے جب دیئے
لوگ دوڑے اس کے درشن کے لئے

لگ گئی جب بھیڑ کچھ زیادہ بکٹ
رکھ دیا اس پر بھی تفریحی ٹکٹ

آئی تھیں اک صاحبہ بھی دیکھنے
بچے ان کے ساتھ ساڑھے آٹھ تھے

پنجرے کے نگراں نے یہ ان سے کہا
آپ دیکھیں شیرنی کیا فائدا

شیرنی کو خود یہیں لاتا ہوں میں
آپ کی دید اس کو کرواتا ہوں میں

تاکہ عبرت آپ سے حاصل کرے
اور آئندہ نہ بچے چار دے

ارادہ ہے

شریف ورنگلی

چھری گھستے ہیں آج غصہ میں
جان کھانے کا کیا ارادہ ہے

بات کرتے نہیں کبھی مجھ سے
آنے جانے کا کیا ارادہ ہے

گھور کر دیکھتے ہیں للچا کر
مار کھانے کا کیا ارادہ ہے

سُن کے کوئل کی کوک وہ بولے
سُر ملانے کا کیا ارادہ ہے

مرغ پکڑے ہیں کیوں پڑوسی کا
کاٹ کھانے کا کیا ارادہ ہے

شہ پڑی ہے بچو بھی پیدل سے
مات کھانے کا کیا ارادہ ہے

سن کے میری غزل ترنم سے
دف بجانے کا کیا ارادہ ہے

پوچھتے ہیں شریف سے آ کر!
ساتھ آنے کا کیا ارادہ ہے

ڈیری کی صنعت ترقی پر ہے

آندھرا پردیش میں ڈیری کی صنعت ترقی پر ہے۔ ۱۹۷۴ء میں آندھرا پردیش ڈیری ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا قیام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران میں اس کارپوریشن نے ۸۸۹ لاکھ لیٹر دودھ حاصل کیا اور اس کے علاوہ ۴۲۵ ٹن مسکہ، ۲۲۱۸ ٹن گھی، ۱۱۶۷ ٹن دودھ پوڈر تیار کیا۔ کارپوریشن کی اس لائق ستائش کارکردگی کی بدولت ڈیری کی صنعت کو زبردست بڑھاوا ملا ہے۔

کارپوریشن کی زیر نگرانی اس وقت ریاست میں چارہ تیار کرنے والے چار کارخانے کام کر رہے ہیں جن سے دودھ سربراہ کرنے والوں کو مویشیوں کے لئے روزانہ ۸۵ ٹن متوازن چارہ فراہم کیا جاتا ہے۔ ان چار کارخانوں کے علاوہ دو اور کارخانوں کا قیام عمل میں آنے والا ہے۔

توقع ہے کہ ڈیری کی صنعت آنے والے برسوں میں بھی بدستور اہم کردار ادا کرتی رہے گی۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامّہ

حکومت آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد

DIPR NO. 13-77-78/R

ارشد علی خاں

یہ آج سے تقریباً پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ دراصل واقعہ کم آپ بیتی زیادہ ہے۔ دراصل ہمیں بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ہے لہٰذا اسی عادت کے اکسانے پر ہم اس ارادہ پر کمربستہ ہوگئے کہ کیوں نا آر ایم پی کا امتحان دے دیں۔ خرچہ بھی کم تھا اور محنت بھی کم لگتی تھی۔ اس ارادہ کو تقویت دینے کے لئے ہم اس امتحان کے فارغ کئی نیم حکیموں سے ملے۔ ان سے ملنے پر معلوم ہوا کہ وہ حضرات پہلے ہی سے کسی نہ کسی اور دھندے میں لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً کسی کی لانڈری، کسی کی سائیکلوں کی دوکان، کسی کی کرانہ دوکان تو کوئی آٹے کی گرنی چلا رہا ہے اور شام کے وقت وہ لوگ اپنا مطب بھی چلاتے ہیں کتنا مفید دھندہ تھا یعنی پارٹ ٹائم بزنس۔ بھلا کون احمق اتنے سنہرے موقع کو چھوڑ سکتا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے فارم داخل کر دیا۔ پھر سیدھے آصفیہ لائبریری پہنچے اور انڈکس کے تمام ڈبوں کو کسی مشاق دھوبی کی طرح کھنگال کر رکھ دیا۔ تمام حکمار زندہ یا مردہ کی کتابوں کے حوالے نوٹ کر لئے پھر ہمیں اتنا اطمینان ہوگیا جیسے ان حکمار کے نام ہی اگر سلیقہ سے یاد ہو جائیں تو چٹکی بجاتے پاس ہو جائیں گے۔

لیکن جوں جوں ہم ان کتابوں کی دیمک بنتے گئے ہمیں احساس ہو چلا کہ اس سمندر کو ہمارے ناتواں دماغ کے کوزے میں سمونا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں۔ بھلا چند دنوں میں وہ حکیم جالینوس، لقمان، بقراط کو کہاں ہضم کر سکتا تھا اس لئے وحشت شروع ہوگئی۔ امکان اس بات کا ہوگیا تھا کہ اس آر ایم پی کے چکر میں ہم جڑی بوٹیوں کی تلاش کے بہانے کہیں جنگل کی طرف نہ نکل جائیں مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اس نے چھپّر نہیں پھاڑا صرف ایک پرانا اخبار پھاڑ کر ہماری دستگیری کر ڈالی۔ ہوا یہ کہ ایک دن بخار چڑھ گیا۔ اسے اتارنے کے لئے ہم ہوٹل پر جا کر دو وڑے اور ڈبل روٹی خرید لائے۔ جب ڈبل روٹی کھونٹنے لگے تو ہمارے دماغ کی پوری گرہیں خود بخود کھل گئیں اور تقریباً ۱۶ سے ۳۲ طبق روشن ہو اٹھے۔ جس اخبار میں وہ باسی روٹی پیاک تھی، اس پر تازہ خبر یہ تھی:

وہ حضرات جو آر ایم پی امتحان دینا چاہتے ہوں! ان کے لئے ایک اطلاع!! اطلاع یہ تھی کہ کوئی "حکیم بندوقی (یا صندوقی ہمیں برابر یاد نہیں رہا) نے ایک مختصر اور جامع کتاب "طب" پر طبع فرمائی ہے جس کے پڑھنے پر "ضمانت" کے ساتھ یہ "گیارنٹی" دی جاسکتی ہے کہ امتحان میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہدیہ صرف ایک روپیہ، پتہ تھا معظم جاہی مارکٹ "تیار کنندہ ادارہ "گم سم"۔ اس "گم سم" پر ہم سچ مچ گم سم ہو گئے!

ہم ڈبل روٹی کم کھا رہے تھے اور اس حکیم بندوقی کی طرف زیادہ دماغ لڑا رہے تھے ایک دفعہ تو واقعی ہم دروازہ کی طرف جھپٹے کہ جا کر حکیم صاحب سے لپٹ پڑیں اور عرض کریں کہ جناب چلائیے آپ کی بندوق کی گولیاں، آر ایم پی کا مجاہد آپ کے سامنے سینہ سپر ہوتا ہے! لیکن گھر والے یہ سمجھے کہ ہمارا بخار تیز ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ ہم پر جھپٹے اور پکڑ کر بستر پر لٹا دیا۔

صبح جب ہم بیدار ہوئے اور بخار کچھ اترا تو بہ مشکل مریض حکیم جالینوس کی طرف پیش قدمی کر بیٹھے لیکن ظالم حکیم بندوقی نے کچھ اس نالائقی کا پتہ دے دیا تھا کہ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے موت کی وادیوں میں کھو جانا پڑ رہا تھا آخر تھک ہار کر ایک ہوٹل میں گھسے اور ایک عدد چاٹ زہر مار کی۔ جب ذرا چستی نظر آئی تو ایک مولانا کی طرف چوروں کی طرح بڑھے وہ اخبار کی سرخیوں پر نظریں گاڑھے خود گڑھ جانے کی پوزیشن میں تھے۔ ہم نے مریل سی آواز سے انھیں اس گڑھے سے نکالنا چاہا لیکن وہ سرخیوں ہی پر نظریں دوڑاتے ہوئے ایک ہاتھ یوں چلایا جیسے مکھیاں اڑا رہے ہوں یا ہمیں باہر جانے کی ہدایت دے رہے ہوں۔ ہم نے پھر مسکینی آواز نکالی "جناب ایک گزارش ہے۔"

اس پر وہ جھلائے اور ہمارے بخار زدہ حلیہ پر قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے بولے: "دفع ہو جاؤ.... اچھے خاصے ہٹے کٹے ہو، بھیک مانگتے شرم نہیں آتی۔"

ہم بری طرح سٹ پٹا گئے اور اوٹ پٹانگ لہجہ میں فوری بولے:

"اجی جناب! ہم حکیم بندوقی صاحب کا پتہ دریافت کر رہے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" وہ دیدے نچا کر بولے

"دراصل ہمیں ان سے طب پر لکھی گئی ایک کتاب لینی ہے۔"

"وہ کیوں؟" اس وقت کا "کیوں" ذرا ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ پھر وہ مسکرا کر اخلاق پر اتر آئے:

"تشریف رکھئے! مجھے ہی حکیم بندوقی کہتے ہیں!"

"کیا آپ کی ذات شریف ہی......" ہم بوکھلا کر بولے

"ذات شریف!!" وہ پھر غصے سے اکڑ گئے۔

"مم.... مطلب یہ ہے کہ آپ کی ہی ذات اقدس..... وہ یعنی ذات باری..... لاحول ولاقوۃ" دراصل ہمیں کل سے بخار ہے

"یعنی حکیم خود مریض ہے..... خیر خیر نکالئے ایک روپیہ...... اور یہ لیجئے!"

اتنا کہہ کر وہ اپنی جیب سے دو صفحہ کا پرچہ نکال کر ہمیں دیتے ہوئے بولے:

"خوشی منائیے جناب! سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے...... کیا یاد کریں گے؟"

ہم نے اثبات میں گردن ہلانی شروع کر دی اور روپیہ ان کے حوالے کر دیا۔ پھر اس طب کی کتاب بلکہ "کتابچہ پر نظریں دوڑانے لگے...... بڑا واہیات کتابچہ تھا.... اس میں سرے سے طب پر کوئی بحث ہی نہ تھی۔

طبیعت تو چاہی کہ واپس کر دیں، بالکل لاسا جائے کا اشتہار کا پمفلٹ تھا جس کی قیمت پہلے تو لینی نہ چاہیے تھی اگر لیتے تو دس پیسے کافی تھی۔ غالباً بنڈوقی صاحب ہمارے ارادوں کو تاڑ گئے اس لئے فوری بولے:

"جناب گھر جاکر مطالعہ فرمایئے! یہاں ہوٹلوں میں طب پر تیاری کر دگے تو مریض کا کیا قبروں میں علاج کروگے؟"

ہم جھنجھلا کر بولے: "اس کتابچہ بلکہ کتے کے کیبچے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قبروں میں بھی ان کا علاج مشکل ہے۔"

ان کی گھگھی بندھ گئی اور غصے میں پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتے تھے، ہم نے سننا نہیں، فوری باہر نکل آئے اور رکشہ میں بیٹھ کر رفو چکر ہو گئے۔

آخر کار امتحان کی تاریخ آ ہی گئی۔ انٹرویو میں ہر قسم کے لوگ تھے، ان میں ہمیں جانی قصاب سے لے کر تھرڈو قوال تک نظر آئے ...... ہم نے بڑی ہمت سے جانی قصاب سے دریافت کیا:

"تم کس سلسلہ میں یہ امتحان پاس کرنے کی فکر میں ہو؟"

وہ کچھ دیر تو تذبذب میں رہا، پھر بول بیٹھا:

"آپ سے کیا چھپانا ہے میاں، دراصل مطب چلے نہ چلے، مریض علاج کرانے آئیں یا نہ آئیں، لیکن ضرور آئیں گے۔"

"تمہارا مطلب مطب سے ہے یا گوشت کی دکان سے؟" ہم جرح کر بیٹھے۔

"مطلب سے میاں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"آخر اس کی وجہ؟" ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ اتنے وثوق سے کس طرح یہ بات کہہ رہا ہے۔

"اوہ ـــ دیکھئے آج کل لوگ دفتروں اور کالجوں وغیرہ سے غائب ہو جاتے ہیں اور جب رجوع ہوتے ہیں تو انھیں ڈاکٹری صداقت ناموں کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"اوہ .... ہو ....." ہم پر حیرانی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ "تو گویا تم صداقت ناموں کا دفتر کھول لوگے۔"

"جی ہاں! اگر دس گاہک آجائیں تو کم از کم بیس روپے یومیہ کی آمدنی گھٹ۔"

"بالکل .... بالکل۔" ہم اس کی سمجھداری پر عش عش کر اٹھے۔

اب ہم چلتے ہوئے اس انٹرویو والے کمرے کے قریب جا کھڑے ہوئے جہاں ان نیم حکیموں کی درگت بنائی جا رہی تھی۔ جب کبھی اس مسلخ سے نیم حکیم باہر نکلتا تھا تو دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا ...... پسینے میں بھیگا ہوا، بال منتشر، چہرہ اترا ہوا، پھر حواس اتنے باختہ کہ کسی فاختہ کی طرح بے ساختہ منٹوں میں شفا خانہ چھوڑ بھاگتا....

ہم نے سوچا کہ یہ بے وقوف خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ ہونہہ ... ہماری ہمت دیکھئے کہ کتنی جوانمردی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ امتحان کی تیاری تو کجا اس کی تاریخ تک یاد نہ رکھی تھی، وہ تو گھر میں یاد دلانے پر ہم چلے آئے تھے۔ چلو ایک تفریح تو ہو جائے گی اور ہم اس انٹرویو کے داؤ پیچوں سے تو واقف ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ اگلے سال پھر آئیں گے .... اور کیا ..... ہم اسی سوچ میں مبتلا تھے کہ چپراسی نے ایک سو تیرہ نمبر پکارا اور ہم چونک کر حاضر جناب بول پڑے۔ چپراسی نے ہمیں نیچے سے اوپر پھر اوپر سے نیچے دیکھا اور جھنجھلا کر بولا: "جناب یہ عدالت نہیں ہے۔"

"نہیں ہے۔" ہم معصومیت سے بولے اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "دراصل ہمیں آج عدالت بھی جانا ہے۔"

"پھر چلے جایئے۔"

"نہیں پہلے ذرا اس مرحلہ سے تو نپٹ لیں۔"

"آئیے" وہ کرخت آواز میں بولا اور ہم اس کے ساتھ سامنے والے کمرے میں گھس گئے۔
جالینوس نما شخص نے کہا "تشریف رکھئے جناب" اس جملے کے ادا ہوتے ہی ہم بجلی کی تیزی سے کرسی پر فروکش ہوگئے۔
"جناب کا نام" جالینوس صاحب رجسٹر کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولے
"نمبر ایک سو تیرہ"
"نمبر ایک سو تیرہ" سقراط قہقہہ لگا کر بولے "جناب آپ کا نام پوچھا جا رہا ہے۔"
"او... جی... جی... وہی... یعنی ارشد۔"
"آپ کے مطب کا نام؟"
"علاج الناس۔"
"علاج الناس!" بقراط طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولے "تو کیا یونانی میں علاج حیوانات بھی ہوتا ہے!"
ہم نے سوچا، یہاں مرعوبیت کام نہ دے گی۔ بس ہو جائے کچھ نہ کچھ تفریح، اس لئے برجستہ بول پڑے:
"کیوں نہیں جناب.... بے شک حیوانات کا علاج بھی اس یونانی سمندر میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اگر نہیں ہے تو یہ یونانی علاج کی توہین ہے اور یہ کہ وہ نامکمل ہے۔ اب حکیم نابینا صاحب کا واقعہ ہی لیجئے۔ وہ کس قدر غضب کے نباض اپنے وقت کے رہ چکے ہیں۔ نبض دیکھ کر مریض کی پوری تشخیص فرما دیتے تھے۔ عورتوں کو چونکہ ہاتھ نہیں لگاتے تھے اس لئے دھاگہ باندھ کر نبض دیکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص نے بھینس کو دھاگہ باندھ کر دوسرا سرا نابینا صاحب کے ہاتھ میں دے کر کہا "یہ میری بیوی ہے جو بہت کمزور ہوگئی ہے۔" پتہ ہے انھوں نے کیا کہا۔ انھوں نے نبض دیکھ کر کہا تھا "اسے بنولہ زیادہ دیا کرو کمزوری جاتی رہے گی۔"
"بہت خوب.... بہت خوب۔" سقراط صاحب بولے۔ "مگر آپ یہاں حکایتیں سنانے نہیں آئے ہیں سمجھے جناب۔"
"وہ تو ہم پہلے ہی سمجھ چکے ہیں..... فرمائیے۔"
جالینوس نے ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور غرّا کر پوچھا: "جناب کی عمر۔"
"رہی ہوگی پینتیس، چھتیس" ہم ان کی آنکھوں کی بجائے چھت کو گھورتے ہوئے بولے
"جناب ڈھنگ سے جواب دیجئے" وہ خفگی کے انداز سے بولے: "اب یہ بتائیے کہ جب آپ کی عمر ۳۵ سال ہے تو کیا دس سال پہلے یعنی ۲۵ سال کی عمر ہی سے آپ مطب چلا رہے ہیں۔"
"جی ہاں!" ہم ڈھٹائی سے سلسلہ دراز کرتے بولے: "دراصل اس کی بھی ایک تاریخ ہے جناب! اصل میں ہم ایک خاندانی حکیم ہیں۔ ہمارے دادا مست قلندر عرف مسیحائے وقت مشکل جھاڑ پھونک و ضرب کلیم بغیر عصائے دفعیات بلیّات..... جادوئی وسلمانی قابوئے جنّاتی.... کرامتی و فیضانی و....."
"بس۔ بس رہنے دیجئے۔" جالینوس غصّے میں پھنکارتے ہوئے بیچ ہی میں بول پڑے: "آپ شائد مالیخولیا کے مریض ہیں۔"
"نہیں.... جی نہیں جناب البتہ ہمارے پڑوس میں اس نام کا آدمی رہتا تھا پرسوں ہی انتقال کر گیا بے چارہ۔"
"خیر آپ فرمائیے کہ آپ کس مرض کے ماہر ہیں۔" سقراط بیچ میں کود پڑے۔

"ماہر تو نہیں کہہ سکتے، ویسے خدا کی دین ہے جس کو چاہے عطا فرمائے۔ آپ کو تو اس آیت شریف کا ترجمہ معلوم ہی ہوگا یعنی اللہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتاہے، جس کو چاہتا ......"

"آپ مرض کا نام لیجئے۔" وہ بیچ میں بول پڑے

"جی ہم بواسیر کا علاج کرتے ہیں۔"

مطلب اس کا یہ ہوا کہ آپ بواسیر کے ماہر ہیں۔"

"جی .... جی ہاں۔"

"کتنے مریض آتے ہیں جناب؟"

"روز فرما رہے ہیں آپ؟" ہم نے کہا

"پھر کیا آپ کا مطلب ماہوار سے ہے۔

"جی نہیں .... لیکن یہ کمبخت مرض ماہوار کے بجائے عمر میں ایک آدھ بار ایک آدھ کو لگتا ہے .... خیر ہمارے حساب سے دس تو مستقل گاہک ہیں .... اوہ یعنی مریض ہیں۔"

"مستقل؟" جالینوس نے جبیں پر شکنوں کا انبار لا کر کہا۔

"جی ہاں دراصل انھیں بڑی غضب کی بواسیر سے پالا پڑا ہے وہ تو خیر ہمارے دم سے ان کا دم ہے، ورنہ وہ بے دم ہو چکے ہوتے۔"

".... خیر اب آپ بتائیے کہ بواسیر کتنے اقسام کی ہوتی ہے؟"

"ایں ....." اس سوال پر ہم بری طرح اچھل پڑے۔ جہاں تک ہمارا تعلق تھا ہم بواسیر کو ایک اور صرف ایک ہی خیال کرتے تھے۔ پھر حافظہ پر زور ڈال کر کہا: "تین"

"بتلائیے کی بواسیر کیوں ہوتی ہے؟"

"کیوں ہوتی ہے؟" ہم دماغ پر زور ڈالتے ہوئے بولے: "یہی اناپ شناپ کھانے سے اور کیا؟"

"آخر؟"

"ہاں .... جی ہاں! دراصل خون میں حدت ہو جاتی ہے اور وہ شدت سے خارج ہونے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ اس طرح بواسیر انگڑائی لیتی ہے۔"

"بواسیر انگڑائی لیتی ہے!" جالینوس نے جھنجلا کر کہا: "آپ کسی ڈرامہ کے ایکٹر تو نہیں؟"

"جی نہیں مطلق نہیں .... کاش کے ہم ہوتے ... ایکٹر .... ہونہہ اگر ٹریکٹر کے ڈرائیور ہی ہوتے تو بس تھا۔"

"لاحول ولاقوۃ" جالینوس نے بقراط کی طرف کچھ اشارا کیا، اس لئے فوری بقراط بول پڑے:

"اچھا جناب! فرمائیے، ان تینوں اقسام کی بواسیر کا آپ علاج کس طرح کرتے ہیں۔"

"بہت سادہ سا علاج ہے جناب! پہلے تو ہم انھیں سخت پرہیز کراتے ہیں۔ اتنا سخت کہ پتھر بھی پگھل جائیں۔ پھر کیا مجال کہ بواسیر کے قدم اکھڑ نہ جائیں۔"

"آپ علاج فرمائیں؟"

"یہی کنگھی کے پتوں کا استعمال۔"

"ان تمام اقسام کے لئے؟"

"جی نہیں صرف خونی کے لئے۔ اب رہا بادی کا مسئلہ! اس کے لئے ہم 'فنافٹ' چاندی کے ورق میں لپیٹ کر دیتے ہیں:"

"فنافٹ! یہ کیا ہوتی ہے۔"

"یہ گیاسس دور کرنے کی تیر بہدف دوا ہے جناب..."

"ٹھیک ہے کوئی بواسیر کے لئے کیا علاج تجویز فرماتے ہیں؟"

"اوہ..... دیکھئے اس کے لئے ہم بیرونی استعمال تجویز کرتے ہیں" ہم نے کچھ شرما کر کہا۔

"مثلاً"

"اس کے لئے ہم "ریگ مال" کا استعمال بتاتے ہیں:"

"ریگ مال یہ کیا بک رہے ہیں آپ!"

"جی وہی یعنی سیکل وغیرہ کے پنکچر جوڑنے کے لئے جو استعمال ہوتا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے یا سائیکل پنکچر کی دوکان...... واہیات" جالینوس غصّہ سے طیش میں آگیا۔

"بالکل واہیات ہیں جناب مگر یہ دیکھئے، موثر علاج جو سینہ بہ سینہ ہمارے آباء و اجداد سے ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا ہے" یہ کہہ کر ہم نے شیروانی کی جیب سے چند دھاتوں کے ٹکڑے نکالے اور ٹیبل پر ڈال دیئے۔ تینوں اطباء دیکھتے جھک گئے۔ ادھر لقمان صاحب نے بھی اونٹ کی طرح گردن نکالی اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد تابیل کی طرح گردن اندر سمیٹ لی۔

"یہ کیا ہے؟" سقراط بولے۔

"اس میں دنیا بھر کی تمام دھاتیں ہیں مثلاً لوہا، پیتل، کھتل، تانبا، سونا، چاندی، جست اور....."

"بس بس رہنے دیجئے.... یہ بتایئے کہ اس کا حاصل کیا ہے؟"

"اس کی انگوٹھی بنا کر پہنا دیتے ہیں، اس کا نام ہے بواسیری چھلّہ، اس کے پہنتے ہی بواسیر اس طرح بوکھلا کے شکار ہو جاتی ہے کہ بستی چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ! اسے آپ فوری جیب میں ڈال لیجئے، یہاں صرف جڑی بوٹیوں پر بحث ہوتی ہے۔ ان دھاتوں کا کیا کام؟"

"واہ.... وہ کیوں نہیں ہے جبکہ کئی دھاتیں دواؤں میں ملائی پڑتی ہیں۔"

ہم ان دھاتوں کے ٹکڑوں کو اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے پھر بول پڑے:

"کئی کشتوں میں تو صرف دھات ہی دھات شامل کرنی پڑتی ہے اور مزید برآں جڑی بوٹیوں کے اجزا پر ریسرچ کی گئی تو انھیں دھاتوں کے مرکبات ملیں گے۔"

"خیر آپ کی طولانی بحث ختم فرمائیے اور تشریف لے جایئے!" جالینوس غرّا کر بولے۔

"ہمارا انٹرویو ختم ہو گیا جناب والا؟" ہم نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" تینوں یک زبان ہو کر بولے

اور ہم فاتحانہ انداز سے باہر آگئے!

لیکن دو ماہ بعد نتیجہ ہم نے دیکھا تو ہمارا نام ندارد تھا۔

رضا نقوی واہی کا خط مناظر عاشق ہرگانوی کے نام

یہ بات سمجھنے سے مرا ذہن ہے قاصر
کیوں ایک زمانے سے ہو خاموش مناظر
اِکزام کا آسیب تو مدت ہوا بھاگا
فرصت کے ہیں دن وقت کا سرمایہ ہے وافر
پھر بند ہے کیوں سلسلۂ خط و کتابت
اس قطع تعلق کا سبب کچھ تو ہے آخر
حیرت ہے کہ دو ماہ میں اک کارڈ نہ لکھے
وہ شخص جو مکتوب نگاری میں ہو ماہر
خط کوئی مقالہ، کوئی تھیسس نہیں ہوتا
جس کے لیے تم لکھو مضامین کے دفاتر
خط لکھنا کوئی فکرِ سخن بھی نہیں ہر گز
جس میں یہ بہانا ہو "طبیعت نہیں حاضر"
"چپ پیر" کی درگاہ سے وابستہ ہوئے کیا؟
اور بیٹھ گئے بن کے اسی در کے مجاور
یا بودھ گیا کے کسی بھکشو نے پھنسایا؟
اور مسلکِ گوتم سے ہوئے تم متاثر
کیا پھر کسی جوگن کا پڑا دوش پہ سایہ!
کیا بن گئے پھر جادۂ وحشت کے مسافر
یا پھر کسی دلدار طرحدار نے پھانسا؟
یہ بات اگر ہے تو خدا حافظ و ناصر
کیا راز ہے اس "مولانا بست" کے پس پردہ
اک روز نہ اک روز وہ ہو جائے گا ظاہر

عظیم منزلوں اور نئی سرحدوں کی جانب پیش رفت

آج آندھرا پردیش عظیم منزلوں اور نئی سرحدوں کی جانب پیش رفت کر رہا ہے۔ ریاست میں ترقیاتی سرگرمیاں زور شور سے جاری ہیں۔ ۷۷-۱۹۷۶ء کے سالانہ منصوبہ کے اخراجات ۲۹۰،۳۸ کروڑ روپے کے مقابلہ میں ۷۸-۱۹۷۷ء کے لئے منصوبہ جاتی اخراجات بڑھاکر ۳۶۵،۰۷ کروڑ روپے کر دئیے گئے تھے۔ اب ان اخراجات میں مزید اضافہ ہوا ہے اور یہ ۳۸۰،۳۸ کروڑ روپے تک پہنچ گئے ہیں۔

زرعی شعبہ حسب دستور مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔ کثیر پیداواری اقسام کے پروگرام کے تحت کاشت کاری کے بڑھ چڑھ کر نشانے مقرر کئے گئے ہیں۔ کیمیائی کھاد کی اب قلت نہیں رہی ہے۔ شعبۂ آبپاشی کو ترقی دینے کے نتیجہ میں توقع ہے کہ ۷۸-۱۹۷۷ء کے دوران میں مزید ۵۵۲۷۰ ہیکٹر رقبے کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ کارپوریشن برائے فروغ آبپاشی نے لفٹ اریگیشن کی متعدد اسکیمات کی عمل آوری کا کام شروع کر دیا ہے۔

شعبۂ صنعت کے لئے ۷۷-۱۹۷۶ء میں مقررہ گنجائش اخراجات ۷،۵۷ کروڑ روپے کو بڑھاکر ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۸،۰۳ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے۔

آندھرا پردیش نئی سمتوں کی جانب پیش رفت کر رہا ہے۔ آئیے ہم سب مل کر اس پیش رفت میں سرعت پیدا کریں۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامّہ
حکومت آندھرا پردیش۔ حیدر آباد

DIPR.NO. 14-77-78/2

سید لئیق احمد
نظام آباد

میں نے سوٹ پہنا

لوگ سردی کی آمد کے منتظر رہتے ہیں کہ کب سردی آئے اور کب وہ سوٹ پہنیں۔ بڑے بڑے شہروں میں تو سُنا ہے
ا گرمی میں بھی سوٹ ڈالے رہتے ہیں بھلے ہی اندر پسینہ سے تر بہ تر ہو رہے ہوں۔

سوٹ سے " PERSONALITY " بنتی ہے جن کی نہیں ہوتی ان کی بھی۔ جن کی ہوتی ہے ان کی اور بھی نکھر جاتی ہے سکڑے
ے کندھے چوڑے نظر آتے ہیں۔ زندگی کے بوجھ سے جُھک گئے ہوں تو سیدھے ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ اگربتی پیپر موم بتی قسم کے نوجوان بھی
سم لگتے ہیں۔ مئی اور جون میں جو لڑکیاں ان کی طرف دیکھتی بھی نہ تھیں ماہ نومبر اور ڈسمبر میں سہیلی کو کہنی مار کر پوچھتی ہیں " وہ کس محلہ کا
ہے؟"

جو ذرا تندرست ہیں اور " پاجامہ " ململ کے کُرتے میں پہلوان معلوم ہوتے ہیں تو وہ سوٹ میں " JAMES BOND " لگتے ہیں
نے دوست احباب جو آپ کو دیکھ کر آنکھ چراتے تھے' اب مسکرا کر سلام کرتے ہیں۔ اتفاق سے آپ سرکاری دواخانہ چلے جائیں تو دو چار
ں آپ کو ڈاکٹر ہی سمجھ بیٹھیں گے۔

سوٹ پہننے سے دھوبی کا خرچ بھی بچتا ہے۔ گرمی میں جہاں قمیض ہر روز بدلنی پڑتی ہے سردی میں ہفتوں چلایئے۔ اگر آپ شادی شدہ
ز پھٹی ہوئی بنین اور پھٹے ہوئے آستین کی قمیض بھی پہن سکتے ہیں۔ سوٹ کے نیچے سب چل جاتا ہے اور اگر آپ کنوارے ہوں تو کوٹ
الر میں گلاب بھی لگا سکتے ہیں۔

ان ہی خوبیوں کو مدنظر رکھ کر ہم نے بھی ایک سوٹ سلوایا اور سوٹ پہننے کے بعد معلوم ہوا کہ جس طرح ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں
، رات اور دن' سکھ اور دُکھ' نفع اور نقصان ہیرو اور ویلن' محبوبہ اور بیوی۔ اسی طرح سوٹ پہننے سے فائدے ہی فائدے نہیں ہیں
س میں خرابیاں بھی ہیں۔

سوٹ میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں ڈھیر ساری جیبیں ہوتی ہیں آمدنی جو موسم گرما میں تھی وہی سردی میں ہے پھر جیب
ملنے سے کیا فائدہ؟ ویسے بھی آمدنی اور جیب کا رشتہ ایسا ہی ہے جیسے ریل گاڑی کا چھوٹے اسٹیشن سے اور پھر عورتوں کے لباس

یں تو ایک بھی جیب نہیں ہوتی خواہ وہ نوکری ہی کیوں نہ کرتی ہوں۔

جیبیں بڑھتی ہیں تو پریشانیاں بھی بڑھتی ہیں اور نہ جانے کیا کیا ردّی چیزیں جیب میں بھرے پھرتے ہیں۔ پرانی چٹھیاں، دودھ والے اور اخبار والے کا بل، کئی روز پیشتر آیا ہوا محبوبہ کا خط، پینٹ کا ٹوٹا ہوا بٹن، بیوی کے بلاؤز پیس لانے کے لئے دی گئی کترن اور تو اور سینما کے ردّی ٹکٹ بھی اتنی جیبیں نہ ہوتیں تو یہ سب کے کچرے میں گئے ہوتے۔ جیبیں ہیں تو سوچتے پڑی رہیں۔

ایک مرتبہ ہم اپنے دوست کے یہاں سوٹ میں ملبوس پہنچے۔ سیکل کو تالا لگایا اور ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے "سردی بہت ہے" سے لے کر دفتری کام پر پہنچے۔ وہاں سے بنگلہ دیش ہوتے ہوئے فلموں اور رشی کپور نیتو سنگھ تک۔ تب تک چائے آگئی، چائے میں شکر کم تھی اس لئے بڑھتی ہوئی مہنگائی پر آگئے۔ پھر اس کے بعد خدا حافظ کہتے ہوئے باہر آگئے ہمارے میزبان اب تک ہم سے دوبارہ ہاتھ ملا چکے ہیں۔ ایک مرتبہ ڈرائنگ روم کے اندر اور ایک بار ڈرائنگ روم کے باہر۔ لیکن ہم ہیں کہ کبھی ایک جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور کبھی دوسرے میں۔ سیکل کی چابی نہیں ملتی۔ پینٹ کی جیبیں دیکھ لیں، کوٹ کی جیبوں کو بھی اچھی طرح کھنگال ڈالا۔ ہم اپنے آپ کو ایک بے وقوف محسوس کر رہے ہیں۔

میزبان سوچتے ہیں کہ چابی شاید اندر ہی رہ گئی ہو۔ وہ کبھی میز پر اور کبھی صوفے کے نیچے دیکھ رہے ہیں۔ بچوں سے پوچھ تاچھ کر رہے ہیں ـــــ اور ادھر چابی ہمارے ہی جیب سے برآمد ہوئی۔ کاغذوں میں پھنس گئی تھی ـــ ہم نے کئی بار ارادہ کیا کہ آئندہ سے ہمیشہ سیکل کی چابی پینٹ کی بائیں جیب میں ڈالا کریں گے۔ آپ پوچھیں گے کہ بائیں جیب میں کیوں؟ اس لئے کہ دائیں جیب میں رومال رہتا ہے اور رومال نکالنے میں چابی گر سکتی ہے لیکن نہ جانے کس طرح یہ چابی ہمارے دوسرے جیبوں میں پہونچ جاتی ہے۔

یہی حال پیسوں کا ہے۔ کالج میں ہمارے ایک ساتھی تھے۔ بڑے "ٹپ ٹاپ" کالج کے گیٹ پر ایک سگریٹ لیتے اور سگریٹ جلا کر ایک لمبا کش لے کر پیچھے کی جیب سے چمڑے کی خوبصورت پاکٹ نکالتے۔ اطمینان سے کھولتے پانچ پیسے اسے دیکر پاکٹ کو بند کر کے پیچھے کی جیب میں رکھ لیتے۔ ہم بڑے رشک سے انہیں دیکھتے، واہ کیا ترکیب ہے۔

ہم نے بھی ایک پاکٹ خریدا اس میں اپنا فوٹو لگایا۔ ایک خانہ میں نوٹ رکھے دوسرے خانہ میں "چلر پیسے" ہم نے سوچا پیچھے کی جیب میں پاکٹ محفوظ نہیں رہے گا۔ اس لئے کوٹ کی جیب میں رکھا ـــ کہاں تو ہم اپنی ہی جیبوں سے پریشان ہیں اور کچھ لوگ ہیں کہ دوسروں کی جیب کی بھی خبر رکھتے ہیں۔ ایک "استاد" نے ہماری پاکٹ مار دی۔ وہ تو غنیمت جانیئے کہ مہینے کا آخری ہفتہ تھا اس لئے زیادہ نقصان نہیں ہوا۔

اب ہم اپنے پیسوں کو الگ الگ جیب میں رکھتے ہیں۔ دس کے نوٹ ایک جیب میں ایک ایک کے دو چار نوٹ اوپر کی جیب میں اور چلر ایک الگ جیب میں۔ اس خیال سے کہ ایک جیب کٹ بھی جائے تو گھر پہنچ جائیں گے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ ہمیں خود بھی یہ یاد نہیں رہنے لگا کہ کونسے جیب میں کیا ہے۔

ایک مرتبہ ہم نے دس پیسے کا لفافہ خریدا اور جیب میں ہاتھ ڈالا تو برآمد ہوا ـــ دس کا نوٹ، دوسری جیب میں

ہاتھ ڈالا تو دو کا نوٹ برآمد ہوا اور جب ہم نے "شگوفہ" خریدا تو جیب سے نکل رہی ہے اٹھنّی۔ اب ہم اپنی سب جیبیں ٹٹول رہے ہیں۔ اس پر مصیبت یہ ہے کہ ہم دیکھنے میں تو اتنے بھولے نہیں لگتے کہ دوکاندار سمجھے کہ بےچارہ بھول گیا ہوگا۔

ایک مرتبہ ہمارا سوٹ ڈرائی کلین ہوکر آیا، کوٹ کی دونوں طرف کی جیبیں سل ہوئی تھیں۔ ہم نے سوچا یہ کیا حماقت ہے مگر پھر ہمیں محسوس ہوا کہ یہ بڑی اچھی بات ہے اب کم سے کم کوئی چیز تلاش کرنے کے لئے دو جیبیں تو کم ہوئیں اور ہم کئی دنوں تک بند جیبیں لئے گھومتے رہے ـــــ لیکن کب تک ہاتھ ہلاتے رہیئے؟ جب تک کوٹ کی جیب میں ہاتھ نہ ڈالا جائے کوٹ پہننے کا فائدہ ہی کیا؟

ہمارا نظریہ ہے کہ کوٹ کا فائدہ یہ بھی ہے کہ ویسے جو ہاتھ لٹکائے رہنا پڑتا ہے اس سے چھٹی مل جاتی ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلنا کتنا واہیات لگتا ہے۔ کم از کم ایک ہاتھ تو ہمیشہ ہی جیب میں رکھا جا سکتا ہے۔ دوسرا سلام کرنے کے لئے یا چلتے چلتے انگلیوں پر حساب لگانے کے لئے باہر رکھنا پڑتا ہے اور جب دونوں ہاتھ جیب میں ہوں تو ہم اپنے کو "لارڈ" محسوس کرتے ہیں۔

ٹھیک ہے کہ ہاتھ پینٹ کی جیب میں بھی ڈالا جا سکتا ہے لیکن ایک تو اس میں وہ آرام نہیں جو کوٹ کی جیب میں ملتا ہے دوسرے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے پھریں تو چھوکرے دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ سوچتے ہیں کہ اسے کتنا گھمنڈ ہے۔

کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے ہم ایک معتبر شخصیت یا کسی کالج کے پرنسپل لگتے ہیں۔ کوئی کچھ بھی سمجھے مگر ہم اپنے آپ کو ایسا محسوس کرتے ہیں۔

سوٹ کو دیکھ کر سبزی والے، مونگ پھلی بیچنے والے اور دوسرے دکاندار دام بڑھا دیتے ہیں۔ دس پیسے کی چیز پندرہ پیسے میں دیتے ہیں۔ روپے کی چیز سوا روپے میں۔

سوٹ سے پریشانیاں بہت ہیں لیکن یہ سوٹ ہی ہے جس کے سبب S.KUMAR کی ساڑی پہنے پرس جھلاتی، چلتی خاتون کے پیچھے پیچھے ۔ سامانوں کے بنڈل سے لدے دیکھ کر لوگ ہمیں ان کا شوہر سمجھتے ہیں کچھ اور نہیں! ▲▲

ڈھکّن رائچوری

جو ہوتائے سو ہوندے حال

دیکھ نکو تو بین ہور سال، جو ہوتائے سو ہوندے حال
اوّتاں پو تو ٹپکا رال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

بالاں جھڑگئیں داتاں گرگئیں گرتیں جوانی کے باتاں
باسی کڑی میں آیا اُبال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

بُڈّھے کوں جب شوق چرایا، پنشن لے کو شادی رچایا
دولن کی عمر سولہ سال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

کوّا چل کو ہنس کی چال، بیٹھا گنوا کو پر ہور بال
نکو چل تو ایسی چال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

اولا بدلا ماس کریلا، چھوڑ دے اُپر ولے پو
نیکی کر دریا میں ڈال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

آنگ پو چڈّی پیٹ کو کھانا نئیں ہے تو نئیں رہندے چوڑ
گھر میں دس دس بچے پال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

جینا مرنا ہے سنگات، موت لگا کو بیٹھی گھات
قبرستان میں جھونپڑی ڈال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

نکمّٹ ملیا تو بیٹھے دبا کو، جاتا تیغ ہو تو جانے دے
مال مفت کا دیدے لال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

اِس کی ٹوپی اُس کے سر، اُس کی ٹوپی اِس کے سر
ٹوپی بدل کو ٹوپی ڈال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

بولنے والا کرتا نئیں، کرنے والا بولتائے نئیں
کیلنگو ادھڑتائے بال کی کھال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

رام کی مالا جپتا جا، رحیم کی تسبیح پڑھتا جا
اپنا جان پرایا مال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

نئیں کرنا تھا کریا محبت پشتا وے سے فیدہ کیا
جی کوں مول لیا جنجال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

چاہے ڈبائے چاہے ترائے جو ہونا ہے ہو کوچ رہنگا
کشتی کو دریا میں ڈال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

پہلے پکّا ارادہ کرلے، پھر جو کرنائے کر کو چھوڑ
آج کا کام کل پو نہ ٹال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

انکھیاں دو ہیں، کاناں دو لیکن جیب ہے ایک تیری
دیکھ ہور سُن سوب جیب سنبھال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

جتّا ڈرانا بھی چاہیں لوگاں ڈرائیں بن ڈھکّن
کردے سوب کی ہوندی چال، جو ہوتائے سو ہوندے حال

پرویز یداللہ مہدی

چہ خوب — ۱۹

ہماری موجودگی کو محسوس کرتے ہی بے دھڑک نے فاتحہ کے پروگرام کو مختصر کر دیا۔ ناسمجھ کے چہرے پر اس قدر جھاڑ و پھری ہوئی تھی، وہ ڈونگرے برس رہے تھے کہ لگتا تھا جیسے "پھوپھی اماں کی بلّی" نہیں بلکہ اس کی محبوبہ، اسے داغِ مفارقت دے گئی ہے۔ قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت ہی رقت آمیز آواز میں فرمایا : "یارب جو ابھی بول رہی تھی وہ کیا ہوئی"۔ جواب میں جی میں تو آئی کہ کہدیں ہوا ہو گئی لیکن موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہم نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اشارے کے جواب میں اشارہ کرتے ہوئے جواباً یہ مصرعہ ارشاد فرمایا ؎

"خدا اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے"

"موت اموت میں بڑا فرق ہوتا ہے شہزاد صاحب!" بے دھڑک نے ہمیں اپنے غم میں برابر کا شریک محسوس کرتے ہی نہایت ہی اپنائیت سے کہا پھر ذرا رازدارانہ انداز میں بات آگے بڑھائی :

"جو ذی روح اپنے معینہ وقت پر اپنے زاویوں اور پیمانوں کے ساتھ اپنی موت آپ مرجاتے ہیں ان کی جدائی اس قدر شاق نہیں گزرتی لیکن جو بدنصیب وقت سے پہلے مار دئے جاتے ہیں، ان کے زاویے اور پیمانے بھلائے نہیں بھولتے"۔

"کیا مطلب .....؟" ہم نے گڑبڑا کر مداخلت کی۔

"کیا آپ کے زاویے اور پیمانے اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ مرحومہ اپنی طبعی موت مری ہیں؟"

بے دھڑک کے اس نئے شوشے نے ہمارے کان کھڑے کر دئے۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جواب میں ایک سوگوار سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی اور پھر کسی چغل خور عورت کی طرح کھسر پھسر والے انداز میں اس نے بات کا بتنگڑ بنانا شروع کیا :

"آپ اس بستی میں نئے نئے آئے ہیں نا! اس لئے اس بستی کے پست ذہنیت لوگوں اور ان کے گھناؤنے زاویوں اور پیمانوں سے ناواقف ہیں، یہاں بوالہوسی روا ہے اور سچی محبت گناہ، مرحومہ کا بس یہی قصور تھا۔ اس کے دل کے زاویوں اور پیمانوں میں محبت کا معصوم سا پھول کھلا تھا، پڑوس میں جو میجر صاحب رہتے ہیں، ان کے "بیامی بلّے" پر مرحومہ کا دل

آگیا تھا۔ لیکن محبت کا یہ کھیل، پھوپھی اماں کو ایک نظر نہ بھایا، اور انھوں نے ..... "

بے دھڑک بات ادھوری چھوڑ کر پاگلوں کی طرح اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا اور اس کی اس حرکت نے ہمیں بھی اس قدر بوکھلا دیا کہ مارے ڈر کے ہم بھی اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے کہ اُسے جس چیز کی تلاش ہے کہیں ہماری جیب سے برآمد نہ ہو جائے۔ قدرت کو چونکہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہماری عزت بچانی منظور تھی اس لئے وہ جسے ڈھونڈ رہے تھے گلی گلی وہ گھر کے پچھواڑے ملی کے مصداق، وہ اہم ترین "شئے" بے دھڑک کی اپنی جیب ہی سے برآمد ہوئی۔ جسے بغور مطالعہ اور معائنہ کی غرض سے اس نے ہمارے حوالہ کر دیا۔ ایک عدد چھوٹی سی شیشی تھی جیسی عموماً عطر کی شیشیاں ہوا کرتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اسے "عطر مجموعہ" کی شیشی سمجھ کر ناک کے قریب لے جا کر سونگھنے کی حماقت کرتے یا "عید ملاپ" کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے انگلیوں کی مدد سے شیشی کے اندر کا "مائع" اپنے کپڑوں پر منتقل کرتے، اس شیشی پر ایک طرف چسپاں چٹھی پر نظر پڑی جس پر "جلی" حروف میں "زہر" لکھا تھا۔ پھر کیا تھا اچانک ہاتھوں میں رعشہ طاری ہو گیا اور اگلے ہی پل شیشی ہاتھ سے پھسل گئی جسے بے دھڑک نے اپنے ہاتھوں میں اس پھرتی سے جھیل لیا جیسے ہم سے سرزد ہونے والی اس حرکت کا اسے پہلے ہی سے علم بلکہ یقینِ کامل رہا ہو۔ اور پھر قبل اس کے کہ ہم اپنی لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کوئی سوال کرتے، بے دھڑک خود ہی شروع ہو گیا:

"اب تو سارا ماجرا اپنے تمام تو زاویوں اور پیمانوں کے ساتھ آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کس نے کیسے ٹھکانے لگانے کے لئے یہ شیشی خالی کی ہے ..... حرص و ہوس کی اس بستی کے خداؤں کو یہ نہیں معلوم کہ بے لناہوں کا خون جس دن رنگ لائے گا، اس دن ان کے زاویوں اور پیمانوں کی خیر نہیں ....."

اتنا کہہ کر بے دھڑک نے نظر بھر کر "بلی" کی قبر کی طرف دیکھا اور پھر ہماری طرف دیکھے بغیر وہاں سے رخصت ہو گیا جیسے ہماری موجودگی کا احساس تک اس کے ذہن سے نکل گیا ہو ......!!!

بے دھڑک کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن ہم ابھی تک عقبی پارک کے اُسی اجاڑ حصے میں تھے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ابھی تک "مرحومہ" بلی کے قدموں میں بیٹھے تھے۔ جتنا وقت ہم نے مرحومہ کی قبر کے پاس چلّہ کشی میں بتایا تھا اس کی رُو سے تو "مجاوری" کے جائز حقدار، ہمیں قرار دیئے جا سکتے تھے۔ دراصل کوٹھی کے اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھوپھی اماں کے تعلق سے بے دھڑک کے اس مدلل انکشاف نے ہمیں اس قدر دہلا دیا تھا کہ اب موصوفہ کے سامنے جاتے ہوئے ہمارے فرشتوں پر کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ چنانچہ زندہ و تابندہ پھوپھی اماں کی اماں سے زیادہ مرحومہ بلی کے قدموں میں خود کو زیادہ محفوظ محسوس کر کے زیادہ سے زیادہ وقت یہیں بتاتے رہے اور پھر رخصت ہونے سے قبل، شبنو کے اصرار پر ڈرتے مرتے 'خدا حافظ' کہنے کی غرض سے بس پل بھر کے لئے ہی پھوپھی اماں کی حضور میں باریاب ہوئے، لیکن یہ پل بھر کی باریابی بھی بھاری پڑی یعنی غلطی سے پھوپھی اماں کی نظروں سے نظریں کیا ملیں یوں لگا جیسے موصوفہ کی آنکھیں نہیں بلکہ زہر کی دو چھوٹی چھوٹی شیشیاں ہیں ..... اس شاک نے ہمیں ایسی چپ لگائی کہ گھر پہنچنے تک ہم راستہ تمام چپ، سادھے رہے، بلکہ گھر پہنچ کر بھی ہم اس طرح چپ سادھے رہتے اگر گھر میں قدم رکھتے ہی ایک اس سے بھی بڑے "شاک" نے ہمیں ایک اور ذہنی جھٹکا نہ لگایا ہوتا ......!

گھر میں ایک عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی تمام نوکر چاکر بوکھلائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ قبلہ "چہ خوب" جو پچھلے کچھ دنوں سے تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے، اپنے گوشۂ تنہائی سے نکل کر اس افراتفری میں اپنی تمام تر "گھن گرج" اور "تکیہ کلام" کے ساتھ موجود تھے۔ اس بھیڑ میں بے دھڑک بھی نظر آیا۔ البتہ جس اجنبی کے ساتھ وہ مصروفِ گفتگو تھا وہ

اپنے ملئے اور پہناوے کے اعتبار سے "سپیرا" دکھائی دیتا تھا بلکہ جب اس کے گلے میں لٹکی ہوئی "بین" پر نظر پڑی تو اس کے "سپیرے" ہونے کا پورا یقین آ گیا بلکہ سپیرے کی موجودگی نے رات والے ہنگامہ کی یاد تازہ کر دی جسے پھوپھی اماں کی بلی کی موت کے سانحہ نے پس پشت ڈال دیا تھا، بلکہ اسی سانحہ نے ہمیں اس قدر بوکھلا دیا تھا کہ ہم گھر کے کسی نوکر کو یہ اطلاع دینا تک بھول گئے کہ ہمارے کمرے میں ایک عدد مار گزیدہ موجود ہے۔ ہو سکتا ہے صبح روز کی طرح صاف صفائی کی غرض سے کوئی نہ کوئی ملازم ضرور ہمارے کمرے میں گیا ہوگا اور پھر جو کچھ ہوا اس کا نتیجہ اس وقت ہماری نظروں کے سامنے تھا ہمیں دیکھتے ہی قبلہ چہ خوب نے لٹھ مار کہ لہجے میں دہاڑ لگائی: "تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے خدایا۔ جو تو نے میری چہ خوب رکھ لی، ورنہ اگر تمہیں کہیں کچھ ہو جاتا برخوردار تو پھر میں کسی کو چہ خوب دکھلانے لائق نہیں رہتا۔"

پھر موصوف شبنو سے مخاطب ہوئے — "شہزاد میاں کے کمرے سے ایک خطرناک چہ خوب برآمد ہوا ہے"

ادھر موصوف کا جملہ ختم ہوا ادھر ثبوت کے طور پر سپیرے نے لوکری میں سے اسی موذی کو باہر نکالا جس نے پچھلی رات ہماری نیند حرام کر دی تھی۔

اب جو ہم نے دن کے اجالے میں غور سے دیکھا تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ موذی خاصا لمبا اور تندرست و توانا تھا۔ اسے دیکھ کر شبنو کی چیخ نکل گئی اور وہ اچک کر اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دبک گئیں۔ سپیرے نے اپنے تمباکو زدہ دانت نکال کر اس موذی کے سر پر ایک چپت رسید کر دی اور کہا: "گھبرائیے مت سرکار، سالا ایک دم بے ضرر ہے۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا: "یعنی زہر نکالا ہوا — ؟"

"بالکل سرکار۔" سپیرے نے اثبات میں سر ہلا کر کہا بلکہ ثبوت کے طور پر اس موذی کا ٹینٹوا اس بے دردی سے دبایا کہ اس نے تڑپ کر اپنا منہ کھول دیا۔ ہم نے غور سے دیکھا واقعی زہر کی تھیلی ندارد تھی۔

قبلہ چہ خوب نے غصہ سے کہا — "بے ضرر ہو یا زہریلا، سانپ سانپ ہوتا ہے، یہ سپیرے کی اولاد قطعی طور پر انسان کو چہ خوب کر دیتی ہے۔" پھر موصوف نے ہماری پیٹھ تھپتھپا کر کہا — "میں تمہاری ہمت، حوصلے اور چہ خوب کی داد دیتا ہوں برخوردار، تم نے اس موذی کو آخر قابو کس طرح کیا؟"

موصوف کے اس سوال کے جواب میں ہم نے رات کا واقعہ خوب مرچ مصالحہ لگا کر سنایا، ساری روداد سننے کے بعد موصوف نے ایک بار پھر ہماری پیٹھ ٹھونکی اور ہماری ہمت، حوصلے، جوانمردی اور پتہ نہیں کن کن صفتوں پر روشنی ڈالنے کے بعد نوکروں چاکروں پر "قہر چہ خوبی" برسانا شروع کیا....

"تم سب نکمے ہو، ٹانگ پسارے سوتے رہتے ہو اور پتہ نہیں کیسے کیسے چہ خوب گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔"

نوکر بے چارے دم سادھے سب کچھ سنتے رہے البتہ بے دھڑک نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش ضرور کی — :

"آپ خواہ مخواہ نوکروں پر غصہ ہو رہے ہیں، مجھے تو اس خطرناک حرکت میں کسی اور کے زاویوں اور پیمانوں کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔"

"کون ہے وہ کمینہ سازشی انسان جو ایسی اوچھی چہ خوب کر سکتا ہے۔" موصوف نے جھلا کر بے دھڑک کو ٹوک دیا۔ اور اس نے ہماری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو سکتا ہے وہ، جس کے زاویے اور پیمانے اس حد تک گر سکتے ہیں۔"

ہم نے جواباً ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا — "وہ جو کوئی بھی ہو، آئندہ ایسا کوئی کھیل نہیں کھیل سکتا۔؟"

"تم لوگ یہ کیا پہیلیوں میں چہ خوب کر رہے ہو!" موصوف نے پھر جھلا کر مداخلت کی۔
"جب تک کوئی واضح ثبوت نہیں مل جاتا کوئی زاویہ، کوئی پیمانہ ہاتھ نہیں لگ جاتا اس شخص کا نام لینا دانشمندی کے خلاف ہے۔" فی الحال بے دھڑک کے اس نپے تلے جواب کی تائید کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

—•—

"ونڈرفل لولی فگر (Wonderful Lovely Figure) — !"
مسز چہ خوب کی زبانِ مبارک سے یہ ستائشی کلمات گرچہ ہمارے ہی سراپا کی شان میں نکلے تھے کیونکہ پچھلے چند منٹوں سے محترمہ 'ناپ تول' والے انداز میں ہمارے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں، لیکن ہم نے بھی تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اپنے دائیں بائیں نظریں دوڑا کر بڑے بھولپن سے کہا:
"معاف کیجئے گا میں کچھ سمجھا نہیں؟ فگر یعنی کہ ..... جملہ ادھورا چھوڑ کر ہم نے گویا خود پر طاری کردہ حماقت مآبی میں اور اضافہ کر لیا۔
"فگر یعنی کہ ..." محترمہ نے ہمارے چھوڑے ہوئے جملے کو نہ صرف جھیل لیا بلکہ اُسے دوبارہ ہماری طرف "اسپن" کر دیا
"تھرٹی سکس، ٹونٹی فور، تھرٹی سکس (36x24x36) ..... واؤ... واؤ.....!!"
موخرالذکر "انوکھے بول" ادا کرتے وقت محترمہ نے زبرت کے کچھ بھاؤ بھی دکھائے یعنی اپنی دونوں انگشت شہادت کو ہوا میں لہرا کر ہمیں شہید کر دیا اور پھر حسبِ روایت قتل کرکے شہیدِ ناز و ادا کے حلق میں آبِ حیات ٹپکانے کی کوشش بھی کی، یعنی اپنی اس حرکت کی وضاحت فرمائی: "مجھے چونکہ ماڈلنگ سے جنون کی حد تک عشق ہے، اس لئے جب کوئی 'متناسب الاعضا' پیکر نظر آتا ہے تو منہ سے بے ساختہ تعریف نکل جاتی ہے ....."
اپنی اس پیمائشی ستائش پر جو کہ شائد بجا ہی تھی، ہم نے پہلے تو شرمانے کی ایکٹنگ کی پھر 'داد' پلٹنے کی کوشش کی ... "ابھی ابھی جو آکڑہ، یعنی کہ "فگر" آپ نے دہرایا ہے وہ میرے ناچیز خیال کے اعتبار سے صرف آپ ہی کی صنف کا پیمائشی آکڑہ ہے۔"
"ہاں! ہے تو مگر جسمانی خوبصورتی کسی کی موروثی جاگیر نہیں — "محترمہ نے اس بار "انقلاب زندہ باد" والا لہجہ اپنایا تھا۔
"میرے خیال میں یہی وہ غلط تصور ہے جو مشرقی مردوں کی اکثریت کو جسمانی خوبصورتی جیسی نعمت سے لاپروا بنائے ہوئے ہے ...! میں پوچھتی ہوں خدا کے بخشے ہوئے خوبصورت جسم کو متناسب اور متوازن رکھنا کیا صرف ہم عورتوں کے لئے ہی ضروری ہے؟"
اتنا کہہ کر محترمہ یوں جواب طلب نظروں سے ہمیں دیکھنے لگیں جیسے سارے مردانے کا ٹھیکہ ہم نے ہی لے رکھا ہو۔ اس سے پہلے کہ یہ "پیمائشی ٹنڈر" ہمارے لئے ہمیشہ کے لئے ہمارے نام 'الاٹ' ہوتا ہم نے پُرزور لہجہ میں ان کے خیال کی تائید کی: "مجھے آپ کے اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے، ہمارے ہاں عام خیال یہی ہے کہ مرد کو 'فگر' کے تعلق سے ایک دم "بے فکر" اور عورت کو اپنے 'فگر' کی فکر میں گھلتے رہنا چاہئے ..... تاہم یہ معاملہ مرد و عورت کی کنواری زندگی تک رہتا ہے لیکن جیسے ہی شادی ہوئی سارا فگر الٹ جاتا ہے یعنی فکر کی بھٹی میں تپ کر مرد کے 'فگر' چھٹ چھٹا کر شیپ (Shape) میں آنے لگتے ہیں جبکہ عورت کے 'فگر' پر بے فکری کی چکنائی چڑھ کر سارے 'شیپ'

کا ستیاناس کر دیتی ہے۔"

ہمارے اس مدلل انداز بیان نے محترمہ کو یقیناً متاثر کیا تھا کیونکہ موصوفہ نے اپنے ابروئے مصنوعی کو جنبش دے کر ایسا زاویۂ قائمہ بنایا تھا جیساکہ صحیح جواب پر ٹیچر حضرات 'ٹِک' لگاتے ہیں' پھر آگے فرمایا :

"یہ سچ ہے کہ موزوں و متناسب 'فگر' قدرت کی بہت بڑی دین ہے لیکن بعض کم عقل' قدرت کی اس دین کا صحیح فائدہ نہیں اٹھاتے ......!"

"جی ہاں' بالکل .....!" ہم نے بے خیالی میں لقمہ دیا۔

"کیا جی ہاں' بالکل .....؟" محترمہ نے ہمیں جھڑکا۔

"یہی کہ نہیں اٹھاتے ....!" ہم نے گڑبڑا کر کہا۔

"کیا نہیں اٹھاتے ؟"

"فائدہ' صحیح فائدہ ...!" ہم نے حاضر دماغی کا ثبوت دینے کے لئے حاضر جوابی سے کام لیا۔

"کس بات کا فائدہ ؟" محترمہ غالباً ہماری گھڑی بھر کی غائب دماغی کا نوٹس لے چکی تھیں' اس لئے گھس رہی تھیں۔

"یعنی کہ اُسی بات کا' جس بات کا....." ہم نے اپنی بے ربط گفتگو میں ربط پیدا کرنے کے لئے دماغ کے سارے تاروں کو جھنجھوڑ ڈالا تاکہ کوئی تو سرا 'گفتگو کے کھیلنے چھور' سے ملے اور جب سرا ہاتھ لگا تو بیانگ دہل فرمایا :

"اسی بات کا فائدہ' یعنی کہ قدرت کی پیدائشی دین تھری ڈسکس 'لونگی فر......"

ہم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا' دراصل ہماری اس اچانک بے ربطگی کا سبب تھے وہ احساسات اور جذبات جن پر ہم بہت دیر سے قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے' ہوسکتا ہے کہ ہم ان پر قابو پانے میں کامیاب بھی ہوجاتے اگر دورانِ گفتگو محترمہ نے اچانک ایناز لیشی گاون" (Gown) اتار کر "قیامتِ صغریٰ" کا ٹریلر نہ دکھایا ہوتا' ویسے بھی محترمہ کا قیامت خیز بدن لباس کی قید میں کب خاموش رہتا تھا .... اور اب تو لباس کے نام پر وہی "چارگرہ" کپڑا تھا' اگلے وقتوں میں جس کی قسمت میں عاشق کا گریبان ہونا لکھا جاتا تھا۔ اب بھلا محترمہ کا کٹیلا بدن' عاشق کے اس گریبان کی معمولی حد بندیوں کو کیا خاطر میں لاتا۔ یہ وقت دراصل محترمہ کے غسلِ آفتابی کا تھا' جو ہمارے لئے آزمائشی وقت ثابت ہو رہا تھا۔ کیونکہ غسل آفتابی کی عادی ان تو بہ شکن بلاؤں کو کیا معلوم کہ غسل آفتاب میں مصروف ان کے "ننگِ وجود" کو دیکھ کر کسی پر "غسلِ آب" واجب ہوسکتا ہے۔

محترمہ نے "ایزی چیئر" (Easy chair) پر پہلو بدل کر ایک اور قیامت خیز زاویہ بناتے ہوئے فرمایا :

"جس طرح خدا کی بخشی ہوئی دیگر نعمتوں سے غفلت برتنا گناہ ہے' اسی طرح قدرت کی بخشی ہوئی اس حسین دین سے لاپرواہی برتنا بھی ایک طرح سے کفرانِ نعمت ہے۔"

محترمہ کی اس کھلے عام دعوت کے باوجود ہم "کفرانِ نعمت" کے مرتکب ہوتے رہے۔ کیونکہ ہماری نظروں کے سامنے قوم یہود پر اترا ہوا "من و سلویٰ" تو تھا نہیں جو "کفرانِ نعمت" پر مردود قرار دیئے جاتے۔ محترمہ نے ہمیں چپ دیکھ کر آگے فرمایا :

"قدرت کی یہ دین ضائع کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ خدا نے ہمیں عقل سلیم دی ہے اسی کی مدد سے ہم اس دین کو بہتر کام میں لاسکتے ہیں اور میری نظر میں سچ پوچھو تو متناسب و متوازن جسم صرف اور صرف "ماڈلنگ" کے لئے ہی بخشا گیا ہے۔"

محترمہ نے بالآخر اپنا مقصد بلکہ نصب العین بتلا دیا : "ماڈلنگ فن بھی ہے اور پیشہ بھی' اس میں سماجی تیز بھی بڑھتا ہے اور آمدنی بھی خاصی ہوتی ہے' یعنی وہی بات آم کے آم گٹھلیوں کے دام ...."

یہاں ہمیں محترمہ سے سراسر اختلاف تھا کیونکہ اس معاملہ میں ہمارا مشاہدہ تو یہ بتاتا ہے "ماڈل" میں جب تک "رس اور کس" ہوتا ہے اس کی حیثیت "آم" کی سی ہوتی ہے اور اُسے "دام" بھی بڑے اونچے ملتے ہیں' لیکن جب سوسائٹی کی جونکیں سارا رس چوس کر اُسے گٹھلی کی شکل میں پھینک دیتے ہیں' تب اس ماڈل کا مول مٹی برابر بھی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر راہ چلتے کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے ایک روز خود مٹی میں مل جاتی ہے ...... ہم نے اس معاملہ میں کوئی بحث چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور محترمہ کی سنتے رہے' پہلو بدل کر ایک نیا وار کیا :

"لیکن تمہاری ہیروئن اپنے موزوں "فگر" سے رتی بھر فائدہ نہیں اٹھاتی ... !"

"میری ہیروئن ... !" ہم نے حیرت سے پلکیں جھپکا کر کہا : "میری ہیروئن سے کیا مراد ہے آپ کی ؟"

"ڈیر شہزادے ! تم واقعی اتنے بھولے ہو یا ......" جملہ ادھورا چھوڑ کر محترمہ ہنسنے لگیں' وہی ہذیانی ہنسی۔ پھر نہایت ہی تمسخر آمیز لہجہ میں فرمایا : "ایک خوبرو نوجوان جب کسی چھتیس[۳۶] ۔ چوبیس[۲۴] ۔ چھتیس[۳۶] "فگری" حسینہ کے گھر میں مہمان بن کر آتا ہے تو اسے اپنی ماں بہن نہیں سمجھتا' ہیروئن سمجھتا ہے ہیروئن ۔ جو اس کے خیال کے مطابق پکے آم کی طرح اسی کی گود میں گرنے کے لئے ہوتی ہے ۔" محترمہ نے راست ہمارے دل کے چور پر ہاتھ ڈالا تھا بلکہ اس کا ٹینٹوا دبوچ لیا تھا ۔ ہم واقعی بغلیں جھانکنے لگے ۔ محترمہ نے ہمیں مزید بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا :

"اور یہاں تو ہیرو بھی ایک دم چکنا چکنا ہے' بالکل فلمی کہانی کی جوڑی ہے ۔ لیکن کسی بھی فلمی کہانی میں اس وقت تک مزا نہیں آتا جب تک کہ کوئی ویلن یا ویمپ دیوار بن کر دونوں کے بیچ میں حائل نہ ہو جائے .... کہو تم کس دیوار کو پسند کرتے ہو ویلن یا ویمپ ..... ؟"

محترمہ کی اس ضرب کاری پر ہمارا بوکھلانا لازمی تھا جس سے کما حقہٗ لطف اندوز ہوتے ہوئے محترمہ نے ایک اور ضرب لگائی ..... "ڈیر ! تم تو اس طرح بوکھلا گئے جیسے میں ہی ویمپ رول .... !"

اور پھر وہی ہنسی' ہذیانی ہنسی کا دورہ' جس کے سرد پڑنے تک ہم اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا چکے تھے' اسی لئے' جواباً وار کرنے کی کوشش کی :

"چلئے آپ کی بات مان لیتا ہوں کہ میں ہیرو ہوں اور شبو ہیروئن لیکن آپ کسی صورت ویمپ نہیں ہو سکتیں آپ تو ہماری بزرگ ہیں ......"

"پھر وہی چوٹ' وہی حربہ .... !" گھڑی بھر کو محترمہ کی آنکھوں میں غصّے کا ایک کوندہ سا لپکا' جس پر فوراً ہی قابو بھی پا لیا اور آگے کہا : "بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ مجھے اب بزرگی کے اس لیبل کو قبول کر لینا چاہئے ۔ خیر چھوڑو اس بزرگی کی چمگادڑ کو' سیکڑوں ویلن اور ویمپ مل کر بھی ہیرو' ہیروئن کو ملنے سے روک نہیں سکتے ۔ اور پھر تم تو واقعی دلوں کے چور ہو ...... !"

"جی .... !" اس نئے حملے پر ہم ایک بار پھر بوکھلا اٹھے ۔

"ارے بھئی کلب کی سالگرہ کے موقع پر ٹیشنل ٹیکسٹائل والوں کی طرف سے جو فینسی ڈریس شو منعقد ہونے والا ہے اس میں حصّہ لینے کا حق یوں تو صرف کلب کے خصوصی ممبروں ہی کو حاصل ہے لیکن میں نے اپنا زور لگا کر اس میں تمہاری بھی شمولیت کی اجازت حاصل کر لی ہے ۔ تم اس قدر متناسب الاعضاء ہو کہ اگر تم اس میں شریک نہ کئے جاتے تو مجھے بڑا

افسوس ہوتا.......“ محترمہ نے پھر ایک بار ستائشی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور بات آگے بڑھائی: ”اس شو میں حصہ لینے والوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی منتخب کئے گئے ہیں اور اسی طرح ان کے کاسٹیوم بھی، جانتے ہو تمہارے نام کون سے کاسٹیوم کا قرعہ نکلا.....“ محترمہ نے رک کر ہمارے تجسس کو اور بھڑکایا اور پھر فرمایا....

”تم اس شو میں ’بغداد کے چور‘ کی حیثیت سے شامل ہو گئے!“

”بغداد کا چور!“ ہم نے گڑبڑا کر کہا۔

”ہاں.... ہزار داستان عرف الف لیلیٰ کے قصوں میں جس کا کردار لافانی ہے جو معمولی چور نہیں بلکہ دلوں کا چور بھی مشہور ہے.....“

یہ کہہ کر محترمہ نے ایسی نظروں سے ہماری طرف دیکھا، جیسے ہم سے اسی سلسلہ میں سر دست کوئی ثبوت چاہتی ہوں۔

۵۸

آئیے ہم اِن کی مدد کریں

ہندوستان کے خوددار سپوتوں یعنی قبائلیوں کی پرورش ہماری پہاڑیاں اور وادیاں بڑے چاؤ سے کرتی ہیں۔ حصول آزادی کے بعد سے ان فلاح و بہبود کے لئے بہت سی اسکیمات شروع کی گئی ہیں۔ فلاحی کاموں میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے تعلیمی فروغ کو دی جارہی ہے۔

اس وقت ۳۷۵ کی تعداد میں آشرم اسکول قائم ہیں جن میں مقیمین کی تعداد ۲۲۱۲۰ ہے۔ درج فہرست اور غیر معلنہ قبائلیوں کے لئے ۱۹۷۴-۷۵ء میں ۲۹۹ اقامت خانے تھے جو بڑھ کر ۱۹۷۶-۷۷ء میں ۳۲۳ ہوگئے۔

ریاست کے قبائلی علاقوں میں صنعتوں کو فروغ دینے کے پیش نظر بہت سی قابل قدر ترغیبات رکھی گئی ہیں جیسے محصول فروخت، اسٹامپ ڈیوٹی، محصول آب اور غیر زرعی محصول وغیرہ سے استثناء۔

آندھرا پردیش شیڈولڈ ٹرائبس کوآپریٹیو فینانس کارپوریشن قبائلیوں کی بہبودی اور آسودگی کی جانب غیر منقسم توجہ دیتا ہے۔ اس کارپوریشن نے مئی ۱۹۷۷ء کے ختم تک جملہ ۵۶٫۷۷ لاکھ روپے مالیت کی اسکیمات منظور کیں جن سے تقریباً ۲۵۰۶ قبائلی مستفید ہوئے۔

آج ہمارے قبائل عظیم منزلوں اور نئی سرحدوں کی جانب پیش رفت کر رہے ہیں۔
آئیے ہم ان کی مدد کریں۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامّہ
حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

DIPR No. 16-77-78/2.

تبصرہ

پیاز کے چھلکے

از فکر تونسوی صفحات ۲۵۶ قیمت ۱۱ روپے

پبلشر اہلوالیہ بک ڈپو 9953/4 نیرو روہتک روڈ۔ پوسٹ بکس 2507، نئی دہلی۔ 110005.

"پیاز کے چھلکے" نامور طنز و مزاح نگار فکر تونسوی کے طنزیہ کالموں کا ایک دلچسپ انتخاب ہے۔ فکر تونسوی برس ہا برس سے بے تکان روزنامہ "ملاپ" میں "پیاز کے چھلکے" کے زیر عنوان طنزیہ کالم لکھ رہے ہیں۔ کالم لکھنے کا یہ عمل اس قدر مشینی اور گردشِ ایام کا پابند ہے کہ تحریر کے تخلیقی پہلو کا متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ فکر تونسوی ہر دن ایک نیا موضوع اپنے کالم کے لئے ڈھونڈھ لیتے ہیں اور اس موضوع سے پوری طرح انصاف بھی کر جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اچھے شاعر کے آگے لفظ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یوں ذہن میں ایک خیال کوندا، لفظوں کی صورت اختیار کر گیا، لیکن موضوع یا خیال کے پیدا ہونے کی بابت اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ غیب سے خیال میں آنے والے مضامین پابند وقت نہیں ہوتے۔ لیکن فکر تونسوی اس کے لئے کبھی فکر مند نہیں نظر آتے۔ ان کے مشاہدہ و تجربہ کی دنیا وسیع ہے۔ راہ چلتے، اٹھتے بیٹھتے، خلوتوں اور جلوتوں میں ان پر غیب سے مضامین کی کشتیاں اترتی ہیں، جنھیں وہ مسلسل دلی کے ہر موسم میں، عام اور ایمرجنسی کے حالات میں، صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے جا رہے ہیں۔ "پیاز کے چھلکے" کی خوبی یہ ہے کہ وقتی مسائل کے ساتھ ساتھ ہمیشہ زندہ رہنے والے موضوعات پر بھی لکھا جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی وقتی مسائل کو اس خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ برتا گیا ہے کہ ان میں ہمیشگی پیدا ہو گئی۔ چاہے کسی دور میں پڑھیے، یہ کالم وہی لطف دیں گے۔ کالم جس موضوع کو بنیاد بنا کر لکھا گیا، اگرچہ وہ مسئلہ باقی نہیں رہا لیکن فکر کے قلم نے مسئلہ کے ساتھ اپنی تحریر کو ختم نہیں ہونے دیا۔

زیر نظر کتاب میں شامل عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ فکر کی دنیا صرف سیاسی معاملات پر محیط نہیں۔ سماجی، معاشی، تہذیبی اخلاقی، مذہبی ... ہر قسم کے تلخ و شیریں حادثات کو ان کالموں میں سمیٹا گیا ہے۔

دراصل ہمارے معاشی و ثقافتی حالات سیاست سے کچھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے آپ نے بکری خریدی ہو (مضمون میں نے بکری خریدی) یا منی بس میں سفر کیا ہو (منی بس) ملکی سیاست اور بدانتظامی ضرور زیر بحث ہوگی۔

فکر تونسوی کے ان کالموں کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے کہ یہ خالص طنزیہ ہیں یا مزاحیہ۔ ہنستے ہنستے وہ طنز کر جاتے ہیں اور طنز کرتے کرتے ہنسانے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی "بھاشن" دینے پر اتر آئیں تو ایک سنجیدہ مفکر کا بھی روپ دھار لیتے ہیں۔ پھر خوبی یہ ہے کہ وہ بھاشن دیتے ہوئے بور نہیں کرتے۔ ان کی مخاطبت ہمیشہ عوام سے ہوتی ہے۔ وہ عوامی ادیب ہیں۔ ان کی زبان بھی عوامی ہے اور مسائل بھی عوامی۔ کتاب میں شامل (۵۴) مختلف مضمونچوں میں عوام ہی کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔ جیسے لوگ غم و خوشی کے مشترکہ حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تحریر تلخ و شیریں گفتاری کا نمونہ ہے۔ طنز و مزاح کو فکر تونسوی نے کئی ایک شہ پارے دئیے ہیں جن میں یہ کتاب یقیناً اضافہ ہے

کتاب کی طباعت و کتابت اوسط ہے۔ ٹائٹل سہ رنگی و خوبصورت ہے۔ (ادارہ)

خرافات

(مراسلے)

- ......"یہ پرچہ اور اس کا اسٹاف کب تک مجرد لوگوں کے کوارٹر میں رہے گا۔ خانہ آبادی کی منزل بھی آنی چاہیئے۔" (پروفیسر) گیان چند۔ الہ آباد یونیورسٹی

- راہی + غالب "نہ میں لکھ سکا اور نہ آپ طلب کر سکے اب میری "بے غیرتی" کو معاف کیجئے اور تازہ تخلیق قبول فرمائیے۔ گلبرگہ ایک بار پھر "قحط آب" کا شکار ہو گیا ہے نل بند.... تالاب خشک اور کنویں خالی! دل ہیں کہ آنکھوں کے ساتھ بھر آئے ہیں۔ دعا کیجئے۔ کالج اور مدارس بند ہو چکے ہیں۔ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے! اس عالم کربلا و قحط آب میں مزاحیہ کلام سپرد قرطاس کر کے "ناپتہ" پانی کرنا ہے۔ ویسے اب ہر چیز کو پانی کر دینے کا عزم ہے۔" راہی قریشی۔ گلبرگہ

- "ماہ اگست کا شگوفہ" دیکھا۔ سوونیر کے ٹائٹل پیج کی تصویر کے انعامی مقابلہ کے نتیجہ میں اپنے عنوان کو اول خوشی ہوئی۔ زندہ دلان حیدرآباد کی صداقت، حق پسندی اور انصاف کا مجھے ایک بار پھر قائل ہونا پڑا۔ پٹنہ، بنگلور رانچی، دھن باد وغیرہ مختلف جگہوں سے دوست و احباب کے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ مبارکبادی کا مستحق میں خود سے زیادہ انصاف پسندی کو سمجھتا ہوں۔" جوہر سیوانی

- "عنوان کے انعامی مقابلے کے لئے جوہر سیوانی کا مصرع 'جس قلم پر تم ہو نازاں وہ ہمارے بس میں ہے' خوب چسپاں ہے۔" شفیق الرحمن، خلیل الرحمن گریڈیہ بہار

- "زندہ دلان حیدرآباد حق و انصاف کے لئے اور بہار کے مشہور و معروف مزاحیہ شاعر جوہر سیوانی عنوان کے انتخاب کے لئے ہمارے مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

محمد اسلام۔ چمن گنج۔ کانپور

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

شگوفہ کا شمارہ نومبر ۷۷ء مشہور طنز و مزاح نگار تخلص بھوپالی کے لئے وقف کیا جا رہا ہے۔

اس خصوصی اشاعت کے مہمان مدیر پروفیسر آفاق احمد ہوں گے۔

اس خصوصی شمارہ کے ساتھ ہی سالنامہ ۱۹۷۸ء کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی ہیں۔

معاونین سے درخواست ہے کہ اپنی تخلیقات قبل از قبل ارسال فرما دیں تاکہ سالنامہ وقت پر شائع ہو سکے۔

مزاحیہ ڈراما نمبر کے سلسلہ میں مختلف زبانوں کے شاہکار ڈراموں کے ترجمہ کا کام جناب ساگر سرحدی کی نگرانی میں جاری ہے اس نمبر کی ترتیب میں موصوف خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں۔

سالنامہ کی اشاعت کے بعد ہم اس خصوصی مزاحیہ ڈراما نمبر کی تاریخ کا اعلان کر سکیں گے

ہماری کوشش ہے کہ مزاحیہ ڈراما نمبر ہر اعتبار سے مکمل، دستاویزی اور ضخیم ترین ہو۔

سالنامہ میں ڈراما نمبر کے مشمولات کا اعلان کیا جائے گا۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

تخلص بھوپالی نمبر

نومبر ۱۹۷۷ء
جلد ۱۰ شمارہ ۱۱

مہمان مُدیر : پروفیسر آفاق احمد (بھوپال)

فی پرچہ : دو روپے پچیس پیسے
سالانہ : بیس روپے
بیرونِ ہند سے : ۳۵ شلنگ

ٹائٹل : طالب خوندمیری

طباعت ٹائٹل :
اسٹینڈرڈ اکوئپمنٹس، شانتی نگر ۔ حیدرآباد

لیتھو طباعت :
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد

بائنڈنگ :
محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی، روبرو عبادت خانہ حسینی ۔ حیدرآباد

۳۱ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

فون : 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ

معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد، فون نمبر 43502

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ

کیف و لذت کی انتہا ہے یہ

نقلی اور گھٹیا قوام کے استعمال سے بچئے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لئے اس کا ڈبہ اور پیکنگ کو دیکھ لیجئے۔

تیار کنندگان

گلزار حوض، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

کتابیات

تخلصیات

خراجِ عقیدت

تبصرے (بال کی کھال)

واہیات ۸۴

مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی

اُردو کے

مُنفرد طنز و مِزاح نگار

عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی

کو

خراجِ عقیدت

پیش

کرتی ہے

★

مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی 186/3 پروفیسر کالونی، بھوپال 462002

آفاق احمد

★

قیامت ہم رکاب .....

تعارف :

عبدالاحد خاں جیسا غیر شاعرانہ و غیر ادبی نام،

شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی تخلص ۔ تخلص ۔ چال ڈھال، وضع قطع سے ادیب کم فوجی زیادہ معلوم ہوتے تھے۔
کاروبار صرف طنز و مزاح کے گھوڑے دوڑانے تک محدود نہ تھا بلکہ ٹیلرنگ، موٹر کے کل پرزوں اور فوج سب ہی ان کی طبع آزمائی کا میدان ٹھہرے۔ بعد میں گزر بسر کے لئے " تجارت استخوان" اتنی راس آئی کہ بیویاں بچے، بنگلہ، باغ سب کچھ میسر رہا۔
" باکار" تھے اور رئیسوں والے روگ بلڈ پریشر کا مستقل شکار! لیکن جان دی اس سے بھی زیادہ رئیسوں والی بیماری میں ۔ ہارٹ فیل! نہ کسی سے خدمت لی اور نہ کسی کو تکلیف پہنچائی۔ خاموشی کے ساتھ ایسے سوئے کہ پھر اٹھے ہی نہیں۔

شانِ نزول :

پتہ نہیں کس حکیم ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ پہلے مقامی روزناموں اور ہفت روزوں میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اپنا رشتہ ادب کی طنز و مزاح دلّی برانچ سے استوار کیا اور پھر " بھوپال پنچ " نکالنا شروع کیا تو تین سال تک ہر ہفتے قہقہوں کے طوفان جگاتے رہے۔

ادبی دنیا میں کیسے نزول ہوا، اس سلسلہ میں مختلف راوی مختلف روایات ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ مجلس احباب میں جو مذاق نشر کیا کرتا ہوں کیوں نہ اُسے تقریر سے تحریر میں منتقل کر دوں۔۔۔
پوسٹ مارٹم رپورٹ " سے عمل جراحی شروع کیا اور پھر جب یہ سلسلہ دراز ہو گیا تو غیر کا ممنون کرم ہونے سے یہ بہتر سمجھا کہ مضمون اپنا ہو تو پرچہ بھی اپنا ہو۔ ایک غیر محتاط روایت کے مطابق " پنچ " کا اجرا اسی جذبے کا رہین منت تھا۔

دریافت کا سہرا :

آپ کی ادبی دریافت کا سہرا اپنے سر باندھنے کے متعدد " ادبی کولمبس " دعوے دار ہیں۔

لیکن ان میں نادم سیتاپوری کا کیس سب سے مضبوط ہے۔ دراصل انھوں نے ہی "مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر" کے مصداق تخلص صاحب کا اپنے نام ایک ذاتی خط دیکھ کر "پنج گردی" پر آمادہ کیا۔ بعد میں تو یہ صورت حال ہوئی کہ ایک دفعہ دریافت ہونا شرط تھا کہ جب تک جئے مسلسل دریافت ہوتے گئے۔ اس سلسلہ میں مقامی طور پر جوہر قریشی، ایم اے شاد، محمود الحسینی نے ابتدائی مضامین لکھے۔ "دبی دبی سی قیامت" کے عنوان سے دسمبر ۱۹۶۱ء میں، میں نے بھی تخلص صاحب کے فن پر قلم اٹھایا۔ مگر حق بات تو یہ ہے کہ تخلص صاحب اپنی دریافت آپ تھے۔

تخلص صاحب کا کل سرمایہ ہے تین سال کے بھوپال پنچ، چھ کتابیں اور ادھر ادھر شائع ہونے والے مختلف مضامین۔ اُن کی تحریروں کا عہد شباب سات برسوں تک قائم رہا۔ ۱۹۵۹ء میں وہ طنز و مزاح کے میدان میں وارد ہوئے اور اگست ۱۹۶۶ء تک بغیر تاج کے بادشاہ بنے رہے پھر ان کی مسلسل بیماریوں نے اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ یکسوئی کے ساتھ ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ بھوپال کے آخری طنز و مزاح والا مشاعرہ ایسا فلاپ ہوا کہ وہ بالکل بجھ گئے۔ اس ناکامی کا گھاؤ بڑا مہلک ثابت ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ مشاعرہ کی ناکامی اور افراتفری کے بعد میں نے جب گھر حاضر ہو کر معذرت چاہی میں اس وقت ان کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔

کہنے لگے : "ارے خاں ! اچھا ہی کیا۔ ورنہ اس دن سب کی عزت خطرے میں تھی"۔

دراصل تخلص صاحب کی خواہش تھی کہ یہ مشاعرہ میں کنڈکٹ کروں۔ مگر مجمع کے تیور دیکھ کر میری ہمت نے جواب دے دیا اور بار بار مائک پر میرے نام کا اعلان ہونے کے باوجود میں ڈائس پر نہیں پہنچا۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ تخلص صاحب ایسے ڈوبے ہیں کہ اب ان کا ابھرنا محال ہے !

پوسٹ مارٹم : عمل جراحی کا حق یا تو ڈاکٹروں کا ہے یا جراحوں کا یا انسان انسان کے درمیان ترقی کرنے والوں کا۔ پھر بھی تخلص صاحب کی کُل ادبی کائنات پوسٹ مارٹم رپورٹ (۱۹۶۱ء) پاندان والی خالہ حصہ اول (شیطان جاگ اٹھا (۱۹۶۲ء) پاندان والی خالہ حصہ دوم (۱۹۶۳ء) غفور میاں (۱۹۶۴ء) پاندان والی خالہ حصہ سوم) اور چند مضامین پر جو ادھر اُدھر پھیلے ہوئے ہیں۔ مشتمل ہے۔

پوسٹ مارٹم میں تخلص صاحب نے مختلف سیاسی و سماجی و ادبی شخصیتوں کا پوسٹ مارٹم کرنے پر ہی اکتفا کیا، بلکہ اُن کی رپورٹ بھی شائع کر دی ہے۔ کہنے کو اس میں جن شخصیتوں کی "چیر پھاڑ" کی گئی ہے ایک دو کو چھوڑ کر مقامی اہمیت کی ہیں مگر یہ بات یقیناً حیرت ناک ہے کہ ان شخصیتوں کے قالب میں ان کی روحیں بھی موجود ہیں جنھیں جانتے تک نہیں مگر جو اس ملک میں ہر جگہ موجود ہیں۔ وہ سیاسی لیڈر، وہ صحافی، وہ شاعر و ادیب، وہ آفیسر دہ اس رپورٹ میں تذکرہ ہے کہنے کو مقامی ہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ تخلص صاحب نے اُن دکھی رگوں پر نشتر رکھا ہے جن

سی مخصوص جسم یا مخصوص شخصیت کی قید نہیں۔

پھر خالہ ہیں بھوپال کی عورتوں کے مخصوص لہجہ میں گفتگو کرنے والی سیاست کے داؤ پیچ سے بظاہر لاتعلق مگر وہ وہ باتیں کرنے والی کہ ساری آلودگیوں کو بے نقاب کر دیں۔

غفور میاں، خالص بھوپالی پٹھان! بے پرکی اڑانے والے۔ مفلسی میں امارت کی باتیں بے علمی میں علمیت کا شور، مگر اب صرف باتیں ہی ان کا سرمایہ ہیں اور پرُعظمت ماضی کی یادیں۔

حدود کا تعیّن : کسی کے "تحریری حدود" کا تعین کرنا سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ خطرہ تخلص صاحب نے زندگی میں بھی مول لیا تھا۔ لیکن تب بھی یقین تھا کہ وہ سب سے بُرا مان جائیں مگر مجھ سے بُرا نہ مانیں گے۔ کیونکہ وہ خلوص کے قدردان تھے۔ تب میں نے لکھا تھا کہ ہماری گفتگو کا ہر فقرہ ادب نہیں ہے۔ اس لئے کیا ضروری ہے کہ ہم جو کچھ گفتگو کریں اُسے تحریر بھی کر دیں۔ تخلص صاحب قیامت کی آن بان کے ساتھ اردو کے مزاحیہ لٹریچر کی خدمت کے لئے میدان میں آئے، لیکن کیا یہ ضروری تھا کہ وہ خوش بو کی باتیں کرتے کرتے ایسی باتیں بھی کرنے لگیں جن میں مہک نہ ہو۔ قہقہہ لگانے کے لئے شستہ لطیف ضروری ہے۔

مجھے یاد ہے کہ علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی مرحوم نے ایک ملاقات کے دوران (۱۹۶۱ء) بڑے ستائشی لہجہ میں کہا تھا کہ تخلص اپنا کام جاری رکھیں۔ وہ بہت سے پیشہ ور مصنفوں سے اچھے ہیں اور خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور خطوط میں بھی اس کا اعادہ کیا۔ واقعی تخلص بہت سے پیشہ ور مصنفوں سے اچھے تھے!

آخری بات : تخلص صاحب اس بات کے بڑے شاکی رہے کہ اردو کے مستند لکھنے والے زبانی جمع خرچ کی حد تک ان کی تعریف کرتے رہے یا نجی خطوں میں ان کی تحریروں کو سراہتے رہے۔ مگر اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ان کے فن پر باقاعدہ مضامین لکھے جاتے۔

اب تخلص صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ مقامی روزنامہ "ندیم" نے خاص نمبر نکالا۔ "انکار" "الحمرا" نے بھی اپنے ادبی سیکشن میں خراج عقیدت پیش کی۔ اور اب آپ کے ہاتھوں میں "شگوفہ" کا تخلص بھوپالی نمبر ہے۔

مصطفےٰ کمال صاحب کی توجہ میں نے اس ضرورت کی طرف مبذول کرائی تھی، انھوں نے میری تجویز کو فوراً قبول کیا۔ اور اپنے اس نمبر میں ادیبوں کی ایک کہکشاں سجادی ہے۔ تخلص صاحب کی تحریر کا ہر رنگ ہے۔ اور اس پر جداگانہ مضمون۔

تخلص صاحب کے مزاحیہ و طنزیہ مضامین اور ان کی بے جگری کا ہمیشہ ذکر رہے گا۔ غفور میاں اور خالہ مرحوم بھوپال کے یادگار کردار ہیں۔ یہ شکلیں اب دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ یہ باتیں اب سننے کو نہیں ملتیں۔ ممکن ہے نئی نسل کو ان کی بہت سی باتیں

مضحکہ خیز لگیں. لیکن یہ کردار تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ "سرزمین [illegible]" کے ان کرداروں کے روپ میں ایک خاص زمانہ کا بھوپال، اس کی تہذیب اور اس کی زبان زندہ ہے مجھے یقین ہے کہ ان ہی کی طرح تخلص صاحب زندہ و پائندہ رہیں گے۔

▲▲

اختر سعید

احمد بھائی

اب سے بیس سال پہلے میں احمد بھائی کا صورت آشنا تھا۔ انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا اور جب موقع ملا تو دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ غالباً ۵۷ء یا ۵۸ء میں بھوپال کے فساد زدہ لوگوں کی قانونی امداد کے سلسلہ میں مجھ سے ملے اور ہمارا ایک دوسرے سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ وہ بڑی باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے، دو چار ملاقاتوں ہی میں ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اور ان کی دلچسپ باتوں نے گفتنی سے ناگفتنی تک کی مسافت ایک جست میں طے کرلی۔ اس وقت یہ گمان بھی نہ تھا کہ باتوں ہی باتوں میں احمد بھائی قلم اٹھالیں گے اور ایک زقند بھر کر طنز و مزاح کے دربار میں شہرت و قبولیت کی کرسی پر سینہ تانے بیٹھے ہوں گے۔

جب انھوں نے بھوپال پنچ جاری کیا تو لوگوں کو یقین ہی نہ آیا کہ یہ خود لکھتے ہیں، یقین آتا بھی کیوں کر، انھیں کسی نے دیوارِ دبستاں پر نام الف لکھتے دیکھا ہی نہ تھا۔ جنھیں یہ بدگمانی نہ تھی کہ اس پردۂ زنگاری میں کوئی معشوق ہے، وہ کچھ ایسی حیرت میں تھے کہ جیسے ایک بچہ پیدا ہوتے ہی باتیں کرنے لگے، اور سننے والے منہ کھول کر رہ جائیں۔

ادب میں طنز و مزاح سے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں، پہلی جنگ عظیم میں ملّا رموزی صاحب نے گلابی اردو کا جامہ پہن کر برطانوی حکومت کے بارے میں کیا کچھ نہ لکھا۔ ایوب خاں کی ڈکٹیٹر شپ کے دور میں شوکت تھانوی نے قاضی جی کی زبان سے کیا کچھ نہ کہا۔ مدھیہ پردیش میں انضمام کے بعد پرانے بھوپال پر جو بپتا پڑی اس کی داستان سنانے کے لئے احمد بھائی نے اپنے منفرد انداز میں خالہ کا برقع اوڑھ لیا۔ خالہ میں احمد بھائی نے نچلے متوسط طبقے کا دکھڑا اور کانگریسی حکومت کی روداد کچھ اس پیرائے میں بیان کی ہے کہ ظالم نے ہنسا ہنسا کر رلا دیا ہے۔ بقول آتش

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں، گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

پدرم سلطان بود کی منہ بولتی تصویر غفور میاں ہیں جو کچھ کچھ رتن ناتھ سرشار کے خوجی سے ملتے جلتے ہیں۔

یہ بزرگ بھوپال کے کھنڈروں میں کارٹون بنے باپ دادا کے محلات ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔

خالہ اور غفور میاں کا رشتہ یہ ہے کہ دونوں بھوپال کی خاک سے اُٹھے ہیں، دونوں نے بھوپال تال کا پانی پیا ہے۔ دونوں ایک ہی جیسے جھونپڑوں میں رہتے ہیں، دونوں بھوپال کی عوامی بولی بولتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ خالہ حقیقت پسند ہیں اور حالات حاضرہ پر اپنی زبان میں بڑی تیکھی تنقید کرتی ہیں۔ غفور میاں ماضی کے خوابوں میں گم ہیں اور حالات زمانہ سے بیزار۔

احد بھائی کا خاص موضوع کانگریسی حکومت کی سماجی ناانصافی اور مسلم معاشرے کی ابتری رہا ہے۔ اس باب میں ان کی تنقیدی گرفت بڑے مسائل پر نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر اتنی سخت تھی کہ اگر خالہ کی زبان آڑے نہ آجاتی تو یا تو وہ جیل میں ہوتے یا بدلے ہوئے حالات میں وزارت کی کرسی پر۔

خالہ اور غفور میاں کے کردار اردو طنز و مزاح میں احد بھائی کی یادگار کے طور پر ہمیشہ باقی رہیں گے۔ احد بھائی نے اپنے دوستوں اور یاروں کے خاکے بھی اڑائے ہیں اور بعض ایسی جیتی جاگتی دلکش تصویریں پیش کی ہیں کہ ان کے کچھ احباب ان کے پوسٹ مارٹم کی وجہ سے مزاحیہ ادب میں ایک کردار کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔

احد بھائی بڑے ہنسوڑ بھی تھے اور بڑے دردمند دل کے مالک بھی، ان کا فن ہنسی اور آنسوؤں کا آمیزہ ہے جسے تلخابۂ شیریں بھی کہا جاسکتا ہے۔ سولہ سترہ سال کی مختصر ادبی زندگی میں انھوں نے شہرت اور ناموری کی ساری منزلیں طے کرلیں اور کئی کتابیں چھوڑ کر اور بہت سی کتابیں اپنے سینہ میں لئے ہوئے چپکے سے منہ موڑ کر چل دیئے۔ جیسے یہ بھی ان کی ایک دل لگی ہو۔ ہائے:

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

رشیدہ بیگم
ایم اے

بھائی جان

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ادیب اور شاعر کی ادبی اور نجی زندگی میں کافی تضاد ہوتا ہے۔ جو شاعر شراب کی تعریف میں تمام عمر دیوان سیاہ کرتے رہے ان کے لبوں نے شراب کو چھوا تک نہیں۔ حق و انصاف کی دہائی دینے والے اپنے خود کے گھر والوں سے انصاف نہیں کرسکے۔ مزاح نگار اپنی صورت اور تیور سے مرثیہ نگاروں کو مات دیتے رہے لیکن بھائی جان جو کچھ باہر تھے وہی اندر، اُن کی عام زندگی اور ادبی زندگی کے درمیان کوئی خلیج نہیں تھی۔ ہر وقت مسکراتا ہوا چہرہ بات بات میں چٹخنے پھڑکتے جملے جانِ محفل رونقِ مکان۔ ایک باغ و بہار شخصیت جس کا نام تھا تخلص بھوپالی۔

لیکن جب وہ صرف عبدالاحد خاں تھے اور ان کی ادبی زندگی شروع بھی نہیں ہوئی تھی اس وقت بھی ان کے طنز و مزاح سے گھر اور باہر سبھی لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ طنز و مزاح ان کی فطرت کا ہی ایک حصہ معلوم ہوتا تھا اس کی مثال ان کے آج سے تیس تینتیس سال قبل کا لکھا ہوا ایک خط ہے جو انھوں نے اپنی بھاوج (بڑے بھائی صاحب کی دوسری بیوی) کے نام شاہجہانپور سے لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے تمام گھر والوں کا اپنے مخصوص انداز میں تعارف کرایا ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی (عبدالرؤف خاں المعروف "میاں") کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "ان سے بات کی ابتداء آپ ہی کرلینا ورنہ وہ سفید ہوجائیں گے مگر بات میں پہل نہیں کریں گے، بہرحال میاں میاں ہیں، ہم دونوں بھائیوں کی قوت، جان، دل، جگر غرض قصائی کی پوری دوکان۔"

اپنی ایک بہن کے شوہر کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے۔

> "ان کے شوہر عزیز نہایت خاموش، ساکت اور "کچھ نہیں گو" واقع ہوئے ہیں۔ زمین دوز آواز میں بولتے ہیں۔ اور آدھی سے زیادہ آواز ناک کے رستے سے باہر آتی ہے یعنی خود تو بات کرنے کا کچھ نہ کچھ مقصد رکھتے

ہیں لیکن دوسروں کے لئے وہ گنگناہٹ سے آگے نہیں بڑھتی ۔ گھنٹوں مراقبہ کی حالت میں سر کے نیچے ہاتھ اور پیر پہ پیر رکھے ہوئے کمزوڑیتی بننے کے تمام مدارج خیال ہی خیال میں طے کرلیتے ہیں اور باوجود اس سوچ کے جہاں سے چلے تھے وہیں اپنے کو پاتے ہیں۔ دوکان پر صرف تین لفظ بولتے ہیں ۔ ہے ' نہیں اور قیمت "

افسوس اس طویل خط یا خاکوں کا صرف ایک صفحہ میرے ہاتھ لگا تھا جسے برسوں سے سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے ۔ یہ مختصر تعارف بعد کے مضامین " پوسٹ مارٹم " کی ابتداء تھی ۔ اسی طرح دہلی میں کئی بار ان کے پر لطف ذو معنی جملے طنزیہ و مزاحیہ فقرے گھر والوں کو سننے کو ملتے تھے ۔ ناممکن ہے کہ بھائی جان گھر میں ہوں اور کوئی شخص مسکراہٹ سے محروم رہ جائے ۔ چند واقعات جو میرے حافظہ میں اسوقت محفوظ ہیں لکھ رہی ہوں ۔

ایک بار ان کا بڑا لڑکا حلیم جو کافی سنجیدہ اور خاموش طبع ہے ۔ سامنے کھڑا کچھ بات کر رہا تھا اس کی صورت دیکھ کر کہنے لگے ۔

" یار حلیم تمہارے چہرے پر مستقل یتیم خانہ کا بورڈ لٹکا رہتا ہے کبھی تو اسے ہٹا دیا کرو "

وہ مسکرایا تو فرمانے لگے " شکر ہے اس دور میں بھی اولاد ماں باپ کا کہنا مان لیتی ہے ۔ ایک مرتبہ اماں جی نے کہا " عبد الاحد تمہارے علم میں کوئی حاجت مند ہو تو زکوٰۃ کے روپیہ رکھے ہیں اس میں سے کچھ دیدو " فوراً قریب بیٹھ گئے چہرے پر انتہائی بے چارگی طاری کر کے کہا

" اماں جی خدا کی قسم اس وقت مجھ سے زیادہ میری نظر میں کوئی دوسرا حاجت مند نہیں ہے میری جیب بالکل خالی ہے ۔ یہ زکوٰۃ کے روپیہ مجھے دیدیجئے خدا آپ کے کماتے والوں کو سلامت رکھے ۔

اماں جی بے ساختہ مسکرادیں ۔ چپل مارنے کو اٹھائی تو ہنستے ہوئے باہر چلے گئے "

کچھ ماہ قبل کی بات ہے خلاف معمول کچھ خاموش تھے میں نے کہا " ایک انگلش فلم اچھی لگی ہے دیکھ آئیے کیا ہرج ہے کہنے لگے " کون سی ہے " میں نے کہا " THE BIBLE " مسکرانے لگے ۔ میں نے جواب طلب نظروں سے دیکھا تو کہنے لگے

" خان ! (مجھے خان یا بائی کہتے تھے) " " ایک خدا کا کلام (قرآن مجید) تو ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں پایا ہوں ۔ تین خداؤں کی بات کیا پلے پڑے گی "

ایک بار اپنے ہی گھر ادنڈ میں بنی مسجد میں بڑے بھائی (عبد الصمد خان) وضو کر رہے تھے اور موذن نے وضو سے فارغ ہو کر اٹھتے ہوئے کہا " اللہ الصمد " آپ قریب سے گزر رہے تھے ۔ رک کر موذن سے کہنے لگے ۔

" یار کبھی ہمارا نام بھی لے لیا کرو ۔ وہ تو صمد سے پہلے آتا ہے "

بیچارے موذن صاحب کھسیا گئے اور خود ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے ۔ گھر کا ایک ملازم معین نام کا تھا صفائی سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا جب اس کی گندگی سے گھبرا جاتے تو اسے قریب بلا کر کہتے ۔

" معین نہانے کے کتنے پیسے لو گے " پھر جیب سے اٹھنی نکال کر دے دیتے " لو خان ! چار آنے کا صابن اور چار آنے نہانے کا انعام "

بھائی جان میں صرف یہی ایک خوبی نہیں تھی وہ روتوں کو ہنسا دیا کرتے تھے بلکہ صحیح معنوں میں ان کی شخصیت قابل احترام اور پیار کئے جانے کے قابل تھی۔ وہ انتہائی بامروت، پرخلوص، نیک سیرت اور انسان کے دل کو خدا کا گھر سمجھ کر اس کا احترام کرنے والے مومن تھے۔ ان کے مشرب میں کسی کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ تھا۔ شاید اقبال کے اس شعر کو پورے گھر بھر میں ان سے زیادہ کسی نے نہیں سمجھا۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

دینی اور مذہبی رجحان ان کے حلیے یا لباس سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کیوں کہ نہ ان کے داڑھی تھی اور نہ لباس مولویانہ! مگر ان کا عمل اور ان کی تحریر اس بات کی گواہ ہے کہ وہ ایک سچے مسلمان تھے۔ انھیں علماء دین کی قربتیں حاصل تھیں وہ ان کا احترام کرتے تھے۔ بڑی عقیدت سے ان کا ذکر کرتے تھے۔ شاید ان ہی صحبتوں کا اثر تھا کہ وہ مومن میں تین خوبیاں دیکھنا پسند کرتے تھے اور یہ تین خوبیاں جن پہ خود بھی عمل پیرا تھے، تحقیق اخلاق، اخلاص اور احساس! اور بقول ان کے جس مسلمان میں یہ خوبیاں نہ ہوں اسے سجدے کر کے پیشانی داغدار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

مولانا علی میاں صاحب سے انھیں دلی لگاؤ اور محبت تھی کبھی کبھی ان کی صحبت سے فیض یاب ہونے لکھنؤ یا بریلی جایا کرتے تھے۔ "علی میاں صاحب مجھ سے مصافحہ نہیں معانقہ کرتے ہیں اور ہمیشہ مجھے اپنے قریب جگہ دیتے ہیں" ڈاکٹر اشتیاق صاحب قریشی نے ایک واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"ایک بار مولانا علی میاں صاحب کی مجلس میں کچھ علماء دین بیٹھے تھے۔ میں اور تخلص صاحب بھی موجود تھے۔ مسلمانوں کے کچھ مسائل زیر بحث تھے۔ اچانک ان میں سے کسی نے مولانا سے سوال کیا "مولانا جواہر لال کی موت کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا ہوگا"

علی میاں صاحب نے خاموشی سے انھیں دیکھا اور پھر تخلص صاحب سے کہا" اس بات کا جواب آپ دیں گے"
پہلے تو تخلص صاحب نے انکساری سے جواب دیا کہ میں آپ جیسے علماء کے سامنے زبان کھولنے کی جسارت نہیں کرسکتا مگر جب علی میاں صاحب نے دوبارہ وہی الفاظ دہرائے تو تخلص صاحب نے مسکراتے ہوئے مختصر جواب دیا۔
"حضرت میں سوچتا ہوں کہ جواہر لال کے مرنے کے بعد خود جواہر لال کا کیا ہوگا"

اور مولانا علی میاں کا چہرہ اس جواب سے چمک اٹھا۔ بڑے پیار سے ان کا شانہ تھپتھپا کر حاضرین مجلس سے کہا
" سنیئے! آپ لوگ دین دار ہیں اور یہ شخص دنیا دار۔"

اور اس دنیا دار شخص کی اکثر و بیشتر پیشنگوئیاں صحیح نکلتی تھیں خواہ وہ کسی فرد واحد کے لئے ہوں، ملک کے لئے ہوں یا اپنے لئے۔ خود اپنے لئے کہا کرتے تھے " میں دونوں بھائیوں سے پہلے مروں گا کیوں کہ ان کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوں" اپنی بیوی سے کہا کرتے تھے میں تمہیں تیمارداری کی تکلیف نہیں دوں گا۔ مرنے سے تین روز قبل ان کے سالے کی بیوی نے مزاج پوچھا تو حسب عادت ہنستے ہوئے کہا۔ "موت کی ریہرسل ہو رہی ہے تین گھنٹیاں بج چکی ہیں بس آخری بجا چاہتی ہے۔ اپن تو رخصت

سفر باندھے تیار بیٹھے ہیں۔"

اسی طرح عبادت اور خیرات کو کبھی مشتہر نہیں کیا، شاید ان کے قریبی احباب کو بھی یہ نہیں معلوم کہ وہ پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے تھے۔ تلاوت قرآن مجید مع ترجمہ کے کرتے تھے۔ پاس ہی کاپی اور پن رکھا رہتا۔ گاہے گاہے اس کاپی پر احکام خداوندی نوٹ کرتے جاتے تھے۔ اسی طرح خیرات یا کسی عزیز کی مدد کو شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بھوپال کی ایک متمول شخصیت کے یہاں جب بوڑھی عورتوں کو لائن لگائے خیرات لیتے دیکھتے اور ساتھ میں ان کے نام اور رقم رجسٹر میں درج کی جاتی تو ان کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آجاتی۔ ایک بار برداشت نہیں ہوا تو مجھ سے کہنے لگے :

"لو خان ! .... کو اللہ میاں کی یادداشت پر بھی بھروسہ نہیں ہے۔ خیرات بھی لکھ کر دیتے ہیں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔"

ایک مرتبہ میرے شوہر کو بزنس کے سلسلہ میں پانچ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ اسی زمانے میں بھائی جان نے کچھ پلاٹ فروخت کئے تھے۔ روپیہ ان کے پاس تھا۔ میرے شوہر نے تین ماہ کے وعدہ سے قرض مانگا۔ دوسرے روز انھیں بلینک چک لاکر دے دیا "لو خان! جتنی ضرورت ہو خود لکھ لینا۔" پھر چلتے چلتے ہنس کر کہنے لگے "مگر یار! بیس ہزار سے زیادہ مت بھرنا، اتنا ہی روپیہ ہے اپنا بنک میں۔"

اپنے گراونڈ میں لب سڑک چھ دوکانیں تعمیر کروائیں۔ سو روپیہ فی دوکان کرایہ مقرر کیا۔ کرایہ دار بھی آگئے۔ مگر جب مہینہ آیا تو ہر کرایہ دار کا ایک ہی جواب تھا۔ صاحب دوکانیں مارکٹ سے علٰحدہ ہیں بکری تو کچھ ہوئی نہیں اتنا کرایہ کیسے دیں۔ کچھ سوچا پھر اعلان کردیا اچھا فی الحال آدھا کرایہ دیدیا کرو جب بکری ہونے لگے تو بڑھا دینا۔ سب ہی خوش ہوگئے اور چند ماہ بعد بغیر کسی تقاضہ یا جھگڑے کے دوکانداروں نے پورا کرایہ دینا شروع کردیا۔ یہ تھا ان کا خلوص، ہمدردی اور اپنائیت جو ہر کس وناکس کے دلوں کو فتح کر لیتے تھے۔

بھائی جان کو زندگی میں تین ہی شوق خاص تھے جو ہر خواہش پر غالب رہتے تھے۔ تعمیرات، پھول اور لکھنا پڑھنا خاندان میں کسی کے یہاں کوئی مکان تعمیر ہو ان سے مشورہ لینا سب ضروری سمجھتے تھے۔ خود اپنے مکان، بھائی کا، بہن کا بون مل دوکانیں، یہ سب انھیں کی نگرانی میں تعمیر ہوئے۔ مزدور کے ساتھ خود بھی دن دن بھر دھوپ میں کھڑے ہو کر کام لے رہے ہیں۔ نہ تھکاوٹ کی شکایت اور نہ بیزاری۔ مہینوں کام چل رہا ہے تو مہینوں اسی ذوق شوق میں مصروف رہیں گے۔ پھولوں کے عاشق۔ گملوں میں پھول ہیں، کیاریاں پھولوں سے بھری ہیں باہر پورا باغ تیار کر لیا۔ کاشت کی زمین خریدی وہاں بھی ہر موسم میں آنے والے پھولوں کے پودے لگائے جا رہے ہیں۔ ایک دو بار پھولوں کی نمائش میں انعام بھی پا چکے۔ قدرتی مناظر کے دلدادہ کبھی کوئی اچھا منظر دیکھ لیا تو دنوں اس کا ذکر ہو رہا ہے۔ ایک بار صبح صبح باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ املتاس کا پیڑ پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ ایک کوّا اس پر آکر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک اس کو دیکھتے رہے جب تک کہ کوّا اڑ نہیں گیا۔ پھر کہنے لگے "بخدا آج تک کوّے کو حرام صورت سمجھ کر لفٹ نہیں دی تھی مگر اس وقت ان پیلے رنگ کے پھولوں میں اس نے جان ڈال دی۔" اس کے بعد اکثر کہا کرتے تھے "خان! کوّے کا حسن

دیکھنا ہو تو پھولتے ہوئے املتاس پر دیکھو۔

روز و شب کے پروگرام کئی سال سے یکساں تھے یعنی صبح پانچ ساڑھے بجے اٹھنا، فجر کی نماز کے بعد تلاوتِ قرآن مجید، پھر دور تک چہل قدمی۔ واپسی پر پیڑوں میں پانی دینا اور پھر ناشتہ اور اس کے بعد لکھنے یا پڑھنے بیٹھ جانا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ اور شام کو دوست احباب بہن بھائیوں سے گپ شپ۔ شام کے کھانے کے بعد بیوی بچوں سے بات چیت اور دس بجے بستر پر۔

ہندوستان کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کی طرح ان کے ساتھ بھی یہ بدنصیبی رہی کہ انھیں ماحول سازگار نہیں ملا۔ گھر اور باہر کی الجھنوں نے انھیں دل کا مریض بنا دیا۔ ایک طرف ادیب شیشہ کی طرح نازک اور حساس دل دوسری طرف سخت دل لوگ جن کے الفاظ کی کاٹ دو دھاری تلوار سے بھی تیز اُن کے دل کو زخمی کرتی رہی۔ سب کو ہنسانے والا خود اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ اپنوں کی بے حسی اور بے مروتی پر کڑھتا رہا۔ خنجر کی نوک پر پھول کی یہ نازک پتی کب تک قیام کرتی آخر ۶ر اگست ۷۷ء کی رات کو غم کا یہ پیالا بھر کر چھلک گیا۔ ٹوٹ گیا۔ بکھر گیا اور اس بے قرار زندگی کو قرار آ گیا۔

مجھ سے نہ صرف میرا عزیز ترین بھائی روٹھ گیا بلکہ اُردو ادب کے لبوں سے اس کی مسکراہٹ اور قہقہے چھین لے گیا اور سرزمین بھوپال کی زبان کو زندہ کرنے والا مسیحا ہمیشہ کے لئے اسے بے زبان کر گیا۔

"تخلصی" لطیفے

کمیونسٹ مہمان : "کیا آپ نماز نہیں پڑھتے؟"

میزبان : "گھر میں پڑھ لیتا ہوں تاکہ معزز مہمان کی دل آزاری نہ ہو"

کاتب : کیوں صاحب! اور یہ آپ غلطیاں کرتے ہیں۔

ایڈیٹر : کون سی غلطی

کاتب : ہاتھی کو بڑی 'ح' سے حاتھی لکھا ہے اور بحران کو چھوٹی 'ہ' سے "بہران"

ایڈیٹر : "پہلے ذرا سمجھا کرو۔ ہاتھی اتنا بڑا جانور ہے وہ بڑی 'ح' سے ہی لکھا جائے گا اب"

کاتب : "اور یہ بہران"

ایڈیٹر : "یہ چھوٹا موٹا بہران ہے اگر کانگریس میں ہوتا تو بحران لکھا جاتا۔"

شیریں و درخشاں مستقبل

یقیناً تعلیم تیز رفتار معاشی ترقی اور عاجلانہ تیکنیکی فروغ کے لئے اہم ترین منفرد عنصر ہے۔

سال ۷۷-۱۹۷۶ء میں تقریباً ۱۰٫۹۰ لاکھ اضافہ بچوں کو اول تا پنجم جماعتوں میں داخلہ دیا گیا جس کے نتیجہ میں ۶ تا ۱۱ سال عمر والے بچوں میں، لڑکوں کے داخلہ کا فیصد ۸۴٫۴ اور لڑکیوں کے داخلہ کا فیصد ۶۰٫۹ ہوگیا کسی لحاظ سے بھی یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

ہماری ریاست میں فی الوقت ۳۵۰۰ ہائی اسکول ہیں۔ سال ۷۸-۱۹۷۷ء کے منصوبہ میں ثانوی تعلیم کے فروغ کے لئے ۶٫۴۳ کروڑ روپیوں کی کثیر رقمی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔ ریاست کے تینوں رہائشی اسکولوں کا بڑا شاندار ریکارڈ رہا ہے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ان تینوں اسکولوں کے پورے طلبہ درجہ اول سے کامیاب ہوئے۔

آندھرا پردیش ان پڑھوں کے ساتھ نئے ڈھنگ سے پیش آرہا ہے۔ چنانچہ فی الوقت ان کے فائدہ کے لئے اضلاع کرشنا، کھمم اور کڑپہ میں غیر رسمی تعلیم کی ایک اسکیم چل رہی ہے۔ اس سال ضلع عادل آباد کے علاوہ دو اور اضلاع میں بھی اس اسکیم کو لاگو کر دیا جائے گا۔

ہماری پروان چڑھتی ہوئی نسل ایک شیریں و درخشاں مستقبل کی سمت بڑھ رہی ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

DIPR.No 18/77-78/2

بھارت چند کھنہ

تخلّص بھوپالی

۱۹۶۶ء کا ذکر ہے جب کہ زندہ دلانِ حیدرآباد کی پہلی کانفرنس منعقد کی جارہی تھی۔ اس جشن کے منتظم و معتمد مجتبیٰ حسین نامی ایک نوجوان اور میں اشتہاری صدر (سوونیر کے لئے اشتہارات کے حصول کے لئے اُس سال وماہ میں موزوں ترین فرد) تھا۔

ملک کے ہر حصے سے بہترین مزاح نگار اور مزاحیہ شاعر بلائے گئے تھے۔ بمبئی سے کرشن چندر اور ان کی بیگم صاحبہ سلمیٰ صدیقی، بدایوں سے دلاور فگار، لکھنؤ سے غلام احمد فرقت کاکوروی اور احمد جمال پاشا، بھوپال سے شفیقہ فرحت، گلبرگہ سے سلیمان خطیب اور بھوپال سے تخلص بھوپالی۔ کنہیا لال کو چھوڑ کر (جنھوں نے اپنی علالت کے سبب معذوری کا اظہار کیا تھا۔ کچھ اس طرح کہ اسٹریچر پر لیٹا ہوا میں ادبی محفل کی صدارت کیسے کر سکوں گا — اور جو اس سال سے اب تک پابندی سے زندہ دلانِ حیدرآباد کے سالانہ جلسوں کے موقعہ پر علیل اور شرکت کرنے سے معذور رہے ہیں)۔ یہ لوگ طنز و مزاح کے دلان کا نچوڑ تھے۔ ظاہر ہے کہ زندہ دلانِ حیدرآباد کا یہ افتتاحی جشن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یادگار رہے گا۔

تخلص بھوپالی صاحب کے نام، کام اور مقام سے تو ہم لوگ بخوبی واقف تھے مگر شکل و صورت سے بالکل ناآشنا۔ جس گاڑی سے موصوف نے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اس گاڑی کے انتظار میں مجتبیٰ اور حمایت اللہ نام پلی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ چونکہ ان دونوں مجاہدینِ ظرافت کو تخلص صاحب سے شرفِ ملاقات کا اعزاز حاصل نہیں تھا اس لئے انھوں نے موصوف کی دریافت کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ پلیٹ فارم کے ایک سرے پر مجتبیٰ اور دوسرے پر حمایت اللہ کھڑے ہو گئے اور جیسے ہی ریل گاڑی اسٹیشن پر رُکی ان دونوں نے ڈبوں کے پاس سے گزرتے ہوئے "تخلص بھوپالی" "تخلص بھوپالی" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ان آوازوں کو سُن کر پہلی مرتبہ حیدرآباد آنے والوں نے سمجھا کہ "تخلص بھوپالی" شاید کوئی خاص حیدرآبادی پکوان ہے جس کے بیچنے والے اس جوش و خروش سے اعلان کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے ایک پلیٹ تخلص بھوپالی کی بھی طلب کی اور یہ زندہ دل "ابھی لایا صاحب" کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ جناب تخلص صاحب نے جو اپنے نام کی پکار سُنی تو ان سے پوچھنے لگے "بھئی یہ تخلص بھوپالی کیا چیز ہے؟"

اُنھوں نے کہا "صاحب! چیز تو وہ از قسم آدم ہے مگر سُنا ہے کہ وہ چیز کھانے کی نہیں بلکہ سُننے سے تعلق رکھتی ہے" تو اس طرح تخلص صاحب کی دریافت ان کی آمد پر ہوئی اور ثابت ہوا کہ تخلص بھوپالی نام کی چیز دیکھنے سے بھی تعلق نہیں رکھتی۔

دورانِ کانفرنس مجھے ان سے ملنے کا بہت کم موقعہ ملا کیونکہ غالباً انھوں نے خاکسار میں کوئی ایسی صفت نہیں پائی کہ وہ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر گلے سے لگالیتے اور مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان کے گرد ہر دم کے زندہ دلوں کے اژدہام کو چیر کر ان کی وسیع اور بسیط شخصیت کو اپنے ننھے ننھے بازوؤں میں سمیٹنے کا قصد کرتا۔

موصوف کا سب سے اچھا وصف یہی تھا کہ ان کے گرد گھیرا، خواہ کسی قسم کا ہو وہ اس میں صاف صاف نظر آجاتے تھے۔ نحیم و شحیم، پہاڑ نما لمبے چوڑے، چوڑے چکلے چہرے پر عظیم متانت، ہونٹوں پر خفیف ۔۔ نہایت خفیف قسم کی طنزیہ مسکراہٹ کا شائبہ، بڑے پُر وقار انداز سے آہستہ آہستہ بولتے اور چلتے تھے۔ رنگ گندمی، چہرے سے بریانی اور مرغ کے سالن کا متواتر اور کثیر استعمال عیاں۔ آنکھوں سے زندگی کے نشیب و فراز کا تجربہ جھانکتا ہوا، ان سے بالآخر جب ملنے کی سعادت حاصل ہوئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں مجسم شرافت و نفاست، لطیف طبع، حلم و انکسار اور تہذیب کے تودے کے سامنے کھڑا ہوں۔ آواز مدھم، آدابِ گفتگو کا خاص لحاظ۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک آتش فشاں پہاڑ کے دامن میں کھڑا تھا جو بظاہر خاموش اور سربلند مگر جب پھوٹتا تھا تو اس میں سے لاوا برآمد نہیں ہوتا تھا بلکہ طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں، ظرافت اور قہقہوں کا دریا اُبلتا اور دلچسپیوں اور جاذبیت کی بوچھاڑ ہوتی۔

میں نے تخلص بھوپالی صاحب کو نہایت مخلص اور شرافت کا پتلا پایا، حالانکہ مزاح کے میدان میں موصوف کی اہمیت کسی غازی سے کم نہیں مگر کیا مجال کہ موصوف اپنے متعلق یا اپنے کارناموں کے تعلق سے کوئی لفظ اشارۃً یا کنایۃً بھی کہیں۔ یہی نہیں بلکہ دوسروں کی توصیف و تعریف میں منہ کھول لیتے اور پھر بڑے اخلاص اور انکساری سے خاموش ہوجاتے۔ کسی ادیب اور شاعر، مدیر و مصنف میں ایسے اوصاف چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ موصوف کی یہ صفت دل موہ لینے والی تھی۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کے ترجمان رسالہ شگوفہ کے لئے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ اس کا یہ شمارہ "تخلص بھوپالی نمبر" ہے اس موقعہ پر میں دعا کرتا ہوں ـــ اس کے سوا اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں ـــ (اس کچھ اور کرسکنے کے تعلق سے اس وقت مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا ہے جو میں تخلص بھوپالی نمبر کی نذر کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب ایک نوجوان عاشق بار بار اپنی معشوقہ سے یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے آپ کو دیکھ کر بہت پیار آتا ہے۔ تو معشوقہ نے بالآخر اس ٹیپ کے بند کو روکنے کے لئے یہ پوچھا کہ آپ کو اور کیا آتا ہے) کہ خدا جناب تخلص بھوپالی صاحب کی مدح کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

یوسف ناظم

ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے!

تخلص بھوپالی تنہا شخص تھے یعنی اس پورے برصغیر میں تنہا شخص تھے، جنھوں نے لفظ تخلص کو نام کا درجہ دیا۔ تخلص بجائے خود نہ تو نام ہوتا ہے نہ صفت۔ یہ تو صرف ایک علامت شناخت ہے، جو شاعری کے پاسپورٹ میں درج کروانی پڑتی ہے۔ اردو میں دو قبیل کے شاعر ہیں، ایک تو وہ جن کا نام ہی تخلص بن گیا اور ایک وہ جن کے تخلص نے اتنی شہرت حاصل کر لی کہ ماں باپ کا اتنی محنت سے رکھا ہوا نام، خود شاعر کے ذہن سے اُتر گیا۔ تخلص بھوپالی تو شاعر بھی نہیں تھے۔ انھوں نے سوچا اگر وہ کوئی تخلص رکھ نہیں سکتے تو کم سے کم تخلص بن تو سکتے ہیں۔

تخلص بھوپالی کوئی ۴۰ سال تک مزاح لکھتے رہے۔ وہ ہم سب میں اونچے پورے تھے۔ یوں بھی ان کا قد ۶ فٹ تو ہوگا ہی۔ چونکہ پیدائشی عبدالاحد خاں تھے اس لئے تن و توش میں بھی انھوں نے کوئی کوتاہی نہیں دکھائی۔ ان سے میری کوئی خط و کتابت نہیں تھی۔ لیکن ایک ذہنی امانت تھی۔ اور وہ اکثر و بیشتر یاد آجایا کرتے تھے۔ ان سے ملاقاتیں بھی زیادہ نہیں ہوئیں صرف چار۔ پہلی مرتبہ وہ حیدرآباد کی مزاح نگاروں کی کانفرنس میں ملے۔ وہ بڑی مشکل سے حیدرآباد آئے تھے۔ بیمار تھے۔ جلسے میں تو شریک ہوئے لیکن محفلوں میں شریک نہ ہو سکے۔ وہ بہت ہی سرسری ملاقات تھی۔ صرف مسکراہٹوں کا ردوبدل ہوا۔ دوسری ملاقات بھوپال میں ہوئی۔ ۱۰ سال تو ہو ہی چکے ہوں گے۔ اُس وقت اُن کے گھر بھی جانے کا موقعہ ملا۔ اچھے خاصے صاحبِ خانہ نظر آئے۔ مکان کے احاطے میں "خانہ خدا" دیکھ کر میں اور بھی مرعوب ہوا۔ پٹھانوں کی سی تواضع کی۔ اہتمام سے کھانا کھلایا، اور اس قدر کثرت سے کھلایا کہ اس کے بعد میں جتنے دن بھوپال میں رہا کھانا کھانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کہہ رہے تھے کہ ان کے ساتھ جنگل کی سیر کو جاؤں۔ وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں باہر بہت آیا جایا کرتے تھے۔ میں نے انکار کر دیا۔ اب خیال آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے۔ ایک آدھ دن خیر سے صحبت رہتی۔ بھوپال کی اس ملاقات میں ان سے بہت باتیں ہوئیں۔ تخلص بھوپالی کی سب ادیبوں شاعروں سے خط و کتابت تھی۔ رشید احمد صدیقی کے خط بھی ان کے پاس موجود تھے۔ وہ اصل میں

پرانی سیڑھی اور نئی سیڑھی کے درمیان ایک کڑی تھے۔ میں نے تو انھیں اس وقت پڑھا تھا جب شاید خود لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ ان کی 'پان دان والی خالہ' ہر گھر کی خالہ بن چکی تھیں۔ ادب میں کرداروں کی پیدائش اور ان کی پرورش آسان نہیں ہے۔ تخلص بھوپالی نے اس 'خالہ' کو بڑی احتیاط اور لگن سے پروان چڑھایا، شاید اسی فکر میں ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ (ادبی ذمہ داری بھی کچھ کم ذمہ داری نہیں ہوتی اور خاص طور پر خالہ کی ذمہ داری تو اور زیادہ وقت مانگتی ہے۔)

ان سے تیسری ملاقات دلی میں ہوئی۔ عمیق حنفی جب دلی ریڈیو اسٹیشن پر تھے تو معلوم نہیں ان کے دل میں کیا سمائی کہ ایک دن انھوں نے دور دور سے مزاح نگاروں کو دلّی بلوا بھیجا۔ تخلص بھوپالی بھی شریک محفل تھے۔ اس وقت وہ مجھے زیادہ ہشاش بشاش نظر آئے۔ پتلون اور بند گلے کے کوٹ میں بلراج ساہنی کا ڈبل دکھائی دے رہے تھے۔ صحت بھی قدرے بہتر دکھائی دی۔ بہت خوش تھے۔ کہنے لگے، بھوپال میں مزاح نگاروں کا اجتماع کروں گا، یہ ملاقات مختصر سی تھی لیکن مفید اور مقوی۔

ان سے چوتھی اور آخری ملاقات بھوپال میں ہوئی۔ غالباً ۱۹۷۵ء میں۔ دلی میں انھوں نے جو کچھ کہا تھا پورا کر دکھایا۔ مزاح نگاروں کی کانفرنس اور مشاعرہ معمولی بات نہیں۔ اُس زمانے میں ان کی صحت خراب تھی۔ مجھے تو موڈ بھی بگڑا نظر آیا۔ لیکن کانفرنس کے دنوں میں برابر دوڑے دوڑے پھرتے رہے۔ اسٹیشنوں کے چکر لگائے۔ مہمانوں کو پھسلایا پُچکارا۔ رات گئے تک جاگتے رہے۔ بھوپال میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی اور تخلص بھوپالی پریشان تھے کہ پتہ نہیں لوگ پذیرائی کریں یا نہ کریں۔ اُس زمانے میں وہاں دو اہم سیاسی جلسے تھے لیکن اس کے باوجود نثری اجلاس اور مشاعرہ دونوں کامیاب رہے۔ تخلص بھوپالی بھی کانفرنس کے بعد ہی مسکرائے ورنہ دو دن تک مسکراہٹ ان کے چہرے کے نزدیک تک نہیں آئی۔ انھوں نے مہمانوں کو خوشی خوشی واپس کیا۔ مصافحہ کیا۔ (مصافحہ وہ ہمیشہ بیدلادی سے کرتے تھے) گلے بھی ملے۔ (اس میں وہ البتہ رعایت سے کام لیتے تھے)

تخلص بھوپالی نے قہقہہ بردوش مزاح نہیں لکھا۔ وہ مزاح کو آنکھ سے ٹپکنے والا نہیں، رگوں میں دوڑتے پھرنے والا لہو سمجھتے تھے۔ وہ مزاح کی خوشبو کے قائل تھے، ان کی آواز کے نہیں۔ ملنے جلنے میں ان کا یہی انداز تھا۔ وہ دوستی میں دھیمی لیکن دیرپا مہک کے جویا تھے۔ چند لمحوں کی چکاچوند روشنی کے مقابلے میں وہ رات بھر جلنے والی شمع کی لو زیادہ اونچے درجے کی چیز سمجھتے تھے۔ شور و غوغا انھیں زیادہ نہیں بھاتا تھا۔ وہ دنیا سے بھی اسی طرح چُپ چاپ چلے گئے۔ پتہ نہیں یہ رازداری تھی یا طرحداری۔

رات میں اچھے خاصے بستر پر لیٹے اور صبح میں نہیں اٹھے۔ بس ان کا جنازہ ہی اٹھا۔

اس قدر شتابی سے فارغ ہونے میں معلوم نہیں ان کی کیا مصلحت تھی؟!۔

تخلص بھوپالی کو ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا

خراج عقیدت

ڈیر کمال

پندرہ بیس دن قبل بھوپال سے ڈاکٹر آفاق کا خط آیا تھا کہ میں شگوفہ کے "تخلص بھوپالی نمبر" کے لئے کچھ لکھوں جس دن ڈاکٹر آفاق کا خط ملا اُسی دن پاکستان سے ابراہیم جلیس صاحب کے انتقال کی اطلاع ملی اس سانحہ سے اب تک سنبھل نہیں پایا ہوں۔ تخلص صاحب کے بارے میں کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن میں رواروی میں کچھ کہنے کا قائل نہیں ہوں۔ شفیقہ فرحت دہلی آئی تھیں تو اُن کے ذریعہ ڈاکٹر آفاق کو اطلاع بھجوائی تھی

تم نے تخلص صاحب کے لئے شگوفہ کی ایک اشاعت کو مختص کر کے بہت اچھا کیا۔ تخلص صاحب سے ۱۹۷۵ء کو پہلی بار ملاقات ہوئی تھی جب وہ مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے مگر اُن سے خط و کتابت اس سے پہلے سے تھی غالباً ۱۹۶۳ء میں جب اُن کی کتاب "غفور میاں" چھپ کر آئی تھی تو میں نے "سیاست" میں ان کی کتاب پر تبصرہ کیا تھا۔ وہ اس تبصرہ سے بہت خوش تھے۔ نہایت بے تکلفی کے ساتھ اُنھوں نے مجھے خط لکھا تھا حالانکہ وہ میرے بزرگ تھے۔ میری ہی خواہش پر اُنھوں نے بھوپال میں ۱۹۷۵ء میں مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس منعقد کی تھی۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ بات بات پہ لطیفے سُناتے تھے اور اپنے مخصوص انداز میں۔

ان کے انتقال سے اُردو کا طنزیہ اور مزاحیہ ادب ایک قد آور شخصیت سے محروم ہوگیا۔ خصوصاً بھوپال والوں کے لئے یہ سانحہ بڑا جانکاہ ہے کیونکہ تخلص صاحب کی تحریروں میں بھوپال کی تہذیب بڑی آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوتی تھی۔ "بھوپال پنچ" میں انھوں نے جو تحریریں لکھی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

وہ پٹھان تھے اور اُن کا قہقہہ بھی "پٹھان" تھا۔ زندگی کے ہر معاملہ میں ان کا رویہ پٹھانوں کا سا تھا، بیباک، راست باز اور نڈر ——

مجھے دُکھ ہے کہ میں اس دلآویز شخصیت کے بارے میں فی الحال تفصیلی طور پر لکھنے کے قابل نہیں ہوں

تمہارا اپنا

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین

ایک پلیٹ تخلص بھوپالی

ہم یوسف ناظم کو چھوڑ کر پھر اسٹیشن پہنچے۔ تخلص بھوپالی آنے والے تھے۔ تخلص صاحب کے بارے میں ہم بہت پریشان تھے آخر انھیں کس طرح ریسیو کیا جائے۔ ہم میں سے کوئی بھی تخلص صاحب سے شخصی طور پر واقف نہیں تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے جناب جاوید لطیفی کو ڈھونڈھ نکالا تھا جو تخلص صاحب سے شخصی طور پر واقف تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ تخلص صاحب کی شناخت کرنے کے لئے ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہنچ جائیں مگر پلیٹ فارم پر دور دور تک ان کا پتہ نہ تھا۔ ہم نے ہوشیاری یہ کرلی تھی کہ 'سوونیر' کی اشاعت کا بہانہ بناکر ہر مزاح نگار کی ایک ایک تصویر منگوالی تھی۔ اب ہم تخلص صاحب کی تصویر لے کر اسٹیشن پر ٹھہرے تھے۔ مگر حمایت کا استدلال یہ تھا کہ تصویر ہمیشہ دھوکہ دے جاتی ہے۔ اس پر کبھی بھروسہ نہ کرو۔ لوگ اکثر اپنی جوانی کی تصویریں بھیجتے ہیں۔ کیا پتہ کہ تخلص صاحب نے بھی ایسا ہی کیا ہو۔ ہم لوگ گاڑی آنے سے پہلے بڑی دیر تک تخلص صاحب کو پہچاننے کے مختلف طریقوں پر غور کرتے رہے۔ مگر حمایت نے اچانک چٹکی بجاکر کہا "تم لوگ فکر نہ کرو۔ ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ انھیں ڈھونڈھنا میرا ذمّہ۔ تم لوگ بس میرے ساتھ ساتھ چلتے رہو۔"

اور ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ تخلص صاحب گرانڈ ٹرنک اکسپریس کو لے کر دندناتے ہوئے پلیٹ فارم پر آگئے۔ ہم حمایت کا منہ دیکھنے لگے۔ اس نے فوراً اپنا حلیہ بگاڑا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ میں تبدیلی پیدا کی اور ہر ڈبے کے سامنے پکارنے لگا۔ "تخلص بھوپالی۔ تخلص بھوپالی ....." وہ تخلص صاحب کا نام ٹھیک اسی انداز میں پکار رہا تھا جس انداز میں اسٹیشن پر چائے بیچنے والے "چائے گرم ' چائے گرم ... پان بیڑی سگریٹ ..." کی آواز نکالتے ہیں۔ ہم لوگ اس کی اس حرکت پر ہنس ہی رہے تھے کہ اچانک ایک ڈبے میں سے کسی مسافر کی آواز آئی "اے میاں تخلص بھوپالی والے ایک پلیٹ تخلص بھوپالی ہمیں بھی دینا ....." مسافر کے اس سوال پر ہم مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ حمایت کی ترکیب ناکام ہوگئی تھی۔ مگر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اسی اثناء میں جاوید لطیفی پلیٹ فارم پر آگئے۔ انھوں

نے آتے ہی پلیٹ فارم کے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "وہ دیکھئے سگنل کے بازو جو سب سے اونچی شئے نظر آرہی ہے، وہی تخلص بھوپالی ہیں"۔ اور ہم نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر ایک پہاڑ کھڑا ہوا ہے۔ اور ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ ہم لوگ پہاڑ کی جانب دوڑ پڑے۔ پھر جاوید لطیفی نے ہم سب کا تعارف 'پہاڑ' سے کروایا۔ پہاڑ آسمان سے باتیں کر رہا تھا، اور ہم پہاڑ سے باتیں کر رہے تھے۔ تخلص بھوپالی صاحب نے ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا " بھئی! میں تو آپ کو ایک بزرگ آدمی سمجھتا تھا مگر آپ تو بالکل بچے نکلے۔"

اور میں نے کہا "جی! یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ ویسے میں بھی آپ کو ایک آدمی سمجھتا تھا، مگر آپ تو بہ اعتبارِ جسامت پانچ چھ آدمی نکلے۔" تخلص صاحب کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے، کہنے لگے۔ " بھئی میں تو آپ کے دلچسپ خطوط پڑھ کر ہی یہاں آنے پر رضامند ہو گیا ورنہ ان دنوں میری صحت بہت خراب ہے۔"

ہم تخلص صاحب کو دوارکا ہوٹل چھوڑ کر کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے.... ۸۸

(طویل رپورتاژ "ایک پلیٹ تخلص بھوپالی" سے ماخوذ)

اُردو بولنے کی مجبوری

تخلص صاحب ایک گاؤں سے اپنی جیپ میں بھوپال واپس آرہے تھے کہ ایک بالوجی نے ہاتھ کے اشارے سے جیپ روکی اور لفٹ مانگی۔

"شریمان! مجھے ایک اوشیہ کاریہ ہے آپ کو کشٹ تو ہوگا۔"

وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ تخلص صاحب نے سوچا کہ ان صاحب سے اُردو بُلوائی جائے انھوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بولے " معاف کیجئے گا اس وقت مدد کے لئے میری جیب میں کچھ نہیں ہے۔

یہ کہہ کر جوں ہی گاڑی اسٹارٹ کی۔ بالوجی فوراً بولے :

" بھائی صاحب، میں بھیک نہیں مانگ رہا مجھے بھوپال ضروری کام سے جانا ہے"

تخلص صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یوں بولئے نا! ورنہ ساری عمر سڑک پہ ہی کھڑے گذر جائے گی اور کوئی پوچھے گا بھی نہیں"

ریاست میں روشنی پھیلتے رہے

ایک پسماندہ علاقہ یا ایک ترقی پذیر ریاست کی تیز رفتار ترقی کے لئے برقی قوت کا فروغ ایک لازمی اور اولین ضرورت ہے۔ کتہ گوڑم مرحلہ نمبر ۴ کی ۱۱۰ میگا واٹ والی پہلی یونٹ کے حال ہی میں چالو ہوجانے سے ریاست میں برقی کی تنصیبی صلاحیت ۱۲۲۸ میگا واٹ ہوگئی ہے۔

ناگرجونا ساگر اور سری سیلم ہائیڈرو الکٹرک اسکیمات کی عاجلانہ تکمیل کے لئے سعودی عرب فنڈ سے بیرونی امداد کے حصول کی جو انتھک مساعی جاری تھیں، وہ بار آور ہوگئی ہیں اور ۲ جون ۱۹۷۷ء کو اس سلسلہ میں معاہدات پر دستخط کی جاچکی ہیں۔

تھرمل پاور کی پیداوار پر بھی اچھی خاصی توجہ مرکوز کی جارہی ہے۔ کتہ گوڑم تھرمل پاور اسٹیشن اسٹیج ۴ بی " توسیعی اسٹیشن کے پیش نظر ۱۱۰ میگا واٹ والی دو یونٹس کی تنصیب ہے۔ پہلی یونٹ نے کام کرنا شروع کر دیا ہے اور دوسری یونٹ ستمبر ۱۹۷۷ء سے کام شروع کر دے گی۔

ہماری ریاست میں ۲۷۲۲۱ مواضعات ہیں جن میں سے نصف کو مارچ ۱۹۷۷ء کے ختم تک برقیالیا گیا ہے جو واقعی ایک سنگ میل کی حیثیت والا کارنامہ ہے۔

آندھرا پردیش برقی قوت کی پیداوار کے سلسلہ میں خود مکتفی بن جانے کی بھرپور مساعی کر رہا ہے تاکہ ریاست کے گوشہ گوشہ میں اجالا ہو جائے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

DIPR. NO. 19/77-78/2

ڈاکٹر اخلاق اثر

تخلّص بھوپالی

تخلص بھوپالی سے پہلی ملاقات' یادگار ملاقات اور سدابہار ملاقات" پوسٹ مارٹم رپورٹ" میں ہوئی۔ پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد ان کی دوسری کتابیں پڑھیں' ان کی سوچ وفکر' اندازِ بیان اور ان کے فن سے واقفیت بڑھتی چلی گئی۔ تخلص بھوپالی نے شاعری بھی کی اور ڈرامے بھی لکھے۔ اخبارات نکالے۔ اپنے اخبار کے لئے بھی لکھا اور دوسرے اخباروں کے لئے بھی لکھا۔ پاندان والی خالہ اور غفور میاں جیسی کتابیں لکھیں۔ ان تمام تحریروں میں ان کے گہرے مشاہدہ' ان کے نفسیاتی مطالعہ سماجی اور سیاسی بصیرت کی کتنی ہی تہیں کھلتی چلی گئی ہیں۔ تخلص بھوپالی کو بیان کا سلیقہ آتا تھا لیکن ان کی مکالمہ نگاری' ان کے فن کا سب سے بڑا حربہ اور ان کی مقبولیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسی مکالمہ نگاری کے ذریعے انھوں نے بھوپال کی ٹکسالی زبان کو محفوظ کیا ہے۔ بھوپال کے مختلف طبقوں کے کرداروں کو ان کی زبان' ان کا لہجہ عطا کیا ہے اور ان کی کتابوں میں یہاں ان گفتگوں میں ڈرامائی عناصر کی بہتات شامل کردی ہے

انھوں نے ڈرامے کم لکھے' کاش زیادہ لکھے ہوتے۔

غفور میاں اور پاندان والی خالہ میں ریڈیائی تشکیل' یا ریڈیو ڈرامہ روپ کے وسیع امکانات ہیں۔ اور ریڈیو میڈیم اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ ریڈیو سے وابستگی کے دوران میری خواہش تھی کہ تخلص بھوپالی کی تحریروں کے ریڈیو ڈراما روپ نشر ہوا کریں اور اس سلسلہ میں مختلف اوقات میں ڈرامے کے شعبہ کے ذمہ داروں سے بات چیت کی جو زیادہ نہ بڑھ سکی کہ اس میں پورا خلوص اور عقیدت شامل نہیں تھی۔

اس وقت تک تخلص بھوپالی سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی پھر اُردو پروگراموں کی نشریات سے مجھے وابستہ کیا گیا تو پروگراموں کی ترتیب کے سلسلے میں نے پہلا نام جو شامل کیا وہ تخلص بھوپالی کا نام تھا۔

تخلص بھوپالی سے پہلی ملاقات بہت مایوس کن تھی' میرے تخیل کے تخلص بھوپالی اور اس حقیقی تخلص بھوپالی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ طویل القامت' لباس کے سلیقے سے

بے پروا سڑک پر کھڑے کھڑے ہاتھ ہلا ہلاکر، زوردار قہقہہ مار کر ہنسنے والا تخلص بھوپالی مجھے کچھ عجیب سا لگا پھر رفتہ رفتہ اس تخلص بھوپالی سے چونکنے لگا کہ اس کا قد ادبی تخلص بھوپالی سے نکلنے لگا تھا۔ وہ بڑے خلوص سے ملتے۔ عمر اور مقام کے فرق کو آڑے آنے نہیں دیتے۔ دل کھول کر غیر مصنوعی طریقے سے گفتگو کرتے۔ کبھی میں ان سے ملنے ان کے گھر جاتا کبھی راستے میں ملاقات ہوجاتی۔ کبھی وہ احمد برادرس کی دکان پر بہ جاتے اور کبھی غریب خانہ پر تشریف لاکر خلوص کے بوجھ سے دبا دیتے۔ میں انھیں خوش آمدید کہنے اٹھارہ بیس سیڑھیاں ایک سانس میں اُتر جاتا۔ کبھی وہ رشید احمد صدیقی کے خط کے آنے اور جواب جانے کا بتلاتے، کبھی سلمیٰ صدیقی کے رویہ سے رشید احمد صدیقی کے کرب اور گوشہ نشینی کا راز کھولتے کبھی لکھنؤ کے سفر سے واپسی پر مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، نسیم انہونوی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ساتھ دلچسپ ملاقاتوں، ادبی نشستوں اور ان بزرگوں اور ساتھیوں کے خلوص اور قدر دانی کا ذکر اس طرح کرتے کہ میں محسوس کرتا کہ ان کی زندگی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ کبھی یوسف ناظم، مصطفےٰ علی بیگ، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر، طالب خوندمیری برق آشیانوی، بوگس حیدرآبادی، گرگٹ حیدرآبادی اور دوسرے زندہ دلانِ حیدرآباد اور مزاحیہ کانفرنس کا ذکر خیر ہوتا اور کبھی آل انڈیا ریڈیو (اردو سروس) دہلی میں محفلِ طنز و مزاح کے واقعات بیان کرتے۔

تخلص بھوپالی لکھتے بھی اچھا تھے اور ان کے پڑھنے کا انداز بھی بہت دلچسپ تھا۔ مختلف کالجوں، ادبی انجمنوں اور ادب دوستوں کے یہاں ان کو مدعو کیا جاتا، پھر ان سے پڑھنے کو کہا جاتا۔ وہ تکلف کرتے، بہانے بناتے اور پھر پڑھنے پر آتے تو کئی کئی مضامین سناتے، ایک ایک لفظ، ایک ایک جملے پر داد وصول کرتے ... وہ داد جس پر صرف شاعروں کا حق ہوتا ہے اور جس پر افسانہ نگار رشک کرتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر علی شاہ کی قیام گاہ پر انھوں نے اپنی کئی تخلیقات سنائی تھیں۔ اور ناب اسٹاپ قہقہوں نے زبردست یورش کی تھی وہ ایک فرد بھی تھے اور ایک محفل بھی۔

تخلص بھوپالی نے بھوپال کی ٹکسالی زبان کے جوہر دکھائے اور یہ جوہر انھوں نے تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل کئے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند اور اختر سعید خاں بھوپالی کی زبان کے لسانی پہلو کے بارے میں تو بات کرسکتے تھے، یہ تخلص بھوپالی کے بس کی بات نہ تھی۔ میں "بھوپال ـــ ایک مطالعہ" ترتیب دے رہا تھا اور اس کے لئے مختلف موضوعات کے ماہرین سے مضامین لکھوا رہا تھا۔ تخلص بھوپالی سے "بھوپال کی ٹکسالی زبان" پر مضمون لکھنے کی درخواست کی۔ وہ کئی مہینوں تک کوشش کرتے رہے اور آخر کار انھوں نے موضوع پر گرفت نہ ہونے اور مشکل موضوع ہونے کو تسلیم کیا۔ ان کے مشورہ پر میں نے یہ مضمون محمود الحسینی صاحب سے لکھوایا۔

تخلص بھوپالی میں انانیت بھی تھی اور اظہار کی آرزو بھی۔ ریڈیو پروگراموں کے لئے آمادہ نہ ہوتے۔ کہتے میں کسی سے ملنے نہیں جاؤں گا۔ میں کہتا آپ کے استقبال کے لئے میں موجود رہوں گا، براہِ راست اسٹوڈیو لے جاؤں گا، چیک لاکر دے دوں گا تو آمادہ ہوتے۔ کانٹریکٹ جاتا تو کئی کئی بار کھو جاتا، ٹرانسمیٹر جانے والی کار سے ڈپلی کیٹ اور ٹرپلی کیٹ کانٹریکٹ روانہ کرتا، کئی دنوں بعد دستخط شدہ منظور نامہ ملتا۔ کئی کئی بار چیک کینسل ہوتا اور ریڈیو اسٹیشن کے اعلیٰ افسروں کے سامنے مجھے ندامت ہوتی اور میں تخلص بھوپالی کو ایک بڑا فن کار، ان کے ریڈیو اسٹیشن آنے کو اعزاز کہہ کر پناہ حاصل کرتا ایک پروگرام ہوتا تو تھک جاتا اور آئندہ اس اذیت سے بچنے کا عہد کرتا اور چند دنوں میں پھر یہ عہد ٹوٹ جاتا۔ ندیم کے [illegible] تخلص نمبر کی ترتیب کے [illegible] مضامین اور ملاقاتوں سے

معلوم ہوا کہ تخلص بھوپالی کی شدید خواہش تھی کہ ان پر مضامین لکھے جائیں، ان سے انٹرویو لئے جائیں اور اس خواہش میں مقام اور عمر و مرتبہ کے فرق کا خیال بھی نہیں کرتے تھے۔ ان میں حد درجہ کی انانیت بھی تھی اور چاہے جانے کی تمنا بھی۔

بھوپال میں پہلی طنز و مزاح کانفرنس ہوئی۔ اختر سعید خاں کی صدارت میں ادبی جلسہ شروع ہوا۔ پروفیسر آفاق احمد کے مضمون "بھوپال میں طنز و مزاح کی روایت" کے بعد شفیع مشہدی نے "اُردو ادب میں طنز و مزاح" پر مضمون پڑھا جس میں تخلص بھوپالی کا بھی ذکر تھا۔ بحث و مباحثہ کے وقت میں نے کہا کہ اگر ہم نے کسی ادیب کی کتابوں کو نہیں پڑھا ہے تو اس کے بارے میں ہمیں رائے دینے کا حق نہیں ہے۔ شفیع مشہدی صاحب نے تخلص صاحب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے میرے اور اہلِ بھوپال کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ بعد میں تخلص صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے اعتراض سے بہت خوش تھے اور شفیع مشہدی کی صاف گوئی کو پسند کر رہے تھے۔ انھوں نے تخلص صاحب سے معذرت کی کہ مضمون عجلت میں تیار کیا گیا تھا اور باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا جا سکا تھا۔

تخلص بھوپالی اپنے عزیزوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور ان کی موجودگی میں کسی بھی فکر سے انکار کرتے تھے۔ ان کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ جب ان کی قدری ہوتی تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ ایم طاہر کے وہ عزیز بھی تھے اور خسر بھی۔ ایم طاہر کو صحافت کا شوق ہے اور اخبارات نکالتے ہیں۔ اس نازک رشتہ کے باوجود دونوں میں بہت خلوص تھا۔ وہ مقامی سیاست کے بارے میں ایم طاہر سے کھل کر بات کرتے اور اپنے مضامین اشاعت کے لئے دیتے۔ لئی اخبارات میں ان کے مضامین چھپتے اور جب ان کو اخبارات کی کاپیاں نہیں فراہم کی جاتیں تو بہت دکھی ہوتے۔ دو ایک صاحبان نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کئے تو فرمایا کرتے کہ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایم طاہر کے تعاون سے ہی انھوں نے طنز و مزاح کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔

تخلص بھوپالی بہت کھرے اور صاف گو تھے۔ ایک بار قائدین کا ایک وفد ان سے ملاقات کے لئے گیا، مسلمانوں کی ترقی کے لئے مشورہ مانگا۔ ایک منٹ کی خاموشی کے بعد انھوں نے فرمایا کہ میرے پاس صرف ایک مشورہ ہے اور وہ یہ کہ آپ حضرات اس قوم یتیم کو بخش دیجئے، یہ خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی۔ ایک دعوت میں بورے کے گوشت کا قورمہ تیار کیا گیا تھا، بوٹیاں چھوٹی کروا دی گئی تھیں کہ بکرے کا گوشت معلوم ہو۔ انھوں نے ایک نوالہ کے بعد محسوس کر لیا اور اُٹھ گئے۔ انھیں حقائق سے اختلاف نہیں تھا، حقائق کو مسخ کرنے سے خوش نہیں تھے۔

تخلص بھوپالی کی نمایاں خوبی ان کے تعلقات کی پاکیزگی تھی وہ ہر حالت اور قیمت پر ذاتی تعلقات نباہتے تھے۔ رشید احمد صدیقی اور تخلص بھوپالی دونوں ایک دوسرے کے مداح تھے۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت تھی اور معاہدہ تھا کہ رشید احمد صدیقی کے خطوط شائع نہیں کروائے جائیں گے۔

تخلص بھوپالی اور عبدالقوی دسنوی صاحب کے درمیان بھی اچھے تعلقات تھے۔ تخلص صاحب قوی صاحب کی ادبی کوششوں کو پسند کرتے تھے اور شعبۂ اُردو کی مدد بھی کرتے تھے۔ نوائے سیفیہ کے ایک شمارہ کے مصارف بھی انھوں نے برداشت کئے۔ قوی صاحب تخلص صاحب کو مدعو کیا کرتے تھے اور شعبۂ اُردو میں ان کی صدارت میں جلسہ کروایا کرتے تھے۔ قوی صاحب کو تخلص صاحب کے پاس رشید احمد صدیقی کے خطوط کا علم ہوا تو خطوط حاصل کرنے کے لئے بضد ہو گئے۔ از راہِ خلوص تخلص صاحب نے خطوط صرف مطالعہ کے لئے فراہم کر دیئے بہت دنوں بعد تک خطوط واپس نہیں ملے اور مستقل یاد دہانیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تو تخلص صاحب نے قوی صاحب کے گھر

جا کر خطوط حاصل کر لئے۔ پھر تخلص صاحب کے اعزاز میں نہ تو ادبی جلسے ہوئے اور نہ انھیں ادبی جلسوں اور مشاعروں میں مدعو کیا گیا۔ یہ حالات میرے علم میں تھے۔

دوسری طنز و مزاح کانفرنس اور مشاعرہ کے موقعہ پر تخلص بھوپالی تشریف لائے اور پروگرام کنڈکٹ کرنے کے لئے فرمایا۔ میں نے پہلی بار معذرت کی۔ پھر انھوں نے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب اور ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب کے دعوت نامے دیئے۔ میں نے قوی صاحب کے دعوت نامے کے بارے میں پوچھا، وہ ٹال گئے۔ میں نے تھوڑی دیر بعد پھر کہا تو انھوں نے خاموشی سے ایک دعوت نامہ بغیر نام لکھے مجھے دے دیا اور کچھ نہیں کہا اور چلے گئے۔

محبی ڈاکٹر اصغر عباس صاحب سرسید ہال ریویو کا "رشید احمد صدیقی نمبر" ترتیب دے رہے تھے۔ میں نے انھیں تخلص صاحب اور رشید احمد صدیقی صاحب کے تعلق کے بارے میں لکھا۔ تخلص بھوپالی سے بھی مضمون یا خطوط کی نقلیں حاصل کرنے کے لئے لکھا۔ جواب آیا، برادرم عبدالرحیم نشتر پیروڈی پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ان کے کام کے سلسلہ میں کئی بار تخلص صاحب سے ملاقات کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ایک بار پھر کوشش کی۔ راستہ میں تیز بارش کا سامنا ہوا۔ بھیگا بھیگا پہنچ تو بے چین ہو گئے اتنا بے چین کہ میں گھبرا گیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب تشریف لائے ہوئے تھے، ان سے ملاقات کروائی اور اتنی تعریف کی کہ اس عمر میں شرم کے کرب سے واقف ہوا۔ گھر سے ناشتہ کر کے گیا تھا مگر اصرار کہ خدا کی پناہ — سلائس مکھن، اُبلے ہوئے انڈے، جلیبیاں — اور میں نے پھر شرم سے بچنے کے لئے دوہرا ناشتہ کیا۔

تخلص صاحب رشید احمد صدیقی کے خطوط کے ان حصوں کی نقلیں دینے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے جن کا تعلق خود تخلص صاحب سے تھا — ملاقات اگلے اتوار پر طے ہوئی جو نہ ہو سکی اور اس سے قبل کہ میں اگلی اتوار کو ان سے ملاقات کرتا سنیچر کے دن تین بجے ان کے انتقال اور جنازہ کی خبر ملی — نماز جنازہ سے محروم رہ گیا۔ تخلص بھوپالی کو سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس تمام وقت میں ان کی کتاب "شیطان جاگ اٹھا" میں شامل "اپنی یادیں" کو یاد کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ تخلص بھوپالی نے اپنے انتقال سے قبل اپنے انتقال اور تجہیز و تکفین کا کتنا حقیقی نقشہ کھینچا تھا۔

اور جب یہ آخری سطریں لکھ رہا ہوں تو کانوں میں تخلص بھوپالی کا یہ جملہ گونج رہا ہے —

"دیکھو خاں! میں نہ کہتا تھا، میرے بعد مجھے یاد کرو گے"

▲▲

پروفیسر ایم۔ اے شاد

اردو کا مایۂ ناز طنز نگار

طنز نگاری بہت لطیف اور نازک فن ہے۔ بقول کسی کے طنز نگار کو تلوار کی دھار پر چلنا ہوتا ہے۔ توازن، سلامت روی اور فکر کی صلاحیت طنز نگار کو اس پل صراط سے گزارے جاتی ہے۔ طنز اگر براہ راست ہو اور اس میں مزاح کا عنصر نہ ہو تو وہ ایک ترش اور تلخ تنقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر مزاح میں طنز کا پہلو شامل نہ ہو تو وہ ایک بے روح قہقہہ یا مسکراہٹ سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

طنز و مزاح کا ایسا لطیف امتزاج جس میں مقصدیت کے ساتھ تلخیٔ احساس اور شگفتگیٔ گفتار ہو اور جس پر تبسم کی رنگین چادر اس طرح پھیلی ہو کہ بادی النظر میں یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جائے کہ کہاں سے طنز اور کہاں سے مزاح کی شیرینی ایک دوسرے میں شامل ہو گئے ہیں۔

یہ غالباً ۱۹۶۰ء کی بات ہے جب تخلص صاحب کی ادارت میں "بھوپال پنچ" کے نام سے ایک ہفت روزہ کا اجرار عمل میں آیا جس کے ذریعہ تخلص صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ "بھوپال پنچ" کا اجرار کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس لئے کہ بھوپال سے اکثر و بیشتر اخبارات اور رسائل نکلا کرتے ہیں اور نکلا کرتے تھے۔ لیکن 'بھوپال پنچ' پرانی ڈگر کو چھوڑ کر ایک نئی راہ پر گامزن ہوا۔ یہ ہفت روزہ خالص طنز و مزاح پر مبنی تھا۔ اس کے تمام مضامین، اڈیٹوریل سے لے کر حرف آخر تک ایک قلم اور ایک ہی فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ بعض اوقات دیگر حضرات کے مضامین بھی شائع ہو جاتے تھے یا کوئی نظم چھپ جاتی تھی لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

عبدالاحد خاں صاحب تخلص بھوپالی ادبی و صحافتی دنیا کے لئے اس لئے نئے تھے کہ اس سے قبل انہوں نے کبھی خود کو اپنے اس روپ میں ظاہر نہیں کیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لئے تخلص صاحب کی شخصیت کے اس انوکھے پہلو نے یقیناً لوگوں کو متعجب کیا۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہوئیں لیکن بعد ازاں لوگوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ تخلص صاحب میں وہ تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک اچھے طنز و مزاح نگار میں ہو سکتی ہیں۔

تخلص صاحب نے "بھوپال پنچ" کے ذریعہ بھوپال کی مخصوص معاشرت، تہذیب، زبان اور روایات

کی عکاسی کی۔ یہیں سے ان کے مضامین کا آغاز ہوا۔ جو بعد میں "پوسٹ مارٹم رپورٹ" کے نام سے ایک مبسوط کتاب کی شکل میں سامنے آئے۔ ان مضامین کے ذریعہ تخلص صاحب نے بھوپال کی مشہور ادبی، سماجی اور ثقافتی شخصیتوں کا ایک بالکل مختلف ڈھنگ سے تجزیہ کیا۔ یہ مضامین دراصل بھوپال کی سرکردہ شخصیتوں کے سوانحی خاکے ہیں۔ جن میں طنز کی گہرائی اور مزاح کی گیرائی نے ایسا حسن پیدا کر دیا ہے، کہ عیب بھی ہنر معلوم ہوتا ہے۔

آج جبکہ ادب برائے زندگی کا مطالبہ ایک مستقل تحریک بن چکا ہے، اور شاعروں اور ادیبوں سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ عوام کے لئے لکھیں اور اس زبان میں لکھیں جسے عوام کی زبان کہا جاتا ہے۔ اہل قلم کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ نہ صرف اس تقاضے کو پورا کریں بلکہ حالات کو نوع بنوع تبدیلیوں کے ساتھ اپنی فکر، اپنے طرز بیان اور اپنے طرز نگارش میں وہ تبدیلیاں پیدا کر دیں جو ناگزیر ہیں۔ تاہم آج بھی جو زبان ہماری نظم و نثر میں استعمال کی جا رہی ہے وہ عوام کی زبان نہیں کہلائی جا سکتی لیکن تخلص صاحب نے اس کا خیال رکھا کہ جو کچھ لکھا جائے وہ اس زبان میں لکھا جائے جو لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ تخلص صاحب کی زندگی حالات کے مختلف پیچ و خم سے گزری ہے۔ انھوں نے غربت سے امارت اور شہرت کی تمام منزلوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ نے تخلص صاحب کی تحریروں میں حقائق کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ گیری پیدا کر دی ہے۔

"پوسٹ مارٹم" تخلص صاحب کی پہلی تصنیف تھی لیکن اسی ایک تصنیف نے انھیں ادب میں وہ مقام دلا دیا جو لوگوں کو برسوں کی محنتوں اور کاوشوں کے بعد ملا کرتا ہے۔ 'پوسٹ مارٹم' پر تبصرہ کرتے ہوئے غلام احمد فرقت کاکوروی لکھتے ہیں :

> "ان کی تحریروں میں بلا کا رکھ رکھاؤ اور قیامت کا طنز ہوتا ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ان کے کہنے کے مطابق نقش اول ہے، مگر بہتوں کے نقش پنجم اور ششم کو ماند کر دینے کی بدرجۂ اتم صلاحیت رکھتا ہے۔"

"پوسٹ مارٹم" نے جہاں مزاح کے اچھے پہلو پیش کئے وہاں طنز کے نشتر بھی، کہیں خلوص ہے، محبت ہے اور عقیدت کے جذبات ہیں۔ کہیں یک گونہ تلخی ہے، جلن ہے اور اس کی صورت میں مسکرانے کی کوشش ہے۔ جبکہ ان کا قلب رو رہا ہے لیکن توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔

'پوسٹ مارٹم' کے بعد تخلص صاحب کی دوسری تصنیف "خالہ" منظر عام پر آئی۔ خالہ ایک مستقل کردار تھا جو ایک مستقل عنوان "پاندان والی خالہ" کے تحت 'بھوپال پنچ' میں شائع ہوتا رہا۔ آج یہ دو جلدوں میں کتابی شکل میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تخلص صاحب نے "غفور میاں" کے نام سے ایک کردار کو جنم دیا جو 'بھوپال پنچ' کے بعد ایک منضبط کتابی شکل میں موجود ہے۔ خالہ اور غفور میاں کے مستقل کرداروں کے ذریعہ تخلص صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔

بھوپال کے متوسط اور نچلے طبقے میں بولی جانے والی عورتوں پر تخلص صاحب کو پورا پورا عبور حاصل ہے۔ عورتوں کی نفسیات، ان کا رہن سہن اور ان کے سوچنے کا انداز خالہ کے ذریعہ ہمارے سامنے کھل کر آجاتا ہے۔ خالہ سے تخلص صاحب نے بہت کام لئے ہیں۔ وہ خالہ کی زبان سے عوامی مطالبات، میونسپلٹی، سماجی رواج، قومی اور عالمی مسائل پر اس انداز سے طنز کرتے ہیں کہ طبیعت پھڑک اٹھتی ہے۔

دراصل خالہ ایک روبہ زوال تہذیب کا نمائندہ کردار ہے۔ اگرچہ یہ کوئی ناول نہیں لیکن اس میں ناول کی جملہ

خصوصیات موجود ہیں۔ تخلص صاحب نے خالہ کے ذریعہ قدیم و جدید ادوار کا تقابل کیا ہے اور ان خالاؤں کی کسمپرسی، بے کسی، بے بضاعتی پر آنسو بہائے ہیں جو انقلاب کے ریلے میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھی ہیں۔ یہ وہ خالائیں ہیں جنھوں نے انقلاب دیکھا لیکن اس کا ساتھ دینے کی سکت خود میں محسوس نہ کی یا ان کی خودداری نے اسے گوارا نہ کیا جو انقلاب کی مخالفت بھی نہ کر سکیں اس لئے کہ ان میں اتنی تاب و توانائی کہاں؟ وہ محض ایک خاموش تماشائی کی طرح قدیم و جدید دوراہے پر کھڑی ہوئی ہیں ایک گہری سوچ میں جس کا جواب ماضی میں ہے مستقبل میں نہیں!

درحقیقت تخلص صاحب نے اپنے اس کردار کے ذریعہ خوجی، مرزا ظاہر دار بیگ اور چچا چھکن وغیرہ جیسے لافانی کرداروں میں ایک اور عظیم کردار کا اضافہ کر دیا اور اس طرح اردو کے مایہ ناز فن کاروں میں اپنی جگہ بنالی۔

"خالہ" کے بعد "شیطان جاگ اٹھا" اور "غفور میاں" منظر عام پر آئے۔ "شیطان جاگ اٹھا" دراصل ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً بھوپال پنچ مرحوم میں شائع ہوتے رہے۔ ان مضامین میں زیادہ تر اصلاحی شعور کی آئینہ داری ہے۔ ان میں طنز ہے معاشرہ پر، سوسائٹی پر اور تمام اداروں پر جو عوامی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ لیکن اس میں دیانت ہے، خلوص ہے اور خوش آئند مستقبل کی امید بھی۔ ان میں سماج سے بیزاری کا احساس تو ہے لیکن فرار نہیں غفور میاں کے ذریعہ تخلص صاحب نے مردوں کے اس طبقہ کی نمائندگی کی ہے جس کے دوسرے طبقہ (عورتوں) کی نمائندگی خالہ کرتی ہیں۔ دونوں کے کرداروں میں بہت قریبی مماثلت ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ زبان کے فرق کے ساتھ اگر خالہ کو غفور میاں کی جنس اور غفور میاں کو خالہ کی جنس میں تبدیل کر دیا جائے تو کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوگا۔ دونوں ایک ہی تہذیب کے پروردہ اور شکار ہیں۔ دونوں ماضی کے جھروکوں سے دورِ گزشتہ کا نظارہ کرتے ہیں اور دورِ حاضر کا ساتھ دینے کی خود میں سکت نہیں پاتے۔ دونوں حال میں رہتے ہوئے بھی ماضی میں رہتے ہیں اور اسی میں لوٹ جانے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن حقائق انھیں اس دنیا میں کھینچ لاتے ہیں جہاں دکھ ہیں، مصیبتیں ہیں، افلاس ہے، اخلاقی پستی اور انسان دشمنی ہے۔ اگرچہ غفور میاں، خالہ کی طرح قبول عام تو حاصل نہ کر سکا لیکن اس کی سماجی اہمیت اور ادبی حیثیت سے انکار ناممکن ہے۔ تخلص صاحب کے ہاں زبان کی صورت اور اس کی شائستگی کا زیادہ خیال نہیں پایا جاتا تاہم ان کی تحریریں جاندار اور متاثر کن ہیں۔

تخلص صاحب نے جلد لینے لئے اردو کے ممتاز فن کاروں میں جگہ بنالی اور خالہ کے ذریعہ ایک زندہ رہنے والا کردار اردو کو عطا کیا ہے جو ادب میں خود ان کی حیاتِ لافانی کا ضامن ہے۔

٭٭

سماجی و معاشی ترقی کا ذریعہ

امداد باہمی کی تحریک جو لازمی طور پر ایک عوامی تحریک ہے، سماجی و معاشی ترقی کا ایک کامیاب ذریعہ ہے۔ چنانچہ ہمارے منصوبوں میں امداد باہمی شعبہ کو زبردست اہمیت دی گئی ہے۔

آندھرا پردیش نے عام آدمی کی ضروریات پوری کرنے کی خاطر اس تحریک میں ۷۵-۱۹۷۴ء سے مزید سرعت اور طاقت پیدا کر دی ہے۔ آندھرا پردیش کوآپریٹیو سنٹرل ایگریکلچرل ڈیولپمنٹ بینک (اے پی سی اے ڈی) ریاست میں پھیلے ہوئے اپنے ۲۰۴ پرائمری کوآپریٹیو ایگریکلچرل ڈیولپمنٹ بینکوں کے جال کے ذریعہ کاشت کاروں کو طویل مدتی قرضے فراہم کرتا ہے۔

ریاست میں آندھرا پردیش اسٹیٹ کوآپریٹیو بینک سے ملحق مواضعات کی سطح پر ۱۵۰۰۰ زرعی قرض کی ابتدائی سوسائٹیاں بھی قائم ہیں۔ اے پی سی اے ڈی نے ۷۶-۱۹۷۵ء کے دوران میں ۲۴ ۲۷ کروڑ روپے کے طویل المدتی قرضے فراہم کئے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں اس کی جانب سے دئے جانے والے قرضوں کی رقم ۳۲ کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہے۔

آندھرا پردیش نے شعبہ امداد باہمی میں جو کارنامے انجام دئے ہیں، ان پر وہ بجا طور پر فخر محسوس کر سکتا ہے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

DIPR. NO. 20/77-78/2

ڈاکٹر سید حامد حسین

"پوسٹ مارٹم کا پوسٹ مارٹم"

پرانے بزرگوں کے پاس فرصت کے دو محبوب مشغلے تھے۔ ایک کیمیا بنانا اور دوسرے موکلوں کو تابع کرنا۔ کبھی کبھی کیا بلکہ ہمیشہ یا الٹا پڑا کرتا تھا۔ نہ سونا ہاتھ آتا اور نہ مؤکل۔ لیکن آپ نے کبھی ایسا بھی سنا ہے کہ صورت حال اتنی بگڑی ہو کہ موکل نے عامل کو تابع کر لیا ہو۔ ایک ایسا واقعہ تقریباً پچیس سال قبل بھوپال میں ہوا جس میں عبدالاحد خاں نامی ایک شخص کو طنز و مزاح کے مؤکل نے تابع کر لیا۔ یہ نیک مرد، صاحب اہل و عیال ہوتے ہوئے بھی صاحب عقل و ہوش تھا اور دوستوں سے بے تکلفی کی حد تک تعلقات ہونے کے باوجود اپنے دھندے کے منافع کو خود پر خرچ کر لینے پر قادر تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیسے خوش مزاجی کا عمل پڑھتے پڑھتے وار الٹا پڑ گیا اور موکل نے اتنا اچانک اور اتنا شدید حملہ کیا کہ اس نیک مرد کا کوئی پینترا کام نہ آیا۔ اسے اتنی بھی مہلت نہ دی گئی کہ وہ اپنی سزا کے لئے کوئی تخلص تجویز کر لیتا چنانچہ امیر جنبی میں "تخلص" کو ہی تخلص بنا کر "بھوپال برنچ" کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ تا دم حیات یہ نیک مرد اپنے مؤکل سے گلو خلاصی حاصل نہ کر سکا۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اب بھی اس کا مؤکل یا اس کا آسیب لوگوں کی پسلیوں اور کمر کے نازک مقامات کو چھیڑ چھیڑ کر ان کی سنجیدگی کا امتحان لیتا رہتا ہے۔

اس نیک مرد کو جو خود منہ چڑھانے کے فن سے ناواقف تھا اس کے مؤکل نے آئینہ گری کا ایسا فن سکھایا جس میں شکلیں اپنے زاویئے بدل لیا کرتیں اور عکس بولنے لگتے۔ ایک بار تخلص کے ایک عکس نے مجھ سے سوال کیا:

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں اس حقیقت سے کیوں کر بہتر ہوں جس کا تم تجربہ کرتے ہو؟"

میں نے جواب دیا: "اس لئے کہ تم تخلص کی تخلیقات میں زندہ جاوید ہو جبکہ میرا تجربہ وقتی ہے، لمحاتی ہے۔"

وہ بولا: "نہیں تجربہ بھی پائدار ہو سکتا ہے۔ لیکن تمہارے تجربہ کو تمہاری مایوسیاں، ناراضگیاں اور تلخیاں پائداری بخشتی ہیں۔ تم اپنے دوستوں کو ان کی کمزوریوں سے یاد رکھتے ہو، لیکن میں انھیں تمہارے لئے گوارا اور پرلطف بنا کر پیش کرتا ہوں۔ تم اپنی خوشگوار صحبتوں کو بھلا دیتے ہو لیکن میں تمہاری تنہائیوں میں لطف و مسرت کی مہک لے کر آتا ہوں۔"

مجھے اس عکس کی بات سچ لگتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ تخلص نے "بھوپال پنچ" میں جیتے جاگتے لوگوں کا "پوسٹ مارٹم" شروع کر دیا تھا۔ لانسوں کے نشتر کی تراش ہو یا تلوار کی، کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن زندہ افراد کے گریبان کا ایک ٹانکہ بھی ادھیڑنے کے لئے قوی عضو جسم اور کارگر قانونی معلومات دونوں کا بیک وقت ہونا ضروری ہے۔ مجھے نہیں معلوم طنز و مزاح کو پروانۂ غلامی کے بعد تخلص نے اپنی مصلحت اندیشی کو کس کی کفالت میں دے دیا تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ اس نے پلا ودودھ بخشوا! پورے دور میں تیر دل کو معانقے کی دعوت دی تھی۔ بھوپال کے شاعروں، ادیبوں، سیاسی لیڈروں، مذہبی رہنماؤں، سر داروں اور بیوپاریوں سب کا قد ناپا اور پیمائش کے دوران اس نے بڑی صفائی سے ان نازک مقامات کا پتہ چلا لیا؟ عظمت کی آہنی زرہوں میں بھی گدگدی ہو سکتی تھی۔

بیس سال پہلے سے بھوپال میں بھی سنجیدگی کے قلعوں پر اُتنے ہی سنگین پہرے دار کھڑے تھے جتنے اس وقت ہیں اور جتنے ہر وقت اور ہر جگہ رہتے ہیں۔ سنجیدہ چہرے جن کی جلد دھیرے دھیرے آہنی توے کی طرح سخت ہو جاتی ہے، بعض کے معتبر امین گردانے جاتے ہیں اور جب یہ عظمت نشان ہستیاں ہم کو شرف زیارت بخشتی ہیں تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم کسی جاگتے انسانی وجود کے بالمقابل نہیں بلکہ کسی بے جان مطلق تصور سے ہم کلام ہیں۔ تخلص نے ان زندہ بتوں پر اپنے قلم سے جرّاحی کیا ہے اور جاپانی عورتوں کے گوشہ ہائے چشم کی طرح ان شخصیتوں کے گوشہ ہائے لب کو ہلکا شگاف دے کر تبسم بنا ہے۔ ان بتوں کی پلکیں جھپکتی سی لگتی ہیں اور ان کی پیشانی پر ہلکی سی نمی ابھرتی معلوم ہوتی ہے۔

تخلص نے زندہ لوگوں کا "پوسٹ مارٹم" کر کے جو ایک لاجواب شخصی میوزیم تیار کیا ہے، ان میں سے ہر شخص کی اہل بھوپال ذہن میں ایک تصویر ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے اپنے ترش، تلخ اور تلخ تر تجربوں کی بنیاد پر ان تصویروں میں گہرے ہلکے رنگ ہیں اور ان کے متعلق بیان کو طرح طرح کے "لیکن" اور "بلکہ" سے آراستہ کیا ہے۔ تخلص کے عکس ہماری ذہنوں تصویروں سے زیادہ روشن اور واضح ہیں۔ ان میں ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں اسیر تاثرات کی سیلن اور کند ھانہ نہیں ہے۔ ان میں ان شخصیتوں کا عطر ہے جس سے ہمارے تجربہ میں ایک نئی زندگی اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

تخلص کی ہر تصویر کی الگ ادا اور ہر عکس کا الگ جلوہ ہے۔ بوالعجبی کو نفسیات کے ماہرین نے انفرادیت کا متین دیا ہے اور افراد کو منفرد کرنے والی بوالعجبیوں کو تخلص نے خوب اچھی طرح سمجھا اور پہچانا ہے۔ الف لیلہ میں جنوں کو بوتل میں کرنے کے طلسمی کرشموں کا بیان ہے لیکن تخلص نے ساحری کا دعویٰ کئے بغیر آمادۂ بغاوت شخصیتوں کو اپنی چٹکی میں سمیٹ لیا ہے۔

شاعر اصغر شعری کو پہچاننے کے لئے اور کیا چاہئے:

• "شعری محفل میں رونق بنے رہتے ہیں۔ ہنس ہنس کر کلام سناتے ہیں اور ناف سے اوپر کے تمام اعضا کو متحرک کرتے ہوئے مصرعہ اولیٰ پورا اور مصرعہ ثانی کو نصف سے زیادہ پڑھ کر ایک دم بریک لگا دیتے ہیں اور خاموش ہو کر سامعین کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ سامعین بھی مطلب سمجھ کر فی الفور علم قیافہ کی مدد سے شعر پورا کر دیتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے شعری دوسرے شعر پر۔"

رائے لالہ ملک راج کو سمجھنے کے لئے یہ اشارے بہت کافی ہیں۔

• تھوڑے ہی روز میں اپنی لائن میں کامیاب پارچہ فروش کہلانے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ موصوف کپڑے کو اس قدر تیز تیز ناپتے تھے کہ گاہک جب آٹھ گز پر پہنچتا تھا تو آپ بارہ گز پر پہنچ کر کپڑا پھاڑ چکے ہوتے تھے۔ لالہ جی نے کپڑے کے ساتھ ہی سیاست بھی سیکھی اور کپڑے کی دکان ہی سے سیاست شروع ہوئی۔ اعلیٰ اور متوسط

طبقہ میں کافی کڑا ادھار کھاتے تھے تاکہ تقاضوں کے سلسلہ میں آمد و رفت رہے اور بالمشافہ ہونے کا چانس ہاتھ آئے۔"

اور کیا وکیل اختر سعید خاں کو آپ بھلا سکتے ہیں جو

"قہقہہ لگانے سے پہلے منہ بند کرکے دو چار مرتبہ حلق میں قہقہہ کا ریہرسل کرتے ہیں اور ایک دم ہی سے باہر۔"

پھر امیر حسن صدیقی کے خلوص کا اعتراف کیوں کر ناممکن ہے، جو

"مستحق اور قابلِ امداد لوگوں کی مدد بھی کرتے ہیں مگر اس طرح کہ مدد دینے کے بعد ہر صبح و شام اُن کے گھر جا کر لکھا پڑھی میں حساب مانگتے ہیں۔ فضول خرچی کے لئے منع کرتے ہیں۔ زمانے کی حالت کو بتاتے ہیں کہ یہاں ہم کو دیکھو کس مشکل سے پیسہ کماتے ہیں۔ آپ بھی خیال رکھنا۔ وقت پر کوئی نہیں دیتا وغیرہ۔ یہاں تک کہ وہ شخص اپنے نقدی محسن کی دارو گیر سے محفوظ رہنے کے لئے فی الفور امداد جوں کی توں واپس کر دیتا ہے یا بغیر نوٹس دیئے راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔"

نادم سیتاپوری کو بھی پہچان لینا دشوار نہیں، جو

"گھر پر رہ کر زندگی گزارنے کو مجلسی آداب کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس زندگی سے بیزاری کی حد تک دلچسپی ہے۔ گھر میں کم اور باہر زیادہ۔ گھر میں آئے کرسی پر بیٹھے۔ لطف اکڑوں بیٹھ کر اس قدر مؤدب لگتے ہیں کہ جیسے کلامِ پاک کا قلمی نسخہ تحریر فرما رہے ہیں یا کوئی حدیث۔ گھر میں نہایت گمشدگی کی حالت میں رہتے ہیں۔ بارہا چور مکان سونا سمجھ کر آئے اور فی الوقت آپ کو دیکھ کر بغیر معذرت کئے الٹے پاؤں بھاگ گئے ہیں۔ کسی بحث و مباحثہ میں اس وقت تک گلو خلاصی ممکن نہیں جب تک مخاطب شرمسار نہ ہو جائے۔ اس قدر تفصیل سے اور ریپڈ فائر الزام لگاتے ہیں کہ مخاطب سچ مچ اپنے کو ملزم سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے۔"

لیکن ان جانی پہچانی شخصیتوں کے بارے میں تخلص کے یہ خاکے پڑھنے کے بعد مجھے کبھی کبھی پتہ نہیں کیوں جلن سی ہونے لگتی ہے۔ کچھ غصہ سا آتا ہے جیسے کسی نے میری جائداد اٹھا کر کسی اور کو دے دی ہو۔ اس کا احساس مجھے سب سے زیادہ اس وقت ہوا جب چندی گڑھ کے سفر کے دوران "پوسٹ مارٹم" پڑھتا دیکھ کر ایک پنجابی ہم سفر نے مجھ سے کتاب مانگ لی اور پھر اس نے نہیں لوٹائی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اُن سب لوگوں کو جانتا ہے کیونکہ وہ سب اس کے شہر کے رہنے والے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ تخلص نے صرف شرارتاً ان کے نام بدل دیئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ پنجابی ہم سفر کا یہ قول کہاں تک سچ تھا لیکن مجھے ایسا ضرور لگا کہ ان لوگوں کو جنہیں میں صرف اپنا، صرف بھوپال کا جانتا تھا، تخلص نے انھیں سب کو دے دیا۔ اب وہ صرف میرے نہیں رہے۔

تخلص نے "پوسٹ مارٹم" میں کسی کا چہرہ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ذکاوت کے نشتر سے ان سیرتوں میں خوش مزاجی کی قلمیں لگائی ہیں جن سے سنجیدہ سے سنجیدہ چہرہ بھی کھل اٹھا ہے۔ پرانے مصریوں کو مردہ جسموں کو محفوظ کرنے کا فن آتا تھا، اور تخلص نے زندہ روحوں کو دوام بخشا ہے۔ لیکن اسے ادب کا ابوالہول نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو لطافتوں کی جنت کا رضوان تھا جس کا کام کھلے دلوں اور روشن دماغوں کی اس طرح چوکیداری کرنا تھا کہ اضمحلال، نامرادی یا پست ہمتی کا کوئی جھونکا ان کھلے دروازوں کو بند نہ کر سکے۔

شفیقہ فرحت

تخلص میاں کی "پاندان والی خالہ" سے گفتگو

یوں تو ہر شخص اپنے علاوہ سب کو بے وقوف سمجھتا ہے، مگر مزاح نگار اوروں کو احمق و بے وقوف بنا دیتا ہے سب کی آنکھوں میں قہقہوں کی دھول جھونک کر، غیر متوقع طور پر عجیب و غریب وجہ پر چونکا دینے والی حرکت کر جائے کہ آپ کے دل و دماغ دونوں ایک جان دو قالب ہو کر دونوں قلابازیاں کھاتے رہیں!

اب تخلص بھوپالی ہی کو لیجئے۔ بنا گئے نا ہم سب کو بے وقوف ....!

ممکن ہے قیامت کے آثار بہت پہلے سے ظاہر ہونے لگیں۔ مگر تخلص میاں کی موت کے تو قطعی کوئی آثار نہیں تھے.. وہ تو یوں چپ چاپ چل دیئے جیسے کوئی یوں ہی بیٹھے بیٹھے اٹھ کر ٹھیلے پر پان کھانے چلا جائے۔

صحت اگر اتنی اچھی نہ تھی کہ شہر کے حکیم ڈاکٹروں کی روزی روٹی کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا تو ایسی بھی نہ تھی کہ تیمارداری کے سلسلہ میں کسی "نورا" کسی "گورا" سے ملاقات کے امکانات پیدا ہو سکیں۔

چلئے تھوڑی دیر کے لئے یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ ان کا بظاہر تندرست جسم اتنا تندرست نہیں تھا کیونکہ ہاتھی کے پاس دکھلانے کے دانت بھی تو ہوتے ہیں

مگر یہ ہارٹ اٹیک پر تجربہ مشکل ہے۔ خاکسار کی اطلاعات کے مطابق دل کے نام پر ان کے پاس ایک قطرۂ خون بھی باقی نہ تھا۔

دل کا کچھ حصہ ان خلاؤں اور نائیوں کی نذر ہو گیا تھا، جنھیں پاندان تک نصیب نہ تھا۔ کچھ غفور میاں کے تصرف میں آیا۔ بچا کھچا "زبانِ ہندوی" کی خدمت میں قسط وار پیش کر کے یہ کہتے رہے :

ان میں لہو جلا ہے ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں!
پھر انسان تھے کچھ اور بھی آستاں ہوں گے!

رتی رتی۔ وغیرہ وغیرہ کا حساب تو ہو گیا۔ آپ ہی بتائیے۔ ہے کچھ گنجائش ..... اور بزنس میں ہونے کے باوجود وہ اتنے دور اندیش تو نہ تھے کہ گاڑی کی اسٹپنی کی طرح ایک آدھ فالتو دل ٹھیک رکھتے .... اور جب مال ہی نہیں تو غنیم حملہ کیوں کرے گا ؟

تو صاحب یہ دورے حملے تو مفت بدنام ہو گئے۔ یہ تو بظاہر ایک اونگھتی ہوئی شخصیت کا چونکا دینے والا مذاق ہے۔ تخلص میاں کے لمبے اور کسی قدر چوڑے جسم پر رکھے ہوئے چوکور چہرے اور اس پر بھی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اور چشمے کے اندر جڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اس قسم کا بلکہ کسی قسم کی تیزی اور تجارتی رنگ اس سرے سے اس سرے تک چھایا رہتا۔ اور یہ یقین ہو جاتا کہ اگر انھوں نے کبھی قلم اٹھایا ہوگا تو صرف بہی کھاتہ لکھنے کے لئے۔

لیکن جو شخص بغیر ایک مصرعہ موزوں کئے، ساری عمر اپنے نام کے ساتھ 'تخلص' کو نتھی کر کے ایک عالم کو بے وقوف بنا سکتا ہے، وہ ملک الموت کو "بیانی" میں اتار کے (لفنٹہ بندی قانون یقیناً محاورہ پر بھی لاگو ہوگا) اپنی موت کی فائل اوپر کروا سکتا ہے ... ! داد دیجئے اس رواں دواں نصیب پر .... !

مگر لطیفے کا ڈراپ سین ابھی کہاں ہوا ..... تخلص میاں کا اس دنیا سے اس دنیا کی جانب "ایرڈ لیتی" تو اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ کچھ ہنگامہ، کچھ ہاؤ ہو، کچھ قہقہے اس دنیا میں بپا ہوں۔ ورنہ عبادتوں کی مقدس سنجیدہ فضا میں میاں تخلص کا نام نہ گھٹ کے رہ جائے، اور تب ایک اور دل کا دورہ یقینی ہے ... !

'پاندان والی" خالاؤ" جن کے پاس زردے اور چھالیہ کی میلی چکٹ تھیلی ہی رہ سکتی تھی۔ مگر جو پھر بھی 'پاندان والی خالا' کہلاتی تھیں، عین عالم جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ میاں کی نشانی ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو محنت مزدوری کر کے پالا۔ دونوں کی شادیاں کیں۔ لڑکا برسوں سے بے روزگار تھا' اس لئے اور اب بھی بڑی تنگی ترشی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ ان خالہ کی جوانی سے بڑھاپے تک کی اس کانٹوں بھری زندگی کا ایک ایک رخ' ایک ایک واقعہ' بے اندازہ غم اور گنی چنی خوشیاں سب تخلص میاں کی نظر میں تھیں۔ خالہ کی نہ رکنے والی زبان کا ایک ایک لفظ ان کے حافظہ میں محفوظ تھا۔ اور اب یہ تخلص میاں کا ایک اور مذاق تھا کہ انھوں نے خالا کو تین جلدوں میں قید کر دیا۔ خالہ کی کپڑا ملِ کی مشین کی طرح ہر وقت چلنے والی زبان۔ ایک سے ایک نئے محاورے اور نادر گالیاں۔ انوکھے انوکھے کوسنے' سب کے سب لیے مقبول' مشہور ہو گئے جیسے کسی چٹ پٹی فلم کے پھڑکتے ڈائیلاگ اور دھڑکتے گانے ... ! شہر بھوپال تھا اور ایک پاندان والی خالہ۔ جس گھر میں دیکھئے انھیں کا ذکر' جہاں سنیے ان کی ہی آواز۔ اور پھر یہ قصے دساور کو بھی جانے لگے۔

کراچی میں بیٹھے اہل بھوپال کے لئے تو بھوپال کا 'ٹریلر' تھا۔ انھیں پڑھ پڑھ کر وہ بھوپال کو یاد کرتے دیاد کر کے روتے۔ اور خالہ تھیں کہ غصے سے پاندان کے ڈھکنے کی طرح کھڑ کھڑائے جاتیں۔ کوئی اللہ والا دکیل نہ ملا جو بن پیسہ مقدمہ لڑتا۔ ورنہ خالہ تو دنیا میں ہی تخلص میاں کا تخلص ضبط کروا دیتیں۔

خیر صاحب یوں تو خدا کے یہاں دیر اندھیر سب ہی کچھ ہے۔ مگر کبھی کبھی اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے والا منظر بھی دیدہ بینا کی نابینا آنکھوں کو دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

سو کچھ ایسے ہی ایک منظر کا "اسکرین پلے" پیش ہے۔ ادھر تخلص میاں حضرت عزرائیل سے ساز باز کر کے قبر کا معائنہ کرنے پہنچے۔ ادھر خالہ اپنا روا یتی پاندان چھوڑ چھاڑ " اپنے نکمے بیٹے ننے کو "کانگریس پالیٹی" کی امان میں دے اور بہو کو اللہ کے حوالے کر از خود پیپ پکیں۔ منکر نکیر اصل اور نقل روح کے معاملہ کی چھان بین میں لگے تھے۔

اور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اس دن فرشتہ انکوائری کمیشن کے لئے کس کا نام پیش کریں۔ لہٰذا ان کے پہنچنے سے پہلے خالہ نے اپنا محاذ سنبھال لیا۔ اور ایسے ایسے سوال کئے اور وہ وہ بے نقط سنائیں کہ تخلص میاں کے رہے سہے حواس گم۔ اور کبھی کبھی بولتی بند ہو گئی اور پہلی بار انھیں اپنی بے وقت اور بے موقع موت کا غم ہوا۔ خالہ نے یوں اپنی مشین گن داغی :

”کیوں رے موئی کاٹے تجھے شرم نا آئی جو رانڈ بیوہ کی بے فضول فضیحتی کرتے کوئی اور نہیں ملا تجھے قلم گھسنے کو..... تیری قبر میں ہاتھ ہاتھ بھر کے کیڑے پڑیں فرشتے تجھے آگ انگاروں پہ لٹائیں۔“

تخلص میاں کے، اس نے ماڈل کے منکر نکیر کی ڈانٹ پھٹکار سن کر اوسان خطا ہو گئے، مگر آواز پہچانی لگی۔ لہٰذا روح میں روح آئی، جواب دیا : ”خالہ! سلام!“

”موئے میں کیوں ہونے لگی تیری خالا! پورا قبرستان بھرا پڑا ہے۔ ڈھونڈھ لے اپنی سگی کو۔“

”ہمارا بھوپال تو تمہیں خالا کہتا تھا۔“

”ہاں ہاں کہتا تھا۔ مگر تو کون کہنے والا۔ جھاڑو پھرے تیری طرح کسی نے مجھ دکھیا کو مارے میں ذلیل تو نہیں کیا۔ خدا تجھ سے سمجھے۔ جانے کہاں کے جاسوس لگا رکھے تھے کہ میری اتی اتی سی بات کی خبر تجھ تک پہنچتی۔ سب چھاپ کے اشرافوں کی مٹی پلید کر دی۔“

”جاسوس نہیں لگا رکھے تھے اس پر تو تمہارا سایہ تھا۔ ہر لمحہ ہر قدم پر ساتھ رہنے والا، تمہارے ساتھ ساتھ مرنے والا۔“

”اے جھاڑو پھرے۔ موت پڑے۔ نامحرم تو کون ہوتا ہے، میرے ساتھ جینے مرنے والا؟ اللہ ان کو جنت میں حلوے مانڈے کھولے مومنوں کا محل دے۔ وہ تھے میرا ساتھ دینے والے۔ مگر اللہ کو یہ منظور نہ ہوا۔“

”خالہ! مجھے تو تم سے تمہاری زندگی سے ہمدردی تھی۔“

”ہاں ہاں بڑی ہمدردی تھی۔ تو میرے ننھے کو سکوٹر نہ بنوا دیتا۔ کانگریس پالٹی میں نہ بھرتی کروا دیتا؟ کہیں چپراسی کروا دیتا؟ یہ تو نہ ہوا، میری غریبی کا ڈھنڈورا پیٹ دیا۔ اللہ کسی کے سر سے مردوں کا سایہ نہ اٹھائے، جو بعد میں اس قدر بے قدری ہو۔“

”ارے خالا! تم تو فضول غصہ کرتی ہو۔ تم تو میرے ملک کی جنتا کی نمائندہ تھیں۔ تمہارے دکھ سارے دلیش میں پھیلے ہوئے عوام کے دکھ تھے۔ خالا! میں نے تمہارا مذاق نہیں اڑایا۔ میں نے تم سے تمہاری طرح کروڑوں سے ہمدردی کی ہے۔ لوگوں کی توجہ تمہاری طرف اور تمہاری طرح کے بے کس مجبوروں کی طرف پھیرنے کی کوشش کی ہے۔“

”ارے اب بڑی بڑی باتیں نہ بنا۔ ابھی آتے ہوں گے وہ منکر نکیر تو سب ٹرٹر بھول جائے گا۔ نورنامے میں ایسا ہی لکھا ہے۔“

”تم میرے لئے منکر نکیر سے کیا کم ہو مگر میرے سوال کا جواب دو۔ کیا اس سے پہلے کسی نے عام آدمی کی زندگی کی اتنی جیتی جاگتی تصویریں اپنے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں پیش کی ہیں؟“

”ارے موئے جھاڑو پھرے! یہ تو کون سی زبان بولنے لگا قبر میں آ کے۔ میری تو کچھ سمجھ میں آتا۔ ایسی کوئی

بات بہشتی زیور میں بھی تو نہیں لکھی ہے۔"

"خالہ میری ان تینوں کتابوں سے وہ لوگ جن کے پاس حساس دل ہے۔ سمجھنے والا دماغ ہے۔ دیکھنے والی نظر ہے، وہ تم کو دیکھ کر اپنے ملک کے عوام کے دکھ درد سے واقف ہو سکتے ہیں۔"

"مگر میں سنتی تھی کہ تونے میرے گھر کے لڑائی جھگڑے فضیحتے سب دنیا والوں کو بتا دیئے۔ اور یہ ہماری بیٹی زینب مائکہ آئی ہیں کہ بھاوج سے لڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ صلح صفائی سے تو دو روز رہنا نہیں جانتی۔ بائی خدا اسے سمجھے۔ زمین کا پیوند کر دے جو تو ہمارے گھر کی غریبی کو اچھالے۔"

"یہ تو ہر گھر میں ہوتا ہے۔ خالہ! جب انسان کے پاس کھانے کو نہ ہو تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو بھی نوچ کھاتا ہے۔"

"ہاں بھیا! سچ کہتا.... تو... اللہ انھیں سونے چاندی کا محل دے۔ جب شروع شروع شادی ہوئی تھی تو روپے پیسے کی خوب ریل پیل تھی۔ تو ہم بھی خوب سیر سپاٹے کرتے پھرتے تھے۔ اب تو روز کی دانتا کل کل ہے۔ مگر مونڈی کاٹے، تجھے کیسے خبر کہ ہر گھر میں یہی چخ چخ ہوتی ہے۔ کیا تو گھر گھر جھانکتا ہے تجھے دنیا میں کوئی اور کام نہیں ؟"

"میری نظریں بہت تیز ہیں۔ خالہ دور پاس سب دیکھ لیتی ہیں۔ کان ایک ایک آہٹ کو سن لیتے ہیں۔ اور دل ہر تڑپ کو ہر تکلیف کو محسوس کر لیتا ہے۔"

"اے بڑا غضب داں بنا پھرتا ہے اور تونے یہ کالو جی اور مولو جی کے بارے میں بھی لکھ دیا ہے۔ اور اپنے پنڈت جی کو بھی نہیں چھوڑا۔"

"خالہ! تم بھی تو ان کے کارناموں سے واقف تھیں اور ان سے کون بے خبر ہے ؟"

"ارے ہاں! انہی کی تو کانگریس پالٹی تھی کہ جس میں یہ گھس جاتا اس کے وارے نیارے ہو جاتے۔ کانگریس کو اللہ جیتا رکھے۔ دونوں ہاتھوں سے لپ بھر بھر کے دیتی ہے۔ ہائے میری کیسی خواہش تھی اور میں اپنے ننے میاں سے کہتی تھی کہ تجھے کانگریس کی سفید وردی مل جائے پہننے کو۔ پھر پنڈت جی کے پاس بیٹھنا کرسی لگا کے۔ سفید وردی دیکھ کے پولیس والے الگ سلام کریں گے دوڑ دوڑ کے۔ کانگریس پالٹی میں یہی تو ایک بات لاکھ روپے کی ہے کہ ہندو مسلمان، کھٹیک، اشراف، بھا قصائی، ڈاکو، چور سب سفید وردی پہنے پھرتے ہیں۔ مجال تو ہے کہ پکڑائی میں آ جائے۔ اللہ پنڈت جی کو دونیا جہان کا بادشاہ کرے اس نے ایسے ایسے فقیروں کو نہال کر دیا جنھیں بھیک بھی نہیں ملتی۔ ننے بھی ذرا سی بھاگ دوڑ کر لیتا تو پالٹی کا ٹکٹ مل جاتا۔ پالٹی کا نہ سہی منسپلٹی کا ہی سہی۔ وہ بھی کیا بری تھی غریبی گزران کے لئے۔"

"خالہ جب تم روز سیاست پر تبصرہ کرتی تھیں اور ہر روز پیش آنے والے واقعات کا علم رکھتی تھیں اور اپنے نقطۂ نظر سے ان پر اظہار خیال کرتی تھیں تو ....!"

"دیکھ جھاڑو پھرے۔ خدا تجھے میتو ناٹی اٹھا کے جائے تو پھر بولا عربی فارسی۔ اے ہم یہ تو جو گزرتی تھی سو کہتے تھے، اور بیٹے بہو کے ہاتھ پاؤں جوڑ کے اخباروں کی جھوٹی سچی خبریں سن لیتے تھے اور اپنی سمجھ سے مطلب نکال لیتے تھے۔ اب ہم کوئی ایسے کوڑھ مغز جاہل بھی نہ تھے۔"

"یہی تو کہتا ہوں خالہ کہ تم دس گھر پھرنے والی تم کو زمانے کی ساری خبریں تھیں۔"

"اے لو، موت پڑا، کیا اب مجھے آوارہ کٹنی بنا رہا ہے؟"

"توبہ توبہ خالہ! میری یہ مجال۔ میں تو تمہاری معلومات اور عقل کی داد دے رہا تھا۔"

"ہاں ہاں ایسے ہی داد دی جاتی ہے نا۔ اچھا بُرا سب لکھ دیا۔ ارے باتوں باتوں میں انسان کے منہ سے اچھا بُرا سب نکل جاتا ہے۔ جو سرکار ناراض ہو جائے تو تو جن بچے سے کو لہو میں پلوا دے اللہ کا قہر نازل ہو تجھ پر۔ اور میں کہتی ہوں آگ لگے تیری زبان کو۔ یہ تو مردوا ہو کر عورتوں کی بولی بولنے لگا! تجھے شرم نہ آئی .... موئے کاٹے یہ سب لکھتے!"

"خالہ دعا دو مجھ کو کہ تمہاری زبان کو، تمہارے محاوروں کو، تمہاری گالیوں کو، تمہارے کوسنوں کو میں نے امر بنا دیا ارے تم یہیں جنت سے بیٹھے بیٹھے جھانک جھانک کے دیکھنا۔ دس بیس سال بعد دنیا سے تمہاری یہ زبان اٹھ جائے گی۔ شہر بھوپال جس کی اپنی ایک تہذیب تھی ایک مزاج تھا، خاص زبان تھی، خاص محاورے تھے، وہ وہی جو تم بولتی تھیں، تم مر گئیں تو یہ تہذیب یہ زبان بھی مر جائے گی۔ خالہ! میں نے اُسے کاغذ کے قلعے میں محفوظ کر دیا۔ اب صدیوں تک یہ زندہ رہے گی اور پُرانا بھوپال پہچانا جائے گا۔"

"ہاں میں سنتی ہوں بڑی بیا کو اس کو پڑھ کر ایسا لگا کہ کراچی میں بیٹھے بیٹھے وہ بھوپال پہنچ گئی ہوں۔"

"ہاں خالہ یہ تو ہے۔ تم سے بھوپال زندہ ہے۔ ایک دور زندہ ہے۔ ایک طبقہ زندہ ہے۔ ایک زبان زندہ ہے۔ بوا اب تو تم مجھے بُرا بھلا نہیں کہو گی۔؟"

"ہاں اللہ تجھے جنت میں چاندنی کے جھوے میں جھلائے، موتیوں کا محل دے۔ تو نے مجھ رانڈ بیوہ بیوہ مفلس کو اتنی عزت دی۔ بس اب اتنا اور کر میرے ننے کو کانگریس پالٹی میں نہ سہی جنتا پالٹی میں ہی بھرتی کرا دے......!"

.... اور سچ تو یہ ہے کہ بنانے والا بھی اپنی تخلیق کو اتنا مکمل نہ بنا پاتا جتنا تخلص بھوپالی نے پاندان والی خالہ کو بنا دیا۔

۸۸

فضل جاوید

"شیطان جاگ اٹھا" والے تخلص بھوپالی سے انٹرویو

یوں تو میں اچھا بھلا سویا تھا لیکن ہڑبڑا کر اٹھنا پڑا۔ ایک ڈراؤنا شخص ہاتھ میں انجکشن نما کوئی چیز لئے پائینتی کھڑا
ا۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو یہ کوئی چور ڈاکو ہے اور مال کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ میں چور کو مخاطب کرکے
لا : "چور صاحب یہ رہی الماری کی چابی۔ میری زندگی کا ماحصل یہی الماری ہے جو چاہیے نکال لیجئے لیکن جان بخشی
جیے۔ ڈراؤنا آدمی ایک بھیانک قہقہہ لگا کر بولا : "ہم مال نہیں چراتے جان کی چوری کرتے ہیں۔ ہم فرشتۂ اجل ہیں
تمہاری روح قبض کرنے آئے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے میرے سیدھے پیر کے انگوٹھے میں انجکشن لگا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے
ا جسم بے جان ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو ایک عجیب، نورانی ماحول نظروں کے سامنے تھا۔ مجھے ایک داروغہ کے سپرد
کے کہا گیا کہ "یہ بھوپال کالونی کے لئے ہے۔" اس کالونی میں بہت سے چہرے جانے پہچانے لگے۔ اچانک پیچھے سے
ک قوی ہیکل ہاتھ میرے کاندھے پر پڑا۔ مڑ کر دیکھا تو بے حد بھاری قہقہہ لگاتے ہوئے تخلص بھوپالی کھڑے تھے۔
حیران و پریشان کھڑا سوچنے لگا کہ کیا میں انتقال کر گیا یا تخلص بھوپالی زندہ ہو گئے۔ پھر انھوں نے پوچھا: "کیوں
ال فضل جاوید اتنی جلدی آ گئے؟" میں سٹپٹایا اور بغلیں جھانکتے ہوئے فرار کی راہ ڈھونڈھنے لگا۔ "ڈرو نہیں میاں میں
ست وہ کتاب واپس نہیں مانگوں گا۔ جس کو لوٹانے کا وعدہ کر کے تم دس بارہ سال پہلے لے گئے تھے ...." میں نے
لدی سے جواب دیا۔ "میں شرمندہ ہوں احد بھائی۔"

"اماں چھوڑو یار .... سناؤ بھوپال کا کیا حال ہے؟"

"بھوپال تو ویسا ہی ہے جیسا آپ چھوڑ گئے لیکن بھوپال کے پروفیسر آفاق احمد اور حیدرآباد کے زندہ دل
مصطفےٰ کمال نے شگوفہ کا "تخلص بھوپالی نمبر" نکالنے کا اعلان کیا ہے۔ "شیطان جاگ اٹھا" پر مضمون لکھنے کا حکم مجھے
ا ہے۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور یہی حسرت لئے یہاں چلا آیا ہوں۔"

تخلص صاحب نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "میاں یہ بھی خوب رسم ہے زمانے کی۔ خیر اگر تم لکھنے کا ارادہ
ر ہی چکے ہو تو یہیں لکھ لو۔ کافی فراغت ہے یہاں۔ کسی نہ کسی فرشتہ کو پٹا کر وہ مضمون بھجوا دیں گے۔" میں خوش ہو گیا۔

"کیوں نہ میں شیطان جاگ اٹھا" پر آپ کا انٹرویو لے لوں :

" شروع ہو جاؤ ... چل خامہ بسم اللہ ...... " انہوں نے اپنا مخصوص قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

میں : " شیطان جاگ اٹھا ' کا پہلا مضمون ' اپنی یادیں ' میں آپ نے جو کچھ بھی لکھا ہے ' کیا وہ آپ کی مکمل سوانح ہے ؟ یقیناً آپ نے اپنی کچھ کمزوریوں کا تذکرہ اس میں نہیں کیا ہوگا جو آپ کی زندگی سے متعلق ہوں گے ؟ "

تخلص : بھئی ! خوب سوئیاں چبھوتے ہو ۔ میں نے جب بھی گریبان میں منہ ڈال کر جھانکا مجھے اس میں تو کچھ ایسا ویسا نظر نہیں آیا ۔ ہاں سوانح مکمل تو نہیں ہوگی مگر ایمانداراانہ ضرور ہے ۔"

میں : " آپ کا مضمون " شیطان جاگ اٹھا " طنز کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے لیکن آپ نے اسے بہت مختصر لکھا ہے ۔ یہ اگر ناول ہوتا تو طنزیہ ادب کا شاہکار ہوتا ۔"

تخلص : اختصار کے ساتھ جس خوبصورتی سے میں نے ایک مقصد کو پیش کیا ہے ' وہی اس کا حسن ہے ۔ فسادات اور بالخصوص ۱۹۴۷ء کے واقعات انسانیت کے نام پر بدنما داغ ہیں ۔ آج کا انسان وہ ہے جس سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے ۔ شیطان خدا سے کہتا ہے ۔ ' اس سے پہلے کہ دنیا کا انسان مجھے گمراہ کر دے ، مجھے جلد سے جلد جنت میں بلا لے ' کروڑوں سال پہلے انسان کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں جنت سے نکالا گیا تھا ' لیکن اب اس موڈ میں ہوں کہ آج انسان کو سجدہ کر کے تیرے حکم کی تعمیل کروں کہ یہ انسان وہ نہیں جس کو سجدہ نہ کرنے کا میں نے عزم کیا تھا ' میرے خیال میں شیطان کا یہ بیان ضخیم ناولوں پر بھاری ہے ۔"

میں : " اس کتاب کے ۲۸ مضامین میں سے بیشتر میں سیاسی رہنماؤں کا مذاق اڑایا گیا ہے ۔ آج کے سماج میں آپ جو بھی برائیاں دیکھ رہے تھے کیا آپ کے خیال میں یہ سیاسی لیڈر اس کے ذمہ دار ہیں ؟"

تخلص : " زندگی کے مختلف شعبوں سے منسلک رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں وہ سب دیکھ لیتی ہیں جو ایک عام آدمی نہیں دیکھ سکتا ۔ میں نے سیاسی رہنماؤں کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ رہنمائی کے غلط طریقوں کا مذاق اڑایا ہے ۔ یہ نام نہاد لیڈر غریب عوام کا خون چوس چوس کر اپنے مفاد کے حصول کے لئے پورے سماج کو کمزور اور کھوکھلا بنا رہے ہیں ۔ اگر غور سے میری اس کتاب کا مطالعہ کرو گے تو معلوم ہوگا کہ " ہماری اچھی تعلیم " میں موجودہ نظام تعلیم کی برائیوں کا ذکر ہے ۔ " میونسپلٹیات " میں اس محکمے کے ذمہ داروں کی فرض ناشناسی اور کوتاہیوں پر ہنسا ہوں ...... ' صحت مند تنقید ' میں نقادوں کے ۔ جو اصولوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے ۔ ' آتش کدۂ ہدایت ' میں اسمبلی کے امیدواروں کی مطلب پرستی کے پردے فاش کئے ہیں ۔ " بے ستاروں کے ستارے " جو ۱۹۶۲ء کے جنرل الیکشن کے موقع پر لکھا گیا ہے اس میں الیکشن کے امیدواروں کے جھوٹے وعدوں کی نقاب کشائی کی ہے ۔ میں دراصل زندگی کے ہر شعبہ میں ایمانداری اور خلوص دیکھنا چاہتا تھا ۔ جہاں کہیں بے راہ روی نظر آئی میرا قلم طنز کے تیر چلانے لگتا تھا ۔"

میں : " اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے " استنجائی پاکیات " لکھ کر قوم کو گمراہی کے راستے سے ہٹانے کی کامیاب کوشش کی ہے لیکن بعض بزرگ سمجھتے ہیں کہ اس " دینی فریضے " کے خلاف لکھنے پر آپ کی مذمت ہونی چاہیے ۔"

تخلص : (ایک مدبرانہ قہقہہ لگاتے ہوئے) دراصل یہ عادتیں شروع سے ہی پیچھے لگ جاتی ہیں اور کثرت استعمال سے ہم لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ نعوذ باللہ یہ بھی کوئی دینی فریضہ ہے جس کی تکمیل اس طرح بے دینی طریقوں پر ہونا چاہیے ۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے ۔ ایک مرتبہ ایک " ڈرائی کلینر " کو ڈھیلیاں لگاتا دیکھ کر میں نے پوچھا کیوں

صاحب، آپ کو کیا تکلیف ہے ؟ چلیئے میں اپنی موٹر میں آپ کو قریب کے لاوارث اسپتال میں جلدی سے داخل کر دوں
غریب ایکدم بوکھلا گیا۔ رومال کے اندر سے ہاتھ برآمد کیا، ڈھیلا دور پھینکا اور خاموشی سے پھر دنیاداری میں لگ گیا
میاں یہ اگر دینی فریضہ ہے تو اسے گھر کی چہار دیواری میں رہ کر بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ شارع عام پر ہی
یہ سب مظاہرے کئے جائیں۔"

میں : "پیلے بیک ڈکاریں' ایک متعفن موضوع سا ہے۔ آپ خراٹوں پر لکھ سکتے تھے، جماہیاں آپ کے مزاح کا موضوع
بن سکتی تھیں۔ لیکن آپ کا یہ مضمون قاری کی طبع نازک پر کچھ خوشگوار اثر نہیں چھوڑتا۔"

مخلص : "میاں ! اخلاق تہذیب اور شائستگی بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں۔ یہاں بھی وہی استنجائی پاکیات والے مظاہرے
ہیں۔ نہ کسی بزم کا پاس نہ کسی محفل کا خیال۔ دو چار پہلو بدلے اور "سیفٹی وال" کھولنا شروع کر دیا۔ کچھ عادی حضرات
اپنے اس فعل ہوائیہ کو اپنی صحت مندی کی علامت بتاتے ہیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ پیلے بیک ڈکاریں پیٹ کی ناہمواریوں کے
ماضمانہ شور کے نادر نمونے ہوتے ہیں۔ مگر ان شاہکاروں کی نمائش نہایت سلیقے کے ساتھ فنکارانہ ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں
کہ لوگ بیٹھے ہیں اور پس پشت ہوائی تحریکات چلائی جا رہی ہیں۔ مگر میاں یہاں تو عجیب عالم ہے ' نہ ڈکاریں ہیں'
نہ پیلے ہے ' نہ بیک ہے . . . . ."

میں : "آپ پر موجودہ نسل اور آنے والی نسل کو گمراہ کرنے کا سنگین الزام ہے۔ آپ مذاق مذاق میں بے روزگاروں
کو چند گھریلو مصنوعات کے نسخے اور فارمولے بتا کر ان سے کمیشن کھاتے آئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں آج جو ملاوٹ کا بازار
گرم ہے وہ صرف آپ کے مضمون کی وجہ سے ہے۔ میرا مطلب "نسخے برائے مصنوعات" سے ہے۔"

مخلص : "میاں تم نے یہ سوال خوب پوچھا ہے۔ مجھ پر لگائے گئے سب الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں۔ دراصل ملاوٹ
ایجاد کرنے والے بڑے ذہین اور شاطر دماغ کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے عوام الناس کو نیز حکومت کو خبردار کیا تھا کہ ملاوٹ
اس طرح بھی ہوتی ہے۔ خالص گھی، خالص شہد، چھالیہ، ہلدی مرچ دھنیہ پسا ہوا، کالی مرچ، چا، گرم مصالحہ، خالص
کھجور عربی، ان سب میں ملاوٹ کی کون کون سی اشیاء ہوتی ہیں، اس کا پردہ فاش کیا ہے۔ اب رہی کمیشن کی بات . .
اللہ کا دیا میرے پاس بہت کچھ تھا۔ البتہ ملاوٹ کرنے والوں کو اس طرح طنزیہ مشورہ دیا ہے : 'اگر ہمارے بتائے
ہوئے طریقوں پر حسب دلخواہ فائدہ ہو تو پھر خیرات ایسے انسانوں کو دینا چاہیئے جو آپ کی صنعتوں کو استعمال کر کے
اندھے اور اپاہج ہو چکے ہوں، ضعف معدہ کے مریض بن گئے ہوں، ہیضہ یا اسہال میں مبتلا ہوں۔' اب میاں اس پر
بھی قصوروار گردانو تو جو سزا چاہو دے لو۔"

میں : "زبان کی صحت کے ساتھ آپ کی تحریروں میں شرافت' جرأت اور توازن ملتا ہے ' آپ کا کیا خیال ہے ؟"

مخلص : "یہ ذرہ نوازی ہے رشید احمد صدیقی کی . . . . ویسے میں کیا عرض کروں۔ میری کتابیں خود تمہارے سوال کا جواب ہیں۔"

میں : "احمد بھائی ! ایک آخری سوال اور پوچھوں گا۔ آپ کی شخصیت کچھ اس درجہ ڈراؤنی ہے کہ آپ مزاح نگار کم اور
تھانیدار زیادہ لگتے ہیں۔ لیکن جب ادب و شعر پر گفتگو ہوتی ہے تو آپ کے فلک شگاف قہقہے آپ کی شخصیت کو یکسر
ایک لطیف شئے بنا ڈالتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ؟"

مخلص : "میاں اب تم یہاں آ ہی چکے ہو۔ بنانے والے سے خود پوچھ لو کہ آخر یہ تضاد کیوں ہے۔"

اتنا کہنا ہی تھا کہ پولی و غیرہ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ بڑے عجیب لوگ ہو تم دنیا والو۔ بھوپال میں دو دو فصلیں غلطی سے دے دی
گئی گو تم لگے۔ میں انٹرویو کے کاغذ سنبھال کر مخلص صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوا دعا کے ساتھ بھوپال کالونی سے رخصت ہوا جو نگار مخلص صاحب نے کہا تھا۔
"ملیں گے اگر خدا لایا۔"

انیس سلطانہ

غفور میاں

آپ سے ملئے ـــ!! آپ ہیں غفور میاں ولد فلاں ابن فلاں ۔ پُرانے بھوپال کے باشندے ـــ بھوپالی ہونے پر جنھیں بے انتہا فخر ہے، جنھیں بھوپال کی ہر چیز عزیز ہے جنھیں اپنی پٹھانیت پر ناز ہے شیخی جن کا طرۂ امتیاز ہے بات میں بات پیدا کرنے کا فن، جتنا غفور میاں جانتے ہیں اتنا آپ تصور بھی نہیں کرسکتے ۔

غفور میاں، بظاہر انگوٹھا چھاپ بزرگ ہیں لیکن ... جن کی علمیت کا ایک زمانہ قائل ہے ۔ ان کے بزرگوں کی شان و شوکت، بھوپال کی تاریخ میں د اگر کہیں مل سکے تو ـــ!! سنہرے الفاظ میں لکھی جاسکتی ہے .کیا سخاوت ہے .... ذرا ملاحظہ تو کیجئے ـــ !! یہ ان کے دادا جان ہیں جو ....

" قسم پیدا کرنے والے کی، پورے شہر کو افطار اور سحری کا اذن دیتے تھے ۔ رمضانوں میں کھلانے والوں کی لائن لگی رہتی تھی ۔ افطار کرتے کرتے لوگ صبح کردیتے تھے اور پھر جو سحری کا لگا لگتا تھا تو افطار کا وقت آجاتا تھا ـــ "

دادا جان سے ایک ملاقات اور کرتے چلئے :

" ہمارے دادا بانسوں کی تجارت کرتے تھے ۔ کیا بانس تھے ـ شہر کے باہر پیٹھا لگایا تھا، اتنے بڑے بڑے بانس ہوتے تھے کہ اتوارہ میں ایک سرا ہے تو دوسرا سرا جامع مسجد کے نیچے سیٹھ رتن لال کی دوکان میں رکھا ہوتا تھا اور موٹان ـــ کیا موٹان تھی جیسے جامع مسجد کا مینارہ "

طولِ بلد اور عرضِ بلد ناپنے کے لئے غالباً یہی بانس استعمال کئے گئے تھے ۔

بھوپالی نکتہ چینوں کی زبان میں ایک اصطلاح ہے " زٹیں مارنا " ـــ اسے آپ دون کی ہانکنے کے اور بے سرو پ

کی اڑانے کے مترادف سمجھتے ۔ تو جناب قبلہ غفور میاں صاحب زٹلیں مارتے ہیں ۔ کبھی ان کے دادا تجارت کرتے ہیں، کبھی زمینداری، کبھی فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں ـــ اور موصوف کو باپ سے زیادہ دادا یاد آتے ہیں ـــ ہائے رے زمانے !

بدلہ سنجی اور حاضر جوابی میں غفور میاں کا جواب نہیں۔ بات بات میں پتہ کی باتیں کہہ جاتے ہیں :

" ہم تو سو بات کی ایک بات جانتے ہیں کہ جب
اُوپر سے نیچے تک سب ہی رشوت پر اپنا
پیٹ پال رہے ہیں تو سرکار تنخواہ بھی ناحق
ہی دیتی ہے ...."

کیا بھرپور طنز ہے ـــ !

غفور میاں کو ایک ہی شوق ہے باتیں کرنے کا ۔ خواہ مخاطب کتنی ہی جلدی میں ہو جب تک بات پوری نہیں کہلیتے اس غریب کا قصور معاف نہیں ہوتا ۔ اور پھر موضوعات کا تنوع ، یہ پتہ ہی چلنے نہیں پاتا کہ بات شروع کہاں سے ہوئی تھی ـــ باتیں اور وہ بھی ماضی کی باتیں .... غفور میاں کو اپنے ماضی سے عشق ہے کہ یہی ان کا سرمایہ ہے ۔

بہادری ہو، کھیل کا میدان ہو، بھوپال کی شان انفرادی حیثیت کی حامل ہے ـــ انھیں دو پشت پہلے والی نواب شاہ جہاں بیگم کا زمانہ یاد آتا ہے :

" شاہ جہاں بیگم کے زمانے میں جمّا خاں آتش باز تھا
سرکار کی سالگرہ پر ہر سال ایک آٹم بم بنا کے اس
لال پریڈ کے میدان میں چھوڑا کرتا تھا ۔ بڑے بڑے
طرم باز خاں، کانوں میں روئی گھسیڑ کے اور
کانوں پہ کنٹوپ چڑھا کے بم کی آواز سنا کرتے
تھے ...... اللہ ہی جانے یہ سب بہادر کہاں
جا گھسے ، ایک کا پتہ نہیں چلتا ۔ اب تو خاں!
خالص گھی کی طرح خالص پٹھان بھی ملنا دشوار ہے۔"

لیکن غفور میاں کی ہر بات میں " بھوپالیت " سے عشق جھلکتا ہے اور بھوپال میں ہاکی کے کھیل کو یوں بھی خاصی شہرت و مقبولیت حاصل ہے ـــ ذرا غفور میاں کی زبانی سنئے :

" پچیس تیس سال پہلے کی ہاکی دیکھتا ـــ اسی
بھوپال میں ۔ ہائے رے کیا زمانہ تھا .....
بھوپال نے تو ہاکی کے پلیر گھاس پھوس کی
طرح پیدا کئے ہیں ۔ پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا
تھا ...."

کوئی موضوع ہو، غفور دادا اپنی سے کہے جائیں گے ۔ یہ ریڈیو والی صفت اگر غفور میاں میں ہے تو خالہ (تخلص صاحب کی اچھوتی تخلیق) بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں ۔ دراصل خالہ میدان میں پہلے ہی آگئی تھی ـــ غفور میاں فند سے بعد میدانِ " گفتار و اخبار " میں آئے ۔

غالباً بھوپال کی بیگماتی حکومت نے لاشعوری طور پر خالہ کے کردار کو زیادہ اُبھارا ہے لیکن پٹھان اور وہ بھی بھوپالی پٹھان اس حقیقت کو مانے گا نہیں ۔ کسی نے تخلص صاحب کے کان میں پھوک دیا کہ :

" میاں خاں ! خالہ ٹھہری عورت ذات،
بھوپال کو دیکھنا ہے تو بھوپالی پٹھان کو دیکھو۔"

بھوپالی پٹھان خواہ کسی مرتبہ کا ہو براہ راست بانیٔ بھوپال، نواب دوست محمد خاں سے ناطہ جوڑتا ہے اور پدرم سلطان بود کہہ کر اظہار فخر کرتا ہے ۔ تخلص صاحب خود بھی پٹھان ہیں لیکن تھوڑے سے بہت علم نے ان کی پٹھانیت [illegible] برقرار نہیں رہنے دیا ۔ اور انھیں چاہئے تھا کوئی خالص پٹھان! اور یوں اَن گنت لوگوں میں سے ان کی نظر نے وہ دُرِّ نایاب تلاش کر ہی لیا جس کی انھیں ضرورت تھی ۔ تو ان کی تلاش بسیار کے بعد ملے انھیں عبدالغفور خاں صاحب بردکاٹ بھوپالی ـــ غیر بھوپالی اس بردکاٹ کی کاٹ کو

کیا جائیں ؟ راوی یوں بیان کرتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں نوآبادیات
کے لئے جب شہر بسایا جانے لگا تو لوگ شہر کے آس پاس
اُگے ہوئے برد کاٹ کاٹ کر وہاں بسنا شروع ہو گئے۔ گویا
یہ ٹاؤن پلاننگ کی ایک منزل بلکہ منزلِ اولین تھی۔ گویا غفور میاں
کا سلسلۂ نسب قدیم بھوپالیوں سے ملتا ہے۔

غفور میاں کا ذریعہ معاش باوجود کوشش کے سمجھ میں
نہ آسکا۔ تخلص صاحب نے انھیں ہمیشہ شبراتی سے کرایہ
مانگتے دیکھا۔ شبراتی جو ان کے مختصر سے مکان کی ایک مختصر
سی کوٹھری میں بطور کرایہ دار بھرتی تھا۔ دوسرے تھے ان کے
دوست میاں بغاتی۔ بغاتی سے ان کی دوستی انتہائی دلچسپ
چیز ہے۔ بغاتی چبھتی ہوئی بات کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے
غفور میاں اسے ہزار بری بھلی کہیں اس کی پیشانی پر شکن
نہیں آتا۔ لیکن اپنی سی کہہ ضرور جاتا ہے۔ لے دے کر یہ دو
دوست ہیں سہیل اور ایک ان کی بیگم۔

اس مثلث کے ذریعے غفور میاں کے کردار کی تکمیل
ہوتی ہے۔ اسے تخلص صاحب نے "غفوریت" کا نام دیا
ہے۔ اس "غفوریت" سے واقفیت کے لئے "بھوپالیت"
سے واقفیت لازمی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ جو کچھ غفور میاں
کی شخصیت میں جھلکتا ہے وہی بھوپال ہے لیکن اس میں بھی
شک نہیں کہ اس میں بھوپال ضرور ہے — قدیم بھوپال !
جہاں لڑکے کنکوے کھیلتے، پتنگ اُڑاتے اور کھپولوں سے
ہاکی کھیلتے جوان ہو جاتے تھے، جہاں زندگی، ایک عجیب
سی بے فکری کا نام تھا۔ لیلہ برج سے فتح گڑھ کے قلعے تک
محدود اس شہر میں رنگ و بو اور کیف و آہنگ صرف
شہر پناہ سے باہر کے طبقۂ اعلیٰ کے لئے مخصوص تھا۔ علمیت
اور علم دوستی، انھیں کا مقدر تھیں۔ باقی "اشراف" کے لئے
جوئندہ یابندہ کے مطابق، مل مزدوری، تانگہ چلانا، خوشامدگری
مرغ بازی، کبوتر بازی اور ..... گپ بازی جیسے ہُنر
رہ گئے تھے۔

بازی بازی، بارلیش با با ہم بازی، ..... نظریات
بھی محدود تھے۔ جلت پھرت صرف زبانی جمع خرچ کا نام
تھا۔ فقرہ بازی اور طراری میں ضلع جگت کا رنگ جھلکتا تھا۔

دیکھئے ہر جگہ "تھی" "اور" "تھا" سے آپ اسے ماضیٔ قدیم
کا کوئی کردار نہ سمجھئے۔ ایک چیز ہے' باقیات الصالحات'
یعنی — اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو۔

غفور میاں کی زندگی میں نہ کہیں تفریح کی گنجائش ہے
نہ کسی اور مصروفیت کی۔ شبراتی کی موجودگی میں مصاحبت کی
شان پیدا ہو جاتی ہے۔

"نہ ہوا کہیں کا مذیہ' ورنہ میاں شبراتی کو اپنی اپنا
اے' ڈی' سی بنا لیتے":

غفور میاں میں اتنی چرب زبانیوں کے باوجود یکساں
لب و لہجہ نے کچھ بے تکی پیدا کر دی ہے۔ کبھی کبھی تو آدمی'
اپنے خاص رُخ سے منہ موڑے' روزنامہ اخباری کالم میں یہ چیزیں
یقیناً زیادہ لطف دیتی ہوں گی۔

اخباری کالم کے ذکر پر یاد آیا' پرانے زمانے میں کہ
جب اپنی زبان لکھنوی اہلِ قلم کے ہاتھوں نکھر چکی تھی ایک
تھے میاں آزاد اور ایک ان کے ساتھی میاں خوجی — خوجی سے
تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے سرشار والے خوجی — تو جیسے
آزاد اور خوجی' اپنے معاشرہ کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔
کچھ اسی خلوص سے تخلص صاحب نے بھی "غفوریت" کی شان
برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

رطب و یابس کہاں نہیں ہوتا — لیکن تخلص صاحب نے
ذہنی اُپج کا بڑا لطیف استعمال کیا ہے۔ اس تصنیف کا
انتساب بہ ظاہر بڑا ہی مضحکہ خیز ہے — انتسابی فقرہ نہیں
وہ تو بالکل بے ضرر ہے۔

"اس بیل جوڑی کے نام —! مگر نیچے ایک تصویر ہے

جس میں دو بیل، گاڑی میں سوار ہیں اور آدمی انھیں کھینچنے پر مجبور ہے۔

لیکن اس تصویر کا مضحک ہونا ہی اس کا بھرپور طنز ہے۔ میاں آزاد (فسانہ آزاد والے) کی طرح نہ تو غفور میاں عالم فاضل ہیں، نہ دیش دیش گھوم چکے ہیں، ان کا تجربہ اسی زندگی سے حاصل کیا ہوا تجربہ ہے۔ تجربات کے نچوڑ میں ان کی طول طویل باتوں سے مفر نہیں۔ بہرحال کبھی وہ "عدالت میں" نظر آتے ہیں (گواہی دیتے ہوئے) تو کبھی "ایک گز کپڑا خریدتے ہیں۔ کبھی گونگے سینما کی وہ تعریفیں ہوتی ہیں کہ ان کے سامنے "مغل اعظم" اور "دیوداس" پھیکے پڑ جائیں۔ کبھی غفور میاں اپنے اکلوتے ۲۹ ویں "روزہ" کا اہتمام کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی خالہ کے لڑکے کی "بات ٹھہرانے" کی ذمہ داری لیتے ہیں (غنیمت ہے کہ بات اُچکی نہیں)۔ کبھی پورا دن قربانی کا بکرا خریدنے میں گزار دیتے ہیں۔ کبھی خالہ کے لڑکے کی شادی کا "مہر ٹھہراتے" ہیں تو کبھی "دھگانے" کا حق دینے پر وعظ و نصیحت کے دفتر کھول دیتے ہیں۔ جب باتیں سننے کے لئے کوئی نہیں ملتا تو ان کی بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور کسی کے انتظار میں بیگم بے چاری کا ناک میں دم آجاتا ہے۔ انھیں "قصہ سناتے" ہیں۔ کبھی بغیر "بلائے" "ولیمہ کی دعوت" میں پہنچ جاتے ہیں تو کبھی "الیکشن کی تیاریوں" میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کبھی انھیں "بھوپال کے بہادر" یاد آتے ہیں کبھی کسی شامت کے مارے کو اس کی پرسش پر دو چار گھنٹے "کسی کا پتہ" بتاتے ہیں اور جب وہ غریب "تاب" نہیں لاسکتا تو شبراتی اور بغاتی کو ان کی پوری تقریر سننا پڑتی ہے۔ غفور دادا کو کھیل اور وہ بھی "ہاکی کے کھیل" سے بڑی دلچسپی ہے۔

بھوپال کی زندگی کے سارے رنگ موجود ہیں۔ ایک غفور میاں کی شکل میں ــ مگر وہ "دیدۂ بینا" اب ہم کہاں سے لائیں گے جس نے یہ زندگی دیکھی اور ہمیں دکھائی تھی۔

مقرب حسین مقرب
رائے سین (مدھیہ پردیش)

نذرانۂ عقیدت

تم خدا کی تخلص تھے مستحسن اس کے
کہ اُن کے بعد انھیں پورا ملک یاد رکھے
وہ زندگی میں لٹاتے رہے ہنسی سب پر
ہم ان کی موت پہ آنسو بھی اُن کو دے نہ سکے

یہ جانتا ہوں جو آیا ہے وہ تو جائے گا
یہ ٹھیک ہے کہ یہ دنیا ہی ایک فانی ہے
یہ مانتا ہوں کہ ویسے تو ہیں ادیب بہت
میں پوچھتا ہوں تخلص کا کون ثانی ہے

دلائی یاد "شگوفہ" کے اس شمارے نے
ہمارے ملک میں اک اہل فن تخلص تھا
بھلا دیا جسے بالکل شمال والوں نے
یہ کم نہیں اُسے اہلِ دکن نے یاد رکھا

میں کہہ رہا ہوں یہ بھوپالی حکمرانوں سے
رہو گے سوئے کہاں تک ابھی ذرا اُٹھو
جو اس کے بعد بھی دے یاد کچھ نہ تم اس کو
کوئی سڑک ہی تخلص کے نام پر کر دو

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیا طریقہ ہے
یہ سوچتا ہوں مقرب تو دل سلگتا ہے
کوئی مرے جو منسٹر تو جھنڈا جھکتا ہے
کوئی مرے جو گورنر تو بینڈ بجتا ہے

تمام اہلِ سخن اہل فن یہ کہتے ہیں
ادیب مر کے بھی لیکن ادیب رہتے ہیں

●

موت برحق ہے جو پیدا ہوا ہے ضرور ایک روز مر کر اپنے اس آخری فرض کی تکمیل کرے گا۔ لوگوں کا یہ خیال کہ اگر کوئی ۴۵ کے پیٹے میں جا پہنچے تو بیس پچیس سال اور کھینچ لیتا ہے لغو بات ہے۔ البتہ بعض حضرات کی موتیں اس قدر سیکولر ہوتی ہیں کہ دونوں تعجب ہوا کرتا ہے یعنی جو "لا اینڈ آرڈر" کی زد میں آکر سرکاری موت مرجائے یا پھر "کرے کوئی بھرے کوئی" کے مصداق اپنوں کے ہاتھوں بھی موت مرکر دوسروں کے کئے کا بھگتان بھگتے۔

ان دونوں قسم کی تنہا دتوں سے اللہ کا شکر ہے کہ میں ہمیشہ محفوظ رہا۔ ۴۵ کی عمر میں پہنچ کر اطمینان کی سانس لی تھی کہ چلو اب بیس پچیس سال کے لئے فرصت ہوئی۔ مگر افسوس میری غیر متوقع اور بے وقت کی موت نے یہ ثابت کر دکھایا کہ درازئ عمر کی خواہش رکھنا ایک خواب ہے۔ موت کا کسی عمر میں بھی لاحق ہونا اٹل ہے۔ موت ہر بہانہ سے آتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ گولی، لاٹھی یا مفسدین کا سہارا لے! موت کو تنکے کا سہارا بس ہوا کرتا ہے۔

ایک دن احباب میں بیٹھا ہوا ہنگ گردی کر رہا تھا کہ کسی بے تکے لطیفہ پر بھوپال کے جواں عمر و جواں سال شاعر و ادیب اظہر سعید خاں نے سامعین کو مخاطب کرکے کہا "اس لطیفہ پر ہنسنے کی کون سی بات ہے مجھے تو مسکرانے کی تک گنجائش نظر نہیں آتی۔ بس کیا تھا! سنتے ہی میرا منہ فق ہو گیا۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ ہلکا بخار رہا گھر آتے آتے ۱۰۶ ڈگری چڑھ چکا تھا مقیاس الحرارت گل کر حلق کے نیچے اتر گیا۔ ایک شعلۂ پریشاں منہ سے برآمد ہوا نتیجہ میں "قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

حضرت شفا گوالیاری اس محفل میں موجود تھے میری گرتی ہوئی حالت کو تاڑ گئے کہ بچنا محال ہے۔ فوراً کاغذ پنسل کی مدد سے ایک قطعہ تاریخ وفات نکالا اور سیدھے روزنامہ "ندیم" کے دفتر میں جا پہنچے۔ قطعہ تھا

شفا نے شاعری میں ٹانک دی تاریخ
تخلص اس جہاں سے ہو گیا رخصت

میرا جنازہ میرے شایان شان بڑے اہتمام سے اٹھایا گیا۔ ہندو، سکھ، عیسائی دور کھڑے ہوئے کارروائی جنازہ دیکھتے رہے کچھ مسلمان بے وضو ہونے کی وجہ سے دور ہی رہے کچھ بھائی لوگوں نے وضو اور غسل کئے بغیر ہی دھکا دی (خدا ان کی نمازِ جنازہ بھی بے غسلوں سے پڑھوائے)۔ تعجب ہوا کہ وہ دوست جو ہم پیالہ ہم نوالہ تھے میرے جنازہ میں شریک نہیں تھے البتہ چالیسویں میں ضرور شریک ہوگئے تھے۔

جوں ہی میت کو قبر میں اتارا تو معلوم ہوا کہ قبر ۵/۱ فٹ کی ہے جبکہ میری میت ما شاء اللہ پوری چھ فٹ ایک انچ کی تھی! نہ معلوم گورکنوں نے کس شرح ان کے ذریعہ بے گار کی تھی! خیر... زندگی میں دینیات کی کتاب میں پڑھا تھا کہ جب زندہ لوگ مردہ کو دفن کرکے چالیس قدم دور چلے جاتے ہیں تو فرشتے (منکر نکیر) مردے کے دینی و مذہبی معلومات کا جائزہ لینے آتے ہیں قطع نظر اس کے کہ مردہ نے زندگی بھر سوائے گوشت کھانے کے دوسرا کوئی اسلامی فریضہ ادا کیا ہو یا نہیں! بہر حال میں کلمۂ توحید اور دیگر اسلامی باتوں کا ورد کر ہی رہا تھا کہ ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ دو فرشتے قبر میں نمودار ہوئے جو خاکی کپڑے پہنے تھے۔ خاکی کپڑے دیکھتے ہی لرز اٹھا اور جھٹ سے خوشامد میں کہا "اسلام علیکم"

"ہوں" فرشتوں نے گویا سلام کا جواب دیا۔

"تیرے گناہ و ثواب کی کتابیں کہاں ہیں؟ ایک فرشتے نے میرے پاس بیٹھ کر سوال کیا۔

"معلوم نہیں" قدرے بھنا کر میں نے جواب دیا۔

"تیرے سرہانے دیکھ" کھڑے ہوئے فرشتے نے غضب ناک ہو کر حکم دیا۔

"معاف کیجئے گا، آپ کا لب و لہجہ کافی درشت ہے۔"

"دیکھتا نہیں خاکی وردی پہنے ہیں" بیٹھے ہوئے فرشتہ نے کوٹ کا دامن دکھلا کر جواب دیا۔

"مگر صاحب یہ انداز گفتگو تو بہت ہی ویسا ہے! میں بھی شریف آدمی ہوں۔ قسمت کی بات ہے کہ مرگیا لاکھوں کی جائداد چھوڑ کر آیا ہوں۔ گورنر کے پاس کرسی ملتی تھی! اکانگریس میں بھی قوم یتیم کی خاموش نمائندگی کرنے کی وجہ بڑی قدر و منزلت . . . . ."

"ابے چپ کر۔ بڑا آیا قدر و منزلت والا! بلا ضرورت وقت خراب کر رہا ہے۔ ابھی اسی۸۰، نوے۹۰ مردے 'ہیارٹ پورٹ' سے آئے ہیں ان کی تفصیل معلوم کرنا ہے کہ عمرِ طبعی سے پہلے کیوں کر مرگئے۔ اچھا کتابیں بتا جلدی۔"

میں نے انتہائی غصہ میں اپنے سرہانے ٹٹولا تو واقعی دو کتابیں پائیں۔ اٹھا کر فرشتوں کو دے دیں۔ ورق گردانی کے بعد ایک فرشتے نے کہا:

نیکیاں درج ہونے والی کتاب تو بالکل خالی پڑی ہے۔ بس یہ اوپر ۸۶ء لکھا ہے! جبکہ گناہوں کی کتاب کے یہ حاشیے تک بھرے پڑے ہیں" بیٹھے ہوئے فرشتے نے مزید رہبری کی۔

"تو گویا آپ سے کوئی ثواب سرزد نہیں ہوا؟" کھڑے ہوئے فرشتہ نے پوچھا۔

"اجی نہیں صاحب۔ ایسا کیسا ہو سکتا ہے، ایک نہیں تھاؤزنڈس"

"ابے انگریز کے بچے سیدھی سیدھی اردو بول" پھر ایک دم فرشتہ نے پوچھا کیوں؟

"تو نے اپنی مادری زبان کیا لکھوائی تھی"

"انجمن ترقی لکھوائی تھی :

"کیا انجمن ترقی ! یہ کون سی زبان ہے ؟"

"آج کل صاحب اسی کو اردو کہتے ہیں۔"

"خیر ہوگا کچھ ..... یہ نیکیوں کی کتاب خالی کیوں رہ گئی ؟"

"اجی صاحب ! سی۔ آئی۔ ڈی والوں کی طرح فرشتوں نے بھی اپنے مطلب کا لکھ لیا ہوگا۔" فرشتہ نے معنی خیز نظریں ڈال کر پھر ایک دم پوچھا :

"دنیا میں کیا کرتا تھا ؟"

"پنچ گردی !"

"کیسی پنچ گردی ؟" فرشتہ نے حیرت سے معلوم کیا۔

"یہی ہنسنا ہنسانا !"

"ہوں تو گویا ہنسی مذاق کے لئے آپ دنیا میں گئے تھے ! اب کیا ہوگا یہاں ؟ کچھ یہاں کا بھی سوچا !"

"اب جو حشر بھی ہو !" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ بیٹھے ہوئے فرشتہ نے ادھر ادھر سونگھ کر پوچھا :

"کیوں بے مسخرے ! تیرے منہ میں خالص گھی کی خوشبو کیسی آرہی ہے۔ کیا اب بھی دنیا میں گھی مل جاتا ہے ؟"

"جناب میرے ایک دوست وزیر تھے جو اپنے بھتّہ افسروں کے توسط سے دیہات سے خالص گھی منگوایا کرتے تھے۔"

"تو کیا وزیر گھی کی تجارت کرتے ہیں .... ؟"

"نہیں صاحب۔ خالی دوستی میں دیا کرتے تھے۔"

"کیا بھاؤ خریدا تھا ؟"

"جناب گھی تو وزیر صاحب کے پاس بھی بغیر بھاؤ کے آیا تھا۔ تھوڑا بہت مجھے بھی عنایت کر دیتے تھے۔" میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ چلو یہ فرشتے اصل موضوع سے ہٹ کر دنیاداری میں تو پڑے۔

پھر کھڑے کھڑے فرشتہ نے میرے کفن کے ایک کونے کو دیکھ کر سوال کیا :

"یہ اس میں کیا بندھا ہے ؟"

"یہ صاحب مدھ بھرے دلیش کی قوم یتیم نے بابو کے نام ایک میمورنڈم دیا ہے۔"

"کس کی عملداری ہے وہاں ؟ کون بادشاہ ہے ؟ کہیں وہ تو نہیں۔" فرشتے نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ "اچھا سا تو نام ہے .... وہ .... کیلا ... ش ... ش .... ناتھ ... کاٹ ..."

"جی جی !" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "وہی ہیں۔ بہت نیکدل، خدا ترس اور اشراف آدمی ہیں۔"

"بس بس خاموش۔ یہ تجھ سے وکالت کرنے کو کون کہہ رہا ہے ؟ رحمدلی کی جانچ یہاں ہوتی ہے، وہاں نہیں ! بہت بڑے سنسکرت کے عالم بنے ہوئے ہیں ہم لوگوں کا سنسکرت سیکھ کر ناک میں دم آگیا ہے۔ جس مردے کو دیکھو سنسکرت میں سوال و جواب چاہتا ہے۔"

غرض کہ فرشتے کرید کرید کر میرے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کو ناپتے تولتے رہے۔ لاکھوں گناہوں کا

میں نے اقرار کیا۔ ہزاروں کا سرے ہی سے انکار کر دیا۔ گناہوں کی تفصیل یہاں بتانا نہیں چاہتا۔

مگر دادا نے پردادا۔ پردادا نے دادا اور دادا نے باپ کو منہ زبانی اور آنکھوں دیکھی تاریخ بتائی کہ بسلسلہ تلاش روزگار جدِ امجد افغانستان سے تشریف لائے۔ قتل و غارت گری اور کمزوروں کی بیخ کنی کرنا خاص پیشہ تھا۔ سردار دوست محمد خان صاحب بانیٔ ریاست بھوپال کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ سردار موصوف کی ہمت اور شہ پر خوب لڑے۔ نتیجہ میں ایک جاگیر ملی جو آج تک سرونج میں باغ کی صورت میں ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے تک بیس روپے ڈھائی آنہ جاگیر کا ملتا تھا۔ مگر اپنی سرکار نے غیر مستحق سمجھ کر چھین لی۔ گویا تلوار کی مدد سے حاصل کی ہوئی جاگیر جب ترازو میں تولی گئی تو باٹوں کا پلڑا زمین پر لگا ہوا تھا۔

اب رہا میری تعلیم کا مسئلہ تو پوچھنا بیکار ہے! جو کچھ پڑھا تھا وہ بڑے بڑے باعلم لوگوں کو پڑھا دیا۔ پھر بھی اپنے تعلیم کے راز کو ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جب موجودہ زمانے کے لکھے پڑھے' باوجود ڈگریاں رکھنے کے اپنی "جہالت" کو راز نہ رکھ سکے تو مجھ جیسے بے ڈگری دار کے لئے اپنی تعلیم کا راز رکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟ دراصل میری تعلیم سے کئی روایات وابستہ ہیں' کسی کا کہنا ہے کہ میں ایم۔ اے تھا۔ کوئی کہتا کہ گریجویٹ تھا۔ لیکن میرے قریبی حلقوں کی روایت زیادہ تر معتبر معلوم ہوتی ہے کہ میں نے میٹرک کے لگ بھگ تعلیم پائی تھی۔ البتہ یہ کریڈٹ ضرور ملتا ہے کہ میرے دو بچے گریجویٹ ہو گئے تھے۔ میرے ساتھ کے پڑھے ہوئے لندن اور امریکہ ہو آئے۔ آج بھی ایک تعلیمی اور چار اسپتالی ڈاکٹر ہیں۔ پانچ کانگریسی وزیر' چھ میجر' آٹھ کپتان' سو دو سو بابو بن گئے۔ کچھ دوست جو زیادہ متعصب اور جھگڑالو تھے' تھانیدار ہو گئے تھے۔ کچھ آج بھی گھاس کاٹ رہے ہیں' کچھ بھینسیں پالتے ہیں' جزاک اللہ کہہ کہہ کر حدِ نظر تک دودھ میں پانی ملاتے ہیں۔ انگریز کے زمانہ میں دودھ میں پانی دیکھنے کے ولائتی آلے ہوتے تھے لیکن جب سے اپنے ملک میں یہ آلے بننے لگے تو صرف پانی میں دودھ کی مقدار ہی بتاتے ہیں۔

اب رہ گئی تربیت! نورٌ علیٰ نور! ایسی تربیت کہ عوام الناس مجھے شریف سمجھنے پر مجبور تھے! اور تھا بھی واقعی شریف! کیونکہ میں نے زندگی بھر اپنی قوتِ برداشت کا پلہ بھاری رکھا۔ ہر ناپسندیدہ بات کو خواہ سرکاری سطح کی ہو یا عوامی' برداشت کر لیتا تھا۔ مشاعروں میں بیٹھ کر ہمیشہ پہلے بیک شعراء کو برداشت کیا۔ غیر قدامت پسند گروہ کے ادیبوں کی فحشیات اور "بے راہ روی" کو برداشت کیا۔ دراز و فحش نگار عورتوں کی مردانہ قسم کے کوک شاستری لٹریچر کو برداشت کیا۔ جرائم پیشہ "خاکی گروہ" کی لاقانونیت اور دھاندلیوں کو برداشت کیا! نیتاؤں کی خواب آور تقریروں کو برداشت کیا! حد ہو گئی کہ اپنی شرافت کے ناطے "اپنوں" کو بھی برداشت کیا جو پندرہ سال کے عرصہ میں دیکھتے دیکھتے ..... غیر بن گئے۔ چلئے' تربیت کا مسئلہ بھی ختم ہوا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد لکھنؤ' دلی' میرٹھ گئے۔ ٹیلرنگ کا کام سیکھا۔ واپس آ کر بھوپال میں زوردار دوکان کھولی۔ ادھار سلوانے والے احباب اور اعزّا کے کپڑوں پر خوب ہاتھ صاف کئے۔ نتیجہ میں ہم سیکھ گئے اور فری میں سلوانے والوں سے پیچھا چھوٹا۔ ۱۹۳۹ء کے قریب برٹش سرکار کو جری اور دلیر قسم کے لوگوں کی ضرورت لاحق ہوئی جو افواج ہٹلر کے دانت کھٹے کر دیں۔ چنانچہ ہمارا انتخاب عمل میں آیا۔ لڑے کم لڑایا زیادہ۔ سرکار انگلشیہ کی گرتی ہوئی معاشی حالت کے پیش نظر ایک دن کا ایمونیشن ایک ماہ تک بڑی احتیاط سے چلایا۔ سرکار نے اس کفایت شعاری کو دیکھ کر جواب دے دیا۔ گھر آ گئے۔ آتے ہی ہڈی سے کھاد بنانے کا کام شروع کر دیا۔ پھر موٹر پارٹس کی دوکان کھولی۔ بنگلے' موٹریں' نوکر چاکر' عیش و آرام قسمت میں لکھا ہی تھا' پورا ہوا۔ وہ لوگ جن سے میں نے کبھی نوکری

کے لیۓ عرضیاں معروض کی تھیں درخواستیں لیۓ پنچ بھون کے سامنے کھڑے رہا کرتے تھے ۔ ایک دن بیکار مباش کچھ کیا کر کے ضمن میں حضرت نادم سیتاپوری کو ایک طویل خط لکھ دیا ۔ بس کیا تھا ۔ موصوف چلے آرہے ہیں کہ " ادب پر ظلم کر رہے ہو ' خدا کے لیۓ لکھو ۔ کوئی پرچہ نکالو ۔ اردو ادب میں مقام رکھتے ہو ۔ ہند پاک میں بہت بڑے مسخرے کا اضافہ ہوگا " غرض کہ جب تک " بھوپال پنچ " جاری نہیں کرالیا اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑا ۔ اور اس طرح مجھے ہنسی مذاق پر لگاکر خود نہ معلوم کہاں کہاں مرثیۓ کہتے پھر رہے ہیں !

یکم جون ۱۹۶۰ء سے ہفت روزہ " بھوپال پنچ " کو جاری کردیا ۔ بھوپال کے لوگوں کے مخصوص لب و لہجہ ، سج دھج ، آن بان ، تہذیب و معاشرت اور رہن سہن کے اعلیٰ مذاق سے بیرونی دنیا کو متعارف کرایا ۔ اس سرزمین قہقہہ زار کے دو مزاحیہ کردار ' غفور میاں اور پاندان والی خالہ تخلیق کیۓ ' جس کی دھوم آج مرنے کے بعد بھی مچی ہوئی ہے ! جہاں تک بن حق و صداقت کو ہاتھ سے نہ چھوڑا ۔ شریفوں کو ہاتھ اور کم ظرفوں کو کبھی منہ نہ لگایا ۔ دب کر یا کسی سے متاثر ہوکر قلم چلانے کو میونسپلٹی کی نالیوں میں بانس چلانے کے مترادف سمجھا ۔ آخر آخر میں تو قلم کی تندی اور تیزی نے اس قدر خطرناک صورت اختیار کرلی تھی کہ مخلص دوستوں نے سرکاری مہمان بننے کے اندیشے ظاہر کیۓ ! اور یہ وہ زمانہ تھا کہ بے ایمان چین نے ہماری مقبوضہ و محفوظ زمین پر حملہ کردیا ۔ سرکار نے چین سے نپٹنے کے لیۓ عوام پر ڈیفنس ایکٹ لاگو کردیا ۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ " پنچ کو خیرباد کہو ورنہ اگر کہیں سرکار نے اپنا ڈیفنس کرلیا تو پھر سزا کاٹنے کے بعد ہی ضمانت پر رہا ہوسکو گے ۔ چنانچہ بلڈ پریشر بڑھا ۔ سفید کپڑوں میں لال آنکھیں ' غراتی نظر آمیں اور بالآخر ۳ نومبر کو پنچ کا آخری شمارہ نکال کر اپنوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہونے سے بچ گیا ۔

اور اس پنچ کو جو ادبی دسترخوان کا نمک اور شرفا کی محفلوں کا " رننگ ٹاپک " ہوکر رہ گیا تھا ' ہمیشہ کے لیۓ ملتوی کردیا ۔ اکابرینِ شہر اور شریف شرفا مجھ سے کافی خائف رہنے لگے تھے ' جب بھی ملتے بڑے خلوص اور تپاک سے منہ چیر چیر کر خیر و عافیت ، نیز دیگر ضروری غیر ضروری باتیں پوچھا کرتے تھے ۔ کچھ شرفا تو اس قدر تعظیم و تکریم کرتے تھے کہ بعض اوقات مجھے اپنے شریف ہونے میں شبہ ہونے لگتا تھا ۔ لیکن پنچ کے ملتوی کرنے کے بعد یہی شرفا اور اکابرینِ شہر بغیر کوئی لفٹ دیۓ منہ پھیر کر جاتے ہوۓ دیکھے گۓ ۔

عام ہندوستانیوں کی طرح مجھ میں لاتعداد خوبیاں تھیں ۔ دل میں کچھ ' زبان پر کچھ ' کاغذ پر کچھ ' پر ایمان رکھتا تھا ۔ جھوٹ وعدہ خلافی ، بے انصافی اور خود غرضی کی عادتیں سیاسی حضرات سے ورثہ میں ملی تھیں ۔ کیونکہ بغیر ان صفات کے کوئی شخص سیاست کے میدان میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا اس لیۓ سیاست بھی خوب کرلیتا تھا ۔ انگریزوں کے زمانہ میں کانگریس کے آنکھ مارنے پر حکومت بھوپال کے خلاف کامیاب سازشیں کیں لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بوقت تقسیم رزق بسلسلۂ حسن خدمات یہی زعمائے کرام اب آپس میں آنکھ مار رہے تھے ۔ البتہ بعد میں یہ دیکھ کر قلب کو اطمینان ہوا کہ اپنی جمہوری حکومت میں کسی مخصوص طبقے یا اس کے کسی فرد کو بطورِ خاص مراعات دینا آدابِ جمہوریت کے خلاف ہوتا ہے ۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ رزق کی طلب نے پریشان کردیا تھا ۔ میرے دوسرے " نعرۂ تکبیر مارکہ " دوست بھی ان دزدیدہ نگاہوں کے شکار ہوگۓ ۔ میں نے بھی لینن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور دوسروں کی گاڑھی کمائی میں بیٹھے بٹھاۓ حصہ دار بننا چاہتا تھا کہ اللہ نے بروقت مدد فرمائی ۔ میری تمام شکایات رفع کرکے مجھ پر روزی کے دروازے کھول دیۓ ۔ چنانچہ لینن کو چھوڑ کر پھر اللہ سے متعلق ہوگیا ۔

دنیا میں جب تک رہا میں نے موٹر کی سواری کو ہمیشہ پسند کیا ۔ سائکل پر بیٹھنے سے نفرت تھی ۔ کیونکہ شروع شروع ایک

سائکل والے نے بیچ چوراہے پر گریبان پکڑ کر دس آنہ اپنی سائکل کا کرایہ رکھ وایا تھا۔
دنیا میں تین سلطانی خطاؤں سے محفوظ رہا یعنی گرنی، گول مال اور گائے۔ انتہائی پرسکون ماحول میں رسالی پاکر زندگی کے طویل سفر پر روانہ ہوگیا ۔۔۔

بہ سلامت روی و باز آئی (تلخیص)
(شیطان جاگ اٹھا" سے)

تخلصی لطیفے

• غفور میاں نے مچھروں سے پیچھا چھڑانے کے لئے ایک سکنڈ ہینڈ مچھر دانی خریدی۔ پہلے روز ... رات لگائی تھی کہ اس میں ایک جگنو چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ بس آپا تھا آپ ... بگولہ ہوگئے اور فرمایا:

"واہ بیٹا! کیا خوب! اب لالٹین لے کر آئے ہو"

• کسی تحصیل کا ایک مال دار شخص اپنے نوکر کے ساتھ شہر آیا اور اس نے وہاں بازار سے سوٹ کیس خریدا۔ دل رکھنے کے لئے نوکر سے پوچھا:

"تجھے بھی چاہیئے سوٹ کیس؟"

"میاں! میں سوٹ کیس کا کیا کروں گا؟"

"ارے کپڑے رکھنا اور کیا کرے گا"

نوکر نے معصومیت سے جواب دیا۔ "میاں! اگر کپڑے سوٹ کیس میں رکھ دیئے تو پہنوں گا کیا؟"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ"

عبدالاحد خاں تخلص

کیف بھوپالی

اپنے بھوپال کا غیور اور خوددار شاعر ...... "سرزمینِ خان" کا نامور فن کار ...... جواں عزم و جواں سال ... شاعرِ انقلاب حضرت محمد ادریس "کیف مخی عنہ"

تمام روئے زمین کی مخلوق چار عناصر سے ترتیب پا رہی ہے۔ لیکن بھوپال میں تخلیق ہونے والے "چار عناصر کے انسان" میں "پانچواں عنصر" ذہانت بھی شامل ہے۔ اسی لئے بھوپال کے لوگ ذہین سمجھے جاتے ہیں۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ "ونکٹ راؤ" مع اپنی بیوی کے بسلسلۂ "تلاش" "محنت مجوری" بھوپال آئے اور آتے ہی "سنکٹ راؤ" کو جنم دیا۔ یہ سنکٹ راؤ ہرگز ذہین نہ ہوگا جو عرصۂ دو سو سال سے سرزمین بھوپال پر اپنے باپ دادا کے توسط سے مستقل پیدا ہوتا چلا آرہا ہے۔ یعنی "بتّرو کاٹ"..... بھوپال کے لوگ رات دن پٹیوں پر بیٹھ کر اپنی خداداد ذہانتوں کو غارت کر دیتے ہیں۔ کاش! اب بھی بیٹھنا چھوڑ دیں تو ان کا مقام کچھ اور سوا ہو جائے۔

کیفؔ زندہ دل، خوش اخلاق اور "خوش ذائقہ" فن کار ہیں۔ کرایہ کے مکان میں رہنا اس لئے پسند کرتے ہیں کہ زندگی بھی کرایہ پر چلتی ہے۔ زندگی میں ٹھاٹ باٹ کا عنصر معدوم ہے۔ بس ایسی ہی بری بھلی گزار کر اللہ کی دی ہوئی جان کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں کہ کہیں کفرانِ نعمت نہ ہو جائے ...... دس بائی دس فیٹ کے ایک نہایت کفایتی مکان میں مستقل بود و باش اختیار کئے رہتے ہیں۔ جس کا واحد حدود اربعہ یہ ہے۔ جانب مشرق گاؤ تکیہ، جانب مغرب ایک دروازہ درآمد برآمد کے لئے، جانب شمال ایک میز اور دیگر اشیاء یعنی کلام وغیرہ، جانب جنوب تعزیت کرنے والوں کی نشست کے لئے بالکل خالی ـــ بیچ میں ایک دری، اس پر ایک چادر اور اس پر حضرت کیفؔ "رحمۃ اللہ علیہ"...

اپنے اس محبوب شاعر کے پاس فرنیچر وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ "فری نیچر" کی بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً ایک آئینہ جو سالہا سال سے اپنے عاشق "بے کیف" کو دیکھ دیکھ کر اندھیا گیا ہے ..... ایک پانی کا گھڑا، زندگی کی تشنگی بجھانے کے لئے ..... ایک لالٹین زندگی کی تاریک راہوں پر روشنی ڈالنے کے لئے اور ایک رضائی، خاموش رفیقۂ حیات کی طرح۔ کیفؔ حتی الوسع کم سوتے ہیں۔ اس لئے پلنگ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ سوئی ہوئی قوم کو جگانے

کے لئے ہمیشہ جاگتے رہیں۔ مگر نہ وہ جاگتی اور نہ یہ سوتے ...... گذراوقات بھی کسی نہ کسی حیلے بہانے ہو جاتی ہے۔ ہمارے شاعر کو زندہ رکھنے میں اللہ کی مدد کو زیادہ دخل ہے۔ کیونکہ صرف چائے پی پی کر بچوں کی طرح پرورش پاتا رہا ہے۔ رزق کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ پھر بھی زندہ ہے ..... کیفؔ روپے پیسے سے بھی بے نیاز رہتے ہیں۔ روپیہ کے متعلق ہمارے فنکاروں کا یہ خیال ہے کہ روپیہ پیسہ بھی بیوی بچوں کی طرح دینے کی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لئے کوئی دیتا نہیں ....

کیفؔ بھی بھوپال میں پیدا ہوئے اور تادمِ تحریر کیفؔ کے نام سے چالو ہیں۔ کیف خوب لکھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ شاعری کی "لت" شروع ہی سے ہے۔ آج تک "لیا" رہے ہیں۔ زبان سلیس اور بامحاورہ ہے۔ ثقیل اردو کی ترکیب استعمال سے ناواقف ہیں۔ زبان بھی سخت ہے اس لئے ثقیل اردو زبان سے نکلتی بھی نہیں۔

بزمانۂ ابتدائی تعلیم "مولوی محمد اسمٰعیل ریڈر" کی دو نظموں "نہر پر چل رہی ہے پن چکی" اور "رب کا شکر ادا کر بھائی" ... کو خوب دل لگا کر "یاد کر دیجئے اور معنی" کے ساتھ پڑھ لیا تھا۔ آج تک یہی "اسماعیلی رنگ" کلام آرہا ہے۔ اور یہی رنگ کیف کی شاعری کی جان ہے اور دوسروں کے لئے وبالِ جان۔

شاعری کے "اڑاؤ پھنساؤ" اور قاعدوں، ضابطوں سے بے نیاز ہو کر صاف ستھری، ہلکی پھلکی اور عام فہم "غالبی" کرتے ہیں..... "نہر پر چل رہی ہے پن چکی" کا خیال آیا تو فوراً ایک "مزدورانہ" نظم لکھ دی اور جب "رب کا شکر ادا کر بھائی" سے متاثر ہوئے تو کلامِ مجید کو منظوم کرنا شروع کر دیا۔ بیک وقت ماسکو اور مکہ شریف پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ دونوں کے شاعر ہیں دونوں سے دور!

محفلوں میں کیف نمایاں رہتے ہیں۔ نظموں کے ساتھ ساتھ لطیفے بھی بناتے جاتے ہیں۔ کسی کے مذاق کو نہایت اعلیٰ ظرفی اور پامردی کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی محفل پر بار ہوئے نہ "بور" .... شاعری کی ابتدا حسبِ قاعدہ "حمد و ثنا" سے کی اور کیف تخلص رکھا۔ لیکن کچھ روز کے بعد جب حالات "بے کیف" ہوئے تو سمجھے حمد و ثنا کا الٹا اثر ہوا۔ رنگ بدلا..... اللہ سے بغاوت کی..... "ماسکوی" رنگ اپنایا۔ کمیونسٹ جیسے ہو گئے لیکن اب بیمار جیسے رہنے لگے ہیں۔ شاعری کی کیفیت کم اور بیماری کی کیفیت زیادہ..... پھر بھی موجودہ رنگ بدلنے پر قطعاً تیار نہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اگر رنگ بدلا تو مرثیے لکھنا پڑیں گے۔ مگر مرثیہ کس پر لکھیں؟ مرنے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں..... قصیدہ اس لئے نہیں لکھتے کہ خوشامد سے نفرت ہے..... ہجو کا کوئی مستحق نہیں کہ یہاں سب "شریف شرفا" ہیں اور "ریختی" یوں نہیں کہتے کہ غمِ جاناں سے عرصہ ہوا بے نیاز ہو گئے۔ چلئے قصہ ختم!

عرصہ ہوا جب کسی گناہ کی پاداش میں سخت بیمار ہو گئے۔ "حسبِ دستورِ قدیم" اللہ یاد آیا۔ جس طرح کہ ۱۹۴۲ء میں اسٹالن نے ہٹلر کی دست برد سے بچنے کے لئے مسجدوں اور کلیساؤں میں پبلک سے حکماً اللہ کو یاد کروایا تھا۔ نتیجہ میں ہٹلر مر گیا۔ نہ ماننے والوں کی بھی اللہ سنتا ہے! کیف کے یاد کرنے پر بھی اللہ نے ایک مرتبہ دیا۔ اچھے ہو گئے..... اللہ کو خوش کرنے کے لئے "کلامِ مجید" کا پہلا پارہ بطورِ سیمپل منظوم کر دیا، جو بہت مقبول ہوا۔ لیکن اقتصادی حالات پھر مائل پرواز..... اپنی قوم نے مزید "پارے" "فری" میں پڑھنے کے لئے بڑے شد و مد سے تقاضے شروع کئے۔ کیف نے اپنی بے بسی بتائی.... امداد چاہی.... قوم مطلب سمجھ گئی... تقاضے بند...... اب الٹے کیف تقاضے کر رہے ہیں اور قوم خاموش! اپنے پیارے ملک "غلستان" میں فن کاروں کی موت و زندگی کے لئے بڑی گنجائش رہتی ہے۔ زندہ رہے تو اپنی قوم سے "بامیدِ غلوی" ملتے اور

مانگتے ہی رہے۔ اور مرے تو اپنی مخلص قوم نے تجہیز و تکفین کا انتظام اس طرح کیا کہ ..... 'قلم' کسی کا 'دوات' کسی کی.. کاغذ کہیں کا ..... اور فوری میں درخواست تیار کی ..... مرحوم کا انگوٹھا جبراً لگا کر درخواست بھی مرحوم ہی کی طرف سے دی۔ اپنی محتاط قوم اس ذمہ داری سے بھی دور رہی۔ کسی ایم۔ایل۔اے سے سفارشی نوٹ لکھوالیا کہ واقعی مرحوم سائل قابل امداد و مستحق کفن دفن ہے۔ دو روز سے بے غسل و کفن پڑا ہوا ہے۔ میونسپلٹی کے "جلد شاد" نوٹس بھی آرہے ہیں اس لئے تجہیز و تکفین ازبسکہ ضروری ہے۔ بہ ہزار دشواری مرحوم کا سرٹیفکٹ "نیک چلنی" داخل کرنے پر اپنی سرکار نے آخر بے بس ہو کر کفن کا انتظام کر ہی دیا۔ خدا والوں نے قبر فری میں کھود دی۔ اس مری ہوئی زندگی میں بھی قوم کے کاندھوں پر "لد" کر قبرستان پہنچے اور خدا خدا کر کے کہیں تیسرے روز دفن ہوئے۔ فراغت ہوئی۔ پیچھا چھوٹا۔ مرحوم بڑے سخت جان تھے ..... جنازے کے ساتھ فقیر فقرا بھی نہیں جاتے۔ فقیروں کو پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بے حس قوم کا مفلس شاعر مرا ہے۔ قبرستان جانا آنا خالی ہاتھ رہے گا۔ اپنے یہ فقیر بھی غضب کے ذہین ہوتے ہیں ..... گورکنوں اور فقیروں نے زندگی میں کم، کسی شاعر یا فن کار کے لئے بددعا نہیں کی بلکہ جب بھی بددعائیں کیں تو کسی "موٹی مرغی" کے لئے ..... لیکن مرا پھر بھی یہی اپنا 'شاعر وائز' ...... دعا رہے اثر۔

گو اپنے شعراء کے ذرائع [illegible] دولوش "تادم شعر و سخن" مسدود ہی رہتے ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد دوسرے مفلسوں کے لئے خیر و برکت کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی مرحوم کا شاگرد رشید دیوان چھپوا کر خوب روپیہ پیدا کرتا ہے۔ استاد کے ایصال ثواب کے لئے ایک پیسہ تک خیرات نہیں کرتا ..... استاد مرحوم کی چار بیڑی کا قرض بھی محمد بھائی ہوٹل والے کو ادا نہیں کرتا۔ سمجھتا ہے کہ مرحوم خود اللہ میاں کے یہاں حساب کر دیں گے۔ میں نے بھی یہاں حساب کر دیا تو محمد بھائی 'کونڈ بلے پے منٹ' ہو جائے گا۔ شاگرد ہی بلا کا ذہین ہوتا ہے۔

کیف جوان انمر جیسے لگتے ہیں۔ جوانی باتوں ہی باتوں میں بتا دی۔ اب جوانی کی عمر کو پار کیا ہی چاہتے ہیں ابھی دو اسٹیج اور باقی ہیں ..... "ادھیڑی" اور "بڑھاپا" ..... کیف کے جینے کی اگر یہی رفتار رہی کہ بیمار ہو ہو کر تندرست ہوتے رہے تو جلد ہی دوسرے اسٹیج پر قیام کریں گے۔ اس کے بعد کہاں جائیں گے؟ شاید مریخ میں۔ اور وہاں جا کر پھر "عزم جواں" کی قسمیں کھایا کریں گے زمین پر آنے کے لئے ..... کیف کو مریخ والے کیا نوازتے ہیں، یہ بعد کی بات ہے۔

ہمارے ملک میں مستحق شعراء کی جو اس قدر ناقدری ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بکثرت لوگ شاعری کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جن کا مطلب سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ نہ کھائیں گے اور نہ کھانے دیں گے۔ جس طرح کسی دوکان کو اچھا چلتا دیکھ کر کوئی دوسرا اس سے ملحق اسی جنس کی دوکان کھول کر بیٹھ جائے۔ نتیجہ میں دونوں تباہ!

"خوردو اور شوقیہ" نئے شاعروں کے بلا ضرورت عذاب کو کم کرنے کے لئے باہر کے ممالک میں شعراء کے بورڈ ہوتے ہیں۔ جہاں کسی نئے شاعر کی اطلاع آئی کہ پولیس نے پکڑ کر بورڈ کے حوالہ کر دیا۔ بورڈ نے بغور شاعری کے 'مریض' کو دیکھا۔ امتحان لیا۔ ردیف قافیہ دے کر دو چار شعر اپنے سامنے موزوں کرائے ..... اگر شاعری کی صلاحیتیں پائیں تو "تاحیات" وظیفہ مقرر کر کے "غالبی" کرنے کا لائسنس دے دیا۔ ورنہ بصورت دیگر "ان فٹ" شاعر کو کسی محکمہ میں "دال روٹی" سے لگا دیا اور سخت نگرانی رکھی کہ کہیں پھر اسے شاعری نہ ہو جائے۔ کیوں کہ 'ان فٹ' شاعر نے مرنے گلے بازی، ترنم اور مائک پر ہلنے کے شوق میں ہی شاعری شروع کی تھی۔ بہرحال

اس طرح دو فائدے ہوئے۔ "غیر ضروری" شعراء دھندے سے لگ گئے اور واقعی شعراء کی قدر و منزلت جوں کی توں قائم رہی۔

کیف "ہفت خیال" شاعر ہیں۔ ہر قسم کے موضوعات پر حالات اور وقت کے تقاضوں سے متاثر ہو کر شاعری کرتے رہتے ہیں ... کیف کی ایک نظم "عزم جواں کی قسم" ہے، جس کو سن کر دل چاہتا ہے کہ ابھی "کدالی پھاوڑے" کہیں سے مستعار لے کر مزدوروں کے ساتھ ہو جاؤ اور ہمالہ کو زیر زمین ہی کر کے واپس آؤ، مگر کاروباری لوگ اس نظم سے متاثر ہونا نہیں چاہتے کیونکہ کاروبار اور محنت مزدوری میں پرانا بیر ہے ..... کیف کی ایک نظم وہ "بابل" والی ہے۔ جس میں ایک لڑکی رخصت ہو کر اپنی سسرال جا رہی ہے اور بے طرح رو رو کر اپنے گھر کے ایک ایک فرد سے غم جدائی کو شاعری میں بیان کر رہی ہے۔ یہ نظم بلا کی رقت انگیز ہے۔ سننے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے، اور دل چاہتا ہے کہ کیف کے پاؤں پکڑ کر استدعا کی جائے کہ ..... "خدا کے واسطے۔ کیف! اس لڑکی کی رخصتی کو روکو۔ جس طرح بھی ممکن ہو۔ بے شادی ہی رہنے دو۔ تمہارا کیا لیتی ہے"..... اس گیت کو اگر کوئی "ذی حس" اور رحم دل انسان اپنی شادی سے پہلے سن کر اچھی طرح سمجھ لے تو اس مظلوم لڑکی پر رحم کھا کر زندگی بھر کنوارا ہی رہے ..... کیف کا یہ "ہمدرد نسواں" گیت اگر اپنی سرکار پروپیگنڈے کے لئے خرید لے تو "فیملی پلاننگ" کا منصوبہ سو فیصدی کامیاب ہو جائے گا۔ کیونکہ "ضبط تولید" کے لئے نہایت ہی مجرب نظم ہے اور کم خرچ بھی ..... ایک نظم کیف کی وہ "پیارے بیٹا" ہے جس کو سن کر مزدور کی رگوں میں خون کھولنے لگتا ہے۔ سینہ ابھار کر، مٹھی بند کر کے ..... لمکا تان لیتا ہے اور "مجسم ٹاٹا کا گارڈ" ہو کر بڑے سے بڑے آدمی کو جوش و خروش کے آثار تک کوئی لفٹ نہیں دیتا۔ لیکن مالدار آدمی جب "بہ جبر و اکراہ" سنتا ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے مزدور تلوار، برچھے اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر اسے گھیرے ہوئے ہیں اور اس کی تمام جائداد "منقولہ و غیر منقولہ" کو فری میں لینے کے لئے اڑے ہوئے ہیں اور انکار کی صورت میں قتل ہونے کا قوی امکان ہے۔

کیف سے چند اصحاب در پردہ "شاعرانہ چشمک" رکھتے ہیں۔ وجہ اختلاف معلوم کرو تو نہایت بے کیف اور غیر شاعرانہ ..... یعنی کیف، مشاعروں میں ان کی دال نہیں گلنے دیتے۔ سامعین کیف ہی سے زیادہ فرمائش کرتے ہیں۔ واہ واہ بھی کیف کو زیادہ ملتی ہے۔

..........ارے صاحب کیف اور پبلک میں پہلے سے ملی بھگت ہو جاتی ہے۔

..........اس قسم کے ریمارکس اور اختلافات ادب اور فن کے لئے سبکی کا باعث ہوتے ہیں۔

باوجود ان مخالفتوں کے کیف حلقۂ ارباب سخن میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں ..... "بے تحاشگی" کی حد تک مقبول ہیں اور مقبولیت انسان کو اعلیٰ کردار، بلند اخلاق اور ہر دلعزیزی کا ثبوت ہوتی ہے .... ابھی حال ہی میں ایک جگہ مشاعرہ ہوا تھا جہاں باوجود وعدے وعید کے شعراء کرام نہیں پہنچے۔ کیف کو رات کے بارہ بجے معلوم ہوا۔ طبیعت خراب تھی۔ تمام چہرے پر ورم تھا، لیکن گئے۔ اپنوں کی بات رکھنا تھی۔ دو نظمیں پڑھیں۔ غیر حاضر شعراء کی طرف سے معذرت کی۔ بھرم رکھ لیا۔ واپس آ گئے۔ کچھ دن ہوئے جب آپ کے چہرے پر کافی ورم آ گیا تھا۔ دشمنوں نے اڑا دی کہ کیف کو آج کل انڈے، مرغی کہاں سے مل رہے ہیں؟ کیف موٹے کیوں ہو رہے ہیں؟ پتہ اٹھاؤ! نادان شیخو کو ورم اور مٹاپے میں بھی تمیز نہیں ہوتی۔

حضرت شفا گوالیاری سے کیف خاصی عقیدت رکھتے ہیں۔ محفلوں میں شفا، کا ذکر خیر تکیۂ کلام کے طور پر کرتے

ہیں۔ سنا ہے شفا نے ایک مرتبہ اپنے دیوان کا تجویز کرنے کے لئے کیف سے مشورہ لیا۔ کیف نے برجستہ کہا کہ "شفا خانہ" رکھ دیجئے"..... اب شفا کیف سے کس طرح نپٹتے ہیں۔ معلوم کرنے کی بات ہے۔

زندہ باد! قوم کے شاعر زندہ دل!!

("پوسٹ مارٹم رپورٹ" سے)

تخلص بھوپالی مشاہیر کی نظر میں

انتخاب — ڈی کے نعیم، ایم اے

رشید احمد صدیقی "زبان کی صحت کے ساتھ آپ کی تحریروں میں شرافت، جراءت اور توازن ملتا ہے۔ آپ کی ادبی ہی نہیں، صحافتی اور سیاسی خدمات بھی شریفوں میں شکر گذاری اور فخر سے یاد رکھی جائیں گی۔ "پان دان والی خالہ" خالہ جان کی تصنیف سے آپ نے اپنے لئے نسبتاً بہت جلد اُردو کے مقبول و ممتاز لکھنے والوں میں جگہ پیدا کرلی۔"

ڈاکٹر وزیر آغا "اسلوب پختہ اور بے عیب ہے مزاج نہایت سنبھلا ہوا اور متوازن ہے اُردو میں خاکہ نگاری کے سلسلہ میں آپکی تصنیف یقیناً ایک زندہ رہنے والی تصنیف ہے۔"

رشید حسن خاں (دلی یونیورسٹی) "آپ کے فقروں کی تہہ داری شگفتگی اور معنویت نے قدم قدم پہ دامنِ نگاہ کو تھام لیا۔ آپ نے اس نقرے کو صداقت عطا کردی ہے کہ مزاح نگار واقعی تلوار کی دھار پہ چلتا ہے میں آپ کی جی داری کی داد دیتا ہوں کہ نہ آپ کہیں متاثر ہوئے نہ مرعوب۔ حق گوئی و بیباکی کو مزاح کے لباس میں اس طرح جلوہ گر کرنا کہ ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ ہماری تنقید آج جس سچائی یا صاف گوئی سے محروم ہے آپ نے مزاح میں اس سچائی اور صداقت کو سمو دیا ہے۔"

ڈاکٹر صفدر آہ (بمبئی) "میں آپ کی طنز نگاری سے کافی مرعوب ہوں۔ آپ اردو کے بہترین طنز نگاروں میں سے ایک ہیں آپ کے طرز کی شگفتگی و روانی کا میں بہ دل مدّاح ہوں۔ یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ بہت کم لوگ ہیں جو آپ کا ایسا لکھ سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر سلام سندیلوی ان کے خاکوں میں بعض وقت بہت سنجیدہ اور گہری باتیں بھی ملتی ہیں جو آپ کے پختہ شعور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ آپ کا اندازِ بیان بہت سبک اور دلکش ہے اس لحاظ سے یہ خاکے بہت کامیاب ہیں۔

ڈاکٹر غلام احمد کاکوروی "آپ طنز و ظرافت نگاری کے ایسے ایسے جواہر ریزے بکھیرتے ہیں کہ ہونٹ کاٹ کاٹ لیتا ہوں۔" "آپ کو دورِ حاضر کا ممتاز ترین طنز نگار سمجھتا ہوں۔ آپ کے طنز میں توازن، گہرائی اور سلیقہ مندی کے ساتھ ساتھ روزمرہ بھی شامل ہے جس پہ آپکو بڑی قدرحاصل

"پان دان والی خالہ"

عبدالاحد خاں تخلص

خالہ خالہ کے میاں اور بمبئی

آج خالہ ہانپتی کانپتی ایک تھیلی ہاتھ میں لٹکائے گھر میں داخل ہوئیں۔ تھیلی زمین پر رکھ کر خالہ نے برقعہ کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "آگ لگے ان چکّی والوں میں۔ بے ایمانی کی حد کر دی ہے۔ گیہوں پسوانے لے جاؤ تو پاؤ بھر اناج تول میں ماریں۔ پھر آٹا دیتے وقت پاؤ بھر الگ چرائیں۔ پسوائی کے دام پورے لیں۔ آدھوں آدھ جوار کا آٹا الگ ملا دیتے ہیں۔ دن بھر میں دو چار پنسیری آٹا چُرا کر دس روپے کھرے کر لیتے ہیں۔ لو بیری جلدی لگی نہ پھٹکری۔"

"کیا ہوا خالہ؟"

"کیا بتاؤں اپنی قسمت کا رونا ہے۔ چاروں طرف لُوٹ مچی ہے۔ اوپر سے نیچے تک سب چیل کوؤں کی طرح نوچے کھا رہے ہیں۔ ایمان تو اٹھ گئے۔ ایک ہوئے تو کہوں۔ پورا آوا کا آوا تو بگڑا ہوا ہے۔ مرتے بھی تو نہیں بکرے کہ پیچھا چھوٹے۔ جس کو دیکھو سر پے سفید چندی رکھے پھر رہا ہے۔ جیسے سات خون معاف ہیں ان کے۔ ڈاکو، چور، اٹھائی گیرے، کمین اشراف سب ایک وردی میں پھرا کرتے ہیں۔ دو آنے کی چندی کیا ہے کہ پیسے کی مشین ہے۔ جس کو دیکھو اللہ رکھے کانگریس پارٹی کی برابری کر رہا ہے بقولِ اقبال غریبوں کا خون پی رہے ہیں۔ کل کو جو واہی تباہی پھرتے تھے اور جن کو کوئی دھرم سانٹے کو نہیں پوچھتا تھا۔ آج راجہ رئیس بنے بیٹھے ہیں۔ اللہ ان پے ہمارا صبر ڈالے۔"

"خالہ بمبئی سے ہمارے بھائی نے چٹائیاں بھیجی ہیں۔ لو ایک آپ لے لو۔ نماز پڑھنا۔" خالہ نے چٹائیوں کو مسکراتے ہوئے اُلٹ پلٹ کر دیکھ کر کہا۔ "یہ تو بڑی سیتل پاٹی ہے بمبئی میں بہت رواج ہے اس کا۔"

"خالہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کیا کبھی بمبئی گئی ہو آپ؟" عورتوں نے تعجب سے پوچھا۔

"اُئی لو، ان دیدوں نے کیا نہیں دیکھا ہے۔"

"کب گئی تھیں خالہ بمبئی؟"

"وہ بس شروع شروع شادی ہوئی تھی۔ اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔ روپے کی خوب ریل پیل تھی۔ اپنی کانگریس پالٹی چکے چکے خوب دے دلا رہی تھی۔ راجہ رئیسوں کی خلافت کرنے کے لئے یہ سنتے کے باوا کو۔ ادھر ان کی طبیعت بھی خوب سیلانی تھی ذرا۔ صبح شام بس یہی لت تھی کہ کہیں نہ کہیں بجو باہر گھومنے پھرنے۔ مہینہ بھر گھر میں رہنا مشکل تھا۔ ادھر آئے کہ پھر ادھر چل۔ اب بیوی تم تو خود اللہ جیتا رکھے عورت ذات ہو۔" خالہ نے کھنکارتے ہوئے کہا۔

"شروع شروع کا لاڈ پیار ان مردوں کا مشہور ہی ہے۔ نگوڑمارے صدقے واری ہو جاتے ہیں۔ یہ چیزلا وہ چیز دے۔ یہ کھلا، وہ کپڑا پہنا کہ وار نہیں لیتے ہیں اور پھر جہاں دو چار بچے ہوئے کہ پھر دیکھو۔ اللہ ہے 'توبہ ہے۔ روز کے لڑائی جھگڑے ہوا کرتے ہیں۔ جینا حرام ہوجاتا ہے۔ جب دیکھو جب تھوتھڑا چڑھا ہے۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ اٹھتے بیٹھتے صلواتیں سنانا۔ خالی پیلی ہر کام میں بے فضول کی مین میخ نکالنا۔ ان مردوں کی کیا کیا باتیں بتاؤں اے بیوی ایک دن تو اور کچھ نہیں تو غصہ اتارنے کے لئے یہی کہنے لگے کہ آٹا گوندھنے میں آگے پیچھے کیوں ہلتی ہے۔ اب لو بھلا یہ بھی کوئی بات تھی۔ بس بیوی۔ دو گھنٹے ٹھیک جان کھایا کرے۔"

عورتیں قہقہے لگا رہی تھیں اور خالہ برابر مظلوم مردوں کی غیبت کر رہی تھیں۔

"ہنسی کی بات نہیں ہے۔ مرد کی ذات بڑی مطلبی ہوتی ہے۔ کتنی محبت سے بات کرو مگر وہ بھنا کے جواب دیتے ہیں کہ آگ لگے، کلیجہ جل بھن کے خاک ہو جاتا ہے۔"

"ہاں خالہ تو کتنے روز بمبئی میں رہیں آپ۔" عورتوں نے خالہ کا رُخ پھیرا۔

"نہ کوئی بیوی۔ یہی کل کچھ روز رہ پائی تھی۔ جاتے ہی ان پولیس کے بکروں نے گھیر لیا۔ بمبئی شہر میں یہ پولیس والے گھیرا گھاری بہت کرتے ہیں۔"

"کیسی گھیرا گھاری خالہ؟" عورتوں نے ہنسی ضبط کر کے پوچھا۔

"یہی کہ کہاں سے آئے ہو۔ کون ہو؟ دو روز ہی ہوئے تھے بمبئی میں، ایک کالا کلوٹا جیسے بھاڑ میں سے نکل کے آیا ہو، ان سے کہنے لگا کہ یہ عورت کو تم بھگا کے لایا ہے۔ کون ہے تمہارا یہ؟ کس کا لڑکی ہے۔ اب بیوی ہلے کا ٹو تو لہو خون نہیں۔ لاکھ وہ سمجھا رہے ہیں کہ یہ میری بیاہتا بیوی ہے۔ اللہ رکھے، ابھی چار مہینے شادی کے ہوئے ہیں۔ مگر وہ مسٹنڈا بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ اب کیا کہتا ہے کہ اچھا تمہارا نکاح کا فارم بتاؤ۔ لو اور سنو۔ اس مسٹنڈے کے لئے نکاح نامہ گلے میں ٹانگے ٹانگے پھرو ہر جگہ۔ بس بیوی حق حیران پریشان کھڑے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ حرامی غنڈوں نے الگ آوازے توازے لگانا شروع کر دیئے۔"

"کیا آوازے خالہ؟ ہمیں تو بتاؤ۔"

"اے بائی کیا بتاؤں۔ سب بھول بھی تو گئی۔ میں تو مارے شرم کے گڑی جا رہی تھی۔ ہزار آدمی اکٹھا ہو گئے تھے۔ کوئی غنڈہ پوچھتا تھا ان سے۔ کیوں میاں؟ کہاں سے پھانس لائے بلبل۔ کوئی کہتا تھا کہ سنیما میں نوکری کیا دو۔ کوئی حرامخور ہمیں سنانے کے لئے کہتا کہ پانچ سو روپے تک بک جائے گی۔ ایک حرامخور بڑا ترس کھا کے کہنے لگا۔ نہ معلوم کب سے بھوکی پیاسی ہے بچاری۔ غرض کہ بیوی ان قبر کھدوں کی کیا کیا ننگی باتیں بتاؤں۔ آخر میں پھر وہ پولیس والے کو ہماری گھبراہٹ دیکھ کر اور شک ہو گیا اور ہم دونوں کو بودا باڑا کی چوکی میں لے آیا۔ تین چار گھنٹے بٹھایا اور چاروں طرف سے یہ پولیس والے آتے جاتے گھورتے رہے۔ شام کو کہیں جا کے آگ لگوں نے پانچ روپے ضمانت میں رکھوا کے چھوڑا۔ ہم نے بھی اپنے ہاتھ پاؤں کی خیرات سمجھ کر اپنا پیچھا چھڑایا۔"

"خالہ کیا برقعہ میں نہیں تھیں آپ ؟ "

"یہی تو غضب ہوگیا۔ کیسا کیسا سمجھایا تھا میں نے کہ برقعہ مت اترواؤ۔ مگر ان کا تو بھیجا اچٹا جا رہا تھا۔ کہتے تھے نئی جگہ ہے، یہاں کون تمہیں پہچاننے والا ملے گا۔ ہٹاؤ برقعہ ورقعہ! بس میری جان کھا کھا کے اتروا دیا اور اوپر سے ایک ریشمی ساڑی پہنوا دی۔ اب میری حالت دیکھنے کی تھی۔ اللہ توبہ ہے میری۔ اللہ کسی دشمن پہ یہ وقت نہ لائے۔ ساڑی پہننے کو پہن لی مگر پاؤں کہیں رکھتی تھی جاتا کدھر تھا۔ اِدھر وہ لنگور کی صورت کالے کیٹ جھاڑو پھرے گھور گھور کے زندہ نگلے جا رہے تھے۔ کوئی سیٹی بجاتا۔ کوئی آنکھیں مٹکاتا۔ کوئی مجنوں موت پڑا پیچھے پیچھے سینما کے ننگے ننگے گانے سناتا چلتا۔ بس بیوی پسینے میں نہا گئی۔" خالہ نے پسینہ پونچھتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"دنیا کو تماشا دکھاتی اپنا۔ بڑی خیر ہوئی۔ بمبئی کیا ہے قیامت کا نمونہ ہے۔ وہ نفسا نفسی ہے کہ مر بھی جاؤ تو کوئی حلق میں پانی ڈالنے والا نہیں ملتا۔ میلوں چلے جاؤ مگر مکانوں کا تانتا خدا یوں میں ختم نہیں ہوتا۔ موٹریں، سائیکلیں، بجلی کی ریلیں، ٹم ٹم، بگھی کر بس۔ بیوی ایک پہ ایک دیکھ لو۔ ذرا چوکے اور کوئی نہ کوئی سواری سینے پہ سوار ہوئی۔ عورتوں کو دیکھو تو ساڑھیوں کے لنگوٹے لگائے چلی جا رہی ہیں۔"

عورتوں نے بے تحاشا قہقہے لگا کر پوچھا۔ "خالہ کیسے لنگوٹے ہیں؟"

"اے وہ ساڑھی کا سامنے والا پلو ٹانگوں کے بیچ میں سے لے جا کے پیچھے کی طرف ٹھونس لیتی ہیں۔ پوری پنڈلیاں کھلی پڑی رہتی ہیں۔ شہر بھر میں بس اسی حالت میں گھومتی پھرتی ہیں۔ جن کو مردوں کی شرم نہ حیا۔ موئی بے غیرتوں کو۔ پیچھے سے دیکھو تو جیسے تھالیں کی تھالیں مٹک رہی ہیں۔ آگ لگے چکی کے پاٹ، کیا ننگا پہناوا ہے۔ اپنے پرانے چلن کے چوڑی دار پجامے عمدہ جو چاروں طرف سے ڈھکے چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ دل میں کوئی خطرہ نہ ڈھک ڈھکا۔ کوئی بھی بنت خوار دیکھے یا نہ دیکھے۔" خالہ نے عورتوں کو بے تحاشا ہنستے دیکھا تو خاموش ہوگئیں۔ اور منہ سے اُگال نکال کر صحن کی موری میں پھینک کر پھر واپس آئیں اور دوبارہ چھالیہ کھانے کی تیاری کرنے لگیں۔

عورتوں نے تھوڑی دیر دم لے کر پھر خالہ کو چھیڑا۔ "خالہ بمبئی میں آپ کس جگہ ٹھہری تھیں؟"

"وہ بائی، محمد خاں کے مارکیٹ میں ایک ہوٹل تھا۔ کیا آگ لگا ہوٹل تھا۔ کمرے دیکھو تو قبروں کا نمونہ تھے۔ تلے اوپر سوار تھے مسافر۔ ایک گیا ایک آیا۔ دوسرا گیا تیسرا آیا۔ ذرا قرار نہیں تھا۔ اللہ بچائے بمبئی سے۔"

"خالہ سمندر تو ضرور دیکھا ہوگا؟" عورتوں نے ہنستے ہنستے نڈھال ہو کر پوچھا۔

"کیوں نہیں سمندر کو بھی خوب دیکھا مگر برقعہ پہن کے گئی تھی۔ بڑا بھاری میدان ہے، سمندر کے کنارے پہ گاڑیوں، ریت پڑی ہے اور وہیں بے حیا مرد عورت ریت میں بیٹھے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ کچھ بے شرم گھٹنے سے گھٹنا لگائے بیٹھے تھے کہ دیکھنے والوں کو شرم آتی تھی۔ ان سنڈوں کو بات کرنے کو بھی بس میدان ملا۔ جیسے انھیں گھر بھی روزی نہیں ہیں۔ دنیا کو تماشا دکھاتے ہیں موئے بے غیرت کہیں کے۔"

"اچھا خالہ ننھے کے باوا آپ سے باتیں نہیں کرتے تھے؟"

"اے چلو ہٹو بھی بیوی۔ بھلا میں بات کرنے دیتی انھیں، ہزاروں کے بیچ میں۔ میں نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ آگے آگے چلو۔ ساتھ چلنے میں شرم آتی ہے۔ کبھی وہ گھوم کے کوئی بات کہتے یا کوئی چیز دکھاتے تو صاف کہہ دیتی کہ ہاں ہاں سب دیکھ رہی ہوں۔ تم تو آگے آگے چلو۔"

"اچھا خالہ سینما بھی دیکھا ہوگا؟"

"اے لو سنیما پے تو وہ جان دیتے تھے۔ دوڑے، چھوٹے اور سنیما" خالہ نے چھالیہ کھاتے ہوئے کہا۔ "شروع شروع کی خصموں کی باتیں جو درگت نہ بنوائیں سو کم ہے۔ ایک جان میری جان کھا گئے کہ سنیما چلو۔ بہت ٹالا مگر بیوی ایک نہیں چلنے دی۔ آخر ہار لپٹ کے سنیما گئی۔ ایک تو الگ کوئی زنانہ درجہ نہیں تھا۔ اب جیسے ہی سنیما میں جا کے بیٹھی تو میرے پاس یہ بھی بیٹھ گئے۔ میں مارے غیرت کے مری جا رہی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ نگوڑی بد ذات سیکڑوں مردوں کے بیچ میں اپنے میاں کی بغل میں بیٹھی ہے۔ اور پھر تو فکّی یہ کہ لگے مجھ سے ہنس ہنس کے باتیں کرنے۔ لاکھ میں نے کہا کہ ذرا دور ہو کے تو بیٹھو، تو اور ہنسنے لگے۔ کہنے لگے نمبر سے بیٹھنا پڑتا ہے۔ لو بیوی یہ نمبر کی اور سنو۔ اگر وہ اپنی خوشی سے الگ بیٹھنا چاہے تو اس آگ لگے نمبر کی وجہ سے موا کہیں بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ خیر بیوی جیسے تیسے گھپ اندھیرا ہوا تو جان میں جان آئی۔ مگر جو دوسری طرف مڑ کے دیکھا تو ایک بدجنا در موت پڑا مجھ قریب سے دیکھنے لگا۔ بس بائی تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ میں نے تو کھیل دیل چھوڑا اور آدمیوں کے بیچ میں گزرتی ہوئی دروازے کے باہر آ گئی۔ اور پیچھے پیچھے وہ۔ 'ٹھیرو تو ٹھیرو تو' کہاں جا رہی ہو' مگر میں نے ایک نہیں سُنی اور باہر آ کر کہہ دیا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ جلدی ہوٹل چلو۔ بس گل اتنی دیر سنیما دیکھنے کی گنہگار ہوں۔ اللہ کا شکر ہے پھر آج تک کبھی سنیما نہیں گئی۔"

"خالہ آج تو ہنس ہنس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اچھا یہ اور بتا دو کہ کیا کھیل تھا سنیما کا۔ کیا دیکھا؟"

"اے کہتی تو جا رہی ہوں کہ بیچ کھیل میں سے بھاگ کے آ گئی تھی۔ وہ غنڈہ بغلی گھونسا بنا ہوا بیٹھا تھا میرے پاس۔ پشیمان بنائے تھا مجھے۔ کھیل کیا دیکھتی۔"

"اچھا خالہ جتنا دیکھا تھا اتنا ہی بتا دو۔"

"میں نے تو بیوی ایکا ایکی دیکھا تھا کہ ایک جوان لڑکی بیچ جنگل بیابان میں گا رہی ہے اتنے میں ایک جوان آدمی میرے خیال سے جھاڑو بھری کا کوئی بہچان والا تھا۔ پیچھے سے آیا اور لڑکی کی آنکھیں بند کر لیں۔ خدا غارت کرے ان کو جو ہزاروں کے سامنے محبت کی باتیں کرتے ہیں۔ جب ہی ایسے لیلیٰ مجنوں کے کھیل دیکھ دیکھ کے کنوارے لڑکے لڑکیاں ایسے ہی لیلیٰ مجنوں کے کھیل کھیلا کرتے ہیں۔ روز خبریں سن لو کہ آج فلاں کی لڑکی فلاں کے ساتھ بھاگ گئی۔ چلو کھیل ختم۔ ماں باپوں کی جیتے جی گردنیں جھکا گئیں دنیا جہاں کے سامنے۔ اس دن کے لئے پالا تھا کہ تم بڑی ہو تو ہمارا نام روشن کرنا۔"

آج عورتوں کا ہنسی سے بُرا حال تھا اور یہ خالہ یہ کہہ کر چل دیں کہ

"بیوی! ہنسی کی بات نہیں ہے۔ ان سنیماؤں نے ہزاروں گھر برباد کئے ہیں۔"

(پاندان والی خالہ سے)

"غفور میاں"

عبدالاحد خاں تخلّص

ایک گز کپڑا

غفور میاں کے مکان کے باہری حصّہ میں ایک کوٹھری تھی جس میں ایک بے عذر، بے زبان اور ناغہ سے بالاقساط کرایہ ادا کرنے والا شبراتی کرایہ دار بھی رہتا تھا۔ غفور میاں نے یہ کوٹھری موجودہ مہنگائی سے نپٹنے کے لئے چار روپے ماہوار پر شبراتی کو دے رکھی تھی۔ منجملہ عام فہم اور "چالو" شرائط کہ

"ماہ بماہ" ہر مہینہ کی پہلی تاریخ پر کرایہ (بجبر واکراہ ہی سہی) ادا کرتا رہوں گا۔ خالی کرانے کی حاجت پر مالک کو پورا حق ہے کہ وہ کھڑے کھڑے کرایہ دار کے برتن ٹھیکرے سڑک پر پھنکوا دے گا اور "میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا" کے بمصداق من مقر کرایہ دار کا کوئی عذر قابلِ قبول نہ ہوگا! شبراتی کرایہ دار کے ذمہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ خاکسار شبراتی روزانہ رات میں غفور میاں کی دو بکریاں اور ایک نہایت بدبو دار بربرا بکرا بھی اپنی جائے رہائش میں باندھنے کے لئے پابند ہوگا۔ نیز رات بھر غفور میاں کے ہر استفسار پر کہ

"ابے خاں شبراتی تینوں جانور خوب بندھے ہوئے ہیں؟"

شبراتی جواب میں "ہاں دادا ہم چاروں بندھے ہوئے ہیں فکر مت کرو!" کہتا رہے گا۔

ایک دن صبح صبح غفور میاں نے شبراتی کو آواز دی۔

"...... ابے شبراتی کوٹھری میں سے تو نکل یار۔ ذرا چوک بازار چلا جا۔ گز بھر کپڑا لے آ خاں۔ یہ دیکھ باندھ کا رومال چندخ چار ہو گیا اب تو......"

"لاؤ دادا پیسے نکالو۔ پھر مجھے بھی محنت مزدوری کے پے جانا ہے۔" شبراتی نے کوٹھری سے برآمد ہو کر پیسے طلب کئے۔

"ہاں بیٹا یہ لے ایک روپیہ۔ دیکھ روپے گز ملے گا۔ ذرا دیکھ کر مضبوط لانا۔ آج کل کلف چڑھے لٹھے آرہے ہیں۔ ایک مرتبہ کے دھونے میں ململ کی طرح نکل آتا ہے۔ اندھیر مچی ہے خاں۔ انساں بھوکوں مر رہا ہے۔ ان مل والوں کے کلف کے لئے چاول کہاں سے مل جاتے ہیں یار؟ خیر دیکھ۔" غفور میاں نے شبراتی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "وہ رام پرشاد کی دوکان دیکھی ہے نا؟"

"ہاں، ہاں دادا خوب دیکھی ہے۔" شبراتی نے پیچھا چھڑانے کے لئے جلدی سے جواب دیا۔
"ہوں! ..... اچھا بتلا تو ذرا کہاں ہے؟ وہ دیکھ بھی تو کہتا ہوں کہ تجھے ابھی کچھ نہیں معلوم ہے۔ ارے وہ بیچ چوک میں علی بھائی لنگڑے دوا فروش کی دوکان کے بالکل سامنے ہے۔ دو چشمے والی ہرے دروازے والی دوکان۔ یہ علی بھائی بھی خان اندھا دھند نفع لیتا تھا۔ بس ایک رات جڑی بوٹی لینے جنگل گیا تو ایک ریچھ جھوم گیا سامنے سے۔ ٹانگ چبا ڈالی۔ بہت دوا علاج کیا مگر آخر کو ٹانگ کٹوانا پڑی۔ ارے خاں اپنے پاس آجاتا شبراتی تو وہ ہڈی جوڑ جڑی دیتا کہ دو روز کے پینے میں ایسا معلوم ہوتا کہ ٹانگ ٹوٹی ہی نہیں۔ جیسے اپنے پاس بھی خاں فقیروں کے نسخے رہتے ہیں۔ برسوں درویشوں کے جوتے سیدھے کئے ہیں اور چلمیں بھری ہیں، جب کہیں جاکے دو چار نسخے ہاتھ لگے ہیں۔"
"دادا۔ مجھے جانا ہے، ذرا جلدی روپیہ نکالو۔"
"ہاں تو بس اسی دو چشمے کی دوکان میں ایک بڈھا سا میلی کچیلی سی پگڑی باندھے بیٹھا ہوگا۔ لاکھوں ہی اللہ نے دیا ہے مگر سال کے سال پگڑی دھلواتا ہے۔ روز شام کو دوکان بند کرکے دو آنے کی بچی کچھی سستی سبزی خرید کر گھر لے جاتا ہے۔" غفور میاں نے شبراتی کے کان کے پاس منہ لے جاکر کہا: "ارے خاں یوں جڑتا ہے پیسہ! یہ اپن میاں بھائیوں کی طرح تھوڑی ہیں جو کھایا پیا چوتڑوں سے ہاتھ پونچھے اور چل میرے بھائی۔ جو دے گا تن کو وہی دے گا کفن کو۔"
"ہاں دادا! روپیہ دے دو مجھے جلدی ہے۔ ورنہ آج مزدوری نہیں ملے گی۔"
"ارے یار شبراتی سمجھ تو لے بیٹا ذرا۔ ہاں تو اس کی دوکان ذرا اونچی ہے، وہ پچھلے سال میونسپلٹی والوں نے اس بیچارے کی دوکان کے سامنے کے پٹے کھود کر پھینک دیئے تھے۔ اب پوری نالی دکھتی ہے۔ کیڑے بلبلاتے رہتے ہیں۔ ہزاروں بھنگی ہیں میونسپلٹی میں۔ کھا کھا کر گرا رہے ہیں مگر یہ نہیں بنتا کہ نالی کی صفائی کر دیں۔"
"ہاں دادا تو بس ایک گز کپڑا لا دوں؟ جلدی سے ایک روپیہ دے دو۔"
"ہاں شبراتی تو اب سمجھ گیا ہوگا۔ بس اسی کی دوکان پر جاکر میرا نام کہہ دینا۔ باپ دادا سے ادھار و سدھار کپڑا لیتے آئے ہیں۔ نام سنتے ہی خاں فوراً اچھا سا کپڑا دے دے گا اور دیکھ پہچان کے لئے یاد رکھنا، اسی رام پرشاد کی دوکان کے سامنے وہ بمبئی والے درزی کی دوکان ہے۔ نرا حجام ہے خاں درزی کیا ہے۔ وہ پچھلی عید پر سالے انا ڑی نے میرے پجامے کی رومالی کچی ہی چھوڑ دی۔ نماز پڑھنا مشکل ہوگیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا گھس رہی تھی۔ خدا خدا کرکے نماز ختم ہوئی اور ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو خاں اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ حق دق رہ گیا۔ وہ تو اللہ نے بڑی خیر کی کہ شیروانی پہنے تھا۔ چپ چاپ رومالی کو اٹھا کر جیب میں رکھی اور گھر آگیا۔"
"دیکھو دادا مجھے بہت دیر ہو رہی ہے۔ مجھے آکر دو روٹی بھی ڈالنا ہے۔ خیر اب تو روٹی پکانے کا ٹیم ہی نہیں رہا۔ البتہ چائے بنا کر پی لوں گا۔ ذرا دادا جلدی سے روپیہ نکال دو۔"
"ہاں یہ لے۔" غفور میاں نے اپنی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا: "بس دیکھ اسی سامنے والی سڑک سے نکل جانا۔ جلدی پہنچ جائے گا۔ وہ کوتوالی کے پاس سے۔ پہلے تو خاں اس بلڈنگ میں بڑا اسپتال تھا۔ ڈاکٹر سہراب جی بڑا مانا ہوا ڈاکٹر تھا۔ کتنا ہی بڑا مرض ہو بس دو خوراکوں میں غائب۔ ہائے ہائے کیا ڈاکٹر تھا۔ یہ شیش محل تو نے دیکھا ہوگا۔ بس اسی میں رہتا تھا اپنی بیوی کے ساتھ۔ مگر خاں، بچارے نے آخر میں خودکشی کر لی تھی اور خاں ایک آج کے ڈاکٹر ہیں۔ کل کے لونڈے، دن بھر وہ کالی کلوٹیوں سے باتیں کیا کرتے ہیں۔ ہر مرض میں وہ .... (موٹی گالی بک کر) کونین ہی دیتے ہیں اور کچھ رہ گئی تو چوتڑوں میں سوئیاں چھید چھید کر گود ڈالا۔ چلو ہو گیا علاج! بس قبرستان

جاؤ پھر۔"

"دادا دیکھو آج کی میری مزدوری چلی جائے گی۔ اب کل تمہیں کرائے کا روپیہ بھی دینا ہے۔ نہیں تو کل تم پھر گالیاں دوگے۔ ذرا جلدی سے روپیہ دے دو۔"

"ہاں یار دے روپیہ۔ بس خیال رکھنا جیسے چوک میں داخل ہوگا تو سیدھے ہاتھ کی طرف رحیم خاں دادا کی پان کی دوکان ملے گی۔ ہائے ہائے شبراتی۔ تو تو کل کا لونڈا ہے۔ یہ رحیم دادا کیا بیٹے ہونٹ کے ہاتھ جاتا تھا۔ اب بھی خاں اس عمر میں اگر تیری گردن پکڑلے گا تو بیٹا شام تک جھوما کرے گا مگر چھڑا نہیں سکتا۔ وہ تو نے محرم میں ملنگ دادا کا اکھاڑا دیکھا جنکا لڑکا مجید پہلوان کے نام سے مشہور تھا۔ مجیدا بھی کیا تلوار چلاتا تھا۔ دو ہاتھوں سے چار تلواریں چلاتا تھا۔ مگر ایک دسویں کی رات نہ معلوم کیا غلطی ہو گئی یا کوئی پینترا غلط ہو گیا کہ ایک تلوار بھن سے پیٹ میں جا گھسی نکل گیا سب تلوار چلانا۔ بس اسی قدموں مچھلی کی طرح تڑپنے لگا اور صبح ہوتے ہوتے مر گیا۔ ادرہاں اپنے مدارالمہام صاحب کی کرسی بھی ملنگ دادا کے اکھاڑے میں لگتی تھی۔ اسی مجید کی تلوار دیکھنے آتے تھے۔ ابے یار شبراتی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کیا کڑیل جوان تھا۔ جیسے شیر جارہا ہے۔"

"دادا قسم خدا کی مزدوری گئی میری تو۔ غریب آدمی ہوں۔ میرے کہنے سے تم روپیہ تو دے دو۔ اگر غلط کپڑا لاؤں تو اپنے ہاتھ سے موجوتے مار دینا۔"

"ابے نئیں بے۔ یہ ریزگاری ہے۔" جیب میں سے غفور میاں نے ریزگاری نکالتے ہوئے کہا۔ "ذرا گن تو لوں۔ تجھے تو خاں بڑی جلدی ہو رہی ہے، شبراتی اب یہ دیکھ" (شبراتی کو ریزگاری دکھاکر کہا) "نئے پرانے پیسوں کا جھگڑا میرے تو باپ بھی مر جائیں تو حساب نہیں لگا سکتے۔ باپ دادا سے سیدھا سادھا حساب چل رہا تھا مگر خاں یہ سب الجھانے کی باتیں ہیں۔ غریبوں کی جیب میں سے پیسے کھینچ کھینچ کر خزانے بھرے جا رہے ہیں۔"

"اچھا دادا مجھے دو۔ میں گن لوں گا۔" شبراتی نے تقریباً روہانسا ہو کر کہا۔

"ابے ٹھیر تو یار پھر وہی جلدی۔ آخر میں تو خود گن کر دیتا ہوں۔" اب غفور میاں نے گنتے گنتے مٹھی بند کرکے کہا "کبھی کبھار تجھ سے کوئی اڑے بھڑے کام کا کہو تو خاں شبراتی وہ ہاتھ پاؤں ٹپکتا ہے تو کہ بس جان نکلی جا رہی ہے۔ اور ہم جو یہ چوبیس گھنٹے تیرے بغیر تاسے کے مکان کی نگرانی کرتے ہیں تو وہ کچھ نہیں۔ ذرا کسی دوسرے کے مکان میں کرایہ سے کر دیکھو۔ رات دن تالے لوٹ رہے ہیں۔ جس کا مال چلا گیا تو آج تک ملا نہیں۔ ہمارا شکر یہ ادا کر شبراتی بیٹا کہ ادھر کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اس محلے میں اب بھی خاں اپنا حکم چلتا ہے۔ رات کو چھ مرتبہ پیشاب کرنے باہر آتا ہوں سڑک پر۔ یہ آرام تمہیں شبراتی میاں کہیں اور نہیں ملے گا۔ مگر خاں شبراتی میں نے اپنے پیشاب کا کتنا علاج کرایا مگر یار چھ کے بجائے چار مرتبہ بھی نہیں ہوا۔ بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کو دکھلایا۔ تین تین روپے روز کے نسخے پیے مگر مرض نہیں گیا۔ اچھا خیر ہاں تو کیا کہہ رہا تھا۔ بس شبراتی تجھ میں یار یہ بات بڑی خراب ہے۔ بات پوری سنتا نہیں۔ بیچ میں ٹخ ٹخ کیا کرتا ہے۔"

"ابے دادا! کیا ٹخ ٹخ کرتا ہوں۔ چپ چاپ تو کھڑا سن رہا ہوں۔ تم تو بس بات میں بات نکالتے چلے جا رہے ہو! ایک بات ختم نہیں ہوئی کہ بیچ میں دوسری شروع ہو گئی۔ اب تم ہی انصاف کرو۔" شبراتی نے دادا کی طرف بھنّا کر کہا۔ "کہاں کپڑا اور کہاں دادا یہ تمہارے پیشاب کا مرض۔"

"ابے تو کیا میرا مرض تجھے لگ گیا۔" غفور میاں نے جھینپ کر غصّہ سے کہا۔ "تیرے ساتھ تو میں نے

رعایت کی کہ مزدور آدمی ہے کام کو دیر ہو رہی ہے ورنہ خاں شبراتی میاں میں نے انھیں پٹیوں پر اینٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) باتوں ہی باتوں میں لوگوں کو سلا دیا ہے۔"

"اچھا دادا۔ رعایت ہی کی تم نے میرے ساتھ۔ مگر روپیہ تو نکالو جلدی سے۔"

"ہاں، دیکھ اور فرض جمال اگر رام پرشاد کی دوکان بند ہو تو پھر ناک کی سیدھ ابراہیم پورہ کی طرف چلا جانا دیکھ اس طرح غفور میاں نے جنوب کی طرف منھ کرتے ہوئے اشارہ کیا۔" بس اس طرف منھ کرکے چل دینا تو۔ دو تین چ چھوڑ کر ...."

"بس دادا۔ بس سمجھ گیا۔" شبراتی نے کہا۔ اور تیز تیز بازار کی طرف چل دیا۔

"اے سُن تو شبراتی روپیہ تو لیتا جا۔"

"روپیہ ہے دادا میرے پاس، کرایہ میں کاٹ لوں گا کل۔" اور جوں جوں شبراتی دور ہوتا گیا، غفور میا نے شبراتی کی طرف چلتے ہوئے چیخنا شروع کیا۔

"بس۔ آگے سے سیدھے ہاتھ کو مڑ جانا ہے اور دیکھ .... ذرا ...... مضبوط دیکھ کر لینا۔ او .... شبراتی کلف دیکھ لینا خاں ...."

شبراتی غفور میاں کی ہر آواز پر ہاتھ کو اٹھا اٹھا کر ہلاتا رہا۔ گویا "سب سمجھ گیا ہوں" اور ایک ق کی گلی میں جلدی سے داخل ہو کر غفور میاں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

غفور میاں جو شبراتی کو سمجھاتے ہوئے کافی دور تک چلے گئے تھے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے واپس "بڑا کام چور ہے، پوری بات بھی نہیں سنی اور چلا گیا۔"

۸۸

عبدالاحد خاں تخلّص

شیطان جاگ اٹھا

اپنے ۱۹۴۷ء کو شیطان کی ڈائری میں جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی دوسرے سن کو نہیں ہے۔ کیونکہ یہی وہ سال ہے جس میں مرت و ذلیت نے اپنی آپس کی دوری کو سمیٹ کر اس قدر قربت حاصل کر لی تھی کہ اگر کسی نے ایک سانس زندگی میں لی تو دوسری موت پرلے کر عالم بالا کو کوچ کر گیا۔ اور یہی وہ سال ہے جس میں لاتعداد "ہندو مسلم بھائیوں" نے خالص نجی طور پر اپنے اپنے "جذبۂ خیر سگالی" کا آپس میں بڑے جوش و خروش سے تبادلہ کیا تھا۔ اور شیطان انسان کے اس متحدہ محاذ سے مطمئن ہو کر ایسی لمبی تان کر سویا کہ ۱۹۶۰ء میں کچھ شر پسند ممالک کے سرد جنگ کے گرم تھپیڑوں کے شور و شغب سے ہی بیدار ہو سکا۔

آنکھ کھلتے ہی شیطان اعظم نے اپنے آس پاس لاکھوں شیاطین خورد و کلاں کو دیکھا تو چیخ اٹھا کہ تم لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر میرے آس پاس کیوں جمع ہو؟ شیاطین خورد و کلاں کورنش بجا لائے اور عرض کیا کہ "حضور ہمارے تمام کام انسان خود کر رہا ہے۔ انسان نے ہمارے لئے اب کوئی کام نہیں چھوڑا۔ بغیر ہماری امداد اور رہبری کے آج انسان ہمیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ چکا ہے۔ "کرسوں بڑھا ہوا ہے پیادہ سوار سے" اور حضور اگر خود بہ نفس نفیس دنیا کا جائزہ لیں گے تو ہماری باتیں صحیح پائیں گے۔"

شیطان نے فلک شگاف "شٹ اپ" کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے فضاؤں میں غائب ہو گیا۔ طویل عرصے کے بعد شیطان نہایت خراب اور خستہ حالت میں اپنے ہیڈ کوارٹر واپس آیا۔ منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ چہرہ زرد تھا۔ غم و غصہ سے تقریباً نیم پاگل ہو چکا تھا۔ آتے ہی شیطان نے ایک درخواست اللہ کے حضور میں گزاری کہ اے خالق ارض و سما، میں نے لاکھوں سال انسانوں کو گمراہ کر کے اپنا مشن پورا کیا اور جملہ انسانی ذریت کو گناہوں اور افعال خبیثہ سے منسلک کیے رکھا لیکن اپنے دنیا کے حالیہ دورے سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسان نے سائنس کی اب وہ ایجادات کر لی ہیں کہ کسی دن نام نہاد ایٹمی قوت سے دنیا کو زیر و زبر کر سکتا ہے۔ کیونکہ اب بغیر میری امداد یا مشورہ کے اور خود اپنے دماغ اور عقل کی مدد سے تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ آج بھی کرۂ ارض کے آس پاس گھومتے

معلق ہوکر گھوم رہے ہیں۔ دو روز پہلے ایک ایسے ہی گولے سے میرا تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا تھا!

انسان آج ان سیاروں میں داخل ہو رہا ہے جس میں جانے کا میں نے کبھی خیال نہیں کیا۔ میرا پورا شیطانی کاروبار ٹھپ ہو چکا ہے اور میرا پورا عملہ کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے۔ باوجود کوشش کے خالص انسان دستیاب نہیں ہوتے۔ اس دور میں انسان نے اپنی ذاتی صلاحیتوں سے قانون کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے کہ جب چاہے بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکا دے اور جب چاہے گناہگاروں کو معاف کر دے! کالے، گورے، نسل، قوم اور مذہب کی بنیادوں پر سزا و جزا دے سکتا ہے۔ آج انسان کے ذاتی اقتدار کی ہوس عالمگیر مصیبت بن چکی ہے! جب انسان چاہتا ہے صرف ایک کرسی کے حصول کے لئے حکومتوں کا تختہ الٹ دیتا ہے! حیرت ہے میرے معبود کہ اس دور میں رعایا کے روٹی کپڑے کا سوال رائی سے غیر متعلق ہو چکا ہے۔ تجارت پیشہ لوگ دو سو فیصدی سے دو ہزار فیصدی تک کا نفع حاصل کرنا اصولِ تجارت سمجھتے ہیں۔ دوکاندار اپنی قابلیت سے اس قابل ہو چکے ہیں کہ ہر چیز تول سے کم دیں۔ روپیہ پیسہ کو اس طرح الٹ پلٹ دیا کہ زندگی بھر بچے کھچے اصلی انسان شرحِ تبادلہ کے چکر میں پڑے رہیں۔ غذاؤں میں سو فیصدی ملاوٹ کر دی گئی ہے۔ پسے ہوئے گرم مصالحہ میں گھوڑے کی لید، نمک میں پھاک، مرچوں میں سوکھے پتے، گڑ میں گوبر اور غیر مفید اجزاء سے دوائیں بنانے میں رحم نہیں کھاتے۔ دنیا میں چاروں طرف بے ایمانی، حق تلفی، ناانصافی اور نسلی و قومی تعصب کا دور دورہ ہے جس سے میری شیطنیت پناہ مانگ رہی ہے! اس لئے عرض پرداز ہوں کہ

"..... اس سے پہلے کہ دنیا کا انسان مجھے گمراہ کر دے مجھے جلد سے جلد جنت میں بلا لے۔ کروڑوں سال پہلے انسان کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں جنت سے نکالا گیا تھا لیکن اب اس موڈ میں ہوں کہ آج کے انسان کو سجدہ کر کے تیرے حکم کی تعمیل کروں کہ یہ انسان وہ نہیں جس کو سجدہ نہ کرنے کا میں نے عزم کیا تھا!" ▲▲

(شیطان جاگ اٹھا سے)

تخلص بھوپالی

"پنچ" کی ڈکشنری

اخبار : گڑے مردے اکھاڑنے اور دفن کرنے کا عمل پیہم

آمدنی : جس کا ظاہر کرنا مفاد عامہ کے خلاف ہے

بجٹ : خسارہ اور ٹیکس

بہادر : "تو پچھاڑ دے، مونچھیں میں اکھاڑ لوں گا"

پاتال : انڈر گراونڈ سازشی اڈہ

پاؤں میں مہندی : مستقل موٹر نشینی کرنا

پس پردہ : گناہوں کا لین دین

تجدید : ہر پانچ سال کے بعد

توڑ جوڑ : ووٹ کے لئے جد وجہد

تشخیص مرض : چھینک کو مرض الموت بتانا

ٹٹی کی آڑ : کھلم کھلا رشوت لینا

ٹنڈر : جس میں حق پیدائش، کی رعایت رکھنا ضروری ہو

ٹکر گدھا : سیاسی یتیم

ٹھوڑی سے ہاتھ لگانا : ووٹ سے قبل کا عمل

ٹھینگا بتلانا : ووٹ کے بعد کا عمل

ثالث : بن بلایا مہمان

ثروت : غربت کا مستقل مذاق

جاسوس : پولیس کی اپنی صفت

جانور : جو تیزی سے انسان بن رہا ہے

جام، جگر، جان جاناں
جوش، جلن } شعراء کرام کے صیغہ جات

حامی بھرنا : ضرورت مندوں کو فوری ٹالنا

حق پیدائش : ذاتی دیکھ بھال اور کفالت

حکمت عملی : وعدہ خلافی، دھوکہ دہی

خاطر خواہ : منہ مانگی رشوت

خام خیالی : دن پھرنے کا انتظار

خضاب : بڑھاپے پر شباب کو سوار کرنا

دائم المریض : بے روزگار

دھینگا مشتی : میونسپل کے مختلف الخیال ممبروں کی کارروائی
دل لگی : مفلسی کا معاشقہ
ڈائری : گناہوں کی ریکارڈ بک
ڈامر : ٹھیکہ دار کو انجنیئر سے جوڑنے کا مسالہ
ڈیلی گیٹس : بیکار مباش کچھ کیا کر
راج ہنس : کوّے
رشوت : سائیڈ بزنس
رباعی : مصروف شاعر کا مختصر کلام
رپٹ لکھانا : اپنے ہاتھوں گلے میں پھندا لگانا
ربانی حساب : رشوت کا آمد خرچ
زر، زن، زمین : نیتاؤں کے نجی صیغہ جات
سروس بک : غلاموں کا نامۂ اعمال
سیر چشم : ہوائی دیدہ
شادی کرنا : آ گائے سینگ مار
شاعری : غالبی کرنا
شہ زور : دوسروں کے بل پر زور دکھانے والا

صابر : رو دھو کر بیٹھ جانے والا
صلاح کار : نا اہل اور نادان مشیر
ضامن : بندر کی بلا طبیلہ کے سر
طغیانی : ہوائی جہاز سے دیکھنے کی چیز
عاشقی کرنا : بلا ضرورت کسی کے سر ہونا
علاج معالجہ : زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ
غنڈا : سوسائٹی کا لازمی جُز
فالتو : قوم یتیم
فہرست : پولیس کے پاس شرفاء کا ریکارڈ
قصیدہ : سفید جھوٹ
قدم اکھڑنا : تبادلہ پر جانا
قید خانہ : فری میں روٹی کپڑا ملنے کی عارضی جگہ
کاپی رائٹ : امتحان میں حرف بحرف نقل کرنا
کاتب : ایڈیٹر کی غلطیوں کا ذمہ دار
کانون، کاتل، کاعدہ، کفس } "ق" سے محتاط رہنے کا نتیجہ

پنچ کی ریسرچ لیبوریٹری سے

- ذاتی کاروبار کرنے والے کے پاس کبھی بھی موٹر آسکتی ہے اور سیاسی کاروبار کرنے والے کے پاس سے کبھی بھی موٹر جا سکتی ہے۔
- خالص بھینس آج بھی ہے مگر خالص گھی کا دستیاب ہونا دشوار ہے۔
- کھادی کے کپڑے اکثر "پولیس پروف" ثابت ہوتے ہیں۔
- پولیس والوں کو مستقل سلام کرتے رہنا " داشتہ آید بکار" کے مقصد کو پورا کرتا ہے۔

"مخلص بھوپالی"

تخلص بھوپالی

خط ــــ غالب کے انداز میں

غالب کا غیر مطبوعہ خط

تخلص بھوپالی کے نام

سن میری جان ـــــ مکتوب ملا ـــ مہر انگیز اور محبت خیز باتوں نے غم تنہائی بھلا دیا۔ وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا بلاشبہ میرا نیستی پڑھ پائیں تو اکبر الہ آبادی بن جائیں ہزار کوس سے بہ زبان باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ میں خوشامدی نہیں جو منہ دیکھی کہوں۔ ہنوز تمہارا منہ دیکھا نہیں دیکھنے کی آرزو ہے۔ غالب کی تعریف کرنا کیا عیب ہے۔ خدا تمہیں دولت واقبال روز افزوں عطا کرے اور اس فراوانی ـ محنت سے جی چرانے والے نکھٹو لوگ سوشلزم کے نعرے لگا کر اس میں حصہ دار بن جائیں اچھا اب سنو احوال واقعی خط تمہارا شفا بخش گوالیاری لائے دوسرا اب تمہارے شہر کے ایک وکیل حبیب احمد لائے۔ ایک قرینہ سے معلوم ہوا کہ تمہاری عمر اور صحت پا بہ رکاب ہے پھر کیا حجاب ہے یہاں آنے میں کیا دیر ہے۔ موت جیسے عظیم فرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کیوں ؟ معلوم ہوتا ہے کسی سیاسی جماعت کے رکن ہو کہ موت سے بھی فریب کھیل رہے ہو اللہ تمہیں توفیق عطا کرے تو میری تمنا دور ہو۔

اور سنو میاں ! ایک نئی افتاد آپڑی بیکنٹھ سے ہر گوپال تفتہ خالص محبت میں مجھ سے ملنے آئے۔ یہ وانہ راہداری ملا نہیں آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کھوکر اپار کیا اور آدھمکے۔ فرشتوں نے پتہ نہیں کیا سمجھا۔ پکڑ لئے گئے۔ قالوا ان للہ و انا الیہ راجعون ہ پاؤں میں بیڑی ہاتھ میں ہتھکڑی چولہے میں جائے ایسی محبت جو ایک مخلص کو حوالات پہونچا دے ! تمہارے حبیب احمد نے جو یہ قیس اور تفتہ کی بات سنی تو فی الفور صدر الصدور کی عدالت میں تفتہ کی طرف سے وکالت نامہ داغ دیا۔ دلائل پیش کئے۔ مخبر نہ جاسوس۔ رہائی نصیب ہوئی کیا غالب کہاں کا غالب غالب پہ لعنت بھیجی۔ راتوں رات پھر بیکنٹھ جا پہونچا۔ اب ذلت کا احساس رفع ہو تو پھر میرا خلوص زور مارے تو نصیب ہو۔ دیکھو اللہ کب ملاتا ہے۔ ویسے بھگوان کی مرضی کو بھی دخل ہے ہم بھگوان تک سفارش لیجانے کی سکت ہمت۔ خدا اور بھگوان میں احتجاجی مراسلے چوبیس برسوں سے آ جا رہے ہیں دونوں اپنی جگہ پہ نا مطمئن دعا کرو خدا بھگوان میں مصالحت کی کوئی صورت نکلے تو شرفاء کو پناہ ملے۔ انسانیت کو امان !

جب تمہارے حبیب احمد شروع شروع آئے تو سخت پریشان اور بیزار رہے۔ شب و روز دنیا کو یاد کر کے زار و قطار روتے تھے۔ ہمہ وقت کی گریہ و زاری نے خستہ حال کر دیا تھا۔ جب فرشتوں نے فردِ جرم کا ایک دفتر سامنے لاکر رکھا تو ہوش کھو بیٹھے۔ رونا دھونا بھول گئے۔ گناہوں کی فہرست بہ طریق گناہ ہائے کبیرہ و صغیرہ طویل ہے ابھی تک مجھے صرف ایک گناہ کا پتہ چلا ہے کہ موصوف نے دنیا میں رہ کر بہت سارے قاتلوں کو سزا اور قضا سے کیوں بچایا۔ جواب دیا کہ یہ فردِ جرم قبل از وقت ہے۔ ایسے تمام مفروضہ قاتلوں کو عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ ان کے روبرو اس باب کا آغاز ہو۔ درخواست منظور! اللہ اللہ اس ذہانت کا کوئی جواب ہے۔ آج تک کسی گناہ کا اقرار کیا نہ ہی اپنے پر ذمہ داری لی۔ بلکہ جواباً عرض کیا کہ کراماً کاتبین کو طلب کیا جائے۔ تاکہ ان سے جرح بحث کرنے کا موقع مل سکے دیکھو عدالت سے کیا اب حکم ہوتا ہے۔ کراماً کاتبین کا حاضر ہونا ممکن نہیں ہمہ وقت مصروف! اس عرض داشت پر جید گناہ گاروں میں خاصی چہل پہل ہے۔

برادرم حبیب احمد کے پاس کوئی منشی نہ اہلمد پیش دامن نہ پیش دست، تن تنہا مصروف کہتے ہیں ایسے وقت پر اگر لاڈلی سرن سنہا وکیل آ پہونچے تو کام ذرا آسان ہو۔ یہ کون سنہا ہیں ان کو مرحوم کا پیغام پہونچا دو۔ تاکید جانو۔ لوگوں نے کہا یہاں ہندو نہیں آسکتا۔ حبیب نے کہا وہ ہندو ہے نہ مسلمان۔ بیک وقت دونوں کا ہونا وہ ثابت کر سکتا ہے اللہ اللہ کیسے کیسے بزرگ آج بھی دنیا میں ہیں جو ہندوؤں میں ہندو اور مسلمانوں میں مسلمان۔ میرے زمانہ اور زندگی میں ایسی سیکولر مخلوق کہاں تھی۔

اور کیا لکھوں، روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس نہ جاڑے کی شدت نہ گرمی کی حدت، نہ خوف و دہشت نہ پولیس کا ڈر۔ نہ کوئی مخبر نہ کوئی جاسوس، نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت منگاؤں نہ روٹی پکاؤں، نہ مئے نہ ساغر نہ تبرید۔ نہ قرضدار بس عالم نور سراسر سرور! اگر بازپرس اور ختم ہو لے تو پھر کیا ہے نورٌ علیٰ نور۔ اچھا بس سب کو سلام کہو۔ رہا میرا تو میں۔ یکے مردہ شخصم بمردی رواں۔ اللہ بس باقی ہوس۔ نجات کا طالب۔ غالبؔ۔

پیغامات

تخلص بھوپالی

"آذر" کے نام پیغام

برادرم - زندہ باد

پرانی کہاوت ہے کہ قبر کی جگہ خالی نہیں رہتی۔ کوئی غم نہیں اگر سال میں دو چار اُردو صحیفے اپنی موت مرجاتے ہیں کیوں کہ دو چار پھر ادبی دنیا میں دھاڑتے ہوئے نمودار ہو جاتے ہیں۔

آذر کی دریافت اور تخلیق پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ لیکن اس کا موجودہ سائز اور بڑا کیجئے۔ پہلی نظر میں کسی دواخانے کی فہرست یا کسی یتیم خانے کی خسارائی رپورٹ کا گمان ہوتا ہے۔ ہوسکے تو گٹ اپ کا کوئی اچھا سا بلاک بنوایئے۔ نئے اور نوجوان طبقے کی ہمت افزائی کیجئے۔ پیشہ ور لکھنے والوں کی یلغار سے جہاں تک ہوسکے اپنے جریدے کو بچایئے۔

خود شفا گوالیاری کی ذاتِ گرامی کو معیاری وصحت مند ادب کا دوسرا نام دیا جاسکتا ہے۔ یقیناً ان کی نگرانی میں "آذر" پاک وصاف اور معیاری ادب پیش کرتا رہے گا۔ ہاں ایک بات آپ کے جریدے میں کھٹکتی ہے کہ آپ نے اپنے ادارے میں کسی بھی غیر مسلمان کو جگہ نہیں دی۔ یہ ہمارے سیکولر اسٹیٹ کے مزاج اور ظرف کے خلاف ہے۔ ہوسکے تو ایک اس قبیل کا آدمی رکھ لیجئے۔ کسی وقت اگر آپ پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا گیا تو اس شخص کا نام بطور ڈھال استعمال کیا جاسکتا ہے نیز ڈی آئی آر کی زد سے بھی بڑی حد تک بچے رہیں گے۔ اگرچہ آپ یا حضرت شفا گوالیاری سے کسی گناہ کے سرزد ہونے کا امکان نہیں ہے لیکن میرے بھائی! اس کا کیا علاج، اس زمانے میں گناہ تھوپے جاتے ہیں، سرزد نہیں ہوتے!

"آذر" میں اشتہارات کا فقدان ہے۔ پہلی فرصت میں اگر اُردو کی خدمت کرنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اشتہارات کا اسٹاک کیجئے۔ اس وقت انجمن ترقی اُردو کے ہاتھوں میں اُردو کا کاروبار زیادہ ہے۔ ہوسکے تو بین الاقوامی اُردو کے ادارہ سے کوئی حقیر رقم وصول کرنے کی جان توڑ کوشش کیجئے۔ معتبر ذرائع سے انکشاف ہوا ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے نئے جرائد کی حوصلہ افزائی کے لئے کچھ دینا دلانا شروع کر دیا ہے۔

میں نے اپنے اس پیغام میں اپنی نیک خواہشات کا اظہار اس لئے نہیں کیا کہ جب بھی گذشتہ میں نے کسی نومولود جریدے
کو اپنی نیک تمنائیں پہنچائی ہیں تو وہ چھ ماہ کے اندر اندر ناپید ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ "آذر" زندہ دیکھنا چاہتا ہوں اس لئے خیرسگالی
پیغام ارسال کرنے سے قصداً گریز کیا ہے۔ البتہ دعا حاضر ہے کہ اللہ تعالیٰ منتظمین آذر کی معاشی حالت کو تا دیر برقرار رکھے
کہ اس قرار پر ہی "آذر" کی زندگی کا انحصار ہے۔
ڈی، آئی، آر کی ہیبت و دہشت کم ہو تو پھر تعمیل حکم میں کوئی اینٹی کانگریس مضمون لکھ کر روانہ کردوں گا۔ ورنہ میاں!
یہ زمانہ تو توبہ و استغفار نیز خیر و خیرات کی طرف زیادہ راغب ہوں۔ رات بھر نفلیں پڑھتا ہوں کہ اللہ نے یہ دن عزت کے
ساتھ گزار دیا اور دن میں چپکے چپکے درود پڑھتا رہتا کہ اللہ کسی طرح شام کرے تو پھر سجدۂ شکر ادا کرنے کے مواقع ملیں۔
مکان کیا ہے عاشور خانہ ہے۔ والسلام۔

تخلص مشاہیر کی نظر میں!

- **ابوالحسن علی ندوی (علی میاں)**

بحیثیت ادیب اور مزاح نگار لوگ ان پر بہت کچھ لکھیں گے لیکن میں تو اُن کے
خلوص، ان کی محبت اور ان کی شرافت نفس سے متاثر اور اس کا عقیدتمند ہوں جو اب اس خود غرضی
اور مادیت کے دور میں خال خال نظر آتی ہے۔

- **کوثر چاند پوری**

تخلص بھوپالی کی موت بے حد اندوہناک ہے۔ اس موقع پر آسانی سے یہ شکوہ کرنے
کا حق پہنچتا ہے کہ:

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

- **نسیم انہونوی**

تخلص مرحوم مزاح نگار ہی نہیں تھے، ان کا علم مجلس بھی ایسا تھا کہ جس محفل میں ہوتے
ہوئے لوگوں کو اتنا ہنساتے کہ پیٹ میں درد ہونے لگتا۔ افسوس! یہ مرنجان مرنج شخصیت ہم میں باقی
نہیں رہی۔

تخلص بھوپالی

تخلص صاحب کی شاعری

خبردار "ہٹیا" وہ اب شیرِ نر !

"تخلص صاحب نے "پنیچ گودی" کے ابتدائی دور (جنوری ۱۹۶۰ء) میں دو نظمیں بھی کہیں۔ ایک میں ۱۹۴۷ء سے قبل کا نقشہ کھینچا ہے اور دوسری میں ۱۹۶۰ء وہی "دادا لوگ" کیا ہو گئے کو پیش کیا ہے۔ تخلص صاحب لکھتے ہیں:

۱۹۴۷ء سے قبل اپنے شہر کے دادا لوگوں کے رہنے سہنے کا نقشہ 'غالبی' میں پیش کیا جاتا ہے۔ مستند اور حاذق شعراء کرام میری نظم پر فنی گرفت کرنے سے اپنے آپ کو قطعاً معذور سمجھیں، کیونکہ شعراء کرام سے معذرت کے ساتھ شروع کر رہا ہوں۔"

(۱)

کروں تذکرہ کیا جو بجتا ہے دادا
بہادر ہے کم اور زیادہ ہے دادا
یہ تلوار و لاٹھی سے رکھتا ہے ذوق
لڑائی و جھگڑے سے ہے اس کو شوق

وہ گز بھر کا سینہ نکالے ہوئے
وہ گردن کو "لقہ" بناتا ہوا
وہ کیوں رے شریفوں سے کہتا ہوا
ٹہلتا، وہ رُکتا رُکاتا ہوا

خبردار! "ہٹیا" وہ اب شیرِ نر
وہ سیٹی سی منہ سے بجاتا ہوا
وہ بھرپور انگڑائی لیتا ہوا
وہ مونچھوں پہ لیموں جماتا ہوا

گرجتا، برستا، ڈپٹتا ہوا
وہ کندھے سے کندھا رگڑتا ہوا
وہ دیتا ہوا راہ گیروں کو دھکے
شریفوں کو غنڈہ سمجھتا ہوا

وہ لاٹھی سے لاٹھی بجاتا ہوا
غزل گالیوں کی سُناتا ہوا
وہ شان اپنی سب پر جماتا ہوا
سروں پر تھپاڑے لگاتا ہوا

ذری میں "ہیرکٹ" کراتا ہوا
پھر "آئیل" ذری کا لگاتا ہوا
وہ کاندھے پہ شملہ اٹھاتا ہوا
بغل میں وہ صافہ دباتا ہوا

ازل سے "ذری" کا ہے کھاتا ہوا
ذری رنگ اہد تک جماتا ہوا
وہ انگلی پہ چونا لگائے ہوئے
وہ پانوں کی پیکیں اڑاتا ہوا

اب آخر یہ نقشہ جماتا ہوا
"ابے ہٹ" مجھے بھی سناتا ہوا
تخلص یہ ہم سن کے چپ ہوگئے
کہیں تو کہیں کیا کہ دادا یہ ہے

(۲)

تخلص نے اپنی دوسری نظم میں ۱۹۴۷ء کے بعد کا نقشہ اس تمہید کے ساتھ پیش کیا ہے:
"حاذق شعراء فنی پگڈنڈیوں کے بجائے "شاہراہ لذت گفتار" پر گامزن ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ کیونکہ میں نے اس کا خیال رکھا ہے":

"زمانہ پٹھانوں کا اب لدگیا"

وہی "شیر نر" آج بدحال ہے
بیچارے کو جینا بھی جنجال ہے
نہ آنکھیں رہیں اب وہ چنگیز سی
نہ گردن میں باقی اکڑ رہ گئی
نہ مونچھیں ہیں باقی نہ لیموں کہیں
ہر اک در پہ گھسنے لگا ہے جبیں
جو کندھوں کو دیکھو تو ڈھلتے ہوئے
نہ بازو میں مچھلی نہ وہ زور ہے
وہ سینہ جو رہتا تھا نکلا ہوا
جو پچکا تو بس پیٹھ سے جا ملا
کوئی گالیاں دے تو ہنستا ہے یہ
کہ اپنے گھر میں ہی کستا ہے یہ
یہ لاٹھی کو رکھتا ہے گھر میں چھپا
نہ اسٹک ہے کوئی نہ اب طمنچہ
"ذری" کے وہ کھاتے نہیں اب کہیں
ہر اک کہہ رہا ہے یہاں کچھ نہیں
کٹانے لگا ہے یہ چوہوں کے کان
کہ یہ شیر ہے اب تو گیدڑ نسان"
تخلص تمہیں ان کا اب خوف کیا
زمانہ پٹھانوں کا اب لدگیا

"بھوپال پنچ" سے

عبدالاحد خاں تخلص

حضرت جگر مرادآبادی کا استغاثہ

فردوس بریں۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۷۱ء آمدہ اطلاعات مظہر ہیں کہ شہنشاہ متغزلین حضرت جگر مرادآبادی نے تحت دفعہ ازالہ حیثیت عرفی دعویٰ کر دیا ہے۔ عدالتی کارروائی کا آنکھوں دیکھا حال پیش کیا جاتا ہے۔

دعویٰ

باجلاس آنریبل حضور اسداللہ خان غالبؔ جج فرسٹ کلاس عدالت خفیفہ برائے تصفیہ فسادات شعر و شاعری۔

مدعی — علی سکندر جگر مرادآبادی مرحوم مقیم حال عالم بالا

مدعا علیہ — علامہ حضرت "فتح نازپوری" ساکن عالم زیریں۔

پہلا سین

عدالت کے ڈائس پر غالبؔ بحیثیت جج تشریف فرما ہیں۔ قریب ہی جیوری کی بنچوں پر قطب شاہ ولی۔ آبرو۔ میر سودا انیس مصحفیؔ، انشاؔ، ناسخ۔ آتش۔ داغ۔ ذوق۔ امیر۔ اقبال اور مولوی عبدالحق خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں معزز سامعین میں فانی۔ مجاز۔ اصغر۔ آرزو وغیرہ (مرحومین نو) قطار در قطار عدالت کی کارروائی سن رہے ہیں۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا مقدمہ تھا اس لئے عالم بالا کے پرسکون ماحول میں کھلبلی پیدا ہو گئی ہے عدالتی کارروائی براڈ کاسٹ کی جا رہی ہے۔ جہنم کے عذابی اور گنہگار لوگ ٹیلیویژن پر کارروائی دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے اپنے عذابوں کو بھول چکے ہیں۔ احاطہ عدالت میں لاکھوں مومنین جمع ہیں۔ چنا جور گرم، بالو ریت کی بھنی مونگ پھلی، پاپڑ کرارے کی ہانکوں پر دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے۔ شعرائے کرام خاکی وردیوں میں ملبوس ۱۴۴ کے منکروں کی سخت نگرانی کر رہے ہیں۔ جنت کے طول و عرض میں اب بھی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ برادران اسلام کو مطلع کیا جا رہا ہے کہ وہ جوق در جوق عدالت میں تشریف لا کر کارروائی مقدمہ سنیں اور ثواب دارین حاصل کریں۔

دوسرا سین

(عدالت)

غالب :۔ (جیوری کی طرف دیکھکر) یہ تو کل پندرہ ہیں۔ سترہ ہونا چاہئیے۔ جگبت، سرشار کہاں ہیں، کیوں پیشکار؟ کیا ان دونوں آنجہانیوں کو آپ نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی؟

پیش کار :۔ حضور بذریعہ ایکسپرس ڈیلیوری بے کنٹھ میں مطلع کر چکا ہوں۔ شاید ویزا نہیں ملا ہوگا۔

غالب :۔ (چیں بجبیں ہوکر) کیا واہیات ہے۔؟ اُدبا شعرا جیسے شریف شرفا کو کس ویزا کی ضرورت ہے؟ ذرا ملا آزاد کو ٹیلیفون کرو۔ وہ عزرائیل کے ذریعہ دونوں کو بلانے کا انتظام کر دیں گے۔ اچھا ٹھہر دمیں خود ہی فون پہ بات کرتا ہوں۔ کیا

پیش کار۔ ۲۰۳۴۹۴۹۴۵۵۲۳۸۹۹۴۵۶۷۸۹ ــــ

غالب :۔ تو یہ ہے؟ بس کرو میاں ـــ بس کرو ـــ یہ نمبر ہے کہ شیطان کی آنت۔ میں تو جی کر مرکبھی اتنوں تو یاد نہیں رکھ سکتا۔ دیر میں آنے کا نتیجہ ہے جو اس قدر طول طویل نمبر ملا۔ خیر تم ہی میرا پیغام پہنچا دو

پیش کار :۔ (ٹیلیفون اُٹھا کر) مناسب ہوتو عدالت کی کاروائی تو شروع کر دی جائے۔ دونوں حضرات آتے ر

غالب :۔ کیا خوب؟ جیوری اس وقت خالص قوم یتیم کے افراد پر مشتمل ہے کل کو کسی نے عدالتِ عالیہ سے لگ بجھا دی تو حضرت! مجھے بھی فرقہ پرست کہلواؤ گے۔

پیش کار :۔ حضور مولانا نے فرمایا کہ عزرائیل روانہ کر دیئے گئے۔ سرشار اور جگبت لمحہ کے اندر ہی اندر آتے ہو

تیسرا سین

غالب :۔ (جگبت اور سرشار کو دیکھ کر) بھئی بڑی دیر کر دی۔ تشریف رکھئے۔ اچھا ہاں جگر صاحب اپنا دعویٰ پیش کیجئے۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔

جگر :۔ عرض پرداز ہوں۔

غالب :۔ ارشاد۔

جگر۔ میں نجیب الطرفین، شریف، خاندانی اور باعزت مرحوم ہوں۔ خاکسار مدتوں عمر ملک کے طول و عرض عظیم شاعر کی حیثیت سے جانا پہچانا گیا۔ مجھے شہنشاہ متغزلین اور رئیس المتغزلین جیسے خطابات سے نوازا گیا۔ خاکسار علیگڈھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی ملی تھی۔

غالب :۔ کیا اعزازی ڈگری؟ کیسی اعزازی؟ آپ کی تعلیمی قابلیت کیا ہے؟

جگر :۔ کسی عظیم فنکار یا سیاسی رہنما کو اس کی خدمات کے پیش نظر ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی جاتی۔ جس کے لئے کسی خاص قابلیت۔ صلاحیت یا تعلیم کی ضرورت نہیں۔

غالب :۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے؟ جب ہی تو آئے دن اُردو میں سب ڈاکٹر بن کر یہاں آ رہے ہیں۔ خیر ب ملے

جگر :۔ پھر خاکسار کو ۵۸ء میں ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے اپنی تخلیق آتشِ گل پر ۵ ہزار کا انعام ملا۔

غالب :۔ (خوش ہوکر) جزاک اللہ پھر تو میاں آپ نے دیسی کی۔ کیا ہاتھ لگایا ہوگا؟ (قہقہہ)۔ جگر۔ میں دیسی ہی پینے کا عادی تھا۔ لیکن بعد میں توبہ کر لی تھی اور شرح و شریعت کے عین ضابطوں کے مطابق زندگی گزار۔

تھا۔ (خواتین کے مجمع سے ایک بچے کی رونے کی آواز)

مجاز:۔ نقش فریادی ہے۔ کس کی شوخیٔ تحریر کا۔

غالب:۔ آرڈر۔ کون صاحب ہیں یہ؟ نکالو باہر عدالت سے۔

جگر:۔ اور آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ میرے انتقال پُر ملال کے بعد بڑے بڑے شعرأ۔ اُدبا اور سیاسی حضرات نے تعزیتی پیغامات دیکر خاکسار کی شاعرانہ عظمتوں کو سراہا ہے۔ چند پیغامات ملاحظہ ہوں۔ جن سے میری شاعرانہ فضیلت کا عدالت کو بخوبی اندازہ ہو جائیگا۔

نیاز حیدر صاحب نے فرمایا کہ جگر ایک ہمہ گیر آفاقی شاعر کی حیثیت سے دنیا میں تسلیم کئے جائیں گے۔

رشید حسن خان دلّی یونیورسٹی۔ جگر صاحب طرزِ غزل گو تھے۔ وہ جتنے بڑے شاعر تھے۔ اُتنے ہی بڑے انسان تھے۔

گوپال متل:۔ جگر صاحب کو لوگوں نے آخری دم تک سب سے آگے جگہ دی۔

ظفر پیامی:۔ جگر عوام و خواص میں یکساں مقبول تھے۔

گوپی ناتھ امن:۔ جگر عوام میں کبیر کی طرح مقبول تھے۔

ڈاکٹر محی الدین زور:۔ توقع نہیں کہ آئندہ کوئی شاعر اس رنگ اور ڈھنگ کا اُردو زبان کا پیدا ہو۔

سجاد ظہیر:۔ جب تک اُردو بولنے والے زندہ ہیں۔ اپنے اس محبوب شاعر کو دل میں جگہ دیں گے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جتنی لطافتوں رعنائیوں کا تصوّر لفظ شاعری سے وابستہ ہے جگر اس کی مجسّم تصویر تھے۔

جسٹس آنند نرائن مُلّا:۔ مجھے کوئی نظر نہیں آتا جو عوام اور خواص میں اتنا مقبول رہا ہے۔ اُن کی مقبولیت کا راز میرے خیال میں ترنم نہیں تھا۔ (عدالت سے مخاطب ہو کر) مُلّا صاحب کا یہ فیصلہ یقیناً معزز عدالت کے لئے بھی قابلِ قبول ہوگا۔ کیونکہ موصوف تادم تحریر جسٹس ہیں۔

غالب:۔ آگے چلئے! دنیا کی طرح یہ عدالت کسی ماتحت عدالت کے فیصلہ کی پابند نہیں ہوا کرتی۔

جگر۔ مناسب۔ حضرت تخلص نے فرمایا۔

غالب:۔ یہ کون ذاتِ شریف ہیں۔ کیا تخلص؟

جگر:۔ مدیر اعلیٰ بھوپال پنچ جن کے مرحوم ہونےکے بعد دیار طنز و مزاح اُجڑ جائیگا۔

غالب:۔ اجی کیا مسخرہ پن ہے۔ تخلص بھی کوئی تخلص ہے۔

خیر:۔ کیا فرمایا آپ نے

جگر:۔ تخلص نے فرمایا کہ شاعری عینِ عالم شباب میں بیوہ ہوگئی جس کو اب بشرط ضرورت نکاح ثانی کرتے وقت ایسا بر ملنا ممکن نہیں۔

غالب:۔ (منہ پھیر کر ہنستے ہوئے) واہ بھئی۔ آدمی تو کچھ ذہین معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھنا پیش کار صاحب ذرا جسٹر

وصولہ۔ کب تک تخلص صاحب موصول ہوں گے۔

پیشکار :۔ (ورق گردانی کے بعد) حضور۔ دو گھنٹیاں تو بج چکی ہیں۔ آخری باقی ہے۔

غالب :۔ گویا جلد ہی آئیں گے۔ اچھا جگر صاحب یہ تو بتائیے کہ اس طول طویل روئیداد کا مطلب کیا ہے۔؟ آخر آپ کو کیا تکلیف ہے۔ عدالت ہنوز گمراہ ہے۔

جگر :۔ مدعا علیہ نے میری شہرت اور وقار کو سخت دھکا لگا ہے۔

غالب ۔ مگر جناب والا۔ مدعا علیہ نے آپ پر کون سے الزامات لگائے ہیں۔

جگر :۔ یہی کہ جگر میں استادانہ رنگ نہیں تھا۔ جگر نے جو کچھ شہرت حاصل کی وہ صرف ترنم کی وجہ سے۔ جگر کے زیادہ تر اشعار شعر و شاعری کی گرامر سے بے تعلق اور بے نیاز رہے۔ یہ ہیں وہ بیانات جو علامہ فتح نازپوری نے لکھے اور اس طرح ارباب شعر و سخن کی نظروں میں مجھے ذلیل کیا۔

اقبال :۔ (غالب سے) مگر جب تک مدعا علیہ اور یہ تمام حضرات جنھوں نے تعزیتی پیغامات دیئے ہیں۔ حاضر عدالت ہو کر کوئی روشنی نہ ڈالیں، عدالت کیونکر کسی فیصلہ پر پہنچ سکتی ہے۔ یک طرفہ فیصلہ دینے کے لئے کم از کم عالم بالا کی عدالتوں کو تو اختیارات نہیں ہیں۔

غالب :۔ بھئی خوب۔ کیا قانونی نکتہ بتایا۔ واقعی۔ یہ تو درست ہے کہ فریق ثانی کی عدم موجودگی میں کیونکر صاحب کے دعوے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے (پیشکار سے مخاطب ہو کر) دیکھو تو رجسٹر کب تک فتح ناز پوری متوقع ہیں۔ "ف" کی تختی میں دیکھو ـــــ

پیشکار :۔ (رجسٹر الٹ پلٹ کر) حضور "ف" میں تو کہیں ذکر نہیں ہے۔

جگر :۔ ذرا نام الٹ کر دیکھیئے شاید "ن" کی تختی میں مل جائے۔

پیشکار :۔ ("ن" کی تختی دیکھ کر) جی ہاں، جی ہاں۔ الٹ میں تو نام ہے۔

غالب :۔ آمد ؟

پیشکار :۔ ابھی تو حضور پہلی وارننگ بھی نہیں دی گئی۔

غالب :۔ اوہو۔ گویا بیس پچیس سال ابھی انتظار کرنا پڑیگا۔ کہیئے جگر صاحب ؟ اب کیا ہو۔؟

مولوی عبدالحق نے جو اردو یونیورسٹی کا نقشہ کوئلہ کی مدد سے دیوار پر کھینچ رہے تھے۔ ایک دم چونک کر کہا۔ مگر میرے علم سے یہ بالکل بعید ہے کہ مرحوم جگر صاحب کو اپنی تذلیل و تضحیک کے متعلق کیونکہ علم ہوا جبکہ بموجب دعویٰ یہ سب الزامات اُن کی وفات حسرت آیات کے بعد لگائے گئے ہیں۔

اقبال :۔ واہ مولانا! کیا غضب کا نکتہ بتایا ہے۔ واللہ مقدمہ ہی ختم ہو گیا۔ ورنہ بہت طول پکڑ جاتا۔

جگر :۔ پلیز۔ پلیز۔ یہ دیکھیئے حضرت حمن خان صاحب جو ہندو پاک میں صرف تنقید۔ بغضیہ کا ہی کام کرتے ہیں مرض سکتہ میں عارضی موت مر کر حال ہی میں تشریف لائے ہیں۔ موصوف سے ہی یہ سب کچھ معلوم ہوا۔

جمن خان :- میں خدا کو حاضر و ناظر جان کہتا ہوں کہ جگر نے اپنے دعوے میں جو شکایات لکھی ہیں۔ وہ حرف بحرف صحیح ہیں۔ حضرت فتح ناز پوری نے اپنے گرج نمبر (GRUDGE) میں جگر کی شاعری کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیئے ہیں۔ اب جگر کے کلام کو دنیا والے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

جگر :- مجھے انتہائی افسوس ہے کہ یہ خون خرابہ میری موت کے بعد کیا گیا کسی کی شہرت کو مرحوم کر کے اپنی شہرت کو زندہ رکھنا کسی بھی اچھے قلم کار کے شایان شان نہیں۔ کاش مدعا علیہ میری حیات میں میری غلطیوں سے آگاہ کرتے تو اب اور اپنے پر احسان سمجھتا اور مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ یہ فیصلہ میں اب شعر و ادب کے پنچوں پر چھوڑتا ہوں۔

مولوی عبدالحق :- سمجھ میں نہیں آتا کہ مدعا علیہ سے کیونکر سہو ہو گیا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جو اردو ادب کے ستون ہیں۔ جن کی ۵۰ سالہ ادبی علمی خدمات کے پیش نظر مجھے یہ یقین ہے کہ اردو دوست حضرات ناز پوری کو اب میرے بعد بابائے اردو تسلیم کریں گے۔

غالب :- آپ نفسِ معاملہ سے ہٹ گئے۔ (گڑگڑاہٹ کی آواز)

فرشتہ - (عدالت سے) جمن خان صاحب کے جو مرضِ سکتہ کا شکار ہو کر آئے ہیں زندہ ہونے میں چند لمحات باقی ہیں۔ واپس دنیا میں پہنچانا ہیں۔

جمن خان نے عدالت کو جھک کر سلام کیا۔ جگر نے (آبدیدہ ہو کر) جلدی سے جمن خان کے کان میں کہا۔ حضرت فتح ناز پوری کو میرا سلام اور شکریہ پہنچا دینا۔

فرشتہ نے جمن خان کو بغل میں دبایا اور فضاؤں میں غائب ہو گیا۔

پیش کار :- حضور اس مقدمے کی پیشی کسی تاریخ کی رکھی جائے۔

غالب :- ۱۵ اگست ۲۰۰۰ء کی بجائے اس وقت تک مدعا علیہ اور مدعی کے گواہان یقینی آ چکے ہوں گے۔

(عدالت برخاست)

حُسنِ طلب

(شفیق اعجاز)

"حلقۂ اربابِ ادب" بھوپال کی مقتدر ادبی انجمن ہے۔ اس نے اپنی سلور جوبلی "زندہ دلان بھوپال کے ساتھ ایک شام" کے عنوان سے منائی۔ تخلص صاحب بھی موجود تھے۔ جلسہ سے کچھ دیر قبل روزنامہ "ندیم" کے ایڈیٹر حکیم سید قمر الحسن نے اپنے سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگانے لگے۔ تخلص صاحب کو بھی طلب ہوئی اور انھوں نے حسنِ طلب سے کام لیتے ہوئے کہا "سگریٹ ہم بھی پیتے ہیں"۔

"بہت اچھا" حکیم صاحب سنجیدگی سے بولے "آپ بھی اپنا برانڈ نکالئے اور شروع ہو جائیے"۔

تبصرہ — تناظر — یوسف اعظمی

'تناظر' کی پہلی صورت گری، معیاری تخلیقات کی دستاویز کی صورت میں ایک نیک شگون سے کم نہیں۔ اردو کے ٹھیٹ ادبی پرچے، ہندوستان میں موت اور حیات کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر عتیق اللہ کے زیر ادارت یہ اشاعت کسی مخصوص آئیڈیالوجی سے وابستگی کے بغیر، ادبی افق پر ایک نئی تابناکی کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس ادبی دستاویز کی ترتیب و تہذیب کی ذمہ داری شری بلراج ورما کی ہے۔ مجلس مشاورت میں ڈاکٹر قمر رئیس، فکر تونسوی، راج نارائن راز، بانی اور مجتبیٰ حسین کی شمولیت، اس کے معیاری ہونے کا یوں بھی ثبوت فراہم کرتی ہے۔

اس پہلی اشاعت میں، ڈاکٹر قمر رئیس نے 'مختصر مضمون میں جو کسی حد تک تشنہ ہے' بھرپور تاثر دینے کی کوشش کی ہے افسانوی گوشے کے پہلے حصہ میں کرشن چندر کا غالیچہ، قاضی عبدالستار کا ساحلی، اقبال متین کا مزبلہ، رتن سنگھ اور بلراج ورما کے افسانے پورا آدمی اور کابوس شامل ہیں۔ یہ افسانے عصری زندگی کے مختلف روپ کا اظہار ہیں۔ 'تناظر' کی اس اشاعت میں ایک خصوصی گوشہ کرشن موہن کے لئے وقف ہے۔ تنقیدی حصے میں وارث علوی نے پیروئ مغرب کی روایات کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ دلچسپ بحث چھیڑ دی ہے کہ ہندوستانی سماج اور ادب نے مغرب سے گہرا اکتساب کیا ہے۔ عصمت جاوید نے کروچے کے مضمون کا ترجمہ 'نظریہ اظہاریت' کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد نے چارلس بادلیر کے حالات کا بہت ہی اچھا مطالعہ پیش کیا ہے انہوں نے بادلیر کی زندگی، اس کی عظمت اور رجحانات کی عکاسی کی ہے۔

شعری حصہ میں خورشید الاسلام کی شامل کئی نظموں میں ایک دو تخلیقات شعری آہنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔ خلیل الرحمن اعظمی کی نظمیں (کتبہ: ۱، کتبہ: ۲) ایک طویل عرصہ کی خاموشی کے بعد ادب میں اہم اضافہ ہیں۔ بلراج کومل کی نظمیں 'مسافت' اور 'سمینار' کا شمار بھی اچھی نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔ محمد علوی کی چند تاثراتی نظموں میں 'خدا' ایک بھرپور تاثر پیش کرتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی، شہریار اور صادق کی منظومات بھی قارئین کی توجہ مبذول کروانے کی تخلیقی قوت رکھتی ہیں۔

فکشن کے دوسرے حصہ میں جوگندر پال اور اقبال مجید کے افسانے 'رامائن' اور 'پوشاک' شامل ہیں۔ 'دل ناصبور دارم' زاہدہ زیدی کا ایک سرریلسٹ ڈرامہ ہے۔ غزلوں کے شعبہ میں ساقی فاروقی، باقر مہدی، عزیز قیسی، حسن نعیم، محمد علوی، مخمور سعیدی، پرکاش فکری، زیب غوری، اشتر خانقاہی، بشر نواز، مظفر حنفی، غلام مرتضیٰ راہی، عادل کاشمیری، منصور سبزواری کی غزلیں شامل ہیں۔ اظہار کے مختلف سانچوں کی یہ 'سمفنی' اس حصہ کو ہمہ جہتی رنگ بخشتی ہے۔

تخلیقات کے ساتھ ساتھ، ترجموں کی افادیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ نیر مسعود نے کافکا کے ایک افسانہ کا ترجمہ 'قصبے کا ڈاکٹر' اور انور مرزا نے سنکسیلر لوئیس کا ترجمہ 'تلاش' پیش کیا ہے۔ آخری ڈاک میں فیض کی خوبصورت غزل بھی شامل ہے ڈاکٹر مغنی تبسم نے ن۔م۔ راشد کی نظم 'مرگ اسرافیل' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ راج نارائن راز اور بانی کی شعری تخلیقات بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے 'جدید اردو غزل: لسانی تجربے سے تخلیقی حرکیت تک' میں عصری غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ لیکن ابھی اس کا مطالعہ نئی نسل کی جدید تر غزل تک ہونا چاہئے۔ 'تنقیدی مطالعے' کے گوشہ میں عتیق اللہ نے خورشید الاسلام، قاضی عبدالستار اور ماد... پر قلم اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر نے بانی کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ راہی نے کرشن موہن اور بلراج ورما نے گوپال متل کے مطالعے پیش کئے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے 'تناظر' ادبی پرچوں کی موجودہ دم توڑتی فضا میں زندگی کی ایک علامت ہے۔ تقریباً ۶۰۰ صفحات پر شائع شدہ اس شمارہ کی قیمت ۲۵ روپے ہے جو اردو عوام کی قوت خرید سے ہم آہنگ نہیں۔ تناظر کا یہ شمارہ ۸/ ۲۲۵ بنڈارا روڈ، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۳ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

فلمی تصویر

حیدرآباد سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت فلمی و ادبی ماہنامہ فلمی تصویر نے اپنی اشاعت کے چھ ماہ مکمل کر لیئے ہیں چھ مہینے کی مدت کسی رسالہ کے لئے کوئی طویل مدت نہیں، اس مختصر سی مدت میں بھی فلمی تصویر نے جو ترقی کی ہے حیرت انگیز ہے۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والا یہ پہلا ماہنامہ ہے جو ملک کے گوشے گوشے میں کثرت سے خریدا اور پڑھا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ بیسیوں بیرونی ملکوں میں جہاں جہاں بھی اردو پڑھنے والے موجود ہیں فلمی تصویر ان کے ہاتھوں میں پہونچ چکا ہے۔ فلمی تصویر میں ملک اور بیرون ملک سے تعلق رکھنے والوں کی تحریریں، خطوط، تبصرے اور مستقل کالم ہر شمارہ میں شامل رہتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلمی تصویر نہ صرف یہ کہ ملک اور بیرون ملک کے بے شمار اُردو پڑھنے والوں کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے بلکہ انھیں اپنے حسین گٹ اَپ اور اپنے معیاری و معلوماتی، ادبی و فلمی مواد سے متاثر بھی کر رہا ہے۔ حیدرآباد ہی نہیں بلکہ سارے ملک میں اتنے بڑے پیمانہ پر اُردو کا کوئی ماہنامہ شائع کرنے کی کامیاب کوششیں اس سے پہلے شاید ہی کہیں دیکھی گئی ہو۔ اس حیرت انگیز مقبولیت اور کامیابی پر ادارہ فلمی تصویر اردو والوں کی دلی مبارکباد اور تعریف و تحسین کا مستحق ہے۔ فلمی تصویر کے چھٹے شمارہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اردو کے اس شاندار ماہنامہ نے اپنے ابتدائی چھ ماہ کے لئے جو پلان بنایا تھا، جو نشانے مقرر کئے تھے انھیں نہ صرف یہ کہ پورا کر لیا گیا ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں مقررکردہ پلان اور نشانوں سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی ہے ملک کی تمام ریاستوں، شہروں حتیٰ کہ ایسے قصبوں اور دیہاتوں میں بھی فلمی تصویر پہنچ چکا ہے جہاں اردو رسائل کے خریدار تو موجود ہیں لیکن اردو رسالے ان دور دراز مقامات تک پہنچ نہیں پاتے۔

فلمی تصویر کے اس اٹھان کو دیکھتے ہوئے یہ پیش قیاسی کی جاسکتی ہے کہ اگلے چھ ماہ میں یعنی ایک سال کی مدت کے مکمل ہونے تک فلمی تصویر نہ صرف اُردو کا بلکہ ہندوستان کا ایک بے حد اہم اور نمائندہ فلمی و ادبی جریدہ ثابت ہوگا، دلکشی جاذبیت یعنی رنگ اور روپ کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ مواد کے تنوع اور معیار کی بدولت معنوی اعتبار سے بھی فلمی تصویر اپنی طرز کے منفرد ماہنامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دبیز اور اُجلے کاغذ پر حسین و رنگین طباعت بہترین تصاویر کے انتخاب اور اشاعت کے علاوہ اُردو کے نامور ادیبوں کی تخلیقات اور ممتاز فلمی شخصیتوں کے انٹرویو، مضامین، تبصروں اور مستقل کالموں کے سلسلہ میں نہ صرف یہ کہ اس رسالہ نے اپنے معیار کو برقرار رکھا ہے بلکہ اسے بلند سے بلند تر کرنے اور ہر نئے شمارہ کو پچھلے شمارہ سے بہتر اور حسین تر بنانے کی کوششوں میں بھی ایک مشن کو آگے بڑھاتے کے جذبے کے ساتھ منہمک ہے۔

پتہ: فلمی تصویر، گرین پیلس، حیدرآباد 500029		(م۔ل)

رضا نقوی واہی

حکم حاکم

(۱) پہلے وہ کیجئے کہ جو کرتے ہیں بھیڑیئے
اُردو زباں کے جسم کی خود کھال اُدھیڑیئے
یعنی کہ رسم خط کا گلا گھونٹنے کے بعد
میرے حضور آ کے، غزل اپنی چھیڑیئے

(۲) کبھی غالب صدی ہے اور کبھی اقبال کی برسی
کبھی تعمیرِ "اُردو گھر" کے موقع پر چراغاں ہے
مگر اُردو کے جائز حق کا جب بھی ذکر چھڑتا ہے
تو اس آواز کی گردن اُڑا دینے کا ساماں ہے

اداریہ

● ستمبر میں پروفیسر آفاق احمد کا خط ملا تھا کہ "شگوفہ" کا کوئی شمارہ ممتاز مزاح نگار تخلص بھوپالی کے لئے وقف کیا جا سکتا ہے۔ موصوف نے اس سلسلہ میں مواد کی فراہمی کا بھی وعدہ کیا جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم نے فوری تخلص نمبر کا اعلان کر دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آفاق صاحب اس کے مہمان مدیر رہیں ہمیں خوشی ہے کہ موصوف نے ہماری درخواست قبول کی۔ جنوری میں چونکہ سالنامہ شائع ہوتا ہے اس لئے ضروری تھا کہ تخلص نمبر نومبر میں چھپ جائے۔ بعض ادیبوں نے وقت کی کمی کی شکایت کی اور بعض مصر تھے کہ تخلص بھوپالی کو خراج عقیدت پیش کرنے میں وہ ضرور شریک رہیں گے یہ شمارہ کچھ دن اور روکا جائے لیکن انتظامی دشواریوں کے سبب ایسا ممکن نہ تھا تاہم ۲۰ نومبر تک موصول ہونے والے مضامین زیرِ نظر شمارہ میں شریک کئے جا سکے۔ وقت کی تنگی کے باوجود تخلص نمبر جس صورت میں شائع ہو سکا، اسے قارئین یقیناً پسند کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اس خصوص میں ادارہ خاص طور سے پروفیسر آفاق احمد کا ممنون ہے جن کی دلچسپی کے بغیر ہم یہ نمبر شائع نہیں کر سکتے تھے اس کام کے دوران میں آفاق صاحب بیمار اور فریش رہے لیکن تخلص نمبر کے کام کو متاثر ہونے نہ دیا ●

بے باک صحافی، منفرد افسانہ نگار اور تیکھے تیور کے طنز و مزاح نگار ابراہیم جلیس کا کراچی میں ۲۶ر اکتوبر کو دماغ کی شریانیں پھٹ جانے کی وجہ سے اچانک انتقال ہو گیا۔ ابراہیم جلیس، جناب محبوب حسین جگر جائنٹ ایڈیٹر سیاست اور ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کے بھائی تھے۔ موصوف مشہور روزنامہ "مساوات" کے ایڈیٹر تھے لیکن پاکستانی حکومت کے معاندانہ رویّہ کی وجہ سے اس کی اشاعت مسدود ہو چکی تھی۔ ابراہیم جلیس نے 'مساوات' کو اپنے خونِ جگر سے زندگی عطا کی تھی اس کو ٹوٹتا دیکھ کر خود اُن کی زندگی کا تارِ نفس ٹوٹ گیا۔ صحافت کا گلا گھونٹنے پر احتجاج کی یہ بےمثال ادا ہے جسے ہم سلام کرتے ہیں!!

THE ANDHRA PRADESH STATE AGRO INDUSTR
CORPORATION LTD.

'INTEKHAB MANZIL', 10-2-3, A.C. GUARDS, HYDERABAD-500

Through their District Offices

assists farmers

in

1. Land Development Activities with Bulldozers;

2. Distribution of Fertilizers, Pesticides and Insecticides;

3. Distribution of HMT Zetor 2511, Escorts and Ford Tractors, Tractor Tyres and Tubes and genuine spare parts;

4. Distribution of Electrical Motors/Oil Engine Pumpsets and modern Bullock Carts through our Agro Pumpsets and Implements Limited.

APSA -Mango, Pineapple and other fruit beverages.

APSARASA -Tin fruit Products like Mango, Pineapple, Orange squashes, jams and Pickles.

SHUGOOFA
Vol, 10 Copy. 11 — 31 Quarters, M. J. M rket, Hyderabad — Nov, 1977. — Ph. 57716

شگوفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

دسمبر ۱۹۷۷ء

جلد (۱۰) شمارہ (۱۲)

فی پرچہ : ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ ــــــ (۲۰) روپے
بیرونِ ہند سے ــــ (۳۵) شلنگ

ٹائٹل : سعادت علی خاں
طباعت ٹائٹل : اسٹینڈرڈ ڈاکومینٹس، شانتی نگر، حیدرآباد
لیتھو طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد ۲
بائینڈنگ : محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، پرانی حویلی، روبرو عبادت خانہ حسینی، حیدرآباد

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ شگوفہ ۳۱ ۔ مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

٭ فون : (57716)

کراچی بیکری
معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔ فون نمبر 43502

کشمیری قوام

گلزار حوض حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

INDIA

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

ہند و پاک کے منفرد مزاحیہ

سالنامہ

۱۰ر جنوری ۱۹۷۸ء کو شائع ہوگا

ملک کے تمام اہم طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات، خاکے
کارٹون، ادبی لطیفے، عصری طنز و مزاح کا جائزہ
مشہور آرٹسٹ سعادت علی خاں کے سہ رنگی سرورق کے ساتھ
ضخامت و قیمت عام شمارہ کی دوگنی

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر یکم جنوری ۱۹۷۸ء تک بک کروالیں۔

زندہ دلان حیدرآباد
کے
میر کارواں

بھارت چند کھنہ کے مضامین کا نیا مجموعہ

دسمبر ۷۷ء کے اواخر میں شائع ہوگا

یوسف ناظم

★

شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں
یعنی
معاملہ دستخطوں کا

لکھنے میں اپنے نام کے ساتھ بد غلطی کرنے کے عمل سے جو چیز برآمد ہوتی ہے وہ دستخط کہلاتی ہے۔ اچھے سے اچھا خوش خط شخص بھی اپنا نام کچھ اس ترکیب سے لکھتا ہے کہ تحریر کی ہر حد سے گذر جاتا ہے۔ اگر یہی بدسلوکی، اُس کے نام کے ساتھ کوئی اور شخص کرے تو چپقلش کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔ شروع شروع میں دستخطوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی، لیکن جیسے جیسے آدمی مہذب اور جرائم کا معیار اونچا ہوتا گیا، دستخط بازی نے ایک فن کی صورت اختیار کرلی اور سب سے اچھی دستخط وہ مانی جانے لگی جو کسی ضدی لڑکے کے مزاج کی طرح بگڑی ہوئی ہو۔ آدمی کی دستخط، آج آدمی سے زیادہ اہم ہے۔ اس کی دستاویزی قانونی اور سماجی حیثیت سے جو شخص بھی اپنے نام کی ایک ہی نمونے کی دو دستخطیں کرنے کی اہلیت رکھتا ہے معتبر سمجھا جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ دونوں دستخطیں بجنسہٖ ایک ہونی چاہئیں۔ (بنک صرف ایسے ہی باہنر لوگوں کی قدر کرتے اور اپنے ہاں آنے جانے کی اجازت دیتے ہیں۔) دستخطوں کی اس اہمیت کی وجہ سے ہر شخص مجبور ہو گیا ہے کہ وہ اپنے نام کے دستخط بنائے۔ اس لئے اب ہر شخص کچی عمر ہی سے اپنے نام کو دستخط میں منتقل کرنے کی مشق کرتا ہے۔ اگر ایک دستخط سے دل کو اطمینان نہیں ہوتا ہے تو وضع قطع کی دستخطیں بنا کر دوستوں اور بزرگوں سے مشورہ کرتا ہے کہ ان دستخطوں میں سے کون سی دستخط زیادہ ضرر رساں ہوگی۔ دوست احباب بھی ایسی دستخط کا انتخاب کرتے ہیں کہ دیکھنے والا کہہ اٹھے۔ ؎

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اس لئے اب دستخطیں وہی رائج ہیں، جو دماغ اور بصارت کو زیادہ تکلیف پہنچاتی ہیں۔ جب آدمی مشق اور مشوروں کے مرحلوں سے گذر کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اب اس کا نام صرف بذریعہ تفتیش ہی پڑھا جا سکتا ہے تو وہ اس نقش کو دستخط کے نام سے اپنے احباب اور عزیز و اقارب میں پھیلاتا اور خوش ہوتا ہے کہ اس نے ایک نئی چیز دریافت کرلی۔ ہر شخص کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ ایسی دستخط پیدا کرے جس کی نقل نہ ہو سکے۔ اور اس کوشش میں اس سے ایسی دستخطیں

بھی سرزد ہو جاتی ہیں، جن کی نقل خود اس سے ممکن نہیں ہوتی۔ ایسے فنکاروں کی ہر دستخط پہلی دستخط سے الگ ہوتی ہے اور ہر دستخط زبان حال سے عرض کرتی ہے کہ

میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

ایسے متلون مزاج لوگوں کی دستخط کو قابل عمل بنانے کے لئے ان سے اپنی نگاہوں کے سامنے دستخط کروا کے تصدیق کرنی پڑتی ہے کہ صاحب دستخط نے ناظرین کی موجودگی میں یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ لوگ جب بھی چیک پر دستخط کرتے ہیں چیک آواز بازگشت کی طرح واپس آجاتا ہے (رقم اگر چہ محفوظ رہتی ہے) ملک کے تعلیمی فیصد کو بڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو دستخط کرنے سکھا دیئے جائیں، یوں بھی اب حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں کہ آدمی کو جب تک دستخط کرنے نہیں آتے اُسے اسمبلی اور پارلیمان کا ممبر بننے کے لئے کھڑا تک ہونے نہیں دیا جاتا۔ (آج سے دس پندرہ سال پہلے تک ایسی کوئی قید نہ تھی)

آدمی بہت دنوں تک اپنے نشان ابہام پر زندہ رہا۔ مگر بلکہ یہاں تک سُنا گیا ہے کہ اکثر شاعروں کے کلام میں جو ابہام پایا جاتا تھا وہ بھی نشان ابہام تھا۔ شاعر کسی پڑھے لکھے نوجوان سے اپنی کہی ہوئی غزل لکھوا کر اس کے نیچے اپنا نشان ابہام نصب کر دیتا تھا۔ شاعروں کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہوا کرتے تھے جنھیں دستخط کرنے نہیں آتے تھے۔ جب بھی ان کا بیان عدالت میں قلمبند ہوتا یا وہ خود اہل غرض بن کر درخواست (بغرض نامنظوری) پیش کرتے تو اس پر اُن کے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے کی تصویر اُتروائی جاتی (عین وقت پر کاسنی رنگ کی روشنائی کا اگر اسٹیمپ پیڈ موجود نہ ہو تو فاؤنٹین پن کو جھٹک کر جتنی بھی روشنائی دستیاب ہوتی اس کے ذریعے انگوٹھے کو رنگا جاتا اور اس انگوٹھے کو کاغذ پر رکھوا کر نشان ابہام کروانے والا شخص اُسے اس قدر طاقت سے دباتا کہ مظلوم سی کراہ اٹھتا۔ صنف نازک اور صنف قوی کے انگوٹھوں کے بارے میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صنف قوی کے دست چپ کے انگوٹھے کا نشان مستند مانا جاتا ہے جب کہ صنف نازک کے دست راست کے

انگوٹھے ہی کو قانونی حیثیت حاصل ہے (لکیروں کے معاملے میں البتہ معاملہ برعکس ہے۔ مردوں کا سیدھا ہاتھ اور عورتوں کا بایاں ہاتھ دیکھنا چاہیئے عورتوں کے ہاں قسمت بھی بائیں ہاتھ کا کھیل ہے)

کئی زبانیں ایسی ہیں جن کے رسم الخط میں رننگ ہینڈ (خط رواں) ممکن ہے یہ زبانیں دستخطوں کے معاملے میں خوش نصیب ہوتی ہیں۔ ان میں یک سے ایک خوب صورت دستخط پائی جاتی ہے۔ اور اگر کئی دستخطیں ایک جگہ رکھ دی جائیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی مقابلہ حسن منعقد ہو رہا ہے۔ (ان دستخطوں کے بھی سبھی خد و خال نمایاں ہوتے ہیں) ان میں سے کوئی دستخط مونا لیزا نظر آتی ہے تو کوئی قلوپطرہ۔ یہ سب دستخطیں بیک جنبش قلم مکمل ہو جاتی ہیں جب کہ اردو دستخطیں رک رک کر کرنی پڑتی ہیں (اردو کی تو ہزاروں مشکلیں ہیں۔ رومن رسم الخط میں ایک ہی نام کی دو چار دستخطوں کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو یہ ایک دوسرے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی نظر آتی ہے۔ لیکن اردو میں ایک ہی نام کی ہر دستخط کا ڈیزائین الگ ہوتا ہے (کشیدہ کاری کے نمونوں کے مجموعے انہی دستخطوں کی مدد سے تیار کئے جاتے ہیں) ایک ہی نام کی دو اردو دستخطیں ایک سی نہیں ہو سکتیں ہمارے خیالات بھی ایک دوسرے سے کبھی میل نہیں کھاتے) ان دستخطوں میں چند دستخطیں ایستادہ ہوتی ہیں، چند ایسی نظر آتی ہیں جیسے کرسیوں پر بیٹھی ہوئی ہوں اور چند خفتہ حالت میں پائی جاتی ہیں۔ دو چار سو دستخطوں کو قریب سے دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اردو کے پروفیسر اور اساتذہ صاحبان خاص طور پر دستخطوں کے معاملے میں بہت کمزور ہیں یا تو انھوں نے اس موضوع پر غور نہیں کیا ہے یا دستخط کو غیر اہم سمجھ کر اس طرح نظر انداز کر دیا ہے جیسے وہ بھی کوئی بھرتی کا شعر ہو۔ دستخط تو ایسی ہونی چاہیئے کہ معلوم ہو کہ دستخط کرنے والے نے خود کی ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی دستخط سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا محمد علی اور سر سید احمد کی دستخطیں ہم تک نہیں پہنچیں۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ اپنی دستخطوں میں بھی انھوں نے اتنی ہی دلچسپی لی ہوگی جتنی خلافت تحریک اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملے میں دکھائی تھی۔

اردو کے اساتذہ میں جن لوگوں نے اپنی دستخط سے غفلت برتی ہے ان میں آل احمد سرور ؔ کا نام سر فہرست آتا ہے، جہاں انھوں نے ڈاکٹر اقبال کے کلام کا اتنی محنت اور لگن سے مطالعہ کیا ہے وہیں ان کے دستخط بھی دیکھ لیتے اور اسے حفظ کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام ؔ کی دستخط میں بھی تقریباً یہی کیفیت ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی دستخط ایستادہ ہے تو موخر الذکر کی خفتہ، خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی دستخط پر کچھ محنت کی ہے۔ ان کے نام کے دو حصوں کے درمیان جو کمان بنتی ہے مصری فن تعمیر کا اچھا نمونہ ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں ادیب ؔ اور سلام سندیلوی ؔ کی دستخطیں قصداً ایسی بنائی گئی ہیں کہ لوگ ان سے بچ کر نکل جانے میں اپنی عافیت سمجھیں کہا جاتا ہے ڈاکٹر مسیح الزماں ادیب نے جب ایک خط سلام سندیلوی کو بھیجا تو سلام سندیلوی نے انھیں لکھ کر بھیجا کہ خدارا اپنے دستخط بدل لئے کیونکہ غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے اس خط کے آخر میں جب سلام سندیلوی کے دستخط دیکھے تو اس دستخط کے نظارے سے انھیں غش آگیا۔ ڈاکٹر محمد حسن ؔ دستخط تو ٹھیک کرتے ہیں لیکن بے نقطہ۔ ان کے نام میں ہے ہی ایک نقطہ۔ اس نقطے کی بھی روشنائی وہ بچا لے جاتے ہیں۔ ممکن ہے ان کا بھی ارادہ کوئی بے نقطہ چیز لکھنے کا ہو۔

اردو کے ایک اور استاد آفاق احمد ؔ کی دستخط بھی کافی استادانہ ہے۔ اس دستخط میں آفاقیت کا عنصر ذرا زیادہ ہی ہے۔ الف سے قاف کو منسلک کرنے کی کوشش

ایسی ہی ہے جیسے دو مختلف النوع سیاسی پارٹیوں کا الحاق ہو رہا ہو۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے کچھ تو قع تھی کہ کم سے کم وہ تو اپنی دستخط کو قابل قبول حالت میں پیش کریں گے لیکن ان کے معاملے میں بھی کافی مایوسی ہوئی۔ ان کے دستخط میں "چند" کا جو لفظ ہے اس کے بارے میں آسانی سے کہا جا سکتا ہے

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔

ان کے اس "چند" سے تو لال چند پرارتھی [۱] کا چند کئی گنا بہتر ہے۔ شملہ کی آب و ہوا کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ لال چند پرارتھی شاعر ہونے کے علاوہ منسٹر بھی ہیں اور ایک منسٹر کا اتنا خوش خط ہونا حیرتناک واقعہ ہے۔ گوپی چند کی دستخط میں ایک اور قباحت یہ بھی ہے کہ "گو" اور "پی" میں فاصلہ ذرا زیادہ ہے اتنا فاصلہ تو دو شہروں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ پریم چند کی دستخط ہماری نظر سے نہیں گذری، لیکن دل کہتا ہے کہ جب انھوں نے اتنی اچھی کہانیاں لکھی ہیں تو دستخط بھی اچھی ہی کر لیتے ہوں گے (دستخط میں کوئی پلاٹ تھوڑا ہی ہوتا ہے) ان کے نام میں اتفاق سے نو ۹ نقطے ہیں۔ نقطوں والی دستخط اور وہ اتنی کثیر تعداد میں نقطوں کی دستخط مشکل کام ہے۔ ہمت جواب دے دیتی ہوگی۔ کوثر چاند پوری [۲] کو بھی ایسی ہی تکلیف دہ صورت حال سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بہر حال وہ اس مہم سے بخیر و خوبی عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ سب کچھ محنت و ریاضت پر منحصر ہے۔ ہمدرد دواخانے کی بھی دین کا اثر ہو سکتا ہے۔ نثار احمد فاروقی کی دستخط ہیں بہت پسند آئی "ق" کے اوپر ایسا معلوم ہوتا ہے شامیانہ سا لگا ہوا ہے اور اس کی طنابیں زمین، ہیں دور تک چلی گئی ہیں۔ عنوان چشتی کی دستخط پر بھی آسمان بنا ہوا ہے لیکن یہ ذرا زیادہ ڈانواں ڈول ہو گیا ہے۔ قاضی عبدالستار کا اصرار ہے کہ ان کے ایجاد کئے ہوئے منبر و محراب کو اُن کی دستخط سمجھا جائے۔ اہل انجمن کے صبر و شکیب کی آزمائش کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

اردو کے اساتذہ کے دستخطوں کا حال تو آپ دیکھ ہی چکے، اردو صحافیوں نے بھی دستخطوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ سید بہاؤالدین احمد ایڈیٹر عصری ادب اردو دنیا میں اپنی دستخط پیش کرنے سے پہلے سید بہارالدین احمد ایڈوکیٹ پٹنہ کی دستخط کا مطالعہ کر لیتے تو انھیں کما حقہٗ فائدہ پہنچتا (سید بہارالدین احمد ایڈوکیٹ ہمیں اس لئے یاد رہ گئے کہ انھوں نے کئی ہزار اشعار پر مشتمل ایک نہایت دلچسپ کتاب مرتب کی ہے۔ یہ کام شعر کہنے سے زیادہ مشکل ہے) خوشتر گرامی کی دستخط میں خوشتر اور گرامی کے درمیان میں جو کچھ بھی لکھا ہے حشو و زوائد کی تعریف میں آتا ہے۔ رحمٰن نیر کی دستخط پر بوسیدہ اسباب کا شبہ ہوتا ہے۔ پرکاش پنڈت اپنے نام کے ۱۲ نقطوں کی وجہ سے شدید تکلیف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ حسن کمال کی دستخط میں لفظ کمال کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی لڑکی کی چھوٹی سی چوٹی میں موباف بندھا ہوا ہے۔ (یہ بھی کمال ہے)

الہ آباد کے ایک صحافی عالم صدیقی کی دستخط البتہ نمائش مصنوعات ملکی میں استعمال کی جا سکتی ہے۔

شاعروں اور ادیبوں کا دامن بھی دستخط کے معاملے میں صاف نہیں ہے۔ ظ۔ انصاری کی دستخط انھیں کی طرح پیچیدہ ہے ع مدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا۔

اس دستخط کو مشکل ہی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ سردار جعفری دستخط کرتے وقت جعفری کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ جاں نثار اختر کی دستخط پا پسپائی کی شکست و ریخت کا منظر ہے۔ قرۃ العین حیدر کی دستخط سے تو آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اب جانے بھی دیجئے۔ مجروح سلطان پوری کی دستخط میں ہمارے حیدرآباد کی ح حیدرآباد کی طرح کسی اور ریاست میں ضم ہو گئی ہے۔ شہاب جعفری بھی اپنی دستخط میں جعفری کے ساتھ بھی دہی ظلم کرتے ہیں۔ جس کی طرح سردار جعفری نے ڈالی ہے۔ محمود ایاز کی دستخط میں محمود ایاز پوشیدہ ہے۔ دستخط کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ محمود، ایاز پر فدا ہو گیا۔ لفظ اختر کو دستخطوں میں طرح طرح سے استعمال کیا گیا ہے۔ وحید اختر، اختر حسن ڈاکٹر ش اختر، اختر سعید، اختر بستوی، ان سب کے دستخطوں میں سارے کے سارے اختر بنات النعش گردوں کی طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بعض تو شہاب ثاقب ہیں۔ ادیبوں، شاعروں میں ڈاکٹر قمر رئیس کے دستخط صاف پڑھے جا سکتے ہیں۔ رئیس کے اوپر ہمزہ کی علامت تو اتنی بڑی ہے کہ داستان امیر حمزہ دکھائی دیتی ہے۔ دستخط دل کھول کر کی جائے تو اسی قسم کے نتائج برآمد ہوتے ہیں مزاح نگاروں میں احمد جمال پاشا کے دستخط ان کے مزاح کی بولتی تصویر ہیں۔ یہ دستخط روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کے کام آتی ہے۔ شفیقہ فرحت کو البتہ اس قسم کی دستخط کرنے سے روکا جانا چاہیئے۔ فرحت کو کرخت میں تبدیل کرنا کون سی ظرافت ہے۔ نریندر لوتھر کی دستخط صلیبی جنگوں کی یاد دلاتی ہے۔ دستخطوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ایک دستخط پر زیادہ سے زیادہ پانچ سکنڈ صرف کرنے چاہئیں۔ کیونکہ زندگی کا ہر ثانیہ اہم ہوتا ہے۔

لیکن وہ لوگ جن کے پاس کرنے کو کچھ اور کام نہیں ہوتا دو یا تین دن میں ایک دستخط سے فارغ ہوتے ہیں۔ ہمارے جاننے والوں میں ڈاکٹر مومن محی الدین اور سردار عرفان کی دستخطوں میں اتنا ہی وقت صرف ہوتا ہے۔ ان کی دستخطیں اگر عمر خیام کے زمانے میں پائی جاتیں تو ہمارا رباعی گو شاعر انھیں کے نمونوں کے ظروف بنوا کر شغل مے نوشی میں استعمال کرتا (ربط مینا کی ترکیب ایسی ہی دستخطوں کے لئے وضع کی گئی ہے) شارب ردولوی کی دستخط کشتی مع بادبان کا منظر پیش کرتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ چند دستخطوں کے نقشے (Map) عبرت کے لئے پیش کئے جائیں۔ سنا گیا ہے کہ رانچی کے ایس ایس میموریل کالج کے شعبۂ اردو کے لکچرار صدیق مجیبی کی خدمت میں بہار اردو اکیڈیمی ان کی دستخط کے صلے میں ایک ایوارڈ پیش کرنے والی ہے۔

لیکن سورت کی انجمن ترقی اردو کے صدر حاتم الحوانی سے ان کا سخت مقابلہ ہے۔ مصور سبزواری اور آہ سنبھلی بھی سمجھتے ہیں کہ ان کی دستخطوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آہ سنبھلی کی دستخط پر بہرحال اس لئے غور نہیں کیا جا سکتا کہ یہ راون کی ڈھائی ہوئی لنکا نظر آتی ہے۔ اس لنکا میں صرف کمی اتنی ہے کہ یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اس میں کولمبو کہاں واقع ہے۔ آہ!

ساغر نظامی کے دستخط کے لئے البتہ کسی بھی اکاڈمی کا ایوارڈ کافی نہیں ہو سکتا۔ اتنا بڑا فنڈ کسی بھی اکاڈمی کے لئے منظور نہیں کیا گیا ہے۔

اور جب ہم اپنی دستخط پر غور کرتے ہیں تو یہ بھی انہیں اپنی ہی طرح خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔

راج کھیل

'راج نرتکی' نے کہی کیا پتے کی بات
ن وہ دَور اور تھا' یہ دَور اور ہے
وقت سوشلسٹ بنا پھر رہا تھا میں
دو کی بات چھیڑ رہے ہیں مگر جو آج
رتے ہیں نے ان کا تضادِ بیاں سُنا
ن وہ میرے رنگِ تحیّر کو تاڑ کے

اُردو کی مانگ پر میں گیا آٹھ بار جیل
اُس وقت تو یہ شُترِ سیاست تھا بے نکیل
ہاتھوں میں راج نیت کی تھامے ہوئے غلیل
وہ دشمنانِ قوم سے رکھتے ہیں تال میل
سوچا کہ ریل ذہن کی شاید ہوئی "ڈی ریل"
بولے کہ تم سمجھ نہ سکو گے یہ "راج کھیل"

گرگٹ صفت جو رنگ نہ بدلے وہ بیوقوف
اِس کھیل میں ہمیشہ ہی ہوتا رہے گا فیل

رضا نقوی واہیؔ

آبِ حیات

لگ گیا "جنتا" کے ہاتھوں نسخۂ "آبِ حیات"
جن کے گُردوں سے نکلتی ہے جو اکسیر الشفاءُ
رات دن پرچار کرتے پھر رہے ہیں دیش میں
مُنجمد بستر پہ لیٹے لیٹے بڈھے کے عوض
اور بعدِ غسل مَلیئے اپنے سارے جسم پر
اِس نئی دریافت سے پہلے غریبوں کے لئے
مفلسی' بیروزگاری، نت نئی بیماریاں
اِس نئی دریافت سے ہر اِک کی چھٹی ہو گئی
کوئی بیماری ہو جھٹ سے ایک جُرعہ پی لیا
چین کی ڈفلی بجائیں کیوں نہ اب "صحت وزیر"
تاؤ مونچھوں کو نہ کیوں دیں' خشک ہونے سے بچی
اب گزارش ہے یہ نیتاؤں سے بچو کی قوم کی
عین ممکن ہے پروٹین اس کے اندر ہو چھپا
قوم کا ہر فرد بن جائے گا پھر تو خود کفیل

چٹکیوں میں ہوں گی حل اب اُس کی ساری مشکلات
اُس کو پی کے ہر مرض سے قوم پائے گی نجات
پُوچھیئے پردھان نیتا سے ذرا اس کی صفات
چُسکیاں لے لے کے جی بھر پیجئے جامِ حیات
اس کے آگے مات ہیں اصغر علی کے عطریات
کتنی مشکل زندگی تھی، کتنی آساں تھی وفات
سب کی سب مِل جُل کے رہتی تھیں لگائے تاک گھات
ڈاکٹر، کمپاؤنڈر، نرس، اسپتال و ادویات
اور گھر بیٹھے جراثیمِ مرض کو دے دی مات
مِل گیا ان کو نئے مشروب میں رازِ حیات
ان کے پیچیدہ قلمدانِ وزارت کی دوات
جسم سے خارج شدہ فُضلہ پہ بھی ہوں تجربات
پھر تو حل ہو جائیں گی ساری غذائی مشکلات
پھر کسی گھر میں نہ ہوگی جھگڑی کی واردات

پھر تو آجائے گا ہر گھر میں "مکمل انقلاب"
خواب جس کا دیکھتے ہیں لیڈرانِ خوش صفات

مُلجم

اُستاد

برق آشیانوی

کہیں رہتے تھے اِک صاحب اُن کا نام تھا استاد
بڑے بے فکر تھے اور زندگی کے غم سے تھے آزاد
کیا ہم نے سوال اُن سے کہ "صاحب یہ تو بتلائیں
یہ "اُستاد" آپ کس فن کے ہیں کچھ ارشاد فرمائیں
پہلوانی کے ہو اُستاد؟ بچوں کو پڑھاتے ہو؟
کہیں طبلہ بجاتے ہو کہ بچے گانے گاتے ہو؟
کسی ہوٹل میں مرغ و ماہی و حلوے پکاتے ہو؟
کہ غزلیں بیچ کر شعر و سخن میں سر کھپاتے ہو؟
کہا۔ "کشتی کا ہی اُستاد ہوں میں اور نہ شاعر ہوں
طبلچی ہوں، نہ باورچی، نہ موسیقی کا ماہر ہوں؟
کسی فن میں نہیں ماہر تو پھر "استاد" کیا معنیٰ
تو ہنس کر آپ بولے "جی مری بیوی ہے استانی"

قطعہ

کام چل سکتا نہیں اب شربتِ دیدار سے
دل کی ٹھنڈک کے لئے لیموں کا شربت چاہیئے
دوپہر کو شہر کے صحرا میں پھرنے کے لئے
قیس کا دل چاہیئے لیلیٰ کی ہمت چاہیئے

... کہا ہے مجھ سے!

اسمٰعیل ظریف

آج پھر سالے نے کچھ قرض لیا ہے مجھ سے
پھر بھی سسرال کا ہر فرد خفا ہے مجھ سے
ابتدا ہی سے میں بدنام ہوں بدنام سہی
"آپ کا نام تو دنیا میں ہوا ہے مجھ سے
ہار مخلص نے جو محفل میں مجھے پہنایا۔!
خود سے پہنایا نہیں دام لیا ہے مجھ سے
اس کے شاگرد کے گھر آج ہے چہلّم شاید
شیخ دعوت میں ابھی ملنے گیا ہے مجھ سے
جانے والو یہ اُدھار تو چکاتے جاؤ
آپ نے داد جو محفل میں لیا ہے مجھ سے
داد دل کھول کے جن لوگوں نے دی ہے مجھکو
چائے ہر شخص نے ہوٹل میں پیا ہے مجھ سے
سنئے غزل آپ کی یہ آپ کا کہنا ہے ظریف
کہنے والے نے تو کچھ اور کہا ہے مجھ سے

غزل

فیاض افسوس

ترکِ اُلفت کے لئے جتنے بھی انجکشن ہوئے
مرتے مرتے ہم بچے کچھ ایسے ری ایکشن ہوئے
چل رہا ہے آگے پیچھے آفتوں کا سلسلہ
ہم ہوئے بھی تو مصیبت کا بڑا جنکشن ہوئے
شام تک دن میں ہمیں تارے نظر آتے رہے
اُرلی اِن دی مارننگ جب آپکے درشن ہوئے
کم نہیں کچھ یہ نوازش بھی مری سرکار کی
ایک بیوی اور پھر بچے بھی دو سنیکشن ہوئے
اختلافِ باہمی کی اور بنیادیں پڑیں!
اتحادِ قوم کی خاطر جو کنونشن ہوئے
جانے کیا ہوگا اگر یہ سلسلہ چلتا رہا!
چار ہی بچوں میں جب چودہ طبق روشن ہوئے
کتنی حیرت ہے کہ جشنِ شادمانی کے لئے
حضرتِ افسوس کے اعزاز میں فنکشن ہوئے

اعضائے رئیسہ اور سر

برق آشیانوی

انسان کے جسم میں کئی اعضا ہوتے ہیں۔ جن میں سے صرف چند ایسے ہیں جن کو اعضائے رئیسہ کا اعزاز عطا فرمایا گیا ہے۔ ان اعضائے رئیسہ کی تعداد کسی حکومت کی کابینہ کے وزرار کی تعداد کی طرح نہایت ہی کم ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر کوئی وزیر اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دے تو اس کا قلمدان وزارت کسی اور وزیر کے سپرد کر دیا جاسکتا ہے لیکن اعضائے رئیسہ میں سے اگر کوئی "عضوِ رئیس" استعفیٰ دیدے (یعنی کام کرنے سے انکار کردے) تو اس کا قلمدانِ ریاست (رئیس کی مناسبت سے ریاست کا لفظ استعمال کیا گیا ہے) کسی دوسرے عضوِ رئیس کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اعضائے رئیسہ کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ انھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ بعض صورتوں میں تو گننے کے لئے صرف ہاتھوں کی انگلیاں ہی کافی ہو جاتی ہیں۔ ان میں بھی خاص طور پر بعض اعضائے رئیسہ کو دیگر اعضائے رئیسہ پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال کے لئے بھی ہم قلمدان ہائے وزارت کو پیش کرسکتے ہیں مطلب یہ کہ بعض وزارتوں کے قلمدانوں کی حیثیت دیگر وزارتوں کے قلمدانوں سے ممتاز، اہم، ورفیع اور بااختیار ہوتی ہے۔ اور بعض وزارتیں تو محض وزارتیں ہوتی ہیں جو جلسوں، مشاعروں، کلچرل پروگراموں یا مشاعروں کی صدارت کرنے یا عمارتوں کے سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے زیادہ موزوں و کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ ان مصروفیتوں کے بعد جو وقت بچ جاتا ہے وہ افتتاح کے دوروں میں صرف ہوتا ہے۔ اس کے خلاف بعض وزارتیں نہایت اہم ہوتی ہیں۔ زیادہ تفصیل اور مثالوں کی ضرورت ہم اس لئے نہیں سمجھتے کہ وزارتوں کی اہمیت اور فرق کو ہم جیسے غیر سیاسی آدمی کے مقابلہ میں سیاسی شعور رکھنے والے عوام بآسانی سمجھ جاتے ہیں۔ ہم نے تو تمام عمر سیاسی زندگی سے بالکل الگ تھلگ رہ کر گزاری ہے، حتیٰ کہ بعض سماجی انجمنوں میں بھی سیاست داخل ہوگئی تو ہم وہاں سے زمین پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں کیونکہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا نہیں آیا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب سے ہم نے بھاگنا سیکھا ہے تو زمین پر پاؤں رکھ کر ہی بھاگ رہے ہیں۔ دو ایک بار کوشش کی کہ سر پر پاؤں رکھیں لیکن ہمارے پاؤں ہمارے سر تک نہیں پہنچ سکے۔ اگر محاورے کا مطلب یہ ہے کہ پاؤں ہمارے ہوں اور سر دوسرے شخص کا تو ایسی جرأت کرنا بھی ہم سے نہ ہو سکا۔ غرض ہم نے وزارتوں اور قلمدانوں کی خرافات

کی ہے تو وہ محض اعضائے رئیسہ سے مماثلت کی حد تک ہے۔

اعضائے رئیسہ میں جن اعضاء کو امتیاز اور اہمیت حاصل ہے ان میں دل، دماغ، سر، جگر، معدہ وغیرہ ہیں۔ ا
آنکھ، ناک، کان، گردے وغیرہ ہیں۔ دل، دماغ، سر اور جگر (مراد آبادی نہیں) کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے ک
سے کوئی ایک عضو کابینہ سے استعفیٰ دے دے تو کوئی دوسرا عضو اس کا قلمدان نہیں سنبھال سکتا۔ البتہ ایک کا
ایک گردہ یا ایک پھیپھڑا استعفیٰ دیدے تو دوسری آنکھ، دوسرا کان، دوسرا گردہ یا دوسرا پھیپھڑا قلمدان ریاست
لیتا ہے۔ خود ہمارے ایک گردے نے بغاوت کی تو اس کو کابینہ ہی سے نہیں بلکہ پارٹی سے بھی خارج کر دیا گیا۔ اس ـ
پتھروں کا ایک ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اور کسی وقت بھی دوسرے اعضائے رئیسہ پر پتھراؤ کر سکتا تھا۔ اس کو ڈاکٹروا
برداشت قرار دے کر عمر بھر کے لئے انتخابات میں حصہ لینے سے محروم کر کے پارٹی یعنی جسم سے خارج کر دیا۔
گمنامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دے کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ہم نے اس کو بہت سمجھایا کہ سیاسی زندگی سے ک
کر کے ہماری طرح گوشۂ گمنامی میں زندگی گزارے لیکن اس نے نہ مانا۔ اور ہماری جان کے درپے ہوگیا تھا جو ہم بر
نہ کر سکے اور اس کو نکلوا کر باہر پھنکوا دیا جس کی وجہ سے ہماری زندگی میں سکون اور امن قائم ہوگیا۔

انسان کے جسمانی نظام میں اعضائے رئیسہ کے علاوہ اعضائے غریبہ بھی ہوتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں کے
طبقہ اعضائے متوسط بھی ہوتا ہے۔ اعضائے غریبہ کی تعداد کی کوئی حد ہوتی ہے نہ حساب۔ یہ تو سر کے بالوں کی طر
ہوتے ہیں۔ ویسے مردم شماری میں ان کی تعداد درج کر دی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا شمار بالکل ایسا ہی ہے
کے بالوں کا۔ اعضائے غریبہ کی فکر اعضائے رئیسہ کو ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے۔ چنانچہ ہر وقت ان کی کسمپرسی اور خستہ
رکھتے ہیں۔ صرف فکر رکھتے ہیں فکر کے علاوہ اور کچھ رکھنا مصلحت کے خلاف ہوتا ہے۔ البتہ اعضائے متوسط ہمیشہ ہما
معلق لٹکتے رہتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ ان کو اعضائے غریبہ میں شمار کرتے ہیں اور اعضائے غریبہ انھیں اعضائے ا
گنتے ہیں۔ چنانچہ یہ نہ ادھر کے رہتے ہیں اور نہ ادھر کے بلکہ چمگادڑوں کی طرح زندگی کی شاخ پر الٹے لٹکتے رہتے ہیں۔

اعضاء کی اس تقسیم کے بعد ہم اعضائے رئیسہ میں سے ایک نہایت ہی اہم عضو رئیس کے بارے میں کچھ
ہیں۔ اس عضو رئیس کا نام ہے "سر"...... "سر" وہ عضو رئیس ہے جس کے ادنیٰ اشارے کے بغیر دیگر تم
رئیسہ بھی کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ سر میں دماغ ہوتا ہے اور دماغ میں عقل، چنانچہ سر کو اعضائے رئیسہ کا
رہنما یا پیشوا جو بھی ہو، کہا جا سکتا ہے۔

ہماری اس گفتگو کو تاجر الیہود بہت دیر سے غور کے ساتھ سنتے رہے اور سر کا ذکر آتے ہی انھوں
عالمانہ شان کے ساتھ فرمایا:

"میاں! یہ انگریز بھی بڑے ذی فہم اور عقل مند ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی دانشور کو جب کوئی خطاب دی
کا خطاب دیتے ہیں۔ دل یا جگر کا خطاب نہیں دیتے۔"

ہم ان کی عالمانہ گفتگو کو سن کر یا تو سر تسلیم خم کر دیتے یا پھر پائے تسلیم کو سر تسلیم پر رکھ کر بھاگنے کی کو
ہیں۔ جس میں ہم آج تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ چنانچہ ہم نے اس وقت بھی صرف سر تسلیم سے کام لیا، پائے تسلیم
پر ہی رہنے دیا اور تقریر جاری رکھتے ہوئے عرض کیا:

"غرض اعضائے رئیسہ میں "سر" سب سے بڑا عضو رئیس ہے۔ اس لحاظ سے اس کو رئیس اعظم بھی ا
بہرحال یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سر میں دماغ ہوتا ہے جس کو عرف عام میں بھیجا کہا جاتا ہے اور عرف

"مغز" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سر میں بھیجا ہوتا ہے اور بھیجے میں عقل، جو موٹی بھی ہوتی ہے اور دبلی بھی۔ موٹی عقل کے مقابلہ میں دبلی عقل زیادہ کارآمد سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ بہت دور تک دوڑ سکتی ہے اور بہت تیز دوڑتی ہے۔ ہر سر میں بھیجا تو ضرور ہوتا ہے لیکن عقل کا ہونا ضروری نہیں۔ بعض لوگوں کے سر میں بھیجا ہوتا ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہوتی، ایسے لوگوں کو فوج میں آسانی سے ملازمت مل جاتی ہے۔ بعض لوگوں کے سر میں بھیجا بھی ہوتا ہے اور عقل بھی لیکن وہ عقل سے کام نہیں لیتے بلکہ عقل کے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتے ہیں۔ ایسے لوگ پولیس اور جیل کی ملازمت کے لئے کارآمد ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک ڈنڈا (عام سر ور ڈنڈا نہیں) بھی ہوتا ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جن کے سر میں بھیجا ہوتا ہے، بھیجے میں عقل ہوتی ہے اور وہ عقل سے کام بھی لیتے ہیں۔ ایسے لوگ پروفیسر، لکچرار یا ٹیچر ہو جاتے ہیں۔ جن بھیجوں میں عقل کی مقدار ضرورت سے کچھ زیادہ ہوتی ہے وہ بیرسٹر یا ایڈوکیٹ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی اور قسم کے سر اور بھیجے ہوتے ہیں جن میں عقل کی مقدار ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ مقدار کی مناسبت سے تجارت، ملازمت یا زراعت وغیرہ جیسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کے بھیجوں میں عقل ہمیشہ بیدار رہتی ہے اور دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کر دیتی ہے۔ اگر عقل روتی اور آنسو بہاتی رہتی ہے تو یہ لوگ سنجیدہ شاعر یا افسانہ نگار بن جاتے ہیں۔ اور اگر مسکراتی اور ہنستی رہتی ہے تو ایسے لوگ مزاح نگار ادیب یا مزاح گو شاعر بن جاتے ہیں۔ ان تمام طبقوں کے علاوہ ایک نہایت ہی خطرناک طبقہ ایسا بھی ہے جس کے سر میں بھیجا تو ہوتا ہے لیکن نہ معلوم قدرت کی کیا مصلحت ہے کہ الٹا ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ آج کل ہماری بیوی بھی ہمارے مضامین شوق سے نہیں بلکہ جستجو سے پڑھنے لگی ہیں۔

سر میں بال ہوتے ہیں (سبحان اللہ ہم نے بھی کیا نئی بات بتائی ہے) اور یہ بالحاظ صنف ہر سر میں ہوتے ہیں۔ یعنی مردوں اور عورتوں کے سروں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس حد تک تو قدرت نے ہر دو اصناف کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے لیکن ڈاڑھی اور مونچھ کی حد تک عورتوں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ اور انھیں اس نعمت سے محروم رکھا گیا جس کی وجہ سے عورتیں مردوں کی طرح ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے اور مونچھوں پر تاؤ دینے کے قابل نہیں رہیں اور مجبوراً انہیں چٹلے اور بیلٹ کا سہارا لینا پڑا۔ اگر عورتوں کو بھی ڈاڑھی اور مونچھوں کی نعمت سے سرفراز کیا جاتا تو شعراء جس طرح اپنے محبوب کے ابروؤں کی کمانوں اور گیسوؤں کی درازی کی تعریف کرتے ہیں اسی طرح مونچھوں کے تناؤ اور ڈاڑھی کی درازی کی تعریف کرتے عورتیں بھی جنھوں نے سر کے بال جمانے میں جتنے نئے نئے فیشن ایجاد کئے ہیں اس سے زیادہ ڈاڑھی سنوارنے کے دلکش اور دلفریب فیشن ایجاد کرتیں۔

بعض لوگوں کے سروں میں بال کم ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کے سروں میں بالکل نہیں ہوتے۔ جن سروں پر بال بالکل نہیں ہوتے ایسے سر گنجے کہلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سروں میں بالوں کا نہ ہونا بڑے آدمی ہونے کی علامت ہے۔ ہمارے سر میں تین چوتھائی بال غائب ہو چکے ہیں لیکن ہم ایک چوتھائی بھی بڑے آدمی نہیں بنے۔

وزن اٹھانے کے معاملہ میں بھی سر نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ حج بیت اللہ کے دوران جب ہم اپنے قافلے سے بچھڑ کر منیٰ کے بازاروں میں "با سر و سامان" پھر رہے تھے (کیونکہ ہمارے ساتھ ہمارا سر بھی تھا اور اس پر سامان بھی) تو ہمارا سر بہت کام آیا۔ اس طرح کہ صبح سے دوپہر تک ہم اپنا سامان یعنی بستر اور اٹیچی اپنے سر پر لادے اپنے کیمپ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ ویسے کبھی کبھی اپنے شانوں پر بھی رکھ لیتے تھے لیکن سر پر رکھ لینے میں جو آرام اور لطف آتا تھا وہ شانوں پر رکھ کر پھرنے میں نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے سر پر سامان کا سایہ دھوپ کی شدت سے بچنے میں بھی معاون ثابت ہوا۔ آخر میں جب ہم اپنے مسائل سے فارغ ہو کر حرم پہنچے تو سب سے پہلے فاروقی سیف الدین صاحب کے حق میں درازیٔ عمر و علو مرتبت کی دعا دوں گی اور اپنے لئے دعا مانگی کہ یا اللہ ہمارا حج قبول فرما۔

غزلیں

محفلِ غیر میں جاتے ہوئے پر جلتے ہیں
آپ کہتے ہیں تو مجبور چلے چلتے ہیں

آؤ بچو! اپنے اسمبلی مزیدار پہیلی بوجھو
کون سے پیڑ ہیں جو پھول بنا پھلتے ہیں

جون انیس سو چالیس میں دیکھا تھا انھیں
آج تک دل میں اُن آنکھوں کے دیئے جلتے ہیں

میرے گھر آئے ہیں مہمان، خوشی ہے لیکن
ساتھ ہی فکر بھی ہے دیکھئے کب ٹلتے ہیں

بنک بیلنس کے بارے میں جب اُس نے پوچھا
میں نے رُک رُک کے کہا۔ "اچھا تو ہم چلتے ہیں!"

اَن گنت لوگ مرے پیارے وطن میں، یارب!
تیری رحمت ہے کہ بن کھائے پئے پلتے ہیں!

"پوئٹک منٹ" میں ناچیز سے آکر ملیئے!
شعر مطلوب ہوں جیسے بھی یہاں ڈھلتے ہیں

ناچیز (اختر حسن)

دوست جب سویا ہوا ہو، اس کا اس طرح کچھ ڈا بناؤ
ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کو پتھر سے اڑا

اپنی کمزوری کو دشمن پر نہ ہونے دو عیاں
ڈرتے ڈرتے ہی سہی دیتے رہو مونچھوں پہ تا

ریل گاڑی سے ہٹایا جا چکا ہے تھرڈ کلاس
اے غریبانِ وطن! اپنی غریبی کا نہ اب تو غل مچا

نسخۂ مکھن سے جب پھسلے نہ پائے التفات
ٹوٹکا کیلے کے چھلکوں کا بنا کر آزماؤ!

کیا بتاؤں ڈاکٹر نکلا ہے پھوڑا کس جگہ
وہ دکھانے کا نہیں اور آپ کہتے ہیں دکھا

درد کے قصے تو چلتے ہی رہیں گے عمر بھر
یار جانے بھی دو ان کو لاؤ اک بیڑی پلاؤ

اپنا کلو ابھی الکشن جیت لے گا دیکھنا
سوئے جنتا پارٹی ہے اب کہ جنتا کا جھکاؤ

منہ پہ انڈا مار کر میرے کوئی چلا اٹھا!
واہ وا کیا نظم ہے آذر اسے پھر سے سناؤ

اسمٰعیل آذر

کوثر جعفری

معذور کو اتنا بھی سہارا نہیں ملتا
ذھوں میں جو راجہ ہو وہ کانا نہیں ملتا
ہنچّی کی ادا بیوی کے ابّا میں کہاں ہے
داماد کے جیسا کوئی سسرا نہیں ملتا
ہر شخص نظر آتا ہے اب عقل کا فربہ
بلیس کا چیلا کوئی دُبلا نہیں ملتا
یڈر کا وزیروں کا ہر اچھے و بُرے کا
بولو تمہیں کس کا یہاں چمچہ نہیں ملتا
دئی نہ کوئی عیب ہے ہر ایک میں کوثر
مجھ سا کوئی قربانی کا بکرا نہیں ملتا

غزل

بھرے ہیں سیٹھ نے گودام دیکھئے کیا ہو
لاک دھندے کا انجام دیکھئے کیا ہو
بان چھپتے ہیں، کم ہو رہی ہے مہنگائی
رے ہوئے ہیں مگر دام دیکھئے کیا ہو
ارہا ہے میرے سر پہ اُسترا اُلٹا
ٹے ہیں چُور سے حجام دیکھئے کیا ہو
عیب ہوتی تھی جن کو نہ مونگ پھلی تک
ا رہے الّو وہ بادام دیکھئے کیا ہو
غسل کرنے بیٹھے ہیں کنارے پہ جگرؔ
رہے ہیں وہ حمام دیکھئے کیا ہو

جگرؔ نظام آبادی

ڈاکٹر مدنّا منظر

گدھے کا قصیدہ

اے شہنشاہ جہالت اور نحوست زندہ باد
بدشگونی تم سے قائم اور غلفت زندہ باد
مغربی دنیا میں تو ہے نیک بختی کا نشان
مشرقی دُنیا سمجھتی ہے تجھے صابر کی شان
گھاٹیوں میں تو مسافر کے لئے ہے اک جہاز
دھوبی اور کمہار ہر دم ہیں اُٹھاتے تیرے ناز
اکثریت کا ہے سہرا تیرے سر پہ ہر جگہ
اس لئے جمہور قائم تیری ہر جا بے شبہ
تیری گوشِ نامبارک کا ہے چرچا دہر میں
جستجوئے سینگ میں ہے عقلِ حیراں شہر میں
کس فراغت سے ہے بیٹھا گھُوڑے کے اوپر دیکھئے
سارا کچرا، کوڑا کرکٹ کا دھنی ہے سوچیئے
اپنے مالک پر کبھی وہ بار ہوتا ہی نہیں
اپنی روزی ڈھونڈنے میں دیر کرتا ہی نہیں
خچّروں کی عزّت و توقیر ایرانی کریں
اُن کے شہزادوں سے اُلفت ہم یہاں دکھنی کریں
گورے گورے، بھورے بھورے، کالے کالے اے گدھو
"خچّرستان" گر بنے منظرؔ کو تم بھولو نکّو

سرور آردی

تنہائی

تنہائی کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس سے بیک وقت اولیائے کرام، رشی منی اور چور اچکے سب پسند کرتے ہیں تنہائی ہی میں اللہ والے اپنے درجات طئے کرتے ہیں۔ اور اسی تنہائی میں ہی گھر کے تالے بھی ٹوٹتے ہیں۔

انواع و اقسام کے "خوانِ واردات" سے "دسترخوانِ عالم" اسی تنہائی میں آراستہ کئے جاتے ہیں۔ انجام تھوڑا بدل جاتا ہے۔ اللہ والوں کو یہ تنہائی اللہ تعالیٰ کے قریب لے آتی ہے تو چور اچکوں کو محکمۂ پولیس کے نزدیک۔ یعنی ایک اللہ کا ہو کر رہ جاتا ہے تو دوسرا جیل کا ہو کر۔

تنہائی میں محبوب کی غیر حاضری بھی موجودگی کا پتہ دیتی ہے، قرب کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لئے حکیم مومن خاں صاحب نے فرمایا تھا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اور نظیری نے بھی بجا فرمایا ؎

تنہائی و خلوت طلبد عشق نظیری
ایں خیال و عدم را بہ امیرِ حشمے بخش

اس طرح کے خیالات اسی تنہائی میں تولد ہوتے ہیں۔ امیدوں اور یقین کے شیش محل بنتے ہیں اور مسمار ہو جاتے ہیں۔ شاعر اسی تنہائی کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ بہت ساری غزلوں کو جنم دیتا ہے اور پھر دوسروں کے لئے دردِ سر بن جاتا ہے۔ حسین تشبیہات اور نادر نادر خیالات کچھ اس طریقے سے شاعر کے ذہن میں بسیرا شروع کر دیتے ہیں گویا آفندی کے ذہن میں تاج محل کا نقشہ مرتب ہو رہا ہو۔ اور پھر شاعر خود بخود مسکرانا شروع کر دیتا ہے۔ مسکراہٹ کی سینکڑوں قسمیں اُس کے لب پر مختلف زاویئے بناتی ہوئی نمودار ہوتی ہیں۔ اور تب وہ تمام خیالات، تشبیہات اور استعارات کی نرم و نازک اور حسین ردا اوڑھ کر غزل کا گھونگھٹ الٹ دیتے ہیں عشق بھی جب حُسن کے حسین اور نازک قدموں میں ہوتا ہے تو اُسے تنہائی کی تلاش ہوتی ہے۔ اور اسی تنہائی میں عشق حُسن کا قُرب حاصل کرتا ہے۔ عشق اپنے ابتدائی مراحل میں سکوتِ دامنِ کہسار میں پناہ لینے کو پسند کرتا ہے۔ وہ ہمنشین نرگس و سنبلا اور رفیقِ گُل بنا چاہتا ہے۔

شام کو چشمے کی رومانی لوریاں سُن کر سونے میں اُسے لطف آتا ہے۔ اور علی الصباح فرشِ سبزہ سے کوئل کی آواز سے بیدار ہونا اُسے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ محفل آرائی سے اُسے نفرت ہو جاتی ہے۔ "کنجِ تنہائی" سے اُسے پیار ہو جاتا ہے۔ اور تب وہ محسوس کرتا ہے جب کیوپڈ کا تیر اُسے اپنا شکار بنا لیتا ہے۔ گویا یہ تنہائی ایک عالم کی تخلیق کا باعث بن جاتی ہے۔

انسان دو تنہائی کے درمیان سینڈوچ ہے وہ تنہا آتا ہے اور اس عالمِ فانی سے تنہا چلا جاتا ہے۔ تنہائی سے فرار کی خواہش کے باوجود تنہائی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ انسان بھی لیکن عضب کا واقع ہوا ہے۔ وہ بھی تنہائی کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا۔ اُسے تخلیہ کی ضرورت قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔

"لیڈر" ایک ایسی قوم ہے جسے تنہائی سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ تنہائی کو جب اُس پر پیار آ جاتا ہے تو لیڈر کی موت ہو جاتی ہے۔ وہ ویرانے کا جگنو نہیں ہوتا۔ وہ آبادی کا جھینگر ہوتا ہے۔

تنہائی میں دو چیزوں کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے۔ اچھی اچھی کتابیں اور چائے سے بھری کیتلی۔ ایک مزدور جو غم و اندوہ کی کالک منہ پر لگائے، سکوں کی کھنکھناہٹ کی چوٹ کھائے، سماج کی دلچسپیوں سے منہ موڑے ہانپتا کانپتا اپنے کنبوں کی پرورش کی فکر میں اپنے نحیف جسم کو گھن لگنے سے بچانے کے خیال سے جب تنہائی کے ٹھنڈے سایہ میں پناہ لیتا ہے تو وہ سارا غم بھول جاتا ہے۔ چند لمحوں کے لئے فکر عنقا ہو جاتی ہے۔ اور وہ مسکرا اٹھتا ہے اسی تنہائی میں اُسے محسوس ہوتا ہے کہ قہرِ حبیب بھی کم نہیں لطفِ حبیب سے۔

تنہائی تاریخ مرتب کرتی ہے جب کوئی دیارام ساہنی، کوئی مارشل اور کوئی راکھال داس بنرجی کھنڈروں کی جانب تنہا نکل جاتا ہے اور تنہائی میں وہاں کی مٹی کو چھوتا ہے تو دنیا کو سندھ گھاٹی اور رگ۔ آریوں کی ہزاروں سال پرانی مدفون تہذیب کا علم ہوتا ہے

کبھی کبھی تنہائی ایک مرضِ مہلک کی طرح نازل ہوتی ہے۔ اس کا شکار آبادی سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ مجمع کثیر سے وہ پناہ مانگتا ہے۔ اہلِ خانقاہ اسے اکثر "سرپرِ سایۂ جن" قرار دیتے ہیں تو مغرب پسند کانکے یا بریلی کی سیر کا مشورہ صادر فرماتے ہیں۔

"گیتانجلی" کا شہرہ آفاق مصنف ٹیگور دونوں جا بجا ہے یہ زچ گیا تو "شانتی نکیتن" کا خالق بن گیا۔ جس کی بنیاد اُس نے تنہائی کی نیو پر رکھی تھی۔

تنہائی کے ماتھے پر جہاں اس وجہ سے کلنک کا ٹیکہ لگا ہوا ہے کہ قتل، ڈکیتی، زنا اور تمام جرائم میں اس کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہاں اس کے سر پر مقدس، تاج بھی اس باعث دمک رہا ہے کہ "حرا" کی اسی تنہائی میں اس ہادی اعظم نورِ مجسم، فخرِ آدم حضرت سرورِ کائنات پر پہلی بار جبرئیل، وحی لے کر آئے اور اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنایا کہ آپ نبی آخر الزماں ہیں۔ یعنی حرا کی اسی تنہائی سے آفتابِ اسلام طلوع ہوا ●

چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

تمہاری گھات سے غافل نہیں ہے
مرا دل مولوی فاضل نہیں ہے

مری بیگم بھی پڑھ لیتی ہے اُردو
پڑھائی میں وہ بالکل نِل نہیں ہے

مری سسرال سے چلتی ہے کھٹ پٹ
وہ پہلے کی طرح گُرڈ ول نہیں ہے

وہ میکے سے لئے آئی ہیں سینڈل
غنیمت ہے کہ اس میں نل نہیں ہے

غلط سمجھے ہو یارو، میری سالی
"چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے"

سمجھتی ہے محبت کے اشارے
پڑھی لکھی ہے وہ جاہل نہیں ہے

تو پڑھئے میرے چہرے کو نہ پڑھیئے
کتابِ غم ہے یہ ناول نہیں ہے

گرانی میں قمیص یاں کیوں وہ پھاڑے
کہ جوہر قیس کا انکل نہیں ہے

جوہر سیوانی

غزل

ان پڑھ

نقلی گھی کا بگھار نکّو نا
پلنگ نیئں سو نوار نکّو نا

عشق کی میرے پاس ہے ڈگری
منجے سمجھو گنوار نکّو نا

ممّی، ڈیڈی کو ماریئے گولی
بیچ میں یہ دیوار نکّو نا

ڈاکٹر کو دکھائیے فوراً
ہجر کا یہ بخار نکّو نا

جو لگاتے ہیں رات دن چکلے
ایسے مطلب کے یار نکّو نا

ایک عاشق سے دل لگاؤ نا
اِتّی لمبی قطار نکّو نا

دشمنوں کو گلاب کے ہاراں
منجے جوتوں کا ہار نکّو نا

نقد کچھ تو خریدیئے اَن پڑھ
مال سارا اُدھار نکّو نا

چپکیاں

نہیں ہے تِل اگر چہرے پہ نقلی تِل نہ چپکاؤ
تم اپنے حسن کی البم میں یہ قاتل نہ چپکاؤ

چپک مجنوں سے لیلیٰ کی یہ مانا عین فطرت ہے
ہر ایک لیلیٰ سے لیکن دوستو محمل نہ چپکاؤ

محبت کے بجٹ میں صرف وعدوں کی ہے گنجائش
سینما اور ہوٹل کے تم اس میں بل نہ چپکاؤ

کرا بیمہ لیا ہے ہم نے اپنی کشتیٔ دل کا
ہماری کشتیٔ دل کو لبِ ساحل نہ چپکاؤ

یہ ٹوٹا سا بھی قد مجھ کو قطب مینار لگتا ہے
تم اپنی سینڈلوں میں اور اونچی ہِل نہ چپکاؤ

اگر بوتل میں صافی ہے تو پھر اللہ شافی ہے
تم اس پہ دخترِ انگور کا لیبل نہ چپکاؤ

یہ ممکن ہے سرِ محفل کوئی مرحوم ہو جائے
مرے خط کو لبوں سے یوں سرِ محفل نہ چپکاؤ

رقیب رو سیہ غالب کا مونس کا برابر ہے
تم اسی بارے میں ہی مالِ مستقبل نہ چپکاؤ

مونس ہبریلوی

مواقعات کی دیوی چشم براہ ہے

ہندوستانی افق پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی کہانی واقعی بڑی دل کش اور دل فریب ہے۔ ہندوستان پچھلے گزشتہ دو دہے ایک عظیم صنعتی انقلاب کے آغاز کے شاہد ہیں۔

ہماری ریاست میں صرف دیوقامت اور وقارافروز صنعتوں پر ہی زور نہیں دیا جاتا ہے بلکہ چھوٹی صنعتیں بھی بھرپور توجہ کی مستحق سمجھی گئی ہیں۔ ریاست گیر اور پُرزور مہموں کے ذریعہ چھوٹی صنعتوں کی ترقی کو زبردست بڑھاوا دیا گیا ہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے ختم تک ان مہموں نے ریاست کے پورے ۲۱ اضلاع کا احاطہ کر لیا جس کے نتیجہ میں ۲۳،۲۸ کروڑ روپے مصروف شدہ سرمایہ سے تقریباً ۲۵۲۰ یونٹوں کا تعین عمل میں لایا گیا۔

خود روزگار اسکیمات کی کامیاب عمل آوری کے سلسلہ میں آندھرا پردیش، ہندوستان کی صف اوّل کی ریاستوں میں شمار ہوتا ہے سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران ۲۰۷۰-۴۷ لاکھ روپیوں کے سرمایہ سے تقریباً ۱۸۵۸ صنعتی یونٹیں قائم کی گئیں

سال ۱۹۵۶ء میں موجودہ ریاست کی تشکیل کے وقت صرف ۵۴ اوسط اور چھوٹی صنعتیں موجود تھیں جن میں مصروف سرمایہ کی مقدار ۴۸ کروڑ روپے تھی۔ آج ہمارے یہاں ۲۴۸ بڑی اور اوسط صنعتیں قائم ہیں جن میں ۲۲۵ کروڑ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔

آندھرا پردیش میں مواقعات کی دیوی اپنی پوری دلربائی اور رعنائی کے ساتھ نئے میدانوں کے متلاشی صنعت کاروں کے خیر مقدم کے لئے چشم براہ ہے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامّہ
آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد

R: 22/77-78/2

انجم نجمی

اکھاڑہ اور پہلوان

ہمیں مت سرکار ہم سوچ کے اکھاڑے اور پہلوان کی بات
ہماری یعنی میری کہانی کا عنوان ہے ۔ اکھاڑہ اور پہلوان ۔ چونکہ
نہیں کر رہے ۔ ہم تو بتانے والے ہیں اُن اکھاڑوں کی بات جس کہانی کے ہیرو نے یعنی کہ ۔ غریب نے ایک جاندار اور شاندار
پہلوان کی طرح سر کرنے کی ناکام کوشش کی ۔ مگر چپکے سے سنیئے ایک بات نہ ہم جاندار ہیں نہ شاندار ۔ اور یہ بات ہماری بیگم
یعنی کہ نیے غم " اچھی طرح جانتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیں گھر کی مرغی دال برابر سمجھتی ہیں تو صاحب آئیے ہمارے ساتھ
وہاں جہاں نرالی بیوی کے بچے سجائے گھر میں دال جوتیوں میں بٹتی ہے ۔ ارے ۔۔۔ ارے ۔۔۔ سنبھالئے سنبھالئے
وار بڑا تگڑا ہے ۔ (برتن ٹوٹنے یا سامان ٹوٹنے کی آواز) ارے منّی کی اماں سنبھال کے ۔ ذرا چھری تلے دم تو لینے دو ۔
گھر کیا ہے آفت ہے آفت ، مصیبت ہے مصیبت ۔ نہ گھر میں چین نہ آفس میں پناہ (ناک بھوں چڑھا کر) ہیں کیا
کہا ۔ گھر آفت ہے ۔ میں مصیبت ہوں تو میں پوچھتی ہوں ۔ تم کیا ہو ۔ اللہ کی مار مجھ پر ۔ چھ ۔ آٹھ بچے میرے
پیچھے لگا دئیے ۔ کس کس کی جان کو روؤں ۔ ارے دو تین اور ہو جاتے تو موئی کرکٹ ٹیم ہی تیار ہو جاتی ۔ اور تم رلفری
بن جاتے ۔ اس روز روز کی ٹائیں ٹائیں سے تو جان بچ جاتی (نرم پڑتے ہوئے) ارے بیگم یہ گھر ہے اور بچے تو اللہ کی دین ہیں ۔
پیار سے تو جانور بھی قابو میں آجاتے ہیں ۔ اور پھر یہ تو انسان کے بچے ہیں ، خالص انسان کے بچے ۔
ارے چپ بھی رہو کمبختو ۔ کیا چیں چیں پیں پیں لگا رکھی ہے ۔ ایک ایک کا سر توڑ دوں گی ۔ کہاں بھاگی
ہے چڑیل ۔ ذرا ہاتھ تو آ ۔ یہ لے ۔ یہ ہے (برتن ٹوٹنے کی آواز) (بڑبڑاتے ہوئے) نہیں سدھرو گی ۔ میں
ہی دفع ہو جاتا ہوں اس گھر سے ۔ کسی پارک میں چل کر آرام سے بیٹھ تو سکوں گا (چلا کر) ہاں ہاں چپکے
سے کھسک جاؤ ۔ یہ سارا وبال میں نے خود ہی تو پیدا کیا ہے ۔ جاؤ جاؤ پارک میں جاؤ ۔ میں
خود ہی بھاڑ جھونک لوں گی ۔

ہاں تو صاحب گھر سے ہم نکلے اور پہونچے بڑھا کو پارک میں یہاں بچوں سے لیکر بوڑھے تک سبھی آتے ہیں ۔ ہم اسے بڑھا کو
پارک اس لئے کہتے ہیں صاحب ، جہاں تک نظر جاتی ہے بچے بڑھتے نظر آتے ہیں اور بوڑھے زندگی کے پڑھے ۔ پڑھائے
سبق کو دہراتے نظر آتے ہیں ۔ (سکون کی سانس لیتے ہوئے) اف ۔ کس قدر آرام ہے ۔ کیا سکون ہے ۔ پہ پا

کہاں بیٹھا جائے۔ اوں — وہاں اُس کونے میں — وہاں تو پھر بچے ہی بچے ہیں — تو پھر — تو پھر — یا اُس کونے میں چلتے ہیں — واہ کیا محفل جمی ہے — سب کے سب شاید پنشن پانے والے بزرگ ہیں۔ چلو گیان دھیان کی باتیں ہی سیکھ لیں گے۔

جمنا پرساد جی کیسا زمانہ آگیا — سوچا تھا پنشن ملنے کے بعد زندگی آرام سے گذر جائے گی۔ مگر لگتا ہے زندگی حرام —

ارے صاحب ایسا لگتا ہے زندگی کسی بنئے کا قرض ہے یا اُدھار کا زیور — ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کا — پنشن کی رقم ہوتی ہی کیا ہے۔ اب بھلا اس میں گھر چلے — بچوں کا بار اٹھائیں یا بیوی کی فرمائش پوری —

نہیں صاحب، بیوی تو اردھانگی ہے۔ آدھے حصے کی حقدار پنشن کی آدھی رقم تو اُسے جانی ہی چاہئے۔ آ کو تمہارے دُکھ سکھ میں حصہ بٹایا یا نہیں۔

جی ہاں ایسے ساجھے دار سے تو کنوارا ہونا کہیں اچھا — دن رات کی تُو تُو میں میں — تُو تُو میں میں کا ہے کا دُکھ — کا ہے کا سُکھ۔

لو بڑے بھینے یہ مورچہ بزرگوں نے بیویوں کے ڈکشن کے لئے چنا ہے ارے بھئی میں کہتا ہوں یہی باتیں کرنی تو گھر نہیں ہے جو پارک کی ہوا میں بھی میاں بیوی کی لڑائی کے جراثیم پھیلا رہے ہیں۔

نہیں۔ نہیں۔ یہاں بھی آرام نہیں — کسی ایسے کونے میں چلے جہاں کوئی نہ ہو۔ یہ تو جیا غالب کا مصرعہ غیر معلوم ہوتا ہے دماغ کو ابھی زنگ پوری طرح نہیں لگا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ دُور دُور تک کوئی نہیں — وا ہری ہری ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس۔ چھاؤں — ہوا — واہ — واہ جنت کا مزا آگیا (عورتوں کی آواز)

ہیں — ہیں — یہ کیا؟ یہ مہیلا فوج ہمارے سر پر دھرنا دینے کیوں آرہی ہے — ارے کیا کریں کیسے

ارے بہنا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ لڑکی کو سنبھالو — ایک دن یہ پر نہ نکالے گی تو سنبھالے نہیں بنے گا۔

ارے بہنو کئی بار سمجھایا — اپنے گھر بھی کنواری لڑکیاں ہیں۔ کیوں دوسروں کی لڑکیوں کا بکھان کریں۔

ادہو — ایسی ہی بی بی شریفن ہو تو کیوں کان دھرتی ہو۔ جاؤ کسی اور محفل میں — ہے — ہے۔ جیسے کبھی کسو بُرائی ہی نہیں کی۔ نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔

دیکھو جی زبان سنبھالو — ہم تو شرافت سے پیش آرہے ہیں اور تم ہو کہ بڑھ بڑھ کے بولے جا رہی ہو —

ہاں۔ ہاں بولیں گے۔ تم کیا بگاڑ لوگی ہمارا۔ سیاں بھئے کوتوال تو ڈر کا ہے کا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میاں انسپکٹر ہیں تو سب پر دھونس جما لوگی۔

ہاں۔ ہاں بک بک کرو۔ تمہارے منہ کون لگے۔

(ٹھنڈی سانس لیکر) یہاں بھی پہونچ گئی مہا کالی کی برادری والیاں ارے گھر کو تو اکھاڑہ بناتی ہی ہو۔ پارک شریف آدمیوں کے لئے چھوڑ دو۔

ہاں صاحب ٹھیک ہے۔ ہم ہی اپنا لیتے ہیں۔ مگر کہاں؟

صاحب سکون تو قسمت والوں کو ملتا ہے۔ اس کونے میں پنشن پانے والے بوڑھوں نے اکھاڑہ بنایا ہوا ہے۔ تو اس کونے میں بیویاں اور سر جبلک کے گزرے ہوئے دنوں کی عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہیں۔ اب کیا کریں؟ ارے واہ۔ کیا بینچ نظر آئی ہے۔ ارے وہی جس پر دو نوجوان شاید پڑھی اور پر یک کا ہیں۔ چلو وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ ان کی باتیں بھی سنیں گے اور جوانی کے دنوں کی یاد بھی تازہ کریں گے۔ ان میں تو بہا۔ عادت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ پیسہ بھی اور پھیکا ہیں۔ پنی پتنی تھوڑی ہیں؟

ہائے سلو۔ ہم تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ دل سے لو کرتا ہے۔ پن تم اچ بولو۔ پیسہ نیں کڑکی ہے۔ تو کیا تم کو پکچر دکھا نئیں سکتا ہے؟

ملاکا ہی مت نائی۔ جیوالا پن رچار ے پیسے نائی چلیے نائی کا بہانہ کرتو۔ پھر کٹ لا کیلئے؟

اے پن مراٹھی کا ہے کو بولتا۔ ہمارا مانگ ہندی بولو نا۔ براؤ کوئی سا پکچر دیکھنے کو مانگتا؟

ہاں بولتا تو ایسا ہے جیسا ہم جوبلیں گا کرکے دکھائیں گا ارے جا جا اپن بھی مکا مارے والا نائی۔

اچھا صاحب آپ کیوں لڑتے ہیں۔ یہ زمانہ تو پیار محبت کا ہوتا ہے ہنسی مذاق کا ہوتا ہے۔ پیار کرو۔ دلار کرو۔ آرے تم کیپا بولا۔ مدد بولو نکا۔

ارے صاحب۔ ہم تو کب سے ہی بھنبھنا گئے بلکہ بڑے بے آبرو ہو کر اُن کے کوچے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور خیالوں میں جوانی کے دن لہرانے لگے۔

ان اکھاڑوں اور جھگڑوں سے تو ہم بھر پائے۔ سبھی زندگی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر چین اور سکون کے ساتھ نہیں۔ زبانی دو لتیاں جھاڑ جھاڑ کے۔ خیر سوچا۔ چلو گھر ہی چلیں۔ اتنے اکھاڑوں اور مورچوں کے سنبھالنے سے بہتر ہے گھر کے اکھاڑے کو سنبھالیں۔ مگر نہیں صاحب اتنی آسانی سے کہاں؟ سوچا ہی تھا کہ سکون کے لیے ایک اور بینچ سجھا دی اور ہم جا کر اس پر بیٹھ گئے۔ شام ہو چکی تھی۔ بلکہ کہئے رات ہو چکی تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس ماحول نے ہم پر بڑا عجب اثر کیا۔ اور صاحب ہم بینچ پر بیٹھے ہی نہیں لیٹ گئے۔ آہا ہا۔ کیسا سکون ملا۔ کیسا آرام ملا۔ بس آنکھ لگ گئی اور آپ ہی سوچئے جب آنکھ لگتی ہے تو خواب نظر آتے ہی ہیں بس ہم نے دیکھا ہم پھر سے جوان ہو گئے اور ہماری خیالی محبوبہ ہمارے پہلو میں آ بیٹھی۔ شرماتے لجاتے اُس نے اپنے آنچل سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ہم نے پوچھا۔ کیوں جی یہ آنچل کیوں مروڑا جا رہا ہے؟ ذرا نظریں اُٹھائیے ہم سے بھی تو نگاہیں ملائیے۔ بولیں جائیے جی۔ ستائیے مت، ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ ہم نے کہا۔ قربان جائیے اس ادا کے۔ مگر دیکھئے صاحب۔ ایک بات کہے دیتے ہیں گھر آنے کے بعد شرمیے گا نہیں۔ اس بار تو مجبوری کی شکل میں بیوی ہمیں مل ہی گئی ہے۔ اگر چھٹکارا مل گیا تو ہم آپ کو اپنی بیگم بنانے کی ہمت ضرور کریں گے۔ وہ شرمائیں، لجائیں اور ہم ان کی اس ادا پر بل کھائے ہی والے تھے کہ کسی نے زور سے ہمارا کان مروڑ دیا اور ہم بل کھانے کے بجائے اینٹھ گئے۔ اور ساتھ ہی سر پر وہ زوردار ہاتھ پڑا کہ خواب اور اس کا نشہ دونوں ہی رفو چکر ہو گئے۔ دیکھا تو بیوی ہاتھ میں لئے سر پہ سوار ہیں...

ہاں ہاں باتیں کروا اپنی جہیتی سے ۔ میں پوچھتی ہوں کون ہے وہ چڑیل ۔ جس سے شادی کرکے اس بھوتنی یہ چھڑانا چاہتے ہو۔ ذرا اپنی عمر تو دیکھو ۔

ارے بیگم لوگوں کا خیال کرو

بھاڑ میں جائیں لوگ اور چولہے میں جائے پارک ، تم گھر چلو۔ میں تمھیں مزا چکھاتی ہوں۔ بڑے آئے ہیں آرام کرنے والے ۔

اچھا بھئی گھر جاکر جو چاہو کرلینا ۔ ابھی تو پنڈ چھوڑو ۔

لئے میں پوچھتی ہوں یہ رسہ تڑاکر کب تک بھاگو گے میں تمہارا ساتھ چھوڑنے والی نہیں۔ گن گن کر بدلے اور ہم نے سوچا آٹھ بدلے بچے کی شکل میں لے ہی چکی ہیں اور ہر روز تین لڑائیوں کے حساب سے جا لڑائیاں لڑ چکی ہیں ۔ اب اگر بدلے ہی لینے ہیں تو پروردگار ہمیں اٹھا ہی لے تو ہمارا پنڈ چھوٹے ۔ کم سے کم اس جنم اس جنم میں کیوں ۔ ابھی تو اگلے چھ جنم بھی باقی ہیں ۔

اب تو صاحبان آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ہم دہقان پان سی ذات کے مالک کیوں ہیں ۔ ہمیں تو ہماری لے ہی جا رہی ہیں "اکھاڑے" میں ۔ اب بازی چت ہوتی ہے یا پٹ یہ تو اوپر والے پر چھوڑ اپنی انا خدا حافظ ہی کہیے ۔ ••

خطیب تحسین

قصّہ پیشاب کا

اُس رات اُن کے چہرے پر تھکن کے آثار قطعی نہیں تھے اور وہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے مگر صبح اُٹھ کر انھوں نے اچانک اعلان کر دیا کہ وہ پیشاب پیتے ہیں۔ یہ صحت کے لیئے بہت ہی مفید شئے ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ وہ پیشاب نوشی کے ذریعہ اپنی صحت کی حفاظت کریں۔ ان کی پیشاب نوشی کے انکشاف نے ہمیں حیرت کے سمندر میں ڈھکیل دیا۔ ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ حیرت کے سمندر کی کوئی تہہ نہیں ہوتی۔ حیرت ـــــ شدید حیرت۔

جلدی کا کام شیطان کا ـــــ آن کی آن میں ہندوستان جنّت نشان میں آگ اور خون کے دریا کے ساتھ پیشاب کی نئی نہریں بھی بہنے لگیں۔ غیر ملکی مشروب بند کر دیا گیا اس کی کمی سے جو خلاء پیدا ہوا تھا اُسے اس نئے قومی مشروب سے بھر دیا گیا۔ پانی کا استعمال معیوب سمجھا گیا اور پیشاب کو افضل مانا گیا۔ شرفاء کسی کو پانی استعمال کرتے دیکھتے شرم سے پیشاب پیشاب ہو جاتے۔ اسلیے رنگ انقلاب سے راتوں رات لغت تبدیل ہو گئی۔ محاورے اس طرح رائج ہو گئے۔

"چلو بھر پیشاب میں ڈوب مرنا" "آنکھ میں پیشاب بھر آنا" "منہ میں پیشاب بھر آنا" "بڑی بڑی کو پیشاب پلانا" "پیتہ پیشاب کرنا" "آنکھ کا پیشاب مرنا" "گھاٹ گھاٹ کا پیشاب پینا۔"

پیشاب نوشی کی اعلیٰ پیمانے پر تشہیر کی جانے لگی۔ فلم "دو بوند پیشاب" کو قومی اعزازات سے نوازا گیا اور تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ نیز ٹی وی پر اس فلم کی بار بار نمائش کی گئی تا کہ دیہی علاقے کے عوام بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

پیشاب کو عطر کا متبادل قرار دیا گیا۔ بلکہ پوتر بھی۔ اس سوال پر حزب اختلاف نے ہنگامہ مچایا کہ آیا پیشاب کے "قریب ترین ساتھی" گوبر صندل کا نعم البدل اور قومی غذا قرار دینے کی تجویز زیرِ غور ہے؟ حکمرانوں نے تردید و تصدیق طلب ایسے بیانات دیئے کہ اپوزیشن مختلف وزراء کے ان متضاد بیانات سے بوکھلا گئی اور مزید کچھ استفسارات کرنا بھول گئی۔

بعد ازاں اس سرکاری راز کے فاش کرنے کے جرم میں چند اعلیٰ افسران کی گرفتاری عمل میں آئی۔

پیشاب کے حد درجہ استعمال سے عوام کی رگوں میں خون کی بجائے پیشاب دوڑنے لگا۔ لوگ اپنے خون کی قسم کھانے کے بجائے اپنے پیشاب کی قسم کھانے لگے۔

ایک بڑے شہر میں فساد اپنی روایتی آن بان کے ساتھ پھوٹ پڑا۔ انسان انسان کے پیشاب کا پیاسا ہوگیا۔ وہ اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھامے اسے بلوائیوں کے چنگل سے بچانے کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں دوڑنے لگا۔ ادھر سمت سے ایک چاقو لہرایا اور لگتے ہی لمحے اس کی شہ رگ سے گرم گرم پیشاب اُبلنے لگا۔ اس نے اپنی شہ رگ سے اُبلتے ہوئے پیشاب میں انگلی ڈبو کر سیندور سے نا آشنا محبوبہ کی مانگ تر کر دی۔ اب وہ سہاگن ہو گئی تھی۔

چونکہ ملک میں ہر طرف پیشاب کا بول بالا تھا۔ اس لئے مسلسل البول کے مریضوں کو زیادہ پیداوار کے ذریعہ ملک کی خدمت کرنے کے صلہ میں انعام و اکرام سے نوازا جانے لگا۔

یوں پانچ طویل سال پیشاب کی دھار کی سی تیزی سے گزر گئے اور عام انتخابات سر پہ آ پہنچے۔ اپنے پنج سالہ پلان میں حکومت نے صحت عامہ کے لئے بہت کچھ کیا لیکن سب کے کرائے پر پیشاب پھر گیا۔ عام انتخابات کے نتائج برآمد ہونے پر حکمران جماعت اور اپوزیشن جماعت تک بھی نہیں پہنچ سکے۔ آخر پر گھڑوں پیشاب پڑ گیا۔

مختار حسین فہیم

ٹھٹھرتی ہوئی سیاہ رات کی بانہوں میں دوڑتا ہوا ہوڑہ میل یکایک اپنی رفتار کھونے لگا۔ آہستہ آہستہ رینگ کر
ک گیا۔

گارڈ بیزاری کے عالم میں جھنجھلاتا اور بڑبڑاتا ہوا اپنے کیبن سے باہر نکلا۔ وہ اپنی نیم خوابیدہ آنکھوں کو ملتا ہوا فرسٹ کلاس
رٹمنٹ کے اُس کونے کی طرف بڑھا جہاں خطرہ کی زنجیر کھینچی گئی تھی۔

وہ جوں ہی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا، اس کے جسم کا ہر حصّہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت اور جوان لڑکی
ر کو مضبوطی سے تھامے ہوئے کھڑی ہے۔ اس کی ساڑی کا پلو ڈھل کر فرش پر پڑا ہوا ہے۔ بلاوز جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ وہ
سل روئے جا رہی ہے اور سسکیاں لیتی جا رہی ہے۔ اس کے آنسو آنکھوں سے پھسل کر رُخسار پر پھیلتے جا رہے ہیں۔ ناک سے "سوں
ں" کی آواز نکل رہی ہے۔ سانسوں کی آمد و رفت تیز ہے جو سینہ کے اُبھاروں میں مد و جزر پیدا کر رہی ہے۔ اس کی تراشیدہ زلفیں
ی ہوئی ہیں اور کچھ رخساروں پر آنسوؤں سے چپک کر رہ گئی ہیں۔ اس کی کمر کے پیچ و خم پر ناخنوں سے نوچے جانے کے نشان ہیں
پر اب خون کے قطرے اُبھر آئے ہیں۔

اس نے گارڈ کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھا۔

اس کا سراپا گارڈ کے لئے مجسمۂ التجا بن گیا۔

گارڈ کو دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے لڑکی نے گارڈ کی توجہ کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے اس مرد کی طرف
ئی جسے وہ اب تک نظر انداز کئے ہوئے تھا۔۔۔ لڑکی کے بیان کے مطابق اس مرد نے لڑکی کے ساتھ زور و زبردستی کر کے اس کے
ہزار روپے چھین لئے تھے اور اس کی عصمت دری کی کوشش بھی کی تھی۔۔۔ گارڈ نے اس مرد کا جائزہ لیا۔ اس مرد کا پورا جسد
کورٹ میں چھپا ہوا تھا اس کی آنکھوں میں سزا کا خوف یا ندامت کے آنسوؤں کی جگہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ گویا اس نے کوئی بڑا معرکہ
ر کر لیا ہو۔۔۔ معاملہ پولیس کے سپرد کر دیا گیا۔

پولیس نے تفتیش و تلاشی کی غرض سے جونہی اس کے شانوں پر سے کوٹ اُتارا۔ ششدر رہ گئی۔۔ اس کے دونوں بازو کٹے ہوئے تھے
لڑکی نے حیرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہسٹریائی کیفیت میں چیخی۔۔۔ "اس مرد کو گرفتار کر لو۔ یہ مرد
ہے۔ اس نے مجھ سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے پاس اس وقت دس ہزار روپے ہیں۔ اس نے یہ نہیں بتلایا تھا کہ وہ اپاہج بھی
۔۔۔ فریبی۔۔۔ کمینہ کہیں کا۔۔۔"

ریاست کے جیالے کسانوں کو آفریں

آندھرا پردیش کی خوشحالی کا دار و مدار کسان کے بل پر ہے۔ ہمارے پانچسالہ منصوبے برسوں سے غذائی اجناس کی پیداوار میں اضافہ کو زبردست اہمیت دیتے آئے ہیں۔ آندھرا پردیش میں غذائی پیداوار میں اضافہ کی مساعی کو ۷۶-۱۹۷۵ء میں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے ۹۴،۳۲ لاکھ ٹن اجناس اگائے جو ایک ہمہ وقتی ریکارڈ ہے۔

قدیم زمانہ سے خشک سالی کے شکار علاقوں میں قلت کے حالات کے ازالہ کے لئے "خشک سالی ہونے والے علاقوں کے پروگرام" کو روبہ عمل لایا جارہا ہے جو فی الوقت اضلاع اننت پور، کرنول، کڈپہ، چتور، نلگنڈہ اور پرکاشم میں جاری ہے۔

چھوٹے کسان کو بھی فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ چھوٹے کسانوں کی ترقیاتی ایجنسی اور مار کسانوں و زرعی مزدوروں کی ترقیاتی ایجنسی کی جانب سے اب تک ۸۷۸،۸۶ لاکھ روپیوں استفادہ کیا گیا ہے

او۔

۹۲،۲۳ کروڑ روپیوں کے مساوی ادارہ جاتی مالیہ فراہم کیا گیا ہے۔ تقریباً ۶،۹۷ لاکھ چھوٹے کسانوں، ازحد چھوٹے کسانوں اور زرعی مزدوروں کی "شناخت" عمل میں لائی جاچکی ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

119-73/2

مشتاق احمد یوسفی

کیا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا؟ ★

سدا سہاگن راگنی

رات کے دس بجا چاہتے تھے۔ بینک میں دس بارہ شب زندہ دار رہ گئے ہوں گے۔ بسیں چلنی بند ہو گئی تھیں اور اندر باہر سناٹا تھا۔ بھوک بھی تھوڑی دیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مری نہیں تو ایسی گہری نیند ضرور سو گئی تھی جو سسکیاں لے لے کر رونے کے بعد بچوں کو آجاتی ہے۔ اچانک عجب وغریب آوازیں آنے لگیں جیسے چیل، مینڈک اور بوڑھی میم مل کر قوالی گا رہے ہوں۔ ہم نے ہال میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تمام آوازیں ایک نو گرفتار، آزاد منش (سابق) سیکنڈ کلاس ایم۔ اے، ایم۔ ایم۔ این۔ پی کنجو کے گلے میں رڑک رہی ہیں۔ انھیں بینک میں وارد ہوئے کوئی ایک مہینہ ہوا ہوگا اور اس وقت وہ ملیالم زبان کا ایک رسیلا گیت گا رہے تھے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ دریائے کاویری کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہو کر ایک دراوڑی دوشیزہ نے انھیں سکھایا تھا۔ یہ دعویٰ درست ہی ہوگا، اس لئے کہ اگر وہ واقعی دریائے کاویری کے اس پار کھڑی تھی تو اس کی دوشیزگی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ انہی کی زبانی اس کا خارا شگاف ترجمہ سُن کر ہمارے تو پسینے چھوٹنے لگے۔ اس کے شرنگار رس کے سامنے اردو کی ساری عشقیہ شاعری بالکل نرسری رہائم اور گڈے گڑیا کا کھیل معلوم ہونے لگی۔ حق نواز چیمہ، اکاؤنٹنٹ، اسٹرانگ روم (محافظ خانہ) کی بالشت بھر لمبی چابیاں چھنکا کر سنگت کر رہے تھے۔ ہر ملیالم بول کے بعد این۔ ایم۔ ایم (پی) کنجو کچھ دیر منہ سے مردنگ بجاتے۔ اور جب وہ گانا موقوف کر کے اور ٹھاٹ بدل کر منہ سے طبلے کی سی آوازیں نکالنے لگتے تو چاچا فضل دین چوکیدار آ کر منہ سے لسنے پہ تھاپ لگا کر اعلان جنگ کرتا اور پنجابی ٹپے کا ٹکڑا "بارہ برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لیاندا بھا دال ✦" لگاکے اہل درد کو لوٹ لیتا۔

★ مشتاق احمد یوسفی کی خود نوشت سوانح "زرگزشت" سے

✦ دوبارہ برس کمانے کو گیا اور کما کے لایا بھا دال!

پاکستان تازہ تازہ وجود میں آیا تھا اور خط تقسیم کی روشنائی ابھی اچھی طرح خشک نہیں ہوئی تھی۔ بیٹھک میں مکتب سب انگریزی میں تھے گفتگو اردو میں۔ لیکن گالی ہر شخص اپنی مادری زبان میں ہی دیتا تھا۔

زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

انگریزی کی گالی بالکل پھیکی، بے باس اور کھوکھلی ہوتی ہے۔ یہ گالی آدمی اپنے آپ کو بھی دے سکتا ہے۔ اردو کی مروجہ گالی، جس کی طرف غالب نے ایک خط میں اشارہ کیا ہے، اُستن اور بوڑھے آدمی کو نہیں دی جا سکتی۔ کاٹ اور تندی بدکلامی کے لحاظ سے البتہ مارواڑی گالی کا جواب نہیں۔ لیکن یہ اتنی گندی اور کٹیلی ہوتی ہے کہ اس کے صحیح مخاطب و مستحق صرف مارواڑی ہو سکتے ہیں اور جن کی تعداد بشمول راقم الحروف پاکستان میں اتنی کم ہے کہ جی کی بھڑاس نہیں نکل سکتی۔ اسی طرح اس زمانے میں بے سُرا گانا بھی ہر شخص اپنی ہی زبان میں گاتا تھا اور کسی کو اس سے یہ گلہ نہیں ہوتا تھا کہ ہماری مادری زبان میں مردم آزادی کیوں نہیں کرتا۔ ایک رات واحد بخش کھوسو نے شاہ عبد اللطیف بھٹائی کا عارفانہ کلام بھیرویں میں سنا کر دلوں کو ایسا گرمایا کہ اسی وقت یہ طے پایا کہ بول کسی بھی زبان کے ہوں، جملہ آلاتِ موسیقی ..... مثلاً دنبورہ وغیرہ ... مستقل بھیرویں ہی بجایا کریں گے۔ بول بھی بھیرویں اور خوشا سدا سہاگن راگنیاں ہیں۔ ہر وقت، ہر شغل اور موسم میں مزہ دیتی ہیں۔ سننے والے کا جی نہیں بھرتا۔ پکے راگ راگنیوں میں ہمیں بھی صرف بھیرویں پسند ہے۔ اس لئے کہ محفل موسیقی کے آداب و روایات کے مطابق اس کے بعد کوئی اور راگ نہیں گایا جا سکتا۔ چنانچہ مارے باندھے جب کسی محفل میں جانا پڑے تو بیٹھتے ہی اسی کی فرمائش کر دیتے ہیں۔

واحد بخش کھوسو ہر بول کے بعد فقط "الا" سے کھا دُپوٹ کی شکیلس کس کے وادیٔ مہران میں لے آتے۔ ملی جلی قوالی کے تیور کچھ ایسے ہوتے تھے:

نصیر احمد خاں :	گناہ کا اپنے معترف ہوں، پر التجا ہے کہ یا کیسا زر !
	کر دے مجھ سنگسار لیکن گناہ کی داستاں تو سُن لو
چاچا فضل دین :	بارھیں برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لیاندا چھاواں، الا !
حق نواز چیمہ :	مو کل سے فرور آج کوئی بات ہوئی ہے
	جانے میں قدم اور تھے، آنے میں قدم اور
کورس :	بارھیں برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لیاندا گنڈھیا، الا !
	(توبارہ برس کمانے کو گیا اور کما کے لایا گنڈھیا، الا !)
عباد الرحمن غالب :	یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
	وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
کورس :	بارھیں برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لیاندا بٹیرا، الا !
	(توبارہ برس کمانے کو گیا اور کما کے لایا بٹیر، الا !)

سامعین میں سے اگر دیوار اور میز کرسیوں کو نکال دیا جائے تو جاندار دل میں ملے دے کے صرف ہم تھے جو اس بے زبان زمرے میں آ سکتے تھے۔ سبھی حاضرین آرکسٹرا کے سرگرم رکن تھے کہ اسی میں عافیت تھی۔ دوسروں کی آواز کے عذاب سے بچنے کے لئے ہر شخص اپنا ذاتی شور سنتا اور کانوں میں انگلیاں دے کر گاتا تھا۔ کچھ دن ہماری موجودگی بار خاطر ہوئی۔ منہ سے تو کسی نے کچھ نہ کہا، لیکن بیزار نگاہیں پکارتی رہیں:

چلے بھی جاؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ایک دن دبے لفظوں میں ہم سے شکایت بھی کی کہ آپ کے اس طرح کام کرنے سے ہمارے شور شرابے
میں خلل واقع ہوتا ہے! ہم کٹے کٹے سے رہنے لگے تو بولے آپ کیوں دل چھوٹا کرتے ہیں؟ اور انھوں نے ہمیں مُنہ سے سیٹی
بجانے اور اس پر میرا بائی کے دوہے پیش کرنے کا پروانۂ راہش گری دے دیا، بشرطیکہ وہ پنجابی ٹپے کی دُھن میں ہوں تاکہ تسلے
سے بھائی کو تکلیف نہ ہو اور وہ حسبِ معمول اپنے جھاڑیں سے دلوں کا میل دور کرتا رہے۔ چاچا فضل دین کبھی خود ہے اب سُرا
جاتا تو تسلا پھینک کر کہتا کہ پتہ کا سماں تو اس وقت، بند صاحب جب دور سے ہر بول کے ساتھ ڈاجیوں اور گائے بکریوں
کے گلے میں پڑی ہوئی ٹلیوں کی گھنٹیوں کی آواز آتی رہے۔

فضل دین چاچا کو وہ لوگ بھی چاچا کہتے تھے جو خود تایا کہلانے کے لائق تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ پہلی ملاقات ہوئی
تو ہم نے نام پوچھا تو اس نے سارا آموختہ سنا دیا تھا: موضع تھوئیاں، دربار بابا حضرت شاہ کلی، علاقہ تھانہ علی پور چٹھہ، ضلع گوجرانوالا
والا ہور، معرفت اللہ دتہ سائیکل پنکچر مستری، کو پہنچ کر یہ دمڑی فضل دین پنشن یافتہ لانس نائک کو ملے۔"

بندۂ مزدور کے اوقات

بنکوں میں ان دنوں صبح ساڑھے آٹھ بجے سے رات کے دس گیارہ بجے تک لگاتار کام ہوتا تھا، جب گورنمنٹ
دفاتر کے اوقاتِ بے کاری نو سے ساڑھے چار بجے تک تھے۔ اول تو رات گئے تک کام کرنے کی کوئی شکایت نہیں کرتا تھا
اور اگر کوئی سرپھرا آواز اٹھاتا تھا تو اس کا تبادلہ بارش میں چٹاگانگ، گرمی میں سکھر اور سردی میں ہر نئی کوئٹہ دیا جاتا تھا جو اس
زمانہ میں شورہ پشت بنکروں کے لئے کالے پانی کی حیثیت رکھتے تھے لیکن جو گردن زدنی ہوتے، ان کو "لائن حاضر" کر دیا جاتا
تھا۔ جہاں ان کے طرّہ پُرپیچ کے سارے پیچ وخم ایک ایک کرکے نکالے جاتے۔ ہمیں یاد نہیں کہ دو ڈھائی سال تک ہم نے
اور ہمارے ساتھیوں نے کبھی چودہ گھنٹوں سے کم کام کیا ہو۔ دن اور رات کا فرق مٹ چکا تھا۔ اور اگر تھا تو، حضرت امیر
مینائی کے الفاظ میں، صرف تذکیر و تانیث کی الٹ پھیر تک،

دن مرا روتا ہے میری رات کو
رات روتی ہے مری دن کے لئے!

دوپہر کو کم ہی لوگ کھانا کھاتے تھے۔ گھر گھرتے سائکل پر کھانے کے ڈبے ٹور کر لانے والوں نے اپنی سروس
کی باری باری ہر ایک ڈبے سے بوٹیاں غائب کرنے کا دھندا شروع نہیں کیا تھا۔ عملے کے بیشتر افراد بشمول راقم آثم، ایرانی
ہوٹلوں کی طرف چہل قدمی کرکے بے کھائے پیے واپس آجاتے۔ جہاں تک ہماری عادات کا تعلق ہے، ہوا خوری کا یہ سلسلہ
۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔ کوئی کسی سے نہیں پوچھتا تھا کہ آج بھی تم نے کھانا کھایا یا نہیں۔ آٹھ نو بجے رات تک پیٹ کا
دُھڑک اُٹھتا۔ اسی کو دبانے، بہلانے کے لئے دراصل یہ گمت ہوتی تھی۔ سبھی بھوک کو کوٹین یا پان سے بہلاتے رہتے
۔ البتہ چاچا فضل دین چوکیدار وڈ اسٹریٹ کے فٹ پاتھ پر دو اینٹیں رکھ کر آٹھ بجے مکئی کی ایک روٹی ڈال دیتا تھا۔
لیکن جب تک دفتر میں ایک آدمی بھی خالی پیٹ بیٹھا کام کر رہا ہوتا، چاچا فضل دین لقمہ توڑنا حرام سمجھتا تھا۔ گیارہ بجے
سے پہلے شاذ ہی اسے روٹی نصیب ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سب کو اپنے ہاتھ سے ملر کے بھٹے بھون کر کھلاتا اور
گاؤں کے بھٹوں کو یاد کرکے آبدیدہ ہو جاتا۔

کچھ دن بعد ایسا ہوا کہ سگریٹ پینے کی بھی استطاعت نہ رہی۔ استطاعت سے ہماری مراد صاحب سرتبہ کر بھی ہمارا اوسط تھا۔ بڑی بات اور بڑی عادت کا صحیح لطف، ولذت دراصل کثرت وزیادتی (Excess) میں ہی آتا ہے۔ صاحبو! اعتدال پر اتنا ہی اصرار ہے تو نیکی میں کرو۔ کون روک سکتا ہے؟ از بسکہ اعتدال کو طبیعت نے قبول نہ کیا، ہم نے سگریٹ کم کرنے کی بجائے بالکل چھوڑ دیئے اور جوشاندے سے کشید کی ہوئی طراری چائے کے قدح کے قدح چڑھا کر بھوک اور نیند کو بھگاتے رہے۔ چائے دراصل ایجاد بھی اسی کار خیر کے لئے ہوئی تھی۔ لشا ما بسہ کس رو سیاہ کو غرض تھی۔ کہتے ہیں کہ چھٹی صدی میں ایک تپسوی بودھی دھرم جنوبی چین گیا اور وہاں ایک دیوار پر نگاہ جما کر دھیان کرنے لگا ایک روز دھیان کے سمے آنکھیں آپ ہی آپ نیند سے مندگئیں اور ساری تپسیا کھنڈت ہو گئی۔ کرودھ میں آکر اس دھیانی نے وہیں اپنے پپوٹے کاٹ کر پھینک دیئے تاکہ آنکھیں کبھی بند ہی نہ ہو سکیں۔ زمین پر جس جگہ وہ پپوٹے اور خون کے قطرے گرے، وہاں نئی کونپلیں پھوٹ نکلیں جنہیں اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ان کا نام چائے پڑا۔ اسی کی یاد میں زین مت والے آج بھی دھیان اور اپاسنا سے پہلے چائے کا گھونٹ ضرور لیتے ہیں۔ سو ہم اس گھڑی اسی امرت کے گھونٹ لے لے کر اس رات کی باتیں سنا رہے ہیں۔

ہم نے اہل زبان سے کیوں شادی کی

میر محفل کا پورا نام: سابق لفٹیننٹ نواب محمد عمر مجاہد خاں پاشا کنجو تھا۔ بینک میں تازہ وارد تھے۔ خود کو کرناٹک کا نواب بتاتے تھے۔ تیور اور طنطنے سے نواب ہی لگتے تھے، مگر ایسا لگتا تھا کہ اپنی قلمرو کے نام سے پہلے انہوں نے "کر" کا اضافہ کر لیا ہے۔ حیدرآبادی، اردو میٹھے مدراسی لہجہ میں بڑے فراٹے سے بولتے تھے۔ ق کا تلفظ خ کرتے تھے۔ حسن حسینہ کو قمری اور قمری کو ثمری کہتے تھے۔ اکثر خان سیف الملوک خان کا مذاق اڑاتے کہ وہ خوبانی کو خربانی کہتا ہے اور حق لوگ جیسے قربانی کو کربانی! خود قربانی کو خربانی کہتے تھے یا! اپنے نام کا تلفظ ین۔یو۔یم۔یم۔ین۔پی۔کنجو فرماتے تھے۔ ایک دن ہم نے چھیڑا، سرکار نے سارا کرناٹک چھوڑ کر یو پی کی خاتون سے کیوں شادی رچائی؟

"کمبخت سالن! انی چاول! اور جھینگے کھاتے کھاتے دانت ہل گئے تھے۔ اتفاق سے ملاقات ہو گئی۔ سلیقہ مند خاندانی عورت۔ لکھنوی کا خلیہ، خوش ہنس کا نے میں طارخ، جھول، دورتی، امور خانہ داری کے قاعدے اور قانون سے واقف، ..... اور کیا چاہیے؟" وہ خوش خیالے۔

"تو گویا یہ آپ کے کچھ کرایکیش، کنگھی، تربانی ہوئے۔" ہم نے کہا۔

"مگر آپ ہم تو مارواڑی رانگڑ ہیں۔ آپ نے اہل زبان سے کیوں عقد نکاح کیا؟"

"ہم نے تو یہ گستاخی محض اردو زبان سے اپنی جھجک نکالنے کے لئے کی تھی۔"

"ایہہ گل ہوئی جاناں والی۔" (یہ بات ہوئی مزے والی) چاچا فضل دین نے ہماری لسانی منصوبہ بندی کی داد دی۔

(کر)ناٹک کا نواب

بینک میں کنجو شہزادہ گلفام کہلاتے تھے۔ اکہرا بدن، صندلی رنگ اور باتوں میں بھی اسی کی خوشبو۔ تیکھے نقوش، تیتے جیسی کمر۔ ناک اتنی لمبی اور نکیلی کہ اسے منگنی کی انگوٹھی پہنائی جا سکتی تھی۔ کان پر منت کی بالی کا رچا ہوا سوراخ۔ مرلوی

ہولنگے۔ اچھے لباس کے شوقین تھے۔ مشہور تھا کہ سوتے میں بھی کروٹ لینے سے پہلے اپنی مانگ اور پاجامے کی کریز درست کر لیتے ہیں۔ ان کی خوش پوشی 'جامہ زیبی' اور بربادی میں نسوانی توجہات کو بڑا دخل تھا۔ مئی جون میں بھی گلے میں 'پولکا' بندکیوں کا سلک اسکارف باندھتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے ٹوکا کہ آپ کی ۱/۳ تنخواہ بزاز اور ۲/۳ درزی کی نذر ہو جاتی ہے۔ پچھلے مہینے آپ نے اپنے خانگی بجٹ کے دوسرے پلڑے میں ہماری حقیر تنخواہ کا پاسنگ ڈالا' تب کہیں ڈنڈی برابر ہوئی۔ ارشاد فرمایا، بیٹے، پرانے دھرانے کپڑے پہننے کا حق صرف کروڑپتی سیٹھوں کو پہنچتا ہے۔ نوکری پیشہ آدمی کے تو، اللہ رکھے، یہی اللّے تللّے رہیں گے۔ مدراسی زبان میں کہاوت ہے، ہیجڑے نے ساری کمائی 'مونچھ منڈائی' میں گنوائی۔ ہمارے قبیلہ کا عقیدہ ہے کہ جو روپیہ چھوڑ کر مرے اس کے نطفہ میں فرق ہے۔ میرے والد نہ جانے کیسے آٹھ ہزار روپے جمع کر لئے تھے جن سے ایک کوآپریٹیو بینک میں اکاؤنٹ کھلوا لیا۔ وہ تو اُن کے مرنے سے ایک ہفتہ پہلے بینک فیل ہو گیا ورنہ سارا شجرہ خاک میں مل جاتا۔ مولا نے بڑا فضل کیا۔

ہر شخص کی اپنی مخصوص چال اور آواز ہوتی ہے۔ یہ قدرت کا معجزہ ہے کہ بعینہٖ ایسی چال اور آواز دنیا میں کسی کی ہوئی، نہ ہوگی۔ لیکن جیسی عجیب و غریب چال ان حضرت کی تھی، ہم نے اس سے ملتی جلتی بھی نہیں دیکھی۔ تقریباً حالت رکوع میں چلتے پھرتے تھے۔ مگر ہاتھوں کی پوزیشن ایسی ہوتی تھی گویا آندھی میں سائکل ہینڈل مضبوطی سے پکڑے چڑھائی چڑھ رہے ہوں۔ بہت دن معلوم ہوا کہ ہارمونیم کے رسیا ہیں۔ اور ہمہ وقت اسے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرنے سے اسی پوز میں اکڑ کر رہ گئے ہیں۔ ہارمونیم اٹھائے ہوئے نہ ہوں تو توازن قائم رکھنا دشوار ہو جاتا۔ قدم قدم پر ڈگمگاتے، لڑکھڑاتے کبھی اُلار ہو جاتے۔ اکثر فرماتے کہ پورے صوبہ مدراس اور کرناٹک میں ہارمونیم پر مجھ سے زیادہ تیز کوئی ٹائپ نہیں کر سکتا ہارمونیم اتنی برق رفتاری سے بجاتے کہ انگلیاں نظر نہیں آتی تھیں۔ دُھن بھی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ فی منٹ ڈیڑھ سو الفاظ کا خون کر لیتے تھے۔

قرض لینے میں انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ کہتے تھے کہ اُدھار سے اخوت و مساوات بڑھتی ہے اس زمانہ میں سب کا حال پتلا تھا۔ کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند۔ جس کو دیکھو 'پاؤں چادر سے گھٹنوں تک نکلے ہوئے ہیں۔ ایسوں سے قرض لینا ایسے کرنا دینا اور پھر لینا...... یہ اُنہی کا جگرا تھا۔ کسی کا ہاتھ تنگ ہوتا تو یار لوگ الٹا اسی سے قرض مانگنے لگتے...... اس ڈر سے کہ کہیں پہلے وہ نہ مانگ بیٹھے۔ اور جب کوئی واقعی قرض مانگتا تو لوگ اپنی اپنی مشکلات کا ذکر اس انداز سے کرتے کہ مانگنے والا بھی آبدیدہ ہو جاتا۔ ہمدردی و دلسوزی کا اس سے زیادہ موثر طریقہ ہنوز ایجاد نہیں ہوا۔ برصغیر کے بعض پسماندہ علاقوں میں اب تک یہ دستور چلا آتا ہے کہ برادری کی بڑی بوڑھیاں کسی کے ہاں غمی میں شریک ہوتی ہیں تو لمبا سا گھونگھٹ نکال کے بیٹھ جاتی ہیں۔ اور اپنے اپنے پیاروں کے نام لے کے بین کرتی دھاڑتی ہیں۔ سب اپنے اپنے مُردوں اور مُرادوں کو فریاد، بچھاڑیں کھاتے خشک آنسوؤں سے روتی ہیں۔ اگر کوئی ناواقفِ حال پہنچ جائے تو وہ ایک گھنٹہ بین سن کر بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس [illegible] میں دوڑھائی سو مُردوں میں سے آج کا مرحوم خصوصی کون ہے۔ [illegible] دنوں دکن میں بھی یہی رسم و راہِ دلسوزی و دستگیری تھی۔ اپنی اپنی عندلیب سے مل کے کچھ دیر آہ و زاریاں کرنے کے بعد سب اپنا [illegible] اور آرزوؤں کو اجتماعی قبرستان میں دفنا دیتے۔ مگر اس طرح کہ دوسرے دن چھنگلیا سے کھود کر نکالی جا سکیں۔

کچھ قرض مانگنے سے پہلے اپنی متروکہ جاہی "زمینات" کا ذکر ضرور کرتے اور رقبہ کو دہراتے' تہراتے اور چوہراتے رہتے۔ ہر دفعہ' پندرہ بیس ہزار ایکڑ کا اضافہ ہی نہیں' بلکہ اپنے غلّہ خیز بیان سے فی ایکڑ پیداوار کو بھی دو چند، سہ چند کر دیتے۔ کرناٹک کے سنگلاخ علاقوں میں گھاس کا تنکا بھی نظر نہیں آتا۔ وہاں نہ صرف گنّے کے جنگل کے جنگل کھڑے کر دیتے

بلکہ ان میں جنگلی ہاتھیوں اور "خمریوں" کے ریوڑ بھی گھسا دیتے۔ جس دن ہم سے ہماری ساری تنخواہ بارہ گھنٹے کے لئے قرض لی ہے "اس وقت ان "زینات" کا رقبہ پھیل کر اتنا ہو گیا تھا کہ سموچا صوبۂ سندھ اس میں سما جائے اور پھر بھی اتنی گنجائش رہ جائے کہ پنجاب کے پانچ چھ اضلاع، محکمۂ انہار و پٹواریان بدزبان سمیت، اس میں کھپ جائیں۔ اگلے اتوار کو پاک بوہیمین کافی ہاؤس میں مرزا نے پوچھا "صاحب! آپ نے کرناٹک کی جدّی جائداد کا کلیم کیوں نہیں داخل کیا؟" جھنجھلا کر بولے "مجھے کیا بادشاہ چوہے★ نے کاٹا ہے؟ میں کلیم میں قلعے کے بدلے کوارٹر نہیں لینا چاہتا۔ ریاستیں بھی کہیں راشن کارڈ پر الاٹ ہوئی ہیں۔ افسوس آپ کو کبھی رئیسوں سے واسطہ نہیں رہا۔ پرتڑوں کے رئیسوں کی خو بو سو سال تک نہیں جاتی۔"

"اگر لفظ "خو" نکال دیں تو مجھے آپ کا دعویٰ حرف بحرف تسلیم ہے۔" مرزا نے اتمام حجت کیا۔

انڈین آرمی سے ڈسچارج ہوئے سات آٹھ سال ہونے کو آئے تھے لیکن سرفروشی و سرکوبی کی آگ اپنے ۳۶ انچ سینے میں دبی رکھتے تھے۔

میان سے نکلی پڑے ہے مری تلوار ہنوز

ایک دن کہنے لگے کہ جب میں کنارا بینک لمیٹڈ میں چیف کیشئر تھا تو تین ڈاکے پڑے۔

"ڈاکے" ہم نے حیرت سے کہا

جی ہاں! بینک پر ڈاکے نہیں تو کیا اولے پڑتے؟"

اپنی حاضر جوابی سے ہمارا دریدہ دہن بند کر کے انھوں نے بڑی تفصیل سے پہلے ڈاکہ میں اپنی حاضر دماغی کا قصہ سنایا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جیسے ہی ڈاکو نے اپنا ۳۸ بور کا پستول نکالا، انھوں نے بڑی دلیری سے ایک ایک ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈی اس کی کنپٹی پر رکھ کر پستول لوٹ لیا۔

▲▲

★ حیدرآباد دکن میں کسی زمانہ میں طاعون کی وبا آئی تھی۔ محلّے کے محلّے صاف کر گئی۔ اسی زمانہ میں محاورہ میں کتے کی جگہ چوہا در آیا۔

مناظر عاشق ہرگانوی

پیکرانِ بے سخن

جاننے کا ذریعہ

مشہور محقق قاضی عبدالودود کے یہاں ڈاکٹر عابد رضا بیدار، قاضی مسعود احمد اور مناظر عاشق ہرگانوی بیٹھے ہوئے تھے گفتگو ابوالکلام آزاد پر ہو رہی تھی۔ قاضی صاحب نے بتایا "ایک بار ایک ڈنر میں ذاکر حسین بھی موجود تھے۔ کسی نے کھانے کے دوران کہا کہ آزاد فرانسیسی بھی جانتے تھے"

"جی ہاں، فرانسیسی سے واقف تھے" ذاکر حسین نے برجستہ جواب دیا "لیکن ترجمہ کے ذریعہ سے"

فائدے کا فائدہ

راج بھون پٹنہ میں سابق گورنر بہار دیو کانت بروا علامہ جمیل مظہری، فراق گورکھپوری اور مناظر عاشق ہرگانوی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ گفتگو جب خالص ادبی موضوع پر ہونے لگی تو جمیل مظہری نے فراق گورکھپوری سے پوچھا:

"ادب کی افادیت کیا ہے؟"

فراق نے جواب دیا "ایک بچہ گولی کھیل رہا تھا۔ اس کے باپ نے اُسے سمجھایا کہ گولی کھیلنا مناسب نہیں ہے، اس کوئی فائدہ نہیں، اس لئے مت کھیلو۔ بچہ گولی کھیلنے کے بجائے لٹّو نچانے لگا۔ باپ نے اس کھیل سے بھی اسے منع کیا کہ لٹو نچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے تب وہ بٹیر لڑانے لگا لیکن باپ نے اس حرکت سے بھی اسے منع کیا کہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بچے نے جھنجھلا کر باپ سے پوچھا "آخر فائدہ کا فائدہ کیا ہے؟ آپ ہی بتائیں"

فائدہ ــــ ایک لطیفہ

فائدہ پر بات چلی تو فراق نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک آدمی نے بیٹے سے پوچھا کہ "مرنے کے بعد جنّت میں جانا پسند کرو گے یا جہنم میں؟"

نے کہا " فائدہ جہاں زیادہ ہو۔"

دو چار جوتے بھی پڑے

م موہن رائے سینیری پٹنہ میں مشاعرہ تھا۔ قریب
ار کا مجمع تھا۔ فراق گورکھپوری کو کافی داد مل رہی تھی
لئے وہ پڑھے ہی جا رہے تھے۔ جب کافی دیر ہو گئی
رے کھڑے وہ تھک گئے تو پڑھتے پڑھتے وہ مائک
ں ہی بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھنے کے بے ساختہ انداز پر
ن کی ہنسی چھوٹ گئی۔ فراق نے برجستہ کہا ؎

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
ہ دو چار جوتے بھی پڑے پھر بھی نہ اٹھے اینٹھ گئے

تبّت یدا

رزا محمد عسکری (مترجم تاریخ ادب اردو) کے ایک گہرے
ت مولوی مجیب اللہ فرنگی محلی تھے وہ ایک فاضل،
، بذلہ سنج اور آزاد طبیعت صوفی تھے۔ ایک مرتبہ
درویش کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ درویش نے ان کا
ی دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ " قل ہو اللہ شاہ" ہے
شاہ صاحب نے صوفی کا نام پوچھا تو جواب دیا:
خاکسار کو "تبّت یدا" کہتے ہیں۔"

چائے نہ پینے کا نتیجہ

کلکتہ میں پروفیسر عبدالباری، علامہ جمیل مظہری اور
احباب مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے
اتفاق سے چائے نہیں پیتے تھے بلکہ اس سے نفرت
تھے اور چائے نہ پینے والوں کو آزاد خطرناک آدمی
تھے۔ جمیل مظہری نے مولانا سے پوچھا " پروفیسر باری
چائے نہیں پیتے ہیں۔ ان کے متعلق حضور کی رائے کیا ہے؟"
مولانا آزاد مسکرا کر بولے " یہ خطرناک تو نہیں ہیں لیکن
ایک گوشہ ان کے ذہن کا بہرحال خالی ہے سو وہ چائے نہ پینے کا نتیجہ ہے"

انگلی کا زخم

ایک مرتبہ پروفیسر طاہر رضوی کی انگلی زخمی ہو گئی۔ وہ اپنی انگلی
پر کپڑے کی پٹی لپیٹے ہوئے تھے۔ مولانا آزاد کے پاس پہنچے تو
ان کی نظر پڑ گئی پوچھا " بھئی، یہ کیا معاملہ ہے؟"
طاہر بولے، مولانا ایک زخم ہے"
یہ سن کر مولانا سلیمے کی انگلی کو اپنے سینے کے بائیں طرف
لے گئے اور دل کے قریب رکھ کر بولے " طاہر صاحب، اس
کی جگہ یہاں تھی۔ کیا غلط جگہ چنی ہے آپ کے زخم نے۔"

شکل پہچانی نہیں جاتی

مظہر امام نے علامہ جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی اور مناظر
عاشق ہرگانوی کو دن کے کھانے پر بلایا تھا۔ جمیل مظہری کچھ دیر
سے پہونچے۔ آتے ہی کہنے لگے " بھئی، آنے میں دیر ہو گئی۔ ذرا
میں داڑھی بنوانے ایک سیلون چلا گیا تھا لیکن ایک خاص بات
یہ ہوئی کہ اپنی کمزور نظروں سے آج میں نے آئینہ میں صورت
دیکھی۔ سچ کہتا ہوں، عمر کی زیادتی سے اپنی شکل نہیں پہچانی
گئی۔ ابوالخیر کشفی کی یہ رباعی بے طرح یاد آرہی ہے ؎

پیری کا عجب طور نظر آتا ہے
ہر دور عجب دور نظر آتا ہے
بھولے سے جو آئینہ اٹھاتا ہوں
اس میں تو کوئی اور نظر آتا ہے

ڈنمٹل

ڈ۔ کالیکا پرشاد

چھاپہ

ں روزپان کی دوکان پہ پان ملنے کے انتظار میں ریڈیو سن رہا تھا کئی اور اصحاب بھی اس نیک کام میں لگے تھے۔
اجپائی ملک کے مختلف مقاموں پہ پڑے چھاپوں کے بارے میں مفصل اہم خبریں سنا رہے تھے۔ یہاں اتنے لاکھ کا
وہاں اتنے لاکھ کی چاندی، ہر نئے چھاپے کی خبر پہ میں بھی اور سامعین کی طرح خوش ہو رہا تھا کہ تبھی ایک ہی خواہ
اکر مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "کمال ہے' آپ کے گھر چھاپہ پڑ رہا ہے اور آپ یہاں ؟"
یرے گھر" ! میں نے متعجب ہو کر پوچھا
ی ہاں' آپ کے ہی گھر ۔ کمال ہے۔
ہ سنتے ہی پان والے نے گاہکوں کے درمیان سے منہ کاٹ کر مجھے پان دیا۔ میں نے وہ پان کا بیڑا اپنے بہی خواہ
ڑھاتے ہوئے پوچھا۔ آپ تمباکو تو کھاتے ہوں گے ؟ " نہیں" کمال ہے۔ ابھی ریڈ شروع ہو چکی ہے
ب یہ تھا کہ پان والا کا رگڑا چھوڑ دیں اور گھر جائیے لیکن میں نے پان والے سے ان کے لئے ایک سادہ پان اور
آرڈر دیا اور اطمینان سے پان لگنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس پہ وہ میرا منہ دیکھنے لگا لیکن ان سے نہ رہا گیا
کمال ہے !(اب میں سمجھا کہ "کمال ہے" شاید ان کا تکیہ کلام ہے) آپ جائیے پان میں لوں گا اور ہاتھ ہلا کر
د اصحاب سے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میں نے کہا ۔ "اب تو چھاپہ پڑ ہی رہا ہے۔ میرے جانے سے چھاپہ رک

ا نہیں۔
س وقت بھیڑ میں سے کسی نے کہا ۔" اتنے دنوں سے چھاپے پڑ رہے ہیں۔ کوئی احمق ہی ہوگا جو مال گھر پہ رکھا ہو گا"۔
رے" انھیں پہلے ہی خبر کرا دی گئی ہو گی" ۔ ایک تیسرے نے طنز کیا۔ یہ چھاپہ والے بھی ملے رہتے ہیں۔
ں نے اب وہاں سے کھسکنا ہی بہتر سمجھا۔ راستے میں ایک وکیل صاحب ملے۔ انھیں شاید پہلے ہی اس چھاپے کا
ا تھا۔ چونک کر بولے ۔ " تم یہاں گھوم رہے ہو۔ تمھارے گھر ریڈ ہو رہی ہے ۔ آؤ جلدی"۔ اور انھوں نے
ی گاڑی میں زبردستی بٹھا لیا۔
ھر پہنچا تو وہاں عجیب حال تھا۔ سارا محلہ سڑک پہ جمع تھا۔ دس دس، پندرہ پندرہ لوگوں کے الگ الگ جھنڈ تھے ۔ مجھے
ہ سب لوگ سمت آئے۔ ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ میں جلدی سے بغیر منہ دکھائے گھر میں گھسنا چاہتا تھا مگر

سپاہیوں نے مجھے دروازہ پہ ہی روک لیا۔
"اندر ریڈ ہو رہا ہے، کوئی نہیں جا سکتا"۔
میں نے کہا ـــــ "میرا ہی گھر ہے، بھئی" ـ
ہو گا ـ ہمیں تو یہ آرڈر ہے کہ کسی کو بھی اندر نہ آنے دو"
اُسی وقت دو افسر باہر آئے ـ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے اندر جانا چاہا ـ پہلے تو انھوں نے انکار کر دیا ـ پھر
ان میں سے ایک نے پوچھا۔ "آپ کے پاس شناختی کارڈ ہے ؟"
"شناختی کارڈ" میں حیرت زدہ رہ گیا۔ "اپنے گھر میں بھی جانے کے لئے شناختی کارڈ کی ضرورت پڑے گی ؟"
"یہ تو ٹھیک ہے مگر ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ آپ ہی شری ...... ہیں"۔
"واہ" میں نے کہا ـ میرا ہی گھر سمجھ کر تو آپ چھاپہ مار رہے ہیں۔ نہ کہ کسی اور کا گھر؟ یقین نہ ہو تو ان وکیل صاحب سے
پوچھ لیں ـ یہ میری شناخت کر سکتے ہیں۔
"خوب!" اُس وقت تک دوسرے صاحب، جو بعد میں مجسٹریٹ تھے، بولے ـــ "ان وکیلوں کا کیا ٹھیک آئے دن
یہ غلط آدمیوں کی شناخت کرتے ہیں"۔
اسی درمیان ایک شخص اندر سے آیا اور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہی ہے"۔ پھر کیا تھا۔ مجھے بلاعزت میرے
گھر کے اندر لے جایا گیا ـ ٹھیک اُسی طرح جیسے مجھے پہلی بار سسرال لے جایا گیا تھا ـ گھر کے اندر پہنچا تو میری نانی مر گئی ـ گھر کا
باتھ روم کھدا پڑا تھا ـ باورچی خانہ ٹوٹا تھا ـ بھگوان کی مورتیاں جہاں قائم تھیں وہاں سے نیچے گری تھیں ـ سارے بکسوں
کے تالے ٹوٹے پڑے تھے ـ سارا سامان الٹا پڑا تھا ـ افسروں سے اس درگت کا سبب پوچھا تو بتلایا گیا کہ باتھ روم اس لئے
کھودا گیا کہ آشیار بچھ کے باتھ روم سے ہی لاکھوں کی بلاک منی نکلی تھی ـ بمبئی کے ایک سیٹھ کے باورچی خانہ سے سونے
کی سلاخیں برآمد ہوئی تھیں ـ اس لئے باورچی خانہ کھودنا پڑا ـ بھگوان کی مورتیاں اور مجسموں کے قریب سے کئی مقاموں پہ
کالا دھن برآمد ہوا ـ اس لئے مورتیوں سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنی پڑی ـ بکسوں کی تلاشی لی ہی جاتی ہے"۔
مجھے ان کی دلیلوں پہ چپ ہو جانا پڑا ـ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے کپڑے اتار کر مجھے بالکل ننگا ہی نہ کر دیا جائے کیوں کہ ایک
چھاپے میں ایک تاجر کی بیوی کے جسم کے مختلف حصوں سے بندھے پچپن ہزار کے نوٹ برآمد ہوئے تھے ـ
تھوڑی دیر بعد ہی تلاشی ختم ہوئی ـ تلاشی لینے والوں نے ایک ڈائری، کچھ لو لیٹرس اور میرے بڑے لڑکے کی ایک کاپی
جس میں اخباروں کی کٹنگ تھی قبضہ میں لے لیئے ـ ڈائری اس لئے کہ اس میں بہت سے نام اور پتے تھے جن پر انھیں شبہ
تھا کہ یہ سب لوگ میرے ساتھ کالے دھندے میں شریک ہیں ـ لو لیٹرس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ نمبر "دو" کے کاغذات ہیں کوڈ ورڈ میں لکھا گیا ہے
لڑکے کی کاپی میں جو اخباروں کی کٹنگ تھی اُس میں اکثر مرکزی اور صوبائی وزرا کے ناموں کی فہرست اور بڑے بڑے افسروں کے نام تھے ـ میرا دلیل
کہ لڑکا آئی ـ اے ـ ایس کے امتحان میں بیٹھنے والا تھا اور امتحان میں ایک دو سوال ان پر ضرور آتے ہیں کوئی ماننے کو راضی نہ ہوا ـ ان کا کہنا تھا کہ یہ لوگ وہ (؟)
جن تک میری رسائی ہے ـ ایک افسر نے تو میری چالاکی کی داد دی ـ اُس نے اُن سبھی منسٹروں و گورنروں کے نام کاٹ دیئے جو اپنے عہدوں سے ہٹ گئے تھے ـ
دوسرے دن اخباروں میں خبر آئی کہ میرے گھر چھاپہ پڑا تھا!!

شیطان کی اُمت
(قسط وار ناول)

پرویز ید اللہ مہدی

آج کلب کی چوتھی سالگرہ تھی۔ خوشی کے اس موقع پر کلب کے چند خصوصی اراکین اپنے اپنے فن کا مظاہرہ بھی کرنے والے تھے۔ یہ بات پچھلے کئی دنوں سے ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ اور جب آغازِ جشن سے کافی قبل ہم شبو کے ہمراہ کلب پہنچے تو اس بات کا یقین بھی آگیا کیونکہ کلب کے ایک کمرے میں شبو کی سہیلی عطیہ ربانی صاحبہ کے والدِ بزرگوار رنگین ربانی صاحب اپنے آرٹ کے نادر نمونوں سے ماحول کو رنگین بلکہ سنگین بنائے ہوئے تھے۔ "تجریدی آرٹ" کے ایسے ایسے ناقابلِ فہم نمونے ٹنگے ہوئے تھے کہ ہمیں اپنا "دماغ" بجائے سر کے حلق میں اٹکا ہوا محسوس ہوا۔ اس سے قبل جب کبھی ایسی کسی ناگہانی افتاد سے دوچار ہوئے ہیں دو چار گلاس پانی کے چڑھا کر دماغ کو معدے میں اتار کر اپنی عافیت کو خطرے سے بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ خطرہ ٹلنا مشکل نظر آتا تھا کیونکہ آرٹ کے اس لق و دق صحرا میں پانی کا قطرہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اس بات پہ ایمان لے آنا پڑا کہ ماڈرن آرٹ کے ستائے ہوئے سچ ہی کہتے ہیں کہ "تجریدی آرٹ" دراصل تخریبی آرٹ ہے۔

شبو اور عطیہ صاحبہ نے محترم رنگین ربانی صاحب سے ہمارا تعارف کروایا۔ جس کے فوراً بعد حسبِ توقع ربانی صاحب نے اپنے آرٹسٹک نمونوں سے ہمیں متعارف کروانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے نمونے نے ہماری عافیت اور عاقبت دونوں کو خاصہ بگاڑ دیا۔ بیضوی شکل کا ایک مُرّاہ دکھایا گیا تھا جس سے اُودے رنگ کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس شاہ کار کا عنوان تھا "سچ کی تلاش"۔۔۔ عنوان پہ نظرِ ثانی کرنے کے بعد سب سے پہلے تو ہمیں اپنے فانی ہونے کا شدت کے ساتھ احساس ہوا پھر یہ جان کر بڑی خفت سی محسوس ہوئی کہ سچ کی روشنی اس قدر بھونڈے رنگ کی ہوتی ہے بلکہ رنگ کی مناسبت سے تو لگتا تھا جیسے سچ میں روشنی نہیں ہوتی بلکہ روشنائی ہوتی ہے اُودے رنگ کی جسے صرف تحریر کی شکل میں ڈھال کر کتابوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے تاکہ ایک دن اسے دیمک چاٹ جائے اپنے خیال کی اس خطرناک پرواز اور تخریبی اندازِ فکر پھر یہ بات ہمارے دل و دماغ میں اور بھی پختہ ہو گئی کہ "تجریدی آرٹ" واقعی "تخریبی آرٹ" ہوتا ہے۔ ہماری خاموشی اور گمبھیرتا کو حضرت آرٹسٹ نے شاید انہماک پہ محمول کیا اس لئے جیسے ہی ان سے نظریں ٹکرائیں بڑے ہی

تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔ "اپنی اس حقیر پینٹنگ کے بارے میں آں جناب کی گراں قدر رائے جاننے کو بے چین ہوں۔"
موصوف کی اس پیشہ ورانہ انکساری کے باوجود ہمیں ان کا یہ سوال سن کر ہم پر کم و بیش ویسی ہی تھر تھری غلبہ پانے لگی جیسی کہ اسکول اور کالج کے زمانے میں ریاضی کے سوالیہ پرچے کو دیکھ کر طاری ہو جاتی تھی۔ فی الوقت ہم اپنی گراں قدر رائے دینے کے موقف میں ہرگز نہیں تھے۔ کیونکہ یہ بات ابھی تک ہماری حقیر سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ بیچ کی یہ روشنی بلکہ روشنائی جس بیضوی شکل کے دائرے سے پھوٹ رہی تھی وہ اصل میں ہے کیا چیز؟ انڈا ہے یا بیگن ـ؟ لیکن اس کے باوجود ہمیں اپنے منہ سے کچھ نہ کچھ پھوٹنا ضروری تھا۔ چنانچہ پھوٹنا شروع کیا۔ "دراصل اس شاہ کار میں جو بات قابلِ داد ہے وہ دراصل قربانی صاحب آپ کی ـ" ہم اپنے منہ سے اتنا ہی پھوٹے تھے کہ موصوف فوراً پھٹ پڑے ـــ "میرا نام قربانی نہیں ربانی ہے رنگین ربانی ـــ" اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ جیب میں سے ایک عدد ملاقاتی کارڈ، نکال کر ہمارے ہاتھ میں تھما دیا' ہم نے کارڈ کا سرسری جائزہ لیا اس پر موصوف کا نام انگریزی اُردو دونوں زبانوں میں خاصے بڑے حروف میں چھپا ہوا تھا۔ ہم نے کارڈ جیب میں رکھتے ہوئے موصوف سے معافی مانگی اور پھر آگے پھوٹنا شروع کیا۔ "دراصل آپ کی اس شاہ کار پینٹنگ کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں' بلکہ میری بات چھوڑیئے خود آپ کے پاس نہیں ہوں گے' چیز ہی ایسی ہے۔ اس شاہ کار کو دیکھ کر میرے ذہن میں مشہورِ زمانہ "پکاسو" کی اس نادرِ روزگار پینٹنگ کی یاد تازہ ہو گئی جس کا عنوان شائد "سفید جھوٹ اور کالا سچ" ہے ـــ" ہم نے حسبِ عادت بے پر کی ہانکی اور فوراً دوسری پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دوسرا نمونہ پہلے نمونہ سے دو جوتے آگے نظر آیا۔ بادی النظر میں یوں لگا جیسے اوبڑ کھابڑ پہاڑی کے پتھریلے دامن میں ایک عدد معصوم صورت بکری اپنے 'ریوڑ' سے بچھڑ کر حیران و پریشان اس سوچ میں غلطاں کھڑی ہے کہ میں اِدھر جاؤں یا اُدھر جاؤں۔ لیکن جب نظروں کا زاویہ بدل کر کچھ زیادہ انہماک اور غور سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ پہلی نظر میں جس چیز پر بکری کا گمان ہوا تھا وہ دراصل کسی ہوائی جہاز کا ملبہ ہے ـــ دوسرے زاویئے نے پہلے زاویۂ نظر کی نفی کر ہی دی تھی۔ قبل اس کے ایک اور زاویۂ نظر پچھلے دونوں زاویوں کی نفی کرتا آرٹسٹ موصوف پھر وہی تجسس آمیز سوال کے ساتھ نظروں کے سامنے آگئے اور جواب میں ہم پھر گلہ صاف کر کے شروع ہو گئے ـــ "اس پینٹنگ کا تو جواب نہیں دہقانی صاحب ـــ"

"دہقانی ـــ" موصوف کی پتلیاں تیزی سے گردش میں آگئیں ـــ اس بار پھر ہماری زبان نے ٹھوکر کھائی تھی ـــ موصوف نے جھلا کر پھر تصیح فرمائی ـــ "جناب والا میرا نام ربانی ہے۔ ربانی ـــ رنگین ربانی ـــ" زبان کے ساتھ ساتھ موصوف بھی حرکت میں آگئے اور اسی جھٹکے کے ساتھ ایک اور ملاقاتی کارڈ جیب سے ہمارے ہاتھ میں منتقل ہو گیا جسے ہم نے خجلت آمیز شرمندگی کے ساتھ اپنی جیب میں منتقل کر لیا ـــ اپنی زبانی پھسلن کی معافی مانگی اور پھر ان کی پینٹنگ کی شان میں قصیدہ خوانی شروع کر دی ـــ "آپ نے دراصل اس شاہ کار پینٹنگ کا کوئی عنوان نہیں رکھا ہے لیکن اس نایاب شاہ کار پر پہلی نظر میں مجھے مائیکل اینجلو کے اس شاہ کار کا دھوکہ ہوا جو سوڈان کے ایک چرچ کی چھت کے اندرونی حصے میں آج بھی موجود ہے اور ایک دنیا سے دادِ تحسین وصول کر رہا ہے' اس شاہ کار کا عنوان غالباً "رات کا سورج"

دن کا چاند ہے۔! موصوف ہماری تعریف کے یہ زبانی پھول سمیٹنے میں مصروف ہو گئے اور ہم نے موقع غنیمت جان کر پچھلے دروازے کا رُخ کیا لیکن آدھی دُور ہی گئے ہوں گے کہ موصوف نے بندروں کی طرح اچھل کر ہمیں آ لیا اور سامنے والی پینٹنگ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پینٹنگ میری تمام پینٹنگس میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے"۔ موصوف کے اس دعوے نے گھڑی بھر کے لئے اس نمونے کی طرف ہماری تمام تر توجہات کو مبذول کروا دیا۔ یہ نمونہ البتہ پچھلے نمونوں کی طرح گرگٹ صفت نہیں تھا یعنی ہر زاویئے سے ایک جیسا نظر آیا، تاہم، ہم نے آگے پیچھے یا دائیں بائیں رُخ بدل کر اس کا معائنہ نہیں فرمایا۔ حالانکہ ہمیں پوری پوری آزادی حاصل تھی چاہتے تو سر کے بل کھڑے ہو کر اس کا جائزہ لے سکتے تھے بلکہ کسی شاعر کے اس شاعرانہ مشورے پر بھی عمل کر سکتے تھے کہ ؎

دُور جا کر دیکھتے نزدیک آ کر دیکھتے ... ہم سے ہو سکتا تو ہم تم کو برابر دیکھتے

لیکن دیکھتے بھی تو کیا؟ دیکھنے لائق کوئی چیز ہو تو آدمی دیکھے بھی البتہ اس شاہ کار نمونے سے بار بار ہمارا ذہن اپنے گھر کی اسی دیوار کا موازنہ کرتا رہا جو محلے کے شریر نونہالوں کے علت "کیچڑ بازی" کی زد میں آ کر اپنی اصلی رنگت و ہیئت کھو چکی ہے۔ اس شاہ کار نمونے میں جا بجا نظر آنے والے مٹیالے رنگ کے دھبوں اور ہماری اسی ستم رسیدہ دیوار پر نقش و نگار کی حیثیت سے دائمی شکل میں پھیلے ہوئے کیچڑ کے دھبوں میں بال برابر فرق نظر نہیں آتا تھا، اس حساب سے ہماری دیوار بھی آرٹ کے بین الاقوامی مقابلے میں حصہ لے سکتی ہے۔ کیا پتہ انعام اول بھی مار لائے۔ البتہ اس شاہ کار نمونے اور اس مخصوص دیوار میں اگر کچھ فرق تھا تو صرف عنوان کی حد تک، ہماری دیوار بلا عنوان تھی اور اس نمونے کا عنوان تھا "ایٹمی انتشار"۔ ہم نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ جب بھی گھر لوٹیں گے اپنی پہلی فرصت میں دیوار کی رسم اسم نویسی کی تقریب بپا کر کے اس کے ماتھے پر بھی یہی نام چسپاں کر دیں گے ۔۔۔ موصوف کے اسی شاہ کار نے ہمیں اس غریب الوطنی میں اپنی بچھڑی ہوئی دیوار کی یاد دلا کر کسی قدر جذباتی کر دیا تھا چنانچہ اس بار شدت جذبات سے مغلوب ہو کر پھر ہم نے موصوف کے نام نامی کی ایسی مار دی یعنی اس بار انھیں "رمضانی" کہہ کر مخاطب کیا۔ پھر کیا تھا موصوف پر ایک بار پھر اُسی جھلاہٹ کا دورہ پڑ گیا بلکہ اس بار تو اس نے کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لی۔ کیونکہ اب کی بار ساری جیبیں ٹٹولنے کے باوجود ان کے ہاتھ کوئی ملاقاتی کارڈ نہیں لگا۔ اس سے پہلے کہ یہ صدمہ موصوف کو اپنے بال نوچنے اور کپڑے پھاڑنے پر مجبور کر دیتا ہم نے نہایت ہی مودبانہ انداز سے ان کے دیئے ہوئے دونوں ملاقاتی کارڈ ان کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ جھینپ سے موصوف کچھ دیر تک یوں گھورتے رہے جیسے کارڈ پر چھپے ہوئے اپنے نام کے ہجے کر رہے ہوں پھر ہماری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس سلسلے میں ہم سے تصدیق چاہتے ہوں، ہم نے نہایت ہی مدلل لہجے میں کہا۔ "جی ہاں یہ آپ ہی کے کارڈ ہیں اس پر آپ ہی کا نام درج ہے رنگین ربانی"۔ ہماری اس اطلاع پر اس سے پہلے کہ موصوف اپنے کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جاتے یا ہمارے کپڑوں کے ساتھ کچھ اس قسم کا سلوک کر کے ہمیں نکال باہر کرتے، مشتو اور عطیہ صاحبہ جو وہیں ماڈرن آرٹ کے اس جنگل میں پھنسا کر روپوش ہو گئی تھیں اچانک نمودار ہو کر ہمیں اور ربانی صاحب یعنی ہر دو افراد کو ایسے کسی مجنونانہ مرحلے سے گذرنے سے بچا لیا۔ ابھی ہم ہر دو خواتین کا اس بر موقع امداد کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پائے تھے کہ عطیہ ربانی صاحبہ نے اپنی بغل میں دبے ایک فریم کو ایک خاکا ایسا ۔ نک ۔ تکی

میں اس کی نقاب کشائی فرمادی۔ شبنم نے اس تازہ شاہ کار کے بارے میں فرمایا: "آج کے جشن کا یہ خاص تحفہ ہے عطیہ کی جانب سے، جسے کلب کی نذر کیا جائے گا۔" ہم نے اس اطلاع پر اس شاہ کار کا قریب سے جائزہ لیا، مختلف رنگوں کی مدد سے ایک ہیولہ سا بنایا گیا تھا جس پر سانپ کا گمان ہوتا تھا یعنی اُبلہ، دم واضح تھا، لیکن جو چیز اس ہیولے کی طرف دیکھنے والے کو کھینچتی تھی وہ تھیں آنکھیں۔ ہمارے ذہن میں کہیں یہ احساس اجاگر ہو رہا تھا کہ یہ آنکھیں دیکھی ہوئی ہیں، ان میں کچھ عجیب اَن مِٹی، اَن بجھی پیاس بھی تھی، نفرت بھی تھی، قہر بھی تھا، درد بھی، اور مکاری بھی۔ یہ آنکھیں آہستہ آہستہ ہمارے ذہن کے کینوس پر واضح ہونے لگیں، یہ آنکھیں جو کسی ناگن سے زیادہ زہریلی تھی یہ آنکھیں مسز چہ خوب یعنی نادرہ خانم کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہوسکتی تھیں ــــ !!!

● خاصی شام ہوچلی تھی۔

بستی کی سربرآوردہ ہستیوں سے کلب آباد ہوچکا تھا۔

آج کلب کی رونق بہار پر تھی۔ اگرچہ کہ کلب کی چوتھی سال گرہ کا جشن تھا لیکن کلب کی سجاوٹ اور لوگوں کی ریل پیل کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کلب کا 'جشنِ سیمین' منایا جارہا ہے۔

کلب کے 'وسطی ہال' میں تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی، کیونکہ اعلان کے مطابق تھوڑی ہی دیر میں خان فولادی عرف طوطا پری اپنے خطرناک فن کا مظاہرہ کرنے والا تھا، جسے ہم ابھی کچھ دیر پہلے تک بھی محض افواہ سمجھتے رہے تھے۔ لیکن جب اسٹیج پر جدید وضع کے سانپوں کے ڈربے نما صندوقچے جمائے جانے لگے تو دیگر شائقین کے ساتھ ہمارے بھی رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ اسٹیج پر حرکت کرنے والا ہر شخص طوطا پری کے اشاروں پر ناچتا نظر آیا۔

آج طوطا پری کے تیور بالکل الگ تھے۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب ٹھہراؤ نظر آتا تھا جسے ہم کوشش کے باوجود کوئی نام نہیں دے سکے۔ آج وہ اس 'خطرناک' فن کا مظاہرہ کرنے جارہا تھا جس کے بارے میں خود اس کا دعویٰ تھا کہ اس فن سے دنیا میں صرف دو ہی آدمی واقف ہیں، ایک وہ خود، دوسرا اس کا 'استاد' جس کا نام ہمارے ذہن سے نکل چکا تھا۔ البتہ یہ یاد تھا کہ طوطا پری کا استاد امریکن ہے اور امریکہ ہی میں اس کی بہت بڑی 'لیبوریٹری' ہے سانپوں کا زہر نکالنے کی'۔ وہ اور طوطا پری، صرف دو اشخاص ایسے ہیں جو زہریلے سے زہریلے سانپ کو نہتے ہاتھوں سے قابو میں کر کے کانچ کی نلیوں میں زہر اگلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ طوطا پری کے استاد کے بارے میں ہم نے بھی شاید کہیں پڑھا تھا لیکن اس قسم کے مظاہرے کے دیدار کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ مگر آج اس خطرناک کھیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے تھے۔ اس لئے تجسس کے ساتھ ایک عجیب خوف کا احساس بھی بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔

اُدھر اسٹیج پر تمام مطلوبہ اشیاء پہنچ چکی تھیں۔ جس چیز نے تمام شائقین کو سب سے زیادہ متحیر کیا وہ تھی کانچ کی ایک قدِآدم الماری۔ چاروں طرف کانچ لگا تھا ایسا کہ اُس پار کا نظارہ صاف ہوتا نظر آرہا تھا۔ چونکہ الماری کے اندر کا رقبہ اس قدر وسیع تھا کہ اسی میں ایک عدد ٹیبل آسانی سے سمایا ہوا تھا اس کے بعد بھی اتنی جگہ خالی تھی کہ دو آدمی بہ آسانی کھڑے ہوسکتے تھے۔ کانچ کی اس مخصوص وضع کی الماری کے بارے میں طوطا پری نے بتلایا کہ آج کے اس مخصوص موقع کے لئے اس نے یہ الماری تیار کروائی ہے تاکہ اس خطرناک مظاہرے کے دوران

شائقین اپنے آپ کو غیر محفوظ نہ سمجھیں اور پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی زندگی کا سب سے خطرناک کھیل اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ پھر اُس نے ان سانپوں کے نام اور ان کی مختصر سی تاریخ بتلائی جو اس نے آج کے مظاہرے کے لئے منتخب کئے تھے۔ اس نے کہا کہ شائقین میں سے بیشتر ایسے افراد بھی ہوں گے جنھوں نے اب تک کنگ کوبرا کا صرف نام ہی سنا ہوگا، یا ہوسکتا ہے تصویر بھی دیکھی ہوگی۔ لیکن آج پہلی مرتبہ اپنی آنکھوں سے اصل کنگ کوبرا کو اپنے تمام تر جاہ و جلال اور زہرناکی کے ساتھ دیکھیں گے۔ طوطا پری نے سانپوں کی نفسیات کے بارے میں بہت ساری باتیں بتلاتے ہوئے یہ خاص بات بھی بتلائی کہ کوئی بھی زہریلا سانپ اس وقت تک حملہ آور نہیں ہوتا جب تک کہ اُسے یہ احساس نہ ہو کہ اس کی جان خطرے میں ہے۔ قدرت نے کچھ اس طرح زہر کی تھیلی اس کے منہ میں لگائی ہے کہ اس کے دانتوں سے اس کا راست تعلق ہے، جب تک کہ سانپ مشتعل نہیں ہوتا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اور جب جھپٹتا ہے تو اس کے دانت کسی انجکشن کی سوئی کی مانند شکار کے جسم میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور فوراً اس کے دانتوں کا زاویہ کچھ اس طرح رُخ بدلتا ہے کہ زہر کی تھیلی خود بخود دب جاتی ہے اور پھر یہ زہر آنِ واحد میں دانتوں کے ذریعہ شکار کے زد میں آتے ہوئے حصے سے جسم کے اندر داخل ہوجاتا ہے اور یہ سارا عمل اس قدر آناً فاناً ہوتا ہے کہ شکار کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملتا اور سانپ کام کرجاتا ہے۔

طوطا پری کی اس لیکچر بازی کے دوران ہی کئی خواتین پر لرزہ طاری ہوگیا لیکن اس کے باوجود وہ ڈٹی رہیں محض اس ڈر سے کہ شوہروں پر اگر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ جنھیں وہ اب تک شیرنی سمجھتے آئے ہیں وہ ایک بھیگی بلی ہے تو پھر شوہروں کے دلوں سے بیویوں کا خوف جاتا رہے گا ـــــ لیکن ہم نہ تو کسی کے شوہر تھے نہ کوئی ہماری بیوی اس لئے ہمارے وہاں سے ہٹ جانے پر کسی کی سبکی ہونے کا ڈر تھا اور نہ ٹھہرے رہنے پر کسی کی سرخروئی کا امکان لیکن اس کے باوجود بھی ہم وہاں رُکے رہے بلکہ رکنے پر مجبور تھے، تماشہ ہی ایسا تھا۔ اس بیچ طوطا پری کانچ کی الماری میں داخل ہوچکا تھا ایک عدد مائیک بھی اندر منتقل ہوچکا تھا۔ طوطا پری نے مخصوص ساخت کے دستانے پہنے اس کے مددگاروں میں سے ایک نے، ایک عدد سانپ کا ڈربہ نما صندوق اندر پہنچایا۔ طوطا پری نے الماری کا پچھلا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ ڈربے کا دروازہ کھول کر اس کی چھت پر آہستگی سے چپت لگائی۔ تھوڑے توقف کے بعد ایک عدد تندرست و توانا کرخت ہیبت سانپ بڑی ہی سُبک رفتاری کے ساتھ باہر نکلا۔ اس سارے عمل کے دوران طوطا پری کی کومنٹری بھی برابر چل رہی تھی، اس نے اسی سانپ کا نام، حسب نسب، زہر کی مقدار وغیرہ کے بارے میں مختصراً معلومات بہم پہنچائیں۔ پھر شائقین کی خوفزدہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے اس نے سانپ کو اپنے ہاتھوں کے اشاروں پر درغلانا شروع کیا۔ کبھی کبھی بڑی ہی مہارت کے ساتھ اسی موذی کے سر پر ہلکی سی چپت بھی رسید کردیتا، کوئی پانچ سات منٹ کے اس رد بدلے، کھڑے کردینے والے تماشے کے بعد بالآخر وہ اس سانپ کو مشتعل کرنے میں کامیاب ہوگیا، جیسے ہی سانپ نے غصے سے اپنی دانست میں جھکائی دے کر وار کیا۔ . . . .

طوطا پری نے پینترا بدل کر اس کی گردن اس خوبی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لی کہ سانپ کا منہ کھل گیا اور

اس کا پچھلا دھڑ اسی تیزی سے بل کھانے لگا جیسے اس میں اچانک برقی رو دوڑ گئی ہو۔ پھر طوطا پری نے ایک عجیب و غریب وضع کی کانچ کی نلکی سے سانپ کا منہ اس طرح لگا دیا کہ اس کے دانت شاید نلکی کے اندر لگے اسفنج کے حصے سے جا لگے۔ پھر شائقین کے دیکھتے ہی دیکھتے نلکی کے نچلے حصے میں عجیب و غریب رنگ کا مائع ٹپکتا نظر آیا۔

طوطا پری نے ایک جھٹکے کے ساتھ سانپ کو واپس ڈربے میں منتقل کر کے دروازہ بند کر دیا۔ شائقین نے تالیوں سے چھت سر پہ اٹھا لیا۔

اس کے بعد طوطا پری نے ایک اور غضب یہ کیا کہ اس بار اپنے ایک ہاتھ کا دستانہ نکال دیا اور کھلے ہاتھ سے مظاہرہ کر کے مجمع میں ایک سنسنی پھیلا دی ـــ اب ہمیں طوطا پری کی طرف دیکھتے ہوئے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر کسی کا یہ قول یاد آ رہا تھا کہ حضرت انسان سے زیادہ خطرناک اور زہریلی مخلوق، خالق نے نہیں بنائی ... سانپ کو ورغلانے کے لئے پینترے بدل بدل کر لہرانے والے طوطا پری کے دونوں ہاتھ ہمیں یوں لگ رہے تھے جیسے دو خطرناک "ناگ" اپنے پھن ہوا میں لہرا رہے ہیں ـــ اس تصور نے ہم پر واقعی کپکپی طاری کر دی۔ چنانچہ یہ اسی تصور کا نتیجہ تھا کہ جیسے ہی ہمارے پہلو میں کھڑے ہوئے صاحب کا ہاتھ بے خیالی میں ہمارے ہاتھ سے ٹکرایا ہماری چیخ نکل گئی۔ جسے سن کر آس پاس کے کئی افراد گھبرا کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ اپنی اس سبکی پر پردہ ڈالنے کیلئے ہم نے اس طرح کھانسنا شروع کر دیا جیسے اچانک کھانسی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ بغل والے صاحب نے گھبرا کر ہماری پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی۔ کلب کا ایک ملازم دوڑ کر پانی لے آیا۔ پانی پینے کے بعد ہم نے اشارے سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اب ہم نارمل ہو چکے ہیں۔ لوگ ہماری طرف سے مطمئن ہوئے ہی تھے کہ طوطا پری اپنے فن کے سب سے خطرناک موڑ پر پہنچ گیا یعنی کلائمکس پر آ گیا۔ اس کے مددگار لڑکے نے ایک بہت بڑا ڈربہ اندر پہنچا دیا۔ طوطا پری نے بتلایا کہ اس ڈربے میں "کنگ کوبرا" بند ہے۔ اس اطلاع پر بشمولیت خاکسار کے تمام شائقین کا یہ حال ہو گیا کہ نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا سانس اوپر ہی اٹکتا محسوس ہوا۔ ادھر کو منٹری دیتے ہوئے طوطا پری کا ہاتھ کنگ کوبرا کے ڈربے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا ہی تھا کہ ادھر مجمع میں ایک نسوانی چیخ کچھ اس طرح ہسٹریائی انداز میں ابھری کہ مجمع میں ایک بھگدڑ مچ گئی ـــ !!!

(باقی باقی)

بالی کی کھال

(تبصرہ)

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

رات کا سفر

اشاریت مغربی شعر و ادب میں ایک رجحان ہی نہیں ایک قابلِ وقعت تحریک کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اسی کے زیرِ اثر اُردو شعر و ادب میں اشاریتی رجحان کا آغاز ہوا اور اب اس کو بتدریج فروغ حاصل ہوتا جارہا ہے۔ نثر سے زیادہ نظم میں! لیکن ایسے فن پارے جن میں اشاریت پائی جاتی ہو اردو میں کم ہی ہیں۔ اردو نثر میں اور کم ـــــ اشاریت کا حُسن اس کے ابہام میں ہے لیکن اگر ابہام، ابتذال کی حدود میں داخل ہوجائے تو اشاریت مضحکہ خیز ہوجاتی ہے۔ جہاں تک اشاریتی افسانوں کا تعلق ہے۔ ان دنوں عموماً ایسے ہی بہم افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ بوریت کا احساس ہوتا ہے ـــــ

"رات کا سفر" اُردو کے اشاریتی افسانوی ادب میں ایک خوشگوار اور صحتمند اضافہ ہے۔ "رات کا سفر" "دیوار کا آدمی" "ہیرے کا قلم" "آوازیں" اور "امن کی بستی" اس مجموعے کے خالص اشاریتی افسانے ہیں۔ "دھند" میں بھی اشاریتی فضا پائی جاتی ہے ـــــ لیکن یہ اشاریت کہیں بھی "گنجلک"، ناقابلِ فہم، دور از کار، مضحکہ خیز اور بھول بھلیوں جیسی نہیں۔ قاری کسی حد تک غور و فکر سے کام لے تو اشاریت کی گرہیں کھلتی ہیں۔ اور معنویت کی دنیا آباد ہوتی جاتی ہے۔ "گیلا کفن" "دودھ کے دانت" اور "جہانِ گذراں" میں اشاریت کم کم ہے لیکن اشاریتی افسانوں کی طرح پُراسراری فضا یہاں بھی ملے گی ـــــ قدیر زماں کی افسانہ نگاری کے موضوعات اسی زمین اور اسی زندگی کے موضوعات ہیں۔ اشاریت کو اُن کے ہاں ایک اسلوب کی حیثیت حاصل ہے ـــــ ان کے افسانوں کے موضوعات، کہیں، مصائب اور آزار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ختم نہ ہونے والی جد و جہد ہے تو کہیں فرد کے داخل اور خارج کے مابین کشمکش! کہیں بے جا نام و نمود اور سب کچھ پانے کی حرص و ہوس اس احساس کے بغیر کہ خود ہماری شخصیت مجروح، پارہ پارہ اور سبک سبک ہورہی ہے تو کہیں ماحول کی وہ پابندیاں ہیں جو پاکیزہ محبت کو بھی گوارہ کرنے کے حق میں نہیں کہیں اس دنیا کی نام نہاد امن پسندی ہے جو اس وقت تک امن پسند ہے تا آنکہ اس کے مفادات و مسلم متاثر نہ ہوں ـــــ "گیلا کفن" اور "دودھ کے دانت" میں بھی فرد کی مسرتوں اور خوں گشتہ آرزوؤں کی کہانی ہے۔

قدیر زماں نے بے دردی آہستگی لیکن بڑی بے رحمی کے ساتھ مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ اُن کے مضحک پہلوؤں کو اُبھارا اور ان پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ چونکہ ان کے اندازِ تحریر میں ایک خنکی ہے ایک دھیما پن اور ٹھہراؤ ہے۔ سیدھے سادے ڈھنگ سے قاری کی توجہ کو سمیٹے رہنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ افسانہ کب اور کہاں ختم ہوچکا ہے۔

قدیر زماں کے فن میں ایک INNER URGE پائی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس لئے نہیں لکھتے کہ لکھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ اُسی وقت لکھنا شروع کرتے ہیں جب کہ لکھنے کے سوائے ان کے پاس اور کوئی صورت نہیں ہوتی وہ اس لئے لکھتے ہیں کہ وہ لکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ان کے افسانے بھی حسبِ ضرورت مختصر ہیں اور افسانوں کا مجموعہ بھی! لیکن کمیت پر نہ جائیے۔ مسائل کے [illegible] تجزیئے، غور و فکر کی کارفرمائی اور اندازِ بیان پر اپنی مضبوط گرفت کے باعث کیفیت کے اعتبار سے افسانوں کا یہ مختصر سا مجموعہ "رات کا سفر" افسانوں کے ضخیم مجموعوں پر بھاری ہے۔

★ ابھی ابھی تخلص بھوپالی نمبر ملا۔ بہت شاندار ہے"۔ محمد منظور احمد، بنگلور

★ "شگوفہ" کا تازہ شمارہ بصیرت نواز ہوا۔ اس دورِ کرب و ابتلاء میں کہ آدمی کو مسکراتے ہوئے ایک جرم کا احساس ہوتا ہے آپ ہزاروں غم رسیدوں کے لئے قہقہوں کی ایک لازوال سوغات شگوفہ کے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔ "شگوفہ" رسائل و جرائد کے بے پناہ ہجوم میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے مقامِ امتیاز حاصل کر چکا ہے۔ محبوب راہی، آکولہ

خرافات

★ "اتنے کم عرصہ میں اتنا اچھا پرچہ نکالنے پر آپ کو اور پروفیسر آفاق احمد کو مبارکباد دیتا ہوں۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے یقیناً کچھ بہتر مضامین شامل نہ ہوسکے ہوں گے۔ [illegible] یہ نمبر تخلص مرحوم کی شخصیت اور اُن کی ادبی زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے بھوپال کے ادبی حلقوں میں آپ دونوں کی کوششوں کو سراہا جا رہا ہے۔ خدا شگوفہ کی عمر لمبی کرے۔

فضل جاوید، بھوپال

★ ماہ نومبر کا "شگوفہ" دیکھا (تخلص نمبر) یہ پرچہ جناب تخلص بھوپالی کی پوری ترجمانی کر رہا ہے۔ تخلص نمبر کا ٹائٹل کا پیج لاجواب ہے جس کے لئے طالب خوندمیری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میری نظم کتابت میں غلط ہوگئی ہے۔ پہلا مصرع یوں ہے۔

(۱) قسم خدا کی تخلص تھے متحق اس کے

متحق کی بجائے 'مستحسن اس کے' لکھا گیا اس طرح ایک مصرع یوں لکھا گیا۔

"رہو گے سوئے کہاں تک ابھی ذرا اُٹھو"

اس مصرع کو یوں لکھا جانا تھا

"رہو گے سوئے کہاں تک ابھی ذرا اُٹھو"

مقرب حسین مقرب دلائیسین